علیم الحق حقی کلیکشن
(ڈائجسٹوں کی شاہکار کہانیاں)
DIAMOND URDU BOOKS

علیم الحق حقی کلیکشن

جو ناول اوپن کرنا ہو اس پہ کلک کریں

01 وقت کے فاصلے
02 استعارہ
03 اعتراف
04 شب احتساب
05 جرم کے سائے
06 مافیا یونیورسٹی
07 ایکشن ری پلے
08 کٹھ پتلیاں
09 دروازہ
10 لہو کے دو رنگ
11 پگلی
12 جوان ہوا
13 رشتہ آدم
14 مس ہرکولیس
15 خندہ تقدیر
16 اماوس کا دیا
17 پہیلی
18 امید کا دیا
19 اچھوت
20
21
22

شاہ زر خان + کول فائر / وقاص احمد

پیشکش : ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

ڈائمنڈ اردو بکس

DiamondUrduBooks.com

اردو ادب، علم اور ثقافت کا بہترین آن لائن ڈیجیٹل ذخیرہ

✦ ویب سائٹ کا جامع تعارف

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے قائم کردہ ایک ممتاز اور بین الاقوامی آن لائن ڈیجیٹل لائبریری ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد دنیا بھر میں موجود اردو دان طبقے، بالخصوص قارئین، محققین، اور طلبہ کو اعلیٰ معیار کی کتب بالخصوص تاریخی، مذہبی، اصلاحی، جاسوسی اور ادبی شاہکار پی ڈی ایف (PDF) فارمیٹ میں بالکل مفت اور آسان رسائی کے ساتھ فراہم کرنا ہے۔

✦ ڈائمنڈ اردو بکس کی نمایاں خصوصیات

📚 وسیع ڈیجیٹل لائبریری

ہزاروں کی تعداد میں تاریخی، اسلامی، رومانی اور جاسوسی ناولز کا اعلیٰ ذخیرہ۔

⚡ ایچ ڈی (HD) کوالٹی

تمام کتب انتہائی صاف ستھرے اور ایچ ڈی پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہیں۔

📱 آسان اور تیز رسائی

موبائل اور کمپیوٹر پر بغیر کسی دشواری کے آن لائن مطالعہ اور ڈاؤن لوڈنگ۔

💎 مفت مطالعہ سروس

قارئین کے لیے تمام مواد مکمل طور پر مفت دستیاب ہے تاکہ علم ہر جگہ پہنچے۔

💡 ہمارا بنیادی عزم و مقصد

اردو زبان کی بقا اور کتاب سے دوستی کے کلچر کو عام کرنا ہمارا اولین مقصد ہے۔ ہم جدید ترین ڈیجیٹل ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اردو ادب کو ہر جگہ پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

دستیاب کتب و تحاریر کی اقسام

DiamondUrduBooks.com

✦ دستیاب کتب کے اہم شعبہ جات

شعبہ / کیٹیگری	موضوعات	قارئین کی پسندیدگی
تاریخی ناولز	اسلامی تاریخ، فاتحین کے کارنامے اور عظیم سلطنتیں	★★★★★ (بہت اعلیٰ)
سلسلہ وار کتب	اسلم راہی ایم اے، عنایت اللہ التمش وغیرہ	★★★★★ (ممتاز)
شاعری و ادب	کلاسک اور جدید شعراء کے منتخب مجموعے	★★★★☆ (بہترین)
مذہبی و اصلاحی	تربیتی کتب، سیرت النبی ﷺ اور سوانح حیات	★★★★★ (مقبول)

مصنفین، شعراء اور اہل قلم کو دعوت!

کیا آپ ایک مصنف، ناول نگار، شاعر یا کالم نگار ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر یا کتاب دنیا بھر کے لاکھوں اردو قارئین تک پہنچے؟

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) تمام نئے اور تجربہ کار لکھاریوں کو یہ سنہری موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو ہماری معتبر ویب سائٹ اور پلیٹ فارم کے ذریعے قارئین تک پہنچائیں۔

ہم درج ذیل شعبہ جات میں تحاریر کا خیر مقدم کرتے ہیں:

اردو ناولز (تاریخی و معاشرتی) | شاعری و غزلیں | افسانے و کہانیاں | مذہبی و اصلاحی مضامین | تحقیقی مقالے

ہمارے پلیٹ فارم کے ساتھ جڑیں

DiamondUrduBooks.com

✦ مصنفین کے لیے خصوصی سہولیات

🌐 عالمی سطح پر رسائی

آپ کی تحریر پاکستان سمیت پوری دنیا کے اردو قارئین تک فوری پہنچے گی۔

🛡️ محفوظ پی ڈی ایف پیشکش

آپ کے نام، تعارف اور حقوق کے مکمل احترام کے ساتھ کتاب کی پیشکش۔

📈 مفت شائعات اور تشہیر

ویب سائٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر آپ کی تحریر کی مفت تشہیر۔

🤝 مستقل تعاون

نئے اور ابھرتے ہوئے قلمکاروں کی مکمل حوصلہ افزائی اور رہنمائی۔

رابطہ کریں اور اپنی تحریر پہنچائیں

اپنی کتاب، مقالہ، شاعری یا تحریر بھیجنے کے لیے ہماری ایڈمن ٹیم سے واٹس ایپ پر براہ راست رابطہ کریں۔

👇 واٹس ایپ پر آٹو پیغام بھیجنے کے لیے نیچے کلک کریں 👇

واٹس ایپ نمبر: 03176699066

✓ بٹن پر کلک کرنے پر آٹو پیغام کے ساتھ واٹس ایپ چیٹ اوپن ہو جائے گی۔

💎 ڈائمنڈ اردو بکس 💎

آفیشل سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، واٹس ایپ گروپس ڈائریکٹری

🌐 مرکزی پورٹل و آفیشل چینل

آفیشل ویب سائٹ
آن لائن پی ڈی ایف کتب کا وسیع ذخیرہ

ویب سائٹ وزٹ کریں 🔗

آفیشل واٹس ایپ چینل
اہم ترین اپڈیٹس اور خبریں

چینل فالو کریں 📢

💬 آفیشل واٹس ایپ گروپس

ڈائمنڈ اردو بکس 1️⃣
مرکزی کتابی بحث و شیئرنگ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ اردو بکس 2️⃣
ثانوی کتابی اپڈیٹس گروپ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ بکس کمیونٹی
مرکزی کمیونٹی حب

کمیونٹی جوائن کریں 🌐

اردو تحاریر کا گلدستہ
منتخب ادبی تحاریر

گروپ جوائن کریں ✍️

کاروان شعر و ادب
شاعری اور شاہکار ادب

گروپ جوائن کریں 📜

کتابوں پر تبصرے
ادبی ریویوز اور تبصرے

گروپ جوائن کریں 📚

ڈی یو بی میڈیا
جنرل پوسٹنگ گروپ

گروپ جوائن کریں 🎬

ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
مختلف مفید لنکس کا مجموعہ

گروپ جوائن کریں 🔗

حمد و نعت آفیشل

اسلامی حمد، نعت و کلام

گروپ جوائن کریں 🕌

بچوں کا کارواں

بچوں کا ادب اور کہانیاں

گروپ جوائن کریں 🎈

📱 دیگر سوشل میڈیا اکاؤنٹس

ٹیلی گرام چینل

ڈائریکٹ پی ڈی ایف ڈاؤن لوڈز

ٹیلی گرام چینل 🚀

ٹیلی گرام گروپ

ڈسکشن اور گفتگو گروپ

ٹیلی گرام گروپ 💬

فیس بک پیج

آفیشل فیس بک اپڈیٹس

فیس بک پیج 👍

فیس بک گروپ

کمیونٹی فیس بک گروپ

فیس بک گروپ 👨‍👩‍👧‍👦

انسٹاگرام

بصری اقتباسات اور پوسٹرز

انسٹاگرام فالو کریں 📸

ٹک ٹاک

مختصر ویڈیو اپڈیٹس

ٹک ٹاک فالو کریں 🎵

⚠️ کسی بھی لنک کے کام نہ کرنے یا ری سیٹ ہونے کی صورت میں فوری رابطہ کریں:

رابطہ منتظم: شاہ زر خان | +92 317 6699066

© 2026 ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس — تمام حقوق محفوظ ہیں۔

عظیم الحق حقی

وقت کے فاصلے

محبت ایک کیفیت کا نام ہے جو اپنی صفات میں پانی کی طرح ہے جیسے پانی جس برتن میں ہو اسی کا رنگ روپ اختیار کرتا ہے ویسے ہی محبت جس دل میں ہو، اسی کا رنگ اپنا رنگ اپنا لیتی ہے اسی لیے زیادہ تر وہ محبت نہیں رہتی، کوئی پست جذبہ بن جاتی ہے کیونکہ آج کل دل کو سنوارنے کی فرصت کسے میسر ہے۔ لیکن جب کسی شرطِ اہلیت کے بغیر بے حساب نوازنے والا کریم فرمائے تو کوزے پر سمندر اُتر آتا ہے، ذرہ آسمان بن جاتا ہے اور خاک کو عظمت و رفعت مثل حباب ہے مگر اس کے ساتھ بے اندازہ کرب کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ یہ آسمان زاد محبت سے چھلکتے ان لمحوں کا احوال ہے جب مشکبو بند معصوم کلیوں کے بطن میں لافانی خوشبو جنم لیتی ہے۔

دو گھنٹے بعد وحید کو آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ حمید احمد تو اسے گھر لے جانا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کر دیا "ابھی تو ہم نے بچے سے اس کی کیفیت بھی نہیں پوچھی ہے۔" اس نے کہا "اور ویسے بھی سر کی چوٹ میں انڈر آبزرویشن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔"

اسی وقت اماں بھی اسپتال پہنچ گئیں۔ وحید مقررہ وقت پر گھر نہیں پہنچا تو ایک گھنٹا پریشان ہونے کے بعد وہ اسکول پہنچیں۔ وہاں سے انہیں حادثے کا پتا چلا اور وہ ہانپتی کانپتی اسپتال آگئیں۔ حمید احمد نے انہیں تسلی دی کہ اب وحید کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ پھر بھی وہ بیڈ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر گردش کر رہی تھیں، ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے اور وہ وحید پر نجانے کیا کیا پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔

اس وقت اماں کی موجودگی کے باوجود حمید احمد کو تنہائی کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ زندگی میں کوئی بڑا بحران آجائے تو تنہائی پسند آدمی بھی تنہائی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ اماں بھی نہ ہوتیں تو وہ کتنے اکیلے ہوتے۔ اس وقت ان کے لیے کتنا بڑا سہارا ہے اماں کا۔ اور انہیں احساس ہوا کہ اس طرح کی صورت حال میں ضرورت بھیڑ بھاڑ کی نہیں ہوتی۔ بس آدمی کے ساتھ دو چار ایسے افراد ہوں، جو اس سے محبت کرتے ہوں، اسے سمجھتے ہوں۔ جنہیں اس کو تسلی دینا اسے بہلانا آتا ہو۔

اماں نے سر اٹھا کر ان کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ان کی انگلیاں ٹھہر گئیں۔ ہونٹ ساکت ہو گئے "حمید... تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟" ان کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

پہلی بار حمید احمد کو احساس ہوا کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ لیکن ابھی بھوک تھی بھی نہیں۔ ہاں سوچنے پر چائے کی طلب ضرور ہونے لگی "اماں... کھانا تو آپ نے بھی نہیں کھایا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے تو کھا لیا تھا۔" اماں نے جلدی سے کہا۔

حمید احمد جانتے تھے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اماں تو ان کی واپسی تک بھوکی رہتی تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وحید کی واپسی سے پہلے انہوں نے کھانا کھا لیا ہو۔ لیکن انہوں نے بحث نہیں کی۔ یہ معاملہ بات کرنے کا نہیں، عملی طور پر کچھ کرنے کا تھا۔

"تم باہر ہو آؤ۔ میں یہاں بیٹھی ہوں وحید کے پاس۔" اماں نے کہا "کھانا کھاؤ۔ تازہ دم ہو جاؤ۔ بچے کو یہ روتی صورت نہ دکھانا۔"

حمید احمد خاموشی سے باہر نکل آئے۔ وہ اسپتال کی کینٹین کی طرف چل دیے۔ ایک بار پھر انہیں تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ کینٹین میں چائے کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد انہوں نے اس پر سوچا۔ تنہائی کا یہ احساس کیوں؟ جبکہ وہ بھیڑ بھاڑ کے قائل بھی نہیں ہیں اور اماں ان کے ساتھ ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو وحید کی پرورش کیسے ہوتی؟ وہ کیا کرتے؟ کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا انہیں۔ لیکن پھر بھی انہیں کسی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ کمی کیا ہے؟

وہ چائے پیتے ہوئے اس پر غور کرتے رہے۔ اچانک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ اگر اس وقت ان کے ساتھ سلمہ ہوتی تو زندگی میں کوئی کمی نہ رہتی۔ تنہائی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ بحران بھی ہوتا۔ لیکن وہ نسبتاً پرسکون ہوتے۔

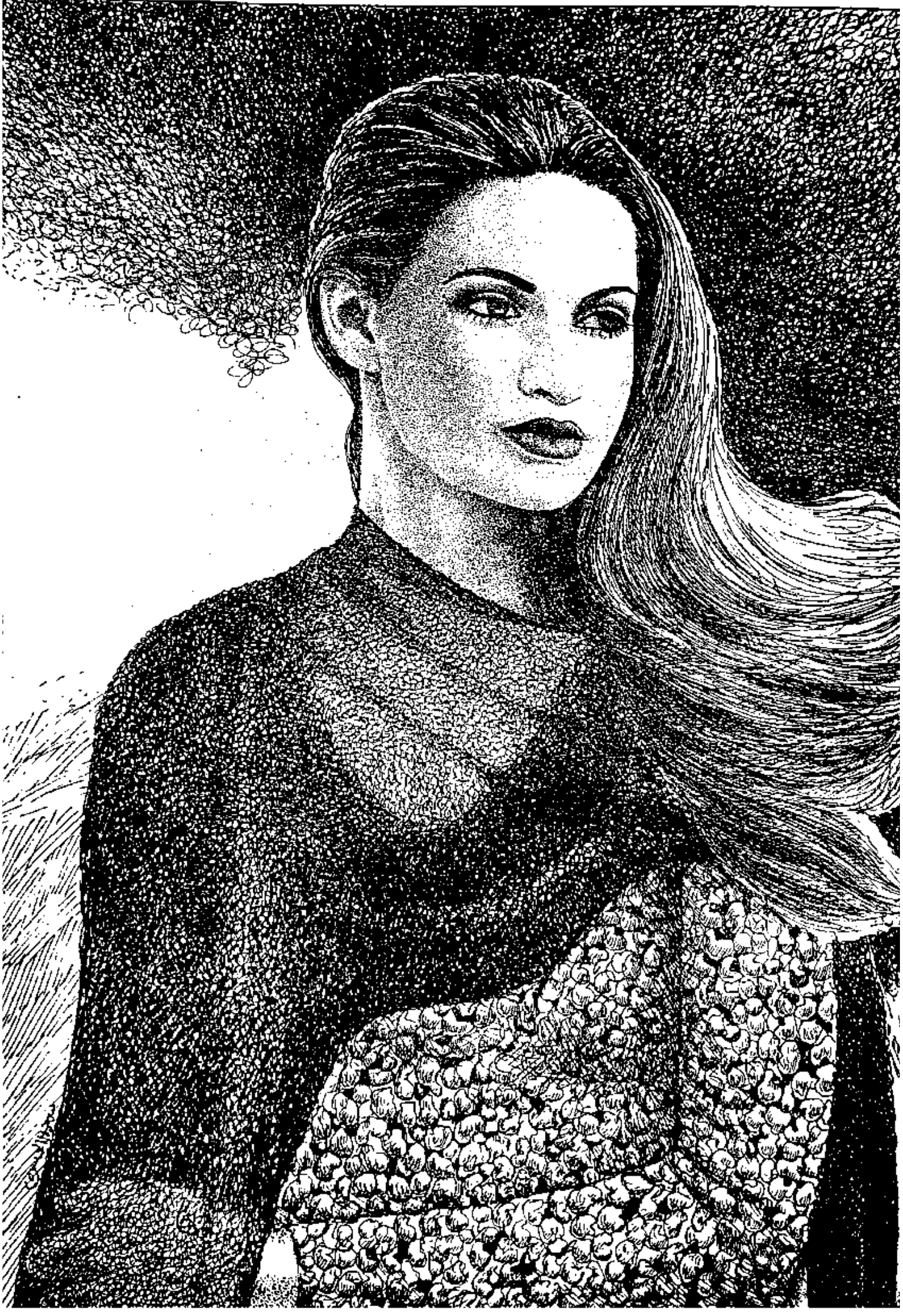

کیوں؟ ان کے ذہن میں سوال ابھرا۔ وہ استدلال کے آدمی تھے۔ اس کے بغیر انہوں نے زندگی میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔

وہ اس سوال کا جواب سوچنے لگے۔ جواب میں انہیں وہ بات یاد آئی، جس پر انہوں نے برسوں پہلے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ انسان بے شمار رشتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جو اس کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ وہ ماں باپ کی اولاد ہوتا ہے۔ پھر دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں، پھوپی، خالہ.... اور ان کے بچے۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو ان رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوتا ہے۔ لیکن دو رشتے ایسے ہوتے ہیں، جو اس کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ اور ماں باپ، بہن بھائی کے ساتھ وہ سب سے قریبی رشتے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دوستی کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک ازدواجی۔

حمید احمد ایسے حالات میں جیے تھے کہ وہ کبھی کسی کو دوست نہیں بنا سکے۔ ماں کے انتقال کے بعد ان کا کسی سے قریبی تعلق نہیں رہا۔ لیکن جب شادی ہوئی تو انہیں پتا چلا کہ قربت کیا ہوتی ہے۔ شاید دنیا میں میاں بیوی کے رشتے سے زیادہ پہلودار کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ سلمہ ان کے لیے سب کچھ تھی۔ وہ ان کی مونس، ہمدم اور غم گسار تھی۔ وہ ان کے لیے ذہنی اور جسمانی آسودگی کا باعث تھی۔ وہ ان کی بہترین دوست تھی، جسے وہ اپنے مسائل سنا کر مشورہ طلب کر سکتے تھے اور کبھی وہ کوئی دکھ بیان نہ کرنا چاہتے تھے تو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس میں ان کی شریک بن جاتی۔ وہ اس کی قربت میں، اس کے جسم کی چھاؤں میں سستاتے اپنی ہر تھکن سے چھٹکارا پا لیتے۔ وہ اس کے ساتھ مذاق کرتے، ہنستے بولتے۔ اسے کچھ لا کر دیتے تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی، ان کی آسودگی، ان کی طمانیت کے لیے کوشش کرتی تو انہیں خوشی ہوتی۔ وہ زندگی سے ان کا رابطہ جوڑنے والی سب سے اہم کڑی تھی۔

لیکن وہ ساتھ صرف تین سال کا تھا۔ پھر سلمہ انہیں چھوڑ گئی۔ لیکن اس نے زندگی سے ان کا رابطہ نہیں ٹوٹنے دیا۔ وہ جاتے جاتے زندگی کی ایک اور کڑی سے انہیں جوڑ گئی.... بیٹے وحید سے۔ اور اس وقت ان کی اپنی عمر تیس سال تھی.... صرف تیس سال۔

وہ استدلال کے آدمی تھے۔ انہوں نے پہلے ہی دن خود سے تفصیلی بحث کر لی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں، جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اور ایسا ہر رشتہ وہ ابتدا سے ہی کھوتے آئے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو ماں نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ ہاں.... اس کی پرورش کے لیے اہتمام وہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے مزید حساب لگایا۔ ان کی اپنی ضرورت چھوٹی نہیں، بہت بڑی تھی۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے مقابلے میں اہم نہیں تھے۔ ان کا بیٹا مستقبل تھا۔ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرتے تو بچے کی پرورش اس انداز میں کی جانی ناممکن ہو جاتی، جو وہ چاہتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ انہیں فیصلہ کرنا تھا اور وہ انہوں نے کر لیا۔ وہ اپنی تمام ضرورتوں کو بھول گئے۔ بیٹے کی پرورش کو انہوں نے زندگی کا محور بنا لیا۔ وہ ابتدا ہی سے ایسے آدمی تھے، جس کے لیے سب سے اہم چیز زندگی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے محرومیوں کو ذہن سے جھٹک دینا ان کی عادت تھی۔ ایسے میں انہیں اپنی کوئی محرومی یاد نہیں آتی تھی۔

لیکن آج انہیں اس کمی کا احساس ہوا تھا۔ کوئی ہوتا جو ان کے بالوں میں انگلیاں لہرا کر کہتا.... پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ دیتے۔

اس انداز میں سوچتے ہوئے اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ اب بھی ایک پھل دار درخت کی طرح ہیں، جس پر پھول کھلتے ہیں۔ لیکن پھل بننے کے بجائے سوکھ کر گر جاتے ہیں۔ انہوں نے لاکھ بھول جانے کی کوشش کی ہو۔ لیکن وہ اب بھی وہی ہیں جو سلمہ کی موت اور وحید کی پیدائش کے وقت تھے۔

انہیں یاد آیا کہ ان کا بیٹا ابھی کچھ دیر پہلے زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا اور وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور انہیں دلاسا دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلے تھے.... بالکل تنہا۔

اسی لمحے ان کے اندر سے تردید ابھری۔ ایسی بات تو نہیں۔ دلاسا دینا تو چھوٹی بات ہے۔ کسی نے ان کی عملاً مدد کی.... اور ایسی مدد، جو وہ تلاش کر رہے تھے اور انہیں کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہاں.... ان کے بیٹے کی زندگی کسی کے خون کی مرہون منت تھی۔

اب وہ مدیحہ کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھے۔ اس نے ان پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور جتانا تو دور کی بات، اس نے ان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ انہیں یاد آیا، مدیحہ نے کبھی ان سے کہا تھا۔ شاید میں کبھی آپ کے کام آسکوں اور انہوں نے بہت رعونت سے کہا تھا.... یہ تقریباً ناممکن ہی ہے مگر آج وہ ان کے اس طرح کام آئی تھی کہ جس کا وہ صلہ دے ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اس نے آخری ملاقات میں کہا تھا.... اب کبھی ہم ملے تو اس کا سبب آپ ہی کی کوئی ضرورت ہوگی، میری نہیں.... اس کی یہ بات بھی سچی تھی۔ لیکن اس نے ان کی ضرورت پوری کر دی تھی اور ملی پھر بھی نہیں تھی۔

حمید احمد کے اندر جھنجلاہٹ ابھری۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوچا تو بات آگے بڑھے گی اور یہ وہ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں زندگی میں پیچیدگیاں پسند نہیں تھی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ اسپتال سے انہیں اس کا پتا بھی مل سکتا تھا اور فون نمبر بھی۔ فون کر کے شکریہ ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں

تھی۔ لیکن انہیں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں... خوف زدہ ہیں۔ وہ اس کی محبت سے خوف زدہ تھے۔ جب انہیں اس کی محبت کا علم ہوا تھا' لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا مرکز و محور وہ خود ہیں' تو انہوں نے دو باتیں سوچی تھیں۔ ایک یہ کہ کاش ایسی محبت انہوں نے ہی کسی سے کی ہوتی۔ دوسرے انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر کبھی ایسی محبت کوئی ان سے بھی کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن اس وقت بھی انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کاش یہ محبت اس لڑکی نے ان سے کی ہوتی اور بعد میں انہیں پتا چلا کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے تو انہیں بہت برا لگا تھا۔ مگر یہ اوپر کی بات تھی اور شاید وہ اندر کی بات سے خوف زدہ تھے۔ وہ کریدنا... اندر جھانکنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی ایسی بات نہ نکل آئے' جو شرمندگی کا باعث ہو۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کاؤنٹر سے اماں کے لیے بسکٹ کا پیکٹ اور پیپر کپ میں چائے لے لی تھی۔

○☆○

مدیحہ اسپتال فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ روز فون پر نسرین سے بات کرلیتی تھی۔ اگلے روز اسے پتا چلا تھا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے اور اگلے روز اسے اسپتال سے ڈسچارج کردیا جائے گا۔

تیسرے روز نسرین نے اسے بتایا کہ حمید احمد بہت پریشان ہیں۔ تاہم انہوں نے اب تک کالج سے چھٹی نہیں کی ہے۔ لیکن وہ ذہنی طور پر الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی غائب دماغی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی پریشانی سے دوچار ہیں۔

مدیحہ سوچتی رہی۔ یہ طے تھا کہ پریشانی بچے ہی کی طرف سے ہوگی۔ لیکن کیا... خدانخواستہ...؟

کئی بار ارادے باندھنے اور توڑنے کے بعد بالآخر اس نے اسپتال کا نمبر ملا ہی لیا "میں ڈاکٹر شاہد سے بات کرنا چاہتی ہوں؟"

"وہ شام پانچ بجے ڈیوٹی پر آئیں گے۔" اسے بتایا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو فون کرلوں گی۔"

شام چھ بجے اس نے دوبارہ فون کیا تو ڈاکٹر شاہد سے بات ہوگئی "او مس حامد' او نیگیٹو والی؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ بتائیے' وحید اب ٹھیک ہوگیا ہے نا؟"

"آپ تو اس کی خالہ ہیں۔ ڈائریکٹ معلوم کرسکتی ہیں۔ آپ اسے دیکھنے بھی نہیں گئیں؟" ڈاکٹر نے الٹا سوال کیا۔

مدیحہ صرف ایک لمحے کو ہچکچائی "دراصل ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" دوسری طرف سے ڈاکٹر نے کہا "اس روز پروفیسر صاحب نے کہا کہ ان کی کوئی سالی نہیں ہے۔ اور مجھے پتا چلا کہ بچے کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ لوگ سسرال سے تعلق توڑ لیتے ہیں۔"

"سبزیاں کھایا کرو۔ ان سے تمہارے
رخساروں کا رنگ بدل جائے گا۔"
"لیکن میں تو نہیں چاہتی کہ میرے رخسار
سبز رنگ کے ہوجائیں۔"

"ڈاکٹر... میرے لیے اس بچے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ وہ آپ کی مرحوم بہن کی نشانی ہے نا۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لی "دراصل ہم سر کی چوٹ کی طرف سے تشویش میں تھے۔ اسکین کرایا تو ایک اور پرابلم سامنے آئی۔ بچے کے دماغ میں چھوٹی سی رسولی ہے۔"

"رسولی؟" مدیحہ پریشان ہوگئی "معاملہ سنگین ہے؟"

"ہوسکتا ہے۔ ہم نے نیورو سرجن سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپریشن ضروری ہے۔ رسولی بڑھ گئی تو پیچیدگیاں بھی بڑھ سکتی ہیں۔"

"چانسز کیا ہیں؟"

"نیورو سرجن ڈاکٹر اشفاق پُرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ عام GROWTH ہے تو بچہ مکمل طور پر شفایاب ہوجائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ...."

"اللہ نہ کرے۔" مدیحہ نے ڈاکٹر کی بات کاٹ دی "یہ بات حمید صاحب کو بتادی گئی؟"

"جی ہاں۔ پروفیسر صاحب پریشان ہوگئے تھے۔ دراصل یہ بہت مہنگا آپریشن ہے۔ اسی لیے وہ ہچکچا رہے ہیں۔"

مدیحہ کی الجھن تو رفع ہوگئی۔ مگر دوسری الجھنیں شروع ہوگئیں "کتنا خرچ ہوگا ڈاکٹر صاحب؟"

"ہمارا اندازہ اٹھارہ ہزار روپے کا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

"یو آر ویل کم۔"

ریسیور رکھنے کے بعد مدیحہ سوچتی رہی۔ حمید صاحب پریشان تھے۔ وہ اور کیا کرسکتے تھے؟ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی۔ اور وہ ایسے آدمی بھی نہیں تھے کہ کسی سے مدد مانگتے۔ جبکہ یہ ان کے بیٹے کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

مدیحہ کو اس سلسلے میں صرف ایک ہی زاویے سے سوچنا تھا۔ یہ اللہ کی عنایت تھی کہ وہ ان کی مدد کرسکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایسے خوددار آدمی کی کس طرح مدد کی جائے جو اپنی ضرورت کسی کو بتائے بھی نہیں۔ اب یہاں تو خوش قسمتی سے پتا چل گیا تھا کہ ان کی ضرورت کیا ہے۔ مدد اس طرح کرنی تھی کہ انہیں احساس نہ ہو

کہ ان کی مدد کی جارہی ہے۔ اس انداز میں کرنی تھی کہ وہ انکار نہ کرسکیں۔ ان کی انا کو' ان کی خودداری کو ٹھیس بھی نہ لگے۔

یہ کام ویسے بھی آسان نہیں تھا۔ جبکہ یہاں تو ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ مدیحہ خود براہِ راست کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ سامنے آجاتی تو حمید احمد بری طرح بھڑک جاتے۔ پھر تو وہ کسی بھی طرح مدد قبول نہ کرتے۔

مدیحہ غور کرتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے ایک نہیں' کئی جھوٹ بولنے ہوں گے۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ لیکن معاملہ ایک انسانی زندگی کا ہی نہیں' اس کے محبوب کی سب سے قیمتی متاع کا بھی تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں اسے پاپا سے مدد لینا ہوگی۔ پاپا کو قائل کرلینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

○☆○

بلقیس بیگم دیکھ رہی تھیں کہ حمید احمد اب بھی پریشان ہیں!

وحید کو تیسرے دن اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تھا۔ وہ اسے گھر لے آئی تھیں۔ حمید احمد کالج گئے ہوئے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے کالج سے چھٹی نہیں کی تھی "اماں.... کالج تو بس چند روز کا ہے۔ پھر چھٹیاں ہوجائیں گی۔" انہوں نے کہا تھا "مگر اس عرصے میں چھٹی نہیں کرسکتا۔ اسٹوڈنٹس کے لیے یہ ایک ایک دن اہم ہے۔ امتحان کی تیاری کا معاملہ ہے۔"

بلقیس بیگم کو حمید احمد پر ہمیشہ فخر ہوتا تھا۔ اس بار بھی ہوا۔ وہ کتنے ذمے دار آدمی تھے۔ معاملہ اکلوتے بیٹے کا تھا' جس کے نام پر انہوں نے اپنی ذات' اپنی ضروریات کو تج دیا تھا۔ وہ زندہ ہی اس کی خاطر تھے۔ مگر ایکسیڈنٹ کے بعد سے انہیں سونے کا کجا' آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ دو صبحیں ایسی گزری تھیں کہ وہ صبح چھ بجے گھر واپس گئے۔ وہاں سے تیاری کرکے وہ کالج گئے ہوں گے۔

بلقیس بیگم نے ایک پورا دن اسپتال میں وحید کے ساتھ گزارا تھا۔ ڈاکٹر شاہد انہیں بہت اچھے لگے تھے۔ وہ ہر لمحہ مسکرانے والے خوش اخلاق آدمی تھے۔ وہ اسپتال آئی نہیں تو بہت پریشان تھیں۔ اور انہوں نے وحید کے متعلق ڈاکٹر شاہد سے پوچھا تھا۔

"اب یہ ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر شاہد نے کہا تھا "لیکن آپ پروفیسر صاحب کو سمجھائیں۔ انہیں اپنے سسرال والوں سے صلح کرلینی چاہیے۔ اچھے لوگ ہیں۔ اس وقت ان کی سالی نے خون نہ دیا ہوتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔"

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب لگی۔ حمید احمد نے کبھی انہیں اپنے سسرال کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا۔ لیکن نہ پوچھنا اپنی جگہ۔ یہ سوچنا تو چاہیے تھا انہیں۔ سسرال تو ہوگا حمید احمد کا۔ اور اس طرح کی صورتِ حال میں ایسا ہوتا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ بچہ مانگ لیتے ہیں پالنے کے لیے۔ انہیں اعتبار نہیں ہوتا کہ ان کا داماد دوسری شادی نہیں کرے گا۔ انہیں یقین نہیں ہوتا کہ وہ بچے کی اچھی طرح پرورش کرسکے گا۔ اور حمید احمد اپنا بیٹا کسی کو نہیں دے سکتے تھے۔ اس پر ناراضگی ہوئی ہوگی۔ بات بڑھی ہوگی.... اور اس حد تک کہ تعلقات ختم ہوگئے ہوں گے۔

"تو وحید کی خالہ نے خون دیا تھا۔" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس پر ڈاکٹر شاہد نے انہیں او نیگیٹو کی کیمیائی کے متعلق بتایا۔

"اس کا نام کیا تھا؟"

"آپ کو بھی نہیں معلوم؟" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

بلقیس بیگم ایک لمحے کو گڑبڑائیں۔ پھر انہوں نے بات بنادی "کئی خالائیں ہیں نا اس کی۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ خون کس نے دیا ہے۔"

"اوہ۔ ان کا نام مدیحہ تھا۔"

صورت حال ایسی تھی کہ انہیں مدیحہ کا نام یاد نہ آتا۔ لیکن جب وہ گھر آئی تھی تو انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ حمید احمد سے محبت کرتی ہے اور وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ سچ یہ ہے کہ اس کے بعد وہ اپنی واحد محرومی یعنی بہو کے بارے میں پُرامید ہوکر سوچنے لگیں۔ اور جب اس نے اپنا نام بتایا.... مدیحہ.... تو انہوں نے سوچا تھا کہ یہ نام حمیدہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ صرف حروف کے الٹ پھیر کی بات تھی۔

تو انہیں مدیحہ یاد آگئی "اچھا' مدیحہ۔ ہاں' بہت پیاری لڑکی ہے وہ۔" انہوں نے کہا۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی وہ مدیحہ کے بارے میں سوچتی رہیں۔ وہ ہمیشہ سے اس بات کی قائل تھیں کہ کوئی بات' کوئی کام' کسی کا کسی سے ملنا.... کچھ بھی بے سبب نہیں ہوتا۔ دنیا میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا۔ اتفاق انسان اسے کہتے ہیں' جس کے پیچھے لگے ہوئے اسباب کا تسلسل انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ اچانک.... بغیر کسی وجہ کے ہوگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ وہ مسبّب الاسباب رب کا منظم و مرتب حکم ہوتا ہے۔

مدیحہ گھر آئی۔ اس نے چائے پی' ان سے باتیں کیں' حمید احمد کی شادی کا البم دیکھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گی۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی تھی کہ اس کا آنا اتفاق نہیں ہے۔ وہ حمید احمد سے ملی تھی۔ ان کے درمیان کچھ تھا۔ اور یقیناً حمید احمد نے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتی کہ وہ یہاں دوبارہ نہیں آئے گی۔ تو یقیناً یہ اتفاق نہیں تھا۔

پھر وحید حادثے میں زخمی ہوا۔ معاملہ سنگین نہیں تھا۔ بس

اسے خون کی ضرورت تھی.... فوری طور پر۔ اور اس کا خون ایسے گروپ کا تھا' جو آسانی سے تو کیا' کبھی مشکل سے بھی نہیں ملتا۔ اور خون ملنے میں تاخیر معاملے کو سنگین بنا رہی تھی۔ زندگی کو خطرہ لاحق ہونے لگا تھا۔ غیر اہم بات اہم ہو گئی۔ تو یہ جو وحید کا خون تھا' یہ تو پیدائش سے ہی اس کے جسم میں تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ اس کے خون کا گروپ او نیگیٹو تھا۔ یہ رب کی مرضی تھی' مشیت تھی۔

اور مجبور باپ بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے خون کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ اور جن لوگوں کی رگوں میں اس گروپ کا خون تھا' وہ سب کے سب گھر بدل چکے تھے۔ یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ یہ مسبّب الاسباب رب کا حکم تھا۔

اور مدیحہ کو اس کالج میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس حادثے کا علم ہو گیا' یہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ اور وہ اسپتال آئی.... اور اس کے خون کا گروپ بھی وہی تھا۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ یہ رب کا سوچا ہوا' ترتیب دیا ہوا اسباب کا سلسلہ تھا۔ یہ طے ہے کہ اللہ نے وحید کی زندگی لکھی تھی تو اس کو خون دینے کے لیے کسی کو تو آنا تھا۔ اور اللہ چاہتا تو کوئی بھی آجاتا۔ لیکن نہیں.... اللہ نے یہ کام اس مدیحہ کو ہی سونپا تھا۔ یہ اسی کے ذریعے ہونا تھا۔

تو مدیحہ کی کوئی اہمیت تھی.... حمید احمد کے' وحید کے' اس گھر کے لیے۔ ورنہ قدرت نے یہ کام کسی اور سے لے لیا ہوتا۔

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ بلقیس بیگم کے ذہن میں ایک لفظ گردش کرنے لگا.... بہو! اللہ کرے' ایسا ہو جائے۔

لیکن اس روز حمید احمد گھر واپس آئے تو بہت پریشان تھے۔ اور وہ دیر سے بھی آئے تھے۔ بلقیس بیگم نے وجہ پوچھی تو بولے کہ کالج میں کام زیادہ ہے۔ چھٹیاں ہونے والی ہیں اور اس کے بعد امتحان ہوں گے۔

حمید احمد نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بلقیس بیگم ان سے مدیحہ کے متعلق بات کرنے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بات شروع کر ہی دی "اللہ کا شکر ہے کہ وحید خیریت سے گھر آگیا۔ اللہ نے بڑا کرم فرمایا۔"

"جی اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔"

"سنا ہے' خون کا بڑا مسئلہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں اماں۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے' جو بہت کم لوگوں کا ہوتا ہے۔ میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر بات نہیں بنی۔ میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"کسی نے خود ہی اسپتال آکر خون دے دیا۔" حمید احمد نظریں چرانے لگے۔

بلقیس بیگم تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتی رہیں "وہ تو رحمت کا فرشتہ ہی ہوا ہمارے لیے۔ بڑا احسان ہے اس کا ہم پر۔"

"جی ہاں اماں۔ اللہ جس سے جو کام چاہے' لے لیتا ہے۔ اللہ

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ھَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصّوں میں مکمّل

قیمت فی حصہ ۵۰/- روپے ★ ڈاک خرچ فی حصہ ۱۶/- روپے

مکمل سیٹ منگانے پر قیمت صرف ۲۰۰/- روپے، ڈاک خرچ معاف۔ صرف ۲۰۰ روپے کا منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس ۲۳ سعید منشن بلیمور یا اسٹریٹ کراچی ۱

کا شکر ہے۔" حمید احمد نے دھیمی آواز میں کہا۔
"کون تھا وہ؟"
حمید احمد نے یوں پہلو بدلا' جیسے اس جواب سے بچنے کی راہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کہا "کوئی لڑکی تھی اماں؟"
"تم نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا؟"
"نہیں۔ میں نے بتایا نا اماں کہ وہ لڑکی تھی۔" حمید احمد کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی۔
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ احسان تو احسان ہے' کسی نے بھی کیا ہو۔"
"میرے پاس اس کا پتا نہیں ہے۔"
حمید احمد چھپا رہے تھے۔ اور اب بلقیس بیگم انہیں پکڑ کر شرمندہ ہی کرتیں "ارے میاں' ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ میں اسپتال والوں سے بات کرلوں گی۔"
"آپ کچھ نہ کریں۔ میں معلوم کرلوں گا اور اس کا شکریہ بھی ادا کردوں گا۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا۔ پھر وہ اٹھ ہی گئے "کچھ کام نمٹانا ہے اماں۔"
بلقیس بیگم ان کی پریشانی دیکھ کر پریشان ہوتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آرہی تھی۔ بیٹا خیریت سے گھر آگیا۔ اب کیا بات ہے۔
رات کے کھانے کے بعد بلقیس بیگم نے ان سے پوچھ ہی لیا
"تم بہت پریشان ہو بیٹے۔ کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی نہیں اماں۔"
بلقیس بیگم کی تشویش زبان پر آگئی "وحید کی طرف سے کوئی پریشانی ہے؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟"
اس پر حمید اور بُری طرح بھڑکے "کیسی بات کرتی ہیں اماں۔ اسے کوئی خطرہ ہوتا تو اسپتال والے اسے چھٹی کیوں دیتے۔"
یہ بات معقول تھی.... سمجھ میں آنے والی۔ بلقیس بیگم مطمئن ہوگئیں "تو پھر کیا بات ہے؟"
"کالج کے کچھ معاملات پریشان کر رہے ہیں اماں۔"
بات ختم ہوگئی۔ لیکن اس رات انہوں نے دیکھا کہ حمید احمد سوتے سوتے اٹھے اور وحید کے پاس جاکر اسے بہت غور سے دیکھنے لگے۔ پھر وہ اس کا سر سہلانے لگے۔ چند منٹ بعد وہ دوبارہ اپنے بستر پر جا لیٹے۔ اس رات انہوں نے ایسا کئی بار کیا۔
بلقیس بیگم نے مداخلت نہیں کی کہ پریشان آدمی کو اور پریشان کرنے سے کیا حاصل اور وہ بے اولاد تھیں۔ لیکن سمجھ سکتی تھیں کہ حمید احمد اکلوتے بیٹے کی طرف سے کتنے خوف زدہ ہوگئے ہیں۔ انہوں نے تقریباً اسے کھو ہی دیا تھا۔ ان کا خوف فطری تھا۔
صبح انہوں نے حمید احمد سے کہا "بیٹے.... ڈرو مت۔ اللہ کی امانت ہے۔ اللہ ہی حفاظت کرے گا۔ اور اس نے کی بھی۔ شکر ادا کرو اس کا۔"

حمید احمد کے ہونٹوں پر کچھ کچھی مسکراہٹ ابھری "میں بلاوجہ کبھی نہیں ڈرتا اماں۔ اچھا.... آج میں دیر سے گھر آؤں گا۔"

○☆○

حمید احمد بہت پریشان تھے!
جس روز وحید ڈسچارج ہوا' وہ کالج سے پہلے اسپتال گئے اور ڈاکٹر شاہد سے ملے۔ ڈاکٹر نے انہیں جو کچھ بتایا' اس نے انہیں دہلا دیا۔ اٹھارہ ہزار روپے! جبکہ وہ جانتے تھے کہ سب مل ملا کر جو اخراجات ہوں گے' وہ پچیس ہزار سے کم نہیں ہوں گے۔ اور ان کے بینک میں بمشکل تین ہزار ہوں گے۔
وہ اسپتال سے گھر آئے تو ان کے دماغ پر وہی پچیس ہزار چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کی باتیں ان کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔ آپریشن جتنی جلدی ہوجائے' بہتر ہے۔ جتنا وقت لگے گا' اتنا ہی معاملہ بڑھنے اور بگڑنے کا خدشہ ہے۔ صرف تین دن لگیں گے۔ تین دن بعد آپ بچے کو گھر لے جائیں۔
ان سے نہ ٹھیک سے کھانا کھایا گیا' نہ سویا گیا۔ رات کو کئی بار وہ اٹھے اور انہوں نے وحید کو دیکھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے انہوں نے دل میں کہا۔ بیٹے.... کیا تم کھو جاؤ گے؟ نہیں.... میں نے سب کچھ گنوا کر صرف تمہیں پایا ہے۔ تم بہت قیمتی ہو۔ تمہاری خاطر میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ خود کو بھی بھول گیا۔ مجھے تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔ تم صرف میرے نہیں ہو میرے بیٹے.... تم میرے باپ دادا' میری نسلوں کی امانت ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے۔
وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ سوچتے رہے۔ پچیس ہزار کا بندوبست کہاں سے کریں۔ زندگی میں انہوں نے کوئی دوست نہیں بنایا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ اتنی بڑی رقم مانگ سکتے۔ اور آپریشن جلد سے جلد کرانا تھا۔ ایک ہفتے بعد کالج کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں.... پندرہ دن کی۔ اس عرصے میں انہیں لازمی طور پر وحید کا آپریشن کرالینا تھا۔ کیونکہ پھر امتحان شروع ہوں گے اور وہ مصروف ہوجائیں گے۔ پہلے INVIGILATION۔ پھر امتحانی پرچوں کی چیکنگ کا کام۔ اس میں انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ وہ وحید کی طرف سے پریشان نہ رہیں۔ یعنی آپریشن ہوچکا ہو۔
وہ پچیس ہزار کے بارے میں سوچتے تو انہیں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وہ کہاں سے بندوبست کریں اس رقم کا۔ نہ وہ کسی سے مانگ سکتے ہیں۔ نہ کسی سے مل سکتی ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں' جسے بیچ کر یہ ضرورت پوری کرسکیں۔
اسی لمحے ان کے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ ایک ایسی چیز ہے ان کے پاس۔ ایک ہی چیز ہے۔ زندگی میں وہی ایک چیز تو انہوں نے بنائی ہے.... مکان! ہاں یہ اس ضرورت میں ان کے کام آئے گا۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔ اللہ وحید کو زندگی

دے۔ وہ کرائے کے مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔ مکان تو انہیں پھر بھی مل سکتا ہے۔ اور ملے نہ ملے' یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ بس وہ مکان بیچ دیں گے۔

اس فیصلے کے بعد انہیں سکون آگیا اور وہ سو گئے۔

اگلے روز کالج سے واپسی پر وہ اس مشن پر نکلے۔ انہوں نے علاقے کی اسٹیٹ ایجنسیوں میں بات کی۔ اس کے نتیجے میں ان کی مایوسی بڑھ گئی۔ انہوں نے تو سوچا تھا کہ وہ اپنا مکان بیچیں گے' پیسہ ہاتھ میں آئے گا اور ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔

ان کا مکان لیز نہیں تھا۔ کاغذات ہوتے تو وہ انہیں رکھوا کر بینک سے قرضہ لے سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی دفتری کارروائی میں وقت لگتا۔

"وقت کی گارنٹی کہیں سے بھی نہیں مل سکتی ماسٹر صاحب۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ان کا مرتبہ کم کرتے ہوئے کہا "دیکھیں۔ یہ بات تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ یہ دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ بیچنے والا موجود ہے' خریدنے والا نہیں تو بات کیسے بنے گی۔ اور خریدنے والا پیسہ لیے کھڑا ہے' بیچنے والا نہیں ہے تو بھی کام نہیں ہوگا۔ یہ ان دو پارٹیوں کا کھیل ہے۔ ہم تو بس تیسری پارٹی ہیں.... دو پرسینٹ والی۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد سودا کرا کے اپنا محنتانہ لیں۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"میں نے کہا نا ماسٹر صاحب' خریدار کے بغیر تو کچھ نہیں ہوتا۔ میں کوشش کروں گا۔ تلاش کروں گا۔"

"مجھے جلدی نہ ہوتی.... فوری ضرورت نہ ہوتی تو مکان کسی قیمت پر نہ بیچتا۔" حمید احمد کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"یہ بات دوسری پارٹی کو پتا نہ چلنے دینا ماسٹر صاحب۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ناصحانہ انداز میں کہا "ورنہ آپ کی پراپرٹی کے دام گر جائیں گے۔"

"کچھ بھی ہو جائے۔ دام گر جائیں۔ میری ضرورت تو وقت پر پوری ہو جائے۔"

اسٹیٹ ایجنٹ نے انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا "دیکھو ماسٹر جی' ان کاموں میں وقت لگتا ہے۔ پارٹی پکی ہو' تب بھی بارگیننگ میں تین چار دن تو لگتے ہیں۔ پھر پارٹی کہتی ہے کہ دو دن بعد بیعانہ لے کر آئے گی۔ کبھی اس میں بھی دو کی جگہ چار دن لگ جاتے ہیں۔ پھر پارٹی بیعانہ دے کر فل پے منٹ کے لیے وقت مانگتی ہے۔ کبھی مہینہ' کبھی دو مہینے۔ یہ سودا کھڑے گھاٹ تو نہیں پٹتا۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا "لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم حرام کی کھاتے ہیں۔ پر کوئی کام کرے تو پتا چلے۔ دونوں پارٹیوں کے بیچ گھومتے گھومتے جوتے گھس جاتے ہیں' ٹانگیں دکھ جاتی ہیں' تب کہیں ٹو پرسینٹ ملتا ہے ہمیں۔"

حمید احمد کو اس وقت اپنی ضرورت کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ وہ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا "میں تمہیں منہ مانگا کمیشن دوں گا۔ بس تم یہ کام جلد سے جلد کرا دو۔ زیادہ سے زیادہ دس دن میں۔"

"ماسٹر صاحب' ہم کو بس اپنے کمیشن سے غرض ہوتی ہے۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "پر آپ سادہ آدمی ہیں۔ ضرورت مند بھی ہیں۔ مجھے آپ پر ترس آتا ہے۔ دیکھیں' اتنی جلدی یہ کام ہوتا نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ آپ اپنا مکان کوڑیوں کے مول بیچ دیں۔ تو یہ تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔"

"مثلاً؟"

اسٹیٹ ایجنٹ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "میں نے آپ کا مکان دیکھا ہے۔ اچھی جگہ ہے۔ ٹھیک ٹھاک بنا ہوا بھی ہے۔ میرے خیال میں اس کی قیمت تین لاکھ سے اوپر ہونی چاہیے۔ آپ مجھے وقت دیں تو میں اسے ساڑھے تین میں ضرور بکوا دوں گا۔ ممکن ہے' کوئی اس کا چار بھی دے مرے۔ لیکن دس دن....! اب ماسٹر صاحب' آپ کہیں کہ یہ آپ ایک لاکھ میں یا پچاس ہزار میں بیچ رہے ہیں۔ تو یہ فوراً بھی بک سکتا ہے۔"

حمید احمد نے سوچا۔ فرق بہت بڑا تھا۔ اور مکان ان کی زندگی بھر کی کمائی تھی۔ وہ جھجکنے لگے۔ پھر انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا

"میں کیا کروں۔ مجھے فوری طور پر رقم کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"آپ ایسا کریں۔ کل تک سوچ لیں۔ پھر مجھے بتا دیجیے۔ پر ایسے سودے میں ہمیں کچھ ملتا نہیں۔ پھر ایسے مکان بکنے لگیں تو ہم لوگوں کا تو دھندا ہی ختم ہو جائے گا۔"

حمید احمد بچے نہیں تھے۔ انہیں اسٹیٹ ایجنٹ کے چہرے پر سچ صاف لکھا نظر آگیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ ان کے لیے گاہک ہرگز تلاش نہ کرتا۔ اتنے سستے داموں تو وہ خود ہی ان کا مکان خرید لیتا۔ یوں اسے بھاری منافع ہوتا "ٹھیک ہے۔ میں کل آؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

وہ باہر آئے تو ان کے قدم ہی نہیں' دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری اسٹیٹ ایجنسیوں پر صورتِ حال اس سے بھی بدتر رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بے حد مایوس تھے۔

اگلا دن بھی یونہی گزرا۔ اس روز سب سے پہلے وہ لیز آفس چلے گئے۔ وہاں اور تلخ تجربہ ہوا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مکان لیز کرا کے' اس کے کاغذات جمع کرا کے قرضے کے لیے اپلائی کریں گے۔ مگر پتا چلا کہ لیز کرانا بھی آسان کام نہیں۔ دفتری کارروائیاں اتنی طویل اور ایسی ہیں کہ روٹین میں اس کام کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اور اگر ہوا تو مہینوں لگ جائیں گے۔ ہاں.... پندرہ ہزار روپے خرچ کیے جائیں تو کام تین دن میں ہو سکتا ہے۔ اور پندرہ ہزار ان کے پاس ہوتے تو وہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے وحید کو اسپتال ہی لے جاتے۔

اس روز وہ صرف اسی اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس گئے' جس نے انہیں سوچنے کو کہا تھا۔ انہوں نے اس کے مشورے پر عمل کر کے سوچا بھی تھا۔ ساڑھے تین لاکھ کے مکان کو ایک لاکھ میں بیچنا بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ لیکن وہ اس کا کیا کرتے کہ یہ مجبوری بھی تھی۔ وحید کی زندگی سے بڑھ کر تو کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ ان کی اپنی زندگی بھی نہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ یہ سودا تو ضرورت سے ایک دن پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہی کرنا ہے تو اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے دن اور جگہ کوشش کر لی جائے۔ کچھ نہ بنا تو یہ راستہ تو ہے۔

اس روز اسٹیٹ ایجنٹ زیادہ اپنائیت سے پیش آیا "آؤ ماسٹر صاحب۔ چائے پیو گے یا ٹھنڈا منگاؤں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب گھر جا کر آرام کروں گا۔ رات ہو رہی ہے۔" حمید احمد نے کہا۔

"پھر کیا سوچا آپ نے؟"

"یہ بتاؤ' تم میرا مکان ایک لاکھ روپے میں اس طرح بکوا سکتے ہو کہ چوبیس گھنٹے کے اندر رقم مجھے مل جائے۔"

ایجنٹ نے انہیں بہت غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی پیشانی پر لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ پھر اس نے کہا "اس بات کی گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں آپ کی خاطر سب کچھ کر لوں گا۔ پورا پے منٹ نہ بھی ہوا تو پچیس ہزار فوری طور پر ضرور دلوا دوں گا۔"

حمید احمد مطمئن ہو گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے "بس اب میں سودے کی بات کرنے ہی آؤں گا۔"

لیکن گھر کی طرف جاتے ہوئے ان کا دل کٹنے لگا۔ ساڑھے تین لاکھ کا مکان... وہ بھی اسٹیٹ ایجنٹ کے بازار کے حساب سے۔ ان کے حساب سے تو اس کا کوئی مول ہی نہیں تھا۔ اور وہ صرف ایک لاکھ میں بک جائے گا اور وہ بے گھر ہو جائیں گے۔ دوسرا مکان بنانے کی انہیں مہلت ملے نہ ملے۔ ایک عمر درکار ہوتی ہے مکان بنانے کے لیے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ابھی ان کے پاس آٹھ دن کی مہلت ہے۔ اللہ اس میں کوئی سبیل کر دے تو....

انہیں نہیں معلوم تھا کہ سبیل ہو چکی ہے!

○☆○

اماں نے ان سے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا "بھوک نہیں ہے اماں۔"

اماں پریشان ہو گئیں "کیا بات ہے بیٹے؟ بہت پریشان ہو؟"

"نہیں اماں۔ بس تھکا ہوا ہوں۔" حمید احمد اماں کو یہ سب کچھ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اچانک اماں کو کچھ یاد آگیا "ارے ہاں.... تم سے ملنے کوئی صاحب آئے تھے.... بڑی سی گاڑی میں۔ کافی دیر بیٹھے۔"

حمید احمد الجھنے لگے۔ گاڑی میں ان سے ملنے کون آسکتا ہے۔ انہیں فوراً مدیحہ کا خیال آیا۔ لیکن اماں کے بیان کے مطابق وہ کوئی مرد تھا "کیا نام بتایا تھا؟"

"نام تو مجھے یاد نہیں۔ کچھ دے کر گئے ہیں تمہارے لیے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے.... حمید صاحب سے میری سفارش کرنا بن کہ میرا کام کر دیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔"

اماں نے انہیں جو چیزیں لا کر دیں' ان میں ایک وزیٹنگ کارڈ تھا' ایک رقعہ تھا اور ایک بند لفافہ۔ حمید احمد کا تجسس سے برا حال ہو گیا۔ انہوں نے کارڈ کو نظر انداز کر دیا اور سب سے پہلے رقعہ کھولا۔

"حمید صاحب'

ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میری بیٹی انٹر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اسے شہریت کے لیے ٹیوشن چاہیے۔ کسی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا اور میں حاضر ہو گیا۔ امتحان تک آپ اسے پڑھا دیجیے تو مجھ پر احسان ہو گا۔ اس کا صلہ تو میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ اپنی بساط کے مطابق چھوٹا سا ایک نذرانہ پیش کر رہا ہوں۔ لفافے میں چیک ہے۔ اسے قبول کر لیں۔ نامنظور ہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔

تیار ہوں تو فون کر کے مجھے وقت بتا دیجیے۔ میں گاڑی بھجوا دوں گا۔ میرا خیال ہے' آپ ایک گھنٹا پڑھا دیں تو کافی ہوگا۔ گاڑی آپ کو چھوڑ بھی جایا کرے گی۔ میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ فقط

ایچ ایچ صدیقی"

اس رقعے کو پڑھ کر حمید احمد کشمکش میں پڑ گئے۔ یہ ان کا اصول تھا۔ انہوں نے کبھی ٹیوٹر بننا گوارا نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت انہیں پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ایسی کہ وہ اس کے لیے اپنا مکان بھی بیچ سکتے تھے۔ تو کیا وہ ٹیوشن نہیں....

انہوں نے حساب لگایا۔ اگر ابھی سے پڑھائیں تو یہ صرف ایک ماہ کا معاملہ ہے۔ اور ایک مہینے کی فیس کوئی کتنی دے سکتا ہے.... زیادہ سے زیادہ ہزار.... دو ہزار! اور اس سے کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں!

ان کا جی چاہا کہ تینوں چیزیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ مگر اندر سے کوئی چیز انہیں روک رہی تھی۔ خاصی دیر وہ ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے بڑی احتیاط سے لفافہ کھولا۔ اس میں چیک کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے چیک کو دیکھا۔ ہندسوں میں جو کچھ لکھا ہوا تھا' اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ۳۰۰۰۰/-

وہ ہندسوں کو گھورتے رہے' جیسے وہ ان کا وہم ہیں اور کسی بھی لمحے تحلیل ہو جائیں گے۔ لیکن ہر صفر اپنی جگہ ضدی پن سے ڈٹا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ تک ایک گھنٹا روز پڑھانے کا معاوضہ اتنا کون دے سکتا ہے۔ تین ہزار بھی بہت زیادہ ہی کہلائے گا۔ یقیناً ایک صفر زیادہ لگ گیا ہے غلطی سے!

لیکن انہوں نے عبارت دیکھی تو عبارت انہی ہندسوں کی تصدیق کر رہی تھی.... تیس ہزار روپے!

اندر کا ہیجان دھیرے دھیرے سرد ہوتا گیا اور وہ مطمئن اور پرسکون ہوتے گئے۔ یہ تو اللہ کی طرف سے مدد ہے۔ ان کے اندر سے کسی نے کہا۔ لیکن وہ ٹیوشن پڑھانے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ان کا اصول ہے! ضرورت اصول سے بڑی ہے۔ اندر کی آواز نے جواب دیا۔ اس پیشکش کو ٹھکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلے روز انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا "میں پانچ بجے سے چھ بجے تک پڑھا سکوں گا۔" انہوں نے کہا۔

"مناسب ہے۔ لیکن میری بیٹی کہہ رہی تھی کہ کالج کی چھٹیوں کے ساتھ یہ سلسلہ شروع کیا جائے تو بہتر ہے۔ آج ۲۳ تاریخ ہے۔ میں ۲۹ کو شام چار بجے آپ کے لیے گاڑی بھجوا دوں گا۔"

حمید احمد کا دل یوں دھڑکا جیسے آخری بار دھڑک رہا ہو۔ یہ بھی اللہ کی تائید ہی تھی۔ ورنہ وہ تو آج سے ہی جاتے۔ ایک مہینے کی ٹیوشن کے تیس ہزار روپے دینے والے کو ٹھلایا تو نہیں جا سکتا۔ مگر اب اتنے دن میں تو وحید آپریشن سے نمٹ سکتا ہے "جی بہت بہتر۔" انہوں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں حمید صاحب I AM REALLY GRATEFUL

○☆○

وحید آپریشن کے بعد اسپتال سے رخصت ہو کر گھر آ چکا تھا۔ حمید احمد خود کو ایسا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے کہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ان کی بہت بڑی مشکل کس طرح آسان کر دی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اس پر زندگی بھر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔

ڈاکٹر نے یقین دلایا تھا کہ وحید اب پوری طرح صحت مند ہے۔ رسولی عام سی تھی۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

۲۹ سے کالج کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس روز صبح ہی سے حمید احمد اپنی اس شاگرد کے بارے میں سوچنے لگے۔ وہ ان کے لیے وی آئی پی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی بہت بڑی مشکل آسان ہوئی تھی۔ وہ اسے اتنی اچھی طرح پڑھائیں گے کہ حق ادا کر دیں گے۔ انہیں بے تابی ہو رہی تھی۔

ٹھیک چار بجے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ لپک کر باہر نکلے۔ ڈرائیور نے ان کے لیے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئے۔

سفر کے دوران وہ اپنی اس شاگرد کے بارے میں سوچتے رہے' جسے انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً اس مضمون میں کمزور ہوگی۔ بہت کمزور۔ ورنہ ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کیوں دی جاتی۔ وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے کم دنوں میں کچھ ہو سکے گا۔ انہیں بہت محنت کرنی ہوگی۔ اور وہ شاید کند ذہن بھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ وہ اسے زیادہ وقت دے دیں گے۔ دے سکتے ہیں۔ وقت ہے ان کے پاس۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکیں گے اس کے لیے؟

وہ چونکے۔ گاڑی اب شارع فیصل سے کالا پل کی طرف مڑ رہی تھی۔ انہیں مدیحہ یاد آ گئی۔ برسات کا وہ دن یاد آ گیا۔ اس

شائستگی

اپنی ایک نہایت ناپسندیدہ شخصیت کو مجبوراً خط لکھتے وقت اقلیم صاحب نے لکھا:

"میری سیکریٹری چونکہ ایک معزز خاتون ہے اس لیے میں اس سے وہ الفاظ لکھوانا نہیں چاہتا جو میں آپ کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں خود بھی چونکہ ایک خاندانی اور شائستہ آدمی ہوں اس لیے وہ الفاظ تحریر نہیں کر سکتا.... لیکن آپ چونکہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہیں اس لیے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ میں درحقیقت کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

سڑک پر وہ اس کے ساتھ گھنٹوں گھنٹوں... اور کہیں کہیں تک پائی میں چلے تھے۔ اور یہاں وہ مین ہول میں گر رہی تھی۔ انہوں نے کتنی مشکل سے اسے بچایا تھا۔

گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ لیکن ان کے خیال' ان کی یادوں کی رفتار اس سے ہم آہنگ تھی۔

گاڑی پل سے گزر رہی تھی۔ یہ وہ جگہ ہے' جہاں مدیحہ نے ان پر اپنے اعتراف کا دھماکا کیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر اس جگہ کو دیکھا۔ پھر وہ رخصت ہو گئی تھی۔ اس نے انہیں ساتھ آنے سے روک دیا تھا... شور مچانے کی دھمکی دے کر۔ اور یہ وہ جگہ ہے' جہاں آتے جاتے بے شمار لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ انہیں جاتی دکھائی دی تھی۔ اور یہ وہ موڑ ہے' جسے مڑ کر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

گاڑی اس موڑ سے مڑی تو یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سوچیں رہ گئیں تو اس طرف گئی تھی مدیحہ۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ آگے ایک دوراہا تھا۔ ایک راستہ کسی کچی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرا ڈیفنس سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ گاڑی اب بنگلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

مدیحہ بھی تو ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے' ابھی کہیں اس سے سامنا ہو جائے۔ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اللہ نہ کرے۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ یہ بات انہوں نے بلند آواز میں کہی ہے۔

"جی سر؟" ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں بے خیالی میں بول گیا تھا۔" حمید احمد نے کہا اور دل میں سوچا... میں اب کبھی اس لڑکی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔

اسی لمحے ڈرائیور نے گاڑی ایک بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ میں موڑ دی...

○☆○

مدیحہ کے لیے وہ دن بڑا عجیب تھا۔ پورے دن متضاد کیفیتیں اس پر طاری رہیں۔ یہ خیال خوش آئند تھا کہ آج وہ اتنے عرصے کے بعد حمید احمد کو دیکھ سکے گی۔ لیکن وہ خوف زدہ بھی تھی۔ کہیں وہ انہیں دیکھنے کے بعد پہلے جیسی نہ ہو جائے۔ اور وہ ان کے ردِ عمل سے بھی خوف زدہ تھی۔ وہ اس پر برس نہ پڑیں۔

پھر اس نے سوچا' اب جو ہو سو ہو۔ اصل کام تو ہو چکا ہے۔ اب کوئی پروا نہیں۔ چاہے وہ اس کی بے عزتی کر دیں۔ اس نے یہ کھیل بہت سوچ سمجھ کر کھیلا تھا۔ اگر حمید احمد اسی دن اسے پڑھانے آ جاتے تو یقینی طور پر وہ رقم واپس کر دیتے اور اسے پڑھانے سے انکار کر دیتے۔ خیر پڑھنے کی تو اسے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وحید کے آپریشن کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔ اسی لیے اس نے ۲۹ تاریخ سے پڑھائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس دوران حمید صاحب وحید کا آپریشن کرا لیں گے۔

اس پورے دن میں اس نے اور تفصیلات بھی سوچ لی تھیں۔ وہ مکمل لائحہ عمل تیار کر چکی تھی۔ نماز کے بعد اس نے اللہ سے عافیت کی دعا بھی کی تھی۔ مگر اس روز وہ اچھی نماز نہیں پڑھ سکی تھی۔ حمید احمد کے تصور سے ویسے تو اس کی کوئی نماز خالی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس روز ان کے آنے کے تصور اور اس کی خوشی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ اس نے جیسے نماز پڑھی تھی' اس کا دل ہی جانتا تھا۔

بہرحال دن بھر کی سوچ بچار اور مناسب لائحہ عمل کی تیاری کے بعد وہ قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔ بس اب اسے انتظار تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ گن رہی تھی۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ خود کو پردے کی آڑ میں رکھتے ہوئے اس نے باہر جھانکا۔ حمید احمد کو کار سے نکلتے دیکھ کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں پھر وہ پریشان ہو گئی۔ حمید احمد بہت دبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ نسیمہ کو وہ پہلے ہی ہدایت دے چکی تھی کہ وہ سر کو اسٹڈی میں لے جائے۔ مگر اب اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گی؟ اور اگر انہیں غصہ آ گیا تو؟

خوف کیسی عجیب چیز ہوتا ہے۔ جو چیز اس کے لیے بہت بڑی خوشی تھی' وہ اسی سے بہت زیادہ خوف زدہ بھی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے ان کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ بلکہ ان کے ساتھ ایک گھنٹا بیٹھنا بھی ہو گا۔

اس نے اپنی کتاب' نوٹ بک اور قلم اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس رفتار سے وہ کب تک اسٹڈی میں پہنچے گی؟

○☆○

دروازہ ایک ملازمہ نے کھولا "آپ بے بی کو پڑھانے آئے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"آجائیے۔"

وہ ایک بڑے اور بے حد آراستہ ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ اس میں سے گزرتے ہوئے ان کی نظر ڈرائنگ روم پر پڑی۔ اس کی آرائش بھی دیدنی تھی۔ ملازمہ انہیں زینے کی طرف لے گئی۔ وہ اس کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ اسٹڈی تھی۔ اس کی آرائش بے حد سادہ تھی۔ وہاں دو میزوں' چند کرسیوں اور ایک کاؤچ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن ہر چیز بہرحال قیمتی تھی۔

"آپ تشریف رکھیے۔ چائے پئیں گے یا شربت؟"
"کچھ بھی نہیں۔ چائے میں پی کر آیا ہوں۔" حمید احمد نے جواب دیا۔
"بے بی ابھی آتی ہیں۔" یہ کہہ کر ملازمہ چلی گئی۔
حمید احمد نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کی طرف گئے۔ وہ لان کی طرف کھلتی تھی۔ لان کو دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی۔ اس سے ترتیب و تنظیم کا اظہار ہو رہا تھا۔ بڑے سلیقے سے کیاریاں بنائی گئی تھیں۔ پودوں کی تراش خراش بھی توجہ کی گواہی دے رہی تھی۔
وہ کھڑکی سے ہٹ آئے۔ وہ دانستہ طور پر اس رخ سے بیٹھے کہ دروازے کی طرف ان کی پشت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ بنگلا اور اس کی ہر چیز امارت کی مظہر ہے۔ ایسے لوگ ضرورت کے وقت ایک ماہ کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے دے سکتے ہیں۔ لیکن وہی کیوں.... اتنے بڑے شہر میں نظرِ انتخاب ان پر ہی کیوں پڑی۔ صدیقی صاحب کا کہنا تھا کہ کسی نے انہیں RECOMMEND کیا تھا۔ مگر کس نے؟
پھر وہ جھنجلانے لگے۔ یہ مسئلہ ہے نا پیسے والوں کا۔ ٹیچر انتظار کر رہا ہے اور پڑھنے والا غائب۔ بھئی معلم کی عزت نہیں کرو گے تو علم کیسے آئے گا۔ اب معلم بھاری فیس لے گا تو اسے لحاظ بھی کرنا پڑے گا۔ پڑھنے والے کا احترام بھی کرنا پڑے گا۔
عقب سے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن گئے۔ پھر نسوانی آواز نے سلام کیا۔ آواز انہیں جانی پہچانی لگی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور فرطِ حیرت سے بُت بن گئے۔ وہ تو وہی تھی' جسے اب وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔
پہلی بات جو ان کی سمجھ میں آئی' وہ بھی عجیب ہی تھی۔ تاثرات کے اعتبار سے تو انہیں لگ رہا تھا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔ جتنے حیران وہ تھے' اتنی ہی حیرت انہیں مدیحہ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔
پھر مدیحہ کے ہونٹ ہلے "آ.... آپ؟"
حمید احمد کو شدت سے غصہ آنے لگا "میری حیرت تو بجا ہے۔ لیکن تم کیوں حیران ہو؟"
"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ آپ ہوں گے۔"
"یہ کیسے ممکن ہے؟"
"میں نے پاپا سے بس اتنا کہا تھا کہ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ تک کیسے پہنچے۔ آپ چاہے' پاپا سے پوچھ لیں۔"
حمید احمد کو لگ نہیں رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسی لمحے انہیں دروازے میں ملازمہ نظر آئی۔ انہوں نے گھبرا کر مدیحہ سے کہا "بیٹھ جاؤ۔"
"بے بی.... چائے لے آؤں یا کافی؟" ملازمہ نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔
"کافی لے آؤ۔" مدیحہ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ پھر وہ حمید احمد کی طرف متوجہ ہوئی "آپ کا بیٹا اب کیسا ہے؟"
"تم سے زیادہ کسے معلوم ہو گا؟" حمید احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"میں سمجھی نہیں۔"
"تمہیں سب پتا رہتا ہے۔ تبھی تو تم اسپتال پہنچ گئی تھیں۔"
"وہ تو نسرین سے معلوم ہوا تھا مجھے۔ اس سے تو روز فون پر بات ہوتی ہے میری۔ آخری اطلاع اس نے یہ دی تھی کہ تیسرے دن وحید گھر چلا گیا تھا۔ اب ٹھیک تو ہے نا؟"
اس گفتگو نے حمید احمد کے ذہن میں ایک نازک سوال اٹھایا۔ کہیں یہ امداد تو نہیں؟ مدیحہ کو پتا چلا ہو کہ انہیں وحید کے آپریشن کے لیے رقم کی ضرورت ہے.... اور اس نے یہ چکر چلا ڈالا ہو۔ اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو پہلے بھی سوچتے تھے کہ ایک مہینے کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے کوئی نہیں دے سکتا۔
"میں نہیں مانتا کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔
"مجھے جو معلوم تھا' جس سے معلوم ہوا تھا' میں نے بتا دیا۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر چونک کر پُر تشویش لہجے میں بولی "کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"
حمید احمد کو اس کی وہ تشویش اداکاری نہیں لگی۔ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی "نہیں۔ اللہ کا شکر ہے' وحید اب ٹھیک ہے۔" انہوں نے اسے آپریشن کے بارے میں نہیں بتایا۔ ملازمہ کافی لے آئی تھی۔ مدیحہ نے پیالی بڑے احترام سے حمید احمد کے سامنے رکھی "کافی پیجیے۔ اور جو جی چاہے' کہہ دیجیے۔" اس نے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پڑھانا نہیں چاہیں گے۔"
"تمہارا خیال غلط ہے مدیحہ۔" حمید احمد نے سرد لہجے میں کہا "میں صدیقی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اور وعدہ میں ہر حال میں پورا کرتا ہوں۔"
"آپ مجھے مایوس کر رہے ہیں حمید صاحب۔ سچ یہ ہے کہ میں...."
"تم مجھے اس طرح نام لے کر نہیں پکار سکتیں۔" حمید احمد نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔
"آپ مجھے بات پوری کرنے دیں حمید صاحب۔" مدیحہ کا لہجہ بھی سرد ہو گیا "اسی میں آپ کے اعتراض کا جواب بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں آپ سے پڑھنا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ سے شاگردی

کا رشتہ توڑنے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔ میں آپ کی شاگرد نہیں بن سکتی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ پاپا نے آپ سے بات کی ہے تو میں انہیں پہلے ہی منع کر دیتی۔ اب بات آپ کے وعدے کی ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو سر کبھی نہیں کہوں گی۔ آپ میرے لیے جو ہیں' ہمیشہ وہی رہیں گے۔"

حمید احمد سنّاٹے میں آگئے۔ توہین کے احساس سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"خدا کی قسم حمید صاحب' میں نے سچی بات کہی ہے۔ میرا مقصد آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔ اگر آپ کو ایسا محسوس ہوا ہو تو میں آپ کے پاؤں پکڑ کر بھی مانگ سکتی ہوں۔" مدیحہ نے جلدی سے کہا "لیکن سچی بات یہی ہے۔ آپ کی شاگردی ایک اعزاز ہے۔ لیکن میں یہ اعزاز حاصل کرنا نہیں چاہتی۔"

اس وقت کافی کی وہ پیالی حمید احمد کے لیے بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ اس قدر اچانک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے اور انہیں اس پر سوچنا تھا۔ مدیحہ کی بات نے ایک بات تو واضح کر دی تھی۔ وہ یہ کہ مدیحہ کو وحید کے آپریشن کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اس لیے ان کا امداد والا مفروضہ غلط ہے اور مدیحہ کی یہ بات بھی درست ہے کہ اس نے صرف ان سے شاگردی کا تعلق توڑنے کے لیے کالج چھوڑا تھا۔ وہ ان سے ٹیوشن پڑھنے کو کیوں کہتی۔ ان کے اخذ کردہ یہ تمام نتائج ان کے لیے طمانیت بخش تھے۔ لیکن ان کے لیے الجھنیں بھی تھیں۔ عام صورتِ حال ہوتی تو وہ مدیحہ کی صورت دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس چلے جاتے اور فیس واپس کر دیتے۔ لیکن وہ تیس ہزار روپے خرچ کر چکے تھے۔ فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے پڑھائیں۔ محض پچیس دنوں کی تو بات ہے۔

کافی کا آخری گھونٹ لے کر انہوں نے پیالی رکھی اور فیصلہ کر لیا کہ انہیں سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ ٹھیک ہے مدیحہ۔ میرے لیے اپنے وعدے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔" انہوں نے کہا "میں تمہیں وہی سمجھوں گا جو میرے لیے تم ہو۔ تم مجھے جو جی چاہے سمجھو۔" انہوں نے گہری سانس لی "مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہیں ٹیوشن کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ میں نے تمہیں جو دیکھا اور سمجھا ہے' اس کے تحت میں کہہ سکتا ہوں کہ تم تیاری کے بغیر بھی امتحان دو تو اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ صدیقی صاحب تمہارے لیے آئے ہیں تو میں صاف انکار کر دیتا۔"

مدیحہ جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو اس نے کوشش کی تھی کہ انہیں معلوم نہ ہو "بات یہ ہے کہ پچھلے چند ماہ سے میرا بہت بُرا حال ہے۔ یہ بات نہیں کہ پڑھائی کی طرف میرا دھیان نہ ہو۔ لیکن سوکس کی طرف سے دل بُرا ہو گیا ہے۔ یہ سیکنڈ

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۵۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۴/- روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۵۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۴/- روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے' جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت ۱۵۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۴/- روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت ۱۰۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۴/- روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو پاکیزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۴/- روپے

کالی کہانیاں
جرائم' جادو' شیطان ازم' ارواح' طنز و مزاح' اسرار و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۳۰/- روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے۔
قیمت فی جلد ۵۰/- روپے
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶/- روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۳ سعید منشن بلیموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ۱

اثر ہے۔ میں مضمون تبدیل بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ اس مضمون کی وجہ سے میری ڈویژن خراب ہو جائے گی۔ یہ بھی شاید بہتری ہوئی کہ آپ آ گئے۔ شاید آپ ہی مجھے پڑھا سکتے ہیں۔"

"جو مضمون اچھا نہ لگے' وہ لینا ہی نہیں چاہیے۔"

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ مضمون مجھ سے بہت کچھ چھین لے گا۔" مدیحہ نے کہا۔ لیکن اس کے دل نے فوراً ہی اس بات کی تردید کر دی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس مضمون کی وجہ سے اسے بہت کچھ ملا تھا۔

"اچھا۔ اب کتاب دو مجھے۔" حمید احمد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ مدیحہ نے انہیں کتاب دی اور وہ فہرستِ ابواب دیکھنے لگے۔

"ایک بات کہوں حمید صاحب۔ آدمی کو بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔"

حمید احمد کو کرنٹ سا لگا "کیا مطلب؟" انہوں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے آپ سے آخری بات بہت بڑی کہہ دی تھی۔ میں نے کہا تھا۔ اب کبھی ہم ملے تو اس کا سبب آپ کی ہی کوئی ضرورت ہوگی' میری نہیں۔ لیکن اب دیکھیں' آپ میری ہی ضرورت میں میرے کام آ رہے ہیں۔"

حمید احمد کھسے گئے۔ وہ اس سے سچ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اس سے کیسے کہتے کہ بڑی بات تو انہوں نے کی تھی۔ جب انہوں نے کہا تھا کہ یہ تقریباً ناممکن ہی ہے کہ وہ کبھی ان کے کام آ سکے۔ اور وہ ان کے کام آئی تھی۔ اس نے ان کے بیٹے کو وہ خون دیا تھا' جو وہ ساری دنیا کی دولت دے کر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ اس سے کیسے کہتے کہ اس کی بات سچی تھی۔ وہ ملے تھے تو مدیحہ کی ضرورت کے تحت نہیں' اپنی ضرورت کے تحت ملے تھے۔ ان میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ اس سے یہ سچ کہہ سکتے۔

"چلو... اب پڑھائی شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

○☆○

حمید احمد نے مدیحہ کو دیکھنے کے بعد جس ٹیوشن کو بہت بڑی مشکل اور آزمائش سمجھا تھا' وہ ویسی ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ اس کا سبب بھی مدیحہ ہی تھی۔ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ انہیں سر نہیں کہتی تھی۔ لیکن حتی الامکان وہ ان کا نام لینے سے بچتی تھی۔

سب سے زیادہ تو انہیں اس کی نگاہوں کا خوف تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اس صورتِ حال کا سامنا کیسے کریں گے۔ انہیں یاد تھا کہ یہ وہ لڑکی تھی' جو بھری کلاس میں پہلے لمحے سے پیریڈ ختم ہونے تک ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ جسے یہ ہوش بھی نہیں رہتا تھا کہ اسے اس بے خودی کے عالم میں کوئی دیکھ لے گا تو کتنی رسوائی ہوگی۔ اور اب یہاں تو تنہائی تھی۔ یہاں تو اسے کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔

لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ مدیحہ بڑی توجہ سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جب بھی نظر اٹھا کر دیکھتے' انہیں وہ نظریں جھکائے بیٹھی نظر آتی۔ کبھی اس کی نظریں اٹھی بھی ہوتیں تو وہ ایک اسٹوڈنٹ کی نظریں ہوتیں۔ ایسا اسٹوڈنٹ' جو توجہ سے پڑھانے والے کی بات سن کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن حمید احمد کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ اب وہ بات مشکل سے سمجھتی تھی۔ ورنہ وہ تو بہت برائٹ لڑکی تھی۔

مگر حمید احمد اس کی وجہ بھی سمجھ سکتے تھے۔ وہ اسٹوڈنٹ جو کورس سے ہٹ کر سوچتے ہیں' وہ نصابی نہیں ہوتے۔ ان کی کامیابی ہی نصاب سے ہٹ کر سوچنے میں ہوتی ہے اور اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دیں تو پیچھے رہ جاتے ہیں۔

انہوں نے ایک دن مدیحہ کو ٹوک ہی دیا "تم پہلے ایسی تو نہیں تھیں؟"

مدیحہ نے نظریں اٹھا کر معصومیت سے انہیں دیکھا "کیسی نہیں تھی؟"

"تم نصاب سے جو کچھ اخذ کرتی تھیں' ان پر سوچتی تھیں' ان سے نتائج اخذ کرتی تھیں۔ انہیں تنقیدی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ان کے محاسن و معائب پر بحث کرتی تھیں۔ اب تم نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ کیوں؟"

"دلچسپی کی بات ہے۔ جب مجھے اس مضمون میں دلچسپی تھی۔ میں اسے سود مند سمجھتی تھی۔ اسے ضروری سمجھتی تھی۔ پھر میری رائے بدل گئی۔ میں نے اسے فضول سمجھ لیا۔ اب یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے امتحان دینا ہے۔ دلچسپی نہیں ہونے کی وجہ سے میں نصاب سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔"

"جو لوگ نصابی نہ ہوں' وہ ایسے ہو بھی نہیں سکتے۔" حمید احمد نے خشک لہجے میں کہا "اب میرا مشورہ یہی ہے کہ رٹا لگانے کی کوشش کرو۔"

"وہ تو میں کر رہی ہوں۔"

دن دھیرے دھیرے گزرتے رہے۔ حمید احمد کو دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ٹیوشن کا یہ تجربہ ان کے خدشات کے برعکس خوشگوار ثابت ہوا ہے۔

○☆○

جس دن کے آنے سے وہ ڈرتی رہی تھی' وہ دن بالآخر آ گیا۔ اگلے روز سوکس کا پرچا تھا۔ اور اس روز حمید احمد کو آخری بار اس کے گھر آنا تھا۔

وہ چوبیس دن مدیحہ کے لیے بڑی آزمائش اور پریشانی کے تھے۔ ان میں پہلا دن سب سے مشکل تھا' جب اس نے پہلی بار حمید احمد کا سامنا کیا تھا۔ وہ مرحلہ دشوار ترین ہونے کے باوجود آسانی سے طے ہو گیا تھا۔ اس سے اسے بڑا حوصلہ ہوا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بات ختم نہیں ہوئی۔ آنے والا ہر لمحہ آزمائش کا ہی ہے۔

لیے بہت سی چیزوں کا پردہ رکھنا تھا۔ اس نے حمید احمد کو یقین دلادیا تھا کہ اسے وحید کے آپریشن اور ان کی ضرورت کے متعلق علم نہیں تھا۔ اس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ اس نے پاپا سے ان کے متعلق بات نہیں کی۔ بلکہ وہ تو ان سے پڑھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ یہ اتفاق ہے۔

مگر آگے جو مرحلہ تھا' وہ اس اعتبار سے اور سخت تھا کہ اس میں تسلسل تھا۔ اسے حمید احمد کو یقین دلانا تھا کہ اسے واقعی ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ اور اسے خوشی تھی کہ وہ اس میں کامیاب رہی۔

لیکن یہ پریشانیاں اس کی خوشی کو کم نہ کرسکیں۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے تو صبر کرلیا تھا کہ اب شاید کبھی حمید احمد سے نہیں مل سکے گی.... انہیں نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ بڑی سچائی سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے ٹیوشن پڑھنے کا فیصلہ بڑی بے غرضی اور خلوص سے حمید احمد کی ضرورت کے تحت کیا تھا۔ اور جو قربت اسے ملی' شاید وہ اس کے خلوص کا انعام تھا۔ ان چوبیس دنوں میں اسے ان کی قربت کے تیس خوب صورت گھنٹے ملے تھے۔ وہ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ تھا۔

وہ پہلے ہی دن سے خود سے خوف زدہ تھی۔ اسے یاد تھا کہ کالج میں وہ کیسے از خود رفتگی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ تو اب اسٹڈی کی تنہائی میں' جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا' اس کی وارفتگی کا کیا عالم ہوگا۔ مگر اسے احساس تھا کہ یہاں حمید احمد مجبور ہیں۔ وہ اسے پڑھانا نہیں چھوڑ سکتے۔ ورنہ وہ اسے ایک دن بھی نہ پڑھاتے۔ اگر وہ انہیں پہلے کی طرح دیکھے گی تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ ہاں انہیں کوفت اور ذہنی اذیت ضرور ہوگی۔ اور اس کا یہ عمل بلیک میلنگ کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ اس نے اسی بات کو اپنی سب سے بڑی آزمائش بنالیا۔ وہ اللہ سے دعا کرتی رہی کہ وہ اس آزمائش میں پوری اترے۔ اور اللہ نے اس کی سن لی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس میں تو اتنا ظرف نہیں تھا۔ لیکن اس نے وہ وقت اچھی طرح گزار لیا۔ وہ حتی الامکان نگاہیں نیچی رکھتی تھیں اور نظریں کبھی اٹھ بھی جاتیں تو وہ کوشش کرتی رہتی کہ ان میں کوئی کیفیت نہ جھلکنے پائے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہی۔

مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان خوب صورت' سرمایۂ حیات ساعتوں کی اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی ہے۔ آنے والے کو جانا بھی ہے۔ وقتی طور پر ملنے والے کو ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانا بھی ہے۔ اسے جدائی کا تجربہ بھی تھا۔ قدم کیسے بھاری ہوجاتے ہیں۔ مختصر سے فاصلے بھی کتنے اذیت ناک ہوجاتے ہیں۔ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش کتنی شدید ہوتی ہے اور پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ جدائی آدمی کو سلگانے والی دھیمی دھیمی آگ ہوتی ہے۔ لیکن جدا ہوتے وقت کے چند لمحے اس بھڑکتی آگ کی طرح ہوتے ہیں' جو بڑے اذیت ناک انداز میں پورے وجود کو پھونک ڈالتی ہے۔

اور اب.... آج اسے دوبارہ اس مرحلے سے گزرنا تھا!

○☆○

اس شام حمید احمد بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہ بہت خوش مزاج ہو رہے تھے۔ کسی کو قید سے رہائی ملنے والی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جبکہ مدیحہ اپنی اداسی کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی "اوہ.... سوا چھ ہوگئے۔" حمید احمد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.... آپ کے جانے کا وقت ہوگیا۔" مدیحہ اپنے لہجے کی اداسی کو چھپا نہیں سکی۔

حمید احمد نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں "ہم جو کچھ کرسکتے تھے' ہم نے کرلیا۔ اب ہم صرف دعا ہی کرسکتے ہیں۔" انہوں نے کہا "لیکن میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔"

مدیحہ نے خود کو دل آزاری کے لیے تیار کرلیا۔ وہ جو مشورہ بھی دیں گے' ناقابلِ عمل اور دل دکھانے والا ہی ہوگا "جی.... میں سن رہی ہوں۔"

"اب صرف ریلیکس کرو۔ پڑھنا مت۔ ہاں صبح سویرے اٹھ جاؤ تو ہر اہم باب پر سرسری انداز میں ایک نظر ڈال لینا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر فوراً ہی وضاحت بھی کی "آخری وقت میں' خاص طور پر پوری رات جاگ کر جتنا پڑھا جائے' اس سے کنفیوژن ہی بڑھتا ہے۔ پچھلا پڑھا ہوا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ میرا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔"

"جی۔ میں اس پر عمل کروں گی۔"

"اور میں خوش ہوں کہ میں تمہارے کسی کام آسکا۔"

مدیحہ نے حمید احمد کو بہت غور سے دیکھا۔ آج وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اسے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہہ نہیں پا رہے ہیں۔ وہ خاموش بیٹھی متوقع نظروں سے انہیں دیکھتی رہی "اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس عرصے کو بہت اچھی طرح گزارا۔ اسے میرے لیے مشکل نہیں بنایا۔"

مدیحہ اب بھی انہیں دیکھتی رہی۔ اس کا اندازہ تھا کہ انہوں نے اصل بات اب بھی نہیں کہی ہے۔

حمید احمد اٹھنے لگے "اب میں چلتا ہوں۔"

"ذرا رکیں۔ دس منٹ اور بیٹھیں۔ اب پھر کبھی تو آپ آئیں گے نہیں۔" مدیحہ نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی آئی۔"

حمید احمد کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اب تک تو خیریت رہی۔ اب یہ لڑکی نجانے کیا کرے گی۔ انہوں نے سوچا۔ مگر پھر یہ سوچ کر اس فکر کو ذہن سے جھٹک دیا کہ اب کچھ بھی ہو' وہ اپنا فرض پورا کر چکے ہیں۔ اور آج یہاں ان کا آخری دن ہے۔

وہ اس بات کے بارے میں سوچ رہے تھے' جو وہ مدیحہ سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کر نہیں پا رہے تھے۔ کیسے کریں؟ کس طرح کہیں؟ وہ ہمیشہ کے سچے' کھرے' دیانت دار آدمی تھے۔ جو بات جیسے محسوس کرتے' کہہ دیتے۔ لیکن آج یہی کام ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔

مدیحہ کی آمد نے انہیں چونکا دیا۔ اس نے ان کے سامنے کافی کی پیالی رکھی۔ اس سے اٹھنے والی بھاپ کافی کی خوشبو سے بوجھل تھی "یہ ہے آپ کی الوداعی کافی میں نے خود بنائی ہے۔" مدیحہ کے لہجے میں خوشی تھی۔

حمید احمد نے کافی کا گھونٹ لیا اور بولے "بہت عمدہ ہے۔ کافی تم بہت اچھی بناتی ہو۔"

"جی۔ محبت سے بنائی ہے۔ اس لیے یہ آرٹ پیس ہے۔"

حمید احمد کو حوالہ یاد تھا۔ انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ تو اس الجھن میں تھے کہ اپنی بات کیسے کریں۔

انہوں نے کافی کا ایک طویل گھونٹ لیا اور بالآخر لب کشائی کی "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے مدیحہ۔ تم نے وحید کو خون دے کر مجھ پر جو احسان کیا ہے' میں تمہیں کسی طرح اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ ہلکے ہو گئے۔

"صلہ دے سکتے ہیں آپ؟" مدیحہ نے آہستہ سے کہا۔

حمید احمد نے ایک پل اسے غور سے دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں "نہیں دے سکتا۔ مر کر بھی حق ادا نہیں ہو گا اس کا۔" انہوں نے کہا۔

"مر کر بھی کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جی کر تو حق ادا کیا جا سکتا ہے۔" مدیحہ نے کہا۔ پھر جلدی سے بات بدلی "تو یہ بات کہنے کے لیے اتنے جھجک رہے تھے آپ؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

حمید احمد بری طرح بھڑکے "تمہیں کیسے معلوم؟"

"میں بڑی دیر سے دیکھ رہی ہوں آپ کو۔" مدیحہ نے کہا "دیکھیں حمید صاحب۔ میرے نزدیک تو وہ کوئی احسان تھا ہی نہیں۔ وحید کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی۔ لیکن آپ جس طرح بادل ناخواستہ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں' وہ تو اچھا نہیں ہے۔ آپ کی ہچکچاہٹ آپ کے لفظوں کی نفی کر چکی ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ اور تھی۔" حمید احمد نے جلدی سے کہا "دراصل مجھے تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا ہے۔ میں نے تم سے بہت بڑی بات کہی تھی ایک موقع پر۔ میں نے کہا تھا کہ تم میرے کام کبھی نہیں آسکتیں۔ مجھے اس کی سزا مل گئی۔ تمہارے ذریعے سے میرا بہت بڑا کام نکلا۔ میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔"

"بس حمید صاحب' یہ اللہ کی مرضی تھی۔"

حمید احمد نے پیالی سے آخری گھونٹ لے کر اسے رکھ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے "اب میں چلتا ہوں۔"

مدیحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی "مجھے بھی ایک بات کہنی ہے آپ سے۔" اس نے کہا۔ حمید احمد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے "آپ سچے اور HONEST آدمی ہیں۔ وعدہ کریں تو ضرور پورا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

حمید احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو یاد ہے' آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا؟" مدیحہ نے کہا "سچا اور پکا وعدہ؟"

پہلو تہی سے فائدہ نہیں تھا۔ بات اور بڑھ جاتی۔ حمید احمد نے کہا "مجھے یاد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں تدریس کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کبھی نہیں ہوں گا۔ ریٹائر کر دیا جاؤں تو وہ اور بات ہے۔"

"میں آپ کے یقین کے حق میں دعا نہیں کر سکتی۔" مدیحہ نے کہا "چلیے.... میں آپ کو نیچے تک چھوڑوں گی۔"

وہ اسٹڈی سے نکل آئے۔ اچانک حمید احمد نے کہا "ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے۔ تم میرے گھر کبھی نہیں آؤ گی۔"

"آپ بلائیں' تب بھی؟"

"یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"آپ پھر بڑی بات کر رہے ہیں۔" مدیحہ نے کہا "بہرحال یہ وعدہ تو میں خود سے بھی کر چکی ہوں۔"

نیچے ڈرائیور گاڑی کے پاس تیار کھڑا تھا۔ اس نے حمید احمد کے لیے دروازہ کھولا۔ حمید احمد نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا "وش یو ریسٹ آف لک مدیحہ!"

" How could you say so when you don't intend to be even good to me. And

you know you are my luck."

مدیحہ نے بھی ڈرائیور کی موجودگی میں انگریزی زبان سے فائدہ اٹھایا۔ پھر بولی "اچھا سر' اللہ حافظ۔ اور شکریہ۔"

وہ گاڑی کے ساتھ چلتی رہی۔ گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو وہ گیٹ پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ آج اس کی باری تھی کہ وہ انہیں نظروں سے دور جاتا دیکھے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا!

○☆○

آدمی جب پریشان ہو' جب کوئی بہت بڑی پریشانی' کوئی بہت بڑی ضرورت اس کے سامنے منہ کھولے کھڑی ہو تو اسے بس اس ضرورت کے پوری ہونے کی' اس پریشانی کے دور ہونے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن وہ اچھا بھی ہو تو پریشانی دور ہونے کے بعد غور و فکر کرتا ہے۔ حمید احمد کو ضرورت کے وقت تیس ہزار کا چیک ملا تو انہوں نے سوچا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ صرف پچیس دن پڑھانے کے عوض کوئی اتنی بڑی رقم بھی دے سکتا ہے۔ سو انہوں نے اس چیک کو کیش کرایا اور اپنی ضرورت پوری کرلی۔

پھر وہ پڑھانے کے لیے گئے اور مدیحہ سامنے آئی تو انہیں اس معاملے میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ انہوں نے سوچا' کہیں وہ چیک معاوضے کے بجائے امداد کا تو نہیں تھا۔ اگر اس وقت کہیں سے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ان کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت لوٹ آتے اور رقم صدیقی صاحب کو واپس کردیتے۔ لیکن یہ اس وقت ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ سو مدیحہ کو پڑھانا ان کی اشد ضرورت بن گیا۔ وہ اسے نہ پڑھاتے تو وہ رقم ان پر احسان بن جاتی۔ وہ خود کو مقروض بلکہ نادہندہ سمجھتے رہتے۔ پھر مدیحہ نے بہت معقول اور مؤثر وضاحت کی۔ انہوں نے اسے تسلیم کرلیا.... قبول کرلیا۔ ان کی ضرورت جو پوری ہو رہی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اسے پچیس دن پڑھا کر وہ آزاد ہو جائیں گے۔ سودا مکمل ہو جائے گا۔ ان پر کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔

لیکن مدیحہ کو آخری دن پڑھانے کے بعد وہ دو تین دن تو ہلکے پھلکے ہوئے۔ اس کے بعد انہیں پھر بوجھل پن کا احساس ستانے لگا۔ انہیں اس معاملے میں پھر گڑبڑ نظر آنے لگی۔ اتنے سے دن پڑھانے کی اتنی بڑی فیس کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ گڑبڑ کیا ہے' کس کی طرف سے ہے' ان معاملات کو انہوں نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ان کا جی چاہا کہ اپنے کولیگز سے پوچھیں کہ کیا یہ ممکن ہے.... پچیس دن کی ٹیوشن کے تیس ہزار! مگر انہیں معلوم تھا کہ کیا جواب ملے گا۔ وہ کہیں گے.... ایسا کوئی بے وقوف ہمیں بھی دلا دو۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ انہوں نے سوچ لیا کہ وہ تیس ہزار ایک قرض تھا' جو انہیں ادا کرنا ہے۔

INVIGILATION کی ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگلے دو ڈھائی مہینوں میں انہیں اچھی خاصی اضافی آمدنی ہوگی۔ پھر بھی انہوں نے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض کی درخواست دے دی۔ وہ رقم ملی تو انہوں نے بینک میں جمع کرادی۔

انہیں اضافی ادائیگی ہوئی تو وہ قرض اتارنے کے قابل ہوگئے۔ اہلیت پاتے ہی انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کیا "میں حمید احمد بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر صدیقی صاحب نے کہا "معاف کیجیے گا۔ میں نے پہچانا نہیں۔ پلیز آپ کوئی حوالہ....."

"میں نے آپ کی صاحب زادی کو ٹیوشن دی تھی۔ اتفاق ہے کہ آپ سے ملاقات آج تک نہیں ہوئی۔"

"اوہ۔ سوری سر۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

"کوئی بات نہیں جناب! آپ کا ایک قرض ہے مجھ پر۔ وہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔" حمید احمد نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ آپ کس قرض کی بات کر رہے ہیں۔"

"جو فیس آپ نے مجھے ادا کی تھی' میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ اس وقت مجھے ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے اسے قرض سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔"

"اوہ۔ تو یہ تو آپ کا اور مدیحہ کا معاملہ ہے۔" دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ

مختصر مختصر

- تنخواہ میں اضافہ شراب کے نشے کی طرح ہے۔ بہت لطف آتا ہے مگر تھوڑی دیر کے لیے۔
- کتاب اس لیے فلم سے بہتر ہے کہ اسے ریوائنڈ نہیں کرنا پڑتا۔ بس' بند کردیجیے' آپ وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے شروع کی تھی۔
- مخالفین سے بحث اس لحاظ سے سودمند ہے کہ اس سے آپ کو اپنے بارے میں پتا چل جاتا ہے کہ آپ کس کردار کے مالک ہیں۔
- امریکا میں آج کل نوعمر بچوں کے والدین کے لیے یہ بھی خوش خبری ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا یا بیٹی صرف کان چھدوانا چاہتی ہے۔
- وہ اتنا تیز بولتی ہے کہ اس کی بات میں دخل دینا ایسا ہی ہے جیسے چلتی ہوئی سلائی مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالنا۔

کو کتنی فیس دی گئی۔ مدیحہ نے اپنے بینک اکاؤنٹ سے ادائیگی کی تھی۔ مجھے تو اس نے بند لفافہ دیا تھا' جو میں آپ کے گھر دے آیا تھا۔۔۔"

حمید صاحب سن ہو کر رہ گئے۔

"اور مدیحہ نے مجھ سے کہا تھا کہ صرف آپ ہی اسے پڑھا سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو رضامند کرنا آسان کام نہیں۔ آپ کبھی ٹیوشن نہیں پڑھاتے۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس کا نام لیے بغیر آپ کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اور میں ایک نوٹ اور اپنے کارڈ کے ساتھ وہ لفافہ آپ کے گھر دے آیا ہوں تو وہ بہت خفا ہوئی تھی مجھ سے۔"

حمید صاحب اب بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ صرف سن رہے تھے۔ ان کی گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

"اور آپ کہتے ہیں کہ اس فیس کے مستحق نہیں تھے۔" صدیقی صاحب کی بات جاری تھی "میں کہتا ہوں' وہ جو بھی تھی کم تھی۔ آپ کی محنت کا حق ادا کیا ہی نہیں جا سکتا میں تو آپ کے گھر مٹھائی لے کر آنے والا تھا۔ مگر کیا کروں' مصروفیت اتنی ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ خود جا کر آپ کے گھر مٹھائی پہنچائے اور آپ کا شکریہ ادا کرے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"میں.... میں سمجھا نہیں۔" بڑی مشکل سے حمید صاحب کی زبان کھلی۔

"آپ کو پتا نہیں۔" صدیقی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی "انٹر کا رزلٹ آگیا ہے نا۔ آپ کے سبجیکٹ میں مدیحہ نے ۸۴ مارکس لیے ہیں۔"

حمید احمد کو معلوم تھا رزلٹ کا۔ لیکن اس حوالے سے مدیحہ کا انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہ حیرت میں ڈوب گئے۔ اتنے اچھے مارکس آئے ہیں مدیحہ کے۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

"صدیقی صاحب' پھر بات ہوگی آپ سے۔" انہوں نے کہا۔

"یو آر ویل کم سر۔"

اس گفتگو کے بعد تو حمید صاحب کو بہت کچھ سوچنا تھا' سمجھنا تھا۔ اور انہوں نے سوچا۔ اور سمجھا بھی۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے صدیقی صاحب کو فون کر لیا۔ وہ رقم لے کر ان کے آفس میں چلے جاتے تو کیا ہوتا۔ صدیقی صاحب کو پتا چلتا کہ ان کی بیٹی نے اتنے سے دلوں کی ٹیوشن فیس تیس ہزار روپے دی ہے تو وہ کیا سوچتے.... ان کے بارے میں بھی اور اپنی بیٹی کے بارے میں بھی۔ وہ سب سمجھ جاتے اور کتنی شرمندگی ہوتی۔ اور مدیحہ پر بھی کیا گزرتی۔

اب پوری بات کھل گئی تھی۔ شواہد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ مدیحہ کو کسی طرح وحید کے آپریشن کا علم ہو گیا تھا۔ اسے ان کی ضرورت کا' ان کی پریشانی کا اندازہ تھا۔ اور اسے ٹیوشن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کتنا کچھ سوچا ہوگا تو ان کی مدد کے لیے یہ تدبیر نکالی ہوگی اور اس نے کتنے خطرات مول لیے تھے ان کی تالیفِ قلب کے لیے۔ اس نے جو اپنی بے عزتی اور رسوائی سے بہت ڈرتی تھی۔

اور بعد میں بھی اس نے انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ اس نے کس طرح خود کو ٹیوشن کا ضرورت مند ثابت کیا تھا۔ یوں کہ وہ اندازہ لگا بیٹھے کہ وہ سوکس میں پاس بھی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ اور اس نے ان پچیس دنوں میں خود پر' اپنی نگاہوں پر کتنا قابو رکھا تھا۔ ایسا تو وہ بھری کلاس میں بھی کبھی نہیں کر سکی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ پچیس دن اسے سکون سے پڑھا سکیں۔ وہ پڑھا نہ پاتے تو ان کے ضمیر پر بوجھ ہوتا۔ وہ تیس ہزار روپے ہر پل انہیں ڈستے رہتے۔ کتنا خیال کیا تھا اس نے ان کا! کون اتنا خیال رکھتا ہے کسی کا!

وہ لمحہ حمید احمد کے لیے بہت بڑی خوشی کا تھا۔ انہیں زندگی میں کبھی توجہ نہیں ملی تھی۔ سو انہوں نے توجہ کی طلب بھی کبھی نہیں کی۔ کبھی کسی نے ان کی اتنی پروا نہیں کی' ان کی تالیفِ قلب کا ایسا خیال نہیں رکھا' کبھی کسی نے ان سے اتنی محبت نہیں کی۔ انہوں نے چاہا بھی نہیں۔ اور اب بغیر مانگے انہیں اتنا کچھ مل گیا تھا۔ اور وہ ناشکرا پن کر رہے تھے۔

اس لمحے حمید احمد نے ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے پوری طرح تسلیم کر لیا کہ مدیحہ کی محبت بے حد عظیم ہے۔ اور وہ خود بھی قابلِ فخر کردار کی مالک ہے۔ جب مدیحہ نے انہیں سب کچھ بتایا تھا تو انہوں نے بڑی حسرت سے سوچا تھا کہ کاش کسی نے ایسی محبت ان سے بھی کی ہوتی۔ مگر پھر انہوں نے ملنے پر اس محبت کی ناقدری کی' تحقیر کی۔ ناشکرا پن کیا انہوں نے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس نعمت کو قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن کفرانِ نعمت تو نہ کریں۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر خدا ایسی عظیم محبت انہیں بھی سونپ دے تو وہ بھی ایسے ہی مجبور اور بے اختیار ہوں گے' جیسی مدیحہ ہے۔ اور انہیں یاد تھا کہ انہوں نے یہ خواہش بھی کی تھی۔ انہوں نے مدیحہ کی کیفیات سننے کے بعد اپنے لیے بھی وہی کچھ چاہا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ انہوں نے اب تک زندگی گزارنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔

انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مدیحہ کی محبت قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن اب وہ اس کی تحقیر کبھی نہیں کریں گے۔ اسے ہلکا کبھی نہیں کریں گے۔ ویسے بھی اب کبھی اس سے ان کا سامنا نہیں ہوگا۔ اب وہ کبھی نہیں ملیں گے۔

ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ یہ تیس ہزار روپے وہ مدیحہ کو واپس کر سکتے تھے۔ لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ ایک تو اس سے مدیحہ کی دل آزاری ہوتی۔ اب وہ سمجھ سکتے تھے کہ مدیحہ نے یہ سب

کچھ جوئے خلوص سے' فرض سمجھ کر کیا تھا۔ دوسرے اس کے لیے انہیں پھر مدیحہ سے ملنا پڑتا۔ اور ملتے تو کچھ بھی ہو جاتا۔ وہ رقم سامنے جائے بغیر بھی اس تک پہنچا سکتے تھے لیکن اس کے جواب میں یہ بھی ممکن تھا کہ مدیحہ اپنا وعدہ بھول کر ان سے ملنے چلی آئے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اسے وعدہ شکنی کا کوئی جواز فراہم نہ کریں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ اور اس تیس ہزار کو بھول ہی جائیں۔

اگلے روز انہوں نے تیس ہزار کی رقم کو نکسٹڈ ڈپازٹ کردیا۔

○☆○

پچھلا ایک مہینہ بلقیس بیگم کے لیے ڈراؤنے خواب کی طرح گزرا تھا۔ اس نے انہیں جسمانی طور پر ہی نہیں' روحانی طور پر بھی تھکا دیا تھا!

پہلے وحید کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ اس کے ساتھ اسپتال میں رہیں۔ پھر وحید گھر آیا تو حمید احمد پریشان رہنے لگے۔ اور ان کے پوچھنے پر بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اور انہیں یاد تھا کہ جس دن وہ صاحب آئے جو حمید کا انتظار کرتے رہے تھے اور پھر ایک خط اور ایک لفافہ دے کر چلے گئے تھے' اس دن وہ خط پڑھنے کے بعد حمید احمد پرسکون نظر آئے تھے۔ ان کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔

مگر اسی رات انہوں نے بلقیس بیگم کو ایک پریشان کن خبر سنائی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وحید کے دماغ کا ایک آپریشن ہونا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ وہ یہ خبر سن کر متوحش ہو گئی تھیں "اس کے لیے تو بہت پیسوں کی ضرورت پڑے گی بیٹے۔" انہوں نے کہا۔

"ہاں اماں۔ بیس پچیس ہزار کا خرچا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بندوبست ہو چکا ہے۔"

"مگر یہ اس قدر اچانک.....! یہ تمہیں کب پتا چلا۔"

"جس دن وحید کو اسپتال سے چھٹی ملی تھی' اسی دن ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"مجھے ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا۔ تم نے بھی نہیں بتایا۔"

"جان کر نہیں بتایا اماں۔ مجھے معلوم تھا' آپ بہت پریشان ہو جائیں گی۔" حمید احمد کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

بلقیس بیگم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو یہ بات تھی' جس کے لیے تین دن حمید احمد پریشان رہے۔ اور ہر بار ان کے پوچھنے پر یہی بتایا کہ کالج کی کوئی پریشانی ہے۔ انہوں نے ایک بار بھی اصل بات نہیں بتائی۔ کیا گھر کے افراد کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ حمید احمد آپریشن کی وجہ سے نہیں' اخراجات کی طرف سے پریشان تھے۔ آپریشن تو آپریشن ہے۔ ہونا ہے تو ہونا ہے۔ اس میں تو بس دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن پیسے کی پریشانی آدمی کو بہت ہراساں کر دیتی ہے۔

"پیسوں کا بندوبست کیسے ہوا؟" انہوں نے حمید احمد سے پوچھا۔

"ایک ٹیوشن مل گئی اماں۔ جو صاحب آج آئے تھے' وہ تیس ہزار کا چیک دے کر گئے ہیں۔"

"کیا سال بھر پڑھانا ہوگا؟"

حمید احمد ہنسنے لگے "ارے نہیں اماں' مشکل سے ایک مہینہ سمجھ لیں۔"

بلقیس بیگم کو یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ دنیا کو اتنا جانتی سمجھتی نہیں تھیں۔ لیکن اتنا سمجھ سکتی تھیں کہ ایک ماہ پڑھانے کی فیس تیس ہزار روپے نہ کوئی مانگ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دے سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ وحید کے آپریشن کا سن کر دہل گئی تھیں۔ آپریشن اور وہ بھی دماغ کا!

پھر اگلے دن حمید احمد نے کہا "اماں.... آج اسپتال چلنا ہے۔ یہ معاملہ جتنی جلدی خیریت سے نمٹ جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ صرف تین دن لگیں گے۔"

چنانچہ ایک ہفتے میں دوسری مرتبہ وہ وحید کے ساتھ پھر اسپتال پہنچ گئیں۔ اسپتال کے وہ چار دن جیسے ان کی زندگی کے تھے ہی نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ اس عرصے میں انہوں نے کتنے وظائف پڑھے۔ اللہ کے کتنے ناموں کا ورد کیا۔ بس وہ یہی کچھ کرتی رہیں۔ نماز پڑھتی رہیں اور وحید کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتی رہیں۔

سب رنگ ڈائجسٹ میں چھپنے والی سلسلے وار کہانی

سونا گھاٹ کا پجاری

قیمت ۔/۵۰ روپے ○ ڈاک خرچ ۔/۲۰ روپے

- ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مر گیا تھا لیکن اس کی خواہش مند کے تہہ خانے میں اصلی حالت میں موجود تھی۔
- سونا گھاٹ کے علاقے پر اس مُردہ پجاری کی پُراسرار طاقتوں کی حکومت تھی اور وہ ہر گذرتے لمحے آقا مقتدر
- ایک مظلوم اور بے بس انسان کی کہانی جو حالات سے تنگ آکر بدی کی طاقتوں کا غلام بن گیا اور زبردست پُراسرار طاقتیں حاصل کر لیں۔
- وہ طاقتور ترین شخص بن گیا لیکن ایک طاقت اس سے بھی زبردست تھی۔

بدی کی طاقتیں کیا تھیں؟ سراب، دھوکہ یا حقیقت؟

ایک شخص کی ہولناک ترین سرگزشت مکمل طور پر کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہ راست ہم سے حاصل کریں۔

سب رنگ ڈائجسٹ کے مندرجہ ذیل سلسلے بھی علیحدہ سے مل سکتے ہیں۔

اُلکا (مکمل، دو حصے) قیمت فی حصہ ۴۰ روپے، ڈاک خرچ ۔/۲۰ روپے	اقابلا (مکمل، دو حصے) قیمت فی حصہ ۴۰ روپے، ڈاک خرچ ۱۶۵ روپے	غلام روحیں (مکمل) قیمت ۱۴۰ روپے، ڈاک خرچ ۱۶۵ روپے

کتابیات پبلی کیشنز ○ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ کراچی

اور آپریشن کے بعد وہ ڈاکٹر کے سامنے رو پڑیں "سب ٹھیک ہوگیا ہے اماں۔" ڈاکٹر نے انہیں دلاسا دیا۔

"یہ تو آپ نے پچھلی بار بھی کہا تھا۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولیں "اور اس کے بعد آپریشن کر ڈالا بچے کا۔"

"اس میں اسی کی بہتری ہے اماں۔ یہ ضروری تھا اور آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ معاملہ سنگین بھی نہیں نکلا۔"

"مجھے یہ بتائیے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں۔ اب انشاء اللہ اس کے ساتھ کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

وہ گھر آگئیں۔ اگلے روز سے حمید احمد کی کالج کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ اس شام کو حمید احمد تیار ہوئے۔ ان کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ انہیں ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔ گاڑی انہیں لینے کے لیے آئے گی اور گاڑی ہی چھوڑ کر جائے گی۔

بلقیس بیگم نے گاڑی کو دیکھا تو ان کی الجھن دور ہوگئی۔ ٹیوشن پڑھانے کے تیس ہزار تو کیا تیس لاکھ بھی مل سکتے ہیں۔

دن گزرتے گئے۔ بلقیس بیگم کے لیے وہ عرصہ بڑی اداسی کا تھا۔ انہیں غم اس بات کا تھا کہ ان کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ وحید کے ساتھ تو وہ پہلے جیسی ہی تھیں۔ لیکن حمید احمد سے وہ بس ضرورتاً ہی بولتی تھیں۔ بس ایک بار انہوں نے حمید احمد سے پوچھا تھا "جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے' وہ لوگ جان پہچان کے تھے؟"

"نہیں اماں۔ اجنبی لوگ تھے۔" حمید احمد نے جواب دیا تھا۔

اس روز بلقیس بیگم کا مان بالکل ہی ٹوٹ گیا تھا۔

مہینے گزر گئے۔ حمید احمد کو احساس بھی نہیں ہوا۔ مصروفیت ہی اتنی تھی۔ پھر مصروفیت کم ہوئی تو شاید انہیں احساس ہوگیا۔ ایک دن انہوں نے ان سے کہا "کیا بات ہے اماں۔ بہت چپ چپ رہتی ہیں آپ۔ میرے پاس بیٹھتی بھی نہیں آج کل۔"

"کچھ نہیں بیٹے۔ بولوں تو کیا بولوں۔"

"کچھ بولیں نا۔ مجھ سے ناراض ہیں کیا؟"

"تم سے کیسی ناراضگی۔" وہ پھٹ پڑیں "تم تو میرے لیے اپنے ہو۔ مگر میں تو تمہارے لیے اپنی نہیں۔"

حمید احمد گھبرا گئے۔ انہوں نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا "کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ خدا گواہ ہے۔ میں آپ کو اپنی اماں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔"

"یہی کہا تھا تم نے مجھ سے پہلے دن۔" بلقیس بیگم نے اداسی سے کہا "یہ میرا گھر ہے' تم میرے بیٹے اور وحید میرا پوتا ہے۔"

"ہوا کیا ہے اماں' بتائیں تو۔"

"گھر کے افراد سے کوئی کچھ چھپاتا ہے۔ تم نے مجھے وحید کے آپریشن کے متعلق نہیں بتایا۔"

"میں جانتا تھا اماں کہ آپ پریشان ہوجائیں گی۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں ایک آدمی پریشان رہے' یہ کافی ہے۔ ایک تو بیچارہ۔"

"اور میں تمہیں پریشان دیکھ کر پریشان نہیں ہوئی۔"

"خدا کی قسم اماں' میں آپ کو اپنی اماں ہی سمجھتا ہوں۔ میں اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔"

"میں تمہارا اعتبار کیسے کروں؟ تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔"

حمید احمد بھونچکے رہ گئے۔ بلقیس بیگم نے بہت سخت لہجے میں بات کہی تھی "کیا کہہ رہی ہیں اماں؟"

اب تو بلقیس بیگم پھٹ ہی پڑیں "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے تم سے اتنی شکایتیں ہوں گی کبھی۔ مجھے بہت شکایتیں ہیں تم سے۔ تم نے مجھ سے چھپایا کہ وحید کو کوئی تکلیف ہے' جس کے لیے آپریشن ضروری ہے۔ تم پریشان رہے اور پریشانی کا سبب مجھ سے چھپاتے رہے۔ اور تم نے اس لڑکی مدیحہ کو سب کچھ بتا دیا...."

"یہ غلط ہے اماں۔"

لیکن بلقیس بیگم کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں "تمہیں پیسے کی طرف سے پریشانی تھی۔ تم نے مجھے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ اور اس مدیحہ سے مدد مانگ لی۔ مجھ سے تو تم نے اس کے گھر آنے پر کہا تھا.... یہ کیا بلا پیچھے لگالی آپ نے۔ پیچھا چھڑانا مشکل ہوجائے گا۔ اور خود کیا کیا؟ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس سے جل رہی ہوں۔ مجھے تو وہ اتنی اچھی لگتی ہے کہ میرے بس میں ہو تو اسے بہو بنالوں۔ اس گھر میں لے آؤں۔ تمہاری ناپسندیدگی دیکھ کر میں نے تم سے یہ بات نہیں کی۔ ورنہ میں تو بھانپ چکی تھی کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور تم نے مجھ سے بالا ہی بالا اس سے اپنی ضرورت بھی کہہ دی۔ میں تمہاری ماں مرگئی تھی کیا۔"

حمید احمد منہ کھولے سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا "آپ پتا نہیں کیا کچھ کہے جارہی ہیں۔" انہوں نے احتجاج کیا "میں نے کسی کو اپنی ضرورت نہیں بتائی۔ مدیحہ کو تو بتا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے تو آپ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں مدیحہ سے رقم کیسے مانگ سکتا تھا۔"

"تم باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے ہو۔" بلقیس بیگم نے غصے سے کہا "تم نے خود مجھے بتایا کہ تمہیں کسی نے ایک مہینے کی فیس تیس ہزار روپے دی ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا کہ جہاں تم ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے' وہ جاننے والے ہیں۔ تم نے کہا' نہیں.... اجنبی ہیں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ تم مدیحہ کے گھر جاتے ہو۔"

حیرت سے حمید احمد کا منہ کھل گیا "یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"جو گاڑی تمہیں لے جاتی اور واپس لاتی تھی' وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ اور وہ وہی گاڑی تھی' جس میں مدیحہ یہاں آئی تھی۔"

"اوہ۔" حمید احمد نے گہری سانس لی "میں نے صرف اس لیے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈر تھا' آپ نجانے کیا قیاس کریں گی اور مجھ سے

الٹی سیدھی ضد کرنے لگیں گی۔"

"اس سے شادی نہیں کرسکتے۔ اور ماں کو چھوڑ کر اس سے مالی مدد طلب کرسکتے ہو۔" بلقیس بیگم رونے لگیں۔

اب حمید احمد کو بھی غصہ آگیا "میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں۔ آپ سے نہیں مانگ سکتا تو کسی اور سے کیا مانگوں گا۔ خدا کی قسم' میں نے کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ میں تو بس اللہ سے مانگتا رہا۔ میں تو مکان بیچنے والا تھا۔"

"مجھ سے کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"کہتا تو سوائے آپ کو پریشان کرنے کے کیا حاصل ہوتا۔ آپ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کہاں سے کرتیں؟"

"ایسا نہیں ہے حمید۔ تیس پینتیس ہزار تو میرا بینک میں پڑا ہے۔ پھر لالو کھیت والا مکان ہے۔ چار پانچ لاکھ کا تو وہ ہے ہی۔ جب سے تمہارے پاس آئی ہوں' تم نے مجھے کچھ خرچ کرنے ہی نہیں دیا۔ اور میرے پاس جو کچھ ہے' وہ تمہارا اور وحید کا ہے۔ مجھے دکھ اسی بات کا تو ہے کہ تم نے مجھے ماں کہا ہے لیکن سمجھا نہیں۔ تم اتنی معمولی سی رقم کے لیے پریشان ہوتے رہے۔ اور تم نے مجھے پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ اور مدیحہ سے...."

"بس... اب نہ کہیے گا یہ بات۔" حمید احمد نے غصے سے کہا۔ پھر انہوں نے اماں کو پوری بات بتادی "اب آپ جس بات پر بھی مجھ سے خفا ہیں' اسے بھول جائیے اور مجھے معاف کردیجیے۔" انہوں نے آخر میں کہا "میں پھر کہہ رہا ہوں' میں اپنی اماں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا اور آپ میرے لیے اماں ہی ہیں۔"

بلقیس بیگم انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں "مسئلہ یہ ہے بیٹے کہ تم محبت کرنے سے بھی ڈرتے رہے ہو اور اس سے بھی کہ تم سے محبت کی جائے۔ اسی لیے تم نے کبھی کسی کو دل کی' روح کی گہرائی سے نہیں چاہا۔ کسی نے تم سے محبت کی تو تم نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس پر دھیان نہیں دیا اور تم نے محبت کی خواہش بھی نہیں کی۔ اسی لیے تم تنہا ہو۔ اسی لیے تم ڈرتے بھی ہو۔ جن کے پاس محبت کی طاقت ہو' نہ وہ تنہا ہوتے ہیں' نہ چھوٹے موٹے بحرانوں سے گھبراتے ہیں۔ وہ اپنا دکھ اپنی پریشانی کسی محبت کرنے والے کو بتاتے ہیں۔ اندر کا خوف ان کے سامنے نکالتے ہیں اور ان سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی' بہت ستانے والی کمی ہے تمہارے اندر۔" انہوں نے گہری سانس لی "تمہیں معاف کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں۔ میں تم سے خفا رہ ہی نہیں سکتی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ مجھ سے جو زبانی تعلق تم نے قائم کیا ہے' اب اسے پکا کرلیا جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم خود کو تبدیل کرلو... میری خاطر' وحید کی خاطر اور خود اپنی خاطر۔"

حمید احمد کی آنکھوں میں آنسو آگئے "جو کہیں گی' میں کرلوں گا۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا اماں۔"

"میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ آئندہ ضرورت کے وقت تمہیں مجھ سے مانگنا نہیں پڑے۔"

حمید احمد کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں "اس کی ضرورت نہیں اماں۔ میں آپ کی' وحید کی قسم کھاتا ہوں کہ ضرورت پڑے گی تو آپ سے کہہ دوں گا۔ ویسے آپ یقین کریں' پریشانی میں مجھے یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ورنہ میں اتنا پریشان ہوتا بھی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتی ہوں۔ اب میں تم سے دوسری بات کروں گی۔ یہ مدیحہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم سے محبت بھی کرتی ہے۔"

حمید احمد کے چہرے کا رنگ بدل گیا "آپ کی دونوں باتیں درست ہیں اماں۔ لیکن دوسری پر مجھے اعتراض ہے۔"

"محبت پر کسی کا زور کب ہوتا ہے بیٹے۔ وہ تو بس ہوجاتی ہے۔ جیسے مجھے تم سے ہوگئی۔"

"لیکن اسے اس کا حق نہیں۔ اس کے اور میرے بیچ ایک بہت مختلف' بہت نازک رشتہ ہے۔"

بلقیس بیگم نے گہری سانس لی "تم بہت پڑھے لکھے ہو۔ عقل اور سمجھ میں مجھ سے بہت زیادہ ہو۔ مگر پھر بھی میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی ہوں۔"

بے یقینی

"کل رات میں نے اپنی بیوی سے کہا "چلو ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ وہ دس منٹ میں تیار ہوگئی۔ ہم کار میں سیر کرنے نکلے لیکن دریا کے پل پر کار پھسل گئی اور جنگلہ توڑ کر دریا میں جا گری۔ ہم میاں بیوی ڈوب رہے تھے کہ ایک کتا تیرتا ہوا آیا۔ اس نے ہم دونوں کو دریا سے نکالا۔ گھسیٹ کر سڑک تک لے گیا پھر اس بے چارے نے بھاگ کر ایک قریبی دکان سے ٹیلی فون کارڈ کے ذریعے اسپتال فون کیا.... ایمبولنس آگئی.... یہ تم ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا....؟"

"بھئی باقی تو سب ٹھیک ہے... لیکن یہ جو تم نے کہا کہ تمہاری بیوی دس منٹ میں تیار ہوگئی.... یہ میں نہیں مان سکتا۔"

"ابھی نہیں اماں... پلیز۔" حمید احمد گھگیانے لگے "ابھی تو میں ایک ایسی بات کو قبول کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' جسے قبول کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔"

"بات پر بات کرو' تبھی سمجھ میں آتی ہے۔ تبھی آسان ہوتی ہے۔ غلط بات پر ڈٹ جانا تو اچھی بات نہیں۔ پڑھے لکھوں کو تو یہ زیب بھی نہیں دیتا۔"

"پلیز اماں۔" حمید احمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا "اس پر پھر کبھی بات کرلیں گے۔ ابھی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" بلقیس بیگم نے کہا۔ ان کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوچکا تھا۔

○☆○

حمید احمد باہر جانے کے لیے دروازہ کھول ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور وحید اندر آگیا "میں تمہیں دیکھنے کے لیے نکل رہا تھا۔" انہوں نے ذرا خفگی سے کہا "مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔"

وحید ہانپ رہا تھا "اسی لیے تو بھاگتا ہوا آیا ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے اس کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ ماشاء اللہ ان کے کندھے تک پہنچ گیا تھا "چلو.... ہاتھ منہ دھولو۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ معمول کے مطابق اسے پڑھانے کے لیے بیٹھے۔ یہ ان کے لیے ہمیشہ خوشی کا وقت ہوتا تھا۔ وہ بہت برائٹ لڑکا تھا۔ پڑھنے میں ہمیشہ دلچسپی لیتا تھا۔ انہوں نے اس کی تربیت ایسی کی تھی کہ وہ ذہن سے سوچتا تھا۔ کتاب کو صرف پڑھتا نہیں تھا' غور بھی کرتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ اس سے انہیں بڑی امیدیں تھیں۔ اس کا مستقبل روشن بھی دکھائی دیتا تھا۔

وحید طبعاً بھی بہت نیک اور سعادت مند تھا۔ اس نے کبھی انہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ باقاعدگی سے اسکول جاتا۔ وقت پر کھیلنے جاتا۔ ہوم ورک دل لگا کر کرتا۔ اس کے علاوہ بھی پڑھائی میں دلچسپی لیتا۔ وقت پر سوتا اور وقت پر اٹھتا۔ حمید احمد کو اپنے اسکول کے زمانے کے ایک ٹیچر کی بات یاد آئی۔ وہ کہتے تھے' یہ بڑے لوگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ حمید احمد اللہ سے دعا کرتے کہ ان کا بیٹا ہمیشہ ایسا ہی رہے۔

ہوم ورک مکمل ہوگیا۔ حمید احمد اس سے اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ اچانک وحید نے کہا "ابو.... آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے اچھا دوست باپ ہوتا ہے۔ کیا واقعی یہ سچ ہے۔"

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا "بالکل سچ ہے۔ تمہیں کوئی شک ہے اس میں؟"

"شک تو نہیں ہے ابو۔ لیکن میرے دوست میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ آپ تو نہیں کھیلتے۔" وحید نے اعتراض کیا۔

حمید احمد کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ انہیں کھیلنے کی کبھی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اور بات مہلت کی بھی نہیں۔ ان کے اندر امنگ اور خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ کچھ کرنے کچھ بننے کی کوشش میں لگے رہے "میں تمہارے ساتھ کھیلتا بیٹے۔ لیکن میں کبھی کھیلا ہی نہیں۔ مجھے کوئی کھیل بھی کھیلنا نہیں آتا۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ انہیں ایک اور زاویہ سوجھ گیا تھا "دوسری بات یہ ہے بیٹے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کھیلنا بھی چاہے تو زیادہ عرصے تک نہیں کھیل سکتا۔ عمر کا فرق بھی آڑے آجاتا ہے نا۔ بیٹا جوان ہوتا ہے.... توانائیوں سے بھرپور۔ اور باپ مضمحل ہوتا ہے۔ اس کے پاس اسٹیمنا نہیں ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں کھیل پایا۔"

انہوں نے وحید کے چہرے کو دیکھا۔ وہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ مزید وضاحت ضروری تھی "جن لڑکوں کے ساتھ تم کھیلتے ہو' ضروری نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ ہاں' وہ تمہارے ہم جولی بہرحال ہیں۔" انہوں نے کہا "اصل میں دوست کی تعریف سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوست وہ ہے بیٹے' جو ضرورت کے وقت آپ کی مدد کرے۔ پریشانی میں آپ کی دل جوئی کرے۔ کوئی مشکل پیش آئے تو وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق آپ کو صائب مشورہ دے۔ جس سے آپ دل کی بات بے دھڑک کہہ سکیں اور وہ اسے راز رکھے۔ وہ اس بات کی تشہیر کرکے آپ کو اوروں کے سامنے شرمندہ نہ کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ سے بے غرض محبت کرتا ہو۔ آپ کی بہتری کو سب سے مقدم جانتا ہو۔ اور وہ آپ سے جواب میں کچھ بھی نہ چاہے۔ تم جنہیں دوست سمجھتے ہو' وہ تمہارے ہم جولی ہیں۔ تمہیں ساتھ کھیلنے کے لیے' وقت گزاری کے لیے ان کی ضرورت ہے اور انہیں تمہاری۔ ہاں' ان میں سے کوئی تمہارا دوست بھی بن سکتا ہے۔ وہ جو اس تعریف پر پورا اترتا ہوگا۔ مگر سب سے اچھا دوست باپ ہی ہوتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ابو۔" وحید نے پُرخیال لہجے میں کہا "ابھی کچھ دن پہلے میں نے جاوید کو بتایا تھا کہ رات کو اکیلے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے تو اس نے یہ بات دوسرے دوستوں.... میرا مطلب ہے ہم جولیوں کو بتادی۔ اب سب ڈرپوک کہہ کر میرا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"یہ تو چھوٹی بات تھی۔ اگر تم کوئی بڑی بات اسے بتادیتے تو کیا ہوتا۔ نہیں بیٹے' دل کی بات صرف سچے دوست سے کہنی چاہیے۔" حمید احمد نے کہا "اور بیٹے' دوست کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپ سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہو' اس نے آپ سے زیادہ دنیا دیکھی ہو۔ تبھی تو وہ آپ کو صحیح مشورہ دے سکے گا۔ اچھا یہ بتاؤ' آج تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔"

وحید ہچکچانے لگا "ابو.... میرے دوست سگریٹ پینے لگے ہیں۔ وہ مجھے بھی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا' میں ابو کو بتائے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ اس پر وہ مجھے ڈرپوک ڈرپوک کہہ کر مذاق اڑانے لگے

میرا۔ مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

حمید احمد کا دل بُری طرح دھڑکا۔ بیٹا اب حساس عمر میں داخل ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے' جہاں بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے "تمہارا دل چاہتا ہے سگریٹ پینے کو؟" انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

وحید پھر اچکچایا "جی ابو' چاہتا تو ہے۔"

"کیوں؟" حمید احمد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ میرے دوست سگریٹ پیتے ہیں۔"

"یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ تمہارے دوست تو اپنے ابو سے چھپ کر سگریٹ پیتے ہیں تو اس وجہ سے کیا تم بھی ایسا ہی کرو گے؟" حمید احمد کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

"نہیں ابو۔ اچھا آپ بتائیں۔ سگریٹ بری چیز ہے۔ سگریٹ پینا بری بات ہے؟"

"مجھے پتا نہیں۔ اس لیے کہ میں نے کبھی سگریٹ پیا ہی نہیں۔" حمید احمد نے سچائی سے کہا "مگر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

وحید وہیں بیٹھا رہا۔ چند منٹ میں حمید احمد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا ایک سگریٹ تھا "میں پورا پیکٹ خریدنا چاہتا تھا۔ مگر مہنگا بہت ہے۔ میں نے سوچا' تجربہ تو ایک سگریٹ میں بھی ہو سکتا ہے۔"

وحید بڑے اچنبھے سے انہیں دیکھ رہا تھا "جاؤ.... جا کر ماچس لے آؤ کچن سے۔"

وحید گیا اور ماچس لے آیا۔ حمید احمد نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور دیا سلائی جلا کر سگریٹ سلگائی "اب ایک کش میں لوں گا۔ پھر تم لینا۔ اس کے بعد اس پر بات کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"

وحید سر ہلاتے ہوئے بہت غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ حمید احمد نے بہت گہرا کش لیا۔ دھواں تیزی سے ان کے حلق میں بھرا اور انہیں پھندا لگ گیا۔ سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ کھانستے کھانستے دہرے ہوئے۔ وحید پریشان ہو کر ان کی پیٹھ سہلانے لگا "کیا ہوا ابو؟" وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔ حمید احمد کھانسے جا رہے تھے۔

بلقیس بیگم نے ان کے بری طرح کھانسنے کی آواز سنی تو پریشان ہو کر باہر نکلیں۔ ان کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا "کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں.... اماں.... تجربہ کر رہے تھے.... پھندا لگ گیا۔" حمید احمد نے بمشکل کہا۔

"ناک چٹکی سے بند کرو اور منہ کھول کر چھوٹا سا گھونٹ لو۔" بلقیس بیگم نے ہدایت کی۔

حمید احمد نے ہدایت پر عمل کیا۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی "آپ جائیے اماں۔ پانی کا گلاس یہیں چھوڑ جائیے۔ پھندا دوبارہ بھی لگ سکتا ہے۔"

"کر کیا رہے ہو تم دونوں۔" بلقیس بیگم نے بھنا کر کہا۔ ان کی نظر گرے ہوئے سگریٹ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔

حمید احمد نے وحید کی طرف دیکھا' جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "ابو.... اب اور کش نہیں لیجیے گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" حمید احمد نے منہ بنا کر کہا "میں پاگل ہوں کہ بلاوجہ تکلیف مول لوں۔ اب تو تمہیں کش لینا ہے بیٹے۔"

وحید کا چہرہ فق ہو گیا "میں....؟ نہیں ابو۔ میں نہیں پیوں گا۔"

حمید احمد سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اس طرح کش لیا تھا کہ پھندا لگے۔ اور وحید ڈر بھی گیا تھا۔ اب وہ اسے یہیں پر چھوڑ دیتے تو تلقین ادھوری رہ جاتی۔ یہ ضروری تھا کہ وحید کش لے۔ اور اسے بھی پھندا لگے۔ لیکن یہ امکان بھی تھا کہ اسے پھندا نہ لگے۔ مگر حمید احمد اس بات پر تکیہ کر رہے تھے کہ ہر بیٹے کا آئیڈیل اس کا باپ ہوتا ہے۔ وہ ہر کام اپنے باپ کے انداز میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ جب وہ کش لے رہے تھے تو وحید انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ تو انہیں یہ رسک لینا ہی تھا۔ اس کے بغیر یہ سبق نامکمل ہی رہتا "نہیں بیٹے' ایک کش تو تمہیں لینا ہی ہوگا۔ اپنے لیے اچھے اور برے کا فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔" انہوں نے گری ہوئی سگریٹ اٹھائی اور بیٹے کی طرف بڑھائی۔

سگریٹ لیتے ہوئے وحید کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ ملتجی نگاہوں سے حمید احمد کو دیکھ رہا تھا "بس ایک کش لو.... گہرا کش۔ میں دوسرے کو نہیں کہوں گا۔" حمید احمد نے کہا۔

وحید نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہونٹوں میں لی اور کش لیا۔ وہ کش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ کچھ گھبراہٹ اور خوف بھی تھا۔ اس کا حشر حمید احمد سے بھی زیادہ خراب ہوا۔ وہ تو لوٹ پوٹ ہو گیا۔ حمید احمد کا دل کٹنے لگا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ بڑی اور مسلسل تکلیف سے بچانے کے لیے یہ تکلیف پہنچانا ضروری تھا۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور بلقیس بیگم والی ہدایات دہرائیں۔

بلقیس بیگم پھر کچن سے نکل آئی تھیں۔ مگر ان کے پہنچتے پہنچتے وحید کی طبیعت سنبھل گئی "یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ پہلے باپ کو پھندا لگا اور اب بیٹے کو۔" وہ بگڑ کر بولیں۔

"کچھ نہیں اماں۔ ایک تجربہ کر رہے ہیں ہم لوگ۔" حمید احمد نے بے حد معصومیت سے کہا۔

مگر اس بار بلقیس بیگم کی نظر سگریٹ پر پڑ گئی۔ وہ آپے سے باہر ہو گئیں "تو سگریٹ پی رہے ہو تم لوگ۔ یہ ذلیل چیز...." انہوں نے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا "حمید احمد' تم نے تو زندگی میں کبھی

اس بدبودار چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جھوٹ بولنے سے جو بدبو پیدا ہوتی ہے منہ میں' اس سے کچھ ہی کم بدبو ہوگی اس کی۔"

"اماں' ہم سمجھنا چاہ رہے تھے کہ لوگ سگریٹ کیوں پیتے ہیں آخر۔ کوئی لطف تو آتا ہوگا۔" حمید احمد بولے۔

"تو لطف آگیا نا۔ لوگ تو شوق میں شروع کرتے ہیں۔ پھر عادی ہو جاتے ہیں اس کے۔" بلقیس بیگم نے وحید کو لپٹا لیا "میرے بچے پر تو تم رحم ہی کرو۔"

"ٹھیک ہے اماں۔ معاف کردیں۔ اب نہیں پئیں گے۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر وحید سے بولے "اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

"خود ہی پھینک دو۔ یہ اسے آئندہ کبھی چھوئے گا بھی نہیں۔" بلقیس بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔

حمید احمد نے چپل سے سگریٹ کو مسل دیا "ٹھیک ہے اماں۔ اب آپ کھانا تو پکائیں۔"

بلقیس بیگم بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔ حمید احمد نے بیٹے سے کہا "یار' مجھے تو سگریٹ فضول چیز ہی لگی۔ لیکن ضروری نہیں کہ تم بھی میرے خیال سے اتفاق کرو۔ تو تم چاہو تو سگریٹ پی لیا کرو۔"

"نہیں ابو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا اس سے۔ لیکن ابو' ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمیں پھندا لگا۔ میرے دوستوں کو کیوں نہیں لگتا۔"

"ایک بات یاد رکھو بیٹے۔ کوئی چیز بھی سب کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتی۔" حمید احمد نے کہا "کوئی چیز کسی کے لیے ہوتی ہے' کسی کے لیے نہیں۔ لگتا ہے' سگریٹ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"جی ابو۔" وحید نے بڑی شدت سے سر ہلایا "تجربے سے یہی ثابت ہوا ہے۔"

حمید احمد مطمئن ہوگئے۔ یہ امکان بہت قوی ہوگیا تھا کہ وحید اب سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔

○☆○

وہ کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ بالکل اچانک بارش شروع ہوگئی... تیز بارش۔ حمید احمد برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئے اور صحن کے پختہ فرش پر بوندوں کا رقص دیکھنے لگے۔ صحن کا شیڈ والا بلب انہوں نے روشن کردیا تھا۔ اس روشنی میں گرتی ہوئی بارش کا منظر انہیں بے حد مسحور کن لگ رہا تھا۔

ایک گھنٹا ہوگیا۔ بارش نہیں رکی۔ انہوں نے اندر جاکر دیکھا۔ اماں بھی سو چکی تھیں اور وحید بھی۔ بارش بھی عجیب چیز ہے۔ مختلف لوگوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے سکون ملتا ہے۔ کچھ بے چین ہو جاتے ہیں۔ کچھ کو اداسی گھیرنے لگتی ہے اور کچھ کی نیند اڑ جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سے خوشی اور سرمستی حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ کچھ لوگ یادوں سے کھیلنے لگتے ہیں۔

حمید احمد کے لیے اب یہ یادوں کو جگانے والا موسم تھا۔ ابتدا میں تو وہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ بارش جب بھی ہوتی' ان کے اور اماں کے لیے تکلیف اور پریشانیاں لاتی۔ وہ سو بھی نہیں پاتے تھے۔ پھر اللہ نے انہیں ٹھکانا دے دیا۔ تب بارش ہوتی تو انہیں پہلے دور کے' بارش کے سوپنے ہوئے مصائب یاد آتے۔ وہ باہر نکلتے اور گلیوں میں اور سڑکوں پر سیلاب کی سی کیفیت دیکھتے تو بارش کے لیے ان کی نفرت دوچند ہو جاتی۔ پورے شہر کو عذاب میں مبتلا کردیتی ہے یہ بارش!

پھر ایک دن بارش کی جھڑی میں اچانک مدیحہ ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کچھ لوگوں کو بارش اچھی بھی لگتی ہے۔ یہ موسم انہیں پاگل کردیتا ہے۔ انہیں یہ جان کر بہت حیرت ہوئی۔

اس روز انہوں نے مدیحہ کے ساتھ آدھا دن گزارا تھا۔ وہ چند گھنٹے ان کے لیے آگہی کے تھے۔ اس روز انہوں نے بہت کچھ سمجھا' سیکھا اور جانا تھا۔ ایسا بہت کچھ جس سے وہ بے خبر تھے۔ ان کے بہت سے نظریات کی اصلاح ہوگئی تھی۔ وہ حیران ہوئے تھے کہ آدمی اپنے سے چھوٹے... بہت چھوٹے کسی شخص سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس روز انہوں نے بارش کو ایک اور رخ سے دیکھنا سیکھا تھا۔ بارش میں ایک پہلو لطافت کا ہوتا ہے۔ یہ مدیحہ نے انہیں بتایا تھا۔ اور اس روز انہوں نے محبت کو دیکھا اور سمجھا تھا کہ وہ کوئی کتابی اور افسانوی چیز نہیں۔ وہ تو ایک نعمت ہے' جو خوش نصیبوں کو عطا کردی جاتی ہے۔ انہیں اس کچی عمر کی لڑکی پر رشک آیا تھا اور انہیں محرومی کا احساس بھی ہوا تھا۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ بارش اور محبت ہم آہنگ ہیں۔ دونوں ہی آدمی کو مست اور بے خود کردیتے ہیں۔ اور اس مستی و بے خودی میں آدمی بڑے سے بڑا خطرہ بے دھڑک مول لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور ان چند گھنٹوں کی رفاقت نے آخر میں انہیں آزمائش میں مبتلا کردیا تھا۔

اس دن کے بعد بارش کے ساتھ ان کا رویہ تبدیل ہوگیا۔ ہاں' وہ یادیں اب بھی جگاتی تھی۔ مگر انہیں پرانے مصائب یاد نہیں آتے تھے۔ انہیں مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وہ چند گھنٹے مکمل جزئیات کے ساتھ یاد آتے تھے۔ بارش میں وہ محبت کے... اور اس سے اپنی محرومی کے بارے میں سوچتے تھے۔ انہیں ایک شعر یاد آتا تھا...

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اور وہ سوچتے تھے کہ انہیں وہ دل ہی نہیں ملا۔ تو شکایت کیسی؟ محرومی پر گلہ کیا؟

اس وقت بھی وہ یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ یہ سب باتیں پانچ

سال پرانی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے برسات کے ان چند گھنٹوں کو گزار لیا۔ مگر بات یہیں پر نہیں رکتی تھی۔ وہ مدیحہ کے ساتھ گزارے ہوئے ہر پل کو دہراتے تھے۔ اس کے گھر کی اسٹڈی میں پڑھانے سے لے کر آخری دن رخصت ہونے تک کا ہر پل۔ مگر تین سال تک بات بس یہیں تک محدود رہی۔ پھر اماں نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا' جو انہیں کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

انہیں یاد تھا' وحید کے آپریشن کے بعد اماں نے ان سے مدیحہ کے موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس وقت انہوں نے اماں کو ٹال دیا تھا۔ اماں بھی طویل عرصے تک صبر کیے بیٹھی رہیں۔ مگر تین سال کے بعد انہوں نے دوبارہ بات چھیڑی اور اس بار حمید احمد انہیں روک نہیں سکے۔

اماں اپنی کہتی رہیں۔ وہ مدیحہ کے قصیدے پڑھ رہی تھیں "وہ تم سے محبت کرتی ہے۔" انہوں نے آخر میں کہا۔

"آپ چاہتی کیا ہیں؟"

"اسے میری بہو بنا دو۔"

"ضرور بنا دیتا۔ لیکن وحید ابھی بہت چھوٹا ہے اماں۔" حمید احمد نے شگفتگی سے موضوع کی سنجیدگی کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔

"مسخرا پن مت کرو۔" اماں نے بگڑ کر کہا "تم جانتے ہو' میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

حمید احمد بھی سنجیدہ ہو گئے "یہ ممکن نہیں ہے اماں۔" انہوں نے کہا "اس کی اور میری عمر میں بہت بڑا فرق ہے۔"

"کچھ ایسا فرق بھی نہیں ہے۔ تم چالیس کے ہو گے۔ اور وہ تیئیس چوبیس کی تو ہے۔"

"دھاندلی نہ کریں اماں۔ وہ بیس اکیس کی ہے اور میں بیالیس کا۔ دگنے سے زیادہ کا فرق ہے اس کی اور میری عمر میں۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" اماں نے بے پروائی سے کہا "ہمارے مذہب نے سب کچھ واضح کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں دو افراد کے درمیان شادی کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ وہ آپس میں نامحرم ہوں اور ایک دوسرے کو ناپسند نہ کرتے ہوں۔ کامیاب شادی وہ ہے' جس میں دونوں ایک دوسرے سے خوش رہیں۔ اس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ اس کی دونوں مثالیں تو سیرتِ پاک میں موجود ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی۔ آپؐ نے شادی میں عمر کے فرق کی پوری طرح نفی کر دی تھی۔"

حمید احمد اماں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنے مدلل انداز میں بات کر سکتی ہیں۔ مگر ان کی تو پہلی ہی بات ایسی تھی کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے' ایسے کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا "اماں' آپ اتنا بڑا حوالہ کیوں دے رہی ہیں۔ ہم معمولی انسان ہیں...."

"گستاخانہ بات مت کرو حمید احمد۔" اماں نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی "میں سمجھتی ہوں کہ حضورؐ نے کوئی کام بھی اپنی خوشی کے لیے' اپنی ذاتی ضرورت کے لیے نہیں کیا۔ آپؐ کا ہر فعل' ہر عمل نظیر ہے۔ امت کے لیے جائز اور ناجائز میں فرق کرتا ہے۔ امت کی رہنمائی کے لیے ہے۔ تبھی تو رسول کریمؐ کی سنت پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ تم اس پر کیسے بات کر سکتے ہو۔"

حمید احمد دم بخود رہ گئے۔ واقعی.... اب اس پر بات کیسے کی جا سکتی ہے۔ پھر بھی انہوں نے کہا "اماں.... یہ اسلامی معاشرہ کب ہے۔ یہاں تو ایسی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

"تو کیا اس ڈر سے تم سنتِ رسولؐ سے رہنمائی حاصل کرنا چھوڑ دو گے۔ تو پھر یہ بھی سوچ لو کہ تم کہاں ہو گے.... اس دنیا میں بھی اور اس دنیا میں بھی۔"

اس بار حمید احمد لرز کر رہ گئے "لیکن اماں' استاد اور شاگرد کے درمیان احترام کا رشتہ ہوتا ہے۔ میں اس رشتے' اس تعلق کو بدنام کرا دوں۔ مطعون ہو جاؤں۔"

"ہاں۔" اماں نے گہری سانس لے کر کہا "کہتے ہیں کہ استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟ تو بیٹے' استاد باپ کی جگہ ہوتا ہے.... احترام کے لحاظ سے۔ مگر باپ نہیں ہوتا۔ اگر استاد اور شاگرد ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہوں تو ان کی شادی میں کوئی قباحت نہیں۔ کہو تو میں مثالیں دوں.... اور وہ بھی بڑے لوگوں کی؟"

"نہیں اماں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" حمید احمد نے گھبرا کر کہا "لیکن آپ اس پر کیوں مصر ہیں کہ میں مدیحہ سے شادی کروں۔ جبکہ میں شادی بارہ سال پہلے بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس لیے نہیں کی کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"یہ بھی غیر فطری بات ہے۔ اور شادی کے لیے میں یوں کہہ رہی ہوں کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"میں تو نہیں کرتا اس سے محبت۔" حمید احمد نے بھڑک کر کہا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ وہ تو محبت کرتی ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھے گی تو تم بھی کرنے لگو گے۔"

"دیکھیے اماں۔ شادی کی شرط یہی ہے نا کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں اور ساتھ خوش رہ سکیں۔" حمید احمد کو بھی جواب سوجھ ہی گیا "تو سچ یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔"

اب کے اماں بھونچکی رہ گئیں۔ پھر انہوں نے سنبھل کر کہا "تم یہ بات ضد میں کہہ رہے ہو حمید احمد۔ میں دیکھ چکی ہوں کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔" حمید احمد نے اس وقت اسے

اپنی کامیابی سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں انہیں پتا چلا کہ اس روز ان کی تمام دلیلیں رد ہو گئیں۔ تمام دفاعی حصار توڑ دیے گئے۔ ان کے پاس صرف ایک جواز رہ گیا.... ناپسندیدگی کا۔ اور وہ جانتے تھے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ وہ مدیحہ کو ناپسند نہیں کر سکتے۔ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ تو اس پر رشک کرتے رہے ہیں۔ انہیں احساس ہو گیا کہ ان کا مؤقف کمزور پڑ گیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد جب بھی کبھی بارش ہوئی اور انہوں نے بلا ارادہ مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کیا تو انہوں نے چونک کر خود سے پوچھا کہ کیا وہ ناپسندیدگی کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں۔ انہیں خود بھی یہ سوال مضحکہ خیز لگا۔ کوئی کسی کو ناپسندیدگی سے اتنی تفصیل سے تو یاد نہیں کرتا۔ پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے مدیحہ سے کہا تھا کہ وہ ایک سچے اور بے حد HONEST آدمی ہیں۔ تو کیا وہ واقعی ایسے ہیں؟ اس کا جواب انہوں نے اکڑ کر دیا۔ ہاں میں ایسا ہی ہوں۔

اس کے نتیجے میں بحث چھڑ جاتی "یہ بتاؤ کہ تم جو مدیحہ کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو اس طرح یاد کرتے ہو' تو یہ محبت نہیں ہے؟" اُن کے اندر بیٹھا وکیل استغاثہ پوچھتا۔

"نہیں۔ یہ محبت ہوتی تو میں اپنا وعدہ پورا کرتا' جو میں نے مدیحہ سے کیا تھا۔ میں اس کے سامنے اعتراف کرتا اور اپنی کالج کی جاب چھوڑ دیتا۔"

"تو پھر کیوں یاد کرتے ہو اسے؟ اس کا کوئی سبب تو ہو گا۔" وکیل استغاثہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گئے "یہ احمقانہ سوال ہے۔ کوئی کسی کو کسی بھی وجہ سے یاد کر سکتا ہے۔ صرف محبت ہی تو اس کی وجہ نہیں ہوتی۔" انہوں نے اعتراض اٹھایا۔

"اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" ان کے اندر بیٹھے جج نے رولنگ دی "سوال کا جواب دیا جائے۔"

حمید احمد سوچتے رہے "دیکھیے می لارڈ۔ ملزم سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا ہے۔" وکیل استغاثہ نے وار کیا۔

"میں سوچ رہا ہوں می لارڈ۔" حمید احمد نے کہا "دراصل مدیحہ سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔ ہمارے درمیان احسان کا رشتہ ہے۔ وہ میری محسنہ ہے۔ اس نے بروقت خون نہ دیا ہوتا تو شاید آج میرا بیٹا زندہ نہ ہوتا۔ اور اگر اس نے درپردہ میری مدد نہ کی ہوتی تو میں یہ مکان اونے پونے بیچ چکا ہوتا اور بے گھر ہوتا۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی اپنے محسن کو اچھے انداز میں یاد نہ کرے۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔" آخر میں ان کا لہجہ فاتحانہ ہو گیا۔

جج نے تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ سنایا "استغاثہ اپنے مؤقف کو مؤثر انداز میں پیش کرنے اور فیصلہ کن شواہد مہیا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ ملزم کی دلیل کمزور ہے۔ اس بیان سے عدالت کی تشفی نہیں ہوتی۔ تاہم یہ عدالت شبے کا فائدہ دیتے ہوئے اسے بری کرتی ہے۔"

ہر بارش میں یہی کچھ ہوتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ پھر برآمدے میں پڑے تخت پر لیٹ کر بارش کا نظارہ کرتے ہوئے حمید احمد کو اونگھ آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری طرح سو گئے۔

انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شادی میں شریک ہیں۔ وہ ایک جوان اور خوش شکل دولہا کے پاس بیٹھے ہیں۔ نکاح خواں نکاح نامے کا فارم بھر رہا ہے۔ وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ دلہن کے نام کے آگے مدیحہ حامد لکھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی ان کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی ہیں۔ وہ اٹھ کر زنان خانے کی طرف بھاگے ہیں' جہاں دلہن عورتوں میں گھری بیٹھی ہے۔ دلہن کا چہرہ سہرے میں چھپا ہے۔ وہ وہاں پہنچ کر سہرا اٹھاتے ہیں تو ان کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ وہ مدیحہ ہے۔

اب خواب میں تمام عورتیں غائب ہو گئیں۔ بس وہ اور مدیحہ رہ گئے "مدیحہ.... تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟" انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا کروں۔ ساری عمر تو نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ ممی اور پاپا نے مجبور کر دیا مجھے۔"

"لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی لوگ تم سے قبول کرانے آئیں گے۔ تم انکار کر دینا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اپنے والدین کی بے عزتی تو نہیں کرا سکتی۔"

"کوئی بے عزتی نہیں ہو گی۔ میں تم سے شادی کروں گا۔"

"اور لوگ کیا کہیں گے۔ یہ بھی سوچا آپ نے؟"

"لوگوں کی کیا اہمیت ہے۔ اصل چیز تو ہماری خوشی ہے۔"

"لوگوں کی اہمیت ہے حمید صاحب۔ بہت اہمیت ہے۔ سب سے زیادہ اہم تو لوگ ہی ہوتے ہیں۔" مدیحہ نے تلخ لہجے میں کہا "انسان معاشرتی جانور ہے۔ جہاں گنجا ہونا معیوب ہو' لوگ وہاں گنجے نہیں ہوتے۔ ہمیں اس معاشرے میں لوگوں کے درمیان رہنا ہے تو ہم وہ کچھ نہیں کر سکتے' جو اس معاشرے کو پسند نہیں۔"

حمید احمد کو یاد تھا۔ ان کی بات انہیں لوٹائی جا رہی تھی "میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں انکار کرنا ہو گا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آپ اپنے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں حمید صاحب۔ میں انکار نہیں کروں گی۔"

حمید احمد بیٹھ گئے اور مدیحہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے "مدیحہ.... تمہیں میری محبت کی قسم' انکار کر دو۔"

"سوری حمید صاحب۔" مدیحہ نے کہا "میں جانتی ہوں' آپ مجھ سے کبھی شادی نہیں کریں گے۔"

حمید احمد اصرار کرتے رہے اور مدیحہ اپنی جگہ ڈٹی رہی۔ بالآخر حمید احمد دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ وہ بس یہی کہے جا رہے

تھے.... میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ۔ میرا یقین کرو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ لیکن مدیحہ انکار کیے جارہی تھی۔

حمید احمد کی آنکھ کھلی تو وہ سچ مچ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ان کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ وہ ہوش اور بے اختیاری کے درمیان معلق تھے۔ انہیں احساس تھا کہ وہ خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ لیکن خواب کی کیفیت کو جھٹکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ابھی تک خواب کے اس منظر میں موجود تھے۔ چند لمحوں میں کیفیت کچھ بہتر ہوئی۔ ان کی دھاڑیں ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ لیکن آنسو اب بھی بہے جارہے تھے۔ اور وہ مسلسل کہے جارہے تھے۔ میں تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا مدیحہ....

ان کی ہچکیاں تھمیں۔ ہوش و حواس بحال ہوئے' تب بھی ان کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ انہیں ایک جھٹکا سا لگا۔ الفاظ ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ ان کی یادداشت میں موجود تھے.... گونج جارہے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ برسات تھم چکی تھی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتا چلا کہ اندر کی برسات جاری ہے۔ ان کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے ہیں۔

"اب ملزم سے پوچھا جائے می لارڈ کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔" اندر بیٹھے وکیلِ استغاثہ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"ملزم جواب دے۔" جج نے ان سے کہا۔

"می لارڈ' میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے مدیحہ سے محبت ہے۔" انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ ان کی سماعت تک بھی پہنچی۔

حمید احمد نے جھری جھری لی۔ تو میں ہار گیا۔ وہ بڑبڑائے۔ اور میں ایک سچا اور HONEST آدمی ہوں۔ میں اپنا وعدہ بھی پورا کروں گا۔

انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھے سوچتے رہے۔ تو یہ دن زندگی کا اہم ترین دن بن گیا ہے۔ آج ایک عہد ختم ہوا اور دوسرا دور شروع ہورہا ہے۔ آج سے تدریس کا پیشہ میرے لیے نہیں رہا۔ اب کیا کرنا ہے' یہ بعد میں سوچیں گے۔ اور آج جاکر مدیحہ کے سامنے اعتراف بھی کرنا ہے....

وہ گھبرا گئے۔ روبرو؟ یہ تو بہت مشکل ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اتنی بڑی بات.... اتنے برسوں کے بعد.... اور وہ بھی آمنے سامنے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ خط بھی تو لکھا جاسکتا ہے۔ وہ پرسکون ہوگئے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ خط لکھیں گے اور آج ہی پوسٹ کردیں گے.... رجسٹرڈ ڈاک سے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ ایسے بوجھ جلدی اتار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

○☆○

ان کے سر اور داڑھی کے بال پوری طرح سفید تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ آنکھیں ایسی چمک دار تھیں کہ آر پار دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر ایسا رعب تھا کہ نگاہ ٹھہرانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی عبا پہنے ہوئے تھے۔

مدیحہ ان کے سامنے نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔

"میں تیرے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں بچی۔" بزرگ نے کہا "جن سجدوں پر تو شرمندہ ہوتی رہی ہے' انہیں قبول کرلیا گیا ہے۔ تیرے سجدوں کی سچائی کی راہ سے ہر رکاوٹ ہٹالی گئی ہے۔ تیری نمازیں مقبول ہوگئی ہیں۔ ہر کھوٹ دور کردیا گیا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" مدیحہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"تو یہی چاہتی تھی نا بچی؟"

"جی ہاں۔ میں یہ بھی چاہتی تھی۔"

"تو کچھ اور بھی چاہتی تھی۔ وہ اب بھی چاہتی ہے؟"

"جی ہاں میرے بزرگ۔" مدیحہ کی آواز لرزنے لگی۔

"میں ایک اور خوش خبری بھی لایا ہوں تیرے لیے۔" بزرگ نے کہا "آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاءاللہ مل جائے گا۔"

بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا....

اذان کی آواز سے مدیحہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہاتھ اب بھی اسے اپنے سر پر رکھا محسوس ہورہا تھا۔ دماغ میں' پورے وجود میں جیسے سکون سا پھیلتا جارہا تھا۔ پھر لمحوں میں اس ہاتھ کی موجودگی کا احساس معدوم ہوگیا۔ مگر وہ خواب اسے پوری طرح یاد تھا۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔ چند لمحوں میں اس خواب کی سچائی اس پر روشن ہوگئی۔ پہلی بار نماز پڑھتے ہوئے ایسا ہوا کہ حمید احمد کا چہرہ اس کے تصور میں نہیں تھا۔ چہرہ کیا' اس کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں تھا۔ اس نے اس سوچ کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اب وہ مکمل یکسوئی اور ارتکاز کے ساتھ اپنے رب کے حضور موجود تھی۔ اس کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کررہا تھا۔

نماز کے بعد اس نے تسبیح پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اسی لمحے خواب والے بزرگ کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجے.... آج جو دل چاہے مانگ لے اپنے رب سے۔ انشاءاللہ مل جائے گا۔ اس پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سجدے میں گرگئی۔ اے اللہ.... آپ سے تو کچھ بھی مانگا جاسکتا ہے۔ آپ جو چاہیں دے دیں۔ میرے مہربان رب.... زندگی آپ کی عطا کردہ نعمتوں' آپ کی عنایات سے بہتر ہے۔ سب کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے۔ مگر بندے کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ دونوں کی.... میری اور حمید صاحب کی دنیا اور آخرت کی بہتری کے ساتھ' سچی خوشیوں' محبت اور ہم آہنگی کے ساتھ....

اس نے وہی کچھ مانگا' جو وہ ہر نماز کے بعد مانگتی تھی۔ مگر آج دعا کے بعد اس سکون کا احساس ہوا' جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور اس کے اندر یقین ابھرا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی ہے۔

اس نے معمول کے مطابق نسیمہ کو جگایا اور خود بالکونی میں چلی گئی۔ وہاں کرسی پر بیٹھ کر اس نے باہر جاتے پچاتے منظر کو دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ ایک سال پہلے جب وہ اس فلیٹ میں نئی نئی آئی تھی تو اسے یہ سب کچھ کتنا عجیب لگا تھا۔ مگر اب وہ مانوس ہوگئی تھی۔ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے.... زخم محبت کے سوا۔

محبت! جب اس نے حمید احمد کو آخری بار اپنے ڈیفنس والے گھر سے رخصت کیا تھا۔ اس بات کو پانچ سال ہوگئے تھے۔ پانچ سال.... پانچ صدیوں جیسے! کتنا کچھ ہوگیا تھا اس عرصے میں۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بس ایک چیز نہیں بدلی تھی.... حمید احمد کی محبت!

امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ بی اے آنرز میں اس کا خاص مضمون اسلامک اسٹڈیز تھا۔ پھر پہلا بڑا واقعہ پیش آیا۔ سمیعہ باجی اور نعیم بھائی کے درمیان علیحدگی ہوئی۔ گھر کے لوگ تصفیہ کرانے کی کوشش میں لگے رہے۔ لیکن بات بنی نہیں۔ سمیعہ باجی نے خلع لے لیا۔

مدیحہ کے لیے وہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ سمیعہ باجی کی نعیم بھائی سے محبت اور پھر طویل انتظار کے بعد شادی نے اس پر بڑا گہرا اور ان مٹ نقش چھوڑا تھا۔ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کردیا تھا۔ اس کی بے غرض' بے طلب محبت انہی کی وجہ سے طلب سے آلودہ ہوئی تھی۔ اتنی محبت' اتنا انتظار' اتنا ایثار.... اور اس کے بعد ایک سال کے اندر علیحدگی! یہ سب کیا ہے؟ کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے؟

اس نے یہی سوال باجی سے کیا۔ باجی افسردہ ہوگئیں "نہیں.... ضروری نہیں۔ بس اپنا اپنا نصیب ہے۔"

"مگر کیوں باجی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اور کیا آپ کی محبت ختم ہوگئی؟ اور نعیم بھائی کی محبت؟"

"نہیں گڑیا۔ میری محبت بھی وہی ہے اور نعیم کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔"

"تو پھر؟"

"سب کچھ وہی ہے۔ بس فضا بدل گئی۔ اور محبت کو فضا کا بدلنا راس نہیں آتا۔"

"میں سمجھی نہیں باجی۔"

"شادی ہوئی تو میں بہت خوش تھی۔ لیکن شادی کے بعد دھیرے دھیرے پتا چلنے لگا کہ نعیم اب وہ نہیں رہے' جس کا میں نے آٹھ سال انتظار کیا تھا۔ اس میں ان کا اتنا قصور نہیں۔ غلطی میرے ڈیڈی اور ممی کی ہے۔ وہ ابتدا ہی میں انہیں قبول کرلیتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نعیم مجھ سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے پانے کے لیے بڑے جتن کیے۔ بے ایمانیاں کیں' کرپشن میں ملوث ہوئے' احسان کرنے والوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ صرف چار سال میں وہ یونہی لالو کھیت سے ڈیفنس سوسائٹی نہیں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے معمولی جاب سے اسٹارٹ کیا تھا اور اب ان کی اپنی کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ انہوں نے اپنی اچھائیاں ترک کیں اور برائیوں کو اپنایا۔ صرف چار سال میں وہ اس سب کچھ کے عادی ہوگئے۔ وہ نعیم نہیں رہے' جس سے میں محبت کرتی تھی۔ اور انہوں نے یہ سب کچھ میری خاطر کیا۔" باجی کا لہجہ تلخ ہوگیا "اور جب میں نے کہا کہ میری خاطر یہ سب کچھ چھوڑ بھی دو۔ پہلے جیسے ہوجاؤ۔ تو انہوں نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں پاگل ہوں۔ وہ یہ سب کچھ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بڑی مشکل سے انہوں نے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ اسے بلاوجہ کیوں گنوائیں۔ اور اس دنیا میں کامیابی کرپشن سے ہی ملتی ہے۔ خود بھی حرام کھاؤ اور دوسروں کو بھی حصہ دو۔ کیونکہ قاعدے قانون سے یہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔ پلاٹ بھی نہیں ملتا۔ بلڈنگ تعمیر کرنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ اور تعمیر کے بعد بلڈنگ پاس بھی نہیں ہوتی۔ اتنے آبجیکشن لگتے ہیں کہ بندہ جواب سوچتے سوچتے پریشان ہوجائے۔ اب تم ہی بتاؤ' میں کیا کرتی۔ میں وہ لڑکی ہوں' جس نے ایک شخص سے محبت کی' اس سے شادی کے خواب دیکھے۔ گھر والوں سے بغاوت کی۔ بیسیوں رشتے ٹھکرائے اور عمر نکل جانے کے خوف سے بے نیاز ہوکر اس شخص کا آٹھ برس تک انتظار کرتی رہی۔ اور جب وہ ملا تو وہ بھی ویسا ہی بن چکا تھا' جیسوں کے رشتے میں نے ٹھکرائے تھے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزارتی' جس کے پاس پرانی چیزوں میں صرف اپنا نام رہ گیا ہے۔ جس کی پوری شخصیت' تمام نظریات تبدیل ہوچکے ہیں۔ وہ تو اجنبی تھے میرے لیے۔ میں علیحدہ ہونے کے سوا کچھ کرہی نہیں سکتی تھی۔"

مدیحہ یہ سب جان کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ تو کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن نہیں۔ حمید احمد ایسے نہیں۔ وہ اپنے اصول نہیں چھوڑتے۔ اور اگر انہوں نے چھوڑ دیے تو کیا اس پر بھی یہی گزرے گی' جو سمیعہ باجی پر گزر رہی ہے؟

سمیعہ باجی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "کیا بات ہے مدیحہ۔ لگتا ہے' تم بھی محبت کی چوٹ کھا بیٹھی ہو؟"

جواب میں مدیحہ نے انہیں پوری کہانی سنادی۔ وہ اپنی بہترین سہیلی سے بھی یہ بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنا آپ بہت بوجھل لگنے لگتا تھا۔ سو اس نے چوٹ کھائی ہوئی سمیعہ باجی کو اپنا رازدار بنالیا۔

سمیعہ باجی نے اس کی روداد بڑی توجہ سے سنی۔ پھر بولی "بلاشبہ تمہارے حمید صاحب بڑے آدمی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ انا سے بھی کام لے رہے ہیں۔"

"بڑے آدمی تو وہ ہیں۔" مدیحہ نے فخریہ لہجے میں کہا "لیکن آپ کی دوسری بات میں سمجھی نہیں۔"

"بھئی' جب تم ان کی شاگرد نہیں رہیں تو مسئلہ خود بخود ختم

ہوگیا۔ اب یہ انا ہی تو ہے کہ جو منہ سے نکل گیا' اٹل ہے۔ دوسرے وہ اپنے مضمون میں چاہے عالم ہوں لیکن عمومی طور پر ان میں علم کی کمی ہے۔ انہوں نے اس معاملے کو اسلامی نکتۂ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

"یہی میں نے بھی کہا تھا۔" مدیحہ بڑے جوش سے بولی "لیکن اپنی کم علمی کی وجہ سے میں انہیں قائل نہیں کر سکی۔"

"دیکھو... اسلام میں رشتوں کے متعلق سب کچھ واضح ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے کچھ رشتوں کے بارے میں حکم دیا ہے کہ انہیں توڑا نہ جائے۔ بلکہ درگزر سے کام لے کر قائم رکھا جائے۔ وہ سب خون کے رشتے ہیں۔ ماں باپ' بہن بھائی۔ دادا دادی' نانا نانی' چچا پھوپی' خالہ ماموں۔ اور وہ سب سگے۔ اور اسلام میں واضح طور منہ بولے رشتوں کو' خود زبانی طور پر قائم کیے گئے رشتوں کو بالکل اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹی کہہ دے' بنالے یا سمجھنے لگے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے لیے محرم بھی نہیں بن جائیں گے۔ بلکہ اسے اسلام میں اچھا بھی نہیں سمجھا گیا ہے۔ اور اسلام دین فطرت ہے۔ انسان کو اسلام سے زیادہ کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ خود انسان نے بھی نہیں۔ چنانچہ جب یہ تاکید کی گئی کہ بیٹی اور باپ بھی بالکل تنہا نہ رہیں۔ کیونکہ ان کے درمیان تیسرا' شیطان ہوتا ہے' تو سب کچھ واضح کر دیا گیا۔ ایسے میں استاد بے چارے کی کیا بساط ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی کشش بہت بڑی حقیقت ہے۔ ایسے میں استاد شاگرد کی یا شاگرد استاد کی محبت میں گرفتار ہو جائے تو یہ غیر فطری نہیں۔ اور وہ محبت اگر سفلہ نہ ہو' نفسانی خواہشات کے ہاتھوں بے لگام نہ ہو تو معیوب بھی نہیں۔ اور شادی کو تو معیوب کہا ہی نہیں جا سکتا۔ نکاح تو برائی کو' برائی کے راستے کو مسدود کرتا ہے۔ اسے تو بس مستحسن ہی کہا جا سکتا ہے۔ کجا یہ کہ کوئی اس پر شرم کرے۔ تو یہ تو گمراہی ہے۔

تو تمہارے پروفیسر صاحب نے بلاوجہ ہی اسے مسئلہ بنالیا۔ اور یہ سوتیلے پن کا بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اسلام نے کسی کو شوہر یا بیوی کی موت یا طلاق کے بعد دوسری شادی سے منع نہیں کیا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ دوسری شادی نہ کرنے کے مقابلے میں دوسری شادی میں زیادہ بہتری ہے۔"

"آپ نے تو میری آنکھیں کھول دیں باجی۔" مدیحہ نے کہا "کاش' میں یہ سب کچھ ان سے کہہ پائی ہوتی۔"

"تو اب کہہ دو۔"

"اب نہیں کہہ سکتی۔ میں وعدہ کر چکی ہوں کہ ان سے کبھی رابطہ نہیں رکھوں گی۔"

"احمقانہ وعدہ ہے یہ۔" سمیعہ باجی نے تیز لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی ہو' میں اسے پورا کروں گی۔" مدیحہ بولی "اور انہوں نے بھی وعدہ کیا تھا مجھ سے۔" اس نے انیس حمید احمد کے وعدے کے متعلق بتایا "مجھے ان کے اعتراف کا انتظار رہے گا۔"

"ایسی انا والے کبھی وعدہ پورا نہیں کر سکتے۔"

"نہیں باجی۔ جس دن انہیں احساس ہوگیا' وہ ہار مان لیں گے۔ میں جانتی ہوں انہیں۔" مدیحہ نے کہا تھا۔

اسلامک اسٹڈیز میں اسے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے بعد اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ وہ اس مضمون کو بڑی محبت اور لگن سے پڑھ رہی تھی۔ وہ ہر چیز' ہر بات ہر عمل کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھتی تھی۔ اور جب وہ شرعی حکم سے ملکی قانون کو متصادم دیکھتی تھی تو اسے بہت افسوس ہوتا تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے اور شریعت نافذ ہو جائے تو لوگوں کو ہزاروں غیر ضروری' تکلیف دہ اور اذیت ناک مسائل سے نجات مل جائے۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ اسلام کے نام پر ووٹ لینے والے اقتدار میں آنے کے بعد خود شریعت سے نظریں چرانے لگتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ غیر شرعی قوانین کا دفاع بھی کرنے لگتے ہیں۔

تین سال بعد اس نے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لے کر پاس کیا۔ اب اس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک لیکچرارشپ کا اور دوسرے وکالت کا.... وفاقی شرعی عدالت کے لیے۔ اس سلسلے میں اس کی سمیعہ باجی سے بات بھی ہوئی "میں لیکچرارشپ کو ترجیح دوں گی۔" اس نے کہا۔

"لیکن شرعی عدالت میں اسکوپ زیادہ ہے۔ تم جج بھی بن سکتی ہو۔"

"یہ اس سے بڑا کام ہے کہ میں دوسروں کو پڑھاؤں۔ تلقین کروں کہ وہ اپنے طور پر اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ معاشرے میں سدھار پیدا ہو۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔"

"لیکن باجی' اس سے پہلے میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

اور اس نے ڈاکٹریٹ کے لیے تھیسس پر کام شروع کر دیا۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ زندگی میں سب سے بڑا طوفان آگیا۔ پیر ہائی وے پر ایک خوف ناک حادثے میں ممی اور پاپا دونوں جاں بحق ہوگئے۔ اور ابھی ان کی قبروں کی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی کہ بہن بھائیوں کے درمیان دولت کی تقسیم پر جھگڑے شروع ہوگئے۔

وہ مدیحہ کے لیے بڑا خوف ناک اور روح فرسا تجربہ تھا۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے ہی سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ ان کے لیے دولت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ نفاق کے سوا کچھ نہیں چھوڑ کر جاتے۔ ان کی اولاد کے درمیان بس نااتفاقی' نفرت' عدم یقین اور اندیشے رہ جاتے ہیں۔

گھر کا پہلے سے جو رنگ تھا' اس میں وہ بس گزارہ ہی کر رہی تھی۔ لیکن ممی اور پاپا کے بعد اس کا وہاں رہنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اس کے اکاؤنٹ میں معقول رقم موجود تھی۔ اس نے اپنی گاڑی لی

اور نسیمہ کے ساتھ یونیورسٹی روڈ کے اس فلیٹ میں چلی آئی' جو اس کے نام تھا۔ وہ اپنے تحفیس میں لگ گئی۔ بعد میں وراثت کے کیس کا عدالت میں فیصلہ ہوا۔ جو ملنا تھا' اسے بھی مل گیا۔ لیکن وہ گھر کے نفرت بھرے ماحول سے بچی رہی۔

کاروبار' جائداد اور نقد رقم کی تقسیم کے بعد سب اپنی اپنی زندگی اپنے انداز میں گزارنے کے لیے آزاد ہو گئے۔ آپس میں ملنا جلنا بھی کم ہی رہ گیا۔ دولت کی خواہش نے رشتوں کو توڑ دیا تھا۔ مدیحہ بہت تنہا تھی۔ لیکن وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا تھیسس مکمل ہونے والا تھا۔ زندگی میں بس ایک کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اسے اس کی بھی کوئی بہت زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس کے اختیار میں کچھ تھا ہی نہیں۔ تو وہ فکر کیوں کرتی۔

اور آج... آج تو اسے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہے۔ اس نے وہ نماز پڑھی' جس کی اسے برسوں سے آرزو تھی۔ اور اس نے وہ دعا کی تھی' جس نے اس کے دل کو سکون بخشا تھا۔ لگتا تھا' زندگی مکمل ہو گئی ہے۔

آہٹ سن کر وہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر نسیمہ کو دیکھا۔ وہ اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی۔

○☆○

اب کیا کیا جائے؟ یہ بہت مشکل سوال تھا۔ ساری زندگی انہوں نے بس ایک ہی کام کیا تھا اور اب وہ اس کے اہل نہیں رہے تھے۔ مگر کچھ تو کرنا ہے۔ متبادل تو ضروری ہے۔ روزگار کا معاملہ ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کچھ کرنا ہی نہیں آتا تھا....

"ارے... تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک۔" بلقیس بیگم نے انہیں چونکا دیا۔

"نہیں اماں۔"

"آج چھٹی کرو گے؟" بلقیس بیگم نے حیرت سے کہا۔

"اب چھٹی ہی چھٹی ہے اماں۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

بلقیس بیگم سناٹے میں آ گئیں "کیا مطلب؟"

حمید احمد نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور التجائیہ لہجے میں بولے "دیکھیں اماں' اس بارے میں آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔ لیکن مجھے تین مہینے کی مہلت چاہیے۔ یہ میرے لیے ضروری ہے۔ آپ اس دوران مجھ سے کچھ نہیں پوچھیے گا۔ پھر میں خود آپ سے بات کروں گا۔"

"ناشتا لاؤں تمہارے لیے؟"

"صرف میرے لیے نہیں' اپنے لیے بھی۔" حمید احمد مسکرائے "اب ہم ناشتا ساتھ کیا کریں گے.... ہر روز۔"

بلقیس بیگم بھی مسکرا دیں۔

ناشتے کے دوران بھی حمید احمد اسی سوال پر سوچتے رہے۔ جو کچھ وہ کرتے رہے تھے' وہ انہیں بہت محبوب تھا۔ اس کے چھوٹے کا صدمہ ایسا تھا کہ کئی دن تک وہ اس سے شل رہتے۔ لیکن انہیں تو ایسے میں بھی سوچنا تھا۔ اور یہ ایسا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ان کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ انہیں ایسا کچھ کرنا تھا کہ جس کے کرنے سے انہیں خوشی حاصل ہو۔ جیسی کالج میں پڑھا کر ہوتی تھی۔ اتنی خوشی تو کسی کام میں نہیں مل سکتی۔ تو اس سے کم سہی۔ لیکن خوشی ہو ضرور۔

بہت سوچنے پر بھی انہیں کچھ سجھائی نہیں دیا۔ انہوں نے سوچا' جلدی کیا ہے۔ پہلے یہ صدمہ جھیل لیں۔ پھر کچھ نہ کچھ سوجھ ہی جائے گا۔ اب ایک دن میں تو سب کچھ ہونے سے رہا۔ برسوں کا ساتھ چھوٹا ہے۔

وہ پوسٹ آفس گئے اور دونوں خط رجسٹری کر آئے.... اپنا استعفا بھی اور مدیحہ کا خط بھی۔ پھر وہ اماں سے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ سارے موضوع ختم ہو گئے تو انہیں چپ لگ گئی۔ دل گھبرانے لگا۔ وہ اس طرح گھر کبھی بیٹھے ہی نہیں تھے۔ انہیں کالج یاد آنے لگا.... اپنی کلاسیں یاد آنے لگیں۔

وحید کے اسکول سے آنے کا وقت قریب آیا تو ان کی گھبراہٹ بڑھ گئی۔ وحید انہیں گھر میں دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اندیشے ستانے لگے۔ اگر وحید کو پتا چلا کہ اب وہ گھر میں رہا کریں گے تو اس کا دل اسکول سے اچاٹ نہ ہو جائے۔ اور وہ ان کے گھر میں رہنے کا عادی نہ ہو جائے۔ پھر وہ کچھ کریں گے اور ظاہر ہے کہ زیادہ دیر گھر سے دور رہیں گے تو وہ سمجھوتا نہیں کر پائے گا۔

وہ گھبرا کر گھر سے نکل آئے۔ لیکن جاتے کہاں۔ ایسی وقت گزاری کی انہیں کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وقت کیسے گزارا جاتا ہے۔ وہ یونہی سڑکوں پر پھرتے رہے۔ تھک گئے تو ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک فیملی روم کا رخ کیا تھا۔

تھکی ہوئی ٹانگوں کو پھیلا کر انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو پہلی بار انہیں مدیحہ کا خیال آیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ انہوں نے اب تک اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں' جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ مدیحہ کا خیال آنے پر انہیں طمانیت کا احساس ہوا۔ اس کا سبب ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ پہلی بار وہ مرد بن کر سوچ رہے تھے۔ اور انہیں آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ پروفیسر نہیں تھے۔ لہٰذا کسی ضابطے کے پابند نہیں تھے۔ وہ کھل کر سانس لے سکتے تھے۔ وہ مدیحہ کے بارے میں آزادی سے سوچ سکتے تھے۔

ان کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ رات وہ خواب دیکھ کر جاگے تھے اور انہوں نے اضطراری طور پر مدیحہ کی محبت کا اعتراف

کرلیا تھا۔ اب وہ سمجھے کہ اتنے عرصے سے وہ خوف زدہ تھے کہ ان سے انجانے میں بددیانتی سرزد ہورہی ہے۔ شاید انہیں احساس تھا کہ انہیں مدیحہ سے محبت ہوگئی ہے۔ لیکن ان کا شعور مزاحمت کررہا ہے۔ انہیں اس کا ادراک نہیں ہونے دے رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ شعور کی مزاحمت فطری ہے۔ وہ ہتھیار ڈالتے تو انہیں اپنی عمر بھر کی کمائی' اپنے پروفیشن سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ لیکن ممکنہ بددیانتی کا احساس شاید انہیں اندر ہی اندر ڈستا رہا تھا۔ تبھی تو پہلا موقع آتے ہی انہوں نے اس محبت کا اعتراف کرلیا۔

لطف کی بات یہ تھی کہ انہوں نے خود سے اعتراف کیا۔ استعفا لکھا اور مدیحہ کو اعترافِ محبت کا خط لکھا۔ یہ سب کچھ کیا۔ مگر انہوں نے اس محبت کے بارے میں نہیں سوچا' جس کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کررہے تھے۔ مگر اس فیملی روم میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے اب انہوں نے اس محبت کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے مدیحہ کو ایک عام لڑکی کی حیثیت میں' ایک عام مرد کی نظر سے دیکھا۔ ان کا وجود خوشی سے بھرگیا۔ سودا مہنگا نہیں۔ بلکہ سستا چھوٹا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ مدیحہ ایسی لڑکی ہے' جس کے لیے دنیا بھی چھوڑی جاسکتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کا ذہن' اس کی روح' اس کا دل اس کے ظاہری حسن سے بڑھ کر حسین ہے۔ اگر وہ اپنی اس محبت کے ساتھ انہیں مل جائے تو زندگی خوب صورت ہوجائے گی۔

اچانک ان کے دل میں ایک خدشہ جاگا۔ وہ بڑے گھرانے کی لڑکی ہے.... بہت بڑے گھرانے کی۔ اور وہ خود اب کچھ بھی نہیں رہے۔ وہ اب ایک ایسے آدمی ہیں' جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ جس کا حال تک درست نہیں۔ تو ایسے میں مدیحہ انہیں کیسے مل سکتی ہے۔ مگر پھر انہوں نے سوچا' یہ سب کچھ مدیحہ بھی جانتی ہے۔ لیکن وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کی طرف بڑھی تھی تو اس کے پیچھے کوئی یقین تو ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

مدیحہ نے انہیں اپنی محبت کی جو کیفیات بتائی تھیں' جن پر انہیں رشک آیا تھا' اب وہ خود پر طاری ہوتے دیکھ رہے تھے۔ چائے کی پیالی ختم کرتے کرتے انہیں جیسے نشہ ہوگیا۔ وہ سرشاری کی عجیب کیفیت تھی۔ وجود کے اندر گہرائی میں سکون ہی سکون تھا۔ لیکن ایک بے تابی تھی' جس نے اوپر کے پانیوں میں تلاطم پیدا کر رکھا تھا۔ بے تابی.... اس بات کی بے تابی کہ وہ مدیحہ کو دیکھیں' اس سے باتیں کریں۔ انہیں ایسی بے تابی کبھی کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ سوچتے اور حساب لگاتے رہے۔ انہوں نے مدیحہ کو جو رجسٹرڈ خط بھیجا ہے' وہ کل نہیں' شاید پرسوں اسے ملے گا۔ مدیحہ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ خط پڑھتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے خط میں اسے پابندی سے آزاد کردیا تھا کہ وہ ان کے گھر نہیں آسکتی۔ وہ آئے گی۔ اور وہ کتنی خوش ہوگی۔ کتنی شکایتیں' کتنی باتیں کرے گی وہ ان سے۔ اور اب اس کے انداز میں کیسا کھلا والہانہ پن ہوگا۔ انہیں اس کا کلاس روم میں لیکچر کے دوران والہانہ نظروں سے دیکھنا یاد آیا۔ اور انہیں بہت اچھا لگا۔ صرف اس لیے کہ وہ پروفیسری کی قید سے آزاد ہوگئے تھے۔

وہ اس کے ساتھ کے خواب دیکھتے رہے۔ انہیں خیال آیا کہ اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اماں کا یہ ہووالا ارمان بھی پورا ہوجائے گا۔ وہ یہی تو چاہتی تھیں۔ اور مدیحہ تو انہیں پسند بھی بہت ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔

پھر اچانک انہیں وحید کا خیال آیا۔ وہ پریشان ہوگئے۔ اس سب سے اہم مسئلے پر انہوں نے سوچا بھی نہیں۔ وحید اتنی بڑی تبدیلی کو قبول کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر نہیں تو پھر سب کچھ ممکن ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوسکے گا۔ وحید کی خاطر ہی تو انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ تو اب کیسے کرسکتے ہیں۔

انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے وحید کو ٹٹولیں گے۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔

اس شام ہوم ورک مکمل کرانے کے بعد انہوں نے بات چھیڑی "یار بیٹے' تمہیں امی کی کمی تو محسوس ہوتی ہوگی؟" انہوں نے وحید سے پوچھا۔

وحید نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کے درمیان اس موضوع پر بات ہورہی تھی "بہت زیادہ ابو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"حالانکہ نہیں ہونی چاہیے۔ اماں تم سے اتنی محبت کرتی ہیں۔"

"وہ تو دادی ہیں۔ امی تو امی ہوتی ہے۔" وحید نے سادگی سے کہا۔

حمید احمد نے ہمت کرکے کہا "میں سوچتا ہوں کہ تمہارے لیے ایک امی لے ہی آؤں۔"

وحید تو اچھل ہی پڑا "سچ ابو۔ مزہ آجائے گا۔"

حمید احمد نے اسے بہت غور سے دیکھا "میں سمجھ رہا تھا کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگے گا؟ میں تو شروع سے یہی چاہتا ہوں۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں۔"

"میرا خیال تھا' آپ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا.... یہ بتاؤ کہ تم کیسی امی چاہتے ہو۔"

"امی جیسی۔" وحید نے بے ساختہ کہا۔ پھر حمید احمد کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وضاحت کی "جیسی میری امی تھیں۔ ان سے ملتی جلتی صورت ہو۔ اور اتنی ہی بڑی ہوں' جتنی میری امی تھیں۔ کیسا مزہ آئے گا۔ اب وہ مجھ سے تھوڑی ہی بڑی ہوں گی نا؟ پھر بھی میں بچوں کی طرح ان کی گود میں لیٹ جاؤں گا۔ وہ مجھے بچوں

کی طرح پیار کریں گی۔ کریں گی نا؟"

"ہاں' کیوں نہیں؟" حمید احمد کا دل بھر آیا۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وحید کے اندر محرومی کا یہ احساس اتنا شدید ہوگا۔ وہ اسے سوتیلی ماں سے بچانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اور وہ ماں کی آرزو کرتا رہا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ ایک بار کھو جائے تو ماں کبھی نہیں ملتی۔ اپنا چودہ سالہ بیٹا انہیں اس وقت چار سال کا لگ رہا تھا۔

"آپ کب لائیں گے امی کو؟"

"دیکھو بیٹے' دعا کرو۔"

اب اہم سوال یہ تھا کہ کیا مدیحہ' وحید کو خوش کرسکے گی۔ اور یہ پریشان کن سوال تھا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ مدیحہ میں سلمہ کی شباہت تھی۔ وحید کے ذہن میں عمر کا جو تصور تھا' مدیحہ اس پر بھی پوری اترتی تھی۔ وہ وحید کی ماں تو نہیں' بڑی بہن جیسی بن سکتی تھی۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ اسے پیار بھی بہت دے گی۔

اس رات حمید احمد ٹھیک سے سوئے نہیں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ خوش تھے۔ قدرت نے ان کی دونوں آرزوئیں پوری کردی تھیں۔ مدیحہ پر جو انہوں نے رشک کیا تھا' وہ رنگ لے آیا تھا۔ انہیں مدیحہ کی محبت تو پہلے ہی سے ملی ہوئی تھی۔ اب انہیں مدیحہ جیسی محبت بھی مل گئی تھی.... مدیحہ کے لیے۔

اگلے روز بھی وہ وحید کے اسکول سے واپس آنے سے ذرا پہلے تک گھر میں بیٹھے رہے۔ مگر ایک فرق تھا۔ گزشتہ روز وہ پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔ لیکن اس روز انہیں اس بات کی فکر بھی نہیں تھی۔ یہ محبت کا کمال ہے۔ ہر فکر ماسوا کو مٹا دیتی ہے۔

اس روز بھی وہ اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور مدیحہ کے تصور سے کھیلتے رہے۔ وہ خوش تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ پہلی بار ان کی زندگی میں بہار آرہی ہے۔ اس روز ریسٹورنٹ میں بیٹھے بیٹھے انہیں ایک خیال آیا۔ انہوں نے سوچا' محکمۂ ڈاک والے کبھی کبھی غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے' خط آج پہنچ جائے۔ بلکہ ممکن ہے' پہنچ گیا ہو۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مدیحہ اس وقت ان کے گھر میں بیٹھی ہو۔

اس خیال نے انہیں بے تاب کردیا۔ وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ گھر پہنچ کر انہیں مایوسی ہوئی کہ مدیحہ نہیں آئی ہے۔ لیکن آس نہیں ٹوٹی۔ کچھ یہ خیال بھی تھا کہ اتنی جلدی خط ملنے کا درحقیقت کوئی امکان نہیں ہے۔

اگلے روز بھی یہی کچھ ہوا۔ مگر وہ شام ان کے لیے بہت سخت تھی۔ وہ سراپا سماعت تھے.... گاڑی رکنے کی آواز' کسی دستک کے منتظر۔ دروازے پر دستک ہوتی تو وہ لپکتے۔ لیکن دروازہ کھول کر مایوس ہوتے۔ کبھی کوئی پڑوسن نظر آتی اور کبھی وحید کے کسی دوست کا چہرہ۔ مدیحہ بہرحال نہیں آئی۔

اگلے روز بارہ بجے کے قریب وہ گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس بار انہوں نے بڑے یقین سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھولنے پر انہیں مایوسی نہیں ہوئی البتہ دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ دروازے پر پوسٹ مین کھڑا تھا۔ مدیحہ نہیں آئی.... کیوں؟ اس نے خط بھیجا ہے! زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

پوسٹ مین نے ان کی طرف خط بڑھایا۔ اور ایک پرچا....

"اس پر سائن کردیں۔"

تو رجسٹری ہے۔ مگر اتنی جلدی! انہوں نے دستخط کیے اور خط لیا۔ اپنی تحریر.... وہ بھونچکے رہ گئے "یہ کیا....؟ خط واپس آگیا میرا؟"

"جی سر۔ وجہ لفافے پر لکھی ہے۔" پوسٹ مین نے کہا اور چلا گیا۔

انہوں نے دروازے پر کھڑے کھڑے لفافے پر ٹیڑھی میڑھی تحریر پڑھی "مکتوب الیہ اب اس پتے پر نہیں رہتا۔ نیا پتا معلوم نہیں۔" کچھ دیر تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر آیا تو انہیں لگا کہ آسمان ان کے سر پر آگرا ہے۔

اس کیفیت میں گھر میں جانا مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے وہیں سے آواز لگائی "اماں' میں جارہا ہوں خدا حافظ۔" پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

○☆○

تین دن گزر گئے۔ کیسے گزرے' یہ حمید احمد کو پتا ہی نہیں چلا۔ انہیں کچھ خیال ہی نہیں تھا۔ وہ ہوش مندانہ انداز میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک وحشت تھی' بے تابی تھی' اضطراب تھا۔ وہ کسی طرح اڑ کر مدیحہ تک پہنچ جائیں.... پوسٹ مین بن کر.... اور وہ خط اسے دے آئیں۔ اس کے علاوہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

چوتھے دن انہوں نے جھرجھری لی' جیسے کسی طویل نیند سے جاگے ہوں۔ یہ وہ کیفیت تو نہیں جو میں نے مانگی تھی۔ وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑائے۔ یہ کیا ہوگیا؟ یہ کیا ہورہا ہے میرے ساتھ؟ انہوں نے سوچا کہ خود مدیحہ کے گھر جائیں' مکینوں سے پوچھیں کہ یہ لوگ کہاں ملیں گے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ آدمی لاپتا ہوجائے۔ ڈھونڈا تو جاسکتا ہے لیکن نہیں..... وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ ان کی حالت' ان کی کیفیت تو دیوانوں کی سی ہے۔

اچانک مدیحہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی' اقبال کا ایک شعر آپ کی نذر کرتی ہوں۔ حمید صاحب۔ یہ میرے دل سے دعا بن کر نکلا ہے۔ خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں۔

تو وہ دعا قبول ہوگئی۔ انہوں نے خود سے کہا۔ مدیحہ نے کیسے دیکھ لیا تھا....؟ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میں سینے میں سمندر

لیے بیٹھا ہوں۔ بس اس میں تلاطم نہیں تھا۔ موجیں تھیں۔ لیکن اضطراب سے محروم تھیں۔ اور اب طوفان آگیا تو موجیں اچھلنے' آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے کی عادی ہو گئیں۔

انہوں نے وقت کی رہ گزر کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیا تھے.... اور کیا ہو گئے۔ معلم.... عاشق۔ اب آئینہ دیکھیں تو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بڑھی ہوئی شیو' نیند سے محروم جلتی' متورم آنکھیں' مسکا ہوا لباس۔ وہ تو تیاگی ہو گئے۔ ہاں سچ مچ۔ سب کچھ تو تیاگ دیا انہوں نے۔ ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور وہ بے کار بھی ہیں' بے روزگار! اور یہ سب کچھ جس کے لیے کیا' وہ انہیں نہیں ملا۔ شاید کفرانِ نعمت کی سزا ہے۔

استعفا واپس بھی تو لیا جا سکتا ہے۔ دنیا اندھیری دیکھ کر گھبرائے ہوئے ذہن نے سوال اٹھایا۔

چپ کم ظرف! انہوں نے اسے ڈپٹ دیا۔ یہ تجارت تھوڑا ہی ہے۔ محبت ہے۔ اہلیت کھو بیٹھے تو منصب چھوڑ دیا۔ یہ تو دیکھ کہ پہلے سے بڑا منصب مل گیا ہے۔

ہاں.... بہت بڑا منصب ہے۔ ذہن نے جل کر کہا۔ دوسروں کو علم بانٹتے تھے۔ اب پھٹیچر ہو۔ لفنگوں کی طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہو۔ یہ تو سوچو کہ اب کرنا کیا ہے۔ خود فاقے کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ کیا اماں اور بیٹے کو بھی بھوکا مارو گے۔ اور بیٹے کی تعلیم کا بھی سوچو۔ جوان ہوتے بیٹے کا باپ.... اور وہ بھی عاشقِ نامراد!

نامراد کیوں' میں تو بامراد ہوں؟ انہوں نے جواب دیا۔ لیکن تیری یہ بات برحق کہ کچھ کرنا ہو گا۔ مگر کیا کروں؟

دل یہی کہتا تھا کہ کچھ ایسا کر' جس میں خوشی ملے۔ مگر ایسا کیا ہے۔ خوشی تو محبت سے ہے۔ اور محبت.... میں نے کب کسی چیز سے محبت کی کہ مجھے خوشی ملے۔ کیا کروں؟

وہ سڑکوں پر چلتے رہتے۔ تھکتے تو ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتے۔ اب تو گھر واپس جانے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ دیر سے گھر جانے لگے تھے۔ اماں نجانے کیسے ضبط کیے بیٹھی تھیں۔ اب تک کچھ بھی نہیں پوچھا انہوں نے۔

ایک دن وہ چلتے چلتے ٹھٹکے۔ وہ ایک اسٹال تھا۔ اسٹال والے نے فٹ پاتھ پر ترپال بچھا کر کتابیں ترتیب سے لگائی ہوئی تھیں۔ ان کی نظر بچوں کی کہانی کی ایک کتاب پر جم گئی۔ کتاب کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ انہوں نے کتاب اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ وہ چار رنگوں میں بہت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی گئی کتاب تھی۔ ان کا دل کتاب کی محبت سے سرشار ہو گیا۔ وہ آٹھ نو سال کے لڑکے بن گئے۔ انہیں یاد تھا کہ وہ کہانیوں کی کتابوں کے لیے ترستے تھے۔ اس زمانے میں کتابیں اتنی اچھی نہیں چھپتی تھیں اور سستی بھی ہوتی تھیں۔ پھر بھی ان کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ کتاب خرید سکتے۔

اس لمحے بجلی کی طرح ایک خیال ان کے دماغ میں کوندا۔ انہیں اس پر سوچنا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے اور چائے منگوالی۔

وہ ریسٹورنٹ سے نکلے تو فیصلہ کر چکے تھے!

○☆○

"اتنی بہت سی کتابیں؟" اماں نے کہا۔ کتابیں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔

"اتنی خوب صورت کتابیں!" وحید کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں خواب ہی خواب تھے۔

"ہاں بیٹے۔ دن میں جتنی تم چاہو' لے سکتے ہو۔" حمید احمد بولے۔

"سچ ابو؟" وحید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

حمید احمد کا دل دکھنے لگا۔ انہوں نے وحید کو کبھی کہانیاں نہیں پڑھنے دی تھیں۔ انہوں نے یہ خیال بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کتابوں سے محروم رہے ہیں۔ اس کی تلافی وہ وحید کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ محرومی کا دکھ سمجھتے ہوئے بھی انہوں نے اسے محروم کر دیا تھا "ہاں بیٹے' جتنی چاہو' لے لو۔" انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر ابو' آپ اتنی کتابوں کا کریں گے کیا؟"

"بچوں تک پہنچائیں گے۔"

اس شام ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد وحید بیٹھا کہانیوں کی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اس کی خوشی دیکھ کر حمید احمد کے دل میں بھی خوشی بوند بوند گر رہی تھی۔ انہوں نے درست فیصلہ کیا تھا۔ خوشی' خوشی بانٹنے سے ملتی ہے' یہ راز انہوں نے سمجھ لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔

اور وحید کو جیسے ہوکا ہو گیا تھا۔ اس کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ اس کے سونے کا وقت گزر چکا تھا اور وہ اب بھی ایک کہانی پڑھ رہا تھا "بیٹے.... تم یہ روز پڑھ سکتے ہو۔ سب آج ہی پڑھ ڈالو گے؟" انہوں نے اسے ٹوکا۔

"میں روز پڑھ سکتا ہوں ابو؟ پرامس؟"

حمید احمد نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "پکا پرامس۔ اب سو جاؤ۔"

اگلے روز حمید احمد نے اپنی تیاری شروع کی۔ وہ کپڑے کا ایک پورا تھان لائے تھے۔ اسے بچھا کر انہوں نے اس پر کتابوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ کتابیں رکھنے کے بعد انہوں نے بڑی نزاکت سے اسے تہ کیا اور گٹھری کی طرح باندھا۔ اس طرح کہ کتابیں مڑیں بھی نہیں۔ وہ یہ کام اس مہارت سے کر رہے تھے' جیسے برسوں سے کرتے آ رہے ہوں۔

اماں انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھیں "تمہارا کیا ارادہ ہے بیٹے؟" انہوں نے پوچھا "یہ کندھے پر رکھ کر گلی گلی کتابیں بیچتے پھرو گے؟"

"جی ہاں اماں۔ اس میں کوئی برائی ہے؟"

"برائی تو نہیں۔ لیکن یہ کام تمہارے شایانِ شان بھی نہیں۔"

"ارے اماں... شان تو بس اوپر والے کی ہے۔" حمید احمد نے کہا "اور اسی میں میرے لیے بہت بڑی خوشی ہے۔"

"یہ کام تم اور طرح سے بھی کرسکتے ہو بیٹے۔" اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔

اب حمید احمد اماں کو کیسے سمجھاتے کہ یہ ان کے لیے کتنا اہم ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس دور میں کوئی یوں کتابیں بیچنے کے لیے نہیں نکلتا۔ لیکن ان کے بچپن میں تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ اب بھی ایسا ہی کریں گے۔ کچھ تو محرومی کا ازالہ ہوگا "اماں.... میں نے آپ سے ایک مہلت مانگی تھی نا۔ وہ مجھے دے دیں۔" انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا "پھر میں اور آپ بیٹھ کر بہت سی باتیں کریں گے۔ میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔ مگر ابھی مجھے میری مرضی کرنے دیں۔ پہلی بار تو میں بچی خوشی کمانے نکل رہا ہوں اماں۔ مجھے دعا دیں۔"

مگر حمید احمد بازو پر گٹھری چڑھا کر گھر سے نکلے تو اماں رونے لگیں۔ کالج میں پڑھانے والا نازک مزاج آدمی، جس نے کبھی بوجھ نہیں اٹھایا، آج اس طرح گھر سے نکل رہا ہے!

○☆○

حمید احمد کو پہلی بار پتا چلا کہ ان کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ بچپن میں انہوں نے اس طرح کتابیں بیچنے والے کو دیکھا تھا۔ اور اس کا ہر انداز انہیں یاد تھا۔ وہ اسی کی طرح گٹھری بناتے، اس کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر چلتے، بوقتِ ضرورت اس کے انداز میں گٹھری اتار کر کھولتے، کتابیں نکالتے اور دوبارہ اسی طرح بند کرتے۔ فرق اتنا تھا کہ وہ بوجھ اٹھانے کے عادی نہیں تھے۔ جلدی تھک جاتے تھے۔ ان کے کندھے دکھ جاتے تھے۔ وہ کبھی گٹھری کو دائیں کندھے پر لیتے، کبھی بائیں پر۔ اور پہلے ہی دن انہیں اپنے بچپن کے کتب فروش کی قوتِ برداشت پر رشک آنے لگا۔ بڑا تحمل تھا اس میں۔ کوئی ان سے گٹھری اتروا تا، کتابوں کا جائزہ لیتا اور کتاب نہ لیتا تو ان کی دوبارہ گٹھری باندھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ گٹھری یا اس کے سر پر دے ماریں یا اس سے اپنا سر پھوڑ لیں۔ مگر کتاب بکنے پر جو خوشی ہوتی تھی، اس کا کوئی بدل ہی نہیں تھا۔ اور جو پہلی کتاب انہوں نے بیچی تھی، اسے تو وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتے تھے۔

پہلے دن تو وہ دس قدم چل کر لڑکھڑا گئے تھے۔ تب انہوں نے پہلی بار خود کلامی کی تھی۔ بعد میں تو وہ اس کے عادی ہوگئے۔ اور پہلی بات جو انہوں نے خود سے کہی، وہ یہ تھی.... اب لدی ہیں نا گدھے پر کتابیں۔ چلتے رہو۔ اس وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ عشق کے راستے پر ان کا پہلا قدم ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ عشق اور انا میں بڑا بیر ہے۔ دونوں ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ یہ سفر ان کے لیے اپنی انا کو کچلنے کا ہے۔

وہ چلتے رہے۔ ہر تھوڑی دور کے بعد وہ تھک کر بیٹھ جاتے اور ہانپنے لگتے۔ سانس یوں لگتا تھا کہ قابو میں ہی نہیں آئے گی۔ اور ہر بار دوبارہ گٹھری اٹھانے کے لیے انہیں پہلے سے زیادہ ہمت کرنی پڑتی۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا گٹھری اٹھانے کو۔ انہیں اندازہ ہوا کہ یہ اتنا مشکل کام ہے تو وہ اسے شروع ہی ... نہ کرتے۔ لیکن اب شروع کردیا تھا تو واپسی کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ دوپہر تک ان کی بوہنی بھی نہیں ہوئی۔ کوئی کتاب نہیں بکی۔ کوئی گاہک ہی نہیں ملا۔ کسی نے انہیں روکا بھی نہیں۔ گٹھری کھلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوپہر کے وقت ایک عورت نے انہیں روکا تو وہ خوش ہوگئے۔ بالآخر.... بالآخر....!

"اے چاچا.... کپڑا بیچ رہے ہو کیا؟" عورت نے پوچھا "چادریں بھی ہیں؟"

"نہیں آپا۔ کتابیں ہیں۔" حمید احمد نے بڑے تحمل سے کہا۔ ورنہ ان کا دل جل گیا تھا۔

"اے میں تمہیں آپا لگتی ہوں۔" عورت نے تپ کر کہا "اور سنو، ماتھے پر بورڈ ہی لگوالو کہ تم کتابیں بیچ رہے ہو۔ ایسے کتابیں بیچتے تو کسی کو نہیں دیکھا۔"

حمید احمد کی بوہنی تو نہیں ہوئی۔ لیکن اس پھیری والی تجارت کے کئی رموز ان پر کھل گئے۔ پہلا یہ کہ گاہک کو مخاطب کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپا تو وہ عورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اس طرح کسی کو کتابیں بیچتے نہیں دیکھا تھا۔ تو وہ بعد کے دور کی ہی پیداوار ہوئی نا۔ دوسری بات سائن بورڈ کی تھی۔ وہ چلتی پھرتی دکان تھے۔ اپنی پیشانی پر بورڈ نہیں لگا سکتے تھے۔ مگر آواز تو لگا سکتے تھے۔ گاہک کو پتا تو چلے کہ یہ دکان کس چیز کی ہے۔

تو وہ صدا لگائیں؟ انہوں نے حیرت سے سوچا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو بہت دھیمی آواز میں بولنے والے ہیں۔ یہ ان سے نہیں ہوسکے گا۔

کیوں نہیں ہوسکے گا؟ دل نے انہیں بری طرح جھڑکا۔ خوشی کمانے نکلے ہو۔ خوشی یونہی تو نہیں ملے گی۔ چلو صدا لگاؤ۔

انہوں نے ذہن میں ایک صدا کو ترتیب دیا اور اس کی خوب ریہرسل کی۔ اس کے باوجود پہلی صدا لگاتے ہوئے ان کے انداز میں اعتماد نہیں تھا۔ اور جب انہوں نے صدا لگائی تو وہ خود انہوں نے بھی بمشکل ہی سنی۔ وہ شرمندہ ہوگئے۔ مگر وہ کوشش کرتے گئے اور گلا کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ اپنی ایک صدا پر وہ جھوم اٹھے۔ یہ ہوئی نا بات۔

"کتابیں لے لو.... بچوں کی ننھی منی رنگین کتابیں۔ کتابیں لے لو!"

کتاب تو نہیں بکی۔ مگر انہیں بھوک ایسی لگی کہ برداشت کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ایسی بھوک انہیں کبھی نہیں لگی تھی۔ اتنا بوجھ

اٹھا کر کبھی اتنا پیدل بھی تو نہیں چلا تھا۔ انہوں نے بھنا کر سوچا۔
چنانچہ کھانا انہوں نے اپنی جیب سے کھایا اور ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد آدھے گھنٹے تک تو ان سے چلنے کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔
پھر وہ دوبارہ چل پڑے۔ آواز لگاتے ہوئے مگر ابھی تک انہیں عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ آواز لگاتے اور ادھر اُدھر دیکھتے۔ انہیں لگتا' تمام لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں.... اور اشارے کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں.... دیکھو تو' پروفیسر صاحب پھیری والے بن کر کتابیں بیچ رہے ہیں۔ اس احساس کے باوجود وہ آواز لگاتے رہے۔ اب پیچھے تو نہیں ہٹا جا سکتا۔
"انکل.... انکل...." وہ کسی بچے کی آواز تھی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے وہ بچہ دوڑتا چلا آرہا تھا۔ اس کا چہرہ اور پیشانی بے حد روشن تھے۔ اس کے نیکر اور قمیص پر جا بجا بہت خوب صورت' رنگین اسٹکر لگے ہوئے تھے
"انکل.... آپ کے پاس رنگین کتابیں ہیں؟"
"ہاں بیٹے۔" حمید احمد نے بے حد اعتماد سے کہا "ابھی دکھاتا ہوں۔" پہلے گاہک نے انہیں اعتماد سے بھر دیا تھا۔ انہوں نے گٹھری اتار کر کھولی اور کتابیں دکھانا شروع کیں۔ کتابیں پھیلانے کے بعد انہوں نے بچے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔
"یہ کتنے کی ہے انکل.... اور یہ....؟"
"یہ ایک روپے کی۔ یہ دو روپے کی اور یہ پانچ...."
بچہ کتابوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ساری کتابیں سمیٹ کر گھر لے جائے۔ حمید احمد نے سوچا' یہ لڑکا کم از کم دس کتابیں لے گا۔
مگر پھر ایک بہت بڑی کیمیاوی تبدیلی رونما ہوئی۔ بچے کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے جانے کے لیے پلٹا....
"کیا ہوا؟ کتاب نہیں لوگے؟" حمید احمد نے اسے پکارا۔
بچے نے پلٹ کر انہیں دیکھا "سوری انکل۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک آگئی۔
حمید احمد کے دل کو کچھ ہونے لگا "تو کیا ہوا۔ پیسے کل دے دینا۔"
"نہیں انکل۔ مجھے کتاب نہیں لینی۔"
"کیا تمہیں پیسے نہیں ملتے؟"
"بہت ملتے ہیں انکل۔ بہت.... لیکن میں خرچ کر دیتا ہوں۔" بچے کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی "مجھے تو سب سے زیادہ پیسے ملتے ہیں۔"
"تمہارے ابو دیتے ہوں گے؟"
"نہیں۔" بچے نے نفی میں سر ہلایا۔ اب وہ آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا "میرے ابو تو اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ مجھے امی پیسے دیتی ہیں۔"
حمید احمد نے بچے کا ہاتھ تھام لیا "یہاں بیٹھو بیٹے۔" اب وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔ اب وہ ایسی سیٹیا لائن کا علاقہ تھا۔ اس بچے کی جگہ وہ خود تھے۔ اور بچے کی شرٹ اور نیکر پر لگے اسٹکرز کی جگہ بھدے بدنما پیوند نظر آرہے تھے۔ دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے حمید احمد۔ انہوں نے دل میں سوچا۔ اب غربت اور یتیمی کے پیوند چھپانے کے لیے اسٹکرز فراہم کر دیے گئے ہیں "سنو.... تم کوئی سی ایک کتاب پسند کر لو۔"
"لیکن انکل' میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"
"تم ایک کتاب پسند تو کرو۔"
یہ کام بچے کے لیے بہت مشکل تھا۔ حمید احمد اسے محسوس کر سکتے تھے۔ یہ کام تو ان کے لیے بھی مشکل ہی ہوتا۔ بالآخر بچے نے ایک کتاب پسند کر لی۔
"تو میاں حمید احمد' یہ کتاب کل تک کے لیے تمہاری ہوئی۔ کل یہ واپس کر دینا تو میں تمہیں دوسری دے دوں گا۔" حمید احمد کا دل ایک سچی خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے کتاب کو ترسے ہوئے سات سالہ حمید احمد کو ۳۵ سال بعد ایک کتاب دے کر اس کی محرومی کا ازالہ کر دیا تھا۔
بچے کی نگاہوں کی شکر گزاری تو ان کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن حیرت کا سبب وہ نہ سمجھ سکے۔ وہ بچے کے جملے نے انہیں سمجھا دیا۔
"انکل.... میرا نام حمید احمد نہیں' عقیل ہے۔"
"ایک ہی بات ہے بیٹے۔ نام سے کیا ہوتا۔" حمید احمد کی آنکھیں بھی جلنے لگیں۔
"انکل.... یہ خیرات تو نہیں ہے نا؟" بچے نے پوچھا۔
حمید احمد کا جی چاہا کہ وہ رو دیں "نہیں بیٹے۔ یہ ایک قرض تھا مجھ پر۔ بہت تاخیر سے اتارا ہے میں نے۔"
بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "شکریہ انکل۔ اب میں جاؤں؟"
"جاؤ بیٹے' یاد رکھنا' کل دوسری کتاب۔"
وہ حمید احمد کی بوہنی تھی۔ وہ خوشی کمانے نکلے تھے اور انہوں نے پہلی خوشی کمالی تھی.... پیسے نہیں' خوشی۔
پھر انہوں نے پیسے بھی خوب کمائے۔ وہ بچوں میں گھر گئے تھے۔ بچے بھی خوش تھے اور وہ بھی۔ لیکن شام کو گھر پہنچنے کے بعد وہ ڈھے گئے۔ انہیں لگتا تھا کہ کندھے بری طرح سوج گئے ہیں۔ اس رات انہیں ایسی نیند آئی کہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔
دوسرا دن بہت سخت تھا۔ گٹھری لے کر نکلنے کا تو تصور ہی ناممکن تھا' ان کا جسم بستر سے اٹھنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ لیکن قدم اٹھانے کے بعد پیچھے ہٹنے کے وہ قائل نہیں تھے۔
اس روز گٹھری اٹھاتے ہوئے ان کی چیخ نکل گئی۔ اماں رونے

تکلیف "کیوں اپنے اوپر ظلم کرتے ہو حمید احمد؟"

"یہ ظلم نہیں اماں۔ میں بہت اچھی خوشیاں کما رہا ہوں۔ آپ کو بتاؤں گا تو آپ بھی خوش ہو جائیں گی۔"

دوسرے دن انہوں نے ایک بہت اہم رمز سمجھا۔ پہلے روز آواز لگانے کے بعد ان کی بکری شروع ہوئی تھی۔ دوسرے روز انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف آواز لگانے کا کمال نہیں تھا۔ اس وقت اسکولوں کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ اب آوازیں لگانے پر بھی کوئی نہیں آ رہا تھا۔ بڑوں کو بچوں کی کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہاں' وہ بچہ عقیل موجود تھا۔ اس تک پہنچنے سے پہلے حمید احمد کئی بڑے کاروباری فیصلے کر چکے تھے۔ ابھی تک وہ صرف پیدل چلے تھے اور اپنے ہی علاقے میں رہے تھے۔ اب انہوں نے سوچا کہ وہ ہر روز ایک نئے علاقے میں جائیں گے۔ بس میں سفر کریں گے تو گٹھری اٹھانے کی مشقت بھی کم ہو گی۔ اور وہ ہاف ٹائم یا چھٹی کے وقت کسی اسکول کے گیٹ پر اپنی گٹھری پھیلا کر بیٹھیں گے۔ بچوں کی کتابیں بچوں ہی کے لیے تو ہیں نا۔ اور انہوں نے ایک فیصلہ عقیل کے لیے بھی کیا تھا!

انہوں نے عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دی "کل سے میں شام کو آیا کروں گا.... مغرب کے وقت۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"تم اسکول نہیں جاتے بیٹے؟" انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"نہیں انکل۔ امی کہتی ہیں' اگلے سال داخلہ دلائیں گی۔"

اس روز حمید احمد رکے رہے۔ بچہ اپنے گھر گیا تو انہوں نے اسے دیکھا اور مکان نمبر نوٹ کر لیا۔ اب وہ ہر مہینے اس بچے کی تعلیم کے لیے کچھ رقم منی آرڈر کریں گے۔ انہوں نے خوشی سے سوچا۔

آنے والے دنوں میں سب کچھ بہتر ہوتا گیا۔ جسم ٹانگیں اور کندھے مشقت کے بتدریج عادی ہوتے ہوتے مضبوط ہو گئے۔ آواز لگانے میں ان کی جھجک ختم ہو گئی۔ ان کا اسکولوں والا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہر روز وہ ایک مختلف علاقہ کور کرتے۔ شام کو وہ اپنے علاقے میں پھرتے۔ عقیل سے پچھلی کتاب لے کر نئی کتاب دیتے اور گھر لوٹ آتے۔

انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ کتنے دن ہو چکے ہیں۔ وہ اس معمول کے عادی ہو چکے تھے اور اس میں بہت خوش تھے۔ زندگی انہیں نعمتوں سے معمور لگنے لگی تھی۔ بہت اچھی بھوک لگتی تھی' بہت اچھی نیند آتی تھی۔ اور دونوں میں بے اندازہ لذت ملتی تھی۔

اسکولوں سے ہٹ کر غریبوں کی کچی بستیاں ان کا کاروباری میدان تھیں۔ ایک بار تو وہ اسی سینما لائن بھی چلے گئے۔ مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ وہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔

اس روز انہوں نے عائشہ باوانی اسکول کے سامنے اپنا گٹھری بازار لگایا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد جب وہ فارغ ہوئے تو ان کے قدم بے اختیار کالا پل کی طرف اٹھ گئے۔ وہ ایک بے خودی کے عالم میں چل رہے تھے۔ پل پار کر کے جب وہ اس مقام پر پہنچے' جہاں برسات کے اس دن مدیحہ مڑ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی' تو وہ بری طرح ٹھٹکے۔ ان کے قدم رک گئے۔ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے خود سے پوچھا۔ جواب انہیں معلوم تھا۔

تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے گٹھری اتار کر رکھی اور ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ستانے کا تو شاید بہانہ تھا۔ اصل میں خود کو ٹٹولنا اور کریدنا مقصود تھا۔

اور تھوڑی سی دیر میں انہوں نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ خود کو اچھی طرح سمجھ لیا.... اپنے اندر چھپے ہوئے کو جان لیا۔ یہ کتابیں بیچنے کا فیصلہ کرنے کے بعد سے انہیں ایک بار بھی مدیحہ یا اس کی محبت یا خود اپنی محبت یاد نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ محبتیں نہ صرف موجود تھیں۔ بلکہ ان کے باطن کی نامعلوم گہرائیوں میں روبہ عمل تھیں۔ وہ کچھ کرتے رہے تھے' جو کچھ کر رہے تھے' اس کے ظاہری محرکات اور تھے۔ لیکن حقیقی محرک وہ محبتیں تھیں' جو ان سے چپکے چپکے یہ سب کچھ کرا رہی تھیں۔ انا بہت توانا ہو تو محبت دب کر رہتی ہے۔ اور محبت دب کر رہے تو بڑی قوت بن جاتی ہے۔ محبت سچی ہو تو جانتی ہے کہ انا اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کا سامان کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے دور کر کے راستہ صاف کر دیتی ہے۔

پروفیسر حمید احمد بہت انانیت پسند تھے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی ایک شاگرد سے محبت کریں۔ انہیں تو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت کو قبول کر لیں۔ یہ ان کے اور ان کے پیشے کے وقار اور مرتبے کے منافی تھا۔ اس کے لیے وہ آسمان سے اتری ہوئی محبت کو بھی ٹھکرا سکتے تھے۔ اور انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ محبت نے خود کو باطن کی گہرائیوں میں' سات پردوں کے پیچھے چھپا لیا۔ وہ دب گئی اور دب کر کام کرتی رہی۔ پھر ابھرنے کا موقع ملا تو وہ ابھری اور اس نے خود کو منوا لیا۔ مگر اب بھی وہ انا سے برتر نہیں تھی۔

پروفیسر حمید احمد نے استعفا دیا.... صرف انا کی خاطر۔ محبت نے ان کی انا کو ان کے اور ان کی انا کے ہی خلاف استعمال کیا تھا۔ وہ اپنا وعدہ کیسے پورا نہ کرتے۔ پورا نہ کرتے تو انا مجروح ہوتی۔ وہ ضربِ کاری اسے ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیتی۔

اور محبت کا تقاضا تھا کہ پروفیسر حمید احمد محبوب کو تلاش نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے گھر جا کر کچھ تو معلوم کریں۔ کچھ تو جانیں۔ لیکن ایک باوقار سفید پوش پروفیسر ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب اس بنگلے میں رہتے ہیں' وہ کیا سوچیں گے۔ اس کے بارے میں کیا کیا گمان کریں گے۔ اور وہ ان سے کیا پوچھیں گے....

کیسے پوچھیں گے؟ نہیں' یہ تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے استعفا دے دیا۔ لیکن ان کا مرتبہ' ان کی شان تو کم نہیں ہوئی۔ وہ یہ نہیں کرسکتے۔

سو محبت نے راہ نکالی۔ اس نے سچی خوشی کمانے کے نام پر انہیں پھیری والا.... تو از لگا کر چیزیں بیچنے والا بنا دیا۔ ان سے بھاری گٹھری اٹھوا کر انہیں میلوں پیدل چلنے والا بنا دیا۔ مرتبہ' شان' وقار.... کچھ بھی نہیں رہا۔ اب تو وہ یہ کرسکتے ہیں.... اور انہیں کرنا ہے۔

"میں محبت ہوں پروفیسر صاحب.... سچی محبت۔ آئندہ کبھی میری نفی نہ کرنا' محبت نے کہا۔ اور حمید احمد نے جان لیا کہ اپنی انا کو وہ شہری بستیوں' گلیوں میں' سڑکوں پر بجھا کر اس پر وزن اٹھائے چلتے رہے ہیں۔ انا کو اپنی اوقات معلوم ہو چکی ہے۔

انہوں نے گٹھری اٹھائی اور چل پڑے۔ لیکن انا کچلی جانے کے باوجود بھی زندہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس طرف جائے' جہاں کبھی وہ مدیحہ کو پڑھانے کے لیے جاتے تھے.... بڑی لمبی سی کاریں۔ آج کتابوں کی گٹھری اٹھائے وہ پیدل وہاں کیسے جاسکتے ہیں۔ مگر محبت اب زیادہ طاقت ور تھی۔ قدم انہیں اسی طرف لے گئے۔ انہیں تو اس وقت پتا چلا' جب ان کی نظر اس بنگلے پر پڑی "بچوں کے لیے ننھی منی کہانیاں.... رنگین کتابیں لے لو۔ بچوں کی کتابیں لے لو۔"

یہ کیا کرتے ہو؟ انا نے احتجاج کیا۔ ایک تو اس طرح یہاں چلے آئے اور پھر فخر سے آواز بھی لگا رہے ہو۔

کیوں نہ لگاؤں۔ یہ وہ کام ہے' جس نے مجھے سچی خوشی دی ہے۔ انہوں نے پھر آواز لگائی "بچوں کی رنگین کتابیں...."

اور اگر صدا سن کر وہ خود باہر نکل آئی تو؟ انا نے انہیں ڈرایا۔

اول تو وہ یہاں ہے نہیں۔ اور اگر ہو اور نکل بھی آئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو رد کیے جانے کے لیے بھی تیار ہوں۔

وہ بنگلے کی طرف چلے.... آواز لگاتے ہوئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ بیل دیں گے۔ انا نے پھر احتجاج کیا۔ لیکن انہوں نے اسے مسترد کردیا۔ انہیں انا کو اس طرح روندتے دیکھا تو عزتیں دینے والے کی رحمت جوش میں آگئی۔ گیٹ کے اندر موجود چھوٹا سا گیٹ کھلا اور ایک نو دس سال کے بچے نے جھانکا "انکل.... آپ اندر آجائیے۔ مجھے کتابیں لینی ہیں۔"

وہ بنگلے میں داخل ہوئے۔ بچہ انہیں لان میں لے گیا۔ وہاں گارڈن چیئر پر ایک خاتون بیٹھی تھیں "ممی.... کتابوں والے انکل آگئے۔" بچے نے اس سے کہا۔

"کتابیں دکھائیے ذرا۔" خاتون نے بے حد شستہ لہجے میں کہا۔

حمید احمد نے گٹھری اتار کر رکھی' کھولی اور کتابیں پھیلا دیں۔ پھر وہ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ سامنے اسٹڈی کی کھڑکی نظر آرہی تھی' جہاں سے وہ اس لان کو دیکھتے رہے تھے۔ آج وہ یہاں ایک مختلف حیثیت میں بیٹھے تھے۔

"تم کتابیں پسند کرلو بیٹے۔" خاتون نے کہا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"

خاتون نے چونک کر انہیں دیکھا "پوچھیے؟ کیا بات ہے؟"

"آپ لوگ یہاں نئے آئے ہیں؟"

"ایک سال ہوگیا۔" خاتون نے جواب دیا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں یہاں باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ یہاں پہلے حامد صاحب رہتے تھے۔"

"ہاں۔ کوئی سوا سال پہلے ان کا اور ان کی مسز کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے یہ بنگلا خرید لیا۔"

"لیکن انہوں نے یہ بیچا کیوں؟"

"جائداد پر خوب جھگڑے ہوئے بہن بھائیوں میں۔ پھر انہوں نے اسے بیچ کر کیش میں CONVERT کرلیا۔"

"ایک بیٹی مدیحہ بھی تھی ان کی۔ وہ مجھ سے کتابیں لیتی تھی۔"

"بچوں کی کتابیں؟" خاتون نے انہیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

"جی نہیں۔ وہ مجھے کتابوں کے نام لکھ دیتی تھیں۔ وہ میں لادیتا تھا۔"

"اوہ۔ وہی ایک معقول لڑکی تھی پورے گھر میں۔ وہ جائداد کے قضیے میں کبھی نہیں الجھی۔ ایک وہی ہے' جس سے میں کبھی نہیں ملی۔ جھگڑے شروع ہوتے ہی اس نے یہ گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"کہاں گئی تھیں' یہ نہیں معلوم آپ کو؟"

"پتا تو مجھے ان میں سے کسی ایک کا بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے' مدیحہ کے سوا سب ABROAD چلے گئے۔" خاتون نے کہا۔ پھر بچے کی طرف مڑیں "کتابیں پسند کرلیں تم نے؟"

بچے نے کتابیں دکھائیں۔ حمید احمد نے قیمت بتائی اور خاتون نے ادائیگی کردی۔ حمید احمد نے گٹھری باندھ کر اٹھائی اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آئے۔ باہر آکر انہوں نے اسٹڈی کی کھڑکی کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ ان کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔

وہ گٹھری اٹھا کر چل دیے۔ ان کے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ چلو.... یہ مرحلہ بھی گزر گیا۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تلاش ختم ہوگئی۔ جانے والے نے کہیں کوئی نشان' کوئی سراغ نہیں چھوڑا کہ اس تک پہنچا جاسکے۔

انہیں اپنی مایوسی پر حیرت ہونے لگی۔ کیا اندر کہیں انہیں یہ یقین تھا کہ مدیحہ کا پتا مل جائے گا؟ وہ اسے پالیں گے؟ ہاں یہی بات ہے۔

کفرانِ نعمت کرنے والے مغرور اور خود پسند انسان' تو نے یہ سوچا کیسے؟ ان کے اندر سے کسی نے تند آواز میں کہا۔

یہ سب درست ہے۔ حمید احمد نے بے حد عاجزی سے سوچا۔ میں نے کفرانِ نعمت کیا.... لیکن بے خبری میں.... ایک اچھے جذبے کے تحت۔ اپنے اصول اور اپنے پیشے کی عزت کی خاطر۔ اور شاید میں مغرور بھی تھا اور خود پسند بھی۔ لیکن میں نے تلافی کی کوشش بھی تو کی۔ میں نے وہ سب کچھ تیاگ دیا' جس کی وجہ سے کفرانِ نعمت کی خطا سرزد ہوئی تھی مجھ سے۔ میں نے خود کو خاک میں ملا دیا۔ کتابوں کی اس گٹھری کا بوجھ تو کچھ بھی نہیں' میں اپنے اعتراف کا بوجھ اٹھائے شہر بھر میں پھرتا پھرا ہوں۔ خود کو کم سزا تو نہیں دی میں نے۔ اور کیا کروں؟

یہ تمام سزائیں کچھ بھی نہیں۔ اندر کی آواز نے کہا۔ تیری اصل سزا یہ ہے کہ جو محبت تجھے بن مانگے' بلا کسی شرط کے مل رہی تھی' اب اس سے محرومی کے ساتھ پوری عمر گزار دے۔ اب وہ تجھے کبھی نہیں ملے گی۔

میں نے ملنے کی آرزو بھی کب کی ہے۔ میں تو صرف اعتراف کا قرض اتارنا چاہتا ہوں۔

یہ موقع بھی تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ مل گیا تو وہ بھی مل جائے گی تجھے!

اچانک حمید احمد نڈھال ہو گئے۔ وہ گٹھری اٹھانا اب ان کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے گٹھری اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ وہ تھکن ایسی تھی' ایسا اضمحلال تھا کہ ان کا پورا جسم شل ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی گزری تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا "کہاں جاؤ گے؟" ٹیکسی والے نے پوچھا۔ انہوں نے بتا دیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اب وہ گھر کے سوا کہیں نہیں جا سکتے تھے۔

○☆○

"واہ.... آج تم جلدی گھر آ گئے۔" اماں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

اس وقت چار بجے تھے۔ تھکن ایسی تھی کہ حمید احمد بیڈ پر گر گئے اور گرتے ہی بے سدھ ہو گئے۔ وہ سو کر اٹھے تو چھ بجے تھے۔ وحید کرکٹ کھیلنے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ برآمدے میں تخت پر جا بیٹھے۔ اماں ان کے لیے چائے لے آئیں۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں "آج تو میں تم سے بات کر سکتی ہوں حمید احمد؟" انہوں نے پوچھا۔

چہرے کے فاضل بال

اور بھدی و بدنما داغ دھبے خواتین کیلئے ایک عذاب سے کم نہیں۔ اب پریشانی اور فکر کی ضرورت نہیں

گلیسی یونانی کریم

کا استعمال کیجئے ہزاروں خواتین کی آزمودہ کریم

قیمت _____ 105/=

موٹاپے سے نجات

بڑھے ہوئے جسم کو صرف (ایک ماہ) میں ۲۰ پونڈ وزن یقینی کم کر کے جسم کو سڈول و اسمارٹ بنا کر پروقار شخصیت کا مالک بنیئے اسمارٹلین غذا کا استعمال کیجئے

اسمارٹلین غذا

قیمت _____ 275/=

مردوں میں مقبول ترین دوا

فربا اور طاقتور بننے کیلئے

کمزور جسم اور سوکھے پچکے گال کو طاقت پہنچا کر جسم کو فربا بناتا ہے چہرے پر سرخی لاتا ہے۔ جسمانی و اعصابی کمزوری دور کر کے طاقت بحال رکھتا ہے

نیچرل پاور (ارزانی)

قیمت _____ 150/=

اسٹاکسٹ:

قوامہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
سلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم حسن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
شہری اشاء جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ ریشم بازار حیدرآباد۔
نیو ہل دواخانہ کچہری روڈ سکھر
پیرزادہ میڈیکل اسٹور پیر الہی روڈ سکھر
حاقانیہ میڈیکل اسٹور گھن پور روڈ لاڑکانہ

طاہر شاپنگ سینٹر ریل بازار اوکاڑہ
علی ہومیو اسٹور اچھرہ موڑ لاہور
ایس اے ہومیو اسٹور ریلوے روڈ لاہور
راجہ برادرز تحصیل بازار سیالکوٹ
پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار گول چوک سرگودھا
عظیم پوٹی سینٹر مدینہ مارکیٹ متیانہ روڈ فیصل آباد
شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد
پنجاب جنرل اسٹور کچہری روڈ سرگودھا
شہناز جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
جرمن ہومیو اسٹور آر دو بازار گوجرانوالہ

علی ہومیو اسٹور سرکلر روڈ گجرات
سٹی ہومیو اسٹور اقبال روڈ کچہری چوک راولپنڈی
لطیف کیمسٹ چاندنی چوک راولپنڈی
ہمدرد دواخانہ مین بازار جہلم
میاں ہومیو اسٹور کربلا چوک ساہیوال
الدینہ جنرل اسٹور سی ایم ایچ روڈ راولاکوٹ
ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان
گنجوی دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان
حی القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ چکوال

بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
خالد دواخانہ مراد بازار ایبٹ آباد
احسن محمود میڈیکل اسٹور میاں محمد روڈ میرپور
عوامی دواخانہ مین بازار مظفرآباد آزاد کشمیر
پرل پنسار اسٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
دکن پنسار اسٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
انعام کیمسٹ شمسی روڈ مروان
سعید فینسی اسٹور اندرون کنگ کیمسٹ کوہاٹ
دارالشفاء مینا بازار منگورہ سوات
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور

ڈسٹری بیوٹر:۔ ریاض محمود ۶۹ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور ۔ بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی۔ فون:۔ ۵۰۲۹۰۳
محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان۔

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی۔ پی پارسل منگوانے کے لیے

حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

"ارے اماں.... آپ کو اجازت کی ضرورت ہے کیا۔" حمید احمد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔"

"ضرورت تو نہیں ہے۔ پھر بھی پوچھ رہی ہوں۔ حالانکہ تمہاری مانگی ہوئی تین ماہ کی مہلت پوری ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔" حمید احمد چونکے۔ انہیں یاد بھی نہیں تھا "تین مہینے ہو گئے۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلا۔"

"مجھ سے پوچھو۔ ایک ایک دن گنتی رہی ہوں میں۔" اماں کے لہجے میں شکایت تھی "تمہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی۔ اچھا.... اب تم بتاؤ گے یا مجھے پوچھنا پڑے گا؟"

"نہیں اماں۔ میں بتاؤں گا۔" حمید احمد نے کہا۔ پھر انہیں ایک ایک بات بتا دی۔ شروع سے آخر تک۔

اماں افسردہ تھیں۔ انہوں نے آب دیدہ ہو کر کہا "غم نہ کرو بیٹے۔ اللہ بچھڑے ہوؤں کو ملانے والا ہے۔ میرا رواں رواں تمہارے لیے دعا کرتا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر اماں نے کہا "آگے کا کیا سوچا ہے تم نے؟"

حمید احمد نے منٹوں میں بہت کچھ سوچ اور سمجھ لیا۔ کچھ فیصلے تو انہوں نے پہلے ہی کر لیے تھے۔ اب تین مہینے کی خود ساختہ قید سے رہائی ملی تھی تو وہ جانتے تھے کہ انہیں زندگی کی بساط نئے سرے سے بچھانی ہے "اماں.... پوری زندگی میں نے کتاب سے محبت کی ہے۔" انہوں نے کہا "پہلے پڑھتا رہا۔ پھر پڑھانے لگا۔ اب پڑھانا چھوٹ گیا ہے تو کتاب بیچنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں میں۔"

"اسی طرح.... ٹھیک...." اماں نے گھبرا کر کہا۔

"میری پوری بات سن لیں اماں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کچھ کہیں۔ مجھے ہی کہنے دیں۔" حمید احمد نے ان کی بات کاٹ دی "یہاں چورنگی پر، سرسید گرلز کالج کے ساتھ کچھ اچھی موقع کی دکانیں ہیں۔ میں وہ خرید کر دکان چلانا چاہتا ہوں۔ اور اماں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا مکان بیچ دیں، اپنی تمام جمع پونجی مجھے سونپ دیں تاکہ میں یہ سب کچھ کر سکوں۔"

اماں ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اتنا روئیں کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حمید احمد گھبرا گئے "کیا ہوا اماں.... کیا بات ہے۔ برا لگا آپ کو؟"

اماں نے خود کو سنبھالا اور انہیں خود سے لپٹا لیا.... بھینچ لیا "مجھے برا لگے گا.... پاگل۔ ارے آج تو میں زندہ ہو گئی ہوں۔ حمید احمد.... تم نے بہت اچھا کیا کہ پروفیسری چھوڑ دی۔ میں بھی تم سے ڈرتی تھی۔ گھبراتی تھی۔ تمہارا رعب تھا مجھ پر۔ میں تم سے محبت بیٹوں کی سی کرتی تھی۔ لیکن عزت پروفیسروں کی سی۔ اور میں سمجھتی تھی کہ تمہیں مجھ سے محبت بالکل نہیں ہے۔ مگر بیٹے، آج تم نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم مجھے ماں سمجھتے.... مانتے ہو۔ یہ بات مجھے کہنی پڑتی تو اتنی خوشی نہیں ہوتی مجھے۔ ارے ماں سے کچھ مانگا تھوڑا ہی جاتا ہے اسے بس بتایا جاتا ہے کہ ہمیں یہ ضرورت ہے اور یہ چاہیے۔ تم نے مجھے خوش کر دیا حمید احمد۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ آج تم نے مجھے مان دے دیا۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ حمید احمد بھی تھے "اماں.... مجھے اظہار نہیں آتا۔ لیکن خدا کی قسم، میں نے آپ کو اپنی اماں کی طرح ہی سمجھا ہے۔ میں نے ان سے محبت نہیں کی..... موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن آپ سے میں نے محبت کی ہے اماں۔ سچ مچ محبت کی ہے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہے تھے۔

"آج مجھے یقین آگیا بیٹے۔"

حمید احمد نے آنکھیں پونچھ دیں اور افق پر نظریں جما دیں، جیسے وہاں مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کا ایک نیا عہد شروع ہو رہا ہے!

○☆○

وحید کے لیے وہ ایک بہت خاص دن تھا۔ آج یونیورسٹی میں ایم اے اسلامک اسٹڈیز کے پہلے سمسٹر کا پہلا دن تھا۔ یہ اس کے نصابی تعلیم کے آخری دور کا نکتۂ آغاز تھا۔ اسلامک اسٹڈیز کے لیے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ اس نے ایم اے عربی میں ٹاپ کیا تھا۔

وہ ناشتا کر چکا تھا۔ دودھ کا گلاس سامنے رکھ کر اس نے "ڈی نیوز" میں جین ڈکسن کے کالم YOUR HOROSCOPE کا جائزہ لیا۔ یہ بات نہیں کہ اس کا ASTROLOGY پر یقین ہو۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے وہ اس کی عادت بن چکا تھا۔ وہ روز اسے دیکھتا تھا۔ لیکن فوراً ہی بھول جاتا تھا۔

اس نے TAURUS کا احوال پڑھا۔ "آپ جس محبت کے خواب دیکھتے ہیں، آج شاید وہ آپ کو نظر آجائے۔ ممکن ہے، بعد میں کبھی آپ محسوس کریں کہ یہ وہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ آپ کو بس محبت سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لیے جلد بازی نہ کریں۔ یہ موٹے چھلکے والا اخروٹ ہے۔ اسے توڑنے میں احتیاط نہیں کریں گے تو اس کا مغز ضائع ہو جائے گا۔"

عجیب سی پیش گوئی ہے۔ وحید نے سوچا۔ خیر.... مجھے کیا۔ یہ تو ہے کہ محبت میری کمزوری ہے۔ لیکن ایسی نہیں کہ مجھے دل پھینک بنا دے۔ یونیورسٹی میں دو سال گزار چکا ہوں میں۔ مگر لڑکیوں سے میری جھجک آج بھی ویسی ہی ہے۔ کبھی محبت ہو ہی گئی تو اظہارِ محبت نجانے کیسے کروں گا۔

اسی وقت حمید احمد بھی ناشتے کی میز پر آگئے۔ وحید نے انہیں سلام کیا "ارے.... تم تیار بیٹھے ہو!" حمید احمد نے سلام کا جواب دینے کے بعد حیرت سے کہا۔ پھر انہیں یاد آگیا "اوہ.... آج سے تمہاری ایم اے اسلامک اسٹڈیز کی کلاسیں شروع ہو رہی ہیں؟"

"جی ابو۔ آج پہلا دن ہے۔" وحید نے جواب دیا۔

حمید احمد بیٹے کو بڑی محبت اور فخر سے دیکھ رہے تھے۔ ماشاء اللہ قد میں ان سے بھی اونچا نکلا تھا۔ ذہین بھی وہ بہت تھا۔ پڑھائی

کے میدان میں بھی وہ ان سے آگے جا رہا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے لیے منزل کا تعین کیا اور اس تک پہنچنے کی پلاننگ بھی کی۔ ایم اے عربی وہ کر چکا تھا۔ اب اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کر رہا تھا.... اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ۔

حمید احمد اسے دیکھتے تو ہر دکھ' ہر پریشانی بھول جاتے۔ اسے دیکھتے تو اللہ کے لیے شکر ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا اور وہ اپنی مرحوم اماں کو یاد کرتے۔ اماں کو جتنا انہوں نے دیکھا تھا' دکھوں میں' غربت میں' پریشانیوں میں' مگر بس ایک ہی فکر کرتے دیکھا تھا۔ ان کی فکر.... اس لیے کہ وہ اپنے ابا کی نسل کو جاری رکھنے کا وسیلہ تھے۔ اور اب ان کا بھی یہی حال تھا۔ وہ وحید کو اس طرح دیکھتے' اس کی فکر ویسے ہی کرتے' جیسے اماں ان کے لیے کرتی تھیں۔ وہ ان کی نسل آگے بڑھانے کا وسیلہ تھا۔ وہ بہت اہم تھا ان کے لیے۔

وحید نے دودھ کا گلاس خالی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا "ابو.... دادی اماں.... میں چلتا ہوں۔"

"وِش یو آل دی بیسٹ!" حمید احمد نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

وحید کے جانے کے بعد اماں نے حمید احمد کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں "بس اب اس کی شادی کی فکر کرو حمید احمد۔" انہوں نے کہا "اللہ میرا یہ بہو والا ارمان بھی پورا کر دے۔ پھر میں سکون سے مر سکوں گی۔"

حمید احمد کے دل پر گھونسا سا لگا۔ تو اماں مدیحہ کے ملنے کے امکان سے دستبردار ہو گئیں۔ اپنے بہو کے ارمان کے لیے انہوں نے انہیں چھوڑ کر وحید سے آس لگالی۔ ٹھیک تو ہے "آپ مرنے کی بات نہ کیا کریں اماں۔"

اماں ان کے چہرے کی کیفیت دیکھ چکی تھیں۔ انہیں وہ بات منہ سے نکالتے ہی افسوس ہونے لگا تھا "اللہ میری اصل آرزو پوری کر دے تو کیا بات ہے۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "بہو تو بیٹے کی بیوی ہوتی ہے۔ پوتے کی بیوی میں وہ بات کہاں۔"

"مجھے تو بھول ہی جائیں اماں۔" حمید احمد کے لہجے میں تاسف تھا "ویسے بھی اب تو بڑھاپا آگیا ہے۔"

"بڑھاپا کیسا۔ ایک بات یاد رکھو حمید احمد۔ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔" اماں تیز لہجے میں بولیں۔ پھر انہوں نے تیزی سے گفتگو کا رخ بدلا "تمہاری دکان کیسی چل رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اماں۔ اب تو وہ جگہ سونے کی قیمت کی ہے۔ اور دکان بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔"

اماں نے پان کی تھالی لا کر ان کے سامنے رکھ دی "تم تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟"

حمید احمد نے پان بنایا اور اٹھا کر منہ میں رکھ لیا "آج دیر سے جاؤں گا اماں۔ دکان شعیب کھولے گا۔ رات میں چابی اسے دے آیا تھا۔"

"یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے تم پر۔ تمہیں قابلِ اعتماد ملازم مل گئے۔ لوگ ترستے ہیں اس نعمت کو۔"

"بے شک اماں۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ آٹھ سال پہلے انہوں نے وہ دکان خریدی تھی تو انہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور دکان کے لیے تو مشہور ہے کہ پہلے سال چٹی' دوسرے سال ہٹی اور تیسرے سال کھٹی۔ کہتے ہیں کہ تین سال ثابت قدمی سے ڈٹے رہو' تب کہیں دکان چلتی ہے۔ اب حمید احمد سوچتے تھے کہ شاید ایسا ہوتا تو وہ ٹھہر ہی نہیں پاتے۔ انہوں نے ایسے احساسات کے ساتھ کاروبار شروع کیا تھا' جو آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ انہیں احساس تھا کہ ان کی عمر ڈھل رہی ہے۔ وہ تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عدم تحفظ کا احساس بھی بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ تجارت کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ ایسے میں ایک اجنبی میدان میں قسمت آزمائی....!

لیکن اللہ کی مہربانی سے ان کی دکان ابتدا ہی سے چل پڑی۔ چند مہینوں میں یہ حال ہو گیا کہ وہ اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں رہا۔ پھر خوش قسمتی سے انہیں اچھے اور ایمان دار ملازم مل گئے۔ انہوں نے بھی ہمیشہ ان کو عزت دی' ان کی قدر کی اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اب وہ کفرانِ نعمت کرنے سے بہت ڈرتے تھے۔

ان آٹھ برسوں میں انہیں وہ معاشی استحکام ملا' جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکے تھے۔ اب تو صرف دکان ہی

بذریعہ ڈاک خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس | ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ | بیوٹی پارلر کورس

بوتیک فیشن | آٹو سروسنگ | ڈرافٹسمین | ایئر ٹکٹنگ | ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ

ریڈیو ٹی وی سی آر ٹیکنیشن | الیکٹریشن | ڈرائنگ ٹیچنگ | اسکول ٹیچنگ میتھڈ

انٹیریئر ڈیکوریشن | فوٹو گرافی | صحافت | امپورٹ ایکسپورٹ | شمسی توانائی

سلمنگ بیوٹی | کمپیوٹر | حکمت کورس | کوکنگ بیکنگ | موٹر سائیکل مرمت

آئل پینٹنگ | میڈیکل ایڈ | ڈینٹل ٹیکنیشن | لیڈیز ٹیلرنگ

ایگریکلچر سپروائزر (جدید زراعت) | پبلک ریلیشن آفیسر | نیوز رپورٹر | مہر سازی | فلاور میکنگ

یہ تمام کورسز اردو میں سینکڑوں تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک لڑکے لڑکیوں کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں

اسلام آباد اکیڈمی

پوسٹ بکس 1237 جی پی او اسلام آباد

لاکھوں کی تھی۔ اور ان کی ماہانہ آمدنی کا اوسط بھی لاکھ سے اوپر ہی تھا۔ مگر انہوں نے اپنا مکان اور رہن سہن نہیں بدلا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے مکان کو ڈھنگ سے بنوالیا۔ باقی ان کے طرزِ زندگی اور ان کے اخراجات میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ یہ سوچ کر پس انداز کرتے رہے کہ کبھی وحید کو ضرورت پڑسکتی ہے۔ سو اب ان کا بینک بیلنس لاکھوں میں تھا۔

اس اعتبار سے انہیں آسودہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بے حد نا آسودہ تھے۔ اس نا آسودگی کا سبب یہ نہیں تھا کہ مدیحہ ان کی زندگی میں نہیں آئی۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے تو ایسا کوئی خواب دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے تو ایک وعدہ کیا تھا اور وقت آنے پر اسے پورا کیا تھا۔ اس طرف سے بھی انہیں طمانیت تھی۔ نا آسودگی کا سبب صرف اور صرف محبت تھی۔ اور ایک سبب یہ تھا کہ وہ محبت کو آسودگی اور طمانیت فراہم کرنے والی نعمت کی حیثیت سے جانتے تھے۔

محبت کے بارے میں جو کچھ وہ جانتے تھے' وہ صرف کتابی تھا یا پھر ان کے پاس مدیحہ کا حوالہ تھا۔ ان دونوں حوالوں نے محبت کی کچھ اور ہی تصویر کھینچی تھی۔ شعر و ادب کے حوالے سے محبت ایک ایسا نہایت طاقت ور جذبہ تھا' جو آدمی کی کایا پلٹ کر دیتا تھا۔ وہ نزاکتِ فکر' سوچوں کی خوب صورتی اور حسن نظر کو فروغ دیتا تھا۔ وہ تخلیقی جوہر کو توانائی بخشتا تھا۔ وہ آدمی کو کہیں سے کہیں لے جاتا تھا۔ وہ انسان میں ایسے جذبے' ایسے خواص' ایسے اوصاف پیدا کرتا تھا کہ انسانیت بھی اس پر فخر کرنے لگے۔

اور مدیحہ کو دیکھ کر انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ آسودگی اور طمانیت کیا ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات سن کر انہیں بلاوجہ رشک نہیں آیا تھا۔ انہوں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ محبت نے ایک ٹین ایجر... ایک عام سی لڑکی کو کیسی قابلِ فخر بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور انہوں نے مدیحہ کو ہر مرحلے میں دیکھا تھا۔ سپردگی کی تو بات ہی اور ہے۔ اس کے تو اضطراب میں بھی ٹھنڈک اور سکون تھا۔ اس میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی' کڑواہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔ اس میں ضبط تھا' گہرائی تھی' ایثار کی خو تھی' خود نمائی کی لگن تھی۔ وہ بغیر احساس دلائے' بغیر سامنے آئے مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس میں بے غرضی تھی۔ خلوص تھا اور اس خلوص میں شدت تھی۔ اس میں پالینے کی' قابض ہوجانے کی ہوس نہیں تھی۔ تبھی تو انہوں نے محبت کی آرزو کی تھی!

لیکن انہیں محبت ہوئی تو پتا چلا کہ وہ ان کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ انہیں محبت ہوئی تو وہ پستی میں چلے گئے... ہر اعتبار سے۔ انہیں وہ پیشہ ترک کرنا پڑا' جس میں ان کی عزت اور توقیر تھی۔ وہ سرگرداں ہوئے۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرے۔ وہ گویا مٹی میں مل گئے۔ اور انہیں ملا کچھ بھی نہیں۔ نہ بے خودی' نہ سرمستی' نہ خوشی نہ سکون۔ انہیں ملا تو جلانے' بے چین کرنے والا اضطراب۔ انہیں ملا تو احساسِ نارسائی۔

مگر نہیں.... محبت نے ایک چیز ان کو دی.... تصور۔ ورنہ وہ کبھی تصوراتی آدمی نہیں رہے تھے۔ وہ تو بے حد عملی تھے۔ وہ کبھی کسی چیز کو پانے کی آرزو نہیں کرتے تھے۔ دل میں آرزو پیدا ہوتی تو وہ اس پر سوچتے۔ تخمینہ لگاتے۔ فیصلہ کرتے کہ وہ ان کے لیے ممکن ہے یا نہیں۔ ممکن ہوتا تو وہ اس کے لیے پے تلی کوشش شروع کردیتے۔ ان کے سامنے ایک ہدف ہوتا کہ وہ اتنے عرصے میں یہ چیز حاصل کرلیں گے اور اگر وہ ان کے خیال میں ممکن نہ ہوتا تو وہ اس کا خیال دل سے نکال دیتے۔ قصہ ختم۔ یہ ان کے مزاج میں نہیں تھا کہ وہ تصور میں اسے حاصل کریں اور اس پر خوش ہوں۔ یہ ان کے لیے منفی چیز تھی۔

مگر اس رات' جب وہ دن میں مدیحہ کے بنگلے پر گئے تھے اور انہیں پتا چلا کہ مدیحہ کا سراغ نہیں مل سکتا' وہ سونے کے لیے لیٹے تو ان کے تصور میں بڑا جیتا جاگتا منظر آگیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ مدیحہ کے روبرو مجرموں کی طرح کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنا خط اسے دیا ہے "یہ امانت تم تک پہنچانے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کہاں کہاں نہیں پھرا۔" وہ کہہ رہے ہیں۔

لیکن اس تصور میں بھی طمانیت' سکون' بے خودی' لذت.... کچھ بھی تو نہیں تھا ان کے لیے۔ مدیحہ نے خط پڑھا اور بڑی بے رخی سے انہیں دیکھا "سوری سر۔" اس کے لہجے میں بھی بے رخی تھی "میں بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ آپ کا مؤقف درست ہے۔ استاد اور شاگرد ہونے کی حیثیت سے مجھے اور آپ کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی آپ کی محبت سے توبہ کرلی تھی۔ آپ بھی توبہ کرلیں۔ اور ویسے بھی اب تو میری شادی ہونے والی ہے۔"

تصور میں حمید احمد پر جیسے گھڑوں پانی پڑگیا "توبہ میں نہیں کرسکتا۔" انہوں نے عاجزانہ لہجے میں کہا "کیونکہ ترکِ محبت میرے بس میں نہیں۔ اور میں تم سے شادی کی درخواست کرنے نہیں آیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا' وہ پورا کردیا ہے۔ یہ قرض تھا مجھ پر۔ میں صرف اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"آپ کس وعدے کی بات کررہے ہیں۔" مدیحہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ پھر اس نے کہا "ارے.... وہ.... مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ چلیں' ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر وہ جاگتے رہے۔ انہیں نیند نہیں آئی۔ سینے میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی' جو پانی پینے سے بجھنے والی نہیں تھی۔

اس خوب صورت داستان محبت کا آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمایئے

مجھے احساس ہے کہ یہ ایک عجیب کہانی ہے۔ میں خود بھی اسے نہیں سمجھ پایا ہوں۔ میں اس امید پر اسے جوں کا توں لکھ رہا ہوں کہ ممکن ہے کوئی قاری جو انسانی فطرت کی پیچیدگیوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہو، اسے سمجھ کر مجھے بھی سمجھا سکے۔

سب سے پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ یہ میری کہانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کہانی کے کرداروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ قصہ ایک شام مجھے میرے دوست نیڈ پریسٹن نے سنایا تھا۔ سنانے کی بھی وجہ یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اُسے یہ خوش فہمی تھی کہ میں اس مسئلے کو سمجھ کر اُسے کوئی مناسب مشورہ دوں گا۔

نیڈ کے بارے میں بھی مَیں آپ کو بتاتا چلوں۔ میرا یہ دوست وارم وُڈ جیل کا وزٹر ہے۔ وہ ایسا سوشل ورکر ہے، جو اپنے کام سے عشق کرتا ہے۔ قیدیوں کی پریشانی کو وہ اپنی پریشانی تصور کرتا ہے۔ اُن کے مسائل حل کرنے کے لئے وہ اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

اس روز ہم نے کیفے رائل میں کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد

اُسی ظالم سمرسٹ ماہم کے ذخیرے میں سے پس انداز کی گئی یہ کہانی کچھ اس طور شائع کی جارہی ہے کہ اس کی اشاعت پر ادارے کے مختلف احباب مختلف آراء رکھتے ہیں۔ جون ایلیا صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اعلیٰ ترین کہانی ہے اور اعلیٰ ترین ذوق رکھنے والے ذہین افراد ہی اس کہانی سے حظ حاصل کرسکتے ہیں۔ محی الدین نواب صاحب فرماتے ہیں کہ دماغ کی چولیں ہلا دینے والی یہ تحریر اگر یکسوئی سے پڑھی گئی تو کسی پڑھنے والے کو مایوسی نہ ہوگی۔ اقلیم علیم صاحب کو یہ کہانی اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اسے دس بار پڑھا اور کہا "اس کہانی پر کوئی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے بس اس سے لطف حاصل کیا جائے"۔ غلام قادر نے کہا کہ میں تو ماہم کے نام پر سب کچھ پڑھ سکتا ہوں اور اس سے لطف اُٹھا سکتا ہوں۔ ساجد امجد کہتے ہیں کہ اگر یہ سمرسٹ ماہم کی کہانی نہ بھی ہوتی تو میں اسے اعلیٰ درجے کی کہانی قرار دیتا لیکن ایک بات جو سب نے مشترکہ کہی وہ یہ کہ ہوسکتا ہے یہ سب پڑھنے والوں کی سمجھ میں شاید نہ آئے۔ ہم نے اس بات سے اختلاف کیا جس کا ثبوت ہے کہ کہانی کو شائع کیا جارہا ہے۔

گھٹن اور حبس کی یکسانیت سے اکتائے ہوئے نوجوان نے تازہ ہوا سے اپنا رشتہ کیسے باندھا؟

علیم الحق حقی

استعارہ

ہے کہ مناسب وقت پر ہوگی۔ جب وہ خوش حال ہو جائے گا۔ میرا ہربرٹ بے وقوف نہیں ہے۔ بہت سمجھ دار ہے۔"

مسٹر سبزی خاموش ہو گئے۔ یہ انہوں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ میڈائس کو بحث میں پلٹ کر جواب دینا ان کے لئے لاحاصل ہے۔

"میں شادی کے خلاف نہیں ہوں مگر شادی سے پہلے آدمی کو برے بھلے کی تمیز اور شعور ہونا چاہئے اور تمہیں پینتیس کی عمر سے پہلے یہ ممکن نہیں۔"

"وہ اپنے تحفے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہے۔" مسٹر سبزی نے موضوع بدلا۔

"ہونا بھی چاہئے" مسز سبزی اب بھی اپ سیٹ تھیں۔

تحفے واقعتاً بہت اچھے تھے۔ مسٹر سبزی نے اسے تحفے میں رسٹ واچ دی تھی جس کی سوئیاں اندھیرے میں بھی چمکتی تھیں اور مسز سبزی نے اسے پتنگ کا تحفہ دیا تھا۔

اور وہ کسی بھی اعتبار سے اس کی زندگی کی پہلی پتنگ نہیں تھی۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ سات سال کا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک پبلک پارک تھا۔ اکثر ہفتے کی سہ پہر کو جب موسم خوشگوار ہوتا تو مسز سبزی اپنے شوہر اور بیٹے کو پارک لے جاتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہفتے بھر دفتر کے گھٹے ماحول میں محنت کرنے کے بعد سوشیل کے لئے تازہ ہوا بہت ضروری ہے۔ پارک بہت بڑا تھا اور وہاں بہت زیادہ لوگ ہوتے تھے۔ مسز سبزی جو لئے دیئے رہنے کی عادی تھیں حتی الامکان خود کو لوگوں سے بچائے رہتیں۔

"ممی۔۔۔ ممی۔۔۔ وہ پتنگ" دیکھیں ایک دن ننھے ہربرٹ نے کہا۔

اس روز خوش گوار ہوا چل رہی تھیں اور آسمان پر چھوٹی بڑی۔۔۔ ہر طرح کی پتنگیں ہوا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

"دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ کیسے اڑائی جاتی ہیں؟" مسٹر سبزی نے پوچھا۔

"جی ہاں ڈیڈ۔"

پارک کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے پتنگ اڑانے والے لڑکے لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ پتنگ ہاتھ میں لے کر ٹیلے پر دوڑ رہے تھے تاکہ ہوا اُن کی پتنگوں کو اٹھا دے۔ کبھی ان کی پتنگیں اڑنے کے بجائے زمین پر گر جاتیں اور وہ اڑتیں تو اڑانے والے دھاگے سے ڈھیل دے کر انہیں اور تنا دیتے۔

ہربرٹ سحر زدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔

"ممی۔۔۔ مجھے پتنگ مل سکتی ہے؟" بالآخر اس نے کہا۔ یہ بات اس نے بہت پہلے سیکھ لی تھی کہ کوئی چیز درکار ہو تو ممی سے مانگنا ہی بہتر ہے۔

"کس لئے ہربرٹ؟"

"اڑانے کے لئے۔"

"بیٹا۔۔۔ اس میں ہاتھ کٹ بھی سکتا ہے۔"

مسٹر اور مسز سبزی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپکے سے مسکرائے۔ انہیں بیٹے کی اس فرمائش پر حیرت ہوئی تھی۔

"اگر تم اچھے لڑکے بنو گے اور میرے کہے بغیر ہر صبح باقاعدگی سے اپنے دانتوں کو صاف کرو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ سانتا کلاز کرسمس کے موقع پر تمہارے لئے پتنگ کا تحفہ نہ لے آئے۔" مسز سبزی نے کہا۔

کرسمس زیادہ دور نہیں تھا۔۔۔ اور پھر سانتا کلاز ننھے ہربرٹ کے لئے پہلی پتنگ لے آیا۔

ابتدا میں تو ہربرٹ کے لئے پتنگ سنبھالنا دشوار ہوا۔ مسٹر سبزی خود پتنگ لے کر ڈھلوان پر بھاگتے اور جب وہ بلند ہو جاتی تو ڈور اسے تھما دیتے۔ وہ بہت چھوٹی پتنگ تھی مگر جب ہربرٹ اسے فضا میں اڑتے، تیرتے اور غوطہ لگاتے دیکھتا اور اس کے ہاتھ کو پتنگ کے جھٹکے لگتے تو اس کے جسم میں جیسے برقی رَو دوڑنے لگتی۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ ننھا ہربرٹ ہفتے کے دن کا۔۔۔ سہ پہر کا انتظار کرنے لگا۔ باپ کے دفتر سے آتے ہی وہ ماں سے پارک چلنے کی ضد کرنے لگتا۔

جلد ہی وہ پتنگ اڑانا سیکھ گیا۔ مسٹر اور مسز سبزی ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُسے پتنگ لے کر نیچے کی طرف بھاگتے دیکھتے تو ان کے سینے فخر سے بھر جاتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہربرٹ کو پتنگ بازی سے عشق ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، ماں کی طرف سے ملنے والی پتنگیں بھی بڑی ہوتی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس فن میں طاق ہو گیا۔ ہوا کا رخ، ہوا کا مزاج وہ بہت اچھی طرح سمجھنے لگا۔ وہ پتنگ سے ایسے ایسے تماشے دکھاتا، جو بظاہر ممکن ہی نظر نہیں آتے تھے۔

پارک میں پتنگ اڑانے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ ان میں بچے ہی نہیں، عاقل و بالغ مرد بھی تھے۔ اور مشترکہ مشاغل سے زیادہ آسانی سے دنیا کی کوئی چیز انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب نہیں کرتی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف ہربرٹ اور مسٹر سبزی بلکہ مسز سبزی بھی وہاں موجود لوگوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ وہاں خود کو ماحول سے کٹا دیکھنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہاں سب اپنی اپنی پتنگوں کے بارے میں شیخیاں مارتے اور اپنی اپنی مہارت کے گن گاتے۔ موازنے ہوتے، مقابلے کی باتیں ہوتیں۔

ہربرٹ سولہ سال کا ہو گیا۔ اب وہ کبھی کسی پتنگ باز کو چیلنج کر دیتا۔ وہ اپنی پتنگ کو مخالف کی پتنگ کے ساتھ ہوا کے رخ پر اڑاتا۔ پھر وہ اپنی ڈور کو مخالف کی ڈور سے ملاتا اور ڈور کھینچتا۔ مخالف کی پتنگ کٹ جاتی۔

اس اثنا میں مسٹر سبزی کو بھی پتنگ اڑانے کا شوق ہو گیا

تھا۔ کبھی کبھی وہ بیٹے سے فرمائش کرتے کہ وہ انہیں بھی پتنگ اڑانے دے۔ دھاری دار پتلون پہنے پتنگ کو لے کر ڈھلوان کی طرف بھاگتے ہوئے وہ بہت عجیب سے لگتے۔ سر پر ہاؤلر ہیٹ بھی موجود ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے لپکتی مسز سبزی بھی اُن کے پیچھے ہوتیں۔ پتنگ اڑنے لگتی تو وہ ڈور شوہر کے ہاتھ سے لے لیتیں اور آہستہ آہستہ ڈھیل دیتے ہوئے' پتنگ اور اوپر..... اور اوپر جاتے دیکھتی رہتیں۔

یوں ہفتے کا دن..... خاص طور پر سہ پہر ان تینوں کے لئے خوشی کی علامت بن گیا۔ مسٹر سبزی اور ہربرٹ صبح ساتھ ہی گھر سے نکلتے تھے۔ وہ ایک ہی ٹرین میں سفر کرتے تھے۔ ہفتے کی صبح وہ نکلتے تو سب سے پہلے آسمان کو دیکھتے..... کہ موسم پتنگ بازی کے لئے سازگار ہے یا نہیں۔ انہیں وہ دن سب سے اچھے لگتے' جب تیز ہوا چل رہی ہوتی۔ ہوا کی مخمون مزاجی میں انہیں اپنی مہارت دکھانے کا بھرپور موقع ملتا تھا۔ پورے ہفتے شام کو وہ پتنگ بازی کے متعلق باتیں کرتے گھر واپس آتے۔ چھوٹی پتنگوں کا تذکرہ وہ حقارت سے کرتے اور اپنی پتنگ سے بڑی پتنگوں کے متعلق باتیں کرتے وقت ان کے لہجے میں حسد ہوتا۔ دوسرے پتنگ بازوں کی کارکردگی کے متعلق بہت تند و تیز و تلخ گفتگو ہوتی' جیسے فٹ بال کے کھلاڑی یا باکسر اپنے حریفوں کے متعلق کرتے ہیں۔ دونوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ایک دن اتنی بڑی پتنگ اڑائیں گے کہ کسی نے نہیں اڑائی ہوگی اور وہ اتنی بلندی تک اڑے گی کہ کسی کا تصور بھی وہاں تک نہیں جا سکے گا۔

ڈور استعمال کرنا تو وہ پہلے ہی ترک کر چکے تھے کیونکہ ہربرٹ کو اس کی اکیسویں سالگرہ پر انہوں نے جو پتنگ دی تھی' وہ سات فٹ اونچی تھی۔ اب وہ ڈور کی جگہ پیانو کا تار استعمال کرتے تھے' جسے انہوں نے ایک بڑے ڈرم پر لپیٹ رکھا تھا لیکن اس سے ہربرٹ کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ کسی نے باکس کائٹ ایجاد کی ہے۔ اس آئیڈیے میں اس کے لئے زبردست اپیل تھی۔ اب وہ خود باکس کائٹ بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ڈرائنگ اسے اچھی خاصی آتی تھی سو اس پر سہ جہتی پتنگ کا ڈیزائن بنانے کی دُھن سوار ہو گئی۔

اس نے سہ جہتی پتنگ کا ایک چھوٹا ماڈل تیار کیا اور اس کی آزمائش کی لیکن تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ ہربرٹ ضدی لڑکا تھا۔ شکست تسلیم کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس نے ٹھان لیا کہ پتنگ بنانے میں اُس سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اسے اس غلطی کو دور کرنا ہے۔

پھر ایک تبدیلی آئی۔

شام کی چائے کے بعد ہربرٹ باہر جانے لگا۔ مسز سبزی کو یہ تبدیلی ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن مسٹر سبزی نے معقولیت سے انہیں سمجھا دیا۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا اب بائیس سال کا ہے اور گھر بیٹھے

خوش خوراک

ایک خوش حال تاجر کو کسی معمولی جرم میں دو ہفتے کی قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ تاجر نے قید بھگتنے کو ترجیح دی تو اُس کے دوست حیران رہ گئے۔ انہوں نے تاجر سے کہا۔ "ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیوں نہیں ادا کر دیتے؟ ایسی بھی کیا کنجوسی!" تاجر نے وضاحت کی۔ "کنجوسی کی بات نہیں' دراصل آج ہی ہمارے باورچی نے دو ہفتے کی چھٹی لی ہے..... گھر پر رہوں گا تو بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا پڑے گا۔"

بیٹھے اس کا بور ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اگر وہ چہل قدمی کے لئے یا فلم دیکھنے کی غرض سے جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

لیکن ہربرٹ کیرئیر کے تیر کا نشانہ بن چکا تھا۔ ایک شام پارک میں بہت کامیاب وقت گزار کر آنے کے بعد وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اس نے اچانک کہا "ممی..... کل میں نے ایک لڑکی کو چائے پر مدعو کیا ہے۔ ٹھیک ہے ممی؟"

"کیا..... کیا تم نے کیا ہے؟" مسز سبزی یوں ہڑبڑائیں کہ گرامر بھی بھول گئیں۔

"آپ نے سن لیا ہے ممی۔"

"پوچھ سکتی ہوں کہ وہ لڑکی کون ہے اور تم اسے کیسے جانتے ہو؟" مسز سبزی نے تند لہجے میں پوچھا۔

"اس کا نام بیون ہے..... بنی بیون۔ ہفتے کی ایک شام' جب بارش ہو رہی تھی' وہ مجھے ایک سنیما ہاؤس میں ملی۔ بس اتفاق تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ گر گیا۔ میں نے اٹھا کر دے دیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا میرا..... اور پھر ظاہر ہے ہمارے درمیان بات چیت ہونے لگی۔"

"تو تم مجھے یہ بتا رہے ہو کہ تم اس فرسودہ پھندے کا شکار ہو گئے ہو؟ ہونہہ..... بیگ گر گیا اس کا....."

"آپ غلطی پر ہیں ممی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے..... بہت ہی اچھی۔ اور تعلیم یافتہ بھی ہے۔"

"یہ سب کچھ کب ہوا؟"

"کوئی تین ماہ پہلے کی بات ہے۔"

"اوہ..... تمہیں اس سے ملے تین ماہ ہو گئے..... اور اب تم کل اسے چائے پر بلا رہے ہو؟"

"بات یہ ہے..... کہ میں اس عرصے میں اُس سے ملتا رہا ہوں۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نے اسے فلم کی دعوت دی تھی..... منگل کی شام۔ اس نے کہا کہ یہ یقینی نہیں ہے۔ ممکن ہے' وہ آ سکے اور ممکن ہے وہ نہ آ سکے۔ لیکن وہ آ گئی بہرحال۔"

"وہ تو اسے آنا ہی تھا۔ تم مجھ سے پوچھ لیتے تو میں تمہیں بتا دیتی۔"

"اس کے بعد سے ہم ہفتہ میں دو بار ساتھ فلمیں دیکھتے رہے ہیں۔"

"تو اسی لئے تم کثرت سے گھر سے غائب رہتے تھے؟"

"جی ہاں' لیکن میری بات سنیں۔ میں اُسے آپ پر زبردستی نہیں تھوپنا چاہتا۔ میں اُس سے کہہ دوں گا کہ ممی کے سر میں درد ہے آج ـــــ اور کسی ریسٹورنٹ میں لے جاؤں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہاری ممی کو اس دعوت پر کوئی اعتراض نہیں" مسٹر سبزی جلدی سے بولے "بس بات اتنی سی ہے کہ تمہاری ممی اجنبیوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتیں۔ انہیں یہ کبھی اچھا نہیں لگا۔"

"میں خود کو اپنی حد تک رکھنے کی عادی ہوں" مسز سبزی نے اداسی سے کہا "وہ کرسٹی کیا ہے؟"

"شہر میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ ایک ہوم میں رہتی ہے' جسے گھر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اب ان کے تین بچے ہیں اور اس کی اپنی سوتیلی ماں سے نہیں بنتی۔ وہ کہتی ہے ـــــ ہر وقت چخ چخ ہوتی رہتی تھی۔"

مسز سبزی نے چائے کی اس دعوت کے سلسلے میں زبردست اہتمام کیا۔ انہوں نے ڈرائنگ روم میں چھوٹی میز سیٹ کی۔ انہوں نے اس پر بڑا نفیس میز پوش نکال کر بچھایا۔ پھر کراکری کا بھی خاص اہتمام کیا۔ وہ برتن نکالے' جو کبھی استعمال نہیں کئے جاتے تھے۔ پھر کیک بنایا۔ میٹھی ٹکیاں تلیں۔ ڈبل روٹی کے بہت پتلے سلائس تیار کئے۔

"میں اس پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ہم کوئی گئے گزرے لوگ نہیں ہیں۔" انہوں نے اپنے شوہر کو بتایا۔

ہربرٹ مس بیون کو لانے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مسٹر سبزی احتیاطاً دروازے پر جا کھڑے ہوئے کہ کہیں ہربرٹ اپنی دوست کو ڈائننگ روم میں نہ لے جائے' جہاں عام طور پر وہ لوگ کھانا کھاتے اور بیٹھتے تھے۔

ہربرٹ مس بیون کو لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس نے آراستہ میز کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہم ـــــ یہ بیٹی ہے۔" اس نے مسز سبزی سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے مس بیون" مسز سبزی نے تصحیح کی۔

"جی ہاں" مس بیون بولی "لیکن آپ مجھے بیٹی کہہ کر پکاریں۔"

"میرا خیال ہے ابھی ہماری شناسائی اتنی طویل نہیں ہوئی کہ میں ایسا کروں" مسز سبزی نے باوقار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے مس بیون۔"

عجیب بات یہ تھی ـــــ بلکہ شاید ہرگز عجیب نہیں تھی کہ بیٹی بیون بالکل ویسی تھی' جیسی مسز سبزی اس عمر میں رہی ہوں گی۔ اس کے نقوش بھی ویسے ہی تیکھے تھے اور آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ رخساروں پر ہلکا سا غازہ تھا اور سیاہ بال گھونگھریالے بنائے گئے تھے۔ مسز سبزی نے صرف ایک نظر میں یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ انہوں نے اس کے لباس کی قیمت کا تخمینہ بھی لگا لیا۔ مس بیون اونچی ایڑی کے قیمتی جوتے پہنے ہوئے تھی۔ سر پر جدید فیشن کا ہیٹ تھا۔ اس کی فراک بہت اونچی تھی' جس کی وجہ سے اس کی جلد کے ہم رنگ اسٹاکنگز کا بیشتر حصہ نظر آ رہا تھا۔ میک اپ اور لباس کی وجہ سے مسز سبزی نے اسے فوراً ہی ناپسند کر دیا لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا طرزِ عمل معزز خواتین کا سا ہی رکھیں گی۔ چنانچہ ابتدا میں تو معاملات ٹھیک چلتے رہے۔

مسز سبزی نے پیالیوں میں چائے انڈیلی اور ہربرٹ سے کہا کہ وہ اپنی دوست کو چائے پیش کرے۔

"سیموئیل ڈیئر' مس بیون سے پوچھو کہ یہ میٹھی ٹکیاں لیں گی یا ڈبل روٹی اور مکھن؟" انہوں نے شوہر سے کہا۔

"دونوں ہی لو ڈیئر۔" مسٹر سبزی نے بڑے پھوہڑپن سے دونوں پلیٹیں سب کے سامنے گھمائیں۔ "مجھے لوگوں کو کھاتے دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔" انہوں نے وضاحت کی۔

بیٹی نے ڈرتے ڈرتے ایک سلائس اور ایک میٹھی ٹکیہ طشتری پر رکھ لی۔ مسز سبزی نے بڑی تندہی سے موسم پر گفتگو شروع کر دی۔ انہیں یہ دیکھ کر طمانیت ہو رہی تھی کہ بیٹی لمحہ بہ لمحہ نروس ہوتی جا رہی ہے۔

پھر انہوں نے کیک کاٹا اور مہمان کی طرف ایک بہت بڑا ٹکڑا بڑھا دیا۔ بیٹی نے دانتوں سے ذرا سا کیک کاٹا اور طشتری میں رکھنے کی کوشش کی۔ ٹکڑا بڑا ہونے کی وجہ سے طشتری سے پھسل کر نیچے جا گرا۔

"اوہ ـــــ آئی ایم سوری" بیٹی نے کہا اور جھک کر کیک اٹھا لیا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایک اور پیس کاٹ دیتی ہوں تمہارے لئے۔" مسز سبزی نے کہا۔

"زحمت نہ کیجئے میں یہی کھا لوں گی۔ فرش بالکل صاف ہے۔"

"امید تو یہی ہے مجھے" مسز سبزی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری "لیکن میں تمہیں ایسا کیک کھلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی' جو فرش پر گر چکا ہو۔ یہ پیس ادھر دے دو ہربرٹ ـــ میں مس بیون کو اور پیس دیتی ہوں۔"

"مجھے کیک نہیں چاہئے مسز سبزی ـــ واقعی ـــ دل نہیں چاہ رہا میرا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرا کیک پسند نہیں آیا۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لئے بنایا تھا۔" مسز سبزی نے دانتوں سے پراٹھا کا ٹکڑا کاٹ کر چبایا "مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں مسز سبزی۔ کیک تو بہت اچھا ہے' بس مجھے خواہش نہیں ہے اس وقت" مس بیون نے اور چائے لینے سے بھی انکار کردیا۔ اس نے پہلی پیالی ہی یوں خالی کی' جیسے اس سے پیچھا چھڑا کر اُسے خوشی ہوئی ہو۔

مسز سبزی نے سوچا' لگتا ہے' یہ لوگ کھانا بھی کچن ہی میں کھاتے ہوں گے۔ ہربرٹ نے سگریٹ سلگا لیا۔

"ایک سگریٹ مجھے بھی دو ہربرٹ" بیٹی نے کہا "بہت طلب ہو رہی ہے۔"

مسز سبزی کو سگریٹ پینے والی عورتیں بہت بری لگتی تھیں۔ تاہم انہوں نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس بھویں اچکا کر رہ گئیں۔ پھر انہیں خیال آیا کہ بیٹی نے ان کے بیٹے کا نام بگاڑا ہے۔ "مس بیون' ہم اسے ہربرٹ کے نام سے پکارنا پسند کرتے ہیں" وہ بولیں۔

مس بیون بے وقوف نہیں تھی' اسے احساس ہو گیا تھا کہ مسز سبزی اسے اَپ سیٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔ اس بار اسے بھی جوابی حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا "جب اس نے مجھے اپنا نام ہربرٹ بتایا تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی کو ہربرٹ کے نام سے پکارا بھی جا سکتا ہے۔ مجھے تو چیخ معلوم ہوتا ہے یہ نام....."

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرے بیٹے کا وہ نام پسند نہیں آیا جو اسے اس کے بپتسمے کے موقع پر دیا گیا تھا۔ مجھے تو یہ نام اچھا لگتا ہے۔ اب یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کس طبقے کے لوگوں میں اٹھ بیٹھ رہے ہیں۔"

ہربرٹ نے جلدی سے مداخلت کی "آفس میں لوگ مجھے برٹی کہتے ہیں ممی۔"

"تو میں اُن کے لئے بھی یہی کہوں گی کہ وہ عام لوگ ہیں..... جاہل۔"

اتنا کہہ کر مسز سبزی یوں خاموش ہو گئیں جیسے اب بولنے میں مزید توہین کا اندیشہ ہو۔ گفتگو کا بوجھ مسٹر سبزی اور ہربرٹ کے کندھوں پر آن پڑا۔ مسز سبزی کو اس بات سے اور طمانیت حاصل ہوئی کہ بیٹی کو توہین کا احساس ہوا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گئیں کہ لڑکی یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے جان چھڑائے۔ خود انہوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں لڑکی کی کوئی مدد نہیں کریں گی۔

بالآخر ہربرٹ نے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے "بیٹی سے میرا خیال ہے اب چلا جائے" اس نے کہا "میں تمہیں گھر پہنچا آؤں گا۔"

"اتنی جلدی؟" مسز سبزی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد مسٹر سبزی نے کہا۔ "پیاری..... خوبصورت لڑکی ہے۔"

"خاک خوبصورت ہے" مسز سبزی نے بھنا کر کہا "میری بات لکھ لو۔ رنگ و روغن اتر جائے تو اندر کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ بہت عام سی لڑکی ہے۔ عام سی..... گندگی کی پوٹ۔"

ہربرٹ ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔

"دیکھیں ممی..... آپ کو غریب لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آپ نے مجھے بہت شرمندہ کرایا ہے۔"

"ہربرٹ..... تم اپنی ماں سے اس طرح بات کر رہے ہو۔" مسز سبزی کا لہجہ بھی شرربار تھا "تمہیں اس طرح کی عورت کو میرے گھر میں لانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ وہ عام سی لڑکی ہے..... گندگی کی پوٹ۔"

مسز سبزی جب بہت غصے میں ہوتی تھیں تو اُن کی گرامر تباہ ہو جاتی تھی مگر ہربرٹ نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا "وہ کہہ رہی تھی کہ زندگی میں اس کی کبھی اتنی توہین نہیں ہوئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھا بجھا کر منایا ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔"

"اچھا' اب میں صاف لفظوں میں کہہ رہی ہوں۔ آئندہ وہ میرے گھر میں کبھی قدم نہیں رکھے گی۔"

"یہ تو آپ کا خیال ہے۔ سن لیں کہ ہماری منگنی ہو گئی ہے۔ اب اس اطلاع کو دل میں اتاریں اور دھواں چھوڑتی رہیں۔"

مسز سبزی تو سانس لینا بھی بھول گئیں "نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔" سنبھلنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"یہ ہو چکا ہے۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے بے حد آزردہ دیکھا تو مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں نے اسے پرپوز کیا اور یقین کیجئے' اسے منانے اور قائل کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا۔"

"بے وقوف..... احمق" مسز سبزی چلائیں۔ اچھا خاصا سین ہو گیا۔ ماں بیٹے کے درمیان خوب تو تو میں میں ہوئی۔ سیموئیل نے مداخلت کی کوشش کی تو دونوں نے ہی بہت خراب لہجے میں اسے منہ بند رکھنے کو کہا۔

انجام کار ہربرٹ پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر نکل گیا اور مسز سبزی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اگلے روز پچھلے روز کے واقعے کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ مسز سبزی کا رویہ سرد اور نرم تھا۔ ہربرٹ بہت چپ چپ اور سوگوار تھا۔ شام کی چائے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہفتے اس نے اپنے والدین کو بتایا کہ شام کو اسے کچھ

مصروفیت ہے اس لئے وہ ان کے ساتھ پارک نہیں چل سکے گا۔
"ٹھیک ہے' تمہارے بغیر بھی ہمارا کام چل جائے گا" مسز سبزی نے کہا۔

ان کی ساحلی علاقے میں سالانہ تعطیلات کے دن قریب آرہے تھے۔ وہ لوگ ہمیشہ ہرن بے جاتے تھے۔ کیونکہ مسز سبزی کے خیال میں وہاں شرفا آتے تھے اور برسوں سے وہ ایک ہی جگہ قیام کررہے تھے۔

ایک شام ہربرٹ نے بے حد سرسری انداز میں کہا "ممّا ان لوگوں کو خط لکھ دیجئے گا کہ اس بار وہ میرے لئے کمرا نہ رکھیں۔ میں اور بنی شادی کررہے ہیں۔ ہم ہنی مون کے لئے ساؤتھ اینڈ جارہے ہیں۔"

ایک لمحے کو کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔
"بالکل اچانک فیصلہ کرلیا کیوں ہربرٹ؟" مسٹر سبزی پریشان ہوگئے۔

"جی ہاں' دراصل بنی کے دفتر میں چھانٹی ہورہی ہے۔ ہم نے سوچا' فوراً ہی شادی کرلیں۔ بنی کی بے روزگاری کا جھگڑا ہی نہ رہے۔ ہم نے ڈینبی اسٹریٹ میں دو کمروں کا مکان لے لیا ہے۔ میرے سیونگ بینک اکاؤنٹ کی رقم فرنیچر کی خریداری میں کام آرہی ہے۔"

مسز سبزی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ پہلے تو اُن کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ پھر اُن کے رخساروں پر موٹے موٹے آنسو لڑھکنے لگے۔

"چھوڑیں نا ممی۔ اسے اتنا بڑا مسئلہ نہ بنائیں" ہربرٹ نے کہا "کبھی نہ کبھی شادی تو ہر کسی کی ہوتی ہے نا۔ اگر ڈیڈی نے آپ سے شادی نہ کی ہوتی تو میں اس دنیا میں آتا۔ پیدا ہوتا بھلا؟"

مسز سبزی نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے "تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے شادی نہیں کی .... میں نے ان سے شادی کی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ عزت دار اور سیدھی راہ پر چلنے والے آدمی ہیں۔ میں جانتی تھی کہ یہ اچھے شوہر اور اچھے باپ ثابت ہوں گے۔ اور ہم دونوں کو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس شادی پر پچھتاوا نہیں ہوا۔ کیوں سیموئیل' ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے پیٹرا کس۔"

"میں ایک بات بتاؤں' آپ بنی کو قریب سے دیکھیں گی تو اسے پسند کئے بغیر نہیں رہیں گی۔ ممی' وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ ملیں گی تو دیکھیں گی کہ آپ میں اور اُس میں بہت سی باتیں' بہت سی عادتیں مشترک ہیں۔ آپ اسے ایک موقع تو دیں ممی" ہربرٹ نے کہا۔

"میری زندگی میں تو وہ اس گھر کی چوکھٹ پار نہیں کرسکتی۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آپ معقولیت سے کام لیں تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم پہلے کی طرح ہفتے کی سہ پہر پتنگ اڑانے جایا کریں گے۔ بس ابھی ذرا دشواری یہ ہے۔ اُس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ پتنگ اڑانا بھی کوئی شغل ہے۔ لیکن پھر اسے بھی لطف آنے لگے گا اور نہیں تب بھی میں آجایا کروں گا اور ہم تینوں پارک چلا کریں گے۔ یہ معقولیت کہلائے گی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ اس عورت سے شادی کے بعد تم میری پتنگ نہیں اڑا سکو گے۔ سمجھ لو کہ میں نے وہ پتنگ تمہیں نہیں دی۔ وہ جس پیسے سے خریدی گئی ہے' وہ میں نے گھر کے خرچ میں سے بچا بچا کے جمع کئے تھے' سال بھر میں۔ وہ پتنگ میری ہے' سمجھے؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ جانیں۔ بنی تو اسے بچوں کا کھیل قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے پتنگ اڑاتے ہوئے شرم آنی چاہئے..... اس عمر میں۔"

وہ اٹھا اور اس بار بھی پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔ پندرہ دن بعد اُس نے بنی سے شادی کرلی۔ مسز سبزی نے شادی میں شرکت سے انکار کردیا۔ انہوں نے سیموئیل کو بھی شریک نہ ہونے دیا۔ وہ معمول کے مطابق چھٹیاں گزارنے گئے اور واپس بھی آگئے۔ زندگی معمولات کے مطابق گزرنے لگی۔ ہفتے کی سہ پہر وہ دونوں پارک جاتے اور اپنی بہت بڑی پتنگ اڑاتے۔ مسز سبزی نے کبھی بیٹے کا نام بھی نہیں لیا۔ وہ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی لیکن مسٹر سبزی کی ٹرین میں بیٹے سے ملاقات ہوتی۔ جب بھی دونوں کو ایک ہی ڈبے میں سوار ہونے کا موقع ملتا' دونوں میں خوب ہی باتیں ہوتیں۔ ایک صبح مسٹر سبزی نے سر اٹھا کر آسمان دیکھا "آج تو پتنگ اڑانے کا موسم ہے۔" وہ بولے۔

"تو آپ اور ممی اب بھی پارک جاتے ہیں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تمہاری ممی بھی اب مجھ سے کم نہیں رہی۔ اسکرٹ میں پنیں لگائے' پتنگ ہاتھ میں لئے اسے ڈھلان پر دوڑتے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کے اندر بھی ایک پتنگ باز چھپا ہے اور یقین کرو' وہ مجھ سے بہتر دوڑتی ہے۔"

"مجھے ہنسنے پر مجبور نہ کریں ڈیڈی۔"

"ہربرٹ .... تم نے اپنے لئے پتنگ کیوں نہیں خریدی اب تک۔ میں تو حیران ہوں تمہیں تو بہت شوق تھا پتنگوں کا۔"

"اب بھی ہے۔ میں نے ایک بار اس سلسلے میں بات بھی کی۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عورتیں کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ بنی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ بچے نہ بنو' اور نہ جانے کیا کیا..... ویسے بھی ڈیڈی میں بچوں والی پتنگ تو خریدنے سے رہا۔ مجھے تو بڑی پتنگ چاہئے۔ اور وہ مہنگی ہوتی ہے۔ ہم فرنیچر خرید رہے تھے تو بنی نے کہا' سستا روئے بار بار' مہنگا روئے ایک بار۔ سو ہم نے قسطوں پر فرنیچر لیا۔ ہر ماہ اس کی قسط دینا ہوتی ہے۔ اس کے بعد اتنی رقم بچتی

ہے کہ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک کے خرچ پر دو کا گزارہ بآسانی ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈیڈی..... میرا اب تک کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔"

"تو بیٹی کام نہیں کر رہی ہے؟"

"وہ کہتی ہے' برسوں گدھے کی طرح محنت کرنے کے بعد اب تو ذرا آرام کرنے کا موقع ملا ہے اور ویسے بھی گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا..... یہ بھی تو کسی کو کرنا ہے۔"

یہ ہربرٹ اور بیٹی کی شادی کے چھ ماہ بعد کی بات ہے۔ مسٹر اور مسز سبزی پارک میں تھے۔ وہ ہفتے کی سہ پہر تھی۔ اچانک مسز سبزی نے اپنے شوہر سے کہا "سیموئیل' جو میں دیکھ رہی ہوں' تمہیں بھی نظر آ رہا ہے؟"

"اگر تمہارا اشارہ ہربرٹ کی طرف ہے تو میں نے اسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ کہا اس لئے نہیں کہ میں تمہیں اَپ سیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ظاہر نہ ہونے دو کہ تم نے اسے دیکھ لیا ہے" مسز سبزی نے ہدایت دی۔

ہربرٹ تماشائیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس نے ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن یہ بات مسز سبزی کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی کہ ہربرٹ کی نظریں اس بڑی پتنگ کے ساتھ حرکت کر رہی ہیں' جسے وہ بارہا اڑا چکا تھا۔

پھر خنکی بڑھ گئی۔ مسٹر اور مسز سبزی گھر واپس آ گئے۔ مسز سبزی کا چہرہ چمک رہا تھا' آنکھوں میں شرارت تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں' کیا وہ اگلے ہفتے آئے گا" مسٹر سبزی نے کہا۔

"اگر میں شرط لگانے کو برا نہ سمجھتی تو ایک پاؤنڈ کی شرط لگاتی کہ وہ ضرور آئے گا۔ میں تو کب سے اُس کی منتظر تھی۔" مسز سبزی نے کہا۔

"منتظر تھیں؟"

"میں ابتدا ہی سے جانتی تھی کہ وہ پارک اور پتنگوں سے دور نہیں رہ سکے گا" مسز سبزی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ان کی بات درست ثابت ہوئی۔ نہ صرف اگلے ہفتے بلکہ اس کے بعد ہر اس ہفتے جب موسم پتنگ بازی کے لئے سازگار تھا' ہربرٹ پارک میں آیا۔ لیکن ان کے درمیان کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ وہاں کھڑا ہو کر انہیں دیکھتا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جاتا۔ چند ہفتے اسی انداز میں گزر گئے۔

پھر ایک روز مسٹر اور مسز سبزی نے ہربرٹ کو حیران کر دیا۔

اس روز انہوں نے وہ پتنگ نہیں اڑائی' جس کا وہ عادی تھا۔ اُس روز ان کے پاس نئی باکس کائٹ تھی..... چھوٹی..... اُسی ماڈل کی جو اس نے خود ڈیزائن کی تھی..... سہ جہتی پتنگ!

فرقِ اصطلاح

جج نے ملزم سے پوچھا "تم اپنی بیوی کو چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے تھے؟"

ملزم بولا "جناب والا' اگر آپ میری بیوی سے اتنے ہی واقف ہوتے جتنا میں ہوں تو آپ مجھے کبھی بھگوڑا نہ کہتے' اصل میں میں بھگوڑا نہیں' پناہ گزین ہوں۔"

اور ہربرٹ نے دیکھا کہ اس پتنگ نے پارک میں ہلچل مچا دی تھی۔ دوسرے پتنگ باز بھی اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ ان کے گرد جمع ہو گئے اور مسز سبزی پُرجوش لہجے میں بولے جا رہی تھیں۔

پہلی بار سیموئیل اس پتنگ کو لے کر دوڑا۔ پتنگ نہیں اڑی۔ وہ پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر آ گری۔ ہربرٹ نے دانت پر دانت جما لئے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس پتنگ کی ناکامی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ مسٹر سبزی پھر ٹیلے پر چڑھے۔ اس بار پتنگ فضا میں بلند ہو گئی' تماشائی تالیاں بجانے لگے۔ کچھ دیر بعد مسٹر سبزی نے پتنگ اتار لی اور اسے لے کر ٹیلے کی طرف چل دیے۔ مسز سبزی اپنے بیٹے کی طرف بڑھ گئیں۔

"تم نہیں اڑاؤ گے ہربرٹ؟" انہوں نے پوچھا۔

ہربرٹ کی سانسیں رک گئیں "ہاں مما..... جی تو چاہتا ہے۔"

"یہ چھوٹی ہے۔ بنانے والوں کا کہنا ہے کہ پہلے اس کے عادی ہو جائیں پھر بڑی پتنگ اڑائیں۔ بہرحال ہم نے بڑی پتنگ کا بھی آرڈر دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب وہ پتنگ ہماری سمجھ میں آ جائے گی اور ہوا بھی مناسب ہو گی تو دو میل اوپر جا سکے گی۔"

مسٹر سبزی بھی ان کے پاس چلے آئے۔

"سیموئیل..... ہربرٹ پتنگ اڑانا چاہتا ہے" مسز سبزی نے انہیں بتایا۔

مسٹر سبزی نے پتنگ ہربرٹ کو تھما دی۔ ہربرٹ کے ہونٹوں پر مسرت بھری مسکراہٹ تھرکی۔ اس نے اپنا ہیٹ ماں کو تھما دیا۔ پھر وہ پتنگ لے کر دوڑا۔ پتنگ بہت خوبصورتی سے اٹھی۔ اسے بلند ہوتے دیکھ کر ہربرٹ کا سینہ خوشی سے بھر گیا۔ اس چھوٹی سیاہ سہ جہتی پتنگ کو فضا میں خوبصورتی سے تیرتے دیکھنا بے حد خوش کن تھا لیکن ہربرٹ کے تصور میں تو وہ بڑی پتنگ لہرا رہی تھی' جس کا ممی ڈیڈی نے آرڈر دے دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ پتنگ ممی ڈیڈی کے بس کی تو ہرگز نہیں ہو گی۔ دو میل اوپر!

"ہمارے ساتھ گھر چلو نا ہربرٹ" مسز سبزی نے کہا "چائے پی کر چلے جانا۔ ہم تمہیں اس پتنگ کا ڈیزائن بھی دکھا دیں گے' جو

ہم بنوا رہے ہیں۔ ممکن ہے تم کوئی اچھی تجویز دے سکو۔"

ہربرٹ ہچکچایا۔ اس نے بیٹی سے کہا تھا کہ وہ چہل قدمی کے لئے جا رہا ہے ذرا ٹانگیں ہی کھل جائیں۔ بیٹی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ ہر ہفتے پارک آتا ہے۔ سو اب وہ اس کی منتظر ہوگی لیکن ترغیب بے حد طاقت ور تھی۔ وہ مزاحمت نہ کر سکا۔

"کیوں نہیں مم" اس نے کہا۔

چائے کے بعد وہ ڈیزائن کا معائنہ کرنے بیٹھے۔ پتنگ بہت بڑی تھی اور اس میں بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق اس نے کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ بہت مہنگی پتنگ تھی۔

"آپ لوگ اسے اُڑا نہیں سکیں گے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ مجھے اپنی مدد کی اجازت نہیں دیں گے ... کم از کم شروع میں۔" ہربرٹ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آئیڈیا برا نہیں۔" مسز سبزی نے کہا۔

ہربرٹ اپنے گھر پہنچا تو بہت دیر ہو چکی تھی... اس کے اندازے سے بہت زیادہ دیر! بیٹی کا موڈ بے حد خراب تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم ہرب؟ میں تو سمجھی مر گئے ہو۔ کھانا رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا۔" وہ غرائی۔

"راستے میں کچھ دوست مل گئے تھے۔ باتوں میں دیر ہو گئی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔"

بیٹی نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ مگر مزید کچھ نہیں کہا۔

کھانے کے بعد ہربرٹ نے فلم دیکھنے کے لئے چلنے کی تجویز پیش کی لیکن بیٹی نے انکار کر دیا "تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ میرا موڈ نہیں ہے۔"

○——□——○

اگلے ہفتے ہربرٹ پھر پارک گیا۔ ممی نے اسے پتنگ اڑانے کی اجازت دے دی۔ نئی..... بڑی پتنگ تین ہفتے بعد آنے والی تھی۔

اچانک ممی نے کہا "وہ بھی موجود ہے۔"

"کون بیٹی؟" ہربرٹ بری طرح چونکا۔

"ہاں..... تمہاری جاسوسی کر رہی ہے۔"

ہربرٹ کو گھبراہٹ ہونے لگی لیکن ظاہری طور پر وہ بہادر بن گیا۔ "کرنے دیں جاسوسی۔ مجھے پروا نہیں۔"

لیکن وہ نروس تھا۔ اس نے چائے کی پیشکش قبول نہیں کی وہ سیدھا گھر چلا گیا۔ وہاں بیٹی اُس کی منتظر تھی۔

"تو یہ ہیں وہ دوست جو پچھلے ہفتے تمہیں راستے میں مل گئے تھے۔ جن سے باتوں میں تمہیں وقت کا پتا ہی نہیں چلا" بیٹی نے طنز کیا "مجھے عرصے سے شک تھا کہ یہ ہر ہفتے کی سہ پہر چہل قدمی کیسی۔ آج پتا چل ہی گیا۔ شرم نہیں آتی اتنے بڑے ہو کر پتنگ اڑاتے ہو۔ میں تو اسے قابلِ نفرت ہی کہوں گی۔"

"جو جی چاہے کہو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا۔ تم اڑاتیں بھی نہیں پتنگ۔"

"میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔ میں تمہیں خود کو بے وقوف بنانے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"میں بچپن سے اب تک ہر ہفتے پتنگ اڑاتا رہا ہوں..... اور جب تک میرا دل چاہے گا اڑاتا رہوں گا۔"

"یہ سب اس بڈھی کتیا کا کیا دھرا ہے" بیٹی آپے سے باہر ہو گئی "وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں خوب جانتی ہوں اُسے۔ اگر تم مرد ہوتے تو زندگی بھر کبھی اُس سے بات نہ کرتے۔ دیکھ چکے ہو کہ اس نے کتنا خراب سلوک کیا تھا میرے ساتھ۔"

"زبان سنبھال کر بیٹی۔ ورنہ بتیسی گرا دوں گا تمہاری۔ وہ میری ماں ہے۔ میرا جب جی چاہے گا اس سے ملوں گا۔"

یہ جھگڑا گھنٹوں چلتا رہا۔ دونوں ایک دوسرے پر گرجتے برستے رہے۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو دونوں کے درمیان پہلے بھی ہوتے رہے تھے کیونکہ دونوں ہی ضدی تھے لیکن یہ پہلا سنگین جھگڑا تھا۔ اتوار کے روز دونوں نے ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں بھی یہی کیفیت رہی۔ باہر سے وہ پُرسکون تھے لیکن اندر اندر کھول رہے تھے۔

اگلے دو ہفتے ایسے آئے کہ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ بیٹی دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ ہربرٹ کو اگر بارش سے مایوسی ہوئی تھی تو اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ جھگڑے کی یادیں دھندلاتی گئیں۔ وہ دو کمروں کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک بیڈ پر سوتے تھے۔ ایسے میں اختلافات بھلانے ہی پڑتے ہیں۔ پھر بیٹی نے بھی اپنے مزاج کے خلاف اپنے ہرب کے لئے اپنا رویّہ نرم کر لیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ہرب نے اس کی زبان کی دھار دیکھ لی ہے اور سمجھ لیا ہے کہ وہ کسی سے زیر ہونے والی نہیں۔ چنانچہ اب وہ اپنا رویّہ درست کر لے گا۔ ویسے وہ اچھا شوہر ہے۔ کھلے دل کا مہربان آدمی ہے۔ کردار کے اعتبار سے بھی لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ سبق کام آئے گا اور اب وہ قابو میں ہی رہے گا۔

لیکن دو ہفتے بعد موسم کے مزاج درست ہو گئے۔

جمعے کو باپ بیٹے ٹرین میں ملے "ایسا لگتا ہے۔ کل موسم پتنگ اڑانے کے لئے بہترین ہوگا" مسٹر سبزی نے کہا "اور ہاں نئی پتنگ بھی آ گئی ہے۔"

"واقعی؟"

"تمہاری ممی نے کہلوایا ہے کہ تمہاری مدد ہمارے لئے خوشی کا باعث ہوگی لیکن میاں بیوی کے درمیان مداخلت کا کسی کو حق نہیں۔ اگر تم بیٹی سے خوف زدہ ہو..... میرا مطلب ہے اس کی زبان بہت دراز ہے نا..... تو بہتر ہوگا کہ تم نہ آؤ۔ پارک میں

آنے والوں میں ایک لڑکا ہے' جسے ہماری نئی پتنگ نے پاگل کر رکھا ہے' وہ ہماری مدد کرے گا۔"

ہربرٹ کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی "آپ کسی اجنبی کو ہماری پتنگ کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مگر نہ کریں میں وہاں پہنچ جاؤں گا" ہربرٹ نے تیز لہجے میں کہا۔

"بہرحال ہربرٹ..... تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔" مسٹر سبزی نے کہا "اگر تم نہ بھی آئے تو ہم کوئی خیال نہیں کریں گے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔"

اگلے روز وہ دفتر سے گھر پہنچا اور فوراً ہی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اسی وقت بیٹی بیڈ روم میں چلی آئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کپڑے بدل رہا ہوں۔" ہربرٹ نے خوش دلی سے کہا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ اپنا راز اپنی حد تک رکھنے کا اُسے خیال ہی نہیں آیا۔ "نئی پتنگ آگئی ہے۔ میں اسے اڑانے جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم ہرگز نہیں جاؤ گے۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔"

"بے وقوف نہ بنو بیٹی۔ میں جا رہا ہوں۔ اور اگر تمہیں یہ بات پسند نہ آئے تو جو جی چاہے کرو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"میں تمہیں جانے ہی نہیں دوں گی۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور اس کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اور اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔

وہ مختصر سی تھی اور ہربرٹ طویل القامت اور مضبوط۔ ہربرٹ نے اس کے دونوں کندھے تھام لئے کہ اسے راستے سے ہٹا دے مگر بیٹی نے اسے لاتیں مارنا شروع کر دیں۔

"تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے جبڑے پر گھونسا رسید کر دوں؟" ہربرٹ نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

"اگر جا رہے ہو تو یہاں کبھی قدم نہ رکھنا۔" بیٹی چلائی۔

بیٹی ہاتھ پاؤں چلاتی رہی۔ ہربرٹ نے اسے اٹھایا اور لے جا کر بیڈ پر پٹخ دیا پھر وہ گھر سے نکل آیا۔

○——□——○

چھوٹی باکس کائٹ نے اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی لیکن بڑی باکس کائٹ کے معاملے میں اس کی حالت بیان سے باہر تھی۔ ہاں..... اس پتنگ کو قابو میں رکھنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ہانپ گئے۔ دوسرے لوگ بھی ان کی مدد کر رہے تھے۔ اس کے باوجود پتنگ اڑائی نہیں جا سکی۔

"کوئی بات نہیں۔" ہربرٹ نے کہا "جلد ہی ہم اس کے عادی ہو جائیں گے۔ آج ہوا بھی مناسب نہیں ہے" وہ ماں باپ کے ساتھ گھر چلا گیا۔ چائے کے دوران وہ بیتے دنوں کی طرح آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ہربرٹ دانستہ وہاں زیادہ دیر رکا۔ وہ بیٹی کے ڈرامے سے حتی الامکان بچنا چاہ رہا تھا۔ لیکن جب مسز سبزی کھانا پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی تو اُسے بھی گھر جانے کے لئے اٹھنا ہی پڑا۔

وہ گھر پہنچا تو بیٹی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "تمہارا بیگ میں نے تیار کر دیا ہے۔" وہ بولی۔

"کیا..... میرا بیگ؟"

"تم جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں نے کہا تھا' جا رہے ہو تو یہاں واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا سارا سامان میں نے پیک کر دیا ہے۔ بیڈ روم میں رکھا ہے اٹھا لو۔"

ہربرٹ نے ایک لمحے کو اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی بات کہہ کر بظاہر پھر اخبار پڑھنے میں منہمک ہوگئی تھی۔ ہربرٹ کا جی چاہا کہ اس کی اچھی طرح ٹھکائی لگائے لیکن اس نے خود پر قابو پالیا۔ "ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ بیڈ روم میں گیا۔ اس کے کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر دیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کاغذ کا ایک پارسل تھا جس میں بیٹی نے اس کی چھوٹی موٹی چیزیں یکجا کر دی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں پارسل سنبھالا اور ڈرائنگ روم سے گزرتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس نے بیٹی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ سیدھا ماں کے گھر گیا اور گھنٹی بجائی۔ ماں نے دروازہ کھولا۔

"میں واپس آگیا ہوں ممی۔"

"اوہ..... ٹھیک ہے۔ تمہارا کمرا تیار ہے۔ سامان رکھو اور نیچے آجاؤ' ہم بس کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے ہی والے تھے۔"

ہربرٹ اوپر گیا۔ مسز سبزی ڈائننگ روم میں چلی گئیں۔ "سنو..... ہربرٹ واپس آگیا ہے" انہوں نے اپنے شوہر سے جلدی سے کہا "جلدی سے جاؤ اور بیئر لے آؤ۔"

کھانے کے دوران ہربرٹ نے انہیں بیٹی سے اپنے تعلقات کے متعلق تفصیل سے بتایا۔

"چلو ہربرٹ۔ اچھا ہوا' آسانی سے جان چھوٹ گئی۔" مسز سبزی نے سب کچھ سننے کے بعد کہا "میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ وہ عام سی لڑکی ہے..... گندگی کی پوٹ' جب کہ تمہیں اچھی تربیت دی گئی۔ مہذب طور طریقے سکھائے گئے۔"

ہربرٹ کو اپنے پرانے بستر میں سونا بہت اچھا لگا۔ گزری ہوئی خوش گوار زندگی یاد آگئی۔ صبح وہ ناشتے کے لئے آیا اور ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتا رہا۔

"آج ہم چرچ نہیں جائیں گے" مسز سبزی نے کہا "ہم آج ایک خوش گوار دن گزاریں گے..... ہلکا پھلکا۔ ہربرٹ بہت پریشان ہے نا۔"

اس ہفتے پتنگ موضوعِ گفتگو بنی رہی لیکن بیٹی کے متعلق بھی

وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ بیٹی کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

"وہ تمہیں واپس لے جانے کی کوشش کرے گی۔" مسز بنری نے بیٹے سے کہا۔

"اس کا تو اب کوئی سوال ہی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے۔" ہربرٹ نے کہا۔

"لیکن تمہیں اسے خرچا تو دینا ہوگا۔" مسٹر بنری بولے۔

"کیوں..... یہ کیوں دینے لگا" مسز بنری چلا اٹھیں "اس نے اسے پھنسا کر اس سے شادی کی اور اب اسے اس کے ہی گھر سے نکال باہر کیا۔"

"بس وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ میں اس کا حق اسے دیتا رہوں گا" دن بہ دن ہربرٹ خود کو بہتر اور زیادہ پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اب تو اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس گھر سے کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ اس کا حال اس پرندے کا سا تھا' جو بھٹک کر کہیں نکل گیا ہو اور اب اپنے آشیانے میں واپس آیا ہو۔ ماں پہلے کی طرح اس کے کپڑوں کا خیال رکھتی' اس کے موزوں کی مرمت کرتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ کھانا اسے اپنی مرضی۔ اپنی پسند کا ملتا' جو وہ ہمیشہ سے کھاتا آیا تھا۔ بیٹی کو کھانا پکانا آتا ہی نہیں تھا۔ ڈبوں کا کھانا چلتا تھا۔ شروع میں تو اسے اچھا لگا۔ چٹنک کا سا لطف آتا تھا۔ مگر پھر وہ بے زار ہوگیا۔ اس کی ماں نے ہمیشہ اسے تازہ کھانا کھلایا تھا۔ کچھ ہی دن بعد غذا کے ڈبے دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا تھا۔ اب پھر گھر کا کھانا میسر آگیا تھا۔ دوسری طرف وہ دو کمروں کے اس چھوٹے سے مکان میں خود کو گھٹا گھٹا محسوس کرتا۔ دو کمرے..... اور ان میں سے ایک بچن کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اب اپنا پرانا گھر اسے بہت کھلا کھلا محسوس ہوتا۔

"میں نے زندگی میں اس سے بڑی غلطی نہیں کی' جو اپنا گھر چھوڑ کر کی تھی ممی۔" اس نے ایک روز کہا۔

"میں جانتی ہوں ہربرٹ۔ لیکن اب تم واپس آگئے ہو اور کوئی وجہ نہیں کہ اب کبھی یہ گھر چھوڑو۔"

اسے جمعے کو تنخواہ ملتی تھی۔ اس شام وہ چائے پی رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

"یہ وہی ہے۔" تینوں نے بیک آواز کہا۔

ہربرٹ کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ مسز بنری نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی "تم گھبراؤ نہ کہو۔" انہوں نے کہا "میں ملوں گی اس سے۔"

انہوں نے جا کر دروازہ کھولا۔ چوکھٹ پر بیٹی کھڑی تھی۔ اس نے اندر گھسنے کی کوشش کی مگر مسز بنری نے اسے روک لیا۔

"مجھے ہربرٹ سے ملنا ہے۔"

"تم اس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں' وہ گھر میں ہے۔ وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا اور اب تک باہر نہیں نکلا ہے۔"

"تو کان کھول کر سن لو۔ وہ تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ اب تم نے پریشان کیا تو پولیس کو فون کر دوں گی میں۔"

"مجھے ہفتے بھر کا خرچ چاہیے۔"

"یہی ایک چیز تو چاہتی ہو تم اس سے۔" مسز بنری نے اپنا پرس کھولا اور اس کی طرف پیسے بڑھائے۔ "یہ ہیں تمہارے ۳۵ شلنگ۔"

"۳۵ شلنگ؟ ۳۵ شلنگ تو صرف کرایہ ہے مکان کا۔"

"بس یہی کچھ مل سکتا ہے تمہیں۔ وہ یہاں رہ رہا ہے تو یہاں بھی تو خرچا دینا پڑتا ہے اسے۔"

"اور فرنیچر کی قسط کا کیا ہوگا؟"

"جب اس کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ اب یہ ۳۵ شلنگ لے رہی ہو یا رکھ لوں پرس میں۔" بیٹی شکست خوردہ' افسردہ اور الجھن زدہ سی سر جھکائے قدم جمائے کھڑی رہی۔ مسز بنری نے پیسے زبردستی اس کی مٹھی میں ٹھونس دیے اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ ڈائننگ روم میں واپس آگئیں۔ گھنٹی پھر بجی..... اور بجتی ہی چلی گئی لیکن انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بالآخر گھنٹی خاموش ہوگئی۔ شاید بیٹی چلی گئی تھی۔

"میں نے دماغ درست کر دیا ہے اس کا۔"

اگلے روز موسم بہت اچھا تھا۔ ہوا کا مزاج بھی مناسب ترین تھا۔ وہ پارک چلے گئے۔ دو تین بار کی ناکامی کے بعد ہربرٹ کا ہاتھ جم گیا۔ دیو قامت باکس کائٹ فضا میں بلند ہوگئی۔ بلند کیا ہوئی' تنتی ہی چلی گئی۔

"وہ خدایا... یہ کم از کم ایک میل اوپر تو ہے۔" ہربرٹ نے سنسنی آمیز لہجے میں ماں سے کہا۔

ایسا تھرل اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ باپ کے مشورے پر ہربرٹ نے بیوی کو ایک خط لکھا۔ "اگر تم مجھے یا میرے گھر والوں کو تنگ نہیں کرو گی تو تمہیں ہر سنیچر کی صبح ۳۵ شلنگ کے پوسٹل آرڈر مل جایا کریں گے۔ اس کے علاوہ فرنیچر کی قسط بھی باقاعدگی سے ادا کر دی جائے گی۔"

مسز بنری نے اس کی بڑی مخالفت کی لیکن زندگی میں پہلی بار مسٹر بنری اپنے موقف پر ڈٹ گئے۔ اور ہربرٹ بھی ان سے متفق تھا۔

اس وقت تک ہربرٹ نئی باکس کائٹ پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ اس سے طرح طرح کے کرتب دکھانے پر بھی قادر ہو چکا تھا۔ اب وہ دوسرے پتنگ بازوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بچے تھے۔ اس کی اپنی کوئی کلاس ہی نہیں تھی۔ ہفتے کی سہ پہر اس کے لئے سرشاری کے لمحات لاتی۔ پتنگ بلند ہوتی تو تماشائیوں کے نعرے' ان کی نگاہوں میں ستائش اور حسد کے ملے جلے تاثرات اسے فتح مندی کا احساس دلاتے۔

ایک شام وہ باپ کے ساتھ اسٹیشن سے واپس آرہا تھا کہ بیٹی

نے اس کا راستہ روک لیا۔ "ہیلو ہربرٹ۔"

"ہیلو۔"

"مسٹر سبزی' میں اپنے شوہر سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی جو تم میرے ڈیڈی کے سامنے نہ کر سکو۔" ہربرٹ نے بے پروائی سے کہا۔

وہ ہچکچائی۔ مسٹر سبزی الگ پریشان تھے کہ رکیں یا آگے بڑھ جائیں۔ بالآخر بیٹی نے کہا "چلو بھی سہی۔ ہربرٹ' میں چاہتی ہوں کہ تم گھر واپس آجاؤ۔ جس رات میں نے تمہارا سامان پیک کیا' میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔ مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ میں تو بس تمہیں ڈرانا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے کیے پر افسوس ہے۔ ایک پتنگ کے پیچھے جھگڑا کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔"

"میں واپس نہیں آؤں گا بیٹی۔ تم نہیں جانتیں' تم نے زندگی میں میری بھلائی کا ایک یہی کام کیا ہے... مجھے گھر سے نکال کر..."

بیٹی کے آنسو رخساروں کو بھگونے لگے "لیکن ہربرٹ' میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس تم واپس آجاؤ۔ بے شک بچوں کی طرح پتنگ اڑاتے رہو' میں کبھی اعتراض نہیں کروں گی۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب میں دیکھ چکا ہوں کہ ازدواجی زندگی کیسا عذاب ہوتی ہے۔ میں اب زندگی بھر شادی کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔ آیئے ڈیڈی..." وہ دونوں تیز قدموں سے چل دیے۔ بیٹی نے ان کے پیچھے آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اگلے اتوار کو وہ چرچ گئے۔ کھانے کے بعد ہربرٹ پتنگ پر ایک نظر ڈالنے کوئلے کے شیڈ میں گیا' جہاں پتنگ رکھی جاتی تھی۔ ہربرٹ کو پتنگ سے ایسا عشق تھا کہ وہ دن میں ایک بار اُسے ضرور دیکھتا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ شیڈ سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔

"اس نے پتنگ تباہ کر دی۔ توڑ پھوڑ دی... اس کلہاڑی سے۔"

مسٹر اور مسز سبزی کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ بھی کوئلے کے شیڈ کی طرف لپکے۔ ہربرٹ کی بات درست ثابت ہوئی۔ اتنی مہنگی پتنگ کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اسے کلہاڑی سے بڑی بے رحمی سے کاٹا گیا تھا۔ اب تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ کبھی پتنگ رہی ہوگی۔ تار کی ریل کا حشر بھی خراب کر دیا گیا تھا۔

"اس نے ہمیں چرچ جاتے دیکھا ہوگا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئلے کے شیڈ میں گھس گئی ہوگی۔" ہربرٹ نے کہا۔

"لیکن وہ اندر کیسے گھسی ہوگی؟" مسٹر سبزی نے پوچھا۔

"میرے پاس شیڈ کی دو چابیاں تھیں۔ میں گھر واپس آیا تو چابی کم تھی۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔"

"یہ ضروری نہیں کہ یہ بیٹی کی حرکت ہو۔ پارک میں بہت سے

> ایک صاحب کی کار کے نیچے اگر ایک کتا کچل گیا تو ان صاحب نے کار روک کر قریب کے بنگلے میں کھڑی ہوئی عورت سے پوچھا۔ "کس کا کتا تھا؟" عورت نے جواب دیا۔ "میرے شوہر کا... اور وہ کہتے تھے کہ یہ دنیا کا بہترین کتا ہے۔" وہ صاحب بولے۔ "آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ میرا خیال ہے انہیں اس سانحے کی خبر بھی کو سنانا چاہئے" عورت نے کہا۔ "وہ بنگلے کے پیچھے باغیچے میں پودوں کو پانی دے رہے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ انہیں یہ بری خبر اچانک سنائیں کیونکہ وہ دل کے مریض ہیں۔ بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان کے پیارے کتے کے مرنے کی اطلاع نہ دیں بلکہ یہ کہیں کہ میں کچلی گئی ہوں۔"

لوگ ہیں' جو اس پتنگ کی وجہ سے ہم سے حسد کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پتا چل جائے گا۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں جا کر اس سے پوچھوں گا۔ اگر پتنگ اس نے توڑی ہے تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

اس کا غصہ اتنا بھیانک تھا کہ مسز سبزی خوف زدہ ہو گئیں۔ "اور قتل کے جرم میں پھانسی چڑھ جاؤ گے؟" انہوں نے کہا "نہیں ہربرٹ' میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ اپنے ڈیڈی کو جانے دو۔ یہ واپس آجائیں تو فیصلہ کریں گے کہ اب کیا کیا جائے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ ہربرٹ' مجھے جانے دو۔" مسٹر سبزی نے کہا۔ ہربرٹ کو قائل کرنے میں خاصی مشکل ہوئی۔ بہرحال جیسے تیسے وہ مان گیا۔ مسٹر سبزی بیٹی سے ملنے چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئے۔

"ہاں' یہ اُسی کا کام ہے۔" انہوں نے بتایا "اس نے فوراً ہی اعتراف کر لیا۔ بلکہ اسے فخر ہے اپنے کارنامے پر۔ میں اس کے الفاظ دہرا نہیں سکتا۔ میں تو خود سناٹے میں آگیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ پتنگ اس کی رقیب ہے۔ پتنگوں سے اُسے نفرت ہے۔ اس نے کہا کہ ہربرٹ اُس سے زیادہ پتنگ سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے پتنگ کو تس نہس کر دیا اور اگر ضرورت پڑی تو وہ آئندہ بھی ایسا ہی کرے گی بلکہ کرتی رہے گی۔"

"خوش قسمت ہے کہ یہ بات اس نے مجھ سے نہیں کہی۔ ورنہ میں پھانسی کے پھندے کا خیال کئے بغیر اس کی گردن مروڑ دیتا۔ بہرحال' اب تو میں اسے زندگی بھر ایک شلنگ بھی نہیں دوں گا کبھی۔"

"وہ تم پر کیس کر دے گی۔" مسٹر سبزی نے کہا۔

"کرنے دیں۔"

"اور ہربرٹ... اگلے ہفتے فرنیچر کی قسط بھی ادا ہونی ہے۔" مسز سبزی نے یاد دلایا۔ "میں تمہاری جگہ ہوتی تو کبھی قسط ادا نہ کرتی۔"

"تو وہ فرنیچر اٹھا کر لے جائیں گے اور اب تک ہربرٹ نے جتنی رقم ادا کی ہے' وہ ضائع ہو جائے گی۔"

"تو کیا ہوا۔ سودا مہنگا نہیں۔ اس خبیث عورت سے تو پیچھا چھوٹے گا۔"

"مجھے پیسے کی کوئی پروا نہیں۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جب وہ فرنیچر لے جا رہے ہوں گے تو اس پر کیا گزرے گی۔ اُس کا چہرہ اس وقت قابلِ دید ہوگا۔ اس کے لئے فرنیچر کی اور خاص طور پر پیانو کی بڑی اہمیت ہے۔ پیانو پر تو جان دیتی ہے وہ۔"

چنانچہ اگلے جمعے کو ہربرٹ نے بیٹی کو خرچ کی رقم نہیں بھیجی۔ اور جب بیٹی نے فرنیچر والوں کے ہاں سے آیا ہوا نوٹس اسے بھجوایا' جس میں کہا گیا تھا کہ اگر فلاں تاریخ تک قسط ادا نہ کی گئی تو وہ فرنیچر اٹھا لیں گے... تو ہربرٹ نے جوابی خط کے ذریعے انہیں مطلع کیا کہ وہ بوجوہ مزید قسطیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ اپنی سہولت کے مطابق جب چاہیں' فرنیچر اٹھوا لیں۔

بیٹی ایک روز اسٹیشن پر اُس کا انتظار کرتی رہی اور جب اس نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو وہ سڑک پر چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دیتی ہوئی اس کے پیچھے چلتی رہی۔

ہر شام کو وہ گھر آتی اور مسلسل یوں گھنٹی بجاتی کہ وہ پاگل ہو جاتے۔ ان کے کان بجنے لگتے۔ ہربرٹ کو جھپٹ کر دروازہ کھولنے اور بیٹی کی مرمت کرنے سے باز رکھنے کی کوششوں میں مسٹر اور مسز سبزی نڈھال ہو جاتے۔ ایک بار تو بیٹی نے پتھر پھینک کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا شیشہ بھی توڑ دیا۔ اس نے گالیوں اور کوسنوں سے بھرے ہوئے پوسٹ کارڈ ہربرٹ کے دفتر کے پتے پر پوسٹ کئے۔ بالآخر وہ عدالت چلی گئی اور مجسٹریٹ سے شکایت کی کہ اُس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور خرچا بھی نہیں دے رہا ہے۔

ہربرٹ کو عدالت سے سمن موصول ہو گیا۔

دونوں نے مجسٹریٹ کو اپنی اپنی کہانی سنائی۔ مجسٹریٹ کو بات عجیب لگی لیکن اُس نے اپنے تاثرات اور انداز سے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے دونوں کے درمیان صلح کرانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ہربرٹ کسی قیمت پر بیوی کے پاس واپس جانے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر مجسٹریٹ نے ہربرٹ کو حکم دیا کہ وہ بیٹی کو پچیس شلنگ فی ہفتہ ادا کرے۔

"میں اسے ایک شلنگ بھی نہیں دوں گا۔" ہربرٹ نے کہا۔

"تو پھر جیل بھی جاؤ گے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگلا کیس لاؤ۔"

لیکن ہربرٹ نے جو کہا تھا' اس پر عمل بھی کیا۔ بیٹی کی شکایت پر مجسٹریٹ کے سامنے دوبارہ پیشی ہوئی۔ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ حکم کی تعمیل نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔

"اس نے میری پتنگ توڑی ہے۔" ہربرٹ نے کہا۔ "میں نے کہہ دیا تھا کہ میں اسے ایک شلنگ بھی ادا نہیں کروں گا اور واقعی ... کبھی ادا نہیں کروں گا۔ آپ مجھے جیل بھیجنا چاہیں تو شوق سے بھیجیں۔"

اس بار مجسٹریٹ کا رویہ سخت تھا۔ "نوجوان... تم بہت بے وقوف آدمی ہو۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں پچھلے واجبات سمیت ادائیگی کے لئے ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں اور اب کے تمہاری شکایت آئی تو میں تمہیں اس وقت تک جیل میں رکھوں گا جب تک تمہارا دماغ ٹھکانے نہ آ جائے۔"

ہربرٹ نے ادائیگی نہیں کی۔ یوں میرا دوست نیڈ پریسٹن جیل میں اُس سے ملا... اور اس کی کہانی مجھے سنائی۔

"کہو... کچھ سمجھ میں آیا؟" نیڈ نے کہانی سنانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ "دیکھو... بیٹی بُری لڑکی نہیں ہے۔ میں اس سے کئی بار ملا ہوں۔ ہربرٹ کی پتنگ سے شدید ترین نفرت کے علاوہ اس میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ اور ہربرٹ بھی کسی اعتبار سے بے وقوف نہیں ہے بلکہ اس کی ذہانت اوسط سے بالا تر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتنگ بازی میں ایسی کون سی بات ہے' جس نے اُس جیسے ذہین آدمی کو پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا ہے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا "ایک تو میں پتنگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ ہوا میں اڑتی ہوئی آزاد پتنگ اس کے لئے آزادی کی علامت ہے' جو کڑی تربیت کی وجہ سے اُسے کبھی نہیں ملی۔ شاید پتنگ کے ذریعے اسے اپنی قوتِ ارادی... اپنی طاقت کے اظہار کا موقع ملتا ہوگا۔ شاید وہ اس کے لئے لگے بندھے معمولات سے' بوجھل زندگی سے فرار کا ذریعہ ہو۔ کچھ بھی ہو' میرے نزدیک یہ بیویوں کے لئے ایک سبق ہے۔ شوہر قابو میں ہو تو اور زیادہ محتاط ہو جانا چاہئے۔ ہر بات ماننے والے شوہر کے لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب کسی بچگانہ بات کے لئے ہر بات منوانے کی عادی بیوی کے سامنے یوں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے گا کہ ازدواجی زندگی ہی منقطع ہو کر رہ جائے۔ بہرحال نیڈ' یہ مسئلہ تو تم کسی ماہرِ نفسیات کے سامنے رکھو..."

اب آپ نے یہ کہانی پڑھ لی۔ اگر آپ انسانی نفسیات سمجھتے ہیں اور اس معاملے کو سمجھ سکتے ہیں تو مجھے بھی سمجھا دیں۔

THE KITE
WILLIAM SOMMERSET MAUGHAM

اعتراف

صلیم الحق حقی

آج کا ایک اہم مسئلہ آدمی کی شناخت بھی ہے جو روز بروز مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کسی شخص کا ظاہر دیکھ کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کرتے ہیں، اکثر کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وہ درست ثابت نہیں ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ظاہر پر ہی بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں

ایک شخص کا احوال، جو اعتراف کی رات قبرستان میں موجود تھا

میں نے اسے دیوانہ وار چاہا تھا.... دیوانگی کی آخری حد تک۔

آدمی محبت کیوں کرتا ہے؟ کیوں کرتا ہے وہ محبت؟ اور محبت کیا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی محبت کرتا ہے تو اسے دنیا میں ایک ہستی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ذہن میں ایک ہی خیال جاگزیں رہتا ہے۔ دل میں ہمیشہ ایک ہی خواہش سرکشیدہ رہتی ہے۔ ہونٹوں پر ایک ہی نام کی پکار ابھرتی ہے اور وہ ایک نام تسلسل کے ساتھ لبوں کو چھوتا ہے۔ پہاڑ کے سنگی سینے میں نمو پانے والے چشمے کے پانی کی طرح روح کی انتہائی گہرائیوں سے وہ نام ہونٹوں تک آتا ہے اور ہونٹ اسے بار بار دہراتے ہیں، ہر جگہ، ہر طرف، سرگوشی میں، جیسے وہ نام نہیں کوئی دعا ہو۔

میں آپ کو اپنی بلکہ ساری دنیا کی کہانی سنا رہا ہوں کیونکہ محبت

کی تو ایک ہی کہانی ہے۔ ہر خطے میں اس کا ایک ہی روپ ہے۔ میں اس سے ملا' میں نے اسے چاہا' میں زندہ رہا تو اس کی محبت اور اس کی نرمی اور مہربانی کے زور پر۔ میں اس کے لمس کے سہارے' اس کی بانہوں میں' اس کے لفظوں میں یوں کھو گیا کہ مجھے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ دن ہے یا رات۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ میں تو اس بوڑھی دھرتی پر اس کی محبت کے سحر میں گم تھا۔ یہ بے خودی' یہ از خود رفتگی صرف محبت ہی میں ممکن ہے اور یہی محبت کی کہانی ہے۔ اس زمین پر' اس آسمان کے نیچے' خواہ مقام کوئی بھی ہو۔

اور پھر وہ مر گئی۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اب تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ایک شام وہ گھر واپس آئی تو بری طرح بھیگی ہوئی تھی کیونکہ اس روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اگلے روز اسے کھانسی ہو گئی۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ کھانستی رہی اور بستر سے لگ گئی۔ پھر کیا ہوا' یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ ڈاکٹر آئے' انھوں نے نسخے لکھے' دوائیں تجویز کیں اور چلے گئے۔ دوائیں لائی گئیں اور کچھ عورتوں نے' جو اس کی تیمارداری کر رہی تھیں' اسے وہ دوائیں پلائیں۔ اس کے ہاتھ گرم تھے۔ اس کی پیشانی جل رہی تھی' اس کی آنکھوں میں بخار کی وجہ سے شعلگی تھی اور گہری اداسی تھی۔ میں نے اس سے باتیں کیں' اس نے جواب دیے' لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ میں ہر بات بھول گیا ہوں' ہر بات... ہر بات... وہ مر گئی اور مجھے اس کی وہ مدھم' ڈبی ڈبی آخری آہ خوب یاد ہے۔ پھر نرس نے کہا: "آہ" اور میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔

اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا "تمھاری صرف دوست تھی وہ؟" اور مجھے ایسا لگا کہ وہ اس کی توہین کر رہا ہے۔ اب جبکہ وہ مر چکی تھی' تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں تھا۔ میں نے پادری کو نکال دیا۔ پھر ایک اور پادری آیا۔ وہ نرم دل اور مہربان تھا۔ اس نے اس کے متعلق باتیں کیں تو میں خوب رویا' دل کھول کر رویا۔ تدفین کے موقع پر مجھ سے مشورہ لیا گیا' لیکن مجھے یاد نہیں کہ لوگوں نے مجھ سے کیا کہا۔ البتہ مجھے اس کا تابوت یاد ہے۔ ہتھوڑے کی اس وقت کی آواز یاد ہے' جب وہ اسے تابوت میں رکھ کر کیلیں ٹھونک رہے تھے۔ میرے خدا! اوہ میرے خدا!

وہ دفن کر دی گئی' دفن' اس اندھیری قبر میں وہ گل بدن' سیم تن' اس قبر میں اتار دی گئی۔ کچھ لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ ان میں اس کی سہیلیاں بھی تھیں۔ میں ان سے بچ کر نکل آیا۔ میں بھاگا' میں بھاگتا رہا۔ رات' بہت رات گئے میں گھر واپس آیا اور اگلے روز سفر پر روانہ ہو گیا۔

کل میں پیرس واپس آیا۔ میری اپنے کمرے' ہمارے کمرے' ہمارے بستر' ہمارے فرنیچر' ہر اس چیز پر۔ جو انسان کے مرنے کے بعد اس کی علامت کے طور پر رہ جاتی ہے' نظر پڑی تو میرا دکھ شدید تر ہو گیا۔ درد نے شدت سے میرے وجود میں اپنے نکیلے دانت گاڑ دیے۔ اذیت اتنی شدید تھی کہ میرا جی چاہا کھڑکی کھولوں اور نیچے کود جاؤں' مر جاؤں۔ میں ان چیزوں کے' ان دیواروں کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا' جنھوں نے اسے پناہ دی تھی۔ جن کے روزنوں میں اس کے وجود کے ہزاروں ذرّے تھے' اس کی جلد کی شہابی رنگت تھی اور اس کی سانسوں کی مہک تھی۔ میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور وہاں سے فرار ہونے کے لیے لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے ہال میں آویزاں وہ قدِ آدم آئینہ نظر آیا۔ وہ آئینہ اسی نے لگوایا تھا تاکہ کہیں جانے سے پہلے اپنا' اپنے میک اپ اور اپنے لباس کا جائزہ لے سکے کہ کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔

میں اس آئینے کے سامنے ٹھٹک گیا' جس میں اس نے بارہا اپنے سراپا کو دیکھا تھا' اتنی کثرت سے کہ مجھے گمان ہوا' ممکن ہے آئینے میں اب بھی اس کا عکس موجود ہو۔ میں آئینے پر نظریں جمائے کھڑا' بھاری جان سے لرزتا رہا۔ آئینہ گہرا' سپاٹ اور خالی نظر آیا۔ اس آئینے نے بھی اسے ان گنت بار اپنی آغوش میں بھرا تھا۔ اس کے وجود کو اپنے اندر سمیٹا تھا۔ اس نے بھی اسے ہر ہر زاویے سے دیکھا تھا' میری محبت کرنے والی نگاہوں کی طرح۔ اس لمحے مجھے اس آئینے سے بے اندازہ محبت محسوس ہوئی۔ میں نے آئینے کو چھوا۔ وہ بالکل سرد تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آئینے سوگوار بھی ہوتے ہیں' ہجر میں سلگتی آنکھوں کی طرح جلتے بھی ہیں اور اُجاڑ اور خوف ناک بھی ہوتے ہیں۔ خوش صرف وہی لوگ رہتے ہیں' جو بھول جائیں کہ آئینے نے ماضی میں' اپنی آغوش میں کیا کچھ سمیٹا تھا۔ جو ماضی کو بھول جاتے ہوں۔ مجھے تو اس آئینے میں جگنوؤں کی طرح اڑتے ہوئے لمس' اور تتلیوں کی طرح تھرکتی ہوئی دھنک رنگ محبت نظر آ رہی تھی۔ وہ جامِ جہاں نما نہیں' جامِ عشق نما تھا۔ آہ' اس آئینے نے مجھے کیسا دکھی کر دیا تھا۔

میں باہر نکل آیا' بغیر باہر نکلنے کی خواہش کے اور مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کس طرف چل دیا ہوں۔ مجھے علم نہیں ہوا کہ میں قبرستان کی طرف جا رہا ہوں۔ اس خاموش بستی کی طرف' جہاں وہ جا بسی ہے۔

میں اس کی سادہ قبر پر پہنچا۔ قبر پر سفید ماربل کی صلیب نصب تھی اور اس پر لکھا تھا:

اس نے محبت کی' وہ چاہی گئی اور مر گئی۔

وہ اس گہری قبر میں دفن تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پھول بدن مرجھا رہا ہو گا۔ ترشی ہوئی مورت پر فرسودگی کا عذاب اتر رہا ہو گا۔ گہرے دکھ نے مجھے نڈھال کر دیا۔ میں نے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی

اور دیر تک، بہت دیر تک اسی حال میں رہا۔ پھر میں نے اندھیرا ہوتے دیکھا۔ شہرِ خموشاں پر اندھیرا بھی چپ چاپ دبے پاؤں اتر رہا تھا کہ سکوت آشنا بستی کے باسیوں کا سکون درہم برہم نہ ہو۔

اچانک ایک عجیب اور دیوانگی پر مبنی خواہش نے مجھے جکڑ لیا۔ ایسی خواہشیں مایوس عشاق کے گداز سینوں ہی میں نمو پا سکتی ہیں۔ میں نے سوچا، چاہا کہ وہ رات میں قبرستان ہی میں گزاروں، رو رو کر اس کی قبر بھگو دوں، لیکن خدشہ یہ تھا کہ مجھے دیکھ لیا جائے گا اور میں زبردستی وہاں سے نکال دیا جاؤں گا۔ اس صورتِ حال سے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔ میں نے چالاکی سے کام لیا۔ وہاں سے اٹھا اور شہرِ خموشاں کی کوچہ نوردی شروع کر دی۔ میں چلتا رہا، چلتا گیا۔ یہ شہر اس شہر کے مقابلے میں کتنا چھوٹا ہے، جس میں ہم زندہ لوگ رہتے ہیں، لیکن اس کی آبادی ہمارے شہر کے مقابلے میں کتنی زیادہ ہے۔ ہمیں بڑے بڑے مکانات اور کشادہ سڑکیں درکار ہوتی ہیں۔ ہماری تین نسلیں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک ساتھ سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتی ہیں۔ ان سبھوں کو پانی پینے کے لیے میٹھے چشموں کی اور شراب کے لیے انگور کی بیلوں کی اور کھانے کے لیے زمین سے غلے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تمام مردہ نسلیں جو انسانیت کے زینے کی حیثیت رکھتی ہیں، انھیں کچھ بھی تو درکار نہیں ہوتا۔ زمین انھیں واپس لے لیتی ہے اور انھیں گھپ اندھیرے میں رہنا ہوتا ہے۔

میں قبرستان کے افتادہ ترین حصے تک آ گیا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ قبرستان کا قدیم ترین حصہ ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو بہت پہلے ..... مدتوں پہلے یہاں آباد ہوئے تھے۔ جن کے جسموں کا گوشت اب مٹی میں گھل مل گیا ہوگا۔ قبروں پر کھڑی صلیبیں فرسودگی کی زد پر تھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آنے والے دنوں میں اس جگہ نئے آنے والوں کو آباد کیا جائے گا۔ وہ جگہ خود رو جنگلی گلاب کی جھاڑیوں اور شمشاد کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ وہ ایک اداس مگر خوبصورت باغیچہ تھا، جس کی نمو انسانی گوشت کی مرہونِ منت تھی۔

میں وہاں تنہا تھا ... بالکل تنہا۔ میں ایک درخت کے نیچے گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس درخت کے تنے سے یوں لپٹا ہوا تھا، جیسے کوئی ڈوبتا آدمی پتوار کو تھامتا ہے۔

اندھیرا دبیز تر ہوا تو میں وہاں سے اٹھ گیا اور دبے قدموں چلنے لگا کہ کہیں صدیوں کی نیند میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی نیند میرے قدموں کی چاپ سے نہ اُچٹ جائے۔ میں تا دیر بھٹکتا پھرا، مگر اس کی قبر مجھے نہیں ملی۔ میں ہاتھ پھیلائے، ٹٹول ٹٹول کر مقبروں سے ٹکراتا بڑھتا رہا۔ لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شہرِ خموشاں زیادہ بڑا شہر ہے۔ یہاں کسی کا پتا نہیں ملتا اور

شوگر کے مریض

کریلے، قیمہ، کالی مرچ، چوہنگاں، ٹماٹر اور بکرے کا لبلبہ کھائیں

حکیم تحسین احمد

گوجرانوالہ ... شوگر انتہائی پیچیدہ اور پریشان کن بیماری ضرور ہے مگر لاعلاج نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آج تک ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی جس کا علاج نہ ہو۔ ویسے شوگر سے جتنا مریض پریشان ہوتا ہے اتنا پریشان دوسری بیماریوں سے کم ہی ہوتا ہے کیوں کہ اگر شوگر کے مریضوں کو زخم ہو جائے تو جلدی ٹھیک نہیں ہوتا ویسے بھی شوگر انسان کو کمزور کر دیتی ہے۔ اگر مریض کو کسی اور بیماری کا آپریشن کروانا ہو تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ آپ اگر شوگر کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں اور کوئی دوا اثر نہیں کرتی تو آپ چوہنگاں، قیمہ، بکرے کا لبلبہ، ٹماٹر بطور غذا پکا کر سوئی کے ساتھ کھائیں۔ انشاء اللہ شوگر کنٹرول ہوگی اور آپ کو یقینی فائدہ پہنچے گا۔ آپ چوہنگاں کا پانی بھی نکال کر استعمال کر سکتے ہیں یہ بھی شوگر کے لیے مفید ہے یہ باتیں حکیم تحسین احمد نے ایک ملاقات میں بتائیں انہوں نے مزید بتایا جوہر جامن، گٹار بوٹی کریلا، صندل سفید، کاہو، گل ارمنی اور کشتہ چاندی بھی شوگر کے موذی مرض کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔ میں نے جب بھی یہ نسخہ شوگر کے مریضوں کو محنت اور طبی اصولوں کے مطابق تیار کر کے دیا تو شوگر کے مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے شفا دی۔ میں آج آپ کے سامنے حکیم شوگر والے کے نام سے مشہور ہوں کیونکہ قدرت نے ان ادویات میں شوگر ختم کرنے کی صفت رکھی ہے۔ ہم میں کمی اس بات کی ہے کہ ہم نسخہ کے مطابق محنت نہیں کرتے۔ معالجین شوگر سے گزارش ہے یہی نسخہ پوری محنت و تجربہ اور لگن سے تیار کر کے شوگر کے مریضوں کو کھلائیں اور ساتھ پرہیز بھی بتائیں۔ انشاء اللہ شفا ہوگی۔ شوگر چند ہی دنوں میں ختم ہو جائے گی۔ مریض انشاء اللہ صحتیاب ہو جائے گا۔ آج کل تو بیرونی ممالک میں شوگر کے لیے معالجین یہی چیزیں استعمال کرنے کی ہدایت کر رہے ہیں کیونکہ ہماری نئی اور پرانی طبی کتابیں اور معالجین بھی ان چیزوں کی شوگر کے بارے میں بہت تعریف کرتے ہیں اور ہر قسم کی کمزوری کے لیے بھی یہی دوائیں مردہ جسم میں طاقت و توانائی پیدا کرتی ہیں۔ آپ دوائی وی پی منگوائیں یا خود ملیں۔ پتا یہ ہے:-

حکیم تحسین احمد چوک نشاط سینما، گوجرانوالہ
فون: ۷۲۱۳۳

کوئی پتا بتانے والا بھی نہیں ہوتا۔ میں کسی اندھے کی طرح راستہ ٹٹول رہا تھا' ٹھوکریں کھا رہا تھا' انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور کئی بار قبروں سے میرا سر ٹکرا چکا تھا۔ میں انگلیوں سے ٹٹول کر مکینوں کے نام پڑھ رہا تھا۔ عجیب رات تھی وہ' بے حد عجیب رات۔ ایسا لگتا تھا کہ اب میں اس کا مہمان نہیں ہو پاؤں گا۔ اس کا نیا گھر مل ہی نہیں رہا تھا۔

وہ تاریک رات تھی۔ چاند بھی نہیں نکلا تھا۔ اب میں قبروں کے درمیان تنگ کچے راستے پر چلتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ قبروں ہی قبریں' ہر طرف قبریں۔ وہاں قبروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ میرے دائیں' میرے بائیں' میرے سامنے' میرے پیچھے' میرے اطراف میں قبروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں تھک گیا۔ مزید ایک قدم چلنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ میرے گھٹنے لرزنے لگے۔ چنانچہ میں ایک قبر پر بیٹھ گیا۔ سناٹا اتنا گہرا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں' لیکن پھر میں نے دھڑکنوں کے سوا بھی کوئی آواز سنی۔ کیا؟ وہ کوئی بے نام سی آواز تھی' بے مفہوم آواز۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آواز کہیں میرے دکھ سے بوجھل سینے کی بے آواز آہ تو نہیں' میرے آزار زدہ ذہن کا کرشمہ تو نہیں یا یہ انسانی اسرار چھپانے والی زمین کے سینے سے ابھرنے والی آواز ہے؟ میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن جہاں میں بیٹھا تھا' وہاں سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ دہشت کے مارے میں ساکت ہو گیا۔ خوف نے مجھے ٹھٹھرا دیا۔ میں چیخ سکتا تھا' اس لمحے میں مر سکتا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں مرمر کی جس سل پر بیٹھا ہوں' وہ حرکت کر رہی ہے۔ ہاں' واقعی وہ سل متحرک ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اٹھ رہی ہے۔ میں بری طرح اچھلا اور برابر والی قبر کی طرف لپکا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میں نے دیکھا اور واضح طور پر دیکھا کہ جس سل پر میں بیٹھا تھا' وہ اٹھ رہی ہے۔ پھر ایک مردہ قبر میں سے نکلا۔ وہ ایک بے لباس ڈھانچا تھا۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی پیٹھ کی پسلیوں سے سل کو اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ رات بہت تاریک تھی' لیکن میں نے یہ سب کچھ بہت واضح طور پر دیکھا۔ میں نے مرمر کی صلیب پر کندہ عبارت پڑھی۔ لکھا تھا:

یہاں جیکوئس اولیونٹ دفن ہے' جس نے ۵۱ سال زندگی گزاری۔ وہ اپنے گھر والوں سے محبت اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ مہربان' شریف اور معزز تھا اور اس نے خدا کی مرضی اور مہربانی سے وفات پائی۔

ڈھانچے نے بھی وہ عبارت بغور پڑھی۔ پھر اس نے راستے میں پڑا ہوا ایک نوکیلا پتھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے ایک ایک حرف کھرچ کر مٹانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صلیب صاف ہو گئی۔ وہ چند لمحے اپنی کھوکھلی خالی آنکھوں سے اس جگہ کو تکتا رہا جہاں وہ حرف موجود رہے تھے۔

پھر اس نے اپنی استخوانی چھنگلیا کی نوک سے روشن حروف میں یہ عبارت لکھی' جیسے بچے فاسفورس کی تیلی سے دیوار پر نقش تصویر بناتے ہیں:

یہاں جیکوئس اولیونٹ عذاب بھگت رہا ہے جو ۵۱ سال کی عمر میں مرا۔ اس نے اپنے نامہربان رویے سے اپنے باپ کو قبل از وقت مرنے پر مجبور کیا کیونکہ وہ جلد از جلد باپ کی دولت اور املاک حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایذائیں پہنچائیں' بچوں کو دکھ دیئے' پڑوسیوں کو دھوکے دیئے' جس شخص کو بھی لوٹ سکتا تھا' لوٹا اور اسے بدبختی کے عالم میں موت آئی۔

یہ لکھنے کے بعد ڈھانچا بے حس و حرکت کھڑا اپنی کارگزاری کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو پتا چلا کہ ساری قبریں کھل گئی ہیں اور ان میں سے مردے باہر نکل آئے ہیں۔ پھر وہ سب اپنی اپنی صلیبوں پر لکھی ہوئی عبارتیں مٹانے اور ان کی جگہ حقیقتیں لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ وہ عبارتیں جو ان کے لواحقین نے ان کی محبت کرنے والوں نے صلیبوں پر کندہ کرائی تھیں' سچی نہیں تھیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ سب بڑھیوں کو ستانے والے شیطان صفت' بددیانت' منافق' جھوٹے' حاسد' ٹھگ اور مجرم تھے۔ پرانی عبارتوں کے نیچے ان میں اچھے باپ تھے' وفادار بیویاں' محبت کرنے والے بیٹے' باعصمت بیٹیاں اور دیانت دار کاروباری تھے' لیکن اب وہ سب اپنی اپنی خوفناک اور مکروہ سچائیاں لکھ رہے تھے۔ دنیا کی کوئی برائی' کوئی گناہ ایسا نہیں تھا' جو انھوں نے نہ کیا ہو' لیکن ان کے قریبی لوگ تک ان سچائیوں سے بے خبر تھے یا انھوں نے خود کو بے خبر ظاہر کیا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھے علم ہوا کہ درگزر کا اتنا مرتبہ کیوں ہے اور درگزر کرنا مشکل کام ہے۔

میں نے سوچا' اس نے بھی اپنی صلیب پر یقیناً کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں ان مردوں کے درمیان بھاگتے ہوئے اس کی قبر تلاش کرنے لگا۔ اب مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس بار مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مل جائے گی اور میں نے اسے پہلی ہی نظر میں' بغیر اس کا چہرہ دیکھے پہچان لیا۔ اس کا چہرہ کفن کی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور سفید ماربل کی جس صلیب پر کچھ پہلے میں نے یہ عبارت پڑھی تھی۔

اس نے محبت کی' وہ چاہی گئی اور مر گئی۔

وہاں اب یہ عبارت لکھی تھی:

ایک دن موسلادھار بارش میں یہ عورت اپنے محبوب سے بے وفائی کے لیے نکلی تھی۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اسے نمونیا ہوا اور مر گئی۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ لوگوں نے اگلی صبح مجھے اس کی قبر پر بے ہوش پڑے پایا تھا۔

WAS IT DREAM
Guy De Maupassant.

سسپنس کے سلور جوبلی نمبر کے لیے ایک سلور جوبلی کا مارا اپنے اسی معاشرے کی کہانی، اہرن ماہ کا توشہ خاص

اُس رات کا افسانہ جو اپنے اندر پچیس برس کے عذاب سمیٹے ہوئے تھی
محبتیں لکھنے والے قلم کی نفرت بھری تحریر

علیم الحق حقی

شبِ احتساب

ہم ہوں گے آپ اپنے ہی دل کا عذاب جب
چہرے سے خواہشوں کے اُٹھے گا نقاب جب
کیا کیا نہ خوف آئے ہیں خود اپنے آپ سے
ہم نے کیا ہے اپنا کبھی احتساب جب

ہمارے ہاں ہر وقت احتساب کا شور مچا رہتا ہے۔ یہی فرمائشیں چلتی رہتی ہیں۔ جنہیں احتساب کا اختیار مل جائے وہ احتساب کے نام پر انتقام لیتے ہیں اور جن کا احتساب کیا جا رہا ہو، وہ دوسروں کے احتساب کا عزم ظاہر کرتے رہتے ہیں اور جب موقع مل جائے تو احتساب اُنہیں یاد بھی نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں احتساب ذات... خود احتسابی کی رسم ہی نہیں۔ یہاں تو لوگ آئینہ بھی کم ہی دیکھتے ہیں۔ سارا زور اپنے ہر فعل، ہر عمل کو درست ثابت کرنے پر رہتا ہے۔ جس نے اپنا کبھی احتساب نہیں کیا، اپنا قبلہ درست نہ کیا، وہ کسی اور کا احتساب نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ گناہ گار کو پہلا پتھر وہ مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ یعنی پہلے انسان اپنا احتساب کرے۔ ہم ایسا نہیں کرتے اور ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم اپنا احتساب نہیں کریں گے تو وقت کرے گا اور جتنی تاخیر سے کرے گا، احتساب اُتنا ہی سخت ہو گا۔

بنگلے کے لان پر رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ زرق برق ملبوسات، دمکتے چہرے، لبوں پر مچلتے تبسم اور خوشبو کی لپٹیں اڑاتے آنچلوں نے لان کو جلوہ گاہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف جیسے خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مرد اور عورتیں چھوٹے چھوٹے گروپ کی شکل میں اِدھر اُدھر موجود تھے۔ کہیں کھنکناتے قہقہے تھے تو کہیں دل آویز تبسم۔ کہیں سرگوشیاں تھیں تو کہیں بلند آہنگ گفتگو۔ ہر شخص اپنے پسندیدہ انداز میں اس محفل سے حظ اٹھا رہا تھا۔

عثمان حفیظ لان کے اس حصے میں کھڑا تھا جو گیٹ سے قریب تر تھا۔ وہ وہاں مہمانوں کو خوش آمدید کہتا رہا تھا۔ کچھ دیر شہناز بھی اس کے ساتھ کھڑی رہی تھی پھر کسی کو لان میں بچھی ہوئی میزوں کی طرف لے جانے کے بعد واپس نہیں آئی تھی۔ مہمانوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ خوش اخلاق، ہنس مکھ اور زندہ دل ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بے حد مقبول تھی۔

عثمان نے بیوی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ آخر کار وہ اسے نظر آ گئی۔ اس وقت وہ اشرف علی کے ساتھ کھڑی تھی اور کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ ایک لمحے کو عثمان کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ شہناز کی یہ ہنسی ہمیشہ اس پر جادو کر دیتی تھی۔ ہنسنے کا اس کا خاص انداز تھا۔ سر پیچھے کی طرف ہو جاتا اور چہرہ آسمان کی سمت۔ اور چہرے پر اور آنکھوں میں روشنی سی پھوٹ پڑتی۔ پھر اس ہنسی کا صوتی تاثر! وہ بے حد مترنم اور بے ساختہ ہنسی

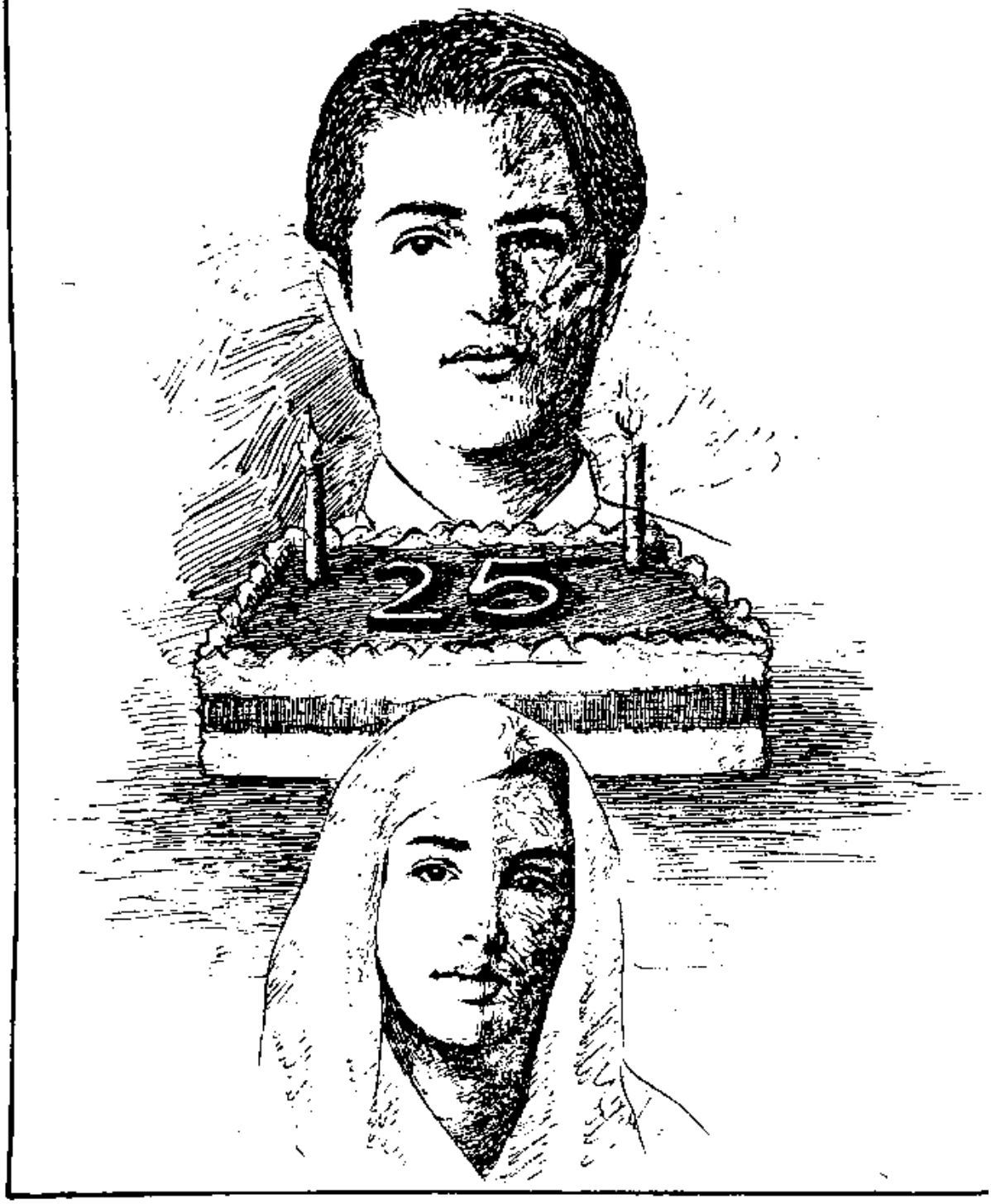

ی۔ سننے والے کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ دل میں' دماغ میں' وجود میں
ے سے چھلکتی خواہشیں سر اٹھانے لگتی تھیں۔ اس کا اپنا بھی یہی
ال تھا۔ برسوں پہلے شہناز کی یہ ہنسی سن کر اسے صرف اور صرف
لوت کی خواہش ہوتی تھی۔ بس وہ ہو اور شہناز ہو۔ اور جب تک
نہ ہو جاتا وہ بے چین رہتا۔

مگر یہ سب کچھ اب قصۂ پارینہ تھا۔ اب وہی ہنسی سن کر صرف
یک لمحے کو وجود خواہشوں کی نگری بنتا تھا اس کے بعد ایسی کراہت
ر بے زاری طاری ہوتی کہ خمار کی کیفیت بھی اس کے سامنے ہیچ
ہو کر رہ جاتی۔

اب بھی یہی ہوا۔ ایک لمحے کے بعد اسے اپنا آپ برا لگنے
لگا۔ یہ عجیب بات تھی۔ شہناز اسے بری نہیں لگتی تھی۔ لیکن خود
سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ ایسے میں وہ شہناز کو بہت غور سے
دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں اشتیاق نہیں ہوتا تھا۔ ایک جوہری کی
سی حرص و ہوس ہوتی تھی' جس کے سامنے کوئی بے حد نایاب اور
حسین ہیرا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس کی نگاہوں میں بولہوسی ہوتی۔
چہرہ تمتما اٹھتا۔ آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگتی۔

اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ کسی نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا "کیا بات ہے یار؟
بھابی کو کھا جاؤ گے کیا؟ بہت بے صبرے ہو۔"

وہ بری طرح چونکا۔ اس نے سر گھما کر احسان کو دیکھا "ایسی

کوئی بات نہیں بھائی۔" اس نے کھسیا کر کہا۔ احسان اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔

"میرا خیال ہے' سب مہمان آچکے ہیں۔" احسان نے سنجیدگی سے کہا "یا ابھی کسی کا انتظار ہے تمہیں؟"

"مجھے؟ نہیں تو۔"

"تو پھر نمٹادو یہ معاملہ۔ اناؤنسمنٹ کردوں؟"

عثمان نے اثبات میں سرہلایا۔ احسان اسٹیج کی طرف چل دیا۔ عثمان نے اپنے خاص ملازم شبیر کو اشارے سے بلایا "کیک اسٹیج پر پہنچادو۔" یہ کہہ کر وہ خود بھی اسٹیج کی طرف چل دیا۔

اسی وقت اسٹیج سے احسان نے اناؤنسمنٹ شروع کردیا۔ "خواتین و حضرات' پلیز متوجہ ہوں۔"

قہقہے تھم گئے۔ سرگوشیاں معدوم ہوگئیں۔ خاموشی چھاگئی۔ سب کی نظریں اسٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ آج میرے عزیز دوست عثمان کی شادی کی سالگرہ ہے۔" احسان مائیک ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔ "اب چند لمحوں میں سالگرہ کا کیک کاٹا جائے گا۔ میں عثمان حفیظ اور بیگم عثمان سے استدعا کرتا ہوں کہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور آپ تمام خواتین و حضرات بھی تمام تر رونق سمیت اسٹیج سے قریب تر ہوجائیں۔ شکریہ۔"

اس دوران کیک لاکر میز پر رکھا جاچکا تھا۔ بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ گئے۔ سب لوگ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج کے گرد دائرہ سا بن گیا۔ شہناز اور عثمان اسٹیج پر پہنچ گئے۔ کیک باکس سے نکالا گیا تو دیکھنے والوں کی سانسیں رکنے لگیں "واہ' کتنا خوب صورت کیک ہے۔" کسی نے کہا۔

"لیکن یہ دو مکان کیوں بنوائے ہیں کیک میں؟" ایک اور نے

واقعی۔ کیک دو کاٹیجز پر مشتمل تھا جو آمنے سامنے تھے۔ ان میں ایک پگڈنڈی تھی جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں کھڑی کھائی تھی جو دونوں کاٹیجز کا ایک دوسرے سے رابطہ کررہی تھی۔

"بہت خوب صورت آئیڈیا ہے بھئی... بہت فنکارانہ خیال ہے۔" کسی نے داد دی۔

کیک اتنا خوب صورت تھا کہ اصل اور اہم بات لوگوں کو دیر سے نظر آئی۔ سب سے پہلے مسز شاہ نے اسے دیکھا "او... واٹ سرپرائز!" انہوں نے بے حد سُریلے پن سے چیخنے کی کوشش کی پھر وہ شہناز کی طرف مڑیں "پچیس سال ہوگئے تمہاری شادی کو سلور جوبلی ہے۔ بھئی بڑی چھپی رستم نکلیں تم۔ یہ تو بتایا ہی نہیں تھا تم نے۔"

چند لمحوں میں یہ بات ہر زبان پر تھی۔ سب ایک دوسرے سے یہی کہہ رہے تھے "یہ تو بہت خاص موقع ہے بھئی۔ یہ ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے۔"

○☆○

اسٹیج پر کھڑی ہوئی مسز شمیم نے برابر کھڑی ہوئی بیگم رضوی سے سرگوشی میں کہا "میرا خیال ہے' اس جوڑے نے ہمارا ایک بڑا مسئلہ حل کردیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" بیگم رضوی نے جواباً سرگوشی کی۔

"ارے وہی مسئلہ... اس سال کے مثالی جوڑے والا۔" مسز شمیم ذرا جھنجلا گئیں۔

بیگم رضوی تقریباً اچھل پڑیں "واقعی... شادی کی پچیسویں سالگرہ۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"تم ایسا کرو کہ باقی ممبرز سے بھی رائے لے لو اور آکر مجھے بتادو۔ میں کیک کٹنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے اناؤنس کردوں گی۔"

بیگم رضوی سرہلاتے ہوئے اسٹیج سے اتریں۔ وہ باقی ممبرز کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہیں۔ آخرکار انہیں صبیحہ بیگم نظر آگئیں۔ وہ ان کی طرف بڑھ گئیں۔ مسز شمیم اپنی جگہ کھڑی مسکراتی رہیں۔ وہ مطمئن تھیں کہ ان کا ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔

مسز شمیم نے برسوں پہلے چند خواتین کے ساتھ مل کر انجمنِ شادی شدہ خواتین کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں' اس میں خواتین کو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے' جو آخرکار بے زاری کا روپ دھار لیتی ہے۔ انجمنِ شادی شدہ خواتین اس مسئلے کا بہترین حل ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ممبرشپ بہت تیزی سے آگے بڑھی۔ انجمن کی سرگرمیاں بے حد متنوع تھیں' جو پورے سال جاری رہتی تھیں۔ کبھی اس کے زیرِ اہتمام کوئی پکنک ہوتی تو کبھی میلۂ جشنِ بہاراں۔ کبھی کسی فنکار کے ساتھ شام منائی جاتی تو کبھی معذوروں کی امداد کے لئے کوئی پروگرام کرلیا جاتا۔ لیکن انجمن کا خاص اور مقبول پروگرام یہ تھا کہ ہر سال ایک جوڑے کو سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دیا جاتا تھا۔ اس تقریب کو سماجی حلقوں میں خاص اہمیت دی جاتی تھی۔

مسز شمیم انجمنِ شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن تھیں۔ یہ مثالی جوڑے والا سلسلہ انہوں نے شروع تو کردیا تھا مگر اب وہ انجمن... کے لئے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ ہر سال ایک مثالی جوڑے کا انتخاب جبکہ مثالی جوڑے کا محض تصور موجود تھا۔ عملی زندگی میں مثالی جوڑا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اسکینڈلوں سے بھرے اس معاشرے میں کسی کا دامن صاف نہیں تھا۔ سبھی ایک جیسی ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ کچھ لوگ ظاہرداری اور بھرم کا خیال رکھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی بے سکون ہے اور ایسے لوگ بھی تھے جو پردہ نہیں رکھتے تھے۔ کہہ بھی دیتے تھے کہ وہ جیسے تیسے ازدواجی زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں۔

تو یہ ہر سال مثالی جوڑے کا ایوارڈ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مسز شمیم جانتی تھیں کہ ہر سال جس جوڑے کو انعام دیا جاتا ہے وہ بظاہر تو بہت خوش ہوتا ہے۔ اپنے ایوارڈ پر فخر کرتا ہے لیکن درحقیقت ایوارڈ ان کی زوجیت کے لئے تازیانہ ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر وہ بے چارے بلبلاتے ہیں۔ مسز شمیم انجمن کی عہدے دار خواتین کی ازدواجی زندگی سے خوب واقف تھیں۔ دور کیوں جائیں ان کی اپنی ازدواجی زندگی بھی کچھ خوش گوار نہیں تھی۔

ایسے میں شادی کی یہ ۲۵ویں سالگرہ مسز شمیم اور انجمن کے لئے نعمت ہی تھی۔ وہ احسان کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ انہیں تقریر کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔

○☆○

کیک پر دو اور پانچ کے ہندسوں والی موم بتیاں ۲۵ کی شکل میں لگادی گئیں۔ احسان نے دیا سلائی جلا کر موم بتیوں کو روشن کردیا۔

"آؤ عثمان۔۔۔ آئیں بھابی۔" اس نے کہا۔

عثمان اور شہناز کیک کے قریب ہو گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کیک پر لگی موم بتیوں پر جھک گئے۔ اگلے ہی لمحے موم بتیاں بجھ گئیں۔ عثمان نے کیک کاٹنے کے لئے چھری اٹھائی۔ شہناز نے اس کے چھری والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ عثمان نے کیک کو اس جگہ سے کاٹا' جہاں دونوں کا انگوٹھا درمیانی راستہ تھا۔ اس نے کیک کے دو ٹکڑے کاٹے اور ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ سے شہناز کو کھلایا۔ شہناز نے دوسرا ٹکڑا اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ڈال دیا۔

مبارکباد کا شور مچ گیا۔ خوش و خرم مہمان مبارکباد دے رہے تھے۔

اسی وقت بیگم رضوی آئیں اور انہوں نے مسز شمیم سے سرگوشی میں کہا "سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال کا مثالی جوڑا ہے۔"

سرگوشی بہت دھیمی تھی لیکن عثمان حفیظ نے اسے واضح طور پر سن لیا۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ سرخ گیا لیکن فوراً ہی اس نے چہرے پر ایک چمکیلی مسکراہٹ کا نقاب ڈال دیا۔ اس نے سر گھما کر بیوی کو دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے وہ کوئی مفہوم نہ پہنا سکا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

احسان اس کے پاس آگیا "بہت مبارک ہو دوست۔" وہ بولا۔ "میں تمہاری حالت جانتا ہوں۔ اس وقت تمہارے بس میں ہو تو اس تقریب کو فوراً ختم کرو اور مہمانوں کو رخصت کرکے۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ اس کی نگاہوں میں شوخی چمکی "۔۔۔ بھابی کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گزارو۔ ہے نا یہی بات؟"

"اس سے زیادہ درستی کے ساتھ شاید ہی زندگی میں کبھی کسی نے مجھے سمجھا ہوگا۔" عثمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے میں تم سے اجازت لینے آیا ہوں۔ تقریب کچھ اور طویل ہو جائے گی لیکن یہ ضروری ہے۔ انجمن شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن مسز شمیم تمہارے مہمانوں سے مختصر سا خطاب کرنا چاہتی ہیں۔" احسان نے مختصر' خاص طور پر زور دیا "اجازت؟ اعلان کردوں۔"

"اجازت ہے۔" عثمان نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"شکریہ عالی جاہ۔" احسان مزاحیہ لہجے میں بولا اور مائیک کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد اس کی آواز لان میں گونج رہی تھی "خواتین و حضرات! ازراہ کرم توجہ فرمائیں۔" توجہ حاصل کرنے کے بعد اس نے مائیک میں کہا "یہاں انجمن شادی شدہ خواتین کی چیئرپرسن مسز شمیم موجود ہیں جن سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ وہ ہم سب کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔ مسز شمیم آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتی ہیں اور ایک اہم اعلان بھی کرنا ہے۔ توجہ فرمائیں۔۔۔۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین' مسز شمیم۔"

مسز شمیم بڑے باوقار انداز میں آئیں اور مائیک تھام لیا "دوستو' میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔۔۔۔"

عثمان اسٹیج سے اتر آیا۔ لوگوں کی مبارکباد وصول کرتا وہ لان کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف چل دیا۔ درحقیقت اسے اس وقت تنہائی کی شدید ضرورت تھی۔ تنہائی! اور ایسی محفل میں تنہائی؟ محفل بھی وہ جس کا ہیرو وہ خود تھا۔ ایسے میں وہ گھر کے اندر بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ آداب میزبانی کے خلاف تھا۔ یہ بداخلاقی ہوتی۔

اس نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس گوشے میں جا بیٹھا۔ وہ اس سے گزرتی ہوئی دو خواتین نے حیرت سے اسے دیکھا "ارے صاحب خیریت ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا "یہاں اس طرح کیوں آبیٹھے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں بیگم خورشید۔ کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے تھکن بھی ہوگئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ چند قدم آگے جاکر ایک دوسری سے کہا "شراب کی طلب ہو رہی ہوگی بے چارے کو۔"

"چلو گرم کرنے کی بھی فکر ہوگی۔ اب آج تو یہ ممکن ہے نا۔" دوسری بولی۔

یہ جملے کرسی پر بیٹھے ہوئے عثمان نے بھی سن لئے۔ وہ دل میں اپنی سماعت کو برا بھلا کہنے لگا' جو وہ باتیں بھی سنتی تھی' جو اس کے لئے نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں بلاوجہ اذیت اٹھانی پڑتی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے بیگم رضوی کی وہ سرگوشی سن لی تھی' جو مسز شمیم کے لئے تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ مسز شمیم بڑے خروش سے بول رہی تھیں لیکن اس تک بس ان کی آواز آرہی تھی' لفظ نہیں۔ کیا طرفہ تماشا ہے' یہ میری سماعت۔ وہ بڑبڑا! تقریر سنائی نہیں دے رہی۔۔۔۔ اور وہ سرگوشی اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

یہ حقیقت تھی۔ بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی۔۔۔۔ سب ممبر متفق ہیں کہ یہی اس سال

مثالی جوڑا ہے۔

اس کے چہرے پر اذیت کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ یہ کام بھی آج ہی کے دن ہونا تھا۔ آج کے دن! یہ دن تو کسی اور ہی کام کے لئے مخصوص ہے۔ یہ تو نجات کا دن ہے۔ اذیت سے، منافقت سے، گھٹن سے نجات کا دن۔۔۔ ایسے میں یہ ایوارڈ کی بیڑی کیوں چلی آرہی ہے میری طرف۔

میں اور شہناز۔۔۔ شہناز اور میں۔ مثالی جوڑا! ہنہہ۔ اس کے حلق سے فراہٹ سی نکلی۔ ہاں۔۔۔ شاید برسوں پہلے کبھی، ابتدا میں۔ بالکل ابتدا میں۔ شاید ہم مثالی جوڑا تھے۔ اس وقت جب میری محبت شفاف، بے داغ تھی۔ پرستش کی حد کو پہنچی ہوئی محبت۔ مگر اب۔ اب تو وہ کوئی بھولا بسرا خواب بھی نہیں رہی۔ اس کی جگہ تو نفرت نے لے لی۔ اور نفرت بھی وہ جو ظاہر نہیں کی جاسکی۔ کچلی ہوئی، مسخ شدہ، قابلِ نفرت نفرت!

اور وہ دن! شہناز کتنی خوب صورت تھی۔ اسے دیکھ کر سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ خیر۔ خوب صورت تو وہ اب بھی بہت ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ وہ اس کی تردید کرنا چاہتا تھا مگر اس کی فطرت کی معقولیت نے اسے روک دیا۔

اس نے سر اٹھا کر پھر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ اس بار اس کی نظریں شہناز کو تلاش کر رہی تھیں۔ لان کے جگمگاتے قلب میں وہ مسز شاہ کے ساتھ کھڑی باتیں کرتی نظر آئی۔ اس نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ شہناز پہلے کی طرح نہیں، پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے اب۔ اس کی معقولیت نے اعتراف کیا۔ وہ اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا، ۲۵ سال پہلے کی شہناز سے اس کا موازنہ کرتا رہا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس عورت کی عمر ۵۰ سال ہے۔ وہ ۳۰، ۳۵ سے زیادہ ہرگز نہیں لگتی تھی۔ کیا انسانوں کی طرح وقت کو بھی دھوکا دیا جاسکتا ہے؟

۲۵ سال پہلے کی شہناز بلاشبہ حسین تھی۔ وہ معصوم اور کم عمر بھی تھی۔ کم عمری کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے پھر اس میں محبت بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگا والی بات ہوتی ہے۔ محبت تو نظروں میں حسین رنگ بھر دیتی ہے۔ عثمان جانتا تھا کہ اس وقت وہ شہناز سے محبت کرتا تھا۔ جبکہ اب اسے شہناز سے نفرت تھی۔ لیکن وہ یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ شہناز اب زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ پہلے وہ کلی تھی تو اب حسن کے گلستاں کا بے مثال پھول بن گئی تھی۔ پہلے وہ ہلال تھی تو اب ماہِ تمام۔ اب تو اس کی شادابی اکسانے والی تھی۔

لیکن عثمان دل کا کیا کرتا، جس میں ۲۷ سال پہلے شہناز چپکے سے اتر گئی تھی۔ اب تو وہ بس یہی سوچ سکتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اسی دن تو اس کی زندگی کے جام میں زہر کا پہلا قطرہ گرا تھا۔ اب تو جام لبریز ہو چکا تھا۔

وہ یادوں کی ڈور تھام کر پیچھے، بہت پیچھے چلا گیا۔

○☆○

شہناز سے تو اس کا رشتہ ہی دکھ کا تھا۔ اس کی پہلی دید کے ساتھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا غم پیوست تھا۔ بعض غم ایسے ہوتے ہیں، جنہیں آدمی کبھی نہیں بھولتا۔ وہ غم بھی ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود شہناز کی پہلی دید کو کبھی نہ بھول سکا۔ اس دید کا ناتا ایسے دکھ سے تھا جو ناقابلِ فراموش تھا۔

اس روز عثمان کی کائنات لٹی تھی!

امی کا انتقال ہوا تو وہ بارہ سال کا تھا۔ اسے یاد تھا، وہ بہت رویا تھا۔ لیکن امی کی موت کے دن نہیں۔ ہاں، اس کے بعد وہ مسلسل روتا رہا تھا۔ جب بھی وہ کوئی ایسا کام کرتا، جو اس سے پہلے امی اس کے لئے کرتی تھیں، وہ رو پڑتا تھا۔ ایسے ہر موقع پر اسے شدت سے محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ رات کے وقت دودھ پینا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ کون خود جا کر گلاس میں اپنے لئے دودھ لائے اور پھر امی کو یاد کر کے روتا رہے۔

پھر ایک رات وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ ابو نے دھیرے سے اسے پکارا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لئے اس کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "جی ابو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ دودھ پی لو بیٹے۔" ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ زخم جیسے پھر سے ہرا ہو گیا۔ ابو نے دودھ کا گلاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بچوں کی طرح بلکتا رہا اور ابو اسے تھپکتے چمکارتے رہے۔ جانے یوں کتنی دیر گزری۔ پھر برسات تھمی تو ابو نے اپنے ہاتھ سے اسے دودھ پلایا "میں بہت کم ظرف ہوں بیٹے۔" انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا "اپنے غم میں الجھ کر تمہارے غم کو بھول گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ تمہارا غم میرے غم سے کتنا بڑا ہے۔ مجھ سے تو میری شریکِ سفر چھنی ہے لیکن تم تو اپنی جنت سے محروم ہو گئے ہو۔"

اس نے پھر ابو کے سینے میں منہ چھپا لیا اور سسکنے لگا۔

"نہ روؤ میرے بیٹے۔" ابو نے اسے تھپکتے ہوئے کہا "تم روؤ گے تو وہاں تمہاری ماں تڑپے گی۔ اسے بہت تکلیف ہوگی بیٹے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ اس سلسلے میں وہ پہلی تسلی، پہلی نصیحت تھی جس نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔

"میں تمہیں تمہاری ماں تو واپس نہیں دلا سکتا عثمان۔" ابو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "لیکن اپنے عمل سے یہ کوشش ضرور کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس کی محرومی کا احساس نہ ہو۔ اب میں تمہارا باپ ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہوں۔"

اور واقعی ابو نے ماں بن کر دکھایا۔ وہ ہر رات اس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آتے۔ بیڈ پر اس کے ساتھ لیٹ کر اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتے اور جب تک وہ سو نہ جاتا، وہ کمرے سے نہ جاتے۔ کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ ابو نہ تو سوتے ہیں اور نہ ہی اس کے کمرے سے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ اس کی آنکھ کھلی اور اس

نے ابو کو خود پر جھکے یا اپنے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے پایا۔ شاید وہ بار بار اس کے کمرے میں آتے تھے۔ شاید وہ سکون سے سو نہیں پاتے تھے۔

عثمان جانتا تھا کہ اس کا باپ دنیا کا سب سے اچھا باپ ہے۔ یہ بات صرف وہ نہیں سمجھتا تھا' تمام لوگ یہی کہتے تھے کہ رئیس صاحب نے بیٹے کے لئے زندگی تج دی ہے۔ بیوی مری تو ان کی عمر ایسی تھی کہ انہیں شادی کرلینا چاہئے تھی۔ پھر وہ صاحبِ حیثیت تھے۔ انہیں تو کنواری لڑکی کا رشتہ بھی مل سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو سوتیلی ماں کی مصیبت سے بچانا چاہتے تھے۔ سو انہوں نے خود کو مار لیا۔

رئیس صاحب کی صحت بیوی کی موت کے بعد تیزی سے گرتی چلی گئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کے چہرے سے گرتے ہوئے بالوں سے' آنکھوں کے نیچے پڑنے والے سیاہ حلقوں سے ہوتا تھا۔ لیکن محنت وہ پہلے سے زیادہ کررہے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ انہیں بیوی کا غم بہت آہستگی اور تسلسل سے چاٹ رہا ہے۔ لیکن عثمان جانتا تھا کہ بات کیا ہے۔

عثمان کی عمر اتنی نہیں تھی لیکن وہ بہت زیادہ سمجھ دار تھا۔ کم عمری میں ماں یا باپ سے محروم ہوجانے والے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زندگی اور دکھ کا فلسفہ اور آگہی ان پر روشن ہوجاتے ہیں۔ عثمان پر بھی بہت کچھ کھل گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ غم انسان کو کبھی نہیں مارتا۔ مار ہی نہیں سکتا۔ غم میں اتنی طاقت' اتنی سکت نہیں ہوتی۔ انسان ہمیشہ غم سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوتا ہے۔ اللہ کسی کو غم دینا چاہے تو اس سے پہلے اسے ظرف عطا فرماتا ہے۔ انسان کو کسی آزمائش سے گزارنا ہو تو پہلے وقت کے ہاتھوں اس انسان کی تربیت کراتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہایت رحم والا' بے حد مہربان ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ اس کے باپ نے جو ہمیشہ سے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنے والا تھا اب باپ کی ذمے داری کے ساتھ ماں کی ذمے داری بھی اپنے اوپر لادلی تھی۔ یہ ایک کوہِ گراں تھا جس کے نیچے وہ دبتا جارہا تھا۔ آدمی دن بھر باپ بن کر بیٹے کے مستقبل کی خاطر محنت کرے اور رات بھر ماں بن کر اس کی باطنی ضروریات اور آسائشات کی فکر میں جاگے تو صحت تو تباہ ہونی ہی ہے۔

ماں کی موت کو چار سال ہوئے ہوں گے کہ ایک دن عثمان نے رئیس صاحب سے اس سلسلے میں بات کرہی لی "ابو' آپ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟" ایک رات اس نے ان سے کہا۔

"رکھتا تو ہوں بیٹے۔"

"کہاں رکھتے ہیں۔ اپنا حال تو دیکھئے۔۔۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں عثمان اور کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔"

"بات تو ہے ابو۔ آپ رات کو سوتے بھی نہیں۔ اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔"

"یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ میں سوتا نہیں ہوں۔"

"میں خود دیکھ رہا ہوں۔ رات میں جب بھی آنکھ کھلے تو آپ میرے پاس موجود ہوتے ہیں۔"

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں جب تمہارے کمرے میں آؤں تمہاری آنکھ کھل جاتی ہے۔" ابو نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

عثمان کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس کی بات مان کر رات کو اس کے کمرے میں آنا چھوڑ دیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بات مان لیں گے لیکن ایک خیال کے تحت وہ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ مطالبہ اس بات کی ضمانت نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ سو سکیں گے۔ اگر وہ اپنے کمرے میں جاگتے رہے تو یہ اور برا ہوگا۔ اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ ان کا دکھ اس کے دکھ سے بڑا ہے۔ ان کی محرومی زیادہ خوف ناک ہے۔ انہیں دل جوئی کی اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ امی اس کی امی تھیں لیکن ابو کی تو وہ شریکِ سفر تھیں' واحد محرمِ راز تھیں۔ اب وہ کسی کو اپنا دکھ نہیں سنا سکتے۔ کوئی نہیں' جس سے وہ دل کی بات کہیں۔ وہ تو اپنا ہر دکھ انہیں سنا دیتا ہے۔ اس کی دل جوئی تو وہ بھرپور طریقے سے کرتے ہیں لیکن ان کے سینے پر رکھا پہاڑ تو کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسے بھی نہیں۔۔۔

بہت سوچ کر اس نے ایک بات کہی "ابو' میری ایک بات مانیں گے؟"

"کہو بیٹے۔"

"آپ یہاں میرے پاس سویا کریں۔ مجھے اکیلے سونا اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"اتنے بڑے ہو کر۔۔۔"

"ابو' آپ کے لئے تو میں بچہ ہی ہوں۔" اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"چلو یہی سہی۔ لیکن بہت عجیب لگے گا۔"

یوں سولہ سالہ عثمان نے اپنے طور پر باپ کو جذباتی تحفظ فراہم کیا۔ اس کا فائدہ ہوا۔ ابو رات کو بے چین ہو کر جاگتے تو وہ بھی بیدار ہوجاتا۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتا۔ ان کے پاؤں دباتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ ابو شرمندہ ہوتے کہ انہوں نے اس کی بھی نیند خراب کی۔ یوں ان کے اندر بے خوابی کے خلاف مزاحمت پیدا ہوئی اور وہ سکون سے سونے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ وہ ابو سے لپٹ کر سونے لگا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ماں سے محرومی کی وجہ سے چھوٹا سا بچہ بن گیا تھا بلکہ اس لئے کہ ابو اسے چھوٹا سا بچہ لگتے تھے۔ اس کے خیال میں انہیں اس کی ضرورت تھی کہ کوئی ان سے لپٹ کر سوئے۔

وہ تعلیم حاصل کرتا رہا اور ابو کا کاروبار پھیلتا رہا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ابو کے ساتھ بڑی خوبی اور کامیابی سے کاروباری معاملات سنبھالنے لگا۔ اسے اپنے باپ پر فخر تھا۔ دنیا میں کسی کا ایسا باپ نہیں تھا۔

پھر ابو اس سے شادی کی ضد کرنے لگے "یار میں اب گھر میں بہو لانا چاہتا ہوں۔ مجھے خدمت کی ضرورت ہے اور کھیلنے کے لئے ایک پوتا بھی چاہئے۔"

"ابھی نہیں ابو۔" وہ کہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ کاروباری امور کو پوری طرح سمجھ کر ان پر حاوی ہو جائے۔ پھر اس چکر میں پڑے۔ وہ اس بری طرح کام میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے پاس فرصت ہی نہیں تھی۔

لیکن ابو کا اصرار جاری رہا "آخر تم بچ کیوں رہے ہو شادی سے؟" ایک دن انہوں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ایسی بات نہیں ابو۔" اس نے کہا اور اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

"لیکن یہ ہوگا کب تک۔ کسی وقت کا تعین تو کرو۔"

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "انشاء اللہ تیس سال کی عمر میں....."

ابو کی نگاہوں سے اداسی جھلکنے لگی "کہیں دیر نہ ہو جائے بیٹے۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ ابھی آپ بہت جئیں گے انشاء اللہ۔"

ابو اداسی سے مسکراتے رہے۔ انہوں نے کہا کچھ نہیں۔

یہ تھے اس کے باپ رئیس احمد۔ ایسا باپ' جو ماں بھی ہو' پوری کائنات ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ان کے انتقال پر اسے لگا کہ اس کی پوری کائنات لٹ گئی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ماں کا غم تو اس نے اٹھایا ہی نہیں تھا۔ وہ تو پورے کا پورا ابو نے بانٹ لیا تھا۔ اب دونوں غم اس پر ایک ساتھ آئے تھے۔

موت کا دکھ اپنی جگہ لیکن موت پچھتاوے بھی لاتی ہے۔ ہر موت کے ساتھ پچھتاوے لگے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک دکھ تو یہ تھا کہ ابو اس سے ہی نہیں' کسی سے بھی کچھ کہے بغیر چپ چاپ چلے گئے۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے اپنی سیکریٹری کو بلانے کے لئے بزر دیا۔ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دل پر ہاتھ رکھے جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ سیکریٹری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھے گئے۔ گھبرائی ہوئی سیکریٹری نے ڈاکٹر کو بلوایا لیکن پنچھی پنجرہ چھوڑ کر اڑ چکا تھا۔

عثمان حفیظ کے لئے وہ زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہا تھا لیکن سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ وہ جیسے کسی خلا میں معلق تھا۔ ایک پچھتاوا تھا کہ اپنا زہریلا ڈنک اس کے وجود میں چبھوئے جا رہا تھا۔ ابو کو بہو لانے کا' اپنے پوتے کو گود میں کھلانے کا کتنا ارمان تھا۔ وہ ان کی یہ آرزو بہ آسانی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے مجرمانہ غفلت برتی تھی اور ابو اپنا ارمان دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اف....! کیسا دکھ تھا یہ' کیسا پچھتاوا تھا۔ ان لمحوں میں اس نے سوچا کہ اب کبھی شادی نہیں کرے گا۔ اب شادی کیوں۔ اور کس کے لئے۔ اپنے لئے؟ ہرگز نہیں۔ یہی تو وہ سزا ہے جو اسے ملنی چاہئے۔ وہ اب زندگی بھر تنہا رہے گا۔

گھر میں لوگوں کا ہجوم تھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابو اور امی دونوں ہی کے قریبی رشتے دار اس دنیا میں نہیں تھے۔ دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے ابو اور امی بھی کم ہی ملتے تھے۔ وہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن سے انہیں تکلیفیں پہنچی تھیں لیکن اس وقت وہ سب جمع تھے اور اس کی دل جوئی میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے مگر عثمان تو اس وقت اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھا۔

تدفین کا مرحلہ قیامت کا تھا لیکن وہ قیامت ہی اسے ہوش میں لے آئی۔ ابو کو لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ وہ رخصت ہو رہے تھے۔ تمام تر ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اب اس چہرے کو وہ کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اب اس جسم سے وہ کبھی نہیں لپٹ سکے گا۔ اب یہ ہاتھ کبھی اسے پیار سے نہیں چھوئیں گے۔ کبھی اس کا سر نہیں سہلائیں گے۔ اسی لمحے گھپ اندھیرے میں کرن سی چمکی۔ اس کے وجود میں طمانیت ابھری اور ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ۔ دیکھنے والے دہل گئے کہ شاید وہ پاگل پن کی حدود میں داخل ہو رہا ہے لیکن اس کی طمانیت سچی تھی۔ اس نے سوچا' جسدِ خاکی تو مٹی کے سپرد کر دیا گیا لیکن ابو میرے دل میں' میری یادوں میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

تدفین کے بعد وہ گھر واپس آیا تو سنبھل چکا تھا۔ نام نہاد رشتے داروں کے سوا سب لوگ رخصت ہوتے گئے۔ سب سے آخر میں نجم صاحب رخصت ہوئے۔ وہ اس کے ابو کے سب سے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے رخصت ہوتے وقت بڑی شفقت سے اسے لپٹایا اور بولے "بیٹے کسی بھی وقت' کسی بھی سلسلے میں میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک مجھے رنگ کر دینا۔ رئیس کا بیٹا میرے لئے میری اولاد سے کم نہیں۔"

"شکریہ انکل۔"

نجم صاحب نے سرگوشی میں کہا "یہ تمہارے رشتے دار وہ ہیں جن سے تمہارے ماں باپ کبھی خوش نہیں رہے۔ تم انہیں ہینڈل کر سکو گے؟"

"جی انکل۔ آپ فکر نہ کریں۔"

ہوا بھی یہی۔ عثمان نے اپنے ان رشتے داروں کو بڑی کامیابی سے ہینڈل کیا۔ تیسرے روز فاتحہ کے بعد اس نے انہیں رخصت کر دیا۔ کسی حد تک بدمزگی بھی ہوئی کیونکہ ان میں کچھ ایسے تھے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر زندگی بھر اس کا غم بانٹنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کچھ اس کا گھر بسانا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں اس کے لئے مناسب ترین شریکِ حیات ان کی دخترِ نیک اختر تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو' ان میں سے کوئی بھی اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے ان پر واضح کر دیا کہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔

زندگی فوری طور پر پوری طرح تو معمول پر نہیں آئی لیکن گاڑی بہرحال چلنے لگی۔ اس نے خود کو کاروباری معاملات میں الجھا لیا کہ غم سے فرار کی یہی سب سے اچھی صورت تھی۔ دن بھر وہ خود کو خوب تھکاتا۔ رات کو نیند نہ ہونے کے باوجود وہ تھکن ہی اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی۔ پھر بھی بہت دیر تک اسے کروٹیں بدلنا پڑتیں۔

وہ ابو کے انتقال کے بعد ساتویں رات تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اس کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک حسین لڑکی کا دل نشیں چہرا ایسے ابھرا جیسے دھوئیں نے کوئی شکل اختیار کرلی ہو۔ مگر وہ چہرہ نظروں کے سامنے سے ہٹنے والا نہیں تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کے اندر کی کیفیت بدل گئی ہے۔ دل کی دھڑکنوں میں خوش گوار یت سی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی سرشاری اور انبساط کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ کھلی آنکھوں سے اس چہرے کو تکتا رہا۔ وہ مبہوت ہوگیا تھا۔ اس کا ذہن یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔ یادداشت اس کی تردید کررہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اتنے غور سے نہیں دیکھا۔ پہلے کبھی اس کے تصور میں کوئی چہرہ نہیں آیا۔ بلاشبہ اس نے زندگی میں سیکڑوں لڑکیوں کو دیکھا تھا لیکن اسے ان میں سے کسی کی صورت یاد نہیں تھی۔

مگر یہ چہرہ بھی فرضی تو نہیں۔ ذہن نے دلیل دی۔

پھر اس کے تصور میں اس چہرے کا گرد و پیش دھیرے دھیرے واضح ہونے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اردگرد کئی عورتوں کے سوگوار چہرے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر اسے نظر آئی ہوگی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ لڑکی تعزیت کے لئے آنے والی کسی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ صدمے اور دکھ سے نڈھال تھا۔ وہ اس کے شعور تک نہ پہنچ سکی لیکن لاشعور نے اس کے عکس کو محفوظ کرلیا اور اب چپکے سے ریلیز کردیا ہے۔

بے بسی یہ تھی کہ وہ یہ یاد نہیں کرسکتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اسے خود پر غصہ بھی آرہا تھا کہ کس حال میں وہ کیسا بکھیڑا لے بیٹھا۔ زندگی کے سب سے بڑے غم کے دوران اس نے خوشی تلاش کی اور جس طرح سے وہ چہرہ اس پر حاوی آرہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبروں پر گلاب کے پھول نہیں کھلتے۔ اس رات وہ سو نہیں سکا۔ وجہ دکھ نہیں تھا' محبت کی کسک تھی۔ اس محبت سے بھاگنے والے کو پہلی نظر کی محبت ہوگئی تھی۔

اسے خوف تھا کہ اس لڑکی کا تعلق اس کے کسی مطلبی رشتے دار سے ہی نکلے گا۔ ابو کی موت کے تین دن تک وہی لوگ چھائے رہے تھے۔ بہرکیف اسے تو اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے اپنے ہر رشتے دار کے گھر گیا۔ بظاہر وہ ابو کے دکھ میں ساتھ دینے پر ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ وہ سب اس کے سامنے بچھ بچھ گئے لیکن گوہر مقصود اسے نہ مل سکا۔ متلاشی نگاہوں کو مایوسی کے سوا کچھ میسر نہیں آیا۔

وہ مایوس ہونے لگا۔ کیا وہ چہرہ محض اس کا تصور ہے۔ تخیلاتی ہے؟ ایسا ہے تب بھی اسے ڈھونڈ نکالنا ضروری ہے۔

ایک دن نجم صاحب دفتر آئے اور اس سے ملے۔ اس عرصے میں انہوں نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ کاروباری معاملات میں انہوں نے اسے بہت قیمتی مشورے دیئے تھے۔ بہت کام کی نصیحتیں کی تھیں۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر جو کمی رہ گئی تھی' انہوں نے پوری کردی ہے۔ اب وہ اپنا کاروبار خود سنبھال سکتا تھا۔ ساتھ ہی وہ ان کے خلوص اور محبت کا قائل ہوگیا تھا۔

اس روز نجم الحسن نے اس سے کہا "عثمان میاں' تم ہمارے ہاں کبھی نہیں آئے۔ تمہاری چچی ہمیشہ تمہیں پوچھتی ہیں۔ مجھ سے لڑتی ہیں کہ اسے ساتھ کیوں نہیں لاتے۔"

"بس انکل' مصروفیت ہی ایسی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم نے اپنے اطراف مصروفیت کا انبار لگالیا ہے۔ جانتا ہوں کہ تم کس چیز سے لڑ رہے ہو لیکن میاں' جنگ میں اپنے حلیفوں کو نظرانداز نہیں کیا جاتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل....."

"بس آج تم میرے ساتھ گھر چلو گے۔" نجم الحسن نے حتمی لہجے میں کہا "میں چھ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔ اس وقت تک کام نمٹالینا۔"

عثمان کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ایسے خلوص اور محبت سے منہ بھی نہیں موڑا جاسکتا۔ وہ جانتا تھا کہ نجم صاحب کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کاروباری طور پر وہ اس سے کہیں زیادہ مستحکم تھے۔ اس نے ہامی بھرلی۔

چھ بجے نجم صاحب اسے لینے آگئے۔

ڈیفنس سوسائٹی میں نجم صاحب کا خاصا خوب صورت بنگلا تھا۔ ان کی بیگم عثمان سے بڑے تپاک اور محبت سے ملیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "بیٹے آتے رہا کرو یہاں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ ہاں' یہ بات میں رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"شکریہ آنٹی۔"

انہوں نے اسے اپنے دونوں بیٹوں سے ملوایا۔ سعود اور محمود کی عمریں اٹھارہ اور بیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ دونوں بہت خوش اخلاق اور ملنسار لگے۔ ان کے انداز میں عثمان کے لئے محبت اور احترام تھا۔ دونوں ہی ابھی تعلیم حاصل کررہے تھے۔

ان کے درمیان کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر نجم صاحب نے کہا "بھئی لان پر چلو۔ چائے وہیں پئیں گے۔"

وہ لان پر آگئے۔ وہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ عثمان کو لان بہت پسند آیا۔ اس کی ترتیب میں نفاست اور سلیقہ تھا۔ پودوں میں کوئی

ایک پتا کوئی ایک ٹنی فاضل نہیں تھی۔ گھاس ہموار تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ہر لمحے اس کی نگہداشت کی جاتی ہے۔

"آپ کا مالی یقیناً بہت اچھا اور محنتی ہے اور درختوں اور پودوں سے محبت بھی کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہاری سب باتیں درست ہیں بس ایک بات غلط ہے۔ وہ مالی نہیں' مالن ہے۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ابھی تمہیں اس سے ملوائیں گے۔ لو وہ آگئی۔"

عثمان نے اشارے کی سمت دیکھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ وہ لڑکی چائے کی ٹرالی دھکیلتی اسی طرف آرہی تھی۔ اس کے سر پر آنچل تھا۔ چہرہ بھی اوٹ میں تھا۔ بہرحال لباس سے اور اپنے پُراعتماد انداز سے وہ مالن نہیں لگ رہی تھی۔

وہ ٹرالی لے کر آئی تو اس کے چہرے کی سائیڈ عثمان کی نظروں کے سامنے تھی۔ پھر وہ سلیقے سے پیالیاں سب کے سامنے میز پر رکھنے لگی۔

"یہ ہماری مالن بھی ہے' باورچن بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری چہیتی بیٹی ہے..... شہناز۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پاپا....." اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

لیکن عثمان کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ جس چہرے کو تلاش کرتے کرتے وہ مایوس ہوچکا تھا' وہ خلافِ توقع اس کے روبرو تھا۔ اس کا دل اس کے نام کی گردان کیے جارہا تھا... شہناز' شہناز' شہناز.....

اسی لمحے شہناز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی والہانہ نظروں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ اسے اس کا یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

لیکن عثمان اس وقت ہر چیز سے بے نیاز تھا!

○☆○

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی۔ شہناز کے ساتھ اس وقت مسز مسعود کھڑی تھیں۔ وہ بھی مسلسل بول رہی تھیں۔ شہناز یہ ظاہر کررہی تھی کہ وہ پوری توجہ سے ان کی بات سن رہی ہے۔ وہ کبھی اثبات میں سر ہلاتی' کبھی نفی میں اور کبھی پُرزور لہجے میں جی ہاں' یہی بات ہے۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہہ دیتی۔ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

بیگم رضوی کی وہ سرگوشی اس نے بھی سن لی تھی۔

یہ سن کر اسے شاک لگا تھا کہ اسے اور عثمان کو اس سال کا مثالی جوڑا قرار دیا جارہا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد مسز شمیم اس کا باقاعدہ اعلان کردیں گی۔ فوری طور پر تو اس بات کا تاثر اس پر پوری طرح مرتب نہیں ہوسکا تھا مگر اب جیسے وہ قطرہ قطرہ دریا بن رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اندر تمسخر امنڈ رہا تھا۔

۲۵ سال پر پھیلی ہوئی منافقت بھری ازدواجی زندگی اور مثالی جوڑے کا ایوارڈ!

مثالی جوڑا... ہنہ! اس نے نفرت اور حقارت سے سوچا۔ یہ لوگ سمجھتے کیا ہیں۔ یہ ایوارڈ ہے ہی احمقانہ۔ دنیا میں مثالی جوڑے کا وجود ہے کہیں؟ اور یہ ہر سال ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ کبھی اپنی ازدواجی زندگی کے آئینے میں دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔

وہ جانتی تھی کہ اس تقریب میں موجود ہر شخص کیسی ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ سب کے ہاں 'تلخیاں' بے وفائیاں اور منافقتیں تھیں۔ معاشرے سے ڈرنے والوں میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنا اصلی روپ دکھا سکتے۔ کسی اور کو کیا کہتی۔ اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ پچھلے بیس سال سے عثمان سے نوشی اور عیاشی میں مبتلا تھا۔ تقریباً اتنے ہی عرصے سے ان دونوں کے درمیان محبت کا سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ سلسلہ دو طرفہ نہیں' یک طرفہ تھا۔ بہرحال تھا تو سہی۔ لیکن منافقت کے بیس سال! بیس سال بہت ہوتے ہیں۔ اتنے عرصے میں تو عادتِ بد فطرتِ ثانیہ کا روپ دھار لیتی ہے۔ اتنے عرصے میں تو جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بن جاتا ہے۔

شہناز کو تقریباً ستائیس سال پہلے کا وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اس کی زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس روز عثمان پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ اگر عثمان سے اس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو آج وہ دن اسے یاد بھی نہ ہوتا لیکن اب تو وہ اس دن کو کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ یادوں میں کھو گئی!

○☆○

اس نے چائے کی پیالی عثمان کے سامنے رکھتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سا ضدی پن تھا اور انداز بے حد والہانہ تھا۔ شہناز کو بہت برا لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ کیسا شخص ہے یہ؟ اس نے سوچا۔ اسے لڑکیوں کو دیکھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔

"چینی کتنی ڈالوں؟" اندر کی ناگواری اس کے لہجے میں بھی در آئی۔

وہ بری طرح چونکا اور گڑبڑا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"جتنی جی چاہے' ڈال دیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

شہناز جل کر رہ گئی۔ اس نے بڑے اہتمام سے آدھا چمچہ چینی اس کی چائے میں ڈالی اور دیر تک ہلاتی رہی' جیسے صرف ہلانے سے چائے میٹھی ہوجائے گی۔

لیکن عثمان نے وہ چائے بڑی رغبت سے پی۔ اس روز وہ رات کے کھانے تک رکا رہا۔ ممی اور پاپا اس کے سامنے بچھے جارہے تھے۔ وہ تمام وقت کڑھتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اس کے سامنے ہی نہ آئے۔ مگر یہ کہاں ممکن تھا۔

شہناز نے جب بھی نظریں اٹھائیں' اسے اپنی ہی طرف نگہ راں پایا۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں تنہائی اور سکون ممکن ہی نہیں۔ اس کی جھنجلاہٹ حد سے گزری تو اس نے سر اٹھایا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر عثمان چند لمحوں میں ہی گڑبڑا گیا اور نظریں نیچی کر لیں۔

تاہم شہناز اسے دیکھتی رہی۔ اب وہ اسے غور سے اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اندر کی سختی نرمی میں تبدیل ہونے لگی۔ جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی' تھا ہی کچھ ایسا۔ اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ بے حد خوب رو جوان ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مزاج کی نرمی ہویدا تھی۔ اس کا انداز مدبرانہ تھا۔ آواز اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس' نرمی اور دل نشینی تھی۔ غرض ہر زاویے سے وہ کوئی ہیرو ہی لگتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی نگاہوں میں اس کے لئے وارفتگی تو تھی لیکن وہ ہوس اور گرسنگی نہیں تھی جس سے اس کا زیادہ تر واسطہ پڑتا تھا۔ مختصر یہ کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتی تھی بلکہ جانے کتنی تو اب تک ہو چکی ہوں گی۔ اسے دیکھتے ہوئے شہناز نے سوچا۔

لیکن شہناز ایسی لڑکیوں میں شامل نہیں تھی... ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

پہلی بات تو یہ کہ اس کا مرد کا تصور بے حد مختلف تھا۔ اس کے نزدیک سخت ہونا ایک خالص مردانہ وصف تھا۔ نرمی کو وہ نسوانی خوبیوں میں شمار کرتی تھی۔ مرد صنفِ قوی ہے سو اسے قوی نظر آنا چاہئے۔ اس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ وہ کسی بحران میں کوئی کمزوری نہ دکھائے بلکہ مردانہ وار اس کا سامنا کرے۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ مرد ہی کیا جو عورت کو رلانا بھی نہ جانتا ہو۔ بلکہ عورت کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہے۔ ایسا مرد عورت کو تحفظ کا وہ احساس کیسے دے سکتا ہے جو عورت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسے وہ مرد مرد لگتے تھے جو جارحانہ رویے کے حامل ہوتے' نروس ہو جانے والے مرد اسے مرد ہی نہیں لگتے تھے۔

اس نے پہلی بار عثمان حفیظ کو اس دن دیکھا تھا جب اس کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔ وہ امی کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت غور سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی ظاہری شخصیت کے بارے میں اس روز بھی اس نے اسی انداز میں سوچا تھا۔ وہ اسے چاہے جانے کے قابل لگا تھا۔ بہت ڈیشنگ پرسنالٹی تھی اس کی۔ اگر شہناز کی زندگی میں پہلے ہی مشکور نہ آگیا ہوتا تو شاید وہ اس دن اسے دل دے بیٹھتی۔

لیکن اس روز بھی اس کی شخصیت کا دکھ کے سامنے سرنگوں ہونے والا پہلو اسے اچھا نہیں لگا۔ عثمان نے اس روز اسے بس ایک نظر دیکھا تھا۔ اور وہ بھی شہناز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دکھ سے نڈھال اس خوب رو جوان کو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے' نہ سنائی دے رہا ہے۔ اس کے لئے تو یہی بڑا کمال تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں رویا.... عورتوں کی طرح بین کر کے نہیں رویا۔ حالانکہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے اندر وہ بین بھی کر رہا ہے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو بھی رہا ہے۔ شہناز کو اس کا یہ عورت پن ذرا اچھا نہیں لگا۔ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ اس کی عمر ۲۵ سے زیادہ ہی ہوگی اور اتنی عمر میں تو آدمی کو موت کی حقیقت سے آگہی ہو ہی جاتی ہے۔ جبکہ وہ تو اس سے پہلے ماں سے محروم ہو چکا تھا۔ موت اور اس کا دکھ اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ پھر ایسی کم ظرفی کیوں؟

شہناز نے ایک لمحے کو بھی یہ نہ سوچا کہ دکھ کی آگہی دکھ کو کم نہیں کرتی۔ ایک موت دیکھ لینے سے دوسری موت کا صدمہ نہیں گھٹتا۔ دکھ کو اس طرح جھیلنا کہ اندر آنسوؤں کا بپھرا ہوا سمندر ہو اور آنکھیں نم نہ ہوں' کمزوری نہیں' مضبوطی ہے۔ نسوانیت نہیں' مردانگی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکی کہ ماں کے کھونے کے بعد باپ کو کھونا دہرا دکھ ہوتا ہے۔ ہر نئی موت اپنے ساتھ ہر پچھلی موت کا دکھ بھی لاتی ہے۔ اس معاملے میں تجربہ کسی کام نہیں آتا لیکن شہناز یہ بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اب تک کسی کو کھویا ہی نہیں تھا۔

شہناز اب بھی عثمان کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاید ان نسوانی کمزوریوں کے باوجود وہ اس خوب صورت شخص کی محبت میں گرفتار ہو جاتی لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ پہلے ہی کسی کی اسیر ہو چکی تھی۔ مشکور علی کی!

مشکور اس کے لئے آئیڈیل مرد تھا۔ وہ ہر اعتبار سے اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ اس سے کالج میں ملی تھی اور فوراً ہی متاثر ہو گئی تھی۔ اس میں وجاہت سے زیادہ جو مردانہ پن تھا وہ اس کے لئے باعثِ کشش تھا۔ وہ ایک سرکاری افسر کا بیٹا تھا۔ ذہین' پُرجوش اور اولوالعزم تھا۔ لیکن پڑھائی کی طرف اس کی پوری توجہ نہیں تھی۔ اس کے برعکس اسپورٹس میں وہ زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔

کالج میں مشکور شہناز سے دو سال سینئر تھا۔ بی اے میں اس نے سیکنڈ ڈویژن لی اور پھر پڑھائی چھوڑ کر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر لی۔ شہناز اس کے کالج چھوڑنے کے بعد بھی اس سے ملتی رہی۔ وہ اکثر اس کی ملازمت کے سلسلے میں اسے چھیڑتی۔ درحقیقت یہ مشکور کا کمزور ترین پہلو تھا۔ شہناز جانتی تھی کہ اس ملازمت میں مشکور کا کوئی روشن مستقبل نہیں ہے۔ خود اسے تو اتنی پروا نہیں تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ جب بھی شادی کا مسئلہ کھڑا ہوگا' پاپا اس کمزوری کی بنیاد پر اس رشتے پر ہچکچائیں گے۔

"ارے... یہ تو میں صرف تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کر رہا ہوں۔" مشکور ہمیشہ خوش دلی سے کہتا "میری اڑان کا تو تمہیں پتا ہی نہیں ہے۔ دیکھنا' میں بہت کچھ کروں گا۔ یہ دنیا تمہیں میرے قدموں میں پڑی نظر آئے گی۔ مجھے تو کائنات کو تسخیر

کرنا ہے۔"

اور شہناز فخر سے اسے دیکھتی رہتی۔

تو مشکور جیسے مرد کے ہوتے ہوئے شہناز عثمان کو بھلا کیسے خاطر میں لاتی۔ اسے تو اس کی والہانہ نگاہیں بہت بری لگتیں۔ اسے الجھن ہوتی تھی۔ اس نے جان لیا کہ اگر ان نگاہوں سے واسطہ پڑتا رہا تو وہ اس سے چڑنے لگے گی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ کاتبِ تقدیر نے اسے اس کا مقدر کردیا ہے.....

○☆○

"ازدواجی زندگی بے حد اہم چیز ہے۔" مسز شمیم کہہ رہی تھیں۔

عثمان حفیظ نے سر جھٹکا۔ بے شک۔ وہ بڑبڑایا۔ اس سے کم از کم میں انکار نہیں کرسکتا۔

اداسی اس کے وجود میں سرایت کررہی تھی۔ دل بہت بوجھل ہوگیا تھا۔ ایک پہاڑ سا بوجھ پچیس سال تک اٹھا کر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تازہ دم رہے۔ ماندگی اور اداسی نہ کمائے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کی فلم سی چلنے لگی۔ مسز شمیم کی آواز معدوم ہوتی گئی۔

وہ سرشاری اور بے خودی کے عجیب عالم میں تھا۔ کام کے دباؤ میں بھی شہناز کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ فرصت کے لمحوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ان میں تو وہ شہناز سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہورہا تھا کہ محبت کیسا طاقت ور اور دل آویز جذبہ ہے۔ اس میں تو ہر سانس لذت آمیز ہوتی ہے۔

ہر شام اس کا جی چاہتا کہ دفتر سے اٹھے تو اپنے گھر کے بجائے نجم صاحب کے گھر چلا جائے۔ وہاں سب کچھ بھول کر شہناز کو تکتا رہے لیکن وہ خود سے لڑتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے گھر جانے کے ارادے سے نکلتا اور پھر خود کو ڈیفنس جانے والی سڑک پر ڈرائیو کرتے پاتا۔ یہ کیا مصیبت ہے' کیا میرے ارادے بھی محبت کے تابع ہوجائیں گے؟ وہ جھنجلا کر سوچتا اور گاڑی کا رخ موڑتا۔

نجم صاحب کے گھر جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ پچھلی بار اسے رخصت کرتے وقت فہمیدہ آنٹی نے اس سے آتے رہنے کو اس کثرت سے کہا تھا کہ اسے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اصرار رسمی نہیں ہے بلکہ خلوص پر مبنی ہے۔ اسے علم تھا کہ وہ جائے گا تو اسے بہت گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ پھر بھی وہ وہاں جانے سے بچ رہا تھا۔ اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ ایک بار اس نے خود کو اس معاملے میں ڈھیل دے دی تو پھر وہ ہر روز وہاں جانے لگے گا۔ وہ خود کو کبھی نہیں روک سکے گا۔ اور قدر کھوتا ہے ہر روز کا آنا جانا۔

دو ہفتے اس نے جیسے تیسے گزارے مگر اب اس کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔ وہ شہناز کی صورت دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے رہا تھا لیکن ایک اور دفاعی حصار سامنے آگیا تھا۔ آنٹی نے اسے کہا تھا کہ وہ آتا رہے لیکن وہ دو ہفتے گزرنے کے باوجود وہاں نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے ان کے اصرار کی' خلوص کی توہین کی ہے۔ وہ لوگ یقیناً ناراض ہوں گے اس لئے نجم صاحب نے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا۔ اب وہ ان کے گھر جائے تو کس منہ سے جائے۔

تین دن اور گزرے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بن بلائے ان کے گھر نہیں جاسکے گا۔ اب وہ یہ دعا ہی کرسکتا تھا کہ وہ خود اسے بلائیں۔

اور اس کی دعا قبول ہوگئی۔

اس روز فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "عثمان حفیظ اسپیکنگ۔"

"ہم سے ناراض ہو عثمان؟" دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے پوچھا۔

"جی۔ میں آپ کو پہچانا نہیں۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری فہمیدہ آنٹی بول رہی ہوں۔"

اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے سے نکل آئے گا۔

"سوری آنٹی... رئیلی سوری کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔"

"کوئی بات نہیں۔ فون پر پہلی بار میری آواز سنی ہے نا۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اتنے دن ہوگئے۔ تم ہمارے گھر نہیں آئے۔ ہم سے ناراض ہو کیا؟"

"ارے نہیں آنٹی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر؟ ہم شاید اپنے خلوص کا پوری طرح تمہیں یقین نہیں دلا سکے۔ میں نے تو اتنی بار کہا تھا کہ میں تم سے رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔ تمہارا آنا ہمیں اچھا لگے گا۔ وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"میں جانتا ہوں آنٹی لیکن کیا کروں' مصروفیت ہی اتنی ہے۔"

"میں جانتی ہوں اسی لئے تو کہتی ہوں کہ روز آجایا کرو۔ آدمی دکھ سے لڑتا ہے تو مصروفیت ہی کو ہتھیار بناتا ہے۔ پھر اکیلے گھر جانے کا تصور بھی دفتر سے نہیں اٹھنے دیتا ہوگا۔"

عثمان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کیسی گہرائی میں محسوس کرکے کیسی سچی بات کہی ہے انہوں نے۔ کوئی کسی غیر کو اس طرح محسوس کرسکتا ہے۔

"پھر یہاں بھی سب تمہارے گرویدہ ہوگئے ہیں۔" آنٹی کہہ رہی تھیں "میرے دونوں بیٹے روز تمہیں یاد کرتے ہیں۔ بس آج شام آجاؤ۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ یوں ہانپتا رہا' جیسے میلوں دوڑا ہو۔ آنٹی نے کہا تھا' سب گرویدہ ہوگئے ہیں تو کیا شہناز بھی.....؟

اس شام وہ سینے میں رقصاں دل لئے نجم صاحب کے گھر چلا گیا۔ واقعی وہ اس کے منتظر تھے۔ دونوں لڑکے اس سے یوں ملے' جیسے وہ کوئی ان کا برسوں کا بچھڑا بھائی ہو۔ ان کا بس چلتا تو وہ اپنے

سوا کسی اور سے اسے بات بھی نہ کرنے دیتے۔ ان کے پاس موضوعات کی بھی کمی نہیں تھی۔ کرکٹ' ٹینس' سیاست' تعلیم۔

"ہم نکل نظر نہیں آرہے؟" عثمان نے آنٹی سے پوچھا۔

"وہ تو اچانک ایک کاروباری دورے پر نکل گئے تھے ورنہ تمہیں فون کرنے میں اتنے دن نہ لگتے۔" آنٹی نے کہا "وہ تو میں نے بڑی مشکل سے تمہارا نمبر تلاش کیا۔ کئی دن سے کوشش کررہی تھی۔"

اس روز عثمان کو احساس ہوا کہ بھائیوں کے برعکس شہناز بہت کم سخن ہے۔ پھر پہلی بار اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جانے پر اس کا ردِعمل بھی دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے حد واضح ناگواری تھی۔ عثمان کے نزدیک وہ ردِعمل فطری تھا۔ یوں دیکھے جانا کسی کو بھی اچھا نہیں لگ سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس وارفتگی سے لڑنا ہوگا۔ اسے یوں دیکھنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس دن کے بعد عثمان کی جھجک نکل گئی۔ وہ باقاعدگی سے نجم صاحب کے گھر جانے لگا۔ ایک دن چھوڑ کر جانے کا معمول بن گیا تھا۔ کبھی دو دن کا وقفہ ہوجاتا تو اسے فون پر آنٹی کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ شہناز کے سوا سب سے بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اب وہ اس گھر کے فرد کی طرح تھا۔

سب کچھ ہوگیا لیکن وہ شہناز سے بے تکلف نہیں ہوا۔ شہناز نے بھی کبھی رسمی باتوں کے سوا اس سے بات نہیں کی۔ اپنی گستاخ نگاہوں کے معاملے میں عثمان بہت محتاط ہوگیا تھا۔ پھر بھی کبھی نگاہ اٹھ ہی جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ ان نظروں کا مکمل مفہوم تو کبھی نہیں سمجھ سکا' اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ تولنے والی نظریں تھیں جیسے وہ اسے سمجھنے' اس کی اصل پیمائش کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ پھر یہ بھی تھا کہ اس کے دیکھنے پر بھی شہناز نے کبھی نظریں نہیں جھکائیں۔ الٹا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی' جیسے اسے چیلنج کررہی ہو۔ اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔

عثمان نے کبھی اس چیلنج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ محبت میں چیلنج قبول کرنے کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ تو محبت کا طالب علم تھا۔ جذبوں' جس پر محبت کے اسرار ایک ایک کرکے کھل رہے۔ اور اسے حیران کررہے تھے۔ جب محبت سے ناآشنا کوئی شخص پہلی بار کسی کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو ایک خاص عرصے تک اپنے آپ میں گم ہوجاتا ہے۔ وہ محبت کے حوالے سے خود کو جاننے کی اور اپنے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ دوسروں کو' باہر کی دنیا کو بلکہ اپنے محبوب تک کو سمجھنے کی فرصت اس کے پاس نہیں ہوتی۔ اپنے اندر گم ہونے اور اس کیفیت کے عرصے کی طوالت کا انحصار اس کی محبت کی شدت' گہرائی اور سچائی پر ہوتا ہے۔ محبت جتنی شدید' گہری اور سچی ہوگی' یہ عرصہ اتنا ہی طویل ہوگا۔

عثمان بھی اس عرصے سے گزر رہا تھا۔ اس نے شہناز کے اس چیلنج کو دیکھا لیکن سمجھا نہیں بلکہ اس نے اسے سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس نے تو بس اتنا دیکھا کہ شہناز اسے تولنے' تولنے والی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جب تک کوئی دلچسپی نہ ہو' کوئی کسی کو ایسے نہیں دیکھتا۔ یہ بات اس کے لئے بہت تھی کہ شہناز اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ مطمئن ہوگیا کہ اس کا جذبۂ محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ اس کے لئے تو بس وہ نظر حوصلہ افزا تھی۔

پھر وہ اس عرصے سے گزر گیا جس میں اس کے اندر کی خوب صورتی اور وسعت نے اسے اسیر کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوب صورتی محبت کی عطا کی ہوئی ہے۔ وہ حیرت سے سوچتا' کیا محبت ایسا حسین' ایسا طاقت ور اور ایسا بے کراں جذبہ ہے کہ آدمی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ پیتل کو سونا بنادیتا ہے۔ اپنی تبدیلیاں اسے خود بھی بہت اچھی لگی تھیں۔

اس عرصے سے گزرا تو باہر کی دنیا سے اس کا تعلق جڑا۔ اس نے دنیا کو اور دوسرے لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر موجود جھیل جیسی پُرسکون اور خوب صورت محبت اپنا اظہار' اپنا اثبات چاہتی ہے۔ اور وہ خود بھی اسے چھپا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ یوں اس کے لئے ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ وہ یہ سب کچھ کسے بتائے؟ ایک طرف وہ اس محبت کو بیان کرنا چاہتا تھا تو دوسری طرف اس کے اندر اس کے خلاف مزاحمت بھی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ محبت کو اور اس کی خوب صورتی کو وہ ٹھیک طور پر بیان نہیں کرسکے گا۔ بیان کے نتیجے میں محبت ہلکی اور گھٹیا ہوجائے گی۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

دل میں کوئی اچھی بات بھی بہت دن تک رہے تو بوجھ بن جاتی ہے۔ شیئر کرنا' وہ دکھ ہو یا سکھ' اچھی بات ہو یا خراب' انسان کی فطرت ہے۔ وہ خاموش اور اَن کہی محبت عثمان کے لئے بوجھ بن گئی۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ محبت بھی بڑھ رہی تھی اور بوجھ بھی۔ ایک وقت آیا کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہیں کیا تو کسی دن وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

قدرتی طور پر اسے دل کا بوجھ شہناز کے سامنے ہلکا کرنا چاہئے تھا لیکن وہ اس کے سامنے اپنی محبت کو ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خواہش کے باوجود اس کے سامنے اس کی زبان نہیں کھلی۔ اس کے علاوہ ایک اور رکاوٹ بھی تھی۔ وہ صرف شہناز نہیں تھی' نجم انکل اور فہمیدہ آنٹی کی بیٹی بھی تھی۔ سعود اور محمود کی بہن بھی تھی۔ ان سب لوگوں نے اسے اعتماد اور محبت سے نوازا تھا۔ اسے اپنے گھر کے فرد کا درجہ دیا تھا۔ ایسے میں اسے زیب نہیں دیتا تھا کہ براہِ راست شہناز سے اپنے دل کی بات کہے۔ یہ تو گھٹیا پن ہوتا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ وہ انکل نجم سے یا آنٹی سے شہناز کو مانگ لیتا۔

جب یہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہونے لگا تو اس نے اپنے بچپن کے دوست احسان سے سب کچھ کہہ دیا۔ احسان نے بہت توجہ سے اس کی بات سنی مگر زیرِ لب مسکراتا رہا۔ عثمان اس مسکراہٹ سے چڑ گیا "یہ گدھے کی طرح اپنے ہونٹ کیوں پھیلائے جا رہے ہو؟"

"گدھا میں نہیں' تم ہو۔ مجھے کیوں سنا رہے ہو یہ کتھا۔" احسان نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "بھائی۔ میرا نام شہناز نہیں ہے۔ نہ میں تمہارے اس اظہارِ محبت کا اہل ہوں' نہ ہی مستحق ہوں۔ میں تمہیں جواب میں وہ محبت بھی نہیں دے سکتا جو تمہیں ملنی چاہئے۔"

"ہر وقت مسخرا پن نہ کیا کرو۔" عثمان نے اسے ڈپٹا "میں شہناز سے یہ گفتگو نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

جواب میں عثمان نے اپنی وجوہات بیان کر دیں۔

احسان ہنسنے لگا "تمہاری بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ بھائی' تم اس سے کوئی گناہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو کہ احساسِ جرم کا شکار ہو۔ یہ کوئی ناجائز کام تو نہیں۔"

"بس مجھے لگتا ہے کہ میں انکل اور آنٹی کے اعتماد کو مجروح کروں گا اس طرح۔"

"اپنی اوندھی منطق خود ہی جانو اور خود ہی بھگتو۔ میرے خیال میں تو شہناز سے بات کرنے میں کوئی برائی نہیں۔"

عثمان کے ذہن نے احسان کی بات درست تو تسلیم نہیں کی۔ پھر بھی ایک ترغیب سی اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اس کا فیصلہ اب بھی یہی تھا کہ اسے شہناز سے ایسی کوئی بات نہیں کرنی۔ لیکن جب وہ شہناز کے قریب ہوتا تو ترغیب اسے کچھ کرنے' کچھ کہنے پر اکساتی۔

شہناز اب بھی اسے اسی طرح دیکھتی تھی۔ وہ نظریں اٹھاتا تو وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی۔ اس کی نگاہوں میں تمسخر اور چیلنج ہوتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر عثمان کے ہونٹ اس سے کچھ کہنے کے لئے مچلے۔ ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں نکلی۔

شہناز اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس کے لہجے میں التجا سی تھی۔ اسے کچھ کہنے پر اکساتی ہوئی' بڑھاوا دیتی ہوئی التجا۔

ترغیب نے عثمان کے دل میں اس بے رحمی سے پنجے چبھوئے کہ وہ تلملا گیا۔ آخر کار فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔

○☆○

"یہ وہ ستون ہے' جس کے بل پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔۔۔" مسز شمیم ازدواجی زندگی کے متعلق کہہ رہی تھیں۔

"بھئی شہناز' پکی بات یہ ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو۔" بیگم سلیمان نے شہناز سے کہا "کیسی بھرپور اور خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری ہے تم نے۔۔۔"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ؟" شہناز نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی تمہارا چہرہ' تمہارا جسم' تمہاری تازگی اور شادابی گواہی دیتی ہے۔ شادی کو پچیس سال ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ نصف صدی پرانی تو ہو تم لیکن دیکھنے میں ۳۰' ۳۲ سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی چھٹائی بڑائی ہو گی مجھ میں اور تم میں۔۔۔"

چھٹائی بڑائی! شہناز نے دل میں بھنا کر سوچا۔ مطلب یہ کہ مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہی ہوں گی بڑی نہ ہوں۔۔۔

"اور مجھے دیکھو۔ اپنی عمر سے کتنی بڑی لگتی ہوں۔ کاش ازدواجی زندگی کے معاملے میں' میں بھی تمہاری طرح خوش نصیب ہوتی۔"

"کاش' ایسا ہی ہوتا۔" شہناز نے جل کے کہا لیکن لہجہ ہمدردانہ رکھا۔ اندر ہی اندر وہ بڑی حقارت سے لفظ خوش نصیب کی گردان کر رہی تھی۔

یادوں کی ٹوٹی ہوئی ظلم پھر سے جڑ گئی۔

عثمان حفیظ بڑے تواتر سے ان کے گھر آنے لگا تھا۔ اس کے انداز میں اب بلا کی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اس گھر کا ہی فرد ہو۔ محمود اور مسعود اس کے گرویدہ تھے۔ ممی اور پاپا تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔

دوسری طرف عثمان کا رویہ بھی اب پہلے سے مختلف ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح پاگلوں کے سے انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اسے نہیں دیکھتا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کی یہ حرکت اسے بیجا طور پر ناگوار گزری ہے۔ یہاں اسے پھر اس کی یہ کمزوری بری لگی۔ مردوں کو یوں ناگواری کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ مرد تو وہ ہے جو ڈٹا رہے۔ کسی عورت کی آرزو کرے تو اسے حاصل کئے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔ اس نے سوچا۔ یہ شخص ہے ہی کمزور۔ اس کی شخصیت میں بودا پن ہے۔

شہناز دودھ پیتی بچی نہیں تھی۔ پھر مشکور کی محبت نے بھی اس کی سمجھ داری میں اضافہ کیا تھا۔ مردوں کی نظروں کے معاملے میں عورتوں کو ویسے بھی فطری شعور ہوتا ہے۔ معصوم بچیاں تک مردوں کی نظروں کو پہچان لیتی ہیں۔ شہناز نے بھی عثمان کی والہانہ نظریں' اس کی وارفتگی دیکھی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہی نہیں' اسے اس کی محبت کی شدت کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ جس شخص کو کسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس بات کا خیال بھی نہ رہے کہ اسے اس عالم میں جو بھی دیکھے گا اس کے راز کو جان جائے گا' وہ اپنے آپ میں ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر شہناز نے ممی اور پاپا کی عثمان سے محبت بھی دیکھی تھی۔ وہ جس طرح سے اس پر جان چھڑکتے تھے' وہ خطرناک تھا۔ جوان بیٹی کے ماں باپ اگر کسی جوان آدمی پر والہ و شیدا ہوں تو اس کا صرف ایک سبب ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ اس جوان کو اپنا بیٹا بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کا مستقبل اس سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں' داماد کی محبت بیٹے سے زیادہ ہوتی ہے اور اس کے داماد بننے سے

پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی کسی لڑکی کے والدین کے دلوں میں کسی خاص شخص کو داماد بنانے کی خواہش جاگتی ہے وہ اسے اولاد کی طرح چاہنے لگتے ہیں۔

شہناز کو احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ عثمان حفیظ خود بھی خطرناک آدمی تھا۔ اس کی خطرناکی اس کی اہلیتوں میں نہاں تھی۔ اسے معقولیت کے ساتھ مسترد کرنا مشکل ہی نہیں' ناممکن تھا۔ معاشی اعتبار سے وہ مستحکم تھا۔ محنتی بھی تھا اور کاروباری شعور بھی رکھتا تھا۔ صورت شکل اور شخصیت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھا۔ خوش گفتار بھی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کردار کے اعتبار سے بھی وہ بے داغ ہے۔ ایسے آدمی کو کوئی کیسے مسترد کر سکتا ہے۔

شہناز ذہین تھی۔ اس دشواری کو خوب سمجھتی تھی۔ اگر مشکور اسے پہلے نہ مل گیا ہوتا تو وہ خود بھی ہچکچائے بغیر عثمان کو قبول کر لیتی لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ صورتِ حال کو اور زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ بات اگر رشتے کی حد تک پہنچ جاتی تو معاملہ مشکل ہو جاتا۔ اور بات وہاں تک پہنچنا ہی تھی۔ عثمان کم ہمت اور بزدل تھا۔ وہ چاہتا تھا لیکن اس کے روبرو اظہارِ محبت کی اسے جرأت نہیں ہوتی تھی مگر وہ اس کے پاپا اور ممی سے تو کسی بھی وقت بات کر سکتا تھا۔ عافیت اس میں تھی کہ اس سے پہلے ہی معاملے کو نمٹا دیا جائے۔

شہناز کو عثمان پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ صحیح معنوں میں مرد ہوتا تو اس سے اظہارِ محبت کیے بغیر نہ رہتا اور اظہارِ محبت کرتا تو شہناز کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ وہ بڑی صفائی سے اسے بتا دیتی کہ یہ ممکن نہیں۔ یہ خیال اسے دل سے نکالنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ ممی یا پاپا سے رشتے کی بات نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا تھا ہی نہیں۔ چنانچہ شہناز ہی کو کچھ کرنا تھا۔

بہت غور و فکر کے بعد شہناز نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عثمان کو اکسائے گی۔ ایک تبدیلی تو عثمان میں آئی تھی۔ وہ اب اسے مسلسل وارفتگی سے نہیں تکتا تھا۔ ایسا ہوتا تو شہناز کو اسے جھاڑنے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ اب شہناز نے خود ہی کام سنبھال لیا۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی اور اندر ہی اندر حکیمانہ لہجے میں کہتی رہتی۔ مجھے دیکھو۔ ادھر دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔

نظروں کی تپش کا تو اسے تجربہ تھا۔ کوئی ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو دیکھے جانے والے کو احساس ہو کر رہتا ہے بلکہ فوراً ہوتا ہے۔ عثمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ احساس ہو جانے پر وہ نظریں اٹھا کر دیکھتا تو شہناز کو گھورتے پاتا۔ اس شہ پر وہ بھی اسے دیکھنا شروع کرتا تو وہ نظریں جھکانے کے بجائے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگتی۔ بغیر لفظوں کے وہ اپنے وجود کی پوری شدت سے کہنا شروع کرتی۔ ہمت ہے تو مجھ سے بات کرو۔ مجھ سے اظہارِ محبت کرو۔ کہو مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو لیکن عثمان نے اس کا چیلنج کبھی قبول نہیں کیا۔ چند لمحوں میں ہی وہ نظریں جھکا لیتا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے' شہناز مایوس ہوتی گئی۔

ایک دن عثمان نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو خلافِ معمول اس کے ہونٹوں میں لرزش نظر آئی۔ شہناز کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید اس کی مشکل آسان ہونے والی تھی۔ وہ متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ عثمان کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز کوئی نہیں تھی۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا یہ لمحے بھی یونہی گزر جائیں گے؟ اسے کچھ کرنا چاہئے "مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے بے ساختہ کہا۔ اس کے لہجے میں اپیل تھی۔ التجا تھی۔

عثمان چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بہت دھیرے سے بولا۔ "نہیں' کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کہوں گا۔"

اس روز شہناز بالکل ہی مایوس ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ اس انداز میں سامنے آئے گا' جس سے وہ بچنا چاہ رہی ہے۔ تو اب اسے کچھ اور کرنا ہوگا اور بہت تیزی سے کرنا ہوگا۔ بلی کے تھیلے سے باہر آنے سے پہلے!

اگلے روز وہ مشکور سے ملی تو اس سلسلے میں اس سے بات کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ عثمان کی بات آنے سے پہلے ہمارا معاملہ چل نکلے۔"

"تو میں اس سلسلے میں کیا کروں؟" مشکور نے پوچھا "اپنی امی کو تمہارے گھر بھیجوں؟"

"نہیں' ابھی نہیں۔ پہلے میں اپنی ممی سے بات کر لوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری امی کو انکار کی توہین کا سامنا کرنا پڑے۔"

"تو کیا انکار بھی ہو سکتا ہے؟" مشکور کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ تم اپنی جاب تو دیکھو۔"

"کیا برائی ہے میری جاب میں؟ اور میں یہاں رکنے والا بھی نہیں۔ مجھے بہت آگے جانا ہے۔ تم دیکھ لینا....."

"یہ تو میں پچھلے چار سال سے سن رہی ہوں۔ میں اپنے پاپا کو خوب جانتی ہوں۔ تمہاری یہ جاب ہمارا کام مشکل کر دے گی۔"

"تو کیا میری شخصیت' میری ذہانت کی کوئی حیثیت نہیں۔" مشکور آپے سے باہر ہونے لگا۔

"یہ بات نہیں....."

"یہی بات ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی پروا بھی نہیں۔ بات نہیں بنتی تو نہ بنے۔"

شہناز اسے فخر اور محبت سے دیکھتی رہی۔ اس کی یہی مردانہ کوالٹی تو اسے بھائی تھی۔ اسے منانے' رام کرنے میں خاصی دیر لگی۔

شہناز نے اس سلسلے میں اپنی ممی سے بات کی۔ ممی نے پاپا کو بتایا تو پاپا پریشان ہو گئے "یہ کیسی خبر لے آئیں نصیحہ۔" انہوں نے کہا۔

"کیوں.... کیا بات ہے؟ آپ پریشان کیوں ہو گئے؟"

"آپ یہ بتائیں کہ عثمان کیسا لڑکا ہے؟" پاپا نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"عثمان تو مثالی لڑکا ہے۔ سچ پوچھیں' مجھے تو بہت ہی پسند ہے لیکن اس وقت اس کا تذکرہ کہاں سے نکال لیا آپ نے؟" ممی کے لہجے میں حیرت تھی۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی ان کی گفتگو سنتی ہوئی شہناز نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس نے جان لیا کہ اب ممی کا ووٹ بھی اس کا نہیں رہے گا۔

"میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا۔ عثمان نے مجھ سے شہناز کے لئے بات کی ہے۔"

فہمیدہ بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی "کمال ہے۔ میں نے کبھی اسے شہناز میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔"

"شرافت یہی ہوتی ہے۔" نجم الحسن بولے "بات جس انداز میں ہونی چاہئے' اس نے اسی انداز میں کی ہے لیکن یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔ تم کہتی ہو کہ شہناز....."

"آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں شہناز سے بات کروں گی۔"

ممی نے شہناز سے بات کی۔ شہناز اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ عثمان تو اسے بالکل اچھا نہیں لگتا اور وہ مشکور کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

فہمیدہ بیگم نے نجم الحسن کو بتایا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ مشکور سے مل لینا چاہئے۔ دیکھا تو جائے کہ لڑکا کیسا ہے مگر ان کا فیصلہ تھا کہ پہلے مرحلے میں وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ شہناز کے لئے یہ بات بھی توقع سے بڑھ کر تھی۔

○☆○

مسز شمیم کی تقریر جاری تھی لیکن عثمان حفیظ اپنے ماضی میں کھویا ہوا تھا۔

نجم صاحب سے بات کرنے کے بعد وہ بے حد ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ اس نے شہناز سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن بات جس انداز میں جہاں پہنچنی چاہئے تھی' وہاں پہنچادی تھی۔ نجم صاحب نے اس کی بات خاموشی سے سنی تھی لیکن کہا کچھ بھی نہیں تھا۔ عثمان بھی اپنی بات کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا تھا۔

اگلے روز نجم صاحب نے شام کے وقت اسے فون کیا "بیٹے' تم ہائنڈ نہ کرنا کہ کل میں نے تمہیں جواب نہیں دیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل۔"

"میرا جواب تو تم جانتے ہو؟"

عثمان کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں "جانتا ہوں لیکن احتیاطاً اسے اپنی خوش گمانی پر محمول کر رہا ہوں۔"

"یہ خوش گمانی نہیں۔ اگر فیصلہ صرف میرا ہوتا تو میں کل ہی تمہیں جواب دے دیتا لیکن یہ معاملہ براہِ راست شہناز کی زندگی کا ہے۔ پھر مجھے تمہاری آنٹی سے بھی مشورہ کرنا ہے۔ پہلے موقع دیکھ کر میں ان سے بات کروں گا پھر وہ شہناز سے بات کرلیں گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں انکل۔"

"بیٹے' کچھ دن لگیں گے۔"

"میں انتظار کروں گا انکل۔"

"اور یہ بات کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گھر آنا چھوڑ دو۔ تم پہلے کی طرح ہمارے ہاں آتے رہو گے۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہی ہوگا۔"

"شکریہ انکل۔" ریسیور رکھنے کے بعد عثمان نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں سپنے اتر آئے تھے۔

○☆○

معاملات شہناز کی توقع سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے آگے بڑھے تھے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ شہناز کے لئے یہ بات باعثِ تشویش تھی کہ وہ اب بھی معمول کے مطابق گھر آرہا تھا اور اس کے انداز میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ جس مزاج اور طبیعت کا آدمی تھا' شہناز کو توقع تھی کہ وہ اب ان کے گھر نہیں آئے گا۔ شرمیلے لوگوں کا ردِ عمل تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر ایک اور بات تھی۔ شہناز نے اپنی مرضی دو ٹوک لفظوں میں بتادی تھی اور پاپا نے اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے وہ صرف مشکور سے ملیں گے۔ اس صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ انہوں نے عثمان کی حوصلہ افزائی کی ہو مگر عثمان پھر بھی معمول کے مطابق آرہا تھا۔ عام طور پر وہ ایک دن چھوڑ کر آتا تھا۔ وہ سلسلہ اب بھی اسی طرح چل رہا تھا۔

شہناز بہت پریشان تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پاپا نے یا پھر ممی نے عثمان کو یقیناً کوئی یقین دہانی کرائی ہے اسی لئے اس کا طرزِ عمل بالکل نارمل ہے۔ اور اگر کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مشکور کے سلسلے میں پہلے ہی سے کوئی منفی فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

اس روز عثمان نہیں آیا تھا۔ کھانے کی میز پر صرف گھر کے لوگ تھے۔ محمود اور سعود تو کھانا کھا کر جلد ہی اٹھ گئے۔ پھر پاپا بھی اٹھ گئے۔ اپنے کمرے کی طرف جانے سے پہلے انہوں نے اس سے کہا "نازو بیٹی' ابھی تمہیں کوئی کام ہے؟"

"نہیں پاپا۔ برتن سمیٹنے ہیں۔"

"کام نمٹا کر اوپر میرے کمرے میں آجانا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

شہناز کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں "جی پاپا۔"

بیس منٹ بعد وہ پاپا کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ممی پہلے ہی سے وہاں موجود ہیں "میری پوزیشن بے حد نازک ہے فہمیدہ بیگم۔" پاپا کہہ رہے تھے "چھان بین کرنا میرا فرض ہے۔ دشواری یہ ہے کہ نازو مجھے غیر جانب دار تسلیم نہیں کرے گی۔"

"آپ اس کے باپ ہیں۔ یہی نہیں' آپ اس سے محبت بھی

بہت کرتے ہیں۔" ممی نے کہا "وہ جانتی ہے کہ آپ اس کا برا نہیں چاہیں گے بلکہ اس کے لئے بہتر سے بہتر کی خواہش کریں گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ آپ کی غیر جانب داری پر شک کرنے کی حماقت کرے گی۔"

"تم نہیں جانتیں نسیدہ بیگم۔ جوان خون میں جب جذباتیت کا ابال آئے تو وہ کچھ نہیں سوچتا سمجھتا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ سمجھ بعد میں آتی ہے جب دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے سچ جھوٹ اور برا بھلا بتائیں بھی نہیں۔ وہ ہماری ذمے داری ہے۔"

شہناز کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس گفتگو سے اس کے اندیشوں کی تائید ہو رہی تھی۔ کوئی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

پاپا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھو بیٹی ہم تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔"

"جی پاپا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بیٹی' پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ مجھے اپنا ہی خواہ سمجھتی ہو یا نہیں؟"

شہناز جانتی تھی کہ کیا بات سامنے آنے والی ہے۔ اس نے کہا "پاپا میرا ایمان ہے کہ آپ میرے بھلے کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے۔"

"تو تمہیں اعتماد ہے کہ میں تمہارے متعلق جو بھی فیصلہ کروں گا وہ درست ہو گا۔"

"یہ دو مختلف باتیں ہیں پاپا۔ فیصلے کا درست ہونا یا آپ کے نکتۂ نظر سے فیصلہ میرے حق میں بہتر ہونا۔" شہناز نے بے حد رسان سے کہا۔

"کیا تمہیں اس سلسلے میں مجھ پر اعتماد نہیں؟" پاپا کے لہجے میں اداسی تھی۔

"یہ بات نہیں پاپا۔ آپ دنیاوی نکتۂ نظر سے میرے لئے بہتر سوچ سکتے ہیں۔" اس نے اعتماد سے کہا "لیکن آپ یہ تو نہیں سمجھ سکتے کہ باطنی طور پر میری پسند ناپسند' میری ترجیحات اور میری ضرورتیں کیا ہیں۔ اس معاملے میں آپ کا فیصلہ ضروری نہیں کہ درست ہو اس لئے کہ آپ میں نہیں ہیں۔ آپ شہناز نہیں ہیں۔"

پاپا کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "بہرکیف۔ تم کچھ بھی سمجھو۔ مجھے تو اپنا فرض انجام دینا ہے۔ میں اس لڑکے مشکور سے مل چکا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے وہ اچھا نہیں لگا۔ وہ کسی اعتبار سے بھی تمہارے لائق نہیں۔"

"مجھے بھی یہ سن کر افسوس ہوا پاپا۔ لیکن کیا کروں' وہ میری پسند ہے اور پسند کا اختلاف کوئی بڑا اور اہم مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے پاپا کہ کوئی زیور خریدتے وقت میری پسند آپ کی پسند کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ زیور میرے لئے خریدا جا رہا ہو۔"

پاپا نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز' اس کے الفاظ یقیناً ان کے لئے شاک کا باعث بنے تھے پھر انہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی مگر زیور کی حد تک۔ زیور اور شوہر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ زیور جب جی چاہے' بدلا جا سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں شوہر اتنی آسانی سے نہیں بدلا جا سکتا۔"

شہناز ایک لمحے کو گنگ ہو گئی۔ پاپا نے اس کی بات پکڑ کر بے حد منطقی دلیل دی تھی لیکن بہرحال وہ بھی انہی کی بیٹی تھی "پاپا' میں نے آج تک جو بھی چیز پسند کی وہ میرے دل سے کبھی نہیں اتری۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کچھ پسند کرتی ہوں۔" وہ کہتے کہتے رکی "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو مشکور کس بنا پر ناپسند ہوا۔ اس میں کیا خامیاں نظر آئیں آپ کو۔"

"اس بات کی کیا اہمیت ہے جبکہ تم کو میری ناپسندیدگی کی کوئی پروا ہی نہیں۔"

"خیر' مشکور کو ناپسند کرنے والے کے لئے اس کی وجوہات بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔" شہناز نے بے حد اعتماد سے کہا۔ "آپ نے بڑی صفائی سے دامن بچا لیا لیکن میں جانتی ہوں مشکور کو ناپسند کرنے کی وجہ مشکور کا کوئی عیب یا برائی نہیں۔ آپ کی ایک پسند ہے۔ عثمان حفیظ!"

"دیکھا تم نے۔ میں نے کہا تھا نا۔" پاپا نے ممی سے کہا پھر وہ اس کی طرف مڑے "نازو' تم نے زیادتی کی۔ مجھے بدنیت تک ٹھہرا دیا لیکن میں تم پر غصہ نہیں کروں گا۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ اس توہین کو پی جاؤں گا البتہ میں تمہیں اس کی خامیاں ضرور بتاؤں گا۔ تمہیں سمجھاؤں گا کہ وہ مجھے کیوں پسند نہیں آیا مگر میں اس سے پہلے تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہیں وہ کن خوبیوں کی بنا پر پسند ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ شہناز کے لئے پاپا کا ردِعمل بالکل غیر متوقع تھا۔ چند لمحے تو اس کے ذہن نے کام ہی نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے مشکور کی خوبیاں یاد کرنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے "وہ وجیہہ ہے۔ اس کی شخصیت پُرکشش ہے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ وہ مضبوط آدمی ہے' پُرعزم اور محنتی۔ وہ ایسا ہے جیسا کسی مرد کو ہونا چاہئے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کھوکھلی باتیں کر رہی ہے۔ وہ خود ہی قائل نہیں ہے تو پاپا کو کیا قائل کرے گی "بس پاپا' سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اب تم خود سوچو کہ تم نے کتنی خوبیاں بیان کیں اس کی۔" پاپا نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "وہ وجیہہ ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں' اس کی شخصیت پُرکشش ہے یہ صرف تمہارے دل کی بات ہے۔ ممی

دعوے سے کہتا ہوں کہ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسے پسند نہیں کرتے۔ اسے اپنے اوپر بلا کا اعتماد ہے۔ یہ بھی کوئی خوبی نہیں۔ خود اعتمادی معقول حد تک ہو تو خوبی ہے' ضرورت سے زیادہ ہو تو یا تو وہ شخص بے وقوف کہلاتا ہے یا پھر منافق ہوتا ہے۔ وہ مضبوط قوی ہے۔ یہ محض تمہارا حسنِ ظن ہے۔ وہ پُرعزم اور محنتی ہے یہ بھی غلط ہے۔ اب یہ تم بیٹھ کر سوچو کہ کیا کسی مرد کو ایسا ہونا چاہئے؟"

شہناز چڑ گئی "آپ صرف اسے رد کرنا چاہتے ہیں۔ عثمان کی خاطر۔"

"عثمان کو بیچ میں مت لاؤ شہناز۔" ممی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم بیچ میں مت بولو فہمیدہ بیگم۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے۔ ہمیں نازو کی ہر بات سننا ہوگی۔" پاپا نے ممی کو ٹوک دیا اور اس کی طرف مڑے "دیکھو بیٹی' میں تین دن پہلے اس سے ملا اور میں نے پہلی ہی نظر میں اسے ناپسند کیا۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اپنی طویل کاروباری زندگی میں ہزاروں انسانوں سے واسطہ پڑا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو برتا ہے میں نے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا پہلا تاثر کبھی غلط نہیں ہوتا لیکن۔۔۔"

"آپ اسے صرف اس لئے مسترد کر رہے ہیں کہ وہ مالی اعتبار سے آپ کا ہم پلہ نہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ وہ مجھے آسائشات فراہم نہیں کر سکے گا لیکن پاپا مجھے آسائشات کی کوئی طلب بھی نہیں۔"

"تم نے خواہ مخواہ میری بات کاٹی۔" پاپا نے متاسفانہ لہجے میں کہا "اور تم بدگمانی بھی بہت کرتی ہو۔ پوچھو اپنی ممی سے کہ مجھ سے ان کی شادی ہوئی تو میرے پاس کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میرا تو ایمان ہے کہ دولت بیوی اور بچوں کے نصیب سے ملتی ہے۔ میں تو اپنے داماد کو صرف اچھا انسان دیکھنا چاہتا ہوں۔ دولت کی مجھے ضرورت نہیں۔ دولت میرے پاس بہت ہے۔"

"شہناز' ہم نے وہ وقت بھی گزارا ہے کہ تمہارے لئے ایک وقت کے دودھ کا بندوبست کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا" ممی نے کہا۔ "پھر محمود کی پیدائش کے بعد ایک دم دن پھر گئے ہمارے۔"

"میں تمہیں کچھ بتا رہا تھا نازو۔ بات وہیں سے شروع کرتا ہوں" پاپا نے کہا "مجھے اپنی مردم شناسی پر بھی اعتماد ہے اور اپنی غیر جانب داری اور سچائی پر بھی۔ مشکور کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں۔ جیسا ظاہر کرتا ہے درحقیقت ویسا نہیں۔ مجھے یقین تھا اس پر لیکن میں نے یقین نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ انسان کتنا پیچیدہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے خود پر اعتماد نہیں کیا۔ میں عثمان کو پسند کرتا ہوں' بہت زیادہ۔ وہ بیٹوں کی طرح عزیز ہے مجھے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے میں اسی کی خاطر لاشعوری طور پر مشکور میں عیب نکال کر اسے مسترد کر رہا ہوں۔ اس لئے میں نے اس کے متعلق چھان بین کرائی اور یقین کرو' مشکور میرے خدشات سے بڑھ کر برا ثابت ہوا۔ اس کے دوست تک متفق ہیں کہ وہ مطلبی اور خودغرض ہے۔ اس کے باس کا کہنا ہے کہ وہ ہڈ حرام ہے اور محنت کرنا نہیں جانتا۔ صرف اپنے باپ کی وجہ سے اسے ملازمت ملی ہوئی ہے۔ وہ ریٹائر ہو گئے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اور سنو' وہ جھوٹا ہے۔ اس کے والد کوئی گزیٹڈ آفیسر نہیں' محض ہیڈ کلرک ہیں۔ ان کی اتنی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ وہ ایسی جگہ کام کرتے ہیں جہاں کاروباری لوگوں کو ان سے کام پڑتے رہتے ہیں۔ خود مشکور میں کوئی ایسی خوبی اور اہلیت نہیں جس کی وجہ سے وہ اچھے مستقبل کی آس لگائے۔ اس پر ستم یہ کہ موصوف کو جوئے اور شراب کے علاوہ ایک ایسی لت بھی ہے جس کا میں تمہارے سامنے تذکرہ نہیں کر سکتا۔ ان لتوں کی وجہ سے وہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ بس باتیں کرنے کا فن اسے خوب آتا ہے جس کی وجہ سے وہ تم جیسی لڑکیوں کو بھی لبھا لیتا ہے اور لوگوں سے قرض لینے میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ یہ ہے تمہارا مشکور احمد۔ اب تم اپنے ذہن میں قائم اس کی خوبیوں کا موازنہ ان مصدقہ برائیوں سے کر کے خود ہی فیصلہ کر لو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ سب کا سب تصدیق شدہ ہے۔"

"میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔" شہناز نے کہا۔ "میں اسے کالج کے زمانے سے جانتی ہوں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔"

"یہ بھی میں نے تمہاری ممی کو بتا دیا تھا۔" پاپا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بتاؤ' تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بتا چکی ہوں۔"

"دیکھو بیٹا' میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کے معاملے میں زبردستی کا قائل بھی نہیں۔ ویسے بھی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے لیکن تمہیں دیدہ و دانستہ تباہی کی طرف کیسے دھکیل سکتا ہوں۔ پلیز میری بات مان جاؤ۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے' لفظ بہ لفظ سچ ہے۔"

"سوری پاپا۔ میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے۔"

اچانک پاپا کے چہرے پر سختی کا تاثر ابھرا "مجھے افسوس ہے کہ تم نے معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں تمہاری ضد کے مقابلے میں ضد کر کے تمہیں کوئی غلط قدم اٹھانے کا موقع نہیں دوں گا کہ یوں میری جگ ہنسائی ہوگی۔ میں تمہاری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا۔ میں باپ کی طرح تمہیں اس گھر سے وداع کروں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مشکور سے شادی کے بعد تمہارا مجھ سے' اپنی ممی اور بھائیوں سے۔۔۔ اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ ہم تمہیں رخصت پوری عزت اور شان سے کریں گے لیکن ہمیشہ کے لئے۔"

ایک لمحے کو شہناز تھرا کر رہ گئی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں شہناز۔" وہ نازو بیٹی کے بجائے اسے شہناز کہہ کر مخاطب کر رہے تھے "ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ چاہے تمہیں ضرورت نہ ہو' پھر بھی میں تمہیں تین دن کی مہلت دوں گا۔ میرا

مشورہ ہے کہ تم خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ نہ سوچنا چاہو تب بھی اپنا فیصلہ تین دن بعد سنانا۔ اور وہ بھی اپنی ممی کو۔ یہ یاد رکھنا کہ میرا فیصلہ بھی اٹل ہے۔ بس اب تم جاؤ۔ میری دعا ہے کہ خدا تمہیں عقل کی روشنی عطا فرمائے۔"

شہناز کمرے سے نکلی تو دل گرفتہ ضرور تھی لیکن وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کے لئے بھی آمادہ نہیں تھی۔ مشکور کی محبت سے پیچھے ہٹنے کی اب گنجائش نہیں تھی۔

وہ سمجھی تھی کہ اب گھر کے ماحول میں کشیدگی رچ جائے گی۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اگلے روز شام کے وقت عثمان آگیا۔ پاپا بھی موجود تھے۔ چائے لان پر ہی پی گئی۔ خوب قہقہے لگے۔ سبھی خوش مزاجی کے موڈ میں تھے۔ عثمان بھی چہک رہا تھا۔ البتہ اسے یوں نظرانداز کررہا تھا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

اگلے تین دن ممی اسے سمجھانے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں۔ آخر جھنجلا گئیں "جہنم میں جاؤ۔" انہوں نے غصے سے کہا۔ "مقدر سے بھلا کوئی لڑسکتا ہے۔"

تیسرے دن ممی نے اس سے آخری بار پوچھا کہ اس کا فیصلہ کیا ہے "میری پسند اور میرے فیصلے آسانی سے نہیں بدلتے ممی۔ میں شادی مشکور ہی سے کروں گی۔" اس نے جواب دیا۔ ممی اس کا فیصلہ پاپا کو سنانے چلی گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئیں تو ان کی آنکھوں میں نمی تھی "شہناز، مشکور کو بتادو کہ اس کے گھر والے جب چاہیں، رشتے کے لئے آسکتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شہناز نے مشکور کو فون کرکے اگلے روز کی ملاقات طے کرلی۔

اگلے روز وہ مقررہ وقت پر دلکشا ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ مشکور بیس منٹ کی تاخیر سے آیا۔ اور جب وہ آیا تو وہ اسے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ اس کا ہاتھ Sling میں تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو اس کے کندھے کے قریب بازو پر پٹی بندھی نظر آئی۔

وہ بے قرار ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی "کیا بات ہے مشکور؟ یہ کیا ہوا؟" اس کے لہجے میں وحشت تھی۔

مشکور نے مسکرانے کی کوشش کی "کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ بیٹھ جاؤ سکون سے۔ مجھے تماشا مت بناؤ۔"

وہ دونوں بیٹھ گئے "تم بتاتے کیوں نہیں مجھے۔"

"بتادوں گا۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ کافی منگواؤ میرے لئے۔ کریم کے ساتھ۔"

شہناز نے ویٹر کو بلا کر آرڈر نوٹ کرایا اور پریشانی سے مشکور کو دیکھتی رہی جس نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ شہناز نے اسے چھیڑا نہیں۔ جانتی تھی کہ ایسے میں مداخلت اسے بالکل پسند نہیں۔

ویٹر کافی لے آیا تھا۔ شہناز نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکادی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شہناز کو ان میں ویرانی سی نظر آئی۔

"اب تو بتادو کہ کیا ہوا ہے۔" شہناز نے التجا کی۔

"کچھ نہیں۔ معمولی سی بات ہے۔ کسی نے گولی چلائی تھی مجھ پر۔" مشکور نے بے پروائی سے کہا۔

"گولی؟" شہناز کی آنکھیں پھیل گئیں "کب کی بات ہے؟"

"دو دن ہوگئے۔ پرسوں صبح کی بات ہے یہ۔"

"زخم کہاں ہے۔"

"بائیں بازو میں۔ گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ ہڈی محفوظ ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ خطرے کی تو کوئی بات نہیں؟"

"خطرہ تو فی الحال ٹل گیا۔" وہ ہنسنے لگا "نشانہ خطا ہوگیا انا ڑی کا۔ گولی دل سے خاصی دور لگی... پورے سوا دو انچ دور۔ اسی لئے یہاں بیٹھا نظر آرہا ہوں۔"

شہناز نے محبوبیت سے اسے دیکھا۔ اب ایسے جری مرد سے کوئی پیار نہ کرے تو کیا کرے "کچھ اندازہ ہے کہ حملہ آور کون تھا؟" اس نے پوچھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" کندھے جھٹکنے کی کوشش میں اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی اور چہرے پر جیسے زردی کھنڈ گئی۔ "آج کل ہر چیز کرائے پر مل جاتی ہے۔ ریوالور بھی اور حملہ آور بھی۔" اس نے اپنی بات پوری کی۔

"کیا مطلب؟"

"ہر بات کا مطلب نہیں پوچھتے بے بی۔ مردوں کی باتیں مردوں کے لئے ہی رہنے دو۔" مشکور نے تمسخرانہ انداز میں کہا "تم اپنی سناؤ۔"

شہناز خوش ہوگئی "میں تو خوش خبری لے کر آئی ہوں۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا "اب تم اپنے گھر والوں کو کل ہی بھیج دو ہمارے ہاں۔ میں نے پاپا سے بات کرلی ہے۔"

مشکور نے کافی کی پیالی اٹھائی اور آخری گھونٹ لے کر خالی پیالی میز پر رکھ دی "سوری بے بی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ تو اب ممکن نہیں۔"

شہناز بھونچکی رہ گئی "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے گھر والے تمہارے ہاں رشتہ مانگنے نہیں آسکتے۔ نہ ہی میں تم سے شادی کرسکتا ہوں۔"

"کیوں آخر؟"

"وجہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"یہ میرا حق ہے۔ وجہ تو تمہیں بتانا ہوگی۔" شہناز نے تند لہجے میں کہا۔ فوراً ہی اس کا لہجہ نرم ہوگیا "ورنہ کہہ دو کہ تم مذاق کررہے ہو۔"

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں اور تمہیں وجہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس لئے کہ جانتا ہوں، عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں اور تمہارے منہ سے کبھی یہ بات نکل گئی تو میں اس خطرے سے دوچار ہوجاؤں

گا جس سے بچنے کے لئے تم سے دست بردار ہو رہا ہوں۔ میں اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

شہناز کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی مشکل سے تو یہ بات بنی تھی۔ اس شادی کے لئے اس نے کیا کیا کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اب مشکور ہی انکاری ہو رہا تھا۔ اور اسے وجہ بھی نہیں معلوم ہوگی۔ نہیں۔ وجہ جاننا تو بہت ضروری ہے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مشکور کے انکار کی وجہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا تعلق ضرور ہے "پلیز مشکور' مجھے سب کچھ بتا دو۔" وہ گڑگڑائی "میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ساری زندگی راز رکھوں گی اسے۔"

مشکور سوچ میں پڑ گیا "یہ تمہارے لئے غیر ضروری بوجھ ہوگا۔ میں تمہیں کرب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"

"یقین کرو۔ اتنا ظرف رکھتی ہوں میں۔"

"تو میری قسم کھاؤ کہ یہ راز ہمیشہ راز رہے گا۔ تمہاری زبان کھلی تو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔"

"میں تمہاری قسم کھاتی ہوں کہ تمہارا یہ راز کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔"

"سوچ لو۔ ضبط کرنا بہت دشوار ہوگا۔"

"سوچنے کی تو اب بات ہی نہیں۔ تمہاری قسم کھا چکی ہوں میں۔"

"قاتلانہ حملے سے پہلے مجھے فون پر دھمکی دی گئی تھی کہ میں تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔" مشکور نے کہا "میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ ایک گھنٹے بعد مجھ پر گولی چلا دی گئی۔"

شہناز نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا "اور تم موت سے ڈر گئے۔ موت کے خوف سے تم مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔"

"بکواس مت کرو ورنہ تھپڑ مار بیٹھوں گا میں۔۔۔"

"تم بات ہی ایسی کر رہے ہو۔"

"پوری بات سنو میری اور زبان بند رکھو تھوڑی دیر۔" مشکور نے سخت لہجے میں کہا "اگلے روز پھر فون موصول ہوا۔ اس بار دھمکی کی نوعیت بدل گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میری تین بہنیں ہیں۔ وہ اغوا بھی ہو سکتی ہیں اور ان کی بے عزتی بھی کچھ مشکل نہیں۔ پھر میرے ماں باپ کی باری آئے گی اور آخر میں میرا نمبر آئے گا۔ اس پر میں نے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں' یہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ فون کرنے والے نے بے نیازی سے کہا کہ میں نے بات نہیں مانی تو یہ بھی دکھا دیا جائے گا۔" اس نے چند لمحے توقف کیا "اب بتاؤ میں کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کی بات ماننے کے۔ گولی چلا کے وہ معاملے کی سنگینی کا ثبوت دے چکا تھا۔"

شہناز کو چپ سی لگ گئی۔ یہ سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔

"اس نے یہ تنبیہہ بھی کی تھی کہ میں تمہیں کچھ بھی نہ بتاؤں ورنہ ہر دھمکی پر عمل کیا جائے گا۔ مجھ سے کہا گیا کہ بس تمہارا خیال دل سے نکال دوں۔" وہ کہتے کہتے رکا "میں مرد آدمی ہوں موت سے نہیں ڈرتا لیکن بہنوں کا معاملہ تو نہیں سہہ سکتا۔ اسی لئے تمہیں نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے تو۔۔۔" وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

شہناز کو اس پر ترس آنے لگا۔ ایسا مضبوط اور جواں مرد کیسا خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا خون بھی کھولنے لگا۔

"تم بتا رہی تھیں کہ تمہارے پاپا راضی ہو گئے۔ یہ کب کی بات ہے؟" مشکور نے پوچھا۔

"چار دن پہلے میں نے پاپا کو بتا دیا تھا کہ میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" شہناز نے بتایا "انہوں نے مجھے تین دن کی مہلت دی تھی کہ میں خوب سوچ سمجھ کر حتمی فیصلہ کر لوں۔ کل میں نے انہیں بتا دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارے گھر والوں کو رشتہ طلب کرنے کے لئے بلا سکتی ہوں۔"

"اس یقین کے ساتھ کہ میرے گھر سے رشتہ مانگنے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔" مشکور نے زہریلے لہجے میں کہا۔

شہناز کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں "کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ قاتلانہ حملہ میرے پاپا نے کرایا ہے اور وہی تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ تو دو جمع دو چار والی بات ہے۔ میرے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہی انہوں نے ہامی بھری ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ پاپا نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس شادی کے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ باقاعدہ مجھے رخصت کریں گے لیکن ہمیشہ کے لئے۔ تم سے شادی کے بعد میرا اس گھر سے' ان سے' ممی اور بھائیوں سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اگر یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہوتا تو انہیں یہ دھمکی دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے ان پر شک تھا بھی نہیں۔" مشکور نے کہا "لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کس کی حرکت ہے۔"

"میں بھی سمجھ رہی ہوں۔" شہناز نے کہا "یہ عثمان کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا لیکن مشکور' تم اس کا دماغ تو بہ آسانی درست کر سکتے ہو۔"

"میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بے بی۔ میری بہنیں میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئی ہیں۔"

"تو پھر؟"

"تم مجھے بھول جاؤ اور خدا کے لئے اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح وہ میرا اور تمہارا تعلق ختم کر سکے گا۔"

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

گھر آ کر شہناز سوچتی اور الجھتی رہی۔ بساط کیسے الٹ گئی تھی۔ جس خواب کی تعبیر کے لئے وہ ممی اور پاپا کے سامنے ڈٹ کر کھڑی

ہوئی تھی' جس کے لئے وہ سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی وہ بس خواب ہی رہ گیا تھا۔ تعبیر اب اسے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسے عثمان سے ایسی نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتی۔

وہ سوچتی اور اسے غصہ آنے لگتا۔ پاپا نے مشکور کو خود غرض اور مطلبی کہا تھا اور مشکور نے اپنی بہنوں کی خاطر کیسا ایثار کیا تھا۔ اپنی محبت سے' اپنے ہر خواب سے دستبردار ہو گیا تھا اور جس عثمان پر وہ جان چھڑک رہے تھے وہ خود غرض ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنانے کے لئے' اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے وہ کیسے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ اور پاپا کہتے ہیں کہ وہ مردم شناس ہیں۔ انسانوں کو پہچانتے ہیں۔ ہزاروں انسانوں کو برتا ہے انہوں نے۔

"کب آ رہے ہیں وہ لوگ؟" ممی نے اسے چونکا دیا۔

"وہ لوگ نہیں آئیں گے۔" شہناز نے جواب دیا۔ وہ اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکی تھی "پاپا نے ٹھیک کہا تھا۔ مشکور اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا۔"

ممی سے اپنی خوشی نہیں چھپائی گئی "اوہ۔ تو اس لئے اداس بیٹھی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ رشتوں کی کوئی کمی تو نہیں تمہارے لئے۔"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے ممی۔ میں عثمان سے شادی کروں گی۔"

"لیکن تم اسے پسند نہیں کرتیں۔"

"وہ ناپسندیدگی تو اس لئے تھی کہ میں مشکور کو پسند کرتی تھی۔" شہناز نے کہا "اور ویسے بھی میں آپ کو اور پاپا کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔"

ممی خوش ہو گئیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کی وساطت سے یہ بات پاپا تک پہنچے گی تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کسی محبت سے دستبردار ہونا بے حد مشکل کام ہے۔ کتنی بار اس کے جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ کر مشکور کے پاس چلی جائے۔ اس سے کہے کہ ہم سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ اپنی دنیا کہیں اور بسائیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اب یہ ممکن نہیں۔ بہنوں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے' وہ نہ بھی ہوتا تب بھی مشکور نے جو کہہ دیا تھا وہ اس سے کبھی نہ ہٹتا۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا۔

اسے مشکور کا اٹھایا ہوا سوال یاد آیا۔ کیا اس طرح وہ ان کے تعلق کو ختم کر سکے گا؟ کبھی نہیں۔ وہ بڑبڑائی۔ اس سوال کا جواب سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔ اس رات اس نے جتنے خواب دیکھے وہ محبت اور انتقام کے ملے جلے خواب تھے۔

○☆○

عثمان بہت خوش تھا۔ اس کے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی!

اس روز رات کے کھانے کے بعد نجم صاحب اسے اپنی اسٹڈی میں لے گئے۔ آنٹی کافی وہیں لے آئیں "بیٹھ جاؤ فہمیدہ بیگم۔ تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔" نجم صاحب نے کہا۔

آنٹی مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

عثمان کا چہرہ تمتمانے لگا۔ انکل اور آنٹی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کوئی اہم بات ہونے والی ہے۔

"ویسے تو تم میرے لئے اولاد کی طرح ہو۔" نجم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن ہم نے تمہیں باقاعدہ اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" عثمان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"یہ گھر کی بات ہے لیکن بہتر ہو گا کہ تم اپنے چند رشتے داروں کو ہمارے ہاں بھیج دو تاکہ تاریخ وغیرہ طے کر لی جائے۔"

"میرے رشتے داروں سے تو آپ خوب واقف ہیں انکل۔" عثمان نے آہستہ سے کہا "وہ تو یہی چاہیں گے کہ یہ رشتہ ختم ہو جائے۔ اس میں ان کا اپنا مفاد ہے۔"

نجم صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔"

"تو یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔" فہمیدہ آنٹی بولیں "آپ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہ گھر کی بات ہے۔ عثمان میرے لئے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔"

"مطلب؟" نجم صاحب نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ شہناز کے باپ ہیں اور میں عثمان کی ماں۔ یوں ہم خود طے کر لیں گے۔"

نجم صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" وہ عثمان کی طرف مڑے "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ تو آپ کا احسان ہے مجھ پر۔" عثمان نے ممنونیت سے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اگلے روز عثمان نے اپنی فرم کے منیجر ساجد صاحب سے بات کی۔ وہ سب سے پرانے آدمی تھے اور ابو سے بہت قریب رہے تھے۔

"آپ بے فکر رہیں عثمان میاں۔" انہوں نے کہا "تمام انتظامات ہو جائیں گے۔ آپ صرف تاریخ بتا دیجئے گا۔ میں اور دفتر کے سب لوگ ہر طرح سے حاضر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب مرحوم صاحب سے اور آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔"

عثمان جانتا تھا۔ اس کا عملی مظاہرہ وہ ابو کے انتقال کے موقع پر دیکھ چکا تھا۔ اس نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ ابو نے ساری زندگی اصل کمائی کیا کی ہے۔

تین دن بعد نجم صاحب نے فون کیا "تم آئے نہیں۔ تین دن سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔" انہوں نے چھوٹتے ہی شکایت کی۔

"بس انکل' اب تو مشکل ہے۔ اچھا نہیں لگتا۔"

"ہم جانتے تھے کہ یہی ہو گا۔" نجم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس لئے تمہاری امی نے اصرار کیا کہ تاریخ دور کی نہ رکھی جائے۔ انہوں نے اس مسئلے پر شہناز کے ابو سے خوب لڑائی کی۔"

عثمان اس دلچسپ گفتگو پر مسکراتا رہا "تو پھر کیا طے پایا؟"

"آج ۱۵ دسمبر ہے نا۔ بس تمہارے پاس ۱۶ دن کی مہلت ہے۔ یکم جنوری کو شادی طے پا گئی ہے۔ باقی تفصیل تمہاری امی خود گھر آکر تمہیں بتائیں گی۔ اب میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔"

"شکریہ انکل۔"

"اور کوئی مسئلہ ہو' کوئی کام ہو جس میں دشواری ہو تو مجھے فون کر دینا۔ ٹھیک ہے بیٹے؟"

"جی انکل۔"

اگلے روز سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ عثمان کے اصرار پر ساجد صاحب کی بیوی اور بچے اس کے گھر آگئے۔ عثمان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ گھر میں اتنی رونق بھی ہو سکتی ہے۔ شادی چیز ہی ایسی ہے۔ گھر کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔

دن تیزی سے اڑتے رہے۔ سالِ رواں ختم ہوا اور نیا سال آپہنچا۔ سالِ نو کا پہلا دن۔۔۔ شادی کا دن' خوابوں کی تعبیر کا دن!

سب مہمان رخصت ہو گئے۔ ساجد صاحب اور ان کے گھر والوں کو اس نے اصرار کر کے چند روز کے لئے روک لیا تھا۔ رات گئے وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس کی دھڑکنیں تیز رفتاری کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی تھیں۔ وہ اس کی ساگ رات تھی۔ ارمانوں بھری ساگ رات!

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ آراستہ چھت بے حد حسین لگ رہی تھی۔۔۔ کچے گلابوں کی سیج نے پورے کمرے کو مہکا دیا تھا۔

مگر کمرے میں کوئی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مسہری کی طرف بڑھا اور سیج کی لڑیاں ہٹا کر دیکھا۔ اس کی دلہن سیج پر موجود نہیں تھی۔ ارے۔ یہ کہاں گئی۔ چند لمحے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور شہناز اندر آئی۔

وہ حیرت سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسے زبردست شاک لگا تھا۔

شہناز سفید کاٹن کے عام سے لباس میں تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ بھیگے ہوئے بالوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نہا کر ہے۔ اس کا دھلا دھلایا چہرہ بے حد تر و تازہ لگ رہا تھا۔ صرف میں کہیں کہیں چپکی افشاں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے لہن بنی ہوگی۔

عثمان گنگ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس لباس میں بھی وہ پیشہ سے کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی لیکن اس کا شاک اپنی جگہ تھا۔ وہ دولہا تھا' جو اپنی ہی سنوری دلہن کو دیکھنے کا شوق لئے کمرے میں آیا تھا۔ اس کی شیروانی کی جیب میں منہ دکھائی کا تحفہ موجود تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔

"کیا بات ہے؟ آپ رک کیوں گئے؟" شہناز کی آواز نے جیسے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

شہناز نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا "کیا؟ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری طرف۔" عثمان کے لہجے میں شکایت تھی۔

"کیوں۔۔۔ مجھے کیا ہو گیا؟" شہناز نے معصومیت سے کہا۔

"یہ تم نے اپنا کیا حلیہ بنا لیا؟" اس کے لہجے کی شکایت اور گہری ہو گئی۔

"اچھی نہیں لگ رہی ہوں کیا؟" شہناز نے بڑے ناز سے پوچھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔ تم تو ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔" عثمان نے بے حد نرم لہجے میں کہا مگر پھر اس کے لہجے میں شکایت در آئی "لیکن یہ ہماری ساگ رات ہے۔ تم میرے لئے دلہن بنی تھیں۔ میرے لئے سجی سنوری تھیں اور اب۔۔۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" شہناز نے انجلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "سوری عثمان' دراصل مجھے گرمی بہت لگ رہی تھی۔ ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔"

اس موسم میں گرمی! نئے سال کے پہلے دن گرمی! عثمان کو کچھ ہونے لگا۔ وہ خود بھی اپنی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اسے غصہ بھی تھا' جھنجلاہٹ بھی تھی اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ شاید اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ جو کچھ کھو گیا ہے اب اسے کبھی نہیں مل سکتا۔ یہ لمحے تو کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے "تم تھوڑی دیر انتظار کر سکتی تھیں پھر گرمی کیسی۔ مجھے تو اس شیروانی میں بھی گرمی نہیں لگ رہی ہے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"شادی کا جوڑا بہت بھاری ہوتا ہے۔ پھر اتنا زیادہ میک اپ۔ میں اس کی عادی نہیں ہوں۔" شہناز نے کہا۔ عثمان کہنا چاہتا تھا کہ عادی تو کوئی لڑکی بھی نہیں ہوتی لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ درحقیقت وہ ابھی تک شاک سے نہیں نکلا تھا۔

"اور مجھے گرمی ویسے بھی بہت زیادہ لگتی ہے۔"

عثمان تھکے تھکے قدموں سے مسہری کی طرف بڑھا اور بیٹھ گیا۔ "اب تم نہا چکی ہو۔ پھر سے دلہن بن جاؤ۔ صرف چند منٹ کے لئے سہی۔ میری خاطر۔ پلیز۔" اس نے التجا کی۔

"وہ میک اپ تو میں قیامت تک نہیں کر سکتی۔ مجھے میک اپ کرنا آتا ہی نہیں۔ کبھی کیا ہی نہیں میں نے۔" شہناز نے عذر پیش کیا "اور سنیں۔ میں روایت شکن لڑکی ہوں۔ میرے خیال میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں' آپ کی خاطر شادی کی پہلی سالگرہ پر میں یہ اہتمام کروں گی۔ ساگ کا جوڑا بھی پہنوں گی مگر آج نہیں۔"

عثمان کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے تمام سپنے بکھر گئے ہیں۔ خوشیوں میں جیسے کوئی کرب گھل مل گیا ہے۔ اس کے ذہن میں تو سہاگ رات کا کچھ اور ہی تصور تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھے گا جہاں وہ پہلے ہی سے سمٹی سمٹائی بنی بیٹھی ہوگی۔ وہ اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا اور اس کا جمال اس کی سانسیں روک دے گا۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہے گا... دیر تک۔ وہ کسمسائے گی تو وہ چونکے گا۔ پھر وہ اسے منہ دکھائی کا تحفہ دے گا اور پھر...

شہناز بے تکلفی سے مسہری پر بیٹھ گئی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔

یہاں نہ وہ دلہنوں والا حجاب تھا نہ سہاگ رات کا وہ افسانوی حسن۔ وہ کسی سنگین مگر حسین حقیقت کی طرح اس کے روبرو تھی۔

"اچھا اب میری منہ دکھائی نکالیں۔" شہناز نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم روایت شکن ہو کر ایسا روایتی مطالبہ کر رہی ہو لیکن وہ تلخی نہیں بڑھانا چاہتا تھا پھر بھی اس نے کہا "جس طرح منہ دکھایا جاتا ہے اس طرح تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔ منہ دکھائی کیا دوں تمہیں؟"

"کیوں بھئی؟ منہ تو دیکھا ہی ہے آپ نے۔" وہ اٹھلائی۔

"یہ منہ تو بہت پہلے دیکھا تھا۔ اسی وقت لے لیتیں منہ دکھائی۔" عثمان کو احساس ہوا کہ اس نے بہت سخت بات کہہ دی ہے۔ صورتِ حال کچھ بھی ہو لیکن وہ بہرحال شہناز کو روح کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اسے کیسے تکلیف پہنچا سکتا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو خیر مذاق تھا۔ یہ لو اپنی منہ دکھائی۔" اس نے شیروانی کی جیب سے رسٹ واچ کا کیس نکالا۔ اس میں سے گھڑی نکالنے کے بعد اس نے شہناز کی کلائی تھامی اور اس پر گھڑی باندھ دی۔

"منہ دکھائی میں یہ عام سی گھڑی۔" شہناز نے بے ساختہ کہا۔

عثمان کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی "یہ عام سی گھڑی نہیں ہے۔ یہ تمہیں پتا چل جائے گا۔" شہناز کی کلائی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگالیا "شہناز' آئی لو یو۔" اس کی آواز بدلنے لگی۔ لہجے میں محبت ہی محبت تھی "میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کا بیان ممکن نہیں۔ بتایا ہی نہیں جاسکتا۔ بس یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری ہے۔" شہناز نے کہا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے شہناز کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک اور چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

وہ اسے مسہری کے پیچھے بائیں جانب والے گوشے کی طرف لے گیا۔ وہاں چھت سے فرش تک ایک مخملی پردہ لہرا رہا تھا "اس ڈوری کو کھینچ کر پردہ کھولو۔" اس نے کہا۔

شہناز نے ڈوری کھینچی۔ پردہ دونوں طرف سمٹنے لگا۔ پردہ ہٹا تو ایک اور حریری پردہ سامنے آیا۔ عثمان شہناز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ حریری پردے کے پیچھے کارنس پر رکھی چیز دیکھ کر شہنا مبہوت ہو کر رہ گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی سانسیں رک گئی ہیں "کیسا ہے؟" عثمان نے پوچھا۔

"بہت حسین۔" شہناز نے جواب دیا۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بلور کا بے حد حسین تاج محل تھا۔ اس نے حریری پردہ بھی ہٹادیا۔

"یہ میری محبت کی علامت ہے۔" عثمان نے کہا "میں بادشاہ ہوتا تو سچ مچ تاج محل تعمیر کراتا تمہارے لئے۔"

شہناز نے سر اٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

"اس کی اصل خوب صورتی اب دیکھنا۔" عثمان نے کہا اور سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بٹن دبائے اور کمرے میں اندھیرا پھیل گیا "کیا کر رہے ہیں؟" اندھیرے میں شہناز کا احتجاج ابھرا۔

عثمان نے ایک سوئچ دبایا اور بلور کا تاج محل روشن ہوگیا۔ تاج محل کے اس ماڈل کے اندر بہت چھوٹے چھوٹے قمقمے تھے لیکن روشنی بہت زیادہ نہیں تھی "اسے اس کمرے کا نائٹ بلب سمجھ لو۔ کیسا لگا تمہیں؟"

"اچھا ہے۔" اس بار شہناز کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

عثمان نے دونوں ہاتھ شہناز کے کندھوں پر رکھے تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ اسے مسہری کی طرف لے چلا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے وجود کے اندھیرے میں سمٹ کر بیٹھا سردی سے تھرتھرا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا انسان برف کی مورت بھی ہوتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ گداز' حرارت اور جنبش سے محروم؟ وہ اپنے وجود کی تمام حرارت گنوا کر بھی برف کی مورت میں حرارت کی رمق تک منتقل نہیں کرسکا تھا۔

کیا سہاگ رات ایسی ہوتی ہے؟ اس نے سوچا۔ اسے احساسِ جرم ستانے لگا۔ وہ تو بہت خودغرض' بہت کم ظرف ثابت ہوا تھا۔ سوائے شرمندگی کے اس نے کیا کمایا تھا۔ محبت کوئی یک طرفہ جذبہ تو نہیں ہوتا۔

اس کے لئے سونا بھی دشوار ہوگیا۔ اس نے پہلو کی طرف دیکھا۔ شہناز بے سدھ سو رہی تھی۔

○☆○

شہناز بہت آہستگی سے عالمِ خواب سے عالمِ ہوش میں آئی۔ اس سفر میں ایک احساس اس کا ہم سفر تھا۔ اور جب اس نے عالمِ ہوش میں قدم رکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ محض احساس نہیں تھ

بلکہ آواز تھی جو بیداری کے عالم میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ کوئی بے حد رومانوی سرگوشی میں دہرائے جارہا تھا "آئی لو یو' آئی لو یو' آئی لو یو۔۔۔"

شہناز نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ بجی ہوئی چھت دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ سہاگ رات کے بعد جاگی ہے۔ وہ رومانوی سرگوشی اب بھی اس کی سماعت میں گدگدی کررہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ عثمان کی آواز ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

اس کا ذہن جو ابھی تک پوری طرح نہیں جاگا تھا' خوف زدہ ہوگیا۔ یہ آواز کیسی ہے۔ کہاں سے آرہی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھے جارہی تھی۔ آواز اس کے بہت قریب سے۔ اس کے اندر سے آتی محسوس ہورہی تھی۔

اچانک اسے اپنی کلائی کے مرتعش ہونے کا احساس ہوا۔ اس کلائی پر منہ دکھائی والی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اس ہاتھ کو اوپر۔۔۔ اپنے چہرے کے قریب لائی۔ آواز زیادہ بلند ہوگئی۔ زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ اس نے گھڑی کو کان سے لگایا اور جان لیا کہ آواز گھڑی میں سے آرہی ہے۔ اس نے بوکھلا کر گھڑی کو ٹٹولا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کئی چابیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے تمام چابیوں کو دبا کر دیکھ لیا۔ آواز بند نہیں ہوئی۔ وہ جھنجلا گئی۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ گھڑی نے جیسے اس کی آواز سن لی۔ اظہارِ محبت کا وہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اس نے برابر میں سوئے ہوئے عثمان کو دیکھا۔ اس وقت وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اس پر پیار آنے لگا مگر فوراً ہی ردِعمل کے طور پر خود پر غصہ آیا۔ اس سے اسے انکار نہیں تھا کہ وہ بہت پُرکشش آدمی ہے۔ یہ بات اس نے بہت پہلے تسلیم کرلی تھی کہ اگر مشکور درمیان میں نہ ہوتا تو وہ عثمان سے محبت کئے بغیر نہ رہتی۔

وہ اسے غور سے دیکھتی رہی اور اس کے اندر متضاد جذبوں کی جنگ ہوتی رہی۔ اگر اس کی شادی عام حالات میں ہوئی ہوتی تو وہ اس کی ظاہری شخصیت کی کشش سے نہیں بچ سکتی تھی لیکن شادی سے پہلے ہی اس کا اصل روپ اس کے سامنے آچکا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی خواہش کے لئے راستہ صاف کیا تھا۔ شہناز کے نزدیک بے رحمی میں کوئی برائی نہیں تھی۔ مرد کو اپنے اہم معاملات میں بے رحم ہونا چاہئے۔ سختی اور سخت گیری مرد پر سجتی ہے لیکن عثمان نے مشکور کو راستے سے ہٹانے کے لئے جو کچھ کیا تھا وہ مردانگی کے خلاف تھا۔ وہ ایسی چھپی ہوئی' بزدلی میں لپٹی ہوئی سفاکی تھی جو صرف عورتوں میں ہوتی ہے۔

تو اب اس سے محبت کو دل چاہے یا اس پر پیار آئے' وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

وہ اٹھی۔ وارڈ روب سے اپنے لئے ایک سادہ سا لباس نکالا اور باتھ روم چلی گئی۔

باتھ ٹب کے نیم گرم پانی میں دراز ہوکر بھی وہ عثمان ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیسے تضادات ہیں اس شخص میں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کے پاس غضب کا Imagination ہے۔ ذوق بھی ہے۔ یہ کسی کی بھی محبت جیت سکتا ہے۔ اسے محبت بھی ہوئی تو ایسی لڑکی سے' جو پہلے ہی کسی اور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اصولاً اسے دل جیتنے کی' اپنے حریف کو محبت کے میدان میں شکست دینے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس میں اس کی صلاحیت بھی ہے۔ تمام ہتھیار موجود ہیں اس کے پاس۔ لیکن اس نے کیا کیا۔۔۔ گھٹیا پن کا مظاہرہ۔ اپنی دولت اور کرائے کی طاقت پر گھمنڈ! اس شخص کو محبت جیتنی بھی نہیں آتی۔ وہ اپنے Imagination' اپنے ذوق سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔

لیکن شادی کی رات وہ مختلف آدمی تھا۔ اس کا وہ جگمگاتا تاج محل دیکھ کر چند لمحوں کے لئے وہ بے خود ہوگئی تھی۔ اس نے خود کو پگھلتا محسوس کیا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس کی بانہوں میں' اس کے سینے پر بکھر جائے لیکن فوراً ہی اسے اس کی اصلیت یاد آگئی۔ وہ سحر فوراً ٹوٹ گیا۔

اور اب یہ گھڑی! یہ رومانوی سرگوشی۔ آئی لو یو۔ یہ اظہارِ محبت۔ اور اظہارِ محبت کرنے والے کی ایسی قربت کہ وہ ہر وقت کلائی سے لپٹا رہے۔ کون ہے جو ایسی محبت کی ناقدری کرسکتا ہے۔ اس سے منہ موڑ سکتا ہے۔ صرف وہی جو خوب صورت ظاہر کے پردے میں چھپے بھیانک اور گھناؤنے باطن کو دیکھ چکا ہو۔

شہناز کے ذہن میں اس لمحے ایک بے حد مشکل سوال نے سر اٹھایا۔ اگر عثمان نے یہ تحفے شادی سے پہلے دیے ہوتے تو کیا ہوتا؟ کیا وہ مشکور کی محبت سے چمٹی رہتی؟ یا عثمان کے اس منفرد اظہارِ محبت کے سامنے سر جھکا دیتی؟

سوال بے حد مشکل تھا مگر اس کے ذہن میں جو جواب ابھر رہا تھا۔ وہ کمزور کردینے والا تھا۔ اب ایسی باتوں کا کیا فائدہ؟ ایسا ہوا تو نہیں نا۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ وقت اب پلٹ تو نہیں سکتا اس لئے یہ سوال مہمل ہے۔ اس کا جواب غیر ضروری ہے۔

نہیں عثمان حفیظ۔ وہ بڑبڑائی۔ میں تم سے محبت نہیں کرسکتی۔ تم بزدل اور کم ظرف ہو۔ تم مرد ہو لیکن مردانگی سے محروم۔ جو کچھ تم نے کیا' اس کی سزا تمہیں دنیا کا کوئی مرد نہیں دے سکتا۔ ہاں عورت دے سکتی ہے اور دے گی۔ میں نے تم سے شادی ہی اس لئے کی ہے۔ میں تمہاری زندگی کو جہنم بنادوں گی۔ میں تمہیں بتادوں گی کہ تم میں کتنا ہی عورت پن ہو' تم سفاکی میں عورت کی ہم سری نہیں کرسکتے۔ تم کتنی ہی۔۔۔ کیسی ہی محبت کرلو مجھ سے' تم مجھے جیت نہیں سکتے عثمان حفیظ۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی تو وہ بیدار ہوچکا تھا۔

○☆○

ایک ماہ میں عثمان کو اندازہ ہوگیا کہ اس کی ازدواجی زندگی شرمندگی کی تحریر بن گئی ہے۔

وہ پریشان رہنے لگا۔ شادی تو خوشی کا نام ہے۔ مسرت لاتی ہے۔ اور ازدواجی زندگی میں ایک آدمی کے خوش اور مطمئن ہونے سے کام نہیں چلتا۔ کچھ خوشیاں تو مشروط ہی اس سے ہوتی ہیں کہ دونوں فریق مطمئن ہوں۔ لیکن وہ پوری کوشش کے باوجود خوشی حاصل نہیں کرپا رہا تھا۔

شہناز اس کے لئے ایک ناقابل تسخیر برفانی چوٹی بن گئی تھی۔ وہ ایک ایسا کوہ پیما تھا' جو پیہم کوشش کے باوجود اسے سر نہیں کرپا رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ اونچے پہاڑوں کو سر کرنے کی مہمات ناکام کیسے ہوتی ہیں اور ان کی کامیابی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ پہاڑ تسخیر ہونے پر آمادہ ہو۔ پہاڑوں کا رویہ معاندانہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑتا ہے اور اگر کوہ پیما ضد کریں تو جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔ دوسری چیز موسم ہے۔ مہم کی کامیابی کے لئے موسم کا سازگار ہونا اشد ضروری ہے۔ ناسازگار موسم میں بھی پہاڑی چوٹیاں سر نہیں ہوتیں۔ اسے یاد آیا کہ دشوار ترین پہاڑی چوٹیاں وہی ہوتی ہیں جہاں موسم سارا سال ہی خراب رہتا ہے۔ جہاں موسم کا مزاج کبھی نہیں ملتا۔ موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ سازگار موسم چند منٹ بھی رہ سکتا ہے اور چند گھنٹے بھی اور پل کے پل میں سب کچھ بدل کر رہ جاتا ہے۔

وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ یونہی تو نہیں چل سکتا۔ اسے احساس ہوگیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس سلسلے میں شہناز سے بات کرنا پڑے گی۔ چنانچہ اس رات اس نے شہناز سے یہ موضوع چھیڑ دیا "تم خوش نہیں ہو شہناز۔"

"نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔" شہناز نے جواب دیا۔

"مجھے تو تم خوش اور مطمئن نہیں لگتیں۔"

"یہ تو پھر آپ ہی جانتے ہوں گے۔" شہناز کا لہجہ معنی خیز تھا "میں آپ کی ذمے داری ہوں۔"

عثمان کا احساس جرم اور بڑھ گیا "وہ تو میں سمجھ رہا ہوں لیکن اس مسئلے کو حل بھی تو کرنا ہوگا۔ کوئی حل تو ہوگا اس کا۔"

"ہونا تو چاہئے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم میری مدد کرسکتی ہو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم مجھ سے تعاون نہیں کرتیں۔ تم میرے ساتھ شامل نہیں ہوتیں۔"

"میں اس سے انکار نہیں کروں گی لیکن اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسے دو افراد کا تصور کریں جو ٹینس کھیل رہے ہیں اور ان میں سے ایک ایسا ہے جو کھیلنا نہیں چاہ رہا ہے مگر دوسرے کی خاطر ہاتھ میں ریکٹ لئے کھڑا ہے

اشتہار

اقوام متحدہ کی عمارت کے نزدیک واقع ایک باربر شاپ کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا!

"ایک باربر کی ضرورت ہے۔ عالمی حالات و واقعات اور سیاست پر عمدگی سے گفتگو کرسکتا ہو۔ ذہین اور خوش اطوار ہو۔ بال بھی کاٹنا جانتا ہو تو ترجیح دی جائے گی۔"

ایسی صورت میں کیا ہوگا۔"

عثمان کی سمجھ میں بات پوری طرح آگئی "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس صورت میں کھیل نہیں ہونا چاہئے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں نے تمہارے اندر کبھی آمادگی محسوس نہیں کی۔ تم ہمیشہ مجھے برف کی مورت کے روپ میں ملیں۔"

"یہ محض اتفاق ہے۔" شہناز نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ویسے میں ہر تعاون کے لئے تیار ہوں اور تعاون کرتی بھی رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آپ کو کبھی روکا نہیں۔"

عثمان چند لمحے سوچتا رہا "حالانکہ تعاون یہ ہوتا کہ تم مجھے روک دیتیں۔ ناآسودگی کمانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آسودگی تو خود مجھے بھی نہیں ملتی۔"

"میں ہمیشہ یہ سوچتی ہوں کہ اس میں آپ کی دل آزاری ہوگی۔"

"اس انداز میں مت سوچو۔ تم مجھے روک سکتی ہو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ اور دوسری طرف تم مطالبہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہو۔" عثمان نے کہا "اور ہاں ایک اور تعاون بھی تم مجھ سے کرسکتی ہو۔"

"آپ بتائیں۔"

"وہ یہ کہ جب تمہارے ہاں آمادگی ہو تو تم مجھے بتادو۔"

شہناز نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا "یہ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ۔ یہ تو بے شرمی ہوگی۔"

"پلیز۔ میری خاطر۔" عثمان نے التجا کی "اور پھر منہ سے کہنا ضروری تو نہیں' اظہار کے اور بھی طریقے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

عثمان اس گفتگو کے بعد مطمئن ہوگیا لیکن وہ طمانیت بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ اب وہ بس یہ کہہ سکتا تھا کہ شاید ان دونوں کے ستارے نہیں مل رہے ہیں۔ منفی انداز میں وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ جب وہ بے حد تھکا ہوا ہوتا یا طبیعت خراب ہوتی یا وہ ڈپریشن سے دوچار ہوتا تو شہناز آمادگی ظاہر کرتی۔ نتیجہ اب پہلے سے بھی خراب نکلتا تھا۔

ایک دن شہناز نے کہہ ہی دیا "آپ بہت بدل گئے ہیں۔ آپ

کو اب مجھ میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کا دل بھر گیا ہے مجھ سے۔"

عثمان بے بسی سے اسے دیکھتا رہا "یہ مت کہو۔ میری محبت کم نہیں ہوئی' بڑھی ہے۔ کیا وہ گھڑی اب تمہیں یہ بات یاد نہیں دلاتی۔"

"وہ تو بے بس' بے جان ہے۔ طوطے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہراتی رہتی ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ وہ میرے دل کی آواز ہے' جسے مناسب اور موثر لفظ نہیں ملتے۔"

اب وہ صحیح معنوں میں پریشان تھا۔ اور اس کا کوئی حل اسے نظر نہیں آرہا تھا۔

○☆○

انتقام جیسا کوئی طاقت ور جذبہ فطرت سے سازباز کرتا ہے تو عورت کی نسوانی سوجھ بوجھ بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات شہناز نے ساگ رات کو ہی ثابت کردی تھی۔ وہ ایک کثیر المقاصد اور کثیر النتائج جنگ لڑ رہی تھی۔ پہلے ہی مرحلے میں اس نے عثمان کو احساسِ محرومی' احساسِ جرم اور شرمندگی سے دوچار کردیا تھا۔ ان میں احساسِ محرومی سب سے خطرناک اور مضر تھا۔ آدمی سب کچھ پالے لیکن اسے کچھ بھی نہ ملے تو اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اور یہ اذیت سب سے زیادہ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے سوچنے سمجھنے اور فیصلے کرنے کی قوت بری طرح متاثر ہوتی ہے احساسِ محرومی مسلسل رہے تو پھر یہ قوتیں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں شہناز جانتی تھی کہ عثمان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

ان کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اور یہ طے پایا تھا کہ وہ خود بھی ضرورت کا اظہار کرسکتی ہے۔ یوں اسے ایک اور ہتھیار میسر آگیا تھا۔ جس دن وہ اسے تھکا ہوا اور ڈپریس نظر آتا' وہ جاتی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتی۔ کبھی وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی اور اسے پگھلا دینے والی نگاہوں سے تکنے لگتی۔ وہ راغب نہ ہونے کے باوجود اس کی خواہش کا احترام کرتا۔ اس خواہش کا احترام جو سچی نہیں' محض اوپری ہوتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اچھا نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ یہ سوچ کر مسکرادی۔ اسے اپنی ہی دی ہوئی مثال یاد آگئی۔ اس نے اس میں ترمیم کر ڈالی۔ اب یوں ہوتا تھا کہ دو ایسے کھلاڑی ٹینس کھیل رہے ہوتے تھے جو کھیلنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک نہیں' دونوں کھلاڑی۔ صورتِ حال پہلے سے خراب ہوگئی تھی۔

پھر یہ سوچ کر اسے غصہ آنے لگتا کہ عثمان کیسا مرد ہے۔ اس کے رد کرنے پر اپنی خواہش سے دست بردار ہوجاتا ہے۔ اور اس کی خواہش کا ہر حال میں احترام کرتا ہے۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔ وہ تو اپنی مرضی کرتے ہیں۔ وہ تو منہ زور گھوڑی کو بھی رام کرلیتے ہیں اور وہ بھی محض طاقت کے بل پر۔ مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔

خود شہناز پر بھی کبھی کبھی دورے پڑتے۔ کبھی کبھی یوں ہوتا کہ اس کا دل عثمان کے قرب کے لئے مچلنے لگتا۔ اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ ایسے میں وہ خود کو باندھ کر رکھتی۔ یاد کرتی کہ وہ اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا کرچکا ہے۔ ایسے میں وہ خود پر اس کی نفرت اور شدت سے طاری کرنے کی کوشش کرتی۔

ایک رات عثمان نے اس سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عثمان کا چہرہ طلب کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں خوب صورت سی وحشت کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ خواہش کی آگ میں تپ رہے تھے۔

اس روز عجیب بات ہوئی۔ عثمان نے اسے چھوا تو اس کے وجود میں جیسے جھماکے سے ہونے لگے۔ پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ ایک جانی پہچانی خواہش نے اس کے پورے وجود کو جیسے جکڑلیا۔ بس دماغ نجانے کیسے اس گرفت سے آزاد رہ گیا تھا اور دماغ بھی وہ جس نے اس ہنگامی صورتِ حال میں بہت تیزی سے کام کرنا شروع کردیا تھا اور اس دماغ نے اسے بچالیا۔

اسے احساس ہوا کہ اس لمس نے اس کے وجود کو دہکا دیا ہے۔ اس کے جسم کا ٹمپریچر بڑھ رہا تھا۔ سانسیں بوجھل اور بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی عثمان کو اس کا ہاتھ سرد لگ رہا ہوگا۔ اس کے جسم کی حرارت ابھی عثمان کے جسم کی حرارت سے کم تھی لیکن بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اس طرح چند منٹ اور گزر گئے تو عثمان کو اس کے ہاتھ کی گرمی کا پتا چل جائے گا اور اس کے لئے پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس نے تیزی سے لیکن نرمی سے دوسرے ہاتھ سے عثمان کا ہاتھ تھام کر اسے ہٹادیا "سوری..... آج میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

عثمان اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔ آنکھیں خون کبوتر کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس بار وہ ضبط نہیں کرسکے گا۔ اس پر جھپٹے گا اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔

وہ سحرزدہ سی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ اس کے اندر ہونے والی کشمکش کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کا اپنا حال بھی عجب تھا۔ اس نے خود کو سختی سے نہ باندھا ہوتا تو وہ اس سے لپٹ گئی ہوتی۔ وہ اس آگ میں جل رہی تھی جو اتفاق سے اور بے خبری میں لگی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ جانتی تھی کہ ایسا ہوا تو وہ مزاحمت نہیں کرے گی بلکہ خود بھی اس کا ساتھ دینے لگے گی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھے جارہے تھے۔

شہناز کے جسم کی پکار ہر لمحہ بلند آہنگ ہوتی جارہی تھی۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر خواہش چیخ رہی ہو۔ اس کے جسم کا رواں رواں عثمان سے التجا کررہا تھا کہ وہ اسے اپنالے۔ اسے یقین تھا کہ یہ التجا اس کی آنکھوں میں بھی چلا رہی ہوگی۔ اس کا دماغ جسم کے خلاف' خواہش کے خلاف مزاحمت کررہا تھا' اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس کی مزاحمت لمحہ بہ لمحہ کمزور ہورہی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ اگر اس نے اس کی نگاہوں کی التجا سمجھ لی تو۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بظاہر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے لیکن درحقیقت وہ نہیں دیکھ رہا ہے۔ ہاں... وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا' جس سے پتا چلتا تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے صرف خلا ہی خلا ہیں۔

ہوا بھی یہی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا اس کی نگاہوں کی التجا نہ دیکھ سکا۔ ایک جھٹکے سے اس نے رخ بدلا اور اس کی طرف پیٹھ کرکے بستر پر دراز ہوگیا۔ لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کا جسم بری طرح لرز رہا ہے۔

اسی لمحے شہناز کے دماغ کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ ساتھ ہی اس کا اپنا جسم بھی لرزنے لگا۔ اس لمحے اسے عثمان پر ترس آنے لگا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے حوالے سے بھی سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس عذاب سے گزر رہا ہے مگر پھر اس کا وجود اس کی نفرت سے بھرگیا۔ تم مرد نہیں ہو۔ مجھے تم سے نفرت ہے... نفرت ہے۔ تم مرد نہیں ہو۔ اس کا پورا وجود بے آواز چلا رہا تھا۔ یہی دو جملے دہرائے جارہا تھا۔

وہ بھی لیٹ گئی لیکن نفرت کے اس طوفان میں بھی اس کے اندر ایک آس کا دیا جل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ کسی بھی لمحے وہ پلٹے گا اور... وہ نفرت کا بوجھ اٹھائے آس کے اس جھولے میں پینگیں لیتی رہی۔ خواہش کی آگ ایسے بھڑکی تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

دیر ہوگئی... بہت دیر ہوگئی۔ جیسے صدیاں گزر گئیں۔ خواہش کا وہ بوجھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ وہ دل میں آس لیے متوقع نظروں سے اس کی پیٹھ تکتی رہی۔ عثمان کے جسم کی لرزش معدوم ہوچکی تھی۔ اور کچھ دیر گزری تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"عثمان... عثمان..." اس نے جذبات سے چھلکتی آواز میں اسے پکارا۔ اپنی آواز وہ خود بھی نہ پہچان سکی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کئی بار پکارا پھر اسے ہلایا۔ اب وہ چت لیٹا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ جھنجلا گئی کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔ آگ لگانے والوں کو یوں سونا زیب نہیں دیتا۔

اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ وہ فطرت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھاگئی تھی۔ اس نے عثمان کو جھنجوڑ ڈالا۔ خاصی دیر بعد اس نے غنودگی آنکھیں کھولیں "کیا بات ہے؟" وہ اب بھی نیند میں تھا۔

شہناز کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے۔ کیا شکست کا اعتراف کرلے؟ "تم سو کیوں رہے ہو؟ مجھ سے باتیں کرو نا" اس نے بھاری... اجنبی آواز میں کہا۔

"سوجاؤ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں" عثمان نے کہا اور جواب مکمل ہونے سے پہلے پھر سوگیا۔

اس بار شہناز کو بے بسی اور مایوسی نے پوری طرح جکڑلیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے عمل کی لپیٹ میں خود آگئی ہے۔ اب تک وہ خود تکلیف اٹھائے بغیر عثمان کے لیے جس کرب کا سامان کرتی رہی تھی' اندازہ ہورہا تھا کہ اب اسے بھی وہ کرب برداشت کرنا پڑے گا بلکہ اس پہلے ہی موقع پر تو اس کا کرب عثمان کے کرب سے بہت زیادہ ہوگیا تھا۔

کرب پر مستزاد اس کی تشویش تھی۔ جسم کے تقاضے ایک بار شروع ہوجائیں تو ان کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔ اسے اس کا توڑ کرنا تھا ورنہ اس کا انتقام اب اس کے ہی خلاف کام کرنے والا تھا اور یہ وہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

اس رات وہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سو سکی۔ فجر کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ نو بجے دستی گھڑی کے آئی لو یو نے اسے جگادیا۔ "شٹ اپ یو فول" وہ غرائی۔ "چپ ہوجاؤ' بند کرو یہ منحوس آواز" اس نے گھڑی اتار کر بے دردی سے ایک طرف پھینک دی۔ پھر اس نے بستر پر نظر ڈالی عثمان موجود نہیں تھا۔ وہ شاید باتھ روم میں تھا۔

○☆○

اس خبر نے عثمان حفیظ کی سب کلفتیں دور کردیں' سب اذیتیں دھوڈالیں کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

سب کچھ جیسے جادو کے زور سے بدل گیا لیکن نہیں... بدلا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس بے اثر ہوکر رہ گیا تھا۔ وہی شہناز کے رویوں کی دھوپ چھاؤں تھی' جس میں چھاؤں بہت کم اور دھوپ بہت زیادہ تھی۔ التفات بے حد موہوم اور سرد مہری بے حد واضح تھی۔ وہ اس کے مزاج کے موسموں میں چیخ رہا تھا اور جی رہا تھا۔ لیکن اس کی محبت تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا' اس نے قبول کرلیا تھا۔

وہ عرصہ عثمان کے لیے بے حد الجھادینے والا تھا۔ کبھی کبھی یونہی اسے محسوس ہوتا کہ شہناز اس سے نفرت کرتی ہے لیکن یہ محض ایک احساس تھا' جسے کسی ثبوت' کسی دلیل کا سہارا میسر نہیں تھا۔ شہناز کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس نے کبھی اس سے بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی کبھی انداز سے ایسا کچھ ظاہر کیا تھا پھر بھی کبھی کچھ لمحے ایسے آئے' جن میں عثمان کو واضح طور پر احساس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کررہی ہے۔

شان کبھی اس پر غور کرتا تو اسے اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگتا۔ کوتاہی کے علاوہ یہ احساس الگ ہوتا کہ شہناز کو پانے کے باوجود بھی وہ بدقسمت ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی شہناز کا حصول تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے باوجود بدقسمتی نے اس کا دامن تھام لیا تھا۔

ازدواجی زندگی کا جو سب سے حسین اور نازک پہلو ہوتا ہے' وہ ابھی تک ادھورا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو صاف شفاف اور شیریں پانی کے دریا کنارے بھی پیاسا کھڑا تھا۔ وہ پانی پیتا.... اتنا پیتا کہ مزید پینے کی گنجائش نہ رہتی لیکن پیاس اپنی جگہ رہتی۔ حلق میں پڑے ہوئے کانٹے اپنی جگہ سرکشیدہ رہتے اور کرب صرف یہی نہیں تھا کہ اس کی پیاس نہیں بجھی' اسے تو دریا کی پیاس کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔ پشیمانی کرب پر مستزاد تھی۔

وہ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا تو اس کی سمجھ میں صرف ایک بات آتی۔ اس کے اور شہناز کے ستارے ہی نہیں ملتے تھے۔ اسے شہناز سے محبت تھی.... بے پایاں محبت' اتنی محبت کہ لفظوں سے' عمل سے اس کا اظہار کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ صرف اسے حقیر کیا جا سکتا تھا۔ بلور کا وہ تاج محل' اظہار محبت کرنے والی وہ گھڑی.... یہ اس کے اظہار محبت کی کوششیں تھیں۔ اور اب وہ سوچتا تو وہ خود اسے بھی گھٹیا پن لگتا۔ جو کچھ تھا' وہ اسے ظاہر کرنے سے قاصر تھیں۔ بس وہ ایک گھٹیا' بھڑکیلا سا اظہار تھا۔ وہ خود بھی سوچتا تو وہ اسے محبت جتانے کی گھٹیا کوشش لگتی۔

مگر وہ عرصہ جہالت کی بات تھی.... عرصہ جہالت کی سوچ تھی۔ شادی سے پہلے وہ ہمیشہ سوچتا رہا تھا کہ شہناز کو کیسے بتائے گا۔ کیسے بتائے گا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ تب اسے یہ دو آئیڈیے سوجھے تھے۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ بات بن جائے گی.... محبوب تک اپنی پوری شدت کے ساتھ نہ سہی' بہرحال پہنچ جائے گی لیکن شادی کی اگلی صبح اسے ان کے حقیر ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس نے بے بسی سے سوچا کہ دنیا میں کسی بھی زبان میں وہ جملہ کہہ دیا جائے.... میں تم سے محبت کرتا ہوں.... آئی لو یو.... جو انسان روز ازل سے اپنے محبوب سے کہتا آ رہا ہے اور اس کے باوجود روز ازل سے تشنہ ہے تو اس لیے کہ یہ محض ایک بیان ہے' جس میں محبت کی شدت سموئی نہیں جا سکتی۔ اور لہجہ بھی کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لہجے کی رسائی بہت دور تک' بہت اوپر تک ہے لیکن مقام محبت تک پہنچنے سے بہت پہلے... بہت پہلے لہجے کے پر جل جاتے ہوں گے۔

سو وہ محبت میں سرشار مؤثر اظہار محبت کی آرزو میں جلتا رہا۔ پھر شادی کے بعد اس کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ سمجھانے والا کوئی اور نہیں' اس کی اپنی شدت تھی۔ اب وہ اس کی دسترس میں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس پر حق دیا تھا تو اس کا کیا کیا جی چاہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کسی طرح شہناز کو مائع میں تبدیل کر دے۔ مہکتا' خوش رنگ آتشی سیال بنائے اور گھونٹ گھونٹ پی جائے۔ وہ سوچتا کہ وہ اس کے لیے آسمان سے اتاری جانے والی بے بدل غذا ہے۔ وہ اسے کھا لے.... یہ سب کچھ اس کی شدت اس سے کہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ شادی اللہ تعالیٰ کے بیش بہا تحائف میں سے ایک ہے۔ شادی اظہار محبت کے لیے وہ پیرایہ عطا کرتی ہے' جو دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں۔

یوں اسے مؤثر ترین پیرایۂ اظہار میسر آ گیا۔ وہ اس کی قربت میں ہوتا تو اس کے جسم کا رواں رواں' اس کی ہر سانس' دل کی ہر دھڑکن.... غرض کہ اس کا پورا وجود شہناز سے اظہار محبت کر رہا ہوتا لیکن وہ طمانیت جو اظہار سے مشروط ہوتی ہے' اب بھی اسے میسر نہیں تھی بلکہ شرمندگی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اب وہ اس پر غور کرتا رہا۔ اس کے سامنے ایک جہان معنی کھل گیا۔ اس کی سمجھ میں اور بہت کچھ آنے لگا۔ کیمیاوی عمل میں ہر جگہ مخصوص حالات میں عناصر کی یکجائی کی شرط ہوتی ہے۔ اور محبت بھی کیمیاوی عمل ہے۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن مل جائیں تو پانی بنتا ہے لیکن فضا میں ہائیڈروجن اور آکسیجن ساتھ رہتے ہیں اور پانی نہیں بنتا۔ پانی تو جب بنے گا جب ہائیڈروجن اور آکسیجن مخصوص کیمیاوی حالات میں یکجا ہوں۔

کمی بس یہیں تھی۔ وہ اور شہناز یکجا تھے لیکن مخصوص حالات اور عوامل کی شرط پوری نہیں ہو رہی تھی اس لیے اسپارک نہیں ہوتا تھا۔ کمی عمل انگیز کی تھی بلکہ عمل انگیز کی بھی نہیں' عمل انگیز جذبہ تو موجود ہوتا تھا کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ لیکن عمل انگیز کی موجودگی میں دونوں عناصر یکجا نہیں ہو پاتے تھے۔

اس نے اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی لیکن بات پھر بھی نہیں بنی۔ وہ اپنی طرف سے ہر قربانی دیتا رہا۔ شہناز کا اشارہ ملتا تو وہ تیار ہو جاتا لیکن وہ محسوس کرتا کہ اس وقت اس کے اندر کوئی کیمیاوی تحرک نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن وہ بے حد رو سینٹک موڈ میں تھا۔ اس نے پیش قدمی کی تو شہناز نے اسے روک دیا۔ اس روز اس کے اندر جو وحشت ابھری' اس نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ وہ نہیں رکنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت منہ زور پہاڑی دریا کے مانند تھا' جو راستے میں پڑی بھاری بھرکم چٹانوں کو ٹھوکریں مار کر' جھاگ اڑاتا آگے ہی آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا' یہ کون ہوتی ہے مجھے میرے حق سے روکنے والی۔ میں نہیں رکوں گا' میں اسے روند ڈالوں گا.... توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔

لیکن عین وقت پر محبت نے مداخلت کر ڈالی۔ محبت میں روندا نہیں جاتا.... محبوب کو توڑا پھوڑا نہیں جاتا۔ وہ ہٹ گیا لیکن وہ ضبط کا بہت دشوار مرحلہ تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ دانت ہونٹوں میں گڑے تھے۔ وجود میں عمارتوں کو خس و خاشاک کی طرح

اڑا لے جانے والی آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ طوفان کی سی خاموشی سے پلٹ گیا۔

اس روز ڈپریشن کی حد ہو گئی تھی۔ وہ کبھی حیوانی جذبوں کا آدمی نہیں رہا تھا۔ اس کے مزاج میں لطافت بہت تھی مگر اس روز جو کچھ ہوا' اس نے ثابت کر دیا کہ اس میں حیوانیت بھی چھپی ہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ اس سے بے خبر رہا۔ کیا آدمی یوں خود سے بے خبر بھی رہتا ہے۔ یہ بات ڈرا دینے والی نہیں تھی۔

وہ بہت شرمیلا آدمی تھا۔ اس کی فطرت میں حجاب تھا۔ وہ کسی سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کر سکا تھا۔ دوستوں کی شادیوں کے موقعوں پر اکثر باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس نے کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی لیکن اب وہ وقت آگیا تھا کہ باہر سے مدد لینا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا ورنہ وہ عمر بھر یہ ڈپریشن پالتا رہتا۔ تباہ ہو کر رہ جاتا۔

دوستوں میں ایک احسان ہی ایسا تھا' جس سے وہ بات کر سکتا تھا۔ وہ بچپن کا بے تکلف دوست تھا لیکن اس سے پہلے عثمان کے نزدیک بے تکلفی کا کبھی یہ مفہوم نہیں رہا تھا کہ نجی نوعیت کی انتہائی ذاتی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں مگر اب معاملہ ایسا تھا کہ رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

سو اس نے احسان کو سب کچھ کہہ سنایا۔ احسان نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی' پھر بولا "یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں..."

"غیر معمولی بات نہیں؟" عثمان نے عجیب سے لہجے میں دہرایا۔ "نہ ہوتی تو میں کبھی تم سے اس سلسلے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات سنی ہی نہیں" احسان نے کہا "یہ واقعی غیر معمولی بات نہیں... ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ غیر معمولی بات ہے اتنے تواتر اور تسلسل سے اس کا ہونا۔ اور اس کا کوئی سبب بھی ہو گا۔"

"وہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ لگتا ہے' پاگل ہو جاؤں گا۔"

احسان کچھ دیر سوچتا رہا "کوئی نفسیاتی گرہ ہی ہو سکتی ہے" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "تم بھابی کا بہت احترام کرتے ہو نا؟"

"محبت کا احترام تو تم سمجھ سکتے ہو۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔"

"اور تمہارے ذہن میں پاکیزگی کا بے حد واضح تصور ہے۔"

"وہ تو ہے۔"

"بات سمجھ میں آگئی۔ تمہارے اندر مزاحمت موجود ہے۔ قربت میں تمہیں یہ خیال رہتا ہے کہ تم اس تعلق کی پاکیزگی کو تباہ کر رہے ہو" احسان نے کہا۔

اب عثمان سوچتا رہا پھر اس نے کہا "ممکن ہے' یہ بات ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کے بعد اچانک میں اتنا پُرجوش کیوں ہو جاتا ہوں" اس نے نفی میں سر ہلایا "نہیں' یہ بات نہیں ہو سکتی۔ یہ رشتہ' یہ تعلق خود سب سے بڑی پاکیزگی ہے۔ اگر میرے ذہن میں یہ خیال ہوتا تو میں کبھی اس کے قریب جاتا ہی نہیں۔"

"قریب جانے کی خواہش تو فطری ہے" احسان نے اس کا اعتراض رد کر دیا "اور تم کہتے ہو کہ بھابی بھی پیش قدمی کرتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بالکل نارمل ہیں۔ ان کا ارادہ وقتی ہوتا ہے' مستقل نہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں وہ قصوروار نہیں۔"

"اتفاق ہے کہ جب میں ایکزاسٹ ہوں' تھکا ہوا اور پژمردہ ہوں یا کسی وجہ سے ڈپریس ہوں تو اسے قربت کی سوجھتی ہے" عثمان نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ موضوع چھیڑا ہی کیوں؟

"اور وہ بھی یہی بات سوچتی ہوں گی؟"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ تمہیں بھی ایسے ہی وقت میں قربت کی سوجھتی ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے" عثمان نے جوش سے کہا "وہ یہ بات کئی بار کہہ بھی چکی ہے۔"

"بس تو تمہیں خود کو ٹٹولنا چاہیے" احسان نے ناصحانہ لہجے میں کہا "آسودگی درحقیقت اندر کی چیز ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی اندر سے ناآسودہ ہو... اندر کوئی رکاوٹ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس اندر کی اس رکاوٹ کو تلاش کر کے دور کر لو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"لیکن میرے اندر کوئی رکاوٹ نہیں" عثمان نے بے بسی سے کہا "میں جس شدت کے ساتھ اس کی طلب کرتا ہوں' تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"آدمی کو اپنے لاشعور کی خبر ہو تو اسے لاشعور کہا ہی کیوں جائے" احسان نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "پھر تو وہ شعور ہو گیا نا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے لاشعور سے آگہی حاصل کرو۔"

عثمان نے اس مشورے پر بڑے خلوص سے عمل کیا۔ اس نے خود کو ٹٹولا... بلکہ کھنگال ڈالا لیکن کوئی رکاوٹ نہیں ملی۔ اس نے جھنجلا کر سوچا کہ یہ رکاوٹ دوسرے فریق کے ہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' شہناز کے لاشعور میں کوئی نفسیاتی گرہ ہو۔ اس نے سوچا ضرور لیکن شہناز سے یہ ثقیل گفتگو کرنے کی اتنے ہمت نہیں ہوئی۔

پھر وہ پورا معاملہ پسِ منظر میں چلا گیا۔ اہمیت صرف اس بات کی رہ گئی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ وہ بہت بڑی خبر تھی اس کے لیے۔ شہناز کے لیے اس کی محبت سوگنا بڑھ گئی۔ تشنگی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اظہار کی حاجت بھی ختم ہو گئی اور کیا چاہیے؟ اظہار تو اس نے کر دیا تھا... اور اسے جواب بھی مل گیا تھا۔

اسے صرف ایک ہی فکر رہ گئی۔ شہناز کی اور اپنے بچے کی

بہتری کی فکر۔ وہ ڈاکٹر سے ملا اور اس کی ہدایات ذہن نشین کرلیں پھر وہ ان پر عمل کرنے میں لگ گیا۔ شہناز کوئی کام کرتی تو وہ اسے روکتا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی تو وہ چیخ اٹھتا۔ وہ اس کی غذا کا خیال رکھتا۔ اس کے لیے پریشان ہوتا جیسے وہ شوہر نہیں' اس کی ماں ہو۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ رسم کے مطابق پہلی زچگی کے لیے لڑکیاں میکے جاتی ہیں۔ فہمیدہ بیگم شہناز کو لینے کے لیے آئیں تو وہ متوحش ہوگیا "آنٹی.... آپ یقین کریں' میں شہناز کا اتنا خیال رکھتا ہوں۔ آپ پوچھ لیں...."

فہمیدہ بیگم ہنسنے لگیں "وہ تو میں جانتی ہوں بیٹے۔ لیکن یہ رسم ہے ہمارے ہاں کی۔ یہ تمہاری امانت تمہاری اجازت سے لے کر جارہی ہوں میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آنٹی لیکن...."

"لیکن ویکن کی اس میں گنجائش نہیں" فہمیدہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی "اچھا ہے' یوں تمہیں سزا بھی مل جائے گی۔"

"سزا؟ کس بات کی سزا؟" اس نے آنٹی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔

"شادی کے بعد تم ہمارے گھر کا رستہ ہی بھول گئے۔ یہ یاد ہی نہیں رہا تمہیں کہ تمہارا ایک گھر اور بھی ہے۔"

عثمان شرمندہ ہوگیا۔ اسے احساس ہوا کہ واقعی اس سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہونے لگی۔ اتنے عرصے میں شہناز نے کبھی ایک بار بھی اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ اسے گھر لے کر چلے۔ اتنے عرصے میں وہ صرف چار پانچ بار گھر گئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی اسے ایک خوش آئند خیال آیا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ہر لڑکی میکے جانے کی ضد کرتی ہے۔ وہی لڑکیاں میکے جانے کا نام نہیں لیتیں' جن کا سسرال میں دل لگ جائے۔ بلکہ جو اپنے شوہر سے اس درجہ محبت کرتی ہوں کہ ان کا ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہونا انہیں گوارا نہ ہو۔

یہ دلیل محبت اتنی خوش کن تھی کہ اسے جدائی کا ملال بھی نہیں ہوا۔ فہمیدہ آنٹی کو اسے ساتھ لے جانے سے تو وہ ویسے بھی نہیں روک سکتا تھا۔

"اب تو تم ہر روز ہمارے گھر آؤ گے نا؟" رخصت ہوتے ہوئے فہمیدہ آنٹی نے اس سے پوچھا۔

"آنٹی.... یقین کریں میں شرمندہ ہوں۔ اب تلافی کردوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

○☆○

یہ انکشاف کہ وہ ماں بننے والی ہے' شہناز کے لیے بہت بڑا شاک تھا۔ وہ اور عثمان کے بچے کو اپنی کوکھ میں پالے۔ عثمان' جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ جس کی زندگی کو اس نے بڑی کامیابی سے نشان اذیت بنادیا تھا۔ وہ اس سے یوں ہار جائے گی۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ اسے اس بات کا اندازہ کافی دیر سے ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر سے اس نے بات کی تو وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"مسز عثمان' یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں اتنی جلدی ماں نہیں بننا چاہتی۔"

"لیکن یہ آپ کا پہلا بچہ ہے" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ابھی میں زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی سے یہ ذمے داری اٹھانا مجھے پسند نہیں۔"

"آپ جیسے بڑے لوگ تو دس بچوں کے باوجود بھی زندگی انجوائے کرسکتے ہیں۔ آپ تو اپنی ذمے داری معقول تنخواہ پر کسی کو بھی سونپ سکتی ہیں۔"

ڈاکٹر کے لہجے میں اسے خفیف سا طنز محسوس ہوا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی "کچھ بھی ہو' مجھے یہ قبول نہیں' کچھ کرو ڈاکٹر۔"

"سوری مسز عثمان۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ بات بہت آگے جاچکی ہے۔"

"ہو کیسے نہیں سکتا...؟"

"آپ ڈاکٹر ہوتیں تو سمجھ سکتی تھیں' یہ آپ کا پہلا موقع ہے۔ آپ کی صحت اور جسمانی کیفیت میرے سامنے ہے۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام تو ہوجائے گا لیکن آپ کی زندگی کی ضمانت میں نہیں دے سکتی۔ پچاس فی صد سے زیادہ امکان یہ ہے کہ آپ نہیں بچ سکیں گی۔"

شہناز کا چہرہ فق ہوگیا۔ زندگی سے اسے بے اندازہ محبت تھی۔ یہ رسک وہ لے ہی نہیں سکتی تھی مگر یہ تصور ہی اس کے لیے روح فرسا تھا کہ وہ عثمان کے بچے کو جنم دے گی۔ بہرکیف اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تن بہ تقدیر ہوگئی لیکن عثمان سے اس کی نفرت بہت بڑھ گئی۔

ایک اچھی تبدیلی بھی ہوئی۔ عثمان کے جسمانی تقاضوں سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ جس بچے کے تصور سے ناخوش تھی' عثمان اسی کے تصور میں سرشار تھا۔ لگتا تھا' اسے اب اس کی کوئی پروا نہیں رہی ہے۔ چند روز تو وہ خوش رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس تبدیلی کے نتیجے میں اذیت کا وہ کھیل ہی موقوف ہوگیا ہے' جس کی خاطر اس نے عثمان سے شادی گوارا کی تھی۔ چنانچہ اس نے خود تقاضے شروع کردیے۔

مگر کچھ ہی دن بعد وہ اس کھیل سے دستبردار ہوگئی۔ اس کے مطلوبہ نتائج نکل ہی نہیں رہے تھے۔ بچے کی خوشی میں عثمان راضی بہ رضا ہوگیا تھا۔ وہ یوں سراپا تسلیم ہوا تھا کہ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔

شہناز کا ڈپریشن بڑھتا گیا۔ تمام وقت اس کے اندر ایک ہی جملہ تڑپتا مچلتا رہتا تھا.... آئی ہیٹ یو۔ اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر اس کا ہدف بھی ایک نہیں رہا تھا' دو ہوگئے

تھے۔ وہ پیٹ میں پلنے والے بچے سے بھی یہی کہتی رہتی تھی۔۔۔ آئی ہیٹ یو۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔

لیکن پھر وہ بچے کی احسان مند ہو گئی۔ اس کی وجہ سے تو امی اسے لینے کے لیے آئی تھیں۔ اسے قید سے رہائی مل رہی تھی۔ اب جبکہ اس کے مقاصد پورے نہیں ہو رہے تھے تو عثمان کے ساتھ رہنا اسے قید سخت معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا۔۔۔ نہیں' عثمان کا بچہ اسے رہائی دلا رہا تھا۔

وہ امی کے ہاں چلی گئی۔ عثمان ہر شام اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتا۔ وہ بے دلی سے قبول کرلیتی۔ عثمان ہمیشہ رات کا کھانا کھا کر واپس جاتا تھا۔ ممی اور پاپا کے اصرار کے باوجود اس نے رات کو رکنا بھی گوارا نہیں کیا' یہ بھی اچھا ہی تھا ورنہ وہ اس کے کمرے میں ہی سوتا۔ ممی نے اس کے لیے وہی کمرا ٹھیک کروادیا تھا' جس میں وہ پہلے رہا کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ اب اس میں ڈبل بیڈ ڈلوادیا گیا تھا۔

وہ خوش تھی کہ چلو منافقت سے کچھ عرصے کے لیے نجات مل گئی لیکن عجیب بات تھی۔ سوتے وقت وہ بیڈ کے عقب کی طرف بائیں جانب نگاہ ضرور کرتی اور کئی بار کرتی۔ اس کا دل عجیب طرح دھڑکتا۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی لیکن بات کئی دن بعد اس کی سمجھ میں آئی۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی اور غیر ارادی طور پر اٹھنے والی نظروں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

اسے امی کے ہاں رہتے بیس دن سے زیادہ ہو چکے تھے کہ اس کی سمجھ میں آیا کہ رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے وقت وہ کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی نظریں کس چیز کی جستجو کرتی ہیں۔ وہ اس تاج محل کو مس کررہی تھی' جو اس کی خواب گاہ کی زینت تھا۔ اس احساس نے اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھائے۔۔۔ نازک سوال۔ وہ اس چیز کو کیوں مس کررہی ہے' جسے عثمان نے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا؟ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا۔۔۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ عثمان کی حماقت کی علامت ہے۔ وہ اسے یاد دلاتا ہے کہ عثمان کتنا احمق ہے۔ وہ اسے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ وہ کس ارادے سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ شاید وہ اسے اس لیے بھی مس کرتی ہے کہ اب کیونکہ وہ عثمان کے ساتھ نہیں رہ رہی ہے تو وہ کہیں یہ بات بھول نہ جائے۔

کیا وہ گھر کو بھی مس کررہی ہے۔۔۔ اپنے گھر کو؟ یہ سوال بھی چونکا دینے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ذہن کوئی جواب دیتا' اس کے اندر بے ساختہ جواب ابھرا۔۔۔ اور اثبات میں ابھرا۔ ذہن نے فوراً صورت حال کی نزاکت کو بھانپ کر اس کی توجیہہ کی۔ یہی کہ وہ یاد رکھنا چاہتی ہے کہ اسے عثمان سے کس قدر نفرت ہے۔

لیکن ذہن کی مداخلت سے پہلے ہی ایک شک سر اٹھا چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کہیں اسے عثمان سے محبت تو نہیں ہوتی جارہی ہے۔ اس سوال پر اس کا اپنا ردعمل بے حد شدید تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو کچھ اس نے اس کے اور مشکور کے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اس سے تو اس کا نفرت کا رشتہ ہے۔

پھر بھی وہ اس معاملے میں جذباتی تردید نہیں چاہتی تھی۔ اس نے معقولیت کے ساتھ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عثمان بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کی محبت کے معاملے میں بے اصولی سے قطع نظر اپنے ہر عمل سے وہ اچھا انسان ثابت ہوتا تھا۔ وہ نرم خو' نرم مزاج' نرم گفتار اور محبت کرنے والا تھا۔ بس اس میں مردانگی کی کمی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اگر اس کے دل میں عثمان کی نفرت نے پہلے ہی پنجے نہ گاڑ دیے ہوتے تو وہ اس کا دل جیت لیتا۔ وہ اس سے محبت پر مجبور ہو جاتی لیکن اب یہ ممکن نہیں' قیامت تک نہیں۔

کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ تم سچ بول رہی ہو؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ سو فی صد یقین ہے۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ اس نفرت کی ہی خاطر میں اسے مس کرتی ہوں۔ میں اس گھر کو مس کرتی ہوں کیونکہ وہیں میں اس سے اس کی کمینگی کا انتقام لے سکتی ہوں۔ میں اس تاج محل کو یاد کرتی ہوں کیونکہ وہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ وہ کس طرح میرے بس میں ہے۔۔۔ میری مٹھی میں ہے۔

تقریباً ایک ماہ بعد وہ سو کر اٹھی تو متوحش تھی۔ اس نے اپنی کلائی ٹٹولی۔ وہ گھڑی کہاں گئی۔۔۔ عثمان کی آواز میں آئی لو یو کہنے والی۔ اسے یاد آیا کہ وہ تو بہت دن پہلے اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی تھی۔ مجھے وہ گھڑی چاہیے۔ میں یاد رکھنا چاہتی ہوں کہ میرا اسیر رہا نہیں ہوا ہے۔ سزا پوری ہوئے بغیر وہ رہا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کی اسیری کا مکمل یقین چاہیے۔

اس رات گھر جانے سے پہلے عثمان نے معمول کے مطابق اس سے پوچھا "کچھ منگوانا تو نہیں ہے؟"

"میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رسٹ واچ رکھی ہے۔ وہ لیتے آیئے گا" اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اس سوال کے جواب میں کوئی فرمائش کی تھی۔

"کون سی رسٹ واچ؟"

"وہی منہ دکھائی والی۔"

عثمان بے حد خوش نظر آنے لگا۔ سوچ رہا ہوگا کہ وہ اس کی محبت کو مس کررہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔

○☆○

وہ بہت خوب صورت لمحہ تھا' جب عثمان نے اپنے پہلے نومولود کو گود میں لے کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور اسے اس میں اپنی جھلک نظر آئی۔ وہ سانس لیتے اس ننھے منے مجسمے کو سحر زدہ سا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ابو زندہ ہوتے تو کیسے خوش

ہوتے۔ یہ ان کی کتنی بڑی آرزو تھی۔ اس نے پوری نہیں ہونے دی۔

"کیا نام رکھو گے اس کا؟" نجم الحسن نے اس سے پوچھا۔

"نعمان" اس نے بے ساختہ کہا "پیار سے اسے نومی کہیں گے ہم۔"

"بہت خوب صورت نام ہے اللہ مبارک کرے۔"

وہ سب خوش تھے۔ نجم الکل' فہمیدہ آپی' محمود' سعود اور وہ خود۔ خوشیاں دونوں گھروں پر ٹوٹ کر برسی تھیں لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شہناز خوش نہیں ہے۔ اس نے شہناز سے یہ بات پوچھ ہی لی "میں اتنی جلدی یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی" وہ بولی "ابھی تو ہمارے محبت کرنے کے دن تھے۔"

عثمان سرشار ہوگیا۔ کتنی محبت کرتی ہے وہ اس سے "یہ تو محبت بڑھائے گا" اس نے فخر سے نعمان کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ کوئی محبت کم تو نہیں کرے گا۔"

"اور پھر مجھے بیٹی کی خواہش تھی" شہناز نے رکھائی سے کہا۔

"یہ تو اللہ کی نعمت ہے۔ جو اس نے دیا' بہت اچھا دیا۔"

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ شہناز کو بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ بچوں کے معاملے میں وہ پھوہڑ تھی۔ اس نے کبھی کسی بچے کو گود میں نہیں لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بچے کتنے نازک ہوتے ہیں۔ اس کی گرفت سخت ہوتی۔ بچہ رونے لگتا۔ وہ اس کا کوئی کام نرمی سے نہیں کر سکتی تھی۔

ایک بات عثمان کو بہت ناپسند ہوئی۔ شہناز نے کبھی نعمان کو دودھ نہیں پلایا۔ اس نے ٹوکا تو وہ بولی "میں کمزور بہت ہوں۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا اسی لیے ابتدا ہی میں فیڈر سے دودھ دیا گیا۔ بعد میں مشکل ہوتی۔"

عثمان نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اسے افسوس بے حد ہوا۔ ایسا بچہ جو مقدر میں دنیا کی ہر نعمت لے کر آیا تھا' ایک قدرتی نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ کتنی بڑی محرومی ہے یہ؟

پھر ایک دن شہناز نے اس سے کہا "نعمان کے لیے آیا کا بندوبست کر لیں۔"

"وہ کیوں؟" عثمان نے بھویں اچکائیں۔

"کیوں کی کیا بات ہے؟" شہناز نے تنک کر کہا "سب گھروں میں یہی ہوتا ہے۔ میں اس کی اس طرح نگہداشت نہیں کر سکتی' جیسے ہونی چاہیے۔"

"تمہاری یہ بات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ زیادہ تر گھروں میں یہ نہیں ہوتا۔"

"میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہی' جو آیا افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"میں افورڈ کر سکتا ہوں لیکن اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ ماں باپ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ وہ بچے خود اعتمادی سے کبھی محروم نہیں ہوتے' جنہیں ماں باپ کا بھرپور لمس اور ان کی محبت ملی ہو۔ جن کے چھوٹے چھوٹے کام ماں باپ کرتے رہے ہوں۔"

شہناز خاموش ہوگئی۔ اس نے اصرار نہیں کیا لیکن چند روز میں ہی عثمان کو احساس ہوگیا کہ یہ کام اسے کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے ایک بے حد خوب صورت آیا رکھ لی۔

بچہ بڑا ہونے لگا۔ شہناز اس سے بالکل ہی بے تعلق ہوگئی تھی۔ عثمان نے اسے اپنی ذمے داری بنالیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے تمام کام اس نے آیا سے سیکھ لیے۔ اب وہ اس کی نیپی بھی بدل سکتا تھا' اس کے لیے دودھ بھی بنا سکتا تھا۔ وہ دفتر سے جلدی گھر آنے لگا۔ شام کو وہ گھنٹوں اس سے کھیلتا' اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ اسے باہر ٹہلانے کے لئے نکل جاتا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بچہ بہت ذہین ہے۔ وہ وقت تک پہچانتا تھا۔ کسی روز اسے دیر ہوتی تو وہ دیکھتا کہ نومی دروازے پر نگاہیں لگائے بیٹھا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے قلقاریاں مارتا۔

"آیا آپ نے کس لیے رکھی ہے آخر؟" ایک روز شہناز نے غصے سے کہا "یہ رات کو اسے کیوں نہیں سلاتی اپنے پاس؟"

"اس نے کب انکار کیا ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا" عثمان نے جواب دیا "یہ ہمارے ساتھ ہی سوئے گا' تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟"

"یہ بے بی کاٹ کس لیے ہے؟ اور آیا کس لیے ہے؟"

"اور یہ ماں باپ کس لیے ہیں۔ تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟" عثمان نے نرم لہجے میں کہا۔

"رات کو کئی بار اٹھتا ہے۔"

"تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے سارے کام تو میں کرتا ہوں۔"

"روتا بھی بہت ہے۔ میری نیند خراب ہوتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں اسے لے کر دوسرے کمرے میں سو جایا کروں گا" عثمان نے بڑے تحمل سے کہا۔

"میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ الگ رہنے والے بچوں کا ڈر نکل جاتا ہے" شہناز نے پینترا بدلا۔

"میرا نظریہ مختلف ہے۔ جن بچوں کے پاس ماں باپ کے جسموں کی گرمی ہو' اوّل تو وہ ڈرتے نہیں اور ڈریں تو ماں باپ سے لپٹ کر خوف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"

"جو جی چاہے کریں لیکن میری نیند خراب نہ کریں۔"

پھر ان کی شادی کی پہلی سالگرہ آگئی۔ وہ دفتر گیا تو شہناز سو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت خوب صورت تحفہ لے کر گھر آیا تو اس کا دل خوش ہوگیا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ شہناز کو اپنا سالگرہ رات کا وعدہ یاد ہوگا۔ وہ وعدہ تو وہ خود بھی بھول چکا تھا۔

شہناز دلہن بنی ہوئی تھی۔ اس نے سالگرہ کا وہی جوڑا اور

وہی زیورات پہن رکھے تھے' جو ساگ رات میں اس کی آمد سے پہلے اس نے اتار پھینکے تھے۔

عثمان کی شکر گزاری کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس رات تین ماہ کا نعمان اپنی ممّا کے پاس سویا۔

○☆○

شہناز کو اپنی کوکھ میں پلنے والے اس وجود سے ویسے ہی نفرت تھی کہ وہ زبردستی اس پر تھوپ دیا گیا تھا' ستم بالائے ستم یہ کہ وہ لڑکا تھا اور ہو بہو عثمان کی تصویر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اسے کب تک اور کیسے برداشت کرے گی۔

وہ نعمان کو دیکھتی تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس کے جسم سے زبردستی خون' ہڈیاں اور گوشت چھین کر اس بچے کو تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ مکمل نہیں رہی ہے۔ وہ کم ہو گئی ہے۔۔۔ گھٹ گئی ہے "یاد رکھنا عثمان حفیظ" وہ بڑبڑاتی "ستم آئندہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکو گے۔ یہ میرا تم سے بھی وعدہ ہے اور خود سے بھی۔"

ننھا نعمان باپ کی شفقت اور محبت اور ممّا کی نگہداشت کے سائے میں دن گزارتا اور بڑھتا رہا پھر اس نے مما کہنا سیکھ لیا۔ لیکن مما نے اسے گود میں لینا نہیں سیکھا۔ چھوٹا سا بچہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ نفرت کیا ہوتی ہے مگر مما کی بے نیازی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

شہناز کے لیے وہ بچہ گویا ہو کر بھی نہیں تھا۔ اسے اس کی پروا ہی نہیں ہوتی تھی لیکن خون کے رشتوں کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ کبھی اسے نعمان پر بے ساختہ پیار آتا۔ وہ اسے گود میں اٹھالیتی اور اس کے چہرے کو بوسوں سے بھگو دیتی۔ اس وقت جیسے اس کے چہرے کے نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ ایسے میں وہ حیران ہوتی کہ ممتا جیسے طاقت ور ترین جذبے کو اس نے کیسے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کہا جاسکتا ہے' نفرت محبت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور جذبہ ہے لیکن کیا نفرت اتنا طاقت ور جذبہ ہے کہ ممتا جیسے عظیم جذبے پر حاوی ہو جائے؟ یہ خیال اکثر اسے الجھن میں مبتلا کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی نعمان کے چہرے کے نقوش اس کے سامنے اجاگر ہونے لگتے۔ اس کے چہرے میں اسے عثمان کا عکس دکھائی دیتا اور وہ اسے تکتی رہتی۔ ننھا بچہ معصومیت میں لپٹی حیرت سے اسے تکتا رہتا۔

اس نے کتابوں میں پڑھا تھا اور نچلے اور متوسط طبقے کے گھروں میں دیکھا بھی تھا کہ لڑکیاں ان شوہروں کے ساتھ پوری عمر گزار دیتی ہیں' جن سے انہیں شدید نفرت ہوتی ہے۔۔۔ جو بجا طور پر نفرت کے لائق بھی ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ رہتی ہیں اور بچے پیدا کرتی رہتی ہیں۔ وہ ان سے نفرت کرتی ہیں لیکن ان کے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اس لیے کہ وہ ان کے بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کے پاس باپ کا ناپسندیدہ حوالہ تو ہوتا ہے جو کبھی کبھار نفرت بھرے انداز میں استعمال ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر ممتا نفرت پر حاوی آجاتی ہے۔ عورت کہتی ہے کہ وہ انسان کے بچے نہیں' سنپولیے پال رہی ہے۔ پھر بھی وہ انہیں پالتی رہتی ہے۔ یہ طاقت ہوتی ہے ممتا میں۔

"ہاں۔۔۔ یہ بات ملے ہے۔" اس کے اندر سے ایک آواز ابھری "کچلی ہوئی محبت نفرت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ ممتا پر بھی غالب آسکتی ہے۔"

محبت! کچلی ہوئی محبت! شہناز استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ محبت ہوئی ہوتی تو اسے کچلنا بھی پڑتا۔ یہاں تو محبت کبھی تھی ہی نہیں۔ اور نفرت ازلی ہے۔

اس کے اندر کوئی اس سے زیادہ زور سے' اس سے زیادہ مذاق اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ اس نے اس آواز کو نظرانداز کر دیا۔ دیوانوں سے بھلا کوئی لڑ سکتا ہے؟

○☆○

ثوبیہ کی پیدائش نعمان کے سوا دو سال بعد ہوئی۔ عثمان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ کمال یہ ہوا کہ اس بار شہناز بھی خوش تھی۔ نعمان کو تو اس نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا اور عثمان جانتا تھا کہ اب کبھی ایسا نہیں ہو سکے گا مگر ثوبیہ خوش نصیب تھی کہ اسے ماں کا دودھ بھی میسر آیا اور ماں بھی ملی۔

اس عرصے میں ننھا نعمان باپ کو ماں کا درجہ بھی دے چکا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والا بچہ تھا۔ اس سلوک کے باوجود بھی وہ ماں سے محبت کرتا تھا۔ کبھی وہ چند لمحوں کے لیے اس پر مہربان ہو جاتی تو وہ ماں پر واری صدقے ہونے لگتا۔ اپنے سارے کھلونے لا کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا لیکن اس کے لیے باپ کی تو حیثیت ہی کچھ اور تھی۔ وہ اس کا سب کچھ تھا۔ اس کی پوری کائنات ہی باپ کا وجود تھا۔ عثمان گھر میں موجود ہوتا تو وہ اپنا کوئی کام آیا کو نہ کرنے دیتا۔

"پوٹی پاپا سے دھلواؤں گا۔"

"پاپا۔۔۔ مجھے دودھ لا کر دیں۔"

"کھانا پاپا کے ہاتھ سے کھاؤں گا۔"

"پاپا کے ساتھ کھیلوں گا۔"

اور عثمان کبھی اس کے کسی کام سے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ جب فرصت ہوتی' وہ خود اسے نہلاتا۔ نعمان کے لیے وہ لمحے بے حد مسرت خیز ہوتے' جب وہ اور پاپا باتھ روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ نہاتے۔ عثمان اس کے جسم کی مالش کرتا۔ سر میں تیل لگاتا' پھر دونوں لان پر دوڑیں لگاتے۔

کبھی کبھی شہناز عثمان سے کہتی "آپ لاڈ پیار میں اسے بگاڑ رہے ہیں۔"

"لاڈ پیار!" عثمان حیرت سے کہتا "میں تو بس خانہ پری کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ خانہ جو تم نے خالی چھوڑ دیا ہے۔"

"چھوٹی باتوں کو بڑا بنانے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔"

اور عثمان اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہ جاتا۔ شہناز کی محبت اس کے دل میں پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے پہلے ایک بیٹے اور بیٹی کا تحفہ دے کر اسے نہال کردیا تھا۔ ان کے ازدواجی تعلق کا اب بھی وہی حال تھا لیکن اب عثمان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ بچے اس کے لیے وسیلۂ اظہار بن گئے تھے۔ ازدواجی زندگی کی خلوتیں معطل ہوگئی تھیں۔ کبھی کبھی اسے بڑی شدت سے کمی محسوس ہوتی لیکن وہ صبر کرلیتا۔ ہمارے ستارے شاید بچوں ہی کی حد تک ملتے تھے' وہ سوچتا....

اس بار اس نے تجویز پیش کی کہ ثوبیہ کو آیا کے پاس سلایا جائے۔ شہناز بھڑک گئی۔ دلیلیں الٹ گئی تھیں۔ جو دلیلیں شہناز نے نعمان کے معاملے میں دی تھیں' وہ اب عثمان دے رہا تھا۔ اور شہناز وہی جوابی دلیلیں دے رہی تھی' جو کبھی عثمان نے دی تھیں۔

"بس تو ہم سب ساتھ سویا کریں گے" عثمان نے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بیڈ بہت چھوٹا ہے" شہناز نے اعتراض کیا۔

"بیڈ کی فکر مت کرو۔ میں بہت بڑا بیڈ بنوالوں گا۔"

شہناز کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ اذیت کا کھیل پھر سے شروع کرنا چاہتا تھا۔ قربت ہوگی تو شعلہ بھڑکے گا۔ شعلہ بھڑکے گا تو آگ لگے گی۔ اور آگ کو بھڑک کر جل بجھنے کا موقع نہیں ملے گا تو جسم سلگتا رہے گا' نہ جلے گا نہ بجھے گا۔

عثمان نے بہت بڑا بیڈ بنوالیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیسے سویا جائے۔ عثمان چاہتا تھا کہ وہ دونوں کناروں پر سوئیں اور بچے درمیان میں۔ شہناز کو اعتراض تھا کہ نعمان سوتے میں لاتیں بہت چلاتا ہے۔ ثوبیہ کے لیے خطرناک ہوگا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ ثوبیہ ماں اور باپ کے درمیان سوئے گی اور نعمان باپ کے برابر کنارے پر۔

کھیل پھر سے شروع ہوگیا۔ وہی خواہش' گریز اور اذیت کا کھیل۔ لیکن اس بار اذیت پہلے جیسی پُراثر نہیں تھی۔

ننھا نعمان بہن سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے قریب رہنا' اس سے کھیلنا چاہتا تھا۔ عثمان گھر میں ہوتا تو دیکھتا کہ شہناز نعمان کو کبھی ثوبیہ کے قریب نہیں ہونے دیتی۔ وہ جب بھی ثوبیہ کے قریب جاتا' شہناز اسے جھڑک کر ہٹادیتی۔

"یہ کیا کرتی ہو تم؟" ایک دن عثمان نے چڑ کر کہا "بھائی بہن کے درمیان نہیں آیا کرو۔"

"آپ نہیں سمجھتے' بچے تو معصوم ہوتے ہیں نا۔ خیال تو بڑوں کو رکھنا پڑتا ہے۔" شہناز نے بے حد رسان سے کہا "کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کھیل ہی کھیل میں نعمان ثوبیہ کے سینے پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ تو میں وقت پر پہنچ گئی ورنہ خدانخواستہ...."

"واقعی؟ یہ خیال تو رکھنا پڑے گا۔"

ثوبیہ بھی بڑی ہوتی جارہی تھی' وہ گھٹنوں چلنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی باتیں کرنے لگی۔ پھر ڈگمگاتے قدموں سے چلنے بھی لگی۔ لیکن شہناز کی احتیاط پسندی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی گئی۔ نعمان ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا۔ باپ کو بیٹی ویسے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ ثوبیہ اور نعمان کے لیے اپنی محبت کا موازنہ کرتا تو اسے ثوبیہ کا پلہ جھکتا نظر آتا مگر محبت کا عملی اظہار وہ نعمان کے معاملے میں زیادہ کرتا تھا اس لیے کہ نعمان کی ضرورت بڑی تھی۔ وہ ایک طرف سے محروم جو تھا۔ ثوبیہ خوش نصیب تھی۔ اسے کوئی خانہ خالی نہیں ملا تھا۔

دونوں بچے قدرتی طور پر ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن شہناز اب بھی دونوں کے درمیان دیوار بنی رہتی تھی۔ عثمان نے اس کا حل بھی نکال لیا۔ وہ شام کو جلدی گھر آتا اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر لان میں چلا جاتا۔ وہ دن بھر کے ترسے ہوئے آپس میں کھیلتے رہتے۔ وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ یہ دیکھ کر کہ نعمان ثوبیہ کا کتنا خیال رکھتا ہے اور اس کی خاطر ہر ایثار کے لیے تیار رہتا ہے' اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

سورج غروب ہوتا تو وہ انہیں گھر میں لے آتا۔ وہ اس کے سامنے کھیلتے رہتے۔ یہاں تک کہ سوجاتے۔

ایک دن نعمان نے اس سے کہا "پاپا.... آپ ہر روز دفتر کیوں جاتے ہیں؟"

عثمان حیران رہ گیا۔ اتنے سادہ اور آسان سوال کا کسی چھوٹے سے بچے کو کیا جواب دیا جاسکتا ہے "بیٹے.... آپ کے لیے پیسے جو کمانے ہوتے ہیں" اس نے کہا۔

"لیکن پاپا' مجھے تو پیسے نہیں چاہئیں۔"

عثمان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ "بیٹے ایک بات بتاؤ۔ یہ اپنا گھر تمہیں اچھا لگتا ہے.... اور یہ گھر کی ساری چیزیں اور تمہارے کھلونے؟"

"جی پاپا!"

"تو بیٹے' میں ہر روز دفتر نہ جاؤں تو یہ سب کچھ چھن جائے گا اس لیے میں روز دفتر جاتا ہوں۔"

ساڑھے چار سال کا بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے بڑوں کے سے انداز میں کہا "یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا پاپا!"

عثمان کو اس پر پیار آگیا "مجھے بتاؤ تو کہ مسئلہ کیا ہے۔ مسئلہ ہے تو اس کا حل بھی ہوگا۔"

"بات یہ ہے پاپا کہ آپ آفس نہ جائیں تو میں اور ثوبیہ دن بھر ساتھ کھیل سکتے ہیں۔"

عثمان سوچنے لگا۔ اس نے پچھلے سال نومی کو اسکول میں داخلہ دلایا تھا اور اب چھٹیاں تھیں "تو مسئلہ حل ہوگیا" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "ہم دفتر سے پندرہ دن کی چھٹیاں لیں گے اور تمہیں پورا پاکستان دکھائیں گے۔ خوب کھیلنا تم۔"

نومی اس سے لپٹ گیا "پاپا.... آپ بہت اچھے ہیں' آئی لو یو"

اس نے اس کے رخسار کو چوم لیا "آئی لو یو پاپا!"
"بس ہم کل ہی چلیں گے۔"

○☆○

شہناز محسوس کر رہی تھی کہ کھیل ختم ہوتا جا رہا ہے!
عثمان دونوں بچوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ کبھی اس کی طلب نہیں کرتا تھا۔ اسے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کم از کم لگتا تو یہی تھا۔ اور یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ وہ تو جلنے اور تڑپنے کے بجائے پُرسکون ہو گیا تھا۔
شہناز متوحش ہو گئی۔ یہ تو سب رائگاں جا رہا تھا۔ عمر ہی رائگاں جا رہی تھی۔ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔
وہ سوچتی رہی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی حکمت عملی ہی ٹھیک نہیں تھی۔ اس میں کچا پن تھا۔ کسی چیز سے محرومی کا بھرپور احساس تو اس وقت ہوتا ہے' جب اس کی افادیت پوری طرح روشن ہو۔ جس شخص نے کبھی سیر ہو کر پانی ہی نہ پیا ہو' اس کی تشنگی تو بس واجبی سی ہی ہوگی۔ پہلے تو اسے یہ ثابت کیا جائے کہ کوئی نعمت کتنی بڑی ہے۔ اس کے بعد وہ محروم ہوگا تو عمر بھر پچھتائے گا۔ اس نے عثمان کو ابتدا ہی سے لذت سے محروم کر کے غلطی کی تھی۔ تبھی تو بچوں نے اس کی محرومی کی بہ آسانی تلافی کر دی تھی۔
اس نے اپنی حکمت عملی درست کرنے کا فیصلہ کر لیا!
اسے لگتا تھا کہ یہ کام مشکل ثابت ہوگا۔ جس طلب سے کسی نے سمجھوتا کر لیا ہو' اسے جگانا آسان نہیں ہوتا لیکن وقت آنے پر اسے معلوم ہوا کہ عثمان نے سمجھوتا نہیں کیا تھا بلکہ وہ غیر معمولی ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جبکہ ضبط ترغیب کے خلاف بہت کمزور ثابت ہوتا ہے اور ضبط بھی وہ جو فطرت پر کیا جا رہا ہو۔
اس کے ہاتھوں کے پہلے ہی لمس نے عثمان کو پگھلا دیا۔ وہ اس پر یوں برسی جیسے برسوں کے تپتے پیاسے صحرا پر موسلا دھار بارش۔ مگر صحرا کی پیاس کہاں بجھتی ہے۔ وہ تو اور بھڑک جاتی ہے۔ صحرا تو سیلاب پی جائے' پھر بھی خشک ہی رہتا ہے۔ ہاں وہ شکر گزار ضرور ہوتا ہے۔
وہ صحرا کو طوفانی بارش پا کر اسے عادی بنا رہی تھی۔ اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک عرصہ تھا۔ اس کے بعد صحرا کے آسمان پر بس چھوٹی چھوٹی بدلیاں رہ جاتیں۔ بدلیاں' جو صرف پیاس بڑھاتی ہیں' برستی کبھی نہیں۔ پیاس کبھی نہیں بجھاتیں۔ وہ بدلیوں کو پکارتا ہے' ان سے التجا کرتا ہے لیکن اپنی پیاس کی دیوار سے سر ٹکرا کر لہولہان ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔
وہ جانتی تھی کہ بھڑکی ہوئی پیاس کے ہاتھوں تڑپتا صحرا بہتے ہوئے سیال کو آبِ رواں سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ زہر ہو کہ تیزاب' اس کے حلق میں ابھرے کانٹوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کیسا عذاب... کیسی موت خریدی ہے۔
وہ بہت خوش تھی۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اب وہ انہیں کھینچنے ہی والی تھی!

○☆○

"... میاں بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے سچا' سب سے پکا اور سب سے قریبی رشتہ ہوتا ہے..." مسز شمیم کی تقریر جاری تھی۔
آدمی چند لمحوں میں کتنا کچھ سوچ سکتا ہے۔ پوری زندگی بھی دہرا لیتا ہے۔ عثمان حفیظ نے حیرت سے سوچا۔ لیکن اب وہ کیا کرے۔ اس کی سوچ اور یادیں زندگی کے جس مقام تک پہنچ گئی تھیں' وہ ناگفتہ بہ تھا۔ اسی لیے سوچوں کا' یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا اور حال کے لمحے سے مسز شمیم کی آواز اس کی سماعت میں در آئی تھی۔
اس نے سوچا' دنیا میں کون ایسا ہوگا' جو پوری سچائی کے ساتھ اپنی پوری زندگی دہرا سکے۔ اتنا ظرف انسان میں کہاں ہوتا ہے اور اتنی صاف زندگی بھی کون گزارتا ہے۔ کون اپنے باطن کو تھال میں سجا کر پوری دنیا کے' لوگوں کے ملاحظے کے لیے لے کر نکل سکتا ہے۔ یہ تو صرف پیغمبروں اور ولیوں کے لیے ہی ممکن ہے۔
ہر انسان کے ساتھ ایسی یادیں' ایسے راز ہوتے ہیں' جنہیں وہ دوسروں پر نہیں کھول سکتا بلکہ ہر کسی کے ساتھ ایسے معاملات بھی ہوتے ہیں' جن پر وہ خود سے بھی بات نہیں کر سکتا۔ جن کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ جنہیں وہ ساری عمر ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔
عثمان حفیظ کے سامنے بھی زندگی کے وہ صفحات آ گئے تھے' جنہیں وہ خود بھی نہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن انہیں زندگی کی کتاب سے نکالنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ایسی یادوں کے لیے کمپیوٹر سے کہیں زیادہ پیچیدہ' اللہ کی تخلیق انسانی دماغ کا ایک حصہ خود کار سنسر کا کام کرتا ہے۔ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے لیکن مکروہ حقیقتیں چھپانا ہی پڑتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چھپانے سے حقائق مٹتے نہیں لیکن...
مسز شمیم کی آواز سے... حال سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ پھر زندگی کی کتاب پڑھ رہا تھا...

○☆○

ازدواجی زندگی کے سات سال گزر چکے تھے۔ خواب بکھر چکے تھے۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایسا پیاسا تھا جو پینے کے نام پر زہر بھی پی سکتا تھا۔ محرومیوں' ناآسودگیوں اور روح کے ناسوروں سے گھبرا کر اس نے جسم و جاں کے لیے نئے مشغلے ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ گھٹیا ہو گیا ہے۔ ذلت کی گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔
شراب اور عورت۔ یہ اس کے نئے ساتھی تھے لیکن یہ سب مشغلے دن کے تھے۔ اس کی شامیں اب بھی اپنے بچوں کے لیے وقف تھیں۔ اس کا دن آسودگی کی جستجو سے شروع ہوتا اور رندھوشی

کے کرب کے ساتھ ختم ہوتا۔ شام اس کے لیے حقیقتاً آسودگی لے آتی۔ بچوں کے ساتھ وہ بہت خوش رہتا لیکن رات اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن جاتی۔ رات اپنے ساتھ ایسے عذاب لاتی کہ اسے رات سے خوف آنے لگا تھا پھر یوں ہوا کہ اس نے رات کو گھر میں بھی پینے کا معمول بنالیا۔

وہ خوب عیاشی کررہا تھا۔ وہ اس کا متحمل ہوسکتا تھا۔ دفتر سے اس کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ ابو کے وفادار ملازم اعتبار کے لوگ تھے۔ کاروبار اس کی بے پروائی کے باوجود نہ صرف چل رہا تھا بلکہ پھل پھول بھی رہا تھا۔ وہ تو اب صرف ضروری کاغذات اور چیکس پر دستخط کرتا تھا۔

اپنی عیاشی کے لیے اس نے شہر کے پُرسکون علاقے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ ایسا علاقہ تھا' جہاں کسی کو کسی پر نظر رکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہاں پڑوسی کو پڑوسی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح دفتر کے ضروری کام نمٹاتا اور اس فلیٹ کا رخ کرتا۔ وہاں اس کے لیے شراب بھی ہوتی اور ہر روز ایک نئی عورت بھی۔ شہر میں کال گرلز کی کمی تو نہیں تھی۔

کچھ بھی سہی' ایک خیال نشے میں بھی اس کے دماغ میں ڈنک گاڑتا رہتا تھا۔ وہ سوچتا.... یہ میں ہوں....! عثمان حفیظ! میں اور ایسا....! یہ سب شہناز کی مہربانی ہے۔ میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ یہ اس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ کیسی محرومیاں دیں اس نے مجھے۔ کیسے زخم لگائے۔ کیسے داغا میری روح کو۔ میں کتنا گر گیا ہوں۔ کیا محبت اتنی بری چیز ہے۔ کیا کمی تھی میری محبت میں۔ کیوں اس طرح ذلیل کیا اس نے مجھے۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا اور ہر لمحے شہناز سے اس کی نفرت میں اضافہ ہوجاتا۔ وہ ایسی نفرت نہیں تھی کہ محبت کی صورت مسخ ہوئی ہو اور اس نے نفرت کا چہرہ اوڑھ لیا ہو۔ وہ کچلی ہوئی محبت نہیں تھی۔ وہ اصلی اور خالص نفرت تھی۔ محبت کی عمارت جل کر راکھ ہوئی تھی اور اس کی جگہ نفرت تعمیر ہوئی تھی۔

کتنا ہی چھپایا جائے' جہاں آگ لگی ہو' وہاں سے دھواں اٹھتا ہی ہے۔

ایک دن شہناز نے اس سے پوچھ ہی لیا "سنا ہے' آپ پینے لگے ہیں؟"

"درست سنا ہے تم نے۔"

"کب سے؟"

"مدتیں ہوگئیں اب تو۔ میں تو گھر میں بھی پیتا ہوں۔"

شہناز کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا "اور مجھے معلوم بھی نہیں؟"

"تمہیں مجھ سے غرض ہی کیا ہے' جو معلوم ہو۔ تمہیں مجھ میں دلچسپی ہی کب ہے۔"

"اور سنا ہے' آپ کی زندگی میں عورتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک سنا ہے تم نے" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"آپ اپنے باپ کی محنت سے کمائی ہوئی دولت یوں اڑا رہے ہیں.... کال گرلز پر۔ ان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں' جو تم میں ہیں" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "اور اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں۔ برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔"

"اب آپ مجھے الزام دیں گے۔"

وہ اس پر الزام ثابت کرسکتا تھا لیکن نفرت ایسی تھی کہ وہ اسے اپنی تباہی کا کریڈٹ بھی نہیں دینا چاہتا تھا "تمہیں کیوں الزام دوں۔ میں تم سے ڈرتا ہوں کیا۔ میں تو یہ اعتراف کررہا ہوں کہ یہی میرا اصل چہرہ ہے۔ بہت دن نقاب ڈال کر جی لیا۔ اب منافقت نہیں چلے گی۔ سیدھی سی بات ہے۔ میرے پاس دولت ہے تو عیاشی کیوں نہ کروں؟"

"مجھ سے ڈرتے نہیں تو مجھے خود سے کیوں نہیں بتایا' گھر میں چھپ کر کیوں پیتے رہے؟"

"تم سے نہیں ڈرتا۔ بچوں کا.... خاص طور پر نومی کا خیال رہتا ہے۔"

شہناز کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نظر آئی "اوہ.... یہ بات ہے۔ مجھے سمجھ لینی چاہیے تھی" پھر اس کے تیور بدل گئے۔ "مجھے آپ کی عیاشی پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بات سن لیں۔ آپ گھر میں کبھی شراب نہیں پئیں گے۔"

یہ وہ وقت تھا جہاں عثمان کو وہ مضبوطی دکھانا تھی' جو اس کے اندر نہیں تھی۔ یہ جنگ تو وہ اپنے آپ سے مہینوں پہلے لڑچکا تھا اور ہار گیا تھا۔ بچوں کی.... اور خاص طور پر ثوبیہ کے مستقبل کی خاطر ضروری تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی جاری رہے۔ وہ اپنے بچوں کو منقسم انسان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ پھر وہ شہناز کو طلاق دیتا تو اس سے معاشرے میں بچوں کی پوزیشن متاثر ہوتی۔ وہ نکو بن کر رہ جاتے۔ اور یہ بھی ضروری تھا کہ شہناز کو اس کی اس سوچ کا علم نہ ہو بلکہ اس پر بالکل برعکس تاثر نقش کیا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ شہناز کو اس کی اس کمزوری کا علم ہوگیا تو وہ اسے بلیک میل کرے گی۔ اس کی زندگی عذاب بنادے گی۔

اس نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا "یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میں جو چاہوں گا' وہی کروں گا۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"یہ میں برداشت نہیں کروں گی" شہناز نے کڑے لہجے میں کہا۔

"نہ کرو" عثمان نے بے پروائی سے کہا "اس گھر کے دروازے بند نہیں ہیں' تم یہاں قید نہیں ہو اور تمہارے پاپا ہنسی خوشی تمہیں افورڈ کرسکتے ہیں۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

شہناز سناٹے میں آگئی۔ یہ تو اس کے خواب وخیال میں بھی

نہیں ہوگا کہ وہ ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ بہرحال اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "واقعی... یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ لیکن میں بچوں کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"موسٹ ویلکم" عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "تم انہیں رکھو یا مجھے دے دو' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں لے جاؤ گی تو میرے لیے اور سہولت ہو جائے گی۔ میں وہ سب کچھ گھر پر بھی کر سکوں گا' جس کے لیے مجھے ایک مہنگا فلیٹ کرائے پر لینا پڑا ہے اور چھوڑ جاؤ گی تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سیٹ اپ چلتا ہی رہے گا" وہ کہتے کہتے رکا "شہناز بیگم' تم مجھے سات سال پہلے والا عثمان سمجھنے کی غلطی مت کرو۔ آئندہ میرا تجزیہ نئی روشنی میں کرنا ورنہ پچھتاؤ گی" اس نے سرد لہجے میں اضافہ کیا۔

"یہ ہے آپ کی وہ محبت' جس کے افسانے...."

"ایک منٹ۔ خوب یاد دلایا" عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "آؤ میرے ساتھ" وہ سوچ رہا تھا' یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آدمی کو جو کہنا ہو' وہ کہہ نہیں سکتا۔ اور اس کے بجائے کچھ اور کہنا پڑتا ہے۔ "محبت تو ضرورت کے تحت ہوتی ہے شہناز بیگم۔ اب تم میری ضرورت ہی پوری نہیں کرتیں تو محبت کیسی؟" وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "آج کل تو میں بازاری عورتوں سے محبت کر رہا ہوں۔"

وہ شہناز کو خواب گاہ میں لے گیا' جسے وہ مہینوں سے بھولا ہوا تھا۔ وہ سیدھا بلوری تاج محل کی طرف گیا اور زور لگا کر اسے اسٹینڈ سے کھسکانے لگا۔ بلور کا وہ تاج محل اس کی توقع سے زیادہ بھاری تھا اس لیے چھتا کا بھی بہت زوردار تھا۔ "سوری شہناز بیگم! اس علامت کو تو مجھے اسی وقت مٹا دینا چاہیے تھا' جب تمہاری محبت ختم ہوئی تھی۔ خیر' اب سہی۔ امید ہے وہ گھڑی تم خود ہی پھینک دو گی" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "اب محبت کی اس علامت کو کوڑے کے ڈھیر پر پھکوا دینا۔ اور اس وقت تک اس کمرے میں ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر چلنا۔"

شہناز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹوٹے ہوئے تاج محل کو دیکھ رہی تھی۔ بہت باریک کرچیاں بہت دور تک' پھیلی تھیں۔ بڑے ٹکڑے اسٹینڈ کے پاس ہی پڑے تھے۔ تو یہ ہوتی ہے محبت؟ اتنی نازک' اتنی غیر محفوظ؟ وہ سوچ رہی تھی لیکن اس کے دل میں دکھ کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"گڈ نائٹ" عثمان نے کہا اور خواب گاہ سے نکل آیا۔ یہ بات اس کے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث تھی کہ تاج محل توڑتے وقت نہ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی نہ اس کے دل میں کوئی ٹیس اٹھی تھی۔ وہ اس پر بھی بہت خوش تھا کہ اس کا بلف کارگر ثابت ہوا۔ اب اسے شہناز کی طرف سے بھی پریشانی نہیں ہوگی۔

اس رات بہت مدت کے بعد ایسا ہوا کہ وہ سکون سے سویا۔

○☆○

شہناز نے جو سوچا تھا' اس کے مطابق عمل کیا۔ اس نے ایک سال میں عثمان کو اپنی لت لگا دی۔ اس نے اپنا آپ اس پر نچھاور کر دیا۔ قربت میں اس کے انداز میں وارفتگی اور محبوبیت ہوتی۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کی کوئی شاہی کنیز بن گئی' جسے شہنشاہ کو خوش کرنے کے تمام گُر آتے تھے۔

پھر اچانک اس نے خوشیوں کی طنابیں کھینچ دیں۔ پُرتکلف مرغن کھانوں کا عادی عثمان اب بھوکا تھا۔ وہ اس کے خوانِ بدن کا عادی ہو چکا تھا مگر دستر خوان سمیٹا جا چکا تھا۔ وہ بہت سکون سے اسے ٹوٹتے' بکھرتے دیکھتی رہی۔ اس کی ریزگی میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ چڑچڑا اور بدمزاج ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ رات بھر نہیں سو پاتا تھا۔ اس کا اثر اس کی صحت پر پڑ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

پھر ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ نسبتاً پُرسکون نظر آنے لگا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس سے کھنچ بھی گیا تھا لیکن یہ فطری ردِعمل تھا۔ البتہ شہناز کو یہ پریشانی ضرور تھی کہ ریزگی کا عمل کیوں رک گیا ہے۔

ایک ٹیلی فون کال نے اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی۔ اسے پتا چل گیا کہ ریزگی کا عمل رکا نہیں' اس نے جہت تبدیل کر لی ہے اور اس کی رفتار بڑھ گئی ہے۔

اس روز ڈیڑھ بجے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"جی مجھے مسز عثمان سے بات کرنی ہے" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے کہا۔

"میں بول رہی ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"بی بی... میں ساجد علی بات کر رہا ہوں۔"

"کون ساجد علی؟"

"آپ کی فرم کا منیجر۔ آپ بھول گئیں مجھے؟ آپ کے گھر کو ہم نے ہی سجایا تھا۔ ہمیں شادی سے پہلے ہی صاحب نے گھر بلا لیا تھا...."

"ہاں... یاد آ گیا۔ کیسے ہیں آپ؟" شہناز نے خشک لہجے میں کہا "صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"جی... میں جانتا ہوں۔ مجھے آپ ہی سے بات کرنا تھی۔"

"مجھ سے؟ کس سلسلے میں؟ آپ جانتے ہیں' میں کاروباری معاملات میں نہیں پڑتی۔"

"کاروباری بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! مجھے آپ کو بہت ضروری... لیکن بہت مشکل بات بتانی ہے" آواز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

شہناز کو الجھن ہونے لگی "بھئی آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں' صاف بات کریں۔"

"بات یہ ہے بیگم صاحبہ کہ ہم بڑے صاحب کے زمانے کے نمک خوار ہیں۔ خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔ آپ کے سوا کوئی نہیں' جس سے بات کرسکیں۔ عثمان صاحب نے کاروبار پر توجہ دینا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ وہ غلط سمت میں چل پڑے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" شہناز نے ترش لہجے میں پوچھا۔

"بتاتے ہوئے دکھ بھی ہو رہا ہے اور افسوس بھی لیکن بتانا ضروری ہے۔ عثمان صاحب کو امیروں والے شوق لاحق ہو گئے ہیں۔"

"وضاحت کیجئے ساجد صاحب۔"

"صاحب پینے لگے ہیں اور عورتوں کا چکر بھی چل گیا ہے۔ دفتر میں سب پریشان ہیں۔ عثمان صاحب ایسے تھے نہیں۔ نہ جانے کیا ہوگیا ہے انہیں۔ ہم لوگ تو کچھ نہیں کرسکتے اس لیے آپ کو صورت حال بتادی ہے۔"

"آپ کا شکریہ ساجد صاحب۔ میں دیکھوں گی کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔ اب تک تو مجھے علم ہی نہیں تھا' اچھا خدا حافظ۔"

اس رات شہناز نے عثمان سے بات کی۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اب ایک بدلا ہوا آدمی ہے۔ اس رات عثمان نے وہ تاج محل توڑ ڈالا' جسے اس نے سہاگ رات کو اس کے لیے اپنی محبت کی علامت قرار دیا تھا۔ وہ شہناز کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اس تاج محل سے یا عثمان کی محبت سے کوئی دلچسپی تھی۔ ملال اس بات کا تھا کہ وہ اس کے ٹرانس سے پوری طرح نکل چکا تھا بلکہ شاید اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ بہرکیف اب وہ اس کے قابو میں بالکل نہیں رہا تھا۔ اس کا اندازہ اسے کچھ دیر پہلے اس وقت ہوگیا تھا' جب عثمان نے اس پر واضح کردیا تھا کہ وہ چاہے تو اس سے طلاق لے سکتی ہے۔ چاہے تو بچے بھی ساتھ لے جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی سفاکی تھی۔

شہناز کو اس ازدواجی زندگی میں ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسی وقت گھر چھوڑ دیتی۔ نعمان سے تو اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ثوبیہ سے وہ دور نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر اس نے عثمان کی آزادی کی پیشکش کو قبول نہیں کیا تھا تو اس کی ایک وجہ ثوبیہ ہی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ معاشرے میں مطلقہ ماں کی بیٹی کو تمام تر خوبیوں کے باوجود عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کا سوسائٹی میں کوئی اچھا مقام نہیں ہوتا۔ اسے اچھا رشتہ ملنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ اور شہناز کو ثوبیہ کا مستقبل بہت عزیز تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مشکور کی شادی ہوچکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ وہ اب بھی اس سے شادی نہیں کرسکتا۔ یہ امکان ہوتا تو وہ پہلے ہی عثمان کو چھوڑ چکی ہوتی۔

اس کا قیدی آزاد ہوچکا تھا' اس کا اسے افسوس تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ ایک اہم مقصد وہ حاصل کرچکی ہے۔ اس لیے وہ اگلے روز ممی سے ملنے گھر چلی گئی۔

"کیا بات ہے؟ بہت بجھی بجھی نظر آرہی ہو؟" ممی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

اس وقت وہ بہت اچھی اداکاری کررہی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کیا بات ہے' تم رو کیوں رہی ہو؟" ممی نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ ممی سے لپٹ گئی "پاپا نے اور آپ نے مجھے جہنم میں جھونک دیا ممی" وہ سسکنے لگی۔

"کیا ہوا؟ بات کیا ہے؟" ممی متوحش ہوگئیں۔

اس نے ساجد علی کی فون کال سے لے کر عثمان سے گفتگو تک سب کچھ من وعن بتا ڈالا "اب آپ بتائیے۔ جن برائیوں کی وجہ سے پاپا نے مشکور کو مسترد کیا تھا' وہی برائیاں عثمان میں بھی نکل آئیں۔ مشکور سے میری شادی ہوگئی ہوتی تو میں شکایت نہ کرتی کہ وہ میرا فیصلہ تھا۔ اب پاپا کیا جواب دیں گے مجھے؟ میں نے یہ سب کچھ انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ میں انہیں اپنے سامنے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب وہ بتائیں کہ ان کی مردم شناسی کیا ہوئی۔"

فہمیدہ بیگم سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھیں "یقین نہیں آتا کہ عثمان ایسا ہوسکتا ہے" وہ بڑبڑائیں۔

"پاپا سے کہیں' اس کے دفتر جاکر ساجد صاحب سے پوچھ لیں۔"

"لیکن اتنے برسوں کے بعد ایسا کیوں ہوا؟" فہمیدہ بیگم کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"اس نے خود مجھ سے کہا کہ یہی اس کا اصلی روپ ہے" شہناز نے تند لہجے میں کہا "سات سال وہ چہرے پر پارسائی کا نقاب اوڑھے منافقت کرتا رہا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ممی۔ کہنے لگا کہ چاہو تو طلاق لے لو۔ تمہارے پاپا تمہیں افورڈ کرسکتے ہیں۔"

"یقین نہیں آتا۔ اتنے برسوں کے بعد کیوں...؟ کوئی سبب تو ہوگا" فہمیدہ بیگم کے لہجے سے بے یقینی نہیں جارہی تھی۔

"آپ کے خیال میں' میں جھوٹ بول رہی ہوں" اس نے چڑ کر کہا۔

"میں یہ تو نہیں کہہ رہی ہوں" فہمیدہ بیگم نے مدافعانہ لہجے میں کہا "تم پاپا کو بھی یہ سب کچھ بتانا..."

"میں تو اب گھر واپس جارہی ہوں۔ پاپا کو آپ ہی بتادیجئے گا ان کی مردم شناسی کے متعلق۔"

ممی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔

○☆○

عثمان مطمئن تھا کہ شہناز کی طرف سے اب اسے کسی پریشان کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کوئی نیا مسئلہ نہیں کھڑا ہوگا۔ وہ اب

تک جو کچھ کر چکی ہے' وہی اس کے لیے بہت ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس بار اس نے دباؤ ڈالا ہے۔ اسے بچل کر رکھ دیا ہے۔ اسے سب سے زیادہ طیبہ کی کا خوف تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی قائم رکھنے کے لیے اس نے بے پناہ اذیت سہی تھی۔ بدترین عذاب اپنے اوپر اٹھائے گھوم رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کو کوئی خلل لاحق ہو۔ اس لیے اس نے اس معاملے میں بے پروائی لاپروائی تھی۔ اس نے شہناز کو یہ تاثر دیا تھا کہ اسے اپنے بچوں کی' ازدواجی زندگی کی اور معاشرے میں اپنے اور بچوں کے مقام کی کوئی پروا نہیں۔

لیکن اس کا یہ اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ شہناز کسی بھی زاویے سے کوئی وار کر سکتی ہے۔ اسے بس اس کی کوئی کمزوری معلوم ہو جائے۔ کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ہنر اسے خوب آتا ہے۔

اس شام وہ بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔ اچانک نعمان نے اس سے پوچھا "پاپا۔۔۔ شراب بہت بری چیز ہوتی ہے؟"

اسے شاک لگا۔ وہ اپنے بیٹے کے معصوم چہرے کو تکتا رہ گیا۔ اس کا بیٹا اب آٹھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سات سال کی عمر کتنی نازک ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے' جب بچہ معصومیت کی دہلیز پر کھڑا شعور اور آگہی کی طرف پہلا قدم بڑھا رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھ داری کے دور میں داخل ہونے والا ہوتا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ اس عمر میں بچوں کو نماز سکھائی جائے۔ نماز پڑھنے کی تلقین کی جائے۔ تلقین سے کام نہ چلے تو سختی کی جائے تاکہ سن شعور کا آغاز دین کے ساتھ ہو۔

اور یہاں اس عمر میں اس کا بچہ شراب کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اسے خود سے شرم آنے لگی۔ غصے سے اس کا خون کھول اٹھا۔

"آپ نے بتایا نہیں پاپا" نعمان نے کہا۔

"ہاں بیٹے۔ شراب بری نہیں۔۔۔ بہت بری چیز ہوتی ہے"

عثمان نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ اللہ کے حکم کا حوالہ نہیں دیا اس لیے کہ وہ خود شراب پیتا تھا۔

"میں نہیں مانتا پاپا کہ شراب بری چیز ہوتی ہے" نعمان کے لہجے میں یقین تھا۔

عثمان نے گھبرا کر ثوبیہ کو دیکھا' جو پوری توجہ سے یہ گفتگو سن رہی تھی "ثوبی بیٹا' بھاگ کر اندر جاؤ اور ثریا سے چائے بنوا کر لاؤ۔ چائے خود لے کر آنا میرے لیے" اس نے کہا۔

"پاپا۔ میں کہہ کر آجاؤں۔ چائے آنا خود لے آئیں گی" پانچ سالہ ثوبیہ نے کہا۔

"نہیں بیٹی۔ چائے تمہی لے کر آنا۔ تمہارے ہاتھ لگیں گے تو چائے اچھی ہو جائے گی۔ جاؤ بیٹا" اس نے چمکارا۔

ثوبیہ خوش ہو گئی "ابھی لاتی ہوں پاپا" اس نے چہک کر کہا اور گھر میں چلی گئی۔

عثمان اب نومی کو گھور رہا تھا "یہ جو تم نے کہا کہ تم شراب کو بری چیز نہیں مانتے' اس کا کیا مطلب ہے؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"میں سمجھتا ہوں پاپا کہ شراب بری نہیں' اچھی چیز ہوتی ہے۔"

عثمان کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی "یہ بے ہودہ بات کیسے سوچی تم نے؟"

"ایک بات بتائیں پاپا۔ آپ شراب پیتے ہیں؟"

وہ الجھن میں پڑ گیا۔ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔۔۔ اور کیسے؟ اب کیا بتائے اسے؟

"اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے پاپا" اس کے بیٹے نے بے حد معصومیت سے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔ میں بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔" اس نے فیصلہ کر لیا "ہاں۔۔۔ میں شراب پیتا ہوں بیٹے" اس کا سر جھک گیا۔ شرمندگی کا احساس پہلی بار ہوا تھا "لیکن تمہیں یہ بات بتائی کس نے؟"

"مما نے بتائی تھی۔ اور میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاپا شراب پیتے ہیں تو شراب بری چیز نہیں ہوگی۔ مما کہنے لگیں' شراب تو ہوتی ہی بری ہے۔"

عثمان کا خون پھر کھولنے لگا۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا' جب اس نے شہناز کے سامنے اس کمزوری کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اس سے نہیں ڈرتا لیکن بچوں کو بچانا چاہتا ہے۔ کم ظرف عورت نے وار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی "مما ٹھیک کہتی ہیں بیٹا" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میں نہیں مانتا' میں نے مما سے کہہ دیا تھا کہ بڑا ہو کر میں بھی شراب پیوں گا۔"

"کیوں کہی تم نے یہ بات؟" وہ غرایا۔

"میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں پاپا' آپ تو ہیرو ہیں۔"

عثمان کو احساس ہوا کہ بچے پر غصہ کرنا جائز نہیں۔ اس کا اس میں کیا قصور۔ قصور تو اس کا اور شہناز کا ہے بلکہ درحقیقت اس کا اپنا ہے "بیٹے۔ میں انسان ہوں' انسان کبھی خامیوں' برائیوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ تمہیں مجھ جیسا نہیں بننا چاہیے۔ ویسا بننا چاہیے' جیسا اللہ نے حکم دیا ہے" وہ نرم لہجے میں کہتا رہا۔ "اللہ کا ہر حکم سچا' اس کی ہر بات برحق۔ اللہ نے شراب کو بہت بری چیز قرار دیا ہے۔ حرام' گندی' غلیظ۔ سمجھے بیٹے' تو میں کوئی برا کام کروں تو وہ میرے کرنے کی وجہ سے اچھا نہیں ہو جائے گا' برا ہی رہے گا۔"

نعمانی کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ جیسے کسی اندرونی کشمکش سے دوچار تھا پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "مگر پاپا۔ میں تو آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے بیٹے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہر برائی چھوڑ کر اچھا بننے کی کوشش کروں گا" اس نے بلا جھجک کہا۔

"پرامس پاپا!" نومی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پرامس مائی سن" اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی وقت ثوبیہ چائے لے آئی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھی۔ پھر بھی تو بھی چائے ساسر میں چھلک چکی تھی۔

"شاباش میری بچی" اس نے بچی کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔

اس روز اسے احساس ہوا کہ اولاد کو نعمتِ عظمیٰ کیوں کہا جاتا ہے۔ اولاد انسان کو راہِ راست پر لے آتی ہے۔ کم از کم وہ تو سیدھا ہو گیا تھا۔

اب یہ اس کا نصیب کہ تین دن بعد وہ اس وعدے کی قید سے آزاد ہو گیا۔

جمعرات کے دن حمیدہ آنٹی سعود اور محمود کے ساتھ آ گئیں۔ اگلے روز حیدر آباد میں ان کے دور پرے کے کسی رشتے دار کے ہاں شادی تھی۔ وہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ دعوت نامہ عثمان کو بھی ملا تھا اور آنٹی اصرار کر رہی تھیں کہ وہ لوگ بھی چلیں۔ شہناز نے صاف انکار کر دیا "میں تو نہیں جا سکتی ممی۔"

آنٹی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا "اب کچھ نہیں ہو سکتا آنٹی۔ آپ اپنی بیٹی کو جانتی ہیں۔ انکار کے بعد یہ اقرار کر لیں تو بھی انکار ہی رہتا ہے۔"

"لیکن بیٹے' انہوں نے فون پر بھی بہت اصرار کیا تھا تم لوگوں کے لیے۔"

"مجھ سے بھی کیا تھا آنٹی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "ہاں بچے میری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ آپ انہیں لے جائیں۔"

"بچے نہیں۔ آپ بس ان کے بیٹے کو لے جائیں۔ ان کی نمائندگی کے لیے وہی بہت کافی ہے۔ ثوبیہ کو میں نہیں بھیجوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم نومی کو تیار کر دو" آنٹی نے شہناز سے کہا اور شہناز نے آیا کو بلا کر نعمان کا بیگ تیار کرنے کی ہدایت دی۔

نعمان بہت خوش تھا کہ وہ حیدر آباد جا رہا ہے لیکن جب اسے پتا چلا کہ پاپا نہیں جا رہے ہیں تو وہ پھیل گیا "آپ بھی چلیں نا پاپا۔"

"سوری بیٹے۔ میں نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"جاؤ گے کیسے نہیں۔ اب تمہارا بیگ تیار ہو گیا ہے۔ تمہیں جانا پڑے گا" شہناز نے نعمان پر آنکھیں نکالیں۔

"میں پاپا کے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور آخر میں قائل کر ہی لیا "تم کیسے بیٹے ہو۔ کیا محبت کرتے ہو پاپا سے" اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "پاپا کی بات تو مانتے نہیں۔"

"پاپا' میں۔"

"پلیز نومی' میری خاطر چلے جاؤ۔"

"اچھا پاپا۔ جا رہا ہوں' لیکن ایک شرط ہے' اب کی چھٹیوں میں آپ ہمیں سری لے کر چلیں گے۔"

"منظور ہے۔"

نومی جا تو رہا تھا لیکن خوش نہیں تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ بس اس کے لحاظ میں جا رہا ہے۔ یہ اس کی بے پناہ محبت کا ثبوت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک تھی۔

"ٹاٹا پاپا۔ گڈ بائی" جب تک کار نظر آتی رہی' وہ ہاتھ ہلاتا نظر آتا رہا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد فون پر اطلاع ملی کہ سرہانی وے پر ایک بدمست ٹرالر نے آنٹی کی ننھی منی سوزوکی کو روند ڈالا۔

ثوبیہ سو چکی تھی۔ اسے آیا کے پاس چھوڑ کر وہ اس ہاسپٹل گئے' جہاں سے فون آیا تھا۔ وہاں نجم انکل پہلے سے موجود تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر ان کے دل بیٹھنے لگے۔ انہوں نے اسے لپٹا لیا۔

"بیٹے' صبر سے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے" انہوں نے اسے تلقین کی لیکن ان کی اپنی آواز بکھری جا رہی تھی۔

وہ انہیں اسپتال کے ایک کمرے میں لے گئے "بیٹے۔ صبر سے۔ حوصلے سے" کمرے میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پھر کہا۔

بیڈ پر لہولہان نعمان لیٹا تھا۔ اسے دیکھ کر تو شہناز بت بن کر رہ گئی۔ عثمان تیزی سے بیڈ کی طرف لپکا۔ "آپ اس سے بات کریں۔ دیکھیں' پہچانتا ہے یا نہیں" ڈاکٹر نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ کرتے کیوں نہیں" عثمان ڈاکٹر پر الٹ پڑا "کیسے ڈاکٹر ہیں آپ۔ دیکھیں' اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے۔"

"سوری عثمان صاحب۔ اللہ کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔ ہم جو کر سکتے تھے' کر چکے ہیں۔ اب دعا کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔" عثمان سے بات پوری نہیں کی گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ڈاکٹر نے جواب نہیں دیا۔ لیکن جواب اس کے چہرے پر صاف لکھا ہوا تھا۔ عثمان بے تابی سے بیٹے کے چہرے پر جھک گیا۔ نومی کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اور مدھم مدھم چل رہی تھی "نومی۔۔۔ نومی بیٹے۔ دیکھو یہ میں ہوں" اس نے بیٹے کو پکارا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

تیسری بار پکارنے پر نومی نے بہت زور لگا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔

"نومی... بیٹے... یہ میں ہوں... تمہارا پاپا۔"
نومی کے ہونٹ ہلے۔ آواز بہت ہلکی تھی۔ عثمان نے اس کے ہونٹوں سے کان لگا دیے "پاپا... سوئیٹ پاپا... آئی لو یو۔ آپ بہت اچھے ہیں پاپا۔ آئی لو یو" بچہ ہانپنے لگا۔
"میرے بیٹے۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میری تو پوری کائنات تم ہو۔" اس نے پوری سچائی سے کہا۔
نومی اب کمزور آواز میں ماں کو پکار رہا تھا۔
"مما... مما... مما۔" عثمان نے پلٹ کر دیکھا۔ شہناز دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ وہ صدمے سے شل ہو رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کا پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔
"شہناز... یہ تمہیں بلا رہا ہے" عثمان نے رندھی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔
شہناز بیڈ کے پاس آگئی۔ نومی پر جھک گئی۔
"نومی... یہ آنکھیں تمہاری مما" عثمان نے کہا۔
بچے کی ڈوبتی آنکھوں میں چمک سی ابھری پھر اس کی نگاہیں دھندلا گئیں "مما... مما... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں؟" وہ آٹھ سالہ نومی کی نہیں' چھوٹے بچے کی آواز تھی۔ عثمان اسے پہچان سکتا تھا... یاد کر سکتا تھا۔ وہ برسوں پہلے کے نومی کی آواز تھی' جب وہ بہت چھوٹا تھا۔
شہناز نے بچے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ عثمان اس پر جھکا ہوا تھا "آئی... لو... یو پاپا..." نومی نے بمشکل کہا۔ اسی لمحے ہچکی آئی اور سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔
یہ تو انہیں بعد میں پتا چلا کہ آنٹی' سعود اور محمود پہلے ہی جا چکے تھے۔ بوڑھے نجم الحسن نے جس وقت اسے صبر اور حوصلے کی تلقین کی تھی' اس وقت وہ خود پہاڑ جیسے صبر اور حوصلے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کی تو کائنات لٹ چکی تھی۔ ان کے لیے تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔
اس غم نے عثمان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ زندگی کا بہت مضبوط سہارا چھن گیا تھا اس سے۔ رات کو دکھ اور اذیت کے کانٹے اسے چبھتے تو وہ نومی سے لپٹ کر سو جاتا تھا۔ اب وہ بستر ہی خالی ہو گیا تھا۔ سچ اس کی بہت پہلے اجڑ گئی تھی۔ اب بستر بھی اجڑ گیا تھا' اب وہ کیا کرے گا۔
شام آتی تو اس کا دل ہولنے لگتا۔ برسوں سے اس کا شام کا معمول تھا کہ شام بچوں کے ساتھ گزرتی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جو ہر روز اسے خوش گوار کا احساس دلاتا تھا۔ بڑے سے بڑے دکھ اور پریشانی میں بھی یہ لمحے اسے جینے کا حوصلہ اور توانائی دیتے تھے۔ اب وہ شام کو لان میں بیٹھتا تو صرف ثوبیہ کی خاطر۔ اور اس کے معصوم سوالات اس کا دکھ اور بڑھا دیتے۔
"پاپا... بھائی کہاں گئے؟" وہ پوچھتی "بھائی کو بلائیں پاپا۔"
"بیٹا... بھائی اب نہیں آئے گا۔ اسے اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا" وہ رندھے ہوئے گلے سے کہتا۔
"تو اللہ میاں نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔ بھائی تو میرے بغیر کھیلتے بھی نہیں تھے۔"
وہ کچھ جواب نہ دے پاتا۔ چپ چاپ آنسو بہاتا رہتا۔
"پاپا... آپ مجھے بھی اللہ میاں کے پاس بھیج دیں۔ میں بھائی کے پاس جاؤں گی۔"
"تو بیٹی' یہاں پاپا کے پاس کون رہے گا پھر۔ اکیلا چھوڑ دو گی ہمیں؟"
"اچھا پاپا' میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟"
"تم ایسی باتیں جو کرتی ہو۔"
پانچ سالہ بیٹی ایک دم بڑی ہو جاتی۔ وہ اپنی فراک کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے چمکارتی "اچھے بچے روتے نہیں ہیں۔ ہے نا پاپا۔"
نومی کی وجہ سے اس نے توبہ کی تھی۔ جو تین دن اسے ملے تھے' اس نے نہ شراب کو ہاتھ لگایا تھا' نہ ہی فلیٹ کا رخ کیا تھا۔ بیٹے سے وعدہ جو کیا تھا اس نے۔ لیکن نومی ہی کی وجہ سے اسے پرانی راہوں پر جانا پڑ گیا۔ دکھ اور اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے تھے۔ پھر یہ خیال بھی تھا کہ جس کی خاطر سب کچھ چھوڑا تھا' جب وہی چھوڑ گیا تو اب کیسا لحاظ۔
اس کی مے نوشی صرف دوبارہ شروع نہیں ہوئی' پہلے سے بڑھ گئی۔ وہ ہر دکھ' ہر پریشانی' ہر اذیت کو شراب میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اذیت تو اور بڑھ جاتی تھی۔ نشے میں وہ عجیب انداز میں سوچنے لگتا۔ نومی کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔ نومی تو نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ وہ تو صرف اس کے لحاظ میں... اسے خوش کرنے کے لیے گیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ افسردہ تھا۔ اسے اس کی وہ آخری جیتی جاگتی جھلک نظر آتی۔ کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے... ٹاٹا پاپا' گڈ بائی کہتا ہوا نومی' جس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن آنسوؤں کی چمک موجود تھی۔ وہ سوچتا... کاش' وہ بھی ان کے ساتھ چلا گیا ہوتا۔ تب وہ یقیناً اپنی کار لے جاتا اور نومی اس کے ساتھ ہوتا۔ یا تو نومی نہ مرتا' یا پھر وہ بھی اس کے ساتھ مر جاتا۔
ایک دن نشے میں وہ بڑبڑانے لگا... خود کلامی کرنے لگا۔
"تم... تم راندۂ درگاہ ہو عثمان حفیظ... بدنصیب انسان۔ تمہاری تو دنیا بھی گئی اور عاقبت بھی۔ خدا نے بیٹے کے روپ میں تمہیں آخری ہدایت دی اور پھر وہ واپس بھی لے لی۔ اب تو تمہارے لیے ہدایت کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ ڈوب جاؤ... غرق ہو جاؤ گناہوں میں۔ لعنت ہو تم پر... غرق ہو جاؤ۔"
ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ رات کو وہ نجم انکل کے پاس ضرور

جاتا۔ کبھی ثوبیہ بھی اس کے ساتھ ہوتی اور کبھی شہناز بھی۔ اس رات وہ اکیلا ہی گیا تھا۔

"اچھا ہوا' تم اکیلے آئے؟" نجم انکل نے کہا "مجھے تم سے کچھ ضروری اور اہم باتیں کرنا تھیں۔"

"جی انکل' فرمایئے؟"

"دیکھو بیٹے' ایک بات مجھے معلوم ہے۔ میں اب زیادہ عرصے نہیں جی سکوں گا۔"

"ایسی باتیں نہ کریں انکل' پلیز" عثمان نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ انکل کی صحت بہت تیزی سے تباہ ہو رہی ہے۔

"مجھے معلوم ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ کچھ کاغذات ہیں۔ ان پر تمہیں دستخط کرنے ہیں" انہوں نے اس کی طرف کاغذات بڑھائے۔

اس نے بتائی ہوئی جگہوں پر دستخط کر کے کاغذات واپس کر دیے پھر پوچھا "یہ کاغذات کیسے ہیں انکل!"

"یہ میری وصیت کے کاغذات ہیں۔ میرے بعد میرا سب کچھ تمہارا ہے.... صرف تمہارا۔"

"یہ تو زیادتی ہے انکل.... شہناز کے ساتھ۔ آپ کو یہ سب کچھ شہناز کے نام کرنا چاہیے۔"

"یہ میں زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہوں" نجم صاحب نے سرد لہجے میں کہا "عورتیں نادان ہوتی ہیں.... نادان اور کم عقل۔ کاروبار کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ وہ تو بڑی آسانی سے لٹ جاتی ہیں۔ اور بیٹی ویسے بھی پرائی چیز ہوتی ہے' اپنی نہیں۔ برسوں پہلے میں نے بہت اچھی سرمایہ کاری کی تھی۔ اس پر میں آج تک پچھتایا نہیں" ان کے ہونٹوں پر کبھی کبھی مسکراہٹ نظر آئی۔ "میں نے پرائی بیٹی دے کر اپنے لیے ایک اضافی بیٹا حاصل کر لیا تھا۔ اپنے بیٹوں کی بے وفائی کے بعد اب وہی میرے کام آ رہا ہے۔"

عثمان کی آنکھیں جھکنے لگیں "میں جانتا ہوں انکل کہ آپ نے مجھ سے ابو جیسی محبت کی ہے لیکن میں اس سب کا مستحق نہیں۔ میں بہت بدل چکا ہوں' بہت گر چکا ہوں انکل۔"

"جانتا ہوں بیٹے۔ تم اور بڑے ہو گئے ہو۔ گر کر اور بلند ہو گئے ہو" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "میں بہت کچھ.... شاید سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تم سے ایک التجا ضرور کروں گا۔"

"آپ حکم کر سکتے ہیں انکل۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم کبھی خوش نہیں رہے پھر بھی میری خواہش ہے کہ ثوبیہ کی شادی ہو تو اس کے ماں باپ تم بنو۔"

"آپ بے فکر رہیں انکل!"

اس رات وہ گھر آیا تو اور بوجھل ہو گیا تھا۔

تین دن بعد اپنے دفتر میں نجم الحسن پر دل کا دورہ پڑا۔ وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ طبی امداد ملنے سے پہلے وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

○☆○

شہناز پر صدمے اس تواتر سے پڑے کہ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔

نعمان کی موت کا صدمہ اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ تو ہمیشہ اسے ایک بوجھ محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایک چیز تھی' جو زبردستی اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ وہ بچہ جسے اس نے کبھی اہمیت اور محبت نہیں دی' جاتے جاتے اسے اَن گنت پچھتاوے سونپ گیا تھا۔ جس بچے کو اس نے محرومیوں کے سوا کچھ نہیں دیا' اس نے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہوئے اپنی تمام محرومیوں کو ایک شکایتی جملے میں سمو دیا تھا اور وہ شکایت اس کا دل چیر گئی تھی۔ بے بسی یہ تھی کہ نہ وہ اس کی محرومی کی تلافی کر سکتی تھی' نہ ہی اس کی شکایت کا جواب دے سکتی تھی۔ اس کی ٹوٹتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں جم کر رہ گئی تھی "مما.... آپ مجھے گود میں کیوں نہیں لیتیں۔" اور اس وقت وہ اپنی اس عمر کی آواز میں بولا تھا' جب اسے پہلی بار اس محرومی کا احساس.... دکھ ہوا ہو گا۔

اس لمحے اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے بے قصور بچے کو کیسی محرومی دی ہے۔ وہ بچہ اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا تھا۔ اور اپنی وہ صورت بھی اسے اپنی مرضی سے نہیں ملی تھی۔ اب شہناز کو سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ جب وہ چلتا پھرتا' بولتا جاگتا بچہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھیں بولتی تھیں.... التجا کرتی تھیں.... مما.... میری مما' مجھے گود میں لے لو۔ اس نے کبھی اس کی آواز نہیں سنی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہ منظر لہرا گیا کہ وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد کیسے مایوسی سے کندھے لٹکائے اپنے باپ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس بچے کو کبھی یہ ضد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ پوٹی ممی سے دھلوائے گا۔ وہ ضد کرتا تھا.... "میں پوٹی پاپا سے دھلواؤں گا۔"

کیسے کیسے منظر اس کی آنکھوں میں پھرتے تھے۔ وہ نظروں میں چاہت اور محبت لیے کیسے ثوبیہ کے پاس آتا تھا۔ کیسے نفرت سے وہ اسے جھڑک دیتی تھی۔ کیسے وہ ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتا' کیسی بے بسی ہوتی اس کے معصوم چہرے پر۔ مما.... یہ میری گڑیا بہن ہے' مما' میں اسے پیار کروں گا۔ میں اپنے سارے کھلونے اسے دوں گا۔ مما' میں اسے ماروں گا نہیں۔ مما یہ تو میری گڑیا بہن ہے۔ مما' مجھے اس کے پاس آنے دو۔ اور کیسے وہ اسے جھڑکتی اور دھتکارتی تھی۔ کیسے وہ سر جھکائے' کندھے لٹکائے تھکے تھکے ننھے قدموں سے واپس چلا جاتا تھا۔ پھر شام کو لان میں اپنے پاپا کے سامنے کیسے وہ اپنی گڑیا بہن کو پیار کرتا.... اس کے واری صدقے جاتا۔

کیسے وہ اس کی جھڑکیاں سن کر اسے محبت اور بے چارگی سے تکتا تھا۔ کیسے بہانے بہانے سے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کی ہچکیاں بند ہیں تو وہ چپ ہو گی۔ ایسا غیر اہم' قابلِ نفرت بچہ کسی کو اتنا رلا سکتا ہے؟ اب تو یہ رونا' یہ پچھتانا عمر بھر کا ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر تو اس کے لیے ماتا بھری تھی۔ نہ جانے چھپی کیسے رہ گئی۔ ارے۔۔۔ وہ تو اس سے محبت کرتی تھی۔ بدنصیب ماں' وہ محبت کبھی اسے نہ دے سکی۔ اب وہ ہمیشہ ناسور بن کر اس کے وجود میں رہے گی اور وہ اسے نکال بھی نہیں سکے گی۔ اس کی تو وہ گود ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی تھی' جسے اس نے کبھی اس کے وجود سے آباد نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ خلا تو کبھی نہیں بھر سکے گا۔ وہ جسے وہ ہمیشہ رد کرتی رہی' اس کے جگر کا پہلا ٹکڑا تھا۔ وہ اس کے گوشت' اس کے خون سے بنا تھا۔ اس کی ہڈیوں نے رس اس کی ہڈیوں سے حاصل کیا تھا۔ ارے۔۔۔ یہ کیسا زیاں ہے؟

پھر ممی' مسعود اور محمود کی موت کا صدمہ! یہ اتنے صدمے ایک ساتھ کیسے اٹھائے جا سکتے ہیں؟ لگتا تھا' دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔ عثمان ہے' جسے اس نے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ پاپا ہیں' جو اس کی شادی کے بعد پہلے جیسے نہیں رہے۔ وہ تو اسے بے رخی کی سزا دے رہے ہیں' بس ایک ثوبیہ ہی ہے۔

ان دکھوں نے اسے بدل کر رکھ دیا۔ وہ خود بخود بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے عثمان کے سلسلے میں بھی اپنا رویہ تبدیل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ چھپی رہنے والی محبتوں سے ڈر گئی تھی' جو اس وقت سامنے آتی ہیں' جب ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کون جانے۔

پھر چھ ماہ بعد پاپا بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ ان کی موت کا دکھ کیا کم تھا کہ ان کی موت نے عثمان کو اس کا رقیب بنا دیا۔ یہ شکایت تو اسے پہلے سے تھی کہ پاپا کو ممی اور بھائیوں کی موت کا دکھ اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ وہ عثمان سے اور قریب ہو گئے۔ شاید اپنی جھوٹی مردم شناسی کا بھرم رکھنے کے لیے۔ پھر وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو اسے ایک اور صدمہ دے گئے۔ انہوں نے وصیت میں اس کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ عثمان کے نام کر گئے۔ یہ نہیں کہ اسے کوئی خواہش تھی پاپا کی دولت سے۔ غم یہ تھا کہ وصیت میں کہیں اس کا نام تک نہیں آیا۔ جیسے وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ کم از کم وہ بنگلا تو اسے دے جاتے کہ وہ ان کی اور تمام جانے والوں کی نشانی تھی۔

پاپا کی موت کے بعد اس کے بدلنے کا عمل رک سا گیا۔ احساسِ جرم اور ندامت کو نفرت اور رقابت نے دبا لیا۔ وہ بھی کیا کرتی۔ عثمان کے حوالے سے ہمیشہ اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی آئی تھیں۔

پھر عثمان نے وہ ذلیل حرکت کی کہ احساسِ جرم و ندامت اور ہر محبت مٹ گئی۔ اس کا ہدف اس بار بھی مظکور ہی بنا تھا۔ مظکور نے بتایا کہ اس بار اسے اس کی تین بیٹیوں کے حوالے سے دھمکی دی گئی ہے۔ اس روز وہ اپنے بیڈ روم میں شکستہ اور خراب رہی۔ عثمان حنیفا' میرے پچھتاوے غلط تھے۔ تم ہو ہی اسی قابل۔ تم تو حد درجہ کمینے انسان ہو۔ یاد رکھو' میں تمہیں ایسا سبق دوں گی' ایسا انتقام لوں گی تم سے کہ کبھی نہیں بھولو گے۔

عثمان کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کا تصور بھی اب محال تھا لیکن اسے یہ زہر پینا تھا اور ایک ہی مرتبہ نہیں' قطرہ قطرہ کر کے پینا تھا۔ صرف اور صرف ثوبیہ کی خاطر۔

اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ ثوبیہ کی شادی بہت جلدی کرے گی!

○☆○

اذیت کے دن رینگ رینگ کر گزرتے رہے۔ دنوں کے' اذیتوں کے ڈھیر لگ جاتے تو کہیں ایک سال گزرتا۔ نوی کا خیال' اس کی یاد عثمان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا۔ وہ ثوبیہ کو ہمیشہ وقت دیتا رہا۔ ایک اسی کی وجہ سے تو وہ زندہ تھا۔

ایک بات اسے عجیب لگتی تھی۔ ثوبیہ کے معاملے میں اس کے اور شہناز کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ اس کے لیے دونوں ایک ہی انداز میں سوچتے تھے۔ اس کی تعلیم و تربیت ایک خاص انداز میں ہو رہی تھی' جو مثالی تھا۔ اسے خود اعتمادی تو دی گئی لیکن ان خرابیوں سے دور رکھا گیا' جو ان کی سوسائٹی میں عام تھیں۔

ایک بات پر عثمان ہمیشہ فخر کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ثوبیہ کو بہت چاہتا تھا لیکن یہ بھی درست تھا کہ شہناز اسے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ چاہتی ہے بلکہ وہ ثوبیہ سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لیکن ثوبیہ نے ہمیشہ شہناز کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہا تھا۔ بچپن میں بھی اس سے پوچھا جاتا کہ تم کس کی بیٹی ہو تو وہ ہر ترغیب کو نظر انداز کر کے فخر سے کہتی تھی۔۔۔ "میں پاپا کی بیٹی ہوں" اس کی ترجیح جوان ہو کر بھی پاپا ہی رہے۔

درمیان میں بارہا ایسا ہوا کہ شہناز عثمان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس کے ساتھ رہنا اسے ہر نفس موت کی اذیت معلوم ہونے لگا۔ اس بار ثوبیہ کا خیال بھی اسے ضبط پر مائل نہیں کر سکتا تھا لیکن نجم الکل کی آخری خواہش کی خاطر وہ یہ زہر پیتا اور ہر نفس مرتا رہا۔

چودہ سال گزر گئے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ ثوبیہ نے گریجویشن کر لیا۔ وہ اتنی خوب صورت نکلی تھی کہ اس کی کہیں مثال نہیں تھی۔ صورت شکل میں وہ ماں پر گئی تھی مگر شخصیت کی انفرادی خوب صورتی خالص اس کی اپنی تھی۔ وہ بہت نیک' اطاعت شعار اور خوب سیرت لڑکی تھی۔

عثمان کو اس کی شادی کا خیال ستانے لگا۔

ایک دن شہناز نے اس سے کہا "مجھے آپ سے ایک ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔"

عثمان کو حیرت ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو کم ہی ہوتی تھی

"کچھ کیا بات ہے؟"

"اب ہمیں ثوبیہ کی شادی کردینی چاہیے۔"

یعنی ہم آہنگی ثوبیہ کے معاملے میں یہاں تک چلی آرہی ہے۔ عثمان نے حیرت سے سوچا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کوئی رشتہ نظر میں ہے؟"

"رشتے تو اس کے کب سے آرہے ہیں لیکن آج مسز آفاق نے اسے مانگا ہے۔"

"یہ آفاق صاحب وہی ہیں نا' جن کا اسٹیٹس میں کاروبار ہے؟"

"جی ہاں۔ اشفاق ان کا بیٹا ہے۔ امریکا کی شہریت ہے اس کے پاس۔ وہیں اپنا ذاتی کاروبار بھی ہے۔"

"بہت مناسب ہے۔ میں جانتا ہوں' وہ اچھی فیملی ہے لیکن یہ بتاؤ' اور کوئی قابلِ ذکر رشتہ بھی آیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ عباسی صاحب کے بیٹے کا رشتہ بھی ہے۔"

"اوہ... یہ تو بہت اچھا ہے۔ بھئی مجھے تو وہ لوگ بہت پسند ہیں" اس نے کہا "اور وہ لڑکا تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔"

"پسند تو مجھے بھی ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ ثوبیہ امریکا چلی جائے" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

واہ رے ہم آہنگی! اس نے دل میں سوچا۔ وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ ثوبیہ شادی کے بعد ملک سے باہر رہے "ٹھیک ہے" اس نے گہری سانس لے کر کہا "لیکن سب سے اہم بات تو ثوبیہ کی مرضی کی ہے۔ یہ تو معلوم کرو کہ ثوبیہ کسی کو پسند تو نہیں کرتی؟"

"آپ کے نزدیک بھی اس بات کی اہمیت ہے" شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا "ویسے یہ میں اس سے پہلے ہی پوچھ چکی ہوں۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔"

"تو پھر اس رشتے کے سلسلے میں بات کرو اس سے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ یہ بات آپ کی موجودگی میں ہو۔"

"تو اسے ابھی بلوالو۔"

شہناز نے ثریا سے کہہ کر ثوبیہ کو بلوالیا۔ ثوبیہ کو اس رشتے کے بارے میں بتایا گیا۔ شہناز کے پاس اشفاق کی تصویر بھی تھی۔ وہ بھی ثوبیہ کو دکھادی گئی۔

"پاپا' میرا ایمان ہے کہ میرے معاملے میں آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے' اس میں میری بہتری ہوگی" ثوبیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا "لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے امریکا پسند نہیں۔ میں اپنے وطن میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تمہیں خود پر اعتماد نہیں؟ ہم نے تو تمہاری تربیت ایسی کی ہے کہ..."

"یہ بات نہیں پاپا۔ لیکن بلاوجہ خود کو آزمائش میں کیوں ڈالا جائے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی۔ ویسے میری خواہش تو یہی تھی کہ... تمہارے پاپا بھی یہی چاہتے ہیں" شہناز نے کہا۔

"تو ممی مجھے انکار کب ہے۔ آپ کی اور پاپا کی خوشی میری خوشی ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس روز عثمان نے سکون کی سانس لی۔

○☆○

پُرزور تالیوں کی مسلسل آواز نے اسے چونکادیا۔ وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ مسز شمیم ابھی اسٹیج پر موجود تھیں اور سبھی لوگ تالیاں بجارہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ اسی وقت احسان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبایا "مبارک ہو دوست' دلی مبارک باد۔"

"کس بات کی مبارک باد دے رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں کھوئے ہوئے تھے؟ تم نے سنا ہی نہیں... عجیب آدمی ہو۔ فکر کیوں کرتے ہو۔ ابھی چند منٹ میں تمہیں بھابی کے ساتھ تنہائی میسر آجائے گی۔"

وہ چڑ گیا "بتاتے کچھ نہیں ہو اور اپنی ہانکے جارہے ہو' ہوا کیا ہے؟"

"مسز شمیم نے اپنی انجمن کی طرف سے تمہیں اور بھابی کو اس سال کے مثالی جوڑے کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ چلو' ان کا شکریہ تو ادا کرو" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اسٹیج کی طرف لے چلا۔ شہناز پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

تالیاں تھم گئیں تو احسان نے مائیک تھامتے ہوئے کہا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ اب عثمان حفیظ مسز شمیم کا شکریہ ادا کریں گے" اس نے مائیک عثمان کی طرف بڑھایا۔

عثمان نے مائیک ہاتھ میں لے کر ایک نظر شہناز کے مسکراتے چہرے کو اور پھر چہروں کے ہجوم کو دیکھا۔ مسکراہٹ تو سبھی کے چہروں پر تھی لیکن زیادہ تر کی آنکھوں میں حسد بھی نظر آیا۔ کچھ ہونٹ ایسے بھی تھے جن پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی "خواتین و حضرات! سب سے پہلے تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے اس تقریب کو رونق بخشی پھر میں انجمنِ شادی شدہ خواتین کے حسنِ ظن پر ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اس ایوارڈ کے قابل سمجھا۔ یہ انجمن کے اراکین کی محبت اور نوازش ہے کہ انہوں نے ہمیں نوازنے کا فیصلہ کیا لیکن میں بہت عاجزی' دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ان کے اس فیصلے سے اختلاف کررہا ہوں..." اس پر احتجاجی آوازیں ابھریں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا "یہ کوئی رسمی اکسار نہیں' سچی بات ہے۔ میں نے اور شہناز نے ایسی ازدواجی زندگی نہیں گزاری کہ مثالی جوڑا کہلائیں۔ یہ بات ہم دونوں سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا اس لیے میں یہ ایوارڈ قبول کرنے سے مؤدبانہ انکار کرتے ہوئے یہ التماس کروں گا کہ یہ ایوارڈ ہمارے بجائے کسی

مستحق جوڑے کو دیا جائے۔"

دیر تک سناٹا رہا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کچھ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹیں تھیں۔ پھر مسز شمیم نے کہا "یہ تو آپ کا فیصلہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شہناز اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔"

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے" عثمان نے کہا۔ "ایوارڈ دونوں کا مشترکہ ہے۔ لہٰذا ایک فریق کا انکار بھی کافی ہے۔ اس سے بہترین جوڑے کے ایوارڈ کی نفی ہو جاتی ہے۔"

"بات معقول ہے" اختر ہاشمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کے باوجود میں شہناز سے جواب سننا چاہوں گی" مسز شمیم بولیں۔

شہناز مسکراتی ہوئی اسٹیج پر آئی اور مائیک میں کہا "خواتین و حضرات! ۲۵ سال میں شاید یہ پہلا موقع ہے کہ میں اور عثمان کسی بات پر متفق ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا کہوں۔"

اس شگفتہ جواب اور اس کے مزاحیہ لہجے نے لمحوں میں ماحول کی کشیدگی دور کردی۔ خوب قہقہے لگے۔

مسز شمیم نے اپنی کھسیاہٹ دور کرنے کے لیے خود بھی شگفتگی کا سہارا لیا "اگرچہ ان دونوں کا اس موقع پر اتفاق رائے انہیں مثالی جوڑا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم انجمن شادی شدہ خواتین اپنے اعلان کو واپس لیتی ہے۔ ہم سب ان دونوں کی سچائی اور دیانت کو سلام کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر لان تالیوں سے گونج اٹھا۔

○☆○

اور اب وہ اکیلے تھے!

تقریب ختم ہو چکی تھی۔ لان کی تمام روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ نوکر سرونٹ کوارٹرز میں جا چکے تھے۔ لیکن ان دونوں کو ہی روشن کمرا بھی تاریک تاریک سا لگ رہا تھا۔ قدرتی بہت زیادہ روشنی میں بہت دیر رہے تو یہی ردِعمل ہوتا ہے۔ نارمل روشنی روشنی ہی نہیں لگتی۔ اندھیرا معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی روشنی آنکھوں سے دل تک اندھیرے ہی اندھیرے بکھیرتی ہے۔

عثمان اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اس نے آکر شراب کی بوتلوں والی کیبنٹ کھولی اور اس میں رکھی ہوئی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے شوکیس سے جام نکالے۔ پہلا جام اس نے بڑے اہتمام سے توڑا اور ڈسٹ بن کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی "میں، کم ان" اس نے کہا۔

دروازہ کھلا اور شہناز کمرے میں آگئی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے ہاتھ میں موجود ٹوٹے جام کو دیکھا "ٹوٹ گیا؟" اس نے پوچھا۔

عثمان نے ٹوٹے ہوئے جام کو ڈسٹ بن میں اچھال دیا "نہیں، توڑ دیا" اس نے جواب دیا "اب ضرورت جو نہیں رہی۔"

"میں بیٹھ سکتی ہوں۔"

"بی مائی گیسٹ" عثمان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

شہناز صوفے پر بیٹھ گئی "بہت خوش نظر آرہے ہو؟"

"اس کا تو مجھے علم نہیں۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ آج میں بہت خوش ہوں۔"

"شاید اس لیے کہ آج اتنے بہت سارے لوگوں کے سامنے میری بے عزتی اور توہین کرنے کا موقع ملا تھا" شہناز کے لہجے میں کاٹ تھی۔

عثمان نے تمام جام سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیے "تم غلطی پر ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا "مواقع تو بہت ملے لیکن میں نے ان سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم کس توہین اور بے عزتی کا حوالہ دے رہی ہو۔"

"بنو مت۔ تم جانتے ہو۔ تم نے وہ ایوارڈ ٹھکرا کے میری توہین کی، مجھے تماشا بنایا، لوگوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع دیا۔"

"بہت خوب۔ یہ تمہارا نکتۂ نظر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایسا کرکے تمہیں مستقل طور پر اور مسلسل تماشا بننے سے بچالیا ورنہ لوگ ساری عمر تم پر ہنستے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں اس پر اعتراض کیوں ہے۔ کیا میں نے غلط کیا؟ کیا ہم مثالی جوڑا ہیں؟"

"اتنے برسوں کی منافقت کے بعد ایک اور منافقت میں کوئی حرج نہیں تھا" شہناز نے کہا۔ وہ بے حد نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"یہ ایوارڈ اب سے ایک سال پہلے بھی دیا جاتا تو میں شکریے کے ساتھ ہنسی خوشی اسے قبول کرلیتا۔ اس وقت تک میں منافقت پر مجبور تھا مگر آج نہیں ہوں۔ آج ہم مثالی جوڑا کہلاتے تو کل نشانِ عبرت بن جاتے۔ میں اپنے معاشرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ شادی کے انسٹی ٹیوشن پر لوگوں کا ایمان رہے۔ یہ تباہ نہ ہو ورنہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔"

"کیسی ہیرو جیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"حالانکہ ولن ہوں، ہے نا؟"

شہناز اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگی پھر وہ رک کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی "سنو عثمان حفیظ، تمہیں شاید معلوم نہیں۔ آج تم حد سے گزر گئے۔ ساری حدیں پھلانگ گئے اور آج میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلک گیا۔ میرا ضبط جواب دے گیا ہے۔"

"حد! تمہیں معلوم بھی ہے کہ حد کیا ہوتی ہے؟ صبر... اس عظیم جذبے کو سمجھتی بھی ہو تم؟ ضبط... ضبط کا مفہوم بھی معلوم ہے تمہیں؟" عثمان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے، میں نے ۲۵ سال ضبط کیا ہے۔"

"بہت خوب!" عثمان ہنسنے لگا "میں چاہتا تو یہ تھا کہ تم ہیروئن ہی رہو اور میں ولن ہی رہوں لیکن تم نہیں چاہتیں تو یہی سہی۔"

"آج یوم احتساب ہے عثمان حفیظ!"

"ٹھیک ہے جان۔ شروع ہو جاؤ" عثمان نے بڑے پیار سے کہا۔ "بتاؤ کہ میں نے کیا کیا زیادتیاں کیں تمہارے ساتھ۔ کیا کیا ظلم کیے۔ کیسا ضبط کیا ہے تم نے؟ مجھے یقین ہے کہ آج بڑے پیارے لفظوں کے بہت مختلف مفاہیم سامنے آئیں گے۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ عمر بھر بھاگتے رہنے والا چور کوتوالی کو کیسے ڈانٹتا ہے" یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگا "کل شب احتساب تھی' شب بھر۔ آئینوں میں کھڑے رہے ہم بھی۔"

شہناز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "پوچھتے ہو کہ میں نے کیا ضبط کیا! جانتے نہیں ہو کیا؟ یاد نہیں ہے کہ کیا کچھ کرتے رہے ہو تم؟ تم نے خود کو شراب میں ڈبو لیا۔ تم مسلسل بدکاری میں مبتلا رہے۔ خود کو آوارہ کال گرلز پر نچھاور کرتے رہے۔ وہ میری توہین نہیں تھی؟ تم شرابی اور عیاش کہلائے۔ تمہارے حوالے سے مجھے طعنے ملے۔ بچوں نے بھی یقیناً یہ اذیت اٹھائی ہوگی۔ انہوں نے اپنے دوستوں' اپنی سہیلیوں سے تمہارے کارنامے ضرور سنے ہوں گے۔"

"لیکن وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرتے رہے۔"

"بیچ میں مت بولو۔ مجھے اپنی بات پوری کرنے دو" پہلی بار شہناز کے لہجے میں تندی آئی۔

"سوری' تم کہتی رہو۔"

"تم نے خود سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو رسوائی دی میرے پاپا تمہاری وجہ سے عمر بھر شرمندہ رہے۔ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری عیاشیاں سب سے چھپی ہوئی ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم ذلت کی کس گہرائی میں گر چکے ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا عثمان حفیظ۔ سب جانتے تھے' تمہارے دفتر کے تمام ملازم جانتے تھے۔ ان کے ذریعے پورے شہر کو یہ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرنے کے بہانے نشتر زنی کرتے رہے۔ یہ سب کچھ سہا میں نے... اور بچوں نے۔ اور تم نے مجھے کیا دیا؟ عزت تک نہیں دی۔ آج ان سب لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کر دیا' جو تمہاری اصلیت سے واقف ہیں۔ جنہیں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ عزت دی تم نے مجھے" وہ ہانپ رہی تھی۔

"کہہ چکیں؟ اب مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" عثمان نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔

شہناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پہلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہوں گا" عثمان نے کہا "ایک بات بتاؤ۔ اگر میں نے یہ سب کچھ ایسے کیا ہوتا کہ تمہارے سوا کسی کو پتا نہ چلتا تو کیا تم اسے درست کہتیں؟ اگر تمہیں اور بچوں کو میری بدکاریوں کے طعنے نہ سننے پڑتے تو کیا تمہارا کرب کم ہو جاتا؟ کیا بدکاری چھپانا کوئی کامیابی ہے؟ کیا اس صورت میں بدکاری لائق عذاب نہیں ہوتی؟ اگر یہ درست ہے تو میری اصل غلطی یہ ہوئی کہ میں چھپ کر گناہ نہیں کر سکا۔ گناہ کر کے پردہ نہیں رکھ سکا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہے یا نہیں۔ گناہ تو گناہ ہے۔ بدکاری تو بدکاری ہے۔ بری عورتوں کے پاس جاؤ گے تو کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو' میری توہین و تذلیل تو بہرحال ہوگی۔ مجھے اذیت تو بہرکیف پہنچے گی۔"

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ کیسا درست اور سچا جواب دیا ہے تم نے۔ اب ایک بات اور بتاؤ' تمہیں اب اس رسوائی میں زیادہ اذیت پہنچی ہے یا اس صورت میں تمہاری اذیت زیادہ ہوتی کہ میرے کرتوتوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا؟ کون سی اذیت زیادہ بڑی ہے' سوچ سمجھ کر جواب دو۔"

شہناز کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی "تم تو یوں تبادلۂ خیال کر رہے ہو' جیسے یہ کوئی علمی مسئلہ ہے' جسے عقل اور منطق سے حل کیا جانے والا ہو۔"

"بات ایسی ہی ہے۔ اس بات کی بہت اہمیت ہے" عثمان نے گہری سانس لے کر کہا "چلو' تمہاری آسانی کے لیے میں اس سلسلے میں ایک تھیوری پیش کرتا ہوں۔ تم صرف اتنا بتا دینا کہ تمہیں اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو معلوم ہونے کی صورت بہتر ہے۔ وہ تم سے ہمدردی کرتے ہوں گے۔ تمہیں مظلوم سمجھتے ہوں گے اور مظلومیت کا احساس اذیت کو کم کر دیتا ہوگا۔ اب سوچو کہ میری بدکاری کا علم صرف تمہیں ہے' کوئی اور اس بارے میں نہیں جانتا۔ ظاہر ہے' تم کسی کو بتانا بھی نہیں چاہو گی تو وہ اذیت اکیلے ہی سہتی رہو گی۔ تمہارا دل کبھی ہلکا نہیں ہوگا اور وہ بوجھ گزرتے لمحے کے ساتھ دگنا ہوتا جائے گا۔ وہ اذیت زیادہ ہوگی یا نہیں؟"

"میں علمی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی اذیت کی بات کر رہی ہوں۔"

"میں بھی اذیت ہی کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے جواب چاہیے۔"

"تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ اپنے گناہوں کی تشہیر کر کے تم نے میری اذیت کم کر دی۔ مجھ پر احسان کیا" شہناز نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تم نے بالواسطہ تسلیم کر لیا کہ میری تھیوری درست ہے۔ خاموشی سے اکیلے عذاب سہنے کی اذیت کہیں زیادہ ہے۔"

شہناز خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"لہٰذا ثابت ہو گیا کہ میری اذیت بہت بڑی تھی" عثمان نے کہا۔

شہناز مسکرا اڑانے والے انداز میں مسکرائی "تو تم نے بھی اذیت اٹھائی ہے؟ بہت خوب۔ واقعی... اذیت دینے میں تو بہت زیادہ اذیت ہوتی ہوگی۔"

"میں نے۔" عثمان نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو وہ اذیت اٹھائی ہے کہ پہاڑ اٹھاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ سمندر پر پڑتی تو وہ غیظ و غضب میں پوری زمین نگل جاتا۔ میں نے وہ اذیت بڑی خاموشی سے اٹھائی ہے۔ اندر سے ہر لمحہ ٹوٹتا رہا ہوں میں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"واقعی؟ دل تو ہیرو بن رہا ہے۔"

عثمان نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "تم کہتی ہو کہ میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ عزت بھی نہیں دی۔ جھوٹ کہتی ہو تم۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی' جو تمہیں کہیں اور سے نہ کبھی مل سکی اور نہ ہی مل سکے گی' جس کی تم مستحق بھی نہیں تھیں۔ میں نے تمہیں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ سب سے قیمتی چیز دی جو کوئی مرد کسی عورت کو دے سکتا ہے۔ تم کہتی ہو' میں نے تمہیں عزت نہیں دی۔ ارے میں نے تو تمہیں اپنی عزت بنالیا' کوئی مرد کسی عورت پر اس سے بڑا اعتبار نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ کچھ دے نہیں سکتا۔ اور تم نے کیا کیا؟ میری عزت کو دنیا کے بازار کی سب سے ارزاں چیز بنادیا۔ میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا' تم نے خود کو رہگذر کی طرح بچھادیا... عام رہگذر بنالیا خود کو' جس کو ہرا ایرا غیرا' چور' چمار جب چاہتا روند سکتا تھا۔ کون سا ایسا طبقہ ہے' جس کا کوئی فرد اس رہگذر سے نہیں گزرا۔ باہر کے لوگوں کی بات چھوڑو۔ میرے نوکر' میرے مالی' میرے ڈرائیور تک کو تم نے سیراب کیا۔ پیاسا صرف میں ہی رہا" اب وہ طوفان کی طرح گرج رہا تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ دم بخود سہمی ہوئی بیٹھی ہے۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا ہے "برسوں پہلے تم نے کال گرلز کی بات کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا... ان میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ میں نے کہا تھا' ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں' جو تم میں ہیں۔ اور اضافی خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً وہ موڈ کی پابند نہیں ہوتیں۔ انکار نہیں کرتیں' برف کی سل ثابت نہیں ہوتیں اور یہ کہ وہ ضرورتاً خود کو فروخت کرتی ہیں۔ نہیں شہناز بیگم' وہ بے چاریاں تمہارے سامنے بے حقیقت ہیں۔ وہ تمہارے قدموں کی دھول ہیں۔ انہوں نے اپنا ریٹ مقرر کر کے خود کو ایک معیار تک محدود کر لیا ہے۔ جبکہ تم لامحدود ہو' تمہارا کوئی معیار نہیں۔ وہ بے چاریاں خود کو ضرورتاً فروخت کرتی ہیں۔ جبکہ تم خود کو بلا ضرورت فروخت کرتی ہو بلکہ تم خود کو فروخت بھی نہیں کرتیں۔ تمہاری کوئی قیمت ہی نہیں۔ تم تو زمین پر پڑی مٹی ہو' جسے کوئی بھی اٹھالے۔ لوگ مفت میں ملنے والی دولت بھی یوں خرچ نہیں کرتے' جیسے تم خود کو بانٹتی ہو۔ ہر جھولی میں گر جاتی ہو۔ خواہ وہ پھٹی ہوئی بھی نہ ہو۔"

"عثمان' تم حد سے..."

"خاموش رہو۔ آج شبِ احتساب ہے۔ یہ احتساب کی فرمائش بھی تمہاری ہی تھی۔ اب ساکت کھڑی رہو' آئینوں کے سامنے۔ اپنا چہرہ ہر زاویے سے دیکھ لو" عثمان دہاڑا "میں نے تمہیں اپنی عزت بنایا تھا۔ تم میری عزت تھیں۔ تم نے میری عزت کو تار تار کر ڈالا لیکن یہ بھول گئیں کہ تمہارا وجود تار تار ہو رہا ہے۔ تم میرے ذلت کی گہرائیوں میں گرنے کی بات کر رہی تھیں۔ تمہیں کبھی یہ نظر نہیں آیا کہ تم کس پستی تک پہنچ چکی ہو۔ اب بیٹھ کر اپنے خسارے کا حساب کرو۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں بچے گا اور کھاتے میں تمہارے حساب میں اب بھی بے حساب ہوگا۔"

دیر تک خاموشی رہی۔ شہناز گم صم بیٹھی تھی پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا۔ نقوش کرخت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں خوف ناک چمک تھی "تو تمہیں مجھ سے کیا توقع تھی؟ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری آوارگیوں پر میرا کوئی ردِ عمل نہیں ہوگا؟"

"ردِ عمل!" عثمان نے حقارت سے کہا "تم کسی بڑی خوش فہمی میں ہو۔ یہ تمہارا ردِ عمل تھا میری آوارگی پر؟"

"ہاں۔ میں تم سے انتقام لے رہی تھی۔"

"انتقام لے رہی تھیں تو پھر ضبط کا ڈھنڈورا کیوں پیٹتی ہو۔ انتقام اور ضبط ساتھ ساتھ نہیں چلتے" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "اور یہ انتقام بھی خوب ہے۔ تم نے میرا کیا بگاڑا' سوچو تو خود کو ہی تباہ کیا۔ ارے تم تو آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ میں خراب ہوا تھا تو تم نے خود کو اور زیادہ خراب کر لیا۔ کس بات کا انتقام تھا یہ...؟"

"وہ بھی بتادوں گی" شہناز کے لہجے میں مضبوطی آگئی "ورنہ تم یہی سمجھتے رہو گے کہ مجھے تمہاری عیاشی بری لگتی تھی" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "مجھے تمہاری عیاشی سے کوئی غرض نہیں تھی' کوئی پروا نہیں تھی مجھے۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بات نہیں" عثمان نے اعتماد سے کہا "بنیادی طور پر تمہاری فطرت ہی خراب تھی۔"

"تم مشکور کو جانتے ہو؟" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں... جانتا ہوں۔"

"اس سے ملے ہو؟"

"دوبار دیکھا ہے اسے۔ ایک بار ملا ہوں۔ دوسری بار ملنا نہیں چاہتا۔"

"تم نے اسے دھمکی دی تھی؟"

"دھمکی تو خالی خولی ہوتی ہے۔ میں نے اسے وارننگ دی تھی۔ عقل مند آدمی ہے' سمجھ گیا۔"

شہناز نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اعتراف کر لے گا "کتنی اٹھائی ہے تمہارے اندر۔ کیسے سکون سے کہہ رہے ہو کہ اسے وارننگ دی تھی۔ ان باتوں کا تذکرہ اتنے فخر سے کر رہے ہو؟" اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

"وارننگ نہ دیتا تو کیا تو یہ خط لکھتا اسے" عثمان نے سخت لہجے میں کہا "اور گھٹیا پن کی بات مت کرو۔ میں نے ایسا گھٹیا پن دیکھا ہے کہ جس سے انسانیت شرم سار ہو کر رہ جائے۔ اور کم از کم تمہارے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

"مشکور کی سب سے بڑی بیٹی کی کیا عمر ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی کوئی بیٹی بھی ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم خوب جانتے ہو کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ تین بیٹیوں کا باپ ہو کر ایسا ہے تو اس کی بے غیرتی میں کوئی کلام نہیں۔"

"اور کسی باپ کو اس کی معصوم بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کرنے والے کو کیا کہو گے؟" شہناز نے تند لہجے میں کہا "تمہیں اس کی بچیوں کے متعلق رکیک دھمکیاں دیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟"

"تو موصوف جھوٹ بھی غضب کا بولتے ہیں" عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مشکور جھوٹا نہیں۔ وہ مرد ہے' صاف بات کرتا ہے اور منہ پر کرتا ہے" شہناز کا لہجہ تفریہ تھا۔

"اور پھر بھی اس نے تمہیں اصل بات نہیں بتائی کہ میں نے اسے کیا وارننگ دی تھی؟"

"وہ مجھے بتا چکا ہے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے گھٹیا پن پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔"

"جھوٹ سچ تو خیر تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال میں تمہاری... بلکہ اس کی بات درست مان لیتا ہوں۔ اب مجھے بتاؤ کہ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم مجھ سے اس دھمکی کا انتقام لے رہی تھیں؟"

"ہاں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں اس گھٹیا پن کی بدترین سزا دوں گی' جسے تم کبھی نہیں بھول سکو گے۔"

"چلو مان لیا کہ تم نے مجھے سزا دینے کے لیے خود کو طوائف بنا ڈالا... بلکہ اس سے بھی بدتر۔ زمین پر پڑی ہوئی کھوٹی چونی' جسے ہر راہ گیر اٹھا کر دیکھتا تھا اور چند لمحے بعد دوبارہ وہیں پھینک دیتا تھا۔ جیب میں رکھنے کی زحمت کوئی بھی نہیں کرتا تھا" وہ غور سے شہناز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہر لفظ پر وہ یوں سمٹ رہی تھی' جیسے وہ کوڑا بن کر لگ رہا ہو۔ "مگر اب یہ بتاؤ کہ بہت پہلے... اٹھارہ برس... بلکہ شاید اس سے بھی پہلے سے جو گھناؤنا کھیل تم مشکور کے ساتھ کھیل رہی تھیں' اس کا کیا جواز تھا؟ اس وقت تو میں نے مے نوشی بھی نہیں شروع کی تھی۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسری عورت بھی نہیں تھی۔ بولو... جواب دو مجھے اس بات کا؟"

شہناز اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تت... تت... تو کک... تو کیا...؟" اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے اٹھارہ برس سے معلوم ہے یہ بات" عثمان نے

سفر کے دوران ایک عمر رسیدہ اور تھکے ہارے تاجر نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات ہوتے ہی وہ بستر میں جا گھسا۔ اچانک دروازہ کھلا اور شوخ لباس والی ایک خوش ادا حسینہ نے اندر جھانکا۔

"معاف کیجئے... میرا خیال ہے میں غلط کمرے میں آگئی ہوں" وہ ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں خاتون! آپ نہ صرف غلط کمرے میں آگئی ہیں بلکہ بیس سال تاخیر سے بھی پہنچی ہیں۔" تاجر نے کراہ کر جواب دیا۔

نفرت بھرے لہجے میں کہا "تم ابھی کچھ دیر پہلے حد کی بات کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میں حد سے گزر چکا ہوں۔ ساری حدیں پھلانگ چکا ہوں۔ تم حد کیا جانو۔ حد تو تم پر عائد کی جا سکتی تھی۔ ساری حدیں تو تم پھلانگ گئی تھیں۔ تم صبر و ضبط کی بات کر رہی تھیں ابھی۔ صبر اور ضبط تم کیا سمجھو گی۔ میں نے صبر کیا ہے... میں نے ۱۸ برس ضبط کیا ہے۔ میں زہر تھوکنے کے بجائے اپنے اندر اتارتا رہا ہوں۔ سمجھیں زہریلی ناگن..."

"لیکن کیسے؟"

"موسم... ہاں' وہ موسم تھا' جس نے تمہارے گناہ کو بے نقاب کیا تھا..."

○☆○

عثمان حفیظ اس رات کو کبھی نہ بھول سکا۔ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی تمام جزئیات اس کے دماغ پر نقش ہو گئی تھیں۔

اندر کا حال بھی ابتر ہی تھا۔ وہ ان دنوں شہناز کے مزاج کے سرد و گرم کا سب سے سخت موسم جھیل رہا تھا۔ ایک دن اچانک ہی وہ اس پر مہربان ہو گئی تھی۔ ایسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ مہربانی طول پکڑے گی' مگر ہوا ایسا ہی۔

شہناز کی مہربانی کا وہ موسم ایک سال سے زیادہ عرصے پر محیط تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ زندگی خوب صورت ہو گئی تھی۔ گھر جنت بن گیا تھا۔ شہناز کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ کے گلاب ہوتے۔ اس کی آنکھوں میں بلاوے ہوتے اور انداز میں محبت۔ وہ سوچتا کہ شاید یہ حقیقت نہیں' محض ایک خوب صورت خواب ہے۔ لیکن خواب میں ایسا کیف کہاں ہوتا ہے؟

ہر زمین کا اپنا ایک موسم ہوتا ہے۔ شہناز کو اس نے پانچ سال دیکھا تھا۔ اس کے موسم روز بدلتے تھے۔ پل پل بدلتے تھے۔ اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی موسم دیرپا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ حیران تھا اور اس حیرانی نے اس کے انبساط کو دوچند کر دیا تھا۔

وہ بہار سے پہلے آنے والی بارش کا موسم تھا۔ وہ بارش جو بہار کی نقیب ہوتی ہے۔ جس کا ایک ایک قطرہ سوکھے درختوں کو نمو سونپتا ہے۔ جس کی وجہ سے شاخوں کے مساموں سے کلیاں

سر اٹھاتی ہیں۔ شرماتی ہوئی ہری ہری کونپلیں پھوٹتی ہیں' شگوفے کھلتے ہیں۔

ہاں' وہ بہار سے پہلے کی بارش تھی۔ وہ برس رہی تھی اور وہ بھیگ رہا تھا۔ اس بھیگنے میں' شرابور ہونے میں ایسی سرشاری تھی' جس سے وہ واقف ہی نہیں تھا۔

ایسی لذت تھی کہ وہ ساکت ہو جاتا تھا لیکن اس کے اندر رقص کا سماں جاگ اٹھتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے وجود میں پورا گلستان بن گیا ہے۔ رنگا رنگ اور مہک سے لدے ہوئے پھول جھوم رہے ہیں۔ بارش اور کچھ دیر ہو گئی تو وہ باہر سے بھی کھل اٹھے گا۔

لیکن اس پر بہار نہیں آئی۔ بارش وقت سے پہلے رک گئی۔ موسم تبدیل ہو گیا۔ آسمان چلچلاتی دھوپ سے بھر گیا۔ چلچلاتی دھوپ... اور وہ بھی بارش کے بعد کی دھوپ جس کی ہر سانس نیزے کی تیز دھار والی انی ہوتی ہے۔ آخری نمو کی محتاج کلیاں سہم گئیں۔ اس دھوپ میں کملانے لگیں' مرجھا گئیں۔ کونپلوں کی سانسیں تھمنے لگیں۔ شگوفوں کے دم گھٹ گئے۔ آتی ہوئی بہار کے بجائے خزاں کے آنے کا تجربہ بالکل نیا تھا۔

اس کے اندر رقص کا سماں تو اب بھی تھا لیکن اب وہ رقصِ وحشت تھا۔

جیسے ایک سال پہلے شہناز مثبت طور پر بدلی تھی' اب منفی طور پر بدل گئی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ لیکن نہیں' پہلے جیسا کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ درست کہ وہ وہی بے رخی اور سرد مہری جھیل رہا تھا' جو اس نے شادی کے پہلے پانچ برس میں جھیلی تھی۔ وہ اسی برفانی دیوار سے اپنا وجود ٹکرا رہا تھا' جو اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ لیکن فرق تھا... بہت بڑا فرق تھا۔ اب وہ اس دیوار کے اندر کی حدت پی چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وہاں لاوا بھی ہے۔ لیکن اس لاوے کو جگانے والا منتر اسے معلوم نہیں تھا۔ وہی اذیت' جو وہ پہلے بھی اٹھاتا رہا تھا اور زندہ رہا تھا' اب اسے لذت کے' کیف و انبساط کے بعد ملی تھی تو لگتا تھا کہ وہ نہیں سہہ سکے گا۔ یہ اذیت اب اسے مار ڈالے گی۔ ختم کر دے گی۔ تیز بارش میں بھیگنے والے جسم پر اچانک تیز دھوپ پڑے تو وہ تو ٹوٹے گا ہی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ ایک لڑکا تھا' جو لذتوں سے بے خبر تھا۔ جسے کچھ معلوم نہیں تھا مگر پچھلے ایک سال نے اسے مکمل مرد بنا دیا تھا جس پر زندگی کے تمام راز کھل چکے ہوں۔ اب وہ اذیت کا ہر مفہوم سمجھ سکتا تھا۔

وہ سوچتا کہ یہ سب کیوں ہوا... کیسے ہوا۔ وہ تو اپنی جگہ قانع ہو چکا تھا۔ اس نے محرومی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھر شہناز میں وہ تبدیلی کیوں آئی اور اب وہ پھر پہلے جیسی کیوں ہو گئی۔ جو اذیت وہ اٹھا رہا ہے' وہ شہناز کو بھی تو ہوتی ہو گی۔

لیکن اسے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔

تو یہ وہ حالات تھے' یہ اس کی کیفیت تھی کہ وہ رات آ پہنچی۔

اسے ایک اجازت نامے کے سلسلے میں اسلام آباد جانا تھا۔ نائٹ کوچ میں اس کی سیٹ ریزرو تھی۔ فلائٹ ساڑھے دس بجے کی تھی۔

وہ شام کو گھر جانے کے لیے دفتر سے نکلا تو موسم بہت خوش گوار ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ڈرائیو کرنے میں اسے بہت لطف آیا۔ لیکن یہ وہ دن تھے جب اسے بارش سے نفرت ہو گئی تھی۔ اندر محرومی کا موسم چل رہا ہو تو باہر کا خواہش جگانے والا موسم کسے اچھا لگتا ہے۔ اس روز موسم نے اسے اور بھڑکا دیا تھا۔ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس نے شہناز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ معمول کے مطابق اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ اپنے مزاج کے خلاف اس نے التجائیں کیں۔ اس نے خوشامد کی لیکن شہناز ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں" شہناز نے تنگ کر کہا تھا "یہ جسم اور روح' دل اور دماغ کے امتزاج کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی بجلی نہیں کہ سوئچ دبایا' روشنی کر دی۔ سوئچ دبایا۔ اندھیرا کر دیا۔ یہ گیس کا چولھا نہیں کہ ناب گھمائی' دیا سلائی دکھائی اور چولھا جل گیا۔"

"مگر میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "تم نے مجھے ایسا آن کیا ہے کہ میں خود کو آف کر ہی نہیں پا رہا ہوں۔"

"میرے آن کرنے سے آن ہو گئے تو آف کرنے سے آف کیوں نہیں ہوتے۔"

"مجھے نہیں پتا" وہ جھنجلا گیا "تم خود سوچو۔ کتنا عرصہ ہو گیا۔ ایک نارمل آدمی کے لیے یہ بہت ہوتا ہے۔"

"مگر میں کیا کروں۔ میری آمادگی کا بھی تو کوئی سوئچ نہیں۔"

"بس آج تم میری خاطر... پلیز..." وہ گڑگڑانے لگا۔

"یہ تو ممکن نہیں عثمان۔ ہاں' میں یہ کر سکتی ہوں کہ پہلی فرصت میں کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کروں۔"

"پلیز شہناز..."

"سوری عثمان۔ چھوڑو... یہ بتاؤ' کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔"

"آج بارش ہو رہی ہے۔ کچھ پکوان تیار کراؤں؟"

"نہیں۔ مجھے خواہش نہیں ہے۔"

"حالانکہ برسات میں پکوڑوں کے لیے پاگل ہو جاتے ہو۔"

"پاگل تو اب بھی ہو رہا ہوں لیکن تمہارے لیے۔"

"واپس کب آؤ گے؟" شہناز نے پوچھا۔

"کل تک آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے امکان یہی ہے کہ واپسی پرسوں ہی ہو گی۔"

وہ ائرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلا تو بوندا باندی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ڈرائیور اسے ائرپورٹ چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔ اس نے بورڈنگ ٹکٹ لیا اور لاؤنج میں چلا گیا۔

جہاز نے ٹھیک ساڑھے دس بجے ٹیک آف کیا۔ وہ بے حد ہموار پرواز تھی لیکن اس کے نصیب میں اسلام آباد لینڈنگ نہیں تھی۔ وہ اسلام آباد پہنچے تو وہاں موسم اتنا خراب ہو چکا تھا کہ جہاز کا لینڈ کرنا ناممکن تھا۔ متبادل ائرپورٹس کو بھی ٹرائی کیا گیا لیکن بات نہیں بنی۔ آخری فیصلہ یہی ہوا کہ فلائٹ کراچی واپس جائے گی۔

جہاز خیریت سے کراچی پہنچ گیا۔ بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ ٹرمینل سے باہر آکر اس نے ٹیکسی کی اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ بارش تیز ہو گئی ہے۔ اس نے کھڑکی کے شیشے چڑھا دیے۔

بارش مسلسل زور پکڑ رہی تھی۔ بارش کی ٹپ ٹپ اسے اپنے دل پر بجتی محسوس ہوئی۔ وجود میں پھر شوریدہ سر خواہشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی دل میں امید بھی جاگ اٹھی۔ شہناز تنہائی محسوس کر رہی ہوگی۔ کون جانے' یہ موسم اس پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔ وہ سوچ رہی ہو کہ کاش اس وقت وہ اس کے پاس ہوتا۔ کون جانے' اس کے وجود میں بھی اس وقت خواہشیں اسی طرح شور مچا رہی ہوں۔ اور ایسے میں وہ اچانک پہنچے تو... وہ عجیب سی سرشاری محسوس کرنے لگا۔

"اب کدھر چلنا ہے صاحب؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اسے چونکا دیا۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کو گائیڈ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔

"بس یہاں روک دو۔"

ٹیکسی والے کو پیسے دے کر اس نے پہلے جیب سے گھر کی چابیاں نکالیں' جو ہمیشہ اس کے پاس رہتی تھیں۔ پھر وہ اپنا بریف کیس لیے نیچے اترا۔ چوکیدار یقیناً اپنی کوٹھری میں سو رہا ہوگا۔ وہ سوائے شہناز کے کسی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے چابی لگا کر گیٹ کھولا اور صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح بھیگ گیا اور اسے سردی لگنے لگی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر گیا۔ ماسٹر بیڈ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رک گیا۔ اسے خیال آیا کہ سب سے پہلے اسے ان بھیگے کپڑوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا' جسے اس نے نومی کی پیدائش کے بعد اپنی خواب گاہ بنایا تھا۔

شبِ خوابی کا لباس تبدیل کر کے وہ باہر آیا۔ ماسٹر بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھمانے پر اندازہ ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس کی چابی بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ دروازے پر دستک دے۔ اسے جگائے یا اپنے کمرے میں جا کر سو جائے۔ عام حالات میں اسے کبھی کسی سوتے ہوئے کو ڈسٹرب کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ جذبات سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت رک نہیں سکتا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔ اندر سے اسے واضح طور پر ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ دروازہ لاک ہے۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ شہناز کے کمرے میں کوئی مرد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ یقیناً اس کی سماعت کا وہم ہے۔ اس نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ اس بار وہ عین دستک دیتے وقت ٹھٹک گیا۔ آواز پھر سنائی دی تھی۔

وہ بہت مہذب انسان تھا۔ چھپ کر باتیں سننا' کسی کی خواب گاہ میں جھانکنا' کسی کی پرائیویسی ڈسٹرب کرنا اس کے مزاج میں نہیں تھا۔ لیکن وہ بے حد مخلف صورتِ حال تھی۔ وہ خواب گاہ اس کی بیوی کی تھی' جو اس کی محرم تھی۔ وقت رات کے آخری پہر کا تھا اور اندر سے کسی مرد کی آواز آ رہی تھی۔

وہ جھکا اور اس نے کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اندر پوری طرح روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی محبت کا تاج محل جگمگا رہا تھا مگر تاج محل کے پیشِ منظر میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اس کے وجود میں آگ بھڑکا دی۔ اس کا جی چاہا' اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا جسم بیدِ مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

جو اس نے دیکھا ہے' حقیقت ہے؟ یا وہ فریبِ نظر ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے اسے پھر جھکنا تھا... پھر کی ہول سے جھانکنا تھا۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ حقیقت نکلا تو کیا ہوگا۔ نہیں۔ وہ فریبِ نظر ہے... محض تمہارا وہم۔ ذہن کے ایک حصے نے کہا۔ سوچو تو۔ ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟

وہ ہمت کر کے پھر جھکا اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھ ہٹا دی۔ سیکڑوں چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ منظر وہم نہیں' حقیقت تھا۔ جگمگاتے تاج محل کے سامنے وہ دونوں کھڑے تھے... اور وہ جس حال میں تھے' کاش انہیں دیکھنے سے پہلے اسے موت آ جاتی۔

مرد اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اجنبی تو وہ عورت بھی تھی۔ وہ اس کی بیوی' اس کی شہناز تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر اس نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی ایسی چمک تو اسے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن نہیں۔ وہ شہناز ہی تھی۔ اصل شہناز' جو اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے تو شاید ڈمی ملی تھی شہناز کی۔

اس کا ردِعمل وہی تھا' جو ایسی صورتِ حال میں کسی مرد کا ہو سکتا ہے۔ جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ دماغ پر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ اس وقت دروازہ توڑ دیتا اور اپنے ہاتھوں سے... صرف اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا۔ انہیں ختم کر دیتا۔ اس وقت اس کی پوری اہلیت تھی اس میں۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اس وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن کوئی طاقت ور۔۔۔ بے حد طاقت ور جبلت اس کی رہنمائی کررہی تھی ورنہ اس وقت وہ سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد عقل کہاں ساتھ دیتی ہے۔

اندر سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس بار اس نے جھک کر کی ہول سے کان لگادیا۔ زہر اس کی سماعت میں اترنے لگا۔

"تمہارا جسم تاج محل سے زیادہ حسین ہے جان" ہوس میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز۔۔۔ توقف۔۔۔ "تمہارا شوہر بہت خوش نصیب ہے۔"

"اگر اس سے پوچھو تو وہ یہ نہیں کہہ سکے گا" وہ بھرائی ہوئی آواز شناخت کی نہیں لگ رہی تھی۔ لہجے میں تضحیک تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بدذوق ہے؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ بدنصیب ہے۔"

"وضاحت کرو۔"

"اس نے مجھے کبھی ایسے نہیں دیکھا۔"

"اوہ۔۔۔ بے چارہ۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اس کے دیے ہوئے اس تاج محل کی روشنی میں اس سے زیادہ حسین عمارت دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ تو ہے" اٹھلاتی ہوئی نسوانی آواز۔۔۔

"ویسے آدمی خوش ذوق ہے۔ یہ تاج محل گواہی دے رہا ہے۔"

"گھٹیا آدمی اور اعلیٰ ذوق۔ عجیب کامبی نیشن ہے۔"

"تم نے تو پھر سے بھوک جگا دی۔ چلو۔۔۔" ملی جلی حیوانی آوازیں۔۔۔

عثمان نے جھٹکے سے کان ہٹالیا۔ اسے حیرت تھی کہ اسے کچھ ہو کیوں نہیں رہا۔ وہ پاگل کیوں نہیں ہوجاتا۔۔۔ دھماکے سے پھٹ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے اندر وحشتیں ناچ رہی تھیں۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ دروازے کو ٹکریں مار کر توڑ دینے کی خواہش بے حد شدید تھی مگر اسی طاقت ور جبلت نے ایک بار پھر اسے روک دیا۔۔۔ جکڑلیا لیکن اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اس کے قدم بے ساختہ اٹھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ اس نے تو خود کو بس اپنے کمرے میں پایا۔ دروازہ اس نے بہت آہستگی سے لاک کردیا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر۔۔۔ غیر ارادی طور پر۔ کمرے کی لائٹ آن تھی۔ اس نے اسے بھی آف کردیا۔

اندر کی وحشت رک نہیں رہی تھی بلکہ بڑھتی جارہی تھی۔ اس وقت وہ پوری کائنات کو کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا تھا۔ لیکن جبلی طور پر اسے احساس تھا کہ اس وقت اسے خود کو باندھ کر رکھنا ہے۔ پہلے اسے عقل کی روشنی میں سوچنا سمجھنا اور کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کچھ بھی کرنا خطرناک ثابت ہوگا۔

بند کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ بارش اور سرد ہوا نے احساس دلایا کہ اب وہ کم از کم سانس لے سکتا ہے۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اندر کی آگ سرد تو نہیں ہوئی۔ البتہ کچھ قابلِ برداشت ضرور ہوگئی۔

بارش کا رخ کھڑکی ہی کی طرف تھا۔ ذرا دیر میں ہی وہ پوری طرح بھیگ گیا لیکن خاصی دیر تک اسے احساس نہیں ہوا۔ پھر اچانک ہی اسے تھرتھری چڑھ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بارش تھم گئی تھی اور سرد ہوا کی کاٹ بڑھ گئی تھی۔ جسم کو سردی لگی تو اندر کی تکلیف تو نہیں، تکلیف کا احساس ضرور کم ہوگیا۔ نہ ہوا ہوتا تو اسے پھر کپڑے بدلنے کا خیال نہ آتا۔ اس نے کپڑے بدل لئے اور پھر کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔ ہوا اب بھی سرد لگ رہی تھی۔۔۔ ڈسٹرب کررہی تھی۔ لیکن اس وقت ڈسٹرب کرنے والی کوئی ایسی چیز اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح وہ کچھ سوچنے کے قابل ہوسکتا تھا۔ وہ ایسی صورتِ حال تھی جس میں سکون آدمی کو بے سکونی میں مبتلا کرتا ہے۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ فوراً ہی اس کے تصور میں وہ منظر لہرایا اور وہ پاگل ہونے لگا۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے ادھر اُدھر کی باتیں سوچنے کی کوشش کی۔ اسے بچوں کا خیال آیا۔ ہاں۔ بچے تو سب سے اہم ہیں۔ ہر چیز سے۔۔۔ ہر چیز سے۔۔۔ ہر بات سے زیادہ اہم۔ بچوں کا خیال بے حد خوش آئند تھا۔ جیسے اوپر سے گرنے والے کو کوئی مضبوط گرفت مل جائے۔

سوچنا تو پڑے گا۔ اس نے اپنے ذہن کو تیار کرنے کی کوشش کی۔ حقائق سے تو منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ پھر وہ دنیا میں کوئی پہلا مرد تو نہیں، جس کے ساتھ یہ ہوا ہے۔ اور وہ آخری بھی نہیں ہوگا۔ یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ اخباروں میں تقریباً ہر روز ایسی کوئی خبر شائع ہوتی ہے۔

وہ پھر بھڑک گیا۔ اخباروں کی سرخیاں اس کی نظروں میں پھر گئیں۔ خبروں میں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ غرایا۔ ساتھ ہی ایسی بیوی کی اور دوسرے شخص کے قتل کی خبر بھی تو ہوتی ہے۔ اور میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کون سی قوت تھی، جس نے مجھے روک دیا۔ مجھے نہیں رکنا چاہیے۔ میں بھی وہی کروں گا۔۔۔

سرد ہوا جسم کو تھپکیاں دے رہی تھی اور وہ شاطر ذہن پر دلیل کی تھپکیاں دے رہا تھا۔ لیکن بپھرا ہوا شیر قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے بعد کی خبریں اخبار میں نہیں چھپتیں۔ اس نے جھنجلا کر خود سے کہا۔ چھپتی ہیں۔۔۔ بہت بعد میں تو یہ حوالہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی واقعے کا تسلسل ہے۔ ورنہ سوچو۔ آدمی نے اپنی بیوی کو قتل کردیا۔ خود پھانسی پر چڑھ گیا۔ اور بچوں کا کیا بنا۔ یہ جیب کترے، قاتل، جرائم پیشہ نوجوان اور طوائفیں۔۔۔ یہ سب کہاں سے آتے ہیں۔ ایسے ہی تو ہوتے ہیں، جن کے سر پر ماں باپ کا سائبان نہیں ہوتا۔

اس خیال نے اسے دہلا دیا۔ اس کے بچے بے سائباں ہوں۔ معاشرے میں بے نشاں ہوں۔ نہیں۔

تو پھر میں کیا کروں؟ دماغ کے اندر کوئی چلایا۔ طلاق دے دو اسے؟

بات وہی ہے۔ اس نے سوچا۔ طلاق دوں گا تو وجہ کیا بتاؤں گا؟ اصل بات بتاؤں گا تو میری اور بچوں کی بے توقیری ہوگی۔ ہم معاشرے میں طنز و تضحیک کا نشانہ بنیں گے۔ میرا تو خیر کچھ نہیں لیکن بچے تباہ ہو جائیں گے۔ یہ وجہ نہ بتاؤں تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگا۔ میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ بچے مجھ سے نفرت کریں گے اور اپنی غلیظ ماں کو اچھا سمجھیں گے۔ کون جانے' اس کے ساتھ رہنا بھی پسند نہ کریں۔ ماں کے ساتھ رہیں۔ یہ بھی خسارہ ہوگا بچوں کا۔

تو اس سے باز پرس کروں؟ سختی کروں اس پر؟ یہ تو اللہ کا حکم ہے۔ دماغ چیخا۔

لیکن اب عثمان کے پاس بہت روشنی تھی۔ مکمل آگہی تھی۔ تمام معمے حل ہو گئے تھے۔ شہناز کی شخصیت' اس کی ہر بات' ہر عمل کا بھید اس پر کھل چکا تھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی کے روکے رکنے والی نہیں تھی۔ سختی کی جاتی تو جو کچھ چھپ کر ہو رہا تھا' کھلے عام ہونے لگتا۔ اس کے بعد طلاق کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ یہ طے تھا کہ شہناز کو عزت کی کوئی پروا نہیں۔ وہ تو عزت کو اپنے پیروں تلے روندنے کی قائل ہے۔

تو کیا یہ سب ہونے دوں؟ پھر ایک چیخ ابھری۔

ہاں۔ ہونے دو۔ اپنے بچوں کی بہتری' ان کے مستقبل کی خاطر یہ زہر پیتے رہو۔ وہ بھی چلایا۔ اور کچھ نہیں کر سکتے تم۔ آنکھیں بند کر لوں؟

بے غیرت بن کر زندہ رہوں؟

بیٹی کے باپ ہو۔ یہ بے غیرتی برداشت نہیں کرو گے تو اس سے بڑی بے غیرتی نصیب میں آئے گی۔ چپ ہو جاؤ۔

عثمان کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ شہناز روزِ اوّل سے اس سے نفرت کرتی رہی تھی۔ وجہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ دانستہ اسے دھتکارتی رہی تھی۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے اسے پیاسا رکھا تھا۔ پھر جب اسے احساس ہوا کہ اس نے پیاس سے سمجھوتا کر لیا ہے تو اس نے انداز بدل کر وار کیا۔ اسے اپنا عادی بنایا اور اس کے بعد پھر دھتکارا تاکہ وہ آئندہ کبھی سمجھوتا نہ کر پائے۔

وہ پہلے دن سے اس کے ساتھ کھیل کھیلتی رہی تھی۔ وہ اسے تباہ کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے کوئی کسر بھی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ تباہ ہو چکا تھا۔ اور اب جو تباہی ہونا تھی' اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

صدر دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا پانچ بجے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا لیکن آسمان پر اب بھی گھٹا تھی جس کی وجہ سے کافی اندھیرا تھا۔ پھر بھی عثمان کو ان کی دیدہ دلیری پر حیرت تھی۔

شہناز نے گیٹ کھول کر اپنے مہمان کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ وہ پلٹی تو عثمان کھڑکی کے سامنے سے ہٹ چکا تھا۔ عثمان کو صدر دروازہ بند ہونے کی' ہر راہداری میں شہناز کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر ماسٹر بیڈ روم کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔

اتنی دیر میں عثمان فیصلہ کر چکا تھا۔ چوکیدار یا کسی اور ملازم کے بیدار ہونے سے پہلے اسے رخصت ہو جانا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ تیار ہو کر بنگلے سے نکل آیا۔ خاصی دور تک پیدل چلنے کے بعد اسے ٹیکسی ملی۔ وہ انٹر کانٹی نینٹل چلا گیا۔ اسی رات نائٹ کوچ سے وہ اسلام آباد چلا گیا۔ کام نمٹانے میں اسے دیر نہیں لگی۔ اگلے دن وہ گھر واپس آ گیا۔

اس بار شہناز کو روبرو دیکھنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ وہ اس کی نفرت سے پھنک رہا تھا۔ چلو' خواہشوں کے عذاب سے تو نجات ملی۔ اس نے سوچا۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟" شہناز نے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ تم اتنی خوب صورت بھی نہیں ہو" اس نے جواب دیا "لیکن میں نے تمہیں دیکھا بھی کہاں ہے؟"

"کیا مطلب؟" شہناز بری طرح چونکی۔

"میں اس طرح سے تمہیں کہاں دیکھ سکا ہوں' جیسے دیکھنا میرا حق ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"دکھانا پسند کرو گی؟" اس نے شہناز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ حجاب بھی کوئی چیز ہوتی ہے" شہناز کے لہجے میں ترشی تھی۔

"واقعی؟ خیر اب مجھے ضرورت بھی نہیں۔ میں تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ بتاؤ' تم ماہرِ نفسیات سے ملیں۔"

"نہیں۔"

"حیرت ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے جاتے ہی اس سے ملی ہوگی" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "اب تو ملنے کی ضرورت بھی نہیں۔"

"کیوں؟ کیا ہو گیا؟"

"میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ جیسا ہے..." اس نے شہناز کے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "..... یہ تو مجھے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ بعض اوقات مشکل مسائل کا سامنے کا حل بھی آدمی کو نظر نہیں آتا" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور شہناز کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

چند روز میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فیصلہ کرنا آسان ہے۔ لیکن اس پر عمل بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو عذاب اس نے سہنے کا

فیصلہ کیا تھا' وہ بہت بڑا' بہت خوف ناک تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دفتر میں کام کررہا ہوتا تو کسی ہول سے نظر آنے والا وہ خوف ناک نظارہ اسے ستاتا۔ اس کی تو رات کی نیند بھی حرام ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنی نظروں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ اتنا کچھ ہوگیا اور اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مرد تو بہت بااختیار ہوتے ہیں۔ وہ سوچتا۔ میں کیسا مرد ہوں۔ اسے خود پر شک ہونے لگتا۔

وہ شک اسے گناہ کی راہ پر لے گیا۔ عورتوں کے ساتھ اس کا انداز بے حد متشددانہ ہوتا۔ لگتا تھا کہ اسے ساری دنیا کی عورتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ عورت نے اسے پامال کیا تھا۔ وہ ساری دنیا کی عورتوں سے بدلہ لے رہا تھا۔

مگر بے غیرتی کا احساس سوہانِ روح بن کر رہ گیا۔ وہ کبھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ اس نے خود کو شراب میں غرق کرلیا کہ اس طرح خود فراموشی تو ملے گی۔ لیکن نشے میں ہوتا تو وہ منظر اسے اور ستاتا۔ وہ تو آسیب کی طرح اس کی یادداشت سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکا۔ ہر رات وہ وہی سب کچھ خواب میں بھی دیکھتا تھا۔ اس کی ہر مختصر نیند اسی خواب پر ختم ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایک رات میں کئی کئی بار!

اس کا نوی دنیا سے چلا گیا۔ ایک بیڑی کٹ گئی مگر دوسری تھی۔ اور وہ زیادہ مضبوط بھی تھی۔ وہ بیٹی جو تھی۔ بیٹی کے لیے عزت اور آبرو سے رخصت ہونے کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو کوئی محرومی نہیں دینا چاہتا تھا۔

پھر ثوبیہ کی شادی ہوگئی۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہوگیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ باضابطہ طور پر بھی آزاد ہوسکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا' جہاں اتنا صبر کیا ہے' کچھ دن اور سہی۔ وہ اپنی آزادی کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ ازدواجی عذاب کی سلور جوبلی بھی ہوجائے اور نئے سال سے نئی زندگی کا آغاز ہو۔ اس کے لیے اسے یکم جنوری کا انتظار تھا۔

○☆○

"تم ضبط کی بات کرتی ہو" عثمان نے حقارت سے کہا "مجھے سکون کی نیند سوئے اٹھارہ برس ہوگئے۔"

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شہناز کا چہرہ بدلنے لگا۔ خدوخال کی خوب صورتی یکسر ختم ہوگئی۔ اب وہ چڑیل سی نظر آرہی تھی۔ "مجھے خوشی ہے کہ میری قربانی رائگاں نہیں گئی" وہ بولی۔

"تمہیں مجھ سے بہت نفرت تھی؟"

"ہاں' اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"لیکن کیوں؟ میں نے تو تم سے ایسی محبت کی تھی کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ پھر تمہیں مجھ سے نفرت کیوں تھی؟"

"مجھے تمہاری شخصیت سے نفرت تھی۔ تم کمزور تھے' بزدل تھے۔ تم مرد نہیں تھے۔ مردانگی نہیں تھی تم میں۔ تم خود سوچو۔ تم نے کبھی مردانگی کا ثبوت دیا؟"

عثمان اس کے صوفے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کردیا۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں" اس نے کہا "پھر بھی میں تمہاری زبان سے مردانگی کی تعریف سننا چاہتا ہوں۔"

"مرد طاقت ور ہوتا ہے" شہناز نے کہا "اس کے ارادے اور عزائم بلند ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں جو چاہتا ہے' حاصل کرلیتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ کوئی کام چھپ کر نہیں کرتا۔ اس میں بزدلی نہیں ہوتی۔ وہ عورتوں کی طرح چھپ کر وار نہیں کرتا" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے تمہیں ذلیل کیا' دھتکارا۔ تم میرے سامنے گڑگڑائے۔ میں پھر بھی نہ مانی تو تم ہار کر بیٹھ گئے۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں" عثمان نے چیخ کر کہا اور شہناز کی کلائی پوری طاقت سے پکڑلی "تم یہ کلائی چھڑا سکتی ہو؟ چھڑا کر دکھاؤ۔"

شہناز نے کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ گرفت بہت سخت تھی۔

"نہیں چھڑا سکتیں۔ اسی طاقت کی بات کررہی تھیں نا تم" عثمان نے حقارت سے کہا "یہ طاقت تو قدرتی طور پر ہے مجھ میں۔ لیکن طاقت کا اظہار مردانگی نہیں۔ میں اسے چھچھورا پن سمجھتا ہوں۔ طاقت ور کی ذمے داری ہے کمزور کو تحفظ فراہم کرنا۔ نہ کہ اسے دبانا۔ اگر میں صبح و شام مرمت کرتا تو تمہاری نظر میں مرد ٹھہرتا۔ لیکن اپنی نظروں میں گر جاتا" اس نے شہناز کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگی "اور میرے ارادے اور عزائم بلند تھے۔ میں بہت اچھا انسان بننا چاہتا تھا۔ میں اپنے بچوں کی بہت اچھی پرورش کرنا چاہتا تھا۔ انہیں حتی الامکان دکھ اور تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر کیا۔ لیکن ایک کمزور شخص نے میری راہ کھوٹی کردی۔ مجھے شکست دے دی۔ لیکن نہیں۔ مجھے میرے طاقت ور ہونے کے احساس نے شکست دی تھی۔

"تم کہتی ہو' مرد دنیا میں جو چاہتا ہے' حاصل کرلیتا ہے۔ یہ بھی مردانگی نہیں۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ میرے نزدیک یہ مقولہ بھی نامردوں کا بنایا ہوا ہے۔ یہ تو خود کمزوری کا اظہار کررہا ہے۔ مرد کے لیے بااصول ہونا ضروری ہے۔ جائز بات پر ڈٹ جائے اور ناجائز بات سے ہٹ جائے۔ خواہشیں تو بے شمار ہوتی ہیں دنیا میں۔ عورت کمزور اسی لیے ہے کہ آسانی سے سرنگوں ہوجاتی ہے۔ طاقت اللہ اس لیے نہیں دیتا کہ انسان اپنی مرضی کے سامنے کسی کا احترام نہ کرے۔ مرضی تو صرف اللہ کی چلتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ اور میں نے کوئی کام چھپ کر کیا تو صرف بچوں کی وجہ سے ورنہ جہاں تو میں خدا سے نہ ڈرے تو کسی بندے سے کیا ڈرے گا۔

"اور سنو۔ یہ درست ہے کہ تم نے مجھے ذلیل کیا۔ دھتکارا۔ میں تمہارے سامنے گڑگڑایا۔ تم نہ مانیں تو میں نے خواہش کو اپنے سر پر سوار کرنے کے بجائے اسے تسخیر کرلیا۔ میرے نزدیک یہی مردانگی تھی۔ تم اسے ہارنا کہتی ہو۔ وہ تو بہت بڑی فتح تھی۔ تمہارے خیال میں یہ مردانگی ہوتی کہ میں من مانی کرتا۔ زبردستی کرتا۔ طاقت کے زور پر تمہیں زیر کرلیتا۔ اسے ریپ کرنا کہتے ہیں۔ تم سمجھتی ہو' ریپ کرنا مردانگی ہے۔ اس مردانگی کا ثبوت تو میں اب بھی دے سکتا ہوں" اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"اب تم بے غیرتی کو بھی قربانی قرار دو گے" شہناز نے مضحکہ اڑایا "تم سب کچھ جانتے تھے۔ پھر بھی تم نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ الگ بات کہ میں رکتی نہیں۔ تم نے مجھے سزا بھی نہیں دی۔"

"میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق کو اپنے ان ہاتھوں سے ختم کرسکتا تھا ۔۔۔ نمونہ دیکھ لو" اس نے پوری قوت سے شہناز کے منہ پر تھپڑ مارا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ چند منٹ وہ کوشش کے باوجود نہیں اٹھ سکی۔ اس نے گرے گرے منہ سے خون تھوکا۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ کئی دانت ہل گئے تھے۔

"درندے۔۔۔ وحشی۔۔۔" وہ بولی۔

"درندہ' وحشی نہیں' مرد کہو۔۔۔ مرد!" عثمان نے زہریلے لہجے میں کہا "یہی تو مردانگی ہے تمہارے نزدیک۔ ورنہ میں تو عورت پر ہاتھ اٹھانے کو بزدلی سمجھتا ہوں۔ کہو تو اس وقت بزور تمہیں حاصل کرکے دکھاؤں۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"غلط! کرسکتا ہوں۔ لیکن کروں گا نہیں۔ یہ جسم جسے تم اُن گنت انسان نما کتوں کے آگے پھینک چکی ہو' میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا" وہ کہتے کہتے رکا "تو میری خوبیوں اور اپنی جہالت کی بنا پر تم مجھ سے نفرت کرتی رہیں؟"

"نہیں۔ اصل بات تم جانتے ہو۔ تم نے مجھ سے میری محبت چھینی تھی۔"

"تو یہ تو مردوں والا کام ہوا نا۔ مرد دنیا میں جو چاہیں' حاصل کرلیتے ہیں" عثمان نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ پھر وہ سنجیدہ ہوگیا "یہ الگ بات کہ یہ مردانگی مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ یہ میرے مزاج میں ہی نہیں۔ ویسے یہ حوالہ مشکور ہی کا ہے نا؟ تم اس سے محبت کرتی تھیں؟"

شہناز اٹھی اور صوفے پر بیٹھ گئی "بتاؤ مت۔ تم یہ بات جانتے تھے۔"

"اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے ایک بات پوچھ لوں تم سے۔ تمہارے خیال میں مشکور میں تمام مردانہ خصائل ہیں۔ وہ ایک مکمل مرد ہے؟"

"ہاں۔ اس لیے میں تمام عمر اپنی محبت اس پر نچھاور کرتی رہی۔۔۔"

"اپنی محبت بھی اور آبرو بھی۔ اور میری عزت بھی؟"

"ہاں" شہناز نے کہا۔ "وہ ایک مکمل مرد ہے۔"

"اب ذرا یہ بھی بتادو کہ میں نے تمہاری محبت کیسے چھینی؟"

"سب جانتے ہو تم" شہناز نے غصے سے کہا "تم میری محبت جیت بھی سکتے تھے لیکن تم نے اس کے لیے ناجائز طریقے اختیار کیے۔ تم کہتے ہو کہ تم جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز کے مقولے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ بتاؤ کہ بلیک میلنگ مردانہ وصف ہے؟ تم نے میری محبت چھیننے میں بزدلی دکھائی۔ عورتوں کی طرح چھپ کر وار کیا۔ تمہیں سزا کوئی عورت ہی دے سکتی تھی۔ میں نے تمہیں بدترین سزا دی۔ مجھے اس پر کوئی پچھتاوا۔۔۔"

"ایک منٹ" عثمان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "یہ دعویٰ تھوڑی دیر بعد کرنا تو بہتر رہے گا۔ جلد بازی مت کرو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے کیا جرم کیا تھا؟ کیسے چھینی تھی تمہاری محبت؟"

شہناز کی نظروں میں ریسٹورنٹ کا وہ ۲۵ برس پرانا منظر پھر گیا۔ اس کی سماعت میں مشکور کی وہ گفتگو گونجی' جب اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرسکتا۔

اس نے وہ گفتگو دہرادی۔ اس کے ہر ہر لفظ پر عثمان کا رنگ بدلتا گیا "اب بولو تم" شہناز نے چیلنج کیا "آئینے میں دیکھو کہ تم کیا ہو۔"

"دیکھ رہا ہوں۔ تم بھی دیکھتی رہو۔ جب نظر آئے گا تو گزری ہوئی پوری زندگی پچھتاوا بن جائے گی" عثمان نے کہا "ابھی تو اپنے پسندیدہ مکمل مرد کا اصل چہرہ دیکھو۔ یہیں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں۔"

وہ کمرے سے چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو کاغذ تھے۔ اس نے ایک کاغذ شہناز کی طرف بڑھادیا "یہ لو۔ یہ ہے تمہارے مکمل مرد کا بیع نامہ۔ اس سے تمہیں پتا چلے گا کہ اس نے کس طرح خود کو فروخت کیا۔ کیسے خود کو غلامی میں دیا۔ پڑھو اسے" اس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔

شہناز نے اس دستاویز کو پڑھا۔ اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

"تم وہ تاریخ تو کبھی نہیں بھول سکتیں جب مشکور نے تمہیں میری بزدلی اور بلیک میلنگ کی کہانی سنائی تھی۔"

"کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے یاد ہے۔ وہ ۲۷ ستمبر تھی۔"

"اور اس پر تاریخ دیکھو۔ ۲۶ ستمبر۔ یہ معاہدہ اس سے ایک دن پہلے ہوا تھا۔"

"میں کیسے یقین کرلوں کہ یہ دستاویز جعلی نہیں ہے" شہناز نے کمزور لہجے میں کہا۔

"یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ ویسے میں کل اسے ادائیگی کا نوٹس بھجواؤں گا تو سب پتا چل جائے گا۔"

"میں نہیں مان سکتی" شہناز کا انداز خود کلامی کا سا تھا "لیکن

تم بتاؤ تو۔ تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

"میں کچھ ثابت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تمہیں اس کا اصل چہرہ دکھا رہا ہوں۔"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"تمہارے آئیڈیل مرد کی مردانگی" عثمان نے کہا "یہ نہ بتاؤ کہ تم کچھ سمجھی ہی نہیں ہو۔ جو حقیقت ہے اس کا سامنا کرو۔"

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

"میں حاضر ہوں" عثمان نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "پہلے تو اس دستاویز کو سمجھ لو۔ اس کے مطابق تمہارے پاپا نے ۲۶ ستمبر کو مشکور علی کو بیس لاکھ روپے قرض دیے تھے۔ اب ۲۵ سال ہو چکے ہیں۔ طے شدہ شرح سود کے مطابق اب اسے کم از کم پچاس لاکھ ادا کرنے ہیں۔ اب وہ خود کو فروخت بھی کرے گا تو اتنی رقم اکٹھی نہیں کر سکے گا۔ اب سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بس یہ کہ اب وہ اپنے انجام کو پہنچے گا۔"

"لیکن اس نے اس رقم سے کاروبار شروع کیا تھا تو تھوڑا تھوڑا کر کے قرض چکایا کیوں نہیں؟" شہناز نے اعتراض کیا۔

"بھولی بننے کی کوشش مت کرو۔ تم سب سمجھ چکی ہو" عثمان نے ترشی سے کہا "ادا کرنے کا تو جب خیال آتا کہ یہ قرض ہوتا۔ مشکور مطمئن تھا کہ اسے رقم واپس نہیں کرنی۔ اس لیے کہ یہ قرض نہیں' یہ تو اس نے اپنی محبت کی قیمت وصول کی تھی۔ ذرا سوچو تو... کتنی مہنگی تھی تمہاری محبت' بیس لاکھ روپے میں بکی۔ اب اسی سودے کی غیر تحریری شرائط بھی سن لو۔ اسی بیس لاکھ کے بدلے مشکور نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود تم سے شادی سے انکار کر دے گا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی تمہاری زندگی میں مداخلت نہیں کرے گا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ اس نے گہری سانس لی۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑا "خالص فلمی اور افسانوی سچویشن ہے نا۔ فلم یا افسانے میں ہیرو ایسی بڑی سے بڑی پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔ ولن قبول کر لیتے ہیں لیکن تحریر کبھی نہیں دیتے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ تمہارا ہیرو کتنا لالچی تھا۔ مجم انکل نے اس سے اس کی قیمت پوچھی۔ اس نے بتا دی۔ انکل نے قبول کر لی۔ لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ اسے قرض کی تحریر دینی پڑے گی تاکہ خلاف ورزی کی صورت میں اسے سزا دی جا سکے۔ اس نے اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انکل مرحوم ڈٹ گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اس کے بغیر وہ اسے ایک دھیلا نہیں دیں گے۔ بے شک وہ تم سے شادی کر لے۔ اس صورت میں بھی اسے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ تمہیں عاق کر دیں گے۔ اگر مشکور اسٹینڈ لے لیتا تو شاید انکل کو ہار ماننا پڑتی لیکن تمہارا ہیرو تو بیس لاکھ کی ترغیب سے ہار چکا تھا۔"

"اور تمہیں یہ سب معلوم ہے" شہناز نے نفرت سے کہا "یہ آئیڈیا بھی تمہارا ہی ہوگا۔ تم نے یوں میری محبت خریدی...."

"مجھے تو مشکور کے متعلق معلوم تک نہیں تھا۔ میں نے تو پہلی بار اس رات تمہاری خواب گاہ میں اسے دیکھا تھا۔ یہ سب تو انکل کی موت کے بعد مجھے معلوم ہوا۔ انہوں نے میرے لیے خط چھوڑا تھا۔ یہ وہ خط ہے۔ یہ بھی پڑھ لو" اس نے شہناز کی طرف دوسرا کاغذ بڑھایا "انکل احساسِ جرم کا شکار تھے۔ اسی لیے انہوں نے کبھی مجھے میری آوارگی اور بے راہ روی پر نہیں روکا۔ شکر ہے کہ انہیں تمہاری گراوٹ کا علم نہیں تھا ورنہ وہ جیتے جی مر جاتے۔ اور پھر مشکور سے قرض کی رقم واپس مانگتے کیونکہ اس نے اپنے وعدے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ شکر ہے کہ انہیں معلوم نہیں ہوا۔"

"پھر بھی پاپا ہمیشہ مجھ سے خفا رہے" شہناز کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"اب تمہارا اپنے ہیرو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ تو مثالی مرد تھا نا" عثمان نے طنزیہ لہجے میں کہا "بیس لاکھ کے عوض وہ تمہاری محبت سے دستبردار ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اسے تم سے نہیں' تمہاری دولت سے محبت تھی۔ دوسری بات' وہ لالچی ثابت ہوا۔ پھر وہ کم حوصلہ بھی تھا کہ تمہیں سچ نہیں بتا سکا۔ اس نے جھوٹ بولا۔ یہ بھی مردوں کا شیوہ نہیں۔ اس نے تمہیں تحفظ نہیں دیا بلکہ بے وقوف بنایا۔ اس نے مجھ پر چھپ کر وار کیا اور وہ بھی اوچھا۔ پھر اس نے عہد شکنی کی۔ اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ تمہیں پامال کرتا رہا۔ اس نے تمہیں استعمال کیا اور میری عزت اور میرا گھر بھی تباہ کر دیا۔ ایسے ہی ہوتے ہیں مثالی مرد؟ اب دیکھو آئینے میں اپنی زندگی.... اور باقی عمر نفرت کرو... خود سے بھی اور اس سے بھی۔"

شہناز کا چہرہ نفرت نے مسخ کر دیا تھا "وہ دلن تھا تو ہیرو تم بھی نہیں تھے۔ تم بے غیرتوں کی طرح مجھے لٹتا دیکھتے رہے۔ تمہیں مجھ کو روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

"اپنی بے غیرتی مجھے تسلیم۔ لیکن میں نے بیٹی کی خاطر وہ زہر ہلاہل پیا۔ اس کی شادی ہو گئی تو میں آزاد ہوا۔ مگر بعد کی بھی تو سن لو۔ انکل کی موت کے بعد مجھے ان کا خط اور قرض کی دستاویز ملی۔ میں نے مشکور کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور تنبیہہ کی کہ اگر اب کبھی وہ تم سے ملا تو اسے تباہ کر دوں گا۔ کاش.... میں تمہیں وہ منظر دکھا سکتا۔ وہ کیسے گڑگڑایا۔ اس نے میرے پاؤں تک پکڑ لیے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا اور وہ پورا بھی کیا لیکن تمہیں اس نے پھر ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ میں اسے اس کی بیٹیوں کے حوالے سے بلیک میل کروں گا! ارے' میں تو اسے ختم بھی کرا سکتا تھا۔ خود بھی ختم کر سکتا تھا اسے۔ اس نے گھٹیا پن کی حد کر دی۔"

"اپنی بیٹی کی محبت میں تم نے خود کو بے غیرت بنا لیا۔ یہی کہہ رہے ہو نا تم؟"

"ہاں۔ ورنہ اس رات میں خود تمہیں اور اس کو قتل کر دیتا۔ لیکن دانش مندی' دور اندیشی اور برداشت بھی مردانہ اوصاف ہی ہیں۔"

"بے چارے تم" شہناز نے عجیب سے لہجے میں کہا "واقعی تم بہت مظلوم ہو۔"

عثمان نے کچھ نہیں کہا۔ اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

"پرائی چیز کی خاطر اتنے کشٹ جھیلے تم نے۔ کیسا زہریلا مل پیتے رہے۔ افسوس۔۔۔"

"بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں۔ میرے لیے نہیں' سبھی کے لیے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے کوڑھ مغز انسان" شہناز نے نفرت سے کہا "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ثوبیہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔"

عثمان پر یہ الفاظ بم کی طرح گرے۔ اس کے ذہن پر شہناز کے الفاظ کی معنویت پوری طرح اجاگر نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کچھ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"وہ تمہاری نہیں' مشکور کی بیٹی ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا" عثمان نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"یہ بات مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔"

"نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے یاد کرو۔ مجھے اب بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے نعمان کو کتنی تکلیف پہنچائی۔ کتنی نفرت کی اس معصوم سے۔ صرف اس لیے کہ وہ تمہارا بیٹا تھا۔ تمہاری تصویر تھا وہ۔ لیکن ثوبیہ کو میں نے کتنا چاہا۔ پوری مامتا نچھاور کی اس پر اس لیے کہ وہ میری اور مشکور کی بیٹی تھی۔ تمہاری اولاد سے تو میں محبت کر ہی نہیں سکتی تھی۔"

لمحوں میں عثمان کی نظروں کے سامنے سے برسوں گزر گئے۔ اس نے جان لیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ اس کے اندر نفرت کا ایک طوفان اٹھا۔ وہ طوفان یقیناً اسے بہالے جاتا۔ وہ اس طوفان کے سامنے بے بس تھا۔ لیکن اسی لمحے اندر سے سمندر جیسی محبت امنڈی اور اس طوفان کو پی گئی۔ وہ محبت ثوبیہ کی تھی۔ وہ اس محبت کو ٹٹولتا رہا۔ اس محبت میں اسے کوئی کھوٹ نہیں ملی۔ اس انکشاف سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں ہے۔

اس محبت نے تھپک تھپک کر اسے پُرسکون کر دیا۔ اس نے سوچا' سارے عذاب تو میں اٹھا چکا ہوں۔ اب کیا غم کرنا۔ اب تو عمر کی شام ہو گئی ہے اور مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بیٹی سے بیٹی جیسی محبت ہی کروں گا۔

"یہاں تم ہار گئیں شہناز بیگم" اس کے لہجے میں سمندر کی سی خاموشی اور گمبھیرتا تھی "ثوبیہ کے لیے میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مجھے کوئی محرومی نہیں ملی۔"

شہناز نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ آنکھوں میں چیلنج۔ وہ چونک کر رہ گئی۔ چیلنج تو وہ ہمیشہ کرتی رہی تھی اسے۔ آج وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔ یہ تو اس کی توہین تھی "ایک اہم بات اور بتانی ہے مجھے" اس نے کہا۔

"ضرور بتاؤ۔ اس لیے کہ پھر کبھی موقع نہیں ملے گا۔"

"میں نے شوہر کی حیثیت سے تمہیں کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے میں سہاگ رات کو سہاگ کے جوڑے میں تمہارے سامنے نہیں آئی۔ میں نے تم سے وعدہ کیا کہ شادی کی پہلی سالگرہ پر وہ جوڑا پہنوں گی۔ دوبارہ دلہن بنوں گی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن تمہارے لیے نہیں۔ میں اس روز مشکور کی دلہن بنی تھی۔ وہ پہلا دن تھا تم سے میری بے وفائی کا۔ اس روز دلہن بن کر میں نے خود کو مشکور کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اور پھر اسی روپ میں تمہارا استقبال کیا تھا۔"

عثمان کو اندازہ تھا کہ وہ کوئی زہریلا انکشاف کرے گی۔ اس نے خود کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ تیاری کام آگئی۔ اس نے بے پروائی سے کہا "میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اب کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ہاں' یہ بات سنانے کے بعد تم اپنے بارے میں غور کرو۔ اردو لغات لے کر اپنے لیے کوئی مناسب لفظ تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں ایسا کوئی لفظ نہیں ملے گا۔ اور ہاں' بیٹھ کر دنیا بھر کی کتابوں میں مرد کی تعریف تلاش کرو۔ اب تمہارے پاس فرصت ہی فرصت ہوگی۔ اپنے ماضی کو گزارتی رہو اور پچھتاوے کماتی رہو کہ گناہ پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں دیتے۔"

"تم مجھے مارو گے نہیں؟"

"جب مارنا تھا' تب نہیں مارا۔ اب کیا فائدہ۔ اب تو ہر سانس تمہارے لیے موت ہوگی۔ میں نے تمہیں وہ محبت دی' جس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ اور تم اس کی مستحق نہیں تھیں۔ یہ میرا دکھ ہے' جسے میں جھیل چکا ہوں۔ اب عذاب اٹھانے کی تمہاری باری ہے۔ اس بار میں تمہیں دو تحفے دوں گا۔ ایک پوری سچائی سے' دل کی گہرائیوں سے تمہارے لیے درازیٔ عمر کی دعا اور دوسرے طلاق۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں' طلاق دیتا ہوں۔"

شہناز اب ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ست گیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں شہناز بیگم۔ یہ گھر تمہیں مبارک ہو۔ میں یہاں سے کچھ لے کر نہیں جاؤں گا۔۔۔ سوائے آزادی کے' جو آج مجھے مل گئی ہے۔ میں اس گھر میں جا کر رہوں گا' جہاں کبھی تم رہتی تھیں' وہ شہناز جو بہت اچھی تھی۔ جہاں انکل نجم اور آنٹی رہتی تھیں۔ جہاں سعود اور محمود رہتے تھے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی پاپا۔"

دروازے کی سمت سے آنے والی آواز نے ان دونوں کو دہلا دیا۔ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دروازے میں ثوبیہ کھڑی تھی۔ اس کے قدموں میں ایک بیگ رکھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں لیکن چہرے پر عجیب سی سختی تھی۔

"بیٹی تم۔۔۔ اندر آجاؤ نا" عثمان نے اسے پکارا۔

"نہیں پاپا۔ اب یہ چوکھٹ پار کر کے میں اندر نہیں آسکتی۔ آپ ہی کو باہر آنا ہوگا۔"

"تم یہاں کیسے۔۔۔؟" شہناز نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"وہیں رک جائیں خاتون" ثوبیہ نے سرد لہجے میں تنبیہہ کی۔ "میں نہیں چاہتی کہ آپ میرے وجود کو اور گندہ کریں۔"

"ثوبیہ' تم....."

"میرا نام نہ لیں آپ" ثوبیہ نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی "آپ کی زبان میرا نام بھی گندہ کردے گی۔"

"تم کب سے کھڑی ہو یہاں؟"

"بہت دیر ہوگئی۔ میں نے آپ کا بیان سن لیا کہ میں کس کی بیٹی ہوں۔"

شہناز گنگ ہو کر رہ گئی۔ عثمان کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا۔ "بیٹی' تم تو امریکا میں تھیں۔ تم یہاں کیسے آگئیں؟ خیریت تو ہے؟"

"یہ سب کچھ میں یہاں..... اس اجنبی اور بدخواہ عورت کے سامنے نہیں بتا سکتی" ثوبیہ نے شہناز کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری ماں ہوں' کیسی بھی سہی۔ تمہیں چاہیے میں نے" شہناز نے کہا۔

"میں نہیں مانتی۔ میری مما بھی یہی ہیں اور پاپا بھی" ثوبیہ نے عثمان کی طرف اشارہ کیا "آپ تو میرے لیے ذلت کا نشان ہیں" وہ عثمان سے مخاطب ہوگئی "پاپا' آپ بھی جائیں' میں آپ سے کٹنے کو بے تاب ہوں۔"

عثمان نے محبت سے اسے دیکھا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ لگتا تھا' وہ کسی بھی لمحے ڈھے جائے گی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ پوری جان سے لرز رہی تھی اور اس کے رخساروں کو بار بار چوم رہی تھی "پاپا..... آپ میرے پاپا ہیں نا..... آپ میری مما ہیں نا..... میرے پاپا..... میرے پیارے پاپا....."

"ہاں میری گڑیا۔ میں ہی سب کچھ ہوں تمہارا۔ اور تم..... تم تو میری جان ہو۔ میرا سرمایۂ زندگی ہو تم" عثمان نے اسے سینے سے بھینچ لیا "آؤ چلیں....."

وہ اسے لپٹائے ہوئے راہ داری میں قدم بڑھانے والا تھا کہ عقب سے شہناز نے التجائیہ لہجے میں اسے پکارا "عثمان..... میری ایک بات سنو۔"

عثمان رک گیا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"اتنا کچھ تم نے مجھے دیا۔ تو ایک چیز میرے کہنے پر بھی دے دو۔"

"بولو۔"

"اس مکار کو نہ بخشنا" شہناز کے لہجے میں نفرت تھی۔ "اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا۔ اس سے پورا قرض مع سود وصول کرنا....."

"اس کے لیے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ یہ تو مجھ پر انکل کا قرض ہے اور قرض میں ضرور چکاتا ہوں" عثمان نے کہا اور ثوبیہ کو لیے آگے بڑھ گیا۔

اس نے گاڑی گھر سے نکالی تو ثوبیہ نے زبان کھولی "پاپا میں اپنے شوہر کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔"

"لیکن کیوں بیٹا؟"

"وہ وہاں جو زندگی گزار رہے ہیں' میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ وہ مجھے بیوی کی حیثیت سے رکھنا چاہیں تو پاکستان آجائیں۔ میں ایک سال ان کا انتظار کروں گی۔ ورنہ....."

"ٹھیک کیا بیٹا۔ مجھے فخر ہے کہ میری تربیت کام آئی۔ تم نے پوری خود اعتمادی سے درست فیصلہ کیا۔"

"پاپا... آپ تفصیل سنے بغیر اسے درست فیصلہ کہہ رہے ہیں۔"

"تفصیل میں گھر چل کر سن لوں گا۔ ویسے مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ تمہارا فیصلہ درست ہوگا۔ اب مجھے ڈرائیونگ پر توجہ دینے دو۔ اوکے؟"

"اوکے پاپا!"

○☆○

وہ کسی گہرے' اندھے کنوئیں میں قید تھی!

رات گزری' صبح ہوئی۔ وہ اسی خواب گاہ میں بیٹھی تھی' جس سے اس نے منفی حربوں سے عثمان کو بے دخل کیا تھا۔ ملازمہ اسے ناشتے کے لیے کہنے آئی تو اس نے اسے ڈانٹ دیا "تم جاؤ۔ میں

داخلے کے لئے خط لکھیں

خواتین وحضرات! ہم بذریعہ ڈاک

- انگلش لینگویج • پینٹنگ • فلاور میکنگ
- بیوٹیشن • نیچرل بیوٹی • انٹیریئر ڈیکوریشن
- لیڈیز ٹیلرنگ • کوکنگ بیکنگ
- مہر سازی • فوٹوگرافی • کمرشل آرٹ
- ریفریجریشن • میڈیکل ایڈ • اسکول ٹیچنگ

اور ریڈیو ٹی وی پر اردو میں باتصویر لیکچرز وکتب کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ داخلے کیلئے تفصیلات جوابی لفافے سے منگائیں۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

اسلام آباد اکیڈمی

۲۵۱ سیکٹر آئی۔ ٹین۔ ون، اسلام آباد

ناشتا نہیں کروں گی۔ چلی جاؤ۔"

"بیگم صاحبہ' دوپہر کے کھانے پر کیا پکاؤں؟"

"جو جی چاہے' پکالو۔ دن میں بھی اور رات کو بھی۔ مگر خبردار مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں خود طلب کرلوں گی۔"

اس کے پاس ایک ہی کام تھا۔ وہ ماضی کے ایک ایک لمحے کو ٹٹولتی رہی۔ یہ عمل ایسا تھا' جیسے کوئی برسوں سے زمین پر پڑے پتھروں کو الٹ کر دیکھے تو کہیں سے کوئی کن کھجورا نکلے اور کہیں سے کوئی اور کیڑا۔ وہ اب سب کچھ سمجھ لینا چاہتی تھی۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دن گزر گیا۔ شام ہوگئی۔ پھر سورج بھی ڈوب گیا۔ کمرے میں اندھیرا ہوگیا۔ بہت دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ اندھیرے میں بیٹھی ہے۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر لائٹ آن کردے مگر پھر خیال آیا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے' دیکھنا چاہ رہی ہے' اس کے لیے تو اندھیرا ہی ضروری ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ وقت دیکھ ہی لے۔ اس نے کلائی کو ٹٹولا۔ اس پر گھڑی نہیں تھی۔ وہ اندازے سے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی۔ اس نے دراز کھولی۔ گھڑی فوراً ہی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے گھڑی کو کلائی پر باندھا۔ چمک دار سوئیوں نے اسے وقت بتادیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

وہ اپنے ماضی سے گزرتی رہی۔ ماضی کو اپنے اوپر گزارتی رہی۔ خود کو ٹٹولتی رہی۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتی رہی' جو پہلے نہیں سلجھی تھیں۔

صبح کا اجالا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ سب کچھ سمجھ میں آیا تو اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ارے یہ کیا.... یہ کیسا زیاں ہے کہ کوئی تلافی بھی ممکن نہیں۔ میں سمجھتی رہی کہ پا رہی ہوں۔ حالانکہ میں سب کچھ کھوئے جارہی تھی۔ اب کیا ہوگا؟

اس نے اپنا' مشکور کا اور عثمان کا ہر روپ دیکھ لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ درحقیقت اسے عثمان سے محبت تھی۔ بس وہ سمجھ نہیں سکی۔ اس لیے نہیں سمجھ سکی کہ وہ ایک فریب میں مبتلا تھی۔ مشکور کی محبت کے فریب میں۔ اور عورت کا ذہن یہ کبھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ دو مردوں سے محبت کرتی ہے۔ مشکور کی محبت کے فریب نے اسے کبھی عثمان کی محبت کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا بلکہ اس محبت پر نفرت کا نقاب ڈال دیا۔ اس محبت کی علامتیں کئی بار ظاہر ہوئیں لیکن شعور تک نہ پہنچ سکیں۔ اب وہ جان گئی تھی کہ عثمان نے اس کے دل کو اسی لمحے فتح کرلیا تھا' جب سہاگ رات کو اسے وہ تاج محل دیا تھا۔

اب وہ دونوں مردوں کو دیکھ سکتی تھی۔ نرم خو' نرم گفتار' خوش اطوار' انا کے طلسم سے آزاد' درگزر کرنے' بے پناہ برداشت کرنے والا عثمان مثالی مرد تھا۔ اور مشکور.... وہ بہت گھٹیا آدمی تھا اور وہ خود ایک ناسمجھ بچی تھی' جو خود کو عقلِ کل سمجھ بیٹھی تھی۔

اس نے کیا کیا؟ کیا پایا' کیا کھویا؟ ان میں سے ہر جواب عذاب ہر نفس کا نقیب تھا۔ اس نے برا کیا۔ خود غرضی کے ہاتھوں لٹی۔ محبت کی تذلیل کی۔ اپنے وجود کو گالی بنادیا۔ اپنے لیے کہیں کچھ اچھا نہیں چھوڑا۔ صرف برائی ہی برائی.... دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس نے ذلتیں پائیں۔ اپنی نظر میں' اپنے شوہر کی نظر میں... اپنے بچوں کی نظر میں.... اور سب سے بڑھ کر اللہ کی نظر میں۔ اور اس نے سب کچھ کھو دیا۔ شبنم کے قطرے سے پاک محبت۔ اپنا شوہر' اپنے بچے' اپنی عاقبت۔ اسے ملا کیا۔ اس کی بیٹی نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ عقل مند ثابت ہوئی۔ اس نے عثمان کی محبت کو پہچان لیا۔ ماں کو چھوڑ دیا۔ اب وہ.... شہناز اکیلی ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ مرتے دم تک تنہا رہے گی۔

اس نے سوچا' خود کو ختم کرلے۔ ایسے کوئی جیا جاسکتا ہے۔ لیکن دماغ نے یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یوں آخرت کا بوجھ بڑھانے سے فائدہ؟ بہتر ہے' سزا جیتے جی سہہ لی جائے۔ توبہ بھی کرے۔ وہ تو بخشنے والا ہے۔ بس دل ندامت سے پانی پانی ہوکر بہہ نکلے اور اس حالت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر ایک بات اور ہے۔ اب اسے کچھ مل تو نہیں سکتا لیکن اب وہ باقی زندگی کے ہر لمحے عثمان سے محبت تو کرسکتی ہے۔ یہ بھی تو قرض ہے اس پر۔ اس محبت کا تو لطف ہی کچھ اور ہوگا۔

اس نے اداس نظروں سے سونے اسٹینڈ کو دیکھا' جس پر کبھی وہ جگمگاتا تاج محل رکھا تھا' جو عثمان کی محبت کی علامت تھا۔ اب وہ خالی اسٹینڈ اس کی نفرت کی علامت بن گیا تھا۔ وہ اس کے ایک جرم کی یادگار تھا اب۔ وہ جرم جو اس نے سچی محبت جیسی نعمتِ عظمیٰ کو ٹھکرا کر کیا تھا۔

اب یہ پچھتاوے' یہ عذاب عمر بھر کے تھے۔ اور عثمان نے اسے درازیٔ عمر کی دعا بھی دی تھی....

اسی لمحے کسی نے.... عثمان نے جیسے اس کے کان میں کہا۔ آئی لو یو.... اور پھر اس رومانوی سرگوشی کو دہراتا گیا۔ شہناز نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی اور اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کو چوم لیا "تھینک یو.... تھینک یو ویری مچ۔ میں تمہاری مستحق نہیں تھی" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "لیکن تم مجھے مل گئیں۔ اب تم ہر روز ماضی کی یہ محبت بھری آواز مجھے سناتی رہنا۔"

اس نے گھڑی کو دل سے لگالیا "آئی لو یو.... آئی ٹرولی لو یو۔ میں تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں کروں گی۔ تمہی تو ہر شبِ اضطراب کی صبحِ تلافی ہو۔"

گھڑی خاموش ہوگئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب یہی اس کا مقدر تھا!

تیسرا رنگ

جرم کے ساتھ

علیم الحق حقی

گھر جنت بھی ہوتے ہیں ـــــ جب تک اُن کی فضا میں یقین اور اعتماد کی سکون بخش ٹھنڈک رچی ہو ـــــ اور چوکھٹ سے شک کے سائے رینگتے ہوئے گھر میں چلے آئیں تو وہی جہنم بھی بن جاتے ہیں ـــــ اور انسان کے لیے انسان ہی سب سے اچھا گھر بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی اُجلے اور روشن گھروں کی کہانی ہے، جن میں شک کی مکڑیوں نے جالے بُن دیے تھے، جہاں عدم یقین اور بے اعتمادی نے محبت کا خون کر دیا تھا۔

ڈاک کے گمشدہ تھیلے سے بارہ سال بعد برآمد ہونے والے خط کا شاخسانہ

از راہِ کرم اس کہانی میں سرورق تلاش کرنے کے بجائے اسے محسوس کرنے کی کوشش کیجیے

اس ماہ کے سرورق پر ایک پُرتجسس اور سنسنی خیز کہانی

نام تھا اُس کا نواب خان... اور وہ نام ہی کا نواب تھا۔ تنخواہ کے نام پر اُسے صرف تین سو روپے ملتے تھے۔

وہ گزشتہ پچیس سال سے محکمۂ ڈاک میں ملازم تھا۔ اِس عرصے میں اُس نے دیانت کے حوالے سے نیک نامی کے سوا کچھ نہیں کمایا تھا۔ کوئٹہ شہر کے باہر ایک گاؤں میں اُس کا چھوٹا سا مکان تھا۔ وہ قناعت کی زندگی بسر کرتا آیا تھا اور اس میں خوش بھی تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے زندگی اُس سے سچ مچ کا نواب ہونے کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ جبکہ وہ نام کا نواب تھا۔

اُس نے اپنی اسکیم کا باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا... بار ہا۔ اُسے اپنے منصوبے میں ایک ہی کمی نظر آئی تھی۔ برف باری۔ برف باری کے بغیر بات نہیں بنتی تھی اور برف باری پر اُس کا اختیار نہیں تھا۔

تیئس دسمبر ۱۹۷۶ء کی اُس صبح اُس کی آنکھ کھلی تو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ غصیلا سیاہ آسمان زمین پر روئی کے گالوں جیسی برف برسا رہا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ خوش ہو گیا۔ یہی وہ دن تھا جس کا وہ عرصے سے منتظر تھا۔

آمنہ غسل خانے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوئی۔ رونے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ نواب اُس کے رونے کی وجہ سے بخوبی واقف تھا۔ آمنہ چند لمحے خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "اُٹھ جاؤ۔ چھ بج رہے ہیں۔"

"میں اُٹھ چکا ہوں آمنہ۔" اُس نے جواب دیا۔

آمنہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ نواب بستر میں لیٹا اُن کاموں کے بارے میں سوچتا رہا جو اُسے آج نمٹانا تھے۔ اُسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ پچیس سال کی کمائی صرف ایک لمحے میں لُٹانے جا رہا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اپنے طور پر وہ دس پندرہ ہزار کی رقم کا بندوبست کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنی حیثیت سے زیادہ مقروض ہو چکا تھا۔

جن معلومات کی بنیاد پر وہ آج اپنی دیانت کے دامن پر داغ لگانے والا تھا اُنتی نہیں تھیں۔ وہ پچیس سال سے ڈاک بانٹنے کا کام کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ علاقے کے لوگ سادہ لوح ہیں۔ لفافے میں نقد رقم رکھ کر بھیجتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتے۔ جو ذرا عقل مند ہیں وہ پوسٹل آرڈرز بنواتے ہیں۔ جو بہت عقل مند ہیں وہ بینک ڈرافٹ بنواتے ہیں۔ سہراب خان نے اُس سے کہا تھا۔ "تم ایسے لفافے مجھے لا دو۔ ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر کیش کرانا میرا دردِ سر ہے۔ منافع آدھا آدھا ہو گا۔" یہ بات سہراب خان گزشتہ دس سال سے کہے جا رہا تھا۔ اُس نے دوسرے پوسٹ مینوں کے حوالے دیے تھے مگر دیانت دار نواب خان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ تو وقت وقت کی بات ہے کہ نواب خان بھی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ اُس کے لیے کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتا تھا لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہتا تھا۔

وہ کچھ عرصے سے کام کے لفافے ڈاک کے ایک خالی تھیلے میں ڈالتا جا رہا تھا۔ باقاعدہ چھانٹی کرنے کا تو اُسے موقع نہیں ملتا تھا مگر اس سے کچھ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ الگ کیے جانے والے لفافوں میں غیر متعلق لفافے کم ہی ہوں گے۔ اس بات کا اُسے یقین تھا۔ اگر اسے یک مشت بڑی رقم کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ہر روز دو چار لفافے غائب کر کے کام چلا لیتا۔ مگر یک مشت بڑی رقم کے لیے خطرہ مول لینا ناگزیر تھا۔

وہ غسل خانے سے تیار ہو کر نکلا تو گلریز کے کھانسنے کی آواز اُس کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔ وہ کشاں کشاں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا جہاں گلریز آمنہ کے ساتھ سوتا تھا۔ اُس نے جھانک کر دیکھا۔ گلریز کا معصوم چہرہ پسینے میں تر بتر ہا تھا۔ وہ اندر گیا۔ اُس نے گلریز کی پیشانی چھوئی اور پھر چادر سے اُس کا چہرہ پونچھ ڈالا۔ گلریز نے آنکھیں کھول کر اُسے سلام کیا۔ اُس نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے بیٹے؟"

"ٹھیک نہیں ہے بابا۔"

"تکلیف اب بھی ہو رہی ہے؟" نواب نے پوچھا۔ گلریز نے اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی ڈاکٹر میر آئیں گے اور تمہیں دوا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے بابا۔" گلریز نے خود کار انداز میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں ہوا تھا۔ "آپ مجھے کراچی بھیجیں گے بابا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹے... ضرور بھیجوں گا۔" نواب نے کہا۔ "تم وہاں کم از کم چھ مہینے رہو گے... انشاء اللہ۔"

گلریز کے ماتھے پر پھر پسینہ پھوٹ پڑا۔ ساتھ ہی کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کے باوجود بھی وہ کراچی کے تصور پر مسکرانے کی کوشش کرتا رہا۔

"سونے کی کوشش کرو بیٹے۔" نواب نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں کام پر جا رہا ہوں۔"

"خدا حافظ ابو۔" گلریز نے کہا مگر اُس کی آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں۔

اپنے کمرے میں آ کر نواب نے ناشتا زہر مار کیا۔ گلریز کو دیکھنے، اُس کی کھانسی سننے کے بعد اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا، ساری دنیا کو آگ لگا دے تاکہ اُس کے بیٹے کے دم توڑتے پھیپھڑوں کو کچھ حرارت میسر آئے۔ ڈاکٹر میر نے کہا تھا۔ "کم از کم سردیوں کے موسم میں اسے کسی گرم مقام پر بھیجنا ضروری ہے۔ اس کے پھیپھڑے سخت سردی برداشت نہیں کر سکتے اور ہاں... جانے سے پہلے اس کا آپریشن بھی ضروری ہے..." ڈاکٹر کا کام تو مشورہ دینا تھا۔ اُسے نواب خان کے مسائل سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ آپریشن کے اخراجات اور پھر کراچی... کراچی میں اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ رشتے دار۔ اُس کا اندازہ تھا کہ دونوں کاموں کے لیے دس پندرہ ہزار روپے کا جیب میں ہونا ضروری ہے۔ جبکہ حالت یہ تھی کہ

قرض کی ادائیگی ہی مصیبت ہو رہی تھی۔

"تم رات کو دیر سے آؤ گے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"ہاں... آج میں ڈاک کی گاڑی پر ہوں گا۔ شاید گیارہ بج جائیں۔"

برابر والے کمرے سے کھانسی کی سمع خراش آواز آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر آمنہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوگا... پیسہ کہاں سے آئے گا؟ میرا بچہ!" وہ رو دی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نواب نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"کیسے ہو جائے گا۔ اب تو کوئی تمہیں قرض بھی نہیں دے گا۔"

"یہ تمہارا نہیں میرا دردِ سر ہے۔ میں نے کہا نا میں رقم کا بندوبست کروں گا۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا اور اُٹھ کر یونیفارم کا کوٹ اور اوور کوٹ پہنا۔ پھر وہ کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ کوٹھری سے اُس نے ترپال کا خالی تھیلا نکالا اور اُسے تہ کر کے اپنے اوور کوٹ میں چھپا لیا۔ اس کے منصوبے میں اس تھیلے کی بہت اہمیت تھی۔

بس اسٹاپ پر پہنچ کر وہ شہر جانے والی جی ٹی ایس کی بس میں سوار ہو گیا۔ اُس نے بائیں جانب والی کھڑکی کے ساتھ والی نشست پکڑ لی۔ بس میں اس کے کئی شناسا موجود تھے۔ اُن سے سلام دعا ہوئی۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس مخصوص نشست پر بیٹھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ دو منٹ بعد بس ایک پُلیا پر سے گزرتی۔ اس پُلیا کے پاس ایک نشیبی جگہ تھی جسے اُس نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ اس جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا مگر اس روز بس نے پُلیا تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگائے۔ برف باری کی وجہ سے ڈرائیور بس آہستہ چلانے پر مجبور تھا۔ منتخب مقام کو دیکھتے ہوئے نواب کا ہاتھ بے ارادہ اوور کوٹ پر پہنچ گیا تاکہ اوور کوٹ کے نیچے ترپال کے تھیلے کی موجودگی کو محسوس کر سکے۔

"یہ دیکھا تم نے نواب خان؟"

اُس نے چونک کر دیکھا۔ کانسٹیبل نور محمد اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا اخبار لہرا رہا تھا۔ "سزائے موت سے بچ گیا۔"

"کون بچ گیا؟" نواب خان نے خالی خالی نظروں سے نور محمد کو دیکھا۔

"خود دیکھ لو یار۔" نور محمد نے اخبار اُس کی طرف بڑھا دیا۔

نواب نے اخبار پر نظر ڈالی۔ سُرخی تھی... ایوب سزائے موت سے بچ گیا۔ خبر کے ساتھ ہی ایوب اور اُس کی بیوی کی تصویر بھی تھی۔ تصویر میں ایوب خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ خبر کے مطابق وہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ اُس نے ایک رات کمپنی کے کیشیئر کو قتل کر کے پچھتر ہزار روپے نقد اور تیس ہزار مالیت کے چیک اُڑا لیے تھے۔ پھر وہ پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ سزا بھی سنا دی گئی مگر لاکھ کوشش کے باوجود پولیس رقم برآمد نہیں کرا سکی۔

"خدا جانے اُس نے رقم کہاں چھپائی ہوگی۔" کانسٹیبل نور محمد نے کہا۔

"پچھتر ہزار روپے کم تو نہیں ہوتے۔"

"واقعی... بہت ہوتے ہیں۔" نواب خان نے دل ہی دل میں کہا۔ "اتنی بڑی رقم تو میرے گلریز کے جینے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔" پھر اُس نے نور محمد سے پوچھا۔ "پولیس ایوب سے نہیں اگلوا سکی؟"

"ہاں۔ یہی تو کمال ہے اس ایوب کا۔" نور محمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کہتا ہے نہ میں نے قتل کیا ہے نہ رقم چرائی ہے۔ میں کہتا ہوں وہ بہت بے وقوف آدمی ہے۔ ایسی رقم کس کام کی جس کے لیے آدمی اپنی پوری عمر جیل میں گزار دے۔"

نواب خان کا بس اسٹاپ آ چکا تھا۔ نواب خان جھرجھری لے کر اُٹھا اور بس سے اُتر آیا۔ اُس نے سڑک پار کی اور پوسٹ آفس کی طرف بڑھ گیا۔

دو گھنٹے بعد وہ ڈاک لے جانے والی گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھا تھا۔ اگلے حصے میں اُس کا نائب نادر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ برف باری اب بھی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا رات تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ گاڑی کا روٹ ایسا تھا کہ نواب خان کا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔

حسبِ توقع سڑک سنسان تھی۔ اکا دکا راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نواب خان نے ڈاک کے تھیلے گنے۔ سرکاری طور پر اُن کی تعداد بارہ تھی۔ تیرھواں اضافی تھیلا۔ یہ وہ تھیلا تھا جس میں نواب خان مال والے لفافے جمع کرتا رہا تھا۔ تمام تھیلے مقفل تھے۔ نواب خان نے اوور کوٹ کے نیچے سے ترپال کا تھیلا نکالا اور تیرھواں اضافی تھیلا اس میں ڈال کر اُس کا مُنہ ڈوری سے باندھ دیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ترپال کے تھیلے میں کیا ہے۔ ایسے تھیلے عموماً کاٹھ کباڑ کوڑا رکھ کر پھینکنے کے کام آتے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اوّل تو تھیلا گرائے جانے کے بعد برف میں دھنسے گا اور پھر مزید برف باری اُسے ڈھانپ دے گی اور اگر کسی کی نظر پڑی بھی تو وہ کوڑے کے تھیلے کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ رات کو واپسی پر وہ برف ہٹا کر تھیلا نکالے گا اور گھر لے جائے گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ درحقیقت وہ ڈاک کا تھیلا ہے۔

پُلیا قریب آ رہی تھی۔ اُس نے عقبی دروازہ کھولا اور ترپال کا تھیلا کنارے پر رکھ لیا۔ طے شدہ مقام پر پہنچتے ہی اُس نے تھیلا گرا دیا۔ تھیلا ایک ملگجے کو نشیب میں لڑھکتا نظر آیا... پھر برف کی دبیز چادر نے اُسے ڈھانپ لیا۔

❀❀

شمیم اور نسیم کی عمریں بالترتیب گیارہ اور نو سال تھیں۔ اُن کے والد بڑے افسر تھے اور ان دنوں کسی کام سے کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکے ضد کر کے اُن کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اُن کا قیام ایک گاؤں کے قریب سرکاری ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ تیئس دسمبر کو انھوں نے برف باری ہوتے دیکھی تو انھیں سیر کی سوجھی۔ چوکیدار نے انھیں سمجھایا کہ برف باری

کے بعد بہت سرد تیز ہوا چلتی ہے۔ لڑکوں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ دور نہیں جائیں گے۔ صاحب کے بچے تھے۔ چوکیدار کا اُن پر کوئی زور نہیں تھا چنانچہ وہ انھیں نہ روک سکا۔ ویسے بھی وہ جانتا تھا کہ برف باری کم از کم رات تک جاری رہے گی۔ سرد ہوا صبح ہوتے ہی چلے گی۔

لڑکے ٹہلتے ہوئے پکیا کی طرف چل دیئے جو ریسٹ ہاؤس سے آدھا میل دور تھی۔ سڑک پر انھیں ڈاک کی گاڑی جاتی دکھائی دی پھر گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور اُس میں سے ایک تھیلا لڑھکتا دکھائی دیا۔ وہ خود بھی اُسی طرف جا رہے تھے، چنانچہ لپک کر تھیلے کے پاس جا پہنچے۔

تھیلا راستے ہی میں گرا تھا۔ انھوں نے مل جل کر اُسے دھکیلا اور راستے سے ہٹا دیا۔ مگر اس کوشش میں دونوں ہانپ گئے تھے۔ تھیلا بہت وزنی تھا۔

"اتنا وزنی کیوں ہے یہ؟" نسیم نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کھول کر دیکھنا پڑے گا۔" شمیم نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور وہ ڈوری کاٹ دی جس سے تھیلے کا منہ بندھا ہوا تھا۔ دونوں نے بڑے بے صبرے پن سے تھیلے کا منہ کھولا اور اندر جھانکا۔ اندر کینوس کا گہرے سبز رنگ کا ایک اور تھیلا تھا۔ انھوں نے وہ تھیلا برآمد کیا لیکن وہ مقفل تھا۔ وہ دونوں نکیلے پتھر سے قفل پر ٹوٹ پڑے لیکن اس قفل کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ شمیم نے تھیلے کو چاقو سے کاٹنے کی کوشش کی مگر یہ بھی بے سود ثابت ہوا۔

"اب کیا ہوگا؟ کیسے پتا چلے گا کہ اس کے اندر کیا ہے؟" نسیم نے مایوسی سے کہا۔ تجسس اُسے کچھ کرنے پر اُکسا رہا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

"ہم اسے کمنڈر میں لے چلتے ہیں۔ اسے بھوسے کی کوٹھری پر چھپا دیں گے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ کل تھوڑا اور چھٹی لا کر اسے کاٹ ڈالیں گے۔" شمیم نے تجویز پیش کی۔

وہ جسے کمنڈر کہہ رہے تھے، درحقیقت ایک متروک کھلیان تھا۔ اب تک انھوں نے کسی کو اُس طرف جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کھلیان کے عقب میں بے حد مہیب ڈھلوان تھی۔ گہری کھائی! دونوں بھائی اُسے دھکیلتے ہوئے کھلیان کی طرف لے چلے۔ راستے میں کئی بار انھیں سانس درست کرنے کے لیے رکنا پڑا۔ کھلیان پہنچ کر انھوں نے چوبی سیڑھی کو ٹھوکر کی دیوار سے لگائی۔ لیکن تھیلا چھت تک پہنچانے میں انھیں دانتوں پسینہ آگیا۔ جیسے تیسے انھوں نے تھیلا اوپر پہنچایا اور اسے لکڑی کے تختوں کی اُس دیوار کی طرف دھکیلنے لگے، جو غالباً چھت کے مقبی حصے میں احتیاطاً لگائی گئی تھی۔ اس سمت نشیب تھا اور بے خیالی میں کوئی نیچے بھی گر سکتا تھا۔ دونوں جھنجلائے ہوئے تھے۔ لہٰذا پوری قوت صرف کر رہے تھے۔

"اچانک تھیلا لڑھکا اور پوری قوت سے چوبی تختوں سے ٹکرایا۔ لکڑی چٹخنے کی آواز گونجی اور تھیلا دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ دونوں بھائی سہمی ہوئی نظروں سے چوبی دیوار کے خلا کو دیکھتے رہے۔ انھیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ لکڑی کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ انھوں نے ہمت کر کے... آگے بڑھ کے کھائی میں جھانکا۔ انھیں چکر آ گئے۔ تھیلا نظر آنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مقام شکر یہ تھا کہ وہ خود تھیلے کے ساتھ نیچے نہیں جا گرے ورنہ ہڈیوں کا سُرمہ بن جاتا۔ کھائی میں جھانکنے کے بعد وہ اور سہم گئے۔

تھیلا اب اُن کی پہنچ سے دور تھا۔ لڑکپن کا تجسس بے حد قوی ہونے کے باوجود خوف تلے دب گیا۔ وہ خاموشی سے کھلیان سے نکل آئے۔

چار دن بعد وہ باپ کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہوئے تو انھیں وہ تھیلا یاد بھی نہیں تھا۔

❀❀

چودہ جون ۱۹۸۸ء کو کوئٹہ کے جی پی او میں اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں کا ازدحام تھا۔ بارہ سال پرانے ڈاک کے تھیلے کی دستیابی کی اطلاع انھیں وہاں کھینچ لائی تھی۔ سبھی کو اُمید تھی کہ اس تھیلے کے حوالے سے کوئی چٹ پٹی خبر ضرور ملے گی۔

تھیلا جی پی او کے احاطے میں ایک میز پر رکھا تھا۔ تھیلا سخت ہو گیا تھا اور بعض جگہوں سے پٹخ رہا تھا۔ اُس کا قفل کھول دیا گیا تھا۔ تھیلے کے قریب پوسٹ ماسٹر کھڑا تھا۔ اُس کے پہلو میں ایک پوسٹل انسپکٹر بھی موجود تھا۔ پوسٹ ماسٹر نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر چند خطوط نکالے۔ اک کے ساتھ ہی خیش بلبوں کے جلے ہوئے۔ اور پھر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ پوسٹ ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا: "حضرات... بیک وقت سب کے سوالوں کے جواب میں نہیں دے سکتا۔ ایک ایک کر کے... ذرا تحمل سے..."

"یہ تھیلا کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوا؟" ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔

"کوئٹہ اور ہنہ باغ کے درمیان تعمیراتی سروے ہو رہا ہے۔ تعمیراتی ٹیم کے ایک رکن کو وہاں یہ تھیلا پڑا ملا۔" پوسٹ ماسٹر نے بتایا۔

"یہ تھیلا وہاں کیسے پہنچا ہوگا؟" دوسرے اخباری نمائندے نے سوال کیا۔

"امکان تو یہی ہے کہ ڈاک کی کسی گاڑی سے گرا ہوگا۔ جس جگہ یہ ملا ہے وہ سڑک سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس تھیلے میں دسمبر ۱۹۷۶ء کے خطوط ہیں۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تھیلا دانستہ گرایا گیا ہو؟" ایک اور صحافی نے دریافت کیا۔

"میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں۔" پوسٹ ماسٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ یہ تھیلا ہمیں ملتا ہی نہیں۔ بہرحال ہم نے تفتیش کی ہے کہ تئیس دسمبر ۱۹۷۶ء کو ڈاک کی گاڑی پر انچارج کون تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی

کیونکہ اُس روز اچانک نواب خان تھا۔ پچیس سالہ ملازمت کے دوران نواب خان کا ریکارڈ بے داغ تھا۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ یہ تھیلا نواب خان کے گاؤں کے قریب ہی ملا ہے۔ ہم نے نواب خان سے رابطے کی کوشش کی مگر نواب خان کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ انتقال چھ جنوری ۱۹۸۸ء کو ہوا۔ یعنی تھیلے کی گمشدگی کے دو ہفتے بعد۔ یہ بھی سن لیں کہ نواب خان نے خودکشی کی تھی۔ اُس کی بیوی نے بتایا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی مہلک بیماری کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اُس کا بیٹا پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا تھا۔ بیٹا، باپ کی خودکشی سے چار دن پہلے فوت ہوا۔ بے چاری آمنہ پر پے در پے قیامتیں ٹوٹیں۔ پہلے بیٹا اور پھر شوہر۔ بہرحال ہم تفتیش جاری رکھیں گے۔ ممکن ہے یہ معما حل ہو جائے۔"

"ان خطوط کا کیا بنے گا؟" ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

"ہم انھیں ڈیلیور کر دیں گے۔ اخبارات کے ذریعے کافی تشہیر ہو چکی ہوگی، لہٰذا تاخیر کے سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تاہم ہم ہر لفافے پر... 'تاخیر سے ترسیل پر ہم معذرت خواہ ہیں...' کی مہر ضرور لگا دیں گے۔" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ اُس نے دانستہ رپورٹروں کو یہ نہیں بتایا کہ تھیلے میں موجود زیادہ تر لفافوں میں پوسٹل آرڈر زیا بینک ڈرافٹس ہیں۔ وہ اپنے محکمے کے ایک دیانت دار مرحوم کارکن کو تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

رپورٹرز نے لفافوں پر تحریر پتے دیکھنے چاہے تو اُس نے انھیں چند ایسے لفافے تھما دیئے جن کے اندر محض خط تھے۔ رپورٹروں نے پتے نوٹ کیے۔ اُن میں سے ہر ایک یہی توقع کر رہا تھا کہ اتنی تاخیر سے پہنچنے والے خطوط عجیب اور ممکنہ حد تک کسی دھماکا خیز کہانی کو ضرور جنم دیں گے۔ بروقت خط نہ ملنے سے لوگوں کی زندگی میں ڈرامائی تبدیلیاں بھی آسکتی ہیں، ایسے بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اپنے محبوب کی آمد کا خط نہ ملنے کی بنا پر خودکشی کر لی ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا...

❀❀

سولہ جون ۱۹۸۸ء کی صبح ساجدہ بشیر بیدار ہوئی تو اُس کا موڈ بے حد خوش گوار تھا۔ اُس نے بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بنگلے کے وسیع و عریض لان میں لہلہاتی ہوئی سرسبز گھاس آنکھوں کو فرحت بخش رہی تھی۔ فضا میں عجیب سی مہک تھی۔

بشیر سے اُس کی شادی کو پچیس برس ہو چکے تھے مگر اُن کے درمیان اب بھی ویسی ہی محبت تھی۔ بلکہ اب تو محبت اور بڑھ گئی تھی۔ ساجدہ اکثر یہ سوچ کر دہل جاتی کہ اگر خدانخواستہ بشیر کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی نہیں جی سکے گی۔ بشیر کے بغیر جینے کا تصور ہی اُس کے لیے محال تھا۔

پچیس سال پہلے جب اُن کی شادی ہوئی تو بشیر کوئی صاحب حیثیت آدمی نہیں تھا۔ وہ تو بس معمولی سا ایک کلرک تھا۔ ساجدہ اُس کے ساتھ بڑے کٹھن حالات سے گزری تھی مگر اُس کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی تھی۔ پھر نذیر اور شاہدہ کی پیدائش کے بعد تنگ دستی اور بڑھ گئی تھی۔ اس حد تک کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا گزارا کیسے ہو رہا ہے۔

شادی کے تیرہ سال بعد حالات اچانک ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ بشیر کو سرمایہ کاری میں زبردست منافع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اُن کے دن پھرنے لگے۔ معاشی حالت مسلسل سدھرتی گئی۔ انھوں نے بچوں کو بہترین تعلیم دلوائی۔ نذیر اپنی خواہش کے مطابق فوج میں بھرتی ہو گیا۔ شاہدہ کی اب شادی ہونے والی تھی۔

ساجدہ نے باتھ روم سے نکل کر کچن کا رُخ کیا۔ ملازمہ نوراں ناشتے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ ساجدہ اُس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گئی۔

نوراں نے میز پر ناشتا لگایا۔ بشیر اور شاہدہ پہلے ہی آ بیٹھے تھے۔ اس وقت باپ بیٹی کے درمیان ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ دیوار پر نذیر کی تصویر آویزاں تھیں۔ اس تصویر میں وہ لیفٹیننٹ کی یونیفارم پہنے، لبوں پر مسکراہٹ سجائے چمک دار آنکھوں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے درحقیقت اُن کے درمیان موجود ہو اور اُن کی گفتگو سن رہا ہو۔ ساجدہ نے بشیر اور شاہدہ کو ہنستے بولتے دیکھا، پھر بیٹے کی تصویر پر نظر ڈالی اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اُس کی جنت کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ وہ جنت ہی تو تھی اُس کی...

دروازے کی طرف سے اخبار گرنے کی آواز سنائی دی۔ شاہدہ اخبار اُٹھانے چلی گئی۔ پھر وہ خبروں والا صفحہ دیکھتی ہوئی واپس آئی۔ "ابو... اخبار میں ایوب کے بارے میں خبر چھپی ہے۔ آپ یقیناً پڑھنا چاہیں گے۔ ایوب بھی تو آپ کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ اُس نے کمپنی کے کیشیئر کو قتل کر دیا تھا..."

ساجدہ نے ایوب کے تذکرے پر بغور اپنے شوہر کو دیکھا۔ بشیر کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ایوب کا نام سن کر ہمیشہ اُس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ ساجدہ اپنے حساس شوہر کے کرب کو سمجھتی تھی۔ اس کیفیت کا تعلق بارہ سال پرانے اُس واقعے سے تھا، جب بشیر کی گواہی کی وجہ سے ایوب کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

اُس روز کام کی زیادتی کی وجہ سے بشیر کو دیر تک آفس میں رُکنا پڑا تھا۔ کیشیئر کے قتل اور ڈکیتی کے بعد اُس نے رات کی تاریکی میں کسی شخص کو بلڈنگ سے نکلتے دیکھا۔ ایک پولیس والے نے اُس شخص کا تعاقب بھی کیا مگر وہ شخص بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس نے شبے کے تحت ایوب کو حراست میں لے لیا۔ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ واردات اُسی نے کی ہے۔ اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔ بشیر کی گواہی کے نتیجے میں اُس کے بچ نکلنے کا امکان بھی نہیں رہا۔ اُسے عمر قید کی سزا ہوئی۔ وہ شادی شدہ تھا... اور دو بچوں کا باپ...

کبھی کبھی بشیر کہتا... "ایوب کو میری وجہ سے سزا ہوئی ہے۔ میں

اُسے جیل بھجوانے کا ذمے دار ہوں۔ یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

ساجدہ اُس کے احساسات کو سمجھتی تھی۔ وہ اکثر اُسے مشورہ دیتی کہ ایوب کے بجائے اُس شخص کے بارے میں سوچا کرے جو ایوب کے ہاتھوں قتل ہوا تھا لیکن بشیر پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ کبھی یوں ہوتا کہ وہ بے حد خوش گوار موڈ میں ہوتا اور پھر اچانک ہی اُس کی آنکھوں میں تاریک پرچھائیاں اُتر آتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ساجدہ کو بالکل اجنبی لگتا کوئی غیر۔ حقیقت یہ تھی کہ گھر میں ایوب کا ذکر چھڑتا تو ماحول ہی بدل کر رہ جاتا۔

بشیر نے کوشش کر کے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بولا۔ "ہاں بیٹے... کیا خبر ہے؟"

"گورنر نے رحم کی اپیل مسترد کر دی ہے۔" شاہدہ نے بتایا۔

بشیر نے سگریٹ سلگایا اور سرسری انداز میں بولا۔ "یہ اُس کی دوسری اپیل تھی... اور یہ بھی مسترد ہو گئی۔ ذرا مجھے اخبار تو دکھاؤ۔"

ساجدہ اُٹھ کر بشیر کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور اُس کے کندھے پر جھک کر اخبار پڑھنے لگی۔ خبر کے مطابق ایوب کی بیوی سائرہ کو اپنے شوہر کی بے گناہی پر کامل یقین تھا اور وہ ہمہ وقت اُس کی رہائی کے لیے کوشاں رہتی تھی۔ اخبار میں وہ پتا بھی تھا جہاں وہ آج کل اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ ساجدہ کے ذہن میں برسوں پہلے شائع ہونے والی ایوب اور سائرہ کی تصویریں گھوم گئیں۔ وہ دونوں نوجوان تھے... اور بے حد خوش نظر آتے تھے۔ تازہ تصویروں میں اُن کے چہروں پر وقت کی گرد کے ساتھ مایوسی اور ناامیدی بھی تھی۔ خبر کے آخر میں لکھا تھا...

"گورنر نے کہا ہے کہ ایوب کی رحم کی اپیل پر اُس وقت تک غور نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ حکام کو اس مقام سے آگاہ نہیں کر دیتا جہاں اُس نے مسروقہ رقم چھپائی ہے۔ دوسری طرف بارہ سال سے قید ایوب کا کہنا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ مجھے بلاوجہ پھانسا گیا ہے۔ اگر میں نے جرم کیا ہوتا تو مسروقہ رقم دے کر پیچھا نہ چھڑا لیتا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو عسرت کی زندگی بسر کرتے کیوں دیکھتا۔ میں یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اصل مجرم پکڑا جائے تبھی حکام کو احساس ہو سکے گا کہ میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہوا ہے۔"

خبر پڑھنے کے بعد ساجدہ کی نظروں کے سامنے عدالت کے منظر پھر گئے۔ ایوب کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ "میں نے جرم نہیں کیا۔ میں مجرم نہیں ہوں... خدا کی قسم!" اور اُس کی بیوی سائرہ چلا رہی تھی۔ "میرا شوہر بے قصور ہے۔ اس نے جرم نہیں کیا۔" پھر اسے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا بشیر نظر آیا۔ اُس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد تھی۔ وہ ایوب اور اُس کی بیوی سے نظریں چرا رہا تھا مگر اس کی زبان پر یہی الفاظ تھے "وہ ایوب ہی تھا۔ میں نے صاف دیکھا تھا۔ وہ ایوب ہی تھا...!"

خبر پڑھنے کے بعد بشیر نے خاموشی سے اخبار میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میں جا رہا ہوں۔" اُس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ "آجاؤ... میں تمھیں مارکیٹ ڈراپ کر دوں گا۔" اُس نے ساجدہ سے کہا۔

"میں ابھی آئی۔"

ساجدہ برس اٹھا کر نکل ہی رہی تھی کہ باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ وہ باہر نکلی اور کار میں جا بیٹھی۔ یہ دیکھ کر اُسے خاصا سکون ہوا کہ بشیر کا موڈ پھر خوش گوار ہو گیا ہے۔ بشیر نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور پوچھا۔ "چلیں؟" اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بشیر نے گاڑی بڑھا دی۔

راستے میں بشیر نے کہا۔ "آج میرا سوٹ کیس پیک کر دینا۔"

"کیا... پھر کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں... کل صبح چمن جانا ہے۔ وہاں کے باغات کا کچھ معاملہ ہے۔"

"چمن!" ساجدہ نے دہرایا۔ "آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ چمن میں تمھارے کچھ باغات بھی ہیں۔"

"میں کاروباری معاملات کو گھر سے دور رکھنے کا قائل ہوں۔"

"ایسا بھی کیا۔ بیویاں اپنے شوہروں کے معاملات کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔ بیوی سے کچھ چھپانا تو نہیں چاہتا۔"

"چھپاتا تو میں بھی کچھ نہیں ہوں۔ مگر میں مردوں کے معاملات میں عورتوں کی دخل اندازی ناپسند کرتا ہوں۔ میں اُن مردوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں جو کاروباری اُمور پر بیویوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔" بشیر نے جواب دیا۔

"کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمھیں نہیں جانتی۔ میں تمھاری شخصیت کے صرف ایک رُخ سے واقف ہوں... وہ رُخ جس کا تعلق گھر اور گھریلو معاملات سے ہے۔"

بشیر ہنس دیا۔ "میری شخصیت کا سب سے پُرکشش رُخ ہے بھی یہی۔"

"مذاق مت کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کرتے کیا ہو۔ کاروبار کیا ہے تمھارا؟"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک گڈز کمپنی کا مالک ہوں۔ میرے ٹرک ملک کے ہر حصے میں مال لے جاتے اور لاتے ہیں۔ باغات کا سلسلہ علیحدہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمھیں اور بچوں کو ہر آسائش میسر ہے۔"

آسائش کے ذکر پر ساجدہ کو بیتا زمانہ یاد آ گیا۔ اُن دنوں پیسے کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ پیسے کے بارے میں گفتگو کرتے وقت اُن کا انداز مختلف ہوتا تھا۔ اُن دنوں وہ چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ بشیر کی تنخواہ بہت کم تھی۔ بہت زیادہ محنت سے اُسے عزت تو ملتی تھی مگر تنخواہ میں اضافہ کبھی نہیں ہوتا

تھا۔ ساجدہ کو یاد تھا کہ اُن دنوں بشیر کس قدر دل گرفتہ رہتا تھا۔ تنگ آکر اُس نے شیئرز خریدنے شروع کیے اور اس کے لیے ساجدہ کو اپنے زیور کی قربانی دینی پڑی۔ یہ علم ساجدہ کو بعد میں ہوا کہ بشیر کو نقصان اُٹھانا پڑا ہے لیکن بشیر حوصلہ ہارنے والا نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ رقم گنوا کر اُس نے اہم تجربہ حاصل کیا ہے۔ اب وہ منافع کما سکے گا لیکن ہوا یہ کہ منافع کے چکر میں اُس کا بال بال قرضے میں بندھ گیا پھر ایک رات وہ گھر آیا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس نے ساجدہ کو بتایا کہ پوری رقم ڈوب چکی ہے اور وہ بیس ہزار روپے کا مقروض ہے۔ ساجدہ کو خوب یاد تھا، اُس رات بشیر نے کہا تھا: اگر مجھے کہیں اتنی بڑی رقم یقینی طور پر ملنے کا امکان نظر آئے تو میں ڈاکا ڈالنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔"

وقت جیسے تیسے گزر گیا تھا۔ ساجدہ نے بشیر کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر آدمی کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ البتہ کر گزرنے کی اور بات ہے... اور بشیر ہر حال ایسا نہیں تھا۔

لیکن اُس واقعے کے چند ہی روز بعد گھر میں معجزاتی طریقے سے روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ پیسہ کسی سیلاب کی طرح چلا آرہا تھا مگر کہاں سے؟ اس سوال کا جواب ساجدہ کو کبھی نہیں ملا۔ اُس نے بشیر سے پوچھا تو ایک ہی جواب ملا: "شیئرز کے کھیل میں یہی ہوتا ہے جان۔ جاتا ہے تو جاتا ہے آتا ہے تو آتا ہے۔ میں نے کامیابی کا راز پا لیا ہے۔" ساجدہ نے مزید تفصیلات جاننے کے لیے زور دیا تو اُس نے کہا: "تم صرف خرچ کرو جان۔ پیسہ لانا میری ذمے داری ہے۔"

پھر بشیر نے اپنی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی شروع کی... اور اس کا کاروبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہ سب کچھ ساجدہ کو خواب سا محسوس ہوتا تھا۔

"چلو... اب اُتر بھی آؤ۔" بشیر کی آواز اسے حال میں کھینچ لائی۔ وہ اُترا اور بشیر کو خدا حافظ کہہ کے بازار کی طرف چل دی۔

❀❀

خریداری سے نمٹ کر ساجدہ گھر پہنچی تو شاہدہ ڈاکیے سے خط وصول کر رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اُس نے کہا: "دیکھیے امی... کتنا پرانا خط ہے۔" اُس نے ساجدہ کی طرف خط بڑھا دیا۔

ساجدہ نے لفافہ لیا اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے پر تیس دسمبر ۷۶ء کی مہر تھی۔ خط لکھنے والے کا پتا ندارد تھا۔ خط بشیر کے نام تھا اور پتا وہ تھا جس پر وہ بارہ سال پہلے رہتے تھے۔ پھر اس پتے کو کاٹ کر اس پر موجود پتا لکھا گیا تھا۔ ڈاکیے نے خط تاخیر سے آنے کے سلسلے میں وضاحت کی اور پُرتجسس نگاہوں سے کبھی ساجدہ کو اور کبھی خط کو تکنے لگا۔

ساجدہ نے لفافہ چاک کر کے خط نکال لیا۔ شاہدہ نے فخریہ لہجے میں ڈاکیے سے کہا: "ہمارے گھر میں کوئی چیز ذاتی نہیں ہوتی۔" ڈاکیا بہت پرانا تھا۔ اسی لیے شاہدہ اور نذیر اُس سے بے تکلف تھے۔

"میں اور میرا شوہر ایک دوسرے کے خط کھول لیتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس ایک دوسرے سے چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔" ساجدہ نے کہا اور خط کھول لیا۔ پھر اُس نے تیزی سے خط پڑھ ڈالا۔ لکھا تھا:

'تمہارا کہنا ہے کہ نادر کو ایوب نے قتل کیا تھا۔ تمہاری گواہی پر اُسے سزا ہو گئی۔ تم نے سب کو بے وقوف بنا دیا مگر مجھے نہیں بنا سکتے، اس لیے کہ میں نے خود تمہیں نادر کو قتل کرتے اور رقم لے جاتے دیکھا تھا۔ میری زبان بندی کی قیمت پچیس ہزار روپے ہے۔ نقد رقم پہنچانے کے لیے میں تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔ تم نہ آئے تو میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔ تم ایک بار مجھے دھتکار چکے ہو۔ اس بار میں اپنے کہے پر عمل کر گزروں گا۔

کریم بخش'

ساجدہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی لیکن اُسے احساس تھا کہ شاہدہ اور ڈاکیا اسے متوقع نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھیں دھماکے کی توقع تھی... اور خط بہت بڑا دھماکا تھا۔ مگر یہ بات اُس کے چہرے سے عیاں نہیں ہونا چاہیے۔ اُس نے بھرپور کوشش کی کہ اُس کا چہرہ بے تاثر رہے۔ خط اُس نے تہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیا۔

"کس کا خط ہے امی؟" شاہدہ سے رہا نہ گیا۔

"کریم بخش صاحب کا ہے۔" ساجدہ نے جواب دیا۔ اپنے لہجے کے سکون پر اُسے خود بھی حیرت ہونے لگی۔ "وہ تمہارے ابو کے بچپن کے دوست ہیں۔ وہ ایک دن کے لیے کوئٹہ آرہے تھے۔ انھوں نے تمہارے ابو سے روبی ہوٹل میں ملاقات کے لیے لکھا تھا۔ اب تو انھیں آ کر گئے ہوئے بھی بارہ سال کے قریب ہو گئے۔"

شاہدہ اور ڈاکیا کچھ سمجھ کر رہ گئے۔ انھیں دھماکے کی توقع تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکیا سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ ساجدہ شاہدہ کے ساتھ گھر میں چلی آئی۔

ساجدہ کے دل و دماغ میں طوفان سا برپا تھا مگر اُس کا چہرہ کسی چٹان کی طرح بے تاثر تھا۔ وہ کچھ دیر کچن کے کاموں میں مصروف رہی، پھر ٹہلتی ہوئی باغیچے کی طرف نکل گئی اور مالی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ خود کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس خط کو ایک بھیانک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ کریم بخش کا نام اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ یہ نام اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اُس نے یہ نام سنا ضرور تھا۔ کہاں؟ یہ اُسے یاد نہیں آرہا تھا۔

مالی سے گفتگو کر کے وہ پلٹی تو اُس کے ذہن پر اچانک ہی خیالات کی یلغار ہو گئی۔ اُسے ایوب یاد آیا جو عدالت میں اپنی بے گناہی کے لیے چلا رہا تھا۔ اُس کی بیوی یاد آئی جو عدالت میں اپنی ننھی بچی کو گود میں لیے

چیخ رہی تھی کہ اُس کا شوہر بے قصور ہے۔ سب سے بڑھ کر بشیر کا رویہ تھا جو گواہی دیتے وقت واضح طور پر ایوب اور اُس کی بیوی سے نظریں چرا رہا تھا۔ "میرے خدا! میں کیا کروں؟" اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اُسے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کا شوہر مجرم... قاتل بھی ہو سکتا ہے لیکن ہر چیز اُس کے خلاف جا رہی تھی۔ ہر چیز بشیر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ دفتر فون کر کے بشیر کو خط کے بارے میں بتا دے۔ بشیر یقیناً کوئی وضاحت کرے گا کہ وہ بے قصور ہے۔

دفتر سے پتا چلا کہ بشیر کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ ساجدہ نے ریسیور رکھا اور دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہنے لگی۔ اُسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ایسی باتیں فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔

وہ صرف ایک بات سے خوف زدہ تھی۔ اگر یہ سب کچھ سچ ثابت ہوا تو؟ اس سے آگے سوچنے کی اُس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ تھک ہار کر اُس نے خود کو مصروف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خود کو خیالات کی یلغار سے بچانے کی یہی ایک صورت تھی۔ اُس نے حسبِ ہدایت بشیر کا سوٹ کیس پیک کرنا شروع کر دیا۔

شام کو اے شاہدہ کے لیے جو زیورات بننے کو دیے تھے، وہ لانا تھے۔ یہ بات گزشتہ رات طے پا چکی تھی کہ بشیر دفتر سے واپس آتے ہوئے بازار سے اُسے ساتھ ہی لے آئے گا۔ جیسے تیسے اُس نے وقت گزاری کی۔ شام کے وقت اُس نے رکشا پکڑا اور صراف کی دکان پر پہنچ گئی۔ زیورات وصول کرنے کے بعد وہ دکان میں رکی رہی۔ بالآخر اُسے دکان کے باہر بشیر کی کار رکی دکھائی دی۔ پھر بشیر نے ہارن دیا۔ وہ باہر نکل آئی۔ بشیر نے زیورات کے ڈبے لے کر عقبی نشست پر رکھے۔ وہ خود اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

"دن کیسا گزرا؟" ساجدہ نے پوچھا۔

"مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ آج میں بہت تھک گیا ہوں۔" بشیر نے کہا پھر پوچھا "تم سناؤ۔ کوئی اہم ڈاک؟"

یہ ہر روز کا معمول تھا۔ بشیر گھر پہنچتے ہی یہ سوال کرتا تھا۔ آج کیونکہ وہ باہر ملے تھے، اس لیے بشیر نے یہ سوال کار چلاتے ہوئے کر لیا۔ ساجدہ نے سوچا اس وقت بشیر بہت تھکا ہوا ہے۔ کھانے کے بعد اس خط کا تذکرہ کروں گی۔ "کوئی نہیں۔ بس ایک خط آیا ہے، میری سہیلی کا۔" پھر اسے خیال آیا کہ خط بشیر کو دکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چپکے سے پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ ترغیب بہت قوی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کر نہیں سکے گی۔ وہ اس خط کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

وہ گھر پہنچے۔ دروازے پر انھیں ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ نمبر پلیٹ کے اوپر ایک اور پلیٹ تھی... اور اُس پر پریس لکھا تھا۔ بشیر گیٹ کھولنے کے لیے گاڑی سے اُترا تو ایک شخص اُس کی طرف بڑھا۔ "آپ بشیر افضل صاحب ہیں نا؟" اُس نے کہا۔ "میں روزنامہ کہستان کا نمائندہ ہوں۔"

"ہاں... میں ہی بشیر افضل ہوں۔ فرمائیے... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

ساجدہ کو گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ وہ بھی نیچے اُتر آئی۔

"میں اُس خط کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، جو آپ کو بارہ سال کی تاخیر کے بعد ملا ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں سے مل رہے ہیں، جن کے خطوط گمشدہ تھیلے میں تھے۔ چند افراد سے تو میں مل چکا ہوں۔ اب اس خط کے بارے میں آپ کا تاثر معلوم کرنا ہے۔ یہ فرمائیے، خط کس نے لکھا اور اُس کا مضمون کیا تھا؟ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کا نام نہیں چھاپیں گے۔"

"کیسا خط؟ میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آئی۔"

"اوہ... اس کا مطلب ہے، ابھی آپ کو خط نہیں دکھایا گیا۔" رپورٹر نے کہا اور ساجدہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "خط یقیناً آپ کے پاس ہی ہو گا۔ آپ بیگم بشیر ہیں نا؟"

"ساجدہ... بتم تو کہہ رہی تھیں کوئی خاص خط نہیں آیا ہے۔" بشیر نے ساجدہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

ساجدہ بری طرح گڑبڑا گئی۔ اُس کی عقل مندی کو وقت حماقت ثابت کر رہا تھا۔ وہ پہلے ہی بتا دیتی تو اچھا تھا۔ معاملہ اب اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

"بولو نا ساجدہ۔ ایسا کوئی خط ملا ہے آج؟" بشیر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"جی ہاں۔"

"کس کا خط تھا؟"

"کریم بخش کا۔" جواب دینے ہی میں عافیت تھی۔

"کریم بخش؟" یہ نام بشیر کی زبان سے یوں ادا ہوا، جیسے گالی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں یخ بستگی اُتر آئی۔

"بشیر صاحب... یہ کریم بخش صاحب کون ہیں؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"مسٹر... میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔" بشیر نے سخت لہجے میں کہا۔

"جناب... میں نے عرض کیا نا کہ میں..."

"اور میں جو عرض کر رہا ہوں کہ میں اس سلسلے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔ آپ تشریف لے جائیں۔" بشیر نے کہا، بڑھ کر گیٹ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"بشیر صاحب، میں..." رپورٹر نے پھر زبان کھولی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" اس بار بشیر نے گرج کر کہا۔ پھر وہ گاڑی اندر لے گیا۔ کار سے اتر کر اُس نے گیٹ بند کیا۔ رپورٹر بڑی نفرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ تاہم اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بشیر ساجدہ پر برس پڑا۔ "تم نے اس

خط کے بارے میں مجھے فون کر کے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے فون کیا تھا۔ تم کہیں گئے ہوئے تھے۔"

"تو اب راستے ہی میں بتا دیتیں۔"

"میں نے سوچا تھا کھانے کے بعد مناسب رہے گا۔"

بشیر سخت نگاہوں سے اُسے گھورے جا رہا تھا۔ "ساجدہ... تم نے پڑھا تھا وہ خط؟" اُس نے پوچھا۔ ساجدہ کے اقرار پر وہ بولا۔ "ایک شخص مجھے قاتل ٹھہرائے اور تم اُس کا خط مجھے دینے میں لیت و لعل سے کام لو؟"

"بشیر... تمہیں کیسے پتا چلا کہ اُس نے تم پر قتل کا الزام لگایا ہے؟ تم نے تو ابھی وہ خط پڑھا بھی نہیں۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا۔

بشیر نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ "لاؤ... خط مجھے دے دو۔" اُس نے کہا۔ ساجدہ نے ہینڈ بیگ سے خط نکال کر اُسے دے دیا۔ اُس نے وہ خط پڑھا۔ پھر پوچھا۔ "کسی اور نے تو یہ خط نہیں دیکھا؟"

"شاہدہ نے دیکھا تھا مگر پڑھا نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ تمہارے پرانے دوست کا خط ہے۔" ساجدہ نے کہا اور اپنے جھوٹ کی تفصیل سُنا دی۔

بشیر نے سکون کا سانس لیا اور خط کے پرزے کر کے اُسے ٹوکری میں پھینک دیا۔ "کوئی پڑھ لیتا تو مصیبت آ جاتی۔ کیسی کیسی سرخیاں لگتیں اخباروں میں۔ گڑے مُردے اکھاڑے جاتے..." وہ کہتے کہتے ٹھٹکا کیونکہ ساجدہ ٹوکری کو گھورے جا رہی تھی۔ "کیا بات ہے ساجدہ؟"

"کیا یہ سچ ہے؟" ساجدہ کو خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

بشیر خاموشی سے ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اُس کی نگاہوں میں ساجدہ کو صرف برہمی نہیں، شدید نفرت بھی محسوس ہوئی۔ وہ لرزنے لگی۔ بشیر نے پہلے کبھی اُسے ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچتا بھی رہی تھی۔ اُسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن زبان سے نکل جانے والی بات تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہوتی ہے۔ لوٹ کر کبھی نہیں آتی۔

بالآخر بشیر کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "ساجدہ... اس سوال کا جواب میں نہیں دوں گا... تم دو گی۔ بولو... تمہارے خیال میں یہ ممکن ہے؟ میں ایسا کر سکتا ہوں؟" ساجدہ خاموش رہی۔ بشیر اچانک پھٹ پڑا۔ "کیوں نہیں دیتیں جواب؟ تم مجھے ساری دنیا سے زیادہ بہتر طور پر جانتی ہو۔ بولو۔ کیا میں قتل کر سکتا ہوں؟ ڈاکے کی اہمیت ہے مجھ میں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک معصوم شخص کو پھانسی کے سڑوا سکتا ہوں میں؟ جواب دو۔"

ساجدہ گنگ کھڑی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بشیر اُس کے جواب کا منتظر ہے لیکن اُس کی آواز تو جیسے چھن گئی تھی۔

"بولو ساجدہ؟" بشیر بپھر گیا۔ اُس نے ساجدہ کی کلائی تھام لی۔ "جواب دو ساجدہ۔ کیا تمہیں اس خط پر یقین ہے؟"

"نہیں... نہیں۔ یقین کرو بشیر! میں جانتی ہوں خط میں جو کچھ لکھا ہے، جھوٹ ہے۔" ساجدہ نے دُکھتی ہوئی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم نے مجھ سے پوچھا کیوں؟"

"بشیر! میری کلائی چھوڑ دو۔ تم مجھے تکلیف پہنچا رہے..."

بشیر نے جلدی سے اُس کی کلائی چھوڑ دی۔ اُس کی آنکھوں میں پلتے شعلے سرد پڑنے لگے۔ "سوری ساجدہ... مجھے احساس ہی نہیں تھا۔" اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

ساجدہ رونے لگی۔ بشیر نے اُسے لپٹا لیا۔ ساجدہ اس کے کندھے پر آنسو بہاتی... سوچتی رہی۔ "یہ ہے میرا مقام... یہ ہے میری جنت۔ میں اسے تباہ کر رہی تھی۔"

بشیر نے اسے ہٹایا اور اُس کی کلائی سہلانے لگا۔ وہ بار بار معذرت کیے جا رہا تھا۔

ساجدہ کے آنسو تھمنے میں کچھ دیر لگی۔

"بیٹھو ساجدہ۔" بشیر نے اُس کے سنبھلنے کے بعد کہا۔ "اس خط کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں، تمہیں بتا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے رویے پر مجھے حیرت ہے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے؟"

ساجدہ نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ "دراصل... دراصل اس خط نے مجھے بہت بڑا شاک پہنچایا ہے۔" بالآخر وہ بولی۔

"شاک تو مجھے بھی لگا ہے۔" بشیر نے کہا۔ "ظاہر ہے ایسا موقع روز روز تو نہیں آتا کہ آدمی کو قتل کے الزام کا سامنا کرنا پڑے۔"

"اور پھر تمہارا ردِ عمل..."

"اور کیا ہو سکتا تھا؟" بشیر نے اُس کی بات کاٹ بھی دی اور مکمل بھی کر دی۔ "فرض کرو... تمہیں کوئی ایسا خط ملے جس میں تم پر مجھ سے بے وفائی کا الزام لگایا گیا ہو... تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالی گئی ہو تو تمہارا ردِ عمل کیا ہو گا؟"

ساجدہ سے نظریں نہیں اٹھائی گئیں۔ شرمندگی اور احساسِ جرم اس قدر شدید تھا کہ وہ اُس سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔

"اور پھر اچانک پن پر بھی غور کرو۔ مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ سر پر ایک ریوالور سوار تھا۔ بہرحال... مجھے خود پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔"

"یہ کریم بخش کون ہے؟" ساجدہ نے پوچھا۔

"ہماری کمپنی میں چوکیدار تھا۔ رات میں ڈیوٹی ہوتی تھی اُس کی۔ یاد نہیں ہے، اُس روز گواہی کے بعد عدالت میں ایک شخص نے مجھے دھکا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا اور تم بھی میرے ساتھ تھیں۔"

ذہن پر زور دینے پر ساجدہ کو کچھ کچھ یاد آگیا۔ اس نے سر کو تقسیمی جنبش دی۔

"اس روز بھی اس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔" بشیر نے کہا۔ "اس نے زبانی طور پر بھی یہی دھمکی دی تھی جو تم خط میں پڑھ چکی ہو۔"

"مگر کس بنیاد پر؟ اسے جرأت کیسے ہوئی بلیک میل کرنے کی؟"

"پتا نہیں۔ مجھے تو وہ پاگل ہی لگا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ مجھے ڈرا دھمکا کر مجھ سے رقم حاصل کر سکے گا۔"

"بشیر۔ میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔" بشیر نے بے بسی سے کہا۔ "اس روز بھی اس نے دھمکی دی تھی کہ رقم نہ ملی تو وہ پولیس سے بات کرے گا۔"

"لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ تم پچیس ہزار روپے کہاں سے لاؤ گے؟"

"پتا نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"لیکن بشیر... کوئی وجہ تو ہو گی..."

"کیسی وجہ؟ کاہے کی وجہ؟" بشیر نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر پھر سائے لہرانے لگے۔

ساجدہ پھر گڑبڑا گئی۔ "میرا مطلب ہے۔" اس نے اس یقین کے ساتھ دھمکی دی ہو گی کہ وہ مؤثر ثابت ہو گی... اور... اور یہ کہ تم اسے وہ رقم ادا بھی کر سکو گے۔ ورنہ اسے جرأت کیسے..."

"میں نے کہا نا... وہ مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔"

"تم نے اسے کیا جواب دیا تھا؟"

"میں نے کہا... اپنی یہ خرافات پولیس والوں ہی کو سناؤ۔ وہ خود تمہاری خبر لیں گے۔ دماغ درست کر دیں گے تمہارا۔ اور میں سمجھا تھا کہ میں نے اس سے جان چھڑا لی ہے۔ اس خط کا تو مجھے علم ہی نہیں تھا۔ میں بالکل ہی لاعلم رہا اس سے۔ ویسے یہ خط مجھے بروقت مل گیا ہوتا تو میں اس کا جواب ہرگز نہ دیتا۔ بلکہ ممکن ہے میں یہ خط لے کر تھانے چلا جاتا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ساجدہ بولی۔ "پھر اس نے تم سے رابطہ بھی نہیں کیا؟"

"نہیں... اور نہ ہی وہ پولیس کے پاس گیا۔ میرا خیال ہے اس کے جھوٹ کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر وہ سچا ہوتا تو اس نے پولیس سے رابطہ ضرور کیا ہوتا۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" ساجدہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایوب کے خلاف شہادت...؟"

"کیا مطلب؟ اس گواہی کا کہاں سے تذکرہ نکل آیا؟ اس معاملے سے کیا تعلق ہے اس گواہی کا؟" بشیر کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میں نے کب کہا کہ کوئی تعلق ہے۔"

"تو پھر تم نے ذکر کیوں چھیڑا اس کا۔ ایوب جیل میں ہے تو اس لیے کہ وہ مجرم تھا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں... وہ مجرم تھا۔" بشیر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

ساجدہ خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ اعصابی اختلال کا شکار ہو رہا تھا... کیوں؟ "میں نے کب کہا کہ ایوب مجرم نہیں ہے۔"

"مجھے تو ایسا ہی لگا جیسے تم اس کی بے گناہی جتا رہی ہو۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ساجدہ نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "تم اتنے نروس اور زود رنج کیوں ہو رہے ہو؟"

"پتا نہیں۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ گواہی کے متعلق تم کیوں اُلجھ رہی ہو؟"

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ایوب کے خلاف تمہاری گواہی بے حد مؤثر تھی۔ اس کے باوجود اس کریم بخش نے تمہیں بلیک میل کرنے کی ہمت کی۔ کیوں؟"

بشیر قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔ اس نے ساجدہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "ساجدہ... اس خط نے مجھے دہلا دیا ہے۔ وہ یادیں اُبھار دی ہیں جنہیں میں بھلانا چاہتا ہوں۔ دیکھو نا... یہ خیال مجھے ہر وقت ستاتا ہے کہ ایوب صرف میری گواہی کی وجہ سے قید کاٹ رہا ہے۔ یہ بوجھ ہے مجھ پر۔ میں یہ بات بھول جانا چاہتا ہوں مگر..."

"مجھے احساس ہے اس بوجھ کا۔"

"تو جو کچھ میں نے کہا، اس پر تمہیں یقین ہے نا؟"

"کیوں نہیں۔ یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے اس میں؟"

"بس... پھر سب ٹھیک ہے۔ اب اس خط کو بھول جاؤ۔ اس میں جو لکھا ہے جھوٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے بشیر۔ مگر میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔" ساجدہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم نے کریم بخش کی بلیک میلنگ کے بارے میں مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا؟ تم نے مجھ سے چھپایا کیوں؟"

بشیر چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر مسکرا دیا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ "میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کریم بخش جھوٹا ہے... بلکہ شاید پاگل بھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

ساجدہ سوچتی رہی۔ بشیر کو کیسے بتاتی کہ عورت کبھی کبھی پریشان ہونا بھی چاہتی ہے۔ شوہر کی پریشانیوں میں حصے دار بننے کو اس کا بھی جی چاہتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ بات بشیر کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسے اس بات پر غصہ بھی نہیں آیا۔ وہ بشیر سے محبت کرتی تھی... اس پر اعتماد تھا اسے، چنانچہ وہ پُرسکون ہو گئی۔

❀❀

اس رات ساجدہ بستر پر لیٹی بشیر کو تک رہی تھی جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے ریڈیو بھی آن کیا ہوا تھا۔ ساجدہ کو تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ خط اب بھی کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اس کے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نہ وہ اس خط کو کبھی بھلا سکے گی اور نہ ہی کریم بخش کا نام اس

کے ذہن سے مٹ سکے گا۔

پھر ریڈیو پر خبریں شروع ہوگئیں۔ مقامی خبریں تھیں۔ کچھ سیاسی خبروں کے بعد نیوز ریڈر نے کہا: "یہ جیل میں ایوب کا بارھواں سال ہے اور یہ دوسرا موقع ہے کہ اس نے رحم کی اپیل کی ہے۔ اپیل مسترد ہونے کے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا... میں بے قصور ہوں۔ میری دعا ہے کہ اصل قاتل پکڑا جائے۔ اس کی وجہ سے میں ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل میں سڑ رہا ہوں اور میرے بچے میری زندگی میں یتیم ہوگئے ہیں۔ میرا اللہ پر یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ انصاف کرے گا اور حقیقت عیاں ہو جائے گی..."

خبریں جاری رہیں لیکن ساجدہ اب اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ بشیر کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر خوف کی وہ ماؤں پرچھائیاں تھیں جو گزشتہ بارہ سال سے ایوب کے تذکرے پر وہ دیکھتی آئی تھی۔ وہ سوچتی رہی... کہیں یہ احساس جرم تو نہیں... ضمیر کا بوجھ تو نہیں؟

اچانک خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر آیا۔ بشیر نے جھلا کر ریڈیو بند کیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ ساجدہ نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں اور سوتی بن گئی۔ بشیر کے چہرے کا وہ تاثر وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی... نہ بشیر دکھانا چاہتا ہوگا۔

چند لمحے بعد بشیر کی انگلیوں کا لمس اسے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوا۔ وہ پلٹا ارادہ سمٹ گئی اور آنکھیں کھول دیں۔

"کیا بات ہے ساجدہ؟" اس کے طرز عمل نے بشیر کو چونکا دیا۔ وہ تو ہمیشہ اس لمس سے بے قابو ہو جاتی تھی۔

"کک... کچھ نہیں۔ بشیر... میں بہت تھک گئی ہوں۔" ساجدہ نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

"میں سمجھ رہا ہوں ساجدہ۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" بشیر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ خط تمہیں اب بھی پریشان کر رہا ہے۔ تم گو مگو کی کیفیت میں ہو۔ الجھ رہی ہو کہ میرا دعویٰ مانو یا اس خط کو درست سمجھو اور مجھے قصوروار بھی نہیں سمجھتا۔ میں خود کو تمہاری جگہ رکھ کر محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بشیر... میں کہہ چکی ہوں کہ مجھے خط پر ہرگز یقین نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود تم خط کی وجہ سے پریشان ہو؟"

"ہاں... مگر بہت تھوڑی۔"

"جتنا اعتراف کر رہی ہو اس سے زیادہ پریشان ہو تم؟"

وہ خاموش رہی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ یہ خاموشی تو تائید کی ثابت ہوگی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "بھول جاؤ اس خط کو۔"

"میں بھول سکتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ ہے۔ مگر تم نہیں بھول سکتیں۔" بشیر کا لہجہ پھر تلخ ہوگیا۔

"میں بھی بھول جاؤں گی... بھول ہی جاؤں گی۔"

"میں جانتا ہوں تم بھولنے کی کوشش کرو گی۔ مگر یہ آسان نہیں ہوگا۔ تم انسان ہو۔ تمہیں ہمیشہ مجھ پر شک رہے گا۔ کاش... کاش میں ثابت کر سکتا..."

"تمہیں کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے۔"

"ساجدہ... نادر کو ایوب ہی نے قتل کیا تھا۔ صرف وہی اسے قتل کر سکتا تھا۔ میں نے خود اسے قتیلا پر سے بھاگتے دیکھا تھا۔" بشیر کی آواز بلند ہوگئی۔ "وہاں اندھیرا تھا' اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ بھاگنے والا ایوب ہی تھا۔ اور پھر میں نے مرتے ہوئے نادر کی چیخ سنی تھی۔ نادر نے بھی ایوب کا نام لیا تھا۔ نادر نے اپنے قاتل کو پہچان لیا تھا۔ تم اور کیا ثبوت چاہتی ہو ساجدہ؟ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"میں ثبوت مانگ ہی نہیں رہی ہوں۔" ساجدہ نے کہا۔ مگر اس کے ذہن میں شک کا سایہ ابھر آیا۔ آخر بشیر مجھے قائل کرنے کی اتنی زیادہ کوشش کیوں کر رہا ہے۔ میں اسے بتا چکی ہوں کہ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ کیا اس کے لیے اتنا کافی نہیں؟

بشیر نے اسے شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ان کے لہجے گرم جوشی سے محروم تھے۔ بشیر کے لہجے میں یاسیت تھی اور ساجدہ کے لہجے میں بے گانگی اور کشیدگی' جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

بشیر کے جانے کے بعد ساجدہ نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن کی کال کوٹھری کے دروازے سے ناخوش گوار یادیں سر ٹکرا رہی تھیں۔ "ہمیں باہر آنے دو... ہمیں باہر آنے دو۔" وہ دروازہ بند رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔

جب بھی کوئی ایوب کا نام لیتا' بشیر کی رنگت متغیر ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتی' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بارہ سال کم تو نہیں ہوتے۔ اتنے عرصے میں تو بڑے سے بڑا زخم بھر جاتا ہے' آدمی ہر بات بھول جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا ضمیر مطمئن ہو۔ اسے دامن صاف ہونے کا یقین میسر ہو۔

اسے تنگ دستی کے وہ دن یاد آئے جب بشیر مقروض تھا۔ وہ بے حد مایوس تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس وقت وہ رقم کے حصول کے لیے ڈاکا بھی ڈال سکتا ہے۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ مایوسی کے عالم میں انسان کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ البتہ کرنے کی بات اور ہے اور بشیر ایسا نہیں ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس نے ٹھیک سوچا تھا یا کیا بشیر صرف تذکرہ کر کے رہ گیا تھا جرم کا... یا اس نے اپنے کہے پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔

پھر اسے وہ رات یاد آئی... قتل کی رات! اس رات بشیر گھر آیا تو اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس نے ساجدہ کو قتل کے بارے میں بتایا مگر جزئیات بتانے سے گریز کرتا رہا۔ ساجدہ کے اصرار پر اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا

نہیں چاہتا؟"

پھر جتنے عرصے مقدمہ چلتا رہا، بشیر جیسے اپنے آپ میں سمٹتا رہا۔ عدالت کا پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس پر غنودگی کے دورے پڑتے۔ یہاں تک ہوا کہ نیند کی گولیوں کے استعمال کی نوبت آگئی۔

اب ساجدہ کے ذہن میں سوالات سر اٹھا رہے تھے... جواب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کیا کریم بخش کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر بشیر کو بلیک میل کر سکتا تھا؟ بشیر کا کہنا تھا کہ اس نے کریم بخش کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ پولیس نے کبھی اُن کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔ مگر اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بشیر نے چپکے سے کریم بخش کا منہ بند کر دیا ہو۔ اسے رقم دے دی ہو۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بشیر کے پاس دولت کہاں سے آئی؟ ساجدہ نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ ایوب کو سزا ہونے کے چند ماہ بعد ہی اُس کے گھر میں دولت کی ریل پیل شروع ہوئی تھی۔ ایوب نے بھی تو یہی کہا تھا "میرے پاس کوئی رقم نہیں۔ میں نے کوئی رقم نہیں چرائی۔ کسی اور نے چرائی ہوگی۔"

ساجدہ سوچتی گئی اور اُلجھتی گئی۔ اسے بشیر سے محبت تھی۔ اُس پر اعتماد تھا۔ لیکن اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اُسے نیند آگئی۔

❀❀

صبح ناشتے کی میز پر وہ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے تھے۔ شاہدہ نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ اُس نے امّی اور ابّو کو چھیڑنے کی کوشش کی مگر فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ سنگین ہے یا نہیں، اُس کی مداخلت ناقابلِ قبول ہے۔ وہ خاموشی سے ناشتے پر جھک گئی۔

ساجدہ اور بشیر کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا بہرحال ہو چکا تھا۔ خط کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا جائے گا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر بشیر نے ساجدہ سے کہا "تم مجھے بس کے اڈے تک پہنچا دو گی؟"

کچھ دیر بعد وہ باہر نکل آئے۔ بشیر نے گیراج سے کار نکالی۔ اِس بار ڈرائیونگ سیٹ ساجدہ نے سنبھالی۔ دونوں کے چہروں پر کشیدگی اور تناؤ تھا اور لبوں پر خاموشی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

بالآخر بشیر نے خاموشی توڑی "کیا بات ہے ساجدہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ساجدہ کے لہجے سے بے بسی تھی۔

"ایک نیم دیوانے شخص نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا اور تم نے اس پر یقین کر لیا۔ میری تردید پر تمہیں یقین نہیں آیا۔ تم اُس کی بات کو میری بات پر ترجیح دے رہی ہو، جس کی تمہیں شکل بھی یاد نہیں۔ جس کے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔" بشیر نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ سچ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی..." ساجدہ نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ اڈے پر پہنچ چکے تھے۔

بشیر نے اُسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "جھوٹ مت بولو مجھ سے۔ میں نے تمہیں بتایا کہ قتل ایوب نے کیا تھا۔ عدالت میں یہ بات ثابت ہو گئی اور کیا چاہتی ہو تم؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کریم بخش نے تمہیں یہ خط کیوں لکھا؟"

"میں سمجھ گیا۔" بشیر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تم اس خط پر یقین نہیں کرنا چاہتیں لیکن اس خط نے تمہارے ذہن میں شک کا بیج بو دیا ہے۔ ہے نا یہی بات؟ مجھے رات ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ خود کو کس طرح بے قصور ثابت کروں لیکن مجھے پتا چل گیا۔ میں اپنی برأت ثابت نہیں کر سکتا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تم مجھ پر یقین کرو گی یا کریم بخش پر۔ یہ صرف موازنے کا کھیل ہے۔" اُس کے لہجے میں یاسیت اُتر آئی۔ "اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اس خط کو بھول جاؤ۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکیں تو ہم مستقبل میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

"تم مجھے یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تمہارے پاس دولت کہاں سے آئی؟" ساجدہ اچانک پھٹ پڑی۔

"دولت؟"

"ہاں۔ ایوب کو سزا ہونے کے چند ماہ بعد ہی ہم اچانک خوش حال ہو گئے تھے۔ کیسے؟ کہاں سے آئی تھی وہ دولت؟"

بشیر کے چہرے سے لگتا تھا اُس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہیں۔ وہ چند لمحے ساجدہ کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا "تو یہ بات ہے؟ گویا میں اس وقت عدالت میں ہوں۔ ملزم کی حیثیت سے؟"

"بشیر...!"

"اور شاید ساری زندگی میری یہی حیثیت رہے گی ہے نا؟ میں جو کچھ بھی کہوں گا اُس کا کوئی اور ہی مطلب لیا جائے گا۔"

"مجھے افسوس ہے بشیر۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں... اور پھر بتا رہا ہوں۔ مجھے شیئرز کے کاروبار میں فائدہ ہوا تھا۔ اب یہ اتفاق ہے کہ فیصلے کے کچھ عرصے بعد ہی مجھے کامیابی نصیب ہو گئی۔ ویسے تم جانتی ہو کوشش تو میں بہت پہلے سے کر رہا تھا... اور مجھے نقصان بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اب بولو... اور کچھ پوچھنا ہے تمہیں؟"

"نہیں... کچھ نہیں۔"

"اب ایک سوال مجھے کرنا ہے۔ ہم پچیس سال سے ساتھ ہیں۔ اور ایک دن میں اتنا بڑا انقلاب آگیا ہے۔ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔ مجھ پر اعتبار... اعتماد کرو۔ اس خط

کو بھول جاؤ لیکن شاید یہ تمہارے لیے ممکن نہیں چنانچہ اب سوچ لو۔ جہاں تک ضمیر کا تعلق ہے میں تم سے زیادہ حساس اور صاحب ضمیر ہوں بہرحال فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک میں قتل کا... اور ایک بے قصور شخص کو دانستہ سزائے قید دلانے کا گناہ گار ہوں تو اس صورت میں ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس صورت میں تمہارا فرض ہے کہ پولیس کو مطلع کر دو۔ خوب سوچ لو ساجدہ۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اب میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بشیر... تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ "میں تم پر یقین رکھنا چاہتی..."

"صرف چاہنا کافی نہیں ہے۔ یقین رکھنا ضروری ہے۔" بشیر نے اس کی بات کاٹ دی اور کار سے اتر گیا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ سڑک کراس کر گیا۔

❋❋

ساجدہ نے گھر جانے کے بجائے لائبریری کا رخ کیا۔ اس نے لائبریرین سے ۷۶ء کے اخبارات کی فائل نکلوائی۔ اس کے سر میں صرف ایک ہی سودا سما گیا تھا۔ اسے حقیقت کی جستجو کرنا تھی... اسے بے نقاب کرنا تھا۔ وہ پرانے اخبارات اسے کورٹ روم میں لے گئے...

کورٹ روم میں چہروں کا ازدحام تھا۔ جج صاحب اپنی کرسی پر متمکن تھے۔ ایک طرف وکیل استغاثہ کھڑا تھا اور دوسری طرف وکیل صفائی ملزموں کے کٹہرے میں ایوب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے کندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ چہرے پر شکست خوردگی تحریر تھی۔ ساجدہ کو سب سے زیادہ ترس سائرہ پر آیا جو اگلی صف میں اپنی شیر خوار بچی کو سینے سے چمٹائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

ساجدہ نے بشیر کی طرف دیکھا۔ بشیر کسی سحر زدہ شخص کی طرح ٹکٹکی باندھے ایوب کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایوب کے چہرے سے نظریں ہٹانا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

پھر ایوب گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ وکیل استغاثہ اس سے سوالات کر رہا تھا۔ "تم سولہ جون کی رات دفتر میں موجود تھے؟"

"جی ہاں جناب۔ کام بہت زیادہ تھا۔ میں نے سوچا نمٹا کر ہی اٹھوں گا۔"

"کیا تم عام طور پر رات دیر تک کام کرنے کے عادی ہو؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر اس رات ایسی کون سی خاص بات تھی؟"

"میں نے بتایا نا جناب دو تین دن کے تساہل کے نتیجے میں کافی کام اکٹھا ہو گیا تھا۔"

"اور تم کمپنی میں پانچ سال سے کام کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اس رات کیشیئر کے پاس زیادہ کیش ہو گا۔ اگلے دن ملازمین کو تنخواہ دی جانی تھی۔"

وکیل صفائی نے اٹھ کر احتجاج کیا۔ جج صاحب نے اس سوال کو کارروائی سے حذف کرنے کی ہدایت دی۔ وکیل استغاثہ نے ایوب سے پوچھا۔ "دفتر میں تم کہاں بیٹھتے ہو؟"

"نچلی منزل پر... زینوں کے ساتھ والے کمرے میں۔" ایوب نے جواب دیا۔

"اور مقتول نادر کہاں بیٹھتا تھا؟"

"نچلی منزل پر... زینوں کے اس طرف والے کمرے میں۔"

"یعنی زینوں کے ایک طرف تمہارا کمرا تھا اور دوسری طرف مقتول نادر کا؟"

"جی ہاں جناب۔"

"یعنی تم اپنے کمرے سے اٹھ کر نادر کے کمرے میں جاؤ تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی تمہیں دیکھ سکے؟"

ایوب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ اسے گھیرے جانے کا احساس ہو رہا تھا۔

"زینوں کے دوسری طرف عقبی دروازہ ہے نا؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تم نے اس رات عقبی دروازہ استعمال کیا تھا؟"

"جی ہاں جناب۔"

"کیا تم ماضی میں بھی ایسا کرتے رہے ہو؟ خصوصاً رات کے وقت؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر اس رات تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یونہی..."

وکیل استغاثہ نے آگے جھک کر ایوب کو شبہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "تم شراب سے شوق کرتے ہو؟"

"کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔ عادی نہیں ہوں۔"

"فکر مند ہوتے ہو یا کوئی ملال پریشانی ہوتی ہے تو پی لیتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

"سولہ جون کی رات تم نشے میں تھے؟"

"جی نہیں جناب۔"

"یاد کرو۔ اس رات تم نے کئی جام پیے تھے۔"

ایوب نے گھبرائے ہوئے جانور کی طرح وحشت بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے بھاگنے کے لیے راستہ تلاش کر رہا ہو۔ "میں... میں... وہ..." اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں یا نہیں میں جواب دو۔" وکیل استغاثہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"جی ہاں جناب۔"

وکیلِ استغاثہ نے ہاتھ بڑھا کر میز سے کوئی چیز اٹھائی جو سوڈے رنگ کے کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے کاغذ ہٹایا اور شراب کی بوتل برآمد کی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ "جس رات تم نے نادر کو قتل کیا، اس رات اس میں سے کتنے جام پیے تھے؟ ہمیں علم ہو چکا ہے کہ یہ بوتل تم نے اسی شام خریدی تھی۔ کہاں سے خریدی تھی، ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔"

ایوب کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "چلو... میں نے مان لیا کہ میں نشے میں تھا۔" اس نے چیخ کر کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ نادر کو میں نے ہی قتل کیا تھا۔"

"تم دفتر سے کس وقت نکلے تھے؟"

"دس بجے... یا زیادہ سے زیادہ دس بج کر پانچ منٹ پر۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ خاص طور پر شراب کی آدھی بوتل معدے میں انڈیلنے کے بعد وقت کا کسے خیال رہتا ہے۔ نادر کو سوا دس بجے قتل کیا گیا تھا۔"

"تم... تم بلاوجہ مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو۔" ایوب نے دہاڑ کر کہا۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

جج نے اُسے تنبیہ کی اور سوال کا جواب دینے کی ہدایت دی۔

"میں جواب دے چکا ہوں۔" ایوب نے تلخ لہجے میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک اور چیز اٹھائی اور کاغذ ہٹایا۔ وہ لفافے چاک کرنے والا چاقو تھا۔ "مسٹر ایوب... نادر کے دل میں یہ چاقو گھونپا گیا تھا۔ اسے پہچانتے ہو؟"

ایوب کا رنگ فق ہو گیا۔ "ہاں... یہ میرا ہے۔"

"درست جواب دیا تم نے۔ انکار ممکن نہیں تھا۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نشے میں دُھت تھے۔ تمہیں رقم کی ضرورت تھی۔ تمہیں معلوم تھا کہ نادر کے پاس اس رات رقم ہو گی۔ قتل کا حوصلہ تم میں نہیں تھا۔ تم شراب کی بوتل خرید لائے۔ نشے نے تمہارے اندر جرأت پیدا کر دی۔ تم نے نادر کو قتل کیا اور رقم لے بھاگے۔"

"جھوٹ!" ایوب حلق کے بل چیخا۔ "یہ جھوٹ ہے..."

پھر منظر بدلا۔ اب گواہوں کے کٹہرے میں بشیر کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ چہرے سے کنفیوژن ہویدا تھی۔ اس بار وکیلِ استغاثہ کا لہجہ نرم تھا کیونکہ وہ اس کا اہم گواہ تھا۔

"مسٹر بشیر! آپ اس رات دفتر میں دیر تک کیوں رُکے؟"

"میں ٹرکوں کے لیے نیا شیڈول بنا رہا تھا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے ایوب کو دفتر میں آپ کی موجودگی کا علم تھا؟"

"میرا خیال ہے اسے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ میرا کمرا اوپری منزل پر ہے۔"

وکیلِ استغاثہ مسکرایا۔ "اب ہمیں یہ بتائیے کہ اس رات آپ نے کیا دیکھا؟"

بشیر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ بولا تو اس کی آواز بھی بہت دھیمی تھی۔ ساجدہ نے اس وقت بھی یہی سوچا تھا۔ یہ بشیر نظریں کیوں نہیں اُٹھاتا... زور سے کیوں نہیں بولتا؟ پھر ساجدہ کی نظریں ایوب کی طرف اٹھیں۔ وہ کسی معمول کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر بشیر کو دیکھے جا رہا تھا۔

"میں نے کام مکمل کیا ہی تھا کہ نچلی منزل سے چیخ سنائی دی۔" بشیر نے کہا۔ "میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اسی لیے چیخ مجھے واضح طور پر سنائی دی۔ چیخ نادر کی تھی۔ اس نے ایک نام پکارا تھا۔"

"وہ نام بھی بتائیے۔"

بشیر ہچکچایا۔ اس نے ایک نظر ایوب کو دیکھا جو اسی کی طرف نگراں تھا۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ "نادر نے چیخ کر ایوب کا نام لیا تھا۔" اس بار اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"آپ کو یقین ہے...؟"

"جی ہاں جناب۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں نے عقبی راہداری میں بھاگتے قدموں کی آواز سنی۔ پھر عقبی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز۔ میں کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لپکا اور باہر جھانکا۔ ایک شخص سیاہ تھیلا اٹھائے بھاگتا نظر آیا۔"

"اس شخص کو پہچانتے ہیں آپ؟"

بشیر پھر ہچکچایا۔ کورٹ روم میں سناٹا چھا گیا۔ بالآخر بشیر نے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔ "جی ہاں جناب۔ وہ ایوب تھا۔"

ساجدہ نے ایوب کو دیکھا جس کا چہرہ خون سے یکسر محروم لگنے لگا تھا۔

"آپ کو یقین ہے مسٹر بشیر کہ آپ نے ایوب ہی کو بھاگتے دیکھا تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے زور دے کر کہا۔

"جی ہاں... مجھے یقین ہے۔"

استغاثہ کا اگلا گواہ کانسٹیبل صاحب داد تھا۔ اس نے کہا۔ "وقوعے کی رات سوا دس بجے میں معمول کے مطابق ڈیوٹی دے رہا تھا کہ میں نے بلوچ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے عقبی گیٹ سے ایک شخص کو نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ تھیلا تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے للکارنے پر بھی وہ نہیں رُکا تو میں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ میرے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں کمپنی کے دفتر پہنچا۔ وہاں بشیر صاحب، نادر صاحب کی لاش کے پاس کھڑے تھے۔ وہ پولیس کو فون کر چکے تھے۔ پانچ منٹ بعد تھانے والے آ گئے۔"

"تم نے بھاگنے والے کا چہرہ دیکھا تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ایک جھلک دیکھی تھی۔"

"کیا وہ یہ شخص تھا؟" وکیلِ استغاثہ نے ایوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

صاحب داد نے ایوب کو بغور دیکھا پھر بولا۔ "جناب! آدمی سیاست تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"اس کے قد کاٹھ کے بارے میں تو بتا سکتے ہو؟"

"قد کاٹھ تو ایسا ہی تھا جناب!" اس بار صاحب داد نے ایوب کی طرف اشارہ کیا۔

پیش کار نے اگلے گواہ کا نام پکارا۔ وہ نام ساجدہ کو حال میں واپس لے آیا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی پرانے اخبار پڑھ رہی تھی جن میں مقدمے کی روداد چھپی تھی۔ کریم بخش... یہ نام...! اس نام سے تو اسے خصوصی دلچسپی تھی۔ وہ اخبار پر جھک گئی جیسے اس طرح اسے کریم بخش کا چہرہ نظر آجائے گا...

"اگلا گواہ کریم بخش تھا۔ کریم بخش نے بتایا کہ جس رات واردات ہوئی، وہ اس کی چھٹی کی رات تھی۔ وکیل استغاثہ نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے باہر کا کوئی آدمی دفتر میں گھس گیا ہو اور اس نے نادر کو قتل کیا ہو۔ کریم بخش نے بتایا کہ اس کے خیال میں یہ ناممکن ہے... کیونکہ دروازوں میں اسپرنگ لاک لگے ہیں اور انہیں اندر ہی سے کھولا جا سکتا ہے۔ باہر سے بغیر چابی کے دروازے نہیں کھولے جا سکتے۔"

ساجدہ نے اخبارات سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور لائبریرین کا شکریہ ادا کر کے باہر آگئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا جس کا گزشتہ روز بشیر نے حوالہ دیا تھا... کریم بخش سے ملاقات کا منظر! اسے یاد آگیا۔

وہ فیصلے کا دن تھا۔ ایوب کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی تھی اور اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ کورٹ بلڈنگ میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اخباری نامہ نگار بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ فون کھڑکائے جا رہے تھے۔ وہ بشیر کے ساتھ عمارت سے نکل رہی تھی۔ اسی وقت اس نے ایک رپورٹر کو کہتے سنا۔ اس کی بیوی اور بشیر خوارنجی نے اسے بچا لیا۔ ورنہ یقیناً سزائے موت ہوتی اسے!

پھر اچانک ایک شخص بشیر کی طرف بڑھا۔ وہ کریم بخش تھا۔

"بشیر بابو... مجھے اکیلے میں تم سے بات کرنی ہے۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔" اس نے بشیر کو مخاطب کیا تھا۔

ساجدہ کی نظروں میں کریم بخش کا چہرہ پھر گیا۔ وہ مدقوق سا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت نے ناگوار تاثر چھوڑا تھا۔ اس کے لہجے اور انداز میں احترام کے ساتھ ساتھ عجیب سا تحکم بھی تھا۔

بشیر اس کے ساتھ ایک گوشے میں چلا گیا تھا۔ ساجدہ کو یاد تھا کریم بخش کہتا اور بشیر سنتا رہا تھا۔ پھر اس نے بشیر کو برہم ہوتے دیکھا۔ ساجدہ کو اب بھی بشیر کی وہ برہمی یاد تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بشیر اس شخص پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے گا۔ خون پی جائے گا اس کا۔

اس نے بشیر کو برہمی سے سر کو منفی جنبش دیتے دیکھا۔ کریم بخش اب بھی کہہ رہا تھا۔ بشیر نفی میں سر ہلائے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی جنبش بھی انکاریہ تھی۔ پھر بشیر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کریم بخش نے ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ بشیر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اس کے پاس چلا آیا۔ "آؤ چلیں۔" اس نے کہا۔ ساجدہ کو یاد تھا۔ اس نے بشیر سے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے۔ بشیر نے کہا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اور پھر ساجدہ کے اصرار کرنے پر اسے ڈانٹ دیا تھا۔ "تم بلاوجہ کی فکر میں خود کو کیوں ہلکان کرتی ہو؟"

حال کے اس لمحے میں ساجدہ کو خط کا ایک جملہ یاد آگیا۔ وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔ کریم بخش نے لکھا تھا۔ "ایک بار تم مجھے دھکا دے چکے ہو۔ اب یہ حماقت ہرگز نہ کرنا۔"

ساجدہ کو احساس ہو گیا کہ حقیقت کو جاننا اس کے لیے اہم ہو گیا ہے۔ بہت زیادہ اہم! یہ جاننا ضروری تھا کہ بشیر کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ اس کی ایک ہی صورت تھی۔ صرف بشیر کا برادر شاہ زیب ہی اسے حقیقت بتا سکتا تھا۔ شاہ زیب کی بیوی سعدیہ سے اس کی دوستی بھی تھی۔ وہ اس سے ملاقات کے بہانے جا سکتی تھی۔ مگر شام کو تاکہ شاہ زیب بھی موجود ہو۔

شام کو وہ شاہ زیب کے گھر جانے کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ ایکسپریس ٹیلی گرام آگیا۔ اس نے ٹیلی گرام نکال کر پڑھا...

"میں خیریت سے چین پہنچ گیا ہوں۔ کل تمہیں فون کروں گا۔ بشیر۔"

ٹیلی گرام میں دو لفظ کم تھے۔ ساجدہ کو وہ کمی شدت سے محسوس ہوئی... دو لفظ! لو یو... لو یو...!

***

ساجدہ نے فیصلہ کیا کہ شاہ زیب سے مل کر گفتگو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ باتوں باتوں میں کام کی بات معلوم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

سعدیہ نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور چھوٹتے ہی بشیر کے بارے میں پوچھا۔ "بشیر تو کسی کام سے چین گئے ہیں۔" ساجدہ نے بتایا۔

"کب آئیں گے؟"

"دو تین ہفتے۔"

"تم بھی خوب ہو، تمہیں شوہر کے غائب ہونے پر فکر نہیں ہوتی؟"

"لو بھلا! اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" ساجدہ نے بے پروائی سے کہا۔

"بھئی... شوہر کثرت سے کاروباری دورے کرنے لگیں تو بیشتر عورتیں پریشان ہو جاتی ہیں۔ انہیں خواب میں خوبصورت سوکنیں نظر آنے لگتی ہیں۔" سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے بشیر کے متعلق اس انداز میں کبھی نہیں سوچا۔"

"میں جانتی ہوں اور مجھے یہی بات بہت اچھی لگتی ہے۔ رشک

آتا ہے مجھے۔"

ساجدہ ہنس دی۔ "اب ایسا بھی کیا۔"

"نہیں! یہ سچ ہے۔" سعدیہ بولی۔ "میں سریت پسند ہوں۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ شاہ زیب کے ساتھ کوئی اسرار وابستہ ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شاہ زیب کھلی کتاب کی مانند ہیں۔ مجھے پتا ہوتا ہے کہ کس وقت وہ کیا کہیں گے۔ بعض اوقات تو میں لفظ بہ لفظ درست اندازہ لگاتی ہوں۔ البتہ بشیر گہرے آدمی ہیں۔ سمندر کی طرح خاموش اور بہت کچھ چھپائے ہوئے۔"

"کیا... کیا مطلب؟"

"لو... اس میں چونکنے کی کیا بات ہے۔ تم گہرائی کا مطلب نہیں سمجھتیں۔ گہرائی سے آدمی کی شخصیت میں عجیب سی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔"

سعدیہ نے موضوع بدل دیا۔ اُن کے درمیان شاہدہ کی شادی اور اس سے متعلق خریداری اور انتظامات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ اسی دوران شاہ زیب بھی آگیا۔ ملازمہ چائے رکھ گئی۔

ساجدہ بے حد محتاط تھی۔ وہ خود سے کوئی تذکرہ چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ کسی نہ کسی طرح مطلوبہ موضوع نکل آئے گا اور وہ بے ضرر طریقے سے معلومات حاصل کر سکے گی۔ اُسے سعدیہ کی بشیر کے بارے میں گہرائی والی بات بھی چبھ رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ بشیر گہرا آدمی تھا اور یہ بھی درست تھا کہ گہرائی نے اُس کی شخصیت میں کشش پیدا کر دی تھی لیکن ساتھ ہی وہ بے خبری کا عذاب بھی تو بھگت رہی تھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر سعدیہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے ساجدہ! تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" شاید اس نے ساجدہ کی بے توجہی بھانپ لی تھی۔

ساجدہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں شاہدہ کی شادی کے انتظامات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"بات کوئی بھی ہو، روپے پیسے کی پریشانی سے آپ محفوظ ہیں۔" شاہ زیب نے کہا۔ "بشیر صاحب کا کاروباری شعور اب بہت پختہ ہو گیا ہے۔"

ساجدہ کو اسی موقع کی تلاش تھی اور ذکر بھی اُس نے خود نہیں چھیڑا تھا۔ اب اسے استفادہ کرنا تھا اس گفتگو سے۔

"بشیر صاحب شروع میں اندھا دھند شیئرز خریدتے رہے ہیں انھیں سمجھاتا تھا کہ ابتدا میں خطرہ مول نہیں لیا جاتا لیکن اُن کا کہنا تھا کہ بغیر خطرہ مول لیے بہت بڑا منافع بھی نہیں مل سکتا۔ ویسے مجھے اس بات کا ملال ہے کہ انھیں میرے توسط سے کبھی منافع نہیں ہو سکا۔"

ساجدہ کے اعصاب تن گئے۔ وہ بہت زیادہ دلچسپی بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ یہ موضوع ختم ہو۔ "بشیر سے آپ کا کاروباری تعلق کب شروع ہوا تھا؟" اُس نے سرسری طور پر پوچھا۔

"مجھے خوب یاد ہے۔ یہ مارچ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ بشیر صاحب نے ایک لاکھ روپے سے سرمایہ کاری کا آغاز کیا تھا۔" شاہ زیب نے کہا۔ "لیکن انھیں منافع کسی اور کے توسط سے ہوا ہو گا۔"

"ایک لاکھ!" ساجدہ حیران رہ گئی۔

"جی ہاں!" شاہ زیب نے کہا۔ پھر ہنس دیا۔ "کمال ہے، میں تو یوں بتا رہا ہوں جیسے یہ کوئی انکشاف ہو۔ آپ اُن کی بیوی ہیں۔ بے خبر تو نہیں ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے یہ بات۔" ساجدہ بولی۔ "اب یہ یاد نہیں آ رہا کہ وہ ایک لاکھ روپے کہاں سے آئے تھے؟"

"مجھے اس کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ مجھے تو اس سے غرض ہے کہ کوئی شخص سرمایہ کاری کر رہا ہے میرے توسط سے۔ مجھے اُس کے ذرائع سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔"

ساجدہ سوچتی رہی۔ نادر کا قتل جون ۱۹۸۷ء میں ہوا تھا۔ گویا اُس کی موت کے نو ماہ بعد بشیر نے ایک لاکھ روپے سے سرمایہ کاری کی تھی۔ پھر اُسے ایوب کی رقم کی اپیل یاد آئی۔ ایوب نے کہا تھا! مجھے رقم کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ رقم میرے پاس ہوتی تو میرے بچے عُسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے۔

اب ساجدہ کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ ایوب کو واقعی رقم کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ہوتا تو رقم دے کر آزادی نہ خرید لیتا۔ اُس کے بیوی بچے مفلوک الحال کیوں ہوتے۔ ساجدہ کا جی گھبرانے لگا۔ پھر بھی دل پر جبر کر کے وہ کچھ دیر اور بیٹھی۔ بالآخر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

گھر پہنچتے ہی اُس نے اخبار کھولا اور سائرہ ایوب کا پتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

❀❀

اگلی صبح ساجدہ، سائرہ سے ملنے کے لیے نکلی۔ سائرہ اپنے بچوں کے ساتھ جس علاقے میں رہتی تھی اُس کا نام سُن کر ہی ساجدہ کا دم گھٹنے لگا تھا۔ علاقہ دیکھ کر تو اُس کا حال اور خراب ہو گیا۔ وہ تو تنگ دستی کے دنوں میں بھی اتنے بُرے حالوں نہیں رہی تھی۔ وہ غریبوں کی بستی تھی۔ تنگ گلیوں سے عجیب طرح کی بدبو پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی کئی بار اُس کا جی چاہا کہ واپس ہو جائے۔

اُس نے دروازے پر دستک دی۔ اگلے ہی لمحے وہ سائرہ کے روبرو تھی۔ پچھلی بار اُس نے سائرہ کو عدالت میں دیکھا تھا۔ سائرہ اُس وقت بھی دُبلی پتلی تھی۔ مگر اب تو وہ مدقوق ہو گئی تھی۔ بالوں پر وقت سے پہلے ہی برف باری کی رُت آ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ساجدہ سے کم عمر تھی۔

سائرہ نے متوحش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "جی فرمائیے؟"

"آپ مجھے جانتی ہیں؟" ساجدہ نے دھیمی آواز میں کہا۔
سائرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا: "اوہ... تم بشیر کی بیوی ہو؟"
"مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟"
سائرہ بدستور دروازے میں کھڑی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر کمرے سے دو بچے نکلے۔ ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکے کی عمر تیرہ اور لڑکی کی بارہ سال رہی ہوگی۔ صحت دونوں کی خراب تھی مگر نہیں وہ صحت کی خرابی نہیں تھی۔ وہ غربت کی مہلک بیماری میں مبتلا تھے اُن کے کپڑوں میں پیوند لگے تھے۔ انھوں نے ساجدہ کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ ساجدہ کو اندازہ ہوگیا۔ بچی وہ تھی جو ایوب کے مقدمے کے دوران سائرہ کی گود میں تھی۔
ساجدہ نے بچوں سے نظریں ہٹائیں اور سائرہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ "اندر آجاؤ۔" اس نے ساجدہ سے کہا۔
کمرے کی حالت اور تباہ تھی۔ وہاں روشنی اور ہوا کا کوئی گزر نہیں تھا۔
"جاؤ... تم دونوں باہر جاکر کھیلو۔" سائرہ نے بچوں سے کہا۔ بچے ہچکچائے... مگر چند لمحے بعد باہر چلے گئے۔
ساجدہ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک شکستہ میز تھی جس پر فریم ہوئی ایک تصویر رکھی تھی۔ وہ ایوب اور سائرہ کی شادی کی تصویر تھی۔ تصویر میں دونوں نوجوان اور خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ اُن کی مسکراہٹیں ہونٹوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ اُن کے چہرے تک جگمگا رہے تھے۔
ساجدہ نے تصویر سے نظریں ہٹاکر سائرہ کو دیکھا۔ تصویر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال پرانی تھی لیکن موجودہ سائرہ میں فرق کم از کم تیس سال کا پڑا تھا۔ ساجدہ نے حساب لگایا۔ سائرہ کی عمر پینتیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی مگر وہ کم از کم پچاس کی لگتی تھی۔
"بشیر... بشیر تم نے یہ کیا کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔" ساجدہ نے دل ہی دل میں کہا۔
"تم کیوں آئی ہو یہاں؟" سائرہ نے اکھڑ لہجے میں کہا۔
ساجدہ نے اخبار کا وہ تراشا اُس کی طرف بڑھا دیا جس میں رحم کی دوسری اپیل مسترد کیے جانے کی خبر چھپی تھی۔ "میں ایک بات جاننا چاہتی ہوں۔ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا شوہر بے قصور ہے؟"
سائرہ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ پھر اُن میں فاتحانہ چمک ابھری۔ اُس کے ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ نظر آئی۔ "اب میں سمجھی تمہیں تمہارا مجرم ضمیر یہاں لایا ہے۔" اُس نے نہایت بے رحمی سے کہا۔
"یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو تم؟"
"تمہارے چہرے پر لکھی ہے یہ بات۔" سائرہ نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "تم جانتی ہو کہ غلط آدمی سزا بھگت رہا ہے۔ تمہارا شوہر بھی اس بات سے واقف ہے۔"
"لیکن عدالت نے ثبوت کی بنا پر..."
"ثبوت؟ میرا شوہر صرف اس لیے جیل میں ہے کہ تمہارے شوہر نے اُس کے خلاف گواہی دی تھی۔"
"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہارا شوہر بے قصور ہے؟ اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"
"ثبوت تو تم خود لائی ہو۔" سائرہ نے کہا اور تراشا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ "گورنر نے اپیل مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ سرِ دست رحم مل جائے تو اپیل پر غور کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم میرے شوہر کے پاس ہوتی تو وہ دے نہ دیتا۔ اُسے جیل میں سڑنے کا شوق نہیں ہے۔ اُس رحم سے کیا فیض پہنچا ہے ہمیں۔ ہمارا حال تمہارے سامنے ہے۔"
ساجدہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ بات معقول ہے۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہ کرسکی۔ اُس نے پھر میز پر رکھی تصویر کو دیکھا۔
"تمہیں معلوم ہے کہ ہم کہاں سے کہاں آگئے ہیں؟" سائرہ نے کہا۔
"ہمارا اپنا مکان تھا۔ پڑوس بھی اچھا تھا۔ میں سوچتی تھی میں اپنے بچوں کی اچھی پرورش کرسکوں گی۔ انھیں اچھا ماحول ملے گا۔ ہم انھیں تعلیم دلائیں گے۔ لیکن پھر ہماری مشکلات کا آغاز ہوگیا۔"
"مشکلات؟"
"ہاں پہلے میری ساس بیمار پڑیں۔ وہ اسپتال میں داخل ہوئیں۔ اس دوران ایوب کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا۔ اُن کی بیوی اور بچے بے سہارا ہوگئے۔ سب سے بڑا بیٹا اسکول میں تھا بے چارے کا۔ ایوب سے تو غیروں کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی اپنوں کی پریشانی سے چشم پوشی کیسے کرتے۔ بہرحال وہ حتی الامکان ہر ذمے داری نبھاتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں کم ظرف تھی۔ اُن پر طعنہ زنی کرتی رہی۔ ایسے میں مرد بے چارہ کیا کرسکتا ہے۔ ایوب کو کچھ سجھائی نہ دیتا تو غم شراب میں ڈبو دیتے۔ عدالت میں یہ حوالہ بھی انھیں لے ڈوبا۔ قتل کی رات بھی انھوں نے پی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ دس بجے وہ آفس سے نکلے۔ پھر انھوں نے باہر بھی پی۔ گیارہ بجے پولیس نے انھیں اٹھالیا۔ اُس دن کے بعد سے وہ گھر نہیں آئے اب تک۔"
"مجھے افسوس ہے..."
"افسوس؟ ہونہہ! وکیل کی فیس کے چکر میں ہمارا مکان بک گیا۔ پھر بھی وہ بری نہیں ہوسکے۔ میرا گھر تباہ ہوگیا۔ اور اصل قاتل کہاں ہے؟ وہ عیش کر رہا ہے بنگلے میں رہتا ہے۔ تم جانتی ہو اُس بنگلے کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے... میرے شوہر کی زندگی!"
"نہیں سائرہ... ایسے نہ کہو۔" ساجدہ نے تڑپ کر کہا۔
"اُس وقت تمہارا شوہر بھی محض ایک کلرک تھا۔ پھر اچانک دولت کہاں سے آئی؟ آسمان سے برسی یا زمین نے کوئی دفینہ اُگل دیا

تھا۔" سائرہ کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ "جواب دو۔ تمہارے شوہر نے بنگلا کیسے خریدا؟ تم حقیقت سے واقف تھیں مگر تمہیں کیا پڑی تھی کہ کچھ کرتیں۔ تم نے میرے شوہر کو جیل میں..."

"نہیں سائرہ نہیں!" ساجدہ کے وجود میں زہر اُتر رہا تھا۔ "یقین کرو مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتی۔ مجھے تو اب احساس ہوا کہ یہ بھی ممکن ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"تمہیں معلوم ہو ہی نہیں سکتا!" سائرہ نے نفرت سے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ قاتل کی بیوی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ جینے میں ایک بار اپنے شوہر سے ملنا... ملنا کیسا... پنجرے میں بند جانور کو دیکھنا کہو... کیسا لگتا ہے تم یہ سب کچھ کیسے سمجھ سکتی ہو۔ جس پر بیتے وہی جانتا ہے تم نے میرا یہ گھر دیکھا۔ میرے بچے دیکھے۔" اب سائرہ کا جسم لرز رہا تھا۔ "تمہیں کیا معلوم۔ بچوں کو ساتھ کھیلنے والے دوسرے بچے قاتل کی اولاد کہیں تو اُن پر اور اُن کی ماں پر کیا گزرتی ہے۔ حالانکہ میرے بچے اس سزا کے مستحق نہیں تھے... یہ تمہارے بچوں کا مقدر تھا..."

ساجدہ کو ایک ایک لفظ استنشی کوڑے کی طرح اپنے وجود سے ٹکراتا محسوس ہوا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی کہ سائرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"میری بات سنو۔ خدا کے لیے... اپنا فرض ادا کرو۔ پولیس کو جا کر حقیقت بتا دو۔" سائرہ نے التجا کی۔

"اپنے شوہر کے خلاف...؟"

"دیانت داری کا یہی تقاضا ہے۔"

"نہیں... نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" ساجدہ رو دی۔

سائرہ نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "تمہیں خدا کا واسطہ۔ تمہیں میرے بچوں پر ترس نہیں آتا۔ تمہارے شوہر نے ہماری زندگی کے بارہ برس چرا لیے۔ اب کم از کم اُسے تو کچھ جھیلنے دو۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ میں کچھ نہیں سنوں گی۔" ساجدہ نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور کمرے سے نکل آئی۔ سائرہ اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"تم ظالم ہو مگر مجھے تم پر ترس آتا ہے۔" سائرہ نے چیخ کر کہا۔ "تم ساری عمر اپنے ضمیر پر بوجھ اٹھائے پھرو گی۔ تمہیں کبھی سکون نہیں ملے گا۔"

ساجدہ اس تباہ گھر سے نکل آئی مگر سائرہ کی آواز اب بھی اُس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اُسے اپنا وجود کسی کھوکھلے پہاڑ کی طرح لگا۔ سائرہ کی آواز کی بازگشت اُس میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

بے سکونی اور بڑھ گئی۔ شواہد کی ہر انگلی بشیر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ اب وہ حقیقت کی تلاش میں اتنا آگے آ چکی تھی کہ واپسی بھی ممکن نہیں تھی۔ دوسری طرف اُسے بشیر سے محبت تھی۔ وہ اُس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کسی قیمت پر نہیں...

***

وہ گھر پہنچی تو بشیر کا کارڈ ملا۔ وہ اُس نے اسپیشل ڈاک سے بھجوایا تھا۔ خوبصورت کارڈ تھا۔ اُس پر لکھا تھا۔ "مجھ پر یقین رکھو۔ امتحان کرو۔ بشیر۔"

ساجدہ کو وہ تم ظریفی لگی۔ ایک خط بارہ سال بعد ملا تھا اور اب ایک خط اُسی دن۔ زمانہ ترقی کر گیا تھا۔

وہ انھی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ شاہدہ نے اُسے چونکا دیا۔ "امی... بھائی کا فون آیا تھا۔ انھیں چھٹی مل گئی ہے۔"

"واہ... خدا کا شکر ہے۔" ساجدہ نے بڑے خلوص سے کہا اور دل میں سوچا۔ "چلو... کوئی اچھی خبر تو ملی۔"

"اور امی... اُن کی ترقی بھی ہو گئی ہے۔ وہ کیپٹن بن گئے ہیں اب۔ ابو سنیں گے تو فخر سے پھول جائیں گے۔"

"اللہ مبارک کرے۔" ساجدہ بولی۔ "کب آ رہا ہے نذیر؟"

"بدھ کی صبح۔" شاہدہ نے جواب دیا۔ پھر اُس نے بشیر کا کارڈ پڑھا اور خوش ہو کر بولی۔ "امی... میرے ابو کتنے اچھے ہیں۔ ہے نا؟"

"ہاں... وہ بہت اچھے ہیں۔"

"اب پچیس سال بعد بھی وہ آپ کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہیں۔ کمال ہے۔" شاہدہ نے ہنستے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

ساجدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ کوئی نہیں جان سکے گا۔ یہ بوجھ صرف بھی کو اُٹھانا ہے۔ باتیں کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اذیت کم ہو جاتی ہے۔ مگر میں تو اس سلسلے میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ یہ بوجھ تو دل پر ہی بہتر ہے۔ اسے ہلکا کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اُس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ اُسے وہ گھر یاد آ گیا جہاں سائرہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اُس سوانح نے احساسِ جرم سوا کر دیا۔ یہ پُرسکون گھر، تمام آسائشات... ہر چیز میں ایک زندہ شخص کا لہو شامل ہے۔ یہ سب چوری کا مال ہے...

وہ اٹھی۔ اُس نے پانچ ہزار روپے کا ایک چیک کاٹا۔ اُسے لفافے میں رکھا اور لفافے پر سائرہ ایوب کا نام اور پتا لکھ کر اسپیشل میل ڈلیوری والوں کو فون کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد کوریئر آیا اور لفافہ لے گیا۔ ساجدہ کو پہلی بار نسبتاً سکون کا احساس ہوا۔

بدھ کی صبح نذیر آ گیا۔ وہ پہلے سے دراز قد، وجیہہ اور تندرست لگ رہا تھا۔ ساجدہ اُسے دیکھ کر گویا پھر سے جی اٹھی۔ ساتھ ہی اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ ہو بہو بشیر کا عکس ہے۔ وہ آتے ہی اُس سے لپٹ گیا۔ "امی... سچ مچ آپ مجھے کبھی یاد نہیں آتیں۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا مگر اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"میں بھی تمہیں کبھی یاد نہیں کرتی۔" ساجدہ بھی ہنس دی۔

"حساب برابر!"

"اور ابو کہاں ہیں؟" نذیر نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا "کسی کام سے گئے ہوئے ہیں؟"

"وہی پرانے ابو... بس پیسہ بڑھانے میں لگے رہتے ہیں ہر وقت" نذیر نے کہا۔ "اور یہ آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے ہیں!"

"کچھ بھی نہیں۔ بس شاہدہ کی شادی کے انتظامات کی فکر ہلکان کیے دیتی ہے۔"

"اب فکر نہ کریں لیکن امی میری چھٹیاں دینے والے دن تک ہیں۔ تقریب سے سیدھا رخصت ہو جاؤں گا میں۔"

ساجدہ نذیر سے باتیں کرتی رہی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد بشیر بھی آگیا۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ بشیر کی آنکھوں میں افتخار کی چمک تھی۔ بہت دنوں کے بعد پورا کنبہ یکجا ہوا تھا۔ یہ ساجدہ کی جنت تھی۔ اُس لمحے وہ ان سب کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا لگ رہا تھا۔ جیسے بیچ میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

لیکن اس دوران بشیر اور ساجدہ ایک بار بھی ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوئے تھے۔

پھر ڈاکیہ آیا۔ ساجدہ نے جا کر ڈاک وصول کی اور لائبریری میں چلی آئی۔ تین خط تھے۔ اُن میں سے ایک خط سائرہ ایوب کی طرف سے تھا۔ ساجدہ نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں کوئی خط نہیں تھا۔ صرف اُس کے بھیجے ہوئے چیک کے پُرزے تھے۔

ساجدہ کے رخسار تمتما اُٹھے۔ اُسے ایسا لگا جیسے سائرہ نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ سائرہ نے بے حد ضرورت مند ہونے کے باوجود رقم قبول نہیں کی ہے۔ اگر وہ سائرہ کی جگہ ہوتی تو خود بھی یقیناً ایسا ہی کرتی۔

اُس نے چیک کے پُرزے ٹوکری میں ڈال دیے۔ اُسی لمحے شاہدہ کمرے میں چلی آئی۔ "امی... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔ چلیے نا... بھائی آپ کو بلا رہے ہیں!"

ساجدہ نے خالی لفافہ جلدی سے میز کی دراز میں رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اب اُس کا موڈ خوش گوار نہیں تھا۔ پہلے جیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس خط نے اُسے یاد دلا دیا تھا کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ دلوں کے درمیان بھی فاصلے حائل ہو گئے ہیں۔

❋❋❋

پورا دن نذیر سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ساجدہ سوچتی رہی کہ آج بشیر سے کھل کر بات کرے گی۔ جلد یا بدیر حقائق کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ بشیر کو یہ بھی بتانا تھا کہ وہ سائرہ سے مل چکی ہے... اور یہ بھی کہ ہر سراغ اُسی کا پتا دے رہا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ اب بھی بشیر کوئی ایسی

چیک اپ پوائنٹ

یہ حقیقت ہے کہ عمر اور حالات کے مطابق ہمارے جسم میں شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے۔ ممکن ہے آپ بھی اس سے دوچار ہوں — اپنا جائزہ لیجئے اور ہمارے پاس آنے کی بجائے اپنی مکمل کیفیت قلمبند کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے۔ مثال کے طور پر:

- مٹاپا یا جسمانی کمزوری اور دُبلاپن
- کمزور یادداشت اور ناقص حافظہ
- کیل مہاسوں، داغ دھبوں اور پھنسیوں
- گنجاپن، بے رونق، گرتے اور سفید ہوتے بالوں
- ازدواجی مسائل اور ناآسودگیوں
- نسوانی سراپا کی رعنائی میں اضافے اور نامکمل جسمانی نشوونما
- چہرے اور گردن کے بدنما، فاضل بالوں
- تمام نسوانی تکالیف اور شکایات
- چھوٹے قد میں اضافے (صرف بیس سال تک)

اگر آپ مندرجہ بالا کسی بھی عارضے کا شکار ہیں تو تفصیلی کیفیت کے ساتھ چیک اپ پوائنٹ سے رجوع کر کے گھر بیٹھے تمام پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، ہمیں ماہرین کا تعاون حاصل ہے۔

خواتین اپنے خطوط "شعبۂ خواتین کی انچارج" کو ارسال فرمائیں

خط و کتابت جوابی لفافے کے ساتھ کیجئے!

پوسٹ بکس نمبر 2297 کراچی نمبر 18

وضاحت پیش کرے گا جو جادوئی طریقے سے صورتِ حال کو بدل ڈالے گی۔
لیکن رات کو بشیر بیڈ روم میں آیا اور اُسے چھوا تو وہ سمٹی اور بدن چُرانے لگی۔
"تمھارا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" بشیر نے شکایتاً کہا۔ اُس کے چہرے پر پریشانیاں اُتر آئی تھیں۔
"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔"
"پہلے مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟ تمھارا یہ غیر معقول رویہ میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکوں گا۔" وہ چیخنے لگا۔
ساجدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کیسے شروع کرے؟
"یہ سب اُسی خط کا چکر ہے نا؟" بشیر آپے سے باہر ہو گیا۔ "تمھیں میری بات پر یقین نہیں۔ اُس ذلیل اور گھٹیا آدمی، اس بلیک میلر کی بات میرے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ یہی بات ہے نا؟"
"بشیر...! ایک بات مجھے سچ سچ بتا دو۔ یہ دولت کہاں سے آئی؟" ساجدہ بھی چلانے لگی۔
"میں تمھیں بتا چکا ہوں۔"
"نہیں... تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"
بشیر ششدر رہ گیا۔ "کیا... کیا کہا ہے تم نے؟"
ساجدہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں شاہ زیب سے مل چکی ہوں۔"
"شاہ زیب سے؟" بشیر کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ "اُس نے کیا بتایا تمھیں؟"
"اُس کا کہنا ہے کہ تمھیں فیئر زمین فائدہ نہیں، نقصان ہوا تھا۔"
"چلو اچھا ہوا۔ اب تمھیں پتا چل گیا۔ اب مطمئن ہو گئی ہو گی۔" بشیر نے سرد لہجے میں کہا۔
"بشیر...! مجھے بتاؤ نا۔ کہاں سے آئی یہ دولت؟" ساجدہ نے اُسے جھنجوڑ ڈالا۔
"اب مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ شاہ زیب سے پوچھو جا کر۔ شاید وہ بتا دے۔" بشیر نے ترشی سے کہا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔ "وہ شیئرز میں نے دوسرے بروکر کے توسط سے خریدے تھے۔"
"کس بروکر کی بات کر رہے ہو؟"
"نام بتاؤں گا تو تم پھر جاسوسی کرنے لگو گی۔ میں کہتا ہوں، تم مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کرتیں؟"
"خدا کے لیے بشیر...!"
"اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا ساجدہ۔ وہ بروکر مر چکا ہے۔" بشیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
ساجدہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اُس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔
"دیکھو ساجدہ... اب یہ گھیراؤ کا کھیل ختم کر دو۔" بشیر نے مزید کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تمھارے خیال میں نادر کو میں نے قتل کیا تھا اور رقم بھی چرائی تھی۔ صرف یہی نہیں، میں نے اپنی جان بچانے کے لیے بے قصور ایوب کو جیل میں پہنچانے کا گناہ بھی کیا ہے۔"
ساجدہ خاموش رہی۔ اس بات کے جواب میں کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔
"ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں۔ تم کو اتنی رات گئے ایک قاتل کے ساتھ تنہائی میں خوف آ رہا ہو گا۔ تم میرا لمس تک برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور اب سچی بات یہ ہے کہ تمھاری اس خوفناک بدگمانی کے بعد میں تمھاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میرا خیال ہے، ہماری ازدواجی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔"
"میری بات تو سنو...!"
مگر بشیر پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ ساجدہ بستر میں دراز ہو گئی۔ ایک عجیب سے احساسِ زیاں نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود ہی اپنی جنت کو برباد کر رہی تھی، صرف اس لیے کہ اُسے بشیر پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بشیر کے بغیر جی نہیں سکے گی، مر جائے گی۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر بشیر کے پاس چلی جائے... اُس سے معذرت کر لے۔ وہ بے اعتمادی کی خطا کار تھی۔
وہ اُٹھی... مگر اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک بوڑھا مگر مہربان اور باوقار چہرہ گھوم گیا۔ وہ اُس کے باپ کا چہرہ تھا۔ پھر اُس کی آواز ذہن کے نہاں خانے میں گونجی... ہمیشہ حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ آدمی کو سچائی سے کبھی نہیں ڈرنا چاہیے۔
وہ بستر پر ڈھے گئی۔ اُسے ہر حال میں حقیقت کا پتا چلانا تھا۔ اور حقیقت کی تلاش کے لیے ابھی ایک دروازہ اور باقی تھا۔ اس دروازے کو کھولنے کے بعد حقیقت کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ اُس نے سوچا کہ حقیقت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہے۔ یہ دروازہ بھی کھول ہی لیا جائے۔

**

بارہ سال کی تاخیر سے ملنے والے لفافے پر کریم بخش کا پتا نہیں تھا مگر اندر خط میں پتا موجود تھا اور وہ ساجدہ کو اب بھی زبانی یاد تھا۔ وہ اگلی صبح دس بجے اس پتے پر پہنچی۔ مکان کبھی اچھا خاصا رہا ہو گا مگر اب اپنے مکینوں کی مفلوک الحالی کی داستان سنا رہا تھا۔ دیواروں سے پلاستر اُکھڑ رہا تھا۔ مکان برسوں سے رنگ و روغن سے محروم تھا۔
ساجدہ نے دروازے پر دستک دی۔ ایک بھاری بھرکم خاتون نے دروازہ کھولا۔ اُس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔
"مجھے کریم بخش سے ملنا ہے۔" ساجدہ نے جواب دیا۔
اندر سے کوئی مردانہ پکار سنائی دی۔ "کون ہے؟"
"ایک عورت تم سے ملنے آئی ہے۔" بھاری بھرکم خاتون نے پلٹ کر چیختے ہوئے جواب دیا۔

"اندر بلالو۔"

بھاری بھرکم خاتون نے ایک طرف ہٹ کر ساجدہ کو راستہ دیا۔ پھر وہ ساجدہ کو اندر والی کمرے میں لے آئی۔ کھڑکی کے پاس کریم بخش بیٹھا تھا۔ وہ بہت متفکر اور ناتواں لگ رہا تھا۔ استخوانی جسم کو دیکھ کر لگتا تھا ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ساجدہ کو اشتباہ کی جھلکیاں نظر آئیں لیکن وہ اسے پہچانا نہیں تھا۔ بولی فرمائیے؟"

"میرا نام ساجدہ ہے۔ میں بشیر کی بیوی ہوں۔"

"بشیر کی بیوی!" کریم بخش نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہیں سکا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں تم سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

کریم بخش نے سخت لہجے میں اپنی بیوی سے کہا۔ "ہاجرہ... تم جاؤ۔ چائے بنا کر لاؤ۔"

ہاجرہ نے ایک نظر ساجدہ کو دیکھا۔ پھر کمرے سے چلی گئی۔ اس نے اپنے عقب میں دروازہ بند کر لیا تھا۔ "اب بولو۔ کیا بات ہے؟" اس کے جانے کے بعد کریم بخش، ساجدہ سے مخاطب ہوا۔

ساجدہ نے اسے بارہ سال پرانے خط کی تاخیر سے وصولی کے بارے میں بتایا۔ کریم بخش نگاہوں میں حیرت لیے اسے تکتا رہا۔ ساجدہ کے خاموش ہونے کے بعد اس نے دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "تو یہ بات ہے۔ خط پہنچا ہی نہیں تھا اس تک۔ اور میں اتنے عرصے پریشان رہا کہ آخر بشیر کے اعصاب کتنے مضبوط ہیں۔ اب یہ بھی بتاؤ، تم میرے پاس کیوں آئی ہو یہ اطلاع لے کر؟"

"میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ تم نے خط میں جو کچھ لکھا ہے، جھوٹ ہے یا درست؟ کیا واقعی میرے شوہر نے نادر کو قتل کیا تھا؟"

"ہاں۔ نادر کو بشیر نے ہی قتل کیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا..."

"یہ کیسے ممکن ہے۔ تم نے عدالت میں کہا تھا کہ اس رات تھانہ چھٹی تھی۔"

"میں نے عدالت میں پوری حقیقت نہیں بتائی تھی۔ اس کی ایک وجہ تھی..."

"مجھے بتاؤ... اس رات ہوا کیا تھا؟" ساجدہ بے چین ہونے لگی۔

"بیٹھ جاؤ۔" کریم بخش نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں بتانے میں کوئی ہرج نہیں... بلکہ فائدہ ہی ہے۔ میری چھٹی تھی۔ اس کے باوجود میں آتش دان چیک کرنے کی غرض سے دفتر چلا گیا۔ میں داخل ہوا ہی تھا کہ میں نے زینوں پر قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اوپر سے نچلی منزل پر آ رہا تھا۔ وہ تمہارا شوہر تھا۔ میں نے اسے دیکھ لیا مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکا۔ وہ نادر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ تمہارے شوہر کے ہاتھ میں سیاہ تھیلا تھا اور وہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسے نادر کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتے اور پھر بتی بجھاتے دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ نادر نے چیخ کر کہا... 'ایوب' تمہارے شوہر کی دفتر میں موجودگی کا اسے علم نہیں تھا۔ البتہ ایوب کے بارے میں اسے معلوم تھا۔ اسی لیے اس نے یہ فرض کر لیا کہ کمرے میں آنے والا ایوب ہے۔ چند لمحے بعد تمہارا شوہر کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں موجود سیاہ تھیلا خالی نہیں تھا۔ اس نے مٹھی کھڑکی کھولی اور سیاہ تھیلا اپنے ساتھی کو دے دیا۔ پھر اس نے پولیس کو فون کر دیا۔ اس پر کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"ساتھی؟ میرے شوہر کا ساتھی؟ وہ کون ہو سکتا ہے؟" ساجدہ کے لہجے میں الجھن تھی۔

"یہ تم اپنے شوہر سے ہی پوچھو۔ اس کا ساتھی کبھی سامنے نہیں آیا۔"

"چلو... ٹھیک ہے۔ رقم کی تو بشیر کو ضرورت تھی مگر نادر کا قتل تو ضروری نہیں تھا۔" ساجدہ نے اعتراض کیا۔

"تمہارا شوہر بے وقوف نہیں ہے۔ نادر کی موت بستر تھی۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ آلۂ قتل ایوب کا تھا اور اس پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود تھے۔ تمہارا شوہر غضب کا اداکار ہے۔ جس طرح اس نے ایوب کو جیل بھجوایا اس پر میں اسے داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عدالت میں اس نے زبردست اداکاری کی۔ وہ ایک اچھے شہری کا کردار ادا کر رہا تھا جسے اپنا ناگوار فرض انجام دینا تھا..."

ساجدہ اندر ہی اندر کٹتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔ "تم جانتے تھے کہ ایوب بے قصور ہے۔ پھر خاموش کیوں رہے؟"

"تمہیں تو اس پر میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اگر میں نے عدالت میں سچ بول دیا ہوتا تو آج ایوب کے بجائے تمہارا شوہر جیل میں ہوتا۔" کریم بخش نے مکروہ قہقہہ لگایا۔ "اس اعتبار سے تم میری مقروض ہو۔ تم بارہ سال سے پُرتعیش اور پُرسکون زندگی گزار رہی ہو... صرف میری وجہ سے۔"

"تم نے صرف دولت کی خاطر بے قصور ایوب کی زندگی تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش نہیں کی؟"

"میں غریب آدمی تھا... اب بھی ہوں۔" کریم بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے سوچا تھا تمہارا شوہر امیر ہو جائے گا تو مجھے بھی حصہ دے گا۔ خاموشی کی قیمت ادا کرے گا مجھے۔ میں بھی خوش حال ہو جاؤں گا لیکن میری دھمکی کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ فیصلہ کن شہادت چھپانے کے جرم میں میں بھی ملوث ہو جاؤں گا۔"

"تو بشیر نے تمہیں کوئی رقم ادا نہیں کی؟"

"ایک دھیلا بھی نہیں۔ پہلی بار میں نے براہ راست دھمکی دی تھی۔ پھر میں نے خط لکھا۔ یہ اب معلوم ہوا کہ وہ خط اس تک پہنچا ہی نہیں۔ میں اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا تھا لیکن وہ مجھے نظر انداز

کر رہا تھا۔ میں گیارہ سال یہ سوچتا رہا ہوں کہ بشیر آہنی اعصاب کا مالک ہے۔ آٹھ سال سے میں بیمار ہوں۔ گزر اوقات بھی مشکل سے ہو رہی ہے۔ میں کوڑی کوڑی کو ترستا رہا ہوں۔ اگر میرا خط تمہارے شوہر کو مل جاتا تو میں نے یہ عرصہ سختی میں نہ گزارا ہوتا۔ میں اسپتال میں پرائیویٹ کمرا بھی لے سکتا تھا۔"

ساجدہ کی آنکھوں میں اس تیزی سے آنسو اُمنڈے کہ کمرا دھندلا نے لگا۔ وہ اس ذلیل شخص سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اُس نے ممنوعہ سڑک پر قدم رکھنے کی حماقت کی تھی اور اب ایک بند گلی کے سامنے کھڑی تھی۔ اب وہ خوف زدہ تھی۔ اپنے لیے۔ بشیر کے لیے۔ بچوں کے لیے۔ وہ واپسی کے خیال سے پلٹی۔

"ایک منٹ۔ میری بات سنو۔" کریم بخش نے پکارا۔ ساجدہ نے پلٹ کر دیکھا۔ "تم مجھے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تمہاری آمد میرے لیے اچھا شگون ہے۔ تمہارا شوہر اب بھی مصیبت میں ہے۔ میں اب بھی پولیس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔"

"یعنی تم اب بھی بلیک میل کرو گے۔" ساجدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں نہیں۔ تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ اب بھی میں اس صورت حال سے فائدہ نہ اٹھاؤں تو یہ میری حماقت ہوگی۔"

"تم غلطی کرو گے۔ اگر بشیر نے ماضی میں تمہارا مطالبہ رد کر دیا تھا تو اب وہ بارہ سال بعد کیسے مانے گا۔"

"تم اسے قائل کرو گی... مجبور کرو گی۔"

"میں؟ یہ کیسے ممکن ہے۔" ساجدہ چیخ اٹھی۔ "میں تو اُس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں تم سے ملی تھی..."

"میں جانتا ہوں، تم نے یہاں آکر حماقت کی ہے۔" کریم بخش کے لہجے میں شیطنت تھی۔ "تم نے مُردے کو زندہ کر دیا ہے۔ اب تم ملوث ہو چکی ہو۔ لیکن میں کوئی لالچی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے ہر ماہ تین ہزار روپے دے دو، میں چپ رہوں گا۔ رقم تم دو یا بشیر دے، مجھے اس سے سروکار نہیں۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔ میری حالت تو تم دیکھ رہی ہو۔ میں زیادہ عرصے نہیں جی سکوں گا۔ لہٰذا مجھے ملوث ہونے سے کوئی خوف نہیں۔ میں سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔"

**

وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ کسی نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ بشیر کا چہرہ اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ بشیر نے اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ لفافہ لہرایا جس میں سائرہ کی طرف سے چیک کے پُرزے موصول ہوئے تھے۔ "سائرہ نے تمہیں خط لکھا تھا... کیوں؟ لاؤ مجھے دکھاؤ وہ خط۔"

ساجدہ اُسے وضاحت سے سب کچھ بتانے پر مجبور ہو گئی۔ ظاہر ہے، خط وہ کہاں سے لاتی۔

بشیر نے اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ بہت زیادہ ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ ساجدہ رونے لگی۔ بشیر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔ "تم نے حد کر دی۔" وہ بڑبڑایا۔ "اب کریم بخش کو پھر بلیک میلنگ کی سوجھے گی اور اس بار اسے ٹالنا آسان نہیں ہوگا..."

"میں شرمندہ ہوں بشیر۔"

"شرمندہ ہو؟" بشیر جھنجلا گیا۔ "اب شرمندگی کا کیا فائدہ۔ نقصان تو پہنچ ہی چکا ہے۔ اُس نے ادائیگی کے لیے کتنی مہلت دی ہے؟"

"ایک ہفتے کی۔" ساجدہ نے کہا۔ پھر صفائی پیش کی۔ "میں کیا کرتی بشیر۔ مجھے اس سے ملنا ہی تھا۔"

"اب ایک بات صاف صاف ہو جائے۔ تمہیں یقین ہے نا کہ نادر کو میں نے قتل کیا ہے؟" بشیر نے پوچھا۔

ساجدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بشیر نے سگریٹ سلگایا۔ اُس کے انداز میں نہ برہمی تھی، نہ مایوسی اور نہ ہی پچھتاوا۔

"تم پولیس کے پاس جا کر سب کچھ انھیں بتا دو نا۔ خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ انھیں بتا دو کہ یہ حادثہ تھا..."

"تم پاگل ہو گئی ہو یا مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو۔" بشیر نے سفاکی سے کہا۔

"لیکن بشیر...! ایوب بے چارہ ناکردہ جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔"

"اس سلسلے میں تمہارا ضمیر تمہیں پریشان کر رہا ہے۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔" بشیر نے بے پروائی سے کہا۔ "اب تو فیصلہ تمہیں کرنا ہے ساجدہ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے۔ تم چاہو تو پولیس کے پاس چلی جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

ساجدہ رونے لگی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"عجیب محبت ہے تمہاری۔ تمہیں اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ تمہیں بچوں کا خیال بھی نہیں آیا۔ شاہدہ کی شادی ہونے والی ہے اور نذیر... خیر چھوڑو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب ہم دونوں کے لیے کوئی مستقبل نہیں رہا۔ ہمارے راستے جُدا ہو گئے ہیں۔"

"نہیں بشیر... نہیں... ایسا نہ کہو..."

"تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ شاہدہ کی

شادی تک خاموش رہو۔ اس دوران ہمیں دنیا پر یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم مطمئن اور خوش و خرم ہیں۔ اس کے بعد... تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

ساجدہ نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "بشیر! ایسا نہ کہو۔ میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گی!"

بشیر نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔

ساجدہ پورا دن کمرے میں رہی۔ نذیر اور شاہدہ کو اُس نے بتایا کہ سر میں شدید درد ہے۔ اُس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اُسے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا۔ پھر وہ حل ادھوری شکل میں اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ وہ حل تو پہلے ہی سے اُس کے ذہن میں موجود تھا۔ مگر وہ اُس سے نظریں چراتی رہی تھی۔

اب وہ اس سلسلے میں سوچتی رہی... بے حد غیر جذباتی انداز میں۔ سیدھی سی بات تھی۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کئی دنوں کے بعد پہلی بار اُسے سکون کا احساس ہوا... اور وہ سو گئی۔

باہر کار رکنے کی آواز نے اُسے جگا دیا۔ اُس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ بشیر دفتر میں دیر تک کبھی نہیں رکتا تھا۔ اُس نے مکان کا صدر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر اوپر آتے ہوئے قدموں کی آہٹ۔ اور وہ آہٹ اُس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتے دیکھا اور سوتی بن گئی۔

بشیر اُس کے قریب آکر رکا اور جھک کر اُسے دیکھا۔ بشیر کے منہ سے بُو آرہی تھی۔ وہ نشے میں تھا۔ پھر بشیر نے جھک کر اُس کی پیشانی چومی اور کمرے سے نکل گیا۔

ساجدہ بشیر کے بعد لیٹی رہی۔ بہت دیر تک۔ پھر وہ اٹھی اور بشیر کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ بشیر سو چکا تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسا نوعمر لڑکا معلوم ہوا جسے پیار یا باپ کی طرف سے پٹائی کا خطرہ لاحق ہو۔ ساجدہ نے بڑھ کر اسے ٹھیک طرح کمبل اُڑھایا۔ جھک کر نرمی سے اُس کی پیشانی چومی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔

اس صبح وہ خود کو خوف سے آزاد محسوس کر رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر نذیر اور شاہدہ موجود تھے، بشیر نہیں تھا۔ نذیر نے اس سے طبیعت کے متعلق پوچھا۔ ساجدہ نے جواب دیا کہ اب بہت بہتر ہے۔ پھر اُس نے بشیر کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو جا چکے ہیں۔" نذیر نے بتایا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اُس نے اخبار اُٹھایا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اخبار پھیلاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں خود ترسی کے آنسو آگئے۔

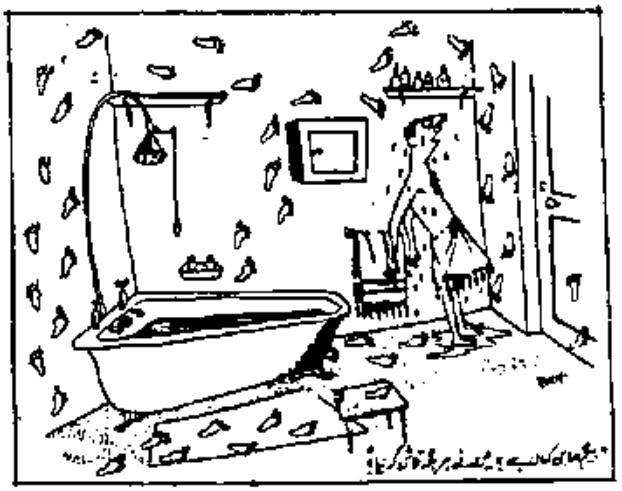

انجام... آخر اس کہانی کا یہ انجام کیوں ہونا تھا۔ کیوں؟ بڑی مشکل سے اُس نے خود کو سنبھالا اور اخبار کی طرف متوجہ ہوئی۔ چند لمحے بعد چھوٹی سی اس خبر نے اسے دہلا دیا۔ لفظ اسے چیختے چنگھاڑتے محسوس ہوئے۔

کسی نے کریم بخش کو قتل کر دیا تھا۔ پولیس قتل کا معاملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

❀❀

شاہدہ کی شادی خوش اسلوبی سے ہو گئی تھی۔ اب ولیمے کی تقریب بھی ختم ہونے والی تھی۔ اس تقریب میں اُن کی حیثیت مہمانوں کی تھی۔ ساجدہ کو لگا اُس کے سینے سے کوئی بہت بڑی چٹان اُٹھ گیا ہو۔ اب وہ آزاد ہونے والی تھی۔ اب سے کچھ دیر بعد وہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر آزادانہ فیصلہ کر سکتی تھی۔

تقریب سے نمٹ کر وہ گھر آئے۔ اب انہیں نذیر کو رخصت کرنا تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اُسے رخصت کرتے ہوئے ساجدہ ملول اور دلگیر ہو گئی۔ نذیر اُس کا مذاق اڑاتا رہا مگر خود اُس کی پلکوں پر بھی نمی اُتر آئی تھی۔ یہ ساجدہ کے دُکھ کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اسے معلوم جو تھا۔

نذیر کے جانے کے بعد بشیر اُس سے مخاطب ہوا۔ "ہاں ساجدہ! اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے نمٹا دیا جائے۔"

ساجدہ کو جھوٹ بولنا تھا اور مؤثر طور پر بولنا تھا۔ وہ اس لمحے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ بالآخر اُس نے کہا۔ "بشیر... مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں تم قاتل نہیں ہو سکتے۔"

بشیر حیران رہ گیا۔ "ابھی چند روز پہلے تو تمہیں میرے قاتل ہونے پر یقین تھا!"

"ہاں۔ میں پاگل ہو گئی تھی شاید۔ اُس خط نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تھی اور مجھے بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ اب سوچتی ہوں، بے چاری سائرہ کا کوئی قصور نہیں۔ اُس کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ وہ ایوب کو بچانے کے لیے کسی پر بھی الزام لگا سکتی ہے۔

دوسری طرف کریم بخش نے مجھے جو کہانی سنائی اس میں کوئی جان نہیں تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں... تمہیں جانتی ہوں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے کریم بخش کو پھر تمہارے سر پر سوار کر دیا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس سے میں نمٹ لوں گا۔"

"ہاں... بلکہ نمٹ چکے ہو۔" ساجدہ نے دل میں سوچا۔ "تم نہیں جانتے کہ میں وہ چھوٹی سی غیر اہم خبر پڑھ چکی ہوں۔"

بشیر نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے ساجدہ۔ خیر... اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا کرتے ہیں کچھ دن تمہارے والد کے کاٹیج میں گزارتے ہیں۔ ان دنوں جھیل کے کنارے کچھ اور ہی سماں ہو گا۔ کل صبح چلتے ہیں تم سامان پیک کر لو۔"

ساجدہ کو خوشی تھی کہ یہ تجویز اسے پیش نہیں کرنی پڑی۔

اس رات وہ سو نہیں سکی۔ لیکن بشیر کو پتا نہیں چلا۔ وہ خود مزے سے سو رہا تھا۔ صبح ناشتا کرتے ہوئے اس نے ڈائننگ روم کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ وہ یہاں آخری بار ناشتا کر رہی تھی... بشیر کے ساتھ۔ ناشتے کے بعد اس نے ملازمہ اور ماں کو ہدایات دیں۔ پھر وہ اور بشیر گھر سے نکل آئے۔

بشیر نے راستے میں رک کر کھانے پینے کا سامان لیا۔ ساجدہ نے بڑے جوش و خروش سے خریداری کی۔ انھوں نے ایک ہفتے کا سامانِ خورد و نوش لے لیا۔ حالانکہ ساجدہ جانتی تھی کہ یہ غیر ضروری ہے لیکن وہ بشیر کو کسی شبے میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بالآخر وہ کاٹیج پہنچ گئے۔ ساجدہ نے کاٹیج کی صفائی کی۔ ہر چیز قرینے سے رکھی۔ اسے خود پر حیرت تھی۔ وہ خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔

کھانے کے بعد بشیر نے کاٹیج کے سامنے سے روئیدگی چھانٹنے کا ارادہ کیا۔ گھاس بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ درانتی لے کر چلا۔ ساجدہ نے اسے پکارا۔ بشیر نے چونک کر دیکھا۔ ساجدہ کے لہجے میں عجیب سا تناؤ تھا۔ پھر ساجدہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔ "تاور لگائے رکھنا۔" یاد رکھنا... میں تم سے محبت کرتی ہوں... شدید محبت۔" وہ بولی۔

بشیر کا وجود مسرتوں کی پھوار سے بھیگ گیا۔ اس نے درانتی اٹھائی اور خود رو گھاس کی طرف بڑھ گیا۔

ساجدہ اگلے مرحلے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ خواب آور گولیوں سے مدد لے گی لیکن یہاں اس کی شکل آسان کرنے کے لیے جھیل موجود تھی۔ ویسے بھی اسے تو بس مرنا تھا۔ کس طرح یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اس نے برتن دھوئے۔ وہ کاٹیج سے نکل کر جھیل کی طرف چلی تو شام ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن پر خیالات کی یلغار تھی۔ اسے بزدلی کا احساس ہونے لگا۔ وہ حقائق سے منہ موڑ رہی تھی۔ فرار کا راستہ اختیار کر رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ بشیر سے محبت کرتی تھی۔ مگر اب بشیر کے ساتھ رہ نہیں سکتی تھی۔ بشیر دو افراد کی جان لے چکا تھا اور اس کی وجہ سے ایک بے قصور آدمی بارہ سال سے سزائے قید بھگت رہا تھا۔ اصولاً اسے پولیس کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا مگر بشیر کی محبت اس کے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔

وہ پانی میں اتر گئی۔ پانی بے حد سرد تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ تو پیراکی کر رہی ہے۔ زندگی سے چمٹے رہنے کی خواہش آدمی کو ہاتھ پاؤں مارنے پر کس طرح مجبور کر دیتی ہے۔ اس کا اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔ وہ اس خواہش سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ تیرتی رہی۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اچھی پیراک نہیں ہے۔ اور پھر سرد پانی ابھی سے ہاتھ پیر سن کیے دے رہا تھا۔ جلد ہی وہ وقت آئے گا کہ وہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار سکے گی۔ ایسے میں اسے جھیل کے وسط میں موجود ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ تیرتی ہوئی آگے بڑھی۔

دیر ہو گئی۔ اب اس کے ہاتھوں کی حرکت سست پڑ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر کاٹیج کی طرف دیکھا۔ بشیر کوئی چیز اٹھائے شیڈ سے باہر آ رہا تھا۔ پھر بشیر کی نظر اس پر پڑی۔ وہ کنارے پر آیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چیخنے لگا۔ ساجدہ اس کی آواز نہیں سن سکتی تھی مگر سمجھا کچھ دشوار نہیں تھا۔ "واپس آؤ... واپس آؤ... واپس..." بشیر دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔

ساجدہ بری طرح سسکنے لگی۔ کیسے واپس آؤں بشیر؟ کس لیے واپس آؤں؟ وہ پلٹی اور تیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کی بینائی دھندلانے لگی۔ پیر بالکل جواب دے گئے۔ اسی لمحے اس نے تیزی سے ہاتھ چلائے... اور پہلی بار اسے یہ اذیت ناک احساس ہوا کہ وہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود جینا چاہتی ہے۔ وہ پلٹی... اب جینا مشکل تھا۔ وہ تیر کر کنارے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

دھندلائی ہوئی نظروں سے اس نے بشیر کو تیرتے ہوئے... اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دعا مانگنے کے لیے منہ کھولا... تو پانی پھیپھڑوں میں اتر گیا۔ وہ اس کیفیت میں بھی یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اتنا سرد پانی پھیپھڑوں میں اتر کر اتنا گرم کیسے ہو جاتا ہے... جیسے پھیپھڑوں میں آگ بھر گئی ہو۔

وہ جینا چاہتی تھی... مگر ڈوب رہی تھی اور بشیر ابھی اس سے خاصا دور تھا۔ جھیل اپنے آبی ہاتھ پھیلائے اسے آغوش میں بلا رہی تھی۔ کانوں میں پانی کی چنگھاڑ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی اور لگتا تھا پھیپھڑے دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔ پھر وہ گہرے پانی میں چلی گئی۔ درد کا ہر احساس مٹ گیا۔ ہر طرف مہربان اندھیرا تھا۔

❀❀❀

وہ بہت دور کی آواز تھی... اور اسے پکار رہی تھی۔ اس کا تسلسل اسے خود سے منکر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ پھر اسے اپنے سینے

پر بے پناہ دباؤ... اور پھر کاٹ دار درد کا احساس ہوا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھولیں۔ اسے آسمان نظر آیا۔ پھر آسمان کی جگہ ایک سائے نے لے لی۔ بشیر اُس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ سسک رہا تھا۔

"ساجدہ... میری ساجدہ... بے وقوف ساجدہ۔"

ساجدہ کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ بشیر کے لہجے کی محبت نے اُس کی آنکھیں نم کردیں۔ اُسی وقت سینے میں درد کی دوسری لہر اٹھی۔ بشیر اس کا پیٹ دبا کر پانی نکال رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بشیر نے اسے اٹھایا اور کاٹیج میں لے آیا۔ اُس نے اسے کمبل میں لپیٹا اور بستر پر لٹا دیا پھر اُس نے آتش دان دہکایا اور اُس کے پاس آگیا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا ساجدہ؟" اُس نے پوچھا۔

ساجدہ آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان سب کچھ کہہ گئی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ بالآخر ساجدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

"ساجدہ... تم بے وقوف ہو۔"

"اور کوئی صورت نہیں تھی بشیر؟"

"تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تم اب بھی مجھے قاتل سمجھتی ہو؟"

"اور کیا سمجھ سکتی ہوں میں؟"

بشیر اسے دیکھتا رہا مگر اُس کی نگاہوں میں برہمی نہیں تھی پھر وہ اٹھا۔ "میں ابھی آیا ساجدہ۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندہ تھا۔ "یہ مجھے خوش قسمتی سے شیڈ میں مل گئے۔" اُس نے کہا۔ "مجھے ان کی تلاش تھی۔ یہ میرے بے گناہی کا ثبوت ہیں۔ ان سے تمہیں پتا چلے گا کہ مجھے درحقیقت شیئرز کے کاروبار میں اچانک زبردست منافع ہوا تھا۔"

ساجدہ خالی خالی نظروں سے اُسے تکتی رہی۔

"تم خود دیکھ لو۔" بشیر نے کاغذات اُس کی طرف بڑھائے۔

ساجدہ نے کمزوری کے باوجود کاغذات دیکھے۔ اس کی آنکھوں سے تحیر جھلکنے لگا۔

"میرا ابرو کر مر چکا ہے۔ میری کوشش کے باوجود اصلی کاغذات نہیں مل سکے۔ مجھے یاد تھا کہ اُن کی نقول میرے پاس ہیں۔ مگر یہ یاد نہیں آتا تھا کہ کہاں۔ میں بھول گیا تھا۔ میں نے دوسرے بروکر کے توسط سے منافع حاصل کیا۔ پھر اس میں سے ایک لاکھ کی سرمایہ کاری شاہ زیب کے توسط سے کی۔ مگر وہ پیسہ ڈوب گیا۔ شاہ زیب مجھے راس ہی نہیں آیا تھا۔ میں پھر پرانے بروکر سے مل کر کاروبار کرتا رہا۔ اُس کی موت کے بعد میں نے شیئرز کا دھندا چھوڑ دیا۔ ٹرک مزید باغات خریدے اور اپنا کاروبار مستحکم کیا۔"

ساجدہ رونے لگی۔ "اور میں تم پر شک کرتی رہی۔ جبکہ مجرم ایوب ہی تھا۔"

"میں تمہیں بتاتا رہا مگر تم نے سنا ہی نہیں۔"

"میں نے کتنا ظلم کیا تمہارے ساتھ۔ میں تو تم سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی۔"

"مزید احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ بشیر نے جا کر دروازہ کھولا۔ وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ارجنٹ ٹیلی گرام تھا۔ اُس نے ٹیلی گرام نکالا اور اُسے پڑھا۔

"کیا ہے بشیر؟"

بشیر نے ٹیلی گرام اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ساجدہ نے پڑھا۔

"آج کے اخبار کا پانچواں صفحہ پڑھ لو۔ اور فوراً واپس آجاؤ۔ وکیل دوراب خان۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا چکر ہے۔" بشیر بڑبڑایا۔ "بہرحال... اب تو تم ٹھیک ہو۔ بس یہیں لیٹی رہو۔ میں اخبار لاتا ہوں۔ آج اخبار پڑھا ہی نہیں۔"

ساجدہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بشیر کاٹیج سے نکل آیا۔

❋❋

بشیر واپس آیا تو مڑا تڑا اخبار اُس کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا۔ اُس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟" ساجدہ نے پُرتشویش لہجے میں اُس سے پوچھا۔

بشیر نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں تھا۔"

ساجدہ کو اچانک ہی خیال آیا۔ "تمہارا مطلب ہے۔ کریم بخش کے قتل کے متعلق؟"

"کریم بخش کی مجھے پروا نہیں۔ میں تو ایوب کی بات کر رہا ہوں ساجدہ۔ میں نے اُس کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔"

ساجدہ نے اُس سے اخبار لیا اور لرزتے ہاتھوں سے پانچواں صفحہ کھول کر خبر پڑھی۔ خبر کے مطابق پولیس نے کریم بخش کے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس کی بیوی ہاجرہ نے قتل کیا تھا۔ ساجدہ کو وہ سوٹی بدن عورت یاد آگئی۔ اُس نے پوری خبر پڑھی۔ ہاجرہ کا بیان خبر پر حاوی تھا۔

"میں نے بیس سال کریم بخش کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ بورچ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے کیشیئر نادر کو میرے شوہر نے قتل کیا تھا۔ اس رات کریم بخش کمپنی کے دفتر گیا۔ اُس نے ایوب کے کمرے سے اُس کا لفافہ چاک کرنے والا چاقو چرایا۔ پھر وہ دستانے پہن کر نادر کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے لائٹ آف کر دی۔ اندھیرے میں نادر اُسے نہیں پہچان سکتا تھا اور نہ ہی اُس کا ذہن کریم بخش کی طرف جا سکتا تھا۔ اُس کے خیال میں حملہ آور صرف ایوب ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

اُس نے اپنی آخری چیخ میں ایوب کا نام لیا۔ وہ چیخ بشیر صاحب نے سُنی تھی۔ بہرکیف میرے شوہر نے نادر کو قتل کیا اور رقم سیاہ تھیلے میں اور چیک بیب میں ڈال کر عقبی دروازے سے بھاگا مگر پولیس والا اُس کے پیچھے لگا تو اُس کے اعصاب جواب دینے لگے اس نے رقم کا تھیلا نہر میں پھینک دیا۔

وہ گھر واپس آیا تو دولت پھینک دینے کے غم میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا جرم رائیگاں ہوا تھا۔ پھر اس کے دیوانگی سے مغلوب دماغ کو کچھ اور سُوجھی۔ اسے علم تھا کہ اس رات بشیر صاحب بھی دفتر میں موجود تھے۔ اُس نے انھیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور ایک دھمکی آمیز خط بھی لکھا۔ لیکن بشیر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کریم بخش کیونکہ خود مجرم تھا' چنانچہ صبر کر کے بیٹھ گیا۔ پھر بشیر صاحب کی بیوی کو وہ خط ملا۔ وہ کریم بخش سے ملنے آئیں۔ کریم بخش نے انھیں بلیک میل کیا اور انھیں رقم ادا کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

کریم بخش گزشتہ دس سال سے بیمار تھا۔ میں اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ میں نے بہت بُرے وقت میں بھی اُس کا ساتھ دیا۔ اگر میں اس کا ساتھ نہ دیتی تو وہ برسوں پہلے مر چکا ہوتا۔

لیکن اب جبکہ اُس نے اپنے لیے وظیفہ بندھوا لیا تھا تو میں اُس کے لیے غیر ضروری اور بے کار ہو گئی۔ حالانکہ آسائش میں اُسے مجھے یاد رکھنا چاہیے تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔ اب اُسے میری ضرورت نہیں۔ میں گڑگڑائی۔ میں نے اُس کی منت سماجت کی۔ مگر اُس کا دل نہیں پسیجا۔ وہ مجھے دھکے دینے لگا۔ میں کہاں تک ذلت برداشت کرتی۔ اور اس میں جان بھی نہیں تھی۔ میں نے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ وہ تھا ہی اسی قابل...'

خبر کے مطابق کریم بخش کے مکان سے بلوچ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے مسروقہ چیک بھی برآمد ہوئے' جنھیں وہ ڈر کے مارے کیش نہیں کرا سکا تھا۔

ساجدہ اُن پرچھائیوں کے بارے میں سوچتی رہی' جو ایوب کے تذکرے پر بشیر کے چہرے پر اُتر آتی تھیں۔ اُس کا دل ہمدردی اور محبت سے معمور ہو گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ بشیر کتنا حساس اور صاحبِ ضمیر آدمی ہے۔ اُس نے اخبار ایک طرف رکھا اور بشیر کا ہاتھ تھام لیا۔

"ساجدہ...! مجھے تنہا چھوڑ دو پلیز۔"

"نہیں۔ تم مخواہ اتنے پریشان ہو رہے ہو۔"

"خدا کی پناہ... خواہ مخواہ! میری گواہی کی وجہ سے ایک معصوم شخص نے بارہ سال جیل میں گزارے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ایوب کو ہی بھاگتے دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ نادر نے چیخ کر اُسی کا نام لیا تھا۔ شاید اسی لیے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی..."

"تو اس میں تمھارا کیا قصور ہے؟"

"کیسے نہیں ہے۔ میں ایوب کا مقروض ہوں۔ میں نے اس کی زندگی کے بارہ سنہرے سال اُس سے چھین لیے۔" بشیر کے لہجے میں تلخی تھی۔

"لیکن تم نے دانستہ تو ایسا نہیں کیا۔"

"ایوب کو سزا ہونے کے بعد بھی میں اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے پاگل ہو جاتا تھا میں۔ میرے یقین کی پختہ دیوار میں شک کی ہلکی سی درز بھی تھی۔ پتا نہیں کیوں... میں اس درز کو کبھی بھر نہیں سکا۔ اس کے نتیجے میں عمر بھر میرے سینے پر بوجھ رہا۔ میرا ضمیر مجھے ستاتا رہا۔ میں سوچتا... بارہ سال بعد بھی یہ بوجھ مجھے کیوں ستاتا ہے۔ وجہ اب معلوم ہوئی ہے..."

"اور بشیر... اس رات تم دیر سے آئے اور نشے میں بھی تھے۔ اگلی صبح میں نے کریم بخش کے قتل کی خبر پڑھی۔ میں کتنی پاگل تھی کہ میں نے سوچا..."

"اس رات ضمیر کی خلش اتنی بڑھ گئی کہ مجھے نشے کا سہارا لینا پڑا۔ مجھے رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ میں نے غلط گواہی دی ہے۔ میں سوچتا تھا نے جاؤں اور کہہ دوں کہ مجھے سو فی صد یقین نہیں ہے کہ میں نے ایوب کو دیکھا تھا۔ لیکن اتنے برسوں کے بعد میں حوصلہ کہاں سے لاتا۔"

"تم نے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا؟ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔"

"نہیں ساجدہ... ایسی باتیں کسی سے نہیں کی جا سکتیں۔"

"مجھ سے بھی نہیں؟"

"کسی سے بھی نہیں۔" بشیر نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنی غلطی سے ایک شخص کی... اُس کے بیوی بچوں کی زندگی تباہ کر دی۔ اس کا کوئی کفارہ ممکن نہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ میں اپنا سب کچھ ایوب کو دے کر اُس سے معافی مانگوں گا۔ کاش... وہ مجھے معاف کر دے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا بشیر۔" ساجدہ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم تنہا نہیں ہو۔ اب جو دکھ بھی ہوگا ہم مل کر جھیلیں گے..."

تاریخ کے صفحات میں ان درس گاہوں کا نام ہمیشہ روشن رہے گا جن کے فارغ التحصیل طلبا کے کارہائے نمایاں سے قوموں کو سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا کی تمام عظیم درس گاہیں اپنے نامور اساتذہ اور طلبا کی یادگار ہیں۔ زیرِ نظر داستان بھی ایک یونیورسٹی کے ماحول کی عکاس اور ایک قوم کے مستقبل کا آئینہ ہے۔ اس شہر کا ماجرا جہاں ہر شعبۂ زندگی پر "مافیا" کی گرفت تھی۔

ماضی کے ساز پر حال کا نوحہ۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسرار

گاڈفادر کے مصنف ماریو پوزو کے دوسرے ناول دی سسلین کے ایک باب سے متاثر ہو کر لکھی گئی ایک تحریر

مافیا یونیورسٹی

اقلیم علیم

مسولینی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جنگ امریکیوں نے جیت لی تھی اور اپنی طاقت کے بل بر روم میں اٹلی کی جمہوری حکومت بحال کرا دی تھی لیکن شمال میں ہونے والی ان تبدیلیوں کا سسلی کے ماحول، طرزِ معاشرت اور باشندوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ مسولینی کے اقتدار سے پہلے مافیا کے بڑے ان کے مقدر کے فیصلے صادر کرتے تھے پھر مسولینی نے مافیا کی متوازی حکومت کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے سسلی میں اپنی مہم کا آغاز کیا تو بیشتر "ڈان" اور "چیف" زیرِ زمین چلے گئے پھر مسولینی کی سفاک سپاہ کو جس پر بھی مافیا سے رابطے کا ذرا بھی شبہ ہوا، اسے سرسری کارروائی کے بعد موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا یا دُور دراز جیلوں میں سڑا دیا گیا۔ یوں مسولینی کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ سسلی میں شمال والوں کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات اور گہرے ہو گئے جو حالات کی بنا پر پہلے سے ان کے دِلوں میں پروان چڑھ رہے تھے۔ اس دَور میں سسلی کے ہزاروں شہری مافیا سے روابط رکھنے کے شبے میں گھروں سے گھسیٹ کر نیپلز، روم، میلان اور دوسرے بڑے شہروں کی جیلوں میں پہنچا دیے گئے۔

مسولینی کے خاتمے پر روم میں جو حکومت بنی وہ بے اختیار

اور بے وسائل تھی البتہ امریکیوں کے ایما پر جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے تاکہ مسولینی کے عتاب کا شکار ہونے والوں کو آزاد زندگی گزارنے کا موقع مل سکے۔ اس طرح جہاں عام شہری رہا ہوئے وہیں مافیا کے بعض سفاک ڈان بھی آزاد ہو گئے جو اپنی خود اعتمادی یا کسی اور وجہ سے مسولینی کی سیاہ کالنشانہ بن گئے تھے۔ اس طرح سسلی میں مافیا نے پہلے سے زیادہ قوت سے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔

جنگ کے بعد ملک میں اشیائے ضرورت کا کال پڑا ہوا تھا، کاشت کار اپنی پیداوار نہایت سستے داموں پر سرکاری گوداموں میں پہنچانے پر مجبور تھے۔ لیرا کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سرکاری گوداموں سے راشن بندی کی بنیاد پر اشیائے ضرورت فروخت کے لیے تقسیم کی جا رہی تھیں۔ اپنے اثر و رسوخ اور عوام پر پرانی دھاک کے سہارے تقسیم کا نظام سسلی میں مافیا والوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ جن چیزوں کی مانگ تھی، وہ گھلے بندوں، اٹلی کی قومی پولیس کے تعاون سے اس کی اسمگلنگ کر رہے تھے۔ عام شہری چند کلو پنیر بھی خچر پر لاد کر لاتے تو اسمگلنگ کے جرم میں دھر لیے جاتے تھے۔

مافیا کے ڈان، سسلی میں زندگی کے ہر شعبے پر تیزی سے چھاتے چلے گئے۔ دکان داروں سے "لوٹ مار سے تحفظ" کے نام پر بھتے لیے جا رہے تھے۔ مچھلی پکڑنے والوں پر مافیا ٹیکس لاگو تھا۔ ان لوگوں کی مرضی اور حصے کے بغیر سسلی کی سرزمین پر ایک لیرا کا لین دین کرنا بھی عملاً ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے فیصلوں سے انحراف کا نام موت رکھ دیا گیا تھا۔ انحراف خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، سزا صرف موت تھی اور ان کی اسی سفاکی نے انہیں سسلی کا بے تاج حکمراں بنایا ہوا تھا جو اپنے ملک، اٹلی کے قانون کو خرید کر اپنی حکومت چلا رہے تھے اور پالرمو میں رہنے والا ڈان کردے مالو پورے سسلی میں مافیا کا سب سے طاقتور ڈان تھا جو پوری قوت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو جاری اور نافذ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ سسلی کا سیکیورٹی چیف انسپکٹر ویلارڈی ہر چھوٹے بڑے آپریشن سے پہلے ڈان کردے سے مشورہ کر کے اس کی رضا کو شامل حال کرنا نہ بھولتا تھا اور اکثر کھانے کی میز پر ڈان کے پہلو میں نظر آتا تھا۔

پالرمو، سسلی کے انتہائی شمال مغرب میں ایک مردہ آتش فشاں کے تخلیق کیے ہوئے گہرے پیالے کے بالکل بیچ میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے تین اطراف سے پہاڑ دیکھنے والے پر آتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور چوتھی سمت میں سمندر کا نیلگوں پانی لہریں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ سسلی کو جتنے فاتحین نے اپنے قدموں تلے روندا، ان سب کی یادگاریں اس شہر میں اب بھی سر بلند نظر آتی ہیں۔ یونانی مندر، بلند مینار مسجد، اسپینی کیتھڈرل، یہودیوں کے معبد اور نارمنوں کا قلعہ سب جوں کے توں موجود ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے ان کا رنگ روپ ضرور بدل گیا ہے لیکن یہ عمارتیں آنے اور پھر چلے جانے والوں کی عظمتوں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ اسی پالرمو سے پہاڑی راستوں پر تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر مونٹے لیپرے کی پسماندہ تاریخی بستی ہے جہاں کے باسی آج بھی ہر برس اپنے مکان پر دوبارہ وہی رنگ کرتے ہیں جو ان کے بزرگوں نے مکان تعمیر کرانے کے بعد پہلی بار کرایا تھا۔ جنھیں تاریخ سے ذرا بھی دلچسپی ہے وہ مکان کا رنگ دیکھ کر معمار کی نسل بتا سکتے ہیں کیونکہ وہ صدیوں سے اسی رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔

جب نارمن فاتح آئے تو انھوں نے اپنے مکانوں کے لیے سفید رنگ پسند کیا۔ یونانیوں نے ہمیشہ نیلے رنگ کو ترجیح دی، عربوں کو سرخ یا گلابی رنگ پسند تھا اور یہودی اپنے گھروں کی صرف پیلے رنگ سے تزئین کرتے تھے۔ صدیاں گزر گئیں، آپس کی شادیوں سے نسلیں خلط ملط ہو گئیں، اب وہاں کے رہنے والے صرف عیسائی اور اطالوی ہیں۔ غیر ملکیوں کے سامنے وہ دبے لہجے میں خود کو اطالوی کہہ لیتے ہیں لیکن اپنی تمام تر غربت اور پسماندگی کے باوجود وہ خود کو سسلی والا کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں جو اٹلی کی سرحدوں میں اطالوی قانون سے ماورا ایک خواب ناک جزیرہ ہے۔

ہیکٹر ایڈونس اسی سسلی کی پالرمو یونیورسٹی میں تاریخ اور ادب کا سینئر پروفیسر تھا۔ قدرت نے اسے بے پناہ ذہانت اور قابلِ رشک یادداشت سے نوازا تھا لیکن یہ مقدر کی ستم ظریفی تھی کہ اس کا قد غیر معمولی حد تک کم تھا۔ وہ ہمیشہ بہترین تراش کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کرتا تھا۔ ٹائی کی میچنگ قابلِ دید ہوتی تھی۔ سر کے سفید اور موٹے موٹے بال قرینے سے سنورے رہتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں، دل کش چہرے اور خم دار ہونٹوں کی وجہ سے وہ بہت وجیہہ اور بارعب نظر آتا تھا لیکن وہ سسلی کے اس معاشرے میں رہ رہا تھا جہاں کسی بھی فرد کو اس کی جسمانی خامی پر بڑی بے رحمی سے نشانہ بنایا جاتا ہے اس وجہ سے یونیورسٹی میں اس کے ہم عصر اساتذہ اس کی وہ عزت نہیں کرتے تھے جس کا علمی درجہ متقاضی تھا۔ البتہ یونیورسٹی کا صدر اس کی دل سے قدر کرتا تھا اور ہیکٹر ایڈونس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ سسلی میں پیدا ہوا تھا، سسلی والوں

کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اس جیسے بونے پروفیسر کو دیکھ کر نہ ہنسنا بھی سسلی والوں کی عادات کے لحاظ سے عزت افزائی کا ایک اہم طریقہ تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ فاتح امریکی افواج سسلی کو روندتی ہوئی مین لینڈ اٹلی میں داخل ہو چکی تھیں۔ مسولینی کا فاشزم مر چکا تھا، اٹلی کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی اور سسلی کی چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سسلی کا کوئی حقیقی مالک نہیں تھا۔ وہ تاریخ کا ماہر تھا اور تاریخ کی سنگین حقیقتوں سے خوب واقف تھا۔ مافیا نے سسلی کا قانون اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا تھا، وہ کینسر کی طرح قانون اور ریاستی اختیارات کی جڑوں میں اترتے جا رہے تھے اور جلد ہی خود ایک ریاست کا روپ لینے والے تھے۔

اس نے مایوسی کے ساتھ کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں۔ وسیع و عریض قطعۂ زمین پر گنتی کی چند عمارتیں کھڑی ہوئی تھیں جنھیں بمشکل کیمپس کہا جا سکتا تھا۔ وہاں زیادہ عمارات کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دوسرے ملکوں کے برعکس وہاں کیمپس لائف کا تصور ہی رواج نہیں پا سکا تھا۔ جو پڑھنا چاہتے تھے وہ گھروں پر پڑھتے تھے اور پہلے سے طے شدہ اوقات میں حسب ضرورت اپنے پروفیسروں سے مدد لے لیا کرتے تھے۔ کلاسوں میں کبھی کبھار پروفیسر لیکچر دیتے تو طلبا سزا و جزا کے احساس سے بے نیاز، سپاٹ چہروں سے خلا میں تکتے رہتے۔ ان کی دلچسپی صرف امتحان دینے میں ہوتی تھی جو بدقسمتی سے مقررہ اوقات پر ہوتے تھے، ان کا بس چلتا تو داخلہ لیتے ہی امتحان دے کر حساب بے باق کر لیتے۔

ہیکٹر ایڈوینس اس رجحان پر دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ اس طرح سسلی والے خود اپنا نقصان کر رہے تھے۔ ڈگری یافتہ احمقوں کی فوج پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے حالانکہ انہیں تو اپنی سرزمین سے جہالت، بیماری اور غربت کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے تعلیم کے میدان میں دوسروں سے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت تھی۔

یونیورسٹی کا وہ موسم اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ مسولینی کے عروج کے مختصر سے عرصے کو چھوڑ کر، ان دنوں سسلی کے ہر علاقے سے مافیا کے چیف اس مادر علمی کی زیارت کو آتے تھے اور اپنی اپنی غرض کے شعبے میں پروفیسروں میں اپنی لابی بنانے کی کوشش کرتے تھے یا کچھ کام لاتے تھے۔ فاشسٹوں کے دور میں یہ چیف ذرا نرم خوئی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے لیکن امریکا بہادر کی بحال کرائی ہوئی جمہوریت کے سائے میں وہ اپنی تند خوئی کے ساتھ برساتی مینڈکوں کی طرح ابل پڑے تھے۔ کسی کے چہرے پر نرمی یا مصالحت نام کو نظر نہ آتی تھی۔

مافیا کے چیف اور سسلی کے دور دراز دیہاتوں میں پھیلے ہوئے مقامی گروہوں کے سربراہ ہر سال چھٹیوں میں اپنے رشتے داروں یا اپنے علاقے کے امرا کے بیٹوں کے کام کرانے آتے تھے۔ ان لڑکوں میں بیشتر وہ ہوتے تھے جو فیل ہو رہے ہوتے تھے اور جانتے تھے کہ کسی سخت کارروائی کے بغیر انہیں کبھی ڈگری نہیں مل سکے گی۔

ہر گھرانے میں ان ڈگریوں کی بہت اہمیت تھی۔ ان کے بغیر والدین کی اپنے بے حس، کند ذہن اور آوارہ بیٹوں سے نجات ناممکن تھی۔ ڈگری نہ ملنے پر وہ ساری عمر باپ کے اوپر بوجھ بنے روٹیاں توڑتے رہتے لیکن ڈگری ملتے ہی یہ آوارہ گرد اور نکمے لڑکے استاد، ڈاکٹر یا پارلیمنٹ کے رکن بن سکتے تھے۔ یہ سب نہ ہوتا تو بھی انھیں چھوٹی موٹی انتظامی اسامیاں تو مل ہی جاتیں جہاں سے ان کی گزر بسر ہو جاتی۔

ہیکٹر ایڈوینس جھرجھری لے کر رہ گیا پھر تاریخ نے اسے کچھ سہارا دیا۔

بالکل مفت معلوماتی بروشر حاصل کیجئے۔ اس کا تھوڑا سا مطالعہ ایسی خواتین کے لئے ضروری ہے جو برسوں سے اولاد جیسی نعمت سے محروم رہی ہوں یا پھر کسی نسوانی شکایت میں مبتلا ہوں۔ ہزارہا بے اولاد خواتین اس معلوماتی بروشر کو منگوا کر آج کئی کئی بچوں کی مائیں بن چکی ہیں اور خوشیوں سے بھری زندگی گزار رہی ہیں آج ہی ایک خط ہمراہ جوابی لفافے کے روانہ کر دیجئے

آئیڈیل انٹرنیشنل

پوسٹ بکس نمبر 2377 ۔ کراچی 18 کوڈ نمبر 74600

اپنی سلطنت کی عظمت کے دنوں میں برطانیہ عظمیٰ نے اپنی فوجوں کو امراء اور رؤسا کے ایسے ہی نکمے لاڈلوں کے سپرد کر دیا تھا جن کے والدین نے پیسہ بہا کر شاہی تجریہ اور فوج میں کمیشن دلوایا تھا۔ اس کے باوجود سلطنت ترقی کرتی رہی۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ کمانڈروں نے غیر ضروری طور پر اپنے آدمیوں کا قتل عام کرایا، ناتجربہ کاری سے پورے پورے جہاز غرق کر دیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے کمانڈروں نے اپنے آدمیوں کے ساتھ موت کا ذائقہ چکھا اور بہادری کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے لیکن اسی کے ساتھ ریاست کا بھی مسئلہ حل ہو گیا کہ نااہل اور اوچھے لوگ ملک کے خزانے پر بوجھ بننے کے بجائے بہادری اور تجربے کے نام پر کہیں کام آ گئے لیکن اطالوی اتنے بے مہر اور خود غرض نہیں تھے کہ اپنے جگر گوشوں کو صرف ذرا سی نالائقی کی بنا پر موت کی آغوش میں ڈال دیتے۔ انہیں اپنے بچوں سے پیار تھا وہ انھیں مصائب سے محفوظ دیکھنا چاہتے تھے اس لیے اس کھیپ کی نگہداشت کا فرض ریاست پر ڈال دیا گیا تھا۔

اس وقت ہیکٹر ایڈوینس کو کھڑکی سے کم از کم تین ایسے مقامی مافیا چیف نظر آ رہے تھے جو اپنے شکار کی تلاش میں تھے۔ ان سب کی وضع قطع کم و بیش یکساں تھی۔ سروں پر کپڑے کی ٹوپیاں، پیروں میں چمڑے کے جوتے، ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور بازوؤں پر مخمل کی وزنی جیکٹیں، کیونکہ موسم قدرے گرم تھا۔

کسی کے پاس پھلوں سے لدی ہوئی ٹوکری تھی کوئی تحفے میں دینے کے لیے بالش کی کونپلوں میں خوب صورتی سے لپٹی ہوئی خانہ ساز شراب کی بوتلیں لایا تھا۔ یہ رشوتیں نہیں تھیں بلکہ ان بھیانک چہروں سے ملاقات کے وقت اساتذہ کے دلوں میں پیدا ہونے والی دہشت کو کم یا ختم کرنے کا ٹوٹکا تھا۔ بیشتر پروفیسر سسلی کے باشندے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ان خبیثوں کی کسی التجا کو کبھی رد نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مافیا چیف جو انتہائی بدوضع، دیہاتی لباس میں تھا، اسی بلڈنگ میں گھسا اور زینے چڑھنے لگا... ہیکٹر اپنے لبوں پر بے جان مسکراہٹ سجا کر آنے والے لمحات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہیکٹر ایڈوینس اس شخص کو جانتا تھا۔ اس کا نام بکیلا تھا اور وہ ایک قریبی قصبے میں ایک فارم اور بھیڑوں کے ریوڑ کا مالک تھا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے اور بکیلا نے پھلوں کی ٹوکری پروفیسر کو دے دی۔

"ہمارے ہاں اس قدر فروٹ گر کر گل سڑ رہا ہے کہ میں نے سوچا کیوں نہ کچھ تمہارے لیے لیتا چلوں۔" اس نے سادگی سے کہا۔ وہ پستہ قامت اور چوڑے بدن کا مالک تھا۔ مشقت کی قوت اس کی نس نس سے ظاہر تھی۔ ایڈوینس جانتا تھا کہ وہ بہت ایماندار ہے اور مافیا کے ان پرانے بڑوں کی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو پیسے کے لیے نہیں بلکہ عزت اور وقار کے لیے لڑا کرتے تھے۔

ایڈوینس فروٹ لیتے ہوئے مسکرایا۔ سسلی میں ایک بیر بھی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ زمین پر گرنے والے ایک زیتون پر سیکڑوں بچے ٹوٹ کر گرتے تھے اور زیتون کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔

بکیلا مسکرایا۔ وہ خوش خلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن ایڈوینس جانتا تھا کہ پل بھر میں وہ خوش خلقی جنون میں بدل سکتی تھی لہٰذا وہ حواباً زیادہ مسکرایا اور بکیلا کہنے لگا "زندگی بھی کس قدر بکواس ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنی زمینوں پر کافی کام کرنا ہے لیکن جب میرے پڑوسی نے ایک چھوٹے سے کام کے لیے کہا۔ تو بتاؤ میں کیسے انکار کر سکتا تھا؟ ہماری باپ دادا کے زمانے سے شناسائی چلی آ رہی ہے اور یہ میری فطرت ہے یا شاید بدقسمتی کہ میں ہر وہ کام کر ڈالتا ہوں جس کے لیے میرا کوئی دوست مجھ سے کہے۔ آخر کار ہم سب آپس میں عیسائی بھی تو ہیں نا؟"

"ہم سسلی والے سب ایک جیسے ہیں۔" ایڈوینس نے نرمی سے کہا۔ "ضرورت سے زیادہ فراخ دل۔ یہی وجہ ہے کہ شمال میں روم سے حکومت کرنے والے ہم سے شرمناک فائدے اٹھا لیتے ہیں۔"

بکیلا نے مکارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سوچا "یہاں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیے۔ میں نے تو شاید کہیں یہ بھی سنا تھا کہ پروفیسر ہم ہی میں سے ہے اور اگر ایسا ہے تو آخر میں نے اس کی تصدیق کیوں نہیں کی؟ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خیر، مافیا میں بھی بہت سے مرتبے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو، کم از کم یہ آدمی جس دنیا اور ماحول میں رہتا ہے اس کے تقاضوں کو خوب سمجھتا ہے۔"

"میں تمہارے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ "جیسے ایک سسلی والا دوسرے کے پاس جا سکتا ہے۔ اس سال یونیورسٹی میں میرے پڑوسی کا بچہ فیل ہو گیا۔ میرے پڑوسی کا دعویٰ ہے کہ اسے تم نے فیل کیا ہے۔ میں نے یہ سنتے ہی کہا تھا کہ سینور ایڈوینس تو دنیا کا مہربان ترین شخص ہے اگر اسے سارے حقائق کا علم ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز بھی ایسی نامہربانی نہ کرتا۔ بس اس پر دونوں میاں

بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انھوں نے مجھ سے التجا کی ہے کہ میں پوری کتھا تمھارے گوش گزار کر دوں اور عاجزانہ درخواست کروں کہ بچے کا گریڈ بدل دو تاکہ وہ ڈگری حاصل کر کے دُنیا میں کہیں اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکے۔"

ایڈوینس نے اس کی انتہا درجے کی عاجزی اور انکسار سے دھوکا نہیں کھایا وہ جانتا تھا کہ سینور بکیلا کی درخواست کو رد کیا گیا تو اس کا جواب کسی تاریک رات کے سناٹے میں اس پر آگ اُگلتی ہوئی گن ہی دے گی۔

"اوہ! ہم اس ماحول میں ایک جوان بچے کی زندگی برباد نہیں ہونے دیں گے۔" اس نے بکیلا کے لائے ہوئے پھلوں میں سے زیتون ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "بچے کا نام کیا ہے؟" بکیلا نے نام بتایا تو اس نے اپنی ڈیسک کے نچلے خانے سے ایک رجسٹر نکالا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا حالانکہ وہ اس نام سے اچھی طرح واقف تھا۔

ناکام لڑکا بہت احمق، ناکارہ، غبی اور ظالم طبیعت کا مالک تھا۔ سست مزاج تھا اور ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایسا جاہلِ مطلق تھا جسے اپنے مضمون کی مبادیات تک کا علم نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ایڈوینس، بکیلا کی طرف دیکھ کر محبت سے مسکرایا اور تحیر آمیز لہجے میں بولا "اوہ! اس نے اپنا ایک پرچا ذرا خراب کیا تھا لیکن یہ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے میرے پاس بھیجو میں یہیں اسے چند روز تیاری کراؤں گا اور اسے امتحان کا ایک اور موقع دیا جائے گا۔ اس بار وہ فیل نہیں ہو گا۔"

دونوں نے ہاتھ ملائے اور آنے والا چلا گیا۔

"خونیوں اور قاتلوں میں ایک اور دوست بنا۔" ایڈوینس نے سوچا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ صلاحیت سے عاری ان بیہودہ اور ناکارہ لڑکوں کو ڈگریوں کی کیا ضرورت تھی؟ ڈگریوں سے استنجا کر کے وہ متوسط درجے کے کسی بھی کام میں گھس سکتے تھے۔

فون کی گھنٹی نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوسری طرف یونیورسٹی کا صدر تھا جو عام طور پر پیشہ ورانہ لحاظ اور آداب پر سختی سے عمل کراتا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے رو پڑے گا۔ "ڈیئر پروفیسر ایڈوینس! کیا میں تمھیں اپنے دفتر تک آنے کی زحمت دے سکتا ہوں؟ یونیورسٹی کو ایک سنگین مسئلے کا سامنا ہے جسے صرف تم ہی حل کر سکتے ہو۔ یہ بے انتہا اہم ہے۔ یقین کرو ایڈوینس! میں سچے دل سے تمھارا احسان مند رہوں گا۔"

اس کے الفاظ اور لب و لہجے نے ایڈوینس کو پریشان کر دیا۔ اس نے نرمی سے پوچھا: "مجھے کچھ تو بتاؤ تاکہ میں تمھارے دفتر آنے تک راستے میں کچھ سوچ سکوں۔"

"عزت مآب ڈان کروسے نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا ہے۔" اس کی آواز ایک سرگوشی میں مرجھا گئی تھی۔ "ان کا بھانجا ہمارے یہاں میڈیکل کا طالب علم ہے۔ اس کے پروفیسر کا خیال ہے کہ اس کا عزت سے کالج چھوڑ دینا ہی بہتر رہے گا۔ ڈان کروسے بڑے اخلاق اور انکسار کے ساتھ ہمارے پاس نظرِ ثانی کی درخواست لے کر آئے ہیں لیکن میڈیکل کالج کے پروفیسر کا اصرار ہے کہ اس نوجوان کو کالج سے چلا جانا چاہیے۔"

"وہ اُلّو کا پٹھا کون ہے؟" ایڈوینس کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

"ڈاکٹر نے ٹورے!" صدر کی آواز سسک رہی تھی۔ "موصوف میڈیکل فیکلٹی کے نئے رکن ہیں لیکن دُنیا ذرا کم دیکھی ہے۔"

"میں ابھی پہنچتا ہوں۔" ہیکٹر ایڈوینس نے کہا اور فوراً ہی کرسی چھوڑ دی۔ صدر کے دفتر کی طرف جاتے ہوئے وہ سخت پریشان تھا۔ کوئی راستہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صدر کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا وہ ہمیشہ ایسے معاملات میں ایڈوینس کی رائے پر انحصار کرتا تھا۔ اصل دشواری ڈاکٹر نے ٹورے کے ساتھ تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک سخت با اصول آدمی تھا۔ اس کے اصولوں میں کوئی لچک نہیں ہوتی تھی۔ طبی پیشے کا وہ ایک مایہ ناز ماہر تھا اس کی ناگہانی موت پورے سسلی کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوتی اور اگر وہ اختلافِ رائے پر استعفا دے کر چلا جاتا تو یہ یونیورسٹی کا نقصان ہوتا۔

ڈاکٹر نے ٹورے نے یقیناً ڈان کروسے کے بارے میں سُن رکھا ہو گا۔ اس کے پاس سمجھ بوجھ کی بھی کمی نہیں تھی پھر وہ اس معاملے پر کیوں اُلجھ رہا تھا؟ یقیناً بات کچھ اور ہی تھی۔

مرکزی عمارت کے سامنے ایک لمبی سیاہ کار کھڑی ہوئی تھی جس سے دو خطرناک صورت والے آدمی ٹیک لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے نفیس کاروباری سوٹ بھی ان

مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گرانقدر معاوضے پر چراتا ہے

نک ویلوٹ کی چوریاں

ان چوریوں کی دلچسپ کہانیاں

وہ تمام کہانیاں جو آج تک لکھی گئی ہیں

قیمت ۱۵/- روپے

ڈاک خرچ ۵/- روپے

کتابیات پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۲۳ کراچی ۱

کے خدوخال کی اصلیت کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شاید ڈان کروسے کا ڈرائیور تھا اور دوسرا باڈی گارڈ جنھیں ڈان کروسے یونیورسٹی کے تقدس کے خیال سے اپنے ساتھ اندر نہیں لے گیا تھا۔

ایڈوینس کے غیر معمولی پستہ قامت پر نگاہ پڑتے ہی دونوں کی آنکھوں میں تحقیر اور تضحیک کے آثار اُمڈ آئے اور وہ مسکرانے لگے۔ ایڈوینس نے سرد نگاہوں سے دونوں کو گھورا جس نے انھیں پریشان کر دیا۔

دیواروں کے ساتھ اوپر تک لگی ہوئی کتابوں کی وجہ سے وہ کمرا صدر کے دفتر سے زیادہ لائبریری نظر آرہا تھا کیونکہ صدر ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ ایک نامور اسکالر تھا جس کا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔

ڈان کروسے ایک بڑی کرسی میں دھنسا کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا اور اس کا چہرہ اس وقت گمبھیر نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے لیکن ڈان کروسے نے یوں ظاہر کیا جیسے ایڈوینس اس کے لیے اجنبی ہو۔ ایڈوینس نے اپنا باقاعدہ تعارف کرایا وہ بیٹھ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر ٹورے اندر آگیا۔

صدر یونیورسٹی میں سب سے لمبے قد کا آدمی تھا اور ایڈوینس تقریباً بونا اس لیے صدر اپنی کرسی میں کافی دھنس کر اس طرح بیٹھا کہ تضاد کم سے کم نمایاں ہو وہ ایڈوینس کا خاصا احترام کرتا تھا۔

"ہمارے درمیان ایک چھوٹا سا اختلاف پیدا ہوگیا ہے" صدر نے کہا اس پر ڈاکٹر ٹورے نے ناک سے ایک غصیلی آواز نکالی جیسے صدر کے وہ نرم الفاظ اسے پسند نہ آئے ہوں لیکن ڈان کروسے نے اپنے سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دی۔ صدر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ڈان کروسے کا بھانجا ڈاکٹر بننے کی آرزو میں تڑپ رہا ہے لیکن ڈاکٹر ٹورے کا کہنا ہے کہ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ڈان کروسے کی مہربانی ہے کہ وہ اپنے بھانجے کا معاملہ لے کر بہ نفسِ نفیس یہاں آئے ہماری یونیورسٹی کے لیے ڈان کروسے کی خدمات اتنی بیش بہا ہیں کہ میرے خیال میں ہمیں ان کی خواہش کا احترام کرنے کی ہر وہ کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے بس میں ہے"

ڈان کروسے نرمی سے بولا تو اس کی آواز میں طنز کا شائبہ تک نہیں تھا "میں خود ایک جاہلِ مطلق ہوں مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں کاروبار کی دنیا میں ناکام رہا ہوں..."

"یقیناً!" ایکٹر ایڈوینس نے سوچا۔ "جو شخص وزیروں کو رشوت دے سکتا ہو، قتل کرا سکتا ہو، دکان داروں اور فیکٹری مالکان کو دہشت زدہ کر سکتا ہو اسے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں نے اپنی راہ زندگی کے تجربوں سے بنائی ہے" ڈان کہہ رہا تھا "میرا بھانجا بھی میری ہی بنائی ہوئی راہ پر چل سکتا ہے۔ اگر میرے بھانجے کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کے لفظ کا اضافہ نہ ہوا تو بے چاری میری بہن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ ایک سچی عیسائی عورت ہے اور اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنوا کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہے"

"میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا" ڈاکٹر ٹورے نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈان نے ایک گہرا سانس لیا اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "میرا بھانجا کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے؟ میں اس کو آرمی میں کوئی سرکاری عہدہ دلوا دوں گا یا بوڑھوں کے کیتھولک ہسپتال میں نوکری دلوا دوں گا۔ وہ بوڑھے مریضوں کے ہاتھ تھام کر محبت سے ان کے دکھ درد سنے گا۔ وہ بڑا ملنسار لڑکا ہے، ان بوڑھے ڈھانچوں کا دل بہلایا کرے گا۔ میں نے تم سے کیا مانگ لیا ہے؟ صرف کاغذوں کی ذرا سی ہیر پھیر جو تم یہاں کرتے ہی رہتے ہو" یہ کہتے ہوئے اس نے دیوار سے لگی ہوئی کتابوں پر حقارت سے نگاہ دوڑائی وہ نگاہیں ایڈوینس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ڈان کروسے کے آخری التجائیہ فقروں سے سخت پریشان ہوگیا اس جیسے آدمی کی طرف سے وہ خطرے کا بدترین سگنل تھا۔ لیکن ڈان ایسے تیور دکھانے میں حق بجانب تھا کیونکہ اس کے پاس اختیار کے ساتھ ساتھ بے پناہ وسائل بھی تھے۔

"مائی ڈیئر ڈاکٹر ٹورے!" ایڈوینس نے ڈان کی طرف سے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم یقیناً کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں! تھوڑا سا پرائیویٹ ٹیوشن، کسی خیراتی ہسپتال میں مزید ٹریننگ۔ اور کیا چاہیے ہمیں؟"

ڈاکٹر ٹورے پیدائش سے اس وقت تک کبھی سسلی والا نہیں محسوس ہوا۔ وہ اپنی جگہ درست تھا اور اسے دبایا جا رہا تھا اس لیے اس نے اپنے غصے کا اظہار کر ڈالا جب کہ سسلی کا کوئی اصل باشندہ ایسی پیچیدہ صورتِ حال میں بھول کر بھی غصے کا اظہار نہیں کرتا۔

"تم نہیں سمجھ رہے مائی ڈیئر پروفیسر ایڈوینس۔ وہ بیوقوف لڑکا سرجن بننا چاہتا ہے"

ہیکٹر ایڈوینس کو میسج اور مریم سے لے کر اپنے سارے سینٹ یاد آ گئے۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل معاملہ کیا تھا، دوسروں کے چہروں پر اپنے انکشاف کے سنگین تاثرات دیکھ کر ڈاکٹر نے ٹورے نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"تمہارا بھانجا اناٹومی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے ایک لاش کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جیسے ہم لوگ بھوننے کے لیے کوئی بھیڑ تیار کر رہے ہوں۔ وہ اپنی زیادہ تر کلاسوں سے غائب رہتا ہے، ٹیسٹ کے لیے کوئی تیاری نہیں کرتا۔ آپریشن روم میں اس طرح داخل ہوتا ہے جیسے ہمارے ساتھ ناچنے کے لیے آیا ہو۔ میں مانتا ہوں کہ وہ ملنسار ہے۔ اور اس سے بہتر آدمی شاید ہی مل سکے لیکن ہم ایک ایسے آدمی کے بارے میں بات کر رہے ہیں جسے ایک دن تیز دھار چاقو ہاتھ میں لے کر جسمانی اعضا کو صحیح مقام سے صحیح طرح کاٹنے کے فیصلے کرنے ہوں گے۔"

ایڈوینس ڈان کی ذہنی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اسے کیا پروا تھی کہ لڑکا کیسا سرجن بنے گا۔ اچھا یا برا، وہ تو اسے سرجن بنانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اس کے گھرانے کے وقار کا معاملہ بھی نظر آتا تھا۔ لڑکا فیل ہو جاتا تو ساکھ کریکری ہو جاتی۔ پھر وہ خواہ کتنا ہی برا سرجن ہوتا، اتنے آدمی تو ہرگز نہیں مار سکتا تھا جتنے ڈان کے معروف، پیشہ ور ملازمین مار لیتے تھے۔

اہم بات یہ تھی کہ نوجوان ڈاکٹر نے ٹورے نے ڈان کی خواہش کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا وہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا حالانکہ ڈان نے لوڑھوں کے کیتھولک ہسپتال کا حوالہ دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ سرجن نہ سہی، اس کا بھانجا میڈیسن کا ڈاکٹر بنا دیا جائے۔

وقت آ گیا تھا کہ ایڈوینس دخل اندازی کرے۔ وہ بولا۔ "محترم ڈان کروسے! مجھے امید ہے کہ ہم ڈاکٹر نے ٹورے کو سمجھا سکے ہوں گے تو وہ تمہاری خواہش تسلیم کر لے گا لیکن تمہارے بھانجے کے دماغ میں سرجن بننے کا خیال کیسے پیدا ہو گیا؟ تم نے خود کہا کہ وہ نرم خو اور ملنسار ہے۔ سرجن تو پیدائشی ایذا پرست ہوتے ہیں۔ نشتر لگا کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور سسلی میں کتنے لوگ ہیں جو ہنسی خوشی اپنا آپریشن کرانا پسند کریں گے؟" وہ ایک لحظے کے لیے خاموش ہوا پھر بولنے لگا۔ "اگر اسے سرجن ہی بننا ہے تو روم میں تربیت لازماً لینی ہو گی۔ روم والے متعصب ہیں۔ ہم اسے یہاں سے پاس کر دیں تو وہ لوگ سسلی کے ایک باشندے کی زندگی تباہ کرنے کے لیے ہزاروں بہانے تلاش کر لیں گے۔ اس طرح اصرار کر کے تم اپنے بھانجے کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہو۔ اجازت ہو تو میں ایک سمجھوتا پیش کروں؟"

"کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر نے ٹورے بڑبڑایا۔

پہلی بار ڈان کی چھپکلی جیسی آنکھیں شعلے برسانے لگیں، نے ٹورے فوراً خاموش ہو گیا اور ایڈوینس جلدی جلدی بولنے لگا۔ "تمہارے بھانجے کو پاس کر دیا جائے گا۔ وہ ڈاکٹر بن جائے گا لیکن سرجن نہیں بن سکے گا، اس وجہ سے کہ وہ اس قدر نرم دل ہے کہ انسانی جسم پر نشتر نہیں چلا سکتا۔"

ڈان کروسے نے اپنے دونوں بازو ایڈوینس کی طرف پھیلا دیے اور سرد مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے اپنے دلائل اور سمجھ داری سے مجھے ہرا دیا۔ چلو یوں ہی سہی، میرا بھانجا سرجن نہیں، ڈاکٹر بنے گا۔ میری بہن کو اسی پر قناعت کرنی چاہیے۔"

وہ عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا اس کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ شاید اسے خود بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں تھی۔ صدر اس کو چھوڑنے کے لیے اس کے ساتھ گاڑی تک گیا مگر کمرے میں موجود ہر فرد نے محسوس کیا تھا کہ ڈان کروسے نے جاتے جاتے نے ٹورے کے چہرے پر بڑی عجیب سی نگاہ ڈالی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈان اس کے خدوخال اپنے ذہن کی سلیٹ پر محفوظ کر رہا ہو تاکہ وقت آنے پر وہ اپنی خواہش کو پامال کرنے والے کو پہچاننے میں کسی غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔

"میرے عزیز ساتھی!" ان کے چلے جانے کے بعد ایڈوینس نے ڈاکٹر ٹورے سے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "اب یہاں سے استعفا دے کر تم روم میں پریکٹس کرنے کی تیاری کر لو۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم؟" وہ غصے میں برس پڑا۔

"تم سے کم۔" ہیکٹر ایڈوینس نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں کہ آج رات تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہمارا سسلی آج تک جنت ارضی کیوں نہ بن سکا۔"

"لیکن میں یہاں سے کیوں چلا جاؤں؟" اس نے احتجاج کیا۔

"اس لیے کہ تم نے ڈان کروسے مالوے "نہیں" کا لفظ کہا ہے۔ سسلی چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہاں تم کہیں بھی اس سے نہ بچ سکو گے۔"

"لیکن اس کا کام تو ہو گیا۔" ڈاکٹر نے ٹورے تقریباً چیخ پڑا۔

"اس کا بھانجا ڈاکٹر بن جائے گا۔ تم نے اور صدر نے یہ تجویز منظور کر لی ہے۔"

"لیکن تم نے منظور نہیں کی۔" ہیکٹر ایڈوینس نے کہا۔ "ہم نے تمہاری جان بچانے کے لیے یہ منظوری دی لیکن اب تم ڈان کی نظروں میں آ گئے ہو۔ سسلی کے روایتی قانون میں

ڈان کی مرضی سے انکار کی سزا صرف موت ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نے ٹورے کے لیے وہ ساری باتیں ناقابلِ فہم تھیں، وہ بے چارہ اُلجھ کر رہ گیا۔

اسی شام پروفیسر ہیکٹر ایڈوینس پالرمو کے بہترین ریستوران میں ڈاکٹر نے ٹورے سمیت یونیورسٹی کے چھ پروفیسروں کی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس روز ان میں سے ہر پروفیسر کو سسلی کے معززین نے شرفِ ملاقات بخشا تھا۔ ان کے لیے گھر میں کشید کی ہوئی بہترین شراب اور تازہ پھلوں کے تحائف لائے تھے۔ بیشتر معززین نے اس قسم کی رسمی ملاقاتوں کے علاوہ اپنی زندگی میں کبھی یونیورسٹی اور کالج تو کجا، اسکول تک کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے علاقے میں سب سے زیادہ خوش حال اور کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ ان کی عزت اور احترام کا یہ عالم تھا کہ ہر معاملے میں ان کی رائے صائب اور اٹل سمجھی جاتی تھی۔ وہ جس راستے سے گزرتے تھے وہاں لوگ احتراماً اپنے سر جھکا لیا کرتے تھے لیکن ان دوستوں نے یونیورسٹی میں کسی کی توہین نہیں کی، کسی سے تیز زبان میں بات نہیں کی۔ تعلیم سے محروم یہ لوگ یونیورسٹی اور وہاں اپنے خونِ جگر سے علم کے پودوں کی آبیاری کرنے والے لوگوں کا احترام کرتے تھے۔ وہ جس سے بھی ملے اس کو اپنا مداح، ہمدرد اور ہم نوا پایا۔ ریستوران میں موجود ہر اُستاد نے اپنے مہمان کی گزارشات کو بصد احترام قبول کر لیا تھا اور یوں چھ لڑکوں کے نام ناکاموں کی فہرست سے نکال کر کامیابی کے خانے میں درج کر دیے گئے تھے۔ جس لڑکے پر ڈاکٹر نے ٹورے رضامند نہیں تھا اس کا معاملہ پروفیسر ایڈوینس اور صدر نے طے کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے ٹورے دہشت سے آنکھیں پھاڑے، اپنے ہم عصر پروفیسروں کی کہانیاں سنتا رہا۔ اصل واقعات کے پہلو بہ پہلو وہ سسلی کی سرزمین پر جنم لینے والے بعض اندوہناک واقعات یا حادثوں کا بھی ذکر کر رہے تھے لیکن اپنے مہمانوں کی دل داری کر کے وہ سب ہی خوش تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا... کم از کم طبی پیشے میں یہ نہیں ہو سکتا۔" ان کی کہانیاں ختم ہونے پر ڈاکٹر نے ٹورے بھرائی ہوئی شکست خوردہ آواز میں بولا۔ "ایک نااہل ڈاکٹر بدترین قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم قاتلوں اور آوارہ گردوں کو یہ مقدس ڈگریاں نہیں بانٹ سکتے۔"

سب ہی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ مسلسل اپنے پیشے کے تقدس کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ آخر فلسفے کے ایک پروفیسر نے اسے جکڑ لیا۔ "طبی پیشہ کہاں سے مقدس ہو گیا؟ ڈاکٹر تو اسی کو نقصان پہنچاتا ہے جس کا وہ علاج کرتا ہے جب کہ گندے اور منفی رجحانات رکھنے والا ایک چالاک شخص اپنے افکار سے ہزاروں لوگوں کے ذہن بگاڑتا ہے وہ ان پر بھی...

اثر انداز ہوتا ہے جنھوں نے کبھی اسے نہیں دیکھا ہوتا۔ افکار کی صحت اور سچائی اور روح کی پاکیزگی ہر علم سے زیادہ مقدس ہے۔"

وہاں ایک تلخ علمی بحث چھڑ گئی کیوں کہ ہر شخص اپنے شعبے کا مستند ماہر تھا۔ رات ڈھلتی چلی گئی اور آخر کار ڈاکٹر نے ٹورے نے پالرمو یونیورسٹی سے استعفا دے کر سسلی کی زمین سے بہت دور، برازیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے دوستوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ برازیل میں پتے کے امراض عام تھے اور وہ پتے کے آپریشنوں میں بہت جلد خطیر رقم کما سکتا تھا۔

رات گئے پروفیسر ہیکٹر ایڈوینس گھر آ کر بستر پر دراز ہوا تو فتح کے ایک بے نام احساس سے سرشار تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے ایک طبی ماہر، اپنے دوست، ایک اُستاد اور اصول پرست شخص کی طبعی موت آنے تک اس کی زندگی بچا لی تھی — انھی خیالات کی رَو میں وہ گہری نیند سو گیا۔

فون کی تیز گھنٹی کی آواز مسلسل گونجتی رہی تو ایڈوینس نے جھلا کر اپنے سرہانے تپائی پر رکھا ہوا فون ٹٹول کر ریسیور اٹھایا اور پھر اس کے چہرے سے غصے کے سارے آثار معدوم ہو گئے۔ اس کی جگہ بشرے پر بدترین ناکامی کی سیاہی پھیلنے لگی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے ٹورے کو دعوت سے گھر واپس جاتے ہوئے ایک ویران مقام پر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے لاش ملنے کی خبر دیر سے موصول ہوئی تھی۔ پولیس سرگرمی کے ساتھ قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔

اگلی صبح ڈاکٹر نے ٹورے کے جنازے کے ساتھ پورا شہر اُمڈ آیا تھا کیونکہ معزز ڈان کروے اپنے مخصوص ماتمی لباس میں جنازے کے جلوس میں پیش پیش تھا۔ اس کے چہرے پر غم واندوہ کے پہاڑ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور وہ رومال سے یوں بار بار اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا جیسے آنسوؤں کو بہنے سے روکنا چاہ رہا ہو مگر ایڈوینس دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، وہ ڈان تھا اور سسلی میں ڈان رویا نہیں کرتے، دوسروں کو رُلاتے ہیں۔

قاتل کو تلاش کرنے والوں کا سربراہ، سیکیورٹی چیف، انسپکٹر ڈیلارڈی کنور ٹیبل شیورلے میں ڈان کے برابر میں موجود تھا۔

*

ایکشن ری پلے

علیم الحق

وہ دونوں بہترین بالرتھے اور دونوں ایک ہی لڑکی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ لڑکی نے شرط رکھ دی تھی کہ دونوں میں سے جو بھی بہترین بالر کا کپ جیتے گا وہی اس کا بھی حق دار ہوگا۔ مگر مقابلے کے دوران ایک بالر نے بے ایمانی کر لی۔

پرتھ کے میدان میں شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ اس نے اسکور بورڈ کی طرف دیکھا۔ پاکستان کا اسکور ۳۲۶ رنز ۹ کھلاڑی آؤٹ تھا اور اس کا اسکور ۱۰۶۔ کھیل کا وقت ختم ہونے والا تھا لیکن اب تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ پرتھ کی قاتل وکٹ پر پاکستان کی فتح اب صرف ۴ رنز دور تھی۔ خوش قسمتی سے اسے اگلی ہی گیند پر موقع مل گیا۔ اس نے بہت جلد دیکھ لیا تھا کہ گیند شارٹ پچ ہے اور مڈل آف سے باہر کی طرف سوئنگ ہوگی۔ وہ تیزی سے پچھلے پاؤں پر گیا اور بٹ

اعتماد سے کور ڈرائیو کھیلا۔ اس کے ساتھ اس نے کریز چھوڑ دی اور رن بنانے کے لیے آتے ہوئے اپنے ساتھی کا ہاتھ تھام کر پویلین کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ شاٹ چوکا ہے۔ سارا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج رہا تھا۔ پاکستانی جھنڈے لہرا رہے تھے کیونکہ پاکستانیوں کی خاصی تعداد میچ دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ جھنڈے ہلا رہے تھے اور ایک ردھم میں خالد کمال خالد کمال چیخ رہے تھے۔

وہ تماشائیوں کے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلاتا ہوا پویلین کی طرف بڑھتا رہا جہاں اس کے تمام ساتھی کھڑے تالیاں بجا رہے تھے ایک اعصاب شکن ننگ کا خاتمہ۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرتے ادا کرتے ہوئے سوچا۔ انھیں میچ جیتنے کے لیے ۳۳۹ رنز بنانا تھے اور پاکستان کا دوسری اننگز کا اب تک کا ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔ پھر پرتھ کی اس تیز ترین وکٹ پر پاکستان کی کارکردگی بھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اوپنرز نے اچھا اسٹارٹ دیا تھا لیکن مڈل آرڈر میں اس کے سوا کوئی جم کر نہیں کھیل سکا تھا۔ یہاں تک کہ ۲۷۵ رنز پر ۹ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے اور ہر شخص کو یقین تھا کہ پاکستان میچ ہار جائے گا لیکن انھوں نے آخری وکٹ کی ناقابل شکست شراکت میں ۸۵ رنز بنا کر میچ جیت لیا تھا۔ یہ ایک جرأت انگیز فتح تھی لیکن اس کے لیے خالد کو ساڑھے چار گھنٹے تک بے پناہ ارتکاز کے ساتھ اعصاب کو توڑ دینے والی جنگ لڑنا پڑی تھی۔ دنیا کی تیز ترین وکٹ اور پھر آسٹریلیا کی بالنگ۔ سکون کا کوئی لمحہ بھی تو نہ تھا۔ خدا کا شکر کہ ہم سرخرو ہوئے۔ اس نے سوچا۔

توقع کے مطابق مین آف دی میچ وہی قرار پایا۔ دونوں اننگز میں اس نے سینچری بنائی تھی اور اس کی یہ میچ وننگ والی دوسری اننگ تو دیکھنے کی چیز تھی۔

اس کے ساتھی اس سے لپٹ گئے۔ یہ پرتھ میں پاکستان کی پہلی فتح تھی۔

اس میچ نے خالد کو فکر کا وہ لمحہ بھی دیا تھا جو آئندہ کئی دنوں پر محیط ہو گیا۔ اس میچ کی دوسری اننگز میں وہ ایک ہک کھیلنے گیا اور ایکشن کے درمیان اس نے دیکھا کہ وہ شاٹ پہلے کھیل گیا ہے۔ وہ تو چونکہ اس نے گیند پر نظر رکھی تھی، اس لیے بچ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ بالر نے بڑی ذہانت سے سلو باؤنسر کرایا تھا لیکن اس باؤنسر نے بہرحال اس پر سوچ کے نئے دروازے کھول دیے تھے۔

اب اسے ریٹائر ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا تھا۔ اس نے سوچا، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ تیرہ سالہ ٹیسٹ کیریئر میں اپنے وطن کی سرزمین پر ایک میچ بھی نہ کھیل سکا۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے سولہ برس میں صرف وطن کے خواب ہی دیکھے تھے۔ وطن کی گلیاں، کوچے، پارک، کھیل کے میدان۔ وہ سب کچھ خواب ہو گیا تھا اور یہ سب کچھ کیوں ہوا، وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے دس سال ایک مسلسل حماقت میں گزار دیے ہیں۔ اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا۔ نہیں، وہ اپنے ضمیر کا مجرم نہیں، اس کا ضمیر مطمئن ہے پھر خواہ مخواہ اس نے خود پر خوشیوں کے دروازے بند کیے رکھے اور جلاوطنی کا عذاب سہتا رہا۔ یہ درست ہے کہ ثمینہ کو سمجھانا مشکل تھا لیکن کوشش تو بہرحال کی جا سکتی تھی۔ سچائی کا تو اپنا ایک لمحہ ہوتا ہے ایک اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ سچ کبھی رائگاں نہیں جاتا۔ خیر اب بھی سہی اگرچہ بہت دیر ہو چکی ہے۔

اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس مرتبہ ویسٹ انڈیز کے خلاف ہوم سیریز کھیلنے وطن ضرور جائے گا اور وہیں اپنی زندگی کا آخری ٹیسٹ کھیلے گا۔ وہ ثمینہ کو حقیقت سے ضرور آگاہ کرے گا وہ تسلیم کرے نہ کرے۔ محض ایک مُردہ شخص کے بارے میں ناگوار حقائق کا اظہار کرنے سے بچنے کے لیے اس نے خود کو زندہ رہنے پر مجبور کر لیا تھا۔ پھر ایک طرح سے یہ ثمینہ کے ساتھ بھی زیادتی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے اسے روحانی سکون کا احساس ہوا لیکن دس سال کی دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ممکنہ تبدیلیوں نے اسے خدشوں میں مبتلا کر دیا۔ جانے اسے کس چیز نے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے پاکستان کا تصور کر کے ذہن سے تمام خدشات کو جھٹک دیا لیکن اب تنہائی اسے مستقل طور پر پریشان کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اڑ کر وطن پہنچ جائے۔

چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی مہکتی بھاپ نے اسے پھر اداس کر دیا۔ اس اداسی کا سلسلہ بالآخر اس یادگار دن کے تصور سے جا ملتا تھا جب اس مہکتی ہوئی بھاپ نے اسے آخری مرتبہ خوشی بخشی تھی۔ اس دن کے بعد چائے پینا (کی) کے لیے ایک اذیت ناک عمل بن کر رہ گیا تھا۔ چائے سے لبریز پیالی سے مہکتی ہوئی بھاپ کی بدلیاں اٹھتیں اور اس کا ذہن اداسی کی گہری دھند کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ پھر یوں ہوتا کہ چائے رکھے رکھے سرد ہو جاتی اور وہ کئی دنوں تک اس دھند میں گھرا رہتا یوں وہ چائے سے دور ہوتا گیا۔

وہ ایک ایسا ہی یادگار دن تھا۔ جگہ بھی یہی تھی لیکن درمیان میں دس برس حائل تھے۔ دس طویل سال جو بالوں میں سفیدی چھوڑتے، خدوخال کی نرمی کو پامال کرتے اور آنکھوں میں معصومیت کی جگہ دکھ کی آگہی کی سختی چھوڑتے ہوئے گزر گئے تھے۔ دس برس اُدھر کی وہ شام یادگار تھی کہ اس شام وہ تینوں آخری مرتبہ اکٹھا ہوئے تھے۔ اس روز ثمینہ نے مہکتی ہوئی چائے سے لبریز پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا کہ وہ محبت جیسی کسی حماقت پر یقین نہیں رکھتی اور وہ شادی بھی اپنی پسند سے کرے گی۔ لہٰذا اگلے روز ہونے والا کرکٹ میچ ان کا مسئلہ حل کر دے گا۔ مسئلہ وہی روایتی قسم کا تھا۔ وہ دونوں بڑے غیر روایتی انداز میں ثمینہ سے محبت کرتے تھے اور ثمینہ محبت کی قائل نہیں تھی۔ رہی بات پسند کی تو

ایک وقت میں ایک سے زیادہ لوگوں کو پسند کرنا کچھ ایسی بُری بات بھی نہیں۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو، اس لیے موازنہ ممکن نہیں۔" ثمینہ نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ طارق تمہارا چچازاد ہے اور میں ماموں زاد۔" خالدہ نے مزاحیہ انداز میں آنکھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"خالدہ! اس وقت مذاق مت کرو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔" ثمینہ نے غصے سے کہا تھا۔

"مذاق تو خیر خالدہ نے بھی نہیں کیا لیکن تم بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتی ہو؟" طارق نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تم دونوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے۔ تم دونوں کرکٹ کھیلتے ہو اور دونوں ہی اچھے بالر بھی ہو۔ یہی وہ نقطہ ہے، جہاں تم دونوں کا موازنہ ممکن ہے۔"

"ٹھیک ہے، کل ویسے بھی گرین اور ریڈ خاندانوں کا ٹکراؤ ہے۔" اسے آج بھی اپنے لہجے کی شوخی یاد تھی۔

"تم دونوں میں سے جو بھی کل بہتر بن بالر کا کپ جیتے گا، میں اس کے حق میں فیصلہ دوں گی لیکن یہ شرط صرف ہم تینوں کے علم میں رہنی چاہیے۔" ثمینہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "اور یاد رکھنا، مجھے اسپورٹس مین شپ بہت اپیل کرتی ہے۔"

"خیر یہ خصوصیت تو ہم دونوں ہی میں بہت زیادہ ہے۔" اس نے ہنس کر کہا تھا اور طارق بھی مسکرا دیا تھا۔

خاندان گرین ایونیو اور خاندان ریڈ ایونیو کا لطیفہ بھی خوب تھا۔ ان کا خاندان بہت بڑا تھا اور کرکٹ ان کا خاندانی کھیل تھا۔ ان کے خاندان نے ملک کو کئی نامور کرکٹر دیے تھے۔ کرکٹ کا رجحان اتنا زیادہ تھا کہ ہمیشہ ان کے خاندان میں کرکٹ کھیلنے والے نوجوانوں کی تعداد بائیس سے زیادہ ہی رہی تھی۔ اس طرح مستقل طور پر دو خاندانی کرکٹ ٹیمیں تشکیل پا گئیں۔ کھلاڑی جاتے آتے رہے لیکن ٹیمیں قائم رہیں۔ ان ٹیموں میں کھیلنے والے آپس میں رشتے دار تھے۔ اس لیے بڑی ہم آہنگی تھی۔ خاندان کی ایک روایت ہر سال ۱۴ اگست کو دونوں ٹیموں کے درمیان ہونے والا نمائشی میچ بھی تھا۔

"کہاں کھو گئے ہو؟" دفعتاً ثمینہ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی بدلیوں سے جھلکتا ہوا اس کا خواب خواب چہرہ دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ عمر اس کے چہرے سے پڑھی جانے لگی ہے۔ محض طارق کی وجہ سے۔ اسے طارق پر غصہ آگیا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا۔ لگتا ہے زندگی سے کٹ کر رہ گئی ہو؟"

"چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ثمینہ نے اسے تنبیہ کی۔

"ہاں۔ آج تو میں چائے ضرور پیوں گا۔" اس نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا ویسے نہیں پیتے ہو؟"

"پی ہی نہیں جاتی۔"

"احساسِ جرم۔" ثمینہ نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں، ہرگز نہیں۔ لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں اور میں تمہیں سمجھانا بھی نہیں چاہتا۔" اس نے شاکی نظروں سے ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"خیر، مجھے کیا؟" ثمینہ نے بے نیازی سے کہا اور اس لمحے وہ اسے وہی پرانی ثمینہ لگی۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

"سنو خالدہ! میں کٹی نہیں ہوں زندگی سے۔" ثمینہ نے بات کا رُخ بدلا۔ "تمہاری یادگار اننگز کے ویڈیو کیسٹ میرے پاس موجود ہیں۔ ہم انھیں وقتاً فوقتاً دیکھتے رہتے ہیں۔ ابو تمہاری بہت تعریف کرتے تھے۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟"

"عمدہ کھیلنگ نے تمہیں واقعی اچھا پلیئر بنا دیا ہے۔"

"ہاں ویسے بھی اچھا پلیئر ہوں۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

"اور مجھے تمہاری اسپورٹسمین اسپرٹ نے بہت متاثر کیا ہے۔" ثمینہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ "تم امپائر کے فیصلے سے پہلے ہی کوز چھوڑ دیتے ہو۔ جانے والا جاتے جاتے تمہیں دو تھپڑ دے گیا، تمہوں نے تمہیں بلندی تک پہنچا دیا۔ ایک ہی دن میں تم نے کتنا کچھ سیکھ لیا تھا۔ اسپورٹس مین شپ اور....."

"سنو ثمینہ! میں ہمیشہ سے بہت اچھا اسپورٹس مین رہا ہوں۔" اس نے ثمینہ کی بات کاٹ دی۔ "تم میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"زیادتی؟" ثمینہ کی ہنسی طنزیہ تھی۔ "کیا تم انکار کر سکتے ہو کہ تم نے ہک کرنا اس کے آخری ٹیسٹ سے سیکھا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ باؤنسر سے ڈرتے تھے؟"

"مجھے اس سے انکار نہیں۔"

"میں سوچتی رہی۔ میں نے بہت سوچا اس بارے میں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کا محرک احساسِ جرم ہے۔ تم نے دنیا کے تیز ترین بالرز کو بلا جھجک ہک کیا اور کبھی ہیلمٹ استعمال نہیں کیا۔ شاید اس امید پر کہ کبھی مس ٹائم ہو جائے۔ مگر ہے شعوری طور پر تمہیں اس کا ادراک نہ ہو۔ ویسے تلافی کی بھی ایک صورت ہے نا؟"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ لیکن میں تمہیں سمجھاؤں گا نہیں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ اب کیا کر رہے ہو؟"

"ٹیسٹ اور فرسٹ کلاس کرکٹ سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔"

"کیوں؟ ابھی سے؟"

"ہاں۔ میں یہ سننا نہیں چاہتا کہ خالد کمال فاسٹ بالرز سے ڈرنے لگا ہے۔ کہانی کا حسن تبھی اجاگر ہوتا ہے جب وہ کلائمکس پر پہنچ کر ختم

ہو جائے۔"

"اچھا خیال ہے۔"

"تمہیں تو مایوسی ہوئی ہوگی کہ اب میرے لاشعور کو تلافی کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔" اس نے چوٹ کی اور وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

"پھر اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"تم یقین کرو گی کہ کرکٹ میری زندگی ہے۔ اس لیے اس سے جدائی تو ممکن نہیں۔ مجھے کینیڈا میں کوچنگ کے لیے معقول آفر ملی ہے۔ اسے قبول کر لوں گا۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم دس سال وطن سے دور کیوں رہے؟"

"میرا جی چاہتا تھا کہ وطن کی سرزمین پر بھی کھیلوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں حساس بھی ہوں۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا کے طور پر میں نے دس برس جلاوطنی میں کاٹ دیے۔ اس عرصے میں میں نے کتنی اہم ہوم سیریز گنوا دیں۔ یوں میں نے اپنے کھیل کے ساتھ بھی ناانصافی کی اور دس برس خود کو پرائی آگ میں بھی جلایا۔"

"پھر تم نے واپس آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"تمہارا لہجہ ایسا ہے، جیسے تم میرا انٹرویو لے رہی ہو۔" اس نے ہنس کر کہا اور پھر یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ "میں اس لیے واپس آیا ہوں کہ میں نے جان لیا ہے، اسپورٹس مین اسپرٹ ضرورت سے زیادہ ہو تو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ میں تاخیر سے سہی لیکن حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔" اس نے ثمینہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے اور مسکرانے لگا۔

"معاف کرنا ثمینہ! شاید یہ تمہارے سوال کا جواب نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے وطن میں کیریئر کا آغاز تو نہ کر سکا۔ سوچا اختتام کے لیے ہی اپنی خاک سے رجوع کر لوں۔"

"اوہ۔ تو تم یہاں ریٹائرمنٹ کا اعلان کرو گے؟"

"ہاں۔ پرسوں ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلا ٹیسٹ شروع ہو رہا ہے۔ یہ میرا آخری ٹیسٹ ہوگا۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو۔"

"شاید۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور، ضرور۔" ثمینہ نے اپنی بے قراری چھپاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "لیکن میں چاہتی ہوں کہ پہلے ہم ایک یادگار میچ دیسی آرپر دیکھ لیں۔"

"تم سمجھتی ہو کہ میں..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "خیر یہ بھی سہی لیکن اس کے بعد تمہیں میری باتیں تحمل سے سننا ہوں گی۔"

"منظور۔" اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ کیسٹ کیبنٹ سے اس نے وہ ویڈیو کیسٹ نکالا جو وہ سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ کیسٹ لے کر وہ وی سی آر کی طرف بڑھ گئی۔

■

حسب روایت وہاں بہت چہل پہل تھی۔ ویڈیو ریکارڈنگ والے اپنے انتظامات میں مصروف تھے۔ کھلاڑی آپس میں اس طرح گھلے ملے ہوئے تھے کہ پتا ہی نہ چلتا تھا کون کس ٹیم سے متعلق ہے۔ ایک طرف ڈاکٹروں کا گروپ باؤنڈری رُوپ کے باہر کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف خاندان کے بزرگوں کا گروہ تھا، جس میں اکثریت دونوں ٹیموں کے اولڈ بوائز کی تھی۔ وہیں ثمینہ کے ابو بھی عشرت خالہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ دونوں آج کے میچ میں ایمپائر تھے۔ گراؤنڈ مین پچ پر رولر گھما رہا تھا۔

ثمینہ نے ایک سائے کھڑے ہوئے خالد اور طارق کی طرف دیکھا ان دونوں میں مزاج کے اختلاف کے باوجود گاڑھی چھنتی تھی۔ انھیں دیکھ کر ثمینہ کو ایک مسرت آمیز سنسنی کا احساس ہوا۔ اس کے یہ دونوں کزن آج اسے جیتنے کے لیے مقابلہ کرنے والے تھے۔ اس مقابلے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ ثمینہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ تھے بھی تو بہت مختلف۔ خالد اس کا ماموں زاد تھا۔ وہ بہت شوخ، ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ وہ ہر چیز میں چھپی ہوئی مضحکہ خیزی تلاش کر لیتا تھا۔ اس کے مزاج میں جارحیت بہت زیادہ تھی لیکن وہ اسپین بالر تھا۔ اپنے مزاج کے برعکس اس کی بیٹنگ پر دفاع کا عنصر غالب رہتا تھا۔ طارق اس کا چچا زاد تھا۔ وہ بہت سنجیدہ، کم گو اور بُردبار تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی نزاکت اور حساسیت تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اسے دراصل شاعر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ فاسٹ بالر تھا اور اس کی بیٹنگ جارحانہ ہوتی تھی۔ وہ گرین الیون کا کپتان بھی تھا۔

دونوں کی شخصیت کا یہ تضاد ثمینہ کے لیے بہت پُرکشش تھا۔ اسے کچھ صفات ایک کی پسند تھیں اور کچھ دوسرے کی۔ ان دونوں کی مشترکہ کشش نے اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج کر دی تھی اس لیے اس نے فیصلے کو آج کے میچ پر چھوڑ دیا تھا۔

دفعتاً ثمینہ کی نظریں شفیق اور امجد پر پڑیں۔ وہ دونوں کٹ میں نہیں تھے۔ ثمینہ ان کی طرف بڑھ گئی۔

"تم دونوں نہیں کھیل رہے ہو، آج؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں۔" امجد نے جواب دیا۔

"اور تم دونوں گرین الیون میں ہو نا؟" شفیق نے اقرار میں سر ہلایا۔

"تب تو طارق کو بہت پریشانی ہوگی۔" ثمینہ نے کہا۔ وہ دونوں بہترین آل راؤنڈر تھے۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" شفیق نے کہا۔ "طارق بھائی سب ٹھیک کر لیں گے۔"

ثمینہ کو فخر کا سا احساس ہونے لگا۔

میچ شروع ہونے کا وقت قریب تھا۔ طارق اور سلیم ٹاس کرنے کے لیے بڑھ گئے۔ ٹاس کر کے واپس آئے تو دونوں بے حد سنجیدہ تھے۔

طارق تو شاید عادتاً سنجیدہ تھا لیکن سلیم کی سنجیدگی معنی خیز تھی۔ ثمینہ کا اندازہ درست نکلا۔ طارق نے ٹاس جیت لیا تھا۔

"سلیم بھائی! آپ لوگ بیٹنگ کیجیے!" طارق نے کہا اور سلیم کے چہرے پر رونق آگئی۔ پھر طارق نے اشارے سے اپنے کھلاڑیوں کو اکٹھا ہونے کے لیے کہا۔ بارہ کھلاڑی قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ طارق نے اس قطار میں سے تنویر کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تنویر میچ میں بارھواں کھلاڑی ہے۔ تنویر بھی بہت اچھا آل راؤنڈر تھا۔

"میچ تو ہم اسی وقت جیت چکے ہیں۔" قریب کھڑا سلیم کسی سے کہہ رہا تھا۔ "گرین ایلیون میں سوائے طارق کے کچھ نہیں رکھا۔ اب تو ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تمام کپ ہم اٹھائیں۔"

"مجھے تو دو باتوں پر حیرت ہے۔" یہ اوصاف کی آواز تھی۔ "ایک تو یہ کہ طارق نے تنویر کو بھی ڈراپ کر دیا اور دوسرے یہ کہ ٹاس جیت کر ہمیں بیٹنگ دے دی۔"

"میرا خیال ہے، آج وہ بہت مایوس ہے۔" سلیم نے کہا۔ ثمینہ نے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ خلافِ توقع بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی چمک تھی۔ حالانکہ اس کی ٹیم میں تین بہترین... آل راؤنڈر کی جگہ نوآموز کھلاڑی کھیل رہے تھے۔

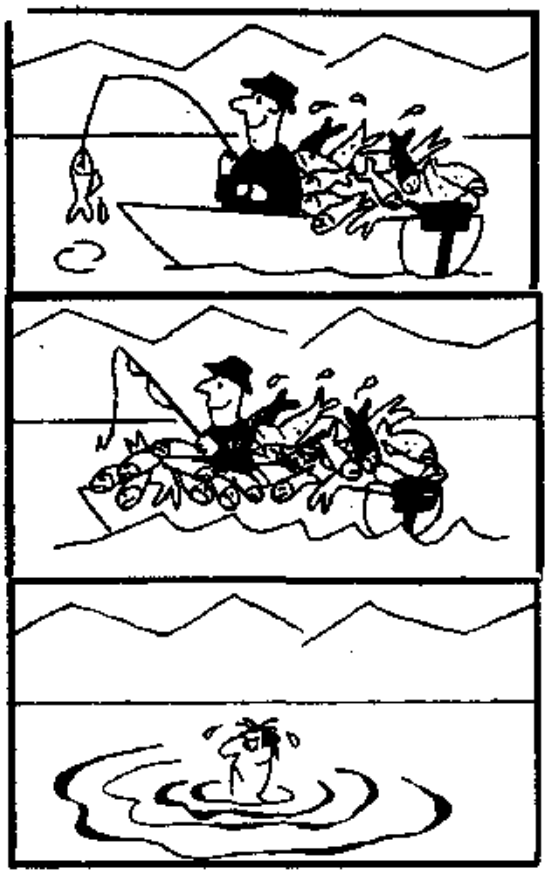

طارق بالنگ شروع کرنے کے لیے قدم گن رہا تھا۔ یہ ایک سنسنی خیز میچ کا آغاز تھا۔ ایسا میچ جس کے نتیجے پر ایک بہت اہم فیصلے کا انحصار تھا۔ ثمینہ بہت زیادہ ہیجان اور سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی دوربین لے کر مڈ وکٹ باؤنڈری کے باہر جا بیٹھی۔ وہ اس میچ کو تنہا بیٹھ کر دیکھنے کی خواہشمند تھی۔

طارق بہت اعتماد سے بالنگ کر رہا تھا لیکن ثمینہ کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ دفاعی بالنگ پر مجبور ہے کیونکہ اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی اور بالر موجود نہیں۔ تین اچھے کھلاڑیوں کی غیر موجودگی نے ٹیم غیر متوازن کر دی تھی۔ ریڈ ایلیون کے کھلاڑی طارق کا اوور بہت محتاط ہو کر کھیلتے تھے اور دوسرے اوور میں اس کی تلافی کر لیتے تھے۔ رنز بننے کی رفتار کافی تیز تھی۔

"یہاں اکیلی بیٹھی ہوئی ہو؟" اس نے نظریں اٹھائیں۔ خالد کھڑا تھا۔ پھر وہ اطمینان سے پاؤں پھیلا کر وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

"لطف آ رہا ہے اکیلے بیٹھ کر دیکھنے میں؟" وہ بولی۔ "ایک بات بتلاؤ، طارق نے ٹاس جیت کر بیٹنگ کیوں نہیں کی؟"

"وہ خود کو بالنگ کا پورا موقع دینا چاہتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ بالنگ کا بوجھ تنہا اس کے کاندھوں پر ہے اور سچی بات یہ ہے کہ وہ حق ادا کر رہا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر وہ دونوں خاموشی سے میچ دیکھتے رہے۔ سولہ اوورز میں ایک سو تین رنز بن چکے تھے اور چار وکٹیں گری تھیں۔ ان میں تین وکٹیں طارق کی تھیں۔ خالد کا نمبر آنے والا تھا، اس لیے وہ ہیڈ کرنے کے لیے اٹھ گیا۔ کھیل اسی رفتار سے چلتا رہا۔ بڑے اچھے شاٹس کھیلے جا رہے تھے۔ ہر شاٹ پر تالیاں بجتی تھیں اور کبھی کبھی خراب فیلڈنگ پر نوعمر لڑکوں کے کارنر سے ہوٹنگ بھی برستی تھی۔ انیسویں اوور میں پانچویں وکٹ گر گئی۔ یہ وکٹ بھی طارق کی تھی۔ اب خالد کھیل رہا تھا۔ بیس اوور کے بعد پانی کے وقفے پر اسکور ایک سو سینتیس رنز، پانچ کھلاڑی آؤٹ تھا۔

"ثمینہ!" انجوائے کر رہی ہو؟" طارق کوک کی دو بوتلیں لیے اس کی طرف چلا آیا تھا۔ ایک بوتل اس نے ثمینہ کی طرف بڑھا دی۔

"کیا صورتِ حال ہے؟" ثمینہ نے پوچھا۔

"تمہارے سامنے ہے۔" اس نے بے پروائی سے کاندھے جھٹکے۔ "میچ تو ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دراصل مجھے اپنے دوسرے بالرز سے سپورٹ نہیں ملی۔"

"تم نے تنویر کو کیوں ڈراپ کر دیا؟"

"تنویر بہت اچھا کھلاڑی ہے لیکن شفیق اور امجد کے بغیر ہمیں ہارنا ہی تھا۔ میں تنویر کو شکست میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کھلاڑیوں کے لیے مورال بہت اہم ہوتا ہے۔ پھر اسی بہانے ان تینوں بچوں کو کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے سال دیکھنا انھی بچوں کا کھیل۔" اور وہ اس کی اسپورٹس مین اسپرٹ کی قائل ہو گئی۔ وہ شکست کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر رہا تھا

درحقیقت آج کا میچ اس کے لیے ایک اعصابی جنگ تھا۔ اس لمحے ثمینہ کو وہ بہت اچھا لگا۔

وقفے کے بعد طارق کا اوور تھا اور اس کے سامنے خالد تھا۔ طارق نے پہلی گیند پھینکی۔ گیند اس قدر اچانک اور تیزی سے اٹھی کہ خالد نے بمشکل اپنا سر ایک طرف جھکاتے ہوئے خود کو بچایا۔ وہ بچ تو گیا لیکن اس کا اعتماد اس گیند کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ وہ طارق کے پورے اوور میں ایک گیند بھی اپنے بلے پر نہ لے سکا البتہ دوسرے اینڈ سے اشرف نے تین چوکے لگا کر رنز کی اوسط برقرار رکھی۔

طارق کا اگلا اوور بھی حسبِ سابق گزر گیا جبکہ شمیم کے اوور میں اشرف آؤٹ ہو گیا۔ اب پچیس اوورز میں اسکور ایک سو چودہ رنز تھا اور چھ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ ابھی چھ اوورز باقی تھے۔ پچیسویں اوور میں طارق کی پہلی دو گیندوں پر خالد مسلسل بیٹ ہوا۔ طارق نے اپیل بھی کی لیکن ثمینہ کے ابّو خاموش کھڑے رہے۔ خالد تیسری گیند بہت محتاط طریقے سے کھیلنے کے لیے نکلا لیکن گیند سوئنگ ہوئی اور اس کے بلے اور پیڈ کے انتہائی معمولی گیپ میں سے گزرتی ہوئی وکٹ کیپر کے گلوز میں چلی گئی۔ اس بار طارق نے بہت زیادہ پُراعتماد اپیل کی۔ فیلڈرز نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ خالد بے نیازی سے سر جھکائے بلے سے وکٹ پر آئے ہوئے گھاس کے تنکے ہٹاتا رہا۔ پھر اس نے ثمینہ کے ابّو کی اٹھی ہوئی انگلی دیکھی۔ اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ وہ وکٹ کیپر کی طرف مڑا اور اس نے اپنے پیڈ کو چھو کر کچھ بتایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کریز چھوڑ چکا تھا۔ یہ طارق کی پانچویں وکٹ تھی۔

"کیا تم آؤٹ نہیں تھے؟" ثمینہ نے خالد سے پوچھا۔

"آؤٹ تو نہیں تھا لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"لیکن آواز تو یہاں تک آئی تھی۔"

"گیند پیڈ سے چھو کر گئی تھی لیکن کوئی بات نہیں۔ یہ تو اس کھیل کا لازمی حصہ ہے۔"

ثمینہ کو بہت غصہ آیا۔ طارق کے برعکس اس شخص میں اسپورٹس مین اسپرٹ بالکل نہیں ہے۔ اس نے سوچا اور اس کا جی چاہا کہ طارق اس مقابلے میں جیت جائے۔

تیس اوورز پورے ہو چکے تھے۔ ریڈ ایلون نے نو کھلاڑیوں کے آؤٹ ہونے پر دو سو چھ رنز بنائے تھے۔ گرین ایلون کے لیے یہ بہت مشکل ہدف معلوم ہوتا تھا۔ طارق نے ستر رنز دے کر سات وکٹیں لی تھیں وہ آٹھویں ممکنہ وکٹ حاصل نہیں کر سکا تھا اور ثمینہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس ناکامی پر خاصا جھنجلا گیا تھا۔ اب کھانے کا وقفہ تھا۔

کھانے کے وقفے کے بعد گرین ایلون نے اپنی اننگ شروع کی۔ گرین ایلون کے بیٹنگ آرڈر میں تینوں نئے کھلاڑی سب سے اوپر تھے۔ یقیناً یہ اعزاز انہیں اعتماد بخشے گا۔

ثمینہ نے سوچا۔ حسبِ روایت ریڈ ایلون کے تیز بالرز نے بالنگ کا آغاز کیا اور انھیں ابتدا ہی میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ابتدائی چھ اوورز میں تین کھلاڑیوں کو آؤٹ کر چکے تھے اور گرین ایلون کے بیٹسمین بڑے دباؤ میں تھے۔ ان کا ہدف ویسے ہی دشوار تھا۔ اس پر یہ ابتدائی دھچکا قیامت ڈھا گیا۔ بہرحال بارہ اوورز تک وہ سنبھلنے میں کامیاب ہو گئے۔

البتہ رنز بننے کی رفتار بہت سست تھی اور ان کی یقینی شکست کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اس اسٹیج پر سلیم نے خالد کو بالنگ کے لیے بلایا۔ اب خالد کے لیے فیلڈ ترتیب دی جا رہی تھی۔

ثمینہ نے حساب لگایا۔ خالد صرف اسی صورت میں جیت سکتا تھا جب وہ تمام وکٹیں حاصل کرے اور یہ ایک دشوار امر تھا۔ ثمینہ کو ایک بے نام سی خوشی کا احساس ہوا۔

"تم کس نمبر پر بیٹنگ کرو گے؟" اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے طارق سے پوچھا۔

"ہم تو دس نمبری ہیں آج۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور وہ دونوں پھر کھیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگلے لمحات بڑے سنسنی خیز تھے۔ خالد نے اپنی پہلی دو گیندوں پر دو وکٹیں لے لی تھیں۔ طارق کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اسکور تیرھویں اوور میں پانچ وکٹوں کے نقصان پر اڑتالیس رنز تھا۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ خالد کو کھیلنا گرین ایلون کے کھلاڑیوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ دوسرے اینڈ سے اوصاف بڑی نپی تلی بالنگ کر رہا تھا۔ وہ فاسٹ بالر تھا۔ پھر اچانک اوصاف کی گیند پر پہلا کیچ چھوٹ گیا۔ کیچ اگرچہ دشوار تھا لیکن ہاتھوں میں آ کر نکلا تھا۔

"لعنت ہے۔" طارق غرایا۔ "یہ فیٹ بلے نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" ثمینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیچ جان بوجھ کر چھوڑا گیا ہے۔"

"بدگمانی مت کرو۔ یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔" طارق خاموش ہو گیا لیکن اوصاف کے اگلے اوور میں اشرف سے ایک آسان کیچ ڈراپ ہو گیا۔

"یہ زیادتی ہے میرے ساتھ۔" طارق اب غصے سے کانپ رہا تھا۔

"لیکن جان بوجھ کر کیچ چھوڑنے کا تو مطلب یہ ہے کہ خالد نے ہماری شرط کے بارے میں اپنی ٹیم کو بتا دیا۔" ثمینہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"کچھ بھی ممکن ہے۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"

ثمینہ کو اس کی بات پر یقین آ گیا کیونکہ اگر یہ کیچ پکڑ لیا جاتا تو خالد ہار گیا تھا۔ اسے تو تمام وکٹیں لینا تھیں۔

دو کیچ ڈراپ ہونے کے باوجود پانی کے وقفے تک سات کھلاڑی آؤٹ ہونے پر صرف اٹھتر رنز بنے تھے۔ خالد کی چار وکٹیں ہو چکی تھیں اور گرین الیون میچ یقینی طور پر ہار گئی تھی۔ میچ اب یک طرفہ اور غیر دلچسپ ہو گیا تھا۔

"یہ تمہاری اسپورٹس مین اسپرٹ ہے؟" وقفے کے دوران ثمینہ نے خالد پر طنز کیا۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم خوب جانتے ہو میرا مطلب۔ یہ کیچ اتفاقیہ طور پر نہیں چھوٹے ہیں۔"

"اگر مطلب ہے میں نے ان لوگوں سے درخواست کی تھی کہ وہ کیچ چھوڑ دیں؟" اس نے بڑے رسان سے کہا۔

"ہاں مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے۔"

خالد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "دیکھو ثمینہ! میں تمہارے کافی قائل ہوں تمہیں مجھ سے چھچھورے پن کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میں ہارنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں سمجھیں؟" اس نے برہمی سے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ کھول کر رہ گئی۔ خالد کی کوئی دلیل سامنے کی حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی تھی۔

وقفے کے بعد خالد نے پہلے ہی اوور میں ندیم کو بولڈ کر کے پانچویں وکٹ حاصل کر لی۔ اگلا بیٹسمین طارق تھا۔ اس نے جاتے ہی ایک رن بنایا لیکن خالد کے اسی اوور کی آخری گیند پر نواں کھلاڑی بھی آؤٹ ہو گیا۔ یوں خالد کی چھ وکٹیں ہو گئیں — یہ یک طرفہ اور پھسپھسا میچ کم از کم تین افراد کے لیے خاصا سنسنی خیز ہو گیا تھا۔ ثمینہ کا سوئمبر اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اب نو اوورز باقی تھے اور آخری کھلاڑی کھیل رہا تھا۔ اگر خالد یہ وکٹ حاصل کر لیتا تو وہ کم رنز دینے کی بنیاد پر بہترین بالر کا کپ جیت لیتا۔ اب تک کی چھ وکٹیں اس نے پانچ اوورز میں صرف نو رن دے کر حاصل کی تھیں۔

طارق نے آخری کھلاڑی کو کافی دیر تک کچھ سمجھایا۔ شاید وہ وکٹ بچانے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ پھر وہ بیٹنگ کریز پر پہنچ گیا۔ ثمینہ نے دیکھا اس کے چہرے پر جوش، ہیجان اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اوصاف کے اوور میں وہ بہت کھل کر کھیلا۔ اس نے تین چوکے بھی لگائے۔ کھیل میں پھر سے جان پڑتی دکھائی دینے لگی۔ اوصاف کے اوور کی آخری گیند پر جو ڈرامہ ہوا اس نے تمام لوگوں کو ششدر کر دیا۔ طارق نے بڑی بیتابی سے اس گیند کو کھیلنا چاہا لیکن نہ کھیل سکا۔ پھر وہ پیچھے دیکھے بغیر رن بنانے کے لیے دوڑا۔ فہیم نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔ گیند وکٹ کیپر سلیم کے ہاتھ میں تھی اور فہیم ابھی کریز سے بہت دور تھا۔ یہ ایک یقینی رن آؤٹ تھا۔ لیکن سلیم نے گیند وکٹوں پر مارنے کے بجائے روک لیا۔ یوں ایک رن بن گیا۔

"یہ بھی خالد کو جتوانے کی کوششیں ہیں۔" ثمینہ نے جھنجلا کر سوچا۔

"واقعی یہ فیئر پلے نہیں ہے۔"

آخری گیند پر رن لے کر طارق، خالد کے سامنے آ گیا۔ خالد نے تمام فیلڈرز کو آگے لے لیا تھا لیکن طارق نہایت اعتماد سے کھیل رہا تھا۔ خالد کے اوور کی آخری گیند پر پھر اس نے ویسا ہی رن لیا لیکن فہیم رن آؤٹ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ ثمینہ کو طارق پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ وہ اکیلا ڈٹا ہوا تھا اور گیارہ کے لڑکے اس کے خلاف صف بستہ تھے۔

اوصاف کے اگلے اوور میں اس نے پھر جارحانہ انداز اختیار کیا اور ایک چھکا بھی مارا۔ آخری گیند پر پھر اسی طرح رن لیا گیا۔ طارق نے فیلڈرز کی بے بسی بھانپ لی تھی۔ پچیس اوورز ہو چکے تھے۔ گرین الیون کے ایک سو دو رنز تھے لیکن رنز کی اب کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اب یہ کھیل صرف تین افراد کے لیے دلچسپ تھا۔ ابھی چھ اوورز باقی تھے اور طارق کو وکٹ بچانا تھی۔ یوں وہ میچ ہار کر بھی فتحیاب ہو جاتا۔

پچیسواں اوور خالد نے پھینکا اور طارق نے بہت محتاط طریقے سے اسے کھیلا۔ آخری گیند پر اس نے پھر ناممکن رن لینے کی حرکت دکھائی۔ فیلڈرز یقیناً بڑی بے بسی محسوس کر رہے تھے۔ ثمینہ باہر بیٹھے ہونے کے باوجود محسوس کر سکتی تھی کہ گراؤنڈ میں ماحول کس قدر کشیدہ ہے۔ طارق نے اوصاف کو پھر بے پروائی سے کھیلا اور پہلی تین گیندوں پر لگاتار چوکے لگائے۔ چوتھی گیند پر اس نے نہایت خراب شاٹ کھیلا۔ گیند اس کے بلے کو چھوتی ہوئی وکٹ کیپر سلیم کے پاس گئی۔ بہت آسان کیچ تھا لیکن سلیم نے اس کو پکڑنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ثمینہ نے اتنے فاصلے کے باوجود طارق کے بدن میں غصے کی لرزش محسوس کر لی۔ اس نے کریز چھوڑی اور سلی مڈ آن پر کھڑے ہوئے خالد کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ لمحے ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ خالد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور طارق کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ طارق نے اپنے بلے کو زمین پر کئی مرتبہ مارا اور پھر بیٹنگ کریز کی طرف مڑ گیا۔ وہ بے حد غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ اوصاف اپنے نشان پر کھڑا طارق کے تیار ہونے کا منتظر تھا۔ طارق نے کریز پر کھڑے ہو کر لیگ کی فیلڈ کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نظریں ثمینہ پر جم گئیں۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا پھر اس تناؤ کو دور کرتی ہوئی اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مڑا اور کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ثمینہ کے اعصاب چٹخنے لگے۔ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دو رہین پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ اوصاف نے گیند کرائی، طارق بیک فٹ پر گیا، اس کے چہرے کا رخ لیگ ایمپائر کی جانب ہوا، اس نے بلے کو تیزی سے پل کرنے کے انداز میں گھمایا، پھر جیسے اس کا توازن بگڑا، سنبھلنے کی کوشش میں وہ کچھ اور پیچھے ہٹا، اس کی ایڑی وکٹوں سے لگی اور بیلز گر گئے۔ اسی لمحے اوصاف

کا پھینکا ہوا باؤنسر اس کی دائیں کنپٹی پر لگا اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح بیلز سے محروم وکٹوں پر گر گیا۔ ثمینہ کے ہاتھوں سے دوربین چھوٹ گئی۔ یک طرفہ میچ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ثمینہ کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

■

خالد نے وی سی آر آف کر دیا تھا لیکن ثمینہ کی نظروں کے سامنے گزرے لمحے اب بھی رواں دواں تھے۔ اس دن کے بعد سے خالد سے اس کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ طارق کی تدفین کے بعد خالد جلد ہی انگلینڈ چلا گیا تھا۔ ماموں جان اور ممانی نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ وہ وہاں تعلیم حاصل کرتا رہا اور کاؤنٹی میں کھیلتا بھی رہا۔ تین سال بعد وہ پاکستانی قومی ٹیم میں بھی منتخب ہو گیا۔ اس نے دنیا کے تیز ترین بالرز کی پٹائی کر کے شہرت حاصل کی۔ وہ کبھی ہیلمٹ نہیں پہنتا تھا۔ اس کی ٹائمنگ اور بیٹنگ کرکٹ کے ناقدین کی نظر میں غیر معمولی اور مثالی تھی۔ بیٹسمین کی حیثیت سے اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا تھا لیکن اس کی بالنگ پس منظر میں چلی گئی۔ اس نے خود بھی بالنگ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ وہ مستقل کرکٹ کھیلتا رہا لیکن جب بھی اسے پاکستان میں ہونے والی کسی سیریز کے لیے مدعو کیا جاتا' وہ کسی نہ کسی بہانے معذرت کر لیتا تھا۔

ثمینہ یہاں تنہائی کا عذاب سہتی رہی۔ اس کے بہت سے رشتے آئے لیکن اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ اپنا عہد نبھانا چاہتی تھی۔ وہ عہد' جس کے مطابق کسی نے اسے جیت لیا تھا اور خود اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ اب طارق کے آخری میچ کی ریکارڈنگ اس کی تنہائیوں کی رفیق تھی۔ اب تو اس میچ کا ایک ایک منظر' جزئیات سمیت اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا' خصوصاً اس کا وہ آخری شاٹ۔ اس کے پاس طارق کے قاتل کی تمام یادگار اننگز کے کیسٹ بھی موجود تھے۔ وہ جب بھی اس کو بے پروائی سے دنیا کے تیز ترین بالرز کو بک کرتے ہوئے دیکھتی اسے روحانی خوشی کا احساس ہوتا۔ یوں لگتا تھا جیسے قاتل ضمیر کی ملامت اور پشیمانیوں کے بوجھ تلے دبا' موت کی آرزو کر رہا ہو' بالکل ویسی ہی موت کی آرزو جیسی اس کے مقتول کو نصیب ہوئی تھی۔

"کہاں کھو گئیں تم؟" خالد نے اسے ٹوکا۔

وہ بُری طرح چونک گئی۔ "اس قتل کا منظر سلو موشن میں دیکھو گے؟" اس نے بڑی نفرت سے پوچھا۔

"جو کچھ دکھانا چاہو' دکھا دو اور جو کچھ کہنا ہو کہہ لو کیونکہ پھر تمہیں مداخلت کیے بغیر صرف سننا ہو گا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"وہ جان بوجھ کر آؤٹ ہوا تھا نا؟"

"ہاں' اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔"

"اور اس کی وجہ وہ نفسیاتی دباؤ تھا' جو تم نے اس پر ڈالا تھا۔"

"تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم نے اس کھیل کی روح کو سمجھے بغیر یک طرفہ فیصلہ کر لیا اور اس پر راسخ ہو گئیں۔ کبھی تم نے اس نفسیاتی دباؤ کا تصور بھی کیا' جو اس نے مجھ پر ڈالا تھا۔ اس پر میرا ڈالا ہوا کوئی نفسیاتی دباؤ نہیں تھا بلکہ میں نے اس کی چال اسی کو لوٹا دی تھی۔"

"ایک بات بتاؤ۔ اس نے آخری شاٹ کھیلنے سے پہلے تم سے کیا بات کی تھی؟"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اوصاف کی گیند پر سلیم نے جو کیچ چھوڑا ہے' وہ فیئر پلے کے خلاف ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ میں نے سلیم سے کیچ چھوڑنے کو نہیں کہا۔۔۔ اور وہ جس فیئر پلے کی بات کر رہا ہے' اس کی تو وہ خود کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی دھجیاں اڑا چکا ہے۔ پھر بیٹنگ کے دوران اس نے جس طرح ہماری پوری ٹیم کو بلیک میل کیا ہے' اس کے بعد یہ شکایت اس کے منہ سے کچھ اچھی نہیں لگتی۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ یونہی آخری گیند پر رن لیتا ہے' میں اسے شکار کر لوں گا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب ہمارے درمیان اعصابی جنگ ہو رہی ہے اور میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔ تم نے دیکھا کہ میری بات درست ثابت ہوئی۔ وہ بہت بودا ثابت ہوا۔"

"اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ تم نے اس پر نفسیاتی دباؤ نہیں ڈالا تھا' قاتل؟"

"سنو ثمینہ!" اس کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔ "آئندہ اس وقت تک مجھے اس طرح مت پکارنا' جب تک میری پوری بات نہ سن لو۔"

"تمہیں قاتل کہہ کر پکارنے کے لیے میں سب کچھ سن سکتی ہوں' سناؤ' کیا سنانا چاہتے ہو' مجھے؟"

"تو سنو اور دیکھو' بیچ میں مت ٹوکنا۔" اس نے سختی سے کہا۔ "میں جو کچھ کہنے والا ہوں اس کے لیے میں اللہ کے اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی جلاوطنی کی سزا کاٹتا رہا ہوں کیونکہ میں اپنے مرحوم دوست اور بھائی کی برائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں بھی انسان ہوں۔ آج میں کم از کم تم پر حقیقت ضرور آشکار کروں گا۔" وہ رُکا اس نے گہری سانس لی۔ "میرا دوست طارق بہت اچھا منصوبہ ساز تھا۔ اس نے ہر چیز کا خیال رکھتے ہوئے پلاننگ کی تھی۔ اس نے اپنے دو بہترین آل راؤنڈرز کو اس میچ میں ان فٹ ہونے کے بہانے باہر بیٹھنے پر رضامند کر لیا تھا۔ وہ دونوں اس کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ تیسرے کو اس نے خود ڈراپ کر دیا۔ معلوم نہیں' اس کے پاس اس بات کا کیا جواز تھا؟"

ثمینہ کے کانوں میں طارق کا بیان کردہ جواز گونج گیا اور وہ گم سم ہو کر رہ گئی۔

"ویسے وہ بہت اچھا ماسک بیٹر تھا۔" خالد نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ اس بات کے بھی ایسے سیکڑوں جواز سوچ سکتا تھا جو اُلٹا اُسی کی اسپورٹس مین شپ کو اجاگر کر دیں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ وہ

بہت ذہین تھا۔ اس نے ان تین کھلاڑیوں کی عدم موجودگی سے دو فائدے اٹھائے۔ ایک تو یہ کہ وہ واحد اچھا بالر رہ گیا لہٰذا زیادہ وکٹیں لے سکتا تھا۔ پھر اس نے نئے کھلاڑیوں سے اوپننگ کرائی تاکہ ان کی وکٹیں پہلے فاسٹ بالرز کو مل جائیں اور ہوا بھی یہی۔ اب تم سوچو کہ اس نے مجھ پر کتنا شدید نفسیاتی دباؤ ڈالا۔ جب مجھے بالنگ ملی تو مجھے باقی ماندہ تمام وکٹیں لینا تھیں اور یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے کھیل کی اسپرٹ مجروح نہیں ہونے دی۔ میں فیئر پلے کا قائل تھا اور اب بھی ہوں.... ورنہ میں سلیم سے کہتا تو وہ بالنگ کا آغاز مجھ سے بھی کرا سکتا تھا۔ ہمارا اسکور کم تو نہیں تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اپنے اعصاب کو چٹخنے نہیں دیا اور نیک نیتی سے محنت کی اور مجھے اس کا پھل بھی ملا۔ پھر جب میں چھ وکٹیں لے چکا تو اس نے بلیک میلنگ شروع کر دی۔ حیران نہ ہو، یہ بات تم کیسے سمجھ سکتی تھیں۔ وہ کرکٹر تھا، ذہین بھی تھا اور موقع شناس بھی۔ تم نے دیکھا کہ اس نے ہر اوور کی آخری گیند پر کیسے کیسے احمقانہ رن بنائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ہم اسے رن آؤٹ نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں بہترین بالنگ کا حیتا ہوا کپ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ رن آؤٹ نہیں کرتے تو نئے اوور کے آغاز پر وہ بیٹنگ کریز پر موجود ہوتا۔" وہ کچھ لمحے چپ چاپ ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ "تم نہیں سمجھیں ثمینہ! جیتنے والی ٹیم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ تمام کپ جیت کر مخالف ٹیم کو آؤٹ کلاس کر دے۔" یکایک ثمینہ کو یاد آ گیا کہ اس دن میچ سے پہلے سلیم نے اوصاف سے یہی کہا تھا۔

"طارق کی کھلی بلیک میلنگ نے ہماری ٹیم میں یہ روح پھونک دی کہ میچ تو ہم بہرحال جیت جائیں گے، لہٰذا بالنگ کپ کے لیے آخری وقت تک فائٹ کی جائے اسی جذبے کے تحت سلیم نے اوصاف کی گیند پر اس کا کیچ لینے کی کوشش نہیں کی۔ بخدا میں نے تو اس سلسلے میں کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ تم سے وعدہ جو کیا تھا۔ وہ تو کرکٹ میں خود بخود ہو جانے والی باتوں میں سے ایک تھی۔ اب تم یہ سوچو گی کہ وہ اتنا اچھا کھیل رہا تھا تو اس طریقے سے آؤٹ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ تو بات یہ ہے کہ وہ جارحانہ بیٹنگ کا عادی تھا اور زیادہ دیر تک کبھی نہیں ٹکتا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے وکٹ نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے وہ میرے خلاف خصوصی دباؤ میں بھی تھا اور دفاع پر بھی مجبور تھا۔ یہ بات اس کے اعصاب پر بوجھ تھی۔ میرے دو اوور ابھی باقی تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ میرے خلاف غلطی ضرور کرے گا۔ اسی لیے اس نے راہِ فرار اختیار کی اور اسی میں جان گنوا دی۔"

"لیکن وہ تو بہت اچھا بیک کرنے والا تھا۔" ثمینہ نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"ہاں لیکن اس بے ہودہ شاٹ کی دو وجوہ تھیں۔ ایک اس کی خود نمائی تھی۔ وہ وکٹ پر ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کسی بالر کو اسے آؤٹ کرنے کا کریڈٹ ملے۔ اس لیے وہ بیک فٹ پر گیا، اسٹروک کھیلنے کے ایکشن میں آیا، لڑکھڑایا اور ہیلز گرا دیے۔ یہ سارا عمل ایسا بے ساختہ تھا کہ ہر شخص نے یہی سمجھا کہ ایسا اتفاقاً ہوا ہے لیکن وہ زندہ ہوتا تو اسی شاٹ کو سلوموشن میں دکھاتا اور تم سے کہتا کہ دیکھو، میں جان بوجھ کر آؤٹ ہوا تھا۔ لیکن اس سے ایک غلطی سرزد ہو گئی اور اس غلطی کا سبب یہ تھا کہ اسے مجھ سے باتیں کر کے غصہ آ گیا تھا۔ کرکٹ میں غصہ بہت مہلک ثابت ہوتا ہے، خاص طور پر فاسٹ بالرز کے سامنے۔ وہ شدید غصے میں گیند پر نظر نہ رکھ سکا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ اوصاف نے باؤنسر پھینکا ہے ورنہ وہ آسانی سے گیند کی لائن سے ہٹ جاتا۔ درحقیقت اس کے غصے نے اس کی جان لے لی حالانکہ اسے غصہ کم ہی آتا تھا۔" وہ کچھ لمحے خاموشی سے ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ "اب بولو کیا کہتی ہو؟"

"میں... میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اور سنو، حقیقت یہ ہے کہ اس میچ کا بہترین بالر میں تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے اس کی گیند پر غلط آؤٹ دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے میں اس اسپن سے جیت گیا تھا اور اس وقت سے میں اس انعام کا منتظر

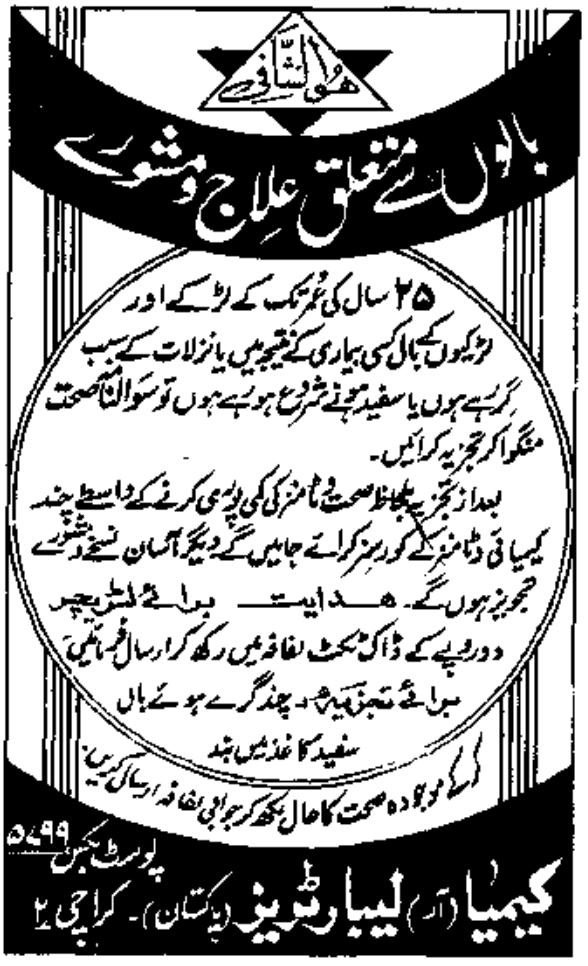

ہوں جو میرا حق ہے۔"

"اتنا میں بھی جانتی ہوں کہ ایمپائر غلط فیصلہ کر جائیں تب بھی اسے واپس نہیں لیتے۔"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اور میں بحیثیت ایک کھلاڑی احتجاج کرنا پسند بھی نہیں کرتا لیکن اگر فیصلہ زندگی اور موت کا ہو تو اس پر کرکٹ کے قوانین کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال اگر تمہارے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہو تو مجھے پکار لینا۔ میں نے بھی تمہاری طرح دس برس ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگتی ہے اور سنو، اگر میری کسی بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دینا لیکن میں اس بت شکنی پر نادم ہرگز نہیں ہوں۔"

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"آج میں لاہور جا رہا ہوں۔ برسوں سے میرے کیریئر کا آخری ٹیسٹ شروع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ میری کارکردگی یادگار ہوگی۔ اور ہاں قتل کا وہ منظر تم نے بارہا دیکھا ہے لیکن اس کی خامیوں کا تمہیں اندازہ نہیں۔ میں تمہیں پرفیکٹ ایکشن دکھاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ بت بنی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دس برس سے وہ جس شیش محل میں رہ رہی تھی، وہ بارش کی پھوار سے چکنا چور ہو گیا ہے۔

اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ طویل عرصے سے ذہن پر چھایا ہوا فریب، ایمان کی طرح اہم ہو جاتا ہے۔ اس نے اس میچ کی ریکارڈنگ کو کئی مرتبہ غور سے دیکھا لیکن خالد کی کہی ہوئی کوئی بات غلط ثابت نہ ہو سکی بلکہ اس کی ہر بات کی تائید ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ دس برس تک اس نے ایک فریب کو ایمان کی طرح پالا ہے۔ طویل فریب کے بعد حقیقت کو تسلیم کرنا بہت دشوار عمل ثابت ہوا۔ وہ اس معاملے کو بچوں کا تو چھوڑ دیتی لیکن خالد کی بات اسے یاد آجاتی اور قائل بھی کر جاتی کہ اگر فیصلہ زندگی اور موت کا ہو تو اس پر کرکٹ کے قوانین کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔ بالآخر اس نے تسلیم کر لیا کہ اس نے یک طرفہ طور پر غلط فیصلہ کیا تھا اور اس پر واجب ہے کہ اب نہ صرف اسے درست کرے بلکہ شرمندگی کا اظہار اور غلطی کی عملی تلافی بھی کرے۔ یہ فیصلہ کر کے رات وہ بہت سکون سے سوئی۔

"صبح ناشتہ کرتے ہوئے اخبار کی سرخی نے اسے چونکا دیا۔ اسے احساس ہوا کہ باطن میں ہونے والی جنگ نے دو دن تک اسے زندگی سے دور کر دیا تھا۔ اس کی نظریں اخبار پر جم گئیں۔

"لاہور۔ 9 ستمبر۔ نامور اسٹار بیٹسمین خالد کمال نے آج پہلے ٹیسٹ کے پہلے دن پاکستانی ٹیم کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس کی پوزیشن بھی مضبوط بنا دی۔ پاکستان کے ابتدائی بیٹسمین ویسٹ انڈیز کے تیز بالروں کے سامنے سپر ڈال چکے تھے اور ایک مرحلے پر صرف تیرہ رنز پر چار وکٹیں گر چکی تھیں۔ ویسٹ انڈیز کی تیز بالنگ کا طلسم خالد کمال کی جارحانہ بیٹنگ نے توڑ دیا۔ ان کی بیٹنگ کی کلاس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کھیل ختم ہونے پر ان کا انفرادی اسکور ۲۸ چوکوں اور ۴ چھکوں کی مدد سے ۱۹۸ رنز تھا اور پاکستان نے چھ وکٹوں کے نقصان پر ۳۶۲ رنز بنائے تھے۔

۳۵ سالہ خالد کمال کی وطن کی سرزمین پر یہ پہلی اننگ ہے جو آخری بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے میچ شروع ہونے سے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ اس ٹیسٹ کے بعد وہ کل کرکٹ سے ریٹائر ہو جائیں گے۔ آج کی خوبصورت اننگ ان کے کیریئر کی بہترین اننگ ہے۔ انھوں نے اپنے خوبصورت کور ڈرائیو، اسکوائر کٹ اور ہکس سے تماشائیوں کے دل موہ لیے۔ ان پر کسی بھی لمحے کسی بھی بالر کا دباؤ نہیں تھا۔ توقع ہے کہ وہ بآسانی ڈبل سینچری مکمل کر لیں گے۔"

اخبار نے خالد کی متعدد تصاویر بھی شائع کی تھیں۔ ثمینہ کو محرومی کا احساس ہوا۔ کاش اس نے یہ اننگ دیکھی ہوتی۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ میں وی سی آر پر دیکھ لوں گی۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر اسے خالد کی آخری بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ تمہارے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہو تو مجھے پکار لینا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ میچ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ لنچ کے وقفے میں کسی طرح قذافی اسٹیڈیم میں اس سے رابطہ قائم کروں گی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

"امی! ٹی وی پر خالد کا میچ آ رہا ہے۔ نہیں دیکھیں گی؟" وہ اس وقت بچوں کی طرح ایک اسٹینڈ تھی۔

"اس کا میچ تو کل بھی آیا تھا۔"

"کل مجھے یاد ہی نہیں رہا۔"

"تم بھی سنکی ہو۔" امی بھنا کر بولیں۔ "وہ آیا تھا تو منہ پھلائے بیٹھی رہیں۔ کل وہ اتنا اچھا کھیلا اور تم اپنے کمرے میں بند رہیں۔ آج تمہیں اس کے میچ کا خیال آ گیا؟ اچانک؟"

"چھوڑیے امی ان باتوں کو۔ وقت ہو گیا ہے، آئیے نا۔" اس نے ضد کی۔

"میں تو خیر دیکھوں گی ہی۔ کل بھی دیکھا تھا میں نے۔ تم چلو، میں آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور ٹیلیویژن والے کمرے کی طرف چل دی۔ آج وہ خود کو دس برس پہلے کی ثمینہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ٹی وی آن کیا۔ فیلڈرز اور ایمپائرز میدان میں پہنچ چکے تھے اور پھر پاکستانی بیٹسمین نمودار ہوئے۔

اس کے سر پر پاکستانی گرین کیپ تھی۔ اسے دیکھ کر ثمینہ کو پہلی مرتبہ فخر کا احساس ہوا۔

خالد نے پہلی چار گیندیں بڑے سکون سے کھیلیں۔ پانچویں گیند باؤنسر تھی۔ وہ بہت تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے پوزیشن لی اور نہایت اعتماد اور سکون سے خوبصورت ہک کیا۔ شاٹ بہت اونچا ہونے کے باوجود باؤنڈری کے باہر گرا اور ایمپائر نے چھکے کا اشارہ دیا۔ خالد کی ڈبل سینچری ہوگئی تھی۔ تماشائی میدان میں گھس آئے۔ وہ اسے گلے سے لگا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اس کے گلے میں ہار لا کر ڈال دیا اور دوسرے لڑکے نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ مسکراتا ہوا سب سے ہاتھ ملاتا رہا۔ بالآخر پولیس نے تماشائیوں کو باہر نکالا۔ خالد نے ہار گلے سے اتار کر ایمپائر کو دیا اور کھیل دوبارہ شروع ہوگیا۔

اوور کی آخری گیند پر خالد نے رن بنایا۔ اب نئے اوور کا سامنا بھی اسی کو کرنا تھا۔

خالد نے چاروں طرف دیکھا۔ فیلڈ کا جائزہ لیا... پھر اس کا رخ کیمرے کی جانب ہوگیا۔ وہ کچھ لمحے یونہی کھڑا رہا۔ اسکرین پر اس کا کلوزاپ نظر آرہا تھا۔ یہ پورا منظر جانا پہچانا سا تھا بلکہ کسی منظر کاری پلے معلوم ہو رہا تھا۔ ثمینہ کانپ کر رہ گئی۔ خالد کی آنکھوں میں ایک واضح چیلنج تھا۔ صرف وہی اس چیلنج کا مفہوم سمجھ سکتی تھی کیونکہ یہ صرف اس کے لیے تھا۔

"قتل کے اس منظر کی خامیوں کا تمہیں اندازہ نہیں۔ میں تمہیں پرفیکٹ ایکشن دکھاؤں گا۔ شاید اسی طرح تم اس منظر کو بھول سکو۔"

وہ لرز کر رہ گئی۔ "نہیں کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

اب وہ کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ بالر اسٹارٹ لے چکا تھا۔ وہ دکھوں پر آیا۔ اس نے گیند پھینکی اور یہ توقع کے عین مطابق باؤنسر تھا۔ خالد تیزی سے بیک فٹ پر گیا۔ اب اس کا جسم اور بلا بک کی پوزیشن میں آرہا تھا کہ دفعتاً عدم توازن کی وجہ سے اس کی ایڑی وکٹ سے ٹکرائی۔ یہ وہی پرانا منظر تھا۔ نہیں... یہ ایکشن ری پلے تھا' شاید۔

"نہیں..." وہ زور سے چیخی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ اس کا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ ہٹائے اور ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اب ایکشن ری پلے دکھایا جا رہا تھا۔ یہ وہی منظر تھا' بارہا دیکھا ہوا منظر۔ وہی پیچھے کی طرف دھیرے دھیرے ہٹتا ہوا پاؤں اور پھر گرتے ہوئے بیلز... وہی منظر تھا۔ بس اداکار تبدیل ہوگیا تھا اور اس مرتبہ اداکاری اور حقیقت کے درمیان ایک بال کا فاصلہ بھی نہیں تھا۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ دفعتاً اس کے وجود میں جیسے روشنیوں کا تیز جھماکا سا ہوا اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اس کے وجود کی ہر روشنی بجھ چکی تھی۔ صرف ٹی وی کا اسکرین روشن رہ گیا تھا۔

اس نے گلوز اتارے اور ایمپائر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایمپائر سے وہ ہار بڑے احترام سے واپس لیا اور اسے پتے کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔ یہ ہار وطن میں اس کے لیے پہلا اظہارِ محبت تھا' ایک اجنبی نوجوان کا پُرخلوص اور بے لوث اظہارِ محبت۔ محبت کے ان پھولوں کی خوشبو سے اس کا سارا وجود مہک رہا تھا۔ اب وہ تالیوں کی گونج میں وکٹ اور ڈریسنگ روم کا درمیانی فاصلہ طے کر رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا' آنکھیں خوشی سے نم تھیں اور جسم کا رواں رواں شکر گزاری کے احساس سے شل ہو رہا تھا۔ پریس والوں نے ڈریسنگ روم تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے آلیا۔

"آپ بہت اچھا کھیلے۔" ایک صحافی نے کہا۔

"اللہ کا کرم ہے۔"

"لیکن آپ گندا شاٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہوئے ہیں۔" دوسرے صحافی نے اعتراض کیا۔

"درست کہتے ہیں آپ۔ میرے بھائی! یہ ایک اعصاب شکن اننگ تھی اور خدا گواہ کہ اس شاٹ سے پہلے میں نے ہر شاٹ اپنی ٹیم کے لیے کھیلا تھا۔ اس کے بعد مجھے کم از کم ایک شاٹ اپنے لیے کھیلنے کا بھی حق تھا۔" اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"اس کے باوجود وہ ایک خراب شاٹ تھا۔" صحافی نے اصرار کیا۔

"اس کے باوجود بھی گیند' اسٹیڈیم کی آخری سیڑھی پر گرنے کے بعد اسٹیڈیم سے باہر جا گری۔" خالد نے بڑی خوش دلی سے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور معترض صحافی کھسیا کر رہ گیا۔

"اور آپ کا ریٹائرمنٹ...؟" ایک اور صحافی نے کہنا چاہا لیکن اس نے گلوز والا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ "باقی آئندہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تمام ساتھیوں سے مبارک باد وصول کرنے کے بعد وہ آرام سے پاؤں پھیلا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھولوں کا وہ ہار اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

'میرا یہ شاٹ یقیناً مؤثر ثابت ہوا ہوگا۔' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ 'آج حقیقت اس پر پوری طرح عیاں ہوگئی ہوگی اور اب ہماری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔ اور میں کینیڈا والی آفر ٹھکرا دوں گا۔ میں یہیں کو جنگ کروں گا' اپنے وطن میں۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ وطن ہوتے ہوئے بے وطن ہونا کتنی بڑی لعنت ہے۔'

سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے تصور میں ثمینہ کا چہرہ لہرانے لگا۔ اس چہرے کے پس منظر میں بہت سے خوبصورت خواب تھے' متحرک اور سچے خواب!

کٹھ پتلیاں

علیم الحق حقی

سیاست کی بساط پر ناچنے والی چند کٹھ پتلیوں کی رُوداد
سیاسی شعبدہ گروں کا ایک تماشائے ستم ایجاد

سیاست آج جس طرح رُسوا سرِ بازار ہے، اسے دیکھتے ہوئے کسی شاعر کا یہ مصرع بڑا برمحل معلوم ہوتا ہے ۔ گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں۔ زیرِ نظر کہانی کوچۂ سیاست کی ایسی ہی کٹھ پتلیوں کے گرد گھومتی ہے جو سب کی سب ایک ہی ڈور میں بندھی کسی ایک ہاتھ کے اشارے پر رقص کر رہی تھیں کہ اچانک ڈور ٹوٹ گئی اور پتلی تماشا بند ہو گیا لیکن ایک نئے تماشے کا آغاز بھی اس اختتام سے منسلک تھا جس میں نئی اور پرانی پتلیاں ایک نئے انداز میں مختلف دُھنوں پر متحرک ہو رہی تھیں۔

سیاست اور سیاست گروں کے حوالے سے لکھی جانے والی اس داستان کا ہر چند کہ ہمارے مُلک سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر سیاسی انارکی کے اس دَور میں جب کوئی بھی حکومت اپنی میعاد پوری نہ کر پائے اور جمہوریت کا خواب ہر مرتبہ اپنی تعبیر سے محروم ہی رہے تو ایسی کہانیاں بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ایک ایسی تحریر جس کا مطالعہ نئے انتخابات سے پہلے یقیناً دلچسپ ثابت ہوگا

ایوانِ صدر میں اپنی میز کے پیچھے بیٹھا صدر محمود شامی کوئی سخت مزاج ہیڈ ماسٹر معلوم ہو رہا تھا۔ گزشتہ ماہ شروع ہونے والے سیاسی بحران نے اس کی صحت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کا چہرہ مُرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑ گئے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں وجود کے اندر دہکنے والی آگ کے شعلوں کا عکس مچل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اپنی بارُعب شخصیت اور اپنے عہدے کے دبدبے کے باوجود احساسِ شکست نے اس کا یہ حشر کر دیا تھا کہ لگتا تھا کسی بھی لمحے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر بڑی تیزی سے قابو پا لیا۔

کمرے میں ایک ہی کیمرا تھا، جو اس کی جانب نگراں تھا۔

جیسے ہی سرخ بلب روشن ہوا، اس نے تقریر شروع کر دی۔ اب وہ کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کروڑوں ہم وطنوں سے ہم کلام تھا لیکن انداز ایسا تھا، جیسے کمرے میں موجود کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہا ہو۔ وہ انتظامیہ کی بدعنوانیوں اور پریس کی بے انصافیوں کے بارے میں انہیں بتا رہا تھا۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ گزشتہ ماہ بدعنوانیوں اور کرپشن کی وجہ سے مجھے اسمبلیاں توڑنی پڑی تھیں۔ اس پر ملا جُلا ردِّعمل سامنے آیا۔ بہت زیادہ تنقید بھی کی گئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ کچھ باتیں برحق بھی تھیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ بدعنوانیوں کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ صرف چہرے بدلے تھے، باقی سب کچھ وہی کاوی تھا۔

"مجھے کچھ بھی سمجھا جائے لیکن میں ملک و قوم کا سچا خادم ہوں۔ مجھے اقتدار کی ہوس نہیں۔ مجھے لوگوں کی فلاح و بہبود سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مجھے اس ملک کے غریبوں سے محبت ہے۔ میں انہیں خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جمہوریت کو مستحکم دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں جو قدم اٹھا رہا ہوں، وہ اسی سمت میں ہے۔

"ناقدین کا یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ ہمارے آئین میں صدر اور وزیرِ اعظم کے اختیارات کے درمیان معقول توازن نہیں۔ اسمبلیوں کے اراکین کو عوام منتخب کرتے ہیں۔ یعنی وہ براہِ راست عوام کے نمائندے ہوتے ہیں جبکہ صدر کا انتخاب عوام کے منتخب اراکین کرتے ہیں۔ یعنی صدر بالواسطہ منتخب ہوتا ہے لہٰذا اسے اسمبلیاں توڑنے کا اختیار حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

"میں اس بات سے متفق ہوں لیکن کچھ اعتراضات مجھے بھی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں جو پارٹیاں جمہوریت کی علمبردار ہیں، جن کے دم سے جمہوریت قائم ہے، وہ خود اپنی بنیاد میں غیر جمہوری ہیں۔ ان کے عہدے دار اپنے کارکنوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے۔ بزعمِ خود بڑے لیڈر عہدے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے تو بعد میں اسمبلی میں ہارس ٹریڈنگ ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعتراض بھی ہے کہ

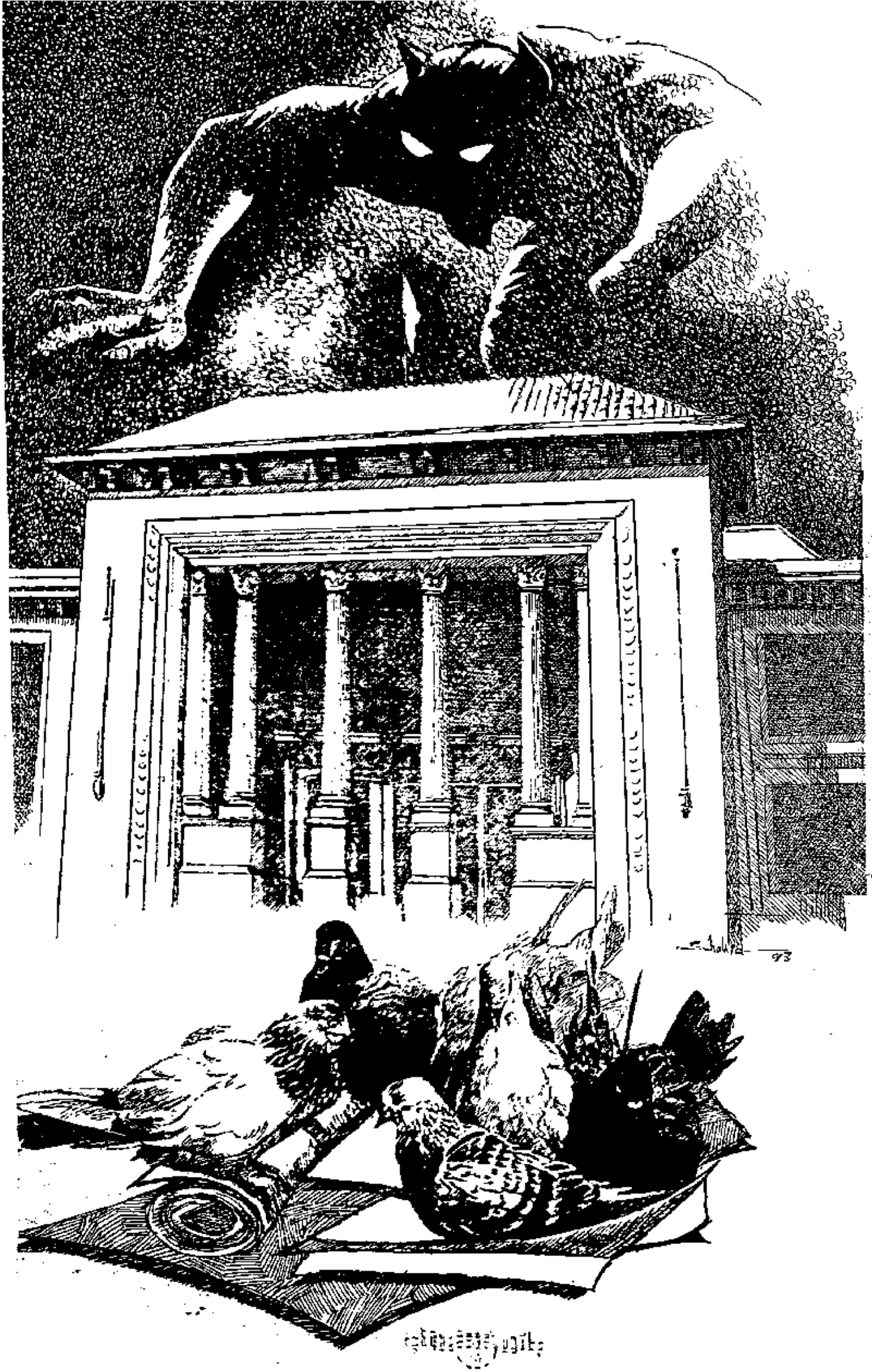

صدر کی طرح وزیراعظم بھی بالواسطہ منتخب ہوتا ہے' اس لیے کہ عام لوگ پارٹیوں کو ووٹ دیتے ہیں لیکن انہیں علم نہیں ہوتا کہ جیتنے کی صورت میں ان کی منتخب پارٹی کسے وزیراعظم نامزد کرے گی۔ اس کا بھی تدارک ہونا چاہیے پھر صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کی بات اچھی لگے گی۔

"آئین کے تحت مجھے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے ترمیم کا حق حاصل ہے۔ میں ملک و قوم کی بہتری اور جمہوریت کے فروغ کے لیے اپنا یہ آئینی حق استعمال کررہا ہوں۔ میں نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے حکم جاری کردیا ہے۔ اس نئی ترمیم کے تحت صدر کو یہ اختیار نہیں رہا کہ وہ اسمبلیاں توڑ سکے۔ اب مجھ سمیت کوئی صدر بھی اسمبلی نہیں توڑے گا۔ اس کے تحت تمام سیاسی جماعتیں پابند ہیں کہ ہر سال ہر سطح پر اپنے تنظیمی عہدوں کے لیے باقاعدہ انتخاب کرائیں گی۔ الیکشن کمیشن اس پہلو پر بھی نظر رکھے گا۔ جو پارٹی ایسا نہیں کرے گی' وہ عام انتخابات میں حصہ نہیں لے سکے گی۔ اس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت عام انتخابات سے ایک ماہ پہلے تک اپنا پارلیمانی لیڈر منتخب کرکے اس کا اعلان کردے گی۔ اس کے لیے ابتدائی مرحلے میں امیدوار نامزد ہوں گے۔ ہر شہر میں اس سیاسی جماعت کے کارکن اس انتخاب میں ووٹ دیں گے۔ الیکشن کمیشن اس انتخاب کی بھی نگرانی کرے گا۔ یوں الیکشن کے بعد منتخب وزیراعظم کو بھی مینڈیٹ حاصل ہوگا۔

"ایک اور آرڈیننس بھی میں نے جاری کیا ہے۔ اس سے عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ کے درمیان توازن قائم ہوگا اور عدلیہ' انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہوجائے گی۔ عدلیہ کسی کا بھی مواخذہ بلا روک ٹوک کرسکے گی۔

"مجھے تسلیم ہے کہ آرڈیننس کے ذریعے ترمیم کوئی جمہوری عمل نہیں لیکن میں نیک نیتی سے یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے سراہیں گے اور اس بار آپ کی منتخبہ اسمبلی ان تبدیلیوں کو باقاعدہ آئینی ترمیم کی شکل میں منظور کرلے گی۔ اس وقت تک آپ صدارتی آرڈیننس سے ہی کام چلایئے۔

"بدعنوانیوں کے سلسلے میں مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر مسلسل الزامات عائد کیے جارہے ہیں۔ الزامات لگانے والوں میں برطرف حکومت اور اخبار نویس پیش پیش ہیں۔ اس سلسلے میں افواہوں کے... بلکہ سفید جھوٹ کے ہتھیار بھی استعمال کیے جارہے ہیں۔ بہرحال میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے اس ملک کی بے لوث خدمت کی ہے۔ تاہم سیاسی مخالفین اور پریس میڈیا کے حملوں نے مجھے معطل کرکے رکھ دیا ہے۔ اب میں اس عہدے پر مزید کام نہیں کرسکتا۔ میں صدر کے عہدے سے استعفا دیتے ہوئے خود کو احتساب کے لیے پیش کرتا ہوں۔

"اللہ اس ملک کو اور آپ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ مملکتِ خداداد پائندہ باد۔"

(پانچ سال بعد)

تنویر الزماں کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ رنگت زرد پڑگئی تھی۔ وہ دبلا پتلا لیکن توانائی سے بھرپور بدن کا آدمی تھا۔ وہ اب بھی مضبوط اور توانا لگتا تھا۔ چار سال کی قیدِ بامشقت نے اسے زیادہ نہیں بدلا تھا۔ بس وہ بجھ کر رہ گیا تھا لیکن اس کی آنکھیں نہیں بجھی تھیں۔ وہ اب بھی چوکنی اور جسم کے آرپار ہوجانے والی تھیں بلکہ چہرے کی زردی نے انہیں اور نمایاں کردیا تھا۔

چار سال پہلے وہ چہرہ ملک کے ہر اخبار سے جھانکتا نظر آتا تھا۔ اس وقت اس چہرے پر سختی تھی اور ڈٹے رہنے کا عزم تھا۔ وہ خوب صورت نقوش کا حامل چہرہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن وہ تیس سے زیادہ کا ہرگز نہیں لگتا تھا۔

تنویر نے جیل میں بھی اپنا ہر ممکن حد تک خیال رکھا تھا۔ اس نے ایکسرسائز جاری رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے کپڑے اس کے جسم پر اب بھی فٹ آئے تھے۔ ان کپڑوں میں وہ خود کو بہت اچھا محسوس کررہا تھا۔ چار سال بعد اس نے انسانوں کا سا لباس پہنا تھا۔ ان چار برسوں میں' قیدیوں والے لباس میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی خود کو انسان نہیں سمجھا تھا۔ وہ تو بس ایک نمبر تھا ..... نمبر ۴۰۔

فوزیہ اس کے لیے وہ کپڑے لائی تھی جو اسے سب سے زیادہ پسند تھے۔ نیوی بلیو شرٹ اور سفید پینٹ۔ اسے یاد تھا' وہ کپڑے اس نے جمالستان سے خریدے تھے اور انہیں محض تین چار بار ہی پہن سکا تھا۔

فوزیہ کا خیال آیا تو اس نے اسے ذہن کے سب سے نچلے تہ خانے میں دھکیل دیا۔ گزشتہ چار برسوں میں اس نے خود کو اس ہنر کی زبردست تربیت دی تھی۔ ہر اہم خیال' ہر اہم یاد کے لیے ذہن کا سب سے نچلا تہ خانہ تھا۔

فوزیہ کے لائے ہوئے کپڑے اسے پہنچا دیے گئے تھے۔ وہ کپڑے پہن کر نکلا۔ باہر پہرے دار اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے جیلر نواز احمد کے کمرے میں لے گیا۔

جیلر نواز کرخت چہرے والا سخت گیر آدمی تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ اس نے یوں میز پر رکھے ہوئے تھے جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔

تنویر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ بہت پُرسکون تھا۔ وہ جیلر کے بولنے کا منتظر تھا۔ اس دوران وہ جیلر کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ کمرے اپنے مکین کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس کمرے کو دیکھتے ہوئے اپنے اس نظریے کی تصدیق پر خود اس کا جی خوش ہوگیا۔

وہ کھڑکی سے محروم کمرا تھا۔ بے ڈھنگا لیکن قدرے صاف ستھرا۔ فضا میں تمباکو کی بُو رچی ہوئی تھی مگر تنویر کو اب تمباکو کی بُو بری نہیں لگتی تھی۔ وہ تو چار سال تک چرس کی بُو برداشت کرنے پر

مجبور رہا تھا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ نو سال پہلے اس نے سگریٹ نوشی کے نقصانات کو تسلیم کرکے جو سگریٹ چھوڑی تھی تو آج تک اسے سگریٹ سلگانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ یومیہ چالیس سے پچاس سگریٹ تک پینے کا عادی تھا۔

"تمہاری آزادی کا دن آگیا ہے" جیلر نے اسے چونکا دیا۔

تنویر نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے" نیاز احمد نے کہا "میرا خیال ہے' ہم نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا ہے اور تمہارے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہیں کی۔"

"میں نے کبھی کوئی شکایت کی بھی نہیں" تنویر کی خاموشی بھی ٹوٹی۔

"یہ درست ہے لیکن شکایت کا تمہیں حق بھی نہیں تھا۔"

تنویر پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ گزشتہ چار برسوں میں وقتاً فوقتاً وہ اس شخص سے شدید نفرت کرتا رہا تھا لیکن اس وقت ایسی بات نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ قیدی کا ردِعمل یہی ہو سکتا ہے۔ جو کچھ نہیں کر سکتا' وہ صرف نفرت کے لیے آزاد ہوتا ہے۔ اور قیدی کو نفرت جیلر سے نہیں ہوتی' اس کے اختیارات سے.... اس کی اتھارٹی سے ہوتی ہے۔ اس نے سوچا' شاید وہ جیلر نواز کی جگہ ہوتا تو خود بھی وہی کرتا' جو جیلر نے کیا تھا۔

"اب تم باہر جاؤ گے تو فی الوقت کچھ دیر کے لیے سب کی توجہ کا مرکز ہو گے' آگے کی مجھے نہیں معلوم" نواز احمد نے کہا "وہ باہر تمہارے منتظر ہیں۔"

تنویر جانتا تھا کہ جیلر کا اشارہ اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کی طرف ہے۔ اور اس کی چار سال قیدِ بامشقت کے ذمے دار بھی وہی لوگ تھے۔ اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنا کام کر رہے تھے۔ ہر شخص کو اپنے پیشے سے مخلص ہونا چاہیے مگر وہ ان سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی سیاسی وابستگیاں تھیں' جن کے پیشِ نظر اپنے مفادات تھے' جو اپنے پیشے سے مخلص نہیں تھے۔ انہی کی وجہ سے وہ پریس والوں سے نفرت کرتا تھا۔

اور اب اسے پریس سے ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی سزا کاٹ چکا تھا۔ اب وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

"تم پریشان ہو کہ میں انہیں کیا بیان دوں گا؟" تنویر نے جیلر سے پوچھا۔

"نہیں۔ بشرطیکہ تم صرف سچ بولو" جیلر نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے' آج کل سچ کچھڑی کی طرح ہوتا ہے' کسی پر بھی اچھال دیا جاتا ہے۔"

جیلر مسکرایا "میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کر سکتا۔"

"ابھی کوئی رسمی کارروائی باقی ہے؟"

بیرا شوہر

ایک خاتون کا شوہر ہوٹل میں بیرا تھا' وہ مر گیا۔ کچھ عرصے کے بعد خاتون ایک روحیں بلانے والے عامل سے ملی جس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کے شوہر سے اس کی ملاقات کروا سکتا ہے۔ خاتون نے مطلوبہ فیس ادا کی اور عامل نے اپنا عمل شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس خاتون نے محسوس کیا کہ وہ اسی ہوٹل میں بیٹھی ہے جہاں اس کا مرحوم شوہر کام کرتا تھا۔ چند لمحوں بعد اسے شوہر بھی نظر آگیا جو قدرے فاصلے پر ایک میز پر کھانا لگا رہا تھا۔ خاتون نے خوش ہو کر اسے آواز دی اور اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ شوہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ خاتون نے پریشان سا ہو کر کہا۔ "تم میرے پاس کیوں نہیں آتے؟"

شوہر نے گھبرا کر کہا.... "میں وہاں نہیں آ سکتا کیوں کہ وہ "میز" میری نہیں ہے۔"

"رسمی کارروائی؟ نہیں تو" جیلر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

تنویر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ جیلر کا ہاتھ بڑا اور نرم تھا لیکن گرفت سے اس کی مضبوطی ظاہر ہو رہی تھی۔

دروازے پر تین بار دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا۔ ایک باوردی پہرے دار کی معیت میں فوزیہ اندر آئی۔ تنویر کو حیرت ہوئی کہ وہ کتنی مختلف نظر آرہی ہے۔ پہلے وہ اسے سلاخوں کے پیچھے سے دیکھتا تھا تو وہ کچھ اور لگتی تھی۔ سلاخیں کتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں۔

لیکن فوزیہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔ گزشتہ چار برسوں نے اسے اتنا تباہ نہیں کیا تھا جتنا فوزیہ کو کیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی لگ رہی تھی۔ لگتا تھا' اس نے ادھیڑ عمری میں داخل ہوتے ہی ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ کچھ موٹی اور پلپلی ہو گئی تھی۔

تنویر کو اپنے اندر اداسی کی ایک مہیب موج اٹھتی محسوس ہوئی۔ وہ موج اس کے پورے وجود کو شرابور کر گئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ فوزیہ خود آگے بڑھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اس کی اداس آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نہ بول سکی۔ پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیلر نواز احمد بھی مسکرا رہا تھا۔

"آؤ.... گھر چلیں" بالآخر فوزیہ نے کہا۔

"خدا حافظ تنویر الزماں" نواز احمد بولا "اینڈ گڈ لک۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ باوردی پہرے دار جیل کے مین گیٹ تک ان کے ساتھ آیا اور ان کے لیے جیل کا آہنی دروازہ کھلوایا۔

جیلر کی بات درست ثابت ہوئی۔ باہر اخبار نویس اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

کیمروں کی کلک کلک نے اس کو اندر سے مجروح کردیا۔ ساتھ ہی سوالات کا ایک ہجوم تھا۔ تنویر صاحب' آزاد ہیں تو کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟ جیل میں کیسی گزری؟ کسی سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟ جیل میں کیسا برتاؤ ہوا آپ کے ساتھ؟

اس آخری سوال پر تنویر چپ نہ رہ سکا "یہ جاننے کے لیے تو آپ کو جیل جانا پڑے گا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سوال کرنے والا کھسیا کررہ گیا۔

فوزیہ' تنویر کا ہاتھ تھام کر اسے سامنے کھڑی کار کی طرف لے گئی۔ اس کار کا بندوبست تنویر کے وکیل رضوانی نے کیا تھا۔ تنویر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اُڑتے ہوئے آزاد پرندوں پر تھیں۔ یہ اتنی بڑی .... اتنی خوب صورت آزادی ایک بہت بڑا فریب ہے۔ اس نے سوچا۔ ان آزاد پرندوں کی آزادی کا انحصار بھی تو ہوا پر ہے۔

وہ پچھلی سیٹ پر فوزیہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"مسٹر زماں' گیٹ وے کے سلسلے میں آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟" ایک صحافی نے کار کے اندر منہ گھسیڑ کر کہا۔

تنویر نے سوال کرنے والے کو بہت غور سے دیکھا "ہڈی اس مقام پر اور مضبوطی سے جُڑتی ہے' جہاں سے ٹوٹی ہو" اس نے سادگی سے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ہڈی تڑواؤ" تنویر نے کہا پھر ڈرائیور کے کندھے پر تھپکی دی "چلو دوست!"

ڈرائیور نے کار آگے بڑھائی۔ ابتدا میں اس کی رفتار کم تھی۔ تنویر نے پلٹ کر جیل کی دیواروں کو دیکھا۔ کار بائیں جانب مڑی۔ اس کی رفتار بڑھی۔ جیل' میڈیا اور اذیت بھرے چار برس پیچھے رہ گئے۔ اب وہ سب ماضی کا حصہ تھے۔ فوزیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

○☆○

حمید نے اخبار میں تنویر الزماں کی رہائی کی خبر پڑھی تو اسے لگا کہ اس کی موجودہ گھٹن بھری زندگی کے زنداں میں بہت چھوٹا سا روزن کھل گیا ہے۔

اس کے روز و شب ایسے لگے بندھے انداز میں گزر رہے تھے کہ اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ لگتا تھا' اب معمولات کا طلسم ٹوٹنے والا ہے۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا دیا۔

وہ قوی الجثہ آدمی تھا۔ اس کے سخت عضلات پر پتلے گوشت کی تہ تھی جو کسی کو بھی دھوکا دے سکتی تھی کہ وہ محض گوشت کا پہاڑ ہے لیکن درحقیقت وہ بہت طاقتور اور چاق و چوبند آدمی تھا۔

"کل صبح تنویر کو آزاد کردیا گیا" اس نے اپنی بیوی شاہدہ کو بتایا۔

شاہدہ کی رنگت دبتی ہوئی تھی لیکن وہ بلاشبہ خوب صورت تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی سلائس پر مکھن لگا رہی تھی۔ "ہمیں کیا!" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"میرے لیے تو اس بات کی بہت اہمیت ہے۔"

"تنویر بے وقوف آدمی ہے۔"

"صرف وہی نہیں' میں بھی بے وقوف ہوں۔"

شاہدہ نے مکھن لگا سلائس اس کی طرف بڑھایا۔ خود وہ سادہ سلائس کھانے لگی۔ ان کی معاشی صورتِ حال خاصی ابتر تھی۔ وہ چھوٹے سے تنگ فلیٹ میں رہ رہے تھے جہاں گرمی اور گھٹن بہت زیادہ تھی۔ جب سے حمید کی سرکاری ملازمت ختم ہوئی تھی' یہ صورت حال چل رہی تھی۔ اب حمید کا گزارہ ایک کرائے کلب کی معمولی سے ملازمت پر تھا۔ تنخواہ بہت کم تھی۔ بس زندگی کی گاڑی کسی طرح کھنچ رہی تھی۔ اب تو شاہدہ سنجیدگی سے خود بھی کوئی ملازمت تلاش کررہی تھی۔ گھر کے قریب ہی ایک دندان ساز کا مطب تھا۔ اسے ریسپشنسٹ کی ضرورت تھی۔ تنخواہ وہ کم دے رہا تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے بہرحال کچھ ہونا بہتر تھا۔ لہٰذا شاہدہ اس ملازمت کے حق میں فیصلہ کرچکی تھی۔

"میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ اب تم تنویر کے ساتھ ملوث نہیں ہوگے" شاہدہ نے اچانک کہا "لیکن میں تمہیں جانتی ہوں' اس لیے میرا خیال ہے کہ تم سے یہ وعدہ لینا بے کار ہی ہے۔"

"بے کار ہی نہیں' یہ زیادتی بھی ہوگی" حمید نے کہا "تنویر ایک محبِ وطن آدمی ہے اور میری وفاداری کا پوری طرح مستحق ہے۔"

"تمہاری تو آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے۔ اس نے تمہیں محبِ وطن نہیں' چور بنادیا ہے۔"

"تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں" حمید نے جواب دیا۔ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ تنویر کی طرح اس کے ساتھ بھی بے وفائی ہوئی ہے اور جنہوں نے بے وفائی کی تھی' وہ ان چار برسوں میں خوب پھلے پھولے تھے۔ ان لوگوں کو اگر سزا ہوئی بھی تھی تو بہت معمولی۔ کوئی اور ملک ہوتا تو ان لوگوں سے سختی سے نمٹا جاتا۔ انہیں سخت ترین سزائیں دی جاتیں لیکن یہاں تو وہ اور دولت مند ہوگئے تھے۔ جب کہ حمید جیسے نچلے لیول کے لوگ سزا پارہے تھے' بے روزگار ہوگئے تھے۔ ان سے اخبار نویسوں کو بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے حمید جانتا تھا کہ نچلی سطح کے لوگ کتنے اہم ہوتے ہیں' کتنی بڑی قوت ہوتے ہیں۔

"تم نے اپنی عزت گنوائی' روزگار سے محروم ہوئے اور زندگی

کے دو سال بھی گنوا بیٹھے" شاہدہ نے کہا۔

"مجھے اپنی قید کا ایک ایک لمحہ یاد ہے۔"

"تو پھر یہ بھی یاد رکھا کرو کہ تنویر اور تم جیسے لوگوں کے نزدیک جو کچھ درست اور جائز ہے' وہ اوروں کے نزدیک غلط اور ناجائز ہے اور اسی لیے ہم اس حال میں ہیں۔"

"یہ بحث تو روزِ اوّل سے چل رہی ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ اس پر سب کبھی متفق نہیں ہوتے۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے، اسی لیے میں احکامات کی تعمیل کرنے کو ترجیح دیتا ہوں' یہی بہتر بھی ہوتا ہے۔"

"خدا کی پناہ! میں سمجھتی تھی کہ وقت بڑا استاد ہوتا ہے مگر تم کبھی کچھ نہیں سیکھ سکتے" شاہدہ نے جھنجلا کر کہا۔

"ممکن ہے' میں نے کچھ سیکھ لیا ہو" حمید بولا۔ کبھی کبھی شاہدہ کے لیے اس کی محبت بڑی آزمائش سے دوچار ہو جاتی تھی' اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات اسے سمجھا نہیں پاتا تھا "ممکن ہے' جسے میں مضبوطی اور ثابت قدمی سمجھتا ہوں' تمہارے نزدیک ہٹ دھرمی اور بے وقوفی ہو لیکن میں جان گیا ہوں کہ کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم۔"

حمید نے بیوی کے سامنے کبھی اعتراف نہیں کیا تھا کہ تنویر کے ساتھ کام کرنا اس کے لیے کس قدر پُرلطف اور سنسنی آمیز تھا بلکہ اس نے اس سلسلے میں بات کرنے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

○☆○

تنویر کو وہ اپارٹمنٹ دیکھ کر دُکھ ہوا' جس میں فوزیہ رہ رہی تھی۔ اپنا بہت اچھا مکان ہوتے ہوئے ایسے اپارٹمنٹ میں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔ سکندر آباد میں ان کا اپنا کشادہ اور عالی شان بنگلا تھا لیکن تنویر کو سزا سہراب پور میں کاٹنا تھی۔ سہراب پور' سکندر آباد سے ۱۲۸ میل کے فاصلے پر تھا۔ فوزیہ نے یہ سوچ کر کہ بار بار آنا جانا تکلیف دہ ہوگا' سہراب پور میں ہی یہ اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ یوں اسے تنویر سے ملنے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہتی تھی۔ سہراب پور جیسے چھوٹے شہر میں یہ فلیٹ بھی بڑی نعمت تھی۔

بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ دس سالہ نرگس لپکتی ہوئی نکلی اور باپ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ باپ کے سینے میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تنویر بڑی شفقت سے اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ نرگس محراب نگر کے ایک کانونٹ اسکول میں پڑھتی تھی، وہیں ہوسٹل میں رہتی تھی۔ فوزیہ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اُلٹی سیدھی باتیں کر کے باپ کو پریشان نہ کرے۔ سو اب وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ چار سال کی دوری کی وہ شکایت بھی کیا کرتی۔

ذرا دیر بعد نرگس نے سر اٹھا کر باپ کو بہت غور سے دیکھا "آج میں بہت خوش ہوں ڈیڈی" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

تنویر نے اس کی پیشانی چوم لی اور دل میں سوچا' اب تک تو

پتا نہیں کیسے' گفتگو چلتے چلتے چینیوں کے لباس بلکہ کم لباسی پر آ گئی۔ کسی نے کہا۔ "کیا بات ہے' آج دن میں زیادہ تر نوجوان قمیصیں اُتارے' خالی نیکریں پہنے نظر آتے ہیں۔"

"گرمی بہت ہے۔" انتخاب عالم نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"کیا یہ گرمی یہاں صرف لڑکوں کو لگتی ہے! لڑکیوں نے تو پورے کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"وہ انہوں نے دھوپ روکنے کے لیے پہن رکھے تھے۔" انتخاب نے برجستہ جواب دیا۔

امجد اسلام امجد کے سفرنامے "ریشم ریشم" سے ایک تراشہ۔

تمہیں باپ کے بغیر جینے کی عادت پڑ جانی چاہیے تھی بٹیا۔'

"ڈیڈی... میں آپ کے لیے کیک لاتی ہوں' برتھ ڈے کیک" نرگس نے چہک کر کہا۔

"لاؤ پھر ہو جائے کیک" تنویر نے خوش دلی سے کہا۔

نرگس کچن کی طرف چلی گئی اور فریج سے کیک نکال لائی۔ وہ واقعی برتھ ڈے کیک تھا۔ اس پر کریم سے لکھا تھا... ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈیڈی "یہ تو واقعی برتھ ڈے کیک ہے۔" تنویر نے کہا "اور آج میرا برتھ ڈے تو نہیں۔"

"ایک اعتبار سے برتھ ڈے ہی ہے ڈیڈی۔"

تنویر کو احساس ہوا کہ اس کی بیٹی اپنی عمر سے آگے نکل گئی ہے۔ زیادہ بڑی ہو گئی ہے۔

وہ کیک کھاتے رہے۔ شام کو وہی کار ڈرائیور جو تنویر کو جیل سے لایا تھا' گاڑی لے کر آ گیا۔ نرگس کو فوزیہ نے خصوصی طور پر دو دن کے لیے بلوایا تھا۔ اسے ہوسٹل واپس جانا تھا۔ ڈرائیور اسے محراب نگر لے گیا۔ تنویر نے بیٹی سے وعدہ کیا کہ جلد ہی وہ اس سے ملنے کے لیے اس کے اسکول آئے گا۔

فلیٹ میں تنویر اور فوزیہ اکیلے رہ گئے۔ ان کے درمیان گزرے ہوئے چار برس تھے۔ تنویر کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی گزارنا ہی بھول گیا ہے۔ جیل کے ان چار برسوں میں اس کی بیٹی کتنی بڑی ہو گئی ہے' بیوی کتنی بدل گئی ہے۔ یہ اتنے لمحوں کا فاصلہ کیسے پاٹا جا سکتا ہے؟

فوزیہ چائے بنا کر لائی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چائے بنا کر اس نے مگ اس کی طرف سرکا دیا۔

"مکان کی کیا پوزیشن ہے؟" تنویر نے پوچھا۔

"نیچے والے حصے میں کرائے دار رہ رہے ہیں' اوپر والا بند پڑا ہے" فوزیہ نے بتایا۔

"کل ہم روانہ ہوسکتے ہیں گھر کے لیے؟"

"کیوں نہیں۔ میرا خیال بھی یہی تھا۔"

تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ ادھیڑ عمر فوزیہ' بدلی ہوئی فوزیہ' وہی پرانی والی فوزیہ! اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا' چار برس کی خلیج پاٹنے میں وقت تو لگے گا۔ چار سال.... خدا کی پناہ.... اور وہ خالی بے رنگ راتیں' جن میں درد کا احساس ہوتا تھا اور یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ درد کہاں ہورہا ہے۔

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" فوزیہ نے اسے چونکا دیا۔

"ہاں' کچھ سوچا تو ہے" وہ منمنایا۔ اسے احساس تھا کہ طویل ازدواجی زندگی میں وہ فوزیہ کو کچھ بھی نہیں دے سکا ہے۔ وہ اس کے مستقبل سے ہی نہیں' ماضی تک سے پوری طرح باخبر نہیں تھی۔ شادی سے پہلے بس اسے اتنا معلوم تھا کہ تنویر انٹیلی جنس میں ہے اور اہم آدمی ہے۔ لیکن فوزیہ بہت سمجھ دار عورت تھی۔ وہ کبھی اس سے وہ سوال نہیں کرتی تھی جنہیں پوچھنے کا ہر بیوی کو حق ہوتا ہے۔ تنویر جانتا تھا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کچھ نہیں بتا سکتا۔ بتادے تو وضاحت کیسے کرے گا۔ یہ ناممکن ہے۔

"جو عرصہ میں نے جیل میں گزارا ہے...." بالآخر تنویر نے کہا "اس عرصے میں دوسرے لوگ کمیٹی سے .... محکمۂ قانون سے تعاون اور مفاہمت میں مصروف تھے۔ ان میں سے کچھ کو بہت کم سزا ہوئی' کچھ سزا سے صاف بچ نکلے۔ انہوں نے گواہیاں دیں' ایک دوسرے کی گردنوں میں پھندے ڈالے اور تنگ کیے۔ پھر گردنیں بچانے کے لیے سودے بازی کی اور میں جس عرصے میں جیل میں سڑ رہا تھا' وہ دوبارہ تعلقات بنانے' عہدے حاصل کرنے اور دولت کمانے میں مصروف تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مشین کا پُرزہ رہے تھے' جو ضابطوں سے واقف تھے۔ اس کے باوجود اپنی جان بچانے کے لیے اصول شکنی کررہے تھے' ضابطوں کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ شاکر' ظہور' نفیس...."

"ناموں سے تو میں بھی واقف ہوں" فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"سارا نزلہ کسی نہ کسی پر تو گرنا تھا۔ میں سب سے آسان ہدف ثابت ہوا۔"

"اور کون ہوسکتا تھا؟"

"تم کچھ اور چاہتی تھیں؟"

"میں؟ میں تو سمجھ بھی نہیں سکتی' میں کیا چاہوں گی۔ واقعی میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتیں یہ باتیں۔"

تنویر نے چائے کا ایک طویل گھونٹ لیا' جو کچھ ہوا محمود شامی کی وجہ سے ہوا' اس نے سوچا۔ محمود شامی ہی نے اس سرطان کو پھیلنے دیا۔ اس کی روک تھام نہیں کی۔ کبھی تنویر کو فخر تھا کہ وہ محمود شامی کے لیے کام کررہا ہے۔ ان دنوں اسے یقین تھا کہ ملک اور قوم کو محمود شامی جیسے مسیحا کی ضرورت ہے۔ وہ ایک مضبوط صدر تھا۔ وہ مقاصد کے حصول کے لیے خفیہ.. حتیٰ کہ ناجائز ذرائع سے کام لیتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ بشرطیکہ نتائج مثبت برآمد ہوں۔

لیکن آخری دنوں میں تنویر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ نتائج ہمیشہ ہی مثبت نہیں ہوتے اور ملک و قوم کے مفاد میں بھی نہیں ہوتے۔ محمود شامی اپنے مفادات کو اہمیت دینے کا عادی تھا۔ وہ اصول پرست بنتا تھا لیکن کوئی اصول راستے کی رکاوٹ بنتا تو وہ ایک لمحے میں اسے ترک کردیتا۔

پھر گیٹ وے اسکینڈل سامنے آیا۔ اصول پرست صدر نے اس کی ذمے داری قبول کرنے کے بجائے اپنے ماتحتوں کو بھیڑیوں کے سامنے پھینک دیا۔ صدرِ مملکت کو ایسے اسکینڈل میں ملوث ہونے کا سرِعام اعتراف نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اسے قریبی حلقوں میں اپنے ان ماتحتوں کی مذمت بھی نہیں کرنی چاہیے تھی جو اس کے احکامات کی تعمیل کررہے تھے اور اس کے اندھے وفادار تھے۔ محمود شامی نے خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے اور اپنی حفاظت کو مقدم جانتے ہوئے ملکی انتظامیہ کی پوری عمارت گرادی تھی۔ یہ تو ملکی مفاد میں نہیں تھا۔ ذاتی مفاد تھا اس میں۔ ملک و قوم تو برسوں پیچھے چلے گئے تھے۔ سب سے زیادہ نقصان ملک و قوم کا ہی ہوا تھا اور اس عمارت کے ملبے تلے دبنے والے سوائے تنویر الزماں کے سب کے سب پھلے پھولے تھے اور خوش حال ہوگئے تھے۔

"ہر شخص نے ہر ذمے داری مجھ پر ڈال دی اور خود بری الذمہ ہوگیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤں لیکن میں نہیں مرا۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی خواہش کے مطابق ٹوٹنے بکھرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ مضبوط بن کر نکلوں۔"

"اور اب؟" فوزیہ نے پوچھا۔

تنویر نے دل میں سوچا۔ اب وہ سب میرے مجرم ہیں' لیکن وہ بہ آوازِ بلند بولا "اور چائے دو' ایک پیالی۔"

چار سال کی خلیج سے گزرنے کا کڑا وقت سر پر آگیا تھا' رات ہورہی تھی!

○☆○

نیلے رنگ کی مرسیڈیز رضیہ شامی کو لے کر قلعہ نما عمارت سے نکلی۔ محمود شامی اپنی اسٹڈی کی کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ سیکرٹ سروس والوں نے بجلی کی مدد سے کھلنے اور بند ہونے والے گیٹ کو بند کردیا۔ ۳۶ سالہ رضیہ اپنے معمول کے مطابق شوہر کو اپنی منزل کے متعلق بتانے کی زحمت کیے بغیر ایک بار پھر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے شوہر کو سیکرٹ سروس کے شامی فیملی کی حفاظت پر مامور دستے کے انچارج منیر سے سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔

شام کی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ عمارت کی دوسری طرف سے

موجوں کے ساحل پر سر پٹکنے کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ محمود شامی نے کھڑکی کے سرخ بھاری پردے کھینچ کر برابر کردیئے۔ سمندر کی آواز باہر ہی رہ گئی۔ وہ اپنی بھاری اور بڑی میز کی طرف چلا آیا۔ میز پر ٹیلی فون کے برابر لیمپ شیڈ رکھا تھا۔ در و دیوار پر مک شیاف تھے۔ فرش پر سرخ دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک طرف بڑا سیاہ چرمی صوفہ سیٹ تھا۔

کچھ دیر تک محمود شامی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں میز پر ٹھک ٹھک کررہی ہیں۔ وسیع و عریض اسٹڈی کی خاموشی میں ٹھک ٹھک کی وہ آواز بہت زیادہ بلند آہنگ تھی۔

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب والی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کیبنٹ کا دروازہ کھولا۔ کیبنٹ کی بغلی دیوار میں ایک خانہ تھا۔ اس خانے میں کتابوں کے پیچھے ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ لائن تھی جس کے متعلق سیکرٹ سروس والے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ جدید طرز کا چھوٹا سا انسٹرومنٹ تھا۔ اس کا تار اتنا لمبا تھا کہ اسے بہ آسانی میز تک لایا جاسکتا تھا۔

اس نے انسٹرومنٹ لاکر میز پر رکھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ایک نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اٹھالیا گیا "ظہور؟" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

سابق صدر کی آواز پہچان کر ظہور حیران رہ گیا۔ اپنے فون پر وہ پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا ورنہ وہ طے شدہ وقت پر خود کسی پبلک بوتھ سے اسے فون کرتا تھا "اگر میرا فون ٹیپ کیا جارہا ہوگا تو کال ٹریس کرلی جائے گی خواہ آپ ایک لفظ بھی نہ بولیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے احتیاطی تدابیر کا خیال رکھا ہے۔"

"یقیناً رکھا ہوگا" ظہور کے لہجے میں احترام در آیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ کس شخص سے مخاطب ہے۔ اقتدار سے علیحدہ ہونے کے باوجود محمود شامی ملک کے طاقتور ترین افراد میں سے تھا۔ وہ اس کے عہدِ صدارت میں انٹرنل جنرل کے عہدے پر فائز رہا تھا اور خود بھی بہت طاقت ور آدمی تھا۔ یہی نہیں ان دونوں کے درمیان دوستی کا بہت پرانا رشتہ بھی تھا۔

"سکندر آباد کی کیا پوزیشن ہے؟" محمود شامی نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔ بظاہر تو وہ کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے لیکن اس کے حق میں کوئی ڈرامائی بات ہوجائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔"

"انتخابی اندازوں کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی ظہور۔"

"یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں جناب۔"

"اور تمہارے کیس کی کیا صورت حال ہے؟"

"امکان یہ ہے کہ میری آخری اپیل بھی مسترد ہوجائے گی۔"

"جانتے ہو ظہور، جو کچھ میرے بس میں تھا، میں نے کیا۔"

"میں جانتا ہوں جناب۔"

"وقت وقت کی بات ہے" محمود شامی کے لہجے میں احساسِ تنہائی در آیا۔

"ارے ہاں.... تنویر الزماں رہا ہوگیا ہے۔"

"اور اتنی طویل قانونی جنگ کے بعد تمہاری سزا شروع ہونے والی ہے۔ یہ ہے چھوٹا ہونے کا فائدہ۔"

"اس کے پاس اپیلوں کی گنجائش بھی تو نہیں تھی۔"

"تم نے جو کچھ کیا، فطری تھا۔ تمہیں جنگ لڑنا تھی۔ آدمی ہتھیار تو نہیں ڈال سکتا۔"

"ہتھیار تو تنویر نے بھی نہیں ڈالے۔"

محمود شامی ہنس دیا "تنویر اپنا احمقانہ کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ شروع سے ہی عجیب آدمی رہا ہے۔ انتہا پسند لیکن قابلِ اعتماد۔ اور اپنے میدان کا منفرد اور اہل ترین شخص۔ یہ تو بتاؤ کہ رہائی کے بعد اس نے بیان کیا دیا؟"

"چند بے معنی لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ٹی وی پر رات کی خبروں میں دیکھیے گا۔ پریس والوں کے ساتھ اس کا رویہ قابلِ دید تھا۔"

"ضرور دیکھوں گا۔ اچھا ظہور، خدا حافظ" ظہور کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ پھر اس نے انسٹرومنٹ کو کیبنٹ کے خانے میں مخصوص جگہ پر رکھا اور کیبنٹ بند کردی۔ چند لمحے وہ سلگتا رہا۔ پھر اس نے میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک روشن بٹن دبادیا۔ "نصیر.... میں ساحل پر جاؤں گا" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"بہتر جناب" دوسری طرف سے جواب ملا۔

محمود شامی نے باہر نکل کر اپنی اسٹڈی کا دروازہ مقفل کیا اور تنگ راہداریوں کے ایک پیچیدہ سلسلے سے گزرا جو اچھی خاصی بھول بھلیاں تھیں۔ ہر راہداری میں سرخ قالین بچھا تھا۔ راہداریوں کی وہ بھول بھلیاں قصرِ جمہوریت کے حفاظتی انتظامات کا ایک حصہ تھیں۔

وہ قصر سے باہر نکلا اور ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ سیکرٹ سروس والے اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ وہ اسے نظر نہیں آرہے تھے لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ لوگ اپنے کام کے ماہر ہیں۔

اس نے سر اٹھا کر بڑی طمانیت سے آسمان پر چمکتے ہوئے آدھے چاند کو دیکھا اور ساحل کی ریت پر قدم بڑھاتا رہا۔ ساحل پر سر پٹکنے والی موجیں اب اس سے صرف دس قدم دور تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ سمندر کی طرف ایسے حساس آلات نصب کیے گئے ہیں، جو معمولی سی سرگرمی پر بھی اس کے محافظین کو الرٹ کردیں گے۔ یہاں وہ بالکل محفوظ تھا۔ اسے سمندر سے ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔

وہ ساحل کے ساتھ چلتا ہوا خاصا دور نکل گیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اسے ٹی وی پر خبریں دیکھنی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے محفوظ قلعے قصرِ جمہوریت کی طرف پلٹ پڑا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی.... صرف ایک بار!

حمید کی آنکھ فوری طور پر کھل گئی۔ اس نے اندھیرے میں ہی بیڈ کے ساتھ رکھی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھالیا "یس؟" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ذرا سے توقف کے بعد حمید بستر پر اٹھ بیٹھا "ہاں ہاں' اچھا' یہیں۔ ریکو میں تین بجے؟ ٹھیک ہے" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے بیڈ کی دوسری سائڈ پر رکھی چمکتے چہرے والی گھڑی میں وقت دیکھا' پونے بارہ بجے تھے۔

"یہ تنویر تھا نا؟" شاہدہ نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"ہاں" حمید نے جواب دیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگیا۔

"اللہ رحم کرے" شاہدہ بڑبڑائی لیکن اتنی دیر میں حمید دوبارہ سوچکا تھا۔

○☆○

ریکو پرانے طرز کا ریسٹورنٹ تھا۔ وہاں چھوٹی گول میزیں تھیں جن کے درمیان خاصی جگہ تھی۔ ایک سائڈ پر کیبن بنے ہوئے تھے۔ چھت سے زنجیروں کی مدد سے گول' خوب صورت گملے لٹکائے گئے تھے جن میں پودے تھے۔ ان میں موجود بیلیں زنجیروں سے لپٹ کر اوپر چڑھ رہی تھیں۔

تنویر نے اندر داخل ہوتے ہی ادھر اُدھر دیکھا اور ایک گوشے میں اسے حمید بیٹھا نظر آگیا۔ وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ ریسٹورنٹ کا کچن بھی اسی طرف تھا۔ فضا میں اشتہا انگیز مہک رچی ہوئی تھی۔

حمید نے تنویر کو آتے دیکھا تو خیر مقدمی انداز میں... اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت کشادہ مسکراہٹ مچلی۔ دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ تنویر نے اس کے کندھوں کو تھپکا۔ بالآخر دونوں بیٹھ گئے۔

تنویر نے دیکھا کہ جیل نے جسمانی طور پر حمید پر کوئی منفی اثر نہیں چھوڑا تھا۔

ویٹر اُن کی طرف چلا آیا تھا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا "کھانا کھالیا ہے تم نے؟" تنویر نے حمید سے پوچھا۔

"جی ہاں' چائے ہی منگوالیجیے۔"

"چائے لے آؤ بھئی" تنویر نے ویٹر سے کہا' ویٹر چلا گیا "تم ٹھیک تو ہو؟" تنویر نے حمید سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"حالات اچھے ہوں' تب بھی جیل کو صحت افزا مقام نہیں کہا جاسکتا۔"

"مجھے رہا ہوئے دو سال ہوچکے ہیں۔ اب تو جیل مجھے یاد بھی نہیں۔"

تنویر مسکرادیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ حمید جیسے آزادی پسند لوگ جیل کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

ویٹر چائے لے آیا۔ حمید چائے بنانے میں مصروف ہوگیا۔ تنویر اپنے سابق ماتحت کو غور سے دیکھتا رہا۔

"نیاز سے بھی ملاقات ہوئی تمہاری؟" تنویر نے پوچھا۔ حمید کی طرح نیاز بھی تاجوری تھا۔ دونوں صرف آزادی کی خاطر تاجور پر ایک پڑوسی ملک کے غاصبانہ قبضے کے بعد اپنی زمینیں اور گھربار چھوڑ کر خداداد نگر چلے آئے تھے اور وہیں کے ہورہے تھے۔ دونوں ساتھ کام کرتے تھے۔ گیٹ وے کے معاملے میں بھی دونوں ساتھ تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ گیٹ وے بینک میں ایک رکن قومی اسمبلی کا سیف ڈیپازٹ کھولتے ہوئے وہ رنگے ہاتھوں دھر لیے گئے تھے۔ نیاز دُبلا پتلا مگر صحت مند انسان تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سپید تھی اور ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ جس وقت وہ ایکشن میں نہ ہوتا تو اس قدر ساکت ہوتا کہ خوف آنے لگتا۔ تنویر نے یہ صفت صرف حد درجہ خطرناک لوگوں میں دیکھی تھی۔

"دو ایک بار فون پر بات ہوئی ہے نیاز سے۔ ہم دونوں ایک ہفتے کے فرق سے رہا ہوئے تھے۔ وہ بہت تلخ ہورہا ہے۔"

تنویر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "تلخ تو ہم سبھی کو ہونا چاہیے۔"

"تلخی تو گھلا دینے والی چیز ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔ اظہار عمل کی شکل میں ہونا چاہیے۔"

حمید نے چائے کی پیالی خالی کرکے رکھی اور ہنسنے لگا "میری بیوی آپ کو ناپسند کرتی ہے۔"

"مجھے تکلیف ہوئی یہ سن کر کیونکہ وہ بہت اچھی اور سمجھ دار عورت ہے۔"

"اسے آپ سے عناد نہیں۔ بس وہ کہتی ہے کہ آپ مجھے دوبارہ کسی مصیبت میں پھنسادیں گے۔ یہ اس کی زیادتی ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ آپ کو اس کا ذمے دار ٹھہراتی ہے۔"

"یہ کسی حد تک درست بھی ہے۔ تمہیں میں نے بھرتی کیا تھا۔"

"کون جانے' یہ نہ ہوتا تو میں کسی اور بڑی مشکل میں پھنس جاتا" حمید نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "ویسے شاہدہ کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ اسے پتا چل گیا کہ کل رات مجھے فون آپ نے کیا تھا۔"

"میں یہ بات جانتا ہوں اور ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں۔"

"آپ یہ بتائیں کہ اس بار کام کیا ہے۔ مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ شاہدہ نے مجھے تنبیہہ کردی ہے۔" حمید بولا۔

"تم نے ابھی میری بات سنی بھی نہیں اور لگتا ہے آمادہ بھی ہوگئے!"

"میں آمادہ ہوں جناب! اس لیے کہ میں جانتا ہوں' آپ کیا کہیں گے۔ آپ کی طرح میں بھی سوچتا رہا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔ ہم تاجوری ویسے بھی انتقام کے قائل ہوتے ہیں۔"

"میں انتقام نہیں' انصاف کہوں گا اسے" یہ لفظ ادا کرتے ہوئے تنویر کو خود بھی ان کی قوت کا احساس ہونے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ" حمید نے پُرسکون لہجے میں کہا "ہمیں اپنے جیسے لوگوں کو اپنے انداز کا انصاف فراہم کرنا ہوگا۔"

تنویر نے سکون کی گہری سانس لی۔ ویسے اسے یقین تھا کہ حمید اس سے متعلق ہوگا "یہ بتاؤ میں نیاز سے رابطہ کیسے کروں؟"

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ اس سے ملنا چاہیں گے۔ میں اس کا فون نمبر لکھ لایا ہوں" حمید نے کاغذ کا ایک پرزہ تنویر کی طرف بڑھادیا۔

تنویر کاغذ کا پرزہ قمیص کی جیب میں رکھتے ہوئے بولا "یہ سمجھ لو کہ تمہیں میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں جناب۔ پہلے کی طرح۔ اور نیاز بھی تیار ہوگا' آپ بے فکر رہیں۔"

"اور میری طرح تمہیں بھی یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں' وہ ضروری ہے۔"

"دیکھیں جی' ہمارے اپنے ساتھیوں نے اپنی اپنی کھال بچانے کے لیے ہم سے غداری کی ہے۔ تاجور میں یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو یقین کیجیے' انہیں گولی سے اڑادیا جاتا۔ یہ آپ کا وطن ہے' یہاں انہیں عزت بھی ملی ہے اور پہلے سے زیادہ خوش حالی بھی۔ یہ ان جیسے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ اچھے آدمی جان دے دیتے ہیں یا جیل جانا گوارا کرلیتے ہیں' غداری نہیں کرتے۔"

"دیکھو حمید' میں جو کچھ چاہتا ہوں' اسے کھل کر کہوں گا' ڈھکے چھپے لفظوں میں نہیں..."

"ہم جلاد کا کردار ادا کریں گے۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں.... جب تک پکڑے نہیں جاتے' ہم سزائے موت دینے والے کہلائیں گے اور پکڑے گئے تو قاتل۔"

○☆○

نیاز سے ملاقات کے لیے تنویر کو سلطانیہ جانا پڑا۔ اس ملاقات کا نتیجہ بھی ویسا ہی اطمینان بخش تھا جیسا سکندر آباد میں حمید سے ملاقات کا۔ نیاز بھی تنویر کی رہائی کا منتظر بیٹھا تھا بلکہ وہ دو دن سے گھر سے نکلا بھی نہیں تھا' اس امید پر کہ اس کا سابق چیف اس سے رابطہ کرے گا۔ یہ خطرناک شخص تنویر کا احسان مند تھا اور احسانات کا صلہ دینے کو بے چین بھی۔

ملاقات اور گفتگو کے دوران وہ بس مسکراتا رہا۔

سکندر آباد واپس پہنچتے پہنچتے تنویر فیصلہ کرچکا تھا کہ اتنا بڑا مکان اس کے لیے بیکار ہے جبکہ ان کا کام کسی چھوٹے سے فلیٹ سے بھی چل سکتا ہے۔ مکان کا مالک ہونے سے بہتر اور ضروری یہ تھا کہ فوزیہ کے اکاؤنٹ میں بھاری رقم موجود ہو۔ سب سے اہم چیز نرگس کا مستقبل تھا۔

یہ سوچ کر وہ مسکرایا کہ سکندر آباد میں زمین کی اور خاص طور پر اچھے مکانوں کی قیمتیں کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھیں۔

"سفر کیسا رہا؟" فوزیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

تنویر بھی مسکرادیا "بس ٹھیک رہا" اس نے کہا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ فوزیہ اس سے کبھی نہ پوچھتی کہ وہ کہاں گیا تھا۔

بے وفا امیر کا

ایک امریکی پادری نے چرچ میں اپنے وعظ کے دوران کہا کہ آج ہمارے درمیان ایسا شادی شدہ جوڑا موجود ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ بے وفائی کررہا ہے۔ اگر اس جوڑے نے چندے کی صندوقچی میں دس دس ڈالر نہیں ڈالے تو ان کا راز افشا کردیا جائے گا۔

دعا کے بعد چندے کی صندوقچی لوگوں کے درمیان ہوتی ہوئی پادری کے پاس پہنچی تو اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ صندوقچی میں دس دس ڈالر کے بے شمار نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

اسی لیے تو کہیں بھی جاؤ' فوزیہ کے پاس۔ گھر واپس آنا اچھا لگتا تھا۔

"چائے پیو گے؟" فوزیہ نے پوچھا۔ وہ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی۔

"پلادو۔"

فوزیہ کچن میں چلی گئی' ذرا دیر بعد وہ چائے کی ایک پیالی لیے چلی آئی۔ تنویر نے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارے اور پاؤں پھیلادیے۔ وہ بہت تھکن محسوس کررہا تھا۔

"ہم نے کچھ سوچا کہ اب ہم کیا کریں گے؟" فوزیہ نے اچانک پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"گزشتہ چار برس میں نے تنہائی کا بڑا عذاب سہا ہے۔ نرگس ہاسٹل میں تھی۔ مجھے پتا چلا کہ تنہائی آدمی کو کھوکھلا کردیتی ہے۔"

"اور مجھے بڑی اچھی کمپنی ملی تھی" تنویر نے تلخ لہجے میں کہا "نفسیاتی مریض' غنڈے' لفنگے اور ناکام مجرم' جن کی ناکامی کا ثبوت یہ تھا کہ وہ جیل میں تھے۔"

فوزیہ صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گئی "اب وہ سب بھول جاؤ۔ ہم ان چار برسوں کی تلافی کرسکتے ہیں۔ اب تم اس چکر سے نکل سکتے ہو۔ اس اعتبار سے سودا مہنگا نہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو تم کبھی اس جنجال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے۔"

"فوزیہ.... یہ وہ جنجال ہے جس سے آدمی کبھی آزاد نہیں ہوتا۔"

فوزیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں' یاد آیا۔ نفیس نے فون کیا تھا۔"

"نفیس نے؟ کیوں؟"

"تمہیں رہائی پر مبارک باد دینا.... نیک تمناؤں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔"

تنویر سوچ میں پڑگیا۔ محمود شامی کے عہدِ صدارت میں نفیس

جامی صدر کا قانونی مشیر تھا لیکن بارہ سال پہلے وہ خود انٹیلی جنس میں ہی تھا۔ محمود شامی کو رازداری کا بڑا خیال رہتا تھا' اسی لیے اس نے اپنے اردگرد انٹیلی جنس کے سابق اراکین جمع کر رکھے تھے۔ نفیس جامی جانتا تھا کہ اس نے کیسے اصول پامال کیے ہیں۔ وہ اپنی غداری کی اہمیت سے واقف تھا۔

"نفیس نے کوئی فون نمبر بھی دیا تھا؟" تنویر نے بیوی سے پوچھا۔

"نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ دوبارہ فون کرے گا۔"

ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ فوزیہ فون ریسیو کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ گفتگو سے تنویر کو اندازہ ہو گیا کہ فون فوزیہ کی کسی سہیلی کا ہے۔ تنویر نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ نفیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نفیس ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اس سے اس کی زندگی کے چار قیمتی سال چھین لیے تھے۔ اس کی جوانی کے آخری چار سال .... اس کی ازدواجی زندگی کے چار سال.... اس کی بیٹی کے بچپن کے آخری اور لڑکپن کے ابتدائی سال۔ انہوں نے اسے آزادی سے محروم کیا تھا۔ اور پھر گلوریا بھی تو تھی....

○☆○

نفیس جامی نے اگلے روز دو بجے تنویر کو فون کیا "میں تم سے ملنے آسکتا ہوں؟"

"بسر و چشم" تنویر نے جواب دیا۔

ٹھیک ڈھائی بجے نفیس آگیا۔ اس نے فوزیہ سے مزاج پرسی کی۔ جواب میں فوزیہ نے اس کی بیوی شبنم کے بارے میں پوچھا۔ پھر وہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔

تنویر نے نفیس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہر اعتبار سے پہلے سے بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر تھی۔ وہ بیش قیمت لباس پہنے تھا۔ اس کا چشمہ اس کی لمبی ناک پر نیچے پھسل آیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق انگشتِ شہادت کی مدد سے اسے بار بار اوپر کرتا تھا۔

"تم میری توقعات سے بڑھ کر بہتر لگ رہے ہو" نفیس نے تنویر کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ پھر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

تنویر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ تنویر کا تاثر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تنویر کو یقین تھا کہ اس کی آنکھوں میں نفیس کو کچھ نہیں ملے گا۔

"تم یہاں کیسے؟ کیا یہاں رہائش ہے آج کل؟" تنویر نے اس سے پوچھا۔

"نہیں' میں یہاں یونیورسٹی میں لیکچر دینے آیا ہوں۔"

"مفت؟"

نفیس کچھ گڑبڑا گیا "نہیں بھئی' معقول معاوضہ ملے گا۔ میرے خیال میں تو تمہیں بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔"

"میں لیکچر کیا دوں گا' میں تو مکمل کر بات کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں" تنویر کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"ابھی لوگ متجسس ہیں اور ہم لوگوں کو بھی زندگی تو گزارنی ہے۔ یہ تو لیموں کی مدد سے سکنجبین بنانے کے مترادف ہے۔"

تنویر مسکرا دیا "یہ تو محمود شامی کا انداز سخن معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ بہت زیادہ بولتا تھا اور یہ خیال نہیں رکھتا تھا کہ کہاں بول رہا ہے۔ غلط جگہوں پر بولتا تھا۔"

"غلط جگہیں تخلیق بھی اسی نے کی تھیں۔"

نفیس نے انگشتِ شہادت سے چشمہ اوپر کیا اور مسکرا دیا۔ وہ تنویر سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نروس انداز میں پہلو بدلا۔

"تمہارے لیکچر کا موضوع کیا ہے؟" تنویر نے پوچھا۔

"حکومت میں ذمے داریوں کی تقسیم' اور میں اس موضوع پر بولنے کا اہل ہوں" نفیس نے کہا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا چیلنج سا تھا "جو کچھ ہوا' اس سے ہم سب نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔" اب وہ قدرے پُراعتماد دکھائی دے رہا تھا "جیل میں بہت خراب تو نہیں گزری۔ ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بس گوارا سمجھ لو۔"

"تنویر' تم نے جو کچھ کیا' اس پر میں تمہیں سراہتا ہوں۔ درحقیقت ہم سب کو ہی خاموش رہنا چاہیے تھا لیکن گھبراہٹ جب پھیلتی ہے تو کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی اور پھر احتسابی کمیٹی والے دباؤ ڈالنا خوب جانتے تھے۔ انہیں ہراساں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ انہوں نے تو کے جی بی اور سی آئی اے کو بھی مات کر دیا۔"

"یہ سب ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔"

نفیس نروس انداز میں ہنس دیا "بہرحال امتیاز اس ہنر میں طاق ثابت ہوا۔ جس کسی نے کمیٹی کے سامنے کوئی بات اگلی' امتیاز نے اسے ایک ایسٹ میں تبدیل کر دیا۔ آدمی اس کے سامنے خود کو دیوار میں چُنا ہوا محسوس کرتا تھا۔"

"تم وکیل ہو' جانتے ہو کہ یہ کام کیسے ہوتے ہیں۔"

"مگر امتیاز کے سامنے میں کچھ بھی نہیں۔"

"اور امتیاز کو احتسابی کمیٹی کا سربراہ محمود شامی نے بنایا تھا" تنویر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"بات جب بگڑنا شروع ہوتی ہے تو کسی کے قابو میں نہیں رہتی" نفیس نے طلائی لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ اس کا سگریٹ کیس بھی طلائی تھا "میں سوچتا ہوں' کاش میں نے بھی صورت حال کا سامنا تمہاری طرح بہادری سے کیا ہوتا۔ مجھے اپنے آپ پر.... اپنے طرزِ عمل پر شرم آتی ہے مگر ہم میں سے بیشتر کا

طرزِ عمل یہی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ حوصلہ مند نہیں تھے اور نظریات اپنی جگہ' سب سے اہم چیز حوصلہ ہی ہوتا ہے۔ حوصلہ مند صرف تم ثابت ہوئے۔"

تنویر آگے کو جھک آیا "تمہارے منہ سے یہ تعریف سُن کر مجھے خوشی ہوئی۔ ایک ماہرِ قانون کا مجھے اس طرح سراہنا ایک اعزاز ہے۔"

"تمہارے نزدیک وہ محض فیلڈ ورک تھا۔ یہ وہ بات ہے جو نہ کمیٹی سمجھ سکی' نہ عام لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ تمہارے نزدیک وہ بس ایسا تھا' جیسے تم کسی دوسرے ملک میں پکڑ لیے گئے ہو اور تمہاری زبان کھلوانے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

"تم نے اور شبنم نے یہ فیصلہ کیوں کیا کہ دارالحکومت میں ہی رہو گے؟" تنویر نے گفتگو کا رخ بدلا۔

"ہم دارالحکومت میں تو نہیں' ہم تو کیٹلام میں رہ رہے ہیں۔ ساحلِ سمندر کے قریب ایک اچھا اپارٹمنٹ مل گیا ہے۔ بالکنی سے بہت خوب صورت ویو نظر آتا ہے۔"

"پوری فیملی ہے وہاں؟"

"نہیں۔ بچے تو دارالحکومت میں ہی ہیں۔ میں اور شبنم کیٹلام میں ہیں۔ میں تو زیادہ وقت سفر میں رہتا ہوں۔ میرا ایجنٹ میرے لیے لیکچرز ترتیب دیتا رہتا ہے۔ تم بھی لیکچر کے سلسلے میں غور کرو یا کوئی کتاب لکھ ڈالو۔ دیکھو.... ایک وقت آتا ہے' جب آدمی کو زبان کھولنا پڑتی ہے۔ اور ہم لوگ جس گندگی میں اُترے تھے' اس کے بعد ہمارا اتنا تو حق بنتا ہے اپنے آپ پر۔ اس کیچڑ سے کچھ تو حاصل ہونا چاہیے ہمیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو نفیس لیکن مجھے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچنا پڑے گا۔ جیل نے مجھے زندگی کی ہر اُمنگ سے محروم کردیا ہے۔ بہرحال امید ہے کہ چند ہفتوں میں یا چند مہینوں میں میں خاصا بہتر محسوس کرنے لگوں گا۔"

نفیس نے اسے ہچکچاتی ہوئی لیکن حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ہم لوگ اس اعتبار سے فائدے میں رہے۔ ذرا ظہور کے بارے میں سوچو۔ ابھی تو اس کی سزا کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ کتنی اپیلیں کیں اس نے لیکن لاحاصل۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگ اعترافِ جرم کرکے جان چھڑا لیتے تو بہتر ہوتا۔ انجام تو طے شدہ تھا۔"

"کوئی انجام طے شدہ نہیں ہوتا" تنویر نے کہا۔

نفیس نے متجسس نگاہوں سے اسے دیکھا "ممکن ہے' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"ہم اب بھی زندگی کی تعمیرِ نو کرسکتے ہیں مگر پہلے مجھ میں زندگی کا کوئی شعلہ تو جاگے۔"

نفیس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا "اب میں چلتا ہوں۔ اس ہفتے دو لیکچر اور ہیں میرے پھر آرام کا وقفہ۔"

آخری اطلاع

ہوائی جہاز میں سوار ایک تاجر ایک بڑے کاروباری منصوبے کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔ اتنے میں کھڑکی کے پاس سے ایک آدمی پیراشوٹ کے ذریعے نیچے جاتا دکھائی دیا۔ وہ آدمی تاجر سے کہنے لگا "چاہو تو تم بھی پیراشوٹ لے کر میرے ساتھ آجاؤ۔"

تاجر بولا "مجھے کیا تم نے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

اس آدمی نے کہا "تمہاری مرضی۔ ویسے میں اس جہاز کا پائلٹ ہوں۔"

تنویر اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھا "تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تم تو اب میرے ہیرو بن گئے ہو" نفیس نے کہا۔

نفیس کے لہجے میں سچائی اور خلوص تھا۔ تنویر نے سر جھکا۔ وہ جانتا تھا کہ لہجے میں خواہ مخواہ سچائی اور خلوص سمونے کے فن سے نفیس خوب واقف ہے۔

"لیکچر دینے کے حق میں فیصلہ کرو تو مجھے مطلع کردینا۔ میں اپنے ایجنٹ سے تمہارے لیے بات کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے نفیس۔ شکریہ۔"

"گڈ لک تنویر۔"

تنویر اسے رخصت کرکے ڈرائنگ روم میں واپس آیا اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد فوزیہ آئی تو اس نے اسے بتایا "میں کہنا بھول گیا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے سلطانیہ جانا ہے۔"

فوزیہ سر کو تھیسی جنبش دے کر رہ گئی۔

"میں باہر جارہا ہوں' کچھ منگوانا ہے؟"

"نہیں۔"

○□○

تنویر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے اسٹور کی طرف جارہا تھا۔ اس نے چیک کرلیا تھا کہ اس کی جیب میں سکّے ہیں۔ اسٹور کے سامنے والے فون بوتھ سے اس نے کیٹلام کے سنوبال ہوٹل فون کرکے اپنے لیے کمرا بک کرایا۔ پھر اس نے سلاٹ میں ایک اور سکّہ ڈالا اور حمید کا نمبر ڈائل کیا۔

"مسٹر ایچ کیٹلام کے سنوبال ہوٹل میں موجود ملیں گے... جمعے کی رات آٹھ بجے۔"

دوسری طرف سے حمید نے کہا "اس نام کے کسی آدمی کو میں

نہیں جانتا۔ رانگ نمبر۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ تنویر نے ڈائریکٹری میں ڈبلیو نکالا اور وسیم کا نام دیکھا۔ وہاں بہت سارے وسیم تھے۔ وسیم احمد' محمد وسیم' وسیم علی وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ایک اور فون کیا اور کیٹلام جانے والی جمعے کی صبح کی فلائٹ میں محمد وسیم کے نام سے سیٹ ریزرو کرالی۔

بوتھ سے نکل کر اس نے اخبار خریدا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ مدت بعد وہ خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

○☆○

اگلی صبح تنویر کریسنٹ اسٹریٹ پر واقع سینٹرل کمرشل بینک جانے کے لیے نکلا۔ قریب پہنچ کر اس نے اخبار خریدا اور ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ ابھی ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ بینک نو بجے کھلتا تھا۔ اس نے کافی طلب کی اور اخبار پڑھنے لگا۔

بینک کھلتے ہی وہ بل ادا کرکے ریسٹورنٹ سے نکلا اور سڑک پار کرکے بینک کی طرف بڑھ گیا۔ بینک میں ایک فرضی نام سے اس نے سیف ڈپازٹ باکس لیا ہوا تھا۔ اس باکس میں بے شمار فرضی ناموں کے شناختی کاغذات اور ڈرائیونگ لائسنس کا ذخیرہ تھا۔ ان میں کریڈٹ کارڈز بھی تھے' قومی شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور تصویریں بھی تھیں۔ وزیٹنگ کارڈز اور پیدائشی سرٹیفکیٹ بھی تھے۔ وہ اس کا ان دنوں کا اسلحہ خانہ تھا جب وہ انٹیلی جنس میں کام کرتا تھا۔ کچھ سادہ فارم بھی تھے جنہیں بھر کر وہ کوئی بھی نیا نام اور شخصیت اختیار کرسکتا تھا۔

اس نے ڈپازٹ باکس سے اپنے مطلب کی کچھ چیزیں نکالیں اور بینک سے باہر آگیا۔ باہر آکر اس نے ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ائرپورٹ چلنے کی ہدایت کی۔ ٹرسٹ کے باتھ روم میں جاکر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر صرف کنگھے کی مدد سے اپنا بالوں کا اسٹائل تبدیل کیا۔ اب اس کے بال پیشانی پر جھکے ہوئے تھے جس کی وجہ سے پیشانی تنگ لگ رہی تھی پھر اس نے گہرے رنگ کے فریم والا چشمہ لگایا۔ وہ دور کی نظر کا چشمہ تھا' جس کا نمبر ۵۰ تھا۔ اسے کوئی بھی استعمال کرسکتا تھا۔ ان معمولی تبدیلیوں سے اس کی شخصیت خاصی تبدیل ہوگئی... اور وہ بھی بڑے قدرتی انداز میں۔ اس فن کا وہ ماہر تھا اور کئی بار اس فن کی وجہ سے ہی اس کی جان بچی تھی۔

ویسے یہ احتیاط غیر ضروری تھی۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اسے کوئی پہچان سکے گا لیکن رہائی کے بعد اخبارات میں بھی اس کی تصویریں چھپی تھیں اور ٹی وی پر بھی اسے دکھایا گیا تھا۔ لوگوں کی یادداشت کا کیا بھروسہ۔ وہ کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ محمد وسیم کی حیثیت سے کیٹلام جانے والے ڈی سی ۹ میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہاں پہنچ کر اس نے ذیشان کے نام سے ایک کار کرائے پر لی اور سنو بال ہوٹل کی طرف چل دیا۔ راستے میں وہ نفیس کے بارے میں سوچتا رہا۔

نفیس نے اسے اس کی ثابت قدمی پر سراہا تھا' یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے لیکن وہ بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی بات پر یقین کرلیتا۔ ممکن ہے' نفیس سچ کہہ رہا ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آئندہ ایسی ہی صورت حال میں وہ پھر ایسا ہی نہیں کرے گا۔ لہٰذا ماضی کے کیے دھرے کی تلافی ضروری تھی۔

اس نے گاڑی پارک کی اور اپنا سامان ڈکی میں ہی چھوڑ کر استقبالیہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے وسیم کے نام کا حوالہ نہیں دیا بلکہ ذیشان کے نام سے ایک کمرا لے لیا پھر اس نے اپنا سامان نکالا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔

کمرا آرام دہ اور پُرتکلف تھا۔ وہاں رنگین ٹی وی بھی موجود تھا' فریج بھی تھا۔ بہت آرام دہ ڈبل بیڈ تھا۔ سبز ٹائلوں والا باتھ روم بہت خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔ دُھلے ہوئے تولیے بھی موجود تھے۔ اس کی زندگی ہوٹلوں کے ایسے ہی کمروں میں گزری تھی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں بہت سے غیر ممالک بھی جاتا رہا تھا۔

ٹیلی فون ڈائریکٹری سے اسے نفیس جامی کا فون نمبر اور پتا معلوم ہوگیا۔ وہ اس نے نوٹ کرلیا پھر اس نے سوٹ کیس کھول کر سامان نکالا اور سلیقے سے رکھا۔ اس کے بعد وہ باہر نکلا' اپنی گاڑی میں بیٹھا اور نفیس جامی کے گھر کی طرف چل دیا۔

رضوان ٹیرس جدید طرز کی ایک بلند و بالا عمارت تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نیا کیٹلام پرانے کیٹلام سے کس قدر مختلف ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں بلڈنگ کے سامنے سے گزر تا گیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ بلڈنگ کا اپنا چوکی دار تھا اور انداز سے وہ سابق فوجی معلوم ہوتا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف رضوان ٹیرس کے سامنے کچھ دُکانیں تھیں۔ ان میں ایک بوتیک اور ایک جوتوں کی دُکان تھی۔ کچھ آگے بس اسٹاپ کے ساتھ ایک ٹیلی فون بوتھ تھا۔ وہاں ایک اور بلڈنگ تھی... نعمان ٹیرس۔

تنویر نے نعمان ٹیرس کے سامنے کار کھڑی کی' ایک کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھا اور کار کو لاک کرکے پیچھے رضوان ٹیرس کی طرف چل دیا۔ لابی میں داخل ہوکر وہ پوسٹ باکسوں کی قطار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ہر پوسٹ باکس پر مکین کا نام اور فلیٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ اسے نفیس جامی' فلیٹ نمبر 27B کا پوسٹ باکس فوراً ہی نظر آگیا۔ مگر وہ کچھ اور تلاش کر رہا تھا۔

"میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟" باوردی چوکی دار نے اس سے پوچھا۔ وہ اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

"فلیٹ نمبر 20C شاہد علی خان" تنویر نے کہا اور بدستور پوسٹ باکس کو دیکھتا رہا۔

"اس نام کے کوئی صاحب یہاں نہیں رہتے جناب۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں جناب۔"

تنویر نے کاغذ کا وہ پرزہ چوکی دار کی طرف بڑھادیا جس پر کار میں بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ لکھا تھا۔

چوکی دار نے کاغذ کو بڑی دلچسپی سے دیکھا "یہ پتا نعمان ٹیرس کا ہے جناب جبکہ آپ اس وقت رضوان ٹیرس میں کھڑے ہیں۔"

تنویر نے کاغذ کو حیرت سے دیکھا پھر کاغذ چوکی دار سے لے کر اسے پڑھا۔

"نعمان ٹیرس اسی سڑک پر کچھ آگے ہے جناب۔"

تنویر نے سکون کی گہری سانس لی "بہت بہت شکریہ" اس نے کہا پھر وہ بلڈنگ سے نکل آیا۔

اپنی کار میں پہنچ کر تنویر نے وہ چار نام اور نمبر کاغذ پر نوٹ کیے جنہیں اس نے پوسٹ باکس کا جائزہ لیتے ہوئے ذہن نشین کیا تھا۔ چاروں نام عورتوں کے تھے۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھما کر رضوان ٹیرس کی طرف لے گیا۔ اس نے گاڑی آہستگی سے بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں موڑی۔ وہاں ہر فلیٹ کے لیے پارکنگ کی علیحدہ جگہ تھی۔ ان چاروں خواتین کی کاریں بھی موجود تھیں۔ اس نے ان کی گاڑیوں کے نمبر اور ماڈل نوٹ کیے پھر وہ گاڑی باہر نکال لایا۔

سنوبال ہوٹل پہنچا تو وہ بے حد مطمئن تھا۔ ابتدائی کام بہت اچھا ہوا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں حمید اور نیاز کی آمد کا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا منصوبہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔ مقروض لوگوں سے قرض وصول کرنے کا وقت آپہنچا تھا!

○☆○

اگلی صبح تنویر نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پارک کی جہاں سے وہ رضوان ٹیرس کے پارکنگ لاٹ پر نظر رکھ سکتا تھا۔

پونے آٹھ بجے ایک دبلی پتلی معمر عورت لال رنگ کی ہنڈا سوک میں نمودار ہوئی۔ گزشتہ روز کی حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر تنویر کہہ سکتا تھا کہ وہ 16C میں رہنے والی مسز خان ہے۔

دس منٹ بعد ایک خوب صورت یورپین عورت سبز رنگ کی فاکس ویگن لے کر نکلی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ مس ہیلن مارشل تھی اور فلیٹ نمبر 29C میں رہتی تھی جو تیس جامی کے فلیٹ سے عین دو منزل اوپر تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے مس میری اسٹیفن باہر آئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ عمر زیادہ ہونے کے باوجود اس کے پُرکشش ہونے میں کلام نہیں تھا۔ وہ سفید شیراڈ میں باہر آئی تھی۔

چوتھی عورت کے نکلنے کے بعد تنویر ایک قریبی ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لیے چلا گیا پھر اس نے ایک گل فروش سے گل دستہ خریدا۔ گل دستے سے منسلک کارڈ پر اس نے لکھا..... "کاش تم میری محبت کا جواب محبت سے دے سکو۔ تمہارا سچا چاہنے والا۔"

تین بجے تک صرف سبز فاکس ویگن واپس آئی تھی جبکہ تنویر سفید شیراڈ کی مراجعت کی امید کر رہا تھا۔ بہرحال اس سے بھی کام چل جائے گا' وہ بڑبڑایا۔

سوا تین بجے نیاز کوریئر سروس والوں کی سی سفید وردی پہنے گل دستہ ہاتھ میں لیے رضوان ٹیرس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے بلڈنگ کے چوکی دار کو بتایا کہ اسے یہ پھول فلیٹ نمبر 29C میں مس ہیلن مارشل کو پہنچانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دربان نے انٹرکام پر مس ہیلن سے رابطہ کر کے اسے گل دستے کے متعلق بتایا۔ مس ہیلن کے لہجے میں الجھن تھی تاہم اس نے دربان کو ہدایت کی کہ وہ پھول لانے والے کو اوپر آنے دے۔

چنانچہ نیاز بغل میں گل دستہ دبائے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

گل دستہ دیکھ کر ہیلن اتنی خوش ہوئی کہ نیاز کو دس روپے ٹپ عنایت کردی۔ گمنام عاشق نے اسے متوجہ کر دیا تھا۔

نیچے لابی میں آنے سے پہلے نیاز ستائیسویں منزل پر ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس نے تیس جامی کے فلیٹ کی پوزیشن اچھی طرح ذہن نشین کرلی تھی۔

○☆○

اگلی صبح تیس جامی اپنے فلیٹ میں اپنی بیوی شبنم کے ساتھ

حرام خور

- اُس بھنورے کی سچی کہانی جو پھولوں کا رس چوستا تھا۔ اُسے رنگ بہ رنگ گلاب پسند تھے۔
- وہ داستان جسے پڑھنے کے لیے سانسیں ہموار رکھنا ایک دشوار کام ہے

ستمبر کے ماہنامہ راز دار میں ملاحظہ فرمائیں

یاد رکھیے کہ 10 اگست کو ستمبر 93 کا راز دار بازار میں ہوگا

ناشتا کررہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی شبنم کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ پُرکشش اور حوصلہ مند عورت تھی۔

نفیس نے ناشتا ختم کیا اور اخبار کا وہ صفحہ کھولا جس میں آج کے ستارے نامی کالم ہوتا تھا۔ اس میں نجوم کی رو سے بتایا جاتا تھا کہ کس کا دن کیسا گزرے گا۔ اسے احساس تھا کہ اس جیسے عملی آدمی کے لیے یہ ہفتہ کیسا رہے گا پڑھنا احمقانہ سی بات ہے لیکن اب اسے عادت ہی ہوگئی تھی۔ یہ بھی تھا کہ اس میں اچھی ہی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں اور وہ پُرامید ہوجاتا تھا جبکہ پورے اخبار میں مایوس کن خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

"آج ایک پرانے واقف کار سے مدد ملے گی" اس نے بہ آواز بلند پڑھا "ایک مستقل نوعیت کا تکلیف دہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔"

شبنم اس سے بڑھ کر حقیقت پسند تھی۔ اس نے پیش گوئیوں کو سُنا اور نظرانداز کردیا۔ وہ خبروں والا صفحہ پڑھ رہی تھی "میں اکثر سوچتی ہوں کہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے" وہ بولی "گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث بیشتر افراد یا تو سزا سے بچ نکلے یا انہیں بہت معمولی سزائیں سنائی گئیں۔"

"لوگ جانتے ہیں کہ یہاں دُہرا معیار چلتا ہے۔ ناپسند کرنے کے باوجود وہ انہیں خوشی خوشی قبول کرلیتے ہیں، اس لیے کہ اکثریت ان معاملات میں ملوث نہیں۔ وہ خود کو محض تماشائی سمجھتی ہے۔"

"کوڑے کے ڈھیر سے نکلنے والے بڑے لوگ..."

"اخبار میں مراسلہ لکھ بھیجو" نفیس نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم عوام کو ردِعمل پر اُکسانا تو نہیں چاہیں گے" شبنم مسکرائی۔

"میں تو انفرادی اور خفتہ ردِعمل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

لیکن شبنم اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ٹہلتی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی اور باہر جھانکنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے پلٹ کر پوچھا "رحمانی کے ہاں پارٹی میں جانا ہے؟"

"ہاں، میں نے وعدہ کرلیا تھا اس سے۔"

"تو مجھے جوتے خریدنے ہوں گے۔"

"ضرور خریدو۔"

"بس تو میں شاپنگ کرنے جارہی ہوں" شبنم نے کہا اور لباس تبدیل کرنے کی غرض سے بیڈ روم میں چلی گئی۔

نفیس نے اخبار دوبارہ اٹھالیا اور اداریہ پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ دس منٹ بعد شبنم تیار ہوکر بیڈ روم سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں پرس تھا "کچھ منگوانا ہو تو بتادو" اس نے نفیس سے کہا۔

نفیس نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور نفی میں سرہلادیا۔

شبنم کے جانے کے بعد نفیس نے اداریہ پڑھ کر اخبار ایک طرف رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے شیو بنانا اور نہا کر کپڑے بدلنا تھے۔ بیڈ روم میں جاکر اس نے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلائے اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔

○☆○

حمید نے شبنم نفیس کو باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ ٹیکسی کے جاتے ہی حمید فون بوتھ کی طرف بڑھا۔ اندر جاکر اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد وہ باہر نکلا اور رضوان ٹیرس سے کچھ دور ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں سے بلڈنگ کے داخلی دروازے پر نظر رکھ سکے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو پھر وہ دُکان کے شوکیس میں رکھے جوتے دیکھنے لگا۔

رضوان ٹیرس کے چوکی دار نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے وہی دُبلا پتلا ڈیلیوری بوائے نظر آیا جو گزشتہ روز بھی آیا تھا۔ اس بار بھی اس کے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ "یہ گلدستہ فلیٹ نمبر 29C کی مس ہیلن مارشل کے لیے ہے۔" نیاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کل بھی آئے تھے نا؟" چوکی دار نے پوچھا۔

نیاز کا خیال تھا کہ چوکی دار مس ہیلن کے متعلق کچھ سنسنی خیز انکشافات کرے گا لیکن وہ خاموشی سے انٹرکام کی طرف بڑھ گیا۔ مس ہیلن سے بات کرنے کے بعد اس نے نیاز کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔

نیاز کو گلدستہ مس ہیلن تک پہنچانے میں بمشکل پانچ منٹ لگے۔ مس ہیلن آج بھی اتنا ہی تھرل محسوس کررہی تھی۔ اس نے پھر نیاز کو دس روپے ٹپ دی۔ نیاز نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ کی طرف چل دیا۔ لفٹ میں بیٹھ کر اس نے ستائیسویں منزل کا بٹن دبادیا۔

وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ فلیٹوں کے دروازوں کے قفل کس قسم کے ہیں... اور وہ تیار ہوکر آیا تھا۔ راہداری سنسان تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور فلیٹ میں داخل ہوگیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ دیوار سے ٹک کر سُن گُن لیتا رہا۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور ساکت جسم کسی بھی وقت حرکت میں آنے کے لیے تیار تھا۔

چند ہی لمحوں میں اسے پانی گرنے کی آواز سنائی دی اور سمت کا اندازہ بھی ہوگیا۔ وہ آواز کی طرف چل دیا۔ بیڈ روم کے اندر والے باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ نیاز نے بڑے سکون سے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتے اور موزے اتارے۔ اس کے بعد یونیفارم اتاری اور صرف بنیان اور انڈرویئر میں باتھ روم میں داخل ہوگیا۔

نفیس کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا اور وہ پتھر کے بُت کی طرح ساکت ہوگیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ صابن کی بٹی اس

کے سیدھے ہاتھ میں تھی۔

نیاز نے بڑی مہارت سے اپنی ٹانگ سحرزدہ نفیس کے گھٹنے کے پیچھے رکھی۔ پھر اس نے ہتھیلی سے اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر اس کے جسم کو لیور کی سی پوزیشن میں رکھا۔ نفیس کے سر کا رخ باتھ ٹب کی دیوار کی طرف تھا۔ اس کی رفتارِ عمل اتنی تیز تھی کہ نفیس کچھ بھی نہ کرسکا۔ نیاز نے اس کا سر تھام کر اسے ناقابلِ یقین تیزی سے باتھ ٹب کے کنارے سے ٹکرادیا۔ کھوپڑی ٹوٹنے کی آواز بے حد واضح تھی۔

باتھ ٹب کا پانی گلابی رنگت اختیار کرنے لگا۔ نیاز باتھ روم سے نکل آیا۔ باہر آکر اس نے ہر وہ چیز صاف کی جہاں اس کے نشاناتِ انگشت کی موجودگی کا امکان تھا پھر اس نے یونیفارم پہنی اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کرتے ہوئے باہر آگیا۔

○☆○

سابق سیکریٹری امورِ داخلہ صابر ملک اپنی اسٹڈی میں اکیلا بیٹھا رات کی خبریں دیکھ رہا تھا۔ وہ نفیس جامی کی موت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ ملازمہ کی آہٹوں کی طرف لگا ہوا تھا جو ادھر اُدھر پھر رہی تھی۔

صابر ملک پستہ قامت آدمی تھا۔ اس کے اندر مٹاپے کا زبردست رجحان موجود تھا۔ ذرا احتیاط میں کمی کرتا تو اس کا پیٹ نکل آتا۔ اس کے نقوش پتلے تھے لیکن گوشت کی تہ کی وجہ سے موٹے لگنے لگے تھے۔ اس کی عمر پچاس سال تھی اور اب وہ پوری طرح ہیلتھ فوڈز پر اور ڈائٹ پروگرامز پر انحصار کررہا تھا۔ وہ صرف براؤن بریڈ کھاتا، چینی کی جگہ مصنوعی مٹھاس والی گولیاں استعمال کرتا اور ہفتے میں دوبار کم از کم تین میل تک جوگنگ کرتا۔ اس کے باوجود اس کا وزن بڑھا ہوا تھا۔

نیوز کاسٹر نے جیسے ہی نفیس جامی کا نام لیا، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

عین اسی وقت ملازمہ نے برابر والے کمرے میں کارپٹ کلینر آن کردیا۔ ٹی وی سے تصویر غائب ہوگئی۔ بس رنگین اُفقی دھاریاں تھرک رہی تھیں۔

"نوراں!" اس نے چیخ کر ملازمہ کو آواز دی۔

لیکن کارپٹ کلینر کے شور میں اس کی آواز بوڑھی ملازمہ تک نہ پہنچ سکی۔

دوسری بار صابر اور زور سے چلایا۔ وہ اسٹڈی سے نکل آیا تھا۔ اس بار ملازمہ چونکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور کارپٹ کلینر کا سوئچ آف کردیا۔

"میں ٹی وی پر ایک خاص چیز دیکھنا چاہتا ہوں" صابر نے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ویکیوم کلینر کی وجہ سے تصویر بھی خراب ہورہی ہے اور آواز میں بھی گڑبڑ ہورہی ہے۔ تم

ہم رکاب

ایک آدمی نے شراب خانے میں چلاتے ہوئے سب کو دعوت دی "جب میں پیوں تو سب لوگ میرا ساتھ دیں" جب اس نے گلاس ختم کرلیا تو دوبارہ چلایا "جب میں دوسرا گلاس پیوں تو ہر آدمی دوسرا گلاس پیے" ہر شخص نے شکریے کے ساتھ دوسرا گلاس بھی لے لیا۔ جب اس شخص نے دوسرا گلاس ختم کیا تو جیب سے دو ڈالر نکالے اور کاؤنٹر پر رکھتا ہوا چلایا "اور جب میں ادائیگی کروں تو سب لوگ ادائیگی کریں!"

ذرا دیر انتظار کرلو" یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔

ٹی وی اسکرین پر ایک خاتون ایک مخصوص مکھن کی خوبیاں بیان کررہی تھیں۔

نوراں اس کے پیچھے اسٹڈی میں چلی آئی تھی۔ اس نے ایک نظر ٹی وی اسکرین کو اور پھر صابر کو دیکھا "مکھن آپ تو کھاتے نہیں اور مکھن میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں صاحب" اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

"کیا؟" صابر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں، آپ تو۔۔۔"

صابر اس کی پوری بات سُنے بغیر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا کیونکہ اسکرین پر خاتونِ خانہ کے بجائے نیوز ریڈر کا عکس ابھر آیا تھا۔

صابر نے نفیس کی موت کی خبر ریڈیو پر سُنی تھی۔ لاش اتنی دیر میں دریافت ہوئی تھی کہ شام کے اخباروں میں بھی خبر نہیں چھپ سکی تھی۔ صابر اس موت کے سلسلے میں تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

لاش نفیس کی بیوہ شبنم نے دریافت کی تھی۔ وہ شاپنگ کرنے نکلی تھی اور دوپہر کا کھانا اس نے اپنی سہیلی کے گھر کھایا تھا۔ ایک بجے اس نے نفیس جامی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ وہ دیر سے گھر آئے گی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ شبنم نے سوچا، نفیس کہیں باہر گیا ہوگا۔ ساڑھے تین بجے وہ گھر واپس آئی تو باتھ روم میں نفیس کی لاش نظر آئی۔ میڈیکل ایگزامنر نے موت کے وقت کا تعین صبح نو بجے کیا تھا۔ یعنی شبنم کے گھر سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد۔ قوی امکان اس بات کا تھا کہ نہاتے ہوئے نفیس جامی کا پیر پھسلا ہوگا اور اس کا سر باتھ ٹب کے کنارے سے ٹکرایا ہوگا۔ وہ ایک ضرب

ہی ہلاک ثابت ہوئی تھی۔

"اب تم صفائی کر سکتی ہو" صابر نے نوراں کو پکارا۔

"آپ کی تو نفیس صاحب سے بہت دوستی تھی" نوراں دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں' ایک زمانے میں ہم بہت قریب رہے تھے۔"

"بہت دکھ ہوا ان کی موت کا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی" نوراں نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے ویکیوم کلینر کی آواز سنائی دینے لگی۔

نوراں کے جانے کے بعد صابر نے ٹی وی آف کر دیا پھر وہ اپنی میز پر جا بیٹھا۔ اس نے مقصود کا نمبر ڈائل کیا۔

مقصود' محمود شاہی کے عہدِ صدارت میں ایوانِ صدر کا ڈائریکٹر آپریشنز رہا تھا۔ وہ دارالحکومت میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ہر وقت مسکرانے کا عادی تھا اور مسکراتے مسکراتے ہی کسی کو بھی بہت بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا.... بلکہ پہنچاتا رہا تھا۔

صابر کی طرح مقصود بھی تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ صابر کی بیوی مر چکی تھی جبکہ مقصود نے چار سال پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ ایک عام سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ملکی سیاست کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کتاب ایک بار پھر خوش قسمتی کو اس پر ملتفت کر دے گی۔

"مقصود اسپیکنگ" بیل بجنے پر اس نے ریسیور اٹھا کر جواب دیا۔

"مقصود' میں صابر بول رہا ہوں۔ کیسے ہو بھائی؟ کتاب کیسی جا رہی ہے؟"

"پریشان کر رہی ہے۔ کم بخت بیشتر کردار میری مرضی کے مطابق نہیں چل رہے ہیں" مقصود کا انداز ایسا تھا جیسے حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہمیشہ اس کی مرضی کے مطابق عمل کرتے رہے ہوں' اور یہ سچ بھی تھا۔ وہ لوگوں کو اپنے اشاروں پر نچانا جانتا تھا۔

"تم نے نفیس کے متعلق سنا؟" صابر نے پوچھا۔

"ہاں' افسوس ہوا سن کر.... لیکن بہت زیادہ بھی نہیں۔ یاد ہے' ہماری کشتی میں پہلا سوراخ اسی نے کیا تھا۔ بہرحال میں نے تعزیتی پیغام بھیج دیا ہے۔"

صابر نے اپنا اگلا سوال بہت محتاط انداز میں ترتیب دیا "اس کی موت کی نوعیت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اس طرح کے حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں" مقصود کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

صابر نے بے چینی سے پہلو بدلا "تم نے کبھی سوچا کہ شاہی کے دورِ صدارت میں جو کچھ ہوا' اس پر کوئی طاقت ور ردِعمل سامنے نہیں آیا۔"

"ردِعمل تو ہوا تھا۔ تمہارا اشارہ عوامی ردِعمل کی طرف تو نہیں؟"

"ہاں' عوام نے کوئی چیخ وپکار نہیں کی' لوگ مشتعل نہیں ہوئے' انہوں نے مظاہرے نہیں کیے' جلوس نہیں نکالے۔"

"میں نے سوچا تھا اس سلسلے میں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر وہ ہماری جگہ ہوتے تو انہوں نے بھی وہی کچھ کیا ہوتا جو ہم نے کیا۔ تو لوگوں نے یہ بات سمجھ لی اور بے پروائی سے اپنے کاموں میں لگے رہے۔"

"لیکن اس اقلیت کے بارے میں کیا خیال ہے جو کسی بھی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جانے پر آمادہ نہیں ہے" صابر نے کہا "ایسے لوگ اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور پر مقصود کی آواز ابھری "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نفیس کو قتل کیا گیا ہے؟"

"نہیں.... لیکن میں اس امکان پر غور کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے' میں اس تمام عرصے میں غیر شعوری طور پر اس بات سے خوف زدہ رہا ہوں۔ یاد کرو' اس عرصے میں ہمارے متعلق اخبارات میں کیا کچھ چھپا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر مباحثے ہوتے رہے۔ کروڑوں افراد میں چند ایسے بھی ہوں گے جو سر پھرے ہوں' جن کی انگلی ٹریگر دبانے کو بے تاب ہو۔"

"لیکن نفیس کو شوٹ نہیں کیا گیا۔ وہ باتھ روم میں پاؤں پھسل جانے سے گرا تھا۔ اور مرنا تو سبھی کو ہے۔"

"فرض کرو' نفیس کو کسی پیشہ ور قاتل نے قتل کیا ہو اور اس انداز میں کیا ہو کہ حادثہ معلوم ہو۔ جو کچھ ہوا' اس سے ہمارے کچھ پرانے ساتھیوں کو بھی تو تکلیف پہنچی تھی۔"

"تم شاکر کے متعلق تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

"شاکر کیا' تنویر الزماں بھی ہے۔ کچھ تاجوری بھی تو ہیں۔"

"انہیں جو تکلیف پہنچی تو اس لیے کہ ہماری طرح وہ بھی ملوث تھے..... اور جہاں تک تاجوریوں کا تعلق ہے تو وہ بے چارے تو محض سپاہی تھے۔"

"تنویر اور شاکر کے ریکارڈز سے تم واقف ہو۔ تنویر کے متعلق سنا ہے کہ وہ جنونی ہے۔ کاز کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میرا خیال ہے' لوگ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ بہرحال نفیس کی موت حادثہ تھی اور حادثہ کسی کو بھی پیش آ سکتا ہے.... کسی بھی وقت۔"

"مجھے تو کسی معمولی سی حیرت کا ہدف بننا بھی کبھی اچھا نہیں لگا" صابر نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم حیرت سے محفوظ تو نہیں ہو گئے۔ اچھا شاکر اور تنویر کے متعلق سوچو ذرا۔ بیوی کی موت کے

بعد سے شاکر بہت نرم خو اور متحمل مزاج ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نزارس سے وابستہ ہے۔ تنویر ویسے ہی وفاداری کے معاملے میں انتہا پسند ہے اور اس وقت اسے سب سے زیادہ مستقبل کی فکر ہوگی۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ نفیس کی موت کا تعلق نزارس سے ہو۔"

"یہ تقریباً ناممکن ہے اور پھر نفیس نزارس میں شامل نہیں تھا۔"

"میرا خیال ہے' تم ٹھیک کہہ رہے ہو" صابر کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی "لیکن عوام کے ذہنوں میں تو ہم سب زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ خیر یہ بتاؤ' نفیس کی تدفین میں شرکت کرو گے؟"

"غیر ضروری ہوگا۔ میں فون پر تعزیت کر چکا ہوں' اتنا کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اپنے تصور کو بے لگام نہ ہونے دو" مقصود نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں اس بات کا خیال رکھوں گا مگر تم بھی اپنا خیال رکھنا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد صابر کو احساس ہوا کہ اس کا آخری جملہ کس قدر مہمل تھا۔ وہ مقصود کو اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر رہا تھا یعنی اس کا تصور... اندر کا خوف بدستور مصروفِ کار رہے۔

صابر خاموش بیٹھا اس وقت کو یاد کرتا رہا جب اس نے نفیس کی موت کی خبر سُنی تھی۔ شام پانچ بجے والی خبروں میں۔ اس کی موت کی خبر سُنتے ہی خوف اس کے وجود میں رینگنے' سرسرانے لگا تھا۔ ایسا خوف جس کی موجودگی سے اس نے خود کو باخبر رکھا تھا۔ برسوں پہلے تاجور کے فارن آفس میں سروس کے دوران کی اس کی بقا کا راز تھا۔ اپنے خوف سے بے خبر رہنا' اسے تسلیم نہ کرنا۔ وہ ابتدا ہی سے اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل کمزور تھا اور اعصابی کشیدگی اس کے لیے ایک نارمل چیز تھی۔ اگر وہ فیلڈ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوتا تو اب تک کبھی کا مر چکا ہوتا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریک پر رکھا ہوا اسموکنگ پائپ اٹھا لیا۔ پائپ کو بھرنے اور سُلگانے کا روایتی سُست رفتار عمل اسے پُرسکون کر دیتا تھا۔ کسی زمانے میں وہ یومیہ ساٹھ سگریٹ پیتا تھا۔ پھر اس نے سگریٹ چھوڑی اور پائپ شروع کر دیا۔ پائپ کے لیے وہ بہت ہلکا تمباکو استعمال کرتا تھا جس میں نکوٹین کی مقدار بہت کم ہوتی تھی۔

پائپ سُلگا کر اس نے چند ہلکے کش لیے اور بالکنی میں چلا آیا۔ وہاں کھڑا ہو کر وہ روشن شہر کو دیکھتا رہا۔ جگمگاتا ہوا وہ شہر اتنی بلندی سے بہت خوب صورت لگتا تھا۔ اس نے سوچا' نیچے چلتے پھرتے ہزاروں لوگوں میں اگر کسی کو میری جستجو ہو تو اس بالکنی میں کھڑا میں کس قدر غیر محفوظ ہوں۔ محفوظ تو ویسے کوئی بھی نہیں۔

وہ سوچتا رہا تھا کہ میں مشہور بھی ہوں' پریس نے مجھے بدنام بھی بہت کیا ہے اور لوگوں کو یہ احساس بھی ہے کہ اس ملک میں انصاف کا دُہرا معیار رائج ہے۔ تو ایسے میں یہ ناممکن بھی نہیں کہ نیچے کوئی قاتل موجود ہو جس کا ہدف میں ہوں۔

○☆○

قاتل... موت جن کے ہم رکاب ہوتی تھی' ایک چھوٹے سے خوب صورت شہر میں آتے تھے' تھوڑا عرصہ رُکتے تھے اور جان لینے کے فن میں اور طاق ہو کر واپس جاتے تھے۔ وہاں انٹیلی جنس والوں کا خاص تربیتی مرکز تھا۔ وہاں قتل کے سلسلے میں تمام ہنر سکھائے جاتے تھے۔ تنویر الزماں 1975ء میں تربیت کی غرض سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ گلوریا ہیمنز وہاں انسٹرکٹر تھی۔ وہ نسلاً انگریز تھی جو روس میں پلی بڑھی تھی۔

گلوریا خوب صورت' دراز قامت عورت تھی۔ عمر چھتیس سینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ پانچ سال سے خداداد نگر کی انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہی تھی۔ روسی زبان سے بھی واقف تھی۔ کہا جاتا کہ وہ بے حد خطرناک عورت ہے۔

تنویر پہلی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا!

تنویر نے پیش قدمی کی' گلوریا نے حوصلہ افزائی کی' دونوں کے درمیان تعلقات قائم ہو گئے۔ یہ انہیں بہت بعد میں پتا چلا کہ انٹیلی جنس والے خود انہیں یکجا کرنا چاہتے تھے۔ وہاں تربیت کے دوران

تنویر نے کئی غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ اس کی ایک ساکھ بن گئی۔

وہیں تنویر کی شاکر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ شاکر وہاں ایک اہم عہدے پر کام کررہا تھا۔ ایک طرح سے وہ وہاں انچارج تھا۔

تنویر کو جیسے گلوریا سے محبت ہوگئی تھی' ویسے ہی شاکر سے نفرت ہوئی تھی۔ اس کی ماتحتی میں تنویر نے ایک ایسے مشن کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کی تھیں' جسے خودکشی کا مترادف ہی کہا جاسکتا تھا۔ اسی کی بنیاد پر اس کی یہ ساکھ بنی کہ.... تنویر جنونی آدمی ہے۔ اپنے مقصد کے لیے جان دینے سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ مشن عین موقعے پر کینسل ہوگیا تھا اور تنویر کو بہت افسوس ہوا تھا۔

پھر ایک دن گلوریا نے تنویر کو بتایا "میرا تبادلہ محراب نگر ہوگیا ہے۔"

تنویر اداس ہوگیا۔ وہ اس تعلق کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بے یقینی سے بھری پل پل رنگ بدلتی زندگی میں گلوریا سے اس کا تعلق استقلال اور ٹھہراؤ کی علامت تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ گلوریا سے محبت کرتا ہے اور اس کی کمی محسوس کرے گا۔

گلوریا چلی گئی اور دو ماہ بعد تنویر کو پتا چلا کہ گلوریا نے شاکر سے شادی کرلی ہے۔

وہ وقت تنویر کے لیے بہت سخت تھا۔ اس کی ذہنی ابتری کی وجہ سے اسے فیلڈ ورک سے ہٹا کر آفس میں دفتری کاموں پر لگادیا گیا۔ اس عرصے میں دوبار اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن خود ہی ارادہ بدل دیا۔ وہ خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ واقعی خودکشی کرنا چاہتا تھا یا نہیں مگر اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اس عرصے میں اس نے احمقانہ حرکتیں کی ہیں۔ وہ معقولیت سے دور ہوگیا تھا لیکن وہ ایسا آدمی تھا جو معقولیت سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا تھا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب غم جاناں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ گلوریا کو نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ اس کی محبت ترک بھی نہیں کرسکا تھا لیکن اس نے اس محبت کو ذہن کے ایک گوشے میں.... ایک کوٹھری میں دھکیل کر کوٹھری کا دروازہ مقفل کردیا تھا۔ جس بلا کو وہ ختم نہیں کرسکا' اسے اس نے زندہ دفن کردیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ فیلڈ ورک میں آگیا... کارنامے انجام دینے کے لیے!

چار سال بعد اس نے فوزیہ سے شادی کرلی۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ شادی گلوریا کی یاد کو بالکل ختم کردے گی۔ برسوں وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ گلوریا کی محبت سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن جب گلوریا کی مُڑی تڑی لاش پہاڑی سڑک کے نیچے کھائی میں ٹوٹی پھوٹی کار میں پائی گئی تو اسے پتا چلا کہ وہ گلوریا کو نہیں بھول سکا تھا۔

○☆○

اویس جاوید نے کئی پیشے تبدیل کیے تھے۔ انٹیلی جنس چھوڑنے کے بعد اس نے عملی سیاست میں قدم رکھا لیکن سرمائے کی کمی کی وجہ سے سیاست کا کاروبار چمک نہیں سکا پھر وہ ایڈورٹائزنگ کی فیلڈ میں آگیا۔ اس کے بعد صدر محمود شامی نے اسے اپنا اپائنٹ منٹ سیکریٹری مقرر کرلیا۔

محمود شامی کے استعفے کے بعد وہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا۔ اس نے کمیٹی کے ساتھ تعاون کیا لیکن اس سے زیادہ تعاون اپنے ساتھ کیا۔ مفاد پرستوں کی روایت کے مطابق اس نے بھی سارے الزامات ایک ایسے شخص کے کھاتے میں ڈال دیے جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ خود سزا سے صاف بچ نکلا۔

اس بحران سے نکلنے کے بعد وہ جاسوسی ناول نگار بن گیا۔ انٹیلی جنس کا تجربہ بھی اس کے کام آیا اور تعلقات تو کام آتے ہی ہیں۔

اس وقت وہ آبشار ہوٹل میں منعقد ہونے والے کرائم رائٹرز کنونشن میں شریک تھا۔ حالانکہ ابھی تک اس کا صرف ایک ناول شائع ہوا تھا "سرکاری چور"۔ سرکاری چور کا پس منظر گیٹ وے اسکینڈل تھا۔ اس ناول نے اسے اپنی صلاحیتوں کا احساس دلادیا تھا۔ لکھنے کے معاملے میں اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ ان دنوں وہ ایک اور پلاٹ پر کام کررہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کنونشن سے واپس جاتے ہی دوسرا ناول شروع کردے گا۔

آبشار کے امپیریل روم میں مشہور مسٹری رائٹرز موجود تھے۔ ان کے پرستار ان سے سوال کررہے تھے... باتیں کررہے تھے۔ اویس کوکا کولا کی بوتل ہاتھ میں لیے اسٹرا سے سپ کررہا تھا۔ وہ کنونشن سے بہت محظوظ ہوا تھا۔ اسے زندگی میں اپنا یہ نیا رول بھی بہت پسند آیا تھا۔ مسٹری رائٹرز دوسرے رائٹرز سے اس اعتبار سے مختلف تھے کہ وہ زیادہ خوش مزاج تھے۔ ان کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی۔

اویس جاوید کا ناول "سرکاری چور" کوئی بہت اچھا ناول نہیں تھا لیکن وہ مقبول بہرحال ہوا تھا۔ اس کی بنیاد ایک حقیقت پر تھی۔ اس کی اشاعت کا وقت بھی بہت عمدہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس وقت اس کا چوتھا ایڈیشن بک اسٹالز پر موجود تھا۔ تعلقات کی وجہ سے اسے پبلشر بھی بہت اچھا مل گیا تھا۔ پبلشر کی ساکھ بھی بہت اہم ہوتی ہے۔

"اویس صاحب' پلیز..."

اویس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک مُعمر خاتون "سرکاری چور" کی کاپی اور ایک خوب صورت قلم اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کتاب ہاتھ میں لی' قلم لیا اور بڑی روانی سے کتاب کے پہلے صفحے پر آٹوگراف دے دیا۔

"مجھے امید ہے' اس کتاب سے محظوظ ہوئی ہوں گی آپ" اس نے خاتون کو کتاب واپس دیتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" خاتون نے جواب دیا "کردار اتنے حقیقی تھے کہ بس۔"

خاتون چلی گئی' اویس بیٹھا مسکراتا رہا۔ اسے آٹوگراف دینا بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے مسٹری رائٹرز کی .... پرستاروں کی کمپنی اچھی لگتی تھی۔

اسی وقت ایک اناؤنسمنٹ ہوا۔ کنونشن کے منتظمین میں سے ایک اعلان کررہا تھا "اب آدھے گھنٹے تک چھٹی منزل پر واقع پرل ہال میں ملک کے مشہور مسٹری رائٹرز اپنی کتابوں پر دستخط کریں گے۔"

اویس نے پروگرام کارڈ پر نظر ڈالی۔ پھر اسے یاد آیا کہ آٹوگراف کی اس تقریب میں اسے بھی شریک ہونا ہے۔ وہ اٹھا اور لفٹ کی طرف چل دیا۔ راستے میں کئی پرستار اس کی طرف بڑھے لیکن اس نے انہیں نظرانداز کردیا۔

جہاں فون بوتھ کی قطار تھی' وہاں سے گزرتے ہوئے اسے ایک بوتھ میں ایک ایسا شخص نظر آیا جو اپنے نقوش سے تاجوری لگ رہا تھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ شخص اس کے کمرے کا ایکسٹینشن نمبر ڈائل کررہا تھا۔ یہ یقین حاصل کرنے کے لیے کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں۔

آدھا گھنٹا گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دستخط کرتے کرتے اویس کے ہاتھ دُکھ گئے۔ اسے خوشی تھی کہ اب ایک گھنٹا آرام کا ہوگا۔ ایک گھنٹے بعد نیچے گولڈن ہال میں شرلاک ہومز کی ایک مسٹری فلم دکھائی جانا تھی۔ اس کے بعد رات کا کھانا' پھر سوال وجواب کا سیشن اور تقریریں۔ سوال وجواب کے سیشن میں اسے اپنے اگلے سیاسی تھرلر کے بارے میں شرکا کے سوالوں کے جواب دینے تھے۔

وہ جانتا تھا کہ یہ سب تھکا دینے والے مرحلے ہیں۔ اس اعتبار سے آرام کا یہ ایک گھنٹا بہت بڑی نعمت تھا۔

وہ اٹھا اور منتظمین سے ہاتھ ملائے۔ تمام وقت وہ مسکراتا رہا تھا۔ پھر وہ آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

پانچ منٹ بعد اس کا ایجنٹ کمال پرل ہال میں داخل ہوا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے اویس کہیں نظر نہیں آیا "اویس کو دیکھا ہے آپ نے؟" اس نے ایک جانے پہچانے مسٹری رائٹر سے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں تھا وہ۔ شاید نیچے چلا گیا' یا ممکن ہے' اپنے کمرے میں ہو۔"

کمال نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہال سے نکل آیا۔ اس کے پاس اویس کے لیے ایک خوش خبری تھی۔ ٹی وی کا ایک پروڈیوسر اویس کے ناول کو فلمانا چاہتا تھا۔ ٹی وی والے اس کے لیے بھاری

> ایک بوڑھی عورت نیند نہ آنے کے مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ ایک چیانٹ کے پاس گئی۔ وہ بے چارہ بھی کوئی دو گھنٹے اسے "آپ سو رہی ہیں' آپ کو نیند آ رہی ہے۔" وغیرہ وغیرہ کہتا رہا مگر بات نہیں بنی۔ بالآخر اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں خاتون کہ میں آپ کو سُلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔
> اس پر وہ عورت بولی۔ "خیر..... تم بالکل ناکام بھی نہیں رہے' کم از کم میری ٹانگیں سو گئی ہیں۔"

معاوضہ دینے کو آمادہ تھے۔ اس کے علاوہ فلم والوں کی ایک پیشکش بھی تھی۔

لفٹ کے پاس کھڑے ہو کر کمال سوچتا اور اُلجھتا رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ نیچے لابی کا رُخ کرے یا بارھویں منزل کے اس کمرے کا جہاں اویس مقیم تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ جو لفٹ بھی پہلے آئے گی وہ اس میں بیٹھ جائے گا۔ اب اوپر جانے والی لفٹ آئے یا نیچے جانے والی' اس نے دونوں بٹن دبا دیے۔

○○○

اویس نے اپنے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی' دروازہ کھولا اور چھوٹے سے داخلی ہال میں قدم رکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسٹری ناولوں میں ہونے والے جرائم حقیقی دنیا میں ہونے والے جرائم سے کتنے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ گزشتہ تین دن سے مسلسل یہ بات سوچ رہا تھا۔ کنونشن میں شریک بیشتر لوگوں کے نزدیک قتل ایک ایسی بے لوچ چیز ہوتی ہے جو اگاتھا کرسٹی کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ یا وہ پولیس کی انکوائری ہوتی ہے جو ایک ارتقائی عمل کے تحت بالآخر ایک منطقی نتیجے تک پہنچ جاتی ہے۔

'شاید اسی لیے اسے فکشن کہا جاتا ہے' اس نے سوچا۔

وہ بیڈ پر جا بیٹھا... اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ پچھلے چند برسوں میں وہ خود کو تھکا تھکا اور بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا۔ اکثر اسے عمر جوانی کے پچھتاوے ستاتے' اگر نیچے موجود لوگوں کو معلوم ہو کہ میں کیا کچھ کرتا رہا ہوں...' اس نے سوچا' تو وہ...'

اس نے ایک انگڑائی لے کر بیڈ سے کمر ٹکائی اور آنکھیں موند لیں' خدا کا شکر ہے کہ یہ بات کچھ ہی لوگ جانتے ہیں۔

مگر وہ آرام نہیں کرسکا۔ کوئی ناقابلِ فہم چیز اس کے ذہن میں رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اور وہ چبھن اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار بھی نہیں تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

بیڈ کے قریب کھڑکی کے پردے پوری طرح سرکے ہوئے تھے

اور سہ پہر کی دھوپ کو اندر آنے سے روک رہے تھے۔ اسے یاد تھا کہ اس نے پردوں کو کس حد تک کھلا چھوڑا تھا۔ ہوٹل کا صفائی کرنے والا صبح کے وقت صفائی کر گیا تھا۔ دوبارہ وہ آتا بھی نہیں تھا۔

اسے ہوا کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک ٹانیے میں اسے قوی شکل میں حرکت کرتا ہوا ایک ہاتھ... اور ایک سنجیدہ تاجورین چہرہ نظر آیا جو نہ جانے کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔

تکلیف نے اس کی سانس توڑ دی۔ وہ بستر پر گرا۔ وہ تکلیف اُسے ایسی لگی جیسی دو سال پہلے دل کے دورے کے دوران ہوئی تھی۔ اسے آنکھوں کو چُندھیا دینے والی روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا اور پھر تکلیف کا احساس بھی نہیں رہا۔ وہ بے وزنی کی سی کیفیت میں خود کو ہوا میں تیرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

آنکھوں کو چُندھیا دینے والی روشنی سرخ ہوئی... پھر گہری سرخ اور پھر سیاہ ہو گئی۔

اویس جاوید نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔ چیخ جو اس کے ہونٹوں پر ہوا کے بلبلے کی طرح مچلی تھی، باہر نہیں آ سکی۔

حمید نے چاقو سے چند اور وار کیے... اناڑی پن سے۔ تاکہ وہ کسی مشتعل اور اناڑی شخص کا کام لگے۔ چاقو سستا سا عام قسم کا تھا جو کسی بھی دکان سے کوئی بھی خرید سکتا تھا۔ چاقو اس نے بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔ پھر اپنے ربر کے دستانے بھی اتار کر چاقو کے ساتھ ڈال دیے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

حمید ساکت کھڑا بیڈ کے گدّے کو اویس کے خون سے سرخ ہوتے دیکھتا رہا۔

"اویس؟" ایک اور دستک کے بعد کسی نے پکارا "میں ہوں کمال۔"

حمید بدستور ساکت کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے کے پاس چابی نہیں ہے اور وہ دروازہ نہیں کھول سکے گا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس صورت حال سے گھبرا جاتا اور ملحقہ کمرے میں باتھ روم کے راستے داخل ہونے کی کوشش کرتا... اس اُمید پر کہ دوسرا کمرا خالی ہوگا اور وہ وہاں سے فرار ہو سکے گا۔ حمید نے بھی اس امکان پر غور کیا لیکن اسے فوراً ہی مسترد بھی کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ باہر صرف ایک آدمی ہے اور اگر ٹکراؤ ہوا تو وہ اسے بہ آسانی سنبھال سکے گا۔

ایک منٹ بڑی سُست رفتاری سے گزرا۔ حمید کھڑا ایک ایک سیکنڈ گنتا رہا۔ خون اب بیڈ سے ٹپک کر نیچے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔

دروازے پر اس دوران کوئی دستک نہیں ہوئی۔ کوئی آہٹ بھی نہیں سنائی دی۔ شاید دستک دینے والا واپس چلا گیا تھا۔

حمید نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک برآمد کی۔ وہ اس نے صبح ہی ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے کاسمیٹکس کاؤنٹر سے خریدی تھی۔ لپ اسٹک سے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لکھا... فاشسٹوں کے لیے موت۔ فاشسٹوں کی ہجے اس نے دانستہ غلط لکھی تھی۔

لپ اسٹک کو جیب میں رکھنے کے بعد اس نے ہر وہ جگہ صاف کی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات رہ جانے کا امکان تھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل آیا۔

لفٹ میں اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جو نچلی منزلوں سے لفٹ میں سوار ہوئے تھے۔ لفٹ نیچے پہنچی دروازہ کھلا، پانچ چھ افراد بہت جلدی میں لفٹ میں گھسے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں گے۔"

"وہ وہاں نہیں ہے۔ میں چیک کر چکا ہوں" ایک شخص بولا۔

حمید کے خیال میں یہ آواز وہ سن چکا تھا۔ دستک دینے کے بعد اسی شخص نے اویس کو پکارا تھا اور اس شخص کا نام یقیناً کمال تھا "مجھے ٹی وی والوں کے اس ایگریمنٹ پر اس سے دستخط کرانے ہیں۔"

حمید لفٹ سے نکل آیا۔

○☆○

تنویر نے اپنا مکان فروخت کر دیا تھا اور اسی روز چھوٹے سے ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا، اب وہ مستقبل کی طرف سے بے فکر تھا۔

ٹھیک دس بجے رات، فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ تنویر نے ریسیور اٹھایا مگر دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

وہ سمجھ گیا کہ حمید کامیاب ہو گیا ہے۔

"جانے کون تھا" اس نے فوزیہ سے کہا "پہلے ہی ریسیور رکھ چکا تھا۔"

وہ دونوں دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

○☆○

اس رات صابر ملک کلب سے دیر سے گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کی وجہ تھی کلب کا شطرنج کا ٹورنامنٹ جس میں وہ بھی حصہ لے رہا تھا۔ کار کے ریڈیو پر گیارہ بجے کی خبروں میں اس نے اویس جاوید کے قتل کی خبر سنی۔

قتل! اس بار شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ گئی، پیٹ میں گرہیں سی پڑ گئیں۔ اس نے گاڑی سائیڈ میں لگا کر روک دی پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ تھامے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس نے کار کا انجن بھی بند نہیں کیا تھا۔

"چاقو کے کئی وار کیے گئے..."

نیوز ریڈر کی آواز اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اسے اپنا دماغ سُن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اویس جاوید زندگی سے ایسا بھرپور آدمی تھا کہ اس کی موت کا تصور کرنا بھی محال معلوم ہوتا تھا اور پھر موت بھی کیا' قتل!

صابر نے خود کار انداز میں ریڈیو آف کردیا اور کار آگے بڑھادی۔ اس بار غیر شعوری طور پر وہ زیادہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اچانک ایک چوراہے پر اسے سگنل کی زرد روشنی کا احساس ہوا۔ سڑک پار کرنے والا ایک راہ گیر یال بال بچا۔ راہ گیر نے پلٹ کر اسے ایک گالی دی مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے اسٹڈی کا رخ کیا اور مقصود کا نمبر ڈائل کیا' چھ گھنٹوں کے بعد دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا۔ مقصود کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔ وہ یقیناً سوتے سے اٹھا تھا۔

"مقصود' میں صابر بول رہا ہوں" صابر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھائی' اتنی رات کو یہ کرم فرمائی کیوں؟" مقصود نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔

"میں نے ابھی ابھی اویس جاوید کی موت کی خبر سنی ہے۔ اسے قتل کردیا گیا۔"

کم از کم دس سیکنڈ خاموشی رہی پھر مقصود کی صاف جاگتی آواز ریسیور پر ابھری "کب؟ کہاں؟ کیسے؟ اور کس نے قتل کیا؟"

"کس نے اور کیوں کا تو ابھی پتا نہیں لیکن اسے آج کسی وقت مہر آباد کے آبشار ہوٹل میں اس کے کمرے میں قتل کیا گیا۔ چاقو کے پے در پے وار۔"

"مہر آباد میں وہ کیا کررہا تھا؟"

صابر' مقصود کے سکون کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا "وہ مسٹری رائٹرز کے کنونشن میں شرکت کررہا تھا" اس نے بتایا۔

"اب تو اس کی کتاب اور بکے گی۔"

"میرا خیال ہے اس کے قاتل نے یہ سوچ کر اسے قتل نہیں کیا ہوگا۔"

"پہلے نفیس جامی اور اب آٹھ دن بعد اویس جاوید" مقصود بڑبڑایا "یہ اتفاق تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن اویس کسی حادثے کا شکار ہوا ہوتا تو میں زیادہ پریشان ہوتا۔ مہر آباد میں تو آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔"

"لیکن آئے دن قتل ہونے والے ایوانِ صدر کے سابق ملازمین نہیں ہوتے" صابر نے اعتراض اٹھایا۔

"قتل کا کوئی محرک؟ رقم تو نہیں لوٹی گئی؟"

"خبر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی" صابر اس دوران اپنا پائپ بھرتا رہا تھا۔ پائپ سلگا کر اس نے کہا "ہم اس امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ اس کا تعلق نذار سے ہوسکتا ہے۔"

"بالکل نہیں کرسکتے" مقصود نے جواب دیا "بلکہ ہم کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ نہ ہی ہمیں ٹھوس حقائق کے بغیر نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی کرنی چاہیے۔ صبح تک ہمیں اس قتل کی تفصیلات معلوم ہوسکیں گی۔"

صابر اپنا خوف لہجے سے دور نہیں رکھ سکا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان دو مسلسل اموات کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ اتفاق ہے تو یہ بھی ہے کہ ہمیں ایسے اتفاقات کو قبول نہ کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ میرا خیال ہے' تمہیں یا مجھے ظہور سے بات کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے' پہلے قتل کی تفصیلات معلوم ہوجائیں پھر تم ظہور سے بات کرلینا۔ مجھے بھی بتادینا کہ کیا بات ہوئی۔"

صابر نے ریسیور رکھنے کے بعد پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیے۔ اس کے لیے یہ بات باعثِ طمانیت تھی کہ مقصود کو بھی اس قتل سے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو خود کو ذرا سی بات پر گھبرا جانے والا سمجھتا تھا' درست نہیں تھا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو تشویش کا مریض سمجھتا تھا۔

وہ اسٹڈی سے نکلا اور نشست گاہ میں آرام کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے پیٹ میں اب تک برف جیسی ٹھنڈی گرہیں حرکت کررہی تھیں لیکن وہ اسے خوف تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے نزدیک بقا اسی میں تھی کہ خوف کو قبول نہ کیا جائے۔

وہ سوچ رہا تھا۔ کاش ابھی صبح ہوجائے اور میں ظہور کو فون کرلوں۔

○☆○

تنویر اور فوزیہ کا معمول تھا کہ وہ ٹی وی پر صبح کی خبریں ضرور دیکھتے تھے۔ تنویر باتھ روم میں کپڑے بدل رہا تھا کہ اس نے اویس کے قتل کی خبر سنی۔ وہ جلدی سے باہر آگیا اور بیڈ پر بیٹھ کر ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہوگیا۔

نیوز ریڈر بے حد غیر ذاتی اور غیر جذباتی انداز میں قتل کی تفصیلات بیان کررہا تھا "اور خون میں نہائی ہوئی لاش ہوٹل کے کمرے میں پائی گئی۔ آلۂ قتل چاقو تھا جو بیڈ کے نیچے پڑا ملا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لپ اسٹک سے۔ فاشسٹوں کے لیے موت۔۔۔ لکھ دیا گیا تھا۔ پولیس ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے اور نہ ہی انہیں کسی پر شک ہے۔ تاہم آلۂ قتل کے علاوہ قاتل کے دستانے جائے واردات پر پائے گئے ہیں۔ اس سے تفتیش کی گاڑی آگے بڑھنے کا امکان ہے۔۔۔"

خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ قاتل نے آئینے پر فاشسٹ کو فاشسٹ لکھا تھا۔ شاید پولیس اس بات کو اہم سمجھتے ہوئے چھپا رہی تھی۔ تنویر سوچ رہا تھا کہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ نووارد مسٹری رائٹر اویس جاوید کو مسٹری رائٹرز کے کنونشن میں' ملک کے نامور مسٹری رائٹرز

کی موجودگی میں قتل کیا گیا ہے۔ مسٹری کو فکشن سمجھنے والوں کے لیے ایک چیلنج... یا ئے ناول کے لیے ایک پاور فل پلاٹ۔"

نیوز ریڈر رہتا رہا تھا کہ کچھ رائٹرز سے انٹرویو کیا گیا۔ پھر اسکرین پر ایک رائٹر نظر آیا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا "میرے خیال میں قاتل اویس جاوید کے اوپر والے کمرے کی بالکنی سے جو کہ خالی تھا رسی کے ذریعے اتر کر اویس کے کمرے میں داخل ہوا ہوگا۔"

تنویر جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے ٹی وی دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اویس کے قتل کے لیے بہت مناسب مقام منتخب کیا گیا تھا۔ پولیس تفتیش شروع کرے گی تو درجنوں اندازے قائم کرے گی جن میں احمقانہ بھی ہوں گے اور نہایت معقول بھی کہ قتل کس نے کیسے اور کیوں کیا۔ اور لگے بندھے اصولوں کے تحت تفتیش کرنے والے امکانات کے سمندر میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے نظر آئیں گے۔ اور ان میں کوئی امکان حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوگا۔ پھر امکانات کے بطن سے مزید امکانات جنم لیں گے...

اور یہ فیصلہ بھی مناسب اور عقل مندانہ تھا کہ اویس جاوید کی موت قتل ہی نظر آئے۔ یوں اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ نفیس اور اویس کی اموات کو کسی بھی طور پر ایک دوسرے سے جوڑا جائے۔

فوزیہ بھی بڑی توجہ سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"یہ توقع نہ رکھنا کہ میں اس پر اظہار افسوس کروں گا" تنویر نے اس سے کہا "روایت ہے کہ مرنے والوں کو برا نہ کہا جائے۔ لیکن اویس اپنی ابتدا سے انتہا تک نہایت خبیث آدمی تھا۔"

فوزیہ نے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دی "آج ناشتا باہر کریں گے" وہ بولی۔

○☆○

محمود شامی دس بجے تک ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اب وہ ظہور کی معمول والی کال کا منتظر تھا۔ دیواری کیبنٹ کے خفیہ خانے میں رکھا ہوا فون اس کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ محمود فون کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔

باہر لان میں گھاس کاٹنے والی مشین چلائی جا رہی تھی۔ اس کی مشینی آواز اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

ٹھیک بارہ بجے سفید انسٹرومنٹ میں لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ اس انسٹرومنٹ میں گھنٹی نہیں بجتی تھی۔

محمود شامی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو ظہور۔"

"میرا خیال ہے' آپ نے خبر سن لی ہوگی۔"

"اویس جاوید کی؟ ہاں۔ افسوس ہوا سن کر" وہ کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ اسے واقعی افسوس ہوا تھا۔ وہ اویس کو پسند کرتا تھا "اور وزارت عظمیٰ کی کیا پوزیشن ہے؟ امیدواروں کی مقبولیت میں کوئی کمی بیشی؟"

"نہیں' صورت حال بدستور ہے۔"

"بہرحال' نظر رکھنا۔ صورت حال بدستور ہونے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں' میں نظر رکھے ہوئے ہوں۔ پارٹی کے اندر اہم لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔"

محمود شامی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ظہور کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ظہور کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔

بالآخر ظہور کی دبی دبی آواز ریسیور پر ابھری۔ "صبح صابر ملک نے مجھے فون کیا تھا... بہت سویرے۔"

"اویس کے سلسلے میں۔"

"جی ہاں۔ صابر نے رات ریڈیو پر اویس کے قتل کی خبر سنی پھر اس کے اور مقصود کے درمیان گفتگو ہوئی۔ وہ پریشان ہیں.... خاص کر صابر۔ ان کا خیال ہے کہ نفیس اور اویس کی موت کے درمیان کوئی تعلق ہے۔"

"یہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا" محمود شامی نے کہا "لیکن اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں نظر آئی مجھے۔"

"دونوں کی موت کے درمیان بظاہر کوئی چیز مشترک نہیں۔ اب اسی کو اس شک کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔"

"تمہیں ان معاملات کی سمجھ ہے۔ تم بتاؤ' کیا تمہیں شک ہے کہ دونوں موتوں کے درمیان کوئی تعلق ہے؟"

ظہور صرف ایک لمحے کے لیے ہچکچایا "لفظ شک بہت بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک ہفتے کے فرق سے ہونے والی ان دو اموات کو اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے جبکہ دونوں افراد کی موت قدرتی نہیں تھی۔ ہمیں اویس کی موت کی تفتیشی کارروائی پر نظر رکھنی ہوگی۔ میں نے اپنے ایک آدمی کو سمجھا دیا ہے۔ وہ اویس کے دوست کی حیثیت سے پولیس سے رابطہ رکھے گا۔"

"فی الوقت پولیس کا کیا خیال ہے؟"

"کوئی خیال نہیں۔ ان کے سامنے امکانات قطار لگائے کھڑے ہیں۔ ممکن ہے' قاتل کوئی نقب زن رہا ہو جو اویس کی اچانک واپسی سے گھبرا گیا ہو۔ یہ سیاسی قتل بھی ہو سکتا ہے۔ دشمنی بھی سبب ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' یہ کسی پیشہ ور قاتل کا کام ہو۔ ممکن ہے' قاتل اناڑی ہو۔ میرا خیال ہے اگر قاتل نے خود سامنے آ کر اعتراف جرم نہیں کیا تو یہ ان جرائم میں سے ہے جو کبھی حل نہیں ہوتے۔"

"کوئی نہ کوئی سراغ تو بہرحال ملا ہوگا" محمود شامی نے خیال آرائی کی۔

"یہی تو رونا ہے کہ سراغ ہی سراغ ہیں' امکانات ہی امکانات ہیں لیکن کارآمد کوئی نہیں۔"

"تو ہم تفتیش پر نظر رکھنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں" محمود شامی نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اس سلسلے میں ظہور اس سے کیا توقع کررہا ہے۔

"صابر اور مقصود اپنے تحفظ کے سلسلے میں یقین دہانی چاہتے ہیں۔"

"باڈی گارڈز چاہتے ہیں وہ؟"

"انہوں نے کہا تو نہیں۔ اور میرے خیال میں ابھی یہ بہت قبل از وقت ہے۔"

"بس تو انہیں میری طرف سے بتادینا کہ وہ محفوظ ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

ظہور نے موضوع بدل دیا "سلیم پور کے پارٹی الیکشن کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم اگلی کال پرسوں اپنے مخصوص وقت پر کروگے۔ اور ہاں.... صابر' مقصود اور دوسرے لوگوں کو بتادینا کہ میں ان کے تحفظ کا ہر ممکن خیال رکھوں گا۔"

"اوکے سر۔"

محمود شامی نے انسٹرومنٹ کیبنٹ کے خلا میں چھپادیا۔ پھر وہ پیٹھ پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ اپنی میز کے قریب ٹھہر گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بڑے معاملات تو پوری طرح اس کے قابو میں ہیں لیکن کچھ چھوٹے اور غیر اہم معاملات اس کے ہاتھوں سے پھسلے جارہے ہیں۔ ماضی میں بھی اکثر ایسا ہوتا رہا تھا۔ بظاہر غیر اہم معاملات اس کے قابو سے باہر ہوتے ہی اہمیت اختیار کرگئے تھے اور خطرناک ثابت ہوئے تھے۔

ایک تو رضیہ بھی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کا رویہ اب اس کے وجود میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا تھا۔ وہ ثمینہ سے ملنے گئی تھی۔ رضیہ سمجھتی تھی کہ وہ اسے بے خبر رکھ کر ملک بھر میں گھومتی پھرتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ ثمینہ نے کافی عرصے سے فون نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں رضیہ اس کی چہیتی بیٹی کو اس کے خلاف بھڑکا تو نہیں رہی ہے۔ اپنے چار بچوں میں سابق صدر کو سب سے زیادہ اپنی یہی بیٹی پیاری تھی۔ محمود شامی کبھی یہ بات ظاہر نہیں کرسکتا تھا لیکن رضیہ شاید یہ بات جان گئی تھی۔ بیویاں شوہروں کی کمزوریوں سے واقف ہوہی جاتی ہیں۔ اور برگشتہ ہوجائیں تو ان معلومات سے استفادہ بھی کرتی ہیں۔

محمود شامی اپنی کرسی پر جابیٹھا۔ جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس نے ایک چابی کی مدد سے میز کی سب سے نچلی دراز کھولی اور شراب کی ایک بوتل اور ایک جام نکالا۔ جام میں شراب انڈیلنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ وہ پیتا بھی ہے۔ اسی لیے وہ شراب چھپا کر رکھتا تھا اور صرف تنہائی میں پیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیاست میں ایسی ایک کمزوری انسانوں کو تباہ کردیتی ہے' خواہ وہ کتنے ہی سچے' کتنے ہی اہل ہوں۔

دو جام پینے کے بعد اس نے جام دھویا اور بوتل اور جام کو دوبارہ دراز میں مقفل کردیا۔

پھر اس نے ایک فائل اٹھائی اور اس کے مندرجات پڑھنے لگا۔ اس فائل میں وہ سوالات تھے جو بی بی سی کے ٹی وی اسٹوڈیو میں اس سے کیے جانے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بہت تھوڑے لوگ اس کے جوابات پر یقین کریں گے لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ اب تک ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

وہ بڑی توجہ سے سوالات پڑھتا رہا۔ اسے بہت محتاط رہ کر جوابات دینے تھے۔ میڈیا کے گدھ ابھی تک اس کی مُردہ سیاست کے ڈھانچے پر منڈلا رہے تھے۔

لیکن محمود شامی اپنی توجہ سوالوں پر مرکوز نہیں کرپارہا تھا۔ ٹائپ شدہ حروف اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتے اور دُھندلا جاتے۔ اس کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔

وہ سوچنے لگا کہ مقصود اور صابر کے تحفظ کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ امکان تو یہی تھا کہ انہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں لیکن انہیں کچھ ہوجائے' یہ بہرحال اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ صورت حال نازک تھی۔ ذرا سی تبدیلی بھی تباہ کُن ثابت ہوسکتی تھی۔

باہر گھاس کاٹنے والی مشین کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند محسوس ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا۔ ایک تو ویسے ہی ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہورہی تھی' اس پر وہ منحوس آواز! اس نے جھنجلے سے انٹرکام کا بٹن دبادیا "یہ گھاس کاٹنے کا سلسلہ کب تک چلتا رہے گا! رُکواؤ اسے" وہ انٹرکام پر غرایا۔

ایک منٹ کے اندر اندر مشین بند ہوگئی لیکن اسے احساس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا ہے جو اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس نے دوبارہ نچلی دراز کھولی اور بوتل نکال لی۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

○☆○

محمود شامی اپنے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا نیلی مرسیڈیز کو گیٹ پر سیکیورٹی کے مراحل سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ پچھلی سیٹ پر رضیہ بیٹھی ہوگی لیکن کار میں سیکرٹ سروس کے ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ ۸۸ء کے ماڈل کی مرسیڈیز تھی۔ محمود شامی سوچ رہا تھا کہ ملک بھر میں اس ماڈل کی اس رنگ کی کتنی گاڑیاں ہوں گی؟ محافظ نے ڈرائیور کو بہت غور سے دیکھا اور گاڑی کی نمبر پلیٹ پر تو بالکل بھی توجہ نہیں دی۔ یعنی ایسے رنگ کی کوئی بھی مرسیڈیز قصرِ جمہوریت میں بڑی آسانی سے داخل ہوسکتی

ہے۔"

عین ممکن تھا کہ صابر ملک کا خوف برحق ہو' نفیس اور اویس کی اموات ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہوں' اگر ایسا ہے تو اس زنجیر کی اور کڑیاں بھی ہوں گی جو باری باری زنجیر میں شامل ہوتی رہیں گی۔

وہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا' ٹیلی فون کا ایک بٹن دبا کر اس نے سیکرٹ سروس کے حفاظتی دستے کے چیف نصیر کو طلب کیا۔ ایک منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی "اندر آجاؤ" محمود شامی نے پکارا۔

نصیر دبلا پتلا چاق و چوبند آدمی تھا۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ محمود شامی کا اشارہ پا کر وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

محمود شامی نے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا دیے اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا اور عام سے لہجے میں کہا "میرا خیال ہے' حفاظتی انتظامات کو کچھ اور سخت ہونا چاہیے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے جناب" نصیر نے کہا "میں حفاظتی انتظامات میں اضافہ کر سکتا ہوں۔"

"اضافے کی تو نوبت نہیں آئی ہے ابھی' میں صرف سختی کی بات کر رہا ہوں۔ گارڈز کو اور چوکنا اور محتاط رہنے کی ہدایت کر دو۔ وقت بہت خراب ہے" یہ کہتے ہوئے محمود شامی اپنے دفتر کی کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کھڑکی میں بلٹ پروف شیشہ لگوانے کی ضرورت نہیں۔ کھڑکی کے سامنے لان ہے اور اندرونی گیٹ والی تنگ سڑک۔ لان ڈھلوانی ہے اور جہاں لان ختم ہوتا ہے' وہاں سے آہنی جنگلا شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی گن مین کھڑکی سے اسے نشانہ نہیں بنا سکتا۔ اول تو کوئی شخص اس نیت سے لان تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور پھر کھڑکی تو وہ بیشتر وقت کھلی رکھتا ہے۔ ایسے میں بلٹ پروف شیشہ کیا کرے گا۔

اس احساس نے اسے چونکا دیا کہ وہ بے ربط انداز میں سوچ رہا ہے۔

"یہ نفیس جامی اور اویس جاوید والا معاملہ ہے سر؟"

نصیر کے اس سوال نے محمود شامی کو اور بُری طرح چونکا دیا "میں دراصل ہر امکان پر نظر رکھنے کا قائل ہوں" اس نے سنبھل کر کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نصیر نے بھی ان دونوں اموات کو ملا کر بیان کیا ہے۔ نصیر جیسے لوگ بہت تیز حس رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی جبلت بہت توانا ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے جناب۔ میں اپنے آدمیوں کو سمجھا دوں گا۔ اس کے علاوہ الیکٹرونک آلات کی فریکوئنسی بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی کچھ تھا۔ ان دنوں سیاسی سرگرمیاں عروج پر ہیں اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کچھ بھی ہوتا رہے جناب' ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہاری کارکردگی بے مثال ہے۔ میں نے تو احتیاطاً مزید چوکنا رہنے کی ہدایت دی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ بہتری کی گنجائش ہر صورت میں رہتی ہے۔"

محمود شامی نے دل ہی دل میں نصیر کے آخری جملے کو سراہا۔ اس کا یہی انداز تو تحفظ کا احساس بڑھا دیتا تھا "کل سہ پہر ایک شخص مجھ سے ملنے آرہا ہے۔ وہ ایک پرانی سفید کرولا میں ہوگا۔ یہ ہے اس کی گاڑی کا نمبر" محمود شامی نے کاغذ کا ایک پُرزہ اس کی طرف بڑھایا "اسے گیٹ سے گزرنے دینا اور مجھ تک پہنچنے کے سلسلے میں ہدایات دے دینا۔"

"بہتر جناب" نصیر نے کاغذ کا پُرزہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

محمود شامی اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ملاقات اختتام کو پہنچی "اور جو تبدیلیاں کرو' مجھے ان سے مطلع کر دینا۔"

"ٹھیک ہے جناب" نصیر بھی اٹھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹا "اگر مستقبل میں آپ کو معمولی سا شک بھی ہو کہ کوئی خطرہ منڈلا سکتا ہے تو آپ مجھے جلد از جلد بتا دیجیے گا۔ میرے لیے آسانی رہے گی۔"

"ضرور۔"

○☆○

اگلی سہ پہر واجد ٹھیک وقت پر قصرِ جمہوریت پہنچا۔ محمود شامی نے راہداریوں کی بھول بھلیوں سے گزرنے میں دانستہ طور پر اس کی مدد نہیں کی۔ اس کے باوجود واجد نے اس کے دفتر تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔

محمود شامی نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

واجد اوسط قد کا طاقتور آدمی تھا۔ وہ ساکت بیٹھا تب بھی اس کے جسم سے توانائی پھوٹتی محسوس ہوتی "آپ تو بہت ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں جناب۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور متجسس نظروں سے سابق صدر کو دیکھتا رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا ہے۔

ذرا دیر بعد اسے معلوم ہو گیا....

○☆○

"کل مجھے روانہ ہونا ہے۔ ایک ضروری کام ہے" تنویر نے فوزیہ سے کہا۔

فوزیہ کوئی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"کافی رات ہو گئی ہے' سوؤ گی نہیں؟"

"بس... آتی ہوں" فوزیہ نے ڈائجسٹ سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

تنویر اٹھنے لگا مگر پھر بیٹھ گیا "میری روانگی دوپہر تک ہو گی۔"

"ٹھیک ہے" فوزیہ نے ڈائجسٹ کا صفحہ پلٹا "میں سوچ رہی ہوں کچھ فرنیچر خرید لیا جائے۔ یہ فرنیچر فلیٹ کے اعتبار سے مناسب نہیں۔"

"تو خرید لو۔ تمہارے اکاؤنٹ میں کافی رقم موجود ہے۔"

"تم کب واپس آؤ گے؟"

"ایک ہفتہ تو لگے گا" تنویر نے کہا "تم جانتی ہو' میں بلا ضرورت ایک منٹ بھی گھر سے دور نہیں رہتا۔"

فوزیہ نے ڈائجسٹ بند کر کے میز پر رکھ دیا "جانتی ہوں۔ میں تمہیں گاڑی میں ائرپورٹ چھوڑ آؤں گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

فوزیہ نے ڈائجسٹ دوبارہ اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ تنویر اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔

بستر پر تنہا لیٹا وہ اپنے اور فوزیہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا پیشہ رازداری کا متقاضی تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اور فوزیہ اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ اب اس پیشے سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا تھا کہ یہ اب اس کا انداز زندگی بن چکا ہے۔ رازداری کی دیوار ان کے درمیان اب بھی حائل تھی۔ پچھلے برسوں میں انہوں نے ضرورتاً اپنے لیے ایک خول بنالیا تھا۔ ایک ان کہا ضابطہ مقرر کرلیا تھا مگر اب وہ خول چٹخنے لگا تھا۔ پہلے ان کہی باتیں ان کی روز مرّہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتی تھیں مگر اب ان کی باہمی گفتگو میں' جو مختصر ہوتی تھی' لہجے کاٹ دار ہو گئے تھے۔

"میں فوزیہ کے ساتھ ظلم کر رہا ہوں" وہ بڑبڑایا۔

فوزیہ سونے کے لیے آئی تو تنویر سوچکا تھا۔

اگلی صبح اس نے فوزیہ سے کہا کہ گاڑی میں اسے ائرپورٹ چھوڑ آئے۔ وہاں سے وہ کرشن گڑھ کے لیے پرواز کر گیا۔ اس نے فرضی نام سے ٹکٹ لیا تھا۔

کرشن گڑھ ائرپورٹ سے اس نے ایک کار کرائے پر لی۔ جلترنگ کے علاقے میں ایک موٹیل اسے اپنے لیے موزوں نظر آیا۔ اس نے وہاں کمرا لے لیا۔ کمرا بہت سستا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں مہنگے ہوٹل بکثرت تھے۔ ردِّعمل کے طور پر موٹیل میں قیام کرنے والوں کا رش رہتا تھا۔

تنویر نے کرایہ پیشگی ادا کیا۔ کاؤنٹر کلرک نے اسے کمرا نمبر ۳۴ کی چابی دے دی۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد وہ باہر آگیا۔ ہائی وے پر ایک ریسٹورنٹ میں اس نے کھانا کھایا۔ واپسی میں وہ اخبار خریدتا ہوا آیا۔

اپنے بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لیٹتے ہوئے اس نے اخبار پڑھا۔ پھر اس نے اپنی معمول کی ایکسرسائز کی۔ شام کو نہا دھو کر کپڑے بدل کر وہ پھر باہر نکلا۔ کھانا کھا کر وہ پیدل ہی موٹیل تک آیا اور آتے ہی سو گیا۔

وہ الارم لگا کے سویا تھا۔ سات بجے الارم کی آواز نے اسے جگادیا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ سستی دور ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر اپنے سوٹ کیس سے چمڑے کا ایک چپٹا کیس نکالا جو سائز میں انگریزی کے کسی پیپر بیک ناول کے برابر تھا۔ وہ اس کیس کو اپنی شیونگ کٹ کے ساتھ باتھ روم میں لے گیا۔

شیو کرنے کے بعد اس نے چمڑے کے اس کیس کو کھولا اور اپنے شخصیت تبدیل کرنے کے فن کے عملی مظاہرے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے بالوں کا اسٹائل تبدیل کیا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تخلیق کیے' جس کی وجہ سے چہرے کی لکیریں زیادہ گہری اور نمایاں نظر آنے لگیں۔

اب وہ اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔

تنویر کو نقلی داڑھی مونچھوں اور ایسے ہی دوسرے لوازمات کی مدد سے حلیہ بدلنے سے چڑ تھی۔ ایک تو ایسا حلیہ تربیت یافتہ آنکھوں کو قدرتی نہیں لگتا تھا۔ دوسرے یہ امکان بہرحال رہتا تھا کہ داڑھی یا مونچھ کا کوئی حصہ کسی بھی وقت جھڑ جائے یا اپنی جگہ چھوڑ دے۔ وہ خود حلیہ اس انداز میں تبدیل کرتا تھا کہ اصل شخصیت سے بہت دور کی مشابہت محسوس ہو۔

اس نے ایک اور چشمہ منتخب کر کے لگایا اور طمانیت سے سہلایا۔ اس چشمے کے فریم نے رخساروں کی ہڈیوں اور ناک کی بناوٹ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس بات پر خود بھی اکثر حیران ہوتا تھا کہ چہرے کی بعض لکیروں اور ابھاروں میں معمولی سی تبدیلی سے بھی شخصیت کیسے بدل کر رہ جاتی ہے اور ان چھوٹی چھوٹی لیکن دور رس تبدیلیوں کے معاملے میں اس کی مہارت کسی ماہر ترین پلاسٹک سرجن سے کم نہیں تھی۔

موٹیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے اچھی طرح چیک کیا کہ وہ کچھ چھوڑ کر تو نہیں جارہا ہے۔ اس نے اپنا سوٹ کیس لاک کیا اور اسے لے کر اپنی کار کی طرف چل دیا۔ اس روز گھٹا کچھ زیادہ تھی۔ دھوپ ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔

کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد اس نے رک کر ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا پھر وہ ہائی وے پر نکل آیا۔ کار اب کوہستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے سرسبز جنگلات تھے۔ ایک طرف ڈھلوان پہاڑ اور دوسری طرف پہاڑ پر۔ شکار کے شائقین کا وہ پسندیدہ علاقہ تھا۔

تنویر الزماں بھی شکار کی غرض سے نکلا تھا!

○☆○

صابر ملک گزشتہ روز اپنے کوہستان والے کاٹیج میں پہنچا تھا۔ اس کاٹیج کی طرف اس کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آیا تھا' کسی کڑے وقت میں آیا تھا' جب اسے تنہائی اور سکون کی ضرورت ہوتی تھی۔

کاٹیج چھوٹا مگر بے حد خوب صورت تھا۔ اندر کی آرائش دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی پہاڑی کاٹیج ہے۔ کچن سبز ٹائلوں والا تھا۔ وہاں جدید دور کی ہر سہولت موجود تھی۔ گیس کے چولھے

تھے، کیبنٹس تھیں، ریفریجریٹر تھا۔ سنک کے اوپر ایک کھڑکی تھی جس سے وہ بل کھاتی پگڈنڈی نظر آتی تھی جو کاٹیج کی طرف آتی تھی۔ پگڈنڈی سوالیہ نشان کی شکل کی تھی۔ بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں گیس کے آتش دان تھے۔ ڈرائنگ روم میں دیواری شیلف تھے جو کتابوں، فشنگ اور ہنٹنگ کی یادگاروں سے سجے تھے۔ بیڈ روم میں ایک ڈریسر اور دو ڈبل بیڈ تھے۔ ڈرائنگ روم بھی آراستہ و پیراستہ تھا۔

صابر ملک بہت پُرسکون نیند سویا۔ صبح اٹھ کر اس نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں قیام کے دوران جوگنگ کو معمول بنالے گا۔ وزن کم کرنے کی مہم یہاں کچھ کامیاب رہتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا یہاں آنے کا فیصلہ درست ترین ہے۔ کسی خطرے کا سامنا کرنا جبکہ وہ غیر ضروری ہو، کوئی عقل مندی کی بات نہیں۔

باہر کوئی گلہری پتوں کے درمیان بھاگی اور کوئی پرندہ چہچہایا۔ صابر نے فیصلہ کیا کہ سامنے والے پورچ میں کرسی ڈال کر بیٹھا جائے۔ وہاں سے سامنے جنگل کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

صبح کا آغاز کہر اور بادلوں سے ہوا تھا مگر اب ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے اپنی لانسر پورچ کی ایک سائڈ میں کھڑی کی تھی۔ کار کے بونٹ پر اسے لومڑی کے پنجوں کے نشان نظر آئے لیکن اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ فضا اتنی پُرسکون تھی کہ وہ خود بھی پُرسکون ہوگیا۔ یہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ کیسی ہی اعصابی کشیدگی لے کر آتا، یہاں وہ ہمیشہ ڈھل جاتی تھی۔

اس نے چائے کا مگ کرسی کے ہتھے پر رکھا، کرسی سے ٹیک لگائی اور دونوں ٹانگیں پھیلا کر پورچ کی ریلنگ پر رکھ دیں۔ نفیس اور اویس کی اموات، ظہور اور مقصود سے پریشان کُن گفتگو اور وہ خوف جو اسے راتوں کو بے وقت جگا دیتا تھا۔ یہ سب کچھ اب بہت غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ سامنے دیودار کے درختوں کے آسمان سے باتیں کرتے جھنڈ سے زیادہ حقیقی دنیا میں کوئی چیز نہیں تھی۔ اور وہ مغرب کی طرف صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی سرسبز پہاڑی.... اور وہ بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان!

اس خوب صورت صبح نے صابر ملک کے وجود میں نئی توانائیاں جگادیں۔ وہ خود کو جوان محسوس کرنے لگا۔ چائے ختم کرکے وہ کاٹیج میں گیا، ٹریک سوٹ اور جاگنگ شوز پہنے اور باہر آگیا۔ جس راستے پر اسے جاگنگ کرنی تھی، وہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا۔ پگڈنڈی سے نیچے کی طرف پھر جنوب کی سمت ایک تنگ، کچے راستے پر جو سرسبز گھنے جنگلوں کے درمیان ڈھلوان سے ہوتا ہوا ایک چھوٹے جھٹے تک جاتا تھا۔ وہ ایسا راستہ تھا جو مشینی انداز میں جاگنگ کا تاثر زائل کردیتا تھا۔ اکثر اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کتنا فاصلہ طے کرچکا ہے یا یہ کہ اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔

صابر کو جاگنگ کے لیے تیار ہونے میں صرف چند منٹ لگے۔ باہر نکلنے سے پہلے وہ کچن میں گیا اور دیواری کیبنٹس کھول کر ان کا جائزہ لیا۔ شیلف پر مذاوس کے چند ڈبے تھے، کچھ ان میں ڈرائی فروٹ کے تھے اور کچھ مختلف ذائقوں کے سوپ۔ اس نے ایک کاغذ پر ان چیزوں کی فہرست بنادی جن کی ضرورت تھی۔ پھر اس نے اس فہرست کو کاؤنٹر پر نمک دان سے دبادیا اور باہر نکل آیا۔

اس نے کاٹیج کو لاک کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی!

اگر اسے اس بات کا شک بھی ہوگیا ہوتا کہ اس نے یہاں آنے کا فیصلہ ایک دن کی تاخیر سے کیا ہے تو اس نے اتنی بے پروائی نہ برتی ہوتی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ تنویر اسے اپنا آئندہ ہدف بنا چکا ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ حمید اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

حمید نے ابتدا ہی سے اس کا تعاقب کیا تھا اور اب وہ کاٹیج کی لوکیشن سے پوری طرح واقف ہوچکا تھا۔ گزشتہ روز اس نے فون پر تنویر سے بات کی تھی اور کاٹیج کی لوکیشن اچھی طرح سمجھادی تھی۔ تنویر نے اسے انتظار کرنے کی ہدایت دی تھی۔

صابر نے دو میل جاگنگ کی مگر وہ واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھ کمر پر تھے۔ وہ جاگنگ کے معاملے میں بہت محتاط رہتا تھا۔ دل اس کا پرانا مسئلہ تھا اور ڈاکٹر نے جاگنگ کا مشورہ دیتے ہوئے اسے محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو جاگنگ اس کی سب سے اچھی دوا ہے۔

کاٹیج میں داخل ہوکر صابر نے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھا جو پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس کی سانس نارمل نہیں تھی، وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ذرا دیر میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھلی تو ایک عجیب آواز کی وجہ سے۔ وہ چونک کر اٹھا، سیدھا ہوا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے ذہن پر زور دیا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آواز چھت پر سے آئی تھی اور پنجوں کے کھجانے کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ شاید چھت پر کوئی گلہری دوڑی ہوگی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اسے احساس ہوا کہ اسے اس طرح نہیں سونا چاہیے تھا۔ اس کی کمر اکڑ گئی تھی اور ٹریک سوٹ کی الاسٹک والی آستینوں نے اس کے دورانِ خون کو روک دیا تھا۔ اس نے اپنے سُن بائیں ہاتھ کو جھٹکے دے کر دورانِ خون بحال کیا لیکن اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ اب اگر وہ بیٹھا رہا تو اس کا دل اٹھنے کو نہیں چاہے گا۔

وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے سے اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اس نے پرانی جینز کے ساتھ اونی قمیص پہنی اور کچن میں جاکر ضروری اشیا کی فہرست اٹھالی۔ اس میں اس نے پائپ کے تمباکو کا اضافہ کیا۔ فہرست جینز کی ہپ پاکٹ میں رکھ کر وہ باہر نکلا اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔

کچے راستے پر گاڑی اپنے پیچھے گرد و غبار کا طوفان اٹھاتی چل

رہی تھی۔ کچے راستے سے گزر کر وہ ہائی وے پر پہنچا۔ اب کار کا رُخ جلترنگ کی طرف تھا۔

بالآخر اس نے جلترنگ کے مین بازار میں گاڑی پارک کی۔ وہاں جدید طرز کے شاپنگ سینٹرز تھے۔ کبھی یہ علاقہ گرمیوں کے دوران تفریح کے لیے آنے والوں کی توجہ کا مرکز ہونے کے ناتے مشہور تھا مگر اب اس نے کافی ترقی کرلی تھی۔ سیزن کے بزنس پر سارا سال گزارنے والے اب اپنے پیروں پر جم کر کھڑے ہوگئے تھے۔

صابر نے ایک سُپر مارکیٹ کا رخ کیا۔ اندر اسے ایک چھوٹی سی ٹرالی دے دی گئی۔ وہ اسے لے کر مختلف سیکشنوں میں پھرتا رہا اور اپنی فہرست کے آئٹم جمع کرتا رہا۔ دو سیکشنوں کے درمیانی راستے پر ٹرالی دھکیلتے ہوئے بیکری سیکشن میں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ نقوش سے وہ کوئی تاجوری لگتا تھا۔ اس کے کندھے بہت چوڑے اور آنکھیں مغربی ملکوں کے لوگوں کی طرح نیلی تھیں۔

وہ صابر کو جانا پہچانا لگا۔

وہ شخص بیکری سیکشن سے ہٹ گیا تھا۔ صابر ملک کو یقین تھا کہ اس نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ شاید دوسری نظر دیکھنے کا موقع مل جاتا تو اسے یہ بھی یاد آجاتا کہ کہاں دیکھا ہے۔ اس نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا مگر وہ شخص نہ جانے کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اچانک وہ گہرا سکون جو کوہستان آتے ہی اس کے اندر اُتر گیا تھا' معدوم ہوگیا۔ اس کے پیٹ میں خوف اور تشویش کی جانی پہچانی گرہیں پڑنے لگیں۔

لیکن اسے یہ بات ناقابل یقین لگ رہی تھی کہ کوئی اس کے پیچھے یہاں تک آئے گا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں ہے— کم از کم ایسے کسی شخص کو تو معلوم نہیں ہوسکتا تھا جس سے اسے خوف ہو۔ مقصود کو اس نے ضرور بتایا تھا کہ ایمرجنسی میں وہ اس سے کہاں رابطہ کرسکتا ہے۔ وہ بھی کالج کے قریب ایک پیٹرول پمپ کا فون نمبر تھا۔ کالج میں تو فون بھی نہیں تھا۔

وہ چیک آؤٹ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ ادائیگی کرنے کے بعد وہ اپنی خریدی ہوئی اشیا دو بڑے شاپنگ بیگ میں بھر کر اپنی کار کی طرف چلا۔ دوبار اس نے پلٹ کر دیکھا کہ شاید اسی تاجوری کی ایک اور جھلک نظر آئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے شاپنگ بیگ کار کی ڈکی میں رکھ دیے۔

اس نے سوچا' مجھے وہم ہوا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ براہِ راست کالج جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چنانچہ وہ جلترنگ کے تفریحی مرکز کی طرف چل دیا۔ وہاں اس نے ایک خالی جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی پھر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ سڑکوں پر بہت رش تھا۔ فٹ پاتھ بھی راہ گیروں سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ ایک اسٹور کے شوکیس میں جیولری دیکھنے کے لیے رکا۔ اس نے ظاہر یہ کیا کہ جیسے اسٹور میں داخل ہونے والا ہے۔ پھر وہ یوں پلٹا جیسے اچانک ہی ارادہ بدل دیا ہو۔ ایک لمحے کو اسے وہی تاجوری نظر آیا پھر وہ پلٹا اور دُکان کے ساتھ والی گلی میں غائب ہوگیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اس پر وہم کا گمان کیا جاسکتا تھا۔

○☆○

حمید جانتا تھا کہ صرف پل بھر کے لیے سہی لیکن صابر ملک نے اسے دوبارہ دیکھا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صابر کوئی اناڑی آدمی نہیں۔ اگر وہ محتاط ہو اور اسے تعاقب کا شبہ ہو تو اس کا تعاقب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فاصلہ بڑھا کر تعاقب جاری رکھا جائے۔

حمید بہت احتیاط سے اس گلی سے نکلا جس نے صابر ملک کے اچانک پلٹ کر دیکھنے پر اسے پناہ دی تھی۔ صابر ملک کافی آگے جاچکا تھا۔ اب اس کے قدم پہلے سے زیادہ تیز تھے اور رخ اسی طرف تھا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ حمید بھی تیز چلنے لگا۔

صابر ملک اگلی سڑک پر مُڑ گیا۔ مُڑتے ہوئے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ حمید اس موڑ پر پہنچا تو صابر ملک تقریباً اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اب وہ تیز نہیں چل رہا تھا بلکہ بھاگ رہا تھا۔ حمید کے مُڑتے ہی وہ داہنی جانب مُڑا اور غائب ہوگیا۔ حمید داہنی جانب مُڑنے والی پہلی گلی میں مُڑ گیا۔ اس نے ٹیکنیک بدلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ متوازی گلی میں وہ بھی تیز رفتاری دکھا سکتا تھا۔

لیکن وہ گلی سے نکلا تو صابر ملک ندارد تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس طرف آنے کے بجائے واپس پلٹ گیا تھا۔ حمید پلٹ کر اسی طرف بھاگا جہاں سے آیا تھا' وہاں پہنچا تو صابر ملک اسے بہت دور نظر آیا۔

حمید نے اپنے قدم اور تیز کردیے۔ اسے احساس تھا کہ اس کی سانس پھول رہی ہے۔ صابر ملک نے پلٹ کر دیکھا... اور شاید اسے دیکھ بھی لیا۔

بائیں جانب مُڑتے ہوئے صابر نے سڑک پار کی۔ حمید وہاں پہنچا تو صابر نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ حمید نے سڑک پار کی تو وہ اسے جاتا نظر آیا۔ شکار اور شکاری کے درمیان فاصلہ خاصا کم ہوچکا تھا۔

وہ سڑک بہت مصروف تھی۔ اس پر ٹریفک زیادہ تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے صابر سائڈ کی عمارتوں سے لگ کر چل رہا تھا' جیسے وہ اسے پناہ دے دیں گی۔ وہ اپنے متعاقب سے اچھا خاصا آگے تھا۔ اگر اسے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ اس کا متعاقب کون ہے تو...

اور حمید کو یقین تھا کہ صابر ملک اسے پہچان گیا ہے۔ اس صورت حال میں اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تیزی سے... تیز رفتاری سے عمل کرے۔ متبادل لائحہ عمل کی تنویر منظوری دے چکا تھا۔

ٹائر چیخے... ایک گاڑی نے ہارن بجایا۔ کار نر پر صابر نے سرخ روشنی کے باوجود سڑک پار کرلی تھی۔ پھر وہ بھاگنے لگا۔ حمید اس کی سمت سمجھنے کے لیے فٹ پاتھ سے اترا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ صابر کہیں مڑ تو نہیں رہا ہے۔ اسے سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی کہ متبادل ایکشن پر عمل سے پہلے وہ فون پر کسی سے رابطہ نہ کرلے' اس کے متعلق نہ بتادے۔ وہ اس مفروضے کے تحت کام کررہا تھا کہ صابر اسے پہچان چکا ہے۔

تیز رفتار کار کا بمپر حمید کی پنڈلیوں سے ٹکرایا۔ حمید اُلٹ کر گرا... اور کار کے راستے میں گرا۔ کار ایک عورت ڈرائیو کررہی تھی' جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ عورت گھبرا گئی تھی۔ وہ بریک بھی نہ لگا سکی۔ کار کافی دور جاکر رکی... اور وہ حمید کے جسم پر سے گزر کر آئی تھی۔ ڈرائیو کرنے والی عورت اب اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پیچھے دیکھ رہے تھے۔

○☆○

صابر ملک بھاگتے بھاگتے رُکا اور ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوگیا۔ وہ خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ تو یقین سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والا شخص وہی تھا جسے اس نے سُپر مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ یہ سب کچھ محض اس کا وہم ہو۔

وہ ٹائیوں کے ریک کے پاس کھڑا ٹائیاں دیکھنے کی اداکاری کرتا رہا۔ درحقیقت اس کی نظر اسٹور کے داخلی دروازے پر تھی۔

گاہک بڑی تعداد میں آجارہے تھے۔ ان میں صابر کو ایک پادری نظر آیا۔ ابتدائی زندگی میں صابر ملک پکا کیتھولک کرسچین رہا تھا۔ اب برسوں سے اس نے کسی چرچ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا لیکن اس وقت اس کے دل میں پادری کے پاس جاکر اس سے بات کرنے کی خواہش ابھری لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا۔ وہ کن انکھیوں سے پادری کو کھلونوں والے سیکشن میں جاتے دیکھتا رہا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ اس دوران اس کا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ تعاقب کرنے والا اندر نہیں آیا۔ شاید وہ باہر اس کا منتظر تھا۔

صابر نے یہ سوچا تو ضرور لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ممکن نہیں۔ اسٹور کا عقبی دروازہ بھی تھا۔ متعاقب کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ اس کا شکار کس دروازے سے نکلے گا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پیچھے اسٹور میں داخل ہوکر اس پر نظر رکھے بشرطیکہ وہ تجربے کار ہو اور تعاقب کی فنی باریکیوں سے واقف ہو۔

بشرطیکہ کوئی متعاقب ہو!

وہ عقبی دروازے سے نکلا اور چوکنے انداز میں نارمل رفتار سے اس طرف چلنے لگا جہاں اس نے کار پارک کی تھی۔

○☆○

حمید نے فون نہیں کیا تھا!

تنویر اپنے موبائل کے کمرے میں بیٹھا برگر کھا رہا تھا کہ اس نے ریڈیو پر وہ خبر سنی... ایک شخص جو چہرے مہرے سے تاجوری لگتا تھا' آج سہ پہر ایک کار کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا۔ لاش کی شناخت نہیں ہوسکی ہے۔ متوفی فٹ پاتھ سے نیچے اترا تھا کہ ایک کار کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ موقعے پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ اس کی جیبوں سے ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی جو اس کی شناخت میں مدد دیتی۔ کوئی شخص اس سلسلے میں کسی قسم کی معلومات فراہم کرسکتا ہو تو اسے چاہیے کہ جلد از جلد جلترنگ پولیس سے رابطہ کرے۔ آج مصر میں...

تنویر نے ریڈیو آف کردیا' اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ہاتھ میں ادھ کھایا برگر تھامے ہوئے ہے لیکن اب اس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ اس نے برگر کو ڈریسر پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال طوفانی رفتار سے گردش کررہا تھا... حمید مرگیا... حمید اب اس دنیا میں نہیں...

کیا صابر ملک نے کسی طرح...؟ لیکن نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ صابر ملک پروفیشنل تھا لیکن حمید اس سے بڑھ کر پروفیشنل تھا۔ اور پھر امکان تو یہی تھا کہ صابر کو علم بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ محض ایک عام سا حادثہ تھا لیکن صابر ملک بھی کسی نہ کسی طور پر اس میں ملوث ہوگا اور اگر نہیں بھی تھا تو اب مقامی اخبارات میں یا ٹی وی پر حمید کی تصویر بہرحال دیکھ لے گا۔

تنویر نے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ لیے۔ اسے اپنے پیٹ میں ایک بھاری پتھر کا سا بوجھ محسوس ہورہا تھا۔ حمید کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اہم بات یہ تھی کہ حمید اس کا دوست تھا۔ یہ احساس تو اسے اب ہوا تھا کہ اس نے اپنے مزاج کے خلاف حمید سے دوستی کچھ زیادہ ہی بڑھالی تھی۔

تنویر نے قمیص پتلون کے اندر کرتے ہوئے سوچا' حمید اصولوں اور ضابطوں سے خوب واقف تھا' اس نے جیکٹ کندھے پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

○☆○

صابر کی نظریں تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتی ہوئی سڑک پر جمی تھیں پھر وہ سڑک سے مڑا اور کالج کی طرف جانے والے کچے راستے پر گاڑی دوڑانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اخبار والوں نے ان لوگوں کے کیے دھرے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا' کسی حد تک تو درست ہوگا۔ محمود شامی' شاکر' ظہور... کون جانے وہ اندر سے بدمعاش ہوں اور انہیں خود بھی اس بات کا علم نہ ہو۔ برائیوں کی اس دنیا میں برائی کی پہچان تو بہت مشکل ہوگئی ہے۔

اس نے ایکسیلریٹر پر دباؤ کم کیا اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اب راستے میں موڑ بہت زیادہ تھے۔ ایک طرف سے سرسبز پہاڑیاں تھیں اور دوسری طرف صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ڈھلانیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے کالج کا رخ کرکے درست فیصلہ کیا ہے' یہاں وہ محفوظ ہے۔

اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور چند لمحے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا گردوپیش کی سکون میں لپٹی ہوئی خوب صورتی کو آنکھوں کے راستے اندر اُتارتا رہا پھر وہ کار سے اترا' ڈکی کھول کر اس نے سامان کے تھیلے نکالے اور انہیں اندر لے گیا۔

سامان سلیقے سے رکھنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں گیا' اپنے لیے ایک جام بنایا اور صوفے پر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ اسے یقین ہوچلا تھا کہ آج جو کچھ ہوا' وہ اس کے اندر کے خوف کا کرشمہ تھا..... اور بے جا بھی نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے سُپرمارکیٹ میں ایک شخص کو دیکھا' جو اسے جانا پہچانا لگا۔ یہ بھی طے ہے کہ اپنے نقوش سے وہ شخص تاجوری لگتا تھا..... اور گیٹ وے والے معاملے میں کچھ تاجوری بھی ملوث تھے۔ بس وہیں سے شاید اس کا تصور بے لگام ہوگیا۔ وہ پریشان اور خوف زدہ ہوگیا۔

اس نے جام خالی کرکے رکھا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ بے چین ہورہا ہے۔ وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اس نے اپنے لیے ایک اور جام بنایا لیکن پینے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جام یونہی رکھا رہا۔ اس نے اسے چھوا بھی نہیں۔

وہ ٹہلتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ سنک کے اوپر والی کھڑکی سے اس نے پگڈنڈی کو دیکھا۔ شام ہورہی تھی۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک سیب اٹھایا اور کاٹنے کی زحمت کیے بغیر اس میں دانت گاڑ دیے۔ سیب کھاتے ہوئے وہ پگڈنڈی کو دیکھ رہا تھا' جو اس علاقے کے سکون کی علامت تھی۔ دھیمی ہوا چلنے لگی تھی۔ درختوں کے صرف اوپر کے پتے ہل رہے تھے۔ اس نے سیب کا بچا کچھا حصہ ٹوکری میں پھینکا اور فیصلہ کیا کہ رہی سہی اعصابی کشیدگی کا علاج جاگنگ ہے۔

اس نے اپنا ٹریک سوٹ اور جاگنگ شوز پہنے اور کالج کے عقبی دروازے سے نکل آیا۔ ابتدا میں اس نے چہل قدمی کے ذریعے ہاتھ پاؤں کھولے۔ چند سو فٹ کا فاصلہ چل کر طے کرنے کے بعد اس نے جاگنگ شروع کردی۔

ایک میل کی جاگنگ کے نتیجے میں اس کی سانسیں بھاری ہوگئیں۔ اپنے جاگنگ شوز کی مخصوص اور مستقل چاپ اس پر خود تنویمی کیفیت طاری کرنے لگی۔ اب وہ چڑھائی طے کررہا تھا جو کالج کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ اپنی رانیں اسے بوجھل محسوس ہونے لگیں۔ کالج وہاں سے ڈیڑھ میل دور تھا۔ اس نے اپنی رفتار میں کچھ کمی کی اور سانسوں کو ہموار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت جنگل میں دوڑ رہا تھا۔

اچانک وہ جنگل سے نکل آیا۔ اب سامنے سرسبز میدانی علاقہ تھا' جو پہاڑی کی جڑ میں واقع تھا۔ ہوا جیسے رک گئی تھی۔ ڈوبتا سورج حیرت انگیز طور پر گرمی برسانے لگا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کے کناروں پر پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جاگنگ موقوف کیے بغیر بازو سے پسینہ صاف کیا۔ اس دوران اس نے بے ساختہ سر گھمایا...

ایک لمحے کو اپنی ایک جانب ایستادہ درختوں کے درمیان اسے حرکت کا احساس ہوا۔

اب وہ ہر قدم پر پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدموں کا ردھم ٹوٹ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے کسی کو دیکھا ہے۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اگر کوئی واقعی اس کا پیچھا کررہا ہے تو درختوں کا جھنڈ ختم ہوتے ہی سامنے آئے گا۔

درختوں کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوا۔ صابر ملک کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ وہ شخص آدھی آستین کی قمیص اور ہلکی پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس کی رفتار صابر سے کچھ تیز تھی اور بھاگنے کے انداز میں قدرتی بہاؤ تھا۔ وہ جسمانی طور پر اے ون کنڈیشن میں تھا۔

صابر نے اپنے قدم تیز کردیے۔ وہ ہر قدم پر پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اس نے اپنے متعاقب کا چہرہ دیکھ لیا' وہ تنویر تھا..... تنویر الٰہی!

نفیس اور اویس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' اس کے بارے میں صابر کے ذہن میں اگر کچھ شبہات تھے تو وہ اس لمحے دُھل گئے۔ اسے یقین ہوگیا کہ سُپرمارکیٹ والا واقعہ وہم نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر دہشت طاری ہوگئی۔ اس نے اپنی رفتار اور بڑھانے کی کوشش کی۔ اسے اپنی اُکھڑتی ہوئی سانسوں کا بھی خیال نہ رہا۔ کالج اب بھی ایک میل دور تھا۔

دیر تک صابر نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اپنی رفتار برقرار رکھے ہوئے تھا اور اپنی درد سے چیختی چیختی پنڈلیوں کو نظرانداز کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہر قدم پر درد بڑھ رہا تھا۔ رانیں دُکھ رہی تھیں۔

ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ان کا درمیانی فاصلہ پہلے کے مقابلے میں آدھا رہ گیا تھا جبکہ تنویر کی سانسیں ابھی ہموار تھیں۔ اسے دوڑنے میں کوئی دشواری نہیں ہورہی تھی۔ اس کا انداز میکانیکی تھا اور ہر اٹھتا قدم ایک دھمکی تھا۔

صابر کو اپنے قدم سُست پڑتے محسوس ہوئے۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑا پوری قوت سے سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا ہو۔ وہ بہت کمزوری محسوس کررہا تھا۔ اس کے قدم بار بار لڑکھڑاتے۔ اُکھڑتی سانسیں کھڑکھڑاہٹ کی آواز بلند کرتیں۔

تنویر اور قریب آگیا تھا۔

اور وہاں کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اسے اپنا دل دھماکے سے پھٹتا محسوس ہوتا۔ اور ہر دھماکے کے ساتھ سینے میں بائیں جانب اذیت کی ایک مہیب موج اٹھتی۔ کندھے دُکھتے اور درد اس کے بائیں بازو میں دوڑ جاتا۔ اسے اپنے پیچھے تنویر کے نپے تُلے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی۔

دائیں جانب اسے اپنے کالج کی چھت نظر آئی۔ اس نے سختی سے دانت پر دانت جمائے اور خدا سے دعا کی کہ وہ اسے وہاں تک پہنچنے کی طاقت عطا فرمائے۔

اور ایک لمحے کو اسے اپنے وجود میں طاقت کا چشمہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ اس نے پانچ چھ لمبے لمبے ڈگ بھرے۔ پھر اچانک سینے کے درد نے آہنی پنجوں کی طرح اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ درد ایک دھاردار چاقو تھا جو بائیں بازو سے گزر کر اس کے سینے میں اُتر گیا۔ وہ اپنے پاؤں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اس سے اٹھائے نہیں جا رہے تھے۔ سینے میں درد اپنی قوت اور حجم بڑھا رہا تھا' پھیل رہا تھا۔ اس کے جسم میں اذیت کی تندلہریں دوڑ رہی تھیں۔ یہ احساس اسے دہشت میں مبتلا کر گیا کہ وہ اب دوڑ نہیں رہا ہے۔ اس کی زبان پر مٹی کا ذائقہ تھا۔ درد اور اذیت نے اس کے جسم کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور اب دھیرے دھیرے اس کے وجود کو نگل رہی تھی۔

○☆○

تنویر گہری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ نیچے گرتے ہوئے صابر کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے احساس تھا کہ صابر پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ صابر کی ایک ٹانگ مُڑی ہوئی تھی اور دوسری ٹانگ کے نیچے دب گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور تنویر کی طرف نگراں تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تنویر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے ہونٹوں سے اپنا کان لگا دیا۔

"قادر...." صابر کی آواز واضح تھی "....معافی...."

تنویر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پینٹ پر سے مٹی جھاڑی۔

"غفار...." صابر کی آواز اس بار بلند تھی۔

غفار وہ شخص تھا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مرنے کے بعد جلایا تھا۔ تنویر کو یہ احساس بھی ہوا کہ صابر اسے پادری سمجھ رہا ہے۔

صابر نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ بس پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ یقینی طور پر معافی مانگ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ ساکت ہو گئے.... جیسے فلم کا کوئی منظر اٹنل کر دیا گیا ہو۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کی زندگی کی روشنی سے محروم آنکھوں کو چوم رہی تھیں۔

تنویر جنگل کی طرف واپس چل دیا جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ صابر ملک کو کم از کم اس سے معافی نہیں مل سکتی تھی۔

اسے اپنی کار تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھا سوچتا رہا۔ اسے اپنے پیٹ میں گرہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں لیکن یہ تصور بھی اس کے لیے محال تھا کہ اسے صابر ملک پر رحم آیا تھا۔

اسے اپنے قید کے دن یاد آ رہے تھے۔ جیل کی کوٹھری میں وہ اکثر گلوریا کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

اس نے اخبار میں گلوریا کی موت کے بارے میں پڑھا تھا۔ اس کی گاڑی ایک کھڈ میں گر گئی تھی پھر گاڑی میں آگ بھی لگ گئی تھی۔ جلی ہوئی لاش کی شناخت میں خاصی دیر لگی تھی۔ گاڑی کے اسپیئر ٹائر کمپارٹمنٹ میں سے تیس لاکھ روپے کی بھاری رقم ملی تھی۔ کار کا وہ حصہ جلنے سے رہ گیا تھا لیکن وہ رقم ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حادثہ کیسے ہوا اور گیٹ وے تحقیقاتی کمیٹی یقینی طور پر یہ بات ثابت نہیں کر سکی کہ وہ رقم کہاں سے آئی تھی۔ ثبوت کا نہ ہونا اپنی جگہ لیکن یہ بات سب جانتے تھے کہ یہ تیس لاکھ اس پانچ کروڑ کا حصہ تھے جو تنویر اور اس کے ساتھیوں کو گیٹ وے بینک میں سینیٹر بشیر کے ڈیپازٹ باکس میں سے ملے تھے اور یہ بھی طے تھا کہ وہ جائز رقم نہیں تھی۔

تنویر نے ہدایت کے مطابق وہ رقم مقصود کے حوالے کر دی تھی۔

تحقیقات کے نتیجے میں ثابت ہو گیا کہ وہ رقم محمود شامی کے الیکشن کے لیے استعمال ہونا تھی۔ ڈیپازٹ باکس کھولے جانے سے دو دن پہلے سینیٹر بشیر کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ بالکل محفوظ رقم تھی جس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کیسے اور کہاں خرچ کیا جائے۔

نفیس نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا.... اچانک اور غیر متوقع طور پر رقم ہمارے ہاتھ میں تھی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کریں۔ اور وہ ایک مرے ہوئے آدمی کی رقم تھی جو نہ اس کا دعویٰ کر سکتا تھا اور نہ کوئی وضاحت.....

اتنی بڑی رقم نشان ضرور چھوڑتی ہے اور نشانات ایوانِ صدر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

محمود شامی کے استعفے سے بہت سے سوالات تشنۂ جواب رہ گئے تھے۔ تنویر کو یقین تھا کہ گلوریا کی موت فطری نہیں۔ اسے انتظامیہ کے حکم پر ٹھکانے لگایا گیا ہو گا بلکہ ممکن ہے' اس کی منظوری خود شاکر نے دی ہو۔ گلوریا بہت اچھی ڈرائیور تھی اور وہ راستہ اتنا خطرناک بھی نہیں تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ گلوریا تیس لاکھ روپے کیوں لیے پھر رہی تھی۔ ویسے وہ موقع پرست تو تھی۔ کیا پتا' رقم لے کر نکل رہی ہو۔ ممکن ہے' شاکر کے پاس لے جا رہی ہو۔

بہرحال کچھ بھی ہوا ہو' اہم بات یہ تھی کہ گلوریا شاکر مر چکی تھی۔

○☆○

"صابر ملک کا انتقال ہوگیا" فوزیہ نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا جو چند منٹ پہلے اخبار والا دے کر گیا تھا۔

تنویر نے کتاب سے نظریں اٹھا کر مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا "کیسے؟"

"ہارٹ اٹیک" فوزیہ نے کہا اور خبر پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثر سے پتا چلتا تھا کہ موت کا سبب قدرتی ہونا اس کے لیے سکون کا باعث ثابت ہوا تھا۔

"ہم میں سے تین رخصت ہوگئے اور وہ بھی اتنے تھوڑے سے وقت میں" تنویر نے کہا۔ "ہم میں سے کہہ کر اس نے فوزیہ کے شکوک کو مزید دھونے کی کوشش کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ فوزیہ خود بھی ان شکوک سے پیچھا چھڑانے کو کتنی بے چین ہے۔ پچھلے برسوں میں تنویر نے اس کام میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ وہ اسے خود فریبی میں مبتلا رکھتا تھا اور اس کے ضمیر پر بوجھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

فوزیہ نے اخبار فولڈ کیا اور اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ صابر کی موت کی خبر پہلے صفحے پر تھی۔ تنویر اس سے اخبار مانگنے میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

فوزیہ خاموش بیٹھی اخبار پڑھتی رہی۔ باقی تفصیل درمیانی صفحے میں تھی۔ اس نے درمیانی صفحہ کھول لیا تھا۔

"تم پڑھ لو تو مجھے بھی دے دینا۔" تنویر نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں عدم دلچسپی بھی مخدوش ہوگی۔

"اسے دل کا عارضہ لاحق تھا" فوزیہ نے کہا۔

"تب تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں' اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔"

"ہاں.... ترپن سال۔"

"یہ وہ عمر ہوتی ہے جب آدمی اتنا فٹ نہیں ہوتا جتنا خود کو سمجھتا ہے" تنویر نے کہا۔

"اور اس پر پچھلے برسوں کی سختیاں۔ وہ اپنے کوہستان والے کالج میں تعطیلات منا رہا تھا۔"

"اکیلا؟"

"ہاں۔"

"یہ اور برا ہوا۔ کوئی ساتھ ہوتا تو اسے طبی امداد میسر آجاتی۔"

"اخبار کے مطابق سب کچھ بہت اچانک اور تیزی سے ہوا۔ وہ اپنے کالج میں تھا۔"

تنویر نے کتاب کا صفحہ پلٹا۔ اسے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ کوئی ردعمل ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔

فوزیہ نے اخبار تہ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ فکرمند نظر آرہا تھا۔ وہ ان علامات سے خوب واقف تھی۔ اس نے اخبار تنویر کے سامنے رکھا اور خود کچن میں چلی گئی۔ تنویر نے اخبار فوراً ہی نہیں اٹھایا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ فوزیہ کچن میں مصروف ہوگئی ہے تو اس نے اخبار اٹھایا۔

فوزیہ نے ٹھیک ہی پڑھا تھا!

ہائیکنگ کرنے والے دو لڑکوں نے جو بھٹک گئے تھے' راستہ معلوم کرنے کے لیے کالج کے دروازے پر دستک دی تھی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ انہیں صابر ملک کی لاش ڈرائنگ روم کے وسط میں پڑی نظر آئی مگر انہوں نے سوچا' ممکن ہے وہ سو رہا ہو یا نشے میں ہو۔ بہرحال وہ دل پر بوجھ محسوس کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پولیس سے رابطہ کرلیا۔

وہ کوئی پروف کی غلطی یا معلومات کا اختلاف نہیں تھا۔ یہ بات طے تھی کہ صابر ملک کی لاش اس کے کالج میں پائی گئی۔

تنویر نے اخبار فولڈ کرکے اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اور اخبار بھی پڑھنے ہوں گے۔ اگرچہ یہ بات یقینی تھی کہ ہر اخبار میں یہ خبر یونہی چھپی ہوگی۔ بہرحال احتیاطاً ڈبل چیک کرنا ضروری تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ صابر کی لاش کالج کے اندر کیسے پہنچی؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟ خود تنویر نے اتنے مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا تھا کہ اس کے دھوکا کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صابر کالج جانے والے راستے پر گرا تھا اور اس کے سامنے ہی مرگیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس میں اتنی زندگی رہ گئی ہو کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر کالج تک جا پہنچا ہو۔

اب حمید کی موت کے بارے میں بھی شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ یہ طے تھا کہ جلد ہی اس کی لاش کی شناخت ہوجائے گی۔ اس کے بعد مزید سوالات سر اٹھائیں گے۔ کیا اس کی موت میں کسی اور کھلاڑی کا ہاتھ تھا؟ لیکن تنویر نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کردیا۔ اس نے ٹی وی پر نیوز کوریج دیکھی تھی۔ جس خاتون کی کار سے حمید ٹکرایا تھا' وہ خاتون اور اس کے دونوں بچے شاک کی جس حالت میں تھے' وہ دکھاوا نہیں ہوسکتا تھا اور ہر گواہ کا کہنا تھا کہ حادثے کا ذمے دار خود متوفی تھا۔ وہ بے حد اچانک.... بہت جلدی میں فٹ پاتھ سے سڑک پر اترا تھا۔

تنویر کے ذہن میں ایک سرد سا محتاط پن جڑ پکڑ رہا تھا۔ اس کی حسیات تیز ہو رہی تھیں۔ اس نئی صورت حال نے نئے خطرات کو جنم دیا تھا۔

○☆○

واجد' محمود شامی کے ساتھ ساحل پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ دور اُفق پر ایک بحری جہاز کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ ان کے سروں پر سے شور مچاتی ہوئی مرغابیاں گزریں' جیسے انہیں مطلع کر رہی ہوں کہ بارش ہونے والی ہے۔ بعض اوقات ساحل پر دم توڑنے والی موجیں محمود شامی کے پیروں تک پہنچ جاتی تھیں۔

واجد بیزار ہو گیا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ محمود شامی تھک جائے اور قصر کی طرف واپس چل دے۔

"میں تمہارے عمل کی تائید نہیں کر سکتا" محمود شامی نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"میں تو اس کی تلاش میں نکلتا بھی نہیں" واجد نے جواب دیا "لیکن کچن کے کاؤنٹر پر اس کا کھانا تیار رکھا تھا' اس کی کار باہر کھڑی تھی اور وہاں کسی اور گاڑی کے ٹائروں کے نشانات موجود نہیں تھے۔ میں نے سوچا' وہ کہیں قریب ہی ہو گا۔"

"اور جب تم نے اسے تلاش کیا تو وہ مر چکا تھا..... کاہیج کی پچھلی پگڈنڈی پر؟"

تیز ہوا کے جھونکے نے واجد کے جسم میں تھرتھری سی جگا دی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے "مجھے یقین تھا کہ اس کی موت طبعی نہیں ہے۔ میں علامات خوب پہچانتا ہوں۔ ہارٹ اٹیک کسی پر تھوپا بھی جا سکتا ہے اور اس کے طریقے بھی بے شمار ہیں۔"

محمود شامی ساحل کی بھیگی ریت کو گھورنے لگا۔ "لاش کے قریب قدموں کے نشانات بھی تھے؟"

"نہیں' لیکن اتنی سخت زمین پر قدموں کے نشان محفوظ نہیں رہتے۔ میں نے لاش کو کاہیج میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میری تھیوری یہ تھی کہ صابر ملک کا قتل کیا گیا ہے۔ لاش کاہیج میں پائی گئی تو قاتل گھبراہٹ میں ضرور جتلا ہو گا۔ وہ سوچے گا کہ شاید صابر ملک مرتے مرتے ذرا دیر کو جی اٹھا ہو گا اور اس میں اتنی طاقت آ گئی ہو گی کہ وہ کاہیج تک پہنچ گیا اور فرض کر لیں کہ قاتل چند منٹ بعد واپس آیا اور لاش غائب ملی تو وہ یہی سوچے گا۔ نا کہ صابر مرا نہیں ہے۔ وہ اپنا کام مکمل کرنے کاہیج آئے گا اور وہاں میں اس کا منتظر ہوں گا۔ یہ ایک ایسا امکان تھا جسے میں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور اب قاتل کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس معاملے میں پولیس کے علاوہ بھی کوئی ملوث ہے..... اور یہ کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے" محمود شامی نے اعتراض کیا۔

"بشرطیکہ صابر ملک کی موت قتل ہو۔"

"اسے قتل کیا گیا ہے۔ میرا وجدان بتاتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے وجدان پر بھروسہ کیا ہے۔"

واجد اس پر بھرپور جبرہ کر سکتا تھا لیکن اس نے عقل مندی کی کہ نہیں کیا "دو گھنٹے بعد وہ لڑکے آ گئے اور دروازہ پیٹنے لگے" اس نے اپنی بات جاری رکھی "پھر انہوں نے کھڑکی سے جھانکا۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا تھا کہ چپکے سے کاہیج سے نکل لوں۔"

وہ دونوں رک گئے۔ سامنے ایک جنگلا تھا۔ وہ سمندر تک چلا گیا تھا اور اس بات کی علامت تھا کہ سابق صدر کا ذاتی ساحل یہیں تک ہے۔

وہ واپس چل دیے۔ ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ واجد کو سردی لگ رہی تھی۔

"بہرحال' معاملات جس طرح چل رہے تھے' انہیں ویسے ہی چلنے دیا جائے" محمود شامی نے کہا "اور مجھے مخصوص اوقات میں فون پر رپورٹ دو۔ مجھے ضرورت پڑی تو تم سے رابطہ کر لوں گا۔ میرے پاس تمہارے کئی فون نمبر ہیں۔"

"بہتر جناب' اور اگر آپ سیکیورٹی کے انتظامات اور سخت کروا لیں تو بہتر ہو گا۔"

"یہ تو میں جس حد تک ضروری سمجھتا تھا' پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

واجد نے اس بار حفاظتی تدابیر کو بطورِ خاص چیک کیا تھا۔ اچھے انتظامات کیے گئے تھے لیکن وہ جس شخص کا پیچھا کر رہا تھا' وہ یقینی طور پر پروفیشنل تھا اور کسی پروفیشنل کے لیے اس حفاظتی دیوار میں رخنے تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ سابق صدر کے مزاج سے واقف تھا۔ اس سے براہِ راست اختلاف کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

"منطقی اعتبار سے قاتل کا آخری اور لازمی ہدف آپ ہیں" اس نے کن انکھیوں سے محمود شامی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ خطرہ میرے لیے کوئی نیا نہیں۔"

واجد یہ بات جانتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ یہ معاملہ مختلف ہے۔ یہ خطرہ نیا تھا اور ذاتی سطح کا تھا۔

"تم بھول گئے ہو کہ میں کس مقام پر تھا۔ کہاں بیٹھا تھا میں۔"

"نہیں جناب۔ مجھے یاد ہے لیکن آپ پر کبھی کوئی قاتلانہ حملہ تو نہیں ہوا تھا۔"

"یہ درست ہے" محمود شامی نے اعتراف کیا "انہوں نے مجھے لفظوں کے' افواہوں کے اور طنز کے ذریعے تباہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مڑی تڑی حقیقتوں کے خنجر گھونپنے کی کوشش کی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یقین کرو' وہ جو کچھ میں نے جھیلا' اس خطرے سے کسی طور بھی کم نہیں تھا' جو ہمیں اس وقت لاحق ہے۔"

"جی ہاں جناب۔"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ نرم ریت پر ان کے قدموں کی آہٹ اور موجوں کے شور کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

واجد جانتا تھا کہ وہ محمود شامی کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ محمود شامی کے دورِ صدارت میں شاکر نے جو اس وقت انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر تھا' اس سے خفیہ نوعیت کے کچھ کام کرائے تھے۔ یہ بات کہ وہ کام غیر قانونی تھے' اس وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔

محمود شامی کی خاصا عرصہ پہلے اس وقت کے وزیرِ اعظم جبار

افضل سے ٹھن گئی تھی۔ محمود شامی نے قومی اسمبلی میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے حکمراں پارٹی کے ارکین اسمبلی کو توڑنا چاہا لیکن اپنی پارٹی پر جبار افضل کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مقبول وزیراعظم تھا۔ عوامی سطح پر بھی وہ ایک مقبول سیاست داں تھا۔ اس کی وجہ اس کے عوامی بہبود کے منصوبے تھے۔ وہ پہلا وزیراعظم تھا جس نے بڑے خلوص سے عام لوگوں کو کچھ دینے کی.... ان کے کام آنے کی کوشش کی تھی۔

قومی اسمبلی میں محمود شامی کے راستے کی دیوار کامران احمد تھا۔ اس کا ایوان میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ جب تک وہ وزیراعظم کے ساتھ تھا' وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ محمود شامی نے اسے ہی ہدف بنالیا۔

سیاست دانوں کو عام لوگوں کی طرف سے محبت بھرے' نفرت بھرے اور دھمکی آمیز خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے خطوط اسپیکر کے ذریعے انٹیلی جنس والوں کو بھجوادیے جاتے ہیں۔ انٹیلی جنس خط لکھنے والوں پر نظر رکھتی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے کہ ان میں سے کوئی صحیح معنوں میں خطرناک تو نہیں۔

ایسے خط کامران احمد کو بھی موصول ہوتے تھے۔ کچھ اس لیے بھی کہ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھا۔ ایوان میں اس کی پُرمغز اور مُدلل تقریروں کے سامنے حزب اختلاف والے بھی بے بس نظر آتے تھے۔

سلطانیہ کا ایک شخص مصور حسین باقاعدگی سے کامران احمد کو دھمکی آمیز خط لکھتا تھا۔ اس کے خطوط کی زبان بہت خراب ہوتی تھی اور یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر متوازن نہیں ہے۔

یہ وہ خاص پروجیکٹ تھا جو واجد کو سونپا گیا۔ شاکر نے مصور حسین کو ایک خاص مقصد کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ پروجیکٹ کا انچارج واجد تھا۔

مصور حسین کے خط روکے جانے لگے۔ واجد ان خطوط کو پڑھتا اور فون پر ان کے جواب دیتا۔ یہ گمنام کال وہ آدھی رات کے بعد کرتا' جب نیم پاگل مصور حسین پر نیند کا دباؤ ہوتا۔ ایک تو ایسے میں اس کا ذہن ہر بات قبول کرنے پر آمادہ ہوتا' دوسرے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ہر روز اس کی ذہنی کیفیت مزید ابتر ہوجاتی۔

دن میں مصور حسین اپنی دُکان پر ہوتا' وہ اکیلا آدمی تھا۔ واجد کئی بار اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس کی ڈائریاں پڑھیں۔ یوں وہ اس کے مزاج اور اس کی نفسیات سے اور واقف ہوگیا۔ رات کو فون پر وہ اس کے گھر کے' اس کی ڈائریوں کے حوالے دیتا۔ مصور حسین نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے بلکہ چند فون کالز کے بعد تو اس کے بگڑے ہوئے ذہن نے واجد کی آواز کو اپنے اندر کی آواز تسلیم کرلیا۔ ضمیر کی آواز۔

اس پروجیکٹ کا مقصد مصور حسین کو اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے پر اکسانا تھا جو وہ کامران احمد کو دیتا تھا... یعنی قتل کردینے کی دھمکی۔ واجد فون پر اسے اکساتا رہتا... غیرت دلاتا رہتا۔

پروجیکٹ کامیاب ثابت ہوا۔ کامران احمد سلطانیہ آیا تو مصور حسین نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ بعد میں اس نے اپنے اندر کی آواز اور خدا کی نشانیوں کے متعلق بتایا۔ اس نے بتایا کہ اس نے خدا کے حکم کے مطابق کام کیا ہے۔ یہ خیال کسی کو بھی نہیں آیا کہ مصور حسین کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔

مصور حسین کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو چوک گئی تھی۔ دوسری گولی سے بچنے کے لیے کامران احمد گھوما تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہوگئی۔ کامران مرا تو نہیں لیکن عمر بھر کے لیے معذور ہوگیا اور ذہنی طور پر بھی متاثر ہوا۔ اس کا سیاسی کیریر جو بہت تابناک تھا' اچانک ہی ختم ہوگیا۔

اگلا بڑا کام جو واجد کو سونپا گیا' وہ گلوریا شاکر سے متعلق تھا۔ سنسان سڑک پر اپنی گاڑی سے سائڈ مار کر گلوریا کی گاڑی کو کھائی میں دھکیلنا دشوار ثابت نہیں ہوا پھر اس نے گاڑی کو آگ لگانے کا سامان بھی کیا لیکن یہ غلطی کہ اس نے اسپیئر ٹائر کمپارٹمنٹ چیک نہیں کیا' غلطی ناقابل معافی تھی۔ اس کی پاداش میں اسے مستقل طور پر نظرانداز کردیا گیا۔ اس کے بعد اب اسے محمود شامی کی خدمت کا موقع ملا تھا۔

واجد نے گلوریا شاکر کے معاملے میں ہونٹ سی لیے' اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس کی عقل مندی تھی۔ گلوریا کی موت کا حکم خود شاکر نے جاری کیا تھا۔ گلوریا اس سے جھگڑا کرنے کے بعد تیس لاکھ کی رقم اور چند اہم راز لے بھاگی تھی۔

محمود شامی کو یہ بات معلوم تھی۔ اپنے عہدِ صدارت میں محمود شامی کسی بات سے بے خبر نہیں رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہوا تو تمہیں انعام ملے گا" محمود شامی نے اچانک پوچھا۔

"جانتا ہوں جناب اور سراہتا بھی ہوں" واجد نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ سزا اور انعام محمود شامی کے فلسفۂ سیاست کے اہم ستون ہیں۔

وہ قصر کی حدود میں داخل ہوگئے۔ محمود شامی نے واجد سے اندر آنے کو نہیں کہا۔ انہوں نے مصافحہ کیا پھر واجد اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ سفید کرولا کی باڈی میں بائیں جانب ایک بڑا ڈینٹ تھا جسے واجد نے کبھی ٹھیک کرانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر واجد کو احساس ہوا کہ سابق صدر اسے دیکھ رہا ہے۔ واجد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔

○☆○

فنگر پرنٹس کی مدد سے حمید کی لاش کی شناخت ہوگئی تھی۔ اخبارات نے اس کی موت کو صابر ملک کی موت سے مربوط کرکے خوب افسانہ طرازیاں کی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جان سکا کہ حمید جلترنگ میں کیا کررہا تھا۔ یہ بات تو اس کی بیوی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

لیکن تنویر شاہدہ کو جانتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ شاہدہ جتنی بے خبری ظاہر کررہی ہے' اتنی بے خبر نہیں ہے۔ وہ ایسی ہی عورت تھی کہ شوہر کی موت بھی اس کا شوہر سے رشتۂ وفاداری منقطع نہیں کرسکی تھی۔ وہ ہر قدم پر یہ سوچتی تھی کہ اس موقع پر حمید اس سے کیا توقع کرتا.... اور اسی کے مطابق عمل کرتی تھی۔

تنویر کے لیے شاہدہ کی خاموشی بہت اہم تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جاکر اس سے ملے۔

اگلے روز دوپہر کے بعد وہ حمید کے فلیٹ پہنچا۔ وہ پرانی چار منزلہ بلڈنگ تھی۔ زینے بے حد تنگ اور گندے تھے۔ لگتا تھا' برسوں سے رنگ وروغن بھی نہیں ہوا تھا۔ نیچے ایک فلیٹ میں ایک میاں بیوی بڑے زوروشور سے لڑرہے تھے۔

تنویر نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اسے افسوس ہورہا تھا کہ سزا کاٹنے کے بعد حمید اتنے خراب حالات میں رہ رہا تھا۔ دنیا نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا لیکن دیا کچھ بھی نہیں تھا۔

شاہدہ نے دروازہ کھولا۔ تنویر نے پہلے اسے فون کردیا تھا' اس لیے اس کی آمد اس کے لیے خلاف توقع نہیں تھی۔ اس کے انداز میں تنویر کے لیے اگر دوستی نہیں تھی تو عناد بھی نہیں تھا "اندر آجایئے" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

فلیٹ اندر سے ایسا ہی تھا' جیسی تنویر کو توقع تھی حالانکہ آرائش کے ذریعے اسے گوارا بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔

شاہدہ نے تنویر کو بوسیدہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے باوقار انداز میں دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے "آپ شاید تعزیت کے لیے آئے ہیں۔"

"ہاں شاہدہ" تنویر نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"ایک بات اور بھی ہے میری بہن" تنویر بولا۔

"مجھے یقین تھا کہ کوئی اور بات بھی ہوگی۔"

تنویر نے اس کا کاٹ دار جملہ نظرانداز کردیا "حمید میرے لیے کام کررہا تھا... موت سے پہلے۔"

"ظاہر ہے..."

"لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی موت کا اس کام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ محض ایک حادثہ تھا۔"

شاہدہ نے نفی میں سرہلایا "وہ محض حادثہ نہیں تھا۔ سب کچھ اس لیے ہوا کہ میرا شوہر بے وقوف تھا.... آپ کی طرح۔"

"بہت کچھ ایسا ہے جو تم نہیں جانتیں.... اور میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی' اس لیے کہ مجھے پروا نہیں اس کی۔ میں اسے اہم نہیں سمجھتی۔" اس نے کرسی سے ٹیک لگالی اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی "میں حمید سے محبت کرتی تھی' اب بھی کرتی ہوں" کوئی اور عورت ہوتی تو اتنا کہہ کر رو پڑتی لیکن شاہدہ کو آنسوؤں کا اظہار ناپسند تھا۔

"حمید جو کچھ کررہا تھا' تم اسے غیراہم کیوں سمجھتی ہو شاہدہ؟"

"اس لیے کہ وہ بے معنی ہے۔ آخر میں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلتا۔"

"تم غلطی پر ہو شاہدہ۔ فرق تو پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہوگا..... مگر صرف تم جیسے' حمید جیسے لوگوں کے لیے۔"

تنویر نے بے چینی سے پہلو بدلا "تمہارے نزدیک بنیادی اہمیت کس چیز کی ہے؟"

"افراد کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی۔ اس لیے کہ نظام بدلنے کی ناکام کوشش میں انسان انہیں بھی گنوادیتا ہے۔"

تنویر اٹھ کر کھلی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے اس نے تین منزل نیچے جھانکا۔ "یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں جن کی تم بات کرتی ہو' خوش گوار لیکن احمقانہ خواب ہیں۔ یہ تمہیں تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھنے دیتیں۔ دیکھو.... ہر انسان اچھی.... پُرآسائش زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن وہ لوگ ایسا نہیں ہونے دیتے۔"

"میرا آسائش کا تصور مختلف ہے۔ اور میرے نزدیک" وہ لوگ" آپ ہیں۔"

تنویر نے پلٹ کر اسے دیکھا "میرا خیال ہے' تم اس سلسلے میں کافی سوچتی رہی ہو۔"

"اور کیا کرتی۔ میرا شوہر احمق تھا' احمقوں کی جنت میں رہتا تھا۔ مجھے ایک بات بتایئے۔ آپ ایک مقصد کے تحت کام کررہے تھے۔ آپ اس ملک کی تقدیر بدلنے کی کوشش کررہے تھے۔ حاصل کیا ہوا؟ کچھ بدلا؟ سوائے اس کے کہ حمید دو سال اور آپ چار سال جیل میں گزار آئے۔ آپ نے آئیڈیلزم کے نام پر بڑے شوق سے اپنا استحصال کرایا کہ نہیں؟"

تنویر واپس آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب سا اضمحلال محسوس کررہا تھا۔ شاہدہ کی بات سچی تھی۔ وہ تصور کرسکتا تھا کہ شاہدہ اور حمید کے درمیان ایسی گفتگو اکثر ہوتی ہوگی۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ کیوں آئے ہیں؟" شاہدہ نے اچانک کہا۔

"یقین نہیں آتا" تنویر بولا "ویسے اسے یقین تھا کہ شاہدہ نے

غلط نہیں کہا ہے۔ وہ اس کے وجدان کا پہلے ہی سے قائل تھا۔
"آپ کو اپنے تحفظ کے لیے میری خاموشی کی ضرورت ہے؟"
"بالکل درست۔ اب بتاؤ' مجھے یہ مل سکتی ہے؟"
"یقیناً ملے گی۔"
تنویر نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا "اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو تم زبان بند رکھنے کا وعدہ کیوں کر رہی ہو؟"
"اس لیے کہ حمید زندہ ہوتا تو مجھ سے یہی چاہتا۔ اور میرے لیے اس کی یادیں بہت محترم ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ میں جانتی ہوں' اس کی موت کے تم اتنے ذمے دار نہیں جتنا وہ خود تھا" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی "اور میں جانتی ہی کتنا ہوں۔ یہی کہ تم اور وہ کسی معاملے میں باہم ملوث تھے۔ اس سے آگے میں کچھ کہوں تو وہ محض قیاس آرائی ہوگی۔"
"میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اس بات کا علم ہو کہ میں نے رہائی کے بعد حمید سے رابطہ کیا تھا۔"
"بے فکر رہیے۔ کم از کم مجھ سے انہیں یہ بات معلوم نہیں ہو سکے گی۔"
یہ بھی کمال کی بات تھی کہ تنویر اس کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتا تھا۔ وہ تھی ہی ایسی راست گو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا "شاہدہ بہن' یقین کرو' مجھے بہت دکھ ہوا حمید کی موت سے۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں..."
پہلی بار شاہدہ کی آنکھوں میں نمی چمکی "مجھے یقین ہے آپ کی بات پر۔"
"بس تو اب میں چلتا ہوں۔"
شاہدہ نے بڑی اداسی سے سر کو تفہیمی جنبش دی' جیسے وہ اس کے لفظوں کو اس سے بہتر طور پر سمجھتی ہو۔
تنویر دروازے کے پاس پہنچ کر پلٹا "حمید خوش قسمت تھا کہ اسے تم جیسی بیوی ملی" اس نے کہا "تم دونوں ہی خوش قسمت تھے۔"
"ہر شخص خوش قسمت بھی ہوتا ہے اور بے وقوف بھی۔"
"تمہارا فلسفہ عجیب ہے مگر ممکن ہے درست ہی ہو۔"
شاہدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تنویر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ نچلی منزل کے فلیٹ میں خانگی جنگ نہ صرف جاری تھی بلکہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ نیچے پہنچ کر تنویر نے سکون کی سانس لی۔
لیکن نیچے پہنچنے کے بعد اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ شاہدہ کے پاس واپس چلا جائے اور اس کے پاس مزید کچھ دیر بیٹھے۔ اس کی موجودگی' اس کے فلسفۂ زندگی کی سادگی اور اس پر اس کا یقین اور اس کا ادراک اس کے لیے بے حد سکون بخش تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ کسی کو بھی ایسے لوگوں کی کمپنی اچھی نہیں لگتی جو اس سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہوں لیکن تنویر کو شاہدہ کے پاس بیٹھ کر وہ طمانیت حاصل ہوئی تھی' جو ایک بچے کو ماں کی قربت سے ملتی ہے۔
اس نے اس خواہش کو ذہن سے جھٹکا' سڑک پار کی اور ریکو کی طرف چل دیا۔ یہ وہ ریسٹورنٹ تھا' جہاں جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ حمید سے پہلی بار ملا تھا۔
ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھانے والوں کا رش تھا۔ تنویر کو بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے لیے چائے منگوائی۔ برابر والی میز پر ایک موٹا آدمی اپنے ساتھی کو ایک کانٹریکٹ کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر اس کی زندگی اور موت کا انحصار تھا۔ موٹے شخص کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی للکارے مار رہی تھی۔
تنویر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے شاہدہ سے اپنی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ شاہدہ کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس نہ کرے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شاہدہ کے انداز... سے اس کے لیے اتنی ہی ہمدردی ظاہر ہو رہی تھی۔
ریسٹورنٹ میں چھوٹا رنگین ٹی وی چل رہا تھا۔ پروگرام روکا گیا اور ایک اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ملک کی مقبول ترین سیاسی پارٹی 'پبلک لیگ' کے سلیم پور کے کارکنوں نے وزارتِ عظمیٰ کے لیے شاہد انور کا انتخاب کیا ہے۔
صدر محمود شامی نے صدارت سے استعفیٰ دیتے ہوئے جو آرڈیننس جاری کیے تھے' انہیں اگلی قومی اسمبلی نے باقاعدہ آئینی ترمیم کی شکل میں منظور کر لیا تھا۔ اس ترمیم کے تحت یہ پہلا انتخاب ہونے والا تھا... اور یہ اس کا ابتدائی مرحلہ چل رہا تھا۔ ملک کے ہر اہم شہر سے پبلک لیگ کے کارکنوں کا فیصلہ سامنے آنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا کہ اگر پبلک لیگ الیکشن کے بعد حکومت بنانے کی پوزیشن میں آئی تو وزیرِ اعظم کون ہوگا؟

○☆○

جس وقت تنویر ریکو ریسٹورنٹ میں چائے پی رہا تھا' چھدرے بالوں والا ایک شخص شاہدہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اڑتے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس کی پیشانی بہت کشادہ لگ رہی تھی۔ اس شخص کا نام حارث تھا۔
حارث کی عمر اگرچہ چالیس سے تجاوز کر چکی تھی' اس کا پیٹ بھی قدرے باہر نکل آیا تھا لیکن چہرے سے وہ تیس سے زائد ہرگز نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ملائمت اور معصومیت تھی۔
اس نے دروازے پر دستک دی۔
شاہدہ نے دروازہ کھولا۔ حارث مسکرایا "آپ بیگم حمید ہیں؟"
شاہدہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"میرا نام حارث ہے۔ میرا تعلق محکمۂ خفیہ سے ہے" حارث نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا "آپ کے شوہر کی موت کا افسوس ہوا۔"

"تم حمید کو جانتے تھے؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ اندر آنے کو نہیں کہیں گی؟"

"ضرور۔ تشریف لائیے" شاہدہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا لیکن اس کے انداز میں واضح ہچکچاہٹ تھی۔

حارث اندر داخل ہوا۔ اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ مچلی اور وہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اس میں نسوانیت اور دل کشی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو ایک پل میں بدل کر رکھ دیتی تھی۔

شاہدہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر اس نے انکار کر دیا "میں نے آپ کو کھانا کھاتے میں ڈسٹرب کیا ہے؟"

"نہیں۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ برتن سمیٹنے والی تھی کہ تم آ گئے" شاہدہ نے مروتاً جھوٹ بولا پھر وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔ واپس آئی تو حارث اسی طرح ایک کرسی کے پیچھے کھڑا تھا.... کرسی کی پشت گاہ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے۔

شاہدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں آپ سے آپ کے مرحوم شوہر کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں" حارث نے کہا۔

"کیوں؟"

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ جلترنگ میں کیا کر رہے تھے؟"

"لیکن کس لیے؟"

حارث ہنسنے لگا "لگتا ہے' جواب مجھے ہی دینا پڑیں گے۔ آپ کو شاید سوال کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"حارث صاحب' جواب میرے پاس ہے ہی نہیں" شاہدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ حمید صاحب آپ کو یہ بتائے بغیر کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں' جلترنگ چلے گئے تھے؟"

شاہدہ نے سر کو تشفی جنبش دی۔ یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ حمید اسے کبھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ معلومات ان دونوں کے لیے ہی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں لیکن اب اسے خویر الزماں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ حمید تو ہر فکر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

"جیل سے رہا ہونے کے بعد آپ کے شوہر کیا کرتے رہے؟"

"دو کرائے سینٹر تھے' جہاں وہ لڑکوں کو مارشل آرٹس کی تربیت دیتے تھے۔"

"لیکن ایک ماہ پہلے انہوں نے دونوں ملازمتیں چھوڑ دی تھیں۔ تو کیا وہ ملازمت کی تلاش میں تھے؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے جاب چھوڑ دی تھی۔ ویسے بھی شعبۂ مال ان کا تھا۔ میں کبھی دخل نہیں دیتی تھی اس میں۔"

"اوہ۔ اچھا' ایک ہفتے کے لیے جلترنگ جانے سے پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر غائب ہوئے تھے؟"

"وہ وقتاً فوقتاً چلے جاتے تھے۔ یہ ان کا اسٹائل تھا۔ اور انہیں آخری بار گئے ایک ہفتہ نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ تین چار دن ہوئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔"

"کتنے دن؟"

"تین دن۔"

"ٹھیک۔ اور انہوں نے کرشن گڑھ تک فضائی سفر کیا تھا؟"

"اچھا۔ مجھے تو معلوم نہیں۔"

"حیرت ہے۔ آپ کو نہیں معلوم۔"

"میں سو کر اٹھی تو وہ جا چکے تھے۔ ان کا رقعہ موجود تھا۔"

"رقعے میں کیا لکھا تھا؟"

"یہی کہ وہ جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ کے شوہر بہت زیادہ رازداری کے قائل تھے۔"

"اس کے لیے آپ انہیں الزام نہیں دے سکتے۔ جانتے ہیں' اخبار والوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ مصیبت آئی تو بڑے لوگوں نے جو اُن سے کام لیتے تھے' سب کچھ ان پر ڈال دیا۔ انہیں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں۔ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا...."

"دھوکا!"

"ہاں۔ وہ یہی محسوس کرتے تھے۔"

حارث سوچ میں پڑ گیا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ عورت کچھ نہیں جانتی لیکن اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ وہ یقین نہیں کر سکتا تھا "آپ کے شوہر کس حد تک تلخ تھے؟"

"تلخ؟ میں نہیں سمجھتی کہ ایسا تھا۔ وہ ہر معاملے کو ایک خاص نکتۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا اپنا ایک فلسفہ تھا جینے کا۔"

"یہ انسان کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔"

"کبھی ایک بڑی رکاوٹ بھی ثابت ہوتا ہے" شاہدہ نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں' اس کا انحصار خود آدمی پر ہے" حارث نے پہلو بدلا "آپ جانتی ہیں ناکہ میں کیوں یہ سب کچھ پوچھ رہا ہوں؟ سابقہ حکومت کے عہد میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کی اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ آپ کے شوہر کے ان لوگوں سے تعلقات بھی رہے تھے۔"

"ہاں.... مگر برسوں پہلے۔ بعد میں تو کسی نے انہیں کبھی پوچھا بھی نہیں کہ کس حال میں ہو۔"

"آپ جانتی ہیں ناکہ میں کن لوگوں کی بات کر رہا ہوں؟"

"جی ہاں' وہ جو گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث تھے۔"
"ان میں سے چار افراد حال ہی میں مر چکے ہیں۔"
"آپ کے خیال میں یہ اتفاق نہیں ہے؟"
"سچ یہ ہے کہ میں نہیں جانتا۔ میرا خیال تھا' آپ سے کچھ معلومات حاصل ہوں گی تو کوئی رائے قائم کی جاسکے گی۔"
"مجھے افسوس ہے کہ میری بے خبری کی وجہ سے آپ اندھیرے میں رہ گئے۔"
"روشنی تو ہو ہی جائے گی بیگم حمید۔"
"یہ ہے رجائی نکتۂ نظر۔"
"آپ کو کوئی اہم بات یاد آئے تو مجھے اس نمبر پر رنگ کر لیجیے گا" حارث نے اس کی طرف کارڈ بڑھایا "تب میری رجائیت بے جواز نہیں رہے گی۔"
شاہدہ نے کارڈ کو ایک نظر دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ وہ حارث کے ساتھ دروازے تک گئی۔
"آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ" حارث کا چہرہ پھر مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا۔
اسے رخصت کر کے شاہدہ کھڑکی کی طرف چلی آئی۔ اس نے حارث کو چھوٹی سبز کار میں بیٹھتے دیکھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا کچھ پڑھتا رہا پھر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی' اگرچہ اس نے نظر اٹھا کر کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن شاہدہ کو احساس تھا کہ وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔
اس نے سوچا کہ تنویر کو فون کر کے حارث کی آمد کے بارے میں بتا دے مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ یہ غیر ضروری ہے۔ حمید مر چکا ہے لہٰذا اس کھیل سے اب اس کا اور حمید کا کوئی تعلق نہیں۔
اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ سکندر آباد کے انتخابی نتائج کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس نے ٹی وی آف کر دیا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

○☆○

سکندر آباد میں وہ جیت چکا تھا۔ مستقبل کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس کی نامزدگی اب تقریباً یقینی تھی۔ اسے اب صرف ایک شہر کی تائید درکار تھی جبکہ فیصلہ سنانے والے چار شہر ابھی باقی تھے۔
وہ حیات ریجنسی ہوٹل کے آرام دہ سوئٹ میں بیٹھا ان اخباری نمائندوں کو فاتحانہ مسکراہٹ سے نواز رہا تھا جنہیں خصوصی طور پر سوئٹ میں داخلے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کی بیوی زرینہ اس کے برابر بیٹھی تھی۔ اس کی ۱۶ سالہ بیٹی عائشہ اور ۱۴ سالہ بیٹا وہاب بھی کمرے میں موجود تھے۔ وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی پر سکندر آباد کے انتخابی نتائج کا تفصیلی اعلان کیا جا رہا تھا۔ وہ سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔
شاہد انور کو ڈر تھا کہ بچے جوشِ جذبات میں کوئی نعرہ فتح بلند نہ کر دیں۔ عوام کو ایسی کم علمی اچھی نہیں لگتی۔ شاہد کو اپنے پبلک امیج کی بڑی فکر رہتی تھی۔
زرینہ انور وزارت عظمیٰ کے امیدوار کی آئیڈیل بیوی تھی۔ وہ ذہین' خوش لباس' خوش اطوار اور حد درجہ باوقار عورت تھی۔ اس نے خود کو پبلک کی توقعات کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ وہ جیسی نظر آنے کی بھرپور کوشش کرتی تھی' درحقیقت ویسی ہی تھی۔ نیوز میڈیا نے بہت پہلے یہ بات محسوس کر لی تھی چنانچہ وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔
"آپ کا اگلا معرکہ سراب پور میں ہوگا؟" ایک اخباری نمائندے نے شاہد انور سے پوچھا۔
شاہد انور کی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی "جی ہاں۔ ہماری اگلی منزل سراب پور ہے" اس نے جواب دیا۔ سب جانتے تھے کہ عین ممکن ہے کہ سراب پور ہی میں اس کی نامزدگی پکی ہو جائے۔
شاہد انور سولہ سال سے عملی سیاست میں تھا لیکن عملی سیاست بھی اس کے چہرے کی معصومیت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ اس کے بال گرنے لگے تھے اور کنپٹیوں پر چاندی جھلکنے لگی تھی لیکن چہرے سے وہ اب بھی نوعمر لڑکا لگتا تھا اور اس کا جوش اور ولولہ بھی نوجوانوں کا سا تھا' اسی لیے اس کے ووٹرز اسے شدت سے چاہتے تھے۔
اپنی بیوی زرینہ کے برعکس شاہد کی شخصیت اس کے پبلک امیج سے بالکل مختلف تھی۔ درحقیقت اب وہ اتنا پُرجوش نہیں تھا' جتنا ظاہر کرتا تھا۔ وہ بہت سوچ کر قدم اٹھاتا تھا۔ دماغ ٹھنڈا رکھ کے خوب حساب کتاب لگا کے کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سیاست میں بقا اسی صورت میں ممکن ہے۔
عملی سیاست میں اس کی کارکردگی کا ریکارڈ بے حد شاندار تھا۔ اس نے بڑے کڑے وقت میں بنیادی حقوق کے لیے آواز بلند کی تھی۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی سہی تھیں لیکن اپنے اس کردار کی وجہ سے پارٹی میں اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ وہ اسمبلی کی کئی کمیٹیوں کا ممبر رہا۔ اس کی دیانت داری کو ہر مقام پر سراہا گیا۔ قانون سازی میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ اس نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ کئی قانونی بل نہ صرف پیش کیے بلکہ ان کے لیے مؤثر لابی اِنگ بھی کی۔ وہ اپوزیشن میں بھی رہا اور حزب اقتدار میں بھی مگر مخالف گروپ میں بھی ہمیشہ اس کی عزت رہی۔ وہ سابق صدر محمود شامی کے حامیوں میں سے تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ محمود شامی کی حمایت اس کا سیاسی مستقبل تاریک کر دے گی تو وہ محمود شامی کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔
کمرے میں فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے مسلسل بج رہی تھی۔ شاہد انور کی انتخابی مہم کا انچارج نوید مبارک باد کی کالیں وصول کر رہا تھا۔ وہ بھی بہت خوش تھا کیونکہ شاہد کی کامیابی اس کی کامیابی تھی۔

نوید ریسیور کریڈل پر رکھ کر شاہد کی طرف آیا "اب کچھ دیر فون آپ ریسیو کرلیں۔ میں تھک گیا ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ضرور، کیوں نہیں" شاہد بھی مسکرادیا۔ وہ اٹھ کر فون کے پاس رکھی آرام کرسی پر آبیٹھا، فوراً ہی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "یس۔۔ شاہد انور اسپیکنگ۔۔۔"

وہ بڑی خوش اخلاقی سے، پُروقار انداز میں کالز ریسیو کرتا رہا۔ فاتح خوش مزاج ہو ہی جاتے ہیں۔ اخلاق اور مزاج کی آزمائش تو شکست کے لمحوں میں ہی ہوتی ہے۔

○☆○

حیات ریجنسی سے کچھ فاصلے پر رائل ہوٹل تھا۔ رائل ہوٹل کے سوئٹ میں وزارت عظمیٰ کے دوسرے حریف عمر نصیر کا کیمپ تھا۔ وہاں کی فضا بجھی بجھی سی تھی۔ عمر نصیر کے ساتھی شکست کی حقیقت قبول کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

اس کمرے میں انتخابی نتائج سے سب سے زیادہ بے فکر اگر کوئی تھا تو وہ خود عمر نصیر تھا۔ وہ دبلا پتلا طویل القامت آدمی تھا۔ اس کی شخصیت بے حد پُروقار تھی۔ اور وہ وقار اس نے لبادے کی طرح اوڑھا ہوا نہیں تھا۔ اس پُروقار شخص کے بہت اندر کہیں گہرائی میں ایک توانا خواہش شعلے کی طرح روشن تھی جس کی تکمیل کے لیے اس نے گزشتہ بیس برس میں اپنی ہر خواہش ترک کردی تھی لیکن اب لگتا تھا کہ وہ اپنی منزل کھوچکا ہے۔ اگر اس کا وقار محض ایک خول ہوتا تو اب تک چٹخ گیا ہوتا کیونکہ اب ایسا لگتا تھا کہ اس کا حریف شاہد انور انتخابی جنگ جیت چکا ہے۔

یہ اس کی شخصیت اور اس کے خلوص کا کمال ہی تھا کہ اس وقت بھی اس کا کمرا اس کے پرستاروں سے ۔۔۔ اس کے مخلص کارکنوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خود کھڑکی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائٹنگ پیڈ تھا جس پر وہ کچھ لکھ رہا تھا۔

اس نے پیڈ کا اوپری صفحہ پھاڑ کر علیحدہ کیا، پین بند کرکے اپنی جیب میں رکھا اور اپنے ایک کارکن کو اشارے سے بلایا "منور۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹیلی گرام شاہد انور کو جلد از جلد بھجوادو۔"

منور نے کاغذ ہاتھ میں لیا اور ٹیلی گرام کا مضمون پڑھا۔

ڈیئر شاہد انور،

اس چوٹی کی طرف ایک اور کامیاب قدم بڑھانے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کرو جسے سر کرنے کی میں بھی کوشش کررہا ہوں لیکن دوست، چوٹی بہرحال ابھی سر نہیں ہوئی ہے۔

تمہارا دوست عمر نصیر۔

"یہ تمہارا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے منور؟" عمر نے خوش دلی سے کہا "تمہیں میری بات یاد نہیں یا اس پر یقین نہیں ہے؟"

کمرے میں موجود لوگ ان کی طرف چلے آئے "کون سی بات جناب؟" منور نے پوچھا۔

"میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ اس ملک میں جاگیردار بھی حکومت کرچکے اور صنعت کار بھی لیکن ملک کی تقدیر متوسط طبقے کا کوئی فرد ہی بدلے گا، جو خود بھی پریشان اور بدحال اکثریت میں سے ہوگا۔"

"ہمیں یاد ہے جناب" کئی آوازیں ابھریں۔

عمر نصیر کو یاد تھا، اس نے یہ بات ایک اخباری نمائندے سے بھی کہی تھی۔ جواباً صحافی نے طنزاً کہا تھا "ملک کی تقدیر تو شاید نہ بدل سکے لیکن وہ شخص اپنی پشتوں تک کی تقدیر ضرور بدل دے گا۔" اس پر عمر نے کہا تھا "جب ملک کے عوام اتنے باشعور ہوجائیں گے کہ اپنے لیے نمائندے دولت مند اقلیت کے بجائے غریب اکثریت میں سے منتخب کریں تو یقین کرو، اس وقت تک انہیں سچے اور مخلص سیاست دانوں کی شناخت بھی ہوچکی ہوگی۔" صحافی حیران ہوگیا۔ اس کی حیرت بھی بجا تھی لیکن یہ عمر نصیر کا وقار تھا، جس نے اس سے صحافی کی توقع کے برعکس جواب دلوایا تھا۔ ورنہ فطری جواب تو یہ تھا کہ مجھے اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کی تقدیر بدلنی ہوتی تو ان بیس برسوں میں کئی بار بدل سکتا تھا۔ وہ صحافی جو اس کے مخالفین میں سے تھا، اس لمحے سے اس کا حامی بن گیا تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے کہا تھا "عمر صاحب، یہاں اقلیت بہت طاقت ور اور بااختیار ہے۔ وہ اتنی بڑی تبدیلی کبھی نہیں آنے دے گی۔" اس پر عمر نے کہا تھا "جب تبدیلی آنی ہوگی تو اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اور میں اس خود غرضانہ خواہش پر شرم سار ہرگز نہیں ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اعزاز سے مجھے سرفراز فرمائے۔"

اب اس کی وہ خود غرضانہ خواہش یاس میں ڈھلنے والی تھی مگر وہ اداس نہیں تھا۔

"سنو دوستو، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" اس نے اپنے کارکنوں سے کہا "میں اب بھی پُراعتماد ہوں تو اس کا بھی کوئی سبب ہوگا۔"

منور فون کی طرف چلا گیا۔ اتنی دیر میں کئی اخباری نمائندے اندر آگئے۔ ایک نمائندے نے عمر سے پوچھا "آپ نے اپنے حریف سے رابطہ کیا؟"

"میرا مبارک باد کا تار چند گھنٹوں میں شاہد تک پہنچ جائے گا" عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب آپ کے خیال میں صورت حال کیا ہے؟" ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔

"کیسی صورت حال؟ کون سی صورت حال؟"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ ایک اور اخبار نویس نے سنجیدگی سے کہا "عمر صاحب، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا کانٹے کھا گیا ہے؟"

وہ وہی اخبار نویس تھا جو کبھی اس کا مخالف تھا اور اب اس کا

گرویدہ تھا۔ عمر نے کہا "نہیں رئیس! ایک تو یہ کہ ابھی ہمارے پاس آخری جنگ کی گنجائش ہے' دوسرے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب تبدیلی آنی ہوگی تو آکر رہے گی اور ضروری نہیں کہ اس تبدیلی کا ہیرو میں ہی ہوں۔"

"اب سہراب پور میں آپ کے امکانات کیسے ہیں؟"

عمر پُراعتماد انداز میں مسکرایا "بے حد روشن۔"

"آپ اپنی حکمتِ عملی میں.... اپنی اپروچ میں کوئی تبدیلی کریں گے؟"

"نہیں۔ میں تو بیس سال سے ایک ہی راستے پر چل رہا ہوں' اسے ترک تو نہیں کر سکتا۔"

سوالوں کا سلسلہ دس منٹ تک جاری رہا۔ عمر نصیر خوش مزاجی سے' کھلے دل سے' اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں جواب دیتا رہا۔ صحافی اس کے اعتماد اور ٹھہراؤ سے بہت متاثر تھے۔ وہ اس سے متفق ہو رہے تھے کہ انتخابی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ... جاری ہے۔

○☆○

نیاز' تنویر کے گھر کے قریب والے پارک میں تنویر سے ملا۔ وہ اپنے مخصوص پُراعتماد انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پارک میں کچھ بچے درختوں کے گرد کھیل رہے تھے۔ کچھ جھولوں سے لٹک رہے تھے' پھسلنیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ کچھ بچے اینٹوں کی ایک نیچی دیوار کے ایک طرف مارم پٹی کھیل رہے تھے۔ ان میں سرخ قمیص پہنے ایک بہت تیز لڑکا بہت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو بڑی مہارت سے ہر بار بچاتا تھا اور گیند دیوار سے ٹکرا کر مارنے والے لڑکے کے پاس واپس چلی جاتی تھی۔ وہ ٹینس کی ایک پرانی اور دبی ہوئی گیند تھی۔ دیوار سے ٹکراتی تھی تو بہت زور کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

نیاز لمبی جیکٹ اور سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا' آنکھوں پر ایسا دھوپ کا چشمہ تھا جس کے شیشے دھوپ میں مختلف زاویے سے مختلف رنگ منعکس کرتے ہیں۔ اس نے صبح تنویر کے گھر فون کیا تھا اور فوزیہ کو اپنا وہ فرضی نام بتایا تھا جس سے تنویر بھی واقف تھا۔

نیاز نے اونچے درختوں کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور بولا "سلطانیہ میں کوئی میرے متعلق پوچھ گچھ کرتا پھر رہا ہے۔"

ٹینس کی گیند دیوار سے ٹکرائی۔ گیند سے بچنے والا لڑکا ہنسا۔ اس کی ہنسی میں سو بیتیت تھی۔

"کس طرح؟" تنویر نے پوچھا۔

"میرے دوستوں سے' ملنے والوں سے اور میرے سالے سے۔"

"کس حیثیت سے؟"

"یہی تو بات ہے۔ وہ صرف ایک شناخت رکھتا ہے.... کرنسی نوٹ۔"

گیند پھر دیوار سے ٹکرائی.... ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔

"کچھ معلومات حاصل ہوئیں اسے؟" تنویر نے پوچھا۔

نیاز نے چشمہ اُتارا اور مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا "کوئی کچھ جانتا ہی نہیں تو اسے کیا بتائے گا۔"

ہوا کا جھونکا آیا۔ درختوں کے پتے شور مچانے لگے۔ وہ دونوں سائڈ میں بنی لکڑی کی ایک بینچ کی طرف بڑھ گئے۔ بینچ پشت گاہ سے محروم تھی لہٰذا وہ دونوں آگے کی طرف جھک کر بیٹھ گئے "اس شخص کا حلیہ معلوم کیا تم نے؟" تنویر نے پوچھا۔

"عام سا حلیہ بتایا گیا ہے۔ بھاری جسم' سیاہ بال' براؤن آنکھیں' شستہ لہجہ" اتنا کہہ کر نیاز مسکرایا جیسے کوئی لطیفہ سنایا ہو "تم تو جانتے ہی ہو باس کہ حلیے کس حد تک درستی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔"

تنویر یہ بات خوب سمجھتا تھا' اس نے دیکھا تھا کہ دو اشخاص ایک ہی شخص کا حلیہ بیان کریں تو وہ شاذ و نادر ہی ایک جیسا ہوتا ہے۔ تاہم موہوم سا حلیہ بھی بعض اوقات نمایاں جسمانی خصوصیات کو سامنے لاتا ہے۔ اس شخص کے چہرے پر کوئی ایسی نشانی نہیں ہوگی جو دیکھنے والے کو یاد رہتی۔ وہ عام سا آدمی تھا.... یعنی کوئی بھی ہو سکتا تھا۔

گیند اس بار گوئی کی سی رفتار سے دیوار پر لگی۔ اس بار لڑکا بال بال بچا تھا۔ اس کی ہنسی نہیں سنائی دی۔ شاید گیند کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔ اب وہ دوسرے لڑکے کے رویہ تھا جو گیند دوبارہ مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا۔

"ہوگا پروگرام متوقع نہ کریں باس" نیاز نے کہا۔

تنویر نیچے زمین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا "ہم بہت محتاط رہے ہیں۔ ہم نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔"

"ممکن ہے اس شخص کو ثبوت کی تلاش ہی نہ ہو" نیاز بولا۔

"وہ جو کوئی بھی ہے اور جس کسی کی بھی نمائندگی کر رہا ہے' اس کے لیے یقین حاصل کرنا تو بہرحال ضروری ہوگا اور اس میں وقت لگے گا۔ اس دوران ہم آگے بڑھ چکے ہوں گے۔"

نیاز نے سر کو تحسینی جنبش دی اور بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چشمہ دوبارہ لگا لیا "آج کی ملاقات طے شدہ وقت پر ہوگی؟"

"ہاں" تنویر بھی اٹھ کھڑا ہوا "بہرحال کوئی خاص بات ہو تو مجھے ضرور مطلع کر دینا۔ اب ہمیں اور زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔"

"یہ شخص شاید پہلے سے ہی...."

"ہاں" تنویر نے اس کی بات کاٹ دی "صابر ملک کی لاش مختلف مقام پر پائی جانے کا ذمے دار یہی شخص ہوگا۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ صابر کو موت کی طرف دھکیلا گیا تھا یا اس کی موت قدرتی تھی۔ میرا خیال ہے' اس شخص نے صابر کی لاش کو چارے

کے طور پر استعمال کیا تھا۔"

"تمہارے خیال میں حمید کو بھی اسی نے قتل کیا ہے؟" نیاز نے نامعلوم شخص کو گالی دیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے' حمید نے جلد بازی میں یہ بات نظرانداز کردی تھی کہ سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ ہے۔ شاید وہ اس وقت صابر کا پیچھا کررہا ہوگا۔ ممکن ہے' صابر نے اسے دیکھ لیا ہو اور اسے جھٹکنے کی کوشش کررہا ہو۔ بہرکیف حمید اپنی بے پروائی کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

نیاز کا منہ بن گیا تاہم اس نے سر کو اثباتی جنبش دی' جیسے تنویر سے متفق ہو۔

"اور ایک بات سن لو نیاز۔ تم میرے پابند نہیں ہو۔ جس وقت جی چاہے' پیچھے ہٹ سکتے ہو۔ یہ بات میں نے ابتدا میں ہی واضح کردی تھی۔"

"جیتے جی تو یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں" نیاز نے کہا "اگر تم نے اس کام کا بیڑہ نہ اٹھایا ہوتا تو میں خود یہ کام کرتا... اپنے طور پر یا حمید سے مل کر۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمہاری رہائی کا منتظر تھا۔"

تنویر مسکرادیا۔ اس نے نیاز سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "محتاط رہنا۔"

"تم بھی۔ تم بہت اہم ہو۔"

تنویر اسے پارک کے گیٹ کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ نیاز کو چلتے دیکھ کر اسے ہمیشہ اس بلی کا خیال آتا تھا جو دبے قدموں چوہے کے پیچھے بڑھ رہی ہو۔

تنویر دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ نیاز نے اسے جو کچھ بتایا تھا' وہ اس پر غور کررہا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ کوئی نہ صرف اسے تلاش کرنے کی غرض سے بلکہ اس کو ترتیب وار انتقام سے روکنے کے لیے اس کا پیچھا کررہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے' قانون سے پہلے اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں قتل کا بوجھ کم کرنے کے لیے وہ قانون کے سامنے وہ معلومات نہ اُگل دے جو پچھلی بار اس نے اپنے سینے میں دفن رکھی تھیں۔ گیٹ وے کے دوسرے شرکا کو اس کی یقینی خاموشی درکار تھی۔

تنویر سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا یہ ان جانا حریف اس جیسا ہی تجربہ کار ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے لیے میدان تنگ ہونے والا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اس کے خلاف کچھ ثابت کیا جاسکے گا۔

تنویر کو ایک عجیب سی آواز اور پھر تکلیف بھری چیخ سنائی دی' اس نے سر گھما کر دیکھا۔ سرخ قمیص والا لڑکا دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے' جھکا ہوا تھا۔ ٹینس کی گیند اس کی پسلیوں اور پیٹ کے مقام اتصال پر لگی تھی۔ اب وہ لڑکا ہنس رہا تھا جو گیند مار تا رہا تھا۔

تنویر اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

○☆○

یہ اسی دن کی بات ہے۔ واجد کی سفید کرولا آدم پور جانے والی نیم پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے واجد دل ہی دل میں اپنی کھٹارا گاڑی کو کوس رہا تھا۔ کار گہری ڈھلان میں اُتری پھر اُبھری تو اسے درختوں کا جھنڈ اور وہاں کھڑی ہوئی خاصی بڑی تعداد میں کاریں نظر آئیں۔

اس نے اپنی کار جھنڈ کے قریب ایک کار کے ساتھ لگادی۔ باہر آکر اس نے دروازہ مقفل کردیا۔

سامنے ایک پگڈنڈی تھی جس پر بہت سارے لوگ جاتے نظر آئے۔ وہ سب میلے میں جارہے تھے۔ واجد بھی اس پگڈنڈی پر چل دیا۔

آدم پور کا میلہ بہت مشہور تھا۔ میلے کی جان کُتّوں کی فائٹ تھی جس میں لاکھوں کی شرطیں لگتیں اور لوگوں کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ میلے میں آنے والے زیادہ تر لوگوں کے لیے کُتّوں کی فائٹ ہی وجہِ کشش تھی۔

واجد کو نہ میلوں ٹھیلوں سے کوئی دلچسپی تھی' نہ کُتّوں کی فائٹ سے۔ وہ تو ایک شخص کی تلاش میں آیا تھا۔ پیر بخش کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ملک میں موجود ہو... کہیں بھی ہو' آدم پور کا میلہ کبھی مس نہیں کرتا۔

پگڈنڈی کے اختتام پر ایک بہت بڑا میدان تھا۔ میلہ اپنے شباب پر تھا۔ طرح طرح کے کھیل تماشے ہورہے تھے۔ ایک طرف ناچ گانا ہورہا تھا۔ شوقین لوگ بڑھکیں مارتے اور پیسے لُٹاتے۔ مختلف اسٹال بھی لگائے گئے تھے۔ وہاں عورتیں بھی بڑی تعداد میں تھیں۔

لیکن واجد کو جس مقام میں دلچسپی تھی' وہاں عورتیں نہیں تھیں۔ سب سے زیادہ ہجوم وہیں تھا۔ سیکڑوں افراد ایک بہت بڑا دائرہ بنائے کھڑے تھے۔

واجد نے پہلے پورے میلے کا چکر لگایا۔ پیر بخش اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ کُتّوں کی فائٹ کے رنگ کی طرف چل دیا۔

خاصے بڑے دائرے میں ایک بڑا مربع قطعۂ زمین تھا جو لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس قطعے میں دو کناروں پر دو بورڈ تھے۔ درمیانی جگہ پر میلی کچیلی خون کے دھبّوں بھری کینوس کی شیٹ بچھی تھی۔ وہ درحقیقت کُتّوں کا رنگ تھا۔

کھیل شروع ہونے والا تھا۔ شور و غل اور تحرک' دونوں میں نمایاں کمی ہوگئی تھی۔ دبی دبی آوازوں میں بڑی بڑی شرطیں لگائی جارہی تھیں۔

دونوں بورڈز پر دو کُتّے اور ان کے ہینڈلرز موجود تھے۔ کُتّے ایک خاص نسل کے تھے جنہیں پٹ بل کہا جاتا ہے۔ وہ متوسط جسامت کے چھوٹے بالوں والے کتے تھے' جن کا سینہ بہت کشادہ' جسم کا پچھلا حصہ بہت پتلا اور جبڑے بے حد طاقتور تھے۔ وہ خاص

لڑا کا کتے تھے۔

جو کتا واجد سے نزدیک تر تھا' اس کا نام شیر دل تھا۔ اس کے کان ندارد تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی پچھلی لڑائی میں کسی حریف نے اسی بُری طرح چبائے ہوں گے کہ ان کی محض علامات ہی رہ گئی تھیں۔ اس کا مالک دُبلا پتلا' نرم آنکھوں والا اس علاقے کا رئیس علی باقر تھا۔ شیر دل کو تربیت اس نے خود دی تھی۔ وہ شیر دل کو گردن سے پکڑے ہوئے تھا۔ شیر دل اپنے حریف پر ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

دوسرا کتا سیاہ و سفید پٹ بل تھا۔ اس کا نام بے جگر تھا۔ اس کا مالک اور ہینڈلر نور پور کا زمین دار رحمت علی تھا۔

دونوں کتے بہترین تربیت یافتہ تھے۔ دونوں اب تک کوئی لڑائی نہیں ہارے تھے۔ اس فائٹ پر لاکھوں کی شرطیں ہی نہیں' علاقوں کی ساکھ اور مالکوں کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

فائٹ شروع ہونے والی تھی۔ لوگ دم سادھ کر بیٹھ گئے تھے۔ واجد ادھر اُدھر دیکھتا رہا مگر پیر بخش اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں کتوں کو چھوڑ دیا گیا.... رنگ کے عین وسط میں وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے' اٹھے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کے جسم میں دانت گاڑ دیے۔ وہ نہ غرائے تھے' نہ انہوں نے کھسیں نکالی تھیں۔ اس لیے کہ وہ عام کتے نہیں تھے۔

بے جگر کی گردن پر شیر دل کی گرفت مضبوط ہوئی تو تماشائی پُرجوش ہو گئے۔ دونوں زور آزمائی کر رہے تھے۔ بے جگر نے سنبھل کر مضبوطی سے زمین پر پاؤں جمائے اور شیر دل کی پشت میں دانت گاڑنے کی کوشش کی۔ اب دونوں دائرے کی شکل میں گھوم رہے تھے اور مناسب موقعے کی تلاش میں تھے۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی غراہٹیں نکل رہی تھیں' دُمیں گردش کر رہی تھیں۔

شیر دل نے یکبارگی بے جگر کی گردن کو جھٹکا ڈالا۔ خون کے قطرے اچھلے اور تماشائیوں کے درمیان گرے مگر دونوں کتے ایک دوسرے کے جبڑے کی گرفت سے آزاد بھی ہو گئے۔ بے جگر موقع ملتے ہی شیر دل پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کی اگلی ٹانگوں کے درمیان واقع سینے کا ابھرا ہوا حصہ گرفت میں لے رہا تھا۔

"اب کے کام لگ گیا تمہارا" رحمت خوشی سے چلایا "اب بچہ لے آؤ اپنے کتے کو دفن کرنے کے لیے۔"

"تم اپنے لاڈلے کی فکر کرو" علی باقر بولا لیکن وہ فکر مند نظر آ رہا تھا۔

شیر دل کے حلق سے رونے کی سی آواز نکلی۔ اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا۔ اس کے سامنے والے حصے میں خاصا بڑا سرخ خلا نمودار ہو گیا۔ جہاں پہلے سینہ اُبھرا ہوا تھا' اب وہاں غار سا پیدا ہو گیا تھا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں مالک اپنے اپنے کتے کو پکڑ کر بورڈ پر لے گئے۔

علی باقر شیر دل کے کان سے ہونٹ لگائے یوں سرگوشیاں کر رہا تھا جیسے کتا سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے تھامے اس پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے کارنر کی بھی یہی صورت حال تھی۔ ریفری نے اشارہ کیا تو دونوں کتوں کو آزاد کر دیا گیا۔

دونوں کتے ایک بار پھر پوری قوت سے ٹکرائے۔ ابھی تک دونوں کے اندر فائٹ کا جذبہ برائے نام بھی کم نہیں ہوا تھا۔ واجد کے پیچھے کھڑا ایک شخص چیخ چیخ کر جانے کیا کہے جا رہا تھا۔ لوگ نروس ہو رہے تھے۔

ہڈیوں سے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز بے حد اعصاب شکن تھی!

اس بار شیر دل زیادہ کامیاب نظر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ بے جگر کا لولہان سر اس کے جبڑے کی گرفت میں تھا۔ بے جگر اوپر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

لیکن کتے کے لیے جو بدترین زخم ہوتا ہے یعنی سینے کا' وہ شیر دل ابتدا ہی میں کھا چکا تھا۔ کوئی اور کتا ہوتا تو لڑائی اسی وقت ختم ہو گئی ہوتی۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران پانچ وقفے ہوئے۔ کینوس پر اب خون ہی خون تھا جس کی وجہ سے کتے بار بار پھسل رہے تھے۔ شیر دل کے سینے کا زخم اب رنگ لا رہا تھا۔ اس کا اگلا بایاں پنجہ بے کار ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے خود کو متوازن رکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور یہ دشواری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں شیر دل کا دوسرا پنجہ بھی بے کار ہو گیا۔ بے جگر نے اس کی تھوتھنی بھی بھنبھوڑ ڈالی تھی جس کے نتیجے میں ایک آنکھ بھی بند ہو گئی تھی۔ بے جگر کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ اس کا سر بری طرح زخمی تھا مگر وہ مشینی انداز میں حملے کیے جا رہا تھا۔ وہ شیر دل کے سینے پر وار کیے جا رہا تھا۔

ریفری کے اشارے پر دونوں کتوں کو الگ کر دیا گیا۔ دونوں غیر معمولی قوتِ ارادی اور استقلال کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ریفری نے پھر اشارہ کیا....

لیکن اب شیر دل پیٹ کے بل گھسٹ رہا تھا۔ اور وہ بھی اس کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ تاہم وہ ایک بہادر جنگجو کی طرح لڑتے ہوئے مرنا چاہتا تھا' اسی لیے وہ گھسٹ کر رنگ میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا پورا سینہ زخم بن چکا تھا۔ کینوس پر خون کی لکیر کھنچ رہی تھی۔

علی باقر نے اشارہ کیا کہ فائٹ ختم ہو گئی ہے۔ وہ شیر دل سے لپٹ گیا تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کچھ آوازیں ابھریں۔ کسی میں جھنجلاہٹ تھی' کسی میں افسوس اور کسی میں مایوسی۔ واجد بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑنے والوں کے لیے زندگی

سے کہیں زیادہ اہم لڑائی ہوتی ہے۔
بعد میں چھوٹی فائٹس ہوئیں مگر واجد باہر نکل آیا۔ وہاں علی باقر شیر دل کو کمبل پر لٹائے اس کی دوا دارو کر رہا تھا۔
"یہ بچ جائے گا نا؟" واجد نے علی باقر سے پوچھا۔
"مشکل ہے" علی باقر نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔
"بہت افسوس ہوا..."
"مجھے اسے پہلے ہی روک دینا چاہیے تھا۔"
واجد گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا "پیر بخش کو جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔
علی باقر کتے کے سینے کے کھلے زخم پر کوئی سفوف چھڑک رہا تھا "اسے کون نہیں جانتا؟"
"وہ نظر نہیں آیا؟"
"ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔"
واجد بیٹھا اسے کتے کے دوائیں لگاتے دیکھتا رہا۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا' معلوم کر چکا تھا۔ محمود شامی کے دور میں صفائی کے تین یونٹ تھے انٹیلی جنس میں جو مختلف نوعیت کے کام کرتے تھے۔ ایک یونٹ کا سربراہ پیر بخش تھا۔ ان میں سے صرف ایک یونٹ احتساب کرنے والوں کی نظر میں آسکا تھا... اور وہ بھی گیٹ وے اسکینڈل کی وجہ سے۔ تینوں یونٹ ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ محمود شامی کے استعفے کے بعد تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گئے' چھان بین شروع ہوئی۔ تب بھی صرف تنویر الزماں کا یونٹ ہی سامنے آسکا۔ تحقیقات کرنے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ قالینوں کے نیچے کتنی گندگی موجود ہے۔ یا وہ جانتے تھے تو انہوں نے بدبو کی خوفناکی کا اندازہ کرتے ہوئے قالین اٹھانے سے دانستہ گریز کیا تھا۔ واجد کو معلوم تھا کہ پیر بخش کا یونٹ جو کچھ کرتا رہا تھا' اس کے سامنے تنویر والے یونٹ کی کارکردگی کچھ بھی نہیں تھی۔
اب واجد کو معلوم ہو چکا تھا کہ پیر بخش ملک میں موجود ہی نہیں "پیر بخش کب سے نہیں ہے یہاں؟" اس نے علی باقر سے پوچھا۔
علی کچھ دیر سوچتا رہا جیسے حساب لگا رہا ہو پھر بولا "چار مہینے سے زیادہ ہو گئے۔"
اس کا مطلب تھا کہ اموات کا سلسلہ شروع ہوا تو پیر بخش اس سے پہلے ہی باہر جا چکا تھا۔ اس نے فہرست پوری طرح چیک کر لی تھی۔ تین افراد کو چھوڑ کر اس فہرست کا ہر شخص' کسی ایک موت کے وقت کہیں اور موجود پایا گیا تھا۔ صرف تین افراد ایسے تھے جو ہر موت کے وقت وہیں موجود تھے۔ تنویر' حمید اور نیاز۔ واجد جانتا تھا کہ دونوں تاجوری تنویر کے کس حد تک وفادار ہیں۔ پھر حمید حادثے میں اسی روز اسی علاقے میں مارا گیا تھا' جہاں صابر ملک کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

واجد کو یقین ہو گیا تھا کہ تنویر الزماں ہی اس کا مطلوبہ آدمی ہے۔
مشکوک افراد کی فہرست میں تنویر سب سے زیادہ خطرناک آدمی تھا۔ واجد اس کے ریکارڈ سے واقف تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں۔ گیٹ وے کا معاملہ بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ایک فوجی آفیسر قطعاً بے وقت بینک کے پاس سے گزرا اور اسے گڑبڑ کا احساس ہو گیا۔ اس نے جو ہنگامہ مچایا' اسے روکنا ناممکن تھا۔ ایکشن لینا پڑا... اور بے حد تیز رفتاری سے لینا پڑا۔ ایسے میں یہ تنویر کا ہی کمال تھا کہ صرف ایک کے سوا وہ اپنے تمام آدمیوں کو چھاپا پڑنے سے پہلے ہی بینک سے نکال لے گیا تھا۔ یہی نہیں' وہ جس کام کے لیے آئے تھے' وہ کام بھی کر گئے تھے۔

○☆○

"افسوس... کوئی صورت نہیں" علی باقر بڑبڑایا۔ اس نے چمڑے کا ایک کیس کھول کر اس میں سے ایک بڑی ہائپوڈرمک سرنج نکالی۔ سرنج میں دودھیا گلابی محلول بھرنے کے بعد اس نے شیر دل کے انجکشن لگایا۔ کتے کا جھٹکے لیتا جسم فوراً ہی ساکت ہو گیا۔
"افسوس...." واجد نے پلٹ کر دیکھا "وہ بے جگر کا مالک رحمت تھا "یہ نہ ہوا ہوتا تو تم اسے دوسرے کتوں کی تربیت کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔"
"اسے جتنا لڑنا چاہیے تھا وہ اس سے زیادہ لڑا" علی نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔
"بے شک" رحمت نے تائید کی "اگر ایسا دل اور ایسی بے جگری کسی انسان کو مل جائے تو کیا ہو؟"
واجد واپس چل دیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا' اسے اسٹارٹ کیا اور یوٹرن لے کر رفتار بڑھا دی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ اس کتے شیر دل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس کی تڑپ' رنگ کی طرف بڑھنے کی ان تھک اور اذیت ناک کوشش یاد آئی۔ وہ جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا... موت تک۔ موت سے پہلے شکست تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔
اور رحمت کا وہ جملہ... "اگر ایسا دل اور ایسی بے جگری کسی انسان کو مل جائے تو کیا ہو؟"
یہ جملہ یاد کرتے ہی واجد کو خیال آیا کہ وہ تنویر الزماں سے کبھی نہیں ملا ہے۔

○☆○

تنویر بستر پر لیٹا تھا۔ فوزیہ بھی جاگ رہی تھی۔ تنویر خاموشی سے صورت حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فوزیہ جانتی ہے... جانتی ہے کہ وہ ان اموات میں کسی نہ کسی طور پر ملوث ضرور ہے لیکن اس نے اس موضوع پر گفتگو نہیں چھیڑی تھی۔
لیکن فوزیہ یہ تو نہیں جان سکتی تھی کہ صورت حال بدل چکی

ہے۔ اب وہ سرکاری مشین کا پُرزہ نہیں کہ قانون اس کی پشت پر ہو۔ قانون تو اب اسے گرفت میں لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے صرف قانون سے خطرہ ہو۔ اب تو میدان میں ایک شکاری اور بھی اُتر آیا تھا۔ اور اس میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ شکاری اہلیت اور خطرناکی کے اعتبار سے کم از کم اس کا ہم پلہ ضرور ہوگا۔ ایک قاتل جو ایک قاتل کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک شکاری جو ایک اور ماہر شکاری کو شکار کرنا چاہتا تھا۔

"میں کچھ عرصے کے لیے جا رہا ہوں" تنویر نے اچانک ہی کہا۔

"ٹھیک ہے" اس کے پہلو کی طرف سے فوزیہ کی آواز ابھری۔

"یہ گیٹ وے میں ملوث لوگوں کی اموات.... یہ اتفاق سے بڑھ کر ہے۔ ہے نا؟"

"مجھے یقین تھا اس بات کا" فوزیہ نے یوں کہا جیسے کسی فلم کے پلاٹ پر تبادلۂ خیال کر رہی ہو۔ شاید وہ اس قسم کے معاملات کو محض ایک سنسنی خیز فلم ہی سمجھتی تھی۔ حقیقت سمجھتی ہوتی تو اب تک اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہوتا۔

"ہمیں حقائق کا سامنا کرنا ہوگا" تنویر نے گمبھیر لہجے میں کہا "ممکن ہے، قاتلوں کی ممکنہ فہرست میں.... مشکوک افراد میں میرا نام بھی ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤں۔"

فوزیہ خاموش لیٹی کچھ سوچتی رہی، بولی کچھ نہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں تم محفوظ رہو۔ اپنی حفاظت کا خیال رکھو، کہیں چلی جاؤ۔"

"میں یہیں رہوں گی۔ یہ سوچنے کا کوئی جواز نہیں کہ مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

پہلے تو فوزیہ کے جواب نے تنویر کو چونکا دیا پھر اس کی سمجھ میں مطلب آیا۔ ابھی تک قتل کی کسی واردات میں بھی کسی بیوی کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی "ٹھیک کہتی ہو" اس نے کہا "ہاں.... تم یہاں محفوظ ہی رہو گی۔"

فوزیہ اٹھ بیٹھی۔ ایک انگڑائی لے کر وہ بستر سے اُتری "کافی؟" اس نے پوچھا۔

تنویر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فوزیہ باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ کچن میں تھی۔ تنویر نے تکیہ مسہری کے سرہانے کھڑا کر کے ٹکایا اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچن سے وقتاً فوقتاً فوزیہ کی نقل و حرکت کی آواز آ رہی تھی۔ اس سے قطع نظر وہ ایک خاموش صبح تھی۔

تنویر جانتا تھا کہ فوزیہ نے اس کی بات پر پوری طرح یقین نہیں کیا ہے لیکن قبول کر لیا ہے۔ یہ اس میں ایک عجیب وصف تھا۔

فوزیہ چھوٹی ٹرے پر کافی کی دو پیالیاں رکھے بیڈ روم میں واپس آئی۔ صبح کا اخبار اس کی بغل میں دبا تھا۔ اس نے تنویر کی طرف پیالی بڑھائی اور پھر اخبار اس کے قریب تہہ کر کے گرا دیا۔ تنویر بڑی احتیاط سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ فوزیہ نے بڑھ کر ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی پر موسم کا حال بتایا جا رہا تھا۔ تنویر نے اسے نظر انداز کیا اور اخبار کھول لیا۔ پہلے صفحے پر محمود شامی کا پٹیٹا انٹرویو تھا جو بی بی سی سے گزشتہ رات ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔ انٹرویو ہیرالڈ فین نے لیا تھا۔ تنویر بڑی دلچسپی سے اسے پڑھنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے درست طرزِ عمل اختیار کیا۔" محمود شامی نے کہا تھا "میرے متعلق چھان بین کی جاتی تو کوئی فرق نہ پڑتا بلکہ میرے لیے تو بہتر ہوتا کیونکہ میں ہر انکوائری سے بے داغ نکلتا لیکن ملک ایک بہت بڑے بحران سے دوچار ہو جاتا۔"

انٹرویو کا مکمل متن صفحہ نمبر چار پر تھا۔

فوزیہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نہا رہی ہے۔ تنویر نے کافی کی پیالی خالی کی اور اخبار اپنے سامنے پھیلا کر صفحہ نمبر چار کھول لیا۔

ہیرالڈ فین کے بعض چبھتے ہوئے سوالات کے جو جوابات محمود شامی نے دیے تھے، اس سے انہی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے عہدِ صدارت میں جو قابلِ اعتراض سرگرمیاں ہوئیں، اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ ان سے بے خبر تھا۔ تاہم اس نے یہ کہہ کر ان سرگرمیوں کا دفاع کیا کہ وہ ضروری تھیں۔ صرف ضروری نہیں، ملک و قوم کی بہتری کے لیے بہت اہم بھی تھیں۔ اس نے کہا کہ تاریخ اسے اچھے لفظوں میں یاد رکھے گی۔ بعض موقعوں پر جہاں تیز رفتاری ضروری ہو اور مقصد نیک ہو، وہاں صدر کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کسی قانون کی کیا تشریح کرتا ہے۔ اس نے کہا "اگر کوئی اس کا یہ مطلب لے کہ صدر خود کو قانون سے بالاتر بنا رہا ہے تو اسے یہ سمجھنے دو۔"

انٹرویو کے ایک حصے نے جہاں محمود شامی کا بیان بے حد مُبہم تھا، تنویر کی توجہ کھینچ لی۔

ہیرالڈ فین: صدر کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے بعد آپ کو بھی قصرِ جمہوریت کی تنہائی ناقابلِ برداشت تو نہیں لگتی؟

محمود شامی: کبھی کبھی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے، جیسے میں یتیم خانے میں چلائے جانے کا منتظر ہوں لیکن میں خود کو اپنی ڈاک میں، اپنے نجی معاملات میں مصروف رکھتا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے بھلا دیا گیا ہے۔ ایسا ہوتا تو آپ اس وقت میرا انٹرویو نہ لے رہے ہوتے۔

ہیرالڈ فین: آپ کہتے ہیں کہ آپ کو بھلایا نہیں گیا لیکن کس انداز میں آپ کو یاد رکھا گیا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

تنویر کے خیال میں ہیرالڈ فین ایک بے حد اہم نکتے کو سمجھ ہی

نہیں سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ یہودی تھا۔ یا شاید اس لیے کہ محمود شامی کو خاص طور پر مغربی صحافیوں کو انٹرویو دیتے ہوئے بائبل کے حوالے دینے کا خبط تھا اور شاید محمود شامی کی اس بات کا مطلب وہی شخص سمجھ سکتا تھا جو صابر ملک کے آخری لمحوں میں اس کے قریب موجود تھا جسے صابر ملک نے غلطی سے پادری سمجھ لیا تھا۔

تنویر جانتا تھا' بیتھانی وہ شہر تھا' جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے مُردہ لزارس کو جلایا تھا۔

اور کوہستان میں دم توڑتے ہوئے صابر ملک نے اپنی دانست میں ایک پادری سے مغفرت کی دعا کی التجا کرتے ہوئے جو آخری لفظ زبان سے ادا کیا تھا' وہ لزارس تھا۔

اب تنویر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ کوئی اتفاق ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شامی کے مُنہ سے وہ بات غیر شعوری طور پر نکل گئی ہوگی۔

تنویر کو احساس ہوا کہ وہ اخبار پڑھتے ہوئے کچھ زیادہ ہی زور دے رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کی گردن دُکھ گئی تھی۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور تکیے پر سر ٹکا کر نیم دراز ہوگیا۔ چھت کو دیکھتے ہوئے اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ انداز عجیب تھا۔ اسے خوشی تھی کہ فوزیہ ابھی باتھ روم میں ہی ہے اور اس کی ہنسی نہیں سُن سکتی۔

لزارس!

ممکن ہے' اس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ اور ممکن ہے' اس کا کوئی مطلب ہو... حیران کردینے والا!

○☆○

گھنٹی پانچ بار بج چکی تھی۔ فوزیہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اسے وہ مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا "میرا نام حارث ہے بیگم زماں۔ میں محکمۂ خفیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ زماں صاحب موجود ہیں؟"

"جی نہیں" فوزیہ نے کہا اور یہ درست تھا۔ تنویر اپنے کہنے کے مطابق سہ پہر کو رخصت ہوچکا تھا۔

حارث بدستور مسکراتا رہا۔ راہداری میں پتنگے بہت تھے اور وہ اس پر منڈلا رہے تھے۔ کچھ پتنگے اندر بھی داخل ہوگئے تھے اور فوزیہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی "میں اندر آسکتا ہوں؟" حارث نے فوزیہ سے پوچھا۔

فوزیہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا' راہداری کی لائٹ آف کی اور دروازہ بند کرلیا۔

"اگر آپ کے شوہر موجود نہیں تو پھر میں آپ سے کچھ سوالات کروں گا۔"

"مجھے اپنا شناختی کارڈ دوبارہ دکھائیں" فوزیہ بولی۔

حارث نے سر کو تنبیہی جنبش دیتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شناختی کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ فوزیہ نے کارڈ کا جائزہ لیا۔ لگتا تو وہ اصلی ہی تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اصلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ حارث محکمۂ خفیہ کا ایجنٹ نہیں لیکن محکمے کے لوگ اس کی پشت پناہی کررہے ہیں۔ اس نے شناختی کارڈ اسے واپس کردیا اور اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

حارث نے ڈرائنگ روم کی آرائش کو غور سے دیکھا "بہت خوب صورت گھر ہے آپ کا" اس نے تبصرہ کیا۔

"پلیز... آپ تشریف رکھیں۔"

حارث ایک کرسی پر بیٹھ گیا "اب یہ بتائیں کہ آپ کے شوہر کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کتنی دیر ہوئی انہیں گئے؟"

"سہ پہر کو گئے تھے" فوزیہ بلا جھجک سچ بول رہی تھی۔

"آپ ان سے رابطہ کرسکتی ہیں؟"

"نہیں۔ میرے پاس نہ ان کا پتا ہے نہ کوئی فون نمبر۔"

پھر وہی جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ "لگتا ہے' یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بیگم زماں' آپ کے شوہر میرے ہم پیشہ ہیں۔ میں بھی اپنی بیوی کو ایسی کوئی بات نہیں بتاتا جس سے وہ کسی خطرے میں پڑے۔"

فوزیہ مینٹل کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں "خطرے کی بات تو خیر نہیں ہوگی حارث صاحب۔ تنویر کے کام نے اسے رازداری کا عادی بنادیا ہے اور میرے خیال میں اس کی معقول وجہ بھی ہے۔"

"جاسوسی اور ایجنٹس کے متعلق کتنے ناول چھپ چکے ہیں مگر میرے خیال میں کسی نے ایجنٹوں کی بیویوں کی طرف بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ حالانکہ داد کی اصل حق دار تو وہی ہوتی ہیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" فوزیہ نے کہا۔ وہ اس کا مقصد نہیں سمجھ پارہی تھی۔

"اگر میں آپ کے شوہر کی جگہ ہوتا تو اپنی حفاظت کے لیے فکر مند ہوتا۔ دیکھیں نا... گیٹ وے اسکینڈل والوں کی اموات کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ کبھی انہوں نے آپ سے اس امکان پر بات کی کہ ممکن ہے' وہ بھی قاتل کی فہرست میں موجود ہوں یا آپ..."

"میرا خیال ہے' ان میں ایک قدرتی موت بھی ہے اور ایک حادثہ تھا۔"

"یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا۔ اور پھر میں تو خود کو زماں صاحب کی جگہ رکھ کر تصور کررہا ہوں۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو مجھے پریشانی ضرور لاحق ہوتی۔"

"تنویر کبھی کبھی بہت پریشان لگتے ہیں۔"

"تو اس بار وہ اسی وجہ سے تو غائب نہیں ہوئے؟" حارث نے پوچھا۔

"ممکن ہے یہی بات ہو لیکن مجھے معلوم نہیں۔"

"انہوں نے آپ سے گیٹ وے اموات کے متعلق بات کی تھی؟"

"مجھے یاد نہیں۔ اخبار پڑھ کر ممکن ہے انہوں نے کوئی تبصرہ کیا ہو۔"

"انہوں نے ان اموات کو ایک دوسرے سے منسلک کیا؟"

"وہ بھی آپ کی طرح ہیں مسٹر حارث .... محض سوچنے والے۔"

"یہاں تو سوچنے کی گنجائش اتنی ہے کہ....."

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"اور مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ اگر زماں صاحب آپ سے رابطہ کریں تو مجھے اس نمبر پر رنگ کر دیجئے گا" اس نے فوزیہ کی طرف کارڈ بڑھایا "ضرورت پڑی تو ہم ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کر سکیں گے۔"

"مجھے خوشی ہوگی" فوزیہ نے کہا اور اسے چھوڑنے دروازے تک گئی "میں تنویر کو بتا دوں گی کہ آپ آئے تھے۔"

"ضرور۔ میں شکر گزار ہوں گا" حارث نے کہا اور باہر آگیا۔

وہ باہر اپنی کار میں کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اسے یقین تھا کہ فوزیہ تنویر اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہی ہوگی۔ اسے سوچنے کا موقع ملنا چاہیے۔ ویسے اسے یقین تھا کہ فوزیہ غلط نہیں کہہ رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوگا کہ تنویر کہاں ہے۔

○☆○

تنویر اور نیاز فلاح چوک پر اس بیس منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے، جس کے ایک فلیٹ میں مقصود رہتا تھا۔ گیٹ وے میں ملوث دوسرے لوگوں کے برعکس مقصود پیسے کے اعتبار سے کامیاب نہیں رہا تھا۔ وہ ایک پرانی بلڈنگ تھی جس کا نام بیلمونٹ ٹاورز تھا۔ نیچے پارکنگ لاٹ تھا، جہاں مکینوں کے لیے کار پارک کرنے کی جگہ تھی۔

نیاز نے سڑک پار کی اور بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہوگیا۔

دس منٹ بعد تنویر نے سڑک پار کی اور عمارت کی لابی میں داخل ہوا۔ وہ لفٹ کی طرف گیا۔ بٹن دبانے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ وہاں اکیلا ہی تھا۔ ماربل کے فرش پر جا بجا جوتے سے رگڑ کر بجھائی جانے والی سگریٹوں کے نشانات تھے۔

لفٹ نیچے آرہی تھی۔ اب وہ دوسری منزل پر تھی۔ دوسری لفٹ بھی نیچے آرہی تھی لیکن وہ چودھویں منزل پر روک لی گئی۔

لفٹ نیچے پہنچی۔ دروازہ کھلا، لفٹ سے ایک خاتون چھوٹا سا کتا لیے نکلیں۔ انہوں نے تنویر کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ تنویر لفٹ میں داخل ہوا۔ دروازہ بند ہوا تو اس نے سترھویں منزل کا بٹن دبا دیا۔

سترھویں منزل پر 17E اپارٹمنٹ میں مقصود رہتا تھا۔

مقصود گھر پر موجود نہیں تھا۔ نیاز کو اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ تنویر نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ تنویر اندر داخل ہوا۔ نیاز نے فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اپارٹمنٹ چھوٹا سا تھا۔ فرنیچر جدید طرز کا اور مہنگا تھا۔ وہ مقصود کے اچھے دنوں کی یادگار تھا۔ دیوار کے ساتھ لکھنے کی میز تھی۔ اس کے مقابل دیوار میں کھڑکی تھی، جس سے دارالحکومت کا خوب صورت منظر دکھائی دیتا تھا۔ دیواروں پر کچھ پینٹنگز آویزاں تھیں۔ وہیں ایک صوفہ پڑا تھا۔ صوفے کے بائیں جانب ایک بڑا بک کیس تھا جس میں کتابیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ وہیں سے تنویر کو بیڈ روم نظر آرہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی طرح وہ بھی صاف ستھرا تھا۔

تنویر نے فلیٹ کی تلاشی لینے کے متعلق سوچا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مقصود کب واپس آئے گا اور مقصود آجاتا تو یہ ضروری ہو جاتا کہ وقت ضائع کیے بغیر معاملات خوش اسلوبی سے نمٹائے جائیں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ فلیٹ میں بے ترتیبی نہ ہو۔

نیاز خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے حد پُرسکون نظر آرہا تھا لیکن وہ چوکنا بھی تھا۔ اس کے کان دروازے میں لگائی جانی والی چابی کی آواز کے منتظر تھے۔ تنویر نے میز کے پاس جا کر دراز کی تلاشی لی۔ درازوں میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔

وہ میز سے ہٹا اور کھڑکی کے پاس جا کر نیچے سڑک کو دیکھنے لگا۔ مقصد مقصود کو دیکھنا نہیں، بس وقت گزاری تھا۔ اسے یقین تھا کہ مقصود بیسمنٹ میں گاڑی پارک کرے گا اور لفٹ میں بیٹھ کر اوپر آئے گا۔

تیز ہوا کھڑکی سے ٹکرائی۔ پھر کھڑکی کے شیشے سے بوندیں ٹکرائیں۔ تنویر نے پردے کھینچ دیے۔

لوہے پر لوہے کی رگڑ کی آواز سنائی دی تو نیاز اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اور تنویر تیزی سے صوفے کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ دروازے سے انہیں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ آوازوں سے انہوں نے محسوس کیا کہ مقصود اندر آیا ہے اور اس نے دروازہ دوبارہ مقفل کر لیا ہے۔

مقصود چابی جیب میں ڈالتے ہوئے اندر آیا۔ اس نے ان دونوں کو نہیں دیکھا۔ وہ کچن کی طرف گیا۔ سامان سے بھرا ہوا شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"مقصود!" تنویر نے دھیمی آواز میں اسے پکارا۔

مقصود اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اس کی کمریں خم ہوئی، جیسے کسی نے اس پر وار کیا ہو۔ شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر کر پھٹ گیا۔ مقصود نے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا تو اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔

تنویر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں خاصا بدل گیا تھا۔ سر پر بال اتنے گھنے نہیں تھے اور عمر زیادہ لگنے لگی

تھی۔

"خدا کی پناہ!" بالآخر مقصود کے منہ سے نکلا۔

"بیٹھ جاؤ" تنویر نے کہا۔

نیاز اور تنویر بڑھے اور اس کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ مقصود صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کھڑے رہے۔

تنویر نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر دیا۔ اچانک ہونے والی روشنی نے مقصود کو چونکا دیا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پہلے تنویر کو اور پھر نیاز کو دیکھا۔ تنویر، مقصود کے اس جھٹکے سے سنبھلنے کا منتظر تھا۔

مقصود کے ہاتھ لرز رہے تھے لیکن اس کی سانسیں نارمل تھیں

"کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے خوف زدہ لہجے میں تنویر سے پوچھا۔

تنویر نے جواب نہیں دیا۔

"تم... تم نے ان لوگوں کو قتل کیا...؟" مقصود کی آواز اب بھی لرز رہی تھی۔

"ہم لزارس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں" تنویر نے کہا۔

"لزارس؟"

نیاز نے جیب سے نیا تیز دھار والا اُسترا نکالا اور اسے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں لے آیا۔ روشنی میں اُسترے کی دھار کی چمک بہت خوف ناک لگ رہی تھی۔

"میرا دوست اُسترے کے استعمال کا ماہر ہے" تنویر نے کہا "یہ تمہارے انگوٹھے کے نیچے سے بڑی صفائی سے گوشت نکال لے گا۔ ایسے کہ تمہارے ناخن کو موڑا جا سکے گا۔ پھر مزید گوشت نکالا جاتا رہے گا۔ ناخن مزید جھکایا جا سکے گا۔ جب تک تمہاری زبان نہیں کھلے گی، یہی ہوتا رہے گا۔ یہ تو ایک ناخن کی بات ہے، دس ناخن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور دس پیروں میں۔"

مقصود کا جسم لرزتا رہا۔ نیاز اُسترا لیے ویسے ہی کھڑا تھا۔ مقصود کو احساس ہوا کہ وہ لوگ سیریس ہیں۔

"لزارس" تنویر نے اسے یاد دلایا۔

مقصود نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ نیاز مسکرانے لگا "میں سب کچھ تو نہیں جانتا" مقصود نے کہا "لیکن جتنا جانتا ہوں، بتا دوں گا" اس نے اچانک یوں جھرجھری لی جیسے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا ہو "یہ چکر برسوں پہلے شروع ہوا تھا... ایوان صدر میں۔ جب مخالفین کی فہرست تیار کی گئی تھی۔ وہ فہرست شاکر نے مرتب کی تھی۔ وہی اس تحقیقاتی کام کا انچارج تھا۔ اس تحقیقاتی کام کے دوران اسے بعض بہت کام کی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ خاص طور پر صوبائی اسمبلی کے ایک رکن کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات تو بہت ہی دلچسپ تھیں۔ وہ رکن دشمنوں کی فہرست میں تو شامل نہیں تھا۔ وہ معلومات شاکر نے شامی کو منتقل کر دیں۔"

نیاز اُسترے سے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن کو نکیلا بنا رہا تھا۔

"معلومات کے متعلق بتاؤ" تنویر نے کہا۔

"اس رکن اسمبلی کی ایک شادی اور بھی ہوئی تھی" مقصود نے جلدی سے کہا "اس شادی کے بارے میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے چند ہی لوگ واقف ہیں اور کسی کو نہیں معلوم یہ بات۔ بہت پرانی بات ہے یہ۔ اس وقت وہ رکن سیاست کی الف بے بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ شادی کے صرف ایک ماہ بعد اس کی دلہن کوٹھے سے گر کے مر گئی، پوسٹ مارٹم ایک ایسے ڈاکٹر نے کیا تھا جس کے ان لوگوں سے گھریلو تعلقات تھے۔ ڈاکٹر اب مر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے جھوٹا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا۔

"شاکر کے ہاتھ ڈاکٹر کے خلاف کچھ مواد لگ گیا تھا۔ اس نے اس کا بیان ٹیپ کر لیا۔"

"جھوٹے ڈیتھ سرٹیفکیٹ سے کیا مراد ہے تمہاری؟" تنویر نے پوچھا۔

"حقیقت یہ تھی کہ لڑکی کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کی موت گرنے کے نتیجے میں گردن ٹوٹنے سے واقع نہیں ہوئی تھی۔ شاکر کے پاس ڈاکٹر کا بیان موجود ہے کہ اس نے جھوٹا ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا۔ اس بیان کے زور پر قتل کا کیس اوپن ہو سکتا ہے۔ وہ رکن یقینی طور پر مارا جائے گا۔"

"تو اب اس رکن کو بلیک میل کیا جا رہا ہے؟"

"یوں کہو کہ ایک لحاظ سے اب وہ گھوڑا ہے جس کی لگامیں محمود شامی کے ہاتھوں میں ہیں۔ محمود شامی اس کا مالک ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی تو لزارس ہے۔ اب وہ رکن صوبائی اسمبلی وزارتِ عظمیٰ کا امیدوار ہے۔ محمود شامی اور اس کا حلقہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں" مقصود نے کہا "محمود شامی سیاسی طور پر مر چکا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ کا وہ امیدوار اسے سیاسی طور پر دوبارہ زندہ کر دے گا۔"

تنویر خاموش رہا۔ نیاز مسکرانے لگا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں بارش کے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانے کی آواز بے حد واضح تھی۔

"پہلے والے تمام حربے پھر آزمائے جا رہے ہیں" مقصود نے کہا "گمنام خطوط، بے بنیاد خبریں، اندر کی معلومات کی اشاعت، جعلی کاغذات، سرمایہ داروں کے عطیات... سب کچھ وہی کا وہی ہے۔ البتہ اس بار وہ لوگ بہت محتاط ہیں... اور زیادہ محفوظ بھی۔ انہوں نے یاد رکھا ہے کہ پچھلی بار غلطیاں کہاں ہوئی تھیں۔ اس بار عوام پہلے سے بھی زیادہ بے خبر ہیں۔ خطرہ کوئی نہیں اور اقتدار دوبارہ انہی کو ملنے والا ہے۔ ایسا اقتدار جس میں جواب دہی کسی اور کو کرنا ہوگی۔"

مقصود اب پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ جیسے وہ معلومات اس کے سینے پر کسی بوجھ کی طرح رکھی رہی ہوں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ تنویر

اب ہر زیادتی کو بھول جائے گا... اسے معاف کردے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب وہ پہلے سے بڑھ کر صاحبِ اقتدار ہونے والے ہیں۔ ڈوبتے کو تو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

تنویر، مقصود کے پاس سے ہٹا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ بارش اور ہوا کے کھڑکی سے ٹکرانے کی آواز کسی تیز رفتار دریا کے بہاؤ کی آواز سے مشابہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معاملات اور پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ اس نے غلاظت کی بدترین دلدل میں قدم رکھ دیا ہے۔

وہ پلٹا، واپس آیا اور مقصود کو گھورنے لگا۔ نیاز اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"محمود شامی اس شخص کو منتخب کرانے کے لیے اپنے تمام وسائل استعمال کرے گا" مقصود نے کہا۔

تنویر اس کے اور قریب ہوگیا "وہ امیدوار ہے کون؟ مجھے اس کا نام بتاؤ۔"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"اس کی پشت پناہی کیوں کی جارہی ہے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔"

نیاز بولا "یہ شخص پاگل ہوگیا ہے۔"

"خدا کی قسم، مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے تمہیں بتادیا۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں معلوم" مقصود گڑگڑایا۔ وہ اس بچے کی طرح بدن چرا رہا تھا جو پٹائی کے امکان سے خوف زدہ ہو "چند خاص آدمیوں کے سوا یہ باتیں کسی کو معلوم نہیں۔ خدا کے لیے... سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ تو محمود شامی کا خاص اسٹائل ہے۔ ہر شخص کو ہر بات معلوم نہیں ہوتی۔ متعلقہ افراد کو بھی پوری معلومات کہاں حاصل ہوتی ہیں۔ تم تو ہمارے ساتھ رہے ہو۔ جانتے ہو یہ بات۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

تنویر کو یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ جتنا جانتا تھا، بتاچکا ہے۔ محمود شامی غیر ضروری طور پر کسی کو بھی معلومات سے مسلح کرنے کا قائل نہیں تھا۔ "یہ بتاؤ، تمہارا اندازہ کیا ہے؟ وزارتِ عظمیٰ کا وہ امیدوار کون ہوسکتا ہے؟" اس نے اصرار کیا۔

"ایسے اندازے کا کیا فائدہ، جس کی کوئی بنیاد نہ ہو" مقصود نے کہا۔

"پھر بھی۔"

"میرے جیسا اندازہ تو تم بھی لگا سکتے ہو۔ سچ سچ... میں اندازہ نہیں لگا سکتا" مقصود پھر گڑگڑانے لگا "اور پھر میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ تم مجھے قتل کرنے ہی آئے ہو۔ ہے نا؟ تم ہی نے دوسروں کو بھی قتل کیا..." وہ یوں جھک کر بیٹھ گیا جیسے سزائے موت کا کوئی مجرم جلاد کے سامنے سر جھکادے۔

"یہ تو تمہارا کہنا ہے کہ دوسروں کو ہم نے قتل کیا ہے" تنویر نے کہا "ہم تو صرف معلومات چاہتے ہیں... لیکن سیدھی سچی معلومات۔"

"وہ میں نے تمہیں دے دیں" مقصود کے لہجے میں تھکن تھی۔ وہ تن بہ تقدیر ہوگیا تھا۔

تنویر نے سر کی جنبش سے نیاز کو اشارہ کیا۔ نیاز نے جیب سے ٹائلون کی وہ ڈوری نکال لی جس میں پھندا پہلے سے بنا ہوا تھا۔

مقصود نے تھکے سے سر اٹھایا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی... تین بار!

نیاز نے جلدی سے ڈوری دوبارہ جیب میں ڈال لی۔

مقصود صوفے سے اتنی تیزی سے اٹھا کہ تنویر اور نیاز حرکت بھی نہ کرسکے۔ جب تک دونوں نے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا، وہ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ایک بوڑھی عورت بے تکلفی سے اندر چلی آئی۔ تنویر اور نیاز اسے بس ہیولے سے نظر آئے۔ اس نے چشمے کے پیچھے پلکیں جھپکا کر مقصود کو دیکھا "خیریت تو ہے مقصود صاحب!"

"جی ہاں بیگم ناز۔ آئیے۔ اندر آجایئے" مقصود نے چمک کر کہا۔ وہ پہلے کبھی کسی کو دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس وقت تو کوئی بھی آجاتا تو اسے اچھا ہی لگتا "یہ میرے دوست ہیں۔ ابھی جانے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ آپ آگئیں۔"

بیگم ناز اندر چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں نوٹ بک "میں نے آپ کو گھر آتے دیکھ لیا تھا۔ میں آپ کی منتظر تھی" وہ بولیں "آپ تو جانتے ہی ہیں، میں نظام کے بچوں کے لیے امداد جمع کررہی ہوں۔"

"کون نظام؟"

بیگم ناز نے ملامت بھری نظروں سے مقصود کو دیکھا "اسی بلڈنگ میں رہتا تھا۔ کل اس کا انتقال ہوگیا۔"

"اوہ... یاد آیا۔ ہاں... میں حاضر ہوں" یہ کہہ کر مقصود نے بٹوہ نکالا اور بٹوے میں سے سو کا ایک نوٹ۔ لیکن اس نے نوٹ بیگم ناز کی طرف نہیں بڑھایا "نظام چوتھی منزل پر رہتا تھا" اس نے تنویر اور نیاز کو بتایا "کینسر تھا بے چارے کو۔ خیر... پھر ملیں گے تنویر... اور نیاز۔"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ ان دونوں کے رخصت ہوئے بغیر وہ بیگم ناز کو نوٹ نہیں دے گا۔

"خدا کرے، کینسر کا علاج جلد ہی دریافت ہوجائے۔ اچھا خدا حافظ۔ خدا حافظ بیگم صاحبہ" یہ کہہ کر تنویر نے نیاز کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لفٹ میں دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں، نیاز فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، وہ پولیس کو فون کرے گا؟" چند لمحے بعد نیاز نے پوچھا۔

"نہیں کرسکتا۔ ورنہ لزارس کا راز خطرے میں پڑجائے گا" تنویر نے جواب دیا "ہمارے متعلق صرف ان لوگوں کو معلوم

ہو سکے گا جو لزارس سے متعلق ہیں۔ اور ہاں... اس شخص کو بھی بتایا جائے گا جسے ہمارے پیچھے لگایا گیا ہے۔"

"واپس چلیں؟"

"نہیں' خاتون کو رخصت کرتے ہی وہ فون کرے گا" تنویر کے لہجے میں برہمی تھی۔

نویں منزل پر لفٹ میں دو افراد اور سوار ہوئے۔ نیچے پہنچنے تک خاموشی رہی۔

باہر بارش ہو رہی تھی "ہمیں اسے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا" نیاز نے کہا۔

"خاتون کی مداخلت کے باوجود؟" تنویر نے پوچھا۔

نیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مقصود نے اس کے سامنے خاص طور پر ہمارے نام لیے تھے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے' خاتون کسی کے سامنے ہمارے نام نہیں دہرا سکتی تھی۔"

تنویر نے اسے بڑے غور سے دیکھا "ہم غلط کام کرتے تھے تو یہ ذہن میں رکھتے تھے کہ اچھے مقصد کے لیے کر رہے ہیں' اس میں لوگوں کی فلاح ہے" اس نے فخرت بھرے لہجے میں کہا "لیکن ہم غلطی پر تھے۔ اب ہم اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ کام یہ بھی غلط ہے لیکن ہم عام لوگوں کو بہتری کی خاطر کر رہے ہیں۔ تو ہم کسی عام شہری کی جان کیسے لے سکتے ہیں۔"

"کسی بڑے مقصد کے لیے عام لوگوں کو قربان کیا جا سکتا ہے" نیاز نے کہا "اب وہ عورت زندہ رہے گی۔ وہ خبیث مقصود بھی زندہ رہے گا اور وہ سب کو بتا دے گا۔ ہمارا کام اور مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں اب کھلی جنگ لڑنی پڑے گی۔"

"یہ تو وہی پرانا فلسفہ ہے محمود شامی والا۔ مقصد بڑا اور عام انسانوں کی جانیں حقیر۔ مگر میں اب اس سے تائب ہو چکا ہوں۔ میں جان بوجھ کر بالارادہ کسی معصوم شہری کی جان نہیں لے سکتا۔ اور مشکل سے کیا ڈرنا۔ ہم تو سر سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ میں اپنی خود غرضی پر شرمندہ ہوں" نیاز نے بڑے خلوص سے کہا۔

"تم بے فکر رہو' میں معاملات چیک کر کے تمہیں تمہارے موبائل فون کروں گا۔ اب تم جاؤ۔"

نیاز کو رخصت کر کے تنویر اس طرف بڑھ گیا' جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ اس نے کوٹ کے کالر اوپر کر لیے۔ ہوا بہت تیز اور سرد تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس مداخلت نے مقصود کو بچایا ہے' وہ بہت بے تکی تھی... اور عجیب بھی۔ موت نے مداخلت کر کے مقصود کی زندگی بچائی تھی۔ مگر وقتی طور پر!

☆

"مجھے یقین ہے کہ میں بس قسمت ہی سے زندہ ہوں" مقصود نے کہا "وہ مجھے ختم کرنے ہی کے ارادے سے آئے تھے۔"

"تو پھر انہیں لزارس کے بارے میں کیوں بتایا تم نے؟ تمہیں تو مرنا ہی تھا" ظہور نے کہا۔

مقصود کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ظہور سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے "تم جانتے ہو' وہ کسی کی بھی زبان کھلوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"یہ ناخنوں والی ترکیب سے بہت خطرناک" ظہور نے اعتراف کیا۔ "میرے تو سُن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"

یہ گفتگو ظہور کے چالیسویں منزل کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہو رہی تھی۔ وہاں بالکنی سے پورا شہر دیکھا جا سکتا تھا۔ برابر والے کمرے میں دو باڈی گارڈز موجود تھے۔ وہ واجد کے وفادار تھے۔ وہی انہیں لایا تھا۔ اپارٹمنٹ میں بڑی مہارت سے الارم سسٹم نصب کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی کیسی ہی کوشش کی جاتی' ابتدائی مرحلے میں ہی الارم بجنے لگتا۔

"خود اپنے لیے تو تم معمولی سے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کرتے" مقصود نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب تو میرے جیل جانے میں ایک ہفتہ بھی نہیں رہا ہے" ظہور بولا "میں نے سوچا' گھر پر بھی قید رہ کر دیکھ لیا جائے۔ زندہ رہنا آزادی سے زیادہ اہم ہے" وہ شیشے کے سلائڈنگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دروازہ بالکنی میں کھلتا تھا۔ وہ چند لمحے باہر دیکھتا رہا "یہ جگہ محفوظ ہے لیکن کون جانے' نیچے پارک میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

ظہور دراز قامت اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ روشن بالکنی کے پیش منظر میں وہ اور جسیم لگ رہا تھا۔ اس نے سائڈ پاکٹ سے پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگا۔ مقصود نے پائپ کے فوائد ظہور سے سمجھے تھے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ تنویر انتقامی کارروائی کرتا پھر رہا ہے" ظہور نے پلٹ کر مقصود کو دیکھتے ہوئے کہا "وہی اتنا بے وقوف ہے کہ خود کو مظلوم آئیڈیلسٹ سمجھ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا معقولیت کی بھی ہے۔"

مقصود بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا "بہرکیف میں تو گزشتہ رات کے بعد اسے کمتر نہیں سمجھ سکتا۔" اس نے کہا "میں تحفظ طلب کر رہا ہوں۔"

ظہور نے پائپ کا کش لیا اور کچھ سوچتا رہا پھر بولا "بات ناقابل فہم نہیں۔"

"تم محمود شامی سے میرے لیے بات کرو گے؟"

"ضرور کروں گا لیکن پہلے تم عارضی طور پر روپوش کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"صابر ملک کی طرح؟"

ظہور نے ایک اور کش لیا اور سر کو تفہیمی جنبش دی کہ وہ اس کا نکتۂ نظر سمجھ رہا ہے۔

مقصود ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے نزارس کے امیدوار کے بارے میں معلوم ہوتا یا منصوبے کی جزئیات سے پوری طرح واقف ہوتا.... ظہور کی طرح تو مجھے یوں تحفظ کی بھیک نہ مانگنا پڑتی۔ ظہور محفوظ رہے گا' یہاں بھی اور جیل میں بھی۔ اور الیکشن کے بعد اس کی سزا بھی معاف ہو جائے گی۔

"میں تمہیں ایک بات بتادوں" ظہور نے اچانک کہا "ہم نے اس سلسلے میں پروفیشنل کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں.... خاصے عرصے سے۔"

"یعنی تنویر کے پیچھے کسی کو لگا دیا گیا ہے؟"

"تنویر کے پیچھے تو نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پہلے ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارا دشمن تنویر ہے۔ ہاں اب تنویر ہمارا ہدف ہوگا۔ صورت حال خود ہی سنور جائے گی۔"

یہ جملہ...؟ صورت حال خود ہی بہتر ہو جائے گی' سُدھر جائے گی یا سنور جائے گی...' ظہور کا پسندیدہ جملہ تھا اور یہ وہ لوگوں سے اس وقت کہتا تھا جب اس کا خود بہتری کی کوشش کرنے کا بالکل ارادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک بار اس کے ایک ماتحت نے چیخ کر جواب دیا تھا... 'جاؤ... خود کو سُدھارو جاکر۔'

"ہم دونوں ہی تنویر سے ذاتی طور پر واقف ہیں" مقصود نے کہا۔ "وہ آئیڈیلسٹ نہیں' مذہبی جنونی بھی ہے۔ وہ رُکنے والا نہیں۔ اسے تو روکنا پڑے گا۔"

"ہاں۔ اب تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں کہ اپنا مشن جاری رکھے" ظہور بولا "میں متین کو... اپنے ایک باڈی گارڈ کو تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ تمہیں تمہارے گھر پہنچا آئے گا۔ اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ تم بند ہو کر بیٹھ جاؤ۔ نکلو تو ایسے کہ بہت لوگوں کے درمیان رہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب تنویر تمہارے گھر کا رخ کرے گا مگر تم بہرحال محتاط رہو۔ کوئی پستول بھی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔"

ظہور بیس سال پیچھے چلا گیا جب وہ ایجنسی کا سرگرم ڈپٹی ڈائریکٹر ہوا کرتا تھا۔ "تو ایسا کرو بغیر لائسنس کا کوئی پستول یا ماؤزر خرید لو۔ گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈوری سے کچن کے برتن باندھ دو...."

"یہ تمام احتیاطی تدابیر میں بھی جانتا ہوں" مقصود نے چڑ کر کہا "اور تنویر بھی ان سے واقف ہے۔"

"اس کے باوجود یہ اب بھی مؤثر ہیں۔ میں محمود شاہی سے بات کرکے کل تمہیں فون کروں گا۔"

یہ اشارہ تھا کہ ملاقات ختم ہوئی۔ مقصود اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ ظہور۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے لیے جو کچھ بھی کرسکتے ہو' ضرور کروگے۔"

ظہور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں اس کے دونوں باڈی گارڈز بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اوسط قدوقامت کے تھے۔ ان کے لباس کے نیچے غیر فطری ابھار بتا رہے تھے کہ وہ مسلح ہیں۔ دونوں تاجوری معلوم ہوتے تھے۔ جو بیٹھا ہوا تھا' وہ مقصود کو جانا پہچانا لگا۔

"متین!" ظہور نے بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا "تم مقصود صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آؤ... حفاظت سے۔"

متین اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی قمیص کے بٹن بند کیے۔ وہ محمود شاہی کے عہد میں واجد کے یونٹ میں اس کے ساتھ کام کرچکا تھا۔ اس کے بعد بھی دونوں کا تعلق نہیں ٹوٹا تھا۔ واجد نے ہی اسے ظہور کی حفاظت کی ذمے داری سونپی تھی۔

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا" ظہور نے مقصود کو یقین دلایا۔

مقصود نے سر کو تھپکی جنبش دی اور متین کے ساتھ باہر نکل آیا۔

○☆○

مقصود کے جانے کے بعد ظہور اپنی اسٹڈی میں گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ محمود شاہی سے صرف طے شدہ وقت پر ہی بات کی جاسکتی تھی اور اس میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف کھینچا اور شاکر کا نمبر ڈائل کیا۔ ساتھ ہی اس نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کردیا۔ اس میں جلنے والی نیون ٹیوب فون کے اردگرد کام کرنے والے کسی بھی مائیکرو ٹرانسمیٹر کو بے کار کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

"ظہور بول رہا ہوں" شاکر کی آواز سننے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا "شکار سے متعلق ایک اہم بات سامنے آئی ہے۔"

"معموں میں بات نہیں کرو" دوسری طرف سے شاکر نے کہا "تمہارے فون کو محفوظ بنا دیا گیا ہے۔"

"مقصود آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ رات تنویر الزماں اس کے گھر پہنچا اور اس سے نزارس کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا خوبرو تاجوری بھی تھا۔ وہ دونوں مقصود کو قتل کرنے والے تھے مگر مقصود کی ایک پڑوسن آدھمکی۔ یوں اس کی جان بچ گئی۔"

"مقصود نے انہیں نزارس کے بارے میں کیا بتایا؟"

"جو کچھ جانتا تھا' سب بتادیا۔"

شاکر چند لمحے خاموش رہا "تنویر کی زبان سے شاید پھسل گیا ہو کہ اسے نزارس کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا؟"

"تم جانتے ہو' تنویر کی زبان پھسلے گی تو کیا' گھلوائی بھی نہیں جاسکتی۔"

"مقصود اب کہاں ہے؟"

"میں نے اسے حفاظتی تدابیر سمجھا کر متین کے ساتھ گھر واپس بھیج دیا ہے۔"

"کیا وہ بہت خوف زدہ ہے؟"

"ہاں لیکن بے فکر رہو وہ ٹوٹے گا نہیں۔"

"تنویر کے ساتھ نیاز ہوگا" شاکر نے خیال آرائی کی۔

ظہور کے لیے وہ نام جانا پہچانا تھا۔ نام سنتے ہی اسے نیاز کا چہرہ بھی یاد آگیا۔ نیاز گیٹ وے اسکینڈل میں ملوث ان لوگوں میں سے تھا جن پر جرم ثابت ہوا اور سزا بھی سنائی گئی۔

"میں صاحب سے بات کروں گا" شاکر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ظہور نے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا پائپ بجھ چکا تھا۔ اس نے اسے دوبارہ سلگا لیا۔ وہ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا تھا جو کس قدر خطرات میں گزرے تھے۔

اور تنویر الزماں کوئی کم خطرناک حریف نہیں تھا!

○☆○

حارث دکان کے باہر کھڑا بنارس کے اکیلے ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی شخص گزشتہ آدھے گھنٹے سے دکان میں گھسا بنارس سے بات کر رہا تھا۔ وہ خوف زدہ معلوم ہوتا تھا۔ بعید از امکان نہیں تھا کہ چوری کا مال فروخت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ حارث کو بہرحال بنارس کی غیر قانونی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بالآخر وہ شخص کاغذ کا ایک بڑا تھیلا لیے باہر آیا جبکہ دکان میں جاتے وقت وہ خالی ہاتھ تھا۔

حارث نے دونوں طرف دیکھا' سڑک پار کی اور بنارس کی دکان میں داخل ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ دھکیلا' دکان میں گھنٹی بجنے لگی۔

بنارس چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ نقوش ایسے تھے کہ لگتا تھا' ہر شخص سے ناراض ہے۔ چہرے کا تاثر زبان حال سے کہتا معلوم ہوتا تھا۔ 'دنیا بہت کمینی جگہ ہے۔ مگر میں بھی اس سے نمٹنا خوب جانتا ہوں...' شاید وہ محسوس بھی یہی کرتا تھا۔

اس نے حارث کو متوقع نظروں سے دیکھا اور ایک زبردست چھینک کو بھگتایا۔

"نزلہ ہو رہا ہے؟" حارث نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بنارس نے نفی میں سر ہلایا "کوئی الرجی ہے" اس نے کہا پھر پوچھا "کچھ خریدنا ہے یا بیچنا ہے؟"

"نہ خریدنا ہے' نہ بیچنا ہے۔ تمہارے بہنوئی نیاز کے متعلق کچھ پوچھنا ہے۔"

"تم پولیس والے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے تو بس نیاز سے مل کر کچھ بات کرنی ہے۔"

بنارس ہنسا اور اس نے کندھے جھٹک دیے "تب تو تم غلط مقام پر آئے ہو۔ میری نیاز سے بنتی ہی نہیں۔ ویسے نیاز سے بات کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی تمہیں؟"

"سخی بات بتاؤں" حارث نے کہا "وہ میرا مقروض ہے۔"

"آؤ دونوں مل کر ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر خوب روئیں۔ بھائی' وہ تو میرا بھی مقروض ہے" بنارس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ بلکہ اس کے انداز... سے لگتا تھا کہ وہ نیاز کو بار بار قرض بھی دیتا رہا ہے اور اس کے قرض خواہوں کے دکھڑے سننا بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔

"یہ بتا دو کہ وہ کہاں مل سکے گا" حارث نے کہا۔

بنارس نے نفی میں سر ہلایا اور بڑی تندہی سے اپنا کان کھجانے لگا "تم نے نجمہ سے معلوم کیا؟"

"اس کی بیوی سے؟"

"ہاں... میری بدنصیب بہن!" بنارس نے درد بھرے لہجے میں کہا "خدا نے مجھے دماغ بہت اچھا دیا اور میری بہن کو صورت بہت اچھی دی لیکن قسمت ہم دونوں ہی کو اچھی نہیں ملی۔"

"اسے بھی نہیں معلوم کہ نیاز کہاں ہوگا" حارث نے اسے مطلع کیا۔

"اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں اور جو شخص اپنی بیوی کو نہ بتائے کہ وہ کہاں جا رہا ہے' وہ سالے کو کیا بتائے گا۔ تین ہفتے ہوگئے سالے کو بھاگے ہوئے...."

"سالے کو نہیں' بہنوئی کو" حارث نے تصحیح کی "اور تین ہفتے؟"

"ہاں۔ تین ہفتے۔ اس دوران شاید دوبار فون کیا ہوگا اس نے۔ عجیب آدمی ہے۔ میرا مشورہ مانو تو اپنی رقم کے سلسلے میں تم بھی وہی کرو جو میں کر چکا ہوں۔"

"کیا کروں؟"

"صبر کرلو" بنارس نے کہا۔ پھر جلدی سے بولا "تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اس پر رقم کی وصولی کے لیے کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالنا۔ وہ بہت غصہ ور ہے اور غصے میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں تو اپنی رقم پر صبر کر چکا ہوں۔"

پھر گھنٹی بجی۔ حارث نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر جیب سے کارڈ نکال کر بنارس کی طرف بڑھایا "وہ آجائے تو اس نمبر پر فون کر کے مجھے بتا دینا۔ میں بڑی سیاست سے کام کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے' اسے تمہاری رقم ادا کرنے پر بھی منا لوں۔"

بنارس فکرمند نظر آنے لگا "بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا...."

"کہ میں اس پر سختی کروں؟" حارث نے پوچھا۔

"ہاں جی۔"

حارث مسکرایا "تم بالکل فکر نہ کرو۔ تمہارے بہنوئی کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"میں دراصل نیاز کے لیے نہیں' اپنی بہن کے لیے پریشان ہوں" بنارس نے کہا اور دکان میں آنے والے گاہک کی طرف

متوجہ ہوگیا "جی فرمایئے۔"

"شکریہ بھئی بنارس صاحب" حارث نے کہا اور دکان سے نکل آیا۔

وہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کرپایا تھا۔ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوتی۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاملات اچانک ہی ناقابل یقین تیز رفتاری سے چل پڑتے ہیں۔

دوپہر ہوچکی تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ ابھی اسے چند گھنٹے گزارنا تھے۔ چنانچہ وہ ایک ہوٹل کے ٹھنڈے لاؤنج میں جا بیٹھا۔ کولڈ ڈرنک طلب کرنے کے بعد وہ سوچنے لگا۔ سوچنے کے لیے یہ آئیڈیل ماحول تھا۔ ایسے میں اس کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔

یہ کیس ایک زاویے سے بے حد دلچسپ تھا۔ اس میں متوقع شکار تعداد کے اعتبار سے کافی زیادہ تھے۔ قاتل جب بھی کسی کو شکار کرتا تو اپنی آئندہ کی سرگرمیوں کے میدان کو کچھ سکیڑ لیتا یعنی ہر کامیابی کے ساتھ قاتل کے گرفت میں آنے کا امکان بڑھ جاتا تھا۔

کامیابی ہی ناکامی کے لیے راہ ہموار کرتی ہے!

حارث سوچ رہا تھا کہ بنارس اتنا بے خبر نہیں، جتنا ظاہر کررہا تھا۔

○☆○

ظہور کو جتنا پسینہ آرہا تھا، اتنا صرف موٹوں ہی کو آسکتا ہے۔ کسی دُبلے آدمی کو اتنا پسینہ آتا تو وہ تحلیل ہی ہوچکا ہوتا۔

ائرکنڈیشننگ یونٹ جو پانچ منزل اوپر نصب تھا، گزشتہ رات خراب ہوگیا تھا۔ مکینک بلائے گئے تھے مگر وہ ابھی تک آئے نہیں تھے۔

بیئر کی چوتھی بوتل صاف کرنے کے بعد وہ صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیل میں کیا حشر ہوگا، مگر نہیں.... وہ سابق اٹارنی جنرل تھا۔ اس کے ساتھ گھٹیا مجرموں کا سا سلوک تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے اے کلاس ملنا تھی۔ یہ طے تھا کہ جیل کی کوٹھری میں ائرکنڈیشنر بھی لگادیا جائے گا۔

'تو پھر جیل ہی کیوں نہ چلا جائے۔' اس نے سوچا۔ 'اگر میں اپنی سزا کاٹنے کے لیے مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تو اخبار نویسوں کو کیسا شاک لگے گا۔ لیکن نہیں.... ان لوگوں کو شاک کہاں لگتا ہے۔ انہیں تو کسی بات پر بھی حیرت نہیں ہوتی۔'

ظہور نے شاکر سے گفتگو کے بعد شامی سے بات کی تھی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ یعنی مقصود کو بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ بس یہی بتایا جاسکتا تھا کہ محمود شامی نے یقین دہانی کرائی ہے کہ اس کے تحفظ کا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔

اسے یاد آیا کہ آج شامی اور شاکر کی ملاقات طے ہے۔

میز پر رکھا تھرمامیٹر بتارہا تھا کہ کمرے کا درجۂ حرارت ۸۶ درجہ فارن ہائٹ ہے۔ ظہور نے شکر ادا کیا کہ ہائیڈرومیٹر موجود نہیں ورنہ ہوا میں نمی کا تناسب جان کر وہ اور کڑھتا۔ مسئلہ صرف گرمی کا نہیں تھا۔ شدید حبس بھی تھا۔

چھوٹی آستینوں کی قمیص پسینے میں بھیگنے کے بعد اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر اور غصہ آرہا تھا کہ اس کے باڈی گارڈز کو گرمی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ خود اس کے جسم پر پسینہ کیڑے مکوڑوں کی طرح جابجا رینگتا، سرسراتا پھر رہا تھا۔ اس نے بیئر کی پانچویں بوتل کھول لی۔ پھر فون اپنے سامنے کھسکایا اور بلڈنگ کی انتظامیہ کا نمبر ملایا۔

"ائرکنڈیشننگ یونٹ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا ہے" اس نے شکایت کی۔

"تحمل سے کام لیں جناب، ہوجائے گا۔"

"کب ہوجائے گا آخر؟" وہ دہاڑا "یہ میرا پانچواں فون ہے اور پانچوں بار مجھے لفظ بہ لفظ یہی جواب ملا ہے۔ تم آدمی ہو کہ کمپیوٹر" اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

وہ پھر صوفے پر دراز ہوگیا۔ اس نے پائپ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر فوراً ہی ارادہ بدل دیا۔ اتنی گرمی میں پائپ سُلگانا.... کچھ بھی سُلگانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اٹھا اور بک شیلف کی طرف بڑھا کہ مطالعے ہی میں وقت گزاری کرے مگر جن کتابوں پر اس کی نظریں جمیں، وہ بھی گرمی کا احساس دلانے والی تھیں.... دانتے کی جہنم اور بال کی ایک گرم رات کی بات....

ظہور اب رات کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔ سورج غروب ہوگا تو درجۂ حرارت کم ہوگا۔

پہلے وہ دونوں باڈی گارڈز کے ساتھ گھر سے نکلا تھا اور ایک ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا تھا۔ لیکن وہاں اسے سکون نہیں ملا۔ خطرے کا احساس اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ اس نے سوچا، ایسے خطرناک آرام سے محفوظ بے آرامی بھلی۔ وہ اپارٹمنٹ واپس آگیا تھا۔

مگر وہ دوپہر سے پہلے کی بات تھی۔ تب گرمی اتنی نہیں تھی۔

اس نے فریج کھول کر بیئر کی ایک بوتل نکالی۔ اس بار اس نے بیئر گلاس میں انڈیلی۔ پھر اس میں ٹرے کے تمام آئس کیوب بھی ڈال دیے۔ 'اب شاید بیئر واقعی کچھ ٹھنڈک پہنچا سکے گی۔' اُس نے سوچا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بیئر کو اس طرح پینا خلافِ اصول ہے۔

اس نے ایک گھونٹ میں آدھی بیئر حلق سے اتار لی۔ پھر بیٹھا غور کرتا رہا کہ جسم کے اندر گرمی کی اذیت میں کچھ کمی ہوئی ہے یا نہیں؟

بالکنی کے شیشے کے دروازے سے اس نے پودوں کے پتوں کو ہلتے دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہوا چل رہی تھی۔ وہ بیئر کا گلاس ہاتھ میں لیے اٹھا، سلائڈنگ ڈور کو دھکیلا اور بالکنی میں چلا گیا۔

بالکنی میں سایہ تھا۔ وہ کمرے کے مقابلے میں کافی خنک معلوم ہورہی تھی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس کی پسینے میں تر قمیص سے ٹکرایا

تو اسے بے اندازہ سکون کا احساس ہوا۔ اس نے ہیٹر کا ایک گھونٹ لیا اور جھک کر نیچے پارک کا منظر دیکھنے لگا۔ سرسبز منظر سکون اور ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا۔ اسے دو کبوتر.... بالکل سفید کبوتر اڑتے ہوئے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ پھر وہ نچلی کسی منزل کی کھڑکی پر جا بیٹھے۔ اس نے ہیٹر کے ساتھ ایک آئس کیوب بھی منہ میں لے لیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اسے چبانے لگا۔

نرم کناروں والی تیز رفتار گولی اس کے سینے سے ٹکرائی۔ سینے کی موٹی ہڈی کو توڑنے کے دوران گولی بھی ٹوٹی۔ آدھی گولی اوپر کی طرف اٹھی اور گلے کو اندر سے پھاڑتی ہوئی باہر نکلی۔ دوسری نصف نے اس کے دل کے بائیں جانب والے خانے کو ادھیڑا اور اس کی پیٹھ میں بہت بڑا خلا چھوڑتی ہوئی نکلی۔

سلائڈنگ ڈور کا شیشہ بلٹ پروف تھا۔ اس پر سرخ اور دودھیا دائرے کا نشان بن گیا۔

ظہور لڑکھڑایا۔ اس کی بے جان ٹانگوں میں جیسے پہیے لگ گئے تھے۔ اس کی جان یوں واضح طور پر نکل رہی تھی کہ اسے پینٹ کیا جا سکتا تھا۔

وہ بالکنی کی ریلنگ سے ٹکرا کر آگے خلا میں گرا تو پہلے ہی مر چکا تھا۔ چالیس منزل نیچے سڑک پر تو بس اسے پھٹ جانا تھا۔ وہ گولی سے نہ مرگیا ہوتا تو وہ بڑی اذیت ناک موت ہوتی۔

○☆○

"مجھے امید نہیں تھی کہ آپ دوبارہ یہاں آئیں گے" شاہدہ نے کہا۔

تنویر نے اندر آنے کے بعد اسے بہت غور سے دیکھا۔ حمید ہمیشہ کہتا تھا کہ شاہدہ کی چھٹی حس بہت تیز ہے اور تنویر بھی یہ بات تسلیم کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہدہ کو ظہور کی موت کا علم ہو چکا ہے اور شاید اب اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا ہے کہ مرنے سے پہلے اس کا شوہر کس کام میں مصروف رہا تھا۔ شاید وہ اپنے شوہر کے بارے میں اس کے اندازے سے بڑھ کر جانتی تھی اور اب تنویر سوچ رہا تھا۔ "یہ اور جانے کیا کچھ جانتی ہوگی؟"

کہا۔ "میں اکثر غیر متوقع کام کرتا ہوں" اس نے دھیمے لہجے میں

"ایسا تو نہیں ہے۔ خیر یہ بتائیں، یہاں کیوں آئے ہیں؟"

اس کے لہجے میں تجسس کے سوا بھی کچھ تھا.... رحم سے ملتی جلتی کوئی چیز۔ تنویر آگے بڑھا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ اس کی طرف مڑا۔ "تم سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا میرے لیے" اس نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری پچھلی آمد کے بعد اب تک کوئی قابل ذکر بات ہوئی ہے؟"

"آپ فون بھی کر سکتے تھے" شاہدہ نے کہا۔ پھر خود ہی بولی "لیکن ان ٹھلوؤں پر آپ اعتبار ہی کب کرتے ہیں۔"

"اور اس کی معقول وجہ بھی ہے۔"

"بہرحال آپ نے یہاں آکر زیادہ بڑا خطرہ مول لیا۔ آپ نے اپنا ایک اصول خود توڑ دیا۔"

تنویر جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے "یہ بات کیوں کہی تم نے؟"

"آپ اس کی وجہ بھی جانتے ہیں" شاہدہ نے جواب دینے سے پہلو تہی کی "اور آپ خطرے سے بھی واقف ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"چھوڑیں۔ کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں۔"

"دیکھو شاہدہ.... کسی کی پروا کرنا ہر شخص کی ضرورت ہوتا ہے۔"

"آپ بھی کسی کی فکر کرتے ہیں؟ یا آپ کو کسی کی فکر کرنے کے لیے کسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"دونوں میں بہت.... معمولی سا فرق ہے۔"

"مگر بہرحال فرق ہے" شاہدہ نے کہا اور اس کی طرف بڑھ آئی "حمید بھی تمہاری ہی طرح تھا۔ بلکہ ایسا بنا دیا گیا تھا۔ سیاسی لوگوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس کے ذہن میں طرح طرح کے فلسفے ٹھونس دیے تھے۔ وہ انہیں کا زینا بیٹھا تھا۔"

"تم غلطی پر ہو شاہدہ۔"

"جی نہیں۔"

نیچے والے فلیٹ میں کوئی مرد چیخ کر گالیاں بک رہا تھا۔ سڑک پر کوئی ہارن بجا۔ کوئی چلایا۔ تنویر صوفے پر بیٹھ گیا جیسے اچانک ہی تھک گیا ہو۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں آیا ہی کیوں۔ شاید لاشعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ اس نے اور حمید نے خود کو پیچیدہ اور لایعنی قسم کے ذاتی چیلنجز میں الجھا لیا ہے۔ انہیں اپنے اپنے منطقی انجام کو پہنچ جانا ہے اور ان کی زندگی کی باگیں اب بھی محمود شامی کے ہاتھ میں ہیں۔

"پچھلی بار آپ کے جاتے ہی حارث نامی ایک شخص یہاں آیا تھا" شاہدہ نے اسے چونکا دیا۔ "کہتا تھا، محکمۂ خفیہ میں ہوں۔"

"تمہارے خیال میں وہ درست دعویٰ کر رہا تھا؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ویسے اس نے شناختی کارڈ دکھایا تھا، وہ حمید کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟"

"چھوٹا قد، نیلی چمکیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی، نکیلی ٹھوڑی۔ عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ پیٹ قدرے نکلا ہوا تھا۔ ہاتھ لمبے لمبے۔ انگلیاں نکوٹین زدہ۔ مسکراہٹ ایسی خوبصورت کہ پل بھر میں اس کی شخصیت بدل کر رکھ دیتی تھی۔"

اس نے اتنا تفصیلی حلیہ بتایا تھا کہ تنویر مسکرا دیا۔ وہ اس کی قوت مشاہدہ کا قائل ہو گیا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ جو شخص نیاز کے متعلق معلومات کرتا پھر رہا تھا، یہ وہی شخص ہو۔ اس نے پانی میں جو کنکر اچھالے تھے، انہوں نے اس کی توقع سے زیادہ

دائرے... بھنور بنائے تھے' اس لیے کہ پانی اس کی توقع سے بہت زیادہ گہرا تھا۔ وہ... وہ تو لزارس سے بھی بے خبر تھا۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد نامعلوم اور بھاری چیزیں حرکت کر رہی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ یہاں آیا تھا... شاہدہ حمید کے پاس۔ یہ فلیٹ وہ جگہ تھی جو اسے اس فریب میں مبتلا کرتی تھی کہ وہ وقت اور بے رحم حالات کی سختی بڑھاتی ہوئی گرفت سے آزاد ہو گیا ہے۔

اسے احساس ہوا کہ اس کا نچلا ہونٹ داہنی جانب سے پھڑک رہا ہے۔

شاہدہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کچن کی طرف سے ایک جانی پہچانی بُو اٹھ رہی تھی' شاید کوئی چیز... ہانڈی جل رہی تھی۔ شاہدہ نے اس بُو کو نظرانداز کر دیا اور اس صوفے کی طرف چلی آئی' جس پر وہ بیٹھا تھا۔

"میں جہاں سے آئی ہوں۔ یعنی تاجورسے... وہاں ایک مقام ایسا ہے جہاں سمندر فرشی ساحل سے ٹکراتا ہے۔ ساحل کی وجہ سے سمندر بھی سُست پڑ جاتا ہے" شاہدہ خواب ناک لہجے میں کہہ رہی تھی "مچھیرے اپنی چھوٹی کشتیوں میں وہاں سے سمندر میں اترنا چاہیں تو لہریں انہیں ساحل پر واپس لا پھینکتی ہیں۔ جب تک وہ سخت جدوجہد نہ کریں' کشتی سمندر میں نہیں لے جا پاتے لیکن جب وہ نیچے والی موجوں کے پار ایک خاص مقام تک پہنچ جائیں تو ان کے پاس واپسی کا امکان نہیں رہتا۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ آگے ہی آگے بڑھتے جائیں" اس نے توقف کیا' ایک گہری سانس لی اور بولی "آپ اس مقام سے گزر چکے ہیں میرے بھائی۔"

"میں جانتا ہوں" تنویر نے کہا۔ اس کی آواز ٹوٹنے لگی تھی۔ اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا۔ آواز میں بس خفیف سی لرزش جھلک سکی "اسی لیے تو میں یہاں آیا تھا بہن' اور اسی لیے تو مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

شاہدہ نے اس کے رخسار پر اپنے سرد ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور اس کا رخسار اپنے کندھے پر ٹکا لیا "بھائی... تم بالکل میرے حمید کی طرح ہو" وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے تھپتھپا رہی تھی "تم کبھی ہار نہیں مانو گے" اس کی آنکھوں میں محبت سی چمکی۔ اس نے جھک کر تنویر کی پیشانی چوم لی "اب جاؤ میرے بھائی۔ الوداع... فی امان اللہ۔"

○☆○

واجد سوچ رہا تھا کہ اب بس ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ تنویر کو مرنا ہو گا... اور یہ کام جتنی جلدی ہو جائے' اتنا ہی بہتر ہے۔ اس نے سوچا ضرور لیکن وہ یہ بات بلند آواز میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ البتہ سابق صدر کے کمرے کی فضا میں یہ خیال رچا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

واجد اور شاکر بڑی میز کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ محمود شامی ٹہل رہا تھا۔

"بنیادی سوال تو یہ ہے کہ اسے معلوم کیسے ہوا یہ راز؟" اس نے رک کر کہا۔ لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

شاکر نے اس سوال کو نظرانداز کر دیا "تنویر سے ہم اور کیا امید کر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ تھا تو اتنا پسند تھا۔ ہمارے خلاف ہوا تو بھی انتہا پسند ہے۔ اس کے دماغ میں تو ٹیڑھ ابتدا ہی سے تھی۔"

"ہم اس سے نمٹ سکتے ہیں" واجد بولا۔

"ہاں... ہاں..." شامی پھر ٹہلنے لگا "ہمیں اس سے جلد از جلد اور فیصلہ کن انداز میں نمٹ لینا چاہیے" وہ رکا اور واجد کی طرف مڑا "تم اب مجھے دن میں دو بار پروگریس رپورٹ دو گے" پھر وہ شاکر سے مخاطب ہو گیا "اور میں اب لزارس سے متعلق مکمل اسٹریٹجی سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔ اب ہمارے سامنے وقت کا مسئلہ ہے۔"

شاکر نے ہاتھ سے سہلا کر بالوں کو ٹھیک کیا اور سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ بہت سنجیدگی سے خوف کو محمود شامی کے چہرے کے نقوش پر اثرانداز ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ممکنہ طور پر محمود شامی سے پہلے اس کی باری آنی ہے۔

یہ کوئی خوش آئند خیال نہیں تھا!

محمود شامی نے ٹہلنا موقوف کیا اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کی مضطرب انگلیاں میز پر طبلہ بجانے لگیں۔ وہ آواز بتدریج بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ خود اسے اس بات کا احساس ہو گیا۔ اس نے انگلیوں کو روک دیا "تمہیں مزید مدد کی ضرورت ہے؟" اس نے واجد سے پوچھا۔

"مزید مدد ملی تو حال اس کچن کا سا ہو گا' جہاں ان گنت باورچی ہوں" واجد نے کہا "تنویر سے نمٹنے کے لیے ہمیں بہت احتیاط اور رازداری سے کام لینا ہو گا۔ میرے پاس جو آدمی ہیں' وہ میرے لیے قابل اعتبار ہیں۔"

"اعتبار تو کر سکتے ہو' یہ بتاؤ' انہیں کنٹرول بھی کر سکتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تنویر اب تک ترتیب صعودی سے کام لے رہا ہے" شاکر نے کہا "اس کا ہر مقتول پچھلے مقتول سے زیادہ اہم' اختیارات اور اپنی پوزیشن کے لحاظ سے بڑا ہوتا ہے۔ مقصود کو وہ ایک بار مس کر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مقصود پر پلٹے گا یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے' پلٹے گا" واجد بولا "وہ تنویر کے لیے نامکمل کام ہے... اور پروفیشنل لوگوں کو نامکمل کام اچھے نہیں لگتے۔ تنویر تو ویسے بھی بہت منتقم مزاج آدمی ہے' وہ مقصود کو آخر کے لیے نہیں چھوڑے گا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے سویٹ ڈش کے بعد کے لیے دہی بڑے بچا کر رکھے جائیں۔"

"تم آدمی ہو یا باورچی؟" محمود شامی نے چڑ کر کہا اور انگلیوں

سے میز پر طبلہ بجانے لگا۔

"بہرحال میں اس سے متفق ہوں" شاکر نے کہا "تنویر خود کو آلۂ انصاف سمجھتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مقصود اس کا اگلا شکار ہوگا۔"

"تنویر ہمیں نہیں ملتا تو نہ ملے۔ ہم اس کے مقصود پر جھپٹنے کا انتظار کریں گے" واجد بولا۔

محمود شامی نے ہونٹ سکیڑے۔ لفظ 'چارا' اس کے ہونٹوں پر ٹھہرا مگر اس نے اسے ادا نہیں کیا۔ اس نے کہا "تم لوگ اپنے اپنے کام میں طاق ہو" پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا "مقصود کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"ایسا نہیں ہوگا" شاکر نے کہا۔

لیکن واجد اس معاملے میں اتنا پُریقین نہیں تھا۔ بمقابل تنویر الزماں جیسا ہو تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ایک پروفیشنل کی حیثیت سے وہ تنویر کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب تنویر چوکنا ہوگیا ہے تو اس تک پہنچنا اور مشکل ہوگیا ہے۔ اسی لیے واجد مقصود پر انحصار کررہا تھا۔ اور پھر مسئلہ وقت کا بھی تھا۔ تنویر کسی کے سامنے زبان کھول بیٹھتا..... نزارس کا تذکرہ کردیتا تو... اب سراب پور کا مرحلۂ انتخاب سر پر تھا۔ پورا کھیل خراب ہوسکتا تھا۔

محمود شامی اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ یقینی طور پر خوف زدہ تھا۔ اس کے جسم کی اینٹھن اس بات کی گواہ تھی۔ اس کے عضلات تنے ہوئے تھے "تم نے سب سے قیمتی لفظ جو استعمال کیا ہے' وہ رازداری ہے" اس نے واجد سے کہا "سب کی بہتری اسی میں ہے کہ تنویر کو مزید معلومات حاصل نہ ہوپائیں" وہ ان دونوں کی طرف مڑا۔ اس کا انداز بے حد جارحانہ تھا۔ "انہوں نے ہماری راہ میں جائز' ناجائز ہر طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن ہم ہر رکاوٹ پھلانگ آئے۔ یہ رکاوٹ بھی ہمیں نہیں روک سکے گی۔"

واجد سوچ رہا تھا' یہ رکاوٹ سے مراد تنویر ہے یا گیٹ وے کی طرف اشارہ ہے مگر اس نے یہ بات پوچھی نہیں۔

"کسی بھی سلسلے میں بات کرنی ہو یا کسی بات کی وضاحت درکار ہو تو تم دونوں کسی بھی وقت یہاں آسکتے ہو" محمود شامی کہہ رہا تھا "پہلے فون کرلینا۔ میں سیکرٹ سروس والوں سے تمہیں کلیئرنس دلادوں گا۔ اس وقت آپریشن نازک ترین مرحلے میں ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد سب آسان ہوگا لیکن آپس کی غلط فہمیوں سے ہمیں بچنا ہوگا۔ فی الوقت ہم کسی غلطی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔" وہ مسکرایا "اب میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا" اس نے سر سے اشارہ کیا کہ میٹنگ برخواست ہوئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر ایک خط پڑھنے لگا۔

شاکر اور واجد دروازے کی طرف چل دیے۔ وہ باہر نکلے' جہاں ان کی کاریں کھڑی تھیں۔ شاکر نے واجد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ واجد نے سر گھما کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "یہاں لفظوں کے ہیر پھیر کی ضرورت نہیں" شاکر نے کہا "تنویر تمہارے رستے چڑھ جائے تو اسے ختم کردو..... ہر قیمت پر۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ کسی اور کے ہاتھوں میں جائے... خاص طور پر قانون کے۔"

"مقصود کو کتنا کچھ بتا سکتا ہوں میں؟"

"اسے کچھ بھی نہ بتاؤ۔ بس تحفظ فراہم کرو اسے۔ اگر اسے تحفظ فراہم نہ کیا گیا تو اس سے تنویر شبہات میں مبتلا ہوگا لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا دردِ سر مقصود نہیں' تنویر ہے۔"

"میں اپنی ترجیحات سے واقف ہوں" واجد نے کہا۔

شاکر اپنی مرسڈیز میں بیٹھ گیا۔ جتنی دیر میں واجد اپنی کرولا میں بیٹھا' مرسڈیز گیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی۔ واجد کی نظریں مرسڈیز کا تعاقب کرتی رہیں۔ گارڈ نے بٹن دبا کر گیٹ کھولا اور الوداعی انداز میں ہاتھ لہرانے لگا۔

واجد سوچ رہا تھا' دنیا میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو؟ اس نے سر جھٹکا' یہ تو ممکن ہی نہیں۔ کوئی بھی قیامت تک نہیں جی سکتا۔

○☆○

واجد نے اپنی گاڑی میں ایونیو کا ایک اور چکر لگایا۔ بیلمونٹ ٹاورز کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کار کی رفتار کم کردی۔ وہ پوری بلڈنگ کو اچھی طرح چیک کرچکا تھا۔ اس نے مقصود کے فلیٹ کا بھی جائزہ لیا تھا۔ اب وہ عمارت کے گردوپیش میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے گاڑی سائڈ میں کی اور رفتار مزید کم کردی۔

بیلمونٹ ٹاورز کے عین سامنے ایک میڈیکل اسٹور تھا جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ کچھ پیچھے اسی طرف ایک ریسٹورنٹ تھا۔ پھر ریگل شوشائن پارلر تھا جو کافی عرصے سے بند تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ کھلنے والا تھا۔ اس کے لیے بورڈز تیار کیے جارہے تھے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں یا تو اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں یا دفاتر۔ کارنر پر ایک اور ریسٹورنٹ تھا۔ واجد نے بند دکان کا پتا نوٹ کیا اور گاڑی کو دوبارہ ٹریفک کے دھارے میں شامل کردیا۔

اگلے کارنر پر اس نے گاڑی پارک کی اور پیدل بیلمونٹ ٹاورز کی طرف چل دیا۔ لابی میں پبلک فون موجود تھے۔ وہاں اس نے دو کالیں کیں۔ پھر وہ لفٹ کی طرف چل دیا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا۔ واجد نے اندر جا کر اوپر والا بٹن دبادیا۔

متین اور قادر..... وہی دونوں تاجوری جو ظہور کے باڈی گارڈز کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے تھے' اپارٹمنٹ نمبر T7E میں مقصود کے پاس موجود تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔ مقصود اسی صوفے پر بیٹھا تھا' جہاں بیٹھ کر اس نے تنویر اور نیاز کے سوالوں کے جواب دیے تھے۔

دروازہ متین نے کھولا۔ پھر دروازہ بند کرکے وہ وہیں کھڑا رہا۔

"مقصود صاحب' آپ صرف ہماری ہدایات پر عمل کریں' محفوظ رہیں گے اور جب تنویر پکڑا جائے گا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا" واجد نے کہا۔

مقصود بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا اور بے رنگ ہورہا تھا۔ وہ پرنٹڈ شرٹ اور سیاہ پتلون پہنے تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں سیدھے ہاتھ سے قمیص کی آستین مروڑے جارہا تھا "خدا کی پناہ ..." وہ لرزتی آواز میں بولا "میں نے ظہور کے متعلق سنا تو..."

"ظہور صاحب نے ہدایات پر عمل نہیں کیا تھا" واجد نے کہا "ورنہ وہ زندہ ہوتے۔ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ بالکنی سے دور رہیں۔"

قادر اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ متین کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ اب بھی دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"تمہارا خیال ہے' تنویر واقعی یہاں آئے گا؟" مقصود نے پوچھا۔ لہجہ بتاتا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نفی میں سننا چاہتا ہے۔

واجد نے کہا "مجھے اس میں شک ہے لیکن آپ نے تحفظ طلب کیا تھا' وہ آپ کو فراہم کردیا گیا۔ اور جہاں تک احتیاط کا تعلق ہے تو احتیاط کرنے سے کوئی نقصان تو ہوتا نہیں ہے۔ اور وہ آپ کی طرف سے ہم کریں گے۔ آپ اپنے معمول کے مطابق رہتے رہیں' جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ متین اور قادر آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

"محمود شامی تک میرا شکریہ پہنچا سکتے ہو؟" مقصود نے پوچھا۔

"کیوں نہیں' پہنچادوں گا۔"

مقصود نے اپنی آستین کا پیچھا چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا "میری دعا ہے کہ اس جھنجٹ سے جلد از جلد جان چھوٹ جائے" اس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر واجد کو دیکھا "تم تنویر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"جتنا جاننا ضروری ہے' جانتا ہوں۔"

"کیا وہ اتنا ہی خطرناک ہے جتنا اس کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے؟"

"شاید وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے لیکن میں کسی بھی اعتبار سے اس سے کم نہیں ہوں۔"

الفاظ سنجیدگی سے ادا کیے گئے تھے۔ مقصود کو انہوں نے نیا اعتماد بخشا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوگیا۔

"اور یہ ضروری نہیں کہ آپ یہاں قید رہیں" واجد نے کہا "آپ کے محافظ ہر جگہ آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

"لیکن یہاں زیادہ محفوظ نہیں رہوں گا میں؟"

"ضروری نہیں۔ دیکھیں .... تنویر آپ کا تعاقب کرے گا تو نظر میں آجائے گا۔ یہاں تو اسے سہولت ہے... معلوم ہے کہ آپ یہاں ہیں۔ اگر ظہور صاحب باہر ہوتے .... لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے تو اس وقت زندہ ہوتے۔"

مقصود پھر پریشان ہوگیا۔

"یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تو نہیں چلے گا" واجد نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک ہفتہ... زیادہ سے زیادہ دو ہفتے۔"

مقصود نے میکانیکی انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دی لیکن انداز سے لگتا تھا کہ اسے اس بات پر یقین نہیں۔

"متین یہاں کمرے میں آپ کے ساتھ ہوگا۔ قادر نیچے لابی میں ہوگا۔ آپ کو ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوگا لیکن یہ موجود ہوں گے" واجد نے تسلی دینے والے انداز میں مقصود کا بازو تھپتھپایا۔ پھر اس نے قادر کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

مقصود انہیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔

واجد اور قادر لفٹ میں بیٹھ کر نیچے آگئے۔ قادر لابی میں کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ واجد باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قادر جو کہ بہین اسموکر ہے' بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کے فرش پر سگریٹ بجھانے کے نشانات میں قابل قدر اضافہ کرے گا۔

باہر آنے کے بعد واجد بیلمونٹ ٹاورز کے انڈر گراؤنڈ گیراج کے سامنے سے گزرا۔ مقصود کی کار اپنی مخصوص جگہ کھڑی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تنویر' مقصود پر دوسرا حملہ اتنی جلدی تو نہیں کرسکتا۔ اسے یہ احساس بھی ہوگا کہ اس بار اس کے ہدف کو ہر ممکن تحفظ فراہم کیا گیا ہے' ہر احتیاطی تدبیر آزمائی گئی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی ممکن تھا کہ یہ اتنا بڑا چیلنج تنویر کو اور بھڑکادے۔ تنویر ایسا عیار اور خطرناک پروفیشنل تھا جو تمام احتیاطی تدابیر سے الٹا فائدہ بھی حاصل کرسکتا تھا۔

واجد کو ایک ایڈوانٹیج حاصل تھا۔ وہ تنویر کو جتنا سمجھ سکتا تھا' محمود شامی اور شاکر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تنویر کے نزدیک مقصود ایک ایسا قرض نہیں تھا جسے چکانا ضروری ہو۔ اس کے نزدیک وہ ایک ادھورا کام تھا اور کوئی پروفیشنل کسی کام کو ادھورا چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اسے پہلی فرصت میں نمٹایا جاتا ہے۔

اور واجد ایک بات جانتا تھا جو تنویر نہیں جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب آدمی مسلسل قتل کرے تو اس کے اندر کیسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اور وہ تبدیلیاں دل پر اور دماغ کے تاریک گوشوں پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں۔ واجد جانتا تھا کہ ان تبدیلیوں سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ تنویر نہیں جانتا تھا۔

واجد کار میں بیٹھا' انجن اسٹارٹ کیا اور کار آگے بڑھادی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ واپس آنے میں جانے کتنی دیر لگے گی۔

وہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آگیا۔ پلاسٹک کے شاپنگ بیگ میں چار برگر رکھے تھے۔ کافی کا تھرماس تھا اور ایک چابی [illegible] نے چابی سنسان ریگل شوشائن پارلر کے تالے میں لگائی' تالا کھلنے کے بعد اس نے دروازے کو کندھے سے زور ڈال کر دھکیلا۔ دروازہ بالآخر کھل گیا۔

اندر گرد بہت تھی۔ نیم تاریکی میں اسے چھوٹا سا ایک پلیٹ فارم نظر آیا۔ پلیٹ فارم پر چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف گتے کے بکسوں کا ڈھیر تھا۔ چھوٹی سی شوبنڈو میلی ہورہی تھی۔ لگتا تھا کہ دکان بند کرتے وقت اس پر صابن ملا گیا ہے۔

اس نے ہتھیلی سے رگڑ رگڑ کر شیشہ صاف کیا۔ پھر اس نے وہاں ایک کرسی لاکر رکھی اور اس پر بیٹھ کر بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کی طرف دیکھنے لگا۔ نگرانی کرنے کے لیے وہ مناسب ترین جگہ تھی۔

○☆○

کارز والے ریسٹورنٹ میں تقریباً ہر وقت مقبول گانے بجتے رہتے تھے لیکن آواز اتنی نہیں ہوتی تھی کہ گراں گزرے۔ تاہم وہاں بیٹھ کر سکون سے کچھ سوچنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔

حارث وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کرسی کا زاویہ بدل کر اپنی ضرورت کے مطابق کرلیا تھا۔ وہ بہت پُرسکون بیٹھا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ کسی کا انتظار کررہا ہے۔

جہاں وہ بیٹھا تھا' وہاں سے صرف بیلمونٹ ٹاورز کا گیٹ نظر آتا تھا لیکن بلڈنگ کے انڈر گراؤنڈ گیراج کا ایک دروازہ پوری طرح نظر آرہا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ ریسٹورنٹ بند ہونے تک وہ یہاں بیٹھے گا۔ اس کے بعد اپنی کار میں بیٹھ کر نگرانی کرے گا۔ یہاں بیٹھنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ بیلمونٹ ٹاورز کے فلیٹ نمبر 17E کی روشن کھڑکی اسے صاف نظر آرہی تھی۔

○☆○

اس نے جام خالی کرکے ہولڈر میں لگا دیا۔ موسم کی وجہ سے یا ایرپاکٹ کی وجہ سے جہاز ڈولتا تب بھی وہ گلاس ہرگز نہ گرتا۔ وہ ہولڈر خاص طور پر نصب کیا گیا تھا۔

یہ بوئنگ ۷۰۷ و یلکوسٹ انڈسٹریز کی ملکیت تھا اور اسے انتخابی مہم کے لیے عاریتاً دیا گیا تھا۔ وہ خود اس کمپنی کا خاصا بڑا اور اہم حصے دار تھا۔ ابتدا ہی سے اس نے اپنی دولت کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا تھا۔ یہ طے ہے کہ اس نے غربت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن اب وہ ملک کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا۔ اور دولت کوئی بری چیز نہیں تھی' نہ وہ اپنے دولت مند ہونے پر شرمندہ تھا۔ بلکہ اس نے تو یہ دیکھا تھا کہ دولت دوٹوں کو بری طرح کھینچتی ہے۔

وہ جہاز میں اپنے پرائیویٹ کمپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ چھوٹا سا ایک بار تھا۔ صوفہ بوقتِ ضرورت ایک لیور دبانے پر بیڈ میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ ایک چھوٹی میز اور ایک ریوالونگ چیئر بھی تھی۔

کسی پریشر پاکٹ کی وجہ سے جہاز اچانک نیچے گیا تو اس کے سامنے رکھی ٹرے میں موجود نیلے رنگ کے کیپسول ادھر اُدھر لڑھکنے لگے۔ وہ سیکوباربیٹل کے کیپسول تھے۔ کبھی نیند مسئلہ بنتی تو وہ یہ کیپسول لیتا۔ زیادہ کیپسول بیک وقت کھائے جاتے تو مہلک ثابت ہوتا۔

اور اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ایک جام کے ساتھ یہ تمام کیپسول حلق سے اتار لے۔

دو گھنٹے سے اس کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دماغ تنگ کرنے والے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود کو ایک بند بوتل میں قید پتنگے کے طرح محسوس کررہا تھا جو بوتل سے نکلنے کی کوشش میں ہلکان ہورہا ہو لیکن بوتل کا ڈھکنا صرف محمود شامی کھول سکتا تھا۔ وہی اسے آزاد کرسکتا تھا۔

محمود شامی نے وعدے کے مطابق اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا.... سب کچھ! اثر و رسوخ' دولت اور راستے میں آنے والوں کے لیے بدبختی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس پوزیشن میں آجائے گا۔ اس دوران اس کے دو حریف ٹھکانے لگائے جاچکے تھے اور اب وہ پبلک لیگ میں ٹاپ کا آدمی تھا۔

محمود شامی وعدے کا پکا ثابت ہوا تھا!

اسے محمود شامی کی دھمکیوں پر بھی کبھی شبہ نہیں رہا تھا۔ محمود شامی جو کچھ کہتا تھا' کرکے دکھاتا تھا۔ اس کے پاس جو معلومات تھیں' وہ وزارتِ عظمیٰ کے نمبر ایک امیدوار کو پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ محمود شامی ضرورت پڑنے پر ان معلومات کو بڑی سفاکی سے بے دریغ استعمال کرے گا۔

ابتدا میں تو مسئلے کا حل بہت آسان تھا.... محمود شامی سے تعاون! سیاست میں کوئی شخص پوری طرح آزاد نہیں ہوتا۔ کسی سے تعاون کرنا پڑتا ہے' کسی کا دباؤ قبول کرنا پڑتا ہے لیکن گزشتہ سات ماہ میں اسے احساس ہوا تھا کہ محمود شامی نے تو اس کی روح تک خرید لی ہے۔ اب وہ انسان نہیں رہ گیا.... محض ایک کٹھ پتلی ہے' جسے مداری کے اشاروں پر ناچنا ہے۔

اس نے جس طرف مڑنے کی' جدھر بڑھنے کی کوشش کی' اس کے سامنے ایک ناقابلِ تسخیر دیوار کھڑی ہوگئی۔ صرف ایک راستہ صاف نظر آتا تھا اور وہ راستہ وہ تھا جو محمود شامی نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔

مگر اب اسے ایک اور احساس ستانے لگا تھا۔ اصولاً تو اسے یہ احساس پہلے ہی ہوجانا چاہیے تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ محمود شامی اب نارمل انسان نہیں' وہ پاگل ہوگیا ہے' ہوش مند نہیں رہا' دیوانہ.... جنونی ہوگیا ہے۔

وہ سامنے رکھے ہوئے کیپسولوں کو تکتا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کیپسول اٹھایا اور اسے اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔

مگر پھر اس نے کیپسول دوبارہ ٹرے پر رکھ دیا۔

وہ اپنی انگلی سے پیشانی کو تھپتھپاتا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ شاید وہ دعا مانگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تمام کیپسول ایک

ایک کر کے شیشی میں رکھ دیے۔ شیشی پر کیپ لگانے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک جام بنایا۔ جام سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ کھڑکی سے باہر ہوا میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مجھ میں یہ کیپسول کھانے کی جرأت نہیں تو کیا میں مشکلات میں گھری قوم کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے کام کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ تنہا بھی تھا اور خوف زدہ بھی' ہر لمحہ اس کی خوف زدگی میں اضافہ کر رہا تھا۔

○☆○

تنویر نے دارالحکومت کے میجسٹک ہوٹل میں کمرا لے رکھا تھا۔ وہ پرانے طرز کی بوسیدہ سی عمارت تھی جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔ اندر بھی وہی حال تھا۔ پرانے طرز کی لابی تھی۔ کمرا بھی بس گزارے کے لائق تھا۔

کبھی کبھی تنویر پچھتاتا کہ اسے کسی بہتر ہوٹل میں کمرا لینا چاہیے تھا لیکن ایک طرف تو وہ مہنگے اور آرام دہ ہوٹلوں کو اپنی عادت نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے اور آدمی اپنی عادتوں کی وجہ سے بہ آسانی پکڑا جاتا ہے۔ دوسرے میجسٹک ہوٹل اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے مناسب ترین تھا۔

وہ جانتا تھا کہ عنقریب یہی کمرا اس کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن جائے گا۔ کون سوچ سکتا ہے کہ وہ ایسے کسی کمرے میں رہ رہا ہوگا لیکن فی الوقت تو اسے اس کمرے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ بس وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

وہ کمرے سے نکلا۔ دروازہ لاک کرنے کے بعد اس نے ماچس کی کاغذی دیا سلائی دروازے کی نچلی درز میں پھنسا دی۔ یوں کوئی اس کی غیر موجودگی میں کمرے میں داخل ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا۔ اس سے فرق کچھ نہیں پڑتا تھا اگر کوئی اسے تلاش کر لیتا تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی پروفیشنل ہی ہوتا اور وہ کمرے میں یونہی داخل نہیں ہوتا۔ پہلے دیا سلائی قسم کی کوئی چیز چیک کرتا لیکن یہ احتیاط اس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔

ہوٹل کے باہر کارنر پر ایک اسٹال تھا۔ وہاں سے اس نے صبح کا اخبار خریدا۔ اخبار بغل میں دبا کر وہ ناصر اسٹریٹ کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے ایک بدحال آدمی ملا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رکا اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہتا تھا لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے تو خود مدد کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ کچھ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ تنویر کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔

کچھ فاصلے پر ایک صاف ستھرا ریسٹورنٹ تھا۔ تنویر وہاں چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ کافی بہت اچھی تھی۔ چند گھونٹ لینے کے بعد تنویر نے اخبار کھولا اور میز پر پھیلا لیا۔

اخبار والے اب پچھلی حکومت کے چار اہم اراکین کے قتل کے سلسلے میں واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ بس اتنا تھا کہ انہوں نے کھل کر اس کا نام نہیں لیا تھا۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ سابق صدر محمود شامی نے اضافی تحفظ کا مطالبہ کیا تھا۔ سیکرٹ سروس والے پہلے ہی اسے تحفظ فراہم کر رہے تھے۔

ایک لحاظ سے تنویر کو خوشی ہوئی کہ سب کچھ کھل کر سامنے آگیا ہے۔ اب نرگس اور فوزیہ' محمود شامی کی دستبرد سے محفوظ رہیں گی۔ اب اس کی بیوی اور بچی کو کچھ ہوا تو اخبار والے بھی براہِ راست محمود شامی کو ذمے دار ٹھہرائیں گے۔ تفتیش ہوگی اور اس میں نوازس بھی سامنے آسکتا ہے۔ محمود شامی ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہے گا۔

فی الوقت محمود شامی کی طرح تنویر بھی یہی چاہتا تھا کہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محمود شامی پولیس کی تحویل میں چلا جائے یا اخباری نمائندوں میں گھرا رہے۔ اس طرح اس کا کام اور مشکل ہو جاتا۔

تنویر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ پہلے صفحے پر زیادہ کوریج وزارتِ عظمیٰ کے پبلک لیگ کی طرف سے امیدوار کو دی گئی تھی۔

"ہے نا مذاق؟"

تنویر نے چونک کر دیکھا۔ ہوٹل کا مالک اس سے مخاطب تھا۔ وہ اخبار کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تنویر کاؤنٹر کے بالکل قریب والی میز پر بیٹھا تھا۔

"بھئی کوئی بھی وزیرِ اعظم بنے۔ ہم لوگ تو اپنے اپنے کام کرتے رہیں گے" ریسٹورنٹ کے مالک نے مزید کہا "ہمارے مسائل تو حل ہونے سے رہے۔ یہی سیاست ہے۔ ووٹ سمیٹو' اپنا الّو سیدھا کرو اور ووٹرز کو بھی الّو سمجھ کر سیدھا کرو ڈنڈے کے زور سے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ" تنویر نے مختصراً کہا۔

"یہ سیاست داں سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نہ ہوں تو اسمبلی میں پہنچ ہی نہیں سکتے۔"

"جی ہاں" تنویر نے اخبار فولڈ کر لیا۔

"اب محمود شامی کو ہی لو" ریسٹورنٹ کا مالک سیاست جھاڑنے پر تلا ہوا تھا "وہ ان لوگوں سے بدتر نہیں تھا۔ بس ان جیسا ہی تھا۔ ہاں بے وقوف زیادہ تھا' اسی لیے پکڑا گیا مگر اب کیا ہوگا؟ بے ایمانوں کا ایک اور ٹولہ آجائے گا۔ انتخاب میں ہم چاہیں تو بدمعاشوں کا نیا ٹولہ لے آئیں ورنہ پرانا ٹولہ تو ہے ہی۔ کھیل تو ایک ہی ہے۔ ہم ووٹوں کے زور سے کھلاڑی بدل دیتے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

ایک گاہک بل دینے آیا تو ریسٹورنٹ کا مالک اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تنویر اخبار پڑھنے کی اداکاری کرنے لگا۔ درحقیقت وہ

یہ سوچ رہا تھا کہ قصر جمہوریت کے حفاظتی انتظامات میں کس قسم کا اضافہ ہوا ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ قبل از وقت پریشان ہو رہا ہے۔ محمود شامی مستقبل کا ہدف ہے' حال کا نہیں۔ حال کا مسئلہ بھی کچھ کم اُلجھا ہوا نہیں تھا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں' میں ووٹ دوں گا؟" ریسٹورنٹ کا مالک پھر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"جی نہیں۔"

"میں ووٹ نہیں دوں گا۔ میں جان چکا ہوں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

تنویر کو الفاظ جانے پہچانے لگے۔ پھر اسے یاد آیا کہ شاہدہ نے یہی بات کہی تھی مگر غصے سے نہیں۔ سادگی سے..... جیسے کوئی بڑی سچائی بیان کی ہو۔

"یہ وہ گرہ ہے' جسے کوئی نہیں کھول سکتا" ریسٹورنٹ کے مالک نے کہا۔

تنویر نے کافی کے پیسے ادا کیے اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ چلتے ہوئے وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد اسے نیاز سے ملاقات کرنی تھی لیکن ابھی وہ ہوٹل واپس جانے کے موڈ میں بھی نہیں تھا۔

وہ یونہی پیدل چلتا رہا۔ بازاروں میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ فٹ پاتھ پر چلنا بھی آسان نہیں تھا۔ آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو.....

وہ چلتا رہا۔ کبھی کسی شوکیس کے سامنے رک کر وہ سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتا۔ اسے اپنی بیٹی نرگس بہت یاد آرہی تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے نہیں گیا تھا... اور اب جا بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ چلتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ میجسٹک ہوٹل کے سامنے کھڑا ہے۔

دنیا گول ہے!

○☆○

واجد ریگل شوشائن پارلر میں وقت گزارتے گزارتے عاجز آچکا تھا۔ وہاں کی سیلن سے اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ طرح طرح کی بدبوئیں الگ ستاتیں۔ ان میں بوٹ پالش کی بُو بھی ہوتی۔ ایک بار گتے کے بکسوں کی طرف سے عجیب سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پھر اس نے سوچا' کوئی چوہا ہوگا۔

اس وقت سائے لمبے ہو رہے تھے اور شام کا جھٹ پٹا اُتر رہا تھا۔ سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا' بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہوئی۔ وہ بیوہ تھی اور دوسری منزل کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ سامنے سے چند کاریں گزریں اور بیلمونٹ ٹاورز کی لابی کا منظر لمحاتی طور پر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا اور پھر سامنے آگیا۔ قادر بدستور لابی میں موجود تھا۔ بیلمونٹ ٹاورز کے گیراج سے سرخ فورڈ برآمد ہوئی۔

واجد کو وہاں ڈیرا جمائے وہ تیسرا دن تھا اور اب وہ بے زار ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان کا اندازہ غلط ہے تو اس وقت تنویر کیا کر رہا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ یہاں وقت برباد کرتے رہیں اور تنویر کہیں اور ہاتھ صاف کر جائے۔

فرش پر رکھے ہوئے واکی ٹاکی سے سگنل موصول ہوا۔ واجد نے ہاتھ بڑھا کر واکی ٹاکی اٹھالیا۔

دوسری طرف سے متین کی واضح آواز سنائی دی "ہم جا رہے ہیں.... کار میں۔"

"ٹھیک ہے" واجد نے جواب دیا۔

وہ اٹھا اور اس نے واکی ٹاکی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ اس نے اپنے کپڑے جھاڑے اور اپنے عقب میں دروازہ مقفل کرتے ہوئے پارلر سے نکل آیا۔ وہ سرسری انداز میں اپنی کار کی طرف بڑھا اور بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔

کوئی تیس سیکنڈ کے اندر مقصود کی کار انڈر گراؤنڈ گیراج سے نکلی اور ٹریفک میں شامل ہوگئی۔ اس کے پیچھے سیاہ مورس تھی' جسے قادر ڈرائیو کر رہا تھا۔ پھر قادر نے ایک گاڑی کو اپنی اور مقصود کی کار کے درمیان آنے کا موقع دیا۔

دونوں کاروں کے کچھ آگے نکل جانے کے بعد واجد نے اپنی کرولا بھی آگے بڑھادی۔ اس نے اپنی گاڑی خاصی پیچھے رکھی تاکہ دونوں گاڑیوں پر نظر رکھ سکے۔ یہ کام اس لیے آسان تھا کہ اسے معلوم تھا کہ مقصود کہاں جا رہا ہے۔ تیئسم ایونیو پر صنوبر ریسٹورنٹ تھا' مقصود وہاں رات کا کھانا کھاتا۔ یہ مسلسل تیسری رات تھی کہ وہ رات کا کھانا اسی ریسٹورنٹ میں کھانے والا تھا۔ واجد کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ سیکیورٹی کے نکتۂ نظر سے معمولات مخدوش ثابت ہوسکتے ہیں۔ تاہم اس نے یہ بات مقصود سے نہیں کہی تھی۔

سورج اب غروب ہو رہا تھا۔ واجد نے ہاتھ بڑھایا اور ہیڈ لائٹس کا سوئچ آن کردیا۔

اب وہ مصروف علاقے میں تھے۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ اور فٹ پاتھ پر بھی بہت رش تھا۔ کچھ فاصلے پر سگنل کی وجہ سے ٹریفک رُکا۔ واجد کو قادر کی کار کا بمپر نظر آرہا تھا۔

کافی آگے..... بہروز اسٹریٹ پر واجد کو اس سیاہ پلائی ماؤتھ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے گزشتہ روز ریسٹورنٹ سے واپس آتے ہوئے اس کار کو مقصود کی کار کے پیچھے دیکھا تھا۔ واجد کو یقین تھا کہ یہ وہی کار ہے۔ ڈرائیور بھی وہی تھا۔

اس نے پلائی ماؤتھ کا نمبر ذہن نشین کرلیا۔

باقی تمام راستے واجد پلائی ماؤتھ کے پیچھے رہا۔ ٹریفک کے گڈمڈ ہوجانے سے کئی بار پلائی ماؤتھ اور واجد کی کرولا' قادر کی مورس سے آگے نکل گئیں۔

ریسٹورنٹ پہنچتے پہنچتے واجد کو یقین ہوگیا کہ سیاہ پلائی ماؤتھ کا

ڈائیور' مقصود کا پیچھا کر رہا ہے لیکن اسے اس کی اور قادر کی موجودگی کا علم نہیں۔

جس دوران مقصود ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا' پلائی ماؤتھ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی رہی۔ واجد نے اپنی گاڑی خاصی پیچھے پارک کی تھی۔ پلائی ماؤتھ کا ڈائیور گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔

پون گھنٹے بعد مقصود ریسٹورنٹ سے نکلا۔ قادر اس سے صرف ایک قدم پیچھے تھا۔ واجد نے اندازہ لگایا کہ وہ پلائی ماؤتھ کو مارک کر چکا ہے اور اب اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے قادر نے اپنی مورس مقصود کی کار سے تقریباً ملائے رکھی۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے اسے آگے نکلنے دیا۔ چند لمحے بعد پلائی ماؤتھ بھی ان کے پیچھے چل دی۔

واجد نے اپنے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور قادر سے کہا کہ واپسی کا روٹ بدلے پھر اس نے اپنی گاڑی پلائی ماؤتھ کے پیچھے لگا دی۔

○☆○

آدھے گھنٹے بعد واجد' متین اور قادر بیلمونٹ ٹاورز کی لابی میں کھڑے تھے۔ مقصود اپنے اپارٹمنٹ میں محفوظ تھا۔

"اس نے جاتے اور آتے ہوئے مقصود کا تعاقب کیا" واجد نے بتایا "وہ کارنر والے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گیراج کی نگرانی کرتا ہے۔"

متین کی آنکھوں سے تشویش جھلکنے لگی "اور کار؟"

"نمبر پلیٹ کی بنیاد پر میں نے تفتیش کی۔ کار کرائے پر لی گئی ہے۔"

قادر نے سگریٹ کے ٹوٹے سے ایک اور سگریٹ سلگائی اور ٹوٹا فرش پر جوتے سے رگڑتے ہوئے واجد کو غور سے دیکھا۔ "یہ تنویر کا آدمی تھا؟"

"ممکن ہے' لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ لگتا ہے' وہ بھی میری طرح صرف نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے پہلے اسے نہیں دیکھا" واجد نے جواب دیا۔

تینوں کچھ دیر خاموش کھڑے سوچتے رہے۔ اس سلسلے میں کئی امکانات ان کے سامنے تھے کہ پلائی ماؤتھ والا کس کی نمائندگی کر رہا ہوگا لیکن ہر امکان پیچیدگیوں میں اضافہ کرنے والا تھا۔

"یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ مقصود کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتانا ہے" بالآخر واجد نے کہا۔

متین مسکرایا "بالکل نہیں۔ وہ تو پتا کھڑکنے سے بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ ہارٹ فیل ہو جائے گا اس کا یہ سن کر۔"

"معمولات جاری رہیں گے۔ بس اس نئے ستارے پر نظر رکھنا۔"

متین لفٹ کی طرف چل دیا اور واجد لابی سے باہر نکل آیا۔

○☆○

اگلی صبح مقصود ذرا دیر کے لیے کسی کام سے اپنے بینک گیا۔

پلائی ماؤتھ نے اس کا تعاقب کیا۔ واپس آنے کے بعد وہ اپنے قلعے یعنی کارنر والے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ جیسے اپنا فرض پورا کر چکا ہو۔

دن کا باقی حصہ مقصود نے اپنے اپارٹمنٹ میں گزارا۔ واجد ریگل شوشائن پارلر میں بیٹھا اپنے تھرماس سے انڈیل انڈیل کر کافی پیتا رہا۔ بے زاری کا علاج اسے کافی ہی لگ رہی تھی۔

شام کے قریب واجد نے باہر جھانکا۔ بوڑھی عورت بیلمونٹ ٹاورز میں داخل ہو رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے ایک شخص کھڑا راہ گیروں کو کوئی پمفلٹ تھما رہا تھا۔ واجد اسے پہلے بھی اسی جگہ دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

بلڈنگ کے سامنے ایک ٹیکسی رکی۔ اس میں سے ایک موٹی عورت گھنگریالے بالوں والی ایک لڑکی کے ساتھ اُتری۔ عورت نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی چلی گئی۔ عورت اور لڑکی لابی میں چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی واجد کو گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا پھر بات سمجھ میں آ گئی۔

اس دوران پمفلٹ بانٹنے والا غائب ہو چکا تھا۔

واجد کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف لپکا لیکن پمفلٹ بانٹنے والا کہیں نظر نہیں آیا۔ عورت اور لڑکی کو ٹیکسی سے اتر کر لابی میں داخل ہونے میں بمشکل بیس سیکنڈ لگے ہوں گے اور اتنی دیر میں وہ غائب ہو گیا۔ اتنے کم وقت میں تو یہ ممکن نہیں تھا.... بشرطیکہ.... بشرطیکہ وہ بیلمونٹ ٹاورز کے دوسرے دروازے پر نہ چلا گیا ہو۔ گیراج کے دروازے پر!

واجد اتنی تیزی سے اٹھا کہ کرسی اُلٹ گئی۔ وہ تیر کی طرح پارلر سے نکلا' بھاگ کر سڑک پار کی۔ پارکنگ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔

انڈر گراؤنڈ گیراج بہت بڑا تھا۔ اس کے اوپر پوری بلڈنگ تھی۔ سیمنٹ کے بہت بھاری ستون اسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ چھت سے زنجیروں کی مدد سے بلب لٹکائے گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر فیوز ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی بہت کم تھی۔ گیراج میں کوئی بیس کے قریب کاریں موجود تھیں۔

دروازے میں کھڑے ہو کر واجد نے اندر کی نیم تاریکی کو دیکھا۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اندر داخل ہوا اور اس طرف بڑھا جہاں مقصود کی کار کھڑی ہوتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا' ممکن ہے پمفلٹ بانٹنے والا فوری حاجت سے مجبور ہو کر گیراج کی طرف لپکا ہو لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ پمفلٹ بانٹنا محض اس کے بہروپ کا ایک حصہ ہو۔ وہ یہاں یہ سوچ کر آیا ہو کہ مقصود اپنی کار کی طرف آئے تو اسے ٹھکانے لگا دے۔ گزشتہ تین دن سے مقصود اسی وقت باہر جا رہا تھا۔

گیراج میں خنکی تھی۔ فرش پر جا بجا پٹرول اور موبل آئل کے

دھبے تھے۔ گریس کی بُو بہت تیز تھی۔ اور کہیں سے فرش پر پانی بوند بوند گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ واجد دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر پھر دیوار کے ساتھ منسلک آگ بجھانے والے آلات کی وجہ سے دیوار سے ہٹنا پڑا۔

وہ مقصود کی کار سے پچاس فٹ دور تھا کہ اس نے کار کی چھت کے اوپر ایک سر ابھرتے دیکھا۔ کوئی کار کے پیچھے چھپ کر گیراج کی پوزیشن کا جائزہ لے رہا تھا۔ واجد اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ وہ جہاں کھڑا تھا' وہاں سائے بہت تھے۔ وہ خود بھی ان سایوں میں شامل معلوم ہو رہا ہوگا۔

اس نے بہت آہستگی سے سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اس شخص نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

وہ شخص اب متحرک نظر آیا۔ واجد نے اپنی نگاہ پر زور دیا۔ وہ شخص اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔

واجد اسے دیکھتا رہا' اس نے کوٹ اتارا اور کھلی کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر اسے کار کی سیٹ پر رکھ دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے مخالف سمت چل دیا۔ اس کا رخ گیراج کے بغلی دروازے کی طرف تھا۔ ایک لمحے کو اس کے وجود نے بغلی دروازے کے خلا کو بھر دیا۔ پھر وہ سڑک پر نکل گیا۔

واجد نے ایک لمحے توقف کیا پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ اب اسے اپنے قدموں کی تیز آواز اور اس کی گونج کی پروا نہیں تھی۔

باہر آکر اس نے وائی ٹاکی پر مستین یا قادر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن یا تو وہ ان کی رینج سے باہر تھے۔ یا کسی چیز نے ٹرانسمیشن کو جام کر دیا تھا۔

وہ شخص جلدی میں ہرگز نہیں تھا... اور اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد بیلمونٹ ٹاورز کے انڈر گراؤنڈ گیراج میں دھماکا ہوا۔ مقصود کی کار دھماکے سے پھٹ گئی۔

دھماکے نے بلڈنگ کو ہلا ڈالا۔ داخلی دروازے پر نصب شیر کا مجسمہ دو ٹکڑے ہوگیا۔ نیچے گیراج ایک لمحے کو جگمگایا... جیسے بجلی چمکی ہو۔ پھر گیراج کے دروازے سے گاڑھے سیاہ دھوئیں کے بڑے مرغولے باہر نکلتے دکھائی دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں میں شامل ہوتے گئے۔

ایک عورت دہشت سے چلائی...

بیلمونٹ ٹاورز کی لابی میں قادر کے اپنے پیروں تلے زمین پھٹتی محسوس ہوئی' اس نے بڑی کوشش سے خود کو گرنے سے روکا۔ سگریٹ کو نیچے پھینک کر جوتے سے مسلتے ہوئے وہ انڈر گراؤنڈ گیراج کی طرف لپکا۔ وہ زینوں پر بہت تیزی سے اترا۔ اس کا ایک ہاتھ ریلنگ پر تھا اور دوسرے میں پستول تھا۔

گیراج کا دروازہ کھلتے ہی اسے مقصود کی کار نظر آئی۔ کار کیا... کار کی باقیات۔ وہ جل رہی تھی۔ بلکہ اب بہت تھوڑی بچی تھی جلنے سے۔ اس کا بونٹ مُڑ چکا تھا اور ایک طرف جھول رہا تھا۔ ڈکی دھماکے سے کھل گئی تھی۔ دھماکے نے چھت کے ایک حصے کو بھی اڑا دیا تھا۔ گیراج سیاہ زہریلے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

قادر جھک کر کار کی طرف بڑھنے لگا۔ گیراج میں دھماکے کے بعد سناٹا کچھ اور گہرا ہوگیا تھا۔

قادر کو وہاں چند ہیولے نظر آئے۔ کچھ ساکت کھڑے تھے اور کچھ کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قادر نے پستول جیب میں رکھا اور رومال نکال کر ناک سے لگالیا۔ اب وہ جلتی ہوئی کار کے خاصا قریب پہنچ گیا تھا۔ کار کی فرنٹ سیٹ پر اسے سیاہ گٹھری سی نظر آئی۔ گٹھری کے گرد آگ نے ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ قادر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔

○☆○

دھماکے کی آواز سن کر اور گیراج کے دروازے سے دُھواں نکلتے دیکھ کر حارث اٹھا اور تیزی سے ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ گیراج میں داخل ہونے اور جلتی ہوئی کار کو دیکھنے سے پہلے ہی وہ جان چکا تھا کہ دھماکا کہاں ہوا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مقصود کھانا کھانے کے لیے نکلتا تھا۔

آگ جتنی شدید تھی' اتنی ہی مختصر ثابت ہوئی۔ حارث کار کے جلے ہوئے ڈھانچے کے قریب پہنچا تو شعلے دم توڑ چکے تھے۔ وہاں کئی افراد موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر بلڈنگ کے مکین تھے۔ وہ دائرے کی شکل میں کار کے پاس کھڑے تھے اور دُھوئیں کے پار جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر جھلسی ہوئی نمبر پلیٹ موجود نہ ہوتی تو حارث یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مقصود کی کار ہے۔ کار قابلِ شناخت نہیں رہی تھی۔

کچھ تماشائی کار کے اور نزدیک ہوگئے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا۔ ایک شخص کار کی مُڑی تڑی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

کار کے عقبی حصے کے پاس کھڑا ایک شخص مستفسرانہ انداز میں بڑبڑایا "کوئی تھا تو نہیں کار میں؟"

جھانکنے والا گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔

حارث کو یقین تھا کہ فضا میں جلے ہوئے گوشت کی بُو نہیں ہے "کار خالی رہی ہوگی۔

"خدا کا شکر ہے کار میں کوئی نہیں تھا" کھڑکی سے جھانکنے والے شخص نے اعلان کیا "شاید پیٹرول کی ٹنکی پھٹی ہے۔"

حارث کی نظر اس تاجوری شخص پر پڑی۔ وہ بری طرح دہلا ہوا تھا پھر وہ واپس جانے کے لیے پلٹا۔

"نہیں' ٹنکی نہیں ہوسکتی" کسی نے پورے وثوق سے کہا "پیٹرول کی ٹنکیاں خود بخود نہیں پھٹتیں۔"

"کار کس کی تھی؟"

"جس کی بھی ہو' اس کی خوش قسمتی میں شک نہیں۔"

○☆○

قادر، مقصود کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اس نے بے ہوش متین کو کاؤچ کے پاس پڑا دیکھا۔ اس کا بغلی اُبھار بتا رہا تھا کہ ریوالور بغلی ہولسٹر میں موجود ہے۔ اس کے سر کا گومڑا بھی بے حد نمایاں تھا۔

قادر کے منہ سے بے ساختہ تاجوری زبان میں گالیاں اُبل پڑیں۔

وہ متین کے پاس سے گزرتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا۔

مقصود بستر کے سائڈ والے کونے میں پڑا تھا۔ اس کے دونوں گھٹنے اوپر تھے۔ لگتا تھا، وہ چھت کو گھور رہا ہے۔ اس کا ہاتھ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ قادر قریب گیا تو اسے نظر آیا کہ مقصود کے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اپنی شہ رگ کے سوراخ میں پھنسا ہوا ہے۔ خون بہنا اب موقوف ہو چکا تھا۔

قادر نے منہ پھیر لیا۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی پھر واکی ٹاکی پر واجد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔

وہ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ریگل شوشائن پارلر نظر آتا تھا مگر اس وقت کچھ نظر آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک بہت خوش لباس اور خوبرو آدمی کو کار نر سے مڑتے دیکھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ نیاز تھا جس نے اپنا کام پوری مہارت، صفائی اور چابک دستی سے کیا تھا، وہ جائے واردات سے رخصت ہو رہا تھا۔

○☆○

تنویر اپنے میجسٹک ہوٹل والے کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں کافی ٹیبل پر پھیلائی ہوئی تھیں۔ صوفے کے دوسرے کنارے پر دو میلے سے بھاری کشن رکھے تھے۔ ٹیبل لیمپ پر شیڈ کی موجودگی کی وجہ سے روشنی بہت ہی کم تھی۔ البتہ پرانے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی روشنی زیادہ تھی۔

کوٹ کے ساتھ آتش گیر مادّہ مقصود کی کار میں رکھنے کے بعد وہ سیدھا یہاں آیا تھا۔ اس کی نیاز سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن رات کی خبروں سے اسے پتا چل گیا تھا کہ نیاز کامیاب ہوا اور مقصود مر چکا ہے۔

اس بار ہمیشہ کی طرح اسے طمانیت کا.... کچھ حاصل کرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

خبروں میں اب مشرق وسطیٰ کی امن کانفرنس کے بارے میں بتایا جا رہا تھا پھر صحرا میں پیش قدمی کرتے ہوئے ایک ٹینک کا شاٹ دکھایا گیا۔ تنویر آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نیوز ریڈر کیا کہہ رہا ہے۔

وہ اس وقت ایک منقسم..... آدمی تھا۔ اس کے وجود کا ایک حصہ خود کو خبروں میں گم کر لینا چاہتا تھا تاکہ سنگین تر ہوتے حقائق سے نظریں چرا سکے۔ وہ اپنی تنہائی سے... اپنے خوف سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی نرگس کو ایک نظر دیکھنا، اس سے باتیں کرنا اور اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا چاہتا تھا۔ نرگس اسے شدت سے یاد آ رہی تھی لیکن دوسرا حصہ حقائق سے چمٹا ہوا تھا۔

جانے کیوں... لیکن یہ حقیقت تھی کہ مقصود کی موت کی خبر سن کر وہ بجھ گیا تھا اور... اور وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھا!

دفعتہً ہوا۔ اسکرین پر دو بڈھے نمودار ہوئے۔ ایک قبض کی شکایت کر رہا تھا، دوسرے نے اس کا وہ مسئلہ حل کر دیا۔ مقبوضین کی دو ٹکیاں۔

تنویر نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائیں...

تب اسے واجد نظر آیا!

واجد بہت خاموشی سے آیا تھا اور اب دروازے سے چند قدم اندر کھڑا تھا۔ اس کا جسم متوازن اور پُرسکون حالت میں تھا۔ وہ مُرمّئی رین کوٹ پہنے ہوئے تھا جس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شاید وہ مسکرا رہا ہو لیکن روشنی کا زاویہ ایسا تھا کہ تنویر یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

"بہت اچھے کھلاڑی ہو تم" واجد نے کہا "اصولوں اور ضابطوں کے تحت چلتے ہو۔"

واجد بالکل ساکت تھا اور اس سکوت کی وجہ سے غیر حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ اس بات نے تنویر کے خوف کو اور بڑھا دیا۔ تنویر، واجد کو جانتا تھا لیکن یہ موٹا اور بھاری بھرکم آدمی.... اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ واجد ہی ہے۔ وہ کچھ مختلف لگ رہا تھا۔ شاید عمر میں اضافے کی وجہ سے....

تنویر نے بھرپور کوشش سے اپنی حیرت پر... اپنے آپ پر قابو پایا۔ اس نے اعصابی کشیدگی کو قوت ارادی کے زور پر جھٹکا۔ وہ سمجھ گیا کہ بیلمونٹ ٹاورز سے ہی وہ اسے اپنے پیچھے لگا کر لایا ہے۔

"یہی زندگی ہے" اس نے واجد کی بات کا جواب دیا "اصول اور ضابطے۔"

اس بار واجد یقینی طور پر مسکرایا تھا۔

"لیکن ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا" تنویر نے کہا "اصول اور ضابطے ہمیشہ کام آتے تو تم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے۔"

واجد نے اس کی بات سُنی ان سُنی کر دی "تم گزرے وقت کی دیوانگی کے اسیر ہو" اس نے کہا "تم پاگل ہو گئے ہو۔ فرض کر لو کہ تم جو کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہو، اس میں کامیاب ہو جاتے ہو... ٹاپ کے آدمی کو بھی ختم کر دیتے ہو تو اس سے کیا ہو گا؟ تمہیں کیا حاصل ہو گا تنویر؟"

"مجھے...؟ میری بیوی اور بچی۔ ہم کہیں چلے جائیں گے، ڈھنگ سے زندگی گزاریں گے۔"

واجد مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا لیکن اس کی نظریں

تنویر پر جمی ہوئی تھیں "ہاں... ممکن ہے۔ تم اپنا مشن پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ پچھلے دو ماہ میں تم بہت کچھ کر چکے ہو۔"

"شامی نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟"

واجد اور آگے بڑھ آیا۔ ٹیبل لیمپ کے پاس تک۔ وہ تنویر اور کمرے کے دروازے کے درمیان حائل تھا "تمہیں بتاؤں.... یہ مقصود والا معاملہ ماسٹر پیس تھا۔ میں تمہاری عیاری کا قائل ہوگیا۔ تم نے دھیان بٹانے کے لیے بم کو بڑی خوب صورت ٹائمنگ کے ساتھ استعمال کیا۔ عین اس وقت جب مقصود کھانا کھانے کے لیے نکلتا ہے۔"

تنویر خاموش رہا۔ ستائش کے جواب میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔

واجد ایک قدم اور بڑھ آیا "لیکن ایک بات تو بتاؤ۔ اگر مقصود کھانے کے لیے چند منٹ پہلے نکلنے کا فیصلہ کر لیتا تو۔"

"دھماکے کے وقت مقصود کار میں ہوتا" تب بھی ٹھیک تھا" تنویر نے جواب دیا۔ وہ دونوں ہی پروفیسروں کی طرح گفتگو کر رہے تھے.... ایسے دو پروفیسر جن کے سامنے کوئی علمی مسئلہ الجھ گیا ہو۔ "نہیں تو فلیٹ میں مارا گیا۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ وہ بس اس صورت میں بچ سکتا تھا کہ دھماکے کے وقت اپنے فلیٹ اور گیراج کے درمیان کہیں ہوتا۔ یہ رسک تو حساب کتاب کے مطابق لینا ہی تھا۔"

"ظاہر ہے۔"

اسی وقت ٹی وی پر جنوبی افریقہ کی خانہ جنگی کی فلم دکھائی جانے لگی۔ شور بڑھ گیا لیکن واجد کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بہکی۔

تنویر نے اندازہ لگایا کہ اس کی بچت کا واحد امکان غیر متوقع طور پر حرکت میں آنے میں ہے۔ سامنے واجد جیسا پروفیشنل تھا۔ لہٰذا اس امکان کی کامیابی کا امکان بھی بہت موہوم تھا۔ کاش.... واجد چند قدم اور آگے آجائے! اس صورت میں توجہ بٹانے والی کسی حرکت کے نتیجے میں جو ایک ٹانیے کی مہلت ملے گی' اس میں وہ واجد تک پہنچ سکتا ہے۔ واجد موٹا ہوگیا ہے لیکن اس کی برق رفتاری اب بھی وہی ہوگی۔ بہرحال ہتھیار نکالنے میں تو وقت لگتا ہے۔ واجد ابھی خالی ہاتھ تھا۔ تنویر نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی جملے کے .... یا لفظ کے درمیان حرکت میں آئے گا۔

یہ سوچ کر اس نے پہلو بدلا اور اپنے پیروں کی پوزیشن بہتر بنالی۔ اب وہ بوقتِ ضرورت تیزی سے حرکت کر سکتا تھا۔

واجد نے اندازہ لگالیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ "اس کی ضرورت نہیں" وہ بولا۔ اس نے رین کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ۴۵۔ کولٹ آٹومیٹک نکال لیا۔ وہ پھر مسکرایا۔ "سنو... میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ تمہیں قتل نہیں کروں گا۔"

خبروں میں وزارتِ عظمیٰ کا ایک امیدوار مختلف قومی مسائل کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ ان سے کیسے نمٹے گا۔

واجد نے نظریں ہٹائے بغیر ایک قدم سائڈ میں ہٹ کر ٹی وی آف کر دیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تنویر نے صوفے سے ٹیک لگالی۔ ریوالور کی نال کا رخ اس کی طرف نہیں تھا۔

"جانتے ہو' مجھے جو ہدایات دی گئی تھیں' میں نے ان پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟" واجد نے پوچھا۔

تنویر نے سر کو جنبش دی اور اپنا ہاتھ صوفے کی اوپری دیوار پر پھیلا لیا۔ اس کی انگلیاں ایک کشن کی سلائی کو چھو رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ واجد جیسے لوگوں کا اندرونی نظام کس بنیاد پر کام کرتا ہے۔

"اس لیے کہ محمود شامی کام تو اب بھی کر رہا ہے مگر ہمارے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق نہیں" تنویر نے کہا "حالانکہ کر سکتا ہے۔ وہ اصول اور ضابطے اس نے خود بنائے تھے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس نے کبھی اصولوں اور ضابطوں کے مطابق کام نہیں کیا۔"

"یہ درست ہے" واجد بولا "اور آدمی ایک بار اصولوں اور ضابطوں میں الجھ جائے تو پھر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ قانونِ ضرورت بن جاتے ہیں۔"

"یہی بات ہے" تنویر نے کہا "اس وقت تم اس پوزیشن میں ہو جس میں سات برس پہلے میں تھا۔ شامی نے مجھے دھوکا دیا۔ ویسے ہی وہ تمہیں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ پروفیشنل نہیں' ایک خطرناک قسم کا امیچور ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورت کے قانون کے تحت کام کرتا ہے" تنویر نے کشن تھام لیا "بہرحال' ایک بات...."

"میں جانتا ہوں" واجد نے کہا "شاکر... میں جانتا ہوں کہ تم جس شخص کے سب سے زیادہ مخالف ہو' وہ شاکر ہے لیکن اسے بھول جاؤ۔ اپنے آپ کو حاصل کرنے کے لیے بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔"

"یعنی سب کچھ چھوڑ کر عفریت کا سر قلم کیا جائے؟ تجویز بری نہیں" باتوں کے دوران اس کے ہاتھ چلتے رہے تھے۔ داہنے ہاتھ سے اس نے کشن تھاما اور بائیں ہاتھ سے دو کشن کے درمیان رکھا ریوالور۔ پھر وہ داہنے ہاتھ والے کشن کو پوزیشن میں لے آیا تاکہ گولی کی آواز دب جائے۔ کشن کے پیچھے اس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ واجد کے سینے کی طرف تھا۔

واجد نے نظر جھکائی تو یہ بدلی ہوئی پوزیشن نظر آئی۔ وہ کچھ حیران ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ تنویر جیسے پروفیشنل کے سامنے حیرت کا کیا کام۔ ریوالور اسے نظر نہیں آیا لیکن وہ اس بلف کو چیلنج بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"اب ہم دونوں برابر کی پوزیشن میں ہیں" تنویر نے کہا "مجھے لزارس کے بارے میں بتاؤ۔"

کمرے میں خاموشی اور گہری ہوگئی۔ واجد کی سانسیں پُرشور

معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے کندھے جھٹک دیے "میں نے فراریس کے بارے میں سنا ہے لیکن جانتا بہت کم ہوں۔ میرا خیال ہے' بیٹھ جاؤں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔"

○☆○

دو روز بعد رات نو بجے شدید بارش میں واجد کی سفید کروا قصر جمہوریت کے جنوبی گیٹ پر پہنچی۔ آہنی جنگلے کے قریب پام کے بڑے درخت بارش اور ہوا کی وجہ سے نیچے جھکے آرہے تھے۔ طوفانی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گاڑی پر بارش گرنے کی آواز شور میں اضافہ کر رہی تھی۔ گاڑی گارڈز کے کیبن کے سامنے روکی گئی۔ کیبن کی دھندلائی ہوئی کھڑکیاں اندر روشنی کی وجہ سے زرد نظر آرہی تھیں۔ شیشوں سے سائے چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔

اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے تنویر بیٹھا تھا!

اس نے مونچھیں صاف کرلی تھیں۔ آنکھوں پر گہرے شیشوں کا چشمہ تھا۔ اس نے گرے رین کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر گرے ہیٹ تھا۔ واجد نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ اس گیٹ سے جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیکیورٹی میں اضافہ کردیا گیا تھا۔ واجد کو یقین تھا کہ جنوبی گیٹ والے گارڈز نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔

گارڈ کو کار کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ تنویر نے ہارن بجایا اور کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے کرلیا۔ اسی وقت ہوا کا تیز جھکڑ چلا۔ درخت دیر تک بڑبڑاتے رہے۔

گارڈ مسلح تھا۔ پہلو والے ہولسٹر میں سرکاری ریوالور موجود تھا۔ وہ پانی سے بھرے گڑھے سے بچ کر کار کی طرف آیا "کیسی رات ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

تنویر ہنس دیا "مچھلیوں کے لیے بے حد مناسب ہے" اس نے کہا اور واجد کے شناختی کاغذات گارڈ کی طرف بڑھادیے۔

گارڈ بارش کی پروا کیے بغیر کاغذات کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ تنویر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ گارڈ جوان آدمی تھا۔ اس کے انداز میں ہلکی خود اعتمادی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تربیت سے زیادہ جبلت کے زیر اثر عمل کرتے ہیں.... اور درست سمت میں بڑھتے ہیں۔

گارڈ نے کاغذات واپس کیے اور کار کے عقبی حصے کی طرف گیا' جیسے نمبر پلیٹ چیک کر رہا ہو۔ عقبی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے خود کار انداز میں عقبی سیٹ کی طرف دیکھا۔

تنویر اسے عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ گارڈ چند لمحے سر ایک طرف جھکائے کھڑا رہا جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہو۔ پھر وہ عقب نما کی رینج سے نکل آیا۔ واپس آکر وہ کیبن میں گیا۔ اس نے کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اندر ایک اسٹول تھا اور ایک میز' جس پر کلوز سرکٹ ٹی وی رکھا تھا۔

سامنے گیٹ کھل گیا۔ تنویر نے گارڈ کو دیکھ کر ہاتھ لہرایا اور گاڑی کھلے گیٹ سے گزار لے گیا۔

بارش کی بوندیں اندر آئیں تو اسے احساس ہوا کہ اس نے کھڑکی کا شیشہ نہیں چڑھایا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے شیشہ چڑھادیا۔ ونڈ شیلڈ کے وائپر مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

کار کے ساتھ ساتھ تنویر کی دھڑکنوں کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ خوف کا تازیانہ جیسا ذائقہ وہ اپنی زبان پر محسوس کرسکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ خوب اجوائے کر رہا ہے۔

اس نے کار بائیں جانب موڑی۔ درخت کے نیچے اسے ایک سایہ سا نظر آیا جو سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

تنویر نے سوچا' سیکیورٹی کے انتظامات کے سلسلے میں واجد نے مبالغہ آرائی ہرگز نہیں کی تھی۔

اب تنویر کو وہ بلڈنگ نظر آئی جو اس نے یا تو ٹی وی پر دیکھی تھی یا اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہاں آنے کا وہ اس کا پہلا موقع تھا۔ اس کی روشن کھڑکیاں چوکنا آنکھوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

آسمانی بجلی نے چند لمحوں کے لیے پورے منظر کو روشن کردیا۔ پھر اندھیرا ہوگیا۔

تنویر نے واجد کی ہدایت کے مطابق بلڈنگ کی سائڈ میں گاڑی پارک کی۔ انجن آف کرنے اور وائپرز کو بند کرنے کے بعد وہ چند لمحے کار ہی میں بیٹھا رہا۔ ایک سرد لہری اس کے اندر اتر گئی۔ وہ جہاں پہنچنا چاہتا تھا' پہنچ گیا تھا۔ مگر اب تک غلطی کی جو گنجائش اس کے لیے موجود تھی' ختم ہوگئی تھی۔ اب اس کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ کار سے اترا۔ بارش پوری قوت سے اس سے ٹکرائی۔ اس نے داہنے ہاتھ سے کوٹ تھاما جیسے اسے گرنے سے بچا رہا ہو۔ لیکن درحقیقت اس سے اپنا چہرہ چھپانا مقصود تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا' جہاں سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ موجود تھا۔ ایجنٹ نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ سر جھکائے اندر داخل ہوگیا۔

اندر گہری خاموشی تھی!

تنویر' واجد کی ہدایات کے مطابق بڑھ رہا تھا۔ دو لیفٹ ٹرن' پھر ایک رائٹ ٹرن۔ اس نے چشمہ اتارا اور پھر ہیٹ اتارلیا۔ بالآخر وہ اس بھاری دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے مخصوص انداز میں دستک دی۔ دو بار آہستہ سے اور ایک بار زور سے۔ باہر بادل پھر گرجے....

محمود شامی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا....

اگر اس کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ تھی تو وہ فوراً ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس کے عضلات تن گئے' چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی' رنگت پیلی پڑگئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے

ہٹا۔ لگتا تھا' وہ خود کو دہشت زدہ ہو کر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہونے سے روک رہا ہے۔

تنویر نے کمرے میں داخل ہو کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر کھڑکی پر پڑی۔ پھر میز' جس پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ وہیں سنہرے رنگ کا ایک خوب صورت قلم رکھا تھا۔

محمود شامی میز کے پیچھے چلا گیا تھا۔ وہ بے جان سے انداز میں اپنی کرسی پر ڈھے گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ بالآخر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "مسٹر زماں' اس حیران کن آمد کا سبب کیا ہے؟"

تنویر نے رین کوٹ اتار کر کرسی کے ہتھے سے لٹکا دیا۔ اس سے پانی گر کر قالین میں جذب ہونے لگا۔

"میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم جو کوئی بھی ہو' قانون سے بالاتر نہیں۔ تمہیں اپنے کیے کا حساب دینا ہے۔ جواب دہ تم اس وقت بھی تھے' جب اقتدار میں تھے... اور اب جبکہ تم اقتدار سے باہر ہو تو جواب دہی کا اصول تم پر اور سختی سے لاگو ہوتا ہے۔ میں اور واجد دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ تم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔"

محمود شامی کے ہونٹوں پر نروس مسکراہٹ تھرکی "کیا کیا ہے میں نے؟ میں سمجھا نہیں..."

"آپ ناسمجھ نہیں جناب صدر۔ ناسمجھ کوئی اور ہے۔"

اس آواز نے تنویر کو چونکا دیا۔ وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے سر گھمایا۔ دیواری الماری میں چھپا ہوا واجد باہر آ گیا تھا۔ اس کے کولٹ آٹومیٹک کا رخ تنویر کی طرف تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"اتنے حیران نظر نہ آؤ۔ یہ تاثر تم پر جچتا نہیں" واجد نے تنویر سے کہا "میں تو کل سے یہیں ہوں" اس نے سر کی جنبش سے محمود شامی کی طرف اشارہ کیا "اب لزارس سے مل لو۔ تمہارے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔"

بجلی کا زبردست کڑاکا ہوا۔ طوفان اور زور پکڑ رہا تھا۔

اس بار جو خوف تنویر کو اپنے وجود میں... نامعلوم گہرائی میں مچلتا محسوس ہوا' وہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ فیصلہ کن' مہلک خوف!

"ہمیں پریشانی اس بات کی تھی کہ تم آپریشن لزارس میں مداخلت کر رہے تھے" محمود شامی نے کہا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں...." تنویر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "... کہ لزارس کا امیدوار کون ہے؟"

بجلی پھر چمکی۔ محمود شامی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مسکرایا۔ تنویر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے درمیانی وقفے کو گنتی کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا۔

"اگر معلومات طاقت ہوتی ہیں مسٹر زماں تو خفیہ نوعیت کی معلومات اس سے دس گنا طاقت ور ہوتی ہیں" محمود شامی نے کہا "تم کیونکہ یہ معلومات اپنے ساتھ باہر نہیں لے جا سکتے' اس لیے بتا رہا ہوں' ہمارا امیدوار شاہد انور ہے۔"

"لیکن اس کا تعلق تو مخالف پارٹی سے ہے۔"

"اس بات کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اس سے تو ہمارے اقتدار کی اثر پذیری بڑھ جائے گی۔"

"اور وہ تقریباً منتخب ہو چکا ہے۔"

"ہاں.... یہ بات اہم ہے" محمود شامی نے خوش ہو کر کہا "اور یوں دیکھو تو اصل میں' میں تقریباً منتخب ہو چکا ہوں۔ وہ وزیراعظم بنے گا لیکن درحقیقت حکومت میں کروں گا۔ اصل قوت' اصل اقتدار میرے پاس ہوگا اور کسی کو یہ بات معلوم بھی نہیں ہوگی لہٰذا جواب دہی کا اصول مجھ پر لاگو نہیں ہوگا۔ میرے کچھ منصوبے ہیں۔ میرے دشمن مجھے نہیں روک سکتے۔ خواب دیکھنے والے کی طبیعت میں استقلال ہو تو خواب رائیگاں نہیں ہوتے' تعبیر میں بدل جاتے ہیں۔ بس خواب دیکھنے والے کو میری طرح حوصلہ مند ہونا چاہیے اور اپنی سوچ پر پوری قوت سے عمل کرنا چاہیے۔"

محمود شامی کی نظریں تنویر پر سے ہٹ گئیں۔ جیسے اس نے اسے مُردہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہو۔

"یاد رکھنا" محمود شامی نے واجد سے کہا "کسی نہ کسی طرح یہ تمام حفاظتی رکاوٹیں پھلانگ کے یہاں تک آ پہنچا تھا۔ سیکرٹ سروس والے تو یہی جانتے ہیں کہ سفید کرولا میں تم آئے تھے۔"

بادل پھر گرجے' بجلی پھر چمکی۔ تنویر درمیانی وقفے میں گنتی گنتا رہا۔

واجد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

اسی لمحے زبردست کڑاکا ہوا۔ پوری عمارت جیسے ہل کر رہ گئی۔

تنویر نے یہ سوچ کر کہ اس کے بعد بجلی چمکے گی اور غیر متوقع ہونے کی وجہ سے وہ دونوں حرکت نہیں کر سکیں گے اور اسے ایک بہت قیمتی ٹائم کی مہلت مل جائے گی' وہ بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی کی طرف بھاگا۔ آگے پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلاتے ہوئے کھڑکی کی طرف جست لگائی۔ شیشہ ٹوٹنے کا جھٹکا بہت زبردست تھا۔

وہ ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کی برسات میں نیچے گرا۔ بارش نے اس کا چہرہ دھلا دیا تھا لیکن اسے اس وقت احساس ہو گیا کہ اس کی ترکیب کارگر نہیں ہوئی۔ واجد جیسے تجربے کار پروفیشنل کو کسی ایسی چال سے شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔

وہ تین قدم بھاگ سکا تھا کہ اس کی پیٹھ میں دو ڈنک سے لگے۔ اس نے خود کو سسکتے اور اپنی گہری سانس کو ٹوٹتے سنا۔

لیکن وہ تاریکی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

گولیوں کی مزید آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی چاپیں ابھریں۔

تنویر اور گہری تاریکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستہ ڈھلوانی تھا۔ پاؤں پھسل رہے تھے۔ اس کے قدموں میں تو ویسے بھی لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ جھکے جھکے بھاگ رہا تھا۔ اور درد کسی بھیانک عفریت کی طرح اسے اپنے دانتوں سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کی پُرشور سانسیں اذیت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ واجد اب بھی اس کے پیچھے تھا۔ سیکرٹ سروس والے بھی تھے۔ تنویر کا رخ عقبی حصے کی طرف تھا' جہاں جنگلا کافی نیچے تھا۔

گولیاں اب بھی چلائی جارہی تھیں۔ تنویر کو یقین تھا کہ گولیاں واجد چلا رہا ہے۔ وہ اسے نکلنے کا موقع کیسے دے سکتا تھا جبکہ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ اس کی چلائی ہوئی گولیوں نے تنویر کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے؟

تنویر کو اپنے حلق میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ وہ دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے خون تھوکا اور بھاگتا رہا۔ اس کے حلق میں پھر خون جمع ہورہا تھا.... جیسے کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہو خون کا۔ اسے بچ نکلنے کی امید نہیں تھی۔ بس وہ یہ چاہتا تھا کہ اسے سیکرٹ سروس والے زندہ گرفتار کریں تاکہ وہ لزارس کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے' بتا سکے۔ اس نے مزید خون تھوکا۔ پھر چیخ کر متعاقبین کو بتانے کی کوشش کی کہ وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کررہا ہے لیکن اب اذیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ چیخنا ممکن نہیں تھا۔ وہ حلق سے آواز بھی نہیں نکال سکا۔

بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری اس پر غالب آرہی تھی' وہ اندھیرے میں لڑکھڑایا' گھٹنوں کے بل گرا' سنبھل کر اٹھا اور پھر ڈگمگایا۔ اب اسے ہر طرف خلا نظر آرہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور خلا میں گرگیا۔ اس کے گھٹنے میں بھی درد ہورہا تھا۔ اذیت نے اسے مفلوج کردیا تھا۔

وہ نہیں دیکھ سکا کہ وہ ساحل کی طرف جانے والی چوبی سیڑھیوں سے الجھ کر گرا ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ساکت پڑا رہا۔

اسے احساس تھا کہ کچھ سائے بھاگتے ہوئے اس کی طرف آرہے ہیں۔ بارش اس کے چہرے پر' اس کی کھلی آنکھوں میں گررہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے آنکھیں بند کرنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سائے سیکرٹ سروس والے ہیں۔ واجد ان کے درمیان ہوگا بھی تو اب اسے بلاجواز شوٹ کرنے کی ہمت نہیں کرسکے گا۔

وہ لوگ اس کے گرد جمع ہوئے.... اس پر جھک گئے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ ان کے ریوالوروں کا رخ اس کی طرف تھا۔

"بے چارہ!" ان میں سے ایک بڑبڑایا۔

"اے.... تم اندر کیسے آئے؟" دوسرے نے پوچھا "تم وہاں تک پہنچے کیسے؟ یہاں تو صدر صاحب کی اجازت کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مارتا۔"

تنویر نے سر اٹھایا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی۔ ان لفظوں کو ادا کرنے کے سخت جدوجہد کی' جنہیں وہ کسی غیر جانب دار سماعت تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔ اسے بے بسی کے ساتھ ایک عجیب سے احساس نے رُلادیا۔ آدمی بُرا کرتا ہے تو اس کے پاس کتنی طاقت ہوتی ہے اور جب وہ اچھا کرنا چاہے تو زبان بھی نہیں ہلا سکتا! کیسا ستم ہے کہ آدمی سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ اور جب بولنے کی شدید خواہش ہو تو گویائی ہی چھن جائے' ہائے....

اس کے سینے میں.... بہت اندر کوئی چیز دھماکے سے ٹوٹی اور منہ تازہ تازہ خون سے بھرگیا۔ اس نے فوزیہ کو پکارنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

اب اس دہن سے الفاظ نہیں' صرف جیتا جاگتا خون نکل سکتا تھا!

"لو بھئی.... یہ تو گیا" کسی نے مایوسی سے کہا۔

وہ خاموش کھڑے اس کے قدموں کے ہذیانی نشان دیکھتے رہے' جن میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔

○☆○

بیس منٹ کے اندر سب کچھ نمٹ گیا!

فوٹوگرافروں نے تصویریں لیں' ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا اور تنویر الزماں کی موت کا اعلان کردیا۔ لاش ایمبولینس میں ڈال کر پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردی گئی۔ پریس والے آئے لیکن انہیں باہر ہی روک دیا گیا۔ کچھ کسی امید پر گیٹ کے باہر کھڑے رہے' کچھ ایمبولینس کے پیچھے چلے گئے۔

محمود شامی اپنے کمرے میں میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ سیکیورٹی والوں کا چیف نصیر میز کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ وہ بہت پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ میز کی داہنی جانب واجد بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ پلاسٹک کی شیٹ لگادی گئی تھی تاکہ بارش اندر نہ آنے پائے۔

نصیر معمول کے مطابق کارروائی کرتے ہوئے ان دونوں سے پوچھ گچھ کررہا تھا۔ سیکرٹ سروس کے بڑے افسر کچھ دیر بعد وہاں پہنچنے والے تھے۔

"اسے آفس میں میری موجودگی کا علم نہیں تھا" واجد کہہ رہا تھا "وہ یہاں گھسا اور شاید ریوالور نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے پستول نکال لیا۔ وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف لپکا۔ میں نے گولی چلادی۔"

"وہ مسلح تھا" نصیر نے تصدیق کی۔ وہ اپنی ڈائری میں یہ سب نوٹ کررہا تھا۔ محمود شامی نے اجازت دے دی تھی کہ پوری کارروائی ٹیپ کرلی جائے۔

"اس کی یہاں آمد کا مقصد واضح ہے۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں" محمود شامی نے کہا "میرا خیال ہے' جیل کی صعوبت ناک زندگی نے اس کا دماغ اُلٹ دیا تھا۔ میرے دوسرے سابق ساتھیوں کی موت کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ وہ ابتدا ہی سے .... کیا کہنا چاہیے.... ابنارمل تھا۔ میرا خیال ہے' یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ برسوں پہلے بھی میں نے یہی بات کہی تھی۔"

نصیر کی پینسل حرکت کرتی رہی۔ کیسٹ سب کچھ ریکارڈ کرتا رہا۔

بارش کا زور ٹوٹا.... پھر بارش رک ہی گئی۔ اتنا کچھ ہوچکا تھا تو اب کمرے میں سناٹا بہت گہرا لگ رہا تھا۔

"سنو...." محمود شامی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے چہرے پر کشیدگی تھی۔ وہ سر ایک طرف جھکائے بہت غور سے کچھ سُن رہا تھا "مجھے ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ تم بھی سنو' مجھے یقین ہے...."

نصیر نے پینسل رکھ دی اور سماعت پر زور دیا۔ پھر اس نے پُرسکون ہوکر کرسی سے ٹیک لگالی "وہاں سے آواز آرہی ہے" اس نے پینسل سے اشارہ کیا "یہ آواز مسٹر واجد کے کوٹ میں سے آرہی ہے۔"

مسٹر واجد کا کوٹ!

واجد اور محمود شامی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر محمود شامی کے حلق سے خوف زدہ سی چیخ نکلی۔ وہ تینوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ کمرا ایک دھماکے کے ساتھ جگمگا اٹھا۔

دھماکے سے عمارت کا پورا غربی حصہ زمیں بوس ہوگیا تھا۔

آسمان پر درجنوں مرغابیاں چکرا رہی تھیں۔ وہ چیخ رہی تھیں۔ برہم بھی تھیں اور انہیں الجھن بھی تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

○☆○

وہ یقینی طور پر ایک فاتح کا کیمپ تھا!

شاہد انور اپنی میز پر بیٹھا تھا۔ سہراب پور کی انتخابی جنگ کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ اس کے آفس میں بڑی گہما گہمی تھی۔ فون کی گھنٹی وقفے وقفے سے بجتی اور کوئی کارکن کال ریسیو کرلیتا۔

لیکن اس وقت شاہد انور کو کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ابھی تک محمود شامی کی موت کی خبر ہضم نہیں کرپایا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو بے حد پُرامید' ہشاش بشاش اور ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔

کیا واقعی ایسا ہوگیا ہے؟

یقین دہانی کے لیے اس نے مورننگ ٹائمز کے صفحے پر نظر ڈالی۔ شہ سرخی چیخ رہی تھی.... قصر جمہوریت میں دھماکا' سابق صدر محمود شامی جاں بحق...

وہ طاقت جو اسے اتنی بلندی تک لے آئی تھی' ختم ہوچکی تھی۔ اب وہ آزاد تھا۔ قسمت نے اس پر بڑا کرم کیا تھا۔ اس نے سوچا' اب میں اس ملک کی اور ملک کے لوگوں کی تقدیر بدل دوں گا۔ قسمت نے مجھے کچھ کرنے کا کھلا موقع دیا ہے.... میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ میں خلوص سے کام کروں گا۔

میں لوگوں کے دل جیتوں گا.... ان پر راج کروں گا!

اس نے سامنے رکھا کاغذ قریب کھینچا اور وہ تقریر پڑھنے کی کوشش کی جو اسے اگلے روز پبلک لیگ کے اجلاس میں کرنا تھی لیکن اسے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنی توجہ تقریر پر مرکوز نہیں کرپا رہا ہے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دیوانہ وار قہقہے لگائے۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پھر دروازہ کھول کر جھانکا "آپ کے لیے ایک کال ہے.... ذاتی" کارکن نے بتایا "نام تو نہیں بتایا لیکن وہ صاحب کہتے ہیں' محمود شامی کی موت سے متعلق بہت ضروری بات کرنی ہے' بات کریں گے آپ؟"

شاہد نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"ٹھیک ہے' فورون سکس پر ریسیو کریں" دروازہ بند ہوگیا۔

شاہد انور نے ریسیور اٹھایا "شاہد انور اسپیکنگ۔"

"میں شاکر بول رہا ہوں۔"

شاہد انور کے اندر کچھ ہونے لگا۔ "جی فرمایئے شاکر صاحب' میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟" اس نے لہجے کو سرسری رکھنے کی کوشش کی۔

"میں تم سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بات کرنی ہے جو تمہارے سیاسی کیریر کے لیے بہت اہم ہے۔ اس پر صرف تمہارے ہی نہیں' اس ملک کے مستقبل کا بھی انحصار ہے۔"

"میں.... میں.... میں...."

"یہ آپریشن لزارس ہے شاہد۔ محمود شامی کی موت سے کچھ بھی نہیں بدلا۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ شاہد انور کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز کی دراز کھول کر بہت سارے نیلے کیپسول نکال لیے۔ وہ خود کو ایک بار پھر زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کررہا تھا۔

کیپسول سامنے رکھے وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کررہا تھا.... کیا مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ میں یہ تمام کیپسول حلق سے اتارلوں؟ اور نہیں ہے تو کیا جرأت اور حوصلے سے محروم مجھ جیسے آدمی کو اقتدار زیب دیتا ہے؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ ملک و قوم کی قیادت کا بارِ گراں اٹھاسکوں....؟

وہ سوچتا رہا.... سوچتا رہا....!

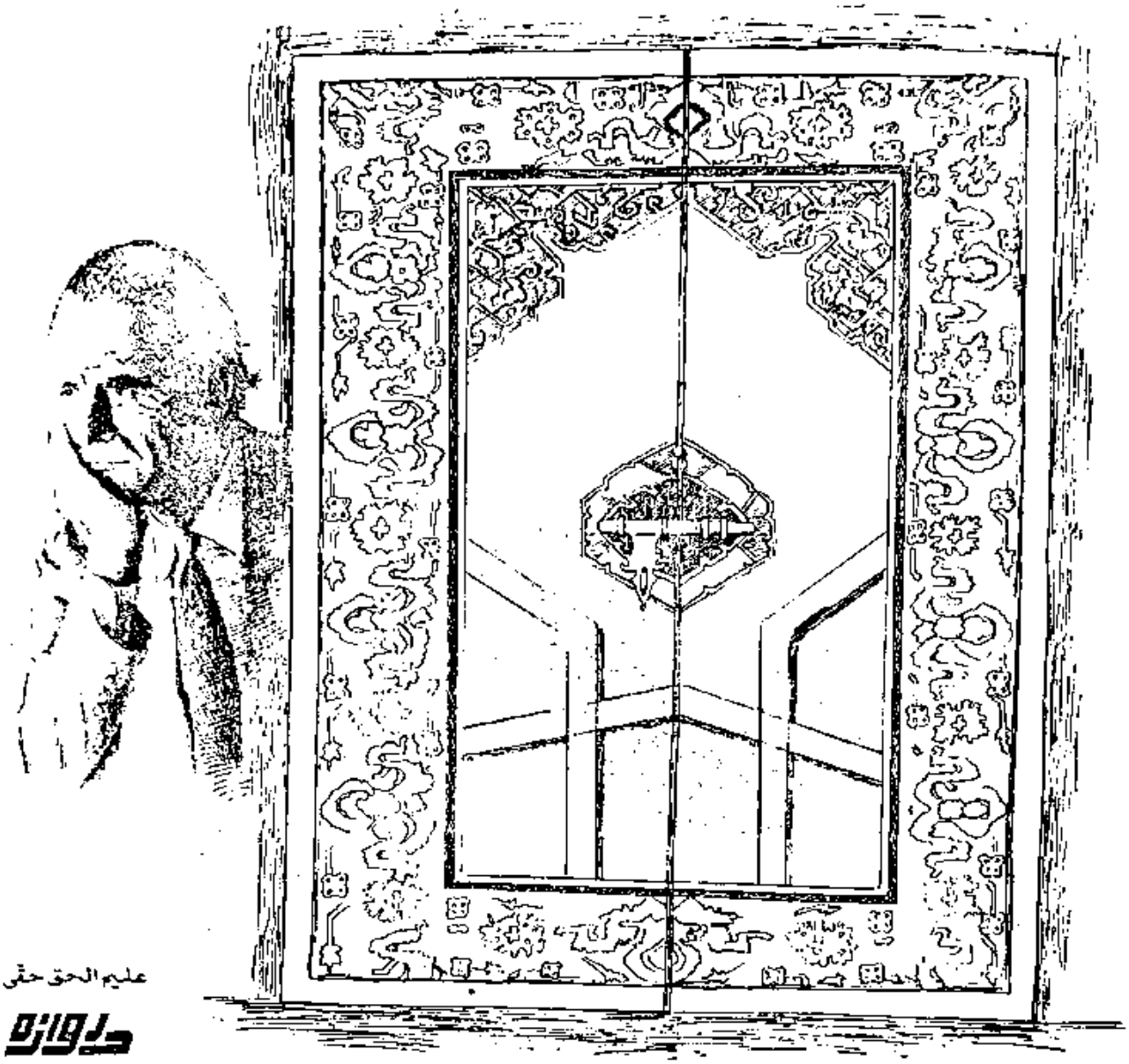

علیم الحق حقی

دروازہ

ایک بد دُعا کے پُراسرار اثرات کا فسانہ۔
رقم کے لین دین سے شروع ہونے والے ایک تنازعے کا حیران کن انجام۔
جس میں کچھ لوگ متاعِ حیات گنوا بیٹھے۔
ایک بد ضرر دروازے کی کہانی جس نے کئی لوگوں پر زندگی کا دروازہ بند کردیا۔

آدمی کے جسم اور اعضا کو جسم کے لئے دوا بنانے والے کارخانے کا ماجرا

میں جانتا ہوں کہ اس داستان پر آپ کو یقین دلانا کہ یہ سچی ہے' اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اور یہ حقیقت کہ یونانی بڈھا ابھی زندہ ہے اور بدقسمت نوجوانوں کے بہت سے رشتے دار بھی ابھی زندہ ہیں' میری مشکلات میں اضافہ کررہی ہے۔ اس لیے کہ اس رکاوٹ کی وجہ سے نہ میں اس قصبے کا اصلی نام آپ کو بتا سکتا ہوں' جہاں یہ عجیب واقعات پیش آئے اور نہ ہی میں کرداروں کے اصلی نام لکھنے کی ہمت کرسکتا ہوں۔ میں بس اس قصبے کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ وہ انگلستان کا ایک بڑا مضافاتی قصبہ ہے' جہاں ایک بے حد قدیم چرچ ہے۔ قصبے سے چند میل پیچھے ایک بڑا دریا سمندر میں گرتا ہے۔ سڑکوں کے اطراف جارجین طرز کے مکانات ہیں' جن کی بہت اچھی طرح نگہداشت کی گئی ہے۔ ان مکانات میں اب بھی دولت مند تاجر رہتے ہیں' جن کا تعلق پرانے شرفا کے گھرانوں سے ہے' یہی لوگ قصبے کا طبقۂ عالیہ ہیں۔

یہ خوب صورت مکان سڑکوں کے بالکل سامنے ہیں۔ ان کے دروازے ٹھیک سڑک کی جانب کھلتے ہیں۔ کسی مکان کے سامنے والے حصے میں باغیچہ نہیں۔ البتہ عقبی حصوں میں بڑے بڑے باغیچے ہیں' جو اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ اندر کی جانب لوگوں نے

خوبانی' آڑو اور دیگر پھل دار درخت لگائے ہیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ یہ انگلینڈ کا ایک پرانا اور متمول علاقہ ہے۔

یہ قصبہ اس لیے متمول ہے کہ کسی زمانے میں یہاں سے پورے یورپ کے لیے تجارتی ٹریفک چلتا تھا۔ کسی حد تک اب بھی چلتا ہے۔ جارجین طرز کے مکانوں میں رہنے والوں کے آباواجداد نے غیر ممالک سے تجارت کے ذریعے اتنی دولت کمائی کہ پشتوں تک کے لیے بے نیازی حاصل کرلی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے مکینوں میں غیر ملکی بھی ایک اہم عنصر بن گئے۔ اِس داستان میں مس روز کو اور مجھے چھوڑ کر تمام اہم کردار غیر ملکی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ انگریز نہیں ہیں۔

سب سے پہلے میں یونانی کا تعارف کراؤں گا۔ اصل نام نہ پوچھیں۔ میں اسے جولیس کہوں گا۔ وہ اسی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے دادا نے یہاں فرنیچر کی تجارت کے ذریعے قدم جمائے تھے۔ اس کے بیٹے نے فرنیچر کو ترک کرکے نہایت اعلیٰ درجے کے نوادرات کی دکان قائم کرلی۔ ان میں چاندی کی اشیاء' تصویریں اور بیش قیمت جواہرات ہوتے تھے لیکن جولیس نے سب کچھ چھوڑ کر خود کو صرف جواہرات تک محدود کرلیا۔ اس کے گاہک اگرچہ زیادہ نہیں تھے۔ لیکن اسے اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ اسے ورثے میں بے حساب دولت ملی تھی۔ میرے خیال میں وہ دکان بھی صرف اس لیے چلا رہا تھا کہ اسے جواہرات سے عشق تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور دنیا بھر کی سیاحت کرچکا تھا۔ خاص طور پر مشرقی ممالک کی۔ وہ کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کی لائبریری بے حد شاندار تھی۔ اس میں پُراسرار علوم کے متعلق بڑی بڑی نادر کتابیں موجود تھیں۔

وہ غیر شادی شدہ تھا۔۔۔ یا شاید نہیں تھا۔ ایک بے حد خوب صورت لڑکی اینا اس کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ لوگ اینا کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ درحقیقت اس کی بیٹی ہے لیکن غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے سب کے سامنے بیٹی نہیں کہہ سکتا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ درحقیقت اس کی محبوبہ ہے۔

جولیس کا بظاہر کوئی رشتے دار زندہ نہیں تھا۔ اینا چند سال پہلے اچانک ہی نمودار ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ ایسی خوب صورتی افسانوں ہی میں نظر آتی ہے۔ وہ اپنے چچا کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر ملکی۔۔۔ بلکہ غیر انگریز لگتی تھی۔

ان تینوں بدقسمت نوجوانوں میں دو تو ایسے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ وہ بے پروا' بے کار لیکن دولت مند تھے۔ ان کے پاس تیز رفتار موٹر کاریں تھیں۔ ان کے نام فوربس اور نیوسم سمجھ لیں۔ تیسرا چاڈوک تھا۔ اس کے پاس جہاز تھے۔ تینوں بے فکرے کھل کر پیسے اور کھل کھیلنے کے قائل تھے۔ قصبے والے ان سے خائف بھی رہتے تھے۔ مگر بعض معاملات میں ان پر فخر بھی کرتے تھے۔ فوربس کی ماں اطالوی تھی۔ اس کے والدین کا انتقال بہت پہلے ہوچکا تھا۔ نیوسم خون کے اعتبار سے آدھا سویڈش تھا۔

مین چاڈوک کے ہاں ملازم تھا۔ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اس کے خون میں آئرش خون کی آمیزش تھی' لگتا تھا' تینوں میں سب سے زیادہ وحشت اسی کے اندر ہے۔ سب سے زیادہ دولت مند بھی وہی تھا۔ قصبے کے ایک بڑے حصے کا وہ مالک تھا۔ لیکن اپنی زمین' جائداد کی دیکھ بھال میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے اُس نے مجھے ایک عمومی منتظم اور سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھا تھا۔ ہمارے درمیان ابتدا ہی سے اچھے تعلقات قائم ہوگئے حالانکہ میں اُس کی وحشتوں اور تفریحات میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے تمام معاملات مجھے سونپ دیے۔ اُس کے کاروبار کے علاوہ اُس کے گھر کا انتظام بھی میرے سپرد تھا۔ کھانوں کا آرڈر دینا' وائن کی خریداری' اس کی پارٹیوں کے تمام انتظامات بھی مجھے ہی کرنا ہوتے تھے۔ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ اپنے بہت بڑے گھر میں' جس کا بہت بڑا باغیچہ دریا تک پھیلا ہوا تھا' وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

ہماری ملاقات آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ ہمارے ذوق مختلف تھے لیکن نہ جانے کیوں میں اُسے بھا گیا۔ اُسے واپس بلالیا گیا۔ جبکہ میں پڑھتا رہا۔ میں نے آکسفورڈ سے ڈگری لی لیکن مجھے ڈھنگ کی کوئی ملازمت نہیں ملی۔ کافی عرصے ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ پھر اچانک ایک دن ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے ملازمت کی پیش کش کی۔ تنخواہ بہت معقول تھی۔ چنانچہ میں نے اُس کی پیش کش قبول کرلی۔

اِس داستان کا جو آغاز کا لمحہ ہے' اس وقت تک مجھے اس کی ملازمت میں دو سال ہوچکے تھے۔

آپ بھی جانتے ہوں گے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چار آدمی تاش کھیل رہے ہوں۔۔۔ ترپ چال۔ اور ان میں سے کسی کو کوئی فون ریسیو کرنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے اٹھنا پڑجائے تو وہ اپنی جگہ کسی کو بھی بٹھادیتا ہے۔ بس اسے یہ

بتادیا جاتا ہے کہ ترپ کیا ہے۔ اسے ہاتھ کے متعلق بہت مبہم آئیڈیا ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ کس رنگ کی کتنی چابیں ہو چکی ہیں اور کس رنگ کی کیا پوزیشن ہے۔ بس وہ جیسے تیسے اندھا دھند ہاتھ مکمل کردیتا ہے۔ اس داستان کے معاملے میں میری پوزیشن بھی بس ایسی ہی ہے' جیسے مجھے کسی کی جگہ ترپ چال کھیلنے کے لیے بٹھادیا گیا ہو۔ اصل واقعہ ہو چکا تھا اور مجھے تفصیل سے نہیں بتایا گیا تھا کہ کیا کچھ ہوا ہے۔ پوری بات مجھے کبھی بھی نہیں بتائی گئی۔ شاید اس لیے کہ چاڈوک اس معاملے میں شرمسار تھا اور اسی لیے کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے جو ڈائری دی' اُس میں بھی اس جرم کے متعلق کھل کر کچھ نہیں لکھا گیا۔ میں صرف اندازہ لگا سکتا ہوں اور میں بدترین اندازے قائم کرنے پر مجبور ہوں۔

☆ ✳ ☆

میں نے اِدھر اُدھر سے تصویری معمے کے جو ٹکڑے ڈھونڈ ڈھانڈ کر جوڑے ہیں' ان سے کچھ یہ تصویر بنتی ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے کہ سب کچھ یوں ہوا ہوگا۔

ستمبر کی ایک خوب صورت شام تینوں جوان کار میں بیٹھ کر تیس میل دور ایک سرائے میں کھانا کھانے گئے۔ انہوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور چھک کر پی۔ چاڈوک ہمیشہ اسی ایک حقیقت کو بار بار بیان کرتا رہا تھا کیونکہ بعد میں جو کچھ ہوا' اسی وجہ سے ہوا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا "ہم نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ ہم بہت نشے میں تھے۔"

اس روز بل ادا کرنے کی باری فوربس کی تھی۔ اس نے بل تو ادا کردیا لیکن ساتھ ہی پھٹ بھی پڑا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بالکل قلاش ہو چکا ہے۔ ہر اعتبار سے دوالیا' اور وہ مسٹر جولیس سے بڑی بڑی رقمیں بطور قرض بھی لیتا رہا ہے۔ اس کے دونوں دوستوں کے لیے یہ بات نہایت حیرت انگیز تھی۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ فوربس بھی انہی کی طرح دولت مند ہے اور انہیں یہ علم بھی نہیں تھا کہ یونانی مسٹر جولیس سود پر قرض بھی دیتا ہے۔ اب پتا چل رہا تھا کہ وہ صرف قیمتی جواہرات کا بیوپاری ہی نہیں تھا بلکہ برسوں سے سود پر قرض بھی دیتا رہا تھا لیکن شاید بڑی بڑی رقمیں اور وہ بھی 'معقول' قسم کے لوگوں کو اور فوربس بھی یقینی طور پر 'معقول' قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ لمبے کی ایک سے زیادہ اور بڑی فرموں میں اس کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اس کے ایک چچا کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور اس نے ترکے میں فوربس کے لیے ہزاروں پاؤنڈ چھوڑے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دس ہزار۔ اور کچھ بیس ہزار بتاتے تھے۔ یہ الگ بات کہ ابھی چند ماہ تک وہ اس ترکے کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ مگر بالآخر وہ اسے ملنا تھا۔ یونانی مسٹر جولیس ایسے آدمی کو قرض دینے سے کیسے انکار کر سکتا تھا' جس کی طرف سے رقم کی واپسی روزِ روشن کی طرح یقینی ہو۔

لیکن اب فوربس نے اعتراف کیا کہ اس کے چچا اس کے لاابالی پن سے بے زار ہو چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے اپنے ترکے سے محروم کردیا تھا اور اپنی نقدی اور جائداد اہل رشتے داروں کے نام کردی تھی۔ فوربس کو یہ بات معلوم ہوئی تو اسے صدمہ ہوا۔ بے عزتی کی بات تھی اس لیے کہ اُس نے لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ پھر اس نے سوچا کہ ذرائع آمدنی تو اس کے پاس موجود ہیں۔ بس ذرا جی جان سے کوشش کرنی ہوگی۔

فوربس نے مزید قرض کے لیے یونانی سے رابطہ کیا۔ مسٹر جولیس اس متوقع ترکے کے حوالے سے اسے جتنا قرض دے سکتے تھے' درحقیقت اس سے زیادہ دے چکے تھے۔ اس روز جو فوربس نے قرض طلب کیا تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ اسے آنجہانی چچا کے ترکے میں سے ایک پھوٹی کوڑی ملنے کی بھی امید نہیں ہے اور مسٹر جولیس نے بھی واضح کردیا

کہ اب وہ قرض کے نام پر اسے سو پاؤنڈ بھی نہیں دیں گے۔ فوربس نے انہیں دھمکی دی کہ وہ قصبے والوں کو بتادے گا کہ وہ سود پر قرض دیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان سخت لفظوں کا تبادلہ ہوا لیکن فوربس مسٹر جولیس کو ان کے مؤقف سے نہ ہلا سکا۔

فوربس کا باقی دن پریشانی میں گزرا۔ اسے رہ رہ کر اپنی خراب پوزیشن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا بال بال قرض میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ طے تھا کہ اسے اپنے دیوالیہ پن کا اعلان کرنا پڑے گا۔ وہ بے عزت الگ ہوگا۔ اور یہ اس کی رنگینی سے بھرپور، بے فکری کی زندگی کا اختتام بھی تھا۔

سو اس رات فوربس نے اپنی قرضوں کے اندراجات سے بھری نوٹ بک دوستوں کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے ذہن کا ہر بوجھ ہلکا کر ڈالا۔

ہمدردی اسے جی بھر کے ملی۔ دوستوں نے اس کی خوب طرف داری کی اور مسٹر جولیس کو خوب برا بھلا کہا۔ انہوں نے عہد کیا کہ یونانی نژاد مسٹر جولیس کو جو یہودی بھی تھے اور یہودی بھی بدترین، قصبے میں رسوا کردیں گے۔ قصبے کے ہر شخص کو بتادیں گے کہ وہ سُود خور ہے۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا اور قصبہ چھوڑنے پر مجبور ہوجائے گا۔ رائے عامہ ہی اس حد تک اُس کے خلاف ہوجائے گی کہ وہ قصبے میں رہ ہی نہیں سکے گا۔

وہ تینوں غصہ کرتے اور ایک دوسرے کے غصے کو بھڑکاتے رہے۔ ان کا نشہ بڑھتا گیا اور ساتھ ہی ان کے دعوے سنگین تر ہوتے گئے۔ وہ اپنی طاقت، اپنا اثر و رسوخ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہے۔ پھر وہ بیٹھ کر یونانی نژاد مسٹر جولیس کو قصبے سے بھگانے کی منصوبہ بندی کرنے بیٹھ گئے۔ شیمپین کی ایک اور بوتل منگوالی گئی۔

چاڈ کو دوسروں کی نسبت اپنے دماغ پر زیادہ قابو تھا۔ اسے احساس تھا کہ مسٹر جولیس ایک معزز کاروباری ہیں۔ ایک مقبول کاروبار کے ساتھ سود کا محدود کاروبار کرلینا کوئی بہت بڑا اور سنگین جرم نہیں تھا۔ وہ تینوں ذاتی طور پر مسٹر جولیس کو جانتے تھے۔ وہ نمود و نمائش کے قائل نہیں تھے لیکن بہرحال انہی کی طرح متمول آدمی تھے۔ وہ ان کے بڑوں کے قابلِ احترام دوست رہے تھے۔ ان کے بزرگ مسٹر جولیس کی عزت کرتے رہے تھے۔ وہ تینوں ان کے خوب صورت مکان میں ہونے والی اکاڈکا پارٹیوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ مسٹر جولیس کو دعوتیں دینے کا خبط نہیں تھا اوروں کی طرح لیکن ان کی پارٹیاں بے حد منفرد ہوتی تھیں۔ ان میں کوئی سرپرائز دینے والی تفریح ضرور ہوتی تھی۔ کبھی لندن سے کسی مشہور و مقبول گلوکارہ کو بلوایا جاتا تو کبھی باورچی کو ہنگری کے ریسٹورنٹ کے انداز میں سجایا اور ترتیب دیا جاتا۔ ایک موقعے پر ڈرائنگ روم میں ہونے والی پارٹی میں ایک مشہور شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ اسی موقعے پر وہ تینوں حسین اینا سے ملے تھے۔ اینا قصبے میں بھی کبھی کبھار ہی دیکھی جاتی تھی۔ وہ قصبے میں ہونے والی پارٹیوں میں کبھی شرکت نہیں کرتی تھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ علم دوست اور خود بھی ہر طرح کی معلومات رکھنے والی لڑکی ہے۔ ان دنوں وہ چینی زبان سیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ دن میں کئی گھنٹے وہ پیانو بجانے کی مشق کرتی تھی۔ وہ برج اور ٹینس کھیلنے پر اپنے چچا کی لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے یا اپنے میوزک روم میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتی۔ درحقیقت اسے کسی کھیل سے دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ ویسی ہرگز نہیں تھی جیسے کتابی کیڑے ہوتے ہیں۔ وہ بے حد خوش اطوار اور بہت اچھی میزبان تھی۔ اُس کے انکل کو اُس سے عشق تھا۔ اس کے ایک ایک انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اُس سے والہانہ محبت کرتا ہے۔

چاڈ نے سوچا، اس معاملے کو یہیں ختم کردینا بہتر ہے۔ مسٹر جولیس بہت اچھے آدمی ہیں اور اینا کا تو جواب ہی نہیں۔ فوربس شاید غصے میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ اگر اس نے دوستانہ انداز میں مسٹر جولیس سے مدد کی درخواست کی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی لیکن شاید اُس نے ان کے سامنے اس انداز میں ہاتھ پھیلایا ہوگا، جیسے وہ کوئی عام سُود خور ہوں۔

پھر چاڈ نے یہ رائے پیش کی کہ بات اسی انداز میں کی جانی چاہیے۔ اور آج ہی۔ بے چارے فوربس کا مسئلہ بھی حل ہوجائے اور تلخی بھی نہ ہو۔ اس لیے کہ دوست فوربس کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ چاڈ نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ فوربس آج رات سونے کے لیے لیٹے تو اس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ ہو۔ اس کا مسئلہ آج ہی حل ہونا چاہیے۔ ہم یہاں سے سیدھے جولیس کے گھر جائیں گے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی ہے اور گھر جانا ان کی دکان جانے سے بہتر ہوگا۔ یہ معزز انداز ہوگا۔ کاروباری نہیں۔ جیسے دوست دوستوں سے ملتے ہیں۔"

دس منٹ کے.... اندر ان کی کاریں قصبے کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ جولیس کے دروازے پر کھڑے

اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا رہے تھے۔

دروازہ اینا نے کھولا۔ اس نے بتایا کہ تمام نوکروں کو سرکس دیکھنے کے لیے چھٹی دے دی گئی ہے۔ چچا کو صبح سے نزلے کی شکایت ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔

"اگر آپ واقعی کسی ضروری کام سے آئے ہیں تو انکل آپ سے مل لیں گے' آیئے میرے ساتھ۔"

وہ انہیں اوپر لے گئی۔ جولیس اپنے بیڈ روم میں تھا۔ وہ مشرقی اسٹائل کا ایک ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ سر پر تنگ سی ٹوپی تھی اور اس وقت وہ درحقیقت غیر ملکی ہی لگ رہا تھا۔

میرا خیال ہے' رقم کے متعلق گفتگو میں زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی کیونکہ جولیس اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ اب وہ مزید قرض بالکل نہیں دے گا۔ اور پھر اس نے ان لوگوں کو لتاڑنا' آئینہ دکھانا شروع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنی احمقانہ فضول خرچیاں کرتے ہیں۔ کس قدر خود غرض اور کتنے جاہل ہیں۔ معاشرے کے کیسے بے کار۔ "میں کیا بتاؤں' اب مجھے کتنا افسوس ہوتا ہے کہ میں نے فوربس کو ابتدا میں ہی رقم کیوں دی۔ افسوس اس لیے نہیں ہوتا کہ میری رقم ڈوب جائے گی۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میری دی ہوئی رقم اس نے اپنی وحشتوں کو مزید بڑھانے۔ اور بھڑکانے میں خرچ کی۔" اس نے کہا۔

اینا نے اپنے انکل کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے' اسے اشارہ کیا کہ وہ اتنی تندی سے بات نہ کرے۔ لیکن جولیس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر وہ بطور خاص چاڈ کی طرف متوجہ ہوا "اور تم۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے والدین کتنے اچھے۔ کتنے عزت دار تھے" اس نے غصے سے کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے اجداد کا کتنا بڑا نام ہے۔ مگر تم۔ تم تو ان سب کے سردار بن گئے ہو۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس نہ صرف یہ کہ دولت سب سے زیادہ ہے بلکہ تم اسے برباد کرنے کے طریقے دریافت کرنے میں ذہانت بھی زیادہ صرف کرتے ہو۔ ان لوگوں کے اخلاقی زوال اور انحطاط کے ذمے دار بھی تم ہو مسٹر چاڈ۔"

چاڈ کو غصہ بہت جلدی اور بہت شدت سے آتا تھا۔ پھر جو کچھ بڈھے جولیس نے کہا تھا' اس میں سچائی اتنی زیادہ تھی کہ اس نے چاڈ کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ اس نے بڈھے جولیس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں جولیس فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اینا اپنے انکل کو بچانے کے لیے لپکی بھی لیکن نیوسم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا۔ وہ مضبوط جسم کا آدمی تھا اس کے لیے اینا پر قابو پانا کچھ دشوار نہیں تھا۔

اب میں اس کمرے کا تصور کر سکتا ہوں' جہاں جذبات بری طرح بھڑکے ہوئے تھے۔ ایسے میں ہوس انگیزی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ یونانی نژاد مسٹر جولیس فرش پر بے بس پڑے تھے۔ یہ تین وحشت زدہ نوجوانوں کو آئینہ دکھانے کا شاخسانہ تھا۔ چاڈ غصے میں تھا لیکن اسے طمانیت تھی کہ اس نے توہین کا بدلہ ہاتھ کے ہاتھ لے لیا ہے۔ فوربس پریشان بھی تھا اور تلخ بھی ہو رہا تھا۔ نیوسم کے پاس غصہ کرنے کا جواز سب سے کم تھا۔ نہ وہ جولیس کا مقروض تھا اور نہ جولیس نے اس کی ذات پر براہِ راست کوئی حملہ کیا تھا۔ وہ تو بس چاڈ پر برستا رہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بے حد حسین لڑکی کو بانہوں میں لیے کھڑا تھا۔

اب کہانی کا وہ حصہ سامنے آتا ہے' جو تصویری معمے کے گمشدہ ٹکڑے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ چاڈ چاہنے کے باوجود نہ کبھی وہ سب کچھ بتا سکا' نہ ہی اس نے وہ اپنی ڈائری میں لکھا۔ اس کے نزدیک وہ بے حد شرم ناک تھا۔ اس کے بارے میں وہ جو کچھ کہتا' اسے بس ایک عذر آمیز چیخ ہی کہا جا سکتا تھا۔ "ہم بہت زیادہ پیے ہوئے تھے۔ نشے میں دُھت تھے" وہ اس طرح صفائی پیش کرتا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ جو کچھ ہوا' وہ اس کے نزدیک شرم ناک تھا۔

مجھے اتنا معلوم ہے کہ بعد میں مسٹر جولیس نے خود کو اتنا سنبھال لیا کہ کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے تھے۔ اور لگتا تھا کہ ان کا قد پہلے سے کچھ بڑھ گیا ہے۔ پھر انہوں نے کسی نامعلوم زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ نہ وہ لفظ ان کے معلوم ہو رہے تھے نہ آواز۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی سائنسی فارمولے کو زبان سے دہرا رہے ہیں اور ساتھ ہی وہ عجیب سے اشارے کر رہے تھے' جو علامتی معلوم ہوتے تھے۔ یوں بولتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ان تینوں کی طرف بڑھے۔ وہ تینوں گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔

"ہم لوگ گنگ ہو گئے تھے" چاڈ نے بعد میں مجھے بتایا۔ "اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ وہ بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ ہم پیچھے ہٹتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے اینا کے جسم سے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔"

وہ تینوں ایک کونے میں گھر گئے۔ جولیس اسی نامانوس زبان میں جیسے کوئی منتر پڑھتا رہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ اشارے کرتے رہے۔ پھر جیسے منتر مکمل ہو گیا۔ وہ خاموش ہوا اور ایک کرسی میں ڈھے گیا۔

سب سے پہلے چاڈ نے ہی خود کو سنبھالا۔ اس نے بہت

بدتمیزی سے پوچھا "کیوں بڈھے' یہ کیا ڈراما ہو رہا تھا۔"

"میں نے... میں نے تم تینوں کو... بددعا دی ہے" جولیس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتایا۔ اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا "اب تم لوگ زیادہ عرصہ نہیں جیو گے' جلد ہی مرجاؤ گے۔"

اس بات کا اثر ان لوگوں پر بالکل نہیں ہوا۔ وہ قہقہے لگاتے' لڑکھڑاتے نیچے اترے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ جولیس کو دکھ اور صدمے نے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بکتا جھکتا ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ اب وہ انہیں انگریزی میں کوس رہا تھا لیکن آواز لرز رہی تھی اور لفظ ناقابلِ فہم ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ تینوں لڑکھڑاتے ہوئے' دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے رہے لیکن نشے کی وجہ سے یہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ بڈھے جولیس نے انہیں ایک طرف ہٹا کر خود دروازہ کھولا۔ دروازے سے نکل کر وہ تینوں اوپری سیڑھی پر کھڑے ہو کر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

"ہم عنقریب پھر آئیں گے" نیوسم نے کہا "اب اینا سے ملنے آیا کروں گا۔ وہ اتنی حسین ہوگی' اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔"

باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ دروازے میں کھڑا جولیس بہت خوف ناک لگ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن لہجہ بہت تند اور خوف زدہ کر دینے والا تھا۔

"اب تم جب بھی اس دروازے کو چھوؤ گے... اور جلد یا بدیر تمہیں اس دروازے کو چھونا ہوگا۔ تو اس کے بعد تم ایک ہفتے کے اندر اندر مرجاؤ گے۔ عین ممکن ہے کہ ایک دن میں... بلکہ ایک گھنٹے میں ہی مرجاؤ۔"

اس بات پر تو وہ تینوں ہنس ہنس کے نیم جاں ہو گئے۔ پھر نیوسم یاوہ گوئی کرتے ہوئے' لڑکھڑاتا ہوا بڑھا اور اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا۔

اچانک بڑی گمبھیر خاموشی چھا گئی لیکن ہوا کچھ نہیں۔ بعد میں میرے اصرار پر چاڈ نے یاد کر کے مجھے بتایا کہ اسے ایسا لگا تھا' جیسے نیوسم کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہو۔ لیکن وہ یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ چاندنی کی وجہ سے بھی ایسا ممکن تھا۔ بہرکیف وہ لوگ خاموشی سے کار میں بیٹھے اور چاڈ کے گھر آ گئے۔ شراب کے اثرات آہستہ آہستہ زائل ہو رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ اندر آئے تو مجھے بہت بجھے بجھے لگے۔

میں نے ان کے لیے ڈرنک بنائے' چاڈ نے کہا "تم جانا نہیں۔ ہمارے پاس ہی بیٹھو۔"

میرے لیے یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ میں ان کی محفل میں نہ کبھی شریک ہوتا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شامل ہونے کو کہتے تھے۔ اب سوچتا ہوں کہ شاید وہ لوگ اس رات کے واقعات پر گفتگو کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کوئی گھنٹا بھر بیٹھا رہا مگر نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔

اچانک نیوسم بڑے ہولناک انداز میں چیخا!

مجھے اس وقت احساس ہوگیا کہ نیوسم پچھلے آدھے گھنٹے سے پی بھی نہیں رہا تھا اور گفتگو میں حصہ بھی نہیں لے رہا تھا۔ چیخ کے فوراً بعد وہ اپنی کرسی سے گر گیا اور یوں ہاتھ پاؤں چلانے لگا' جیسے کسی شدید اذیت میں مبتلا ہو۔ اس کا چہرہ اذیت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی قابلِ فہم نہیں تھا۔ یہ بات طے ہے کہ وہ اس وقت بدترین اذیت سے گزر رہا تھا۔ ہم نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی مگر اس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

میں نے فون کر کے چاڈ کے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ایک گھنٹے بعد نیوسم اسپتال میں تھا۔ وہاں فوری طور پر اس کا ایمرجنسی سائنس کا آپریشن ہوا۔ اس میں کسی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ بہرکیف آپریشن ہر اعتبار سے کامیاب ہوا لیکن نیوسم ہوش میں آنے سے پہلے ہی مرگیا۔

اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ اس رات کیا واقعات پیش آئے تھے اور نیوسم کی موت کا چاڈ پر اتنا اثر ہونا میرے لیے حیران کن ہرگز نہیں تھا۔ وہ لڑکپن کے زمانے سے ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ وہ اسکول میں... کالج میں ایک ساتھ پڑھے۔ اس کے بعد ہر مرحلے پر' ہر تفریح میں وہ ایک دوسرے کے شریک رہے۔ اتنے قریبی دوست دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں' جیسے وہ تھے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ چاڈ کو نیوسم کی صحبت کیوں اس قدر پسند ہے۔ چاڈ بے فکرا تھا۔ کئی اعتبار سے اسے بے وقوف کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں بعض بڑی نازک خوبیاں بھی تھیں' ایسے اوصاف بھی تھے' جو نیوسم کی صحبت کی وجہ سے گھٹ کر رہ گئے تھے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ نیوسم میں خوب رُوئی کے علاوہ کوئی خوبی نہیں تھی۔ ہاں' وہ توانائی سے بھرپور جوان تھا۔

نیوسم کی موت کے ایک ہفتے بعد چاڈ اور فوربس اٹلی روانہ ہو گئے۔ جہاں فوربس کے کئی رشتے دار ان کی میزبانی کے لیے موجود تھے۔ ان کا پروگرام چھ ماہ سے بھی زیادہ قیام کا تھا۔ تمام اخراجات چاڈ کے ذمے تھے۔ مجھے فوربس کے

اکاؤنٹ میں بہت تگڑی رقم منتقل کرانا پڑی حالانکہ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی۔ اس کے علاوہ روانگی سے ایک دن پہلے چاؤ نے مجھے ایک مشن سونپا' جو مسٹر جولیس سے متعلق تھا۔

"تم مسٹر جولیس کے پاس جانا اور ان سے کہنا کہ فوربس نے ان سے قرض لیتے وقت جو تحریری اعترافات ان کو دیے ہیں' وہ لوٹا دیں اور وہ جتنی رقم کے بھی ہوں' اتنی رقم مسٹر جولیس کو ادا کر دینا۔ فوربس کو اندازہ بھی نہیں کہ کتنی رقم ادا کرنی ہے اور سود کی شرح کیا طے پائی تھی۔ میں جو چیک تمہیں دے رہا ہوں' میرے خیال میں یہ اس ادائیگی کے لیے کافی رہے گا۔ لیکن کم پڑے تو تم بینک سے مزید رقم نکلوا لینا۔ اور مسٹر جولیس جس شرح سے بھی سود لیں' خاموشی سے ادا کر دینا۔ یہ قرض ہر قیمت پر مکمل طور پر ادا کرنا ہے تمہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ وہ کوئی اعترافی رسید بچا نہ لے' جس کی بنیاد پر وہ بعد میں فوربس کو دھمکا سکے۔"

میری سمجھ میں بعض باتیں نہیں آئی تھیں۔ خاص طور پر یہ آخری بات۔ بہرحال اتنی معلومات پر میں کام کر سکتا تھا۔

"اور ہاں۔" چاؤ نے مزید کہا "مسٹر جولیس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ دھیان سے سننا اور تفصیل سے لفظ بہ لفظ مجھے لکھ بھیجنا۔ اٹلی کے پتے پر۔"

اس وقت میں مسٹر جولیس' نیوسم اور اٹلی فرار۔ ان تینوں میں کوئی تعلق محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ احساس ہو گیا کہ فوربس کے معاملے میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ اس لیے بھی کہ چاؤ نے مجھے تاکید کی تھی کہ رازداری کا خاص طور پر خیال رکھوں.... اب مجھے مسٹر جولیس سے ملاقات کے بعد امید تھی کہ یہ معاملہ کچھ کھل جائے گا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میں اتنا اہم آدمی نہیں تھا کہ مسٹر جولیس نے کبھی مجھے اپنے گھر کسی پارٹی میں مدعو کیا ہوتا۔ میں مسٹر جولیس سے صرف ایک بار ملا تھا۔ چند ماہ پہلے' ایک دوست کے ہاں۔ مجھے اُس کی شخصیت نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ بہت خوب صورت گفتگو کرتا تھا۔ عجیب سے انداز میں علمیت سے بھرپور گفتگو' جس میں نہ بوجھل پن ہوتا تھا' نہ خشکی اور بورت۔ نہ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ علمیت کے زور پر مخاطب کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ کسی کا بیان کردہ کوئی نکتہ شکر گزاری کے ساتھ قبول کر لیتا۔ وہ شخص یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس نے مسٹر جولیس کی معلومات میں اضافہ کر دیا ہے لیکن جب اسی موضوع پر گفتگو کا دائرہ وسیع ہوتا تو کسی مرحلے پر اچانک پتا چلتا کہ جو نکتہ شریکِ گفتگو نے اپنی دانست میں مسٹر جولیس کو سمجھایا تھا وہ تو بنیادی نوعیت کا تھا اور مسٹر جولیس یقینی طور پر اس سے بخوبی واقف تھے۔ یہ ان کے مزاج کا انکسار اور سادگی تھی کہ انہوں نے اس نکتے کو یوں سنا' جیسے وہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔

میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ بھجوایا۔ مسٹر جولیس نے فوراً ہی مجھے اپنے پرائیویٹ آفس میں بلوا لیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میں ان کے سفید بالوں والے سیکریٹری سے مل رہا ہوں کیونکہ چند ماہ پہلے میں نے مسٹر جولیس کو دیکھا تھا تو وہ بے حد خوب رو اور باوقار آدمی تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا آدمی مسٹر جولیس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جان کر مجھے شاک لگا۔

بہرحال مسٹر جولیس نے بڑے مہذب انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔ ان کی بے تاثر اور خالی خالی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ ان کی آواز میں زندگی کی رمق بھی نہیں تھی۔ مگر جیسے ہی میں نے اپنا مدعا بیان کیا' ان میں جیسے جان پڑ گئی لیکن بڑے خوف ناک اور قابلِ رحم انداز میں۔ وہ جیسے اپنی کرسی میں دھنس گئے۔ نہیں' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سکڑ اور سمٹ گئے۔ انہوں نے اپنا سر جھکا لیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ان کے بال جو پہلے سُرمئی تھے اب بالکل سفید ہو چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ کبھی کبھی ان کے جسم پر لرزش کی ایک لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔

انہوں نے میری پوری بات خاموشی سے سنی۔ اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ اٹھے اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک کمرے کے ایک گوشے میں رکھے سیف کی طرف بڑھے۔ انہوں نے سیف کھولا اور کاغذات کا ایک بنڈل نکالا۔

"مسٹر اسٹیونز۔ میں ایک عزت دار آدمی ہو" انہوں نے مجھ سے کہا "اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس بس یہی رسیدیں ہیں" یہ کہہ کر انہوں نے اُن رسیدوں کے پرزے کیے اور آگے بڑھ کر انہیں آتش دان میں ڈال دیا۔ آتش دان میں کاغذ جل اٹھے۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔

"اب فرمایئے' میں ان کے عوض کتنی رقم ادا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ ایک پینس بھی نہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے قرضہ کینسل کر دیا؟"

"میں کسی رقم کا دعوے دار نہیں۔"

"مسٹر فوربس کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی" میں نے

احتجاج کیا "اور نہ ہی مسٹر چاڈوک یہ پسند کریں گے۔ میں آپ سے پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ قرض خواہ کتنا ہی ہو' مسٹر چاڈوک کے لیے اسے ادا کرنا ہمارے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں اور وہ اپنے دوست مسٹر فوربس کی طرف سے یہ قرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہر قیمت پر۔"

"میں نے کہا نا' میرا کوئی دعویٰ ہی نہیں ہے" انہوں نے کہا اور میز پر رکھی گھنٹی بجادی۔

اب مجھے صحیح معنوں میں خوف آنے لگا۔ معاملہ واقعی بہت سنگین تھا۔ فوربس کی تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی مگر چاڈ کی خاطر میں چاہتا تھا کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔ میں نے اُس سے التجا کی۔ ہر طرح سے خوشامد کی لیکن انہوں نے جواب تک نہیں دیا۔

اسی دوران ان کا چپراسی آگیا' جسے انہوں نے گھنٹی بجا کر طلب کیا تھا۔

"چارلس۔ معزز مہمان کو عزت و احترام سے باہر چھوڑ آؤ" انہوں نے چپراسی سے کہا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "صبح بخیر مسٹر اسٹیونز۔"

میں نے جان لیا کہ اب میری کسی بات کا ان پر اثر نہیں ہوگا لیکن ایک بات بہرحال مجھے ان سے کہنی تھی "مسٹر جولیس۔ اب سے دو دن پہلے مجھے اس قرض کے بارے میں معلوم تک نہیں تھا۔ مسٹر چاڈوک کل ہی اپنے جہاز میں اٹلی چلے گئے جانے سے پہلے انہوں نے مجھے یہ کام سونپا تھا۔ مجھے صرف یہ قرض ادا نہیں کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ آپ کا کوئی پیغام بھی ہے۔ مسٹر چاڈوک یا مسٹر فوربس کے نام۔ مجھے اس معاملے کی نوعیت کا علم نہیں لیکن مجھے آپ سے یہ پوچھنے کی خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو اُن سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے یہ تاثر دیا گیا تھا کہ آپ کی طرف سے دوستی کا پیغام یا کسی قسم کی یقین دہانی متوقع ہے۔ آپ میری پوزیشن سمجھ رہے ہیں نا؟ اگر کچھ کہنا ہے تو۔ میرا مطلب ہے' کوئی پیغام۔" میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

انہوں نے ہاتھ سے مجھے خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا "میں پوری طرح سمجھ رہا ہوں مسٹر اسٹیونز لیکن مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ کوئی پیغام نہیں بھجوانا ہے۔"

اس کے بعد میرے پاس واپس چلے آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

میں نے سوچا کہ چاڈ کو ٹیلی گرام کردوں مگر پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مکمل تفصیل کے ساتھ اس ملاقات کا احوال خط میں لکھنا زیادہ مناسب رہے گا۔ سو میں نے خط لکھ دیا۔ دو ہفتے گزر گئے۔ چاڈ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اچانک مجھے اس کا حیران کن ٹیلی گرام موصول ہوا' جس میں اُس نے اطلاع دی تھی کہ وہ واپس آرہا ہے۔ فوربس اور اس کی آنٹی اس کے ساتھ ہیں' اور وہ اس کے ساتھ ہی قیام کریں گے۔

اب واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں چاڈ کی ڈائری سے اندراجات پیش کررہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

۴ اکتوبر۔ ہم روم پہنچ گئے۔ امید تھی کہ اسٹیونز کا ٹیلی گرام پہنچے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

۶ اکتوبر۔ ابھی تک اسٹیونز کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ میں پریشان ہوں۔

۷ اکتوبر۔ اسٹیونز کا خط آگیا ہے۔ مسٹر جے ہمیں معاف کرنے کو تیار نہیں۔ منحوس آدمی۔ خیر۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم اس سے اور اُس کے لعنتی دروازے سے بہت دور ہیں۔ اور مجھے تو وہ بددعا حماقت ہی لگتی ہے۔ دیوانگی! میں نے سوچا ہے' آج رات فوربس کے ساتھ زبردست تفریح کروں گا۔

۸ اکتوبر۔ طبیعت بہت بے کیف ہے۔ کل ایک ایسے دروازے کے سامنے سے گزر ہوا' جو بالکل مسٹر جے کے گھر کا دروازہ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا تو برا حال ہوگیا۔ ساری تفریح غارت ہوگئی۔

۱۰ اکتوبر۔ رات فوربی کا دماغ چل گیا۔ ان دنوں اس کی مے نوشی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔ رات اس کی آنٹی نے اس سے دروازہ کھولنے کو کہا تو وہ چیخنے لگا... میں سب سمجھتا ہوں' یہ مجھے ختم کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔

۱۲ اکتوبر۔ روم مجھے بہت برا لگنے لگا ہے۔ زیادہ وقت گھر میں ہی گزرتا ہے۔ اسی میں عافیت بھی ہے۔

۱۳ اکتوبر۔ رات سو ہی نہیں سکا۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بڈھا شیطان کوئی چکر چلا رہا ہے۔ کل میں نے سوچا کہ کیا اس دروازے کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا بھی اتنا ہی موثر ہوسکتا ہے۔ اگر وہ دروازے کا کوئی ٹکڑا خط میں رکھ کر مجھے یا فوربی کو بھیج دے اور ہم خط کھولیں اور اسے چھوئیں تو کیا ہوگا؟ مگر نہیں۔ یہ سب بکواس ہے۔ نری خرافات۔ پھر بھی فرض کرو کہ ایسا ہی ہوتا ہے تو۔؟

۱۴ اکتوبر۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ مسٹر جے کوئی شیطانی چکر چلا رہا ہے۔ کاش میں وہیں ہوتا۔ اس کے قریب اور اس پر نظر رکھ سکتا۔ یا اس سے مل کر بات کرنے کی کوشش

کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اپنی بددعا واپس لے لے۔ فوربی تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ میرا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ نیند اول تو آتی نہیں۔ سوتا ہوں تو بس ذرا دیر۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ مے نوشی بالکل چھوڑ دی ہے۔

۱۵ اکتوبر۔ اب اپنی تشویش اور پریشانی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ آج رات گھر واپس جا رہا ہوں۔ فوربی بھی چلے گا لیکن وہ مُصر ہے کہ اس کی بڈھی آنٹی بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ کہتا ہے۔ میں گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ فی الحال سب میرے گھر چلیں گے۔ میں نے اسٹیونز کو تار دے دیا ہے۔

میں اسٹیشن پر انہیں ریسیو کرنے گیا۔ انہوں نے جہاز روم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ فوربس کی آنٹی کو فضائی سفر سے خوف آتا تھا۔ فوربس کی آنٹی میری توقع سے زیادہ بڈھی ثابت ہوئی۔ اس کی شادی ایک فرانسیسی سے ہوئی تھی' جو چند برس بعد انتقال کر گیا تھا۔ اس کا نام مادام فادور تھا۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی۔

فوربس کو دیکھ کر مجھے شاک لگا۔ وہ تو سچ مچ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سونے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین چار دن چاڈ کے گھر میں مقیم رہا۔ اس دوران اُس نے خاصی حد تک خود کو سنبھالا۔ اُس کی حالت اتنی تباہ نہیں لگ رہی تھی لیکن اس کی اعصاب زدگی بدستور تھی۔

چاڈ دبلا اور زرد رُو ہو گیا تھا۔ وہ اعصاب زدہ تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے انداز میں چوکنا پن تھا۔ جیسے کسی جانور کا پیچھا کرنے والا شکاری۔ لیکن نہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ اس شکار کی طرح چوکنا تھا جس کے پیچھے شکاری لگا ہو۔ اس نے مجھ سے مسٹر جولیس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا۔ مسٹر جولیس سے ملاقات کی جزئیات مجھے کئی کئی بار بیان کرنا پڑیں۔

فوربس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ان دونوں کے لیے مسٹر جولیس سے ان کے آفس میں ملاقات کا وقت لے لیا۔ وہ وہاں سے واپس آئے تو سیدھے لائبریری میں آئے۔ میں وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر جانے کے لیے اٹھا۔

"خدا کے لیے اسٹیونز۔ تم کمرے سے یوں نکل رہے ہو' جیسے ہم اچھوت ہوں اور تم ہم سے بچ کر بھاگ رہے ہو۔" چاڈ نے کہا اور گھنٹی بجائی۔

چاڈ نے پہلے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں بھی اسے کھری کھری سناؤں اور کمرے سے نکل جاؤں لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر باز رہا۔ اس وقت اسے ہمدردی اور مدد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ وہ آتش دان کے پاس کھڑا اس وقت تک گھنٹی بجاتا رہا' جب تک بٹلر آ نہیں گیا۔ اس نے بٹلر کو برانڈی لانے کی ہدایت کی۔

روم سے واپسی کے بعد سے چاڈ نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اپنے لیے برانڈی کا ایک بڑا جام بنایا۔ یہی نہیں' اس کے بعد وہ جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ درمیان میں فوربس سے باتیں بھی کرتا رہا لیکن بے ربط باتیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی مسٹر جولیس سے ملاقات کا بھی وہی نتیجہ نکلا تھا' جو میری ملاقات کا تھا۔

چاڈ مسٹر جولیس سے مل کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر تھا۔ برانڈی کے کئی جام حلق سے اترنے کے بعد وہ تاثر معدوم ہو گیا۔ اس کی جگہ بہادری نے لے لی۔ اس نے فوربس سے کہا "کون کم بخت اُس سے یا اُس کے لعنتی دروازے سے خوف زدہ ہے۔"

جواب میں فوربس منمنایا "میں ہوں۔"

"میں بھی ہوں" چاڈ نے کہا "لیکن یہ تو طے ہے کہ جب تک ہم اس دروازے کو نہیں چھوتے' عافیت سے ہیں۔ اور یہی ثابت کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سڑک پر سے گزروں اور اس لعنتی دروازے پر ایک پتھر ماروں۔ چلو فوربی میرے ساتھ۔"

مگر فوربی کسی قیمت پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن چاڈ کے مسلسل اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے مگر اس کی دو شرطیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں گا اور دوسرے یہ کہ وہ سڑک کے اس طرف چلیں گے۔ یعنی جولیس کے مکان سے دور۔ سڑک پار۔ کم از کم اس وقت یہ بات مجھے احمقانہ لگی لیکن میرے خیال میں ان دونوں کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں اپنے طور پر جانے دیا جاتا اور میں انہیں گھر میں رکے رہنے پر قائل نہیں کر سکا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

☆ ✱ ☆

وہ موسم خزاں کی ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ دھوپ بھی تھی اور قدرے خنک ہوا بھی چل رہی تھی۔ سڑکوں پر سوکھے پتے جابجا نظر آ رہے تھے۔ پانچ منٹ میں ہم اس سڑک پر پہنچ گئے' جہاں مسٹر جولیس کا گھر تھا۔ ہم ان کے گھر کے مقابل والے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

اچانک چاڈ نے ہمیں روک دیا "وہ دیکھو" اس نے

کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اپنی بددعا واپس لے لے۔ فوربی تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ میرا حال بھی کچھ بہتر نہیں۔ نیند اول تو آتی نہیں۔ سوتا ہوں تو بس ذرا دیر۔ بھوک بھی نہیں لگتی۔ مے نوشی بالکل چھوڑ دی ہے۔

۱۵ اکتوبر۔ اب اپنی تشویش اور پریشانی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ آج رات گھر واپس جا رہا ہوں۔ فوربی بھی چلے گا لیکن وہ مُصر ہے کہ اس کی بڈھی آنٹی بھی ہمارے ساتھ جائیں گی۔ کہتا ہے۔ میں گھر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ فی الحال سب میرے گھر چلیں گے۔ میں نے اسٹیونز کو تار دے دیا ہے۔

میں اسٹیشن پر انہیں ریسیو کرنے گیا۔ انہوں نے جہاز روم میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ فوربس کی آنٹی کو فضائی سفر سے خوف آتا تھا۔ فوربس کی آنٹی میری توقع سے زیادہ بڈھی ثابت ہوئی۔ اس کی شادی ایک فرانسیسی سے ہوئی تھی، جو چند برس بعد انتقال کر گیا تھا۔ اس کا نام مادام فاور تھا۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی۔

فوربس کو دیکھ کر مجھے شاک لگا۔ وہ تو سچ مچ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ سونے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین چار دن چاؤ کے گھر میں مقیم رہا۔ اس دوران اُس نے خاصی حد تک خود کو سنبھالا۔ اُس کی حالت اتنی تباہ نہیں لگ رہی تھی لیکن اس کی اعصاب زدگی بدستور تھی۔

چاؤ دبلا اور زرد رُو ہو گیا تھا۔ وہ اعصاب زدہ تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے انداز میں چوکنا پن تھا۔ جیسے کسی جانور کا پیچھا کرنے والا شکاری۔ لیکن نہیں۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس شکار کی طرح چوکنا تھا جس کے پیچھے شکاری لگا ہو۔ اس نے مجھ سے مسٹر جولیس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا۔ مسٹر جولیس سے ملاقات کی جزئیات مجھے کئی کئی بار بیان کرنا پڑیں۔

فوربس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ان دونوں کے لیے مسٹر جولیس سے ان کے آفس میں ملاقات کا وقت لے لیا۔ وہ وہاں سے واپس آئے تو سیدھے لائبریری میں آئے۔ میں وہاں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں انہیں چھوڑ کر جانے کے لیے اٹھا۔

"خدا کے لیے اسٹیونز۔ تم کمرے سے یوں نکل رہے ہو، جیسے ہم اچھوت ہوں اور تم ہم سے بچ کر بھاگ رہے ہو۔" چاؤ نے کہا اور گھنٹی بجائی۔

چاؤ نے پہلے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں بھی اسے کھری کھری سناؤں اور کمرے سے نکل جاؤں لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر باز رہا۔ اس وقت اسے ہمدردی اور مدد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ وہ آتش دان کے پاس کھڑا اس وقت تک گھنٹی بجاتا رہا، جب تک بٹلر آ نہیں گیا۔ اس نے بٹلر کو برانڈی لانے کی ہدایت کی۔

روم سے واپسی کے بعد سے چاؤ نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اپنے لیے برانڈی کا ایک بڑا جام بنایا۔ یہی نہیں، اس کے بعد وہ جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ درمیان میں فوربس سے باتیں بھی کرتا رہا لیکن بے ربط باتیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی مسٹر جولیس سے ملاقات کا بھی وہی نتیجہ نکلا تھا، جو میری ملاقات کا تھا۔

چاؤ مسٹر جولیس سے مل کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر تھا۔ برانڈی کے کئی جام حلق سے اترنے کے بعد وہ تاثر معدوم ہو گیا۔ اس کی جگہ بہادری نے لے لی۔ اس نے فوربس سے کہا "کون کم بخت اُس سے یا اُس کے لعنتی دروازے سے خوف زدہ ہے۔"

جواب میں فوربس منمنایا "میں ہوں۔"

"میں بھی ہوں" چاؤ نے کہا "لیکن یہ تو طے ہے کہ جب تک ہم اس دروازے کو نہیں چھوتے، عافیت سے ہیں۔ اور یہی ثابت کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سڑک پر سے گزروں اور اس لعنتی دروازے پر ایک پتھر ماروں۔ چلو فوربی میرے ساتھ۔"

مگر فوربی کسی قیمت پر جانے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن چاؤ کے مسلسل اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے مگر اس کی دو شرطیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں گا اور دوسرے یہ کہ وہ سڑک کے اس طرف چلیں گے۔ یعنی جولیس کے مکان سے دور۔ سڑک پار۔ کم از کم اس وقت یہ بات مجھے احمقانہ لگی لیکن میرے خیال میں ان دونوں کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں اپنے طور پر جانے دیا جاتا اور میں انہیں گھر میں رکے رہنے پر قائل نہیں کر سکا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔

☆ ✱ ☆

وہ موسم خزاں کی ایک خوش گوار سہ پہر تھی۔ دھوپ بھی تھی اور قدرے خنک ہوا بھی چل رہی تھی۔ سڑکوں پر سوکھے پتے جابجا نظر آ رہے تھے۔ پانچ منٹ میں ہم اس سڑک پر پہنچ گئے، جہاں مسٹر جولیس کا گھر تھا۔ ہم ان کے گھر کے مقابل والے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔

اچانک چاؤ نے ہمیں روک دیا "وہ دیکھو" اس نے

فوربس کا بازو تھامتے ہوئے کہا "دروازے پر تو اچھے خاصے لوگ جمع ہیں۔"

"تو کیوں نہ ہوں" فوربس نے بے بسی سے کہا "انہیں اس دروازے سے خوف تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو صرف ہم دونوں ہی بدنصیب ہیں۔"

"لیکن یہ لوگ کر کیا رہے ہیں؟" چاڈ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اس وقت ہم دروازے سے خاصا دور تھے۔ ذرا آگے گئے تو پتا چلا کہ چار مزدور دروازے کے ساتھ ہی کوئی کارروائی کر رہے ہیں۔ ہم مخالف فٹ پاتھ پر رک گئے۔

"سڑک پار کر کے جاؤ اسٹیونز۔۔۔ اور دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے؟" چاڈ نے مجھ سے کہا۔

میں سڑک پار کر کے گیا۔ چاروں کاریگر دروازے پر کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ ایک فرم کا فورمین کارپینٹر تھا اور کئی بار ہمارے لیے بھی کام کر چکا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور مجھے ہیلو کہا۔

"کہو بھئی' یہ کیا کام ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کا جواب میں نے چاڈ تک پہنچا دیا۔ مسٹر جولیس نے اپنے گھر کا دروازہ تبدیل کرایا تھا۔ وہ لوگ نیا دروازہ نصب کر رہے تھے۔ فورمین نے کہا تھا کہ وہ خود حیران ہے کیونکہ پرانا دروازہ بہت ہی اچھی حالت میں تھا۔ وہ خوب صورت جارجین انداز کا دروازہ تھا۔ بظاہر اسے تبدیل کرانے کی کوئی تک نہیں تھی۔

دونوں نے میری بات توجہ سے سنی اور چند لمحے خاموش رہے۔ بالآخر فوربس نے خاموشی توڑی "شکر ہے' اس عذاب سے جان چھوٹی" اس نے کہا "نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری۔ بس اب گھر چلو۔ میں آج سکون سے ایک جام پیوں گا۔"

لیکن چاڈ خاموش تھا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز لرز رہی تھی "پرانا دروازہ کہاں گیا؟" اس نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

فوربس حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم کچھ بھی نہیں سمجھے بے وقوف" چاڈ نے کہا "وہ یہاں لگا ہوا تھا تو کم از کم ہماری نظروں کے سامنے تو تھا۔ ہم احتیاط برت سکتے تھے۔ مکان کو آگ لگوا دیتے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ آج ہی مجھے یہ خیال آیا تھا لیکن اب۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ بھاگ کر سڑک پار کی اور کاریگروں کے پاس پہنچ گیا۔

"پرانے دروازے کا کیا بنا؟" اس نے فورمین سے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

فورمین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تاہم بڑی تمیز سے جواب دیا "مسٹر جولیس نے آج صبح اسے فروخت کر دیا۔ میں نے خود اسے گاڑی پر لد کر جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی ہم نے کام شروع کیا تھا۔"

"کس نے خریدا ہے وہ دروازہ؟ کہاں لے جایا گیا۔۔؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں جناب۔ جو لوگ دروازہ لے کر گئے' میں انہیں نہیں پہچانتا۔ مجھے تو یہ بات ہی عجیب لگی کہ کسی نے دروازہ خریدا۔ حالانکہ وہ اٹھارویں صدی کا بہت اچھا اور مضبوط دروازہ تھا لیکن ایسے دروازے تو اس شہر میں سیکڑوں ہیں۔"

چاڈ واپس آیا اور بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چلنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوربس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔

ہم دوبارہ لائبریری میں جا بیٹھے "کچھ پئیں گے؟" میں نے چاڈ سے پوچھا۔

لیکن چاڈ نے انکار کر دیا "میں اپنا ذہن صاف رکھنا چاہتا ہوں" اس نے کہا۔ پھر وہ فوربس سے مخاطب ہوا۔ "اب ہمیں اسٹیونز کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔ میں اور تم یہ کام نہیں کر سکتے۔ کیوں فوربی' میں اسٹیونز کو اتنا بتا دوں' جتنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو؟"

"ہاں۔ بتا دو" فوربس نے کہا۔

تب چاڈ نے مجھے وہ کچھ بتایا' جو میں اب تک بیان کر چکا ہوں۔ سب کچھ سنانے کے بعد اس نے کہا "یہ ہے کل خرافات لیکن تم بھی تسلیم کرو گے کہ ہے بے حد خطرناک خرافات۔ اس لیے کہ ہمارے دماغ پر۔۔۔ اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔ یہ فوربس تو خود کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کر لے گا اور شاید میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دروازے کو تلاش کیا جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ قصبے کی فرنیچر کی ہر دکان چیک کرو۔ معلوم کرو کہ آج صبح اس مقام سے دروازہ وہاں لایا گیا ہے یا نہیں۔ اٹھارہویں صدی کا پینل والا دروازہ۔ معلوم کرو کہ کس نے وہ دروازہ خریدا ہے اور کہاں نصب کیا جا رہا ہے اسے۔ ایسے سیکڑوں دروازے ہیں یہاں' کیا پتا' وہ کسی دوست کے گھر لگے۔ اور ہم کسی دن اس سے ملنے یا اس کے ہاں ڈنر پر جائیں۔ اسے چھوئیں اور پھر۔" وہ جھرجھری

لے کر رہ گیا۔ پھر وہ وحشت زدہ انداز میں ہنسنے لگا "ویسے بڈھے کو داد دینی پڑتی ہے۔ اس نے ہم سے بہت شاندار انتقام لیا ہے۔"

☆ ✳ ☆

میں نے فوری طور پر دروازے کے سلسلے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ پوچھ گچھ کا وہ سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میرا خیال ہے کہ مقامی کارپینٹرز اور تعمیراتی کمپنیوں والے مجھے پاگل سمجھنے لگے ہوں گے۔ میں نے کاریگروں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس سلسلے میں مجھے کچھ بتائیں گے تو میں انہیں معلومات کا معقول معاوضہ ادا کروں گا۔ بعض اوقات مجھے معلومات فراہم کی گئیں اور میں ان کے زور پر آگے بڑھا لیکن آگے جاکر معلومات غلط ثابت ہوئیں۔ ایسے بہت سے لوگ ملے، جنہوں نے کسی گھر میں کسی پرانے دروازے کی تنصیب کے متعلق سنا تھا۔ ظاہر ہے، پرانے دروازے خریدے بھی جاتے تھے، فروخت بھی ہوتے تھے اور گھروں میں لگائے بھی جاتے تھے لیکن ان میں میرا مطلوبہ دروازہ کہیں نہیں تھا۔

میرا خیال ہے، پورے انگلینڈ میں کسی کو دروازوں کے متعلق اتنی معلومات نہیں تھیں جتنی مجھے حاصل ہوگئی تھیں۔ مجھے متعدد بار جارجین طرز کے دروازوں کے علاوہ بھی دروازوں کے پیچھے دوڑنا پڑا تھا۔ ان میں وکٹورین طرز کے، ملکہ الزبتھ کے، ملکہ این کے دور کے اور رجنسی طرز کے دروازے شامل تھے۔ بس مجھے کہیں کسی پرانے دروازے کے لگائے جانے کی خبر ملتی تھی اور میں اس کے پیچھے دوڑ جاتا تھا۔ یہ الگ بات کہ میری بھاگ دوڑ ہمیشہ بے سود ثابت ہوئی۔ تاہم میں نے ایک کام اور کیا۔ بڑی رازداری سے چاڈ کے تمام دوستوں کے گھروں کو چیک کیا۔ اس طرح یہ تسلی ہوگئی کہ ان کے گھروں میں دروازوں کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کرسمس آنے تک ہم نے دروازے کی جستجو ترک کردی تھی۔

فوربس اپنے گھر واپس چلا گیا تھا اور وہاں اپنی آنٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسے چاڈ کا شکرگزار ہونا چاہیے تھا، جس نے اس کے مالی معاملات درست کردیے تھے اور وہ اب بھی شاہانہ طریقے سے رہ رہا تھا۔ وہ اور چاڈ اب ایک دوسرے سے بہت کم ملتے تھے۔ فوربس اب بہت بدل گیا تھا۔ اس نے مے نوشی سے چھٹکارہ پالیا تھا اور ان دنوں اسے ورزش کا خبط ہوگیا تھا۔ وہ بہت بھاری ورزشیں کرتا تھا۔ اُس ہرمار سے اُس نے ہاکی کھیلنا شروع کردیا۔ اسکواش وہ پہلے بھی کھیلتا تھا لیکن اب اسکواش کی لگن بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ بہت صحت مند نظر آتا تھا۔ اس میں سنجیدگی بھی آگئی تھی۔ تاہم میں نے اس کے ساتھ اسکواش کھیلنے والوں کو یہ کہتے سنا۔ اب وہ پہلے جیسا اسپورٹس مین نہیں رہا ہے۔ اس کی خوش مزاجی رخصت ہوگئی ہے۔

دوسری طرف چاڈ اب گھر سے بھی کم ہی نکلتا تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت لائبریری میں گزرتا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ابتدا میں وہ خوف کی وجہ سے گھر سے نہیں نکلتا تھا لیکن بعد میں اسے مطالعے کا چسکا لگ گیا۔ اسے پتا چلا کہ مطالعہ بہت اچھی مصروفیت بھی ہے اور اس سے عجیب سی مسرت اور طمانیت ملتی ہے۔ اس کے بعد اُسے گھر سے نکل کر کہیں تفریح کرنا وقت کا زیاں معلوم ہونے لگا۔ یہ میں آکسفورڈ کے زمانے سے جانتا تھا کہ وہ بے حد ذہین ہے۔ مگر اس نے غلط صحبت اختیار کرکے اپنی ذہانت کو بیکار شے بنا کر رکھ دیا تھا۔ مگر اب ہم مل کر مطالعہ کرتے تھے۔ تاریخ ہمارا سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی ڈرامے، شاعری اور لاطینی ادب میں بھی چاڈ کو خاص دلچسپی تھی۔

"میں اس مجرم کی طرح ہوں، جسے سزائے موت سنائی جاچکی ہے" اس نے ایک بار مجھ سے کہا "اور میں سوچتا ہوں کہ علم سے محروم کیوں مروں۔"

وہ اکثر اس خوف ناک رات کے اور مسٹر جولیس کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ کبھی رات گئے اسے اُس رات کا خیال آتا۔ وہ ہمیشہ مسٹر جولیس کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ کھینچتا تھا، جب وہ کسی اجنبی زبان میں ان لوگوں کو بددعا دے رہے تھے۔ یا وہ وقت جب وہ چاندنی میں نہائے ہوئے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔

اٹلی سے واپسی کے بعد چاڈ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اینا کے متعلق معلوم کروں کہ اس کا کیا حال ہے۔ میں نے بڑی رازداری سے اس معاملے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے بتایا گیا کہ بہت دنوں سے اینا کو کسی نے نہیں دیکھا ہے اور مسٹر جولیس سے اس سلسلے میں کوئی پوچھے تو وہ کمزور آواز میں کہتے ہیں۔ وہ سفر کررہی ہے۔

اس پر ایک شخص نے پوچھا "آج کل وہ کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے، آسٹریا میں ہے" مسٹر جولیس نے جواب دیا تھا۔

اس شخص نے اگلے روز یہی سوال کیا تو مسٹر جولیس نے اسے بتایا کہ اینا آج کل مصر میں ہے۔

میں نے چاڈ کو یہ سب کچھ بتادیا۔ چاڈ نے اس کے بعد کبھی

اینا کے متعلق نہیں پوچھا بلکہ اس نے کبھی اینا کا نام بھی نہیں لیا۔ اس میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ دُبلا اور کمزور ہوگیا تھا۔ وہ بداطوار تو خیر کبھی نہیں رہا تھا لیکن اب وہ غیر معمولی طور پر نرم خو' مہربان اور دوسروں کا خیال کرنے والا ہوگیا تھا۔ میں پہلے بھی اسے پسند کرتا تھا لیکن اب میرے لیے اس میں اتنی زیادہ کشش تھی کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

ہمارے گھر لوگ آتے رہتے تھے لیکن چاڈ کو بڈھے ڈاکٹر پین روز اور اس کی بیٹی بیٹرائس کی صحبت بہت پسند تھی۔ بیٹرائس کو وہ بائس' کہہ کر پکارتا تھا۔ پہلے بائس چاڈ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ وہ بڑی نرم خُو اور اچھی لڑکی تھی۔ چاڈ کا لاابالی پن اسے برا لگتا تھا لیکن چاڈ بدلا تو وہ بھی بدل گئی۔ اب یہ بات یقین سے کہی جاسکتی تھی کہ وہ دونوں ہر لمحہ ایک دوسرے کی محبت میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

کرسمس کی رات میڈم فاور اور فوربس کو چاڈ کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ ہم لائبریری میں ان کا انتظار کرتے رہے۔ میڈم فاور پہلے آئیں۔ انہوں نے بتایا کہ فوربس کا چہل قدمی کا موڈ تھا۔ لہٰذا وہ انہیں دروازے تک چھوڑ کر خود ٹہلنے کے لیے چلا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ دس منٹ میں واپس آجائے گا۔

ہم لوگ کاک ٹیل کی چسکیاں لیتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ چاڈ میڈم فاور سے فرانس کے صنعتی انقلاب کے بارے میں باتیں کررہا تھا۔ میڈم فاور دلچسپ گفتگو کرتی تھیں۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

پھر فوربس آگیا۔ وہ کچھ عجیب سا ہورہا تھا۔ یہ بات چاڈ نے بھی محسوس کرلی "کیا بات ہے فوربی؟" اس نے پوچھا "تم اس وقت مار کھائے ہوئے کتے کی طرح لگ رہے ہو۔"

"کتے کی طرح؟" فوربس نے دہرایا۔

"ہاں۔ لو یہ جام لو" چاڈ نے کہا۔

"کتے کی طرح؟" فوربس نے جام لیتے ہوئے پھر دہرایا۔ اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ سوبر تھا' پھر اچانک میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس نے اپنی کلائی پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔

"کیا بات ہے' کوئی چوٹ لگ گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے' معمولی چوٹ ہے۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

میں نے رومال ہٹا کر دیکھا۔ وہ چھوٹی سی خراش تھی لیکن بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اوپر خون کا ایک قطرہ موجود

استاد نے شاگرد سے پوچھا "قاتل کا کیا مطلب ہے؟"

"معلوم نہیں" شاگرد نے جواب دیا۔

"اچھا! اگر تم اپنے باپ کو قتل کردو تو تم کیا کہلاؤ گے؟" استاد نے پوچھا۔

"یتیم!" جواب ملا۔

مرسلہ: قیصر رضا' لاہور

تھا۔ میں نے باتھ روم لے جاکر خراش کو دھویا اور اس پر آیوڈین لگادی۔ تب اس نے مجھے وہ واقعہ سنایا جو اسے پیش آیا تھا۔

وہ اپنی آنٹی کے ساتھ آرہا تھا کہ اس کے دل میں اکیلے چہل قدمی کرنے کی ایسی شدید خواہش ابھری کہ جسے دبانا ناممکن تھا۔ اس نے آنٹی کو اندر جانے کو کہا اور خود دروازے سے پلٹ گیا۔ نہ جانے کیوں۔۔۔ لیکن اس کے قدم خود بخود ایلم اسٹریٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ ایلم اسٹریٹ قصبے کی وہ واحد سڑک ہے' جہاں ہر مکان مکمل طور پر جارجین طرز کا ہے۔

وہ سڑک کے کارنر پر رک گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر کوئی نامعلوم طاقت اسے اکسا رہی ہے کہ وہ اس اسٹریٹ کے تمام مکانات کے دروازوں کو ہاتھ لگائے۔ اُس نے اسے ردّ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

"مجھے ایسا لگا' جیسے کوئی شخص مجھ سے باتیں کررہا ہے۔" اس نے مجھے بتایا "میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ اگر تم نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا تو تم بزدل ہو۔ نامرد ہو۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ اگر اس وقت میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا تو خود اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔"

چنانچہ اس نے پوری سڑک کا چکر لگایا اور ہر مکان کے دروازے کو چھوا۔ پھر اس نے سڑک پار کی اور دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس طرح کے مکانوں کے دروازوں کو ہاتھ لگایا۔

"پہلے دروازے کو چھوتے ہوئے میں خوف زدہ تھا۔" اس نے کہا "پھر میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ میں نڈر ہوگیا۔ میں نے بڑے غرور اور نفرت سے ہر دروازے کو ہاتھ لگایا اور جب میں ہر دروازے کو چھو چکا تو یقین کرو' مجھے بڑی طمانیت ہوئی۔ میں خود کو بہتر آدمی محسوس کررہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے کوئی بھاری قرض اتار دیا ہے' کسی بڑے بوجھ سے آزاد ہوگیا ہوں میں۔ اسی وقت ایک کتے نے مجھ پر جست

لگائی۔ وہ بڑی جسامت کا سیاہ کتا تھا اور میری گردن میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کے بعد اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ بھونکتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ یہاں آتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری کلائی سے خون بہہ رہا ہے میں نے اس پر رومال لپیٹ لیا۔"

یہ سب کچھ مجھے بتانے کے بعد اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں چاڈ کو کچھ بھی نہ بتاؤں۔

ہم لائبریری میں واپس آئے۔ کھانا لگایا جا چکا تھا۔ کھانا سکون سے کھایا گیا مگر کھانے کے بعد اس نے پانی کی بلوری صراحی اٹھا کر آتش دان میں پھینک دی۔

انگلینڈ میں ریبیز کا اثر خوف ناک حد تک سُرعت سے ہوتا ہے۔ فوربس نے ہائیڈروفوبیا کی ہر اذیت اٹھائی اور وہ بھی صرف چھ دن۔ مگر چھ دن کی وہ اذیت برسوں کی بیماری پر بھاری تھی۔ ایک ہفتہ گزرنے سے پہلے وہ ختم ہو گیا۔

☆ ✱ ☆

یہ حیرت انگیز بات تھی کہ چاڈ پر فوربس کی موت نے کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے تسلیم کر لیا کہ بدقسمتی اسے چھوڑے گی نہیں۔ میں نے مایوسی کی اس دھند کو ہٹانے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ اب کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دروازہ کس گلی میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمیں مکان کے بارے میں علم نہیں مگر یہ احتیاط تو کی جا سکتی ہے کہ اس اسٹریٹ کا ہی رخ نہ کیا جائے۔

لیکن چاڈ نے اس حقیقت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ پُرکشش ہو گیا لیکن اب وہ اپنے اندر سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو ایک خول میں بند کر لیا تھا اور اس خول کو توڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ یہاں کی تمام جائداد فروخت کر کے کہیں کسی دور دراز مقام پر چلا جائے۔ ضروری ہو تو وہاں بھی نام بدل کر رہے۔

مگر چاڈ نے صاف انکار کر دیا اور انکار پر ڈٹا رہا۔ "سب بے کار ہے" اس نے کہا "مجھے ہر حال میں حقیقت کا سامنا کرنا ہے تو یہاں کیوں نہ کروں۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میرا گارڈن ہے، میری کتابیں ہیں اور۔۔۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے بائس کا نام اپنی نوکِ زباں پر روک لیا ہے۔ "تم مس پین روز سے شادی کر لو۔" میں نے التجا کی "اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور خوش رہو۔ بہت اذیت اٹھا لی تم نے۔"

"میں۔ میں اس سے شادی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

میں نے مسٹر جولیس سے ایک بار اور رحم کی اپیل کرنے کا ارادہ کیا اور ان کے دفتر گیا۔ وہاں پتا چلا کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور کئی ماہ بعد آئیں گے۔

"انہوں نے اپنا پتا دیا ہو گا۔" میں نے ان کے سکریٹری سے کہا۔

"انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ ان کا پتا کسی کو بھی نہ دیا جائے۔" سکریٹری بولا "ہاں' آپ انہیں خط لکھ دیں تو وہ انہیں بھجوا دیا جائے گا۔"

میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب ایک خط کا بھی نہیں ملا۔

اب یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن وہ موسمِ بہار ہم نے ہنسی خوشی گزارا۔ چاڈ گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ گارڈن میں چلا جاتا تھا۔ وہ مطالعے کو اور زیادہ وقت دینے لگا تھا۔ یہی نہیں' اس نے مختصر کہانیاں اور ادبی مضامین بھی لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس کی کہانیوں کے موضوعات انوکھے' دلکش اور نازک تھے اور وہ انہیں ٹریٹ مینٹ بھی نازک دیتا تھا۔ بعد میں وہ کہانیاں فرضی نام سے شائع بھی ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملات اس رخ پر نہ گئے ہوتے تو وہ ایک عظیم ادیب ثابت ہوتا۔ ہم اگرچہ خوش تھے لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ یہی رہتا۔ یہ نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہوتا کاش۔ کاش۔۔۔! خوشی کے باوجود گھر کی فضا جیل کی اس کوٹھری کی سی تھی' جس میں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے ہیں۔ یہ گمان ہوتا کہ گھر میں کوئی بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔

لیکن اس کوٹھری میں بسترِ مرگ اور اس پر پڑا ہوا کوئی مریض ہی نہیں' ایک ایسی ہستی بھی موجود تھی' جس سے وہ کوٹھری جگمگاتی تھی۔ بائس! بائس کی ماں مر چکی تھی' اب ہمارے ہاں بائس اور ڈاکٹر پین روز کے سوا کوئی نہیں آتا تھا۔ بائس اکثر سہ پہر کو آ جاتی۔ وہ وائلن بجاتی اور چاڈ سنتا۔ پھر اپنے مطب سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر بھی آ جاتا اور ڈنر ہمارے ساتھ ہی کرتا لیکن وہ دونوں چاڈ کی صورتِ حال نہیں سمجھ سکے تھے۔ سمجھے بھی تھے تو بہت تھوڑا لیکن وہ تھوڑا ہی اتنا تھا کہ انہوں نے اسی کی وجہ سے قصے کی روایات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ شاید ہی کبھی کوئی دن ایسا گزرتا ہو' جب بائس' چاڈ کے ساتھ تنہائی میں کئی گھنٹے نہ گزارتی ہو۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا' کہیں وہ یہ نہ سمجھتی ہو کہ چاڈ کسی ایسے

ویسے چکر میں بندھا ہونے کی وجہ سے اس سے شادی سے گریزاں ہے۔ چنانچہ میں نے حتی الامکان موضوع کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ "تم چاڈ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو۔" میں نے اس سے التجا کی۔ یہ کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ بہت سمجھ دار لڑکی تھی اس نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کردی کہ وہ اس معاملے کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ چاڈ نے اسے سمجھادیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ یہ جاننے کے بعد بائس نے شادی کا خیال دل سے نکال کر جو کچھ بھی اپنے پاس تھا' سب چاڈ پر نچھاور کردیا۔ دوستی' ہمدردی' محبت!

جون کی ایک شام جدائی کی گھڑی آپہنچی۔ ہم نے شام کی چائے گارڈن میں پی تھی۔ ڈاکٹر اور بائس بھی موجود تھے۔ چائے پینے کے بعد چاڈ اور بائس ٹہلتے ہوئے دریا کی طرف چلے گئے۔ میں اور ڈاکٹر بیٹھے سگریٹ کے کش لیتے رہے۔

موسم گرما تقریباً آدھا گزر چکا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی موجود نہیں تھا۔ چاڈ اور بائس دیر تک نہیں آئے تو میں ڈاکٹر کو لے کر گھر چلا گیا۔ گیارہ بجے کے قریب بائس گارڈن سے آئی تو اس کی جھولی گلابوں سے بھری ہوئی تھی۔

"یہ فرانسی کے لیے ہیں" اس نے اپنے باپ سے کہا "چاڈ ان کی چھٹائی پر تلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا' ضائع کرنے کی بجائے فرانسی کو دے دیں۔"

وہ پھولوں کو جھولی سے آزاد کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پھر وہ ان تمام پھولوں کو سمیٹ کر نہیں لے جاسکے گی۔

چاڈ ٹوکری لے آیا۔ پھول ٹوکری میں بھردیے گئے۔ اب چاڈ مُصر تھا کہ وہ خود پھول لے کر چلے گا اور گھر تک پہنچائے گا۔ یہی نہیں' پھر ڈاکٹر کے گھر بھی چلیں گے۔ ہم سب۔ اس بات پر بائس بھی رضامند ہوگئی کہ پھول فرانسی کے گھر دیتے ہوئے جائیں گے۔

"یہ فرانسی کون ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ڈاکٹر اپنا پائپ سلگانے کے لیے رک گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ چاڈ اور بائس باہر نکل چکے تھے بلکہ وہ کار تک سڑک بھی چکے تھے۔

"بائس کی سہیلی ہے۔ بہت عرصے کے بعد واپس آئی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"کہاں رہتی ہے؟"

"ایلم اسٹریٹ کے کسی مکان میں۔ نمبر مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے مضبوطی سے ڈاکٹر کا بازو تھام لیا "پائپ کو چھوڑیں۔ جلدی کریں جناب۔" میں عملاً اس کو کھینچ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے۔" ڈاکٹر نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

میں ڈاکٹر کو چھوڑ کر خود ہی لپکا۔ میں چاڈ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میں نے بائس کو کہتے سنا "یہی دروازہ ہے چاڈ ڈیئر۔"

تب مجھے اندازہ ہوا کہ شاید سہیلی کو اپنے ہاتھوں سے پھول دینے کی خواہش میں بائس نے پھولوں کی ٹوکری چاڈ سے لے لی تھی۔ فٹ پاتھ اور دروازے کے درمیان ایک ہی قدمچہ تھا۔ چاڈ اس پر چڑھا۔ اس نے پلٹ کر بائس کو دیکھا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے منہ سے تشویشی لہجے میں بس ایک لفظ نکلا۔ "چاڈ۔۔۔!"

لیکن چاڈ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں مزید کچھ نہ کہوں۔

چاڈ نے بڑی محبت سے بائس کو دیکھا اور بے حد شیریں لہجے میں پوچھا "تمہیں یقین ہے ڈیئر کہ یہی وہ دروازہ ہے۔"

"ہاں چاڈ! فرانسی یہیں رہتی ہے۔ پلیز۔۔۔ دستک دو نا۔"

چاڈ نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ پھر رات کی عبا پہنے خوب صورت آسمان کو اور اس سڑک کے دونوں طرف سوئے ہوئے خوب صورت' پُرسکون مکانوں کو یوں دیکھا' جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔۔۔ جیسے وہ سب کچھ نظر میں بسالینا چاہتا ہو۔

پھر اس نے دروازے پر دستک دی!

خدا کا شکر ہے کہ کوئی بے حد خوف ناک بات نہیں ہوئی۔ بس وہ بڑی آہستگی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اُس کی تیزی سے بے نور ہوتی ہوئی نگاہیں بائس کے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ وہ مر رہا ہے۔

بائس بہت تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ مگر اسی لمحے چاڈ ڈھے گیا۔ بائس کے ہاتھ سے پھولوں کی ٹوکری گری اور خوب صورت گلاب چاڈ کے سینے پر بکھر گئے۔

☆ ✱ ☆

بعد میں میں نے اس دروازے کے متعلق معلومات کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ مکان ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور اس کا دروازہ آج تک بدلا نہیں گیا۔ وہی ڈیڑھ سو سال پرانا دروازہ اب بھی لگا ہے' جس پر چاڈ نے دستک دی تھی۔

یہ وہ دروازہ نہیں تھا۔ تو پھر یہ سب کیا تھا چاڈ کو کیا ہوگیا؟ وہ کیوں اس طرح مرگیا!

THE DOOR
LENNOX ROBINSON

لوہے کے دو رنگ

علیم الحق حقی

سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد بوسنیا میں جو کچھ ہوا اور اب کوسووو میں ہو رہا ہے، وہ متعصب اور تنگ نظر یورپ کی سیاہ تاریخ کا تاریک تر باب ہے۔ جو مظالم وہاں مسلمانوں پر ڈھائے گئے، وہ چنگیزی ہیں نہ نازی۔ ان کے اظہار کے لیے یہ اصطلاحیں ہیچ ہیں کہ یہ خود اپنی مثل ہیں۔ اس دوران سفاکی کی جو کہانیاں منظرِ عام پر آ گئیں، اُن سے کہیں زیادہ ہمیشہ کے لیے زمین کے سینے میں محفوظ ہو گئیں۔ اس عرصے میں محبت و خلوص کے متوالے بھی اپنی داستانیں رقم کرتے رہے۔ انہی واقعات کے تانے بانے سے بُنی گئی یہ کہانی ایثار و بربریت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ وسیع النظری اور روشن خیالی کے نام پر تنگ نظری اور جہالت میں مبتلا مغرب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو صحیح اور غلط کی تمیز رکھتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی چند افراد میں سے ایک تھا۔ فاتحِ عالم جذبۂ محبت کی کرشمہ سازی اس پر عیاں ہو چکی تھی اور احسان کے درست مفہوم سے بھی کسی نے اُسے آگاہ کر دیا تھا۔ محبت و ایثار کے ان گنت واقعات کا وہ شاہد بھی تھا اور امین بھی۔ عیسائی ہونے کے باوجود وہ اس سچائی پر ایمان لا چکا تھا کہ انسانیت اور رواداری میں کوئی مذہب دینِ اسلام پر سبقت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ رواداری کے نام پر جب رواداری کا ہی خون کر دیا گیا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

بیس نوجوانوں کے قاتل افسر کا احوال، اُسے اپنی بے گناہی پر اصرار تھا

وہ یوگوسلاویہ کی ایک فوجی عدالت تھی، جہاں ایک غیر معمولی مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ کورٹ مارشل گورین نام کے ایک کیپٹن کا ہو رہا تھا۔ تین جج اس مقدمے کی سماعت کر رہے تھے۔ عدالت کا سربراہ ایک بریگیڈیئر تھا جبکہ دیگر دونوں ارکان کرنل تھے۔

مقدمے کے واحد عینی گواہ لیفٹیننٹ میسٹولوف نے اپنا بیان مکمل کیا اور نفرت آمیز نگاہوں سے کیپٹن گورین کو تکنے لگا۔

بریگیڈیئر نے اپنے ساتھی کرنلوں کو غور سے دیکھا۔ ان دونوں نے اپنے سروں کو تفہیمی جنبش دی۔ بریگیڈیئر ملزم کیپٹن گورین کی طرف متوجہ ہوا "تم نے اپنے ماتحت کا بیان سنا" اس نے کیپٹن کو مخاطب کیا "اس نے کہیں جھوٹ تو نہیں بولا؟ اس کے بیان سے یا بیان کے کسی حصے سے تمہیں اختلاف تو نہیں ہے؟"

"نہیں جناب۔ بس نقطۂ نظر کا فرق ہے" کیپٹن گورین نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں اعتراف ہے کہ تم نے اچانک اور بلاوجہ اندھادھند فائرنگ کر کے اپنے انیس ماتحتوں کو بھون ڈالا؟" ایک کرنل نے پوچھا۔

"میرا فعل اچانک تو تھا جناب۔ مگر بے وجہ نہیں تھا۔"

"اوہ۔۔۔ تو اپنے ماتحت فوجیوں کو بھون ڈالنے کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے؟" دوسرے کرنل نے بھویں اچکاتے ہوئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"جی ہاں جناب، وجہ تھی۔"

"میرا خیال تھا کہ تم کوئی عذر پیش کرو گے" بریگیڈیئر نے کہا۔ "مثلاً یہ کہ تمہاری یادداشت غائب ہو گئی تھی یا دماغ چل گیا تھا تمہارا" بریگیڈیئر کا لہجہ سرد تھا۔

"یا یہ کہ تم غصے میں اندھے ہو گئے تھے" ایک کرنل نے ٹکڑا لگایا۔

کیپٹن گورین نے گہری سانس لی "یہ درست ہے کہ میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا" اس نے کہا "لیکن سچ یہ ہے کہ فائرنگ کرتے وقت میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔"

تینوں ججوں نے ایک دوسرے کو دیکھا "یعنی تم جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو؟" بریگیڈیئر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"جی ہاں جناب۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔"

"تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں نے کہا نا جناب کہ اس کی وجہ تھی۔"

"اعترافِ جرم تو تم کر چکے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب باقاعدہ بیان بھی دے ڈالو۔ ہم وہ وجہ بہرحال جاننا چاہیں گے جس کے تحت تم نے بغیر کسی وارننگ کے اپنے ماتحت کا مرڈر پر بے دردی سے فائرنگ کی۔ مگر سنو۔۔۔ ایک بات بتاؤ، تمہیں کوئی پچھتاوا ہے اپنے

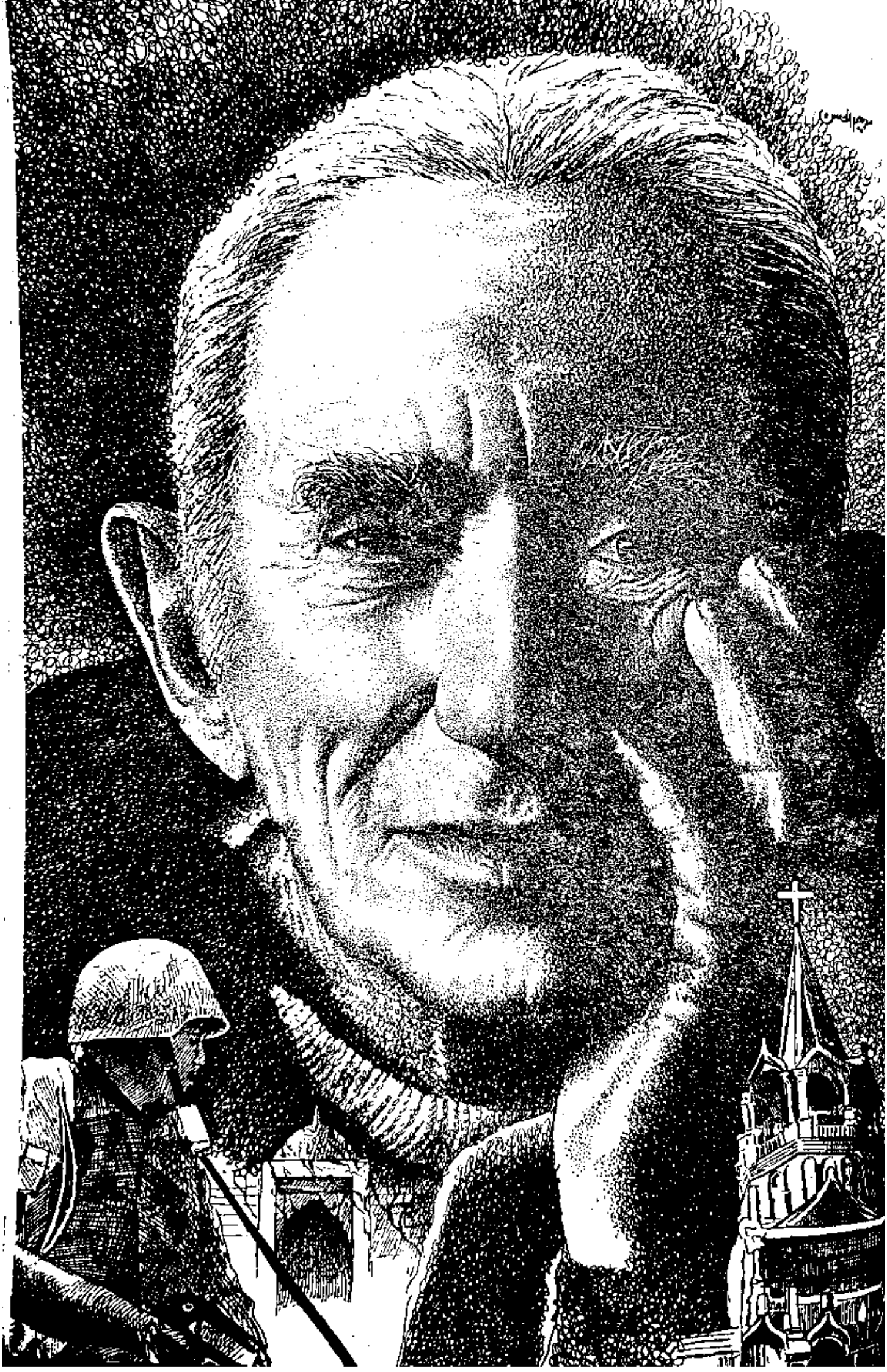

اس فعل پر؟"

"جی نہیں جناب۔ اس صورت حال میں دوسری بار بھی میں ایسا ہی کروں گا۔"

"دوسرے لفظوں میں تم خود اپنے لیے موت کی سزا تجویز کررہے ہو؟"

"جی نہیں جناب۔ مجھے یقین ہے کہ انصاف ہوا تو میں باعزت بری کردیا جاؤں گا" کیپٹن گورین نے بے حد اعتماد سے کہا۔

تینوں ججوں کے چہرے کا رنگ بدل گیا "یہ تو ہم دیکھیں گے" بریگیڈیئر نے کہا "تم تفصیل سے سب کچھ بتا ڈالو۔ ہمیں محرک جاننے میں دلچسپی ہے۔"

"بہتر جناب!" کیپٹن گورین نے کہا۔ چند لمحے وہ خلاؤں میں گھورتا رہا پھر بولا "وہ ۱۸ مارچ کی شام تھی....."

○☆○

وہ ۱۸ مارچ کی شام تھی!

کیپٹن گورین کو اپنا گھر اور گھر کے لوگ بہت شدت سے یاد آرہے تھے۔ ان کے دستے کو اس جنگل میں پڑاؤ ڈالے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ اس کا آبائی گاؤں سوڈینہ اس جنگل سے صرف تیس میل کی مسافت پر تھا۔ گاؤں بلندی پر تھا۔ پہاڑی راستے دشوار گزار تھے پھر بھی جیپ پر وہ بمشکل ایک گھنٹے کا سفر تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ اتنا قریب ہوکر بھی وہ وہاں جا نہیں سکتا تھا۔

اچانک دستے کے انچارج میجر ایلڈرج نے اسے بلوالیا۔ وہ میجر کے خیمے میں چلا گیا۔

"تم سوڈینہ کے رہنے والے ہو نا؟" میجر نے پوچھا۔

"یس سر!" کیپٹن نے جواب دیا۔

"مجھے اپنے گاؤں کے بارے میں بتاؤ۔"

اس کے لیے کیپٹن کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی "سوڈینہ رقبے کے اعتبار سے بڑا گاؤں ہے۔ میرا مطلب ہے' لوگوں کے پاس وہاں زرعی زمین بہت ہے۔ گھر سو سے کچھ زیادہ ہوں گے۔"

"مجھے اپنے گاؤں کے مسلمانوں کے بارے میں بتاؤ۔"

کیپٹن گورین کی آنکھوں میں حارث انکل کا شفیق چہرہ پھر گیا۔ وہ اسے گھر کے لوگوں کی طرح یاد آتے تھے۔ "مسلمانوں کے وہاں مشکل سے بیس گھر ہوں گے" اس کی نگاہیں جیسے گاؤں پہنچ گئیں۔ وہ جو بتا رہا تھا' دیکھ بھی رہا تھا "گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک راستہ پیچھے کی ڈھلان کی طرف نکلتا ہے' اس پر دو میل چلیں تو مسلمانوں کی زمینیں اور گھر شروع ہوتے ہیں۔ تمام گھر ساتھ ساتھ ہیں اور گاؤں میں داخل ہوکر سیدھے چلے جائیں تو ہمارے گھر آتے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں چرچ ہے ہمارا۔"

"بیس گھر" میجر نے پُرخیال لہجے میں دہرایا "تعداد کتنی ہوگی مسلمانوں کی؟"

"ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں ہیں" کیپٹن گورین نے جواب دیا پھر پوچھا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اطلاع ملی ہے کہ سوڈینہ کے مسلمان آج رات خاموشی سے گاؤں چھوڑ کر بوسنیا روانہ ہورہے ہیں۔"

کیپٹن گورین حیران رہ گیا "لیکن کیوں؟ ہمارے گاؤں میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ مذہبی منافرت بھی نہیں رہی۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا" میجر کا لہجہ تلخ ہوگیا "جب سے بوسنیا قائم ہوا ہے' ان لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے وہاں جانے سے بوسنیا کی مملکت مضبوط ہوجائے گی۔ یورپ کے قلب میں اسلامی مملکت ان کے خیال میں بہت بڑی کامیابی ہے۔"

"جبکہ ہم بوسنیا کو ختم کردینا چاہتے ہیں" کیپٹن گورین نے سادگی سے کہا "سربیا اور کروشیا میں بانٹ دینا چاہتے ہیں۔"

میجر نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا لیکن کیپٹن کے چہرے پر کوئی معترضانہ تاثر نہ دیکھ کر مطمئن ہوگیا "ہاں.... ہم وسیع النظر لوگ ہیں۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دیتے ہیں پھر کسی آزاد اسلامی مملکت کی کیا ضرورت ہے" میجر کہتے کہتے رکا "بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"سوڈینہ کے مسلمان...."

"ہاں۔ ہمیں ان کو روکنا ہے" میجر کو یاد آگیا۔

"کیا ضرورت ہے اس کی۔ جارہے ہیں تو جانے دیں۔"

"نہیں بھئی۔ ہمیں دنیا پر یہی تو ثابت کرنا ہے کہ بوسنیا کا وجود غیر ضروری ہے۔ یورپ کے مسلمان کسی بھی ریاست میں آزادی کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور رہ رہے ہیں۔ پھر ہم کیوں بنیاد پرستی کے فروغ کا خطرہ مول لیں۔ یورپ کو تاریکی سے بچانا ہے۔ خیر میں کیپٹن پولارج کو بیس جوانوں کے ساتھ سوڈینہ بھیج رہا ہوں۔ مسلمانوں کو ہر قیمت پر نقل مکانی سے روکنا ہے۔ اچھا.... اب تم جاؤ۔"

کیپٹن عادتاً تعمیل کے لیے اٹھا مگر جاتے جاتے پلٹا۔

"سر.... آپ مجھے بھیج دیں نا۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ میں ان کو بچپن سے جانتا ہوں اور قائل کرسکتا ہوں۔"

میجر مسکرایا "ہوں.... یوں کہو' گھر والوں سے ملنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے' تم بھی چلے جاؤ لیکن کمان کیپٹن پولارج ہی کے پاس رہے گی۔"

"تھینک یو سر!" گورین نے کہا اور خیمے سے نکل آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔

○☆○

گورین کو گھر گئے اور گھر والوں سے ملے ایک سال سے زیادہ ہوچکا تھا۔ اس سفر کے دوران میں وہ بہت خوش تھا۔ وہ گھر جائے گا۔ چند گھنٹے ہی سہی' پاپا اور بیوی بچوں کے ساتھ گزارے گا اور مشن ایسا ہے کہ اس کی حارث انکل سے بھی ضرور ملاقات ہوگی۔

نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر ہے۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ گورین کیپٹن پولارج کے عقب سے آگے والی جیپ میں بیٹھا تھا۔

"اس چڑھائی کے بعد گاؤں شروع ہو جائے گا" گورین نے پولارج کو بتایا۔

"تم چاہو تو پہلے اپنے گھر چلے جاؤ" پولارج نے پیشکش کی۔

"نہیں۔ ڈیوٹی فرسٹ۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ چڑھائی سے ذرا پیچھے تھے کہ گورین کو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ وہ ہنرک تھا جو لپکتے قدموں سے ایک طرف جا رہا تھا "سر... منٹ کے لیے گاڑی روک سکتے ہیں" گورین نے بڑی لجاجت سے پولارج سے کہا "گھر کا حال تو یہیں معلوم ہو جائے گا۔"

"کیوں نہیں" کار پورل گاڑی روکو۔"

جیپ رکی اور پیچھے آنے والا ٹرک بھی رک گیا۔ ہنرک اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ گاڑیاں رکیں تو اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر جیپ سے گورین اترتا دکھائی دیا۔ وہ جیپ کی طرف لپکا "ارے گورین.... تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

گورین کا دل زور سے دھڑکا "کیا معلوم ہو گیا؟"

ہنرک نے ایک نظر ٹرک میں سوار فوجیوں کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا "اوہ.... تم تو کسی کام پر آئے ہو شاید۔ تو تمہیں کچھ معلوم نہیں؟"

"کیا معلوم نہیں؟ ہوا کیا ہے؟" گورین نے ہنرک کو جھنجوڑ ڈالا۔

ہنرک چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر تاسف سے بولا "تمہارے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

گورین کے چہرے کا رنگ یوں اڑا جیسے جسم کا سارا خون اڑ گیا ہو "کیا ہوا؟ پاپا خیریت سے تو ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن ان کی حالت اچھی نہیں۔"

کیپٹن پولارج یہ سب سن رہا تھا۔ وہ جیپ سے اترا اور گورین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "گورین، تم فوراً گھر جاؤ۔ یہ جیپ لے جاؤ۔ تمہارے پاپا ٹھیک ہوں تو آ جانا ورنہ کوئی بات نہیں" اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا، وہ جیپ سے اتر آیا۔

"تھینک یو سر!" گورین نے پولارج کو سیلوٹ کیا پھر وہ اسے راستہ سمجھاتا رہا "تمہیں وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

فوجی دستہ گاؤں کی مسلمان آبادی کی طرف چل دیا اور گورین نے جیپ گھر کی طرف دوڑا دی۔ وہ لمحوں میں گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

○☆○

گورین کو گھر پہنچے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ پاپا غنودگی کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں غنودگی لانے والی کوئی دوا دے رکھی تھی۔ گورین بیوی اور بچوں سے ملا ضرور لیکن وہ باپ کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہا۔ وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پاپا بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ویسے ہرگز نہیں رہے تھے جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ ان کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور ہونٹوں پر نیلاہٹ۔

"آپ اندر چلیں۔ پاپا اٹھ جائیں تو ان سے مل لیجئے گا" اس کی بیوی نے کہا۔

"نہیں، اتنی دیر میں، میں ڈاکٹر سے مل آتا ہوں" گورین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے گورین کو بتایا کہ یہ دل کا دوسرا دورہ تھا... اور کافی شدید تھا۔ گورین کو اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر اسے امید دلانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن خود پُرامید نہیں ہے۔ "ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں" ڈاکٹر کہہ رہا تھا "بس ان کا خوش ہونا بہت ضروری ہے۔ انہیں پریشانیوں سے بچانا ضروری ہے۔ اب وہ کوئی صدمہ جھیل ہی نہیں سکتے۔"

"مگر کوئی پریشانی تو ہے بھی نہیں" گورین نے کہا۔

"تم پاس ہوتے تو اچھا ہوتا، وہ بہت تیزی سے سنبھل پاتے۔"

گورین خاموش رہا۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"ویسے بھی آدمی کی عمر ستر سے تجاوز کر جائے تو بڑھاپے کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے... میری طرح" ڈاکٹر نے شگفتگی سے سنگینی کا علاج کرنے کی کوشش کی "تم اتنے پریشان مت لگو۔ یہ تمہارے پاپا کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ مسکراؤ... پریشانی کی تو کوئی بات بھی نہیں۔"

گورین مسکرا دیا۔ ڈاکٹر اس کام کا بہت ماہر تھا۔

"کچھ دن رکو گے؟"

"شاید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ صبح تک۔"

گورین ڈاکٹر کے پاس سے اٹھ کر گھر واپس آیا تو پاپا جاگ چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ گورین نے دانستہ ان کی طبیعت کا تذکرہ نہیں چھیڑا۔ پاپا ہی گاؤں اور گاؤں والوں کے متعلق اس کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ کرتے رہے۔ اب ان کے چہرے پر بحالی تھی۔

"حارث انکل کیسے ہیں؟" گورین نے پوچھا۔

"رشک آتا ہے اسے دیکھ کر" پاپا نے گہری سانس لی "مجھ سے تین سال بڑا ہے اور اب بھی اپنے فارم پر سب کچھ خود ہی کرتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ بستر پر پڑا ہوں۔" آخری بات کہتے ہوئے پاپا کے لہجے میں اداسی آ گئی۔

گورین کو ڈاکٹر کی بات یاد تھی' اس نے بہت تیزی سے موضوع بدلا۔ پاپا کو بھی پتا نہیں چلا۔ باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

اطلاعی گھنٹی بجی۔ گورین کے بڑے بیٹے نے دروازہ کھولا اور پکار کر کہا "پاپا۔۔۔ ہنرک انکل آئے ہیں۔"

گورین ہچکچا رہا تھا مگر پاپا نے کہا "بلا لو اسے۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔"

"بیٹے۔۔۔ انکل کو یہاں لے آؤ" گورین نے بیٹے کو پکارا۔

مگر ایک ثانیے کے بعد ہنرک اندر آیا تو اسے دیکھ کر گورین دھک سے رہ گیا۔ ہنرک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "کیا ہوا ہنرک؟ خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھیوں نے مسلمانوں پر فائرنگ کردی ہے" ہنرک کی آواز لرز رہی تھی۔

گورین کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"انہوں نے گاؤں کے سب مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرلیا تھا" ہنرک بولا "اور فائرنگ بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں' کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔"

گورین پاپا کو بھول ہی گیا تھا۔ ان کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تو اس نے سر گھما کر انہیں دیکھا۔۔۔ اور وہاں جو نظر آیا' اسے دیکھ کر اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ پاپا کو سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ان کا ہاتھ اپنی بائیں چھاتی پر تھا اور چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ "پاپا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"حا۔۔۔ رث۔۔۔ حا۔۔۔ رث۔۔۔" پاپا بمشکل بولے۔ ان کے لہجے میں سوال تھا۔

گورین گھبرا گیا "ڈاکٹر کو بلانا ہوگا۔ پاپا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔"

مگر پاپا زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگے۔ پھر انہوں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ گورین نے ان کے ہونٹوں سے کان لگا دیے۔ پاپا ٹوٹتی آواز میں کہہ رہے تھے "میری فکر مت کرو۔ حارث کی طرف جاؤ۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے' تم جانتے ہو نا۔۔۔"

"لیکن پاپا' آپ کی طبیعت۔۔۔"

"میں جو کہتا ہوں' وہ کرو" پاپا کا لہجہ سخت تھا۔ اچانک وہ چلائے "جاؤ گورین' حارث کو بچاؤ۔"

چند لمحے بڑی کشمکش کے تھے۔ پھر گورین نے پاپا کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "فکر نہ کریں پاپا۔ میں جاتا ہوں۔ حارث انکل کو کچھ نہیں ہوگا" پاپا پر اس کا اچھا ردعمل دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ ہنرک کی طرف مڑا "چلو ہنرک' میرے ساتھ۔ تم ڈاکٹر کو لے کر آجانا۔"

وہ دونوں نکل رہے تھے کہ پاپا کی نحیف آواز ابھری۔ "حا۔۔۔ رث۔۔۔" ان کے لہجے میں التجا تھی۔

"آپ فکر نہ کریں پاپا!" اس نے انہیں دلاسا دیا۔

وہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ڈاکٹر انہیں آتا دکھائی دیا۔ وہ رک گئے۔ ڈاکٹر تیز قدموں سے چلتا ان کے قریب آگیا "ہم آپ ہی کی طرف جا رہے تھے۔" گورین نے کہا "مسلمانوں پر فائرنگ کا سن کر پاپا کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی ہے۔"

"میں جانتا تھا کہ یہ فادر کے لیے اچھا نہیں ہے۔ خبر سنتے ہی میں یہاں کے لیے چل دیا" ڈاکٹر نے وضاحت کی اور گھر میں چلا گیا۔

"تم پاپا کا خیال رکھنا۔ میں اس ... طرف جا رہا ہوں" گورین نے ہنرک سے کہا۔

"لیکن گورین' تمہاری موجودگی ضروری ہے۔"

"نہیں' مجھے یہاں دیکھ کر پاپا کی طبیعت اور بگڑ جائے گی۔ مجھے جانا ہے۔ پھر مجھے حارث انکل کی بھی فکر ہے۔"

"ٹھیک ہے گورین' جاؤ۔"

گورین نے جیب میں بیٹھ کر سیٹ پر رکھی مشین گن کو تھپتھپایا اور جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

اب اندھیرا ہو چکا تھا لیکن راستے جانے پہچانے تھے۔ گورین پوری رفتار سے گاڑی چلاتا رہا لیکن اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گاؤں کی حدود کے آغاز سے اس نے گاڑی مسلمانوں کے سیکشن کی طرف جانے والی ڈھلان پر موڑ دی۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا' اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلا گھر آچکا تھا مگر وہاں ہر طرف غیر فطری سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ حالانکہ ابھی اتنی رات بھی نہیں ہوئی تھی۔

اسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی بہت خوفناک بات ہو چکی ہے۔

ابھی تک اسے کوئی فوجی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ گاؤں میں سب سے آخری گھر حارث انکل کا تھا۔۔۔ اور اب وہ اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔

مگر حارث انکل کا گھر بھی اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اسی لمحے گاڑی اوپر چڑھی تو اسے سامنے والی پہاڑی پر روشنی نظر آئی۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔۔۔ اور وہ فوجی تھے۔

اس نے گاڑی کی رفتار اور بڑھا دی۔ پہاڑی پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی' مشین گن اٹھائی اور نیچے اترا۔ گاڑی کی آواز سن کر اس کے ساتھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیپٹن پولارج اس کی طرف بڑھا "تم آگئے کیپٹن' تمہارے پاپا ٹھیک تو ہیں؟" اس نے پوچھا۔

گورین نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کے قدم بھی نہیں رکے "یہاں کیا ہوا ہے؟" اسے خود بھی اپنی آواز عجیب سی لگی۔

"ہاں۔۔۔ یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ ہوا ہے" پولارج نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ بتاؤ' کیا ہوا ہے؟" گورین کا لہجہ سخت تھا۔

کیپٹن پولارج کا منہ بن گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ انچارج وہ ہے

اور گورین اس سے اس طرح جواب طلب نہیں کر سکتا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ گورین اس وقت شاک میں ہے اور یہ سب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہے "میں نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اڑے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قتل مکافی خلاف قانون نہیں ہے اور ہم انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اس پر بحث ہوئی۔ میرے جوان مشتعل ہو گئے اور..." کیپٹن نے بات ادھوری چھوڑ دی "ان کو ضرور سزا ملے گی۔ کورٹ مارشل ہو گا ان کا۔"

خون گورین کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ دماغ پر جیسے کسی نے سرخ چادر ڈال دی تھی۔ وہ اس طرف بڑھا' جہاں فوجی جوان گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ وہاں پہنچا تو انہوں نے اسے راستہ دیا۔

وہ تازہ کھودا گیا بہت گہرا گڑھا تھا۔ کدال اور بیلچے بھی وہیں رکھے تھے۔ باہر نکلی ہوئی مٹی سے اندازہ ہوتا تھا کہ گڑھا جتنا گہرا لگتا ہے' اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ گڑھے میں دیکھتے ہی اسے چکر آ گئے۔ وہ خون آلود لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔

چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ پھر اس نے بمشکل پوچھا "کیا سب کو ختم کر دیا تم نے؟"

"نہیں سر۔ جوان عورتوں کو نسل خراب کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے" ایک فوجی نے چہکتے ہوئے کہا۔

"آپ ذرا دیر سے آئے سر۔ ورنہ بوائی میں آپ بھی شریک ہو جاتے۔"

گورین کے وجود میں غصے کا جوالا مکھی دہکنے لگا۔ وہ پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ مگر حارث انکل کا خیال اسے روک رہا تھا "لاشیں ہٹا کر دکھاؤ۔ مجھے کسی کی تلاش ہے۔"

دو سپاہی لاشیں اِدھر اُدھر کرنے لگے۔ زیادہ دیر نہیں لگی۔ انکل حارث کا چہرہ دیکھتے ہی وہ دیوانگی جسے اس نے جسم و جاں کی پوری طاقت سے روک رکھا تھا' قابو سے باہر ہو گئی۔ اسے نظر کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس نے مشین گن تانی اور اندھا دھند چاروں طرف فائرنگ شروع کر دی۔

مشین گن خاموش ہو گئی۔ مگر اس کی انگلی ٹریگر دباتی رہی۔ وہ ہوش میں آیا تو ہنرک اسے جھنجوڑ رہا تھا "یہ سب کیا ہے گورین!"

اس نے چونک کر ہنرک کو دیکھا پھر گردوپیش کا جائزہ لیا اور پُرسکون لہجے میں بولا "دیکھ نہیں رہے' یہ قبرستان ہے۔"

ہنرک رونے لگا۔ اچانک گورین کو سب کچھ یاد آنے لگا... دھیرے دھیرے... تھوڑا تھوڑا... "پاپا...؟" اس کا سوال بے حد بلیغ تھا۔

چہرے کے فاضل بال

اور بھریوں و بدنما داغ دھبے خواتین کیلئے ایک عذاب سے کم نہیں۔ اب پریشانی اور فکر کی ضرورت نہیں

یونانی کلیسی کریم

کا استعمال کیجئے ہزاروں خواتین کی آزمودہ کریم

قیمت _____ 105/=

موٹاپے سے نجات

بڑھے ہوئے جسم کو صرف (ایک ماہ) میں ۲۰ پونڈ وزن یقینی کم کر کے جسم کو سڈول و اسمارٹ بنا کر پروقار شخصیت کا مالک بنئے اسمارٹلین غذا کا استعمال کیجئے

اسمارٹلین غذا

قیمت _____ 275/=

مردوں میں مقبول ترین دوا

فربا اور طاقتور بننے کیلئے

کمزور جسم اور سوکھے پچکے گال کو طاقت پہنچا کر جسم کو فربا بناتا ہے چہرے پر سرخی لاتا ہے۔ جسمانی و اعصابی کمزوری دور کر کے طاقت بحال رکھتا ہے

نیچرل پاور (یونانی)

قیمت _____ 150/=

اسٹاکسٹ:

خواجہ اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
مسلم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
قادری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ ریشم بازار حیدرآباد۔
نیو دہلی دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
پیرزادہ میڈیکل اسٹور بیراج روڈ سکھر
حافظ میڈیکل اسٹور گنج پور روڈ لاڑکانہ
طاہر شاپنگ سینٹر ریل بازار اوکاڑہ
علی ہومیو اسٹور اچھرہ موڑ لاہور
ایس اے ہومیو اسٹور ریلوے روڈ لاہور
راجہ برادرز تحصیل بازار سیالکوٹ
پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار گول چوک سرگودھا
عظیم ہومیو سینٹر مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
شاہی طبی دواخانہ چابک پوٹ بازار فیصل آباد
پنجاب جنرل اسٹور کچہری روڈ سرگودھا
قہستانی جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
جرمن ہومیو اسٹور آردو بازار گوجرانوالہ
علی ہومیو اسٹور سرکلر روڈ گجرات
سٹی ہومیو اسٹور اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
لطیف کیمسٹ چاندنی چوک راولپنڈی
صدر دواخانہ مین بازار جہلم
میاں ہومیو اسٹور کربلا چوک ساہیوال
المدینہ جنرل اسٹور سی ایم ایچ روڈ راولاکوٹ
ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان
گنجوی دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان
ای القیوم جنرل اسٹور ہسپتال روڈ چکوال
بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد
احسن محمود میڈیکل اسٹور ریاں محمد روڈ میرپور
عوامی دواخانہ مین بازار مظفر آباد آزاد کشمیر
پرل پنسار اسٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
دکن پنسار اسٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
انعام کیمسٹ شمسی روڈ سرگودھا
سید عیسیٰ اسٹور اندرون کنگ گیٹ کوٹ
دارالشفاء مدینہ بازار منگورہ سوات
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور

ڈسٹری بیوٹر:۔ ریاض محمود ۶۹ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور ۔ بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی۔ فون:۔ ۵۰۲۹۰۳
محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان۔

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لیے

حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

ہنرک نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے پاپا نہیں رہے گورین۔"

گورین رو بھی نہیں سکا۔ اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہو سکتا تھا۔

○☆○

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ خاصی دیر خاموشی رہی پھر کورٹ مارشل کرنے والے بریگیڈیئر نے پوچھا "تم فرار کیوں نہیں ہو گئے؟"

"فرار تو مجرم ہوتے ہیں سر!" گورین نے کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ تم مجرم نہیں ہو" کرنل بولا۔

"خیال کی بات نہیں سر۔ میں مجرم ہوں ہی نہیں۔"

"لیکن جرم تو ثابت ہو گیا۔ اس کے لیے تمہارا بیان ہی کافی ہے" دوسرے کرنل نے کہا۔

"مجرم وہ سب تھے' جنہیں میں نے مارا۔"

"ان کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں ان کو سزا دینے کا حق نہیں تھا" بریگیڈیئر نے کہا۔

"میں کہتا ہوں سر کہ آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی وہی کرتے جو میں نے کیا" گورین کے لہجے میں استحکام تھا۔

"ہرگز نہیں' یہ میں کبھی نہ کرتا" بریگیڈیئر نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ میں نہیں ہیں۔ جو میں نے دیکھا ہے' میں جانتا ہوں' وہ آپ نہیں جانتے۔"

"اور جان بھی نہیں سکتا۔"

گورین نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھائی "یہ پڑھنے کے بعد آپ انصاف کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اس پر۔"

"یہ..... یہ کیا ہے؟"

"یہ بلاجواز' بلا اشتعال قتل کیے جانے والے حارث انکل کی آپ بیتی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اتنا غصہ کیوں آیا؟"

"ضروری تو نہیں کہ میں اسے پڑھوں۔"

"یہ ایک دستاویزی شہادت ہے۔ آپ کو اسے پڑھنا چاہیے" گورین نے اصرار کیا "اس سے پتا چلے گا کہ حارث انکل کتنے بڑے انسان تھے اور انہیں قتل کرنے والے کتنے مکروہ جانور۔"

بریگیڈیئر چند لمحے ہچکچایا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھی کرنلوں سے مشورہ کیا اور پھر بولا "سماعت مکمل ہو چکی ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں گے اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا لیکن انصاف کے نام پر ہم ملزم کی یہ فرمائش پوری کر رہے ہیں۔ اگلے ہفتے آج ہی کے دن فیصلہ سنایا جائے گا۔"

اور عدالت برخاست ہو گئی۔

○☆○

اپنے گھر کی اسٹڈی میں بریگیڈیئر کارتیلوف نے پڑھنے کی غرض سے وہ کتاب اٹھائی جو اسے ملزم کیپٹن گورین نے دی تھی۔ عدالت برخاست ہوتے ہی بریگیڈیئر نے اپنے ایک ماتحت کو اس کتاب کی دو اور جلدیں فراہم کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ دو جلدیں آئیں تو اس نے مقدمے کی سماعت کرنے والے کرنلوں کو ایک ایک جلد تھما دی۔ طے یہ پایا کہ وہ یہ کتاب پڑھیں گے اور اس کے بعد مقدمے کا فیصلہ لکھیں گے۔ ان دونوں کاموں کے لیے ان کے پاس ایک ہفتہ تھا۔

بریگیڈیئر نے کتاب کا ٹائٹل دیکھا۔ خوب صورت گردپوش ٹائٹل تھا۔ اوپری حصے پر ایک طرف ایک چرچ اور دوسری طرف ایک مسجد کی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ نیچے برف سے ڈھکا ہوا ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ اس میں سانتا کلاز تحفوں کا بھرا ہوا تھیلا اٹھائے ایک طرف جا رہا تھا۔ چرچ اور مسجد کے درمیان کتاب کا نام لکھا تھا..... محبت فاتح عالم!

ٹائٹل نے بریگیڈیئر کو بہت متاثر کیا۔ اسے لگا کہ وہ ایک اچھی کتاب کا مطالعہ کرنے والا ہے۔ ویسے اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے تو فرض سمجھ کر پڑھنا تھا اس کتاب کو۔ لیکن فرض اچھا بھی لگے تو بہت خوش دلی سے ادا کیا جاتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

اس کی نظر سرورق کے نچلے حصے پر چھپے مصنف کے نام پر پڑی۔ حارث امروک۔ نام بہت چھوٹے حروف میں چھپا تھا اور پہلے اسے نظر ہی نہیں آیا تھا۔

اس نے کتاب کا ورق کھولا۔ پرنٹنگ ڈاٹا پر نظر ڈالی۔ کتاب بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ وہ خودنوشت تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کتاب کسی بھی قسم کے تعارف سے..... حتیٰ کہ دیباچے سے بھی محروم تھی۔

کرنل نے پہلا صفحہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

○☆○

یہ سب میں اس وقت لکھ رہا ہوں' جب اپنی عمر کے ۵۴ ویں سال میں ہوں۔ یہ وہی کہانی ہے' جو شاید مجھے بہت پہلے سنا دینی چاہیے تھی لیکن ایک نامعلوم حس نے میرے قلم کو روکے رکھا۔ سو میں انتظار کرتا رہا۔ برسوں بیت گئے۔ اب اس موسم خزاں میں جبکہ کرسمس کی آمد آمد ہے' میں نے سوچا کہ اب میری عمر ایسی ہے کہ میں سب کچھ بڑی سچائی کے ساتھ لکھ سکتا ہوں اور اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں' اسے سمجھ بھی نہ سکوں۔ یعنی یہ سب کچھ لکھنے کا یہ مناسب وقت ہے۔

میں اس وقت تیرہ برس کا تھا' جب میرے والدین نے مجھے خود سے دور کر دیا بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ انہیں مجھ کو خود سے دور کرنا پڑا۔ انہوں نے مجھے سوئیڈن بھیج دیا جہاں میرے نانا رہتے تھے۔

وہاں ان کی آبائی زمینیں تھیں۔ یہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کی بات ہے' جب امریکا اور پورا یورپ کساد بازاری کے بدترین وقت سے گزر رہا تھا۔ ہمارے گھر کے حالات بہت خراب تھے۔ ڈیڈی مہینوں پہلے ملازمت سے محروم ہو چکے تھے اور اب دوسری ملازمت سے بھی محروم ہو چکے تھے لہٰذا اب تیسری ملازمت کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ گھر میں زیادہ تر فاقے ہوتے تھے۔ ڈیڈی اور مما کو اپنی فکر نہیں ہوتی تھی لیکن مجھے کبھی بھوکا سونا پڑتا تو انہیں بہت رنج ہوتا تھا۔

میں بہت خوش قسمت تھا کہ ننھیالی فارم موجود تھا' جہاں میں جا سکتا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ زمین دار لوگ دوسروں کے مقابلے میں خوش قسمت ہیں۔ حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں' وہ بھوک کی آزمائش سے بہرحال بچے رہتے ہیں۔

میرے نانا کا نام منصر تھا اور نانی کا نام ایلیا۔ جس فارم میں مجھے بھیجا گیا' وہ نانا کے دادا علی کا بسایا ہوا تھا' جو فوج میں میجر رہے تھے۔ فوج میں شجاعت کے مظاہرے پر انہیں جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھکی ہوئی وہ غیر آباد زمین انعام میں دی گئی تھی۔ انہوں نے اس زمین پر بڑی محنت کی۔ اس کی صفائی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمین بھی ان پر بے حد مہربان ہو گئی۔ ان کے بعد وہ زمین ان کے بیٹے ابراہیم کو ملی اور ان کے بعد منصر یعنی میرے نانا کو۔ یہ سب بے حد محنتی اور جفاکش لوگ تھے.... زمین سے محبت کرنے والے' بہت اچھے کسان!

ان کی زمین پچاس ایکڑ کے قریب تھی۔ بیس ایکڑ زمین کاشت کی جاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا جنگل تھا' جہاں لومڑیوں اور گلہریوں کی بہتات تھی۔ ایک چھوٹی سی مگر نہایت سرسبز چراگاہ تھی' جہاں بھیڑیں چرتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی مگر گہری جھیل تھی' جس کا پانی بے حد نیلا دکھائی دیتا تھا۔ ایک خاصا بڑا گودام تھا' جہاں غلہ اور بھوسا رکھا جاتا تھا۔ پھر ایک شیڈ بھیڑوں کے لیے اور ایک گایوں کے لیے تھا اور ایک بڑا اصطبل بھی تھا۔ یہ تھی میرے نانا کی چھوٹی سی دنیا۔

رہنے کے لیے لکڑی کا ایک کاٹیج تھا' جس پر برسوں پہلے سفید رنگ کیا گیا ہوگا۔ اس میں باتھ روم ایک ہی تھا مگر مجھے رہنے کے لیے الگ کمرا میسر آیا۔

میں اوور آل پہنتا اور سات میل پیدل چل کر اسکول جاتا' جو چرچ کے برابر واقع تھا۔ اس اسکول میں ساتویں جماعت میں دو ہی طالب علم تھے.... میں اور ایک اور لڑکا۔ اس کا نام ایلک گورین تھا اور وہ چرچ کے پادری کا بیٹا تھا۔ اسکول کے بعد میں نانا کا ہاتھ بٹاتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں میں نے اچھے خاصے کام سیکھ لیے۔ میں گاڑی جوت لیتا اور کھول لیتا۔ کھیتوں' فصلوں کی بھی سمجھ آنے لگی۔ بس دودھ دوہنا مجھے نہیں آیا۔ کوشش میں نے اس کی بھی کی لیکن بھیڑیں میرے قابو میں نہیں آتی تھیں۔ تیرہ سال کی میری عمر تھی۔ میں دبلا پتلا شہری لڑکا تھا۔ گاؤں کے جانور بھی مجھے خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بہرحال میں.... نانی کے کاموں میں ان کا ہاتھ زیادہ بہتر طور پر بٹا سکتا تھا اور بٹاتا تھا۔ وہ برتن دھوتیں تو میں برتن خشک کر کے رکھتا۔ لکڑیاں کاٹ کر لاتا۔ نانی مجھ سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

کچن کے عقب میں لکڑیوں کا شیڈ تھا۔ وہاں اسٹیل کا ایک بڑا سلنڈر رکھا تھا' جو نیچے آتے آتے دو بڑی نلکیوں میں دو سمتوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ سلنڈر کے اوپر کے کھلے ہوئے حصے میں بالٹی بھر دودھ انڈیلا جاتا اور دونوں نلکیوں کے نیچے برتن رکھ دیے جاتے۔ اب جھکتے ہوئے' دونوں پاؤں مضبوطی سے جما کر ہینڈل کو پوری رفتار سے اور مسلسل گھمایا جاتا تو سلنڈر کے اندر کارروائی شروع ہوتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سپریٹر کس طرح کام کرتا ہے۔ میں بس یہ جانتا تھا کہ ہینڈل مسلسل گھمایا جائے تو اندر سے غراہٹوں کی آواز آتی ہے۔ مزید گھمائے جائیں تو وہ آواز ایک چیخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہینڈل کو پوری طاقت اور رفتار سے گھماتے رہیں تو اچانک ایک نلکی سے دودھ اور دوسری سے کریم نکلنے لگتی ہے۔ اس وقت مشین کی آواز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بہرے ہونے کا خوف طاری ہونے لگتا ہے۔

اس ہینڈل کو تیز رفتاری سے گھماتے ہوئے میں آنکھیں بند کر لیتا اور خوابوں میں کھو جاتا۔ کبھی میں خود کو ایک ملاح سمجھتا' جس کی کشتی سمندری طوفان میں گھر گئی ہو اور وہ اسے بچانے کے لیے چپو چلائے جا رہا ہو اور کبھی میں ایک بہادر ہیرو بن جاتا جو چٹان کے کنارے کو پکڑ کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں لٹکی ہوئی ہیروئن کو اوپر زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔

اور ہاں.... وہاں انڈے بھی تو تھے۔ نانی نے دو سو مرغیاں پالی ہوئی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کی تمام مرغیاں بہت محنتی ہیں.... اچھی' انڈے دینے والی مرغیاں۔ میرے حساب سے نانی انکسار سے کام لیتی تھیں۔ کیونکہ لیگ ہارن نسل کی مرغیاں تو انڈے دینے کی مشین تھیں کیونکہ میں نے انہیں عام مرغیوں کی طرح ٹہلتے' اِدھر اُدھر چونچیں مارتے اور کڑکڑانے کی غرض سے دڑبے سے نکلتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ وقت ضائع کرنے کی قائل ہی نہیں تھیں۔ وہ صرف اس وقت باہر نکلتی تھیں' جب انہیں انڈا دینا ہوتا تھا۔ شاید باقی وقت وہ بڑی تندہی سے انڈے تخلیق کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔

بہرحال.... یہ میرا ایک کام تھا' جو میں باقاعدگی سے کرتا تھا۔ میں انڈوں کے بارے میں ٹہلتا' کھوجتا پھرتا' مرغیوں کے پھل جمع کرتا' انہیں دھوتا' خشک اور صاف کرتا اور کریٹ میں محفوظ کرتا۔ مگر اس کام کے بعد ناشتے کی میز پر کسی انڈے کا سامنا کرنا میرے لیے آسان نہیں ہوتا تھا' خواہ پلیٹ پر رکھا ہوا انڈا ابلا ہوا ہو' اف فرائی ہو یا آملیٹ کی شکل میں ناقابلِ شناخت ہو۔ مجھے اس سے

کھن آتی تھی۔

نانی ہر ہفتے انڈوں کے دو کریٹ قریبی قصبے کے ایک کریانہ فروش کو بھجواتی تھیں۔ ان کے بدلے جو ملتا تھا' اس کے وہ دو حصے کرتی تھیں۔ ایک حصہ گھر کے خرچ کے لیے اور دوسرا وہ گاڑی خریدنے کے لیے پس انداز کرتی تھیں۔

نانی کو اس بات پر بہت شرمندگی ہوتی تھی کہ پورے گاؤں میں ایک وہی ہیں جن کے پاس آٹو موبائل نہیں ہے ورنہ سب کے پاس ٹرانسپورٹ کے نام پر کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ نانی کے ساتھ برتن دھلواتے وقت مجھے بہت معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے مجھے بتایا کہ تین سال پہلے ان کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ گاڑی خریدی جاسکتی تھی۔ بدقسمتی سے ایک چکنی چپڑی باتیں بنانے والا سیلز مین آٹپکا اور اس نے نانا کو پھسلالیا۔ اس نے نانا کو نیا رملے آئل پل جو کہ بہت مہنگا تھا' ٹکادیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نانا اپنے پرانے ٹریکٹر کے بدلے تیل سے چلنے والا وہ ہاتھی لے لیتے لیکن نانا کی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنی مشینری سے بہت محبت کرتے تھے' خواہ وہ متروک ہوچکی ہو لہٰذا نانا نے نقد رقم سے ادائیگی کرکے آنے والی کار کا پتا صاف کردیا اور بے کار ہورہے۔

"تمہارے نانا کی مشینوں سے محبت ہی کی وجہ سے ہم گاؤں میں سب سے ریک ورڈ ہیں" نانی نے بتایا۔ "ہمارے ہاں اب بھی وہ مشینیں اور آلات استعمال ہوتے ہیں' جنہیں دوسرے ترک کرچکے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"تمہارے نانا اپنی کوئی مشین بیچنے کو تیار نہیں ہوتے اور نئی خریدنے کے لیے پیسے جمع نہیں ہوپاتے۔"

"اوہ!"

"مگر اب میں کار کے لیے رقم جمع کررہی ہوں۔"

مجھے دلچسپی ہوئی "کون سی کار خریدیں گی آپ؟"

"اسٹڈ بیکر۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ میں شہری تھا' کاروں کے بارے میں اچھا خاصا جانتا تھا "فورڈ کیوں نہیں؟"

"اسٹڈ بیکر کی تشہیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ فری وہیلنگ آٹو موبائل ہے" نانی نے بتایا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"گاڑی کو ایک بار اسپیڈ دینے کے بعد انجن بند کردو' اس کے بعد وہ میلوں بغیر پیٹرول کے چلے گی' کتنی بچت ہے۔"

"مگر اسٹڈ بیکر اور فورڈ کی قیمتوں میں اتنا فرق ہے کہ آپ اس سے ہزاروں گیلن پیٹرول خرید سکتی ہیں" میں نے نانی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن نانی نہیں مانیں۔ وہ عورت تھیں اور بار بار خیالات بدلنے کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں "چھوڑو اس بات کو" انہوں نے کہا اور بات ختم کردی۔

○☆○

میں اکثر نانا اور نانی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جب میں ان کے ہاں گیا تو میں ان دونوں کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں تھا۔ میں ڈیڈی اور مما کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے دوبار آچکا تھا۔ مگر وہ بچپن کی بات تھی۔ یہ بات سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا' یہاں تک کہ کرسمس آگیا۔ بہرحال اس وقت تک میں نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں انسان ہیں اور ان سے میرا تعلق دشوار نہیں' آسان ہے۔ ایک لڑکا آسانی سے نانا نانی کو دوسرے لوگوں سے جدا کرکے' ان سے بہت گہری محبت کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ فطری محبت قدرتی طور پر اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور اسے ابھارنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ وہ خود بخود ابھر آتی ہے۔ جب میں وہاں گیا تھا تو میرا خیال تھا کہ یہ نانا نانی دادا دادی..... یہ لوگ کچھ غیر حقیقی ہوتے ہیں' جیسے ڈراموں کے کردار۔ وہ کبھی جوان رہے ہوں گے۔ انہوں نے بھی محبت کی ہوگی' نفرت کی ہوگی' دکھی ہوئے ہوں گے۔ کبھی وہ کمزور' ضدی اور اڑیل بھی رہے ہوں گے۔ کبھی ان کے مزاج پل پل رنگ بھی بدلتے ہوں گے۔ وہ خوف سے' شدتوں سے' غصے سے اور حیرت سے بھی واقف رہے ہوں گے۔ مگر یہ سب کچھ وہ اب تک بھول چکے ہوں گے۔ اب ان جذبوں سے' ان کمزوریوں سے' ان قوتوں سے وہ بے خبر ہوں گے۔

میں تو شروع سے یہی سمجھتا تھا کہ والدین سفید سن' مہربان' لاغر اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں عنقریب مرجانا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

○☆○

وہ پُراز واقعات موسم خزاں تھا۔ گاؤں میں حال ہی میں بجلی آئی تھی۔ شاید ناقص وائرنگ کے نتیجے میں آگ لگی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ چرچ آگ لگنے کے نتیجے میں تباہ ہوگیا۔ اسے دوبارہ تعمیر کرنا ضروری تھا اور یہ گاؤں والوں کی ذمے داری تھی۔ سب لوگ اتوار کے دن جمع ہوتے..... کیا عیسائی اور کیا مسلمان اور یہ کام کرتے۔ کبھی بارش کا سماں ہوتا اور معمول کے کام رک جاتے تو اس دن بھی سب اکٹھے ہوکر چرچ کا کام کرتے۔ بالآخر دسمبر تک نیا چرچ تعمیر ہوگیا۔ لوگوں کے لیے مالی مدد کرنا بہت مشکل تھا۔ ہر شخص جو کچھ دے سکتا تھا' دے چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چرچ باہر سے بھی اور اندر بھی' رنگ وروغن سے محروم تھا۔ روشنی بھی نہیں تھی۔ بہرحال بنچیں موجود تھیں۔ فادر میکس کورین نے پہلی سروس کے دوران میں خوشی کا اظہار کیا کہ یہ بھی غنیمت ہے۔

دوسرا واقعہ اور طرح کا تھا۔ اس شام نانا گودام کی طرف سے آئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ ان کی پرانی بھیڑوں میں سے ایک بچہ دینے والی ہے "میری بات پر یقین مت کرو" انہوں نے کہا۔

"کیونکہ مجھے خود بھی اپنے آپ پر یقین نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ کم از کم چار ماہ کی گیابھن ہے۔"

"تو اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بھیڑیں موسم سرما میں کبھی بچہ نہیں دیتیں" نانا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "میں جانتا ہوں یہ بات۔ چالیس سال سے بھیڑیں پال رہا ہوں میں۔ میمنے اپریل مئی.... اور زیادہ سے زیادہ جون میں پیدا ہوتے ہیں۔"

"اگر میں بھیڑ ہوتا..." میں نے خالص شہریوں کی سی بدتمیزی سے کہا "تو میرا جب جی چاہتا' جب مناسب سمجھتا' بچہ دیتا۔ بھیڑ کوئی پابند ہے کسی کی۔"

"ہر چیز.... ہر ذی روح قانونِ قدرت کی پابند ہے اور تمہاری آزاد طبیعت ہی کی وجہ سے اللہ نے تمہیں بھیڑ نہیں بنایا" نانا کے لہجے میں شفقت تھی اور وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہے تھے "بلکہ اللہ نے تم پر بچہ دینے کی ذمے داری سرے سے نہیں ڈالی ورنہ تم میری نواسی بھی ہو سکتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے.... خوب ہنسے۔

"کیا بے ہودگی ہے یہ" نانی نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو کچھ سمجھا ہی نہیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کہو تو سمجھاؤں" نانا نے پیش کش کی۔

نانی نے شاید بات بدلنے کی کوشش کی "چلو منصر' یہ تو اچھا ہی ہے۔ تمہیں کرسمس کے موقع پر میمنا ملنے والا ہے" وہ بولیں اور دلیے کی دیگچی چولھے پر رکھ دی "اور سنو' مجھے کیلنڈر کی تصویریں یاد آتی ہیں۔ بی بی مریم اور ننھے مسیح کی تصویروں میں اکثر ایک میمنا بھی دکھایا جاتا ہے۔ کون جانے' اس زمانے میں میمنے سردیوں میں ہی پیدا ہوتے رہے ہوں۔"

"وہ تصویریں مصوروں کی بنائی ہوئی ہیں" نانا نے خشک لہجے میں کہا "اور مصور بھیڑیں نہیں پالتے۔ وہ کیا جانیں بھیڑوں اور میمنوں کے بارے میں۔"

تیسرا واقعہ منفی تھا.... یعنی کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا' وہ نہیں ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ برف باری نہیں ہوئی۔ دن سرمئی ہوتے گئے۔ نومبر سرد سے سرد تر ہوتا گیا۔ جھیل کی سطح پر کہرا جمتا رہا۔ نانا نے سیب کے جوس کا بیرل عقبی صحن میں رکھ دیا لیکن برف نہیں پڑی۔ ہر طرف یہی باتیں ہونے لگیں۔ لوگ جہاں ملتے' یہی موضوع رہتا۔ سب کو فکر تھی کہ اس سے سرما کی فصل خراب بھی ہو سکتی ہے۔

مگر یہ طے تھا کہ یہ موسم سرما ہے اور کرسمس قریب آ رہا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے گھر آتے ہوئے مجھے اکثر رونا آ جاتا تھا۔ پہلے میں ہر ہفتے ڈیڈی اور مما کو خط لکھتا تھا۔ اب ایک دن چھوڑ کر لکھنے لگا۔ عقبی صحن میں رکھا سیب کے جوس کا بیرل جمنے لگا۔ نانا ہر روز اس کی برف صاف کرتے اور اسے دوبارہ جمنے کے لیے وہیں چھوڑ دیتے۔ جب بیرل کی تہ میں شفاف مائع صرف چند انچ اونچا رہ گیا تو وہ اسے بڑی محبت سے سینے سے لگا کر لائے اور جا کر نیچے تہ خانے میں رکھ آئے۔

اس عرصے میں نانا اپنی گیابھن بھیڑ کا کثرت سے جائزہ لیتے رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے کوئی موجد اپنی کسی ایجاد کو عملی طور پر آزمانے سے پہلے جانچتا' دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ وہ ہر ہر زاویے سے اس کا معائنہ کرتے۔ اس کے اونی بالوں کو تھپتھپا کر دیکھتے۔ پھر کبھی سہلاتے' کبھی جھٹکتے۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ بھیڑ گیابھن تھی.... اور یہ ایک حقیقت تھی۔

نانا نے اس روز تمام نمازیں گھر پر پڑھیں۔ وہ مسجد بھی نہ جا سکے۔

نانا کے گھر آنے کے بعد مجھے پہلی بار صحیح معنوں میں معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس سے پہلے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ نماز بھی پڑھی جاتی ہے۔ میرے ڈیڈی اور مما شاید بس نام کے مسلمان تھے۔ ہمارے طور طریقے' ہمارا رہن سہن عیسائیوں کا سا تھا۔ مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ ہم عیسائی نہیں' مسلمان ہیں۔ میں ڈیڈی یا مما سے فرق معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو پتا چلتا کہ انہیں خود بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔ سچ پوچھیں تو ہمیں بس کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت آتا تھا اور بس.... اور یہ معلوم تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔

نانا کے ساتھ میں نماز پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔ نانا اور نانی روز قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ مگر نانا کو اعتراف تھا کہ مذہب کے بارے میں انہیں بھی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان سیلفوں اور عالموں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔ حکومت ڈرتی تھی کہ اپنے دین کے بارے میں جان گئے تو مسلمان سخت' متعصب اور متشدد ہو جائیں گے۔ بس اتنا کافی ہے کہ انہیں اپنے مذہب کے متعلق آزادی حاصل ہے۔

"تو ہم مسلمان کیوں ہیں نانا؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

نانا چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے "شاید اس لیے کہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے۔"

"تو ہم کرسچن کیوں نہیں ہو جاتے؟" میں نے اعتراض کیا۔ "جب ہم اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو مسلمان ہونے کا فائدہ؟"

"اس لیے کہ ہم کتنے ہی بے خبر ہوں' مگر اپنے اندر یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ دینِ برحق ہے" نانا نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اسلام صرف اچھی باتیں سکھاتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔"

"اچھا نانا.... یورپ تو پورا عیسائیوں کا ہے پھر یہاں مسلمان

کیسے آگئے؟" میں نے سوال کیا۔

"لوگ دوسرے ملکوں میں تو جاتے رہتے ہیں نا۔ صدیوں پہلے سے یہ ہوتا رہا کہ کوئی کسی اسلامی ملک میں گیا اور وہاں کچھ عرصے رہا۔ اس دوران میں اس نے مسلمانوں کو دیکھا اور اسلام کے بارے میں جانا..... اور اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہوگیا۔ پھر وہ گھر واپس آیا تو اس نے وہ روشنی اپنے گھر والوں کو دی۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ ان سے متاثر ہو کر ان کے پڑوسی مسلمان ہوگئے۔ یوں خاموشی سے اسلام پھیلتا رہا۔ جب حکومت کو اندازہ ہوا تو انہوں نے میلفین کی آمد پر پابندی لگادی مگر اسلامی تعلیمات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں جو ایک بار ایمان لایا' پھر ایمان سے ہٹا کبھی نہیں۔"

"تو آپ اتنے بے خبر کیوں ہیں؟"

نانا افسردہ نظر آنے لگے "اس لیے کہ میرے پاپا مجھے کچھ بتا نہیں سکے۔ اس لیے کہ انہوں نے کبھی مجھے دیکھا نہ میں نے انہیں۔"

اس لمحے بوڑھے نانا مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح لگے "تو نانا مسلمان کرسمس کیوں مناتے ہیں؟" میں نے ایک اور اعتراض کیا۔

"ایک بات تو یہ کہ یہ نسلوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ یہ ہماری ثقافت کا حصہ بن گیا ہے۔ دوسرے اسلام تمام پیغمبروں پر' تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی ہدایت کرتا ہے تو ہم حضرت عیسیٰؑ کے پیغمبر ہونے پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن نعوذ باللہ انہیں اللہ کا بیٹا نہیں مانتے اور نہ ہی ان کے مصلوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے کبھی مسلمانوں کو ایسٹر کے تہوار میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا ہوگا۔"

نانا نے ٹھیک کہا۔ مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی اس بات پر۔

"مسلمان اہلِ کتاب کا احترام کرتے ہیں اور جب تک ان کی دشمنی کھل کر سامنے نہ آجائے' انہیں برا نہیں کہتے' برا نہیں سمجھتے۔ ہمارا مذہب رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم اہلِ کتاب کی خوشیوں میں' ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم کسی سے نفرت نہیں کرتے' بس اتنی سی بات ہے۔"

"لیکن نانا' ہمیں اپنے مذہب کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہیے۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔ وقت آئے گا تو وہ بھی ہو جائے گا' کون جانے۔"

یہ باتیں میرے اور نانا کے درمیان ہوتی ہی رہتی تھیں' کبھی کبھی نانی بھی ان میں شریک ہو جاتیں۔

خیر۔ اس سال کرسمس اتوار کے دن آیا تھا۔ نانی نے بتایا کہ کرسمس کے دن وہ بھی چرچ جاتی ہیں..... بیشتر مسلمان جاتے ہیں۔ اس رات نانی نے میٹھے میں کیک بنایا اور سیاہ رس بھریوں سے اس کی ڈیکوریشن کی۔ یہ رس بھریاں انہوں نے اگست میں توڑ کر ٹن میں محفوظ کرلی تھیں۔ کیک مجھے بہت اچھا لگا۔

کھانے کے بعد نانا گیا بھن بھیڑ کی دیکھ بھال کے لیے باڑے کی طرف چلے گئے۔ میں معمول کے مطابق نانی کا ہاتھ بٹانے لگا' جو برتن دھو رہی تھیں۔ میں برتن خشک کرکے رکھتا رہا۔ پھر نانی اگلے روز کے کھانے کے لیے مرغی روسٹ کرنے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ میں اس میں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اچانک نانی نے کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھا اور بڑبڑائیں۔

"اتنی عمر ہوگئی میری۔ اتنے برسوں کا ساتھ ہے۔ مگر میں تمہارے نانا کو نہیں سمجھ سکی۔ شاید کبھی سمجھ بھی نہیں سکوں گی۔"

مجھے یقین تھا کہ نانی درست کہہ رہی ہیں۔ مجھے علم تھا کہ نانا اور نانی کا ۴۶ سال کا ساتھ ہے۔ اگر وہ اتنے عرصے میں انہیں نہیں سمجھ سکیں تو اب کیا سمجھیں گی۔ چنانچہ میں نے بے حد سادگی سے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں نانی' اب تو مشکل ہی ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ مشینری سے انہیں عشق ہے۔"

میری پوری توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ میں نے کیتلی بھر پانی چولھے پر رکھا تھا۔ اب وہ ابل رہا تھا "جی نانی..... آپ نے کہا تو تھا" میں نے بے توجہی سے کہا۔

"ان سے ایک مرغی بھی ذبح نہیں کی جاتی" نانی نے انکشاف کیا۔

"مگر مرغی مشینری تو نہیں ہے نانی۔"

"ہے تو فارم کی ہی چیز۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ارے..... ساری زندگی میں ہی مرغیاں ذبح کرتی رہی ہوں" نانی بولیں "اور تو اور' وہ پڑوسیوں کے لیے بھی بہت نرم ہیں۔"

"پڑوسی نہ تو مشینری ہیں' نہ فارم کی چیز" میں نے پھر اعتراض کیا۔

"پڑوسی کیا' وہ گاؤں کے کسی آدمی کو دکھ نہیں دینا چاہتے۔"

"میں سمجھا نہیں" میں نے کیتلی چولھے سے اتاری اور کھولتا ہوا پانی سنک میں ڈالا تاکہ پائپ میں موجود چکنائی کی رکاوٹ دور ہو جائے۔

"ارے..... سبھی منہ اٹھا کر آجاتے ہیں تھریشر مانگنے۔ پچھلی گرمیوں میں بھی یہی ہوا تھا" نانی نے کہا "اسی بنیاد پر تو انہوں نے نیا ٹریکٹر خریدا تھا۔ کہتے تھے' پورے گاؤں والوں کی فصلیں نمٹاؤں گا۔ یوں ٹریکٹر کی رقم نکل آئے گی۔ تب تم کار خرید لینا۔ میں ان کی باتوں میں آگئی اور پتا ہے کیا ہوا' دو سال ہوگئے۔ یہ ہر کسی کی گندم الگ کرتے ہیں۔ مگر کبھی کسی نے ایک پائی بھی نہیں دی۔ نہ دینے کا ارادہ ہے کسی کا۔"

"کیوں؟"

"گندم کی قیمت گر گئی نا۔ تو سب نے ذخیرہ کرلیا..... اس امید

پر کہ وقت آنے پر اچھی قیمت پر بیچیں گے اور انہوں نے کسی سے کچھ مانگا بھی نہیں۔ مانگتے تو مل بھی جاتے۔ میں جانتی ہوں' بیشتر لوگ ادائیگی کرسکتے ہیں۔ لیکن اپنا حق مانگتے ہوئے بھی تمہارے نانا کا دل دکھتا ہے۔ کہتے ہیں..... کڑا وقت ہے اللہ سب کے لیے اور پھر سبھی دوست ہیں میرے" نانی نے نانا کے لہجے اور آواز کی نقل اتاری "یہ تھا میرا مطلب کہ انہیں پڑوسیوں سے بھی عشق ہے۔"

"اوہ..... یہ بات ہے۔"

"اور کبھی بری طرح اڑ جاتے ہیں..... اڑیل ٹٹو کی طرح۔ اب یہ ان کی بھیڑ ذرا بچہ دے دے' پھر دیکھنا۔ وہ ضد کریں گے کہ یہ بھیڑ کا بچہ ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ سال کے اس حصے میں بھیڑ کبھی بچہ دیتی ہی نہیں۔" نانی نے مرغی کے اندر کی صفائی کرتے ہوئے دل اور کلیجی ایک طرف رکھی "میں ایک اور مثال دوں۔ پتا ہے' تمہارے نانا چوسال کے تھے تو آرگن بہت اچھا بجاتے تھے۔"

"یقین نہیں آتا" میں نے کہا۔

"انہیں اپنے والد کی وفات کا پتا چلا بس پھر اس کے بعد انہوں نے کبھی آرگن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

میں نے چونک کر نانی کو دیکھا "وہ کیوں؟"

"بس ضد اور اڑیل پن" نانی نے گہری سانس لی "ان کی ماں مجھے بتاتی تھیں کہ انہوں نے ان کی بڑی خوشامد کی۔ التجائیں کیں۔ مگر یہ نہ مانے' ہے نا عجیب بات۔ نرم ہیں تو بہت نرم۔ اور سخت ہوئے تو کوئی ہاتھ بھی جوڑلے' یہ کس سے مس نہیں ہونے والے۔"

میں نے پانی کی کیتلی کو پونچھ کر' خشک کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے خاندان کے متعلق کچھ نہ کچھ مجھے ممی بھی بتاتی رہتی تھیں۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا اور یاد بھی تھا۔ نانا کے والد ابراہیم اسی فارم سے جنگ پر روانہ ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۷۱ء کی بات ہے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کی جوان بیوی یعنی میری پرنانی سارہ کو ایک خط ملا' جس میں لکھا تھا کہ وہ چھ مہینے سے لاپتا ہیں۔ پرنانی اپنے بیٹے یعنی میرے نانا منصر کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ نانا نے اپنے پاپا کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانچ سال بعد محکمۂ جنگ سے پرنانی کے نام ایک اور خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ نانا بڑی بہادری سے جنگ لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کی باقیات بھی بھجوائی گئیں' جن کی باقاعدہ تدفین ہوئی۔

"اسی لیے نانا نے اس کے بعد کبھی آرگن نہیں بجایا۔ یہی بات ہے" میں نے کہا "میرا مطلب ہے' اپنے پاپا کی وفات کا سن کر ان کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"بکواس' نری بکواس۔ یہ تو تھرڈلا پن ہے" نانی نے غصے سے کہا۔

چند منٹ بعد باہر برف پر قدموں کی چاپ ابھری۔ اس وقت تک میں برتن خشک کرنے سے اور نانی مرغی کی صفائی سے نمٹ چکی تھیں۔ نانا کچن میں آئے اور چولھے کے پاس کھڑے ہوکر ہاتھ تاپتے رہے "ایسا طوفان میں نے کبھی نہیں دیکھا" وہ بولے۔

نانی نے کراہنے کی آواز نکالی جو کراہ سے زیادہ غراہٹ سے مشابہ تھی۔

"بھیڑ بھی بس بچہ دینے ہی والی ہے" نانا نے اطلاع دی۔

"اور حارث کا فون بھی بس آنے ہی والا ہوگا" نانی بولیں۔

وہ فون کال ڈیڈی اور ممی کی طرف سے میرے لیے کرسمس کا تحفہ تھا۔ ہمارے گھر کا فون تو کٹ چکا تھا مگر انہوں نے طے کیا تھا کہ اپنے ایک دوست کے گھر جاکر ٹھیک آٹھ بجے رات مجھے فون کریں گے۔ وہ تین منٹ کی متوقع گفتگو میرے لیے بہت قیمتی تھی۔ اسی خیال سے نانا اور نانی ڈرائنگ روم میں چلے گئے کہ کہیں میں مروت کے مارے ان تین منٹ میں انہیں بھی شریک نہ کرلوں..... اور خود تشنہ رہ جاؤں۔

وہ کرسمس ٹری سجانے میں مصروف ہوگئے۔ شہر میں کرسمس ٹری بہت اچھی طرح سجایا جاتا ہے۔ یہاں گاؤں میں وہ بات نہیں۔ پھر بھی موم بتیاں جلائی گئیں تو جگمگاتا ہوا کرسمس ٹری بہت خوب صورت لگنے لگا۔ درخت پر صرف دو تحفے تھے..... اور دونوں میرے لیے تھے۔ نانا نے اخروٹ کی لکڑی کے دستے والا جیبی چاقو دیا تھا جبکہ نانی نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے بہت لمبا' بہت بڑا اونی اسکارف بُنا تھا۔

"آپ دونوں کا بہت شکریہ۔ دونوں تحفے بہت اچھے ہیں" میں نے کہا "مگر میں آپ دونوں کو کچھ نہیں دے سکا۔ مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا اور میرے پاس پیسے بھی نہیں تھے کہ بازار سے کچھ خرید کرلے آتا۔"

"ارے حارث..... پگلے..... تم..... تم تو خود ہی ہمارا تحفہ ہو" نانی نے میرے رخسار چومتے ہوئے کہا۔

نانا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیے "اور تم ابھی بچے ہو۔ بڑے ہوجاؤ تو تحفہ بھی دے دینا۔" ان کے لہجے میں محبت تھی۔

ہم نے ایک دوسرے کو کرسمس کی مبارک باد دی پھر میں کچن میں چلا گیا کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے۔

نانا نانی میز پر بیٹھ گئے۔ میں دیوار پر نصب ٹیلی فون کے پاس کھڑا ہوگیا۔ پانچ منٹ گزرے' مجھے بے تابی ہونے لگی' میں نے سوچا' لائن پر کوئی ہوگا۔ چنانچہ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ سوچا کسی کی گفتگو ہی سن لوں۔ مگر وہاں ڈائل ٹون کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ریسیور لٹکادیا۔

چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ دیواری کلاک ٹک ٹک کررہا تھا۔ ہوا گھر کی دیواروں کو ہلائے دے رہی تھی۔

"ذرا سوچو تو" نانی نے خاموشی توڑی "کون سوچ سکتا تھا کہ دو افراد جو اتنی دور ہوں' ایک دوسرے سے بات کرسکتے ہیں۔ پتا نہیں' آگے یہ انسان کیا ایجاد کرے گا۔"

نانا خاموش رہے' چند لمحے بعد بولے "اتنا خراب موسم ہے۔ ٹیلی فون کا رابطہ تو منقطع نہیں ہوگیا کہیں۔"

اس پر نانی نے گھور کر انہیں دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولیں۔

"سنو حارث' فون آئے تو ہم سے بات مت کروانا" نانا بولے "ہم تو خط بھی لکھ سکتے ہیں۔ یہ مختصر کال تمہارا تحفہ ہے۔ اس کا ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔"

"شکریہ نانا!" میں نے کہا۔ میری ہتھیلیاں پسیج رہی تھیں۔ مجھے اپنے حلق میں ایک گولا سا پھنسا محسوس ہو رہا تھا۔

بالآخر فون کی گھنٹی بجی۔ ہم سب نے سانسیں روک لیں۔ تین گھنٹیوں کے بعد میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھ سے ہیلو بھی نہیں کہا گیا۔ گلے میں پھنسا ہوا گولا دو زردی والے انڈے جتنا بڑا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر مما کی آواز ابھری اور وہ گولا ٹوٹ گیا۔ "بیٹے.... میری نظر کلاک پر ہے" مما نے کہا "ہم تین منٹ سے زیادہ بات نہیں کر سکیں گے۔ تم وقت ضائع مت کرنا۔"

"مما.... آپ کیسی ہیں؟ اور ڈیڈی کیسے ہیں؟ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں' ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ تمہارے دوست تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

"انہیں کہیے گا' میں بھی انہیں بہت مس کرتا ہوں۔"

"تم سناؤ بیٹے' تم ٹھیک ہو۔ دل تو لگ گیا ہے نا؟"

"جی مما' بہت خوش ہوں میں' یہاں جانور بھی ہیں۔ بڑی دلچسپیاں ہیں۔ آپ اور ڈیڈی بھی یہاں ہوتے تو...." میری آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"ممی اور پاپا کیسے ہیں؟" ممی نے تیزی سے موضوع بدلا۔

"جی' ٹھیک ہیں۔"

"اچھا.... اپنے ڈیڈی سے بات کرو۔"

میں نے ڈیڈی سے ان کی خیریت پوچھی پھر پوچھا کہ ملازمت ملی یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک نہیں ملی ہے پھر انہوں نے بھی جلدی سے موضوع بدلا "یہاں تو موسم بہت اچھا ہے۔ تمہاری طرف کیا حال ہے؟"

"یہاں تو برفانی طوفان آیا ہے ڈیڈی" میں نے کہا۔

"اور وہاں کی سناؤ۔"

"نانا کی ایک بھیڑ بچہ دینے والی ہے۔ نانا نے تحفے میں مجھے چاقو اور نانی نے اونی اسکارف دیا ہے.... خود بُن کر...."

میری نظریں بھی کلاک کی سوئیوں پر تھیں۔ وقت ختم ہو رہا تھا۔ میری آواز پھر پھنسنے لگی۔ ممی اور ڈیڈی نے مجھے کرسمس کی مبارک باد دی اور نانی کو مبارک باد دینے کی ہدایت کی۔ پھر وہ مجھے خدا حافظ کہہ ہی رہے تھے کہ رابطہ منقطع ہوگیا۔

میں نے ریسیور ہک پر لٹکا دیا لیکن پلٹا نہیں کیونکہ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ایک آئیڈیا آیا ہے میرے ذہن میں" نانی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "کیوں نہ ہم پارلر میں چلیں۔ وہاں میں میلوڈین بجاؤں گی اور ہم سب گائیں گے۔"

میں اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پلٹ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں نے فون پر نظریں جمائے جمائے بمشکل کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو بجانا آتا ہے۔"

"اب میں اچھا تو نہیں بجا سکتی.... پہلے کی طرح" نانی کے لہجے میں اداسی تھی "گٹھیا نے انگلیوں کو کمزور کر دیا ہے اس لیے کم ہی بجاتی ہوں لیکن پہلے بہت بجاتی تھی۔ ان کی ممی نے مجھے سکھایا تھا' بہرحال چاہو تو چلو۔"

نانی نے نانا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کچن سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے آنسو پونچھے اور ان کے پیچھے ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ نانا نے سلائیڈنگ ڈور کو دھکیل کر کھولا اور ہم پارلر میں چلے گئے۔ نانی نے روشنی کر دی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ میں اس میلوڈین کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی پارلر میں بھی نہیں گیا تھا۔

وہ بہت بڑا اور بہت خوب صورت باجا تھا۔ ۳۳ انچ اونچا' چالیس انچ چوڑا اور ۲۱ انچ گہرا۔ اوپر کے ٹاپ میں قبضے لگے تھے' جس کی وجہ سے اسے فولڈ کیا جا سکتا تھا اور فولڈ کر دیا جاتا تو وہ میوزک ریک بن جاتا۔ کی بورڈ بھی بہت خوب صورت تھا۔ اوپر خوب صورت حروف میں بنانے والے کا نام لکھا تھا۔ سیسن اینڈ کمپنی۔ نیچے دس انچ چوڑے دو پیڈل تھے۔ اس کے ساتھ ایک بینچ تھی۔

نانی بینچ پر بیٹھی اور میلوڈین بجانے لگیں۔ ہم نے کئی گیت گائے۔ نانی نے جو گیت گائے' وہ میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ نانا بھی آواز ملا رہے تھے۔ ہم نے.... رات خاموش ہے.... اور ہم تین دل کے بادشاہ.... گائے۔ پھر نانی نے سفید چابیوں کے بجائے سیاہ چابیوں پر ہاتھ مارا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتیں مگر اسی لمحے میری نظر ان کی انگلیوں پر پڑی۔ ان کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ گٹھیا کا درد انہیں ستا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بجاتی اور گاتی رہیں اور اس میلوڈین کی آواز.... میں کیا بتاؤں کہ وہ کتنی خوب صورت تھی اور نانا نانی کی بوڑھی آوازوں میں باہم کتنی ہم آہنگی تھی۔ وہ بہت خوب صورت سماں تھا۔ مگر مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بہت واضح اور یقینی احساس تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پارلر میں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اگرچہ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر مجھے گیتوں میں ملی جلی ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ نہ دیکھنے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہاں کچھ اور لوگ موجود ہیں۔

اور وہ کرسمس کی رات تھی!

نانی اچانک گاتے گاتے رکیں۔ "منصر..... مجھے بہت زبردست خیال سوجھا ہے" انہوں نے نانا سے کہا "جیسے یہ خیال غیب سے آیا ہو۔"

میں اور نانا منہ کھولے انہیں دیکھتے رہے۔ ہم منتظر تھے۔

"یہ میلوڈین..... کیوں نہ ہم اسے چرچ کو دے دیں۔" وہ بینچ سے اٹھیں۔ چشمے کے پیچھے ان کی آنکھیں معمول سے زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ "چرچ میں تو پیانو بھی نہیں ہے۔ یہ میلوڈین گانے میں ان کی مدد کرے گا اور ہمارے ہاں تو یہ بے کار ہی پڑا ہے۔ میں بھی نہیں بجاتی کبھی اور تم تو ہاتھ بھی نہیں لگاتے اسے۔ چرچ میں کام تو آئے گا نا۔"

نانا اپنی مونچھوں کے کناروں کو مروڑتے رہے۔ "میرے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"کل اتوار بھی ہے اور کرسمس بھی۔ ہم انہیں سرپرائز دیں گے۔ سب لوگ چرچ میں داخل ہوں گے..... تب انہیں یہ میلوڈین نظر آئے گا۔"

"کل؟" نانا نے پُرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "ایلی..... بھول جاؤ۔ یہ برف کا طوفان دیکھ رہی ہو۔ میں ایسے میں یہ میلوڈین چرچ تک نہیں لے جا سکتا۔"

"بیل جو تو..... اور گاڑی پر لے جاؤ۔"

"پتا ہے، برف کے ذرات ہی تین فٹ تک ہوں گے۔ گاڑی دھنس جائے گی۔ یہ ممکن ہے....."

"بکواس۔" نانی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"میری ایلی۔ تمہیں مایوس کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا۔ مگر میں تمہیں بتا دوں کہ کل چرچ میں عبادت ہی نہیں ہوگی۔ راستے برف سے ڈھک چکے ہیں۔ کوئی کیسے جائے گا۔"

نانی نے منہ پھیرا اور میلوڈین پر اس کا ٹاپ ڈھک دیا "کاش..... ہمارے پاس گاڑی ہوتی..... آٹو موبائل" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔

اس پر نانا کو غصہ آگیا "ایسے میں کوئی گاڑی بھی نہیں چل سکتی۔ تمہاری اسٹڈیبیکر بھی نہیں۔"

"تمہیں کیا پتا منصر سلطان۔ تمہارے پاس کبھی گاڑی رہی ہی نہیں" نانی نے بے حد وقار سے کہا۔

میری زبان بند ہو گئی تھی۔ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یقین بھی نہیں آرہا تھا۔ مجھے فارم پر آئے چار ماہ ہو چکے تھے اور میں نے کبھی انہیں ایک دوسرے سے تلخ و ترش بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میرے حساب سے تو والدین کے والدین کو ایک دوسرے سے لڑنے کا حق ہی نہیں تھا۔ مگر وہ لڑ رہے تھے..... اور وہ بھی کرسمس کی شب!

نانا نے پہلے تو نانی کو خونخوار نظروں سے دیکھا، جو ان کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی تھیں۔ پھر وہ میری طرف مڑے اور سر ہلا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں گودام جا رہا ہوں۔" انہوں نے کہا "تم نے کبھی کوئی بیدائش دیکھی ہے؟"

"جی نہیں، کبھی نہیں" میں نے گھبرا کر کہا۔

"دیکھنا چاہتے ہو؟"

"نج..... جی..... کک..... کہہ نہیں سکتا۔"

"تو فیصلہ کر لو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بھیڑ کیا دے گی..... مچھلی، کوئی پرندہ یا کوئی عجوبہ۔ بہرحال وہ یقیناً..... بھیڑ کا بچہ تو نہیں دے سکتی۔ سال کے اس حصے میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہاں..... تو کیا خیال ہے؟"

"جی..... میں..... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بس تو چل پڑو میرے ساتھ۔"

میں نے اپنا اسکارف اچھی طرح لپیٹا، دو جیکٹیں چڑھائیں، سر پر ٹوپی رکھی اور نانا کے ساتھ نکل آیا۔ نانا نے دو لالٹینیں جلالی تھیں۔ ایک انہوں نے مجھے تھما دی۔ ان کی چمنیاں بہت صاف تھیں اور جگمگا رہی تھیں۔

"اُف یہ مادائیں" نانا بڑبڑائے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کا اشارہ بھیڑوں کی طرف ہے یا بیویوں کی طرف۔ ایسے میں چپ رہنا ہی بہتر تھا۔

ہم باہر طوفان میں نکل گئے۔

○☆○

میں نے اسکارف اتنی اچھی طرح لپیٹا تھا کہ ہونٹوں اور آنکھوں کے سوا میرے چہرے کا کوئی حصہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ اس کے باوجود برف اڑاتی ہوا نے میری پلکوں کو برف سے لاد دیا۔ جی چاہتا تھا کہ اسکارف سے ناک کو بھی ڈھانپ لوں۔ مگر اس کے بعد سانس کی آمد و رفت خطرے میں پڑ جاتی۔ طوفان ایسا تھا کہ اگر لالٹین نہ ہوتی تو نہ میں نانا کو دیکھ پاتا، نہ ان کے پیچھے چل پاتا۔ کچھ بھائی، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ نانا کو گودام بھی نظر نہیں آرہا ہوگا۔ مجھے بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

مگر نانا وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازہ بس اتنا کھولا کہ ہم بھی تنگی سے اندر داخل ہوئے۔ پھر انہوں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحے ہمیں ایک دوسرے پر جمی برف جھاڑنے میں لگے۔ نانا نے میری برف جھاڑی اور میں نے ان کی۔

گودام کے دور افتادہ گوشے میں بھیڑوں کا شیڈ تھا۔ وہاں سو سے زائد بھیڑیں تھیں جو بھوسے کے بستر پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بڑی بے تعلقی اور خاموشی سے ہمیں گھورا۔

"کون سی ہے نانا؟" میں نے اپنا اسکارف کھولتے ہوئے پوچھا۔

"وہ!" نانا نے ایک الگ تھلگ نیم دراز بھیڑ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھیڑ ایک لمحے کے لیے اٹھی مگر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ وہ بہت بے چین لگ رہی تھی۔

"ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کب بچہ دینے والی ہے" میں نے بے حد اہم سوال اٹھایا۔

"بس پتا چل جائے گا۔"

"مگر کیسے نانا؟"

"تم تو گھامڑ ہو یار۔ یہ تجربے کی بات ہے۔ تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ مجھے ہے' مجھے پتا چل جائے گا" لفظوں کے برعکس نانا کے لہجے میں جھنجلاہٹ نہیں تھی۔

"اچھا... پھر ہم کیا کریں گے۔"

"سوچیں گے۔"

ہم نے اپنی ٹوپیوں کے کانوں کے غلاف اوپر اٹھا دیے۔ باہر کے مقابلے میں شیڈ خاصا گرم تھا لیکن ہماری سانسوں کا دھواں اب بھی ہمارے سامنے دھند بنا رہا تھا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ بالآخر مجھے نر کے سینگ نظر آئے۔ وہ بے حد خمیدہ اور خوب صورت سینگ تھے۔ بھیڑیے کو بھی شاید اس کا احساس تھا۔ اس کے انداز سے تفاخر جھلک رہا تھا۔ نانا کو وہ بہت پسند تھا۔ انہوں نے اس کا نام کالون رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بہت اچھی نسل کا ہے "یہ اور صدرِ مملکت..... دونوں بہت کم گو ہیں" وہ اکثر کہتے تھے "اور جب یہ بولیں تو ان کی بات دھیان سے سننا چاہیے۔"

"نانا... بھیڑ کیا سوچتی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"اف یہ مادائیں" نانا نے آہ بھر کے کہا "اور ان کے تضادات۔ ہوش مند آدمی تو پاگل ہو جائے۔ اب یہی دیکھ لو کہ بھیڑ مادہ ہے اور کوئی مادہ ہی اتنے بے وقت' خلافِ فطرت موسم سرما کی ایک رات آدھی رات کے وقت بچہ دے کر ایک شریف آدمی کو پریشان کر سکتی ہے۔ جبکہ اس وقت اسے گرم بستر میں ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی ایک عورت ہی توقع کر سکتی ہے کہ اس کا شوہر شدید برفانی طوفان میں چھ پہاڑی میل کا فاصلہ طے کر کے ایک بھاری اور بہت بڑا میلوڈین لاد کر چرچ پہنچا کر آئے گا۔ دنیا کی کوئی جدید ترین گاڑی بھی برف میں چلنے اور منزل پر پہنچنے کی سکت نہیں رکھتی۔ مگر کون کسے سمجھائے' اف یہ مادائیں!"

میں ہاتھوں میں ٹھوڑی رکھے وہیں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد نانا نے کہا "میں نے ۱۳ء میں گاڑی لینے کا ارادہ کیا تھا مگر اس کے بدلے آئل پل لے لیا۔ پھر اگلے سال میں نے سوچا تھا کہ تھرینکنگ سے جو رقم ملے گی' اس سے گاڑی خرید لوں گا۔ مگر تمہیں کیا پتا کہ اس سال کیا ہوا۔ خیر پتا تو ہے۔ کساد بازاری نے ہی تمہیں یہاں پہنچایا ہے۔"

بھیڑ بے چین ہو کر ایک دم کھڑی ہوئی مگر فوراً ہی لیٹ گئی۔

"ایلیا نے تین سال سے یہ آرگن نہیں بجایا ہے" نانا نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

میری توجہ کالون نامی اس بھیڑیے پر تھیں۔ وہ بڑی بے پروائی سے سوکھی گھاس چبانے میں مصروف تھا۔ وہ اس ڈرامے سے قطعی بے خبر تھا' جو گودام کے اسٹیج پر کچھ دیر بعد کھیلا جانے والا تھا۔ حالانکہ اس ڈرامے کا سب سے بڑا سبب وہ ہی تھا۔ وہ اس ڈرامے کا مصنف تھا۔ مجھے اس کی بے نیازی پر رشک آ رہا تھا۔ جتنی اس کی مادہ بے چین تھی' اتنا ہی وہ پُرسکون تھا۔ اسے تو اپنی تاریخ ساز اہمیت کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ دنیا کا پہلا اور ممکنہ طور پر آخری نہ بھیڑ ہے جو دسمبر کے مہینے میں باپ بننے والا ہے۔

"اب سوچو' چقندر میں سے خون تو نہیں برآمد کیا جا سکتا" نانا نے مجھے چونکایا "دوستوں اور پڑوسیوں سے ایسے وقت میں پیسوں کا تقاضا کیسے کیا جا سکتا ہے' جب ان کے پاس کچھ ہو ہی نہیں۔ یہ سب اچھے لوگ ہیں۔ نادہند نہیں ہیں۔ جب ان کے پاس پیسے ہوں گے تو بغیر کہیں ہمیں دے دیں گے۔"

"نانا' مجھے افسوس ہے کہ نانی سے آپ کی تلخی ہوئی۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس میں قصوروار میں ہوں۔ میں یہاں نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اگر تھا بھی تو ممی اور ڈیڈی کو یاد کر کے روتا تو نہیں۔ مجھے بہلانے کے لیے ہی نانی نے میلوڈین بجایا۔ میں اگر نہ روتا تو انہیں اس کا خیال بھی نہ آتا۔ اور اگر وہ میلوڈین نہ بجاتیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آتا۔"

"یہ کوئی خاص بات نہیں" نانا نے بھیڑیے کالون کی سی بے نیازی سے کہا "لڑائیاں تو ہوتی رہتی ہیں ہماری۔"

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا تمہارے ڈیڈی اور ممانہیں لڑتے۔"

"لڑتے ہیں مگر وہ تو جوان ہیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا..."

"کہ بڈھے لوگ بھی لڑتے ہیں" نانا نے میری بات پوری کر دی "سنو میرے بچے' بڈھے بھی لڑتے ہیں۔ یہ تو زندگی ہے۔ محبت میں بے کیفی اور کمی واقع ہونے لگے تو لڑائی ہوتی ہے اور اس کے بعد محبت پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے اور پھر شہد کے ساتھ سرکہ بھی ہوتا ہے۔ یہی تو ازدواجی زندگی ہے... اور یہی اس کے مزے ہیں" وہ کہتے کہتے رکے' جیسے کوئی بات اچانک سمجھ میں آئی ہو۔ پھر انہوں نے مجھ پر آنکھیں نکالیں اور غصے سے بولے "اور سنو' کیا میں تمہیں بوڑھا دکھائی دیتا ہوں؟"

"دکھائی تو نہیں دیتے مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ بوڑھے ہیں" میں نے سادگی سے کہا۔

نانا ہنسنے لگے۔ خوب ہنسے "تم ہو مزے کے آدمی یار" انہوں نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

کیا بھن بھیڑ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی... اور میں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا "میرا خیال ہے' میں گاڑی والے بیلوں کو اضافی چارا دے آؤں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آخر آج کرسمس کی رات ہے۔ انہیں انعام ملنا چاہیے۔"

درحقیقت جیسے جیسے بھیڑ کا وقت قریب آ رہا تھا' میں اسے

دیکھنے سے تائب ہوتا جارہا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مجھے دیکھنے کو کیا ملے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس قسم کے حقائق کے لیے ابھی میں بہت چھوٹا ہوں۔ یہ بڑوں کے معاملات ہیں' انہیں ہی بھگتنے چاہئیں۔

میں باڑے کی طرف چلا گیا۔ پہلے میں نے گاڑی میں جوتے جانے والے بیلوں کی تواضع کی۔ پھر اصطبل کی طرف نکل لیا۔ نانا کے پاس گھوڑوں کی ایک جوڑی بھی تھی۔ ٹام اور ڈولی کھڑے کھڑے سو رہے تھے۔ میں نے ان کے آگے اچھی طرح چارا ڈالا۔ دونوں جاگ گئے۔ انہوں نے ہنہنا کر شکر گزاری کا اظہار کیا اور مزے سے کھانے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے ان دونوں کو کرسمس کی مبارک باد دی اور بھیڑوں کے شیڈ میں واپس آگیا۔

وہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

"مائی گاڈ" میں نے کراہتے ہوئے کہا "یہ ابھی تک نمٹی نہیں۔"

"جب اس کا موڈ ہوگا' نمٹے گی" نانا بولے "آخر یہ آزاد بھیڑ ہے۔"

میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور بھیڑ کو دیکھنے لگا۔ اس کی بے چینی بہت بڑھ چکی تھی۔ میں اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے کچھ اور سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اچھا نانا' یہ بتائیں۔ یہ میلوڈین آیا کہاں سے؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

اس کے نتیجے میں خاندان کی تاریخ سے میری آگہی کچھ اور بڑھ گئی۔

اپریل ۱۸۶۹ء کے ایک دن میری پرنانی سارہ اسی گھر کے کچن کی کھڑکی میں کھڑی اپنے شوہر ابراہیم کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس وقت زمین میں ہل چلا رہے تھے۔ اچانک وہ رک گئے۔ انہوں نے بیلوں کی جوڑی کو وہیں چھوڑا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ ایسا انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی فطرت تھی کہ جب کوئی کام شروع کرتے تو اسے ختم کرکے ہی دم لیتے۔

میری پرنانی اس وقت بہت کم عمر تھیں۔ ان کی شادی کو صرف دو سال ہوئے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ان کے شوہر انہیں کیا بتانے کے لیے آرہے ہیں۔ پھر بھی نہ وہ روئیں نہ بے ہوش ہوئیں۔ بس انہوں نے چولھے پر چڑھی ہوئی سالن کی دیگچی کو بہت مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ابراہیم سیدھے کچن میں آئے اور انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھی بات کی "ہوویل کے نواح میں ایک نئی توپ خانہ رجمنٹ کے لیے بھرتی کی جارہی ہے" انہوں نے نانی سارہ کو بتایا "میں بھی اس میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔"

نانی سارہ نے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہیں۔

"تمہیں چھوڑ کر جانا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے" نانا ابراہیم نے کہا "لیکن میری واپسی جلد ہوگی۔ دشمن کو شکست دینے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بات یہ ہے کہ شجاعت ہمارا آبائی ہتھیار ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے زنگ لگے۔"

"اور یہاں کا کیا ہوگا؟" بالآخر یہ نانی سارہ نے پوچھا۔

"میں یہاں کے کاموں کے لئے ایک ملازم رکھ لوں گا۔ وہ زمین کی دیکھ بھال کیا کرے گا۔ تم اس کی نگرانی کروگی۔ سب کام چلتا رہے گا۔"

نانی سارہ جلدی سے دیگچی پر جھک گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شوہر ان کے آنسو دیکھے۔

نانا ابراہیم نے ان کا چہرہ اٹھایا اور ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ارے.... تم رو رہی ہو!"

"جی نہیں۔ دیگچی پر جھکی تھی۔ بھاپ کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آگیا۔" نانی سارہ نے اپنی آواز سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتاؤ۔"

"کیا....؟" نانی سارہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"اگر تم بہادری سے میری جدائی سہہ سکتی ہو تو میں بھی بہادری سے جنگ لڑ سکتا ہوں۔" نانا ابراہیم نے کہا۔ "یہ بات بہت دنوں سے میرے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر مجھے اپنے اسلاف کے ورثے سے بھی محبت ہے اور اپنے وطن سے بھی اور شورش کرنے والے کبھی یہاں تک بھی آسکتے ہیں۔ ہمیں اس کا سدباب کرنا ہوگا اور ایک محبت کی خاطر دو محبتوں کو نظرانداز کردینا بے انصافی بھی ہے۔ جبکہ میں جوان بھی ہوں اور صحت مند بھی۔ تو ایسے میں مجھے ایک بار فوج کو خدمات ضرور سونپنی چاہئیں۔"

"آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔" نانی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ کو اپنا فرض بھی ادا کرنا چاہیے اور دوسری محبتوں کا خراج بھی ادا کرنا چاہیے۔ میری محبت کبھی آپ کے راستے کی دیوار نہیں بنے گی۔"

میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مجھے اَن دیکھے پر نانا اور پرنانی پر پیار آرہا تھا۔

"مما نے یہ تو کہہ دیا' مگر انہوں نے جو بات پاپا کو نہیں بتائی' وہ انہیں بہت مہنگی پڑی۔" نانا بولے۔

"وہ کیا بات تھی؟" میں نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"یہ کہ میں ان کے رحم میں آچکا ہوں۔"

بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ "میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں پگلے۔ مطلب یہ کہ جس وقت کی یہ بات ہے' مجھے مما کے پیٹ میں آئے دو ماہ ہو چکے تھے۔"

"تو بڑی نانی نے بڑے نانا کو یہ بات بتائی کیوں نہیں؟"

"انہوں نے سوچا کہ اگر انہوں نے یہ بتا دیا تو پاپا انہیں اس حال میں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ پاپا کو نہ جانے کا قلق رہے گا اور ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا رہے گا۔"

"پھر...؟"

"پھر یہ کہ انہوں نے پاپا کو بتایا نہیں۔ انہیں جنگ پر جانے دیا۔ وہ خاموشی انہیں بہت مہنگی پڑی مگر وہ بہت بہادر عورت تھیں... بہادر لوگوں کی اولاد۔"

باہر اب برفانی طوفان کسی زخمی درندے کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔

"میں میلوڈین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ارے ہاں... ہوا یہ کہ پاپا نے رجسٹ جوائن کرلی۔ ایک ہفتے بعد ہوویل کا ایک دکاندار گاڑی پر یہ آرگن لاد کر ہمارے گھر لایا۔ اس نے بتایا کہ میرے پاپا نے ہوویل میں اس کا آرڈر دیا تھا اور پہنچانے کے لئے پتا بھی دیا تھا۔ یہ پاپا کی طرف سے تحفہ تھا ماما کے لئے... شکرگزاری کا اظہار تھا کہ انہوں نے انہیں جنگ پر جانے سے روکا نہیں۔ پاپا کو میرے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا' یہ آرگن ماما کا دل بہلانے میں کام آئے گا۔ ایک رفیق ثابت ہوگا۔ ماما پیانو بجانا جانتی تھیں۔ پمپ آرگن بجانا سیکھنے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔"

"اور بعد میں انہوں نے آپ کو بھی سکھا دیا؟" میں نے تائید چاہی۔

"ہاں۔ میں چاہتا تھا کہ پاپا لوٹ کر گھر آئیں تو میں ان کے لئے آرگن بجاؤں۔ ان کا استقبال کروں اس لئے میں نے بہت شوق سے آرگن بجانا سیکھا۔"

"آگے مجھے معلوم ہے۔ بڑے نانا کبھی واپس نہیں آئے مگر یہ تو بتائیں کہ ان کی وفات کا علم ہونے کے بعد آپ نے کبھی آرگن نہیں بجایا... کیوں؟"

انہوں نے مجھے ایسی... اور گہری نظروں سے دیکھا کہ مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش... میں نے یہ زخم نہ کریدا ہوتا۔ "اس لئے کہ اب میرے پاپا کبھی نہیں سن سکتے تھے۔ نہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے' نہ میں انہیں دیکھ سکتا تھا پھر میں کیوں بجاتا... کس کے لئے بجاتا۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟" نانا کے لہجے میں بے پناہ شدت تھی۔ اس لمحے وہ مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح لگے۔

"کافی ہے نانا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا پرانا دکھ ان کے سینے میں اب تک نہ صرف زندہ... بلکہ تازہ ہوگا۔ میں نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ اگر میں نانا کی جگہ ہوتا اور اپنے ڈیڈی کی دید سے بھی محروم ہوتا تو میرا کیا ردعمل ہوتا لیکن مجھ سے تو یہ سوچا بھی نہیں گیا۔ لڑکے اتنی اداسی' اتنی سوگواری کے متحمل ہی نہیں ہوسکتے مگر میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ والدین کے والدین' اتنے بوڑھے لوگ اتنے دکھی بھی ہوسکتے ہیں۔

اس معاملے سے گھبرا کر میں نے توجہ گیابھن بھیڑ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ بھیڑ اچانک ہی گھبرا کر چلائی۔ اس کی اس چیخ میں اذیت تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "خدایا... یہ کیا...؟ یہ تو بلبلا رہی ہے۔"

"یہ اب تیار ہے۔"

میں نے جلدی سے لالٹین اٹھائی۔ "میں ذرا مرغیوں کو دیکھ آؤں۔" میں بس وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

"کیوں؟ تمہارے خیال میں مرغیاں کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہیں؟" نانا نے مذاق اڑایا۔ "تمہارے خیال میں وہ انڈوں کی جگہ ہیرے موتی دینے والی ہیں۔"

"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں مرغیوں کا انسپکٹر ہوں۔" میں نے بھنا کر کہا اور ٹہلتا ہوا مرغیوں کے دڑبوں کی طرف چل دیا' جو بھیڑوں کے شیڈ کے برابر ہی تھا۔

دڑبوں میں دو سو کے قریب مرغیاں تھیں اور تیس سے زائد مرغے تھے۔ وہ سب اس وقت محو استراحت تھے لیکن لالٹین کی روشنی اور میرے قدموں کی چاپ نے انہیں بے آرام کردیا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لئے ناپسندیدگی تھی۔ سرد راتوں میں اتنی دیر سے آنے والا بن بلایا مہمان کسے اچھا لگتا ہے۔ وہ یقیناً بہت ڈسٹرب ہوئے تھے۔ ان میں جو شریف قسم کے مرغے تھے' جو کچے لفنگے مرغوں کی طرح دن دہاڑے کی چھاپا ماری کو ناپسند کرتے تھے' اس مداخلت پر بہت جز بز ہوئے اور بھنا بھنا کر بانگ دینے لگے۔

میں نے جلدی سے لالٹین نیچے رکھی اور واعظوں اور سیاسی رہنماؤں کے درمیان کا سا انداز اختیار کیا۔ "خواتین و حضرات! میرے لئے یہ امر باعث فخر و مسرت ہے کہ اس مبارک اور مسعود رات میں مجھے آپ سے بات کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ خطاب کے لئے یہ کوئی مناسب اور شریفانہ وقت نہیں اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ کو ایک اہم اور کام کی نصیحت کرنے آیا ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اور وہ نصیحت یہ ہے کہ آپ انڈے دیں' انڈے بنائے جائیں' انڈے دیے جائیں۔ کام کریں... صرف کام... محنت سے... لگن سے۔ انڈے آپ کی واحد معیشت ہیں۔ بیٹ سے کچھ بھلا نہیں ہوتا مگر آپ سوچیں تو کہ آپ بیٹ کتنی دیتے ہیں اور انڈے کتنے کم۔ آپ انڈے زیادہ دیں اور بیٹ کم کریں تو یقیناً تھوڑے ہی عرصے میں خوشحال ہوجائیں گے اور روئے زمین پر مرغیوں کا سب سے زیادہ متمول معاشرہ آپ ہی کا ہوگا۔ محنتی مرغیوں اور مرغوں کو سلام۔" آخر میں' میں نے گرج کر کہا۔

مگر میری اس طویل مختصر تقریر کے دوران میں تمام سامعین سو چکے تھے۔ وہاں نہ چوں کی آواز تھی نہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ۔ شریف النفس مرغوں نے بھی اپنے شغل سے دستبردار ہوتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں۔

"لیکن نہیں میرے ساتھیو! زیادہ جان کھپانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے خود اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ "جلد بازی شیطان کا کام ہے۔ سکون سے اپنا کام کریں۔ یاد رکھیں' روم ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ نانی کی پسندیدہ اسٹڈ بیکر ایک ہفتے میں نہیں خریدی جاسکتی۔ اس کے لئے اربوں انڈوں کی ضرورت ہے اور آپ صرف دو سو ہیں۔ سو اس کی فکر چھوڑ دیں۔ آپ دن میں ایک سے زیادہ انڈے دے ہی نہیں سکتیں پھر بیکار پریشان ہو کر خود کو گھلانے کا کیا فائدہ۔ بہتر ہے' پُرسکون رہیں۔ زندگی سے لطف اٹھائیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹیں۔ فطرت کو' اس کے نظاروں کو سراہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ کو مشین بننے کے بجائے فنکار بننے پر زور دینا چاہیے۔ تعداد ناممکن ہے تو اسے کوالٹی کے ذریعے حاصل کریں۔ خوب سوچیں' خوب سجے سجائے' منفرد اور غیر معمولی انڈے دینے کی کوشش کریں۔ کوئی ایسا عجیب و غریب انڈا دینے کے بارے میں سوچیں کہ لوگ ایک انڈا ایک کروڑ انڈوں کی قیمت میں خریدنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہی صورت ہے نانی پر احسان کرنے کی اور احساسِ عدم تحفظ سے چھٹکارا پانے کی۔ ورنہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کتنا ہی زور لگائیں' کتنی ہی محنت کریں اور عام انڈے کتنے ہی دیں' بالآخر آپ کی آخری منزل نانی کے ہاتھوں حلال ہونا ہی ہے۔ ایسا جلد ہو یا بدیر اور یاد رکھیں' نانی کے ہاتھوں کتنا شہادت بھی نہیں ہے۔" اس آخری بات کا ردِعمل دیکھنے کے لئے میں نے نظر دوڑائی۔ ایک مرغے نے زوردار بانگ دی۔ ایک مرغی خوف سے پیلی پڑ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا انڈا اندر ہی گل گیا ہوگا۔ ان دو کے علاوہ باقی سب خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہے۔ میں نے جان لیا کہ یہ سب عاقبت نااندیش اور احمق لوگ ہیں' جنہیں آنے والے کل سے نہ کوئی غرض ہے' نہ اس کی کوئی فکر ہے۔

"خواتین و حضرات' مجھے جو کہنا تھا' میں کہہ چکا۔" میں نے تقریر سمیٹی۔ "آپ سب کو کرسمس کی مبارک باد۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں نے کمر تک جھک کر اپنے سامعین کے سامنے احتراماً سر خم کیا' اپنی لالٹین اٹھائی اور بھیڑوں کے شیڈ کی طرف واپس چل دیا۔

لیکن شیڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے گیا بھن بھیڑ کی دردناک چیخ سنائی دی۔ آواز اتنی بلند تھی کہ طوفان کا شور بھی اسے نہیں دبا سکا تھا۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ بیچاری بڑی اذیت میں ہے۔

میں وہاں پہنچا تو نانا اس پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ سوکھے بھوسے پر پہلو کے بل پڑی تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں مخالف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ بیچارہ اس کا نر کالون بھی حیران و پریشان کھڑا تھا۔ یہی نہیں' اس کے تمام ہم جنس جاگ کر کھڑے تھے اور بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ کالون کی تھوتھنی پر تواتر سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاید وہ پچھتا رہا تھا۔

"کوئی گڑبڑ ہے؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ یہ بے چاری سر توڑ کوشش کر رہی ہے مگر بات نہیں بن رہی ہے۔" نانا نے کہا اور بھیڑ کے پہلو کو جگہ جگہ سے دبا کر معائنہ کرنے لگے۔ "یا تو بچے کی ٹانگ کہیں پھنس گئی ہے۔ یا پھر پوزیشن ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بچہ الٹا ہے یا آڑا ہے۔ ایسے میں پیدائش میں دشواری ہوتی ہے۔" نانا نے کہا۔ "اصولاً سر نیچے ہونا چاہیے۔" وہ اکڑوں بیٹھے اور انہوں نے مزید معائنہ کیا۔ "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کاش..... مجھے معلوم ہوتا۔"

نانا دانتوں سے ناخن کاٹنے لگے۔ میں نے انہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی شدید سردی تھی مگر ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے پھر وہ اٹھے۔ انہوں نے اپنی جیکٹ اتاری اور قمیص کی آستینیں چڑھانے لگے۔

"اب آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔ یہ مرجائے گی۔"

مجھ پر لرزہ چڑھنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر ان کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔ "نہیں نانا۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔

"یہ ضروری ہے بیٹا۔ جانور انسان کی ذمے داری ہوتے ہیں۔ انسانوں پر لازم ہے کہ ضرورت کے وقت ان کی مدد کریں۔ میں اس وقت اس کی مدد نہیں کروں گا تو یہ بھیڑ اور اس کا بچہ دونوں ختم ہو جائیں گے اور مجھے اللہ کو جواب دینا ہوگا۔"

"خدایا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں یہ پہلے بھی کر چکا ہوں۔ بچے کی ٹانگ پھنسی ہے تو اسے نکالنا ہے اور اگر پوزیشن میں خرابی ہے تو بچے کو گھما کر اس کا رخ تبدیل کرنا ہے۔"

میں نے دانت پر دانت جما دیے۔ "میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"ہاں! تم اس کی دلجوئی کرو۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤ۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ لو اور تھپتھپاتے' چمکارتے رہو۔ یہ شدید تکلیف میں ہے۔"

"ٹھیک ہے نانا۔ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔" میں نے سکون کا

سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں کبھی کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرا۔ کسی کام سے اتنا نہیں بچا۔ مجھے بھیڑ پر ترس آرہا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اذیت کے اس عالم میں وہ کیا کر بیٹھے گی۔ وہ تو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ مجھے کاٹ بھی سکتی تھی' لات بھی مار سکتی تھی.... اور کچھ بھی کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں خوفزدہ تھا۔ اس کے باوجود میں بے حد احتیاط سے نیچے بیٹھ گیا اور میں نے اس کے سر کو اپنی بانہہ کے حلقے میں لے لیا پھر میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

نانا اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے مگر میں نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اس وقت اس شیڈ کا جو منظر تھا' اس نے مجھے ایک کیلنڈر پر چھپی تصویر یاد دلا دی۔ اس میں لالٹینوں کی روشنی کے گرد ہالہ تھا۔ بھوسے کے تنکے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ بھیڑیں خاموش کھڑی تھیں اور ایک بوڑھا آدمی ایک بھیڑ پر یوں جھکا ہوا تھا' جیسے اللہ کے حضور دعا کر رہا ہو پھر مجھے اس ابتلا کا خیال آیا' جس میں نانا' وہ بھیڑ اور میں پھنسے ہوئے تھے اور مجھے لگا کہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ میں دھماکے سے پھٹ جاؤں گا۔

اچانک بھیڑ نے ایسی چیخ ماری کہ پہلے نہیں ماری تھی۔ ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے اپنے سر کو جھٹکا۔ اسے قابو میں رکھنے کے لئے مجھے زور لگانا پڑا۔ اپنے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹنے پڑے۔ میں نے اس کی تھوتھنی اپنے چہرے سے لگا لی۔ اسے قابو میں رکھنے کی ایک یہی صورت تھی۔

"پلیز.... میری ننھی بھیڑ.... ہلو مت۔ شاباش۔" میں نے اسے چمکارا۔ اس کی تھرتھری ہوئی سانسیں میری ناک میں گھسی جا رہی تھیں۔ "میری ننھی بھیڑ.... فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم کامیاب رہیں گے۔" اس کے باوجود میں اسے چمکارتا رہا' تھپتھپاتا رہا۔

مجھے نہیں پتا' وہ ایک منٹ تھا یا ایک گھنٹا۔ بہرحال وہ وقت گزر گیا اور اچانک بھیڑ نے ایک دم خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا' جیسے وہ مر گئی ہے۔

"میرے خدا۔" مجھے نانا کی چہکتی آواز سنائی دی۔

مجھ میں آنکھیں کھولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ "کیا ہوا نانا؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل پوچھا۔

"میمنا ہے.... اور کیا ہوتا؟"

"اور ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"چاق و چوبند۔ تندرست و توانا۔"

میں نے آنکھوں کی جھریوں سے دیکھا۔ نومولود میمنا سوکھی گھاس کے تنکے چبا رہا تھا مگر اس کے پیٹ سے بندھی ہوئی ایک سرخ ڈوری بھی مجھے نظر آرہی تھی۔ میں نے پھر آنکھیں بھینچ لیں۔ چند لمحے بعد میں نے آنکھ کھولی تو نانا نال کاٹ چکے تھے۔ "یقین نہیں آتا۔" وہ بڑبڑائے۔ "یہ کرسمس کا میمنا ہے۔ کیسی ناممکن بات ہے۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آتا۔" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"اب تم اس بیچاری کو تو چھوڑ دو۔" نانا نے کہا۔ "یہ اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

میں نے بھیڑ کے سر کو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور اٹھ کھڑا ہوا پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نانا نے میمنے کو سوکھی گھاس پر اس کی ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ بھیڑ نے سر آگے کی طرف بڑھایا اور بڑی محبت سے اسے چاٹنے لگی۔ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر دور جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جسم کی جان نکل چکی ہے۔ میں نے بازو سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ مجھے عمل پیدائش کی تھیوری پہلے ہی سے معلوم تھی لیکن درحقیقت میں جانتا کچھ بھی نہیں تھا اور جو کچھ اب میں نے جانا اور سمجھا تھا' وہ خوش کن ہرگز نہیں تھا۔ زندگی کے راز' زندگی کے حقائق کم ہی خوش کن ہوتے ہیں۔

بہرحال مجھے لگ رہا تھا کہ پچھلے چند گھنٹوں نے مجھے بڑا کر دیا تھا۔ میں لڑکے سے مرد بن گیا تھا۔ میں نے اس بھیڑ اور میمنے کے حوالے سے پیدائش کے عمل کو سمجھ لیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ انسان کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے پرنانا ابراہیم' بڑی نانی سارہ' نانا' نانی' میرے ڈیڈی اور مما..... اور میں خود کیسے پیدا ہوا ہوں گا۔ مائیں کتنی اذیت اٹھاتی ہیں تو زندگی کی افزائش ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے اللہ نے ماں کے پاؤں کے نیچے جنت رکھی ہے۔

میں بہت کچھ سمجھ رہا تھا۔ انسان اذیتیں اٹھاتا اس دنیا میں آتا ہے' پھر یہاں جدوجہد کرتا اور تکلیفیں اٹھاتا ہے لیکن یہ اذیت اسے احساس فتح سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس لمحے میں نے اپنے نانا کو دیکھا۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں اٹھا تو میرے ہونٹوں پر بھی ایک کشادہ مسکراہٹ تھی۔ میں اس وقت خود کو زندگی سے بھرپور اور بہت بڑا محسوس کر رہا تھا۔

اچانک نانا نے پوری قوت سے اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ "آئل پل" انہوں نے بلند آواز میں کہا پھر انہوں نے جلدی سے اپنی ٹوپی سر پر جمائی' جیکٹ اٹھائی اور مجھے بہت غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جیسے کوئی آگ جل رہی تھی۔ "حارث..... میرے بچے۔ تمہارا کیا خیال ہے' ہم اسے اسٹارٹ کر سکتے ہیں؟"

"کسے اسٹارٹ کر سکتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ٹریکٹر کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟ ٹریکٹر اسٹارٹ کر کے کیا کرنا ہے۔" میں اب بھی حیران تھا۔

"اس پر آرگن لاد کر چرچ پہنچا سکتے ہیں۔"

"اوہ..... اوہ....." میں نے گہری سانس لی۔ "کیوں نہیں..... وہ اسٹارٹ کیوں نہیں ہو گا؟"

"اس لئے کہ میں نے موسم سرما میں کبھی اسے اسٹارٹ ہوتے نہیں دیکھا ہے۔" نانا نے کہا۔ "لیکن بیٹے.... اگر ہم اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر برف کی بھی ایسی کی تیسی۔ اس پر تو کچھ بھی لاد کر کہیں بھی لے جاسکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں بھی ایکسائٹیڈ ہوگیا۔ "ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں نانا۔"

"اے..... زیادہ جذباتی مت بنو۔ فاصلہ چھ میل کا ہے اور یہ بہت خوفناک طوفانی رات ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' ہم کامیاب ہوجائیں گے؟" ان کے لہجے میں التجا در آئی۔ وہ مجھ سے مثبت جواب سننا چاہتے تھے۔

"کیوں نہیں نانا۔ ناکامی کا تو سوال ہی نہیں۔" میں نے بے حد خلوص اور جوش سے کہا۔

"دیکھ بیٹے' میں اب نہ جوان ہوں' نہ اتنی جان ہے مجھ میں۔"

"تو میں آپ کی مدد کروں گا۔"

"بیٹے' وہ آرگن بہت قیمتی ہے۔ بہت اعلیٰ لکڑی کا بنا ہوا ہے اور وہ یادگار بھی ہے۔"

"ہم بہت احتیاط برتیں گے۔ اس پر خراش بھی نہیں لگے گی۔"

"میرے پاس اس آئل پل کی کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں اسے کیسے اسٹارٹ کیا جاسکتا ہے لیکن پڑھنا بہت آسان ہوتا ہے اور لکھے ہوئے کے مطابق عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"چھوڑیں نانا۔ کوشش کریں گے تو نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کہنا آسان ہوتا ہے بیٹے اور کرنا مشکل۔ سوچو تو یہ کام ناممکن لگتا ہے۔"

"ناممکن تو اس موسم میں یہ سمنے کی پیدائش بھی تھی لیکن دیکھ لیں' یہ سچ مچ کا..... جیتا جاگتا ہے کہ نہیں۔"

نانا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "خدا کی قسم' یہ تم نے بڑی سچی بات کہی ہے۔ معجزے تو اب بھی ہوجاتے ہیں۔ بس اللہ کی مرضی ہونی چاہیے۔" وہ کہتے کہتے رکے اور چند لمحے ہچکچائے۔ "مگر ایلی کا مسئلہ بھی تو ہے۔ یہ اس کے لئے سرپرائز ہونی چاہیے ورنہ مزہ نہیں آئے گا۔"

"تو ہم نانی کو بتائیں گے ہی نہیں۔"

"ایلی بہت ہلکی نیند سوتی ہے۔ کوئی دبے پاؤں قریب سے گزرے تو جاگ جاتی ہے۔" نانا جوانوں کے سے انداز میں ہنسے۔ "اور ہمارے اس ٹریکٹر کی آواز! اسے یہاں اسٹارٹ کریں تو بلغراد میں بھی بھگدڑ مچ جائے۔ تم نے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا میرے پاس۔

"چلو..... کہیں چل بیٹھتے ہیں۔ مل جل کر سوچیں گے تو شاید کچھ سوجھ ہی جائے گا۔"

ہم ذرا دور جاکر بھوسے پر بیٹھ گئے۔ میں ایک تنکے سے دانت کریدتا رہا۔ نانا اپنی مونچھوں کا کنارہ مروڑتے رہے۔ معاملہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ کرسمس کی سرد ترین رات تھی۔ درجۂ حرارت صفر سے کتنا نیچے ہے' یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ اس موسم میں ایک بوڑھا شخص اور اس کا تیرہ سالہ نواسہ ایک ناممکن کام کرنا چاہ رہے تھے۔ پہلے مرحلے میں انہیں نقطۂ انجماد سے نیچے کے موسم میں ایک بے حد پرانا ٹریکٹر اسٹارٹ کرنا تھا..... اور وہ بھی ایک ایسی خاتون کی لاعلمی میں' جو گہری نیند نہیں سوتی تھی اور ٹریکٹر ایسے اسٹارٹ ہوتا تھا' جیسے توپ سے گولا داغا گیا ہو۔ دوسرے مرحلے میں بھاری آرگن کو ٹریکٹر پر لادنا تھا۔ تیسرے مرحلے میں ایسے موسم میں' جب راستے برف سے ڈھکے ہوئے تھے' اسی ٹریکٹر کو چھ میل دور لے کر جانا تھا اور برف باری جاری تھی اور اس آرگن کو اگلی صبح اتوار اور کرسمس کی سروس میں استعمال ہونا تھا اور صبح صرف چند گھنٹے دور تھی۔

"وہ اسے بجاتی نہیں لیکن اس آرگن سے اسے بہت محبت ہے۔ اسے خود سے جدا کرنا ایلی کے لئے آسان نہیں۔" نانا پُرخیال انداز میں بڑبڑائے۔

میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ میں دوسرے مسائل پر غور کررہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نانا بڑے حوصلے اور ہمت والے ہیں لیکن ان میں اتنا اسٹیمنا بھی ہوگا؟ ان کی عمر ستر کے قریب تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اتنی عمر میں آدمی کا ایک پاؤں قبر میں ہوتا ہے۔ اگر راستے میں کوئی خوفناک بات ہوگئی تو.....؟ تو کیا ہوگا؟ میرا کیا ہوگا؟ میں کچھ کرسکوں گا؟

"ایلی بہت بہادر عورت ہے۔" نانا نے کہا۔ "میری ماما سارہ کی طرح۔"

میں اپنی سوچ جارہا تھا۔ نانا نے تو نانی سے کہہ دیا تھا کہ کل چرچ میں سروس ہونا ہی ناممکنات میں سے ہے۔ تو پھر اتنی مشقت کرکے آرگن وہاں پہنچانے کا فائدہ۔ یہ مشن ہی بے سود لگ رہا تھا۔

"یہ طوفان ساری رات چنگھاڑتا رہے گا۔" نانا بولے۔ "اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بھی وقت اس کا زور ٹوٹ جائے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اور اگر نانی ٹریکٹر کی آواز سن کر جاگ گئیں تو مزہ ہی کرکرا ہوجائے گا۔ نانا تو انہیں سرپرائز دینا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں ٹریکٹر برف میں پھنس جائے اور میں اور نانا وہیں منجمد ہوکر وفات پاجائیں۔

"شادی کے بعد یہ پہلا کرسمس ہے کہ میں نے ایلی کو کوئی تحفہ نہیں دیا۔" نانا نے سوگوار لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ آرگن چرچ پہنچا

دیا جائے اور صبح سروس میں کام آئے تو یہ اب تک کا سب سے بڑا سب سے قیمتی تحفہ ہوگا میری طرف سے.... ایلی کے لیے۔"

"مگر یہ ناممکن ہی لگتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اچانک میرے اندر اس اُمنگ کی ایک لہر اٹھی' جو صرف نوجوانوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ میں نے سوچا' ایسے ناممکن کام کرکے ہی تو سچی خوشی ملتی ہے۔

اچانک نانا نے میرے بازو کو چھو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی چمک رہی تھی۔ "تم ذرا کل صبح اپنی نانی کے چہرے کا تو تصور کرو۔ وہ کل صبح چرچ میں داخل ہوں گی اور اچانک.... بالکل اچانک انہیں وہ آرگن نظر آئے گا۔ کیسا لگے گا!"

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔"

نانا مسکراتے رہے۔ پھر انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "تو پارٹنر' کیا خیال ہے۔ کوشش تو کریں نا؟"

"بالکل۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ہم ہر دشواری بھول گئے تھے۔ برفانی طوفان' بھاری آرگن اور چھ میل کا ناممکن فاصلہ۔ ہم سر جوڑ کر تفصیلات طے کرنے لگے۔ منصوبے کی نوک پلک درست کرنے لگے۔ بتدریج ایک خاکہ سا تیار ہوگیا۔ اس پر عمل کرنا کسی ہیرو ہی کا کام تھا۔ ہمارے سینے کچھ کرنے سے پہلے ہی فخر سے پھول گئے۔ اس میں خطرات بھی تھے اور بدمعاشی بھی۔ ہمارے جسموں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ہم دو سازش کرنے والوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھے درپیش چیلنج سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ یہ طے تھا کہ ہم ایک بہت بڑی مہم پر جارہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" نانا نے ٹوپی کو کھول کر کانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا پھر انہوں نے بھیڑ اور اس کے نوزائیدہ میمنے کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ معزز خاتون کرسمس کے موقع پر جنم دے سکتی ہے تو اس کا مطلب ہے معجزوں کا دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اور ہمیں ایک معجزے ہی کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" میں نے ایسے کہا' جیسے ان کا کوئی ہم عمر دوست ہوں۔ نہیں.... بلکہ وہ مجھے اپنے ہم عمر دوست لگ رہے تھے۔

"بس تو اب کام شروع کردینا چاہیے۔" وہ نتھنے پھلاتے ہوئے بولے۔

ہم گھر کی طرف چل دیے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی کہ ہم نے جو کام اپنے ذمے لیا ہے' وہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ نانا نے ایک لالٹین لی اور تہ خانے میں چلے گئے۔ میں کچن میں داخل ہوگیا۔

"کیا ہوا؟ میمنا آگیا؟" نانی نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی تو نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "میرا خیال ہے' ہمیں اس بھیڑ پر پوری رات کھپانی ہوگی۔"

"یہ تو بڑی زیادتی ہوئی تم لوگوں کے ساتھ۔ اچھا' اچھا' منصر کہاں ہیں؟"

"تہ خانے میں۔ آتے ہی ہوں گے وہ بھی۔"

نانی رات کی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ انہیں ہاٹ واٹر بوتلیں تیار کرنی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لئے برتی کمبل کے ساتھ یہ بوتلیں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔

نانا کچن میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں ٹن کی دو پیالیاں تھیں۔

"میں نے سوچا' سیب کا جوس ہی ٹرائی کیا جائے۔"

"اب تک تو وہ نشہ آور ہوگیا ہوگا۔" نانی بولیں۔

"ارے نہیں۔" نانا نے کہا۔ "اس کے لئے تو کم از کم دو تین گرم دن چاہئیں۔"

نانی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگیں۔ میری نانی الکحل کسی بھی شکل میں نہیں قبول کرتی تھیں۔ انہیں تو وائن کا ایک گلاس بھی گوارا نہیں تھا۔ اس موضوع سے بچنے کے لئے وہ بننے والی سویاں اور اون کا گولا لے کر بیٹھ گئیں۔ نانا یہی چاہتے تھے کہ ان کا دھیان بٹے اور انہیں اپنی کارروائی کا موقع مل جائے۔ انہوں نے کپ بورڈ سے تین چھوٹے گلاس نکالے اور ٹن کے ایک کپ میں موجود مشروب دو گلاسوں میں انڈیلا اور دوسرے کپ کا مشروب انہوں نے پورا تیسرے گلاس میں انڈیل دیا۔ مجھے آنکھ مارتے ہوئے وہ تیسرا گلاس انہوں نے نانی کی طرف بڑھایا۔ باقی دونوں گلاسوں میں سے ایک انہوں نے مجھے دے دیا۔

"لو بھئی.... کرسمس مبارک ہو۔" نانا بولے۔ "خدا کرے' یہ طوفان بھی جان چھوڑ دے۔"

"اور زمین پر امن قائم ہو اور انسانوں کو فلاح نصیب ہو۔" نانی نے جام تجویز کیا۔

میں نے اور نانا نے سیب کے میٹھے مزے دار جوس کا گھونٹ لیا۔

نانی نے بھی سپ لیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے تھے منصر۔" وہ بولیں۔ "یہ خوش ذائقہ ہے۔ اور ابھی بھاری نہیں ہوا ہے۔" وہ مسکرائیں۔

اس پر نانا بھی مسکرائے۔ میں بھی مسکرا دیا۔

ہم بیٹھے رہے۔ نانی کی انگلیاں سلائیوں کو گھما رہی تھیں۔ شاید وہ کوئی سوئیٹر بن رہی تھیں۔ "غیر مصروف ہاتھ شیطان کا کام کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "اسی لئے میں اپنے ہاتھوں کو ہمیشہ مصروف رکھتی ہوں۔"

میں نے سوچا' گٹھیا کی تکلیف کے باوجود نانی کا یہ حال ہے۔

نانی کو مزید "سیب کا جوس" دیا گیا۔ ان کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی اور وہ بہت خوش مزاج لگنے لگیں۔ انہوں نے مجھ سے

کہا۔ "میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سناتی ہوں۔ دیکھو' عزت نفس اور وقار کا کیسے خیال رکھا جاتا ہے۔" انہوں نے کن انکھیوں سے نانا کو دیکھا اور بات آگے بڑھائی۔ "اب میں سوچتی ہوں' شاید یہ بھی عزت و وقار کی بات ہے کہ میں کرسمس کی صبح اپنے میلوڈین کو چرچ میں دیکھنے کی خواہش کر رہی تھی اور میں نے نہیں سوچا کہ یہ ممکن ہے یا نہیں۔ بہرحال جو کہانی میں سنا رہی ہوں' وہ تمہاری مما کے متعلق ہے۔ سنو اور سمجھو کہ عزت اور وقار کے لئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

میں اور نانا' نانی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"اس وقت تمہاری مما کی عمر سولہ سال ہوگی۔" نانی نے کہا۔ "ہمیں ہوویل کے ایک بینکار نے اپنے ہاں پارٹی میں مدعو کیا۔ عائشہ بھی گئی۔ ان دنوں نارنگیاں بہت قیمتی چیز ہوا کرتی تھیں اور مہمانوں کو نارنگیاں پیش کرنا تواضع کی حد ہوتی تھی۔ جسے سال میں ایک نارنگی میسر آجاتی تھی' وہ بے حد خوش نصیب کہلاتا تھا۔" نانی نے "سیب کے جوس" کا ایک اور طویل گھونٹ لیا۔ "واہ... بہت مزے کا ہے۔" انہوں نے ایک پھندا لگانے کی کوشش کی لیکن سلائیوں پر ان کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ "یہ گٹھیا بڑا تکلیف دہ مرض ہے۔ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔ "ہاں' تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہاری ماں عائشہ کو اس پارٹی میں مدعو کیا گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ شام کو کس وقت نارنگیوں کی چھوٹی ٹوکری مہمانوں کے درمیان گردش میں لائی جائے گی۔ چنانچہ میں نے عائشہ کو نصیحت کی کہ عزت اور وقار بڑی چیز ہوتی ہے۔ آدمی کو سر اونچا کر کے فخر اور عزت سے رہنا چاہیے۔ میں نے کہا... جب ٹوکری تمہارے سامنے آئے تو تم نارنگی کے لئے ہاتھ مت بڑھانا۔ تم یہ تصور کرنا کہ گھر پر ہر روز تمہیں ایک نارنگی کھانے کو ملتی ہے۔ دوسرے لوگ جھپٹ جھپٹ کر نارنگیاں لیں گے پھر ٹوکری دوسری بار تمہارے سامنے لائی جائے تو ذرا ہچکچانا... اور چند لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد ایک نارنگی لے لینا۔ دیکھو بیٹی' یہ ہوتے ہیں سیر چشموں کے طور طریقے۔ سمجھ گئیں نا؟"

نانی نے پھر ایک پھندا لگانے کی کوشش کی اور ناکام رہیں۔ اب ان کی انگلیاں مرتعش تھیں۔ نانا نے ان کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ نانی نے سیب کے جوس کا ایک اور طویل گھونٹ لیا۔ "کیا کہہ رہی تھی میں؟"

درحقیقت نانی جو کچھ پی رہی تھیں' وہ جوس نہیں' نشہ آور مشروب تھا۔ یہ بات نانا نے مجھے پہلے ہی بتا دی تھی۔ "یہ بے ضرر ہے۔ ایسا ہے' جیسے آپ کے دماغ پر کوئی تتلی آکر بیٹھ گئی ہو۔" انہوں نے کہا تھا۔ "لیکن زیادہ مقدار میں لیا جائے تو یہ بچھو کے ڈنک سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے۔" دراصل نانا یہ چاہتے تھے کہ نانی انکی بے خبر سوئیں کہ آئل پل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی انہیں نہ جگا سکے۔

"ہاں... تو میں کہاں تھی؟" نانی نے پھر پوچھا۔

"آپ پارٹی کا واقعہ سنا رہی تھیں۔"

"کون سی پارٹی؟" نانی نے حیرت سے پوچھا۔

"نارنگیوں والی۔"

"ہاں... پارٹی۔" اب نانی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ "خیر... وقت آیا اور نارنگی کی ٹوکری گردش میں لائی گئی۔ تمہاری ماں نے نارنگیوں کو نظرانداز کر دیا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ عائشہ کا جی تو مچلا لیکن اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ "جی شکریہ۔" نانی کے ہاتھ سے سلائیاں گر گئیں۔ وہ نیچے دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے انہیں چونکایا۔

"کہاں کیا ہوا؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ممی نے نارنگی نہیں لی پھر کیا ہوا؟"

"اوہ نارنگی۔ ہاں... ہوا یہ کہ ٹوکری دوبارہ گردش میں آئی ہی نہیں۔ لوگوں نے پہلے ہی ہلے میں صاف کر ڈالی۔ میں کہتی ہوں..."

"کیا کہتی ہو؟" نانا نے پوچھا۔

نانی انہیں اور لڑکھڑا گئیں۔ انہوں نے ذرا جھک کر کرسی کا سہارا لیا۔ "مجھے چکر آرہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا منصر کہ بات کیا ہے۔ نیند سے بُرا حال ہے میرا۔"

نانا تیزی سے اٹھے۔ "تو سو جاؤ۔ چلو' میں تمہیں بیڈ تک پہنچا دوں۔"

نانا نے نانی کا ہاتھ تھاما اور انہیں بیڈ روم میں لے گئے۔ میں نے اون کا گولا اور سلائیاں دراز میں رکھ دیں پھر میں نے نانی کے گلاس کا بچا ہوا مشروب سنک میں انڈیلا اور گلاس کو اچھی طرح دھو ڈالا۔ مشروب جیسے ہی نیچے اترا' وہاں پٹاخہ سا چلا۔ میں گھبرا گیا۔ یہ نانا نے کیا پلا دیا نانی کو۔

کمرے سے نانی کے گانے کی زوردار آواز آرہی تھی پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ یہ نانیاں' دادیاں ایسے جوان لڑکیوں کی طرح تو نہیں ہنستیں۔

ذرا دیر بعد نانا کچن میں واپس آئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے کلاک پر نظر ڈالی۔ دس بجنے والے تھے۔ ہم انتظار کرتے رہے مگر یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ بیڈ روم سے نانی کے خراٹوں کی خوش کن آواز سنائی دینے لگی۔ نانا نے سرگوشی میں مجھے اوپر جا کر تیار ہونے کی ہدایت کی۔

میں تیار ہو کر نیچے آیا۔ لکڑی کے شیڈ میں جا کر ہم نے لالٹینیں جلائیں پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ شاید ہم دونوں ہی کو یقین کی ضرورت تھی... خود پر بھی اور ایک دوسرے پر بھی۔

پھر ہم نے دروازہ کھولا اور باہر چیختے چنگھاڑتے طوفان میں نکل گئے۔

○☆○

ہم سیدھے غلہ گودام میں گئے۔ یہ گودام ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ جنوب کی جانب سے کھلا ہوا تھا کیونکہ سرد طوفانی ہوا شمال کی سمت سے چل رہی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے لالٹینوں میں تیل بھرا۔ اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ لالٹینیں راستے میں دھوکا نہ دے جائیں پھر میں نے لالٹین سے نانا کو راستہ دکھایا کیونکہ وہاں مشینری اور آلات کا انبار تھا۔ ٹریکٹر کے پاس پہنچ کر نانا اس کے آگے پیچھے گھوم کر اس کا معائنہ کرتے رہے پھر انہوں نے ٹریکٹر کی ٹنکی بھی پوری طرح بھروی۔

میں اس ٹریکٹر کی پوری تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہ آسان کام نہیں۔ پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ آپ اپنے ذہن سے جدید ٹریکٹر کے تصور کو کھرچ دیں۔ نانا کا ٹریکٹر ہارس پاور سے لدا پھندا نہیں تھا۔ وہ سیلف اسٹارٹر کی عیاشی سے بھی محروم تھا۔ اس میں ہیڈ لائٹس اور سیٹ کشن بھی نہیں تھے۔ ریڈیو نصب ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ذہن میں رکھیں کہ وہ ۲۸ء کا ماڈل تھا۔ وہ رملے کا آئل پل ماڈل ۴۰۔۲۰ تھا اور وہ اتنا بڑا اور بھاری تھا کہ آج کے دور میں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ٹریکٹر میں سامنے کی طرف ایک چوکور چمنی تھی' جو انجن کے موڈ کے مطابق مختلف مقداروں میں دھواں اگلتی تھی۔ سائیڈ میں ماڈل کا نام اور کمپنی کا نام لکھا تھا۔ انجن ۸×۱۰ انچ سائز کا تھا۔ یہ دو سلنڈر والا افقی انجن تھا۔ یہ مٹی کے تیل سے چلتا تھا اور اس کی دو رفتاریں تھیں۔ کم رفتار دو میل فی گھنٹا تھی اور پوری رفتار ۳.۲ میل فی گھنٹا تھی۔ بیلٹ وہیل پر ۴۰ ہارس پاور کی قوت تھی اور وہ ایک منٹ میں ۴۵۰ بار گھومتا تھا۔ پہیے اسپوک کیے گئے کاسٹ آئرن کے تھے۔ عقبی پہیے تقریباً چھ فٹ اونچے تھے' اگلے پہیوں اور ٹرانسمیشن کے اوپر کیب تھی' جس کے اوپر ایک سائبان تھا۔ وہاں ڈرائیور کے لئے آہنی سیٹ تھی اور اسٹیرنگ وہیل تھا.... اور دیگر کنٹرول تھے۔ یہ ٹریکٹر سولہ فٹ لمبا اور دس فٹ اونچا تھا۔ اس کا وزن تقریباً ساڑھے چھ ٹن تھا۔ اس میں بس ایک کمی تھی۔ اس میں آرمر پلیٹیں لگا دی جاتیں' دو ایک گنیں نصب کردی جاتیں اور کیب کو گھمانے کا بندوبست کردیا جاتا تو وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں کسی بھی ٹینک سے برابری کی بنیاد پر مقابلہ کرسکتا تھا۔ کم از کم میں نے اس سے پہلے اس نوعیت کی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ہول آنے لگا۔

میری نانی کے نزدیک وہ بہت مہنگا تھا۔ وہ جس گاڑی کی آرزو رکھتی تھیں' یہ اس سے کئی گنا قیمت دے کر خریدا گیا تھا۔ میرے نانا کے نزدیک وہ ٹریکٹر طاقت ' عزت اور سربلندی کا نشان تھا لیکن بہرحال میرے نانا اس کے لئے متضاد جذبات رکھتے تھے۔ انہیں اس سے محبت تھی کیونکہ اس کی مدد سے پچھلے کئی سال سے پورے گاؤں میں ہونے والی گندم کی فصل کا دانہ دانہ الگ کیا جاتا رہا تھا لیکن شاید اس سے نفرت بھی تھی کیونکہ اب تک اس سے انہیں ایک دھیلے کی آمدنی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ معاشی بدحالی کا زمانہ تھا۔ اس میں وہ کسی سے صلہ مانگتے تو وہ بے رحمی ہی کھلاتی۔ جبکہ ٹریکٹر کی خوراک کم نہیں تھی اور انہیں اس کا بندوبست اپنے پلے سے کرنا پڑتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے غربت میں ہاتھی پال لیا تھا اور میرے نزدیک وہ ایک ایسی عجیب الخلقت مشین تھی' جسے اس وقت' اس شدید موسم میں پٹانا تھا تاکہ اس کی مدد سے میلوڈین چرچ تک لے جایا جاسکے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ہم ایک چوہے کو حرکت دینے کے لئے ایک پہاڑ کو آگ لگا رہے تھے۔

بہرحال پہلا مسئلہ اسے اسٹارٹ کرنا تھا۔ درجۂ حرارت.... درجۂ حرارت تو نہیں کہا جانا چاہیے۔ بہرحال ٹمپریچر اس وقت نقطۂ انجماد سے کم از کم دس درجے نیچے رہا ہوگا۔ انجن ایسا سرد ہو رہا تھا کہ اگر وہ کوئی مخلوق ہوتا تو مرچکا ہوتا۔ اتنے بڑے اور جسیم ٹریکٹر سردیوں میں اسٹارٹ ہی نہیں ہوتے۔ اس موسم میں ان کا کام ہی نہیں ہوتا۔ وہ بس بیکار پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔

نانا نے سب سے پہلے دونوں سلنڈروں کے کپ میں گیسولین انڈیلا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ یہ مٹی کے تیل سے چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلتا تو ہے لیکن گیسولین زیادہ گرمی فراہم کرتی ہے۔" نانا نے وضاحت کی۔ "چنانچہ ہم اسے گیس سے اسٹارٹ کریں گے اور گیس پر ہی چلائیں گے۔ یہاں تک کہ انجن پوری طرح گرم ہوجائے پھر ہم مٹی کے تیل پر اسے چلا سکیں گے۔"

نانا نے دستانے اتارے اور فلائی وہیل کی طرف گئے۔ وہ ہینڈل پر جھکے جو دھکیلے جانے پر خود ہی واپس آتا تھا۔ انہوں نے اسے ایک بار' دو بار.... تین بار گھمایا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ نانا نے اپنے ہاتھوں پر تھوک ملا اور فلائی وہیل کو دس بارہ بار گھمایا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

"دھما کا کرنا پڑے گا۔" نانا نے کہا۔ انہوں نے مجھے روشنی دکھانے کا اشارہ کیا اور آلات کے انبار کی طرف چل دیے۔ وہاں سے انہوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک بلو ٹارچ برآمد کی۔ اس میں انہوں نے گیس بھری اور پھر ماچس کی مدد سے اسے جلایا۔ اس کی لو کم کرتے کرتے وہ اسے نیلی روشنی تک لے آئے پھر ہم ٹریکٹر کے پاس آئے۔ نانا نے بلو ٹارچ مجھے دی اور ٹریکٹر کے پلگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پلگ کا کام انجن کے باہر کی حرارت کو اندر منتقل کرنا تھا پھر یہ اس حرارت کو مرتکز کرتا۔ گیس کے بخارات سلنڈر میں جاتے تو سلنڈر جل اٹھتا۔

میں نے نیلے شعلے کا رخ پلگ کی طرف کیا۔ نانا نے ہینڈل تھاما

اور اسے کھینچنے لگے لیکن نتیجہ اب بھی کچھ نہیں نکلا۔

نانا کی سانس پھول گئی۔ وہ سانس درست کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ غور و فکر کر رہے ہیں۔ بالآخر انہوں نے کہا۔ "میں کرسمس کی رات اپنی زبان گندی نہیں کرنا چاہتا ورنہ یہ ٹریکٹر صرف گالیوں کی زبان ہی سمجھتا ہے۔ خیر۔ ایک ترکیب اور ہے۔ اسے آزماتے ہیں۔ تم یہاں آؤ۔"

وہ مجھے ٹریکٹر کی دوسری سائیڈ لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے سلنڈر سے باہر آنے والا پائپ دکھایا۔ "تم اسے گرمی دو۔" انہوں نے کہا۔ "سلنڈر میں ٹھنڈی ہوا بھری ہوئی ہے۔ یہاں سے گرمی براہِ راست سلنڈر میں جائے گی اور سرد ہوا انجن میں تبدیل ہو جائے گی پھر گیس اپنا کام دکھا سکے گی۔"

میں پائپ کو گرمی دینے لگا اور نانا پھر ہینڈل کے ساتھ الجھ گئے۔ انہوں نے فلائی وہیل کو اتنی قوت سے اور اتنی بار گھمایا کہ اگر وہ کھیس بلونے والی مشین ہوتا تو کھیس اگل دیتا۔

نانا کا ہاتھ رکا تو ان کی سانسوں کے شور کے سامنے شوریدہ سر طوفان شرمندہ ہو گیا ہو گا۔ وہ کوئی بھی محنت کا کام کرتے تو ہانپتے ضرور تھے مگر میں نے انہیں اس طرح ہانپتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ انہیں پھیپھڑوں کی بیماری تھی' جو بھوسے سے قربت رکھنے والوں کو اکثر ہو جاتی ہے۔ بھوسے کی گرد سانسوں کے ساتھ اندر جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تہہ جمنے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انفیکشن بھی ہوتا ہے اور سانس لینے میں دشواری بھی ہونے لگتی ہے۔ اس زمانے میں کسانوں کو یہ بیماری اکثر ہوتی تھی۔

"بُرے پھنس گئے ہم۔" نانا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم پائپ کو گرمی دیتے ہو تو یہاں پلگ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پلگ کو گرمی دو گے تو پائپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ کھڑے ہو کر اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کچھ سوچتے رہے۔

"لیکن نانا' ہمت تو نہیں ہارنی چاہیے۔" میں نے انہیں چیلنج کیا۔ "ہمیں یہ کام کرنا ہے۔"

"تمہارے پاس کوئی تجویز ہے؟" انہوں نے منہ بنا کر پوچھا۔

"کہیں تو میں کوشش کروں؟"

"خوش آمدید۔"

میں لوکین کی خوش امیدی سے مالا مال تھا۔ میں نے دستانے اتارے اور وہیل کی طرف گیا۔ اپنے جسم کی تمام طاقت ہاتھوں میں لاتے ہوئے میں نے پوری قوت سے وہیل گھمایا۔ لیکن میں بڑی مشکل سے اسے ہاف ٹرن دے سکا۔

مجھے حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ بوڑھے نانا اتنے طاقتور تھے کہ وہیل آسانی سے گھما لیتے تھے اور میں جوان اور صحت مند اسے ٹھیک سے ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔

"شکریہ بیٹے۔" نانا نے بے حد خلوص سے کہا۔

مجھے توہین کا احساس ہونے لگا۔ "کس بات کا شکریہ؟" میں نے تند لہجے میں پوچھا۔

"تم نے مجھے ایک اور راستہ سجھا دیا۔ تمہارے بازو تو کام کے نہیں مگر ہم تمہاری ٹانگوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ سنو۔"

نانا نے دونوں لالٹینیں ٹریکٹر کے دونوں جانب رکھ دیں۔ "اب تم پلگ کو گرمی دو۔ وہ سرخ ہو جائے تو بھاگ کر دوسری طرف آؤ اور پائپ کو گرمی دو۔" انہوں نے کہا۔ "اور وہ گرم ہو جائے تو پھر بھاگ کر پلگ تک آؤ۔ یہی کرتے رہو پھرتی دکھاؤ گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ پائپ اور پلگ دونوں گرم ہو جائیں گے۔ بات بن جائے گی۔"

بات عقل کی تھی۔ میں نے عمل شروع کر دیا۔ نانا دھیرے دھیرے وہیل گھماتے رہے اور میں پلگ اور پائپ کے درمیان گردش کرتا رہا مگر اس مسلسل مشقت کا نتیجہ تھکن کے سوا کچھ بھی نہیں نکلا۔

ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ نانا سامنے والے وہیل کے پاس بیٹھ گئے اور میں چمنی کے پاس ڈھے گیا۔ ہم دونوں نڈھال تھے۔ نانا کا اپنی مشین پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا اور نانا پر میرے اعتماد میں پتلی سی سسی' مگر ایک دراڑ پڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے میں انہیں بہت بڑا انجینئر سمجھتا تھا۔

مگر اچانک اس آہنی عفریت کے اندر..... کہیں گہرائی سے ایک واضح آواز سنائی دی۔ وہ کوئی آہ معذرت نہیں تھی بلکہ بے آرامی پر احتجاج تھا۔ ٹریکٹر اس سرد موسم میں بے وقت زحمت دیے جانے پر احتجاج کر رہا تھا۔

نانا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں فلائی وہیل کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بڑی آہستگی سے' نزاکت سے اسے گھمایا۔

انجن دھیرے سے کھانسا..... کھو کھو..... کھو کھو..... پھر وہ کھانسی بڑھتی گئی۔ ٹریکٹر ہلنے' لرزنے لگا اور چند لمحے بعد گاڑھا سیاہ دھواں اگلنے لگا۔

ہم جیت گئے تھے۔

کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے میں اور نانا ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھتے رہے۔ ہم دونوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ اس وقت تک ٹریکٹر کی آواز اتنی زیادہ بلند ہو چکی تھی کہ بات کرنے کے لئے نانا کو میرے کان سے منہ ملا کر چیخنا پڑا۔ "اسے اور گرم ہونے کے لئے یہیں چھوڑ دو۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

نانا لائحہ عمل کی جزئیات تک پہلے ہی طے کر چکے تھے' سب سے پہلے ہم نے ٹریکٹر کے راستے میں پڑی ہوئی چیزیں ایک طرف ہٹا کر راستہ بنایا۔ ہم نے بڑے تختے' دو بڑے کمبل' رسی کا ایک گچھا' لالٹینیں اور دوسری ضروری چیزیں لیں اور گھر کی طرف چل دیے۔

ہمارے پاس ایک ہتھ گاڑی بھی تھی مگر اسے کھینچنا بڑا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ فی الوقت اس پر بوجھ بھی نہیں تھا جبکہ واپسی میں اس پر بوجھ ہونا تھا۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے ہم اسنوبین بن چکے تھے..... برفانی بھوت۔

ہم نے گاڑی پورچ کی سیڑھیوں کے نیچے روکی۔ سیڑھیوں پر دو تختے بچھائے' جو ہتھ گاڑی سے لگے ہوئے تھے۔ رسی کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ پورا اہتمام کرنے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں گئے۔ سلائیڈنگ ڈور بہت آہستگی سے پوری طرح کھولنے کے بعد ہم پارلر میں گئے۔ ہمارا انداز نقب زنوں کا سا تھا۔ دونوں طرف سے میلوڈین کو دھکیلتے ہوئے ہم اسے ڈرائنگ روم میں..... اور پھر پورچ تک لے گئے۔ مقامِ شکر تھا کہ میلوڈین کے پہیے ٹھیک کام کر رہے تھے۔

ابھی تک سب کچھ اچھی طرح ہوا تھا مگر اب دشوار مرحلہ آگیا تھا۔

ہم نے میلوڈین کو کمبلوں سے اچھی طرح لپیٹا اور رسی کی مدد سے باندھ دیا۔ اب ہم نے دونوں سائیڈوں کو لکڑی کے دونوں تختوں پر رکھا۔ میلوڈین کو اتارنا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اوپر کی طرف میں تھا اور نیچے کی طرف نانا۔ ہم تھوڑا تھوڑا کر کے میلوڈین کو پھسلا رہے تھے۔ وہ ذرا قابو سے باہر ہوتا تو میرا دم نکل جاتا۔ ذرا سی غلطی سے نانا کا سرمہ بن سکتا تھا۔

بہرحال وقت ہم نے میلوڈین کو ہتھ گاڑی پر خیریت کے ساتھ چڑھا دیا پھر میں جا کر بیچ لے آیا۔

ہم میلوڈین کو لے کر گودام کی طرف چل دیے۔ قسمت ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم ہرگز یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھ گاڑی ڈھائی سو پاؤنڈ وزنی میلوڈین کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی اور ہم گھٹنوں گھٹنوں برف میں چل رہے تھے۔ نانا کی سانس اکھڑی جا رہی تھی۔ میں بھی ہانپ رہا تھا۔ جس زنجیر کو پکڑ کر ہم ہتھ گاڑی کو کھینچ رہے تھے' وہ اب ہتھیلیوں میں اتری جا رہی تھی۔ تنگ آکر ہم نے اسے کلائی پر لپیٹ لیا۔

گودام تک سو گز کا فاصلہ تھا' جو پندرہ منٹ میں طے ہوا۔

منزل پر پہنچ کر ہم سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ٹریکٹر کا انجن بدستور غرائے جا رہا تھا۔ اب وہ مٹی کے تیل پر چل رہا تھا اور اگلے مرحلے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس آہنی عفریت کے ہر حصے کو بوسوں سے بھگو دیتا۔

سانس درست کر کے ہم اٹھے۔ نانا نے بیچ کو کیب میں رکھا پھر انہوں نے ٹریکٹر کو ریورس کیا اور ہتھ گاڑی تک لے گئے۔ اب ایک اور سخت مرحلہ میلوڈین کو ہتھ گاڑی سمیت ٹریکٹر پر چڑھانے کا تھا۔ جیسے تیسے وہ مرحلہ بھی بغیر کسی نقصان کے طے ہو گیا۔ ایک مرحلے پر مجھے لگتا تھا کہ میں میلوڈین کے نیچے دب کر مر جاؤں گا۔ میں نیچے سے اسے دھکیل رہا تھا۔ رسی نہ ہوتی تو شاید کوئی حادثہ ضرور ہوتا۔ ہتھ گاڑی کے بغیر میلوڈین کو ٹریکٹر پر نہیں چڑھایا جا سکتا تھا پھر ہتھ گاڑی میلوڈین کو چرچ کے اندر پہنچانے میں بھی مدد دیتی۔

نانا نے ہینڈ تھروٹل کو آگے کی طرف دھکیلا۔ دونوں سائڈروں نے ٹمپو تیز کیا۔ نانا نے اسے نچلے گیئر میں ڈالا..... اور ہم روانہ ہو گئے۔

مگر وہ اچھا اسٹارٹ نہیں تھا۔ دس فٹ آگے بڑھے ہوں گے کہ نانا نے ٹریکٹر کو روکا اور لالٹین ہاتھ میں لئے نیچے اتر آئے۔

"اتنا اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ایسے میں راستہ کیسے نظر آئے گا۔ ذرا رکو۔" یہ کہہ کر وہ گودام کی طرف چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں آہنی تاروں کی مدد سے بنائے گئے حرف S کی شکل کے دو ہک تھے۔ انہوں نے دونوں لالٹینوں کو ان ہکس میں پھنسایا اور کیب کی چھت سے ان ہکس کو لالٹینوں سمیت لٹکا دیا۔ دونوں سائیڈوں پر یوں انہوں نے ہیڈ لائٹس کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔

نانا نے پھر تھروٹل کھینچا' نچلا گیئر لگایا' ٹریکٹر کے دیو قامت پہیے گھومے اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ ہم دو میل فی گھنٹا کی رفتار سے روانہ ہو گئے۔ بدترین مرحلے گزر چکے تھے۔ اب صرف چھ میل کا سفر باقی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ خدا کی تائید ہمارے ساتھ ہے۔

○☆○

پُرشور سانسیں لیتا ہوا سیاہ دیو قامت ٹریکٹر مجھے بحری جہاز کی طرح لگ رہا تھا۔ مجھے وہ بہت بڑا' بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا۔ جھولتی ہوئی لالٹینوں کی جھلک نظر آتی تو اس پر جہاز کے مستول کا گمان ہوتا۔ نانا آگے کی طرف جھکے ہوئے برف کے سمندر کو نظروں سے ٹٹول رہے تھے۔ وہ جہاز کے کیپٹن تھے۔

اگلے ہی لمحے روشنیاں اور کیپٹن سب میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ برف نے مجھے کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ برف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بہرحال میرے دیکھنے کی ایسی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ میرا فرض تو میلوڈین کو اس کی جگہ رکھنا تھا' اس کا خیال رکھنا تھا کہ اس کے گرد کمبل کو باندھنے والی رسی نہ کھلنے پائے اور میلوڈین پر سے کمبل نہ ہٹنے پائے۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہتھ گاڑی کبھی ادھر لڑھکتی' کبھی ادھر۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میلوڈین کے نیچے پہیے لگے تھے۔ انہوں نے اسے اس کے جثے اور وزن کے باوجود پھرتیلا بنا دیا تھا۔ چنانچہ میرے سامنے واحد راستہ یہ تھا کہ میں مضبوطی سے قدم جما کر میلوڈین کے پیچھے کھڑا رہوں اور دونوں ہاتھوں کے حلقے میں اسے سمیٹے رہوں۔ یہ پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ میرے بازو شل ہو رہے تھے۔ میرے دانت بج رہے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

ٹریکٹر دیوزتر برف میں جاتا تو ذرا نیچے ہوتا' اس کی رفتار بھی کم

ہوتی۔ اس سے نکلتا تو رفتار خود بخود بڑھتی۔ اس کے ردِعمل کے طور پر ہتھ گاڑی لرزنے لگتی تھی۔ ادھر میلوڈین میری بانہوں میں تھرتھرانے لگتا۔ میں اسے ایسے لپٹائے ہوئے تھا' جیسے میں نے بھیڑ کے سر کو لپٹایا تھا۔ اس طوفانی اندھیری رات میں میلوڈین کی حفاظت کرتے ہوئے مجھ پر اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کھلی۔ وہ بہت قیمتی بھی تھا.... اور بہت محبوب بھی۔ حتیٰ کہ وہ مجھے بھی محبوب ہوگیا تھا۔ ہم اسے اس کے گھر سے ہنکا رہے تھے۔ میلوڈین نے زندگی میں وہی ایک گھر دیکھا تھا۔ اس کی عمر ۸۰ سال تھی۔ وہ ایک فوجی کسان کا تحفہ تھا.... اپنی محبوب بیوی کے لیے اور اس بیوی نے اس میلوڈین کو بجانا سیکھا تھا.... اور اپنے ننھے بیٹے کو بھی سکھایا تھا۔ یوں یہ ایک بیٹے اور ایک باپ کے درمیان واحد قابلِ فہم رابطہ تھا۔ جبکہ باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

بیٹا بڑا ہوگیا۔ اس کی شادی ہوگئی۔ اس کی بیوہ ماں نے اپنی بہو کو بھی میلوڈین بجانا سکھادیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ممی نے بھی اپنے بچپن میں اس کے کی بورڈ پر اپنی ننھی ننھی انگلیاں تھرکائی ہوں گی۔ ان کے ننھے ننھے پیروں نے اس کے پیڈلوں کو دبا کر اوپر نیچے کیا ہوگا اور جب وہ بڑی ہوئی ہوں گی تو انہیں اس کی انسانی جذبات کے حوالے سے اہمیت اور اس کی تاریخی قدر و قیمت کے بارے میں معلوم ہوا ہوگا۔ ابراہیم اور سارہ' منصر اور ایلیا' میری ماں.... اور اب میں۔ یہ میلوڈین چار نسلوں کو ایک دوسرے سے ملا رہا تھا۔ ان کے درمیان تعلق جوڑنے والا رابطہ تھا اور اب نانی کی فرمائش پر نانا اس سے دستبردار ہو رہے تھے.... اسے چرچ کو بطور عطیہ دے رہے تھے۔

اب میں ٹھیک سے یاد نہیں کر سکتا کہ اس وقت مجھے یقین تھا یا نہیں مگر کرسمس کی اس رات اس بات کی اہمیت تھی بھی نہیں۔ میں دعا کر رہا تھا کہ ہم میلوڈین کو بحفاظت چرچ تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خدا اس پر ہم سے یقیناً خوش ہوگا۔

پھر ایک اور مشکل مرحلہ آگیا۔ اب ہمارے اور گاؤں کی سڑک کے درمیان ایک پہاڑی حائل تھی اور ہم اسے پار نہیں کر پا رہے تھے۔ آئل بل نے بہت کوشش کی لیکن چڑھائی بہت زیادہ اور بہت سیدھی تھی اور برف چار فٹ گہری تھی۔ انجن بند نہیں ہوا' پہیے گھومتے رہے۔

نانا نے ہینڈ بریک لگائے اور نیچے اتر گئے۔ "مجھے اسٹارٹ مل جائے تو ہم کامیاب ہوسکتے ہیں" انہوں نے کہا "بوجھ کم کرنا ہوگا۔"

ہم نے زنجیریں کھولیں' ہتھ گاڑی کو آزاد کر کے نیچے اتارا اور کچھ پیچھے لے گئے۔ نانا دوبارہ کیب میں سوار ہوئے۔ انہوں نے ٹریکٹر کو ریورس کیا۔ اسے کوئی تیس یا چالیس گز دور لے گئے پھر انہوں نے تھروٹل کھینچا' سیکنڈ گیئر لگایا اور ٹریکٹر پوری قوت سے آگے کی طرف چلا۔ وہ ریل کے پرانے انجن کی طرح چیختا چنگھاڑتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ برف کے نیچے دبے ہوئے پتھر اچھل رہے تھے۔ چنگاریاں اڑ رہی تھیں مگر بالآخر وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

میں دیوانہ وار تالیاں بجانے لگا۔

نانا نے ہینڈ بریک لگایا اور پلٹ کر نیچے آئے۔ ہم دونوں نے پھر کلائی پر زنجیر لپیٹی اور ہانپتے کانپتے ہتھ گاڑی کو اوپر کی طرف کھینچتے رہے۔ اوپر پہنچتے پہنچتے پھر ہماری سانس اکھڑ گئی مگر بالآخر ہم کامیاب ہوگئے۔

ہتھ گاڑی کو دوبارہ ٹریکٹر پر لاد دیا گیا۔

پہاڑی سے اترتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب روشنی نظر آئی۔ وہ شاید ہینشا کا مکان تھا۔ میرا خیال ہے' انہیں ہمارے ٹریکٹر کی آواز سنائی دے رہی ہوگی۔ اس وقت کے سناٹے میں تو ٹریکٹر کی آواز شاید پورے گاؤں تک پہنچ رہی ہوگی۔ جو ہینشا اور اس کی بیوی ابھی یقیناً اٹھ گئے ہوں گے۔

جیسے ہی ہمارا ٹریکٹر ہینشا کے گھر کے سامنے رکا' نانا نیچے اتر گئے "ہمارے لیے تازہ دم ہونا ضروری ہے۔" نانا نے کہا "اب یہ لوگ تو جاگ ہی گئے ہوں گے' مائنڈ نہیں کریں گے۔"

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ میرا بھی سردی سے بُرا حال تھا.... ان کی طرح۔ ہم منہ سے دھواں چھوڑتے ان کے گھر کی طرف چلے لیکن جیسے ہی ہم پورچ تک پہنچے' گھر کی بتیاں بجھادی گئیں۔ نانا نے دروازے پر دستک دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ نانا میرا ہاتھ تھام کر پورچ سے پیچھے چلے گئے۔ وہاں سے ہم بہتر طور پر آواز لگا سکتے تھے۔

مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ "یہ کیا بات ہے؟" انہوں نے جلتی ہوئی لائٹ بھی بجھادی۔"

"وہ شرمندہ ہوں گے۔ مقروض ہیں نا" نانا نے کہا "انہوں نے مجھے تھریشنگ کی اجرت اب تک نہیں دی ہے۔"

"تو آپ نے ان سے مطالبہ ہی کب کیا؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہینشا اپنا قرض احسن طریقے سے اتارنے کا قائل ہے۔ نہ اتار پائے تو منہ چھپاتا ہے۔"

"تو وہ مارے شرمندگی کے ہم کو یہیں جم کر مرنے دیں گے۔"

"یہ بہت غریب لوگ ہیں۔ معاشی بدحالی نے سب سے زیادہ انہیں ستایا ہے۔"

یہ بات مجھے معلوم تھی۔ گاؤں میں سبھی کو ان سے ہمدردی تھی۔ وہ بے اولاد تھے۔ ان کے پاس نہ مرغیاں تھیں' نہ کوئی اثاثہ۔ ایک گائے تھی ان کے پاس اور اسی ایکڑ تقریباً ناکارہ زمین۔ پتا نہیں' ان کا گزارہ کیسے ہو رہا تھا۔ بہرحال حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی ذاتی گاڑی میں چرچ جاتے تھے۔

"مجھے اس سے غرض نہیں" میں نے کہا "کرسمس کی رات

مہمانوں سے تو منہ نہیں موڑنا چاہیے۔"

"اس کی تکلیف بھی انہیں ہم سے زیادہ ہوگی اور ہم انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے ورنہ زندگی بھر یہ خود کو معاف نہیں کریں گے۔"

ہم انہیں آواز دیتے رہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نانا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دروازے پر لے گئے۔ انہوں نے پھر دستک دی۔ بالآخر چوتھی دستک پر روشنی ہوئی اور دروازہ کھلا۔ جو ہینشا نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا "معاف کرنا' ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ تم ہو" اس نے کہا "ہم سمجھے' طوفان کا شور ہے۔"

وہ کھلا جھوٹ بول رہا تھا... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' مجھے بہت بُرا لگا۔

اندر بھی اتنی ہی سردی تھی' جتنی باہر تھی۔ چولھے میں آگ کی لو نیچی تھی۔ نانا نے کہا بھی کہ ہم ذرا خود کو گرم کرنے کے لیے رکے ہیں۔ اس کے باوجود ان میاں بیوی نے آگ بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ مزید لکڑیاں ڈالنا تو درکنار' انہوں نے آگ کو کرید کر تازہ بھی نہیں کیا۔

کچن میں صرف دو کرسیاں تھیں۔ ہم دونوں ان پر بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا غصہ سرد پڑنے لگا۔ ایک تو وہ میاں بیوی میرے نانا نانی سے بھی زیادہ بوڑھے تھے۔ دوسرے ان کے گھر میں کرسمس ٹری بھی نہیں تھا' جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واقعی تباہ حال ہیں۔

نانا نے انہیں بتایا کہ ہم اتنی رات کو کس لیے نکلے ہیں تو انہوں نے نانا کو یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔

"اس سال میں نے ایلی کو کوئی تحفہ نہیں دیا" نانا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "ہم نے سوچا کہ صبح چرچ میں سرپرائز اس کے لیے تحفہ ہوگی" مگر یہ کہتے کہتے انہیں احساس ہو گیا کہ انہوں نے ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے کیونکہ ان دونوں نے بھی اس بار ایک دوسرے کو تحفے نہیں دیے تھے۔

وہ خاموش رہے۔ اسی خاموشی میں لمحے گزرتے رہے اور ہم سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ بات کرنے کے لیے بھی کوئی موضوع نہیں تھا پھر نانا نے کہا "جو..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں..... دیکھو..... ہم تیس سال سے اچھے پڑوسی ہیں..."

"مم..... میں..... میں شرمندہ ہوں" جو ہکلایا۔

"مجھے بات پوری کرنے دو جو" نانا نے کہا "مجھے تھریشنگ کی اُجرت کسی نے بھی نہیں دی اور مجھے اس کی امید بھی نہیں۔ کم از کم فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔"

"لیکن دنیا کا کام پیسے ہی سے چلتا ہے" جو بولا۔

"خیر..... میرا کام اس کے بغیر بھی چل رہا ہے۔ میں اسے بھولا ہوا ہوں..... اچھا وقت آنے تک۔"

"میں اپنا قرض وقت پر چکانے کا قائل ہوں۔"

"میں یہ بات جانتا ہوں۔ تمہاری بڑی قدر ہے میرے دل میں۔"

"میں جب چھوٹی تھی تو پاپ کارن بہت کھاتی تھی۔ اب تو ملتی ہی نہیں" ایبی نے کہا۔

"سب کا ہی بُرا حال ہے" میرے نانا بولے۔

"آپ اگر مشکل میں ہیں جناب تو حکومت سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے" میں نے جو ہینشا سے کہا۔

"اس ذلت کے مقابلے میں مجھے مرجانا قبول ہے" جو نے کہا۔

"میں جب چھوٹی تھی تو میرے پاس جھالر والے ملبوسات تھے" ایبی بولی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"مگر یہ آپ کا حق ہے' اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

نانا نے جلدی سے کہا "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ابھی ہمارا کام پورا نہیں ہوا ہے" پھر وہ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائے "آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ نے مسافروں کو ٹھکانا فراہم کیا۔ صبح چرچ میں ملاقات ہوگی۔ میری کرسمس۔"

"یہ میری شادی والے دن کا لباس ہے" ایبی نے کہا۔

ہم جلدی سے باہر نکل آئے۔ ہم ٹریکٹر کے پاس پہنچے تو میں نے نانا سے پوچھا "یہ ایبی کا کیا چکر ہے؟ کچھ کھسکی ہوئی ہیں کیا؟"

"کبھی وقت بھی آدمی کو کھسکا دیتا ہے۔"

"میں تو اب بھی ویسا ہی ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہوں۔"

"لکڑی بہت مہنگی ہے بیٹے۔ میں نے جو کو کچھ لکڑی دینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے نہیں لی۔"

مجھے نانی کی سنائی ہوئی ممی کی کہانی یاد آگئی "یہ تو وہی نارنگیوں والا معاملہ ہے۔"

"ہاں بیٹے۔ عزت اور وقار بڑی چیز ہوتی ہے اور کوئی ضرورت ایسی نہیں ہوتی' جو پوری نہ ہو تو آدمی مرجائے۔"

ہم ٹریکٹر پر سوار ہو گئے۔ نانا کیب میں اور میں میلوڈین کے پاس۔ سفر پھر شروع ہو گیا۔ برف باری اب بھی ویسے ہی ہو رہی تھی' کبھی بھی نہیں رکے گی۔

○☆○

اب سفر ہموار تھا۔ ہم گاؤں کی سڑک پر تھے۔ نانا ڈرائیو کر رہے تھے۔ لالٹینیں جھول رہی تھیں۔ ہتھ گاڑی اِدھر اُدھر کھسک رہی تھی۔ میلوڈین میری آغوش میں محفوظ تھا۔ ہم کوئی چوتھائی میل چلے ہوں گے کہ دائیں جانب پھر روشنی نظر آئی۔ وہ اسٹیکیل فیملی کا مکان تھا۔ یہ طے تھا کہ ہمارے وہاں سے گزرنے سے پہلے ہی ہینشا فیملی کی طرح کلائیڈ اور کیٹی بھی جاگ جائیں گے۔

ٹریکٹر رکا تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا "اب کیا ہوا نانا!"

نانا کیب سے اتر گئے "میں بہت تھک گیا ہوں اور سردی سے نڈھال بھی ہوں" نانا نے اپنے ہاتھ بغلوں میں چھپاتے ہوئے

کہا "بہتر ہے کچھ دیر آرام کرلیں۔"

میں بے صبرا ہو رہا تھا۔ اگر ہم اسی طرح رکتے اور آرام کرتے رہے تو سروس کے بعد ہی چرچ تک پہنچیں گے اور اسٹیکیبل کے ہاں رکنے میں مجھے ویسے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تھکا ہوا نہیں تھا۔ لہٰذا نانا کی تھکن بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

مگر مکان کی طرف بڑھتے ہوئے گھٹنوں گھٹنوں برف میں نانا لڑکھڑائے اور مجھے انہیں سہارا دینا پڑا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ نانا میں بالکل جان نہیں رہی ہے۔

اس بار ہمارا اچھی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ کیٹی اسٹیکیبل نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گئی پھر اس نے سبز چائے کے لیے پانی چولھے پر رکھ دیا۔

"ہمیں اس طرح زحمت دینے پر شرمندگی ہے" نانا نے کہا۔ "ارے.... کلائیڈ کہاں ہے؟"

"انہیں سردی کے ساتھ بخار ہوا ہے۔ کھانسی بھی بہت ہے۔ میں ان کی پیشانی پر سرسوں کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ پٹی رکھتی ہوں تو بری طرح چیختے ہیں۔ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ کرسمس کے موقع پر یوں بیمار ہوگئے" کیٹی نے کہا۔

"واقعی.... یہ تو محرومی ہے۔ خیر تم پٹیاں رکھتی رہو۔ خواہ وہ کتنا ہی چیخے" نانا نے کہا اور لائن سے بیٹھی ہوئی کیٹی کی بیٹیوں کی طرف مڑے "گڈ ایوننگ ینگ لیڈیز۔ تم میرے نواسے حارث کو جانتی ہو؟"

وہ چاروں کھی کھی کرکے ہنسنے لگیں۔ میرے جسم میں گرمی بھرنے لگی۔ جن چار وجوہات کے تحت میں اس مکان میں ٹھہر کر آرام نہیں کرنا چاہتا تھا' وہ وہی چاروں تھیں۔ کلائیڈ اور کیٹی نے جب بھی بیٹے کی آرزو کی' انہیں ایک عدد بیٹی ملی۔ چار آرزوؤں کے بعد انہوں نے ہار مان لی۔ ان چاروں کے نام بالترتیب اگنس' فرانسس' ڈولورز اور گرٹروڈ تھے۔ ان کی عمریں چودہ' گیارہ' نو اور چھ سال تھیں اور وہ سیڑھیوں پر ایسے بیٹھی تھیں جیسے پہلی دوسری' تیسری اور چوتھی پوزیشن پانے والی کھلاڑی ہوں اور انعامات کے لیے بیٹھی ہوں۔ وہ میرے ہی اسکول میں پڑھتی تھیں لہٰذا ان سے مفر ممکن نہیں تھا۔

ان لڑکیوں کو ناپسند کرنے کے باوجود میں ان کی ماں کو پسند کرتا تھا۔ وہ سرخ چہرے والی پستہ قامت اور فربہ اندام خاتون تھی۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی اور وہ مہمان نوازی کے آداب سے واقف تھی۔

کیٹی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے میرے نانا سے پوچھا۔ "یہ تو بتائیں کہ ایسی طوفانی رات میں آپ ٹریکٹر لیے کیوں پھر رہے ہیں؟"

نانا نے انہیں وجہ بتائی۔

کیٹی کے رخسار خوشی سے دہک اٹھے "میں نے زندگی میں ایسا سچا اور اچھا جذبہ اور عمل پہلے نہیں دیکھا۔ چرچ کے لیے آرگن کا تحفہ اور وہ بھی کرسمس کے موقع پر۔ کل صبح ایلیا کا چہرہ خوشی سے کیسا تمتما رہا ہوگا۔ کیوں میری بچیو' ہے نا شاندار بات۔"

چاروں لڑکیاں چابی سے چلنے والی گڑیوں کی طرح سر ہلانے لگیں۔

"منصر' آپ نے کمال کردیا۔ میں آپ کو پیٹ بھر سبز چائے پلاؤں گی" یہ کہہ کر کیٹی کچن میں چلی گئی۔

میں لڑکیوں سے گفتگو سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لینے لگا پھر میں نے کرسمس ٹری کا معائنہ کیا اور پھر قالین کے ڈیزائن پر غور کرنے لگا۔ آخر میں جائزہ لینے کے لیے چھت کے سوا کچھ نہیں بچا تو میں نے منہ اٹھایا اور چھت کو گھورنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ لڑکیاں مجھے گھور رہی ہیں۔

یہ بات نہیں کہ میں بے وقوف یا شرمیلا ہوں۔ شہر میں کئی لڑکیوں سے میری دوستی تھی۔ مگر وہ پرکشش' فیشن ایبل اور ذہین لڑکیاں تھیں.... بے شمار خوبیوں سے آراستہ.... جبکہ یہ گاؤں کی لڑکیاں بس شریر تھیں۔ چالاک بھی تھیں۔ میں کئی بار ان کی چالاکیوں اور شرارتوں کا نشانہ بن چکا تھا۔

"یہ چائے پیجیے منصر" کیٹی چائے لے آئی تھی "منصر؟"

ہم نے نانا کی طرف دیکھا مگر وہ دیوان پر دراز ہوکر سو چکے تھے۔ ان کا سر سرہانے پر ٹکا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا اور وہ پُرشور آواز میں سانسیں لے رہے تھے۔

کیٹی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا اور ہمیں اپنے ساتھ کچن میں چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم کچن میں پہنچے تو اس نے دروازہ بند کرلیا "لو حارث بیٹے' یہاں بیٹھ کر چائے پی لو" اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ "میں نہیں چاہتی کہ تمہارے نانا کی نیند خراب ہو۔"

میں کچن ٹیبل کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سبز چائے مجھے ناپسند تھی مگر اگنس' فرانسس' ڈولورز اور گرٹروڈ کے مقابلے میں قابلِ قبول تھی۔ وہ چاروں بھی میز کے گرد بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے کہنیاں میز پر ٹکائی ہوئی تھیں اور ٹھوڑیاں ہاتھوں کے پیالے میں رکھے مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے میں عجوبہ ہوں۔

کیٹی نے برقی چولھا جلادیا تاکہ گرمی ہوجائے پھر وہ کاؤنٹر کے قریب کھڑی مجھے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ میں چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ بیڈ روم کی طرف مسٹر اسٹیکیبل کے زور زور سے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ دوسری طرف سے ٹریکٹر کے انجن کی کھانسی کی آواز آرہی تھی۔

"تمہارے نانا بہت تھک چکے ہیں۔ نڈھال ہوگئے ہیں" کیٹی نے کہا "انہیں نیند کی ضرورت ہے۔"

"جی مادام!"

"ان کی عمر اور صحت کے لیے یہ موسم اور یہ رات بہت

خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جو کام تم کر رہے ہو' بہت عظیم ہے لیکن تمہارے نانا کی صحت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تم میری خاطر ایک کام کر سکتے ہو حارث!"

"جی مادام!"

"انہیں سونے دو اور جب یہ جاگیں تو انہیں گھر جانے پر آمادہ کرو۔ آرگن صبح کے وقت چرچ پہنچایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں.... نہیں.... یہ تو ممکن نہیں۔"

"کیوں؟"

"پھر سرپرائز نہیں رہے گی" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔ "آپ کو اندازہ نہیں کہ کتنی دشواریوں اور خطرناک مرحلوں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔"

"اوہ.... یہ بات ہے۔ کلائیڈ کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ تمہارے ساتھ چلے جاتے اور میں کلائیڈ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی" کیٹی نے کہا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد اچانک بولی "یہ بتاؤ' تم ٹریکٹر چلا سکتے ہو؟"

"میں نے پہلے کبھی چلایا تو نہیں لیکن دیکھتا رہا ہوں۔"

"تو سنو۔ ڈننگز فیملی یہاں سے آدھا میل دور رہتی ہے۔ میں فون کر کے اوٹس کو کہتی ہوں' وہ تمہیں چرچ کے پاس مل جائے گا اور تمہاری مدد کر دے گا۔ اپنے نانا کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نانا کی صحت کے معاملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لیکن مشن اس مرحلے میں نامکمل چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا جبکہ ہم کامیابی کے اتنا نزدیک پہنچ چکے تھے۔ یہ نانی کی فرمائش تھی' جسے پورا کرنے کی ضد نانا کے دل بچے نے کی تھی اور میں پوری طرح ان کے ساتھ تھا۔

سو میں ہچکچا رہا تھا۔ میلوڈین مجھ اکیلے کے بس کا نہیں تھا۔ اوٹس ہاتھ بٹا سکتا تھا لیکن پھر نانا رہ جاتے۔ بہرحال آخر میں اس بات کی اہمیت رہتی بھی نہیں ہے کہ کام کس نے نمٹایا "میرا خیال ہے' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی "شکریہ حارث۔ اچھا' میں اوٹس کو فون کرتی ہوں۔"

وہ فون کے لیے ڈائننگ روم میں گئی۔ میں نے چائے ایک طرف ہٹا دی۔ "تمہیں چائے اچھی نہیں لگی؟" فرانسس نے پوچھا۔

"نہیں تو' اچھی لگی۔ اچھی لگتی ہے۔"

"جھوٹا کھوٹا۔ بے پیندے کا لوٹا" ڈولورز نے تبصرہ کیا۔

"یہ عرب کا شیخ ہے" اگنس بولی۔

"کوئی کچھ کھایا پی رہا ہو تو اسے اس طرح گھورنا نہیں چاہیے" میں نے نصیحت کی۔

"اور کرسمس کی رات دیر سے لوگوں کے گھر جانا اور سانتا کلاز کی آمد میں خلل ڈالنا بھی بری بات ہے" گرٹروڈ نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"تم سب سے چھوٹی ہو۔ نانی دادی مت بنو" میں نے کہا۔

"اور سانتا کلاز سچ مچ تھوڑا ہی ہوتا ہے" فرانسس بولی۔

"یو شٹ اپ" ڈولورز اس پر الٹ پڑی "گرٹروڈ کو یہ بات معلوم نہیں۔ وہ ابھی چھوٹی ہے۔"

اسی وقت کیٹی واپس آ گئی "اوہ ڈیئر.... میرا خیال ہے' فون کی لائنیں خراب ہو گئی ہیں' اب.... اب کیا کریں؟"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ جملہ.... اب کیا کریں.... نہیں.... اب کیا کروں میں.... ہونا چاہیے اور جواب اس کا یہ ہے کہ میں جا رہا ہوں مگر یہ بات بے حد اعتماد سے بااختیار انداز میں کہنی تھی چنانچہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کندھے پھیلائے اور سینہ ابھارا اور کہا "مسز اسٹیکیبل...."

"میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اگنس نے اعلان کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور میرا دماغ خالی ہو گیا۔

"نہیں.... تم نہیں جا سکتیں" کیٹی نے کہا۔

"یہ بہت دبلا ہے۔ بھاری آرگن اکیلے نہیں اٹھا سکتا۔"

"میں بھی جاؤں گی" فرانسس نے چیخ کر کہا۔

"اور میں بھی" ڈولورز چلائی۔

"ممی' میں بھی جاؤں گی" سب سے چھوٹی گرٹروڈ کے بھی پر نکلے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے" میں نے بلند آواز میں احتجاج کیا "میں یہ کام اکیلا کر سکتا ہوں۔ چڑیوں کا غول لے کر میں...."

"حارث!" کیٹی نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ "حارث.... یہ برا آئیڈیا نہیں۔ میری بچیاں مضبوط ہیں اور تم اتنے بڑے بھی نہیں ہو کہ تنہا یہ سب کچھ کر سکو۔ چرچ اب دو میل دور ہے۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا "بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں انہیں تیار کر دیتی ہوں۔ تمہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ واپسی میں بچیوں کو یہاں چھوڑنا اور اپنے نانا کو گھر لے جانا۔"

"ہم ضرور جائیں گے" اگنس مسکرائی۔ اسے اپنی فتح کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"ہم جائیں گے' ہم جا رہے ہیں" دوسری تینوں بہنیں بھی خوش ہو گئیں۔

مجھے احساس ہوا کہ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ یہ احساس سیمسن سے لے کر ہر اس مرد کو ہوتا رہا ہے' جس پر صنفِ نازک مسلط ہو جاتی ہے "لیکن مسز اسٹیکیبل...." میں نے کمزور آواز میں احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"شش.... منصر کو نہ جگا دینا۔ شور مت کرو" کیٹی نے اپنی بیٹیوں کو اشارہ کیا پھر وہ میری طرف مڑی "دیکھو حارث' تم ایک

بہت بڑا کام کررہے ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں انہیں کبھی نہ بھیجتی لیکن تمہاری نانی سے مجھے بہت محبت ہے اور یہ ان کی خواہش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمیں بھی اس سعادت میں شریک کرلو۔"

"جی... بہت بہتر" میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ میں پریشان ہوگیا۔ نانا نڈھال تھے اور ناقابل برداشت لڑکیوں کا ایک گروہ اسے ایڈونچر سمجھ کر اس میں شریک ہورہا تھا۔ یہ بہت خراب صورتِ حال تھی مگر میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

کیٹی نے بیٹیوں کو لباس تبدیل کرنے کے لیے اوپر بھیجا اور ایک جار میں سے گھر میں بنے ہوئے بسکٹ نکالے اور پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھائے "مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں نے اسی لیے بچیوں کو ہٹادیا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ میری طرح بھاری ہوں لیکن تمہاری ہڈیوں کو بہرحال اپنے اوپر گوشت کی ضرورت ہے" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "یہ لڑکیاں بہت شریر ہیں۔ ہاتھ بٹائیں گی تو شاید کچھ بردباری آئے گی ان میں۔ تم انہیں ذرا کھینچ کر ہی رکھنا۔ واضح کردینا کہ انہیں تمہارے حکم کی تعمیل کرنی ہے ہرحال میں۔"

بسکٹ بہت خوش ذائقہ تھے مگر میری زبان پر مزہ صرف مایوسی کا تھا۔

"تمہیں اپنے ممی ڈیڈی تو بہت یاد آئے ہوں گے آج؟"

میرا منہ بسکٹ سے بھرا ہوا تھا... میں نے اثبات میں سرہلادیا۔

"یہ اچھا ہوا کہ تمہاری ان سے فون پر بات ہوگئی۔"

اب کے میں انہیں حیرت سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

وہ مسکرائی "گھبراؤ نہیں۔ ہم نے تمہاری گفتگو تھوڑا ہی سنی ہے... باقی سب گاؤں والوں کو یہ بات معلوم تھی کہ بلغراد سے تمہارے لیے فون آئے گا۔"

اسی وقت سیڑھیوں پر ہونے والی دھمک نے اعلان کیا کہ لڑکیاں نازل ہونے والی ہیں۔ کیٹی نے سر اٹھا کر دیکھا اور مجھ سے آہستہ سے بولی "حارث، موقع ملے تو اپنے نانا کو بتانا کہ تھریشنگ کی ادائیگی نہ کرنے پر ہم ان سے شرمندہ ہیں۔ کلائیڈ ہروقت اس بات پر کڑھتا رہتا ہے مگر فی الوقت ہم کچھ کرہی نہیں سکتے۔ کہہ دوگے نا بیٹے؟"

میں نے بسکٹ نمٹادیے تھے "جی مادام... کہہ دوں گا۔"

"کچھ اس وجہ سے بھی میں لڑکیوں کو بھیج رہی ہوں۔ پیسے نہ سہی مگر ضرورت کے وقت مدد تو کی جاسکتی ہے۔"

"جی شکریہ!"

لڑکیاں نیچے آگئیں۔ کیٹی ان کا معائنہ کرنے لگی "ہاں ٹھیک ہے" وہ بولی "اب تم جاکر کرسمس ٹری سے اپنے تحفے یہاں لے آؤ، جلدی کرو۔"

"تحفے؟ سانتا کو تو موقع ہی نہیں ملا آنے کا؟" چھوٹی گرٹروڈ نے اعتراض کیا۔

"ارے... وہ پہلے ہی آگیا ہوگا۔ جب ہم لوگ سو رہے تھے" کیٹی نے کہا۔

لیکن گرٹروڈ آسانی سے قائل ہونے والی نہیں تھی "مگر میں تو سوئی ہی نہیں اور میں نے اسے آتے بھی نہیں دیکھا۔ قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی۔"

"اب اس کے لیے پریشان نہ ہو۔ تحفے لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

وہ تینوں دبے قدموں ڈرائنگ روم میں گئیں اور واپس آگئیں۔ ان کے ہاتھوں میں تحفوں کے ایک جیسے پیکٹ تھے۔

"اب انہیں کھولو" ان کی ماں نے حکم دیا۔

انہوں نے پیکٹ کھولے۔ ہر پیکٹ میں ربر کے لمبے جوتے تھے جو سردیوں میں پہنے جاتے ہیں۔

"واہ بھئی... سانتا کلاز کو پتا ہوتا ہے کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے" کیٹی نے کہا۔

"جوتے!" اگنس بولی۔

"جوتے!" فرانسس نے دہرایا۔

"واہ!" ڈولورز نے تبصرہ کیا۔

"مگر میں نے تو گڑیا مانگی تھی" گرٹروڈ نے احتجاج کیا۔

کیٹی کا منہ بن گیا "شکر کرو خدا کا۔ لاکھوں بچیاں ایسی ہوں گی جنہیں کرسمس ٹری کے نیچے کوئی تحفہ نہیں ملا ہوگا۔ میرا خیال ہے، جیسے ہم سب کے لیے یہ کڑا وقت ہے، ویسے ہی سانتا کلاز کے لیے بھی ہے۔ اچھا اب انہیں پہنو اور اپنے کوٹ پہنو پھر ٹوپیاں سر پر رکھو۔ جلدی کرو، حارث پریشان ہے۔ تمہیں چھوڑ ہی نہ جائے۔"

وہ چاروں یہ سنتے ہی تیزی سے چلی گئیں "تم بڑے پیارے ہو حارث۔ ہمیں بھی بیٹے کی بڑی آرزو تھی" کیٹی مجھ سے مخاطب ہوئی "مجھے اپنی بیٹیوں سے بہت محبت ہے مگر ایک بڑا بیٹا ہوتا تو وہ ان کی رہنمائی کرتا نا۔"

لڑکیاں تیار ہوکر آگئیں۔ ٹوپیاں انہوں نے آنکھوں کے اوپر تک کھینچ لی تھیں اور مفلر آنکھوں کے نیچے تک چڑھالیے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی سبز چائے کی دوسری پیالی ملنے پر ہوسکتی تھی۔

کیٹی نے اپنے دستے کا معائنہ کیا "دستانے لے لیے تم نے؟"

چار سر اوپر نیچے ہلنے لگے۔

"اور سن لو۔ حارث انچارج ہے تم سب کا۔ کسی نے اس کا حکم نہ مانا تو چمڑی اتار دوں گی اس کی۔ سمجھ گئیں۔"

چاروں سر پھر ہلنے لگے۔

"اور سنو... شاید آج کی رات تمہیں کرسمس کے بارے میں بہت کچھ سکھانا چاہتی ہے۔ کرسمس کا مطلب صرف لینا نہیں، دینا

بھی ہے۔ دینے میں اصل خوشی ہے۔ حارث کو اور اس کے نانا کو دیکھو' یہ مسلمان ہیں مگر کرسمس کے موقع پر اتنی تکلیف اٹھا کر چرچ کو تحفہ دے رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آج تم مثالی کام کرو۔ مدد کرو' بدتمیزی بالکل نہ ہو' ٹھیک ہے؟"

ان چاروں نے بڑی شدت سے سر ہلائے۔ ماں نے باری باری لپٹا کر انہیں پیار کیا پھر دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ کرسمس کی سرد اور طوفانی رات میں اتنی دیر کو اپنی بچیوں کو کہیں بھاری کام کے لیے بھیجنا کسی ماں کے لیے بھی آسان نہیں ہو سکتا "اب تم جاؤ۔ اور منصر کی نیند خراب نہ ہو۔ میں تمہارے پاپا کو اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گی' جب تک تم خیریت سے واپس نہ آجاؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ اچھا حارث' ان کا خیال رکھنا بیٹے!"

"جی ضرور" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

ہم دبے پاؤں ڈرائنگ روم سے گزرے۔ نانا خراٹے لے رہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ انہیں جگا کر ان سے معذرت کروں۔ ایک اعتبار سے میں ان سے غداری کر رہا تھا مگر مجبوری تھی۔

کیٹی نے دروازہ کھولا اور پورچ تک آئی۔ باہر برف باری اور ہوا کی وہی کیفیت تھی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ محبت بھری مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لیے اور میرے کان میں بولی "حارث۔ لارڈ تمہارا گلہ بان ہو' جاؤ۔"

"شکریہ مادام!" میں نے کہا۔

○☆○

رملے آئل پل ماڈل ۴۰-۲۰ ٹریکٹر کو میں آج تک دنیا کا سب سے شاندار ٹریکٹر سمجھتا ہوں۔ اس رات اس نے وہ کچھ کر دکھایا جو دنیا کی کوئی گاڑی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر توقع پر پورا اترا۔ جو ہم نے چاہا' اس نے کر دکھایا..... اور وہ بھی تھوڑے سے مٹی کے تیل..... اور تھوڑی سی خوش اعتقادی کے عوض۔ میں نے اسے چلایا۔ جبکہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔

میں نے تھروٹل اوپر کیا۔ نچلا گیئر لگایا۔ پہیے گھومے..... اور دھواں اگلتا ٹریکٹر پھر تاریک رات کا سینہ چیرتا آگے بڑھنے لگا۔

عقبی حصے میں ہتھ گاڑی تھی۔ اس پر میلوڈین لدا تھا۔ فرانسس' ڈولورز اور گرٹروڈ میلوڈین کو لپٹائے بیٹھی تھیں۔ اگنس نے یہ میرا پہلا ہی حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کیب میں چڑھ گئی تھی اور آرگن کی بینچ پر میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اگر وہ لڑکا ہوتی تو میں اس کی اتنی مرمت کرتا کہ وہ تابع داری پر مجبور ہو جاتی مگر وہ لڑکی تھی..... اور مجھ سے لمبی بھی اور بھاری بھی تھی اور وہ تھی بھی آٹھویں جماعت میں۔ چنانچہ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خود کو یہ تسلی دیتا رہا کہ میں نے اس پر رحم کھا کر ایسا کیا ہے۔ وہ طبعاً تھی ہی ایسی بدتمیز کہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔

میں اس کے بارے میں بری بری باتیں نہایت ہمدردی سے سوچتا رہا۔ اس کے ہاتھوں پر خشکی کی تہ تھی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اور اگنس اسٹیکیبل جیسا نام بھی اس نے خود نہیں رکھا تھا۔ اب تو اسے اسی نام کے ساتھ مرتے دم تک جینا تھا اور یہ طے تھا کہ اس بے چاری کی کبھی شادی نہیں ہوگی۔ ہر اعتبار سے وہ ہمدردی کی مستحق تھی۔ اور سب سے قابلِ رحم بات یہ تھی کہ وہ مجھ پر مرمٹی تھی۔ یہ ایک بے سود عشق تھا کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دنیا سے رخصت ہوں گا تو اپنے پیچھے بے شمار ٹوٹے پھوٹے دل چھوڑ کر جاؤں گا۔

اب سڑک چوڑی تھی۔ ہم داہنی جانب مڑے تو ہتھ گاڑی نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ اب راستے میں کوئی پہاڑی نہیں تھی اور فاصلہ بمشکل دو میل کا تھا۔

سلنڈر پوری طرح گرم تھے اور میں شاید اونگھ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ایک بہت جسیم اور خوب صورت مشکی گھوڑے پر سواری کر رہا ہوں اور میرا رخ اسٹرابری کے باغات کی طرف ہے۔ میں نے نیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ میں زبردست اور خوب صورت جوان نائٹ تھا۔ مجھے اپنے پرچم کی لاج رکھنی تھی۔ ملک کا وقار بلند کرنا تھا۔ غلاموں کو آزاد کرانا تھا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں میری بیوی سارہ بھی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے خط میری جیب میں موجود تھے۔ وہ کتنی حوصلے والی تھی۔ اس نے مجھے جنگ پر جانے کے لیے کیسی بہادری سے رخصت کیا تھا۔ اس نے مجھے بیٹے کے متعلق بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائے۔ بعد میں اس نے مجھے خط لکھ کر اس کے متعلق بتایا تھا۔ اس کا نام اس نے منصر رکھا تھا۔ میلوڈین وہ بجاتی تھی اور میرے بیٹے کو بھی سکھا رہی تھی۔ میں اسے اور اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ میں اپنے بیٹے کی دھنیں سننا چاہتا تھا۔ اسے میلوڈین بجاتے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی روز دشمن کی گولی میرے سینے میں اتر جائے گی۔ میں اس سے بے خبر' اپنے گھوڑے پر سوار بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلا رہا ہے پھر ایک زہریلی آواز سنائی دی "او گدھے' ٹریکٹر کو سڑک سے نیچے کیوں اتار رہے ہو۔ ڈفر۔"

میں یوں اچھل کر جاگا کہ میرا سر کیب کی چھت سے ٹکرا گیا۔ اگنس کی بانہوں نے مجھے جکڑا ہوا تھا اور ٹریکٹر ایک خودمختار عفریت کی طرح دائیں جانب جھکتا جا رہا تھا۔

میں نے جلدی سے وہیل گھمایا اور ٹریکٹر کو بائیں جانب لایا۔ ٹریکٹر کو سڑک پر لا کر میں نے سکون کی سانس لی کہ مجھے اگنس کے پنجوں سے رہائی ملی مگر اسی لمحے ایک اور افتاد آپڑی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

دراصل برف باری اچانک ہی اور تیز ہو گئی تھی۔ لالٹینوں کی روشنی اس کی وجہ سے بالکل ناکافی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے تھروٹل کو پیچھے کھینچا اور ہینڈ بریک بھی استعمال کیا۔ ٹریکٹر رک گیا۔

"کیا مصیبت ہے" اگنس غرائی۔
میں نے دونوں لالٹینیں بکس سے اتاریں اور اس کی طرف بڑھائیں "نیچے اترو" میں نے چیخ کر کہا "تم اور فرانسس انہیں لے کر آگے آگے چلو تاکہ مجھے سڑک کا پتا چلتا رہے۔"
"اور تم ہم پر سے ٹریکٹر گزار دو۔ یہ تو کسی قیمت پر نہیں ہوگا" اگنس نے ٹکا سا جواب دیا۔
"تمہیں اپنی ماں کی بات یاد نہیں؟"
"مما یہاں موجود نہیں ہیں۔"
"اور تمہیں کرسمس کا جو مطلب سمجھایا گیا تھا؟"
"سب فضول بات ہے۔ عمل کے وقت پتا چلتا ہے۔"
میں پریشان ہوگیا۔ میں نے اخلاق' قانون' مذہب اور جذبات.... سب کچھ آزما دیکھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اب ایک فریب کا ہی حربہ رہ گیا تھا۔ بادل ناخواستہ میں نے وہ بھی آزما ڈالا "دیکھو اگنس' تم مجھے پسند کرتی ہو۔ تردید مت کرو۔ میں جانتا ہوں اور میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اگر تم اس وقت تعاون کرو تو اور زیادہ پسند کرنے لگوں گا۔"
"کتنا زیادہ؟" اس نے پرچون کی دکان کھول لی۔
اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حضرت آدمؑ نے بھوک سے مجبور ہو کر ممنوعہ پھل نہیں کھایا تھا بلکہ وہ خود کو پاگل ہونے سے بچانا چاہتے تھے "بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اتنا زیادہ کہ دنیا میں کسی نے کسی کو اتنا پسند نہیں کیا ہوگا۔ بس حد ہو جائے گی پسندیدگی کی۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔
اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اگنس نے کیب سے چھلانگ لگادی اور پیچھے سے فرانسس کو بھی اتار لیا۔ دونوں نے ایک ایک لالٹین لی اور اپنے درمیان ٹریکٹر کی چوڑائی جتنا فاصلہ رکھ کر آگے آگے چلنے لگیں۔ میں نے ہینڈ بریک کو آزاد کیا اور چیخ کر کہا۔
"لالٹینیں اوپر کرو۔"
آخری ایک میل کا فاصلہ ہم نے اس طرح طے کیا۔ چھوٹی دو لڑکیاں آرگن کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ بڑی دونوں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا احسان مند تھا۔ بے انصافی تو نہیں کی جا سکتی۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کم از کم دس درجے نیچے تھا۔ ایسے میں ان بے چاریوں کا کیا حال ہوگا اور کہیں برف اتنی گہری تھی کہ اگنس اور فرانسس لڑکھڑا جاتیں۔ ان کی رفتار کم ہو جاتی۔ وہ رک بھی جاتیں.... اور مجھے ٹریکٹر روکنا پڑتا پھر وہ اس دشوار حصے سے گزر کر مجھے اشارہ کرتیں اور میں ان کی لالٹینوں کی زرد روشنی کے اشارے پر آگے بڑھتا۔
لیٹی دیکھتی تو اپنی بیٹیوں پر بجا طور پر فخر کرتی۔ سردی' اندھیرے میں اور دشوار راستے پر دو میل فی گھنٹا کی رفتار سے برف پر بھاگتے ہوئے وہ کرسمس کی روح کو صحیح معنوں میں سمجھ رہی تھیں۔ یہ الگ بات کہ اگنس کو تحرک روحانیت نے نہیں' رومان نے فراہم کیا تھا۔
یہ وہ سڑک تھی' جس پر روز چل کر ہم اسکول جاتے تھے۔ جب کارنر آگیا۔ چرچ کے عقب میں عیسائیوں کا قبرستان تھا اور اس کے پیچھے اسکول کی عمارت تھی۔ لالٹینوں کے پیچھے چلتے' وہیل گھماتے میں نے ٹریکٹر کو سڑک پر سے اتارا اور نیم دائرے میں سفر کرتا دو بڑے درختوں کی طرف چلا کیونکہ وہ جگہ بلندی پر تھی اور چرچ کے قد مچے بھی وہاں سے قریب تھے۔
ٹریکٹر روکنے کے بعد ایک لمحے میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے ہینڈ بریک سیٹ کیا' انجن کو رننگ کنڈیشن میں چھوڑا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے ہینچ اتاری اور اسے ستواں چھت کے نیچے رکھ دیا۔
اب میں ہتھ گاڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ ڈولورز اور گرٹروڈ نے آرگن سے ہاتھ ہٹالیا تھا۔ اگنس اور فرانسس پیچھے سے ہانپتی ہوئی آرہی تھیں.... میں نے انہیں دور رہنے کو کہا اور میلوڈین کو رسیوں کی بندش سے آزاد کر دیا۔ میں نے چرچ کی سیڑھیوں پر تختے اس حساب سے بچھائے کہ میلوڈین کے پہیے ان پر آجائیں۔
پھر میں نے لڑکیوں کو پکارا "سنو بھئی' تم لوگوں نے زبردست کام کیا ہے۔ اب غور سے سنو۔ ایک مرحلہ اور ہے۔ میلوڈین کو چڑھانے کے لیے ایک طرف سے اٹھانا ضروری ہے پھر دوسری طرف سے اٹھا کر تختوں پر رکھنا اور اس کے بعد نیچے سے دھکیلنا ہے۔"
"مجھے تو نیند آرہی ہے" ڈولورز نے اعلان کیا۔
"میں سردی سے ٹھٹھر گئی ہوں" یہ فرانسس تھی۔
"یہ ہمارے بس کی بات نہیں" اگنس نے کہا۔
"میں گھر جانا چاہتی ہوں" ننھی گرٹروڈ بولی۔
"ابھی چلی جاؤ گی" میں نے کہا اور میلوڈین کی طرف بڑھا۔ اس پر ڈھکے ہوئے کمبلوں پر بہت برف جمع تھی۔ میں نے اسے جھاڑ کر بوجھ ہلکا کیا "اب آجاؤ جلدی سے۔ شاباش' اسے یہاں سے پکڑو۔"
میں کنارہ پکڑے کھڑا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے وہاں جمع ہوئیں۔ "پکڑو.... اور اٹھاؤ" میں نے کہا۔
میں نے زور لگایا۔ ایک لمحے بعد ان کا زور بھی شامل ہوا۔ میلوڈین تختوں پر لٹکا دیا گیا۔
میں سیدھا کھڑا ہوا "اب ایک طرف سے دھکیلنا اور ایک طرف سے اٹھانا ہے" میں نے کہا "گرٹروڈ' تمہیں دیکھنا اور خیال رکھنا ہے کہ آرگن تختوں سے نیچے نہ کھسکے اور تم تینوں اسے اٹھا کر اوپر دھکیلو۔"
اس مرحلے پر میلوڈین بالکل سیٹ کر دیا گیا۔ اب اوپر چڑھاتے کا دشوار مرحلہ سامنے تھا۔

ہم زور لگاتے رہے لیکن سیڑھیوں کی اونچائی کی وجہ سے زاویہ بہت خطرناک تھا۔ ہم اس حد تک میلوڈین کو اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ ڈھائی سو پاؤنڈ وزن کو بیک وقت اونچائی تک اٹھانا اور پھر اوپر دھکیلنا ناممکن ثابت ہو رہا تھا۔

میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "اب اٹھاؤ۔"

لیکن ہم ناکام رہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہماری اجتماعی ناکامی کا بوجھ بھی مجھ پر آپڑا۔ میں اٹھ نہیں سکا۔ میں اور نانا..... اور بعد میں یہ چاروں لڑکیاں بے شمار دشواریوں سے گزر کر میلوڈین کو چھ میل دور چرچ تک تو لے آئے تھے لیکن سیڑھیوں سے چرچ کے دروازے تک چھ فٹ کا فاصلہ مسئلہ بن گیا تھا۔ کیا اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی میں نانی کو یہ منہ مانگی خوشی نہیں دے سکوں گا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔

تین چار بار اور کوشش کرنے کے بعد میں نے جان لیا کہ یہ کام میرے اور ان چار لڑکیوں کے بس کا نہیں۔

میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ میری کمر دکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جلتے ہوئے آنسو میرے رخساروں پر بہتے رہے۔ مجھے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگا۔ میں دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگا۔ عجیب بے بسی تھی جو مجھے اندر سے کاٹے ڈال رہی تھی۔

میں پیچھے ہٹا اور اپنے جسم کے بوجھ سے میلوڈین پر زور لگایا۔ "لڑکیاں..... یہ لڑکیاں....." میں نے غصے سے کہا "کاش میرے ساتھ کوئی مرد ہوتا تو یہ کام پورا ہو جاتا۔ مگر میرے ساتھ کمزور اور ناکارہ لڑکیاں ہیں، جو کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔"

یہ سن کر اگنس رونے لگی۔ اسے دیکھ کر فرانسس کو رونا آگیا اور پھر ان سب نے بالترتیب رونا شروع کر دیا۔

تو یہ تھے ہم سب اس وقت..... طوفانی رات کے، بدحالی کے زمانے کے کرسمس کے بچے! اور ہم سب رو رہے تھے ہم سوچ رہے تھے کہ یہ خواب ہے..... اور ابھی آنکھ کھل جائے گی۔

اچانک برف باری تھم گئی!

ہوا بھی رک گئی تھی۔ ہم لالٹینوں کی روشنی میں کھڑے تھے۔ ٹریکٹر کے انجن کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

اچانک ہمارا رونا بھی موقوف ہو گیا۔ ابتدا میں وہ بہت دور سے آتی ہوئی موہوم سی آواز تھی، جسے برف نے اور دبا دیا تھا۔ وہ جنوب سے آرہی تھی اور اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔

ہم جنوب کی طرف دیکھنے لگے، آواز بتدریج بلند ہو رہی تھی اور قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

○☆○

اندھیرے میں وہ بالکل اچانک ہی ہمارے سامنے آیا۔ وہ سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا جسم بہت بڑے کوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی تھی۔ درخت کے قریب پہنچ کر گھڑسوار گھوڑے سے اترا۔ اس نے باگیں درخت کی شاخ سے باندھیں اور اپنا کوٹ اتار کر گھوڑے کی زین پر ڈال دیا پھر وہ ٹریکٹر کی طرف بڑھا اور نیچے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ٹریکٹر کا انجن خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ باوقار انداز میں قدم بڑھاتا ہوا ہماری طرف آیا۔

لالٹین کی زرد روشنی کے حلقے میں وہ آیا تو ہم نے اسے اچھی طرح دیکھا۔ وہ ایک دراز قامت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر بھورے بالوں کی داڑھی تھی، جس کی وجہ سے وہ بزرگ ہونے کا تاثر چھوڑتا تھا۔ اس کے جسم پر نیلی وردی تھی..... توپ خانے کی۔ اس کی بیلٹ سے بائیں طرف سنگین والی بندوق لٹک رہی تھی۔ دائیں جانب ایک ریوالور لٹکا ہوا تھا۔

ہم پانچوں کے سامنے وہ دیو لگ رہا تھا۔ لڑکیاں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوپی کے کنارے کو چھوتے ہوئے کہا "گڈ ایوننگ لڑکیو!" پھر اس نے فوجیوں کے سے انداز میں میرا معائنہ کیا۔ میں بدن چرانے لگا "خوب..... بہت خوب!" اس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا تاثر چھوڑوں گا مگر مجھے بہرحال اپنے ماتحتوں کے لیے ایک اچھی مثال قائم کرنا تھی "آپ کو ٹریکٹر بند نہیں کرنا چاہیے تھا" میں نے گھڑسوار سے کہا "اب اسے دوبارہ اسٹارٹ کرنا مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

"بعد میں دیکھا جائے گا بیٹے!" اس نے اپنے ہاتھوں کو باہم رگڑتے ہوئے کہا "ہمیں لڑکیوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے یہ میلوڈین اندر پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ تم وہاں اوپر کھڑے ہو جاؤ اور دیکھتے رہو کہ پیسے تختوں سے نیچے نہ اترنے پائیں۔"

وہ صریحاً حکم تھا۔ میں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ گھڑسوار جھکا۔ اس نے میلوڈین کو اوپر اٹھایا..... اتنا اوپر کہ اپنے کندھے پر رکھ لیا پھر جو اس نے زور لگایا تو ایک ہی بار میں میلوڈین اوپر پہنچ گیا۔

"دروازہ کھولو" گھڑسوار نے مجھ سے کہا "اور لڑکیو، تم لالٹینیں اٹھاؤ۔"

میں نے دروازہ کھولا مگر چاروں لڑکیاں بت بن کر رہ گئی تھیں۔ دونوں لالٹینیں مجھے ہی اٹھا کر لانی پڑیں۔ گھڑسوار نے میلوڈین اٹھا کر اس دروازے کی اونچی چوکھٹ سے گزارا اور پھر اسے بینچوں کے درمیان سے گزارتا قربان گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ میں اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

"کہاں رکھا جائے اسے؟" گھڑسوار نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، وہاں ٹھیک رہے گا" میں نے اشارہ کیا۔

میں بینچ اٹھا کر لانے کے لیے باہر گیا اور لڑکیوں سے چہکار کر کہا "اندر چل کر مدد کرو نا۔"

مگر وہ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اگنس

نے بمشکل کہا" بھبھ... بھوت... بھوت..."

"دماغ خراب ہے" میں نے اس پر آنکھیں نکالیں "وہ بھوت نہیں"

"تو پھر کیا ہے؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ اندر چلو' کچھ کام بھی کرو۔"

بڑی مشکل سے وہ چرچ میں گھسنے پر آمادہ ہوئیں۔ میں نے دروازہ بند کیا اور انہیں گھیر کر قربان گاہ کی طرف لے چلا لیکن وہ اجنبی گھڑسوار کے قریب بھی نہیں گئیں۔ ایک بینچ پر بیٹھ کر تھرتھراتی رہیں۔

گھڑسوار نے میلوڈین پر ڈھکے ہوئے کمبل ہٹادیے۔ میں نے میلوڈین کی بینچ لے جاکر اس کی جگہ پر رکھ دی۔

گھڑسوار میلوڈین کا معائنہ کررہا تھا "واہ... شاندار۔ بالکل نئے جیسا... اور زندگی جیسا بڑا۔ بہت خوب صورت ہے۔ ہے نا لڑکے۔"

"یس سر!" میں نے کہا۔

"ذرا دیکھیں تو۔ کیا میرا نوٹ اب بھی وہیں موجود ہے؟" اس نے کی بورڈ کے ٹاپ کو فولڈ کردیا پھر لالٹین اٹھائی اور جھک کر کیبنٹ میں جھانکنے لگا "حیرت ہے۔ وہ وہیں موجود ہے۔"

"کیسا نوٹ؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو میں نے لکھ کر اس میں ٹھونس دیا تھا۔ یہ دیکھو نا۔"

میں اس کے پاس گیا اور کیبنٹ میں جھانکا۔ ایک سائیڈ میں ایک زرد کاغذ تھا... کھلا ہوا... جسے چپکا دیا گیا تھا۔ اس پر لکھے حروف براؤن پڑ گئے تھے لیکن اب بھی صاف پڑھے جارہے تھے۔ لکھا تھا... عزیز از جان سارہ کے لیے' تنہائی سے بچانے کے لیے۔

"پتا نہیں' سارہ کو یہ کبھی ملا بھی یا نہیں؟" گھڑسوار نے کہا پھر میری طرف مڑا "تمہیں معلوم ہے؟"

"نہیں جناب!"

اس نے لالٹین نیچے رکھ دی اور بینچ پر بیٹھ گیا "مجھے وہ دن خوب یاد ہے' جیسے کل ہی کی بات ہو۔ میں نے ایک گائے اور دس بھیڑوں کے بدلے یہ میلوڈین لیا تھا۔ نقد رقم اس کے علاوہ تھی مگر اس کے لیے میں کوئی بھی قیمت ادا کرسکتا تھا۔ میں تو اسے چھو بھی نہیں سکا مگر یہ میرا نمائندہ تھا... میرا ترجمان۔"

ہم سب خاموش تھے... میں بھی اور لڑکیاں بھی۔ گھڑسوار میلوڈین کی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے چرچ کا جائزہ لیا۔ اس کی ہر چیز علاقے کی غربت اور پسماندگی کی غمازی کرتی تھی مگر وہاں رکھا ہوا وہ میلوڈین نہایت پُرشکوہ لگ رہا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی لکڑی جو کہ چیری کے درخت کی تھی' خوب چمک رہی تھی۔ اس کے میوزک ریک پر جو نقشین کام تھا' وہ بلاشبہ فن کا نمونہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ جیسے میلوڈین بنایا ہی اسی چرچ کے لیے گیا تھا۔ نانی نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔

"آپ کی داڑھی اصلی ہے؟" گرٹروڈ کی آواز نے سب کو چونکادیا۔

بینچ پر بیٹھے شخص نے سر گھما کر دیکھا "بالکل اصلی ہے بیٹا۔ تم ایسا کرو' میری گود میں آکر بیٹھو اور داڑھی کو کھینچ کر دیکھو' خود پتا چل جائے گا۔"

گرٹروڈ ہچکچا گئی "آپ سانتا کلاز ہیں؟"

"ہو بھی سکتا ہوں" گھڑسوار مسکرایا۔

گرٹروڈ اسے شک کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "لیکن سانتا ریڈ سوٹ پہنتا اور رینڈیرز کی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔" اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔

"کبھی کبھی۔"

"اور وہ موٹا اور خوش مزاج ہے جبکہ آپ ایسے نہیں ہیں۔"

"بے شک لیکن سانتا کے بے شمار حلیے اور بے شمار لباس ہوتے ہوں گے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔"

"خیر۔" گرٹروڈ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اب وہ بے تکلف ہونے کے چکر میں تھی۔ "بات یہ ہے کہ میں نے گڑیا مانگی تھی... اور آپ نے مجھے تھما دیے جوتے۔"

"اوہ... سوری مس مگر وہ جوتے اتنے اچھے ہیں... اور میں ایک ایسی رجنٹ سے واقف ہوں جو بخوشی تمہارے جوتوں کے بدلے بہت کچھ دے سکتا ہے۔"

مگر گرٹروڈ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ اگلے کرسمس پر مجھے گڑیا چاہیے... اور وہ بھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے والی۔"

"تمہیں اچھی لڑکی بن کر رہنا ہوگا۔"

"میں ہمیشہ سے اچھی بچی ہوں۔"

"بس تو میں سوچوں گا۔" گھڑسوار نے وعدہ کیا پھر پلٹتے ہوئے کی بورڈ کا ٹاپ اٹھایا اور بٹنوں پر انگلیاں لہرائیں۔ "کاش... مجھے سارہ کو اسے بجاتے دیکھنے کا موقع ملا ہوتا۔ کاش میں نے ننھے منصر کو دیکھا اور سنا ہوتا۔" وہ چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا پھر جوشیلے انداز میں اٹھا اور اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ "ایک بات سمجھ میں آئی ہے حارث بیٹے۔" مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ وہ میرا نام جانتا ہے۔ وہ سب کے نام جانتا تھا۔ میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"سنو بیٹے' کل تم میرے منصر کو مجبور کرنا کہ وہ میلوڈین کو بجائے... وہ گانا جو وہ میرے گھر آنے پر میرے لیے گانا چاہتا تھا' تاکہ میں اسے سن لوں۔" گھڑسوار نے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "پلیز..."

میرے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ دانت بھنچ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا "وہ نہیں گائیں گے جناب؟"

اس نے میری ٹھوڑی چھوڑ دی "نہیں گائے گا؟ کیوں نہیں گائے گا؟"

"انہوں نے کبھی وہ گانا نہیں گایا۔ جس روز انہیں پتا چلا کہ آپ واپس نہیں آئیں گے' اس کے بعد انہوں نے کبھی میلوڈین

نہیں بجایا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے مگر وجہ نہیں معلوم۔"

اب یہ سب کچھ کہنا بہت مشکل تھا۔ رات نانا سے جو بھیڑوں کے شیڈ میں گفتگو ہوئی تھی' میں اسے لفظ بہ لفظ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں نے ان سے وجہ پوچھی تھی۔ انہوں نے کہا.... کیونکہ میرے پاپا اب کبھی نہیں سن سکیں گے۔ وہ مجھے دیکھ سکیں گے' نہ میں انہیں دیکھ سکوں گا۔"

گھڑسوار کی آنکھوں سے اذیت جھانکنے لگی۔ اس وقت میں نے پہلی بار غور کیا کہ اس کی رنگت راکھ جیسی تھی۔ اس کے چہرے پر مردنی تھی اور وہ کتنا تھکا ہوا اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔

"اوہ۔" بالآخر اس نے کہا۔ "منصر نہیں جانتا مگر یہ سچ ہے کہ میں اسے سن سکتا تھا لیکن وہ تو چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ خیر' کل اگر وہ میلوڈین بجائے اور گیت گائے تو میں ضرور سنوں گا۔ حارث.... میرے بچے' تم اسے راضی کر لینا۔"

وہ مجھ سے ناممکن کو ممکن بنانے کو کہہ رہا تھا۔ 'کیسے کروں؟ وہ بہت ضدی ہیں۔' میں نے چند لمحے سوچا پھر پوچھا۔ "اچھا' میں انہیں آپ کے بارے میں بتا سکتا ہوں؟ اجازت ہے؟"

"ارے نہیں..." اس نے جلدی سے کہا پھر لڑکیوں کو اور ان کے بعد مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ کام ہے جو تمہیں نہیں کرنا ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی نہیں۔ سمجھ میں آیا کچھ؟ کسی کو نہ بتانا کہ میں یہاں آیا تھا۔ ویسے تو کوئی یقین کرے گا بھی نہیں۔ کیونکہ عمر جیسے جیسے بڑھتی ہے' آدمی اتنا ہی مادی اور بے عقیدہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کو مت بتانا کچھ۔"

"میں چاہوں تو بتا سکتی ہوں۔" گرٹروڈ بولی۔

گھڑسوار نے اسے سختی کی نظر سے دیکھا' پھر اس کی بہنوں کو اور آخر میں مجھے پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو پہلے سے زیادہ اونچا لگ رہا تھا.... جیسے دیو ہو۔ "ایک آواز نکال کر دیکھو۔ مجھے جس دن موقع ملے گا' چپکے سے پکڑ لوں گا اور سارے دانت توڑ کر اور کان کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

ہم سب نے جان لیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ حد یہ کہ گرٹروڈ بھی سہم گئی تھی۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ اس کی دھمکی کام کر گئی ہے' اس کے چہرے پر نرمی بکھر گئی۔ "حارث بیٹے! اس وقت تو تم سب کو بستر میں ہونا چاہیے۔" اس نے بے حد محبت سے کہا۔ "اور کل کی فکر کرو۔ آج رات میں نے ضرورت کے وقت تمہیں سہارا دیا ہے۔ کل تم اس کے بدلے مجھے میرا پسندیدہ گیت سناؤ' جس کا میں کب سے منتظر ہوں۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"میں پوری کوشش کروں گا جناب۔" میں نے کہا۔ "بہت سچی کوشش۔"

"پیارے لڑکے ہو تم اور میرا خون ہو اس لئے میں تم پر اعتبار کروں گا۔ چلو بچو' اب گھر کی فکر کرو۔ لالٹینیں اٹھاؤ۔"

ایک لالٹین میں نے اٹھالی اور دوسری اگنس کو دے دی پھر ہم آگے آگے چلے' دروازے سے گزرے اور سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ گھڑسوار سب سے آخر میں نکلا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

باہر رات ویسی ہی پُرسکون تھی جیسا ہم اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ ہوا کے جھکڑوں اور برف باری کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ درخت سے بندھا ہوا گھوڑا اپنے مالک کو دیکھ کر ہنہنانے لگا۔

گھڑسوار گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "تم سب یہاں آؤ.... میرے پاس۔" اس نے پکارا۔ ہم قریب گئے تو اس نے ہم پانچوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ایک دائرہ سا بنا دیا۔ "میرے بچو! بہادر ہونے کے لئے فوجی ہونا ضروری نہیں۔ تم لوگوں نے آج رات جو کچھ کیا ہے' میں اسے کمال بہادری کہوں گا۔ میں نے زندگی میں بہادری کی ایسی کوئی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی اور سنو' میں تم میں سے ہر ایک کا شکر گزار ہوں۔"

"یو آر ویل کم۔" گرٹروڈ بولی۔

اب وہ جا رہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ پوچھنے کا یہ آخری موقع ہے۔ "وہ جنگ' کہتے ہیں بہت خوفناک تھی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اور وقعت کے اعتبار سے...."

"اپنے وطن کے لئے جنگ لڑی جائے تو اس کی وقعت کا حساب نہیں۔ بس سوچتا ہوں' کاش ہر جنگ جہاد ہوتی۔ تمہیں موقع ملے تو جہاد ضرور کرنا۔ اس میں نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ زندہ تو غازی' مرے تو شہید۔"

"جی ہاں جناب۔"

"خدا کی رحمت تم پر سایہ فگن رہے۔ تمہیں جہاد ضرور نصیب ہو گا۔ بس میری بات کبھی بھولنا نہیں۔ اچھا بچو' گڈ نائٹ.... اور ہاں' کرسمس مبارک ہو۔"

ہماری جوابی مبارک باد سے پہلے وہ ٹریکٹر کی طرف بڑھا۔ اس کا ہینڈل تھامتے ہوئے فلائی وھیل کو اس نے پوری قوت سے چکر دیا۔ اگلے ہی لمحے انجن جاگ اٹھا' دھواں اور آواز اگلنے لگا۔ گھڑسوار نے اپنی ٹوپی کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے سر تھوڑا سا خم کیا پھر اس نے کاٹھی پر رکھا ہوا اپنا کوٹ پہنا' گھوڑے کو کھولا اور اس پر بیٹھ کر ایڑ لگا دی۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

ہم پانچوں ساکت و صامت وہیں کھڑے اس سمت دیکھتے رہے' جدھر وہ گیا تھا پھر ٹاپوں کی آواز بھی مدھم ہو گئی اور ٹریکٹر کے انجن کی آواز رہ گئی۔

○☆○

ہم ٹریکٹر پر بیٹھ کر واپس جا رہے تھے۔ اس بار کوئی دشواری راستہ نہیں روک رہی تھی۔ اچانک اگنس میرے کان میں چلائی۔

"کون تھا وہ؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ تمہارے نام سے واقف تھا اور تم بھی اسے جانتے تھے۔"

میں نے ظاہر کیا کہ ٹریکٹر کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔

"میں اپنے پاپا کو بتا دوں گی۔"

اب مجبوری تھی۔ یہ بات میں کیسے نہ سنتا۔ "اگنس' ایسا نہ کرنا۔ اس کی دھمکی یاد نہیں۔" میں نے اسے ڈرایا۔

"وہ تو یونہی سی دھمکی تھی۔"

"اس نے کہا تھا' کسی سے کچھ نہ کہنا۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔ "اگر تم نے کسی سے کچھ کہا تو میں تم سے نفرت کرنے لگوں گا۔"

میری دھمکی سن کر اس کے ہونٹ سل گئے۔ اب میں سکون سے ٹریکٹر چلا سکتا تھا۔ راستہ آسان تھا۔ موسم کی سختی بھی دور ہو چکی تھی۔ میں اس سفر کو انجوائے کر رہا تھا۔

اگنس کا گھر دور سے جگمگاتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ماں نے کوئی روشنی بجھی نہیں رہنے دی تھی۔ میرے ٹریکٹر روکتے ہی لڑکیاں اچھل کر اتریں۔ میرے نانا لیٹی کے ساتھ سڑک پر ہی کھڑے ہماری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیٹی نے اپنی بیٹیوں کو یوں لپٹا لیا' جیسے اسے ان کی واپسی کی کوئی امید ہی نہیں رہی ہو۔ "خدا تمہیں خوش رکھے حارث۔ صبح ملاقات ہوگی۔ کرسمس مبارک۔" اس نے اپنی بچیوں کو گھیر کر گھر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔

نانا ٹریکٹر پر چڑھ آئے مگر میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ میں نے تھروٹل اٹھایا' لیور کو اوپر کیا اور ٹریکٹر کو ایسا زبردست اسٹارٹ دیا کہ نانا کو سنبھلنے کے لئے چھت کا سریا پکڑنا پڑا پھر وہ ایک فینڈر پر بیٹھ گئے اور گھر پہنچنے تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان نظروں میں تعجب بھی تھا' ستائش بھی اور تشویش بھی۔

سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں تھی۔ میں نانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ صبح وہ چرچ میں داخل ہوں گی تو کیا کہیں گی؟ کتنی خوش ہوں گی پھر مجھے گھڑ سوار نانا کا خیال آیا۔ ان کی فرمائش میں کیسے پوری کروں؟ اپنے نانا کو میلوڈین بجانے پر کیسے رضامند کروں۔ جبکہ انہیں اس کو چھوئے ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہو گئے پھر مجھے اپنے ڈیڈی اور ممی کا خیال آیا۔ ان سے فون پر بات کرنے کے بعد میں ان کے بارے میں سوچ تک نہیں سکا تھا۔ انہیں پتا چلے گا کہ آج کی رات ان کے بیٹے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ کتنا فخر کریں گے پھر مجھے نانی کی سنائی ہوئی کہانی یاد آئی اور میں نے سوچا' وقار کی ایسی تیسی۔ میں تو طمانیت کی موٹی تازی' رس سے بھری نارنگی ضرور لوں گا۔ چاہے وہ وقار کے بدلے ملے۔

ہم گھر پہنچے۔ میں نے بڑی مہارت سے ٹریکٹر کو براہِ راست اس کی جگہ لے جا کر روک دیا۔ نانا نیچے اترے اور انہوں نے انجن بند کر دیا۔ ٹریکٹر نے اپنی آخری فاتحانہ سانسیں لیں اور پھر خاموش ہو گیا۔

ہم نے ہتھ گاڑی کو نیچے اتارا اور اسے اس کی جگہ پر پہنچا دیا۔ رسیاں اور کمبل اپنی جگہ پہنچا دیے گئے۔ اب نانی دیکھتیں تو کہہ نہ سکتیں کہ گودام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے۔ گودام کے باہر ہم دونوں چند منٹ کھڑے سن گن لیتے رہے۔

"طوفان جان چھوڑ گیا۔" بالآخر میرے نانا نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"مگر بہت سردی ہے۔ منفی دس تو اب بھی ہوگا۔"

"جی.... کم از کم۔" میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ستارے ٹمٹما رہے تھے مگر وہ اتنے روشن نہیں لگ رہے تھے.... اور بہت زیادہ اوپر بھی دکھائی دے رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں سو گیا۔" نانا نے معذرت کی۔ "نڈھال ہو گیا تھا میں۔"

"کوئی بات نہیں نانا۔" میں نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"تو تم نے میلوڈین چرچ میں پہنچا دیا۔"

"ہوا کی طرح.... پانی کی طرح۔" میں گنگنایا۔

"تم نے ان لڑکیوں کی مدد سے اسے چرچ کے اندر پہنچا دیا۔"

"جی پکی بات ہے۔"

"مگر کیسے؟"

اب مجھے احتیاط سے کام لینا تھا۔ "جیسے میں نے اور آپ نے اسے گھر سے نکالا تھا.... ہتھ گاڑی کی مدد سے!"

"لیکن بچیوں کے لئے تو وہ بہت بھاری.... بہت بڑا تھا۔" نانا کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"ارے نانا' وہ بچیاں نہیں' بھینسیں ہیں بھینسیں۔"

"لڑکے' سچ بتاؤں۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔"

"اچھا۔ صبح خود دیکھ لیجئے گا۔"

نانا اب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے میں دور بہت دور' خلاؤں میں تاروں کو دیکھ رہا تھا' جو کبھی جلتے تھے' کبھی بجھتے تھے۔

"سنو! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میں آخرت میں بھی تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" نانا بولے۔

"مجھے خوشی ہوئی نانا۔" میں نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔

ہم گھر کی طرف چل دیے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "نانا.... ایک نظر بھیڑوں کو بھی دیکھ لیں نا۔"

"تم کہتے ہو تو چلتے ہیں۔"

ہم بھیڑوں کے شیڈ میں پہنچے۔ بیشتر بھیڑیں سو رہی تھیں۔ شاید وہ ہری بھری چراگاہوں کے' موسم بہار کے اور بال اتارے جانے کے خوشگوار خواب دیکھ رہی ہوں گی لیکن بچہ دینے والی بھیڑ اور اس کا نر دونوں جاگ رہے تھے۔ بھیڑ کھڑی تھی اور اس کا ممنا دودھ پی رہا تھا۔ اس کی دُم کی زندگی سے بھرپور حرکت اس کی خوشی کی غمازی کر رہی تھی۔

نانا نے اپنی مونچھ کے ایک کونے کو مروڑا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان کے چہرے پر کتنی تھکن' کتنا بڑھاپا نظر آرہا ہے۔ اگر ان کی داڑھی چوڑی ہوتی تو وہ "کسی" سے کتنا زیادہ مشابہ نظر آتے۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔" نانا بڑبڑائے۔ "یہ الگ بات کہ کسی نے تمہاری مدد کی ہو۔"

ہم پھر برف پر سے گزرتے گھر کی طرف چل دیے۔ ہم دونوں ہی نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ بستر ہمارے انتظار میں سرد ہو چکا ہوگا مگر کوئی بات نہیں۔

○☆○

میں صبح جلدی اٹھ گیا۔ عقبی صحن میں مرغیوں نے طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہوا تھا۔ ان کے شور نے مجھے جگا دیا۔ جاگتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ کرسمس کی صبح ہے اور ہمیں چرچ بھی جانا ہے اور مجھے نانا کو میلوڈین بجانے پر آمادہ کرنے کی کوئی ترکیب بھی سوچنی ہے۔

میں نے کپڑے بدلے اور نیچے چلا گیا۔ وہ ایک خوبصورت دن تھا..... سرد دن مگر دھوپ اور روشنی سے بھرا ہوا۔ میں کچن میں داخل ہوا۔ نانی اپنی عادت کے مطابق بیک وقت دو کاموں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ ناشتا بھی بنا رہی تھیں اور ایک اور مرغی بھی صاف کر رہی تھیں۔ "کرسمس مبارک۔" میں نے چہک کر کہا۔

"تمہارے نانا نے کارنامہ انجام دے دیا۔" نانی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"کارنامہ؟" میں بوکھلا گیا۔ "کیسا کارنامہ؟"

"ارے انہوں نے زندگی میں پہلی بار مرغی ذبح کر ڈالی۔ میں اس شخص کو ساری زندگی نہیں سمجھ سکوں گی۔"

"نانا ہیں کہاں؟"

"ضروری کام نمٹا رہے ہیں۔"

"اور آپ کو کیسی نیند آئی؟"

"نیند کیا' بے ہوشی تھی۔ پتا نہیں رات مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ارے ہاں بیٹے' کرسمس مبارک ہو تمہیں۔"

نانا کچن میں داخل ہوئے۔ "سنو بھئی' سردس تو آج ہوگی۔ شاید کاؤ بلز نے راستوں اور سڑکوں سے برف ہٹائی ہے۔" انہوں نے چپکے سے مجھے آنکھ ماری۔ "یا شاید قصبے کی انتظامیہ نے صفائی کرا دی ہے۔"

اگلے دو گھنٹے بڑی مصروفیت کے تھے اور نانا کے لئے آئیڈیل تھے کیونکہ نانی کو بھولے سے بھی پارلر میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ موقع ملتا تو میلوڈین وہاں موجود نہ پا کر وہ کچھ سمجھ جاتیں۔ بہرحال ہم نے بیٹھ کر ناشتا کیا پھر میں نے برتن دھوئے۔ نانی مرغیوں میں مسالا بھرتی رہیں پھر انہوں نے وہ روسٹ ہونے کے لئے اوون میں رکھ دیں۔

مسٹر اینڈ مسز کاڈویل اپنی سیڈان میں ہمیں چرچ لے جانے کے لئے آئے تو ہم سب تیار تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں عقبی سیٹ پر خواتین کے ساتھ بیٹھا۔ نانا مرغی کی باسکٹ لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھے۔

راستے میں کہیں برف رکاوٹ نہیں بنی!

نانا کی درخواست پر گاڑی ہیسٹنا کے مکان پر روکی گئی۔ جواو اور ایبی چرچ جا چکے تھے۔ نانا نے مرغی کی باسکٹ ان کے پورچ میں دروازے پر چھوڑ دی۔

ہم اسٹیکیبل کے گھر کے سامنے سے گزرے اور کاؤنٹی روڈ پر پہنچ گئے۔ اب میرے پاس وقت کم تھا۔ بڑے نانا نے مجھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ میں دن کی روشنی میں سوچ اور کہہ سکتا تھا کہ بڑے نانا ہماری مدد کے لئے نہیں آئے تھے۔ کسی طرح میں نے اور لڑکیوں نے زور لگا کر میلوڈین کو اندر پہنچایا تھا۔ کم عمری میں جھوٹ مختصر ترین راستہ ہوتا ہے لیکن سچ بلوغت کی طرف لے جاتا ہے اور سچ یہ تھا کہ اب چند منٹ بعد نانا کی فیملی کو جو عزت اور سرفرازی ملنے والی تھی' وہ صرف اور صرف اس مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر آنے والے کے دم سے تھی۔ وہی اس عزت کا مستحق تھا اور اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو ساز بجاتے دیکھنا چاہتا تھا' اس کا گانا سننا چاہتا تھا۔ وہ بیٹا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گانا جو ایک ننھے لڑکے نے اپنے باپ کے استقبال کے لئے سوچا اور جوڑا تھا اور میں نے کہا تھا..... میں پوری کوشش کروں گا۔ سو اب مجھے کوشش کرنی تھی اور اس کے نتیجے میں میں نانا کے غصے کا' گاؤں والوں کے مذاق اور تمسخر کا نشانہ بن سکتا تھا۔ مجھے عمر بھر کی شرمندگی بھی مل سکتی تھی۔

چرچ کے باہر گاڑیوں کی قطار دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ آج ہاؤس فل ہوگا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ہم لیٹ پہنچے ہیں۔

ہم گاڑی سے اتر آئے۔ نانا نے دانستہ نانی کو الجھا لیا تاکہ ہم آخر میں داخل ہوں۔ مسٹر اور مسز کاڈویل چرچ میں چلے گئے۔ میں نانا کی بات سمجھ رہا تھا۔ وہ نانی کا دھیان بھٹکانا چاہتے تھے تاکہ سرپرائز ان کے لئے فل سرپرائز ہو۔ "نوکری میں کیا رکھا تھا تم نے؟" انہوں نے نانی سے پوچھا۔

"کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور کیا ہوتا۔" نانی جھنجلا گئیں۔

"میں سمجھا....."

"چھوڑو فضول باتیں۔" نانی نے کہا اور قدم بڑھایا..... نانی کے پیچھے ہم دونوں چرچ میں داخل ہوئے۔

میں اپنی نانی کے چہرے کا تاثر لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کر سکوں گا۔ یہ کام ناممکن ہے مگر بیان تو مجھے کرنا ہے۔ نانی کو پچھلی نشستیں پڑوسیوں اور جاننے والوں سے بھری نظر آئی ہوں گی..... اور وہ سب نظریں جمائے انہی کو دیکھ رہے ہوں گے۔

انہیں چرچ کو گرمی دیتا آہنی چولھا نظر آیا ہوگا۔ انہیں فادر گورین نظر آئے ہوں گے' جو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے یہ سب دیکھا ہوگا مگر نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ تو آرگن دیکھ کر بہت بن گئی تھیں۔ کبھی وہ آرگن کو' کبھی نانا کو اور کبھی مجھے دیکھتی تھیں۔ ان لمحوں میں ان کا بوڑھا چہرہ جوان لگنے لگا تھا۔ وہ جوان ہوگئی تھیں..... اور ان کا شوہر ان سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔

میں اور نانا آگے بڑھے اور نانی کو درمیان میں لے لیا۔ ہم انہیں ایک بینچ کی طرف لے گئے۔

فادر گورین کی آواز چرچ میں گونج اٹھی۔ "عبادت سے پہلے میں مسٹر اور مسز منصر امروک کا شکریہ ادا کروں گا' جنہوں نے بڑی محبت سے چرچ کو وہ میلوڈین تحفے میں عنایت کیا' جو ۱۸۶۹ء سے ان کی فیملی کے پاس ہے' جو ان کے لئے بزرگوں کی نشانی ہے۔ مجھے یقین ہے' سب لوگ اس تحفے کو سراہیں گے اور ان لوگوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولیں گے اور انہیں ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ تحفے کی شکر گزاری کے علاوہ ہم سب منصر امروک اور ان کے نواسے حارث کے شکر گزار ہیں جنہوں نے طوفانی رات میں اس میلوڈین کو اپنے ٹریکٹر پر لاد کر یہاں تک پہنچایا۔ انہوں نے ثابت کردیا کہ اسلام بڑا دین ہے اور مسلمان واقعی تمام اہلِ کتاب سے محبت کرتے ہیں۔ یہ جذبہ ہی تھا کہ میلوڈین اتنے خراب موسم میں چھ میل دور لایا جاسکا ورنہ یہ کام عملاً ناممکن تھا....."

"فادر....." میرے نانا نے مداخلت کی۔

"یس مسٹر امروک؟"

"مجھے ضرورت سے زیادہ کریڈٹ نہ دیں۔" نانا بولے۔ "میں تو بس اسٹیکیبل کے گھر تک ہی آسکا تھا۔ ہمیں ٹریکٹر کو اسٹارٹ کرنے میں بڑی پریشانی ہوئی تھی اور اس سے پہلے مجھے ایک بھیڑ کو بچہ دینے میں مدد دینی پڑی تھی۔ چنانچہ میں نڈھال....."

"بھیڑ؟ بچہ؟" چارلی گریو نے چونک کر پوچھا۔

"اس موسم میں؟" یہ ایمٹ روچ تھا۔

"جی جناب۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی بھیڑ نے اس موسم میں بچہ دیا۔ مگر یہ سچ ہے۔ بہرحال میں نڈھال تھا۔ اسٹیکیبل کے گھر میں' میں سو گیا۔ کیٹی نے اپنی بچیوں کو میرے حارث کے ساتھ بھیجا۔ باقی سب کام ان بچوں نے کیا۔"

اب سب لوگ ان چاروں بہنوں کو مسکراہٹوں سے نواز رہے تھے اور وہ شرمائے جارہی تھیں۔

"ہم ان بچیوں کے بھی شکر گزار ہیں۔" فادر گورین نے کہا۔ "اب مسز امروک' اگر آپ ہمیں آرگن پر کوئی افتتاحی دھن سنا دیں تو یہ ہمارے لئے بڑا اعزاز ہوگا۔"

"آئی ایم سوری فادر۔" نانی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "گٹھیا کی تکلیف نے میری انگلیوں کو ناکارہ کردیا ہے۔ اب میں یہ آرگن بجا ہی نہیں سکتی۔ مجھے معاف کردیا جائے۔"

عبادت گزاروں کے مجمع سے ہمدردانہ آوازیں ابھریں اور ڈوب گئیں۔

"تب مسز امروک' مجھے افسوس ہے کہ....."

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "فادر' میرے نانا کو آرگن بجانا آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرے بڑے نانا ابراہیم کی خواہش ہے کہ نانا وہ گیت گائیں' جو انہوں نے سوچا تھا کہ ابراہیم کی واپسی پر گائیں گے۔"

چرچ میں خاموشی چھا گئی۔ اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ خواہ کتنی ہی تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اس مسئلے کا کوئی اور حل تھا ہی نہیں۔ ایک بیٹے کی نظروں میں باپ کی حیثیت بحال کرنی تھی۔ بیٹے کو یقین دلانا تھا کہ باپ مرنے کے بعد بھی اس بیٹے کو نہیں بھولا ہے' جس کے وجود کا اسے اپنی زندگی میں علم بھی نہیں تھا۔ میں اپنے آپ میں بڑا ہوگیا تھا۔ میرے اسلاف میں سے دو بڑے میرے سامنے اور ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے اور وہ دونوں ہی بہت ضدی اور آسانی سے نہ ماننے والے تھے۔ "یہ ابراہیم کون ہیں؟"

"ابراہیم امروک' میرے بڑے نانا..... توپ خانے کے سپاہی۔ انہوں نے یہ میلوڈین سارہ کو اس وقت دیا تھا' جب وہ جنگ پر گئے تھے۔"

"سارہ؟"

"میری بڑی نانی۔ انہوں نے نانا کو میلوڈین بجانا سکھایا تھا' جب یہ بہت چھوٹے تھے لیکن جب ابراہیم کی موت کی خبر پہنچی تو میرے نانا نے میلوڈین بجانا چھوڑ دیا۔ کبھی بھی نہیں بجایا لیکن ان کے پاپا چاہتے ہیں کہ آج یہ میلوڈین بجائیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو حارث؟"

"انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا۔"

"کب؟"

"کل رات کو جناب۔ یہیں..... اسی جگہ۔"

"اسی جگہ؟"

میں نے فادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نانا اور نانی کی طرف دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی ورنہ میں ڈھیر ہی ہوجاتا۔

"جی ہاں جناب۔" میں نے کہا۔ "سچ یہ ہے کہ میں اور یہ لڑکیاں پوری کوشش کے باوجود میلوڈین کو اندر نہیں لا پارہے تھے۔ یہ بہت بھاری ہے۔ ایسے میں بڑے نانا گھوڑے پر سوار ہوکر آئے اور ہماری مدد کی۔ بعد میں انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں نانا کو وہ گیت گانے پر مجبور کروں' جو نانا نے ان کی واپسی پر ان کے استقبال کے لئے تیار کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں کوشش کروں گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم کسی کو ان کے متعلق نہ بتائیں کیونکہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا لیکن میں کیا کروں؟ نانا کو کسی اور طرح رضامند کر ہی نہیں سکتا۔"

آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا مگر

یہ سچ ہے۔ میں تنہا کھڑا تھا۔ صرف اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ چرچ میں موجود ہیں' ان کے علاوہ بھی کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ "ممکن ہے' آپ مجھ پر یقین نہ کریں لیکن لڑکیوں سے پوچھ لیں۔" پھر میں ان کی طرف مڑا۔ "کیوں اگنس' وہ آئے تھے نا۔"

اگنس یوں بیٹھی رہی' جیسے میں اسے نظر ہی نہیں آرہا ہوں۔

"فرانسس..... ڈولورز..... تم ہی بتاؤ نا۔" میں نے اپیل کی۔

وہ بھی بت بنی بیٹھی رہی۔

"گرٹروڈ..... تم تو سچ بولو گی نا؟"

گرٹروڈ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جی' میرا خیال ہے سانتا کلاز یہاں آیا تھا۔" وہ بولی۔ "اس کی داڑھی بھی تھی۔ اس نے نیلا سوٹ پہنا تھا' لال نہیں اور وہ کالے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ اس کے پاس تحفوں کا تھیلا نہیں تھا' تلوار تھی اور وہ موٹا اور خوش مزاج بھی نہیں تھا۔ وہ اداس اور دبلا پتلا تھا اور میں نے اس سے جوتوں پر احتجاج کیا تو اس نے اگلے کرسمس پر مجھے گڑیا دینے کا وعدہ کیا۔" وہ اور بھی کچھ کہتی مگر لیٹی نے کھینچ کر زبردستی اسے بٹھا دیا۔

فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ حاضرین کو میری بات پر یقین نہیں آیا ہے۔

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ میں فادر سے مخاطب تھا۔ "فادر..... آپ کی بورڈ کے ٹاپ کے اندر دیکھیں۔ وہاں آپ کو سارہ کے نام ابراہیم کا لکھا ہوا نوٹ ملے گا۔ یہ انہوں نے کل خود مجھے بتایا تھا۔ یہ نوٹ بورڈ پر چپکایا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ 'اپنی سارہ کے لئے' تنہائی کا ایک ساتھی۔' میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔"

فادر گورین مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے پھر وہ محتاط انداز میں میلوڈین کی طرف گئے۔ اس کے کی بورڈ کا ٹاپ اٹھایا' کیبنٹ کے اندر جھانکا' اپنی عینک درست کی اور دوبارہ اندر جھانکا پھر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے۔ "نوٹ موجود ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اور اس کے الفاظ بھی یہی ہیں۔ مسٹر امروک' آپ کو اس نوٹ کی موجودگی کا علم تھا؟"

سب ہمہ تن سماعت بن گئے۔ "نہیں فادر۔" نانی کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔ "اس کا تو میری ساس سارہ کو بھی علم نہیں تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے متعلق اس لمحے سے پہلے نہیں جانتا تھا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔"

وہاں سب کا یہی حال تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مرد سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ میری بات کو آسانی سے رد کیا جا سکتا تھا۔ میں ایک لڑکا تھا' جس نے ایک کہانی گھڑلی تھی۔ گرٹروڈ تو تھی ہی بچی مگر وہ نوٹ ایک حقیقت تھا۔ ڈھائی سو پاؤنڈ وزنی میلوڈین ایک اور حقیقت تھا۔ وہاں موجود سب لوگ جانتے تھے کہ ایک لڑکا اور چار لڑکیاں مل کر وہ بھاری میلوڈین چرچ کے اندر کسی بھی طرح نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اب میرے لئے کھڑا رہنا ناممکن تھا۔ میں بیٹھ گیا۔

فادر نے اپنی عینک اتار کر اس کے شیشے رومال سے صاف کیے اور پھر عینک دوبارہ لگالی۔ "دوستو' مجھے نہیں علم کہ اس سے ہمارے دلوں کو کتنا اور کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہم سب نے بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم نے ایک معجزہ دیکھا ہو۔ بچوں کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ سکتی ہیں' جو ہم بڑوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور ہم میں کون ایسا ہے' جو کہہ سکتا ہو کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ نہیں اس موسم میں ہم نے تباہ شدہ چرچ کے ملبے پر یہ نیا چرچ کھڑا کر لیا۔ یہ معجزہ نہیں کہ ہمیں ایک مسلمان فیملی کی طرف سے آرگن مل گیا اور یہ تم تک بچوں نے پہنچایا ہے۔ یاد رکھیں' گزشتہ رات کرسمس کی رات تھی' جو ہے ہی کرشموں کی رات۔ سو دوستو' آؤ دعا کریں۔"

سب نے سر جھکا لیے۔ "مالک' میلوڈین کے معجزے پر ہم تیرے شکر گزار ہیں۔ ہم ان بچوں کے حوصلے کے شکر گزار ہیں' جو یہاں سونا چاندی نہیں' موسیقی لے کر آئے۔ خداوند' اس عورت ایلیا امروک پر اپنی رحمت فرما اور اس شخص منصر امروک پر اپنی رحمت فرما' جو اپنے گاؤں والوں کے لئے رحم اور دریا دلی کا نشان ہے۔ اب ہم خداوند' تجھ سے ایک معجزے کی دعا کرتے ہیں اور منصر امروک سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کی روح کے سکون کے لئے وہ گیت سنائے جو اس نے باپ کے خیر مقدم کے لئے تیار کیا تھا۔ اس باپ کے لئے جو تیری مرضی کے تحت لوٹ کر نہ آسکا۔ آمین۔"

فادر نے نظریں اٹھا کر ہم تینوں کو دیکھا اور پکارا۔ "منصر۔"

میری نانی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی۔

میرے نانا آہستہ سے اٹھے اور بینچوں کے درمیان سے گزرتے قربان گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ میلوڈین کے سامنے یوں جا کر کھڑے ہوئے' جیسے وہ کوئی عدالت ہو پھر آہستگی سے وہ بینچ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے پاؤں پیڈل پر رکھے اور دباؤ ڈالا۔ آرگن کے پردے ہوا سے بھر گئے۔ نانا کا ہاتھ اٹھا۔ انگلیاں چابیوں پر گریں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

ہم سب سانسیں روکے بیٹھے تھے۔ وقت ایسا لگتا تھا کہ تیزی سے معکوس سفر کر رہا ہے۔ سب منتظر تھے اور میلوڈین کے سامنے بینچ پر بیٹھا ہوا شخص دیکھتے ہی دیکھتے بدل رہا تھا۔ اب وہ جوانوں کی طرح تن کر بیٹھا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیسے لڑکا بن گیا..... افسردہ' کھویا کھویا' باپ سے محروم لڑکا۔ کیا اس کی یادداشت اسے دھوکا دے جائے گی؟ کیا اس کی انگلیاں اس کے ماغ کے حکم کی تعمیل نہیں کر پائیں گی؟ کیا زندگی بھر کی محرومی اور اذیت لمحے میں ڈھل

سکے گی؟

نانا کی انگلیوں نے کی بورڈ کو چھوا۔ صبح کی نرم دھوپ میں ان کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چرچ خوبصورت اور پُراثر موسیقی سے بھر گیا تھا اور وہ گیت بڑے لوگوں کے لئے تھا جو ایک ایک کرکے کھڑے ہونے لگے۔ وہ سب نانا جیسے ہی تھے' ان کے پاس وہ زخم تھے' جنہیں وقت کبھی نہیں بھر سکا تھا۔ وہ سب قربانی کے مفہوم سے واقف تھے۔ قربانیاں دے چکے تھے۔ وہ سب نانا کی آواز میں آواز ملانے لگے۔ ان کی آوازوں میں دلیری تھی مگر وہ لرز رہی تھیں۔

موت سے لڑ کر' موت سے جیت کر آنے والے
میں جیون' میں تیرے گلے کا ہار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا
نظریں جمائے راستہ تکتا رہتا ہوں
اب آجاؤ' آبھی جاؤ' ہر پل کہتا ہوں
تم ماما کا سنگار پاپا' پاپا پاپا میرے پاپا
کیا میں تم کو یاد کبھی نہیں آتا ہوں
بات یہ سوچ کے اکثر میں ڈر جاتا ہوں
مجھ کو ہے تم سے پیار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا
ملی نہیں آغوش وہ پیاری اس دن تک
دیکھی نہیں صورت ہی تمہاری اس دن تک
عمر گئی بے کار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا

گیت ختم ہوا تو صرف نانا اور نانی ہی کی نہیں' تمام حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

○☆○

میں اگلے موسم گرما تک فارم پر رہا پھر ڈیڈی کو ملازمت مل گئی اور انہوں نے مجھے بلوا لیا مگر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے شہر کی زندگی اچھی نہیں لگتی۔ میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروں گا۔

اب اس بات کو اکتالیس برس ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کبھی بڑے نانا کی جھلک بھی نہیں دیکھی بلکہ برسوں تو مجھے بھی یہی شک رہا کہ وہ میرے اپنے ذہن کی اختراع تھی مگر پھر مجھے فادر کے الفاظ یاد آئے۔ انہوں نے کہا تھا' بچوں کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں' جو بڑوں کو نظر نہیں آتا۔ اب بھی کبھی سرد راتوں میں مجھے ٹریکٹر کے انجن کی آواز سنائی دیتی ہے جیسے وہ میلوڈین کو اٹھائے چلا جارہا ہے۔ اب بھی سرما کی کسی صبح مجھے میلوڈین کی آواز سنائی دیتی ہے..... پاپا پاپا میرے پاپا۔

میں اس کرسمس کے تحفوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر میرے نانا نے نانی کو اس میلوڈین کا تحفہ دیا تو ایک اعتبار سے ان دونوں

حسن وہ! جو چھپائے نہ چھپے!

میرے نسوانی حسن کا راز

بلوسم بریسٹ کریم (یونانی)

قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہا برس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد

بلوسم بریسٹ کریم جو قیمت =/150

• بریسٹ کے ٹشوز کو سخت کرکے ابھار لاتی ہے۔
• بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کرکے پروقار شخصیت کا مالک بناتی ہے
• کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے

اسٹاکسٹ:
خواجہ سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل سٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
سلم جنرل سٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
تھری اسٹار جنرل سٹور مدینہ مارکیٹ۔ ریشم بازار حیدرآباد
نیو دہلی دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
پیرزادہ میڈیکل سٹور بیراج روڈ سکھر
حافظ میڈیکل سٹور گجن پور روڈ لاڑکانہ
ہیل جنرل سٹور پیر بخش مارکیٹ شاہ عالم لاہور
طاہر شاپنگ سنٹر ریل بازار اوکاڑہ
محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان
راجہ برادرز تحصیل بازار سیالکوٹ
پاکستان جنرل سٹور کچہری بازار گول چوک سرگودھا
عظیم بیوٹی سنٹر مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
اوکے شاپنگ سنٹر صدر بازار ڈیرہ غازی خان
ایس نبی بخش میڈیکل سٹور مسلم بازار گجرات
گنجوی دواخانہ شاہی بازار بہاولپور
بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
گل برادرز آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد
جرمن ہومیو سٹور بانو بازار رحیم یار خان
ابن سینا سٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازیخان
حبیب دواخانہ گھنٹہ گھر بازار ملتان
المراد ہومیو سٹور ہائی سٹریٹ ساہیوال
شہزاد دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد
گورے اینڈ گورے میڈیکل سٹور کچہری بازار سرگودھا
نثار میڈیکل سٹور ریلوے روڈ سیالکوٹ
جرمن ہومیو سٹور اردو بازار گوجرانوالہ
الحافظ دواخانہ بانو مارکیٹ کلاں بازار ڈیرہ غازی خان
حی القیوم جنرل سٹور ہسپتال روڈ چکوال
کوثر دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد
سنگھار محل مارکیٹ مسجد اہلحدیث میاں چنوں
عوامی دواخانہ مین بازار مظفر آباد
یو پی پنسار سٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
دکن پنسار سٹور ہری کشن روڈ کوئٹہ
انعام کیمسٹ شمسی روڈ مردان
سعید فینسی سٹور اندرون کنگ گیٹ کوہاٹ
دارالشفاء سینا بازار منگورہ سوات
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور
گندھارا کاسمیٹکس سنٹر خان مارکیٹ شاہین بازار کریم پورہ پشاور
ممتاز اینڈ سنز نانگی کمرشل مارکیٹ میرپور آزاد کشمیر

ڈسٹری بیوٹرز
• ریاض محمود ۶۹۔ نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور • بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی
• محمد صالحین اینڈ سنز موتی والے چوک بازار ملتان • گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لئے
حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

نے مل کر وہ خدا کو تحفے میں دے دیا۔ مجھے جو روحانی تحفے ملے' وہ بہت بیش بہا تھے۔ صحیح معنوں میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے۔ دوسری طرف مجھے اس یقین کا تحفہ ملا کہ بلاشبہ اسلام سب سے اچھا اور اللہ کا سب سے پسندیدہ دین ہے۔ وہ رواداری اور محبت سکھاتا ہے۔ نفرت' تعصب اور تنگ نظری سے دور کرتا ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب سے ناواقفیت کے باوجود اتنے اچھے ہو سکتے ہیں کہ دوسرے ہمیں اس طرح سراہیں تو مذہب کو سمجھنے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد ہم عظمت کی کن بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مطالعہ کروں گا اور دین کی آگہی حاصل کروں گا۔

اور میں نے کیا بھی یہی۔ آج میں اسلام سے پہلے کی طرح بے خبر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بھی میں نے سمندر سے بس دو چار بالٹی پانی حاصل کیا ہے۔ اللہ نے زندگی دی تو یہ کام جاری رکھوں گا۔ جو کچھ سمجھ رہا ہوں' بساط بھر دوسروں تک بھی پہنچا رہا ہوں۔ آگہی بڑھتی رہنی چاہیے۔ اس خطے کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کمی رہی ہے۔

میرے نانا کا اسی سال اپریل میں انتقال ہوا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ میں نے پیچھے ان کے پھیپھڑوں کی بیماری کے بارے میں لکھا ہے۔ اگلی فصل کی بوائی کرتے ہوئے انہیں ٹھنڈ لگ گئی' جو چپکے چپکے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہیں نمونیا ہوگیا۔ ہوویل سے کئی بار ڈاکٹر کو بلایا گیا کیونکہ نانا کو اسپتال لے جایا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا' کیا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی حالت بہت تیزی سے گرتی چلی گئی۔

یہ سب کچھ صبح اور دوپہر کے درمیان ہوا۔ اس صبح مسٹر اور مسز ہینشا' مسٹر اور مسز اسٹیکبل اور مسز کاڈویل نانا کی عیادت کے لئے آئے۔ سبھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ لائے تھے۔ حالانکہ نانا ہر چیز سے بے نیاز تھے۔ وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کچن کے برابر والے بیڈ روم سے نانی نکلیں۔ انہوں نے بتایا کہ نانا کو ہوش آگیا ہے اور وہ مجھے بلا رہے ہیں۔

میں گیا اور نانا کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میں خوفزدہ تھا۔ اس وقت تک موت سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اب پتا چلا کہ موت سے آدمی اتنا خوفزدہ نہیں ہوتا' جتنا آدھی رات کو مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر آنے والے سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ موت جو مہربان ہے' نجات دلانے والی ہے۔ اللہ کی رحمت ہے اور اس پر فتح نہیں پائی جاسکتی کیونکہ وہ اللہ کا حکم ہے جو ٹلتا نہیں۔

مگر اس وقت میں یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں صرف تیرہ سال کا تھا..... اور خوف زدہ تھا۔ میں اپنے نانا کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ نانا بہت سفید' بہت کمزور ہوگئے تھے۔ ان کی آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہونٹ حرکت کررہے تھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے ان کے منہ سے اپنا کان ملا دیا۔

"جاؤ بیٹے۔ چہل قدمی کر آؤ۔" نانا سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"جاؤ..... بھیڑوں کے گلے کو دیکھو۔ اس میمنے کو ڈھونڈو۔"

"نہیں نانا' نہیں۔"

"میں کہتا ہوں' جاؤ۔"

"دل نہیں چاہ رہا ہے نانا۔"

"یہ میرا حکم ہے بیٹے۔"

لہجے کے اس تحکم نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے کرسمس کی رات چرچ کے باہر کسی کا تحکمانہ لہجہ یاد آگیا۔ جب کسی نے میلوڈین کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر نانا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی بڑے نانا کی آنکھوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ وہ ایک فوجی کی تجربہ آنکھیں تھیں۔

میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ڈگمگاتا ہوا چلا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ دیکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ باہر نکل کر میں چراگاہ سے گزرتا ہوا روڈ پر آیا۔ میں زندگی میں کبھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا اور میں بہت اکیلا بھی تھا پھر میں واپس آیا۔ بیری کی جھاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے چراگاہ میں چلا گیا' جہاں بھیڑوں کا گلہ موجود تھا۔ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ نانا نے مجھے کیوں بھیجا ہے۔ تاکہ ان کا وقت آئے تو میں ان سے دور رہوں اور کوئی کام کررہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ جب میں گھر واپس جاؤں گا تو نانی میری منتظر ہوں گی۔ وہ کہیں گی۔

"تمہارے نانا چلے گئے حارث۔"

وہ ایک گرم صبح تھی۔ دھوپ میں بڑی تمازت تھی۔ گھاس لمبی' بے حد ہری اور زندگی سے بھرپور تھی۔ نیلے آسمان پر چھوٹی چھوٹی سفید بدلیاں تھرک رہی تھیں' جیسے ٹریکٹر کا چھوڑا ہوا دھواں۔ ہوا پرندوں کے چہچہوں کی مٹھاس سے اور کھاد کے ذائقے اور معصومیت سے معمور تھی۔

میں چرتی ہوئی بھیڑوں کے نزدیک چلا گیا۔ بھیڑوں کے بال اتار لئے گئے تھے اور وہ بالکل سفید نظر آرہی تھیں۔ کچھ کے پیٹ موٹے ہورہے تھے۔ کچھ دنوں میں وہ بچے دینے والی تھیں۔ نر بھیڑ کالون وقتاً فوقتاً کسی بھیڑ کی طرف للچائی ہوئی نگاہ اچھالتا اور پھر بے نیازی سے گھاس پر منہ مارتا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر میں اس کرسمس والے میمنے کو تلاش نہ کرسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جانوروں کو صاف طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

میں نے بھیڑوں کو مخاطب کیا۔ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مجھ سے بولا نہیں جارہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"رک جاؤ۔" میں چلایا۔ "چرنا چھوڑ دو' تمہیں نہیں معلوم' کیا ہورہا ہے۔ تمہیں اپنے پیٹ کی پڑی ہے۔"

لیکن بھیڑوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے شغل میں مصروف

رہیں۔

"لعنتی بھیڑو۔" میں پھر چلایا۔ "تمہیں نہیں پتا کہ وہ جو تمہیں کھلاتا پلاتا تھا' جو تمہیں نہلاتا تھا' جو بچے پیدا کرنے میں تمہاری مدد کرتا تھا' وہ تمہارا ہمدرد' وہ تمہارا نگہبان..... تمہیں کچھ پروا نہیں اس کی۔ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ نہیں پتا نا تمہیں۔ بدبختو' وہ مر رہا ہے۔" میں بری طرح سسکنے لگا۔ "اس وقت منصر امروک مر رہا ہے۔ موت کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ وہ جانے والا ہے..... اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سنا تم نے؟ تمہیں کوئی پروا ہے یا نہیں؟"

مجھے سچ مچ رنج ہوا۔ بھیڑوں کو کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے ان سے منہ پھیرا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پوری چراگاہ میں دوڑ گیا۔ میں نے اچھل کر باڑھ پار کی اور سڑک پر چلا گیا پھر میں اناج گودام اور کباڑ گودام کے درمیان چکراتا پھرا۔ تھک گیا تو میری رفتار کم ہوگئی۔ میں نے آستین سے آنسو پونچھے کیونکہ میری نانی مکان کے باہر آکھڑی ہوئی تھیں اور میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں ان کی طرف بڑھنے لگا۔

میں قریب پہنچا تو نانی نے مجھے لپٹا لیا۔ میں بھی ان سے لپٹ گیا۔ "حارث..... میرے بچے' تمہارے نانا چلے گئے۔" انہوں نے رقت بھری آواز میں کہا۔ "بالآخر باپ بیٹے مل گئے..... ہمیشہ کے لئے!"

○☆○

نانی کو وہ گاڑی کبھی نہ مل سکی' جس کے لئے وہ رقم جمع کر رہی تھیں۔ نانا کے تین سال بعد وہ بھی چل گئیں۔ اس سے ایک سال پہلے ہی میں رہنے کے لئے ان کے پاس جا چکا تھا۔ میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ اب میرا دل شہر میں کبھی نہیں لگے گا۔

میں نے نانی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ نانی کی موت کے بعد میرے اصرار پر اور میری محبت سے مجبور ہو کر ممی اور ڈیڈی بھی وہاں آگئے۔ ہم سب وہاں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ وقت آنے پر ڈیڈی اور ممی بھی چلے گئے۔ میری شادی ان کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔

یوں میری کرسمس کہانی ختم ہوتی ہے۔ میں خوش اور مطمئن ہوں۔ میں نے مسلمان کا مطلب سمجھ لیا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ صحیح معنوں میں مسلم بنوں۔ مسلم یعنی اللہ کا فرمانبردار اور مطیع۔ میں نے ہر لمحے اپنے رب کی اطاعت کی کوشش کی ہے۔ کوتاہی بھی ضرور ہوئی ہوگی مگر وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

سب کچھ ہے مگر مجھے بڑے نانا کی وہ دعا یاد آتی ہے جو انہوں نے مجھے دی تھی۔ وہ پوری نہیں ہوئی اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے پوری ہوگی۔ میں سیدھا سادہ کسان بن گیا۔ میرے پاس تلوار نہیں' قلم ہے۔ میں جہاد کیسے کروں گا؟ شہید کیسے ہوں گا؟ یہ سب سوچ کر ایک لمحے کو میں مایوس ہوتا ہوں مگر فوراً ہی وہ مایوسی مٹ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے نانا کی کرسمس کی رات والی دعا اسی لمحے مقبول ہوگئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوگا مگر یہ ہوگا ضرور۔ میں جہاد بھی کروں گا اور شہادت بھی پاؤں گا..... انشاء اللہ۔

○☆○

کتاب ختم ہو چکی تھی مگر بریگیڈیئر کارتیلوف مبہوت بیٹھا تھا۔ اس نے کتاب کو بند نہیں کیا۔ آخری صفحہ اب بھی اس کے سامنے تھا۔

وہ عجیب کتاب تھی۔ کیا کہا جائے اسے؟ بریگیڈیئر سوچتا رہا۔ شاید یہ ایک معجزے کی..... نہیں' کئی معجزوں کی کہانی ہے۔ یا یہ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کو فروغ دینے کی کوشش ہے۔ یا یہ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے لکھی گئی ہے؟ بریگیڈیئر فیصلہ نہ کر سکا۔ بس وہ اتنا کہہ سکتا تھا کہ اتنی اثر انگیز کتاب اس نے اس سے پہلے نہیں پڑھی مگر سوال یہ تھا کہ کیا یہ کتاب مقدمے کے فیصلے کو تبدیل کرا سکتی ہے؟ اور اس پر سوچنے کے لئے بریگیڈیئر کے پاس چھ دن کی فرصت تھی.....

○☆○

وہ فیصلے کا دن تھا۔

"ملزم کیپٹن گورین' تمہیں اعتراف ہے کہ تم اپنے ساتھیوں پر فائرنگ کرتے وقت ہوش و حواس میں تھے؟" بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"یس سر۔" کیپٹن گورین نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور اس کے باوجود تم خود کو مجرم نہیں سمجھتے؟" ایک کرنل

بذریعہ ڈاک

خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ		بیوٹی پارلر کورس
اردو مڈل کورس (تعلیم بالغاں)	ڈرافٹسمین	ایئر کنگ	ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
ریڈیو ٹی وی سی آئی ٹیکنیشن	الیکٹریشن	کمپیوٹر	اسکول ٹیچنگ میتھڈ
انٹیریئر ڈیکوریشن	فوٹو گرافی	صحافت	امپورٹ ایکسپورٹ
فزیکل ہیومن ویلفیئر سلمنگ	شمسی توانائی	کوکنگ بیکنگ	فلاور میکنگ
آئل پینٹنگ	میڈیکل ایڈ	ڈینٹل ٹیکنیشن	لیڈیز ٹیلرنگ
ایئر لائن کیبن سپروائزر کورس (صرف خواتین)	پبلک ریلیشن آفیسر	نیوز رپورٹر	مہر سازی

یہ تمام کورسز اردو میں لیکچرز، تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹیڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک گھر کے لوگوں کو گھر بیٹھے کرائے جاتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی

پوسٹ بکس 1237 جی پی او، اسلام آباد

نے پوچھا۔
"یس سر۔"
"تم نے اپنے ساتھیوں کو مجرم سمجھ کر خود سزا دی۔ جبکہ تمہیں اس کا حق نہیں تھا۔" دوسرا کرنل بولا۔
"ہاں۔ ہم ان کا کورٹ مارشل کرسکتے تھے۔"
کیپٹن گورین چند لمحے بریگیڈیئر کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔
"اس طرح کے واقعات اب آئے دن ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے۔ نسل خراب کرنے کے نام پر مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی جاتی ہے۔ اب تک کسی ایک سپاہی کا بھی کورٹ مارشل نہیں ہوا۔ پوری دنیا چیخ اٹھی ہے مگر ہم نے دکھاوے کے لئے بھی کچھ نہیں کیا۔"
"تم مسلمان تو نہیں ہو؟"
"نو سر۔"
"اس کتاب کے حوالے سے اپنے بارے میں بتاؤ۔" کرنل نے فرمائش کی۔
"اس کتاب میں فادر گورین کا جو تذکرہ ہے' وہ میرے دادا تھے اور میرے والد ایلک گورین' حارث انکل کے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے۔"
"اس لئے تم اتنے جذباتی ہوگئے۔"
"یہ بات نہیں سر۔ ظالم کا ہاتھ کسی کو تو پکڑنا پڑتا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"فرض کرلیں' میرے ساتھیوں نے یہی سب کچھ عیسائیوں کے ساتھ کیا ہوتا اور میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کیا کرتے۔"
"وہی جو تم نے کیا۔" بریگیڈیئر نے بے ساختہ کہا پھر کسی احساس کے تحت اس نے بات بنائی۔ "مگر پھر بھی یہ جذباتی فیصلہ ہوتا۔"
"میں نے اپنا پوائنٹ ثابت کردیا جناب۔" گورین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اسی لئے مجھے اپنی برات پر اصرار ہے۔ جناب عالی' مسلمان ہوں' عیسائی ہوں یا کوئی اور قوم ہو۔ انسان کے خون کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔۔۔ سرخ مگر ہمارا رویہ ایسا ہے' جیسے مسلمانوں کے خون کا رنگ مختلف ہوگا مگر ایسا ہے نہیں جناب۔"
"ہم پندرہ منٹ کا وقفہ کررہے ہیں۔" بریگیڈیئر نے اعلان کیا۔ "اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا۔"
عدالت کے تینوں ارکان اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک دوسرے کا فیصلہ سنا۔ بالآخر وہ عدالت میں چلے آئے۔
گورین پُرامید نظروں سے ایک ایک چہرے کو تک رہا تھا۔
"ہم تمہیں متفقہ طور پر سزائے موت سناتے ہیں کیپٹن گورین۔ اب سے تھوڑی دیر بعد تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا جائے گا۔" بریگیڈیئر نے سرد لہجے میں کہا۔
"تھینک یو سر۔" گورین مسکرایا۔ "مجھے اس فیصلے کے بارے میں بالکل شبہ نہیں تھا جناب۔"
"کیسے؟"
"میں یا پوری دنیا لاکھ کہتی رہے کہ ہر انسان کے خون کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے مگر آپ جیسے تعصب کی رنگین شیشوں والی عینک آنکھوں پر چڑھا کر دیکھنے والوں کو لہو کے دو رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو یہاں وہ سب کچھ نہ ہوتا' جو ہو رہا ہے۔"
"تقریر مت کرو۔" کرنل نے اسے ڈپٹا۔
"ہاں۔ تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ پوری کردی جائے گی۔" بریگیڈیئر نے کہا۔
"نہیں سر۔ آپ یہ بھی نہیں کرسکیں گے۔"
"جاں بخشی کے سوا تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔ تمہیں وہ ملے گا۔" بریگیڈیئر نے یقین دلایا۔
"آپ یقین سے کہہ رہے ہیں۔"
"شیور۔"
"تو کسی مسلمان عالمِ دین کو بلا لیں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" گورین نے کہا۔
تینوں منصفوں کے چہرے دھواں دھواں ہوگئے۔ بریگیڈیئر نے مسلح پہرے داروں کو اشارہ کیا۔ "اسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے لے جاؤ۔۔۔ فوراً۔"
"میں نے کہا تھا نا' آپ میری آخری خواہش پوری نہیں کرسکیں گے۔" گورین نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "مگر یہ خواہش پوری کرنے کے لئے مجھے آپ کی اجازت یا مدد کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ گواہ رہیں۔۔۔" اس کی آواز بلند ہوگئی۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"
بریگیڈیئر کے اشارے پر پہرے دار سزائے موت کے مجرم کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ تینوں فیصلہ سنانے والوں کے چہروں پر کھسیاہٹ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بھی نظر نہیں ملا رہے تھے۔ ان کے سر ایک طرف جھکے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کچھ سننے کے منتظر ہوں۔
پھر باہر دنوں گنیں گرجیں۔۔۔ ایک آواز میں۔۔۔ ایک بار۔۔۔ دوسری بار۔۔۔ اور تیسری بار۔۔۔ ان تینوں نے سکون کی سانس لی مگر فوراً ہی مضطرب ہوگئے۔ انہیں واضح طور پر کلمۂ شہادت کی پکار سنائی دی تھی۔ اشھدُ ان لا الٰہ الا اللہ واحدہٗ لا شریک لہ واشھد ان۔۔۔
"کیا تم بھی وہی سن رہے ہو' جو میں سن رہا ہوں؟" بریگیڈیئر نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔
انہوں نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے سروں کو اوپر نیچے ہلا دیا۔
▲▲▲

پاگل

علیم الحق حقی

وہ ایک پاگل بڑھیا تھی۔ کیونکہ بدلتی ہوئی دُنیا اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور بدلتی ہوئی دُنیا جس کی سمجھ میں نہ آئے اُسے پاگل کے سوا اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے مگر وہ بڑھیا پاگل کے سوا شاید کچھ اور تھی۔

ایک ایسی کہانی جس کے انجام میں واقعی ایک دنیا کانپ اٹھے

پاگل بڑھیا کہلانے سے پہلے وہ صرف بڑھیا کہلاتی تھی۔ اس سے پہلے وہ بوڑھی مسز نیلسن تھی اور اس سے پہلے (یہ بہت، بہت، بہت پرانی بات ہے) وہ مسز نیلسن تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ مسٹر نیلسن بھی ہوتے تھے مگر اب تو بس ان کی چند نشانیاں رہ گئی تھیں۔ جنگ کی یادگاریں جو مینٹل پیس پر لائن سے رکھی ہوئی تھیں۔ اب تو مینٹل پیس سے گرد بھی نہیں جھاڑی جاتی تھی۔ ان میں ایک بحری جنگی جہاز کا ماڈل تھا۔ دشمن کا ایک ہیلمٹ تھا، دشمن ہی کا ایک بم تھا، ایک چاقو تھا، کچھ اور چیزیں تھیں چھوٹی چھوٹی۔ دشمنوں کے بیج اور بٹن وغیرہ۔

ان دنوں دشمن بہت دور کی چیز معلوم ہوتا تھا اور شاپنگ بہت آسان تھی۔

اب تو چند بلاک کا فاصلہ بھی میلوں پر محیط معلوم ہوتا ہے۔ پہلے چند بلاک چلنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ پیڑوں کے سائے سائے...

پرانی طرز کے خوش نما مکانات کے ساتھ ساتھ چلنا کتنا بھلا لگتا تھا۔ پرانے فیملی اسٹورز تھے' جہاں سے اشیائے ضرورت خریدی جاتی تھیں۔

اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ درختوں کو بدلتے وقت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کا شعور نہیں تھا۔ ان کی شریر شاخیں بجلی کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ ان کی جڑیں گندے پانی کی لائنوں کے لئے رکاوٹ بنتی تھیں اور ان کے تنے فٹ پاتھوں کو تنگ کرتے تھے۔

چنانچہ بیشتر پرانے درخت کاٹ ڈالے گئے۔

یہ ایک بہت بڑا شاک تھا' جس کے لئے بوڑھی مسز نیلسن کو کسی نے ذہنی طور پر تیار کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک دن کہیں کوئی بڈھا درخت فٹ پاتھ پر کمر جھکائے کھڑا نظر آتا۔ دوسرے دن وہاں مرے ہوئے تنے' بریدہ شاخوں اور زخمی ٹہنیوں' پتوں اور برادے کے سوا کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن وہ کچھ بھی نہ رہتا۔

پرانے طرز کے مکانات بھی گرادیئے گئے تھے... اور جو نہیں گرائے گئے تھے' ان کے حلئے تبدیل ہوگئے تھے۔ انہیں اور اونچا کردیا گیا تھا اور ان کے کئی کئی حصے کردیئے گئے تھے۔ اب وہ اپارٹمنٹ کہلاتے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ مکینوں کو ان اپارٹمنٹس سے وہ وابستگی محسوس نہیں ہوتی تھی' جو پرانے گھروں سے انہیں رہی تھی۔

جہاں تک پرانے فیملی اسٹورز کا تعلق ہے وہ بھی اس انقلاب کی زد میں آئے تھے۔ ایسے ہی ایک اسٹور کے مالک مسٹر برمن نے کہا تھا "میں تو اب کوئی چیز بھی نہیں بیچ سکتا۔ اس لئے کہ سپر مارکیٹ سے ہر چیز اس قیمت میں مل جاتی ہے' جس میں میں خریدتا ہوں۔ اور مسز نیلسن' بچے بھی اب پہلے کی طرح اپنے والدین سے پیسے لے کر چیز خریدنے نہیں آتے۔ اب تو وہ صرف چیزیں چرانے آتے ہیں۔ میں سوچتا تھا' میرے بعد میرا بیٹا اسٹور سنبھالے گا لیکن وہ ویت نام سے تابوت میں واپس آیا۔ اب کیا ہوسکتا ہے؟"

سپر مارکیٹ وہاں بنائی گئی تھی' جہاں کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔ حالانکہ اسے وہاں بننا چاہئے تھا' جہاں پرانے اسٹور تھے۔ وہ پرانا سرکاری باغیچہ' جہاں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے' سپر مارکیٹ کے لئے اجاڑ دیا گیا تھا۔ اب بچے باغیچوں کے بجائے سڑکوں پر کھیلتے تھے۔

اور پھر سپر مارکیٹ میں چیزیں سستی ملتی تھیں تو ادائیگی بھی نقد کرنا ہوتی تھی۔ مہینے بھر کا ادھار نہیں چلتا تھا اور سامان کوئی لڑکا گھر پر نہیں پہنچاتا تھا۔ پہلے تو ڈیلیوری بوائے گھر پر سودا پہنچانے آتا تھا اور اسے گھر پر پکی ہوئی کوئی چیز کھانے کو دی جاتی تو خوش ہو کر شکریہ ادا کرتا تھا۔

مسٹر نیلسن کی موت کے بعد اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لڑکا سودا لے کر آتا تو ۲۵ سینٹ کے عوض لان ٹھیک کردیتا' گھاس کاٹ دیتا۔ خالی بوتلیں لے کر شکریہ ادا کرنے کا رواج بھی تھا۔ پہلے کے غریب لوگ بوتلیں فٹ پاتھ پر یا بجلی کے کھمبوں پر مار کر توڑنے کو زیاں سمجھتے تھے۔

اب تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ لان کی صفائی اور گھاس کی کٹائی کے لئے ایک ڈالر کے عوض بھی کسی لڑکے کی خدمات میسر نہیں آتی تھیں۔ بوتلیں تفریحاً توڑ دی جاتی تھیں... اور غریب لڑکے توڑتے تھے۔

"یہ دنیا کس طرف جارہی ہے؟" بوڑھی مسز نیلسن ایک ایک سے پوچھتی۔ پھر وہ چیختی "میں سب جانتی ہوں' مجھے سب معلوم ہے' تم لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہو۔"

یہ وہ وقت تھا' جب لوگوں نے اسے پاگل بڑھیا کا نام دیا۔ وہ کہتی تھی کہ بڑے لڑکے اس پر چٹانیں پھینکتے ہیں۔ بڑے لڑکے اس کی تردید کرتے اور پولیس کا کہنا تھا کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

جب اس نے شاپنگ کے لئے نکلتے وقت اپنے سر پر فوجی ہیلمٹ رکھنا شروع کیا تو لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اور وہ شاپنگ کے لئے گھر سے نکلنے پر مجبور تھی۔ وہ زمانے تو لد گئے تھے جب کسی اسٹور کو فون کر کے کہہ دیا جاتا تھا "کہو بھئی' ایسٹھر اور ننھے نومولود کا کیا حال ہے؟ اور ہاں' ایک پاؤ چینی' اور ایک پاؤ مکھن بھجوادینا۔"

کبھی کبھی پگلی کے ذہن سے یہ بات نکل جاتی' وہ پرانا نمبر ڈائل کرتی' جو اسے اب بھی یاد تھا لیکن اب وہاں کوئی اور فیملی رہتی تھی۔ وہ اس کی خریداری کی فرمائشوں کے جواب میں گندی زبان استعمال کرتے تھے۔ لوگوں میں اخلاق نام کی چیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔

پرانے علاقوں میں اب بھی پرانے' بڈھے جنٹلمین اور لیڈیز موجود تھیں لیکن شروع میں وہ انہیں بوڑھا ماننے کو تیار ہی نہیں تھی "میری دادی بوڑھی تھی" وہ کہتی "اور اسے پرانی خانہ جنگی یاد تھی۔ مرتے دم تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی ملنے والے کا جنم دن بھولی ہو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں میری دادی یاد ہوگی۔"

"لو' پاگل بڑھیا کو دیکھو' خود سے باتیں کررہی ہیں" نوجوان لڑکیاں بہ آوازِ بلند تبصرہ کرتیں۔ ان کے لہجے بہت خراب ہوتے۔

اور پگلی کے تصور میں لہراتی ہوئی مسز جارج' جو کبھی کی مرچکی تھی' اسے دلاسا دیتے ہوئے کہتی "تم ان کی باتوں پر کان مت دھرو مسز نیلسن۔ ہم یہ ظاہر کریں گے' جیسے ہم نے ان کا تبصرہ سنا ہی نہیں۔"

"مسز جارج... یہ تمہارا ہاتھ۔ کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟"

"آؤ چہل قدمی کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ نہیں سن رہے ہوں گے تب میں تمہیں بتاؤں گی۔"

مسز جارج پیاری عورت تھی۔ اپنے زمانے میں تو وہ بہت ہی خوب صورت رہی ہوگی۔ پگلی سوچتی رہی۔ آخر کسی نے اس کا ہاتھ کیوں توڑ دیا۔

"میری شاپنگ کی رقم میرے پرس میں رہتی ہے اور کہاں رکھوں؟ میں کہیں اور گھر بھی نہیں لے سکتی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

اس سے ثابت ہوگیا کہ باہر نکلتے وقت ہیلمٹ پہننا کتنا ضروری ہے۔ مسز جارج کا ہاتھ اسی چکر میں ٹوٹا۔ کسی نے اس کا پرس چھینا' اسے دھکا دے کر گرایا اور رفو چکر ہوگیا۔

ہیلمٹ نہ پہنا جائے تو وہ لوگ سر توڑ دیں۔

کون وہ لوگ؟

"تم انہیں پکڑتے کیوں نہیں؟" وہ پولیس والوں سے کہتی۔

پولیس والوں نے کہا کہ اس حلقے پر تو علاقے کے تمام لڑکے پورے اترتے ہیں۔ کس کس کو گرفتار کریں۔

مسز شلز کے قتل پر بھی پولیس والوں نے یہی کہا تھا لیکن اگر وہ ہیلمٹ پہنے ہوتی تو اس کا سر کیوں پھٹتا۔

اس سے ہیلمٹ کی اہمیت واضح ہوتی تھی۔

"پولیس ہوتی کس لئے ہے؟ تم لوگ انہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟" وہ پوچھتی۔

"وہ کون؟"

پھر پگلی بھی زد میں آگئی۔

کسی نے اسے دبوچا' اس کا ہیلمٹ اتارا اور اسے دھکیل کر گرا دیا۔ پھر وہ زیادہ تیز بھی نہیں بھاگا' بار بار پلٹ کر دیکھتا اور ہنستا۔

"تم بہت خوش قسمت تھیں۔" ایک پولیس مین نے پگلی سے کہا۔ "ممکن ہو تو رات کے وقت گھر سے نکلا ہی نہ کرو۔"

"لیکن یہ دن کی بات ہے۔" بڑھیا نے چیخ کر کہا۔

ایک روز کسی نے اوپر فلیٹ کی کھڑکی سے اس پر چٹان پھینکی لیکن نہیں' وہ چٹان نہیں تھی۔ وہ پتھر بھی نہیں تھا وہ تو اس کے شوہر کا یادگار ہیلمٹ تھا لیکن اسے بری طرح پچکا دیا گیا تھا۔ اب وہ ہیلمٹ ہی نہیں لگتا تھا۔

پگلی نے سوچا' اب اپنے تحفظ کے لئے کیا کروں میں؟ اب گوشت خریدنے نکلوں گی تو کیا ہوگا۔ پولیس کہاں ہے؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟

"سوری لیڈی سوری۔" پولیس مین نے کہا "آپ اتنا بڑا چاقو اپنے پرس میں رکھ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں۔ یہ خلاف قانون ہے۔"

"تو پھر میری حفاظت کون کرے گا؟ تم لوگ تو نہیں کر سکتے۔"

بڑھیا چلائی۔ "اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں رہا۔"

وہ چاقو بھی اس کے شوہر کی نشانیوں میں سے تھا لیکن پولیس مین نے اسے ضبط کر لیا۔

وہ چیخ کر مسز جارج کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے زمانے میں کتنی حسین خاتون رہی ہے۔ اس نے چیخ کر مسز جارج کو پکارا لیکن سڑک پر بہت شور و غل تھا۔ ہر گھر کی کھڑکی سے ریڈیو کی' ٹیپ کی' ریکارڈ پلیئر کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ پھر چلائی "مدد... مدد..." لیکن اتنے شور میں کون اس کی سنتا۔

اور اس شخص کی رفتار حیرت انگیز تھی' جس نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے مسز جارج کا پرس جھپٹا تھا اور اسے نیچے گرایا تھا پھر ہنستا ہوا' پرس اچھالتا ہوا بھاگتا چلا گیا تھا۔

"ایسا تو میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔" پگلی نے سوچا' اور اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں۔ چاقو پولیس مین نے ضبط کر لیا اور شاپنگ کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ اب کیا کروں؟ اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں لیکن اس میں جیبیں رہی ہی نہیں تھیں گویا پرس لے کر نکلنا ضروری تھا۔ اب کیا ہو؟

اس نے پرس کے تسمے کو ایک زنجیر کی مدد سے اپنے ہاتھ سے باندھ لیا۔ پرس میں محض چند ڈالر تھے۔

اسے اپنے عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو اس نے چلانا شروع کر دیا لیکن اتنے شور میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ جانتی تھی کہ ایک دن ایسا ہوگا اور اب وہی کچھ ہو رہا تھا۔

اس نے بڑھیا کے پرس پر جھپٹا مارا' زوردار جھٹکا دیا۔ استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی نازک زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ پرس لے کر یہ جا وہ جا۔

بڑھیا نے سوچا۔ میں پاگل ہی تو ہوں' جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میرے استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی یہ زنجیر پرس کو بچا لے گی۔

بڑھیا چیختی رہی' اور وہ بھاگتا رہا۔ پرس میں لوہے کی کوئی چیز کھنکھنا رہی تھی۔

اچکا بمشکل آدھے بلاک دور گیا ہوگا کہ بم پھٹ گیا۔

سب جانتے تھے کہ وہ پاگل ہے۔ پاگل خانے میں سب اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تنہائی بھی نہیں' اور وہ آزادانہ شاپنگ کر سکتی ہے۔ وہ پرس جھلاتی ہوئی پاگل خانے کی کینٹین جاتی ہے ... اور کوئی اسے پریشان نہیں کرتا۔ کوئی اس سے پرس نہیں چھینتا۔

اب وہ محفوظ ہے!

CRAZY OLD LADY
AVARM DAVIDSON

"صبح میں نے ہوا کو دیکھا۔" لڑکے نے انگلیوں سے چاولوں کا نوالہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہوا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "تُو کھانا کھا جلدی سے اور کام پر جا۔"

"میں نے سچ مچ اُسے دیکھا تھا باپو۔" لڑکا مُصر تھا۔ "میں بکریاں چرانے وادی میں گیا تو وہ مجھے نظر آئی۔ وہ اکیلی تھی... بہت اوپر... اور ہنس رہی تھی۔ اُسے کھیلنا اچھا لگتا ہے۔"

"کسے اچھا نہیں لگتا۔" باپ نے بدمزگی سے کہا۔ "خاص طور پر کام کا وقت ہو تو کھیلنا ہی اچھا لگتا ہے۔ اِدھر آ۔" جھاڑو کہاں ہے تیری۔ دیکھ سات بجے کا ہونپو بج گیا۔ تجھے اس وقت بنگلے میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے دیکھ... میں آفس کا فرش دھو بھی چکا۔ جلدی کر... جلدی۔ تُو نے پھر دیر کی تو صاحب خفا ہو گا۔ اس نے بارش سے پہلے ہمارے گھر میں ٹین کی چھت ڈلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ تُو وقت پر جانا بھولے گا تو صاحب چھت ڈلوانا بھول جائے گا۔ جلدی کر... جلدی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر لڑکے کا کان تھاما' اسے مروڑا اور کھینچ کر لڑکے کو کھڑا کر دیا پھر اس نے پھول جھاڑو اس کی بغل میں ٹھونسی اور اس کی پیٹھ پر دھول جمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن لڑکا مچھلی کی طرح سے پھسلا اور دروازے سے گزر کر ٹھنڈی چمکیلی صبح میں نکل گیا۔

"تُو نے ہوا کو دیکھا تھا... ایں۔" باپ نے چیخ کر طنز کیا۔

"ہاں... میں نے سچ مچ دیکھا تھا۔" لڑکے نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ وہ چائے کے باغ میں دھوپ چھاؤں سے سجی پگڈنڈی پر دوڑ رہا تھا۔ "میں نے اُسے دیکھا۔ وہ اکیلی تھی... بہت اوپر۔ اور ہنس رہی تھی۔"

اُسی وقت ہوا نے لڑکے کے بالوں کو چھوا۔ وہ بڑا سازشانہ' خوشدلانہ لمس تھا۔ جیسے وہ اسے راز فاش کرنے سے منع کر رہی ہو۔ اس نے اس کے لفظوں کو تھاما اور انہیں اپنے ساتھ لے اُڑی۔ اس نے ان لفظوں کو کبھی اچھالا' کبھی پکڑا اور پھر بادلوں کے سپرد کر دیا' جو پہاڑ کی چوٹی پر مجمع لگا رہے تھے پھر اس نے انہیں بادلوں سے چھینا اور سایہ دار درختوں کی شاخوں پر دے مارا۔ سوکھے پتے ناچتے' تھرکتے' سرگوشیاں کرتے نیچے اترنے لگے۔

"... وہ اکیلی تھی... بہت اوپر... اور ہنس رہی تھی۔" اس کے لفظوں کی بازگشت پہاڑ کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک... افق تا افق ناچتی رہی۔

لڑکے نے جھک کر راستے سے ایک پتھر اٹھایا اور کھلنڈرے پن سے ہوا کی طرف اچھال دیا۔ "مجھ سے چھیڑ کرتی ہو؟" لیکن پتھر ہوا تک پہنچنے سے پہلے ہی مڑا اور زمین کی طرف لوٹ آیا۔ لڑکے کو مایوسی ہوئی۔ عام سے... بے کار پتھر سے کھیلنے کو کس کا جی چاہتا ہے؟

کاش اُس کے پاس کوئی رنگین پتنگ ہوتی۔ ویسی جیسے اس نے

کھیلنے کی شوقین جوان ہوا کی کہانی

کھیلنا کسے اچھا نہیں لگتا! اور ہوا تو کھیلنے کی بہت ہی شوقین ہوتی ہے۔ آوارہ بادل، درختوں کے پتے اور کاغذی پتنگیں ہوا کے محبوب کھلونے ہیں... لیکن کچھ کھلونے بعض کھیلنے والوں کے لیے نئے ہوتے ہیں۔ خود سے کھیلے جانے کی تمنا رکھنے والے یہ کھلونے کھلاڑیوں کو کھیلنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔

جوان ہوا

علیم الحق حقی

ایک مہمان صاحب کے بچے کو اُڑاتے دیکھا تھا... وہیں بنگلے میں۔ اس کے پاس بھی ویسی پتنگ ہوتی تو وہ اسے ہوا پر اچھال پھینکتا اور اسے آسمان کی طرف بڑھتے دیکھتا' پھر وہ اور ہوا پتنگ پتنگ کھیلتے' خوب ہنستے' ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرتے۔

اس نے بانسوں کے پُل کو نظر انداز کیا اور بنگلے کے پیچھے والے نالے کو اچھل کر پار کیا۔ وہ سوچ رہا تھا... یہ پُل تو بڈھے' رعشہ زدہ لوگوں اور معذوروں کے لیے ہوتے ہیں۔ لڑکوں کے لیے نہیں۔ نالا پار کر کے اسے لیچی کا درخت اور بوگن ویلیا کا جنگلا نظر آیا۔ سامنے ہی بنگلے کا... سفید چہرہ تھا... اور دیکھتی' تاکتی ہوئی کھڑکیوں کی بے شمار آنکھیں اور اندر پورے دن کی گرد اٹھائے' جھاڑو اور پونچھے کے منتظر فرش۔

اور وہ خود ہوا کی طرح تھا' جوان... اکیلا... اور اسے کھیلنا اچھا لگتا تھا!

اس نے سر اٹھا کر ہوا کو دیکھا اور جھاڑی اس طرح لہرائی' جیسے صاحب لوگ رخصت ہوتے وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر ہاتھ لہراتے ہیں۔ لڑکے کا خیال تھا کہ اس طرح قسمت ان پر مہربان ہوتی ہے... اور دیوتا ان سے خوش ہوتے ہیں۔

"ہوا!" اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر' چیخ کر ہوا کو پکارا۔ "اے آسمان پر اڑنے والی ہوا۔"

ہوا نے اس کے ناکافی لفظوں کا مذاق اُڑایا۔ وہ اس کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر اسے جنگلے کے اوپر اچھال دیا۔ جھاڑو سبزیوں کے باغیچے میں گری۔ وہ ہنستا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔

"میرا انتظار کرنا ہوا۔" وہ چلایا۔ "دوپہر کا بھونپو بجنے تک میرا انتظار کرہوا۔"

"وہاں سے نکل... ننھے شیطان۔ باہر آ۔ تُو نے یہ اپنی گھٹیا جھاڑو صاحب کی ترکاریوں میں پھینکنے کی جرأت کیسے کی۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ تو پھر آدھا گھنٹا دیر سے آیا ہے۔ میں کب سے اس سرد برآمدے میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

اردلی' اسے گھور رہا تھا۔ وہ مختصر سا آدمی تھا... جھریوں سے بھرا۔ دیکھنے میں وہ جنگلی بندر جیسا لگتا تھا۔ ایسا جنگلی بندر' جس کے دونوں میں ادھ جلی بیڑی دبی ہو' ایسا بندر جو سر پر پگڑی باندھتا ہو۔

"سب ہوا کی وجہ سے ہوا ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"ٹھہر تو جا۔ ابھی میں تیری ہوا نکالتا ہوں۔" بڈھے اردلی نے کہا۔

دونوں ایک ساتھ بنگلے میں داخل ہو گئے۔

****

وہ کام میں الجھا رہا۔ فرش تھا... قالین تھے' آتش دان تھے' لوہے کی ٹوکریاں تھیں' کچن کے کوڑے دان تھے' کوڑے کی ٹوکریاں تھیں۔ بہت سارا کام اس کا منتظر تھا۔ پھر فرنیچر سے گرد جھاڑنا' اس پر پالش کرنا اور فرش پر پونچھا لگانا۔ فرش بہت لمبا تھا اور باہر ہوا اس کے انتظار میں گھنے سایہ دار درختوں سے کھیل رہی تھی۔

ایک بار وہ چمنی کی طرف سے اُسے پکارتی... چیختی آئی۔ "لڑ... کے... لڑ... کے..." اور چمنی سے راکھ اڑی اور اس کے چہرے پر جھپٹی۔ اس کا..... دم گھٹنے لگا پھر اسے چھینکیں آنے لگیں۔ دوسری طرف بڈھا اردلی اس پر چڑھ دوڑا۔ "حرام خور... ٹھہر تو جا۔ جان بوجھ کر قالین اور کرسیوں کے کور خراب کرتا ہے۔"

دروازے کی طرف سے چھوٹی میم صاحب نے پکارا۔ "لڑکے... جیسا اردلی بولتا ہے' ویسا کر۔ احتیاط سے..."

میم صاحب اس سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی اور عام طور پر وہ اسے جواب نہیں دیتا تھا۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ نظر اٹھانا یا جواب دینا بری بات ہے' ادب اور احترام کے خلاف ہے لیکن اس صبح سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے جوان ہوا کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے راکھ سمیٹتے ہوئے ہاتھ رکے اور اس نے پلٹ کر اپنے کندھے کے اوپر سے میم صاحب کو دیکھا۔ میم صاحب کے ہاتھ میں قینچی تھی' جسے وہ ہوا میں یوں چلا رہی تھی' جیسے خیالی پودوں کی شاخیں برابر کر رہی ہو۔ دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی۔

"یہ ہوا کی حرکت تھی میم صاحب۔" اس نے کہا۔

"آہا۔" وہ بولی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے باہر باغیچے میں قدم رکھا تو سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جیسے ہوا کو تلاش کر رہی ہو۔ صبح اب دوپہر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

میم صاحب نے گتے کا ایک ڈبا اسے پھینکنے کے لیے دیا۔ اس میں اسے سرخ کاغذ نظر آگیا... پھولوں کے سے سرخ رنگ کا اور ایسا صاف ستھرا اور شفاف جیسے شیشہ ہو۔ اس نے کاغذ نکالا اور اسے برآمدے میں لے گیا۔

"اب کوئی اور شیطانی سوجھ رہی ہے تجھے؟" بڈھے اردلی نے پوچھا۔ وہ بیٹھا صاحب کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے اسے کاغذ دکھایا۔ ہوا فوراً ہی کاغذ کی طرف لپکی۔ کاغذ پھڑپھڑانے لگا۔

"احتیاط سے ہوا..." لڑکے نے چیخ کر کہا۔ "شرارت نہ کر۔ ذرا ٹھہر جا۔ میں تیرے لیے پتنگ بناؤں گا۔"

"احتیاط سے ہوا..." بڈھے اردلی نے منہ بگاڑ کر اُس کی نقل اتاری۔ "بھنگی کا لڑکا... نام رام داس... اور ہوا سے چھیڑ خانی کرے ہے۔ ہوا تجھ سے باتیں کرتی ہے! اور تجھ جیسا جنگلی پتنگ بنانا کیا جانے۔ ہاں... میں جب لڑکا تھا... تیری عمر کا۔ تو شہر میں رہتا تھا۔ جہاں میرے باپ کا مکان تھا...."

لیکن رام داس ہنس رہا تھا... پتنگ کے تصور سے ہی خوش تھا۔ اس نے اردلی کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے پونچھے کے جو کپڑے

سکھانے کے لیے دھوپ میں پھیلائے تھے' ہوا اب اُن سے کھیل رہی تھی۔

"... دو تیلیاں لچک دار بانس کی....." اردلی کہہ رہا تھا... "انہیں یوں موڑو... اے یوں..." اس نے اشارے سے بتایا۔

"یہ تو جوتے ہیں۔" رام داس نے کہا۔

"بے اُلو... میں کہہ رہا ہوں' دو تیلیوں کو یوں کراس کرتے ہیں..." بڈھا اردلی کہتا رہا۔ "میرے والد کا ایک دوست تھا۔ بھلا سا نام تھا اس کا۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا۔ ہاں تو ہم اس کی دکان پر جاتے تھے' مانجھے اور پتنگ کی دکان تھی اس کی۔ تو ہم وہاں بیٹھ کر اسے پتنگیں بناتے دیکھتے تھے۔ بعد میں ہم اس سے پتنگیں لے کر جاتے' چھت کا رخ کرتے۔ وہاں سے ہم پتنگ اُڑاتے۔ دوسری... اونچی اونچی اڑنے والی پتنگوں کے ساتھ' بڑی بڑی عمارتوں سے اونچی۔ وہاں ہزاروں لاکھوں پتنگیں اُڑ رہی ہوتیں۔ اور تو... تو جنگلی لڑکا... تو مجھے پتنگوں کے بارے میں کیا بتائے گا۔ دو چھڑیاں ہوں اس سائز کی۔ ایک کو کمان کی طرح یوں موڑا جائے اور دوسری سیدھی سیدھی..." اردلی اٹھا اور عقبی سیڑھیوں کی طرف گیا۔ وہاں سے اس نے پکارا۔ "مالی... مالی!"

رام داس نے کاغذ ایک طرف رکھ دیا۔ "ہوا... دوپہر تک انتظار کر۔ دوپہر کا بھونپو بجے گا تو تجھے تیری پتنگ مل جائے گی۔" اس نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

اس نے بلی کے رہنے والے کیبے میں تازہ مٹی بھری اور اسے دوبارہ اندر لے گیا پھر اس نے اپنا کپڑا اور پالش کا ٹن سنبھالا اور باتھ روم کے فرش پر پالش کرنے لگا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ کر وہ فرش صاف کرتا رہا یہاں تک کہ فرش میں اسے اپنا عکس نظر آنے لگا اور اس تمام عرصے میں ہوا چلاتی رہی... اپنی پتنگ کا مطالبہ کرتی رہی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ پتنگ کیسے بنائے' جس کا اس نے ہوا سے وعدہ کر لیا ہے۔ اس نے زندگی میں صرف ایک بار پتنگ دیکھی تھی۔ رنگین کاغذ کا ایک مرتب ٹکڑا' جو دو چھوٹی کمچیوں پر تان کر چپکایا جاتا ہے۔ ایک کمچی سیدھی اور دوسری کمان کی شکل میں۔ جسے آسمان کی طرف اچھالا جائے تو وہ اوپر ناچنے لگتی ہے۔

"پتنگ!" باتھ روم کی کھڑکی سے اندر آتی ہوا گڑگڑا رہی تھی۔ "میری پتنگ" وہ التجا کر رہی تھی... کھڑکی کے پردوں سے سر ٹکرا رہی تھی' پھر اس نے دیوار پر لٹکی ہوئی کاغذ کی جھالر کو اکھاڑا اور ہار کی طرح رام داس کے گلے میں ڈال دیا۔

"شریر ہوا۔" لڑکا خوشی سے چلایا۔ اس نے جھالر کو دوبارہ اتکا دیا۔

دو پتلی ہوئی' پتلی چپٹی تیلیاں۔ اردلی نے کہا تھا اور انہیں یوں ایک دوسرے سے کراس کرو... ایک کو موڑو کمان کی طرح۔ اردلی کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ عقبی برآمدے کے فرش پر لکڑی کی دو کمچیاں رکھی تھیں۔ سیدھی' صاف ستھری اور ہموار۔ قریب ہی بڑے صاحب کی گوند کی شیشی رکھی تھی۔ ڈور کا ایک گولا بھی تھا۔

"اِدھر آ لڑکے... کاغذ کہاں ہے۔" اردلی نے اسے پکارا۔ "دیکھ یہ ہیں دو تیلیاں۔ میں نے اپنے والد کے دوست کی دکان میں پتنگ بنتے دیکھی تھی اور یہ ڈور بھی میں لے آیا ہوں۔ اب تُو کاغذ لے آجلدی سے۔"

رام داس نے گلابی کاغذ کی وہ سرسراتی' بڑبڑاتی شیٹ اٹھائی اور اردلی کے پاس لے گیا۔ اردلی نے کاغذ کو سلیقے سے تہ کر کے رکھا پھر بانس کی چھلی ہوئی پتلی تیلیاں اس پر رکھ دیں۔ "قینچی۔" وہ رام داس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اب ہمیں قینچی چاہیے۔ تو یہ کاغذ دبا کر بیٹھ۔ میں ابھی آیا۔"

"دیکھ ہوا!" لڑکا اوپر دیکھ کر چیخا۔ "دیکھ... تیری پتنگ بن رہی ہے۔"

ہوا خوشی سے گنگناتی اور مسخرا پن کرتی رہی۔ وہ الگنی پر لٹکے ہوئے صاحب کے موزوں میں گھس گئی۔ موزے پھول گئے اور الگنی پر لٹکے لٹکے تھرکنے لگے۔ لڑکا سب کچھ بھول بھال کر خوشی سے تالیاں بجا کر ہوا کو داد دینے لگا۔ گلابی کاغذ نے موقع پا کر اُڑنے کی کوشش کی لیکن لڑکے نے فوراً ہی اسے ہاتھ سے دبا دیا۔

مکان کے عقبی حصے کی طرف سے ننگے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے پیچھے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ۔

چھوٹی میم صاحب قینچی خود لے کر آئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ انہیں قینچی سے کیا کاٹنا ہے۔

"یہاں سے... اور یہاں سے کاٹنا۔" اردلی نے کہا۔

"یوں..." چھوٹی میم صاحب نے کاغذ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اس کو یوں نہ کرو اور یوں..."

"کاغذ کافی ہے۔" اردلی نے گوند کی شیشی اپنے قریب کھینچی۔

"اور دُم...؟" چھوٹی میم صاحب نے کاغذ پر قینچی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں... اس کونے پر۔" اردلی نے انگلی رکھ کر بتایا۔

"اسی کاغذ سے کاٹوں؟" قینچی چلانے والا ہاتھ ہچکچایا۔

"ایسے..." جھریوں بھری انگلیاں تیلی کو خم دے رہی تھیں۔ "ہم اور طرح کی پتنگیں بناتے تھے۔"

"ہندوستان میں ایسے ہی بنتی ہیں۔" اردلی نے کہا۔ "میں جب چھوٹا سا تھا اور شہر میں رہتا تھا تو ہم اکثر ابا کے دوست کی دکان پر جاتے..."

ہوا نے بیزار ہو کر موزوں سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ "میری... پتنگ..." وہ لڑکے کے کان میں منمنا رہی تھی۔ لاؤ میری پتنگ۔"

رام داس نے گھاس پر لیٹے دوپہر کے گہرے مگر چھوٹے سایوں کو غور سے دیکھا۔ اب کسی بھی لمحے دوپہر کا بھونپو بج سکتا ہے۔ اس

نے دل میں سوچا اور میں نے ہوا سے وعدہ کیا تھا کہ...

اس نے تشویش سے گلابی کاغذ کو دیکھا' جو گلابی ہاتھوں اور جھریوں بھرے ہاتھوں کی گرفت میں پھڑپھڑا رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ پتنگ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

"جلدی کرو... جلدی..." رام داس بے صبری پن سے چلّایا۔ "ہوا پتنگ مانگ رہی ہے۔"

"ہش" اردلی پھنکارا اور اسے گھورنے لگا لیکن گلابی ہاتھ اپنے کام میں لگے رہے۔

"پتنگوں کا ہوا سے ہمیشہ یارانہ رہا ہے۔" چھوٹی میم صاحب نے کہا۔ "لو... پتنگ تیار ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں پتنگ تھام کر انہیں سامنے کی طرف پھیلایا تاکہ پتنگ کو غور سے دیکھ سکے۔ اس کا سر ایک جانب جھکا ہوا تھا۔

کام ہو چکا تھا۔ گلابی کاغذ پتنگ کا روپ دھار چکا تھا۔ رام داس نے ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی نہیں۔ اتنی جلدی کاہے کی ہے۔" اردلی نے اسے جھڑکا۔ "پہلے ایک بڑا والا سلام چھوٹی بی بی کو۔"

رام داس نے دونوں ہاتھ جوڑے... ہتھیلی سے ہتھیلی ملاتے ہوئے... اور انہیں اپنی پیشانی تک لے گیا۔ اس کی نظریں چھوٹی میم صاحب کے پیروں کے سرخ ناخنوں پر جمی تھیں لیکن وہ ہوا کے ساتھ پتنگ پتنگ کھیلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے پھر پتنگ کی طرف ہاتھ بڑایا۔

مگر اس وقت تک اردلی پتنگ پر قبضہ کر چکا تھا۔ وہ تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے انگلیوں سے اسے ٹٹول رہا تھا۔ "یاد رکھ' ہر پتنگ اُڑتی بھی نہیں ہے۔" اس نے رام داس سے کہا۔ "آؤ... کوشش کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ عقبی باغیچے میں چلا گیا۔

"یہ میری پتنگ ہے۔ میری ہے یہ پتنگ۔" ہوا منمنائی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"اور میرا کیا ہو گا؟" لڑکا بھی پاؤں پٹختے ہوئے اردلی کے پیچھے چل رہا تھا۔

"اب تماشا دیکھ۔ اردلی نے پتنگ کے کنّے باندھتے ہوئے کہا۔ پھر ڈور جوڑ کر اس نے پتنگ کو اوپر اُچھالا۔ اسی وقت فضا میں دوپہر کے بھونپو کی آواز گونجی۔ ہوا نے غوطہ لگا کر اپنی پتنگ کو دبوچا... اور اٹھا لیا۔ اردلی آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ چھوٹی میم صاحب بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ہوا اس کے سنہرے بالوں کو اڑا رہی تھی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈور تھام لی۔ ذرا دیر بعد اس نے ڈور رام داس کے ہاتھ میں دے دی۔

ہلکی پھلکی ڈور بھاری ہو رہی تھی... اور تنی ہوئی تھی...

"ہوا... اے ہوا... سنتی ہے۔" رام داس نے پکارا۔ "دیکھا... میں نے اپنا وعدہ پورا کیا نا۔" اب وہ اور ہوا' دونوں ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔

اردلی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ "ایسے نہیں اُلّو... یوں... ادھر دیکھ۔"

اور رام داس سوچ رہا تھا... بے وقوف بڈھا۔ مجھے ہوا سے کھیلنا سکھا رہا ہے۔

"ہم تو چھت پر چڑھ کر پتنگ اُڑاتے تھے۔" اردلی کہہ رہا تھا۔ "پتنگ بازی کا مزہ تو شہروں میں ہے۔"

لیکن لڑکا کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس ہوا کے ساتھ پتنگ پتنگ کھیلتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ پتنگ کبھی دائیں جھکتی' کبھی بائیں' کبھی کبھی تو یوں لگتا' وہ سامنے والی نیلگوں پہاڑی کو چوم لے گی پھر وہ اچھل کر اوپر... آسمان کے درمیان میں اٹھتی آتی۔

"ہوا... پھر اٹھا اسے۔ ایک بار اور۔" رام داس چلّایا۔ "وہ ہنس رہا تھا۔

"اور ڈور چھوڑو۔ اور بڑھاؤ۔" چھوٹی میم صاحب کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "یہ درختوں کی وجہ سے مشکل ہو رہی ہے۔"

ہانپتا ہوا اردلی پیچھے رہ گیا تھا۔ چھوٹی میم صاحب نے پلٹ کر اسے حکم دیا۔ "اردلی... تم واپس جاؤ۔ تم بڈھے ہو۔ ہمارے ساتھ نہیں بھاگ سکتے۔ جاؤ واپس۔"

اور اردلی خاموشی سے واپس ہو گیا۔

اب ہوا' وہ اور میم صاحب آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ چھوٹی میم صاحب اس کے برابر آئی اور ڈور تھام لی۔ لیکن نہیں... اس نے ڈور تھامی نہیں تھی... توڑ دی تھی۔ پتنگ جھومتی ہوئی... آزاد چلی جا رہی تھی۔ "چھوٹی میم صاحب' یہ تم نے کیا کیا؟" رام داس تقریباً رو دیا۔

چھوٹی میم صاحب نے اس کے رخساروں کو غور سے دیکھا' جہاں مسیں بھیگ رہی تھیں۔ "دیکھ' ہوا کو تیری پروا نہیں۔ وہ اکیلی اکیلی پتنگ سے کھیل رہی ہے۔" وہ بولی۔ "تو میرے ساتھ کھیل۔ آ... اس جھنڈ میں چل کر کھیلیں۔ میں پاپا سے کہہ کر تیرے گھر پر ٹین کی چھت ڈلوا دوں گی... آ جا۔"

چھوٹی میم صاحب کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی نظر آ رہی تھی... پتنگ کے کاغذ جیسی! رام داس نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس بار وہ نظریں جھکانا بھول گیا۔ میم صاحب اچھی لگ رہی تھی... ہوا جیسی لیکن اس سے ڈر بھی لگ رہا تھا' جیسے آندھی سے لگتا ہے۔

"میں آپ سے کیسے کھیلوں گا۔" رام داس نے بے بسی سے کہا۔ "ایک تو میں بھنگی کا بیٹا... اور پھر ہوا سے تو پتنگ کا کھیل کھیلتا۔ آپ سے کیا کھیلوں..."

"آ... میں تجھے بتاؤں گی۔" چھوٹی میم صاحب نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور درختوں کی طرف چل دی۔ اوپر جوان ہوا پتنگ کو اڑا رہی تھی... اس سے کھیل رہی تھی۔

*

محبت کائنات کا خوب صورت ترین جذبہ ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پائے جانے والے ہر تفاوت کو بے حیثیت کر دینے کی صلاحیت اس میں موجود ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کی بقا اور خوب صورتی اسی فاتح عالم جذبے کی رہینِ منت ہے۔ اَن دیکھے تعلق کی ڈور سے بندھے دو افراد کی داستان۔ اُن کے درمیان کوئی خونی رشتہ تھا نہ مذہبی ناتا! اس کے باوجود ایک دوسرے سے اُن کا لگاؤ دیکھنے والوں کے لیے تعجب کا باعث تھا۔

دلوں کو گداز آشنا کرنے والی خوب صورت کہانی

علیم الحق حقی

اوائل مئی کی اُس صبح ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بیت اللحم پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ کوئی بس خراب ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہو کر رہ گیا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔" مائلز نے جھنجلا کر کہا۔ وہ کار سے اترا اور بہت زور سے دروازہ بند کیا۔ آگے کاروں اور لاریوں کی ایک بہت طویل قطار تھی۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ہاتھوں سے آنکھوں پر چھجّا بناتے ہوئے اس قطار کو گھورتا رہا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ اس کی قمیص پسینے کی وجہ سے پیچھے سے مٹیالی ہو گئی تھی۔

میں کار میں بیٹھی رہی۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ٹریفک جام ہوا ہو۔ میں جانتی تھی کہ یہ مسئلہ خود بخود اور اپنے وقت پر ہی حل ہو گا یا شاید نہ ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مائلز بھی یہ بات جانتا تھا لیکن عادت سے مجبور تھا۔ جھنجلانا، کُڑھنا، بڑبڑانا اُس کی عادت تھی۔

ہماری شادی کو دس سال ہو چکے تھے مگر اب بھی مجھے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کی مکمل تاریخ مائلز کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ لیکن وہ اس تاریخ کے نتائج کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کا نکاسیٔ آب کا نظام، وہاں کا کھانا اور ٹریفک کے ضابطے ـــ وہ انہیں اپنے خلاف سوچی سمجھی سازش تصور کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کی توہین کرنے کے لیے ہیں۔

ایک بات بتاؤں۔ ان تمام باتوں پر میں برہم ہوں تو برحق ہے۔ لیکن مائلز نے تو یہاں سیاست دانوں، افسروں اور دہقانوں سے طویل طویل انٹرویو کرنے میں ہفتوں گزارے تھے اور بعد میں ترتیب و تدوین میں مہینوں صرف کر کے اس مواد کو خوب صورت اور متاثر کن مضامین میں ڈھالا تھا۔ اسے یہ برہمی زیب نہیں دیتی۔

میرا کام مائلز کے کام کی نسبت سادہ اور آسان ہے۔ مجھے صرف تصویریں کھینچنا ہوتی ہیں اور یہ ایک ایسا کام ہے جسے میں انجوائے کرتی ہوں۔ بس کوئی خوب صورت، عجیب یا مضحکہ خیز چیز نظر آئی، انگلی دبی اور کلک! منظر محفوظ ہو گیا۔ کوئی چیز بُری لگی یا راہ میں کوئی رکاوٹ آئی ـــ کلک! ناخوش گواریت ہمیشہ کے لیے ثبوت کے ساتھ ریکارڈ ہو گئی۔ میں اُسے شریفانہ اور تسلی بخش انتقام سمجھتی ہوں۔

ہم پچھلے تین ماہ سے سڑکیں ناپ رہے تھے۔ ترکی، شام اور لبنان کے متعلق مضامین تیار ہو چکے تھے۔ جس اخبار نے ہمیں بھیجا تھا، اس کے مالکان ہماری کارکردگی سے بہت خوش تھے اور اب ہمیں اس سیریز کے کلائمکس کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت اللحم پر آرٹیکل کرنا تھا۔

مائلز واپس آیا اور کار کی سائڈ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا "کم از کم ایک میل تک ٹریفک بلاک ہے۔" اس نے بتایا۔

"تو ایسا کرو کہ گاڑی موڑ لو۔" میں نے تجویز پیش کی۔ پیچھے جا کر ہم کوئی اور روڈ تلاش کر لیں گے۔ چاہے راستہ لمبا ہو جائے، کم از کم چلتے تو رہیں گے ہم۔"

مائلز نے بڑی بے زار نظروں سے مجھے دیکھا "تم کبھی نقشے نہیں دیکھتیں۔" اس نے کہا "بیت اللحم کو صرف ایک سڑک جاتی ہے۔ سرحد شہر کے بالکل پیچھے ہے۔ سڑک گھوم کر جاتی ہے۔"

سرحد! مجھے اچانک خیال آیا کہ میں اسرائیل کی سرحد کو بھول ہی گئی تھی "سرحد کتنی قریب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔"

لہٰذا بات ختم ہوئی۔ ہم انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے سامنے سڑک ڈھلوان کی طرف جا رہی تھی۔ آگے وہ موڑ تھا جہاں بس خراب ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یا تو کھیت تھے یا پھل دار درختوں کے باغ۔ مگر کنارے پر پتھر کی دیواریں تھیں۔ پتھر کی وہ اونچی نیچی دیواریں سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور کھیتوں کو تقسیم بھی کر رہی تھیں۔ دور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ وہ اردن کے عقب میں مو آب کے پہاڑ تھے۔ بس کے گرد مجمع لگا تھا۔ گرد آلود سیاہ سوٹ پہنے، سر پر سفید کپڑا لپیٹے، جھلسی رنگت والے لوگ! ان میں محض چند ایک ہی ایسے تھے جو رکی ہوئی کاروں میں سے اترے تھے ورنہ بیشتر لوگ زمین سے اٹھ کر بس کے گرد جمع ہوئے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ آپ کسی وادی کے وسط میں گاڑی روک دیں، جہاں

ہر سمت میں میلوں تک دیکھ سکتے ہیں۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یقینی طور پر دو تین افراد نمودار ہوں گے اور بڑی تمیزداری اور انکسار سے مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ جائیں گے اور آپ کو کھانا کھاتے دیکھتے رہیں گے۔

اچانک کہیں سے دو بھکاری نمودار ہوئے۔ ایک بُڈھا آدمی تھا' جو لاٹھی ٹیک کر چل رہا تھا۔ دوسرا ایک دبلا پتلا لڑکا تھا۔ بس کے گرد لگے مجمع سے انہیں کچھ بھی نہیں ملا لیکن کاروں کی قطار سے انہیں کچھ نہ کچھ مل گیا تھا۔

"کیا ان کی گزر اوقات بھیک پر ہے؟" میں نے پُرتجسس لہجے میں مائلز سے پوچھا۔

"ممکن ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مہاجر ہوں۔ سیاسی تبدیلیوں کے نتائج ہمیشہ غریبوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔" موجودہ صورت حال کے متعلق مائلز کے رویّے میں ایسی بے تعلقی تھی' جو مجھے ذرا اچھی نہیں لگی۔

لڑکے نے کار کی کھڑکی سے ہاتھ پھیلایا تو میں نے کہا "انہیں کچھ دے دو۔" مائلز انہیں دھتکارنے والا تھا۔

"دیکھو بی بی۔ ہم ساری دنیا کا دکھ درد دُور نہیں کر سکتے۔" مائلز نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ تاہم اس نے بڈھے کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر کچھ رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ بُڈھا بار بار شکریہ ادا کیے جا رہا تھا۔

بُڈھا اور اُس کا ساتھی لڑکا چلے گئے تو میں نے حیرت سے مائلز سے پوچھا "تو تم دوسروں کی مدد کرنے اور خیرات میں یقین نہیں رکھتے؟"

"کوئی بھی نہیں رکھ سکتا۔ ہمیں ضرورت مندی کے اسباب کو دور کرنا چاہیے۔ ایسا ہو جائے گا تو کسی کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"لیکن مائلز....." میں نے اختلاف لینا چاہا۔ مجھے بحث کرنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن اسی لمحے آگے کی سمت سے ایک خوشی کی چیخ سنائی دی۔ بس ٹھیک ہو گئی تھی اور رکا ہوا ٹریفک چل پڑا تھا۔

مائلز نے کار آگے بڑھا دی۔ ہم بیت اللحم پہنچے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم بیت اللحم سے زیادہ دور نہیں تھے۔

○☆○

اتنا چھوٹا شہر! میں نے مایوسی سے سوچا۔

شہر ایک پہاڑی پر بڑے خوب صورت زاویے سے بسا تھا۔ چاروں طرف سرسبز ڈھلانیں تھیں اور نہایت خوب صورت مناظر تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پوری دنیا کے لیے ایک خداداد لالٹین ہے۔ لیکن مکانات جدید طرز کے اور غیر نمایاں تھے۔ سڑکیں تنگ اور گندی تھیں۔

"یہ ہے بیت اللحم۔" مائلز نے بَل کھاتی سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ پھر اس نے سیاحوں سے بھری

ایک بس کے برابر کار روک دی "وہ رہا چرچ۔" اس نے ایک اونچی پتھر کی دیوار کی طرف اشارہ کیا "یہ اصطبل کے اوپر بنایا گیا ہے۔"

اُس دیوار میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بس اس کی جڑ میں چار مربع فٹ کا ایک سوراخ تھا۔ میں نے سوراخ اس لیے کہا ہے کہ یہ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ چرچ کا مرکزی دروازہ ہوگا۔

"لیکن کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ مائکز اندر داخل ہونے کے لیے جھک کر دُہرا ہوگیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھی۔ اپنے کیمرے کی وجہ سے مجھے بہت دشواری ہورہی تھی۔ آگے ایک چوڑی' خالی پٹی تھی۔ وہاں خاصی تاریکی تھی۔ دیواروں میں کافی اوپر تنگ کھڑکیاں تھیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مکمل اندھیرا ہوتا۔ آگے ہمیں ستونوں کی چار قطاریں دکھائی دیں۔

"مجھے ہمیشہ بتایا گیا ہے کہ یہ دشمنوں کو تعاقب کرنے سے باز رکھنے کے لیے تھے۔ خاص طور پر گھڑسوار دشمنوں کو روکنے کے لیے۔" مائکز نے بتایا۔

"دشمن؟"

"ازمنۂ وسطیٰ میں۔ چرچ اس سے بہت پرانا ہے۔ چوتھی صدی کا۔ لیکن عیسائیوں نے بیت اللحم پر قبضہ گیارھویں صدی میں کیا۔ سو سال بعد یہ دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یعنی یہاں ہمیشہ جنگ ہوتی رہی۔ میرا خیال ہے' لوگ چرچ میں پناہ لیتے ہوں گے۔" اس کی آواز مدھم ہوگئی۔ وہ چرچ کو آگے تک دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' میں ذرا اصطبل دیکھ لوں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔

"قربان گاہ کے نیچے۔" مائکز نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

نجانے میں کیا دیکھنے کی توقع کررہی تھی۔ شاید وہ کچھ جو پینٹنگز میں نظر آتا ہے۔ لکڑی کا ایک گرم شیڈ... صاف ستھرا بھوسے کا ڈھیر اور پیارے پیارے جانور۔ لیکن وہ تو بس چٹان میں ایک سوراخ تھا۔ اسے غار بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ریل کے ڈبے جیسی چھوٹی سی جگہ تھی۔ خالی اور سرد' چھت اتنی نیچی تھی کہ میں پورے قد سے کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں کھڑی چند لمحے اس جگہ کو گھورتی رہی۔ مجھے کسی کتاب کے الفاظ یاد آئے۔ یہاں مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ میں پلٹی اور چرچ میں واپس آگئی۔

"اور معصوموں کی قربان گاہ ہے' جہاں وہ قتل کیے جاتے تھے۔ اس دروازے سے گزرو۔" مائکز نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ پھر زیادہ اعتماد سے بولی۔ "نہیں' مجھے نہیں دیکھنا' چلو یہاں سے۔"

"ٹھیک ہے۔" مائکز کے لہجے میں حیرت تھی۔ لیکن اس نے بحث نہیں کی۔ ہم واپس چل دیے۔

گرمی بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ مائکز نے کہا "پیا لیچ کرلیں۔"

ہمیں ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ میں نے اپنا ساز و سامان شیڈ میں رکھ دیا۔ ہم ٹیرس پر تھے۔ جہاں سے ایک تنگ سڑک نظر آرہی تھی۔ یہاں نسبتاً خنکی تھی۔ ایک طرف انگوروں کی ایک بیل تھی۔

میں خیالوں میں یوں کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے خاموشی کی طوالت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہرحال کافی پینے کے دوران میری خاموشی ٹوٹی "تم آخر یہاں کے متعلق کیا کرو گے۔ مجھے تو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے جیسے یہ چھت پر بیٹھی ہوئی فاختہ۔" میں نے چھت کی طرف اشارہ کیا "میں اس کی تصویر کھینچ لوں گی لیکن تم کیا لکھو گے۔ تم نے مجھے بس اتنا بتایا ہے کہ یہاں تشدد اور خوں ریزی کا طویل سلسلہ چلتا رہا ہے' نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔" میں کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں کچھ زیادہ ہی ڈرامیٹک ہوگئی تھی۔

مائکز نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا "حیرت ہے کہ تم نے یہ بات کہی۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا۔"

اُسی لمحے نیچے سڑک کی طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ کارنر کے موڑ پر لڑکوں کا ایک گروہ کسی کا پیچھا کرتا... پتھر اٹھا کر مارتا نظر آیا۔ وہ سب چیخ اور ہنس رہے تھے۔ وہ عین ہماری ٹیرس کے نیچے آکر جمع ہوگئے۔ شور و غل بڑھ گیا۔

"یہ کیا کررہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے ٹیرس کی دیوار سے پتھر ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔" مائکز نے کہا۔ وہ جھک کر نیچے دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

پھر اچانک ایک نئی آواز سنائی دی۔ کرب میں ڈوبی ایک چیخ۔ موڑ کے قریب ایک دراز قد ہیولا نظر آیا' جس کے جسم پر پتھر اُچھل رہے تھے۔ وہ لڑکوں کے پیچھے تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں بے یقینی تھی۔ دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی۔

اُس کی داڑھی اور انداز مجھے جانا پہچانا لگا۔ اچانک میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہ بھکاری تھا' جو سڑک پر بھیک مانگتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ اندھا ہے۔ وہ رکا اور سر ایک طرف جھکائے چند لمحے کچھ سنتا رہا۔ پھر وہ دوبارہ آگے بڑھا۔ اُس کا رخ اس طرف تھا' جہاں سے لڑکوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اچھل کر کھڑی ہوئی اور ٹیرس کی دیوار کی طرف لپکی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔

لڑکے دیوار کی جڑ کے قریب نیم دائرہ سا بنائے کھڑے تھے۔ کسی کو گھیرے ہوئے۔ وہ اب بھی اِکّا دُکّا پتھر مارتے۔ لیکن ان کے درمیان پڑی ہوئی وہ کوئی شے ساکت تھی۔ اس کی وجہ سے ان کا جوش و خروش ختم ہوگیا تھا۔ اب چیخ و پکار بھی کم ہوگئی تھی۔

اچانک دیوار کی جڑ کے قریب پڑے بنڈل میں سے ایک براؤن ٹانگ باہر نکلی۔ مائکز کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ تیزی سے زینوں کی طرف لپکا۔ نیچے لڑکوں کے درمیان پہنچ کر اُس نے

ایڑھا دھند انہیں گھونسے اور لاتیں مارنا شروع کردیں۔ اس پر دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔

آپ نے اب تک اندازہ لگالیا ہوگا کہ مائلز بے صبرا آدمی ہے لیکن وہ عمل ہرگز نہیں۔ میں نے زندگی میں جسمانی تشدد نہیں دیکھا۔ لہٰذا جب میں دیکھتی ہوں تو اس پر یقین نہیں کرتی۔ میں مائلز کو یوں دیکھتی رہی' جیسے وہ کوئی اجنبی ہو۔ اور یقین کریں' وہ لمحہ بھی اجنبی ہی رہا تھا۔

لڑکوں کا غول پہلے تو اس اُفتاد کے نتیجے میں یوں منتشر ہوا' جیسے مچھلیوں سے بھرے تالاب میں کنکر اچھال دیا جائے۔ مگر پھر لڑکے سنبھل کر مائلز کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ ان کی انگلیاں مائلز کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ اس سے خاصا دور رہنے کی کوشش کررہے تھے۔

مائلز نے نیچے پڑے ہوئے بنڈل کو بڑی آہستگی سے اٹھایا۔ لڑکے کے سینے پر لیٹے ہوئے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔ وہ ننھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ لیکن بظاہر وہ زخمی نہیں تھا۔ میں جب تک زندہ ہوں' محبت کا وہ انداز کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس کی آواز سنتے ہی نابینا بڈھے کے دونوں ہاتھ بے تابی سے آگے کی طرف بڑھے اور اس نے لڑکے کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ لڑکے کا گرد آلود سر اب بڈھے کے سینے پر رکھا تھا۔

مائلز نے آہستگی سے بڈھے فقیر سے کچھ کہا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایک لمحے کے بعد میں نے بڈھے کے سر کو اثباتی جنبش کرتے دیکھا۔ پھر وہ تینوں مڑے اور ٹیرس کی طرف آنے والے زینوں پر چڑھنے لگے۔ مائلز بڈھے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔

وہ اوپر آئے۔ مائلز کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہورہا تھا۔ لڑکا بڈھے سے چمٹا ہوا تھا۔

میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ گرمی اچانک ہی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی۔ میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ میں نے ریسٹورنٹ کے مالک کو اوپر آتے دیکھا۔ اس کے چہرے اور انداز سے ناپسندیدگی کا اظہار ہورہا تھا۔ اس لمحے میں تماشائی نہ رہی۔ اس منظر میں شامل ہوگئی "یہ ہمارے دوست ہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

ریسٹورنٹ کا مالک حیرت زدہ سا پیچھے ہٹ گیا۔ مائلز اُن دونوں کو اپنی ٹیبل کی طرف لے آیا۔ بوڑھے آدمی نے لاٹھی ایک طرف رکھی اور بڑے باوقار انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکا نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

پہلی بار مجھے ان دونوں کو بہت قریب سے بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ بوڑھے کا سر بہت بڑا' بہت خوب صورت تھا۔ اس کی جلد سفید تھی۔ لیکن آنکھوں کی بے نوری بہت خوف ناک لگ رہی تھی۔ لڑکے کی جلد براؤن تھی۔ اس کے لمبے گھونگھریالے بال براؤن تھے۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ لباس دونوں کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔ لڑکے کے کپڑوں پر جما ہوا خون بھی لگا تھا۔ میں نے لڑکے کو دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے۔

تمام دن کی مایوسی اور بدمزگی پھر لوٹ آئی۔ وہ دونوں بے حد تباہ حال تھے اور ہمدردی کے بہت زیادہ مستحق۔ اور دونوں کے ساتھ بہت زیادہ بدسلوکی کی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بیت اللحم کے پاس ان کے لیے بے رحمی اور تشدد کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مائلز عربی میں بڈھے کی دل جوئی کررہا تھا۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے کہا "میرا خیال ہے' جلدی سے کھانا منگواؤ۔"

بڈھے نے اپنا سفید ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن ہم کھانا کھاچکے ہیں۔" اس کی آواز چرچراتی ہوئی تھی' جیسے کوئی بہت پرانا لوہے کا گیٹ۔ لہجے میں بھاری پن تھا۔

اُس کے انگریزی بولنے پر ہمیں تعجب ہوا۔

"تو پھر چائے پئیں گے یا کافی؟" مائلز نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"جو چاہے پلوادیں۔"

مائلز نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

"میں نے ایک زمانے میں انگریزوں کے پاس کام کیا ہے۔" بڈھے نے دھیمی آواز میں کہا "لیکن اب تو انگریزی بولے برسوں ہوگئے۔" وہ مسکرایا۔

"تمہاری انگریزی میری عربی کے مقابلے میں بہت ... بہت زیادہ بہتر ہے۔" مائلز نے خوش دلی سے کہا۔ پھر اچانک ہی خاموش ہوگیا۔

میں مائلز کی کیفیت محسوس کرسکتی تھی۔ ایسے پُرتشدد مناظر دیکھنے کے بعد یہ خوش دلانہ گفتگو اُسے لغو لگ رہی تھی۔ محسوسات اور گفتگو دو مختلف سطحوں پر تھے۔ صرف بڈھا آدمی پُرسکون تھا۔ جیسے پیش آنے والے واقعات نے اس پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا ہو۔

بڈھے نے مائلز کی طرف سر گھماتے ہوئے کہا "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جناب۔"

"نہیں۔ ایسا نہ کہیں۔ خدا کے لیے۔" مائلز گڑگڑایا۔

"ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔" بڈھا اداس لہجے میں کہتا رہا "ہم اجنبی ہیں۔ ایلی جیسے لڑکے چالاک اور بدمعاش نہیں ہوتے۔ ایلی ان دوسرے لڑکوں سے مختلف ہے۔ ایلی کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے۔" اس نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکا بلی کی طرح اس کے پائنچے سے رخسار رگڑنے لگا۔

"بیت اللحم ڈراؤنی جگہ ہے۔" میں پھٹ پڑی۔ میں چاہتی تھی کہ میری ہمدردی کی شدت اُس تک پہنچ جائے۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگا۔ یہاں بیت اللحم میں ظلم ہو اور خون بہایا

جائے۔" میں نے عجیب سے لہجے میں کہا "یہاں ہمیشہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور اب بھی...." میں کہتے کہتے رک گئی۔

بڈھے نے نرم لہجے میں پوچھا "آپ یہ توقع کیوں کرتی ہیں کہ بیت اللحم ساری دنیا سے مختلف ہوگا۔"

میں گنگ رہ گئی۔

اُس نے میری خاموشی کا کچھ اور مطلب لیا "اوہ... آپ کرسچن ہیں۔ میرے بچے کی طرح۔" اس نے پھر مسکراتے ہوئے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ کافی لیجیے۔" مائکل نے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ بڈھا کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا پھر اُس نے پیالی طشتری پر رکھ دی اور کہا "شکریہ!"

میں اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں تصور کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ اُس نے زندگی کیسی گزاری ہوگی لیکن میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکی کہ اب اُس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ ایک اتنا باوقار اور خوب صورت آدمی، جو انگریزوں کے ساتھ کام کرچکا ہے اور اب بھیک مانگتا ہے، ذہنی طور پر کمزور ایک لڑکے کے ساتھ!

"تو یہ ایلی آپ کا پوتا ہے؟" مائکل نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ اس سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ اجنبی ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ اس کی ماں کا انتقال میرے گاؤں میں ہوا تھا۔"

"تو آپ کا گاؤں کرسچنوں کا گاؤں ہے۔" مائکل نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔"

"تو پھر....؟" مائکل کہتے کہتے رک گیا۔ وہی سوال میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا۔ اگر رشتے داری بھی نہیں تھی اور مذہب بھی جدا تھے تو بڈھے نے ایلی کی ذمے داری کیوں قبول کی تھی۔ یہ درست ہے کہ ایلی بڈھے کے لیے آنکھوں کا کام کرتا تھا لیکن خود ایلی کو اس سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

"اب مجھے اجازت دیں۔" بڈھے نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اب ہم جائیں گے۔ اُس نے لاٹھی اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمارے پاس کار ہے۔" مائکل بھی اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔

"نہیں شکریہ۔ آپ یروشلم جائیں گے جبکہ مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

بڈھے کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ہم نے اُن کے لیے بہت تھوڑا کچھ کیا تھا۔ لیکن ہمیں مزید مدد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مائکل نے میرا بیگ اور کیمرے جمع کیے۔ میں نے بڈھے کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم نیچے سڑک پر آگئے۔

"گڈ بائی مادام۔ اللہ آپ کو اجر دے۔ میں آپ کے لیے دُعا کروں گا۔"

"نہیں۔ آپ جہاں کہیں، ہم آپ کو وہاں پہنچادیں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں، آپ بے فکر ہوکر جائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ایلی میرے ساتھ ہے۔"

میں جانتی تھی کہ اس وقت یہ سوال کرنا عجیب لگے گا لیکن سڑک پر کھڑے ہوکر اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا "کیوں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے خود بھی یہ بے تکا پن لگ رہا تھا "مجھے اس سوال پر معاف کردیجیے گا لیکن مجھے بتائیں کہ آپ نے ایلی کو کیوں اپنایا؟"

"کیوں؟" میرا سوال اُس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں "بھئی اس کی ماں مرچکی تھی۔"

"لیکن آپ ہی کیوں؟"

اُس نے کندھے جھٹک دیے "یہ بھی وہیں تھا اور میں بھی وہیں تھا۔" وہ یوں مسکرایا، جیسے مذاق کررہا ہو "اس کو مدد کی ضرورت تھی۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ ایلی نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ دونوں تنگ سڑک کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

ہم نے یروشلم کا سفر خاموشی میں کیا۔ رات جب ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھے، تب نابینا بڈھے اور ایلی کا موضوع چھڑا۔

مائکل نے میرے پورٹرائیڈ کیمرے کو ٹٹولا اور ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ تصویر میں نابینا بڈھا بیت اللحم کی تنگ سڑک پر کھڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ ایلی کے کندھے پر تھا۔ وہ اس وقت کی تصویر تھی، جب ہم انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔

میں دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر میں نے کہا "میرا خیال ہے، مجھے اپنا کام تمہیں سونپ دینا چاہیے۔" میں مسکرائی۔ اس کے لیے میری ستائش حقیقی تھی "یہ درحقیقت ایک غیر معمولی تصویر ہے۔"

مائکل نے شرمندگی سے مجھے دیکھا "بس مجھ سے رہا نہیں گیا۔" اُس نے کہا "میں نے سوچا، شاید اسے کلک کی آواز نہ سنائی دے۔ وہ دونوں اس قدر متاثر کن لگ رہے تھے۔ محبت کی علامت۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھری "اور اگر تم چاہو تو میں اپنا کام تمہیں سونپ دوں۔ مجھے تو اپنے مضمون کے سلسلے میں کچھ سُجھائی نہیں دے رہا ہے۔"

میں اُسے گھورنے لگی "تمہیں اب بھی نہیں معلوم کہ کیا لکھنا ہے؟"

"مجھے اندازہ تک نہیں۔" اُس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"گڈ گاڈ۔ عجیب آدمی ہو تم۔" میں نے کہا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ میں تیزی سے مائکل کے ٹائپ رائٹر کی طرف لپکی۔ میں نے کاغذ چڑھایا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ٹائپ شروع کردیا "اوائل مئی کی اُس صبح ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بیت اللحم پہنچنے میں دو گھنٹے لگے....."

*

مرد کو صنفِ
کرخت اور عورت کو صنفِ
نازک کہا جاتا ہے لیکن کبھی نہ کبھی کہیں
نہ کہیں کوئی ایسی عورت بھی پیدا ہو جاتی ہے
جسے صنفِ نازک کہنا کسی طور بھی مناسب معلوم
نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے سامنے اچھے خاصے مرد
صنفِ نازک معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ایک ایسی ہی عورت کی کہانی جسے صنفِ نازک میں شمار نہیں کیا جاتا تھا

مس ہرکولیس

علیم الحق حقی

امریکی بحریہ کا سابق لیفٹیننٹ جوزف ایشٹن لاس ویگاس کے نو تعمیر شدہ کورال ہوٹل کے کلاک روم سے برآمد ہوا۔ وہ یہاں ایک بے حد ضروری اور ہنگامی نوعیت کے کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اُس نے ہوٹل کے سوئس منیجر فرانزکی طرف دیکھا اور سر کو اثباتی جنبش دی۔

"او کے!" اس نے کہا "اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں نے رکاوٹ دور کر دی ہے۔"

پھر اُس نے اپنے لازمی استعمال ہونے والے آلات کا بیگ اپنے اسسٹنٹ کو دے کر اُسے گھر جانے کی ہدایت کی اور خود حق تر کرنے کی غرض سے ہوٹل کے آؤٹ ڈور بار کی طرف چل دیا۔ اُسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ دل ہارنے والا ہے۔

اس وقت فلور شو شروع ہو چکا تھا۔ وہ شو نیو ادا کے مشہورِ زمانہ قمار بازار کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ چھ فٹ لمبی، سنہرے بالوں والی ایک لڑکی اسپاٹ لائٹ کی دودھیا چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ وہ بہت لمبی تھی لیکن ساتھ ہی بے حد حسین بھی۔ وہ خوشگوار مترنم آواز میں گا بلکہ گنگنا رہی تھی۔

"میں طاقت میں دس کے برابر ہوں۔
لیکن اس سے فائدہ کیا ہے۔
میں اکیس برس کی لڑکی ہوں۔
میں نے جس کا ہاتھ بھی تھاما اُس کی کلائی ٹوٹ گئی۔

سوچ رہی ہوں میری شادی کب ہوگی شاید کبھی نہیں۔
ہرکولیس کی بیٹی ہوں میں مجھ سے شادی کون کرے گا؟"
نے کی شوخی کے باوجود اُس کی آواز میں محرومی کا بھٹا ہوا سوز تھا
درد کی دبی دبی آنچ تھی۔ آرکسٹرا کے قریب تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر ایک پلے کارڈ گاتھا جس پر تحریر تھا۔ میریلین میرلو۔ دنیا کی سب سے طاقتور لڑکی۔

جوزف ایشٹن نے اس لڑکی کو دیکھ کر جو پہلی بات سوچی وہ یہ تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے سینے میں کبھی اتنی شدید طلب نہیں جاگی۔

"اور اب" مس میریلین نے اعلان کیا "میں حاضرین میں سے چار افراد کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ جیوری کی حیثیت سے تشریف لے آئیں۔"

لیکن کوئی ایک شخص بھی آگے نہیں بڑھا۔

"میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی آیئے۔" میریلین کے لہجے میں ترحم تھا۔ "دیکھیں، پہل کون کرتا ہے۔"

جوزف ایشٹن جس کا قد صرف پانچ فٹ نو انچ تھا لیکن کسرتی جسم کسی مڈل ویٹ چیمپئن باکسر کا سا تھا آگے بڑھا۔ اس نے اپنا جام خالی کر کے رکھ دیا تھا لیکن اس کا انداز کسی تنویم زدہ شخص کا سا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی مکھی کسی مکڑی کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

"واہ! ایک شریف آدمی تو بڑھا۔" لڑکی نے چمک کر کہا اور جوزف کے سامنے کورنش بجالائی۔ "شکریہ جناب اس کرسی پر بیٹھ جایئے۔" وہ پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تین حضرات اور تشریف لے آئیں پلیز، گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

بالآخر کورم پورا ہو گیا۔ گھبرانے اور ڈرنے جیسے توہین آمیز الفاظ نے لوگوں کی مردانگی کو اُبھار دیا تھا۔

میریلین نے جیوری کے چاروں اراکین کو لوہے کی ایک میخ تھما دی۔ پھر وہ بولی۔ "سب جانتے ہیں کہ عورت مرد سے زیادہ خطرناک سہی لیکن اس سے کمزور ہوتی ہے۔ ذرا زور لگا کر دیکھیں آپ اس میخ کے دو ٹکڑے کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

چاروں مرد اسکول کے بچوں کی طرح اپنی اپنی کرسی پر پہلو بدل کر زور لگانے لگے۔ جوزف کے علاوہ ان میں ایک پیشے کے لحاظ سے اٹریل بیلوں کو سدھانے والا تھا ایک ہائی وولڈ کا ڈائریکٹر تھا اور ایک پولو کا کھلاڑی۔ وہ چاروں اپنی اپنی جگہ بے حد جان دار تھے۔

جوزف نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں میخ کا جائزہ لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ میخ بہت مضبوط ہے۔ نیوی میں بھی بارہا اس کا واسطہ دھاتی چیزوں سے پڑا تھا اور اب وہ لاس ویگاس میں چار سال سے ایک ماہر پلمبر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ وہ دھات کو خوب سمجھتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میخ کو خم کھانے پر مجبور کرنا بھی ناممکن ہے۔ کجا یہ کہ اسے دو نیم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کم از کم اس کی انگلیوں میں تو اتنی جان نہیں تھی۔

میریلین نے میز سے ویسی ہی ایک اور میخ اُٹھائی۔ اسے کہنی میں لپیٹا تین چار بار زور لگایا اور پھر حاضرین کے ملاحظے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ میخ دو ٹکڑے ہو چکی تھی۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اور قہقہے لگا کر اُسے داد سے اور چاروں مردوں کو بیداد سے نوازا۔

جوزف حیران رہ گیا۔ لڑکی کے عضلات میں ذرا سی اینٹھن بھی تو نظر نہیں آئی تھی لیکن اس نے جو کچھ کیا تھا سب کی نگاہوں کے سامنے کیا تھا۔

پھر میریلین نے آدھا انچ نصف قطر کی ایک سلاخ باری باری چاروں مردوں کی طرف بڑھائی۔ مقصد صرف معائنہ تھا۔ معائنے کے بعد اس نے سلاخ کو دانتوں میں دبایا اور زور لگا کر اسے ایک بیرپن کی شکل میں لے آئی۔

آخر میں اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ایک ایک جلد چاروں مردوں کو تھما دی۔ وہ بے چارے زور لگاتے رہے۔ اس دوران میریلین نے بڑے مزے سے ڈائریکٹری کو پھاڑ کر آدھا کر دیا اور تاؤ دلانے والے لہجے میں بولی۔ "کمال ہے آپ لوگوں سے تو کاغذ بھی نہیں پھاڑا جاتا۔"

جوزف ڈائریکٹری سے الجھنے کے بجائے اُسے دیکھتا رہا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ بڑے بڑے تھے لیکن اُن کی حرکات میں بدصورتی نہیں تھی۔ وہ جھکی اور اس نے ڈائریکٹری کو موڑا۔ اس کے سنہرے بالوں کی دو لٹیں اس کی پیشانی پر جھومنے لگیں۔ جوزف کا دل اس کی محبت اور ہمدردی سے معمور ہو گیا۔ پھر کلائمکس کا لمحہ آ پہنچا۔ لڑکی سیدھی ہوئی اور اس نے کسی یونانی جنگ کی دیوی کی طرح ہاتھ اٹھائے اور اگلے ہی لمحے ڈائریکٹری کے دو ٹکڑے کر دیے۔

ہینڈ نے چیخ کر لڑکی کو اس کی کارکردگی پر خراج تحسین پیش کیا۔ تالیوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بڑی ادا سے حاضرین کے سامنے سر خم کر کے داد وصول کرتی رہی۔ جیوری کے اراکین اپنی اپنی جگہ واپس آ گئے۔ فلور پر موجود ہر شخص کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہا تھا۔

جوزف دس منٹ تک اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک ویٹر سے مس میریلین کے ڈریسنگ روم کے متعلق دریافت کیا۔ وہ ڈریسنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو پتا چلا کہ جیوری کے باقی اراکین پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ لڑکی چینی طرز کے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ وقت اس کے لیے خاصا کڑا ہے۔ لیکن وہ ایسے مراحل سے بخوبی گزرنے کی عادی بھی معلوم ہوتی تھی۔

لڑکی کے سامنے تین آفرز پہلے ہی موجود تھیں لیکن اسے ان

میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈائریکٹر اُسے اپنے پہاڑی فارم ہاؤس میں لے جانا چاہتا تھا۔ پولو کا کھلاڑی اُسے رات بھر جُوا کھلانے کے موڈ میں تھا اور بیل سدھانے والا اُس کے ساتھ دور جنگلوں میں گھڑسواری کرنا چاہتا تھا۔

جوزف کے ڈریسنگ روم میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ تینوں مرد اُسے گھورنے لگے۔ اُن کے نزدیک شخصیت اور اہمیت کے اعتبار سے وہ ایک بہت بڑا زیرو تھا۔

جوزف نے لڑکی سے کہا: "میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں آپ کی پرفارمنس سے بے حد محظوظ ہوا ہوں۔ آپ کا فن قابلِ قدر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کچھ توقف کیا اور پھر بولا: "میں... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ آپ مصروف ہیں۔"

لڑکی نے سرد نگاہوں سے اُسے دیکھا: "ستائش کا شکریہ لیکن فرض کر لیں کہ میں مصروف نہیں ہوں پھر؟" وہ چوتھی آفر کے بارے میں متجسس معلوم ہو رہی تھی۔

جوزف سوچ میں پڑ گیا۔ اس قدر تھکا دینے والی پرفارمنس کے بعد یہ بات یقینی تھی کہ لڑکی بھوکی ہوگی۔ یہ بات وہ اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ وہ بھی ایک گھنٹے تک ایک نامعقول پائپ سے اُلجھنے کے بعد ادھر آ گیا تھا اور خود اُسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اُس وقت رات کا ایک بجا تھا۔

بالآخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا: "میں چاہتا ہوں مس کہ آپ میرے ساتھ سام اسنیکس چلیں۔ ہم وہاں نیوادا سینڈوچ کھائیں گے۔" اُس نے تجویز پیش کی۔

"اوہ!" میریلین اُلجھ سی گئی: "یہ نیوادا سینڈوچ کیسا ہوتا ہے؟"

"یہ اسپیشل سینڈوچ ہوتا ہے۔ اس میں مرغی، پیاز، ٹماٹر، مکھن، چٹنی اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ محنت کے کام کے بعد ایسی ہی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

"مجھے تو سن کر ہی بھوک لگنے لگی۔" میریلین نے کہا: "آپ باہر میرا انتظار کریں۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔" پھر اُس نے دوسرے امیدواروں سے کہا: "حضرات! اب میں آپ سے معذرت چاہوں گی۔ نیوادا سینڈوچ فاتح قرار پایا ہے۔"

جوزف کی خوبصورت کار دیکھ کر لڑکی چونکی۔ اُس کے چہرے کا تاثر یہ کہتا محسوس ہوا: "کہیں تم بھی کوئی پلے بوائے تو نہیں ہو!"

لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ جوزف کس قدر منفعت بخش پیشے سے وابستہ ہے۔ پھر وہ برطانوی ہونے کی حیثیت سے یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس وقت وہ جس سرزمین پر ہے، وہاں امارت کی پہچان کاروں اور اُن کے ماڈلوں سے نہیں ہوتی۔ فراوانی کی وجہ سے، وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے پاس کتنی کاریں ہیں۔ ایک اچھی کار تو غریب کو بھی میسر آ ہی جاتی ہے۔

تاہم نیوادا سینڈوچ ویسا ہی ثابت ہوا جیسا کہ اُسے بتایا گیا تھا۔ دونوں نے ڈٹ کر سینڈوچ کھائے اور ساتھ میں بیئر کے گھونٹ بھی لیتے رہے۔

"آپ انگریز ہیں، ہے نا؟" جوزف نے پوچھا۔

"ہاں، آپ کو کیسے پتا چلا؟" لڑکی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ یہ بات اُس کے لیے تکلیف دہ تھی کہ اُس کی قومیت اتنی جلدی کھل گئی۔

جوزف کو اُس کے لہجے سے توہین کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اُس کی خوشی کے لیے تو یہی بہت تھا کہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے بہت قریب ہے۔ "جنگ کے دوران میں نے چند ماہ لندن میں گزارے ہیں۔" اُس نے بتایا: "مجھے انگریز اچھے لگتے ہیں۔"

یہ اُن کے درمیان ایک قدرِ مشترک نکل آئی۔ بے مہری کی برف چٹخنے لگی۔ میریلین نے بتایا کہ وہ کلیپٹن کی رہنے والی ہے۔ اس کے سوا اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کس طرح وہ قد نکالتی گئی، یہاں تک کہ اُس کا منگیتر اُسے چھوڑ بھاگا کیونکہ اُسے خدشہ تھا کہ لوگ اتنی لمبی بیوی پالنے پر عمر بھر اُس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس حادثے کے بعد میریلین نے اپنا مذاق خود اُڑانے کی ٹھان لی۔ اُس نے اپنے پس انداز کیے ہوئے پچاس پاؤنڈز کی مدد سے سرکس کے ایک ریٹائرڈ 'طاقت ور آدمی' سے اُس کا ایکٹ خرید لیا۔ پھر اُس نے اُس میں اپنی شخصی کشش کے علاوہ کچھ اضافے کیے اور اسی پیشے میں آ گئی۔ یہاں وہ بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ مالی اعتبار سے بھی وہ بہت زیادہ کامیاب تھی۔

کھانے کے بعد جوزف نے کہا: "مس میریلو! میں سوچ رہا ہوں کہ یہ چاندنی رات ہے۔ کیوں نہ میں آپ کو پتھروں والا بند دکھا دوں۔ وہ دنیا کا حسین ترین منظر پیش کرتا ہے۔"

"یہ اپروچ بھی نئی ہے۔" میریلین نے کہا۔

"یہ خوبصورت تجربہ آپ کبھی نہیں بھلا سکیں گی۔"

"مجھے اس میں شک نہیں۔" میریلین نے کہا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا: "ٹھیک ہے، زندگی میں کم از کم ایک بار ہر چیز کو آزمانا چاہیے۔ کم از کم لڑکیوں کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔"

تیئیس میل کا وہ سفر اُنیس منٹ میں کٹا۔ اُن کے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ کیونکہ جوزف کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ سڑک بہت تنگ اور پُرپیچ تھی۔ جا بہ جا خطرناک موڑ تھے۔ دس منٹ تک چڑھائی کا سفر تھا۔ پھر جوزف نے ایک دیوار نما چھجے کے پاس کار روک دی۔

نیچے، پانی کے آئینے میں تین چوتھائی چاند چھب دکھا رہا تھا۔ پتھروں اور مٹی سے بنا ہوا وہ بند بہت بڑا تھا۔ ایک ہزار فٹ نیچے

دریائے کولاریڈو چاندی کے تار کی طرح نظر آرہا تھا۔

لڑکی سنگی دیوار پر بیٹھ گئی اور خاموشی سے وہ منظر دیکھتی رہی۔ چاندنی میں اُس کے سنہرے بال بھی چاندی جیسے لگ رہے تھے۔ اُس کی نیلی آنکھوں کی رنگت گہری ہو گئی تھی۔

"یہ منظر پسند آیا آپ کو؟" جوزف نے پوچھا۔

لڑکی نے بے پروائی سے کندھے جھٹک دیے۔ "ہاں برا نہیں ہے۔"

جوزف کو اُس کی کم ذوقی پر مایوسی ہوئی لیکن اُس نے اس مایوسی کو اُس خوشی کے نیچے دبا دیا جو اُسے لڑکی کے قرب سے حاصل ہو رہی تھی۔ "آپ جانتی ہیں ایک اعتبار سے آپ بھی اسی کی طرح ہیں۔" اُس نے کہا۔

"کیا یہ ستائش کا انداز ہے؟"

"میرا مطلب ہے... مکمل... کامل..." جوزف نے وضاحت کی۔ پھر بولا۔ "ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ایک آہ بھر کر بولی۔ "میں جانتی ہوں آپ کیا پوچھیں گے۔ یہی کہ کیا میریلین میریلو میرا اصل نام ہے۔ نہیں یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔ میرا اصل نام ڈیزی ولز ہے۔"

"آ... آپ کو کیسے پتا چلا؟" جوزف گڑبڑا گیا۔

"سب یہی پوچھتے ہیں نام کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ میں سلاخ کیسے موڑ دیتی ہوں اور ڈائریکٹری کیسے پھاڑ دیتی ہوں۔"

"اس کے بعد میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔" جوزف نے اعتراف کیا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسا مظاہرہ کبھی نہیں دیکھا۔"

ڈیزی نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ سب ارتکاز کا کمال ہے۔ میں اس لمحے اپنی تمام توانائیوں کو ہاتھوں میں مرتکز کر لیتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کے بعد نڈھال ہو جاتی ہوں۔"

"اُف..." جوزف نے ہمدردانہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

اس کی آواز اور لہجے میں اتنی محبت اور ہمدردی تھی کہ ایک لمحے کو ڈیزی کا جی چاہا معمول کے مطابق ٹالنے والا جواب دینے کے بجائے اُسے حقیقت بتا دے۔ شوبزنس کا راز اُس پر آشکار کر دے لیکن وہ راز بے حد اہم بے حد قیمتی تھا۔ طاقت ور آدمی کا کھیل ایک فن کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ دنیا میں اب بھی بہت سے لوگ اُس فن کے ذریعے روزی کما رہے تھے۔ اس فن کے راز کا افشا اُن کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔

مگر وہ کمزور لمحہ بہت تیزی سے گزر گیا۔

جوزف نے کہا۔ "مس ولز! آپ کو آرام کی ضرورت ہوگی۔ یہ میری زیادتی ہے کہ میں نے آپ کو آرام سے محروم کیا۔ آپ فکر نہ کریں میں آپ کو جلد از جلد واپس پہنچا دوں گا۔"

اور واقعی اُس نے ایسا ہی کیا۔ واپسی کے سفر میں کار کی رفتار سو میل فی گھنٹا سے متجاوز تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ڈیزی ولز المعروف بہ میریلین میریلو اپنے کمرے میں دانت برش کرتے ہوئے اور بال سنوارتے ہوئے دُبلے پتلے معمولی سی شخصیت کے حامل جوزف ایشٹن کو یاد کر رہی تھی جس نے بتایا تھا کہ وہ پلمبر ہے لیکن اُس کے پاس اتنی خوبصورت اور مہنگی کار تھی کہ پورے امریکا میں کسی کے پاس نہیں ہوگی اور وہ بے حد شائستہ اور خوش اطوار تھا۔ عام لوگوں کی طرح بدتمیزی کرنا تو درکنار اُس نے تو اُس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

ایک ہفتے بعد جوزف ایشٹن نے ڈیزی ولز کو شادی کی پیشکش کی لیکن اُسے مسترد کر دیا گیا۔

اس پہلی رات کے بعد شو ختم ہوتے ہی سام اسنیکس جا کر نیو ادا سینڈوچ کھانا اور بیئر پینا اُن دونوں کا معمول بن گیا تھا۔ اتوار کی رات ڈیزی نے خود فرمائش کی کہ وہ اُسے پتھر بند لے چلے۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ بند کا منظر بے حد مسحور کن تھا۔ شاید اُس خوبصورتی ہی کا کرشمہ تھا کہ ڈیزی نے سرگوشی میں کہا۔ "بہت خوبصورت منظر ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔"

اُس کے اس جملے نے جوزف کے شرمیلے پن کی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اُس نے بڑی نرمی سے ڈیزی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ "پتا ہے ڈیزی! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جانتی ہو نا؟"

ڈیزی نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ "پوہ اُلّو بنانے کے لیے سب مرد یہی کہتے ہیں۔"

منگنی ٹوٹنے کے بعد یہ تبدیلی آئی تھی کہ ڈیزی کو محبت کی گفتگو سن کر کچھ ہونے لگتا تھا۔ اُسے غصہ آجاتا تھا.....

ٹوٹا ہوا دل کبھی اچھوتے دل کی طرح نہیں ہو سکتا۔ جس دل پر کبھی زخم لگا ہو اندمالِ زخم کے باوجود اس دل میں لفظ محبت کی گونج ٹیسیں جگا دیتی ہے۔

ڈیزی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ہر روز جوزف کے ساتھ وقت گزارنے کا معمول کیوں بنایا۔ وہ شریف تھا طبعاً مہربان تھا دوسرے مردوں کے ساتھ نمٹنے کے کئی طریقے تھے۔ ہاتھ چھڑانا ہنسی اڑانا جھڑکنا دھکیلنا اور حد سے گزر جانے کی صورت جوجستو کے ہاتھ دکھانا جس کی اُس نے باقاعدہ تربیت لی تھی۔ لیکن جوزف بالکل مختلف آدمی تھا۔ وہ اُس کے تجربات میں اضافے کی حیثیت رکھتا تھا۔

"میں تمھیں اُلّو نہیں بنا رہا ہوں ڈیزی!" جوزف نے بے حد تحمل سے کہا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنھیں وہ لڑکی حقیقی زندگی میں مل جائے جس کے وہ خواب دیکھتے رہے ہیں جس کی وہ طلب کرتے رہے ہیں ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں۔"

"مجھے تمہاری بات پر کوئی شک نہیں۔" ڈیزی نے کہا۔ دو طرح کے لوگ اس سے شادی کے خواہش مند رہتے تھے۔ ایک تو وہ جن کے خیال میں وہ ایک آسان روزی کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے وہ جو کمزور تھے اور اس میں ماں کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جوزف دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ "لیکن میں بہت کامیاب جا رہی ہوں۔ میں شادی کیوں کروں؟" ڈیزی نے اعتراض کیا۔

"محبت کے لیے، بچوں کے لیے اور ایک گھر کے لیے تمہارا بھی جی چاہتا ہوگا کہ کوئی تمہارا خیال رکھے، تمہاری پروا کرے۔"

"میں محبت پر یقین نہیں رکھتی۔ میں اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتی کہ دنیا میں کوئی مرد ایسا بھی ہو سکتا ہے جس سے میں محبت پر مجبور ہو جاؤں۔"

"تمہارے خیالات مردوں کے متعلق کچھ اچھے نہیں ہیں۔" ڈیزی نے کہا۔

جوزف نے افسردگی سے کہا۔ ڈیزی کی شخصیت کی سختی نے اسے اداس کر دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اسے وجدان کا وہ الہامی لمحہ بھی میسر آ گیا تھا جو محبت کرنے والوں کی زندگی میں اکثر آتا ہے۔ اس نے ظاہری سختی کی تہہ میں چھپا باطنی درد اور اذیت دیکھ لی تھی۔ وہ سخت مزاج لڑکی اندر سے بہت چھوٹی، سہمی ہوئی اور لاچار تھی۔

"ہو بھی نہیں سکتے۔ میرے نزدیک مرد یا تو چور ہوتے ہیں یا کمزور۔" ڈیزی کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"اور اگر میں کسی طرح ثابت کر دوں کہ میں مختلف ہوں تو..."

"تم نہیں کر سکتے۔" ڈیزی نے کہا۔ پھر بڑی نرمی سے بولی: "ایسی کوشش نہ کرنا جوزف! میں آسانی سے قائل ہونے والی نہیں ہوں۔ میں محبت کے لیے نہیں بنائی گئی ہوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں اس منظر کے حوالے سے ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔" اس نے نیچے ہاتھ پھیلا کر بند کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی مردوں ہی نے تخلیق کیا ہے۔" جوزف نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مشینوں کی مدد سے۔" ڈیزی نے کہا۔

یہ دو رات بعد کی بات ہے۔ نائٹ کلب کے فلور پر اسپاٹ لائٹ کی دودھیا روشنی میں وہ طویل القامت لڑکی سیاہ لباس پہنے کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک میز اور چار کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیوں پر اس رات کی جیوری کے اراکین بیٹھے تھے۔ ان میں ٹیکساس کا ایک کروڑ پتی تھا، ایک بل فائٹر تھا، ایک پولو کا کھلاڑی تھا جس کا تعلق برازیل سے تھا۔ چوتھا جوزف ایشٹن تھا۔ اس کی ڈنر جیکٹ کے بٹن ہول میں سرخ پھول لگا ہوا تھا۔

ڈیزی نے ہمیشہ کی طرح حاضرین میں سے چار افراد کو جیوری کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی۔ سب سے پہلے دعوت قبول کرنے والا جوزف تھا۔ ڈیزی کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی لیکن اگر وہ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور گمبھیرتا دیکھ لیتی اور اس کے بھنچے ہوئے جبڑوں پر اس کی نظر پڑ جاتی تو وہ یقیناً پریشان ہوتی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہے۔

چاروں مرد مینجوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ڈیزی کی پشت ان کی طرف تھی۔ وہ حسبِ معمول مائک ہاتھ میں لیے حاضرین کو بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ جوزف ایشٹن نے ایک طویل سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اس کی تمام قوت صرف اس کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی تھی۔

دنیا کی طاقت ور ترین لڑکی اپنی جیوری کی طرف پلٹی تاکہ ان سے مینیں وصول کرے۔ جوزف ایشٹن چوتھے نمبر پر تھا۔ ڈیزی کا تعلق سرکس سے نہ رہا ہوتا تو وہ اس شاک کو نہ جھیل پاتی۔ جوزف نے مینج کے دو ٹکڑے اس کی ہتھیلی پر گراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ڈیزی نے مینج کے دونوں ٹکڑے بائیں ہتھیلی میں چھپائے اور تینوں ثابت مینجوں کو داہنے ہاتھ سے یوں بلند کیا کہ حاضرین میں سے کسی کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر اس نے ٹوٹی ہوئی مینج کو میز پر رکھا اور معمول کے مطابق رومال اور پانچوں مینیں اٹھا کر اپنے مظاہرے میں مصروف ہو گئی۔

"مضبوط، طاقت ور اور جاندار مرد۔" اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ صرف جوزف ایشٹن ہی اس کی آواز کی لرزش کو محسوس کر سکتا تھا۔

لوہے کی سلاخیں تقسیم کرتے وقت وہ کچھ پریشان تھی۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ مینج والا واقعہ اتفاق ہے۔ شاید مینج کمزور یا پہلے سے ٹوٹی ہوئی ہوگی، لیکن خطرہ مول لینا غیر ضروری تھا۔ چنانچہ وہ اس انداز میں کھڑی ہوئی کہ تماشائیوں اور جوزف ایشٹن کے درمیان حائل ہو گئی۔ اب تماشائی جوزف کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ کھڑی معمول کے مطابق تماشائیوں سے باتیں کرتی رہی۔

پھر وہ لوہے کی سلاخیں واپس لینے کے لیے مڑی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جوزف ایشٹن سلاخ کو یو پائپ کی شکل میں دہرا کر چکا تھا۔ اس بار جوزف نے اس سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ تماشائی چیخ رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور جوزف کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ صورتِ حال غیر معمولی ہے۔ وہ بھی سنسنی کے احساس اور اعصابی کشیدگی سے دوچار ہو گئے تھے۔

سلاخ کو چھپانا ممکن نہیں تھا۔ ڈیزی نے جوزف کے ہاتھ سے مڑی ہوئی سلاخ لی اور پھنکار کر کہا: "چور!" اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ توہین کی اذیت سے بھی دوچار تھی۔ اس نے زندگی میں جس پہلے مرد کی پروا کی تھی وہ کمزور اور بودا نکلا تھا۔ جبکہ دوسرا اس کا ایکٹ

چرا رہا تھا اُسے بے وقوف بنا رہا تھا اور وہ بھی ساری دنیا کے سامنے۔
اس نے تینوں ثابت سلامتیں لے کر تماشائیوں کو دکھائیں۔ پھر اپنی سلامتی سوڈکر اُسے ہیرو بن کی شکل دی لیکن اس بار رنگ نہ جم سکا۔
بہرحال ایکٹ تو مکمل کرنا ہی تھا۔ چنانچہ آخری مرحلے میں اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹریاں تقسیم کیں۔ جوزف سب سے آخر میں بیٹھا تھا۔ اُس نے جوزف کو نظرانداز کر دیا۔ اُسے ڈائریکٹری نہیں دی۔ پھر وہ پلٹا اور مائک کے ذریعے تماشائیوں سے مخاطب ہوئی: "ٹیلی فون کمپنی والوں نے مجھے اپنی پرانی ڈائریکٹریاں پھاڑنے کا ٹھیکا دیا ہے۔"
قہقہوں کی صورت اُبھرنے والا ردِعمل معمول سے بہت زیادہ تھا۔ ڈیزی کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ جوزف ایشٹن تنہا ڈائریکٹری پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے ڈائریکٹری لی تھی کیونکہ اُسے تو ڈیزی نے ڈائریکٹری دی ہی نہیں تھی۔
جوزف کی پیشانی کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس کی بھوؤں سے رخساروں سے پسینہ دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ چہرے کی گلابی رنگت گہری سُرخ ہو گئی تھی۔ مرد تماشائی چیخ چیخ کر اُس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ "شاباش جوان! شاباش! تم اسے پھاڑ سکتے ہو! اس لڑکی کو دکھا دو کہ مردوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں! ثابت کر دو لڑکے کہ مرد چوہے نہیں ہوتے!"
اُدھر جاں کنی کی سی کیفیت میں مبتلا جوزف کے مُنہ سے بھی بلبلے جیسے نکل رہے تھے۔ جن کا مفہوم کچھ یہ تھا: "مرد چور ہوتے ہیں یا کمزور ہے نا! مردوں کی کوئی عزت نہیں ہے نا! وہ میز بھی دو ٹکڑے نہیں کر سکتے! ایک حقیر کتاب بھی ان سے نہیں پھاڑی جا سکتی! میں نے محبت کی ہے تو اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں! انتہا کو بھی پہنچا سکتا ہوں۔ میں اس لڑکی کو دکھا دوں گا...."
ڈیزی کسی معمول کی طرح ساکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جوزف کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت بے پناہ اذیت اور بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جوزف بھی بڑی اذیت میں تھا۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑے بحران سے گزر رہا ہے۔ زور لگانے اور بے پناہ ارتکاز کے نتیجے میں اُس کی رنگت نیلی پڑ گئی تھی۔
پھر ایک زوردار آواز ابھری۔ ڈائریکٹری کی ضخامت نے جوزف ایشٹن سے ہار مان لی تھی۔ وہ بیچ میں سے پھٹ رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد دو حصوں میں منقسم ڈائریکٹری نیچے پڑی تھی اور جوزف بڑی بے یقینی سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ پورا نائٹ کلب تالیوں کی گونج سے لرز رہا تھا۔
لیکن ڈیزی وِلز اپنے ایکٹ کی بربادی پر چھوٹ چھوٹ کر رو رہی تھی۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی اسٹیج سے اتر گئی۔ وہ اس وقت بھی رو رہی تھی۔
اچانک دو طویل القامت بھاری بھرکم آدمی جوزف ایشٹن کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے۔ اُن کے بڑے بڑے ہاتھوں پر گھنے بال تھے۔ انھوں نے دونوں طرف سے جوزف کے ہاتھ تھام لیے۔ "او کے طاقت ور آدمی!" اُن میں سے ایک نے کہا: "باس تم سے کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ انکار مت کرنا اور ہم سے اُلجھنے کی کوشش بھی نہ کرنا کیونکہ تم اتنے طاقت ور نہیں ہو۔" وہ اُسے کھینچتے ہوئے فلور سے لے گئے۔
اپنے آفس میں بارلو چند لمحے جوزف کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے غرا کر کہا: "تم نے نہ صرف میرا ایکٹ تباہ کیا بلکہ خاتون کو رُلایا بھی ہے۔ میں نے اُسے لندن سے ہزاروں ڈالر خرچ کر کے یہاں اس لیے نہیں بلوایا تھا کہ تم جیسا کوئی عقل مند آدمی مفت کی پبلسٹی کے لیے مجھے اور اُسے دونوں کو بے وقوف بنائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمھارا کیا دھندا ہے اور تم کس چکر میں ہو لیکن یقین رکھو میرے آدمیوں سے فراغت پانے کے بعد تم اپنے دو ٹوٹے ہوئے ہاتھوں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکو گے۔"
جوزف ایک اور جنگ کے لیے تیار تھا۔ پھر بھی اس نے بڑے تحمل سے کہا: "میری بات سنو مسٹر بارلو! میں تو صرف..."
اُسی وقت دروازہ کھلا اور ہوٹل کا منیجر فرانز آفس میں داخل ہوا۔ اُس نے جوزف کو دیکھتے ہی کہا: "ارے مسٹر ایشٹن! آپ یہاں۔ میرا خیال ہے باس نے آپ کو بتا ہی دیا ہوگا کہ ان کے ذاتی کمرے کا شاور بھی گڑبڑ کر رہا ہے۔"
بارلو ایک لمحے کو حیران نظر آیا۔ پھر اُس نے اپنے منیجر کو سر کے اشارے سے قریب بلایا: "تم اس بندر کو جانتے ہو؟ کون ہے یہ؟"
فرانز نے جھک کر اُس منحوس سرگوشیانہ لہجے میں بارلو کو بتایا جس میں وہ لاس ویگاس کے مشہور و معروف اور اہم لوگوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ الیکٹریشن، پلمبر، مکینک... یہ وہ لوگ تھے جو اس ہوٹل کی رگوں میں رواں دواں زندگی کو جاری و ساری رکھتے تھے۔ یہی اُن کی اہمیت تھی۔
بارلو کا مُنہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا: "او کے مسٹر ایشٹن! او کے۔ میں اور میرے آدمی تو محض مذاق کر رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم کون ہو۔ اگر ہو سکے تو میرے کمرے کے شاور کا پائپ چیک کر لو۔ میں سرد پانی کا نل کھولتا ہوں تو گرم پانی برآمد ہوتا ہے۔"
دروازہ پھر کھلا۔ اس بار ڈیزی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا انداز جارحانہ بلکہ دیوانگی سے پُر تھا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا لیکن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں!" اُس نے گرج کر کہا: "کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ مجھے الیکٹریشن نے بتایا ہے کہ تم جوزف کو سزا دینے والے ہو..." وہ رُکی اور اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جوزف کے پیروں کے پاس فرش پر دو سُرخ دھبے تھے۔ وہ

چند لمحے ان دونوں کو گھورتی رہی۔ "اوہ... وحشیو... تم نے اس پر تشدد کیا ہے؟" اس نے دہاڑ کر کہا اور حرکت میں آ گئی۔

پہلے گارڈ نے عادتاً کلہاڑے کے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھانے کی حماقت کی۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر خلا میں گولا کر تب دکھا رہا تھا۔ وہ ساکت ہوا تو اس کا پاؤں اس کے کان کے پیچھے تھا۔ دوسرے گارڈ نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ڈیزی نے اسے اٹھا کر بند کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے یقیناً خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ وہ کھڑکی توڑ کر دوسری طرف نہیں گرا بلکہ ٹکرا کر کمرے ہی میں پلٹ آیا۔

ڈیزی کے جلال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے بعد بارلو نے کسی بیل کا پٹر کی طرح اٹھنا شروع کیا۔ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا لیکن اس سے پہلے ہی جوزف کو ہوش آ گیا۔ ایکشن کی تیزی نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "ڈیزی! کیا کر رہی ہو؟ سنو... رک جاؤ!"

ڈیزی نے بارلو کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا اور چند لمحے بعد اپنی کمر سہلاتا ہوا اٹھا۔

ڈیزی نے حیرت سے کہا۔ "لیکن جوزف! میں تو تمہارے تحفظ کے لیے لڑ رہی تھی۔"

"سنو بے بی! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں اور تمہاری بھی۔" جوزف کا لہجہ تند تھا۔

بارلو نے تلخ لہجے میں کہا۔ "خاتون! اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم لاس ویگاس کے بہترین پلمبر کو اپنے ہاتھوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو آپ غلطی پر..."

"لیکن یہ خون! جوزف! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اپنے ہاتھ دکھاؤ مجھے۔"

جوزف نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لیے۔ پھر اس نے ڈیزی کے اصرار پر انھیں اس کے سامنے پھیلا دیا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔ بس یہ اس قسم کے کام کے عادی نہیں..."

ڈیزی دیکھتی رہی۔ اس کے دونوں ہاتھ بری طرح چھلے ہوئے تھے۔ ان سے خون بہہ رہا تھا۔

"کسی نے مجھے تکلیف نہیں پہنچائی ہے۔" جوزف نے وضاحت کی۔

ڈیزی نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر پھیلائے اور کسی ڈاکٹر کے سے انداز میں ان کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے جوزف کے چہرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ "جوزف! یہ سب کیا ہے؟ کیا تم پروفیشنل نہیں ہو؟ تم نے میرا ایکٹ نہیں بچایا، تم نے میرا ایکٹ تباہ کیا ہے!"

جوزف چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ "کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم! میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں ثابت کر دوں گا، تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں کمزور نہیں ہوں۔"

"جو! تمہیں بتانا پڑے گا۔ تم نے یہ سب کیسے کیا؟"

وہ اس سوال پر پہلے حیران اور پھر برہم نظر آیا لیکن اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ کمرے میں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ بارلو اور فرانز ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ "میں نے تو وہی کیا جو تم نے مجھے بتایا تھا۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی تمام توانائی، تمام توجہ اس ایک لمحے پر مرتکز کر دی اور پھر سب کچھ خود بخود ہو گیا۔"

"لیکن... لیکن جو..." ڈیزی نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "یہ تو ناممکن ہے جو! میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے جو بھی اس سلسلے میں سوال کرتا ہے، میں اسے یہی جواب دیتی ہوں۔ میں انھیں اپنی ترکیب تو نہیں بتا سکتی۔ یہ تو ایک شعبدہ ہے۔ جب تک تم اس کی ٹرک سے واقف نہ ہو، یہ سب کچھ کیسے کر سکتے ہو؟"

جوزف بری طرح چونکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک نظر دیکھا اور بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ "میرا خیال ہے آدمی محبت کے زور پر سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے تمہاری نظروں میں سرخ روئی حاصل کرنا تھی۔ تمہیں اپنی عزت پر مجبور کرنا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں تم پر اپنی محبت بھی ثابت کروں گا اور یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ میں کمزور نہیں ہوں۔ بولو اب تم مجھ پر... میری بات پر یقین کرتی ہو؟"

ڈیزی کی آنکھیں برسنے لگیں۔ "جو... اوہ جو!" وہ اس وقت کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سسکی ہوئی تھی۔

جوزف چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ "تم اتنی مضبوط، اتنی سخت نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو لیکن میں ہوں اور اسی لیے اب فیصلہ میں کروں گا۔ تم اندر سے نرم ہو اور ننھے بچوں کی طرح غیر محفوظ ہو۔ اسی لیے تم نے سختی اور طاقت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اب تمہیں اس لبادے کی ضرورت نہیں۔ ایکٹ ختم ہو چکا ہے۔ میں نے تمہارا آخری ٹیلی فون ڈائریکٹری پھاڑ کر پھینک دی ہے۔ سمجھ گئیں؟ اب کوئی ایکٹ نہیں ہوگا۔"

ڈیزی کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ "ٹھیک ہے جو!" اس نے حسین سی آواز میں کہا۔

"شاباش اچھی لڑکی۔" اس نے کہا اور اسے ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"سنو!" عقب سے بارلو نے پکارا۔ "میرے شاور کا کیا ہوگا؟"

جوزف نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "اس وقت تمہیں بارلو!" اس نے کہا۔ "میں اپنے شاگردوں میں سے کسی کو بھیج دوں گا۔ گڈ نائٹ!"

پھر وہ اپنی ٹرافی اٹھائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

MISS. HERCULES
Gilbert Harris.

خندۂ تقدیر

علیم الحق حقی

اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ مشیت ایزدی کے خلاف ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ انسان تدبیریں کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور وہ کرتا بھی ہے لیکن کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہوتی جب تک قدرت کی مرضی اس میں شامل نہ ہو۔

ایک شخص کا ماجرا جس کی تدبیر الٹ گئی تھی۔

ہر شخص کی زندگی میں کم از کم ایک بار ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ مایوسی کی انتہائی کیفیت سے گزرتا ہے۔ اس کے سامنے ایسی رکاوٹ ہوتی ہے جس کے بارے میں وہ درست تخمینہ بھی نہیں لگا سکتا۔ اس وقت حالات ایک ایسے کنوئیں کی مانند ہوتے ہیں جس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ ایسی حوالات کی طرح ہوتے ہیں جس سے فرار ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

جو ناس کی زندگی میں وہ وقت آدھی رات سے ذرا پہلے آیا۔

اسے اچانک علم ہوا کہ اس کا پارٹنر عباس گزشتہ دس ماہ سے بڑے منظم انداز میں اس کمپنی کو لوٹ رہا ہے جو انھوں نے اشتراک میں قائم کی تھی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب کمپنی کو تباہی کے راستے سے واپس لانا ممکن نہیں رہا ہے۔ اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کرنے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔

یہ المناک حقیقت اس پر بہت آہستہ آہستہ روشن ہوئی۔ اس کا ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس کا پارٹنر اس کا

دوست اس کے ساتھ دغابازی کرسکتا ہے، وہ چور ہوسکتا ہے اور چور بھی اتنا بڑا! لیکن یہ حقیقت تھی کہ عباس نے اپنے دوست کی زندگی کی ہر خوشی چرالی تھی۔ اب جوناس سوچتا تھا تو اسے حیرت ہوتی تھی کہ اسے عباس کے رہن سہن اور طرزِ زندگی سے اس بات کا اندازہ اب سے بہت پہلے ہی کیوں نہ ہوگیا۔ عباس کا معیارِ زندگی دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہوا تھا۔ نئی کاریں، بڑا مکان، پُرتکلف دعوتیں، یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں تفریحی تعطیلات۔ پھر بار بار خاصے طویل عرصے کے لیے غائب ہو جانا لیکن جوناس نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنے پارٹنر پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔

اور اب صرف چھ گھنٹے کے عرصے میں حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوگئی تھی۔ جوناس خود ایک تربیت یافتہ اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس نے اکاؤنٹس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اس نے ہر اس بل کو شمار کیا تھا جو فوراً ادائیگی تھا۔ اس وقت پوری کمپنی اس کے سامنے یوں بکھری پڑی تھی جیسے صدیوں پرانے کھنڈرات۔ اب کمپنی کے پاس کوئی اثاثہ نہیں تھا، کوئی نقدی نہیں تھی، صرف وہ بل تھے جو ادا کیے جانے تھے یا بنک کا اوور ڈرافٹ تھا۔

وہ اُٹھا اور بھاری قدموں سے سیف کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ چند روز بعد سالانہ آڈٹ ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں آڈیٹرز کے سامنے صحیح صورتِ حال آجائے گی۔

سیف میں اس کے ذاتی کاغذات رکھے تھے۔ اس نے کاغذات نکال لیے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ سب کچھ اس کے نام تھا اور سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ارما اور بچوں کے لیے کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ سفاک حقیقت یہ تھی کہ اس نے انھیں بے گھر کر دیا تھا، ایک طرح سے انھیں فٹ پاتھ پر لاکر پھینک دیا تھا۔ مکان، کار، فرنیچر، غرض ہر چیز قرق ہو جانا تھی۔ بچوں کی زندگی تباہ ہوگئی تھی۔ اب پچپن سال کی عمر میں اُسے ملازمت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس عمر میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا اور اسے پوچھنے والا تھا کون۔ ایک ناکام بزنس مین اور ایک نااہل اکاؤنٹنٹ کسی کے کیا کام آسکتا ہے۔ اب وہ محنت مزدوری کرسکتا تھا یا سڑکوں پر جھاڑو لگا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اچانک اس کی نگاہ ایک پھولے ہوئے لفافے پر پڑ گئی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چمکیں لیکن وہ چمک فوراً ہی معدوم بھی ہوگئی۔ وہ اس کی زندگی کی بیمہ پالیسی تھی۔ اس کی موت کی صورت میں اس کی بیوی کو دس ہزار ڈالر ملتے۔ پالیسی سے دستبردار ہونے کی صورت میں بھی اسے اچھی خاصی رقم ملتی لیکن اسے جو ادائیگیاں کرنا تھیں، ان کے سامنے وہ رقم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ عباس فرار ہو چکا تھا اور اب ساری ذمہ داری اسی کی تھی۔

دس ہزار ڈالر کی رقم اس کے لیے اچانک ہی بے حد پُرکشش ہوگئی۔ اس نے لفافہ گھسیٹ لیا۔ وہ پالیسی کی شرائط جاننا چاہتا تھا۔ اس طرح اسے پتا چل سکتا تھا کہ اس کی بیوی کے لیے رقم حاصل کرنے کے امکانات کس حد تک روشن ہیں۔ لفافہ کھینچتے ہوئے کسی دھاتی شے کے سیف میں گھسٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کا پرانا ریوالور تھا۔ زمانۂ جنگ کی یادگار۔ ریوالور کی خوفناک چمک نے اس کو تھرا دیا۔ پھر اس نے اپنی مرضی کے خلاف ہاتھ بڑھایا اور ریوالور بھی کھینچ لیا۔

اپنی میز پر آکر اس نے پالیسی ایک طرف اور ریوالور دوسری طرف رکھ دیا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا جو اس کی اعصابی شکستگی کا غماز تھا۔ پھر اس نے لفافے میں سے پالیسی نکالی اور اس کی تہیں کھول ڈالیں۔ پالیسی پڑھتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے چمکتے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔ پھر اس نے بڑی بیزاری سے ریوالور کو دور ہٹا دیا تاکہ وہ اس کی نظروں کی حدود سے باہر رہے۔

کام بہت دشوار تھا لیکن اس نے شروع سے آخر تک پالیسی کو پڑھ ڈالا۔ وہ اکاؤنٹنٹ کی آنکھیں تھیں جنھوں نے پالیسی کو پوری طرح پڑھ کر اس کی تمام جزئیات کو دماغ کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا، ٹھہر ٹھہر کر، سمجھ سمجھ کر تاکہ ہر شق کی اہمیت اس پر پوری طرح کھل جائے۔ اس کے مایوس ذہن میں ایک بے رحم خیال کانچ کے ٹکڑے کی صورت سر اُبھار رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ پالیسی کو پڑھتا گیا، اس کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں۔ وہ ایک عجیب انداز میں پُرامید ہوتا گیا۔ اس کا کاروبار، مکان، کار، فرنیچر سبھی کچھ اس کے نام تھا۔ وہ سب قرقی کی نذر ہو جائے گا۔ پالیسی کے دس ہزار ڈالر اس کے بیوی بچوں کو مل سکتے ہیں بشرطیکہ وہ خودکشی کرلے۔ یہ مسئلے کا ایک ممکنہ حل تھا، جہاں تک اس کا تعلق ہے، اس کا نہ ہونا ہی اس کے ہونے سے بہتر ہے۔ آخر وہ ہے ہی کس قابل۔ اس پر بیوی اور بچوں کی ذمے داری تھی اور اس نے یہ ذمے داری کیا خوب نبھائی تھی۔ وہ کتنا اچھا بزنس مین تھا کہ اتنی آسانی سے اپنے پارٹنر کے ہاتھوں لٹ گیا۔ وہ کتنا اچھا شوہر تھا، کتنا اچھا باپ تھا کہ اس نے بیوی بچوں کے لیے ایک خوف ناک مستقبل کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

اسے خود پر بہت شدت سے غصہ آیا۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ بڑھا کر ریوالور اٹھا لیا۔ اس نے ریوالور کی دیکھ بھال میں کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اسے تیل دیتا رہا تھا، اس کی صفائی کرتا رہا تھا۔ ریوالور بھرا ہوا تھا۔ اس وقت اسے ریوالور پر بہت پیار آیا۔ وہ ریوالور یاد دلاتا تھا کہ کبھی اس نے مردوں کی طرح بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اس نے ایامِ جوانی میں اپنے وطن کا دفاع کیا تھا۔

اس نے ریوالور کو بڑی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور اس کی انگلی ٹریگر کو بڑے پیار سے سہلا رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ ریوالور منہ میں رکھ کر فائر کرنا سب سے بہتر ہوتا ہے، ایسی بات اس نے کئی ناولوں میں پڑھی تھی۔

پڑھی تھی۔ اس میں تکلیف بھی نہیں ہوتی اور موت بھی فوری طور پر واقع ہو جاتی ہے۔ پیشانی پر نال رکھ کر فائر کرنا بہت بے رحمانہ اور مکروہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں صرف سوچا کرتا ہی بری طرح لرز گیا۔

جب وہ پالیسی کی اس اہم شق تک پہنچا تو ریوالور اس وقت بھی اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس شق پر نگاہ پڑنے کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پالیسی میں یہ شق موجود ہے لیکن وہ حسابی ذہن رکھتا تھا۔ اسی لیے اُس نے بے تاب ہو کر اس شق کو تلاش کرنے کے بجائے پوری پالیسی کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس شق کا مطالعہ کر کے اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ اب وہ آتشیں حروف اُس کی بصارت کو جھلسائے دے رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے اس شق کو پڑھتا گیا' فرار کا واحد دروازہ بھی بند ہوتے ہوتے بالکل مقفل ہو گیا۔ خودکشی کی صورت میں پالیسی خود بخود کالعدم ہو جائے گی۔

اُس کے چہرے پر پسینہ چھوٹ پڑا۔ وہ الفاظ اُس کے لیے گویا جہنم کا دروازہ کھول گئے تھے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ خودکشی کا ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جسے تفتیش کرنے پر خودکشی ثابت نہ کیا جا سکے۔ ایسا طریقہ' جس سے موت حادثاتی معلوم ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ریوالور کی صفائی کے دوران گولی چل جائے؟ لیکن اُس میں دو قباحتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اُس کے بچ جانے کا امکان موجود تھا۔ دوسری بات اور زیادہ باعثِ تشویش تھی۔ اُسے یہ علم کیسے ہوگا کہ اُس کی کوشش کامیاب ہو گئی ہے۔ اور اس کی موت حادثاتی قرار دے دی گئی ہے۔ وہ دوسری اور ابدی زندگی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے اس متحرک زندگی میں دنیا سے اس بے یقینی کے ساتھ رخصت ہونے کا تصور بے حد روح فرسا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے عزت سے جینے کا سامان بھی چھوڑے جا رہا ہے یا نہیں۔ پھر وہ یہ سوچ کر ہنس دیا کہ اُسے اِن باتوں کا علم ہی کہاں ہوگا۔ اسے کیسے پتا چلے گا کہ اس کے بیوی بچوں کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا سامان میسر آیا ہے یا نہیں۔ وہ تو موت کے ساتھ ہی ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

بہرحال' وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ کام ناممکن ہے۔ یعنی اس انداز میں خودکشی کرنا کہ وہ سو فیصد حادثہ قرار پائے اور پالیسی کی رقم اس کی بیوی کو یقینی طور پر مل جائے۔

اُسی لمحے سام نامی چوکیدار نے دفتر کے نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔ فرار کا وہ تصوراتی دروازہ' جو خودکشی کی صورت میں پالیسی کالعدم ہونے کی شق کے مطالعے کے بعد بند ہو گیا تھا' اُس کی آمد سے ایک دو انچ کے قریب کھل گیا۔

"آج دیر تک کام کر رہے ہو گورنر؟" سام نے کہا۔ اسی وقت کلاک نے بارہ بجائے۔ "مسٹر جوناس! خیریت تو ہے؟" پھر سام کی نظر جوناس کے ہاتھوں پر پڑی۔ ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں

بچوں کے لیے

انتہائی دلچسپ ناول

رعایتی قیمت پر

۱۔ آدھا آدمی	۶/-	۹۔ مسٹر چکرم	۶/-
۲۔ آخری حربہ	۶/-	۱۰۔ پکارتی لاشیں	۶/-
۳۔ بنک کا اغوا	۶/-	۱۱۔ جسم کی بلائیں	۶/-
۴۔ ڈاکٹر ڈیڈ	۶/-	۱۲۔ غنڈہ ٹیکس	۶/-
۵۔ چاند کا اغوا	۶/-	۱۳ مردہ چور	۶/-
۶۔ شیشے کے انسان	۶/-	۱۴ اصلی نقلی	۶/-
۷۔ آنکھ کی واپسی	۶/-	۱۵۔ ذلیل کیچوا	۶/-
۸۔ مغرور مجسمہ	۶/-	۱۶۔ تیسرا روپ	۶/-
		۱۷۔ ڈینجر بلان	۱۵/۵۰

تمام کتابوں کی کل قیمت ۱۱۱/۵۰ روپے ہوتی ہے لیکن مکمل سیٹ طلب کرنے پر قیمت صرف ۵۵/- روپے ہوگی ڈاک خرچ بھی رعایتی صرف پانچ روپے ہوگا۔ مکمل سیٹ کے علاوہ آپ اپنی پسند کی چند کتابیں بھی طلب کر سکتے ہیں اس صورت میں قیمت فی کتاب ۴/- روپے اور ڈینجر بلان کی قیمت ۱۰/- روپے ہوگی۔ ڈاک خرچ ۴ کتابوں تک ۵/- روپے اور ۸ کتابوں تک ۶/- روپے ہوگا۔ یہ رعایتیں صرف منی آرڈر کی رقم بھیجنے پر ہی مل سکیں گی رقم صرف منی آرڈر کے ذریعے ارسال کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا نام و پتہ اور کتابوں کا نام ضرور لکھیں منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں۔

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس ۲۲ سیدھ منشن، بلیو ریا اسٹریٹ، کراچی۔۱

پالیسی۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

جوناس بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر کوئی اُسے قتل کر دے تو ارما کو دس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔ کیا وہ سام کو اس بات پر رضامند کر سکتا ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ وہ ارما کو خط میں ہدایت کر سکتا ہے کہ سام کو دو ہزار ڈالر دے دے تاکہ سام ملک سے فرار ہو سکے لیکن پھر اُسے احساس ہو گیا کہ یہ دیوانگی ہے۔ سام ایسا کسی قیمت پر نہیں کرے گا۔ وہ تو اُسے پاگل قرار دے دے گا۔ فرار کا دروازہ پھر پوری طرح بند ہو گیا۔ بچوں کے مستقبل کے لیے روشنی کی کوئی کرن نہیں رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہے سام!" جوناس نے اُسے بے حد کشادہ مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔

سام نے بعد میں بتایا کہ اُس نے باس کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت درحقیقت جوناس کے دل میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا لیکن سام کو وہ مسکراہٹ تازندگی یاد رہے گی۔ اُس قاتل کی مسکراہٹ یاد رہنے والی چیز تھی۔ ان سٹ سام تمام عمر لوگوں کو یہی بتائے گا۔

بہرحال سام نے باہر جا کر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

جوناس کو اُس کے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ بدستور دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں ہاتھ میں پالیسی لیے بیٹھا رہا۔ اُس کا دماغ ٹھٹھر گیا تھا۔ اُس سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ خطرے سے وقت میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔ بلکہ مر جانا چاہتا تھا۔ کاش اپنی قوتِ ارادی کے زور پر سو جانے کی طرح مر جانا بھی انسان کے اختیار میں ہوتا۔ اُس نے سنا تھا کہ قدیم مشرق کے لوگ اس سلسلے میں بااختیار تھے۔ پھر کالے جادو کا معاملہ بھی تو ہے۔ موم کا ایک چھوٹا سا پتلا بنا لیتے۔ اُسے تو اپنا پتلا بنانا ہوگا۔ پھر اُس پتلے کے دل میں سوئی اُتار دیتے لیکن خودکشی کے معاملے میں یہ بھی بے سود تھا۔ اُس کا پتلا جو اس کے قریب موجود ہوگا راز فاش کر دے گا۔ خودکشی ثابت ہو جائے گی اور پالیسی کالعدم قرار پائے گی۔

دروازہ پھر کھلا۔ اُس کے جسم میں برقی کی ایک تند لہر دوڑ گئی۔ آخر سام مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ اگر میرے کام نہیں آسکتا تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتا ہے۔ اُس نے جھلا کر سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید سام اُسے تنہائی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

دروازہ کھلا۔ اس کے بعد چند لمحے خاموشی رہی۔ جوناس نے نظریں اُٹھائیں اور اچانک خون اُس کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ دروازے میں اس کا پارٹنر عباس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں دہشت تھی۔ "عجیب بات ہے!" جوناس نے سوچا۔ "اتنی طویل رفاقت کے باوجود میں نے کبھی اس کا بھینگا پن محسوس نہیں کیا!"

جوناس کا دماغ کھول رہا تھا۔ وہ ذلیل شخص کوئی ایسی چیز لیے آیا تھا جو وہ وہاں بھول گیا تھا۔ اب وہ حیران اور دہشت زدہ تھا۔ اُسے تو اُمید بھی نہیں ہوگی کہ میں یہاں موجود ہوں گا۔ جوناس کا ریوالور والا ہاتھ بلند ہوا۔ عباس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ وہ دہشت بھری نگاہوں سے ریوالور کی نال کو دیکھے جا رہا تھا۔

"جوناس!" عباس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کی آواز مینڈک کی ٹراہٹ سے مشابہ تھی۔

جوناس نے بغیر ایک لفظ کہے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس کے بددیانت پارٹنر کے دل میں اُتر گئی۔ جوناس نے بے حد پُرسکون انداز میں ریوالور میز پر رکھ دیا۔ کوریڈور کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر سام کا خوف زدہ چہرہ دروازے میں نظر آیا۔ اس نے پہلے عباس کی لاش کو دیکھا اور پھر نظریں اُٹھا کر جوناس کو جو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے اسے قتل کر دیا ہے سام!" جوناس نے کہا۔ "پولیس کو فون کرو۔ میں جلد از جلد اعترافِ جرم کرنا چاہتا ہوں۔"

لاک اَپ میں اسے بے پناہ خوشی کا احساس ہوا۔ وہ ایسی خوشی تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی اُسے ملی تھی اور نہ آئندہ مل سکتی تھی۔ عمل کے اس لمحے میں جوناس کے دماغ نے بہت تیز رفتاری سے کام کیا تھا۔ عباس بہت اچھے موقع پر آیا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی لمحہ تھا۔ عباس کی آمد ایسی تھی جیسے تقدیر کی انگلی کی خفیف سی حرکت نے بساطِ وقت پر کسی پیدل کو اُردب میں ڈال دیا ہو۔ وہ مناسب ترین لمحے میں مناسب ترین مقام پر مناسب ترین آدمی تھا۔ اُس ایک لمحے میں جوناس کی قوتِ استدلال اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اُس نے حساب لگایا تھا کہ وہ قاتل کی حیثیت سے سزائے موت پائے گا تو وہ فطری موت ہوگی۔ پالیسی کی رقم اُس کی بیوی کو مل جائے گی۔ باقی سب کچھ جائے جہنم میں۔ خود اُس کے لیے تو اب زندگی میں کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

قانونی کارروائی کے دوران وہ بہت پُرسکون رہا۔ اس نے غیر معمولی تعاون کا مظاہرہ کیا۔ اس نے تفصیلی اعترافِ جرم پر بلا جھجک اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ سام کی گواہی اس کے بیان کی پوری طرح تائید کرتی تھی۔ اُس نے اصرار کیا کہ اُس کی بیوی کو مطلع نہ کیا جائے۔

مقدمے کے دوران اُس نے اس بات پر زور دیا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے اپنی صفائی کے لیے وکیل کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر سرکار کی طرف سے اُسے وکیل فراہم کیا گیا تو اس نے بالکل ہی چُپ سادھ لی۔ وہ کچھ کہتا تو صرف اتنا کہ اس نے اپنے پارٹنر عباس کو بالارادہ قتل کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے پاس نہ کوئی وضاحت تھی اور نہ کوئی جواز۔

سام کی شہادت جوناس کے اعترافِ جرم کے ایک ایک

لفظ کی تائید کرتی تھی۔ جوناس دل ہی دل میں دعا کرتا تھا کہ ارما سام کے متعلق اپنے دل میں جذبۂ انتقام نہ پال لے۔ سام کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے تو صرف اور صرف سچ بولا تھا۔

جوناس نے اپنے بیوی بچوں سے ملنے سے صاف انکار کیا تھا۔ اس کی بیوی نے وکیل سے التجائیں کیں، اسے خط لکھے لیکن جوناس اپنے اس فیصلے پر ڈٹا رہا کہ وہ کسی سے بھی ملاقات نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ کتابِ زندگی کا آخری باب بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اب صرف اختتامیہ باقی تھا۔ اپنی نااہلی کے باوجود جو کچھ اس کے اختیار میں تھا وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے کر چکا تھا۔ وہ مطمئن، پُرسکون اور آسودہ تھا لیکن اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ بیوی یا بچوں پر ایک نظر پڑتے ہی اس کا استقلال اور اعتماد رخصت ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ بیوی بچوں سے ملنے سے انکار کرتا رہا۔ وہ اس گریز کی کوئی وجہ بھی نہیں بتاتا تھا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ مقدمہ اس قدر طول کیوں پکڑ رہا ہے۔ اس میں کمی کیا تھی۔ وہ اعترافِ جرم کر چکا تھا۔ بوڑھا سام، جو فائر کے صرف چند لمحے بعد جائے واردات پر پہنچ گیا تھا، تقریباً عینی شاہد کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر اس کا یہ بتانا کہ اس نے جوناس کو آدھی رات کو اپنے دفتر میں ریوالور لیے بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر جوناس کی مسکراہٹ کا بیان۔ استغاثے کے کیس میں کوئی جھول نہیں تھا۔

مقدمے کی تاریخیں آگے بڑھتی رہیں۔ سماعت بار بار ملتوی ہوتی رہی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، جوناس کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں تاخیر کا سبب نہیں آ رہا تھا۔ کیا عدالتیں کسی ایسے شخص کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے ہچکچاتی ہیں جو پھانسی کا خواہش مند ہو۔ یہ تو سیدھا سا معاملہ تھا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، جان کے بدلے جان۔ بس ایک فرق تھا۔ اس بار جلاد کو ایک ایسا شخص ملے گا جو اس سے بھرپور تعاون کرے گا۔

یہ جوناس کی خوش قسمتی تھی کہ مسلسل کوششوں کے باوجود سزائے موت کی روایت اب بھی قائم تھی۔ منسوخ نہیں کی گئی تھی۔

"آج فیصلہ سنایا جائے گا۔" کسی نے اسے بتایا۔ وہ خوش ہو گیا۔

جیوری کا فورمین اور دیگر اراکین رسمی فیصلے کے بعد کورٹ میں داخل ہوئے تو جوناس سے نظریں چرا رہے تھے۔ "جرم ثابت ہو چکا ہے۔" فورمین نے اعلان کیا۔

جوناس نے مشکل فیصلے کے الفاظ سنے۔ وہ اس کے لیے فتح کا لمحہ تھا اور وہ فتح کے احساس سے سرشار تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے کا دن تھا۔

سزائے موت پر اکیس دن بعد عملدرآمد ہونا تھا۔ جوناس ان میں سے ایک ایک دن سے لطف اٹھا رہا تھا۔ سزائے موت کی کوٹھری اس کے لیے ایک دلکش اور پُرلطف مقام ثابت ہو رہی تھی۔ وہ دن بھر شطرنج اور ڈرافٹ کھیلتا، پہرے داروں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا، پیٹ بھر کے کھانا کھاتا اور معصوم بچے کی طرح گہری نیند سوتا۔ جیل کی چار دیواری میں وہ دیومالائی کردار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی زندہ دلی اور ثابت قدمی مثالی تھی۔

اس کی موت سے تین روز پہلے ریاست کا گورنر اس کی کوٹھری میں داخل ہوا۔ جوناس نے کھڑے ہو کر بے حد دلکش مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "گورنر سر! آپ بالکل فکر نہ کریں۔" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔ "میں تیار ہوں۔ میں تو اسی روز سے اس مرحلے کے لیے تیار ہوں جب میں نے ارتکابِ جرم کیا تھا۔ میں پوری طرح تعاون کروں گا۔ آپ کو میری طرف سے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب وہ مجھے پھانسی گھر کی طرف لے جائیں گے تو میں اپنے قدموں پر ہوں گا۔ انھیں مجھے گھسیٹنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میں چیخوں گا بھی نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کی مذہبی تشفی کی پیشکش قبول نہیں کی ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اسی میں آپ کی خوشی ہے تو پادری کو بلا دیجیے۔ بلکہ آپ اسے اپنے ساتھ ہی لے آئے ہوتے۔"

"میری یہاں آمد کا مقصد مختلف ہے جوناس!" گورنر نے کہا۔ "تمھیں اپنی بیوی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے تمھاری بقا کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ اس نے اپیل دائر کی۔ دوسری طرف اکاؤنٹینٹس نے غبن کا سراغ لگا لیا۔۔۔"

جوناس اپنی جگہ کھڑا کسی پنڈولم کی طرح جھولے جا رہا تھا۔ پہلی بار اسے جیل کی گھٹن اور سنگی چار دیواری کی ہیبت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آنے والے برسوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مایوسی کے، قید کے تاریک سال۔ گورنر کے الفاظ اس کے لیے تازیانہ ثابت ہوئے تھے۔ پالیسی کا تصور امرِ محال ہو چکا تھا۔

"ان حالات میں تمھارے کیس کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا۔" گورنر نے مزید کہا۔ "مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ تمھاری سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔"

جوناس جھولتے جھولتے اچانک گر گیا۔ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ تقدیر اس کی تدبیر کی ناکامی پر قہقہے لگا رہی تھی، مضحکہ اڑا رہی تھی۔ گورنر نے فوری طور پر جیل کے ڈاکٹر کو طلب کر لیا۔ ڈاکٹر نے جوناس کا معائنہ کیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے افسوس ہے گورنر!" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے، انھیں کوئی ناقابلِ برداشت صدمہ ہوا تھا۔"

جوناس کی تدبیر ہار گئی تھی لیکن قدرت کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ ورنہ وہ موت کی آرزو میں عمر بھر تڑپتا رہتا۔ آزادی کی نعمت سے محروم۔

SENTENCE OF THIS COURT
Alan Archer.

جس کی تحریروں کا آپ انتظار کرتے ہیں، اُسی کے قلم سے ایک لازوال تحریر

اماوس کا دیا

علیم الحق حقی

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس پر ہر زبان میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے، ہمیشہ سے لکھا جا رہا ہے اور ہمیشہ لکھا جاتا رہے گا۔ موضوعات کثرت سے لکھے جانے پر پامال ہو جاتے ہیں لیکن محبت کی تازگی برقرار ہے اور رہے گی۔ یہ اس جذبے کی آفاقیت کا ثبوت ہے۔ گزشتہ سال آپ نے انہی صفحات پر ناقابلِ فراموش داستان "عشق کا عین" ملاحظہ فرمائی۔ مصنف کا اپنا خیال تھا کہ اس کے بعد شاید وہ محبت پر کچھ نہیں لکھ سکیں گے لیکن انہی کے قلم سے محبت کی ایک اور یادگار داستان پھر انہی صفحات پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ عشق کا عین میں وہ محبت تھی جو بندے کو خدا سے ملاتی ہے۔ اس کہانی میں یہ وہ آسمانی محبت ہے جس میں زمین کے تمام رنگ موجود ہیں۔ سفلی بھی اور نوری بھی۔ اس کے باوجود وہ اوّل و آخر محبت ہی ہے۔ ایک عظیم انسانی جذبہ۔ اس کہانی میں کردار نگاری کا فن اپنے عروج پر ہے۔ یہ کہانی دو بے حد مشہور اور حقیقی کرداروں کے باہمی تعلق سے انسپائر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن کہانی کے واقعات اور کرداروں کا خاندانی اور نفسیاتی پس منظر اور دیگر سب کچھ فرضی ہے مگر انہیں بہت زیادہ سوچا اور بے حد عرق ریزی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ مصنف نے انہیں اس طرح پیش کیا ہے کہ آپ بھی خود کو ان کرداروں کے ساتھ انسانی نفس کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا محسوس کریں گے۔ ان کے ساتھ آپ کا سینہ بھی دُکھ سے چھلنی ہوگا اور ان کے ساتھ آپ بھی محبت کی سرشاری میں بہہ گئیں گے... شرابور ہو جائیں گے۔

آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ عظیم کہانیوں کو صفحات کا پابند کرنا زیادتی ہے اور ایسی کہانیوں کو بالاقساط شائع کرنا ہمیں اور پڑھنا آپ کو گراں گزرتا ہے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ ایسی کہانیاں ٹکڑے کیے بغیر آپ تک پہنچائی جائیں لیکن یہ ممکن نہیں۔ کاش ہمارے وسائل اور آپ کی قوتِ خرید میں استطاعت ہوتی۔ یہ کہانی سالگرہ نمبر کے توشۂ خاص کی حیثیت سے ان آخری صفحات کی زینت بن رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مکمل کہانی کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

اُسے سمندر زندگی لگتی تھی اور اس نے سمندر کو اپنے اندر اُتار لیا تھا

"ایک بات پر یقین رکھو انور۔ میرے دل میں خودکشی کا خیال کبھی نہیں آسکتا۔"

انور کے اندر کی اداسی ایک دم تحلیل ہوگئی جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور باپ کو دیکھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ باپ کے چہرے کو غور سے دیکھے۔ دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ آئینے کے روبرو کھڑا ہے۔ جادوئی آئینے کے روبرو، جس نے اس کے سر کے تمام بالوں کو برف جیسا سفید کر دیا ہے۔ نگاہوں کو جہاں دیدگی دے دی ہے اور چہرے پر چند لکیریں... آنکھوں کے نیچے، آنکھوں کے پہلوؤں میں۔

وہ باپ کا ہمشکل تھا۔ اس کی جوانی کی تصویر!

باپ کے چہرے کی وہ لکیریں بھی اسے حقیقی نہیں لگتی تھیں۔ جیسے وہ کچھ اور نہیں، باپ کے اپنے برش کا کمال ہو۔ بے نیازی سے لگائے گئے چھوٹے چھوٹے ہلکے سے اسٹروک مگر یہ بھی تھا کہ وہی لکیریں تو باپ کی عمر کا احساس دلاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے یاد آتا تھا کہ باپ کی عمر ۸۸ برس ہے۔ اس کے سوا تو وہ کسی اعتبار سے بوڑھا نہیں لگتا تھا۔

"پاپا۔ یہ خیال تو میرے دل میں کبھی آ ہی نہیں سکتا کہ آپ خودکشی کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہیں۔" اس نے آہستہ سے

کہا۔

تنزر جمیل نے نظریں اٹھا کر بیٹے کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ انور کا چہرہ بدل گیا تھا۔ اب وہاں اداسی کا کوئی رنگ نہیں تھا اور یہ کمال اس کے پہلے جملے نے دکھایا تھا۔ لفظوں سے قطع نظر اس کے لہجے کی بیگانگی نے بیٹے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو گا۔ ایسے میں اداسی جیسی نازک اور لطیف چیز کیسے پنپ سکتی ہے۔ انور کو اس کے لہجے نے احساس دلایا ہو گا کہ باپ کو نہ اس کی پروا ہے' نہ ضرورت ہے۔ باپ کو تنہا چھوڑ کر امریکا جانے کے خیال سے جس اداسی نے اس کے دل کو جکڑا تھا' وہ یہ جملہ سنتے ہی یوں تحلیل ہو گئی ہو گی جیسے صبح کی نرم دھوپ میں شبنم کے قطرے تحلیل ہو جاتے ہیں۔

تنزر جمیل پھر مسکرا دیا لیکن اس بار اس مسکراہٹ کی تہ میں دکھ چھپا ہوا تھا مگر وہ دکھ انور کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ یہ تنزر جمیل کی محبت کا اسٹائل تھا۔ وہ محبت کے اظہار کا قائل نہیں تھا۔ لفظوں میں تو ہرگز نہیں۔ قدرت نے اسے اظہار کا پیرایہ رگوں اور لہو کی زبان میں عطا کیا تھا۔ اور اس نے ساری عمر اسی سے استفادہ کیا تھا۔ وہ جن سے محبت کرتا تھا' اس نے لفظوں اور لمس کی زبان میں کبھی ان سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اظہارِ محبت لوگوں میں خود انحصاری کو پنپنے نہیں دیتا جبکہ ... محبت کا کام محبوب کو مضبوطی عطا کرنا' اسے خود انحصاری سکھانا ہونا چاہئے تاکہ زندگی کے کسی بحران میں' کڑے وقت میں وہ مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے صرف خود پر تکیہ کرنا سیکھے۔

اس وقت اس نے اپنے محبوب بیٹے کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ اس نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ صرف خود پر انحصار کرتا ہے اور بیٹے کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

اس نے بیٹے سے کہا "دیکھو انور' میں ... تقریباً ایک صدی پرانا آدمی اب عمر کے اس حصے میں ہوں' جہاں انسان زندگی اور موت کے درمیان NO MANS LAND میں کھڑا ہوتا ہے اور یہ بغرزون دو ملکوں کی درمیانی سرحد کی طرح کوئی چوڑی پٹی نہیں ہوتی۔ وہ بہت تنگ پٹی ہوتی ہے۔ آدمی کتنی ہی احتیاط برتے' اس کا پاؤں موت کی لکیر کو چھو رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کس لمحے' کس مقام پر زندگی کی زمین ختم ہو جائے گی اور موت کا خلا آ جائے گا" اس نے گہری سانس لی "اور جس کے چلتے قدم موت کی سرحد کو چھو رہے ہوں' وہ خودکشی کے بارے میں سوچنے کی حماقت کیوں کرے گا۔ موت تو ویسے ہی اس کی ہم رکاب ہوتی ہے۔"

انور سحرزدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ... پاپا خالص مصور ہیں۔ ہر چیز کو' ہر جذبے کو' ہر سچویشن کو VISUALISE کرتے ہیں۔ واہ۔ کیا اچھوتا خیال ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان NO MANS LAND بہ شکل پل صراط۔

"پاپا۔ آپ اس خیال کو پینٹ کیوں نہیں کرتے؟" اس نے بے ساختہ کہا۔

تنزر ہنس دیا "میں زندگی کا مصور ہوں انور۔ موت کو میں دوسرے جہان میں جا کر پینٹ کروں تو کروں مگر وہاں موت ہو گی ہی نہیں" وہ بولا "میں تو رقص کا مصور ہوں اور رقص میرے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ کائنات کی ہر چیز رقص میں ہے۔ ہر انسانی جذبہ' ہر کیفیت' خوشی' غم' محبت۔ ہر شے رقص کا پیراہن اوڑھے ہے جب کہ موت سکوت ہے۔ اس میں کوئی حرکت' کوئی ردھم نہیں" وہ کہتے کہتے چونک کر رکا "تم موضوع سے کیوں ہٹاتے ہو مجھے۔ بات تمہارے امریکا جانے کی ہو رہی تھی۔"

"جی پاپا اور آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ آپ اصرار کر رہے ہیں کہ میں چلا جاؤں۔ میں آپ کی تنہائی کے خیال سے ہچکچا رہا تھا۔"

"تنہائی تو میرا سب سے پسندیدہ کھلونا ہے۔ تنہائی میرے لئے راجا اندر کی سبھا ہے۔" تنزر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ خود تو عمر گزار چکا۔ اس نے زندگی میں وہ سب کچھ کر لیا' جو کوئی انسان کر سکتا ہے جب کہ انور ابھی جوان ہے۔ اس کے سامنے پوری زندگی ہے۔ اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے تو اب وہ ... تنزر جمیل بڑھاپے میں اپنے جوان بیٹے کے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔

لیکن اس نے بیٹے سے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ یہ تو کمزوری کا اظہار ہوتا اور یہ اسے گوارا نہیں تھا پھر عمر زیادہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بوڑھا تو ہے بھی نہیں۔ ابھی تو اسے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بڑھاپا اور جوانی تو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ وہ تو اب بھی اوسطاً بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔

ایک لمحے میں اس نے یہ سب سوچا اور پھر اپنی بات مکمل کی۔

"میری تنہائی میں رقص و سرود کی محفلیں سجتی ہیں۔ جام ہائے ناب کے دور چلتے ہیں اور کائنات مستی و بے خودی میں ڈوب جاتی ہے۔ وہ وقت میرے لئے سب سے بڑے انجوائے منٹ کا ہوتا ہے۔"

انور کا دل تلخی اور شکایت سے بھر گیا۔ پاپا نے اپنی تنہائی ممی کی تنہائی کی قیمت پر خریدی تھی اور سید ممی سادی ممی کی تنہائی ان کے لئے راجا اندر کی سبھا نہیں تھی۔ وہ ان کے لئے اداسی اور دکھ کا مہیب خلا تھا۔ اسی خلا میں گرتے گرتے وہ موت کے پاتال میں اتر گئیں۔ وہ تو عمر بھر زندگی اور موت کے درمیان میں چلتی رہی تھیں اور انہوں نے کبھی کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ ممی نے تین جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ اکیلے سہا۔ کوئی غم بٹانے والا جو نہیں تھا۔

"پاپا' آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔ میری بھی نہیں" انور نے اداسی سے کہا۔ یہ لفظ اس نے پی لئے کہ ممی کی بھی نہیں تھی۔

"کسی کی ضرورت محسوس کرنا کمزوری کی علامت ہے جب کہ میں مضبوط انسان ہوں اور تمہیں بھی مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔"

آذر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں مضبوط نہیں بننا چاہتا پاپا" انور کے لہجے میں رکھائی آگئی۔ "میں جانتا ہوں کہ مضبوط آدمی اندر سے کتنے کمزور ہوتے ہیں اور مضبوطی کے نتیجے میں کتنے اکیلے ہو جاتے ہیں۔"

اصولاً یہ سچ سننے کے بعد آذر کو نظریں چرانی چاہئے تھیں لیکن اس نے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "تم تنہائی سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا "آدمی آتا بھی اکیلا ہے اور جاتا بھی اکیلا ہے۔ درمیان میں وہ کتنی ہی انجمن آرائی کرلے' انجام سب سے خوف ناک تنہائی ہوتا ہے۔ نزع کی تنہائی سے لے کر قبر کی تنہائی تک۔"

"آپ تنہائی کے فلسفے پر بڑی خوبصورت گفتگو کرتے ہیں۔" انور اچانک پھٹ پڑا۔ اس کے لہجے میں بپھرے ہوئے طوفانوں کی سرکشی تھی "لیکن آپ تنہائی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ نے کبھی ممی سے پوچھا تھا کہ تنہائی کیا ہوتی ہے؟ کبھی انہیں محسوس کرنے کی کوشش کی؟"

"تنہائی محرومی ہے۔ محرومیاں سب کے ساتھ ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کی محرومیاں نظر آجاتی ہیں اس لئے کہ وہ ان کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ مضبوط لوگوں کی محرومی کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ جیسے میں ہوں۔ میری کوئی محرومی تمہیں نظر نہیں آئی۔" آذر نے بے حد تحمل سے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت کا شائبہ بھی نہیں تھا "لیکن اس وقت یہ گفتگو بے محل ہے۔ تم مجھے موضوع سے نہ بھٹکاؤ۔ اپنی ممی کے سلسلے میں اپنی معمول کی شکایات پھر کبھی فرصت میں کرلینا اور رہی محسوس کرنے کی بات تو کسی کے جذبوں' احساسات اور سوچ کو محسوس کرنا محض ایک گمان ہوتا ہے' جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ آئینہ ہے' جس میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ ہر آدمی کے محسوسات کی ایک حد ہوتی ہے اور محسوس کرنے کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے۔ وہ اسی کے مطابق دوسرے کو محسوس کر سکتا ہے۔"

انور کا منہ لٹک گیا۔ پاپا ہمیشہ یونہی بات کرتے تھے۔ جیسے برف کی کوئی سل اپنی بے مہر ٹھنڈک دوسروں کو پہنچاتی ہے۔

"تم کاغذات مکمل کرلو۔ میں تین چار فون کروں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا اور کوئی فکر نہ کرنا۔ امریکا میں نیویارک کے ہر بڑے کلب میں میرے پرستاروں کا ایک حلقہ ہے۔ تمہیں وہاں رہ کر کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" آذر نے اپنی بات مکمل کی۔

"شکریہ پاپا مگر میں آپ کے کسی پرستار سے ملوں گا بھی نہیں۔ مدد لینا تو دور کی بات ہے۔"

آذر نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔

"میں اب کبھی آپ کے نام کی رسائی استعمال نہیں کروں گا۔ مضبوط لوگ سہارے کبھی تلاش نہیں کرتے نا؟ میں اپنے یہاں کے حوالے یہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔" انور نے وضاحت کی

سوال

ٹیچر بچوں کو سمجھا رہی تھی کہ سردیوں میں مناسب کپڑے پہنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ مثال سے سمجھانے کے لئے اس نے چھوٹی سی ایک کہانی گھڑ کر بچوں کو سنائی "ارشد ایک اچھا بچہ تھا لیکن دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں وہ ایک روز صبح ہی صبح صرف بنیان اور نیکر پہن کر قریبی پارک میں کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اس وقت وہ اسپتال میں ہے۔ اسے نمونیا ہوچکا ہے۔ آپ لوگ اس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ایک کونے سے چھوٹے سے ایک بچے نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"مس! ارشد کا بیٹ آج کل کس کے پاس ہے؟"

اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلتا ہوں پاپا۔"

آذر جمیل حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ بیٹے نے اس کی بات اسی کو لوٹا دی تھی۔

○○○

تنہائی ہوئی تو اندر سناٹا بج گیا!

اس کے ہاتھ میں جام تھا۔ آنکھوں میں سرور اور تصور میں محفلِ نشاط۔ نرتکیاں رقص میں مصروف تھیں۔ رقص.. اعضا کی شاعری!

لیکن وہ لطف نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ طبیعت میں بدمزگی سی تھی۔ بیٹے نے بلاوانستگی میں اس کی دکھتی رگ پر انگلیاں رکھ دی تھیں۔ محرومی! محرومی!! اس کی محرومیاں ایسی تھیں' جن کا کسی کو پتا نہیں تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکا تھا۔

اس نے جام سے ایک گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ شراب میں طویل زندگی کی سی گئی تھی۔ اس نے جام پٹک دیا اور ہاتھ سے رقاصاؤں کو رقص موقوف کرنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے میں گھنگروؤں کی آواز بجھ گئی۔ اندر سناٹا سکوت طاری ہوگیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

پھر اس سکوت میں گھنگروؤں کی چھن چھن ابھری۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی راج نرتکی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ بہت بے کیف ہو؟" وہ مترنم آواز میں بولی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "تم ہو۔ تم کب آئیں؟"

"میں یہاں سے کب جاتی ہوں۔" راج نرتکی نے حیرت سے

کہا۔ "مجھے تو تم جانِ محفل کہتے ہو۔ میں تو اس محفل میں ہی رہتی ہوں۔ تم جب بھی آؤ' میں یہیں موجود ہوتی ہوں۔" راج نرتکی کے لہجے میں اتراہٹ تھی۔

"اوہ۔ ہاں۔" وہ بے دھیانی سے بولا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟ آج تم پہلے جیسے نہیں۔ اداس کیوں ہو؟"

"ہیں نہیں۔ اپنی محرومیوں کا خیال آگیا تھا۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر خیال لہجے میں بولا۔ "تم کتنی جوان' تر و تازہ اور شاداب ہو اور میں۔"

"اس محفل میں کسی کی کوئی عمر نہیں۔" راج نرتکی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہاں سب جوان ہیں۔ یہاں وقت کا گزر نہیں۔ ذرا آئینہ دیکھ لو۔"

آذر کو آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی' صرف نظریں اٹھانا ہی کافی تھا۔ وہ تو آئینہ خانہ تھا مگر اپنا عکس دیکھتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ آئینے میں تو اسے بڈھے آذر کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ ۸۸ سالہ آذر کا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میری عمر ۸۸ سال ہے۔ اور نظر بھی آرہی ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے آج؟" نرتکی بھی جھنجلا گئی۔ "تم پھر سے گیارہ سال کے بچے بن رہے ہو۔"

یہ گیارہ سال کے بچے کا حوالہ آذر کے لئے ایک اور تازیانہ تھا۔ کیا یہ دن ہی ایسا ہے کہ جو آئے گا' کچوکے دے گا۔ وہ اچانک ہی پھٹ پڑا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ چلی جاؤ خدا کے لئے۔" اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

راج نرتکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کھڑے کھڑے غائب ہو گئی۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔ آئینہ خانہ بھی اوجھل ہو گیا۔ اب وہ اپنے اسٹوڈیو میں تھا۔

آذر نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایزل پر ایک نامکمل تصویر لگی تھی۔ اِدھر اُدھر ایسے کینوس بکھرے ہوئے تھے' جن کی صرف فنشنگ باقی تھی۔ ایک طرف وہ کینوس رکھے تھے' جو مکمل ہو چکے تھے۔ وہ امریکا میں اپنی تصویروں کی نمائش کی تیاری کر رہا تھا۔

شیشے کے ٹاپ والی میز پر ایک جام رکھا تھا۔ اس نے جام اٹھا کر ایک گھونٹ لیا پھر اسٹوڈیو کا جائزہ لیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ وہ محفل کہاں گئی۔ وہ آئینہ خانہ کیا ہوا۔ وہ اِندر سبھا۔ یہ کیا ہوا کہ تنہائی اپنی رنگینی اور جادو کھو بیٹھی بلکہ اذیت ناک ہو گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے تصور کو دعوت دی لیکن اس کے سامنے اِندر سبھا نہیں آئی۔ کوئی آئینہ خانہ نہیں آیا۔ کہیں کوئی نرتکی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ایک تاریک خلا تھا' جس میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" وہ آنکھیں بند کیے کیے غرایا۔

اس لمحے تصور میں روشنی ہو گئی۔ اِندر سبھا تو نظر نہیں آئی لیکن پرانی یادوں کا ایک کمرا ابھر آیا۔

تھوڑی دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بات ہی اتنی پرانی تھی پھر اسے یاد آگیا کہ یہ اس کا پرانا کمرا ہے' جہاں اس کا لڑکپن گزرا تھا۔ یہ اس کے آبائی مکان کا کمرا تھا۔ اس مکان کو وہ بہت پہلے خیرباد کہہ آیا تھا۔ اب تک تو اس کی دیواروں۔ بلکہ بنیادوں کو بھی وقت نے چاٹ لیا ہو گا۔ مٹا ڈالا ہو گا۔

مگر اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ خود ہی تماشا تھا اور یہ خود ہی تماشائی۔ وہ اس کمرے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ گیارہ سالہ آذر جمیل کو اور وہ بے حد روانی سے پنسل کی مدد سے ایک نسوانی جسم کو کاغذ پر اجاگر کر رہا تھا۔ اس جسم کے خطوط و قوسین کا تناسب قابلِ داد تھا۔ اس عمر میں کسی عام لڑکے سے ایسی فنکارانہ چابک دستی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

گیارہ سالہ آذر نے اپنی بنائی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ میں بڑی محبت تھی۔

وہ اسکیچ زہرہ کا تھا۔ زہرہ جو اس کی کزن تھی..... چھوٹی سی تھی کہ ماں باپ دونوں کے بعد دیگرے اسے اکیلا چھوڑ گئے۔ اسے آذر کے والدین نے ہی پالا تھا۔ اور اتنی ہی محبت سے پالا تھا کہ ماں باپ کا حق ادا کر دیا تھا۔

اسی لمحے زہرہ کمرے میں چلی آئی۔ "ارے ننھے منے۔ تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟"

آذر کو وہ دن تمام جزئیات سمیت یاد تھا۔ وہ کبھی اسے بھول نہیں سکا۔

○☆○

آذر نے زہرہ کی آواز سنتے ہی اسکیچ کو پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا۔ زہرہ کا تجسس سے برا حال ہو گیا۔ "ننھے منے۔ دکھاؤ نا۔ کیا چھپا رہے ہو؟"

آذر کو یہ "ننھے منے" ہمیشہ برا لگتا تھا۔ خاص طور پر زہرہ کے منہ سے لیکن اس نے کبھی تردید نہیں کی تھی۔ اتنی کم عمری میں بھی وہ عملی تردید کا قائل تھا۔

"دکھاؤ نا۔" زہرہ نے پھر کہا۔

آذر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ یہ اسکیچ زہرہ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ چھپنا چھپی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں تو آذر اس اسکیچ کو اس لئے بچانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زہرہ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر چند لمحے بعد اس کا نظریہ تبدیل ہو گیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ البتہ اس کے اندر سے کسی نے کہا کہ اسے اس اسکیچ کو زہرہ کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے کی بھرپور کوشش کرنی ہے۔ وہ یہ کوشش کرے گا تو چھپنا چھپی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اس چھپنا چھپی کی لذت سے وہ زیادہ سے زیادہ محظوظ ہو سکے گا۔

چھپنا چھپی اتنا زور پکڑ گئی کہ زہرہ کو تن بدن کا ہوش ہی نہیں

"اچھا۔ یہ بتاؤ۔ میں یہ فرق دور کر کے اس تصویر جیسی بن سکتی ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ یہ کام مشکل تو ہے' ناممکن نہیں۔"

اس جواب نے زہرہ کی ہچکچاہٹ دور کر دی۔ حسین سے حسین ترین بننا ہر عورت کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے۔ وہ اس آرزو کی خاطر کیا نہیں کر سکتی۔ "اچھا چلو۔ مجھے وہ فرق بتاؤ۔"

تنور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو ٹھیک ہے۔ یہاں سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔"

زہرہ اس کی ہدایت کے مطابق سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تنور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ وہ نظریں چرانے لگی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایسے دیکھنے ہی سے تو فرق نظر آتا ہے۔" تنور نے کہا۔ "تم آئینے میں دیکھتی رہو۔"

تنور نے اپنی انگلی سے اس کے چہرے کو بڑی نرمی سے سہلایا۔ وہ سمٹنے لگی۔ "کیا کرتے ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔ تمہارا چہرہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس ہو تب بھی اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ناک کو تھوڑا سا چھیلا نہیں جا سکتا۔ ہونٹوں کو تھوڑا سا خم نہیں دیا جا سکتا۔ رخساروں کی ہڈی کو تھوڑا سا اونچا نہیں کیا جا سکتا۔" وہ ہنسنے لگا۔

زہرہ جھنجلا گئی۔ "کیوں فضول بک رہے ہو۔ فرق بتاؤ نا۔"

"بتاتا ہوں۔" تنور نے کہا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر زہرہ کا سراپا جائزہ لیا پھر اس نے پیچھے کھڑے ہو کر زہرہ کے دونوں پہلوؤں کو کمر کے مقام سے چھوا۔ "یہاں پیمائش میں ایک ایک انچ کی کمی ہو اور یہاں سے یہاں تک۔" اس کی انگلیاں اوپر نیچے حرکت میں آئیں۔ "ایک خم ہو۔ کمان جیسا۔"

زہرہ نے کسمساتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹکے اور مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی۔ "کمال کرتے ہو۔ لو۔ ایسے ایک انچ سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لگتا ہے کہ فرق نہیں پڑ سکتا۔" تنور نے عالمانہ شان سے کہا۔ "لیکن فرق پڑے گا۔ دیکھو۔ اوپر نیچے سب کچھ ویسا ہی رہے گا' جیسا اب ہے مگر یہاں کے ایک انچ کے فرق سے یہاں سے وہاں تک۔" ہاتھوں کی تیز حرکت۔ "یہ سب کچھ بدل جائے گا۔" اب وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "اور یہاں۔" وہ اسے سمجھاتا رہا۔ یا سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ حیران' کچھ پریشان سا رہ گیا۔ زہرہ اچھی خاصی تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے سے اتر آئے تھے اور سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

تنور اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ بات تو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی مگر اسے یہ احساس ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی اس کی اپنی بھی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جبلت نے اسے احساس دلا دیا کہ زہرہ کی بھی ویسی ہی کیفیت ہے۔

"کیا بات ہے اتنا تو تم چھینا جھپٹی میں بھی نہیں ہانپی تھیں؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں زہرہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا۔ "ہاتھ ہٹاؤ اپنے۔ مجھے نہ چھونا۔"

"میرے ننھے منے ہاتھ تمہیں تکلیف تو نہیں پہنچا سکتے۔" اس نے صفائی پیش کی۔ "تم تو مجھے ننھا منا کہتی ہو۔"

"تم ننھے منے نہیں ہو۔" زہرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "..... ہو بھی اور۔ اور ہرگز نہیں ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ ہوں بھی اور ہرگز نہیں ہوں۔" تنور کے لہجے میں الجھن تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ماحول کا سارا کھنچاؤ ایک پل میں دور ہو گیا۔ "تم نہیں سمجھو گے۔ چھوٹے سے مرد ہو نا۔"

"خیر چھوڑو۔ میں تمہیں فرق سمجھا رہا تھا۔" تنور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

"مجھے کوئی فرق نہیں سمجھنا۔ تم اپنے ہاتھ دور رکھو۔" زہرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

تنور حیران سا اسے دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی رہی پھر دروازے کی طرف چل دی۔

"ناراض ہو کر جا رہی ہو؟" تنور نے اسے پکارا۔

"نہیں تو۔ میں ننھے منے سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔" زہرہ نے پلٹ کر کہا۔

"اچھا۔ میرا اسکیچ تو دیتی جاؤ۔"

زہرہ نے اپنے ہاتھ میں موجود اسکیچ کو دیکھا اور اٹھلا کر بولی۔ "یہ تو میں نہیں دوں گی۔ اس کی مدد سے میں فرق کو سمجھوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں دوسرا بنا لوں گا مگر دیکھنا' کیسا خراب بناتا ہوں۔ اب ویسی تصویر بناؤں گا جیسی تم ہو۔"

زہرہ نے جواب میں اسے منہ چڑایا اور کمرے سے نکل گئی۔ تنور دیر تک اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ 'میرے ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ایسی کیا بات ہے' وہ سوچ رہا تھا۔

○☆○

تنور چونکا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ مخروطی آرٹسٹک انگلیاں' جنہیں بڑھا پا چھو نہیں سکا تھا۔ اس نے چونک کر اسٹوڈیو کا جائزہ لیا۔ سائڈ ٹیبل پر اس کا جام رکھا تھا۔ اس میں دو گھونٹ ابھی باقی تھے۔ اس نے ایک ہی سانس میں جام خالی کر دیا اور سوچنے لگا۔

اس بار وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چند دہائیوں پہلے فنِ مصوری کے ایک ناقد نے اس کے بارے

میں لکھا تھا۔ "آذر جمیل پیدائشی مصور ہے۔ حسنِ تناسب کا جو شعور اسے قدرتی طور پر ودیعت ہوا ہے' وہ اسے اس کے ... ہم عصروں میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے جینئس ہونے میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ ابتدا ہی سے غیر معمولی بچہ رہا ہو گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کا بچپن بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں گزرا ہے۔ وہ لوگوں کو حیران کر دیتا ہو گا۔ کاش میں اسے اس کے بچپن میں دیکھ پاتا۔"

یہ یاد کرتے ہوئے آذر مسکرا دیا۔ اس ناقد کو اندازہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس نے کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے۔

ابھی چند لمحے پہلے آذر نے اپنے لڑکپن کی ایک یاد تازہ کی تھی۔ جیسے کوئی فلم دیکھی ہو۔ ذات کے نہاں خانے میں سب کچھ چھپا ہوا تھا۔ لیکن تازہ تھا۔ وہ اپنا اور دوسروں کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سن سکتا تھا۔ اور چند لمحے پہلے اس نے سنا بھی تھا۔ اب وہ اسی حوالے سے سوچ رہا تھا۔

وہ خود بھی حیران ہوتا تھا کہ کتنی کم عمری میں وہ کتنی بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ کتنا وسیع تھا اور لہجے میں کیسی پختگی اور اعتماد تھا۔ آج کل یہ اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ بچے بہت ذہین ہو رہے ہیں۔ ورثے میں ملی ہوئی اس دور کی آگہی انہیں قبل از وقت بڑا بنا دیتی ہے مگر جو کچھ اس نے چند لمحے پہلے دہرایا' وہ ۱۹۱۹ء کی بات تھی۔ اس عہد میں جب کہ تعلیم عام نہیں تھی۔ اس کے وہ نکالے خود اس کے لئے بھی غیر معمولی اور ناقابلِ یقین تھے مگر یہ بھی تھا کہ وہ تعلیم یافتہ اور بے حد دولت مند باپ کا بیٹا تھا۔

اور پھر پہلی نظر کی وہ محبت جو اسے کم عمری میں ہوئی اور سترہ سال کی بھرپور لڑکی سے ہوئی۔ اس وقت تو بس وہ یہ جانتا تھا کہ زہرہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اسے چھونے کو دل چاہتا ہے بلکہ کبھی کبھی اسے کھلونے کی طرح توڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے لیکن بعد میں اس کی سمجھ میں پوری طرح آگیا تھا کہ اس محبت کی اساس جسم تھا۔ وہ خالص جسمانی محبت تھی اور وہ جسم سے نظریں چرا کر کبھی محبت کر بھی نہیں سکا۔

اور اس محبت نے کتنی کم عمری میں اس کی دنیا بدل کر رکھ دی ... اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ اگر اس کی زندگی میں زہرہ نہ ہوتی تو شاید وہ ایک بالکل مختلف آدمی ہوتا۔ مصور تو وہ پیدائشی تھا۔ اسے مصور ہی بننا تھا لیکن وہ مختلف انسان ہوتا۔ اس کی زندگی میں اتنے خلا نہ ہوتے۔ اس سے باپ کی محبت اور شفقت نہ چھنی ہوتی اور شاید وہ اتنا بڑا مصور بھی نہ ہوتا۔ زہرہ نے ... ہاں' ایک عام سی خوش بدن لڑکی نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ اس کے لئے تقدیر تھی' جس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔

آذر نے اپنے لئے جام بھرا۔ اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور یادوں کی کتاب کھول لی۔

○☆○

آذر کو زہرہ سے اور زہرہ کو آذر سے ابتدا ہی سے خاص انسیت تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ بچپن میں جب کبھی وہ ضد کرتا اور مچلتا تو صرف اور صرف زہرہ کے قابو میں آتا تھا۔ زہرہ کے پاس جانے کیسا جادو تھا کہ وہ اس کی گود میں جاتے ہی چپ ہو جاتا... بلکہ ہنسنے کھیلنے لگتا۔ چار پانچ سال کی عمر کی باتیں تو اسے خود بھی یاد تھیں۔ وہ صرف اور صرف زہرہ کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کی آغوش اسے سب سے زیادہ پسند تھی اور اس سے پہلے ہی سے وہ زہرہ کے ساتھ سونے لگا تھا۔

وہ زہرہ سے لپٹ کر سوتا تھا۔ پوری معصومیت کے ساتھ' ننھے بچوں کی طرح۔ ڈرائنگ تو اس نے چار سال کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی۔ تناسب کا شعور اسے ابتدا ہی سے تھا۔ اگلے چند برسوں میں یہ ہوا کہ اس نے شعوری طور پر ہر چیز پر غور کرنا شروع کر دیا کہ اس میں کہاں اور کس حد تک تناسب کی کمی ہے۔ اس کے اندر چھپے ہوئے پیدائشی مصور کی تربیت شروع ہو گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر ایک شعلہ ہے جو اظہار چاہتا ہے لیکن اسے عجیب سی بے چینی رہنے لگی تھی پھر وہ بے چینی جستجو کا روپ دھار گئی اور کیونکہ وہ زہرہ سے لپٹ کر سوتا تھا اس لئے زہرہ غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر اس جستجو کی منزل بن گئی۔

یہ اس وقت ہوا جب وہ نو سال کا تھا۔ وہ سردی کی ایک رات تھی اور وہ لحاف میں زہرہ سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ اسے اب بھی یاد تھا کہ اس رات اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں اس نے بہت ساری تتلیاں دیکھیں اور وہ ان تتلیوں کو پکڑنے کے لئے دیوانہ وار دوڑ رہا تھا مگر تتلیاں اس کے ہاتھ نہیں آرہی تھیں اور اس پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔

بچے تتلیوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ بھی دوڑتا تھا بلکہ تتلیاں اسے زیادہ ہی اچھی لگتی تھیں۔ ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے حقیقی زندگی میں اسے سرشاری کا' لطف و انبساط کا احساس ہوتا تھا مگر خواب میں وہ متوحش تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تتلیاں تناسب سے محروم تھیں اور اسے بہت خوفناک لگ رہی تھیں۔ کچھ تتلیوں کے دونوں پر چھوٹے بڑے تھے' کچھ کا سر اور وجود پروں کے مقابلے میں بہت بڑا تھا اور کچھ کے پر ان کے وجود اور سر کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ ان سب میں بس ایک قدرِ مشترک تھی۔ وہ بہت بدصورت' بدنما اور بھیانک لگ رہی تھیں۔

وہ ہانپتا' دوڑتا انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس پر خوف بھی طاری تھا۔ بالآخر ایک تتلی اس کے ہاتھ آگئی لیکن جیسے ہی اس نے تتلی کو پکڑا' تتلی نے اپنا منہ پلٹا کر اس کی انگلی میں کاٹ لیا۔

دہشت سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے حلق

سے خوف ناک چیخ نکلی۔ وہ جاگا لیکن اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا' جب زہرہ نے جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہوا ننھے منے۔ کیا ہوا؟" وہ کہے جا رہی تھی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خواب گاہ میں ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹٹولنے والے انداز میں زہرہ کے پہلوؤں پر نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے حرکت کر رہے تھے۔ چند لمحے وہ بول بھی نہیں سکا۔

زہرہ بدستور پوچھے جا رہی تھی۔ "کیا ہوا ننھے منے۔ کیا بات ہے؟"

"آپا۔ آپا۔" بالآخر اس کی آواز نکلی۔

"کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈراؤنا خواب؟" زہرہ نے پوچھا۔

"ہاں آپا۔"

زہرہ نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ "کیا دیکھا تھا ننھے منے؟"

"تتلیاں دیکھی تھیں آپا۔"

"بچے کہیں کے۔ تتلیاں دیکھ کر تو خوشی ہوتی ہے۔ ڈر تھوڑا ہی لگتا ہے۔" زہرہ نے اسے سینے سے بھینچے بھینچے کہا۔

"وہ بہت خوفناک تتلیاں تھیں آپا۔"

زہرہ نے اسے ذرا سا پیچھے ہٹا کر اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ "تتلیاں خوبصورت ہوتی ہیں' خوفناک نہیں۔"

"مگر وہ خوفناک تھیں۔" اس نے کہا اور تفصیل سے بتانے لگا۔

زہرہ اس کی بات توجہ سے سنتی رہی پھر بولی۔ "وہ تو خواب تھا۔ ورنہ تتلیاں تو پریاں ہوتی ہیں۔ تتلیوں کے بھیس میں۔ خیر بھول جاؤ اس خواب کو۔ لیٹو اور مجھ سے لپٹ کر سو جاؤ۔"

وہ لیٹ بھی گیا اور زہرہ سے لپٹ بھی گیا مگر دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ زہرہ لیٹتے ہی سو گئی مگر اس کے تصور میں تاب سے محروم وہ خوفناک تتلیاں تھرکتی رہیں۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ زہرہ کے پہلو پر حرکت کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی بہت غیر محسوس طور پر وہ پُرسکون ہوتا گیا۔ تتلیوں کا خواب بتدریج اس کے ذہن سے محو ہوتا گیا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں سمجھ سکا لیکن برسوں بعد اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ سب کیا تھا اور کیوں ہوا تھا۔ اس رات زہرہ کو چھوتے رہنے سے اس کا خوف کیوں دور ہوا تھا۔ اسے سکون کیوں ملا تھا۔ خواب ڈراؤنا اس لئے تھا کہ اس میں خوبصورتی تاب کھو بیٹھنے کے بعد خوف ناک بدصورتی میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن زہرہ کے حسنِ تاب نے اس کے خوف کو زائل کر کے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

مگر اس رات پُرسکون ہو جانے کے بعد ایک دور رس اور انقلابی تبدیلی بھی اس کے اندر رونما ہوئی۔ پُرسکون ہو جانے کے بعد زہرہ کے جسم پر اپنے ہاتھوں کی حرکت سے اسے لذت کا احساس ہونے لگا اور وہ بڑی انوکھی لذت تھی۔ اس کے لئے بالکل نئی۔ لذت کا وہ احساس لئے وہ نجانے کب سو گیا۔

اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔ وہ اس کے لئے عرصۂ تربیت تھا۔ اس کے مصور ہاتھ جسمانی خطوط اور پیچ و خم کی آگہی حاصل کر رہے تھے۔ حسنِ تناسب کا سبق یاد کر رہے تھے۔

اس عرصے میں اس کی سمجھ میں اور بھی بہت سی باتیں آئیں۔ وہ لمس اور جذبوں میں فرق کرنا سیکھ گیا۔ لذت ماں کی آغوش میں بھی تھی اور زہرہ کی آغوش میں بھی تھی لیکن دونوں میں فرق تھا۔ ماں کی آغوش میں ٹھنڈک اور ایک طرح کی مٹھاس تھی جب کہ زہرہ کی آغوش میں گرمی' گداز اور عجیب سا کھنچا کھنچا سا تناؤ تھا۔ ماں کو چھونے سے اپنے اندر روشنی کا احساس ہوتا تھا جب کہ زہرہ کو چھونے سے اپنے اندر اندھیرے سرسراتے محسوس ہوتے اور وجود کی عمارت میں تاریک گوشوں کی موہوم سی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ماں کو چھو کر سکون ملتا تھا مگر زہرہ کو چھو کر لگتا تھا کہ جسم میں کوئی آگ سی بھڑک اٹھی ہے۔ وحشت سی سر اٹھانے لگتی تھی۔ لگتا تھا' کوئی خواہش مچل رہی ہے۔ وہ خواہش کیا ہے' یہ وہ نہیں سمجھ پاتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس نے جان لیا کہ ماں کو وہ کسی بھی وقت کسی بھی طرح پوری بے تکلفی سے چھو سکتا ہے۔ زہرہ کو وہ اس بے تکلفی سے نہیں چھو سکتا اور اس کی جبلت نے بتا دیا تھا کہ زہرہ کو کسی بھی طرح چھونا اس کے لئے معیوب ہے۔ ہاں چھپ کر ایسا کیا جا سکتا ہے مگر اس وقت یہ محض ایک موہوم سا احساس تھا۔ بعد میں زہرہ کے طرزِ عمل نے اس کی تصدیق کر دی۔ کچھ بھی ہو' اس کے وجود میں موجود آگہی کا بیج نمو پا کر پھوٹ نکلا تھا اور ممنوعات کے ننھے سے بچے نے سر ابھار لیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی بچہ تھا' مستقبل کا ایک بے حد بڑا مصور۔

زہرہ کی نیند بہت پکی تھی۔ وہ بے خبر سوتی تھی اس لئے کچھ عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر پھر تنور کی وحشت اور تجسس نے مل کر اسے اکسایا اور وہ برادِ راست اور بے حجاب لمس کے لئے مچل گیا۔

مگر پہلے ہی موقع پر زہرہ کی آنکھ کھل گئی۔ شروع میں تو اسے صرف کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ نیند میں ڈوبا ذہن کچھ سمجھ نہیں سکا لیکن بالآخر اسے تنور کے بے حجاب ہاتھ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے تنور کو کئی بار پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تنور کو جبلت نے بتا دیا کہ اس کے لئے سوتا بنے رہنے ہی میں عافیت ہے۔ زہرہ اسے پسند نہیں کرے گی۔

یوں تو سال کی عمر میں اسے علیحدہ کمرا مل گیا۔ وہ الگ سونے لگا۔ یہ بات اسے اچھی نہیں لگی لیکن دل میں چور تھا اور یہ خوف تھا کہ زہرہ ابا جان کو اس حرکت کے متعلق بتا نہ دے اس لئے اس

نے احتجاج نہیں کیا۔ ابا جان سے وہ ڈرتا بہت تھا۔ شاید اس لئے کہ ان سے واسطہ کم ہی پڑتا تھا حالانکہ وہ بہت شفیق باپ تھے۔

مگر وہ دوری اسے تکلیف دہ لگی۔ وہ کمی بہت بڑی تھی۔ وہ دن بھر زہرہ سے قریب رہنے کے بہانے تلاش کرتا۔ مختلف حیلوں سے اسے چھوتا لیکن تسلی نہ ہوتی۔ اس عرصے میں اس پر منکشف ہوا کہ اسے زہرہ سے محبت ہو گئی ہے۔ اس وقت محبت کا بس یہ مطلب اس کی سمجھ میں آیا کہ آدمی کسی کی ضرورت محسوس کرے اور اس کے لئے تڑپے تو اسے محبت کہتے ہیں۔

اس جدائی اور محرومی میں اس کے اندر کا مصور یک لخت بڑا ہو گیا۔ ایک رات اسے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ یونہی کاغذ پنسل لئے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ پنسل کو لے کر جسمانی خطوط اور پیچ و خم کے اس راستے پر چل پڑا جو اسے ازبر ہو چکا تھا۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ اس نے زہرہ کا اسکیچ بنا دیا تھا۔

اس کے بعد تو یہ اس کی محروم راتوں کا مشغلہ بن گیا پھر اسے زہرہ کے اسکیچ دیکھتے ہوئے تشنگی اور کمی کی۔ یا یوں کہئے کہ زیادتی کا احساس ہونے لگا۔ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا فطری حسنِ تناسب اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں گیارہ سال کی عمر میں اس نے زہرہ کو IMPROVE کرتے ہوئے وہ اسکیچ بنایا جسے دیکھ کر زہرہ کو احساس ہوا کہ وہ خوبصورت تو ہے ہی لیکن حسین ترین بھی بن سکتی ہے۔

مگر اس دوران اس نے تنہائی میں زہرہ کو تم کہہ کر مخاطب کرنا اور زہرہ اور آپا میں بے تعلقی کی حد تک فاصلہ پیدا کرنا سیکھ لیا تھا۔ زہرہ اس بات سے چڑتی بھی تھی لیکن محبت سے مجبور تھی۔ آخر اس نے آذر کو گود میں کھلایا تھا۔

○☆○

آذر نے جام اٹھا کر دو اور گھونٹ لئے۔ کیسا دن ہے! اس نے سوچا۔ آج تو ٹے خوش رنگ میں تجی کے سوا کچھ نہیں۔ ہر گھونٹ اندر کی تجی کو اور بڑھا رہا ہے اور پھر اس ماضی کو دہرانا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس سے تو وہ ہمیشہ بچتا تھا۔ اس کی تنہائی۔ راجا اندر کی سبھا تو بہت رنگین تھی۔ تنہائی کا تو وہ ہمیشہ منکر اور خواہاں رہا تھا۔

اس نے اس امید پر آنکھیں موندیں کہ اس کے سامنے اس کی رنگین محفل آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ اس نے راج نرتکی کو دھتکار دیا تھا۔ اس کی پاداش میں وہ ماضی کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جو ماضی کو حال سے ہم آہنگ کر کے رنگینیوں سے آراستہ کرنے کا عادی تھا۔

اس نے جان لیا کہ آج اسے ماضی کا سفر کرنا ہے۔ اپنی محرومیوں کی یاد تازہ کرنی ہے۔ سو اس نے سپر ڈال دی۔

○☆○

آذر نے زہرہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ایک اور تصویر بنا لے گا۔ اور بہت خراب بنائے گا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن اسے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس تصویر نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا۔ یہ الگ بات کہ زہرہ کو اس تصویر کا کبھی پتا نہیں چلا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔

اس بار وہ پنسل اسکیچ تک محدود نہیں رہا۔ اس نے بڑی مہارت سے زہرہ کی تصویر کو رنگوں کا لباس پہنایا۔ یہ الگ بات کہ تصویر بے لباس تھی۔ اس وقت اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ مصوری کی دنیا میں NUDE تصویروں کا وجود ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

زہرہ کی اس تصویر پر اس نے کئی ماہ کام کیا لیکن اس طرح کہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ زہرہ کو بھی نہیں۔ زہرہ کو اس نے کس طرح دیکھا کب دیکھا۔ یہ صرف وہی جانتا تھا۔

اس روز زہرہ کی طبیعت خراب تھی۔ بخار تھا، جس کی وجہ سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں بھی درد تھا۔ سردی کا احساس بھی تھا اسی لئے اس نے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔

زہرہ کے کمرے کے برابر ہی آذر کا کمرا تھا۔ آذر دروازہ بند کئے زہرہ کی تصویر پر کام کر رہا تھا۔ وہ اس تصویر کو ہر لحاظ سے بے داغ اور مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے تصویر کو اپنی کتاب میں رکھا اور زہرہ کے کمرے میں چلا آیا۔

زہرہ کو لحاف اوڑھ کر لیٹے دیکھ کر اسے تشویش ہوئی مگر اس نے شرارت بھرے انداز میں لحاف الٹ دیا۔

"کیا کرتے ہو چھوٹے سے مرد؟" زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔ لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"ہوا کیا ہے زہرہ۔ آپا؟" آذر نے پوچھا۔

"سردی لگ رہی ہے۔ بخار ہے مجھے۔ سر میں اور پورے بدن میں شدید درد ہے۔" زہرہ نے جواب دیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

آذر نے جلدی سے اسے لحاف اڑھا دیا پھر بچوں کے سے لہجے میں التجا کی۔ "چھوتو باہر نکال لو زہرہ۔ آپا۔"

زہرہ نے چھو لحاف سے باہر نکال لیا۔ اس عالم میں بھی وہ مسکراہٹ نہ روک سکی۔ "کیوں چھوٹے سے مرد؟"

"عجیب سا لگتا ہے۔ چھوتو سامنے رہنا چاہئے۔"

زہرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ آذر اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس لمحے زہرہ کو تکلیف میں دیکھ کر اسے اس پر عجیب طرح سے پیار آیا۔ اسے ایسا لگا، جیسے وہ ایک جوان مرد ہے اور زہرہ چھوٹی سی بچی۔ اس لمحے وہ اس تصویر کو بھی بھول گیا جو عرصے سے اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کا خیال بھی محو نہیں ہوتا تھا۔

اچانک زہرہ کراہنے لگی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ "بہت درد ہو رہا ہے آپا؟" اس بار آذر فکر کے مارے اسے زہرہ کہنا بھی بھول گیا۔

زہرہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اسے یوں دیکھا جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہی ہو پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آذر نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بوکھلا گیا۔ وہ تو آگ ہو رہی تھی۔ "تمہیں تو بہت تیز بخار ہے آپا۔"

زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں امی کو بلا کر لاتا ہوں۔"

"نائی اماں کو معلوم ہے۔ انہوں نے مجھے دوا بھی دی ہے۔" زہرہ نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم پریشان نہ ہو چھوٹے سے مرد۔ بس درد کم ہو جائے تو میں بالکل بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔"

"آپا۔ ذرا اس طرف کھسکو۔"

"کیوں؟"

"کھسکو تو۔"

زہرہ تخت پر دوسری طرف لیٹی اور آذر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ "میں تمہارا سر دباتا ہوں آپا۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ زہرہ کا سر دبانے لگا۔ زہرہ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ شاید اس میں سکت بھی نہیں تھی۔ آذر بھی بہت خلوص سے اس کا سر دباتا رہا۔ اس وقت وہ اس کے لئے بس محبت کرنے والی آپا تھی۔ اسے بس یہ خیال تھا کہ اس کی آپا تکلیف میں ہے۔ وہ آپا جس نے ہمیشہ اس کے آرام کا خیال رکھا تھا۔

زہرہ وقفے وقفے سے کراہ بھی رہی تھی۔ ایک بار جو وہ کراہی تو آذر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آپا؟"

"پورا جسم دکھ رہا ہے' بہت درد ہے۔" زہرہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

آذر کا ایک ہاتھ پیشانی پر رکا اور دوسرا لحاف کے اندر چلا گیا۔ وہ پورے خلوص سے اس کا درد اپنے ہاتھوں سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زہرہ نے اس بار بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ درحقیقت اسے بہت آرام مل رہا تھا۔

لیکن چند منٹ بعد صورتِ حال بدل گئی۔ آذر کے ہاتھوں کو نہ محبت کرنے والی آپا یاد رہی نہ اس کی تکلیف لیکن یہ سلسلہ چلنے والا نہیں تھا۔ زہرہ کا ردِعمل نہایت سخت تھا۔ اس نے لحاف اٹھایا اور آذر کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ لگتا تھا' اسے سردی' بخار اور درد کا احساس نہیں رہا ہے۔

آذر شرمندہ تھا۔ زہرہ سے بھی اور خود سے بھی۔ وہ نظریں نیچے کیے بیٹھا رہا۔

"ہٹ جاؤ میرے پاس سے۔" زہرہ نے تند لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیل دیا۔ "تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔" زہرہ دہاڑی۔ "میں تمہیں چھوٹا سمجھ کر طرح دے جاتی ہوں لیکن آج تم حد سے گزر گئے۔"

آذر اس کے دھکیلنے سے تخت سے گر گیا تھا۔ کچھ تکلیف کا

کتا کہانیاں

"تمہارا کتا ذہین ہے؟"

"بہت۔ جب میں اس سے کہتا ہوں' بھئی تمہارا دل چاہے تو میرے پاس آجاؤ۔ دل نہ چاہے تو مت آؤ' تو وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے تو آجاتا ہے۔ دل نہیں چاہتا تو نہیں آتا۔"

○☆○

"کل میں نے اپنے کتے کو ڈکشنری چباتے ہوئے پکڑ لیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"بس۔۔۔ یوں سمجھو میں نے الفاظ اس کے منہ سے چھین لئے۔"

○☆○

"عرفان میاں برسوں تک اپنے کتے کے ساتھ اسکول جاتے رہے لیکن ایک وقت آیا کہ آخر انہیں جدا ہونا پڑا۔"

"کیوں؟"

"کتے نے میٹرک کر لیا تھا۔"

اور کچھ توہین کا احساس۔ اس پر مستزاد شرمندگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے بسی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زہرہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر تڑپ گئی۔ "چھوٹے بھائی۔ کیوں خود کو اور مجھے تکلیف پہنچاتے ہو۔ کیا شیطان گھس گیا ہے تم میں؟" اس کی آواز دھیمی اور لہجہ نرم ہو گیا۔

یہ دیکھ کر آذر کو حوصلہ ہوا۔ "زہرہ۔" اس نے کہنا چاہا۔ زہرہ کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس نے خاصے فاصلے پر آپا کا اضافہ کیا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"بس خاموش ہو جاؤ۔" زہرہ کی آواز تو دھیمی رہی لیکن لہجہ سخت ہو گیا۔ "تم نے مجھے میری نظروں میں ہی گرا دیا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں غلط ڈھیل دی۔ صرف اسی لئے کہ تم سے محبت ہے مجھے' لیکن تم تو محبت جانتے ہی نہیں۔ میرا کوئی سگا چھوٹا بھائی ہوتا تو میں اس سے بھی اتنی محبت نہیں کر سکتی تھی اسی لئے میں تم سے لاڈ کرتی رہی اور اس میں تمہیں تباہ کر دیا۔"

"زہرہ۔۔۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے گھگیائے

ہوئے لہجے میں کہا۔

"آج کے بعد تم نے مجھے تم کہا یا بچوں کی طرح بے تکلفی سے میرا نام لیا تو میں عمو جان سے شکایت کردوں گی۔" زہرہ نے تنبیہہ کی۔

یہ دھمکی سن کر آذر کے ہوش اڑ گئے۔

"اور رہی محبت تو تم کیا جانو کیا سمجھو کہ محبت کیا ہے۔" زہرہ اپنی کہے جارہی تھی۔ "تم تو بس وقت سے پہلے بڑے ہو گئے ہو اور تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو مجھے؟ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا اور وہ مجھے یوں چھوتا تو خدا کی قسم، ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتی اس کا۔ خون پی جاتی۔ تم مجھے ذلیل کرتے ہو میری اپنی نظریں۔"

"لیکن آپا، میں آپ سے محبت کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ سے اچھا کبھی کوئی نہیں لگے گا۔ میں آپ سے۔"

زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی لیکن اب اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔ "آخر ہو تو چھوٹے ہی۔ وہی راگ الاپے جارہے ہو۔ دیکھو۔ میں کوئی بھی ہوں، سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے عمر میں بہت بڑی ہوں۔"

اس موقع پر آذر کو کوئی دور کی سی آواز سنائی دی۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ شاید اس کے کمرے کے سامنے لیکن اس نے اس پکار پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گفتگو اس نہج پر تھی کہ وہ زہرہ کے لئے ہمہ تن سماعت بن گیا تھا۔ وہ کچھ اور سن ہی نہیں سکتا تھا۔

زہرہ کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم پیدا ہوئے تو میں ہوش مند لڑکی تھی۔ تم میرے لئے وہ نومولود بھائی تھے، جو مجھے کبھی نہیں مل سکا تھا۔ میں نے تمہیں گودوں میں کھلایا ہے۔ تمہارا گو مُوت کیا ہے میں نے۔ اس لئے تم میری نظریں چھوٹے ہو اور ہمیشہ چھوٹے ہی رہو گے۔ اب تو بہ کرو میرے سامنے۔"

آذر کو وہ پکار اب بھی سنائی دے رہی تھی لیکن اب آواز دھیمی تھی۔ اس نے ذرا دھیان دیا تو اسے احساس ہوا کہ پکارنے والا اب اس کے کمرے میں ہے پھر وہ آواز بھی پہچان گیا۔ وہ ابا جان تھے۔ اس پر خوف طاری ہو گیا۔

وہ لپک کر کمرے سے نکلا۔ اسی لمحے ابا جان اس کے کمرے سے نکلے۔ وہ اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"جی ابا جان۔"

لیکن ابا جان چہرے پر چٹان کی سی سختی لیے اس کی طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔ وہ چند لمحے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور الجھتا رہا۔ ابا جان ناراض کیوں لگ رہے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ شاید وہ دیر سے اسے پکار رہے تھے۔ اس نے ان کی پکار یاد کی تو خیال آیا کہ اس وقت ان کی آواز اور لہجے میں غصہ نہیں تھا تو پھر اب کیا ہو گیا؟ اس کا دل خوف اور اندیشوں سے بھر گیا۔ اسے معلوم کچھ بھی نہیں تھا لیکن یہ یقین تھا کہ کوئی بہت بری بات ہوئی ہے۔

اس پریشانی میں اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ زہرہ کے کمرے کے بجائے اپنے کمرے میں آگیا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا ویسا ہی تھا، جیسا وہ چھوڑ کر نکلا تھا۔ اب وہ زہرہ کے اور اس کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

یہ کہتے ہوئے زہرہ کے لہجے میں قطعیت تھی کہ وہ ہمیشہ اسے چھوٹا سمجھے گی۔ وہ جھنجلانے لگا۔ چھوٹا تو وہ اب بھی نہیں ہے۔ چھوٹے بچے ایسی تصویریں نہیں بناتے جیسی وہ بنا رہا ہے۔

تصویر کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور تصور میں ابا جان کا ناراض چہرہ لہرا گیا۔ ساتھ ہی اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اس کتاب کو اٹھایا، جس میں وہ زہرہ کی تصویر رکھ گیا تھا۔

تصویر کتاب کے نیچے میز پر رکھی تھی!

اس نے سکون کی سانس لی مگر وہ لمحہ بھر کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ تصویر اس نے میز پر، کتاب کے نیچے نہیں، کتاب میں رکھی تھی اور اب تصویر کتاب میں نہیں۔ کتاب کے نیچے ملی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ تصویر ابا جان نے دیکھ لی ہے!

یہ خیال ہی اس کے لئے لرزا دینے والا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ محض خیال نہیں، حقیقت ہے۔ ابا جان جس غصے میں گئے تھے، وہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے تصویر دیکھ لی ہے ورنہ پہلے تو وہ اسے نرمی سے پکار رہے تھے۔

اب وہ ابا جان سے کیسے نظریں ملائے گا۔ وہ تو ان کا سامنا بھی نہیں کر سکے گا۔ وہ سوچتا رہا اور ہوتا رہا۔ عشق کا بھوت اس کے سر سے ایسا اترا کہ اسے زہرہ کا خیال بھی کئی دن تک نہیں آیا۔

ایک ہفتہ ایسا گزرا، جیسے سزائے موت پانے والا مجرم اپنے وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اس ایک ہفتے میں ابا جان کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ بات تو وہ ویسے بھی کم ہی کرتے تھے لیکن اس دوران جب بھی سامنا ہوا، ابا جان نے منہ پھیر لیا۔ ان سے بات کرنے کی اسے ہمت بھی نہیں ہوئی۔

دسویں دن امی نے اسے بلایا۔ ان کے چہرے پر بڑی گمبھیرتا تھی۔ "بیٹے۔ میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ ولایت جانے کی تیاری کرلو۔"

آذر کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے سنبھلنے میں چند منٹ لگے۔ "یہ اچانک۔"

"اچانک نہیں۔ تمہارے ابا جان مہینوں۔ اور بعض اوقات برسوں سوچتے ہیں۔ ہاں اعلان اچانک کرتے ہیں۔"

آذر نے احتجاج سے پہلے اپنا حوصلہ مجتمع کیا "لیکن امی، میں یہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں انگلینڈ نہیں جانا چاہتا" بالآخر اس نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ تم چاہو یا نہ چاہو، تمہیں کرنا یہی ہے۔" امی نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو زیادتی ہے امی۔"

"غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہارے ابا جان نے تمہاری بہتری کی خاطر فیصلہ کیا ہو گا۔ تم تو ابھی اپنا برا بھلا نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں اتنا نا سمجھ نہیں ہوں جتنا آپ اور ابا جان سمجھتے ہیں۔"

"بہرحال بیٹے' یہ تمہارے ابا جان کا حکم ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ ٹل نہیں سکتا۔"

آذر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ ابا نے اسے سزا دی ہے لیکن یہ سزا کتنی سخت ہے' یہ ابا جان بھی نہیں جانتے تھے۔ اپنے گھر سے دور جانا اور دور رہنا۔ اور خاص طور سے زہرہ سے دور رہنا بہت بڑی سزا تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ رہ سکے گا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر امی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ "تمہارے ابا جان کے اس فیصلے سے مجھے جو تکلیف پہنچی ہے' وہ تمہاری تکلیف سے بہت بڑی ہے بیٹے!" انہوں نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "لیکن تمہارے ابا جان کی خوشنودی اور تمہاری بہتری کے خیال سے میں نے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔"

آذر سے کچھ نہیں کہا گیا۔ باپ کے سامنے دم مارنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بے بسی اور دکھ کے احساس سے شل ہو کر وہ رو پڑا۔ امی کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ دونوں دیر تک روتے رہے۔

اس رات وہ زہرہ کے پاس بھی گیا۔ "آپا۔ ابا جان مجھے انگلینڈ بھیج رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں چھوٹے مرد' میں جانتی ہوں۔" زہرہ کے لہجے میں اداسی تھی۔

"میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے آپا۔"

زہرہ اس کی تبدیلی پر مسکرائی۔ وہ اس کا نام نہیں لے رہا تھا' آپا کہہ رہا تھا۔ "یہ زیادتی نہیں ہے آذی۔ بہتری کے لئے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ کچھ کھو کر ہی کچھ بن سکتا ہے آذی۔ یہ کوئی سزا نہیں' انعام ہے عمو جان کی طرف سے۔"

آذر نظریں چرانے لگا۔ وہ کیسے بتاتا کہ یہ واقعی سزا ہے۔ یہ کہتا تو اسے جرم بھی بتانا پڑتا' جو اسے گوارا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں نے آپ کو بہت ستایا ہے آپا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

زہرہ اور بھی خوش ہو گئی۔ وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ننھے منے۔ چھوٹے کیا' غلطیاں تو بڑے بھی کر دیتے ہیں۔ بس غلطی کا احساس ہو جائے اور اس کی اصلاح کر لی جائے یہی بہت ہے۔"

آذر نے ایک جھٹکے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ "انگلینڈ جانے میں فائدہ بھی ہے آپا۔ میرا کام آسان ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"کون سا کام؟" زہرہ نے پوچھا۔

"مجھے مر جانا ہے۔ وہاں میں آسانی سے مر جاؤں گا۔"

زہرہ نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "چھی' چھی' کیسی گندی باتیں کرتے ہو۔ جینا شروع کیا نہیں اور مرنے کی باتیں کرنے لگے۔"

"آپ نہیں سمجھیں گی آپا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ مجھے ڈانٹتی ہیں۔ میں تو یوں بھی آپ کے بغیر مر جاؤں گا۔ اتنی دور جا کر یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔ دیکھ لیجئے گا آپا' میں مر جاؤں گا آپ کے بغیر۔"

زہرہ نے چاہتے ہوئے بھی اس کی سرزنش نہیں کی۔ اتنی دور جانے والوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔ الٹا اس نے اپنے زانو پر اس کا سر رکھ لیا اور اسے تھپکنے لگی۔

○☆○

آذر نے جام سے ایک اور گھونٹ لیا اور تلخی سے مسکرایا۔ اس مرنے والی بات کو ۷۶ سال ہو چکے تھے۔ زہرہ جوانی میں ہی مر گئی تھی۔ اب تو اس کی ہڈیاں بھی خاک ہو گئی ہوں گی اور وہ اس کے بغیر بھی اب تک زندہ تھا۔ اس نے طویل عمر پائی تھی۔ اور وہ بھی صحت اور تندرستی کے ساتھ۔

بارہ سال کی عمر میں آدمی ایسا ہی رومینٹک ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ بات بات پر مرنے کی تیاری کرتا ہے۔ زہرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کچی عمر کے لڑکے جینا شروع کیے بغیر مرنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

اس نے جام میز پر رکھا اور دوبارہ ماضی کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آصفہ شاکر ہومیو کلینک

جمعرات تعطیل

ڈاکٹر آصفہ شاکر
B.A.D.H.M.S (R.H.M.P)

ڈاکٹر نرگس مغل
B.A.I.G.D
D.H.M.S. (R.H.M.P)

9/1 سفاری ویو اپارٹمنٹ بلاک 7
گلشن اقبال۔ کراچی
نزد مین گیٹ سفاری پارک۔

اوقات کار: شام ۵ بجے تا رات ۹ بجے
صبح ۱۰ بجے تا دوپہر ۱ بجے (صرف ہفتہ)

Contact Telephone No: 4966698

○☆○

خان بہادر جمیل الرحمان کے لئے اپنے بیٹے کو انگلینڈ بھجوانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انگریزوں سے ان کے مراسم بہت گہرے تھے۔ کیوں نہ ہوتے۔ ان کے اور انگریزوں کے درمیان رشتہ ہی ایسا تھا۔ وفاداری کا رشتہ! ۱۸۵۷ء میں ان کے والد نے اور اس کے بعد جمیل الرحمان نے اپنے انگریز رہنماؤں کے لئے گراں قدر اور بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔ اس کے صلے میں نہ صرف انہیں بڑی بڑی جاگیریں ملیں بلکہ وائسرائے اور دیگر بارسوخ انگریزوں سے ان کے ذاتی تعلقات بھی قائم ہوئے۔ سو بیٹے کو انگلینڈ بھجوانا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ بہرحال جنگ میں زندگی کہاں رکتی ہے۔ آذر جمیل کا جانا بھی نہ رک سکا۔ بالآخر وہ انگلینڈ چلا گیا۔

شروع شروع میں آذر کو بہت پریشانی ہوئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ وہ انڈیا کے بہترین اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا لیکن یہاں تو ماحول ہی مختلف تھا۔ آکسفورڈ کے لہجے کی شستگی سے تو بیشتر انگریز بھی محروم رہتے ہیں۔ وہ تو پھر کالا ہندوستانی تھا۔ دوسری وجہ اس کی اداسی اور دل گرفتگی تھی۔ گھر چھوڑ کر اتنی دور پردیس آنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آدمی بارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی محبت سے بہ جبر دور کر دیا گیا ہو۔ وہ انگلینڈ پہنچا تو بہت دل شکستہ تھا۔

پھر اسے یہ احساس دلایا گیا کہ یہاں وہ خان بہادر کا بیٹا نہیں' محض ایک غلام زادہ ہے۔ اس کے باپ اور دادا نے اپنے... ہم وطنوں کے لہو کا سودا کر کے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ایک خطاب اور بے شمار مراعات اور انعامات ضرور حاصل کر لئے ہیں لیکن وہ اوّل و آخر غلام ہیں۔ طبقۂ امرا میں شامل ہونا تو دور کی بات ہے' وہ عام انگریزوں کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔

سو آذر جمیل گھٹ کر رہ گیا۔ اسکول جانے کے بعد اس کے دو ہی کام رہ گئے... گھر خط لکھنا اور تصویریں بنانا۔ گھر خط لکھنے کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ زیادہ تر خط وہ زہرہ کو لکھتا تھا۔ اور لکھ کر خود ہی پڑھتا تھا اور پھاڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی امی کو خط لکھ دیتا تو اسے پوسٹ بھی کر دیتا۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ ابا جان کو خط لکھے اور ان سے معافی مانگے مگر اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر ایک سرکشی سر ابھارتی۔ ابا جان کے لئے اس کے ذہن میں ایک لفظ گونجنے لگتا تھا۔ غدار۔ غدار۔ اس کے اندر باپ کی محبت مزاحمت کی شکل میں ابھرتی لیکن غدار کی پکار کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی۔ وہ کبھی ابا جان کو خط نہ لکھ سکا۔ ابا جان نے بھی کبھی اسے خط نہیں لکھا۔ شاید وہ اسے معاف نہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا زور مصوری پر پڑ گیا۔ اس نے تو آخری پناہ کے طور پر مصوری کا سہارا لیا تھا لیکن مصوری نے اس پر انگلینڈ کی سوشل لائف کے دروازے کھول دیے۔

یورپ وہ خطۂ زمین ہے' جہاں کی ثقافت مصوری کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں اسے مصوری کے حوالے سے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا لیکن انگلینڈ میں یہ حوالہ بہت معتبر ٹھہرا۔ اس کے روم میٹ کے ذریعے اس کی مصوری کی شہرت رات کی رانی کی خوشبو کی طرح پھیلنے لگی۔

سب سے پہلے اسکول کے ایک ٹیچر نے اس سے مصوری کے بارے میں استفسار کیا پھر پرنسپل نے اسے بلا کر پوچھا۔ پرنسپل نے اس کا کام بھی دیکھا اور بہت متاثر ہوا۔ پہلی بار کسی نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور ہر ممکن مدد اور رہنمائی کی پیش کش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسکول میں کالے غلام زادے کے بجائے ایک اہم آرٹسٹ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

کچھ عرصے کے بعد اسے پارٹیوں میں مدعو کیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا لیول بڑھا اور وہ طبقۂ امرا تک جا پہنچا پھر اسے آرتھر کنگسلے نے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ آرتھر کوئی بڑا مصور نہیں تھا لیکن جہاں تک مصوری کی تاریخ اور فنِ مصوری کی باریکیوں کا تعلق ہے تو وہ بلاشبہ بہت بڑا عالم تھا۔ وہ ہر بڑے مصور کے اسٹائل سے واقف تھا اور ان کے عیوب و محاسن سے بھی باخبر تھا۔ دوسری طرف آذر میں مصوری کی فطری صلاحیت تھی۔ آرتھر سے اسے بہت کچھ حاصل ہوا بلکہ سچ یہ ہے کہ آج وہ جو کچھ بھی تھا' اس میں آرتھر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

آذر کی ذہنی نشوونما کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ وہ بہت صحت مند اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور لڑکا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ ایک خوب رو نوجوان تھا۔ اسے جنسِ مخالف کی توجہ کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی بلکہ اسے توجہ کی زیادتی کی شکایت تھی۔ ہندوستان کے گھٹے گھٹے ماحول کے مقابلے میں اسے انگلینڈ میں بہت زیادہ آزادی نظر آئی۔ حالانکہ انگریز بے حد قدامت پرست تھے لیکن آذر کی سمجھ میں یہ قدامت پرستی نہیں آتی تھی۔ بہرکیف جب وہ چھٹیاں گزارنے پیرس اور روم گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ انگریز آزادی کے معاملے میں یورپ سے کتنا پیچھے ہیں۔

وطن میں جو کچھ ہوا تھا' اس کے حوالے سے اپنے بارے میں آذر کا ایک امیج بن گیا تھا اور وہ امیج بہت خراب تھا۔ اپنی نظر میں وہ نفسانی و حیوانی خواہشات کا اسیر ایک بگڑا ہوا بچہ تھا لیکن اس بچے نے انگلینڈ اور یورپ میں اسے حیران کر دیا۔ وہیں اس کا خود سے پہلا تعارف ہوا۔ جہاں جلوے خود نگاہوں پر مہربان ہوتے ہوں' وہاں نگاہوں کی بے نیازی معمولی بات نہیں ہوتی۔ یہاں حسن دامن گیر تھا اور وہ دامن بچا کر گزرتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کا خود پر اعتماد بحال ہو گیا۔ وہ حسن پرست ضرور تھا' بوالہوس

نہیں تھا۔ اس کے تصور پر زہرہ کی حکمرانی تھی۔ زہرہ کی محبت دل میں نہیں تھی بلکہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زہرہ جیسا حسین دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اعضا کا وہ تناسب جو زہرہ میں تھا' جسے اس نے تصویر میں اور بہتر بنانے کی کوشش کی تھی' دنیا میں کسی کے پاس نہیں تھا مگر یہ صرف اسی کی نظریں دیکھ سکتی تھیں۔

زہرہ کی وہ NUDE تصویر' جو فساد کا باعث بنی تھی' اس کی رفیق تھی۔ وہ اپنے سامان میں اس تصویر کو رکھنا نہیں بھولا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اس تصویر کو دیکھتا اور تصور میں گھر پہنچ جاتا۔ گھر' جس کا تصور اب اسے خواب سا لگتا تھا۔ حقیقت سے کوسوں دور۔

انگلینڈ میں اسے سات سال ہو گئے۔ نفسانی خواہشیں اور جسمانی تقاضے تو اس کے وجود میں بہت پہلے سر اٹھا چکے تھے۔ اب ماحول بھی ساز گار تھا اور آوارگی کے مواقع بھی حاصل تھے مگر حیرت انگیز طور پر اس نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔ وہ بس زہرہ کے تصور سے حظ اٹھاتا رہا۔ لندن میں عورتوں کے حلقوں میں اسے برف کا انسان اور لاوے کا مصور کہا جاتا تھا۔ اس کے فن میں جذبوں کی حدت اور جذبات کی تپش تھی۔

اکیس سال کی عمر میں اس نے تعلیم مکمل کرلی۔ پرنسپل کا کہنا تھا کہ اسے پیرس کی آرٹ اکیڈمی میں بھی تعلیم حاصل کرنی چاہئے لیکن اس نے ابا جان کو اس سلسلے میں خط لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ پرنسپل نے خان بہادر صاحب کو خط لکھا اور اجازت لے لی۔ پیرس کی آرٹ اکیڈمی سے دو سال بعد اسے سند مل گئی۔ اب اسے وطن واپس جانا تھا۔

وطن واپس جاتے ہوئے اس کا وجود ابا جان کے لئے محبت اور شکر گزاری سے لبریز تھا۔ ابا جان نے اسے انگلینڈ یوں بھیجا تھا' جیسے کالے پانی کی سزا دی ہو لیکن درحقیقت وہ اس کے لئے بہت بڑا انعام ثابت ہوا تھا۔ اس نے خود کو اور اپنی صلاحیتوں کو پہچانا تھا۔ اب وہ اپنے بارے میں زیادہ جانتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بڑا مصور بننے کے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ یورپ کے تجربات نے بھی اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔

○☆○

آذر نے چونک کر دیکھا۔ اسٹوڈیو میں جانے کب سے اندھیرا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر مختلف سوئچ دبائے اور اسٹوڈیو جگمگا اٹھا۔ وہ اپنی جگہ آکر بیٹھا اور جام اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور دوبارہ یادوں میں کھو گیا۔

○☆○

ائرپورٹ پر اسے ریسیو کرنے کے لئے صرف اختر بھائی آئے تھے اور آتا بھی کون۔ ابا جان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اختر بھائی سے لپٹ گیا۔ اختر بھائی سے کبھی اس کی قربت نہیں رہی تھی مگر گیارہ سال کی جدائی نے ان کی دبی ہوئی محبت کو ابھار دیا تھا۔

وہ گلے مل کر پیچھے ہٹا تو اختر بھائی رو رہے تھے۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم آگئے۔" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ حیرت سے بھائی کو دیکھتا رہا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں' یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

گھر جاتے ہوئے راستے میں وہ بار بار اختر بھائی کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے چار سال بڑے تھے۔ اس حساب سے وہ صرف ۲۷ سال کے ہوئے لیکن وہ اتنے بڑے لگ رہے تھے' جیسے ایک دم ادھیڑ عمر ہو گئے ہوں۔ شاید اس لئے کہ اتنے برسوں میں اس نے ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

گھر پہنچ کر اسے اور بڑا شاک لگا۔ امی تو بالکل ہی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ جھریوں سے بھر گیا تھا۔ ان کی نظر بھی کمزور ہو گئی تھی۔ تبھی تو وہ اس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں پھر انہوں نے اسے سینے سے بھینچا اور بلک بلک کر رونے لگیں۔

آذر کو پہلی بار انگلینڈ میں گزارے برسوں کا ملال ہوا۔ اس عرصے میں گھر کے لوگ کتنے بدل گئے تھے۔ جس وقت نے اسے سنوارا تھا' اس نے اس کے گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ بہت سختی برتی تھی۔ جیسے وہ انہیں روند کر گزرا ہو۔

امی دیر تک روتی رہیں۔ وہ بھی روتا رہا۔ انہیں سنبھلنے میں خاصی دیر لگی۔ بالآخر امی نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "اپنے کمرے میں جاؤ اور نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"

نوکر نے اس کا سامان کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر اپنے لئے کپڑے نکالے۔ غسل خانے جانے کے ارادے سے وہ کمرے سے نکلا تو دل مچل گیا۔ اب تک اس نے کسی سے زہرہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا مگر اب اس کے کمرے کو دیکھ کر ضبط جواب دے گیا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی' دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔

وہ اس کے لئے ایک اور بڑا شاک تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا' وہ مکمل طور پر اس کی توقع کے برعکس تھا۔ زہرہ کمرے میں نہیں تھی۔ اس میں تو ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بشرطیکہ اسے یہ خیال آتا کہ زہرہ شاید امی کے پاس ہے یا باورچی خانے میں کام کر رہی ہے۔ ابھی آجائے گی لیکن گیارہ برس کے بعد اس کمرے میں بے تحاشہ داخل ہونے والے کے دل میں ایک ثانیے کو بھی یہ خیال نہیں آیا۔ اس کا تو دل دھک سے رہ گیا۔

کمرا ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن ہر چیز پر گرد کی اتنی دبیز تہ تھی کہ کسی چیز کی اصل صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے بُن دیے

تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مہینوں۔۔۔ بلکہ برسوں سے کسی نے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا ہے۔

اس کا دل خوف اور اندیشوں سے بھر گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی آسیب زدہ مقام پر کھڑا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

اچانک باہر کسی نے اسے پکارا۔ پھر آواز سے ایسا لگا' جیسے پکارنے والا اس کے کمرے میں چلا گیا ہے۔ ایک دم سے وہ بارہ سال کا لڑکا ہو گیا۔ ابا جان نے بھی تو اس دن اسے ایسے ہی پکارا تھا۔ اس نے سننے میں دیر کر دی تھی اور اس کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلا تھا۔ آج پھر ابا جان اسے پکار رہے ہیں۔ اس مرتبہ دیر نہیں ہونی چاہئے۔

وہ لپک کر کمرے سے نکلا۔ اسی لمحے اس کے کمرے سے ابا جان نکلے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس بار بھی ابا جان اس سے منہ پھیر کر کچھ کہے بغیر نکل جائیں گے اور پھر ایک لمبی سزا اس کا مقدر ہو گی لیکن نہیں۔ اس بار وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ گیارہ برس ہو گئے۔ اس نے ابا جان کو دیکھا بھی نہیں۔ ان کی آواز بھی نہیں سنی۔ یہ تو ظلم ہے لیکن ابا جان اس کی طرف بڑھے۔ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "کیا بات ہے؟ میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

وہ آواز بھی اس کے لئے شاک کا باعث بنی۔ یہ آواز۔۔۔ یہ ابا جان تو نہیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند صاف ہونے لگی۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ وہ تو اختر بھائی تھے۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس بار اختر بھائی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"یہ سب کیا ہے بھیا؟" آذر نے زہرہ کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زہرہ آپا کہاں ہیں؟"

اختر بھائی کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ "تمہیں معلوم تو ہے۔ آپا اپنے گھر میں ہیں۔ شادی کے بعد لڑکیاں اپنے گھر میں ہی رہتی ہیں۔"

آذر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "کب ہوئی ان کی شادی؟"

"تم تو ایسے بات کر رہے ہو' جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں۔ ان کی شادی کو تو دس سال ہو گئے۔ تمہیں انگلینڈ گئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی۔"

"مجھے واقعی نہیں معلوم بھیا۔" اس نے جیسے فریاد کی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابا جان نے تمہیں خط لکھا تھا۔"

"ابا جان نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔"

"حیرت ہے۔ ابا جان کا حکم تھا کہ گھر میں کوئی اور تمہیں خط نہیں لکھے گا۔ وہی تمہیں خط لکھتے رہیں گے۔ کیا واقعی تمہیں آپا کی شادی کا پتا نہیں؟"

"صرف یہی نہیں۔ مجھے کبھی کسی نے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ ابا جان نے بھی نہیں۔"

اختر بھائی کی آنکھوں سے الجھن جھلکنے لگی۔ "حیرت ہے۔ ابا جان نے ایسا کیوں کیا؟ خیر اب ان سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا۔"

یہ سچ تھا۔ ابا جان سے کون پوچھتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات آذر بھی جانتا تھا لیکن اس لمحے اس کے سینے میں جوالا مکھی سا دہک اٹھا۔ ابا جان کی محبت اور شکر گزاری جو وہ انگلینڈ سے لے کر آیا تھا' جل کر بھسم ہو گئی۔ ابا جان کو دیکھنے اور ان سے لپٹنے کی تڑپ سرد پڑ گئی۔ سب اچھے جذبوں کی جگہ غصے اور نفرت نے لے لی۔ اس وقت وہ اس کے سامنے ہوتے تو وہ یقیناً ان سے بدتمیزی کر بیٹھتا۔ اب وہ ان کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"جاؤ۔ تم جا کر نہا لو۔" اختر بھائی نے کہا۔

"بھیا پلیز' اس کمرے کی صفائی کرا دیں۔ میں اسے پہلے جیسا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اختر بھائی مسکرائے۔ "یہ کام ابھی ہو جائے گا۔ تم جاؤ۔"

وہ غسل خانے میں چلا گیا لیکن ٹھنڈا پانی بھی اس کے غصے اور نفرت کی آگ کو سرد نہ کر سکا۔

نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ باہر نکلا تو ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ وہاں جاگیر کا بڑا کارندہ نعمت علی بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کیسے ہیں چھوٹے سرکار؟" اس کے لہجے میں احترام تھا۔

"ٹھیک ہوں نعمت علی۔" اس نے کہا۔ "تم سناؤ' کیسے ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے چھوٹے سرکار۔ آپ کے سائے میں عزت سے جی رہے ہیں۔"

"کیسے آئے ہو؟"

"بڑے سرکار سے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں۔"

نعمت علی الجھا ہوا نظر آنے لگا۔ "انہوں نے مجھے بلوایا ہے چھوٹے سرکار۔ ابھی دو منٹ پہلے مجھے ان کا پیغام ملا تو میں دوڑا آیا ہوں۔"

'تو کیا ابا جان گھر میں موجود ہیں؟ اور مجھ سے نہیں ملے! خیر' میں بھی کب ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اختر بھائی ڈیوڑھی میں آئے۔ نعمت علی نے لپک کر ان کی دست بوسی کی۔ "کیا حکم ہے بڑے سرکار؟" اس نے عاجزی سے پوچھا۔

آذر نے چونک کر اختر بھائی کو دیکھا۔ اس لمحے وہ بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر' ان کے انداز میں عجیب سا جاہ و جلال اور حکمت تھی پھر وہ بولے تو ان کا لہجہ بھی ابا جان کا سا تھا۔

"نعمت علی' تمہیں فوری طور پر جہانگیر پور جانا ہے۔ فصلوں کا

حساب کر کے لے آؤ۔"

"جو حکم سرکار کا۔" نعمت علی نے کہا اور فوراً ہی چلا گیا۔

آذر کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہیں آیا مگر اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ وہ حیران تھا کہ گھر واپسی پر یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیسی ذہنی الجھاؤ ہے جو اس کے اعصاب توڑے ڈال رہی ہے۔

"یہ سب کیا ہے بھیا؟"

"کیا۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔" اختر بھائی بولے۔

پہلے تو آذر خود بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ کس بات پر ہراساں ہے مگر ٹوٹتی زبان میں لفظ اس کی زبان سے نکلے تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کا پورا جسم کسی کمزور سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ "بھیا آپ۔۔۔ اور بڑے سرکار۔"

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اختر بھائی کا چہرہ تپنے لگا۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ ایک دم سے وہ ادھیڑ عمر اور بڑھاپا نظر آنے لگے۔ انہوں نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

اندیشے آذر کے شعور میں حقیقت کا روپ دھارتے جا رہے تھے۔ اس نے اختر بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں مجھے؟"

"کہہ تو رہا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔" اختر بھائی کی آواز رندھ گئی تھی۔ "آؤ۔ امی کے پاس چلیں۔"

اختر بھائی اس کا ہاتھ تھام کر امی کے کمرے میں لے گئے۔ امی نماز پڑھنے کے بعد جاء نماز سمیٹ رہی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ نماز پڑھنے کے دوران روتی رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

"امی۔۔۔ اب آپ ہی بتا دیں اسے۔" اختر بھائی نے ٹوٹتی ۔۔۔ آواز میں کہا۔

امی نے سر اٹھا کر پہلے اختر اور پھر آذر کے چہروں کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک طرح کی استقامت ابھری۔ انہوں نے بڑی نرمی سے آذر کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے تخت کی طرف لے چلیں۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے اس سے کہا۔ "اوپر آ کر لیٹ جاؤ۔ میری گود میں سر رکھ کر۔"

اس وقت آذر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نہ اسے کچھ سمجھائی دے رہا تھا۔ وہ گم صم سا تخت پر بیٹھ گیا۔ "امی۔۔۔ کیا بات ہے۔ مجھے بتائیں تو۔ ابا جان کی موجودگی میں بھیا بڑے سرکار کیسے بن گئے؟"

امی نے زبردستی اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی بیٹے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولیں۔

آذر ان لفظوں کے مفہوم سے آشنا تھا مگر اس کے اندر انہیں قبول کرنے کے لئے آمادگی نہیں تھی۔ "امی۔۔۔ مطلب کیا ہے آپ کا؟"

آذر کے چہرے پر گرم گرم آنسو گرے تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"تمہارے ابا جان اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" امی نے بڑی مشکل سے کہا۔

آذر نے بڑی بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ اس نے اختر بھائی کو دیکھا۔ وہ بھی خاموشی سے رو رہے تھے۔ آذر جان گیا تھا کہ یہ سچ ہے مگر پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ایک دم سے وہ بہت بڑا ہو گیا تھا۔ شاید اختر بھائی کی طرح!

"سوا سال ہو گیا۔" امی نے دھیمی آواز میں کہا۔

آذر کے اندر جیسے دھماکا ہوا۔ وہ پھٹ پڑا۔ "اور کسی نے مجھے اطلاع بھی نہیں کی۔ جیسے میں اس گھر کا فرد ہی نہیں ہوں۔" اب وہ شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ "اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ پہلے پتا چل گیا ہوتا تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

وہ اٹھنے لگا لیکن امی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چھڑانا چاہا لیکن امی کی گرفت بہت سخت تھی۔ "کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ یہاں نہیں رہوں گا۔"

"بیٹھ جاؤ ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا تم پر۔" امی بپھر گئیں۔

"مجھے تو جیتے جی مار دیا آپ لوگوں نے۔" وہ بھی بپھرا ہوا تھا۔

جواب میں امی کا تھپڑ اس کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ چٹاخ کی آواز بہت خوفناک تھی۔ اختر بھائی نے امی کا ہاتھ تھام لیا۔

"امی۔ یہ تو خیال کریں کہ اس کے لئے یہ صدمہ کتنا بڑا ہے۔ خدا کے لئے امی۔"

تکلیف سے آذر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ امی نے کھینچا تو وہ دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تمہارے ابا جان کی زندگی میں اس گھر میں کبھی ان کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے یہ روایت ان کے مرنے کے بعد بھی نبھائی ہے۔ انہوں نے تمہیں خط لکھنے کو منع کیا تھا۔ ہم تمہیں خط نہیں لکھ سکتے تھے۔"

"لیکن امی' یہ اور بات تھی۔ اتنی بڑی بات۔۔۔"

"میرے بھائی' میری جان' ابا جان کا حکم تھا کہ تمہیں ان کی بیماری کی خبر دی جائے نہ موت کی۔" اختر بھائی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "ہم کیا کرتے بلکہ میں تو تمہارے بغیر خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا رہا۔"

آذر جانتا تھا کہ امی اور اختر بھائی دونوں سچ بول رہے ہیں۔ ابا جان یہ حکم دے سکتے تھے۔ اور انہوں نے دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اس حکم کی تعمیل ہونی چاہئے تھی۔ امی تو خیر نصف صدی کی عادت سے مجبور تھیں مگر بھیا۔

اس نے شکایتی نظروں سے اختر بھائی کو دیکھا۔ اختر بھائی نے

اس کی نگاہوں کا مفہوم پا لیا۔ انہوں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بھائی، تم سے تو میں معافی مانگ سکتا ہوں اور مانگ رہا ہوں لیکن ابا جان سے تو مجھے قیامت تک معافی نہیں مل سکتی تھی۔ تم تو مجھے معاف کر دو گے نا۔"

آذر نے ان کے سینے سے لپٹ کر اس کا جواب اثبات میں دے دیا۔

امی اور اختر بھائی دیر تک اسے ابا جان کی بیماری اور موت کے متعلق بتاتے رہے۔ آنکھیں برستی رہیں پھر آذر نے کہا۔ "بھیا۔ مجھے ابا جان کی قبر نہیں دکھائیں گے۔"

"آؤ چلو۔" اختر بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی قبرستان کی طرف چل دیے۔ راستے میں آذر نے کہا۔ "بھیا۔ آپ مجھے قبر دکھا کر واپس آجایئے گا۔"

اختر بھائی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "کیوں بھائی؟ دیکھو آذی۔۔۔"

"بھیا۔ مجھے ابا جان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اختر بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اسے ابا جان کی قبر پر لے گئے اور خود فاتحہ پڑھ کر قبرستان سے نکل آئے۔

اب وہ تھا اور باپ کی قبر۔ وہ متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔ ایک طرف اسے باپ پر غصہ تھا۔ اس سے شکایت تھی۔ دوسری طرف جانے والے کی محبت جوش مار رہی تھی۔ ان متضاد اور متصادم جذبوں کا اظہار اس کے تیزی سے بدلتے لہجے اور آواز کے زیر و بم سے ہوتا۔ کبھی وہ سرگوشی میں بات کرتا اور کبھی ایک دم سے چلّانے لگتا۔ وہ ان سے باتیں کرتا رہا، جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہوں۔ "یا تو آپ اتنے شفیق باپ تھے یا ایک غلطی کی سزا دینے میں اتنے بے رحم ہو گئے۔ مجھے آپ نے گیارہ سال اپنی دید سے، اپنی آواز تک سے محروم رکھا۔" وہ اچانک چلّانے لگا۔ "یہ کہاں کا انصاف ہے۔ آپ نے مجھے گھر سے، گھر کے رشتوں سے محروم کر دیا۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو اس کا اور انتہائی سزا دینے میں غلطی آپ کی تھی۔ آپ مجھے۔ اپنے بیٹے کو جانتے ہی نہیں تھے۔ غلطی تو میری تھی مگر اتنا بڑا گناہ نہیں تھا وہ۔ ہوتا تو میں انگلینڈ میں گیارہ سال گزار کے اتنا پاک صاف واپس نہ آتا۔ آپ نے ظلم کیا مجھ پر۔" وہ اچانک رونے لگا۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ابا جان، اس کے سامنے ہیں۔ قبر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن اسے نظر نہیں آرہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تو قبر سے ہم کلام ہے اور ابا جان اس دنیا میں جا چکے، جہاں جانے کے بعد کوئی کسی سے نہیں ملتا۔ وہ ابا جان سے کبھی بات نہیں کر سکے گا۔

"آپ نے مجھے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" وہ پھر بپھر گیا۔ "آپ میری بات سنتے کیوں نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟" اس ابتر ذہنی کیفیت میں اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ ابا جان تو مر چکے ہیں۔ اس بار اس احساس کی چوٹ براہِ راست دل پر پڑی۔ پہلی بار موت کی مکمل اہمیت اور احساس اس کے شعور تک بغیر روک ٹوک کے پہنچا۔

باپ کی موت کا غم بہت بڑا ہوتا ہے پھر اس باپ کی موت جو بیٹے سے دس سال... ناراض رہا ہو اور اسی ناراضی کو لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ موت تو یوں بھی پچھتاوے لاتی ہے لیکن آذر کا پچھتاوا بہت بڑا تھا۔ اور تلافی بھی کوئی نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سینے پر کوئی بہت بھاری چٹان آپڑی ہے، جو اسے ہلنے بھی نہیں دے گی، لگتا تھا، سینہ پھٹ جائے گا۔ سانس رکنے لگی تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا لیکن اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایسی کیفیت اس پر پہلے کبھی نہیں گزری تھی مگر ایسی صورتِ حال بھی کبھی پیش نہیں آئی تھی۔

پھر قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ قبر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور وہاں ابا جان لیٹے نظر آئے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس نے ابا جان کا سینہ جل تھل کر دیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ آنسوؤں کا ذخیرہ کب ختم ہوا۔ وہ اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اختر بھائی پریشان ہو کر آئے تو اسے قبر پر بے ہوش پایا۔ وہ اسے ملازموں کی مدد سے گھر لے گئے۔ وہاں بظاہر تو اسے تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا لیکن درحقیقت سنبھلنے میں اسے کئی دن لگے۔ وہ آنکھیں کھولتا، بیگانگی سے ہر شخص کو۔ گھر کے در و دیوار کو دیکھتا اور آنکھیں بند کر لیتا، جیسے کچھ بھی نہیں پہچانتا ہو۔ باجی آگئی تھیں اور وہ انہیں بھی نہیں پہچانا تھا۔

ہوش و حواس کی دنیا میں اسے زہرہ ہی واپس لائی۔ یہ اسے بعد میں پتا چلا کہ زہرہ کا سسرال سے آنا آسان نہیں تھا۔ اسے اس بات کی اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔ یہ بات سب جانتے تھے۔ اس لئے خاص طور پر اسے بلوایا نہیں جاتا تھا۔ کوئی تقریب ہوتی تو پورے گھر کو دعوت نامہ بھیج دیا جاتا لیکن زہرہ کم ہی آتی تھی اور ایک دن سے زیادہ وہ کبھی رکی ہی نہیں تھی۔

مگر اس بار زہرہ کو رہنے اور ٹھہرنے کے لئے بلوایا گیا تھا۔

امی آذر کے لئے بہت پریشان تھیں۔ ڈاکٹر بھی اپنی سی کر کے ہار گئے تھے مگر اس کا ذہنی جمود نہیں ٹوٹا تھا۔ اس پریشانی میں اچانک امی کو زہرہ کا خیال آیا۔ انہیں حیرت بھی ہوئی کہ یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے اختر بھائی سے بات کی کہ اس جمود کو توڑ کر اسے ہوش کی سرحد میں صرف زہرہ ہی لا سکتی ہے۔ بچپن میں بھی جب وہ کسی ضد پر مچلتا تو صرف زہرہ ہی کے قابو میں آتا تھا۔

بات اختر بھائی کی سمجھ میں آگئی۔ وہ خود زہرہ کو لینے اس کی

سسرال چلے گئے۔ زہرہ کی سسرال میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ زہرہ کا میکے سے بلاوا آیا تھا اور اسے کچھ دن میکے میں رہنا تھا۔ باقی لوگ ایک طرف' لیکن زہرہ کا شوہر اسے ہرگز بھیجنا نہیں چاہتا تھا لیکن خان بہادر صاحب سے انکار کی جرأت بھی نہیں تھی۔ سو زہرہ میکے چلی آئی۔

"اختر۔ خیریت تو ہے؟" زہرہ نے راستے میں اختر سے پوچھا۔ اختر نے آذر کی آمد اور اس کی کیفیت کے متعلق بتایا۔ زہرہ بھی پریشان ہو گئی۔

گھر پہنچتے ہی امی زہرہ کو آذر کے کمرے میں لے گئیں۔ آذر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ لگتا تھا' سو رہا ہے۔ زہرہ اسے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ درمیان میں گیارہ برس کا فاصلہ تھا۔ اسے جانے کیا کیا یاد آیا۔ آذر کے بچپن سے اس کے انگلینڈ جانے تک مگر یہ جوان مرد جو بستر پر لیٹا تھا' اس کے لئے اجنبی تھا۔ وہ اس کے چہرے میں پرانا چہرہ ڈھونڈ رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ اسے اپنا پرانا والا آذر لگنے لگا۔ شاید اس لئے کہ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ چند ہفتوں سے وہ واقعی ننھا منا بچہ بن گیا تھا اور اپنے شعور کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنے سب لوگوں کو۔ شاید خود کو بھی بھول گیا تھا۔ اسے راہ بھولے ہوئے اس ننھے منے بچے پر پیار آنے لگا۔

"آذی۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو' کون آیا ہے۔" امی نے آذر کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

لیکن آذر نے کئی بار پکارنے پر بھی آنکھ نہیں کھولی۔ "عجیب ہو گیا ہے۔" امی نے زہرہ کو بے بسی سے بتایا۔ "کچھ بولتا نہیں۔ سنتا ہے نہ پہچانتا ہے۔"

"آذی۔ ننھے منے۔ خفا ہو گیا۔" زہرہ نے جھکتے ہوئے اسے پکارا۔

آذر بری طرح چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ امی کو دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی پھر اس کی نگاہیں زہرہ کے چہرے پر ٹکیں۔ ایک لمحے ان نگاہوں میں اجنبیت رہی پھر عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلے۔

زہرہ اور جھکی۔ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی۔ آپا۔ آپا۔ وہ ہولے ہولے پکار رہا تھا۔ لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں ننھے منے' یہ میں ہوں زہرہ۔ تمہاری آپا۔"

وہ بدستور اسی لہجے میں آپا۔ آپا۔ پکارتا رہا۔

زہرہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آذی۔ مجھے نہیں پہچانے؟ میں تمہاری آپا ہوں۔"

آذر کی آنکھوں میں شناسائی جھلکی۔ "آپا۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟ یہ سب کیا ہو گیا؟"

امی خوشی سے رونے لگیں۔ کتنے دن بعد وہ ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ننھے منے؟" زہرہ نے اسے چمکارا۔

"ابا جان چلے گئے آپا اور کسی نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

وہ شکوے کرتا رہا اور زہرہ اسے بچوں کی طرح بہلاتی رہی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔ اگلے چند دنوں میں اس کے قدم بڑھتے رہے۔ وہ زہرہ کا ہاتھ تھامے بڑھ رہا تھا۔ زہرہ بھی اسے پورا پورا وقت دے رہی تھی۔ اسے پوری طرح نارمل ہونے میں ایک ہفتہ لگا۔

"آپا تمہیں پتا ہے' ابا جان مجھ سے ناراض تھے۔" ایک دن اس نے زہرہ سے کہا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟"

"دیکھو نا' انہوں نے کبھی مجھے خط نہیں لکھا۔ کسی اور کو بھی نہیں لکھنے دیا۔ مجھے اپنی بیماری کی۔ بلکہ موت کی بھی خبر نہیں ہونے دی۔"

"یہ بات نہیں۔" زہرہ نے کہا۔ "وہ نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری پڑھائی پر کوئی برا اثر پڑے۔ وہ تم سے اتنی محبت کرتے تھے کہ تمہیں دکھ سے بچانا چاہتے تھے۔"

"آپا' تمہیں نہیں معلوم' ابا جان مجھ سے بہت زیادہ ناراض تھے۔"

اس بار زہرہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھے بے خبر سمجھ رہے ہو حالانکہ تم خود بے خبر ہو۔ تمہیں ان کی محبت کا اندازہ ہی نہیں اس لیے کہ انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔"

اب کے وضاحت طلب کرنے کی باری آذر کی تھی۔ "یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟"

"یہ تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔" زہرہ نے کہا۔ "عمو جان کو تم نے ان کی زندگی کے آخری دس برسوں میں دیکھا ہی نہیں۔ میں جانتی ہوں' وہ ویسے ہی محبت کرنے والے انسان تھے۔ مجھے انہوں نے اتنی محبت دی کہ ابو جان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی لیکن وہ محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "مگر جب انہوں نے تمہیں انگلینڈ بھیجا تو تمہاری محبت نے انہیں کمزور کرنا شروع کر دیا۔ شروع کے تین چار سال تو وہ ضبط کرتے رہے پھر ان کا ضبط جواب دے گیا۔ میری شادی تو تمہارے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد ہو گئی تھی۔ میں شادی کے بعد یہاں آئی ہی کم ہوں بلکہ رہنے کے لئے تو اب پہلی بار آئی ہوں۔ کبھی ایسے ضرور آ جاتی تھی کہ صبح آئی اور شام کو چلی گئی۔ عمو جان میں تبدیلی یہ آئی کہ وہ میرے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ صرف اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ میں تم سے کتنی قریب تھی۔ وہ مجھ سے صرف تمہاری باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے لہجے میں بے پناہ محبت ہوتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بیٹی کے گھر جانے کو کتنا برا سمجھتے تھے لیکن وہ ہمارے

ہاں آتے اور گھنٹوں تمہاری باتیں کرتے۔"

آذر حیرت زدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہ سب اس کے لئے ناقابلِ یقین تھا۔

"پھر ایک دن وہ آئے تو بہت خوش تھے۔" زہرہ کہے جا رہی تھی۔ "مجھ سے کہنے لگے۔ میری توقع کے برعکس میرا آذر قابلِ فخر بیٹا ثابت ہوا ہے۔ جانتی ہو' وہ انگلینڈ میں پوری آزادی حاصل ہونے کے باوجود نہیں بھٹکا۔ میری نگاہوں میں حیرت دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی کہ انہوں نے تمہیں ولایت بھیج کر ایسا آزاد بھی نہیں چھوڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں تمہارے پل پل کی خبر رہتی ہے۔"

آذر سناٹے میں آگیا۔ یہ تو اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا۔

"یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ وہ ہمیشہ تمہارے کردار کے بارے میں فخریہ لہجے میں باتیں کرتے مگر جانے کیا بات تھی کہ بات کرتے کرتے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتے۔ کاش۔۔۔ کاش اس نے۔۔۔ لیکن انہوں نے کبھی جملہ پورا نہیں کیا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ افسردہ ہو جاتے پھر وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور کہتے۔ تم نہیں جانتیں زہرہ' آذر بھی نہیں جانتا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ تم آبرو ہو میرے گھر کی۔ میرے بھائی کی نشانی ہو۔ میری سمجھ میں ان کی افسردہ کاش کا اس آخری بات سے تعلق کبھی نہیں آیا۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

وہ تعلق جو زہرہ کی سمجھ میں نہیں آیا' اسے آذر سمجھ سکتا تھا اور سمجھ گیا تھا۔ زہرہ کی باتیں سنتے ہوئے وہ ابا جان کے اس تضاد کی وجہ سے الجھتا رہا تھا کہ ایک طرف وہ اس سے اتنی محبت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے اسے اتنی بڑی سزا دی کہ اسے اپنے جنازے میں بھی شریک نہیں ہونے دیا اور گھر بھر سے کاٹ کر رکھ دیا مگر اس آخری اشارے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔ ابا جان اس سے بہت محبت کرتے تھے لیکن اس نے غلطی ہی اتنی بڑی کی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود اور اتنی محبت کے باوجود اسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دانست میں اس نے ان کے گھر کی آبرو پر ہاتھ ڈالا تھا۔ شاید وہ ان کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ اسے زندہ ہی نہ چھوڑتے۔ کاش۔۔۔ کاش وہ انہیں سمجھا سکتا۔۔۔ بتا سکتا کہ وہ غلط سمجھے تھے۔

اگلے روز زہرہ اپنے گھر چلی گئی۔ زندگی معمول کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ وہ مصروفیت میں کھو گیا۔

○☆○

آذر جمیل نے جام خالی کیا اور میز پر پٹک دیا۔ اس کا سر اور سر کے اندر دماغ یوں دکھ رہا تھا جیسے وہ سر کے بل میلوں دوڑا ہو۔ کچھ نشہ بھی تھا' جس نے اس کے اندر کی جھنجلاہٹ کو اور بڑھا دیا تھا۔ جھنجلاہٹ اس بات کی تھی کہ وہ زندگی کی کتاب کے ابتدائی صفحے کھولنے اور انہیں پڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ صفحے ایسے نہیں تھے جنہیں وہ شوق سے دہراتا' یاد کرتا۔ اس نے تو ان صفحات کو ذہن کے کسی نامعلوم نہاں خانے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا لیکن آج پورا نظام درہم برہم ہو گیا تھا' اس کی محفلِ نشاط برہم ہو چکی تھی۔ جن محرومیوں کو وہ چھپاتا تھا۔ خود سے بھی۔ تاکہ دنیا کے سامنے مضبوط انسان بن کر رہے' وہ تن برہنہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور پھر ماضی نے خود کو اس پر تھوپ کر اسے دکھی کر دیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی تو جلدی سے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ گویا اس کی مضبوطی کا حصار ماضی کی اس شورش کے نتیجے میں اندر سے چٹخا تھا مگر باہر سے ثابت و سالم تھا۔

وہ اٹھ کر گیا' فریج کی دو گولیاں نکالیں اور پانی کی مدد سے حلق سے اتار لیں پھر وہ نیند کے انتظار میں کاؤچ پر دراز ہو گیا۔ نیند ہی اسے ماضی اور اس کی محرومیوں کی یلغار سے بچا سکتی تھی۔

○☆○

ٹھیک اسی وقت اداکارہ نیا کی اسٹوڈیو میں ایک رقص فلم بند کرا رہی تھی۔

کیمروں کی رینج سے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے فلم فن کے نمائندے ریاض تجسم نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس سیٹ پر بیٹھے اسے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ کافی عرصے سے وہ انٹرویو کے لئے نیا کے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن نیا کے پاس وقت نہیں تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اس بات پر رضامند ہوئی کہ فلم نرتکی کے سیٹ پر شوٹنگ کے دوران جب بھی موقع ملے گا' وہ اس کے سوالوں کے جواب دے گی مگر وہ گھنٹے ہو چکے تھے اور اب تک ریاض کو ایک سوال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ریاض کو کوفت تو ہو رہی تھی لیکن اس کا کام ایسا تھا کہ اس میں یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا پھر یہ بھی تھا کہ یہاں وہ انجوائے کر رہا تھا۔ رقص اور وہ بھی نیا کا۔ اس کے لئے تو سیٹ پر انتظار ہو جاتا تھا کہ لوگوں کو ہٹانا پڑتا تھا مگر ریاض یہاں نیا کا مہمان تھا۔ اس کی تو تواضع بھی ہو رہی تھی۔

ریاض تجسم شوٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نیا اس وقت رقص کا ایک ایکشن دے رہی تھی۔ بالآخر ہدایت کار آکاش ورما مطمئن ہو گیا۔ وہ اس پورے ایکشن کو ایک ہی شاٹ میں فلم بند کرنا چاہتا تھا اور وہ خاصا طویل شاٹ تھا۔ اسی لئے اتنی ریہرسل کی ضرورت پڑی ورنہ نیا اتنی ماہر رقاصہ تھی کہ ایک ریہرسل کے بعد ہی شاٹ او کے دیتی تھی۔

"اب ہم ٹیک کریں گے۔" آکاش ورما نے بلند آواز میں کہا پھر وہ کیمرامینوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔

ریاض تجسم برسوں سے فلمی صحافت سے وابستہ تھا۔ اس کی

سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے۔ اس وقت بھی یہ بات اس سے چھپی نہ رہ سکی کہ اس طویل شاٹ کے لئے اتنی زیادہ ریہرسل نیا کی وجہ سے نہیں کی گئی ہے۔ اس نے تو ہر ریہرسل میں درست ایکشن دیا تھا۔ درحقیقت آکاش ورما کو فکر اس بات کی تھی کہ کیمرامین اپنے کیمروں کو موو کرنے میں نیا کی رفتار کا ساتھ بھی دے سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریہرسل کے دوران کیمرامینوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

شاٹ اوکے ہوگیا۔ سیٹ پر موجود ہر شخص مطمئن نظر آنے لگا۔ نیا ریاض کی طرف چلی آئی۔ "سوری۔" اس نے مترنم آواز میں کہا۔ "میں آپ کو بالکل وقت نہیں دے پا رہی ہوں۔ بہت شرمندگی ہے مجھے آپ سے۔"

ریاض کو حیرت ہوئی۔ ایسے موقعوں پر اسٹار معذرت نہیں کرتے تھے بلکہ ڈپلومیسی سے کام لے کر بہلاتے تھے اور نیا تو سپر اسٹار تھی پھر بھی وہ معذرت کر رہی تھی۔ "کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں پھر بھی انجوائے کر رہا ہوں۔"

"آپ کا یہ انتظار بے ثمر نہیں ہوگا۔" نیا بولی۔ "مجھے دو شاٹ اور دینے ہیں پھر شوٹنگ پیک اپ ہو جائے گی اور میں آپ کو پورا انٹرویو دوں گی۔ ایک مکمل نشست میں۔" ریاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ تو عنایت خسروانہ تھی اس کے لئے۔

آخری دو شاٹس میں دیر نہیں لگی۔ نیا تھوڑی دیر بعد اس کے پاس آگئی۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

ریاض اس کے ساتھ باہر آگیا۔ نیا نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آجایئے۔"

ریاض کو پھر حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے اگلی سیٹ سنبھال لی۔ "کہاں لے جا رہی ہیں آپ مجھے؟"

"کہیں بھی لے جاؤں۔ آپ کو انٹرویو چاہئے یا نہیں۔" نیا کے لہجے میں شوخی تھی۔

"آپ سے انٹرویو کے لئے تو میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔"

چند لمحوں بعد گاڑی سڑکوں پر بہہ رہی تھی۔ نیا مشاق ڈرائیور بھی ثابت ہو رہی تھی۔ ریاض خاموش بیٹھا ڈرائیو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

دس منٹ بعد نیا نے گاڑی ایک بنگلے کے گیٹ پر روکی اور ہارن دیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نیا گاڑی اندر لے گئی۔

ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر ریاض کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بالکل انوکھی آرائش تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نیا کو واقعی رقص سے عشق ہے۔ دیواروں پر مجسمے تھے اور ہر مجسمہ رقص کے ایکشن میں تھا۔ ریاض ان مجسموں میں ایسا کھویا کہ اسے نیا کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا۔

"میں دس منٹ لوں گی۔" نیا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "جس چینج کر کے آئی ہوں پھر کھانا کھائیں گے۔" وہ اسے جواب دینے کا موقع دیے بغیر زینوں سے اوپر چلی گئی۔

ریاض بیٹھ گیا مگر وہ ان مجسموں میں ہی الجھا رہا۔ یہاں تک کہ نیا واپس آگئی۔ "بہت اچھے لگے ہیں یہ مجسمے؟" اس نے پوچھا۔

ریاض نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نیا اتنی حسین ہے اور میک اپ اس کے حسن میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کا حسن تو صحیح معنوں میں بے داغ تھا۔

اس کی محویت دیکھ کر نیا نے شوخ لہجے میں کہا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔" ریاض نے بے ساختہ کہا پھر اسے خیال آیا کہ نیا کیا پوچھ رہی تھی۔ "آپ کا ڈرائنگ روم بہت خوبصورت ہے۔"

"آیئے۔ کھانا کھالیں۔"

وہ ریاض کو ڈائننگ روم میں لے گئی۔ کھانے کے دوران ریاض نے جب بھی کوئی بات کرنا چاہی، نیا نے اسے روک دیا۔ "کھانا سکون سے کھائیں۔ انٹرویو بعد میں کر لیجئے گا۔" وہ بولی۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ ملازمہ کافی لے آئی۔ نیا نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اب سوال کریں۔ اب یہ خصوصی انٹرویو ہوگا۔ میرا ایسا انٹرویو کبھی نہیں چھپا ہوگا۔ اب تو خوش ہیں۔"

"میں بہت شکر گزار ہوں آپ کا۔" ریاض نے پوری سچائی سے کہا۔ نیا اس کے انتظار کی وہ تلافی کر رہی تھی، جو اس کے گمان میں بھی نہیں تھی۔

ریاض سوال کرتا رہا اور نیا جواب دیتی رہی۔ ریاض کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ خطرناک حد تک صاف گو ہے۔ اس میں اپنے ساتھی اداکاروں اور اداکاراؤں کی سی ڈپلومیسی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ اسے فلم انڈسٹری میں اپنے مستقبل کی پروا نہیں ہے بلکہ ریاض نے یہ رائے قائم کی کہ نیا تمام تر آثار اور امکانات کے باوجود فلم انڈسٹری میں زیادہ عرصہ رہے گی نہیں۔ حالانکہ بہت کم وقت میں وہ سپر اسٹار بن چکی تھی۔ اس جیسی کوئی اداکارہ جو رقص میں بھی ایسی مہارت رکھتی ہو، نہ تو فلم انڈسٹری میں موجود تھی اور نہ ہی یہ امکان تھا کہ طویل عرصے تک سامنے آسکے گی۔ پروڈیوسر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے لیکن وہ اندھا دھند فلمیں سائن کرنے کی قائل نہیں تھی۔ معاوضہ بھی وہ ایسا لے رہی تھی کہ بڑی سے بڑی اداکارہ کا معاوضہ اس کے نصف سے بھی کم تھا۔ اس کے باوجود ریاض تبسم کے خیال میں اسے فلمی صنعت سے تھوڑے عرصے میں جدا ہو جانا تھا۔ خواہ فلمی صنعت اسے خیرباد کہے یا وہ فلمی صنعت کو۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے صاف گو اور سچے لوگ جھوٹ اور مصلحت کی اس دنیا میں زیادہ دن نہیں

چلتے' خواہ کتنے ہی باصلاحیت ہوں۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سپر اسٹار بن چکی ہیں۔" ریاض نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہے کہ ابھی تک آپ بڑی اداکارہ ثابت نہیں ہوئی ہیں بلکہ ابھی تک آپ محض ایک رقاصہ ہیں۔"

"مجھے اس کا اعتراف ہے۔ ابھی تک مجھے کوئی ایسا کردار نہیں ملا' جس میں میری اداکاری کی صلاحیتیں سامنے آتیں۔ وجہ یہی ہے کہ میں بہت اچھی رقاصہ ہوں پھر یہ بھی ہے کہ باکس آفس پر فلم ہٹ ہونا ضروری ہے۔ فلمیں ناکام ہوں گی تو پیسہ کون لگائے گا۔۔۔ فلم کون بنائے گا۔ یہ کاروبار ہے' آرٹ کی خدمت کوئی نہیں کرتا۔ آپ جانتے ہیں کہ کثرت سے فلمیں فلاپ ہونے کے نتیجے میں ہماری فلم انڈسٹری کس حال کو پہنچ گئی تھی لیکن اب اس میں جان پڑ رہی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اس میں میرا بھی کنٹری بیوشن ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن اب نرتکی میں مجھے موقع ملا ہے۔ یہ رول بہت پاور فل ہے۔ اس میں' میں خود کو بڑی اداکارہ ثابت کر سکوں گی۔"

"بہت خوب۔ یہ بتائیں کہ رقص کی آپ نے باقاعدہ تربیت لی ہے؟"

"جی ہاں اور ریاض بھی باقاعدگی سے کرتی ہوں۔"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی فلموں میں ڈانس ڈائریکٹر کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔"

"وہ غلط کہتے ہیں۔" نیا نے بے حد سکون سے کہا۔

"وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ رقص کے ہر ایکشن میں کچھ اسٹیپس آپ کے اپنے ہوتے ہیں اور ان پر اچھے سے اچھا ڈانس ڈائریکٹر بھی اعتراض نہیں کر پاتا بلکہ وہ آپ کی صلاحیتوں کو سراہنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

"یہ ایک الگ بات ہے۔" نیا مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں رقص کی گرامر سے واقف ہوں اس لئے اضافی اسٹیپس دیتی ہوں۔ ڈانس ڈائریکٹر بچے فنکار ہیں اس لئے انہیں سراہتے ہیں۔ یہ ان کی عالی ظرفی ہے۔ جہاں تک رقص کا تعلق ہے میں آزادانہ رقص کر سکتی ہوں لیکن فلم کا رقص مختلف چیز ہے۔ ڈانس ڈائریکٹر کے بغیر بات نہیں بن سکتی ہے۔ لہٰذا ایسی کوئی بات کہنا ڈانس ڈائریکٹرز کے ساتھ زیادتی ہے۔"

ریاض اس کی منصف مزاجی اور راست گوئی کا اور قائل ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک شاہکار انٹرویو کر رہا ہے اور اس میں نیا کا بڑا دخل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نیا نے اس سے پہلے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں تھا۔ وہ سوال کرتا رہا اور اسے بے ساختہ جواب ملتے رہے۔

پھر وہ محبت کی طرف آ گیا۔ "محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

نیا پہلی بار ہچکچائی۔ "محبت انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔" بالآخر وہ بولی۔ "لیکن ہر محبت محبت نہیں ہوتی۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں' جنہیں سچی محبت مل جائے ورنہ محبت کسی ضرورت کے تحت بھی کر لی جاتی ہے اور کسی اور جذبے پر بھی لوگ محبت کا خطاب ڈال دیتے ہیں۔ وہ محبت بہرحال نہیں ہوتی۔"

"یعنی آپ کے خیال میں محبت بڑی کمیاب چیز ہے؟"

"جی ہاں۔ اور ہم فلمی لوگوں کے لئے تو نایاب ہی سمجھیں۔"

"اس کی وجہ؟"

نیا کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "دراصل ہم لوگوں کی شخصیت کے گرد گلیمر کا ہالہ ہوتا ہے۔ ہماری شخصیت کے اصل خدوخال کسی کو نظر نہیں آتے۔ کوئی دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ سب ہمارے ظاہر پر مرتے ہیں۔ باطن کی خوبیوں اور خامیوں سے بے نیاز ہو کر اور محبت کا نتیجہ شادی کی صورت میں نکلے تو پھر خامیاں بری اور بڑی لگنے لگتی ہیں۔ یہ میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں' جو سچائی سے قریب تر ہوتی ہے۔ ورنہ زیادہ تر لوگوں کی محبت محبت نہیں' کچھ اور ہوتی ہے۔ خاص طور پر دولت مند لوگ جو محبت کے نام پر کسی اداکارہ کو پروز کرتے ہیں تو درحقیقت وہ اس اداکارہ کو اس کی شہرت سمیت خریدنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر لوگ کہیں۔ دیکھو' یہ ہے اداکارہ نیا کا شوہر۔ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ ذرا سوچو نیا سے شادی کر لی اس نے۔"

"اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی۔" ریاض کو اب اس انٹرویو میں لطف آ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' شہرت کی آرزو ہر انسان کو ہوتی ہے' کسی کو کم کسی کو زیادہ لیکن جنہیں دولت مل جائے' انہیں شہرت کی کمی بہت بڑی لگتی ہے۔ یہ احساس انہیں کچوکے دیتا ہے کہ اتنی دولت کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی نہیں جانتا' کوئی اہمیت نہیں دی جاتی انہیں۔ انہیں پتا چلتا ہے کہ دولت کوئی بہت بڑا حوالہ نہیں اور یہ تلخ حقیقت ان سے ہضم نہیں ہوتی۔ جب وہ کچھ نہیں کر پاتے تو کسی اداکارہ سے اظہارِ محبت کرتے ہیں اور تحفے تحائف کے ذریعے اسے تسخیر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسی شادیاں چار چھ ماہ چلتی ہیں۔ کسی فریق کو افسوس بھی نہیں ہوتا۔ زیادہ تر ایسی محبت ملتی ہے ہم اداکاراؤں کو۔"

ریاض مجسم حیران رہ گیا۔ یہ جواب ایسا تھا' جیسے انٹرویو پہلے سے طے شدہ ہو اور سوال نیا کو ایک ہفتہ پہلے دے دیے گئے ہوں اور اس نے اس پر ہوم ورک کیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا اور اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ نیا ان باتوں پر غور کرتی رہتی ہے۔ اس سے اس کی شخصیت کی گہرائی سامنے آتی تھی۔ ریاض کا واسطہ ایسی کسی ایکٹریس سے کبھی نہیں پڑا تھا بلکہ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ حسن کی یہ دیویاں سوچ بھی سکتی ہیں۔

"آپ کو کبھی محبت ملی؟" ریاض کا سوال بہت شارپ تھا۔

"جی نہیں۔ البتہ اظہارِ محبت کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔" نیا نے بلا جھجک جواب دیا۔

"آپ نے کسی کو قبول بھی نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ میں نے ایسے ہر اظہار کو 'بچنے' پرکھنے کی کوشش کی اور آخر میں رد کر دیا۔ میرے خیال میں ہر اداکارہ کو یہی کرنا چاہئے اس لئے کہ سب سے زیادہ ہمیں ہی جھوٹے اظہارِ محبت سے واسطہ پڑتا ہے۔ ذاتی طور پر میں محبت کے نام پر دھوکا کھانے کی قائل نہیں۔ غرض کی تجارت کرنی ہوئی تو اسے تجارت سمجھ کر ہی کروں گی' اس پر محبت کا جھوٹا لیبل کبھی نہیں لگاؤں گی۔"

"تو کبھی یوں بھی ہوتا ہو گا کہ کوئی اداکارہ سچی محبت سے محرومی کے ساتھ پوری زندگی گزار دے؟"

"کبھی نہیں' زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ ہمیں ہر طرح کے فریب سے واسطہ پڑتا ہے۔ جذباتی طور پر ہم اداکارائیں سب سے زیادہ عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہیں۔ دیکھیں نا' ہمارے پرستار بھی ایک عام عورت کی طرح ہماری عزت نہیں کرتے۔ ہمیں وقتی طور پر دل بہلانے والا کھلونا سمجھا جاتا ہے پھر ہمارے پاس دولت بھی ہوتی ہے۔ اس کے شکاری الگ ہماری گھات میں رہتے ہیں۔ ایسے میں سچی محبت کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔"

وہ اداکاروں کے نفسیاتی مسائل بہت اچھی طرح بیان کر رہی تھی۔ ریاض نے کہا۔ "تو گویا یہ کوئی کمپلیکس ہوا۔"

"ہاں۔ عدم تحفظ کمپلیکس تو پیدا کرتا ہی ہے۔"

"تو کسی اداکارہ کے سامنے سچی محبت آئے تو زیادہ امکان یہی ہو گا کہ وہ اس پر شک کر کے اسے مسترد کر دے گی۔"

وہ پھر کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ "جی ہاں' یہ تو ہو گا۔ دیکھیں' میرے نزدیک محبت بھی ایک طرح کا رزق ہے اور رزق مقدر سے ملتا ہے لیکن شاید زیادہ تر اداکارائیں ایک دو تجربے کے بعد محبت کا خیال ہی دل سے نکال دیتی ہیں۔ انہیں محبت کی پروا نہیں رہتی مگر میں اپنے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سچی محبت ملی تو میں اسے پہچان لوں گی اور اسے کمپلیکس کی نذر کر کے ضائع نہیں کروں گی۔ میں محبت کی طلب سے دست بردار نہیں ہوئی ہوں۔"

"یہ بتائیں' آپ محبت کی اہلیت رکھتی ہیں؟"

"محبت کی اہلیت تو ہر انسان میں ہوتی ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی سبھی کو ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کی طلب سے دست بردار ہو جائیں' وہ نرمی اور گداز سے' لطافت سے' زندگی کی بہت بڑی خوبصورتی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے لئے یہ پسند نہیں کروں گی۔"

"آپ نے کبھی محبت کی؟"

"میری تو زندگی ہی محبت کرتے ہوئے گزری ہے۔" نیا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ جانتی ہیں' میں کس محبت کی بات کر رہا ہوں؟"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "ہاں۔ ایک بار کی تھی۔ مگر دکھ اور جدائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب بھی مجھے کسی سے محبت ہوئی تو میں اسے ضائع نہیں کروں گی۔"

"آپ کو کس قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟"

"مجھے مردوں میں جو خوبی سب سے زیادہ پسند ہے' وہ ذہانت ہے۔" نیا نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ مجھے جس شخص سے محبت ہو گی' وہ جینئس ہو گا اور اس کی شخصیت باوقار ہو گی۔ جامہ زیب وہ ایسا ہو گا کہ جو لباس بھی پہن لے' وہ اس پر جچے۔" اس کا لہجہ خوابناک ہو گیا۔ "اور وہ بہت مضبوط مرد ہو گا۔"

"آئے دن آپ کے اسکینڈل بنتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی اخبار میں کسی کے ساتھ کبھی آپ کی شادی کی خبر چھپ جاتی ہے۔"

"لیکن میں اب بھی غیر شادی شدہ ہوں۔" نیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ تردید کرتی ہیں نہ تصدیق۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"سادہ سی وجہ ہے۔ تصدیق اس لئے نہیں کرتی کہ غلط بات کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ تردید اس لئے نہیں کرتی کہ ہر اگلی افواہ پچھلی افواہ کی تردید کر دیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اِٹ اِز پارٹ آف دی گیم۔ اسکینڈل سے پبلسٹی ملتی ہے۔"

"شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں واضح طور پر کہہ رہی ہوں کہ میری شادی خفیہ نہیں ہو گی۔" نیا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرے شادی کرنے سے ایک سال پہلے پوری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ میں شادی کر رہی ہوں۔ اس لئے کہ میں فلمیں سائن کرنا بند کر دوں گی اور اپنے فلم سازوں کو نوٹس دے دوں گی کہ میری شادی سے پہلے ایک سال کے اندر اندر میرا کام مکمل کر لیں۔"

"کیوں؟"

"میں صرف شادی نہیں کرنا چاہتی' ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور میرے خیال میں یہ فل ٹائم جاب ہے۔ شادی کے بعد میں خالص گھریلو عورت بن کر رہوں گی۔ میں بہت اچھی بیوی اور بہت اچھی ماں ثابت ہوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ نیا جی۔" ریاض تبسم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وش یو گڈ لک۔"

ریاض باہر نکلا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ایک تہلکہ مچا دینے والا انٹرویو اس کے پاس تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس انٹرویو کی اشاعت سے اسے بہت فائدہ ہو گا لیکن اس سے کہیں زیادہ فائدہ نیا کو پہنچے گا۔ اس کا امیج ایسا بنے گا۔ مگر وہ اس کی مستحق بھی تھی۔ اتنی مختلف' پڑھی لکھی اور سلجھے ہوئے ذہن کی ہیروئن فلمی صنعت کو کبھی میسر نہیں آئی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک سرخی گونجی۔ جھوٹ کی نگری میں سچ کی روشنی!

○☆○

نیا نے دودھ کا گلاس خالی کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ یہ انٹرویو اس کے لئے بہت بڑی کامیابی تھی۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا کہ اس نے اس قدر تفصیلی انٹرویو دے ڈالا تھا۔ اس سے پہلے وہ سیٹ پر سرسری سے انٹرویو دیتی رہی تھی۔ وہ بے حد ذہین تھی' پڑھی لکھی بھی تھی۔ جانتی تھی کہ صحیح وقت پر درست قدم اٹھانے کی کتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور نامناسب وقت پر صحیح قدم اٹھانا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔

اب تک وہ اداکارہ سے زیادہ رقاصہ تھی جو کم سے کم لباس میں ہیجان انگیز رقص فلم بند کرانے کے لئے تیار رہتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے کوئی اچھا رول نہیں ملا تھا۔ اسے اچھے رول کا انتظار تھا اور اس انتظار کے دوران اسے انڈسٹری میں وقت گزارنا تھا۔

آٹھ ماہ پہلے اسے وہ رول مل ہی گیا جس کی وہ منتظر تھی۔ نرتکی کا ٹائٹل رول ایک رقاصہ کا تھا لیکن اس میں اداکاری کا اسکوپ بہت زیادہ تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس نے بہت اچھی پرفارمنس دی ہے۔ فلم تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ دو تین ماہ کے بعد اسے ریلیز ہونا تھا۔ نیا جانتی تھی کہ نرتکی ہٹ ہو گئی تو وہ نمبرون کہلائے گی اور فلم کا ہٹ ہونا قسمت سے ہوتا ہے لیکن نیا صرف قسمت پر انحصار کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اس فلم کو ہٹ کرانے کے لئے وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ اور کر رہی تھی۔ یہ انٹرویو بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

نیا نے اس انٹرویو کے معاملے میں ایک تیر سے دو نہیں' کئی شکار کئے تھے۔ ریاض مجسم یہ سمجھ رہا تھا کہ سرسری انٹرویو کی جگہ تفصیلی انٹرویو کا موقع اسے خوش قسمتی سے ملا ہے پھر وہ نیا کے حسن اخلاق کا بھی ہمیشہ کے لئے معترف ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں نیا نے اس کے انتظار کی تلافی کی تھی حالانکہ نیا کو ہر قیمت پر وہ انٹرویو دینا تھا۔ اس کے لئے اس نے بساط بچھائی تھی اور ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلی تھی ورنہ ایک بار ریاض کی طرح ایک اور صحافی چھ گھنٹے تک نیا کے سرسری سوال جواب کے لئے خوار ہوا تھا اور آخر میں نیا نے اسے سوری کہہ کر ٹال دیا تھا۔

نیا نے حساب لگایا تھا کہ اب تفصیلی انٹرویو کا وقت آ چکا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے کردار میں بہت اچھی پرفارمنس دے چکی تھی۔ فلم کی ریلیز سے پہلے اس کی پاور فل پبلسٹی کے لئے ایک ایسا انٹرویو ضروری تھا جو پڑھنے والوں کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو اور جو اس انٹرویو کو پڑھے وہ فلم نرتکی دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ پہلا اہم فیصلہ یہ تھا کہ انٹرویو کسے دیا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد نیا نے ریاض مجسم کا انتخاب کیا۔

ریاض مجسم فلمی پرچے فلم فن کا نمائندہ تھا لیکن نیا جانتی تھی کہ صحافتی حلقوں میں اس کی بڑی وقعت ہے۔ ملک کے سب سے بڑے اخبار میں اس کے کئی انٹرویو چھپ چکے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ریاض اس غیر معمولی انٹرویو کو فلم فن تک محدود نہیں رکھے گا بلکہ یہ انٹرویو روزنامہ نمسکار میں بھی ضرور شائع ہو گا اور روزنامہ نمسکار ہر گھر میں پڑھا جانے والا اخبار تھا۔

یعنی نیا طے کر چکی تھی کہ ریاض کو یہ انٹرویو دینا ہے!

پھر نیا نے حساب لگایا کہ اسے پڑھنے والوں پر اور اپنے پرستاروں پر اپنی ٹاپ ٹی اسکرین شخصیت کا کیا اثر مرتب کرنا ہے۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد عام اداکاروں سے مختلف اپروچ اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بے لاگ تبصرہ کرنے والی سیدھی' سچی اور صاف گو لڑکی کے روپ میں ان کے سامنے آئے۔ اسی اپروچ کے تحت اس نے ریاض مجسم کے ہر سوال کا جواب بظاہر بے ساختہ' لیکن درحقیقت بہت سوچا سمجھا اور محتاط جواب تھا۔ خصوصاً محبت اور شادی کے بارے میں جواب بہت سوچ سمجھ کے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سوال ضرور کئے جائیں گے۔ تمام اداکارائیں انٹرویو دیتے ہوئے یہیں تو مار کھاتی ہیں۔

اس انٹرویو میں سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔ سچ بہت بڑے لیکن غیر اہم تھے اور جھوٹ بہت چھوٹے چھوٹے لیکن اس اعتبار سے بہت اہم تھے کہ انہیں اس کا بہت اچھا امیج بنانا تھا۔ مثلاً محبت اور شادی کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا' سچ تھا۔ ہر اداکارہ محبت کی طلب کرتی' لیکن محبت سے ڈرتی ہے۔ عدم تحفظ اور استعمال ہونے کا خوف ہر اداکارہ کو ستاتا ہے۔ یہی معاملہ شادی کا ہے۔ یہ بہت بڑی سچائیاں تھیں۔ پڑھنے والا ان کے حوالے سے اسے بہت شدت کے ساتھ سچی' کھری اور صاف گو اداکارہ سمجھے گا اور فطری طور پر پورے انٹرویو کو اس کی ہر بات کو سچ سمجھے گا۔

جھوٹ چھوٹے چھوٹے لیکن اہم تھے۔ مثلاً ڈانس ڈائریکٹرز والا سوال۔ درحقیقت وہ خوش ہوتی تھی اس بات پر کہ اس کے معاملے میں ڈانس ڈائریکٹر کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ رقص کے معاملے میں اس کی عظمت کا اعتراف تھا لیکن اس کے جواب سے تمام ڈانس ڈائریکٹرز اس سے خوش ہو جائیں گے۔ وہ اس کا اور زیادہ احترام کریں گے اور اس کے رقص پر اور زیادہ محنت کریں گے۔ اسی طرح سے اس نے صاف گوئی کا امیج بنا کر تمام اہم لوگوں کو خوش کیا تھا۔

نرتکی کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی کہا تھا' سچ تھا لیکن اس میں اس کی غرض بھی شامل تھی۔ اس فلم ہی کی خاطر تو اس نے یہ انٹرویو دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کا انٹرویو دینے سے بچتی رہی تھی کہ ناقدین کی نظر میں وہ چھوٹی اداکارہ کا بڑا انٹرویو ٹھہرتا لیکن اب وہ مستقبل کی نمبرون اداکارہ تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے جو جھوٹ بولے ہیں' انہیں کوئی جھوٹ نہیں سمجھے گا۔ لوگ جب کسی کو سچا مان لیں تو اس کے منہ سے نکلنے والی ہر بات سچ سمجھی جاتی ہے۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ

اس نے انٹرویو لینے والے صحافی کو متاثر کردیا تھا۔ ایک ایسے صحافی کو جو فلمی ستاروں کے جھوٹ سننے اور پکڑنے کا عادی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب ریاض تبسم ہمیشہ اس کی مدح سرائی کرے گا اور اپنی تحریروں میں اس کی تعریف کردے گا۔ قارئین کا متاثر ہونا تو لازمی ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عقل مند اور ذہین آدمی لوگوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے اور بے ضرر راز بے ساختگی کے ساتھ بتا کر یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ وہ منہ پھٹ ہے اور خود کو چھپا کر رکھنا اسے نہیں آتا لیکن کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنے بڑے اور اہم رازوں کو ہمیشہ کے لئے ان کے تجسس تک سے محفوظ کرلیا ہے۔

نیا کو یاد تھا' ریاض نے اس سے پوچھا تھا۔ "آپ کی زندگی کا سب سے بڑا خواب؟"

اور اس نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ "میرے پاس خواب دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے سونے کے لئے وقت ملتا ہے تو بے سدھ ہو کر سوتی ہوں اور نیند پوری ہونے سے پہلے اٹھنا پڑ جاتا ہے۔ خواب کیسے دیکھوں؟"

حالانکہ اس کا ایک خواب تھا۔ وہ خواب شاید فلمی دنیا کی ہر ہیروئن دیکھتی ہے۔ ان میں جو بے وقوف ہوتی ہیں وہ اسے ٹی وی پر یا صحافیوں کے یا پبلک کے سامنے بیان کردیتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ صرف خواب دیکھنا کافی نہیں۔ جس خواب کی تعبیر ناممکن ہو' اسے بیان کرنا اپنا مذاق اڑوانے کے برابر ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' یہ منہ اور مسور کی دال! نیا یہ نہیں سننا چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنا خواب چھپا کر رکھا تھا۔

نیا کا خواب بھی وہی تھا جو شاید ہر فلمی ہیروئن کا ہوتا ہے۔ ہالی ووڈ لیکن اس کے لئے وہ محض خواب نہیں تھا۔ وہ اس خواب کو سچ ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ بس اسے ایک موقع کی تلاش تھی اور پہلا مرحلہ ملک میں نمبر ون ہیروئن کا مقام حاصل کرنا تھا۔ اس نے اس سمت میں پہلا قدم اٹھالیا تھا۔

اس نے تکیے پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور بڑبڑائی۔ آہ ہالی ووڈ۔ سویٹ ہالی ووڈ۔ ویٹ فار می۔ آئی وڈ بی کنگ۔

○☆○

انور کی امریکا روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے اب اگلے روز اسے چلے جانا تھا مگر وہ بہت پریشان تھا۔ جس دن اس نے پاپا سے امریکا جانے کے سلسلے میں بات کی تھی اور مضبوط انسان بننے کے عزم کا اعلان کیا تھا اس دن سے پاپا بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ یہ تبدیلی ظاہری طور پر تو اتنی نمایاں نہیں تھی۔ کسی اور کو تو پتا بھی نہ چلتا لیکن وہ پاپا کا چہیتا بیٹا تھا اور بچپن سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔

ظاہری تبدیلی یہ تھی کہ پاپا کی آنکھیں متورم رہنے لگی تھیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ انور جانتا تھا کہ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاپا کی بے نوشی بڑھ گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی نیند پوری نہیں ہو رہی ہے۔ شاید انہیں اچھی اور گہری نیند بھی نہیں آرہی تھی۔

"تو کیا اس کا سبب میرا دور جانا ہے؟" اس نے سوچا۔ یہ بہت خوش کن خیال تھا لیکن اس نے فوراً ہی اسے مسترد کردیا۔ اسے پاپا سے آخری گفتگو بہت اچھی طرح یاد تھی۔ پاپا نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے بھی نہیں۔ حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ وہ اسی کو چاہتے تھے لیکن وہ عقل سے سوچنے والے آدمی تھے۔ جذباتی نہیں تھے۔ ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے اسی لئے وہ اس کے امریکا جانے کے حق میں تھے۔ ملک کی فضا ایسی تھی اور بے یقینی ایسی شدید تھی کہ ان کے خیال میں یہاں کوئی یکسوئی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

پاپا کی بے نوشی معمول کے خلاف نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوئی تھی۔ ذرا ترنگ میں آتے تو پاپا خوش مزاج ہو جاتے۔ ان کی شخصیت تبدیل ہو کر رہ جاتی' جیسے ان کے اندر سورج طلوع ہو گیا ہو۔ شراب پی کر وہ بہکے کبھی نہیں تھے۔ خیر بہکتے تو وہ اب بھی نہیں تھے لیکن اب پینے کے بعد خوش مزاجی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اور بجھ جاتے تھے۔

انور پریشان تھا تو غلط نہیں تھا۔ باپ کی عمر ۸۸ سال تھی اور وہ اسے چھوڑ کر امریکا جا رہا تھا جب کہ اس کے جانے کی بات ہونے کے بعد سے باپ کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آئی تھی اور وہ تبدیلی منفی تھی۔ ایسے میں وہ یہی سوچ سکتا تھا کہ باپ کو تنہائی کے احساس نے پریشان اور پژمردہ کردیا ہے۔ یہ غیر فطری بات بھی نہیں تھی۔ ۸۸ سال کی عمر میں تنہائی راجا اِندر کی محفل نہیں ہو سکتی' کوئی لاکھ دعویٰ کرتا رہے۔ وہ تو بہت خوف ناک تنہائی ہوتی ہو گی۔ جیسے روئے زمین پر صرف ایک انسان رہ گیا ہو۔

انور یوں کب تک پریشان ہوتا۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ باپ کے پاس چلا گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ آذر جمیل بہت سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اسے بیدار ہوئے دیر ہو چکی تھی لیکن ابھی وہ خواب گاہ میں ہی تھا۔

انور نے دروازے پر دستک دی۔ "کم اِن" اندر سے آذر نے بھاری آواز میں کہا۔

انور نے دروازہ کھولا اور کمرے میں چلا گیا۔

آذر بیڈ پر ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رائٹنگ پیڈ رکھا تھا اور ہاتھ میں پنسل تھی۔ اس نے سر اٹھا کر انور کو دیکھا اور مسکرا دیا لیکن وہ بے جان مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ زبردستی مسکرایا ہو۔

"آؤ انور' بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

انور نے کرسی اٹھائی' بیڈ کے پاس لا کر رکھی اور اس پر بیٹھ گیا۔ "شکریہ پاپا۔" اس نے آہستہ سے کہا پھر اس نے آذر کو غور

سے دیکھا۔ آج اس کی آنکھیں اور زیادہ حزن لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور گہرے ہو گئے تھے۔

"تو کل تم جا رہے ہو۔" آذر نے کہا۔ انداز ایسا تھا' جیسے اسے یاد دلا رہا ہو۔

"جی پاپا۔"

"اور اپنی ضد پر قائم ہو؟"

"یہ ضد نہیں پاپا' آپ کو خوش کرنے کی کوشش ہے۔ آپ کی ایک خواہش کا احترام ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تم میری کس خواہش کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ مجھے مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ میں تمنائی جیسی فطری چیز سے نہ ڈروں۔ میں مضبوط بننے کی' آپ کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

آذر جھنجلا گیا۔ "کسی کے لفظ پکڑنا۔ اور ان کا اصل مفہوم سمجھے بغیر پکڑنا ذہانت کی کمی کی دلیل ہے لیکن میرے بیٹے کے پاس ذہانت کی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ذہانت سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم مضبوط ہو مگر جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر حقائق سے نظریں چرانا کمزوری ہے اور یہ کمزوری دور ہونی چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ پردیس کی تمنائی کا تمہیں تجربہ نہیں۔"

"اب ہو جائے گا۔" انور نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "اور میں نے جذباتیت والی کمزوری سے بھی نجات حاصل کر لی ہے۔ آپ پھر بھی مجھ سے شکایت کر رہے ہیں۔ میں تو امریکا بھی مضبوط بننے کے لئے جا رہا ہوں۔" پاپا کی نظروں میں سوال دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔ "دیکھیں نا' یہاں میں اوسط درجے کا ڈاکٹر ہوں اور اوسط درجہ کمزوری کی دلیل ہے اسی لئے مجھے امریکا جا کر اسپیشلائزیشن کرنے کا خیال آیا ہے۔"

آذر یہ سن کر مسکرایا۔ وہ اس کی مخصوص مسکراہٹ تھی' جس میں آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" اس نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر کبھی اوسط درجے کا نہیں ہوتا۔ وہ خدمت جو کرتا ہے انسانوں کی اور وہ کمزور بھی نہیں ہوتا۔ میں تمہیں روک اس لئے نہیں رہا ہوں۔ بلکہ تمہارے جانے پر اس لئے اصرار کر رہا ہوں کہ تم بہت بڑے ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ یہ میرا خواب ہے اسی لئے میں نے تمہیں اصرار کر کے میڈیکل میں داخلہ دلایا تھا۔"

انور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "پریکٹیکل لوگوں کے پاس خواب بھی ہوتے ہیں؟" اس کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"ہاں ہوتے ہیں بلکہ خواب دیکھنے کا حق بھی انہی کو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تعبیر کی فکر کرتے ہیں اور تعبیر پاتے بھی ہیں۔"

انور لاجواب ہو گیا۔ "لیکن میرا ڈاکٹر بننا آپ کا خواب کیسے تھا۔ اور کیوں تھا؟"

آذر چند لمحے سوچتا رہا جیسے یادیں تازہ کر رہا ہو پھر وہ بولا۔ "میری والدہ۔ تمہاری دادی کا انتقال ہوا تو میں چالیس سال کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری دادی کی موت ڈاکٹر کی نااہلی کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے ساتھ میرا جی چاہا کہ کاش میں نے ڈاکٹری کی ہوتی اور امی کا علاج میں خود کرتا۔ سینے میں آگ بھڑک اٹھی تھی مگر پریکٹیکل آدمی ہوں۔ جانتا تھا کہ میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے اس کی سو میں نے اس خواب کو اپنے سب سے پسندیدہ بیٹے کے لئے محفوظ کر لیا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ "اولاد ہوتی ہی اس لئے ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "آدمی اپنی ہر محرومی کی تلافی اولاد کے ذریعے کر سکتا ہے۔ یہی ایک صورت ہوتی ہے محرومی سے نجات حاصل کرنے کی۔ تم نے میری محرومی دور کر دی۔"

انور کے لئے وہ انکشاف تھا۔ پاپا نے پہلی بار یہ بات بتائی تھی لیکن اسے یہ یاد تھا کہ پاپا جو اپنے فن اور اپنی مصروفیات کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز تھے' اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے رہے تھے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اب اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی۔

"تم ہمیشہ بات اِدھر کی اُدھر کر دیتے ہو۔" آذر نے جھنجلا کر کہا۔ "میں تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں کہ میری ہر چیز پر تمہارا حق ہے۔ میرا ریفرنس تمہارے لئے باعث شرم نہیں ہونا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پردیس میں اجنبی اور اکیلے رہو۔"

"ایسا نہیں ہو گا پاپا۔ میں اپنے لئے خود ماحول بنا سکتا ہوں اور بناؤں گا۔ میں وہاں تنہائی کا شکار بھی نہیں ہوں گا۔ میں بچہ تو نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جو جی چاہے کرو۔" آذر نے غصے سے کہا۔

"شکریہ پاپا۔" انور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج آپ نے مجھے بھنگایا ہے۔ میں آپ کے پاس یہ باتیں کرنے نہیں آیا تھا۔ مجھے کوئی اور بات کرنی تھی آپ سے۔"

"کرو۔" آذر نے بے زاری سے کہا۔

"پاپا۔ میں آپ کے لئے پریشان ہوں۔"

آذر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم پریشان ہو؟ میرے لئے! کیسی احمقانہ بات ہے۔ کیا تک ہے پریشانی کی؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

"وجہ تو ہے۔ پچھلے دو ہفتوں سے آپ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"میں پریشان نہیں ہوں۔"

"آپ پریشان ہیں اور اس کا اثر آپ کی صحت پر پڑ رہا ہے۔ نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے۔"

آذر ہنسنے لگا۔ "اوہ تم ڈاکٹر ہو نا۔"

"جی نہیں۔ یہ فرق تو عام آدمی کو بھی نظر آ جائے گا۔" انور

نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "آپ نے شاید کئی دن سے آئینہ نہیں دیکھا۔"

"روز دیکھتا ہوں۔ خود سے بہت پیار ہے مجھے۔" آذر نے شگفتگی سے کہا۔

"تو یہ کیسی حقیقت پسندی ہے کہ آپ کو اپنی متورم آنکھیں اور ان کے نیچے سیاہ حلقے نظر نہیں آتے۔"

"نظر آتے ہیں۔ میری عمر میں یہ اونچ نیچ' یہ دھوپ چھاؤں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"اس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں" انور کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی "آپ سدا بہار آدمی ہیں لیکن ان دنوں کوئی پریشانی آپ کو نڈھال کررہی ہے۔ اور وہ یقیناً کوئی بہت بڑی پریشانی ہوگی۔"

"تم ڈاکٹر رہو۔ علم قیافہ کے ماہر نہ بنو۔"

"یہ قیافہ نہیں' مشاہدہ ہے۔ آپ کی نیند بھی متاثر ہوئی ہے۔"

"یہ درست ہے۔ بات صرف نیند کی کمی کی ہے۔" آذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ میری پوری بات سن لیں۔ آج کل آپ کی مے نوشی بھی بڑھ گئی ہے اور آپ خوش مزاج بھی نہیں رہے۔ یہ بھی پریشانی کی علامت ہے۔ پھر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ معمول سے زیادہ ٹرنکولائزرز لے رہے ہیں اور نیند آپ کو پھر بھی نہیں آتی۔"

"اتنے عالم و فاضل ہو تو پھر میری پریشانی سے بھی واقف ہوگے" آذر جھنجلا گیا۔

"اندازہ لگا سکتا ہوں" انور نے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ میرے اتنی دور جانے سے اور اپنی تنہائی کے خیال سے پریشان ہیں۔"

آذر جوش اور غصے میں اٹھ کھڑا ہوا "کیا بک رہے ہو۔ ہزار بار بتا چکا ہوں کہ مجھے تنہائی سے کبھی ڈر نہیں لگا اور نہ ہی کبھی لگے گا اور رہی تمہارے جانے کی بات تو تم میرے خواب کی تعبیر کو آگے بڑھانے کے لئے جارہے ہو۔ یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے' پریشانی کی نہیں۔"

"تو پھر اپنی پریشانی بتایئے مجھے۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے" آذر نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"پریشانی تو ہے لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے۔ اب میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنا جانا کینسل کردوں۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں سکون سے کچھ کر ہی نہیں سکوں گا وہاں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ جانا تو تمہیں پڑے گا" آذر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"پاپا میں بچہ نہیں ہوں" انور نے احتجاج کیا۔

"میرے لئے تو بچے ہی ہو" آذر نے کہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "تم جانتے ہو کہ تمہارے جانے کی میرے لئے کیا اہمیت ہے۔"

"لیکن میں اس طرح نہیں جاسکتا۔ آپ مجھے بتادیجئے کہ آپ کو پریشانی کیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"فرق پڑے یا نہ پڑے۔ میرے لئے یہ ضروری ہے۔"

"میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ کوئی اہم بات نہیں" آذر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے جو پریشانی ہے' وہ بے حد نجی نوعیت کی ہے۔ میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ تمہیں بھی نہیں۔"

"تو پھر میں جاؤں گا بھی نہیں۔"

"اس لئے میں مضبوطی اور کمزوری کی بات کرتا ہوں" آذر کو ایک دم غصہ آگیا "آج پہلی بار میں نے تمہیں اپنے ایک خواب اور اس کی تعبیر کے بارے میں بتایا اور آج ہی میں کمزور بھی ہوگیا۔ مضبوط ہونا اس لئے ضروری ہے کہ انسان طبعاً بلیک میلر ہوتا ہے۔ فائدہ اٹھانے کے ہر موقع کی تاک میں رہتا ہے۔"

"یہ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ؟" انور نے کمزور لہجے میں کہا۔ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

"تم جانتے ہو کہ تم مجھے بلیک میل کررہے ہو۔"

"یہ بلیک میلنگ نہیں ہے پاپا۔ میں آپ کے لئے پریشان ہوں اور اس پریشانی کے ساتھ امریکا نہیں جاسکتا۔"

"تم مانو یا نہ مانو' یہ بلیک میلنگ ہے" آذر نے سخت لہجے میں کہا "خواب آدمی کی کمزوری ہوتے ہیں اور کسی کے ہاتھ کسی کی کمزوری لگ جائے تو وہ اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی لئے میں ہمیشہ مضبوط بن کر رہا۔ پہلی بار مجھ سے چوک ہوئی اور وہ بھی بیٹے کے معاملے میں۔ انجام خود دیکھ لو۔ تمہیں اندازہ ہوگیا کہ میں تمہارے امریکا جانے میں انٹرسٹڈ ہوں' تو تم نے شرطیں لگانا شروع کردیں۔"

"یہ بات نہیں ہے پاپا۔ آپ مجھے اپنی پریشانی بتادیں نا۔"

"یعنی ایک اور کمزوری تمہارے ہاتھ میں دے دوں" آذر نے زہریلے لہجے میں کہا پھر اس نے لہجہ نرم کرلیا "میں تمہیں صرف یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ میرا کوئی صحت کا مسئلہ نہیں۔ مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں' جو تمہارے لئے کسی بھی طور پریشانی کا باعث ہو۔ میرا ایک ذاتی معاملہ ہے' جو میں تمہیں ہرگز نہیں بتا سکتا۔ اب تمہاری مرضی' امریکا جاؤ یا نہ جاؤ۔ مجھے اتنی زیادہ پروا بھی نہیں۔"

انور بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی نظروں میں ستائش ابھری۔ پاپا واقعی مضبوط آدمی تھے۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹ سکتے تھے۔ اس وقت انہوں نے اسے کتنی آسانی سے ہینڈل کیا تھا اور بے بس کرکے رکھ دیا تھا۔ اب وہ امریکا نہ جاتا تو ہمیشہ خود کو بلیک میلر سمجھتا رہتا۔ اس نے ہاری ہوئی جنگ کو ایک اور

زاویے سے جیتنے کی کوشش کی "ٹھیک ہے پاپا۔ میں امریکا جارہا ہوں لیکن میں وہاں آپ کا ریفرنس کبھی استعمال نہیں کروں گا۔ میں آپ کو مضبوط بن کر دکھاؤں گا۔ میں اپنی انفرادیت بنانے کے لئے آپ کے نام کو بھی ترک کردوں گا۔"

آنور نے اطمینان کی سانس لی۔ مشکل لمحہ خوش اسلوبی سے گزر گیا تھا "ٹھیک ہے بیٹے۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ اپنے جانے کے سلسلے میں اور ایڈمیشن کے سلسلے میں تم نے اپنا ہر کام خود کیا ہے۔ اپنے زور پر۔ مجھے تو تم پر فخر ہے۔"

"میں چلتا ہوں پاپا۔ جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے انور۔"

انور جاتے جاتے پلٹا "پاپا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

"تم جانتے ہو کہ اپنا آپ مجھے کتنا پیارا ہے۔ میں ہمیشہ اپنا خیال رکھتا ہوں۔"

انور نے سر کو تھپکی جنبش دی [redacted] مجھے پوری سچائی سے یقین دلادیں کہ یہ جو آپ کا ذاتی قسم کا مسئلہ ہے' جو پریشانی ہے آپ کی' یہ جلدی دور ہوجائے گی اور آپ پہلے جیسے ہوجائیں گے۔ ایسا ہوجائے تو میری بے اطمینانی کم ہوجائے گی۔"

"یقین کردیجئے' یہ سچ ہے۔ وہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں صرف ضد سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک مسئلہ حل ہوگیا ہوتا۔"

"تو پاپا' اپنی ضد چھوڑ دیں" انور نے کہا پھر وہ مسکرایا۔ "تھینک یو پاپا۔"

انور کے جانے کے بعد آذر بھی مسکرایا۔ وہ بیٹے کو کیا بتاتا' کیسے بتاتا کہ وہ اپنے ماضی سے اور اس کی محرومیوں سے بھاگ رہا ہے۔ ماضی ہے کہ خود کو اس پر تھوپ رہا ہے۔ اسے خود کو دہرانے پر مجبور کررہا ہے اور وہ لڑ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی محرومیوں کی یاد تازہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس ضد کے نتیجے میں اسے ایک اور محرومی مل گئی ہے۔ اس کی تنہائی اب راجا اِندر کی سبھا نہیں رہی۔ وہ تنہا ہوتا ہے تو ماضی اسے ستاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ جام پر جام لنڈھاتا ہے لیکن لذت اور سرور سے محروم رہتا ہے۔ نشہ اور اذیت دہ ہوگیا ہے پھر نیند کی گولیاں بھی بے اثر ہوگئی ہیں۔ نیند برائے نام آتی ہے۔ اور اچھی نہیں آتی۔

اسے انور کا مشورہ یاد آیا۔ کیا اسے ضد چھوڑ دینی چاہئے۔ یوں تو اس کی صحت تباہ ہوجائے گی اور اس عمر میں وہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

○☆○

نرگسی کا صرف پیچ ورک باقی رہ گیا تھا۔ نیا ایک عجیب طرح کی سنسنی محسوس کررہی تھی۔ یہ فلم اس کے کیریئر کے لئے نہایت اہم تھی۔ وہ فلم سے اور اپنی پرفارمنس سے مطمئن تو تھی۔ مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے باوجود فلم فلاپ ہوسکتی ہے۔ پچھلے برسوں میں فلاپ ہونے والی بہت معیاری فلموں کی فہرست بہت طویل اور حوصلہ شکن تھی۔ ان دنوں وہ سوچتی تھی کہ فلم کی کامیابی کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی پبلسٹی کے لئے اچھوتا آئیڈیا سوچنا ہوگا۔

اس دوران ایک اور بات بھی ہوئی تھی۔ ایک مرد اس کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ ارب پتی صنعت کار جگدیش تھا۔ اس کی متعدد انڈسٹریز کامیابی سے چل رہی تھیں اور اب وہ فلم انڈسٹری میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ نیا کا اندازہ تھا کہ درحقیقت جگدیش کو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس وہ اس تک پہنچنے کے لئے مصنوعی روشنیوں کی اس دنیا میں چلا آیا تھا۔

نیا کی جگدیش سے پہلی ملاقات ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ یہ پارٹی جگدیش نے مشہور ہدایت کار امرجیت کے اعزاز میں دی تھی۔ امرجیت وہ شخص تھا' جس نے نیا کو فلمی دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ نیا دنیا میں سب سے زیادہ لحاظ اسی کا کرتی تھی۔ اگر امرجیت نے نہ کہا ہوتا تو شاید وہ اس پارٹی میں کبھی شریک نہ ہوتی۔ اس پارٹی میں شریک ہونے والے تمام افراد فلمی صنعت سے تعلق رکھتے تھے۔

نیا نے اس پارٹی میں جگدیش کو پہلی بار دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس کے تصور میں جگدیش کوئی موٹی توند والا بھدا سیٹھ تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ وہ تو بہت خوبرو اور وجیہہ آدمی تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ نیا دل میں یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ فلمی دنیا کے کئی ہیروز سے بہتر ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس میں روایتی ہیرو کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

تقریب رسمی ہی تھی' جیسی عام طور پر فلمی دنیا کی تقریبات ہوتی ہیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جارہی تھی۔ ہر درجے کی اداکارائیں اِدھر اُدھر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ بی آر کا سلسلہ زوروں پر تھا۔ نیا کو ایسی تقریبات میں کوفت ہوتی تھی چنانچہ وہ اس شخص کے ساتھ چپکی رہی جس کی وجہ سے تقریب میں شریک ہوئی تھی... یعنی امرجیت۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔" بھاری آواز میں ایک اناؤنسمنٹ نے نیا کو چونکا دیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ جگدیش مائیک ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ "میں چند لمحوں کے لئے آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔"

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر نگاہ جگدیش کے چہرے پر جم گئی۔

"مجھے ایک اہم اعلان کرنا ہے۔ آج کی یہ تقریب بے سبب نہیں۔ میں آپ کو اس کا سبب بتانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے' میرا تاثر غلط ہو لیکن میرے خیال میں آپ کی فلمی صنعت ایک فیملی کی طرح ہے۔ ہدایت کاروں اور فن کاروں سے لے کر تکنیک کاروں تک ہر شخص اس گھرانے کا فرد ہے اور گھر میں لاکھ اختلافات ہوتے رہیں لیکن گھر گھر ہی رہتا ہے۔"

مختلف سمتوں سے بے تکی' بے تکی آوازیں ابھریں۔

"آج اسی گھرانے میں اپنی شمولیت کے لئے التجا کر رہا ہوں اور اس شمولیت کے لئے میں نے اس گھرانے کے ایک بزرگ کی سفارش حاصل کی ہے میرے محترم دوست امرجیت کو کون نہیں جانتا۔ ان کے فلمی صنعت پر بے حد احسانات ہیں۔ انہوں نے اس انڈسٹری کو ایسے ایسے روشن ستارے دیے ہیں' جن سے یہ دنیا دمک رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے جگدیش کی نظر ایک لمحے کو نیا کے چہرے پر رکی اور پھر امرجیت کے چہرے پر جا ٹھہری۔ "امر صاحب کیا آپ میری سفارش نہیں کریں گے۔"

امرجیت نے ہاتھ میں موجود جام کو بلند کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسٹرونگلی ریکومینڈیڈ۔"

"تھینک یو سر۔" جگدیش نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔ "اب خواتین و حضرات' یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ مجھے قبول کریں یا مسترد کردیں۔"

ہر طرف سے ویل کم' موسٹ ویل کم کی آوازیں آنے لگیں پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جگدیش نے چاروں طرف رخ کر کے کئی بار سر خم کیا۔

"شکریہ۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں ۔ میں آپ کی اس فیملی کا ایک اچھا ممبر ثابت ہوں گا۔ میں نے فی الحال بڑے پیمانے پر فلم سازی کا اور اس کے علاوہ فلم ڈسٹری بیوشن کا پروگرام بنایا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو ہم سب مل کر کام کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے آپ سب کا تعاون حاصل رہے گا اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ اب آپ سب انجوائے کیجئے۔ شکریہ۔"

ایک بار پھر تالیاں بجیں اور بجتی رہیں۔

جگدیش کی اس اناؤنسمنٹ کے بعد محفل کا مزاج تبدیل ہو گیا۔ مہمان خصوصی ایک طرف رہ گیا اور میزبان جانِ محفل بن گیا۔ ہر شخص اس سے ملنا' اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے' وہ ایک ارب پتی تھا جو کئی زاویوں سے ہر ایک کے کام آسکتا تھا۔ خاص طور پر وہ اداکارائیں اس کے پیچھے لگ گئیں' جو کوئی مقام بنانے کی جدوجہد کر رہی تھیں یا پھر وہ ہدایت کار تھے جو کبھی ایک مکمل فلم نہیں بنا سکے تھے اور نہ ہی بنانا چاہتے تھے۔ چھ آٹھ مہینے وہ فلم بنانے کی اداکاری کرتے رہتے۔ اس دوران ان کی مرغی روٹی سکون سے چلتی رہتی اور جب فنانسر خالی ہو جاتا تو وہ اسے لات مار کر پھر سے دال دلیے کی کوشش میں لگ جاتے۔

نیا جگدیش کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب سے بہت خوش اخلاقی سے مل رہا تھا لیکن وہ بہت ریزرو بھی تھا۔ اس کا انداز عامیانہ نہیں تھا۔ وہ تیسرے درجے کی ادا فروش اداکاراؤں سے بھی بہت احترام سے بات کر رہا تھا لیکن اس کے انداز میں ان کے لبھانے کی کوششوں کے لئے حوصلہ افزائی نہیں تھی۔

نیا کو نجانے کیوں ایسا لگا' جیسے وہ اداکاری کر رہا ہے۔ اسے اس کے انداز میں بناوٹ محسوس ہوئی۔

"فیملی کے گدھ نئے ممبر پر منڈلا رہے ہیں۔" امرجیت نے نیا سے کہا۔ "آؤ کسی پُرسکون گوشے میں بیٹھیں۔"

نیا امرجیت کے ساتھ ایک خالی میز کی طرف چل دی۔ وہ بیٹھ گئے۔ ویٹران کے لئے مشروب لے آیا۔ "تمہاری فلم نرتکی کی اسٹوڈیو رپورٹ بہت اچھی ہے۔" امر نے کہا۔

"میرا خیال ہے' وہ اچھی فلم ثابت ہوگی۔" نیا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"مجھ سے بات کرتے ہوئے اتنی احتیاط۔" امرجیت نے اسے چھیڑا۔ "میں جانتا ہوں تم پوری طرح اس فلم پر تکیہ کر رہی ہو۔"

"جی ہاں" نیا نے کہا پھر پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے اس فلم کے بارے"

"مجھے معلوم ہے' آپ اس کے رشز دیکھ چکے ہیں۔"

"ہاں' میرا خیال ہے کہ یہ فلم تمہاری اور آکاش ورما کی فلم ہے۔ دونوں نے ہی کمال کردیا ہے۔"

نیا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ استاد کے منہ سے یہ تعریف غیر معمولی تھی۔ "آپ کا کیا خیال ہے فلم کامیاب ہوگی؟"

"کامیابی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" امرجیت نے خشک لہجے میں کہا۔ "میری سب سے خوبصورت فلم نے مالی طور پر میری کمر توڑ دی تھی۔"

نیا نے سر جھکا لیا۔ امر درست کہہ رہا تھا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ کوئی آئیڈیا سوچنا اور کچھ کرنا ہوگا۔ فلم کو غیر معمولی پبلسٹی ملنی چاہئے۔

پارٹی ختم ہوتے ہوتے نیا کو اندازہ ہو گیا کہ جگدیش اسے دانستہ نظرانداز کر رہا ہے۔ وہ مسکرا دی۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن اسے یقین بھی ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ایک ہفتے بعد جگدیش نے ایک ساتھ چار فلمیں شروع کرنے کا اعلان کیا۔ ایک کلہدایت کار امرجیت تھا اور دوسری فلم نرتکی کے ڈائریکٹر آکاش ورما کو ڈائریکٹ کرنا تھی۔ نیا کو حیرت ہوئی کہ اسے ان میں سے ایک فلم بھی نہیں ملی۔ اس بات سے اسے دھچکا لگا لیکن وہ اسے زیادہ اہمیت اس لئے نہ دے سکی کہ اس کے سر پر نرتکی کی پبلسٹی کا بوجھ تھا۔

بالآخر اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔

○☆○

انور کو امریکا گئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔

آذر اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھا جام ٹے ناب سے شغل کر رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ پچھلے دو ماہ سے وہ کوئی کام بھی نہیں کر سکا تھا۔ طبیعت اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ بے زاری اس قدر

تھی کہ لطف و کیف ایک ایسی لفظی ترکیب بن کر رہ گیا تھا' جس کا اس سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔

اس کیفیت میں وہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بہت سکون سے' سرشاری کے عالم میں کام کرنے کا عادی تھا۔ ایسے میں اس کی رگوں میں جیسے خون کی جگہ سرور و نشاط رقصاں ہوتے تھے اور پھر کام کرتے ہوئے اسے گرد و پیش کا احساس بھی نہیں رہتا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور جام خالی کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ یہ جنگ تو بہت طویل ہو گئی۔ اس نے آزردگی سے سوچا۔ اور اس میں اپنے جیتنے کا تو کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

اسے وہ دن یاد تھا' جب انور نے اس کے زخم محرومی کو کریدا تھا۔ جیسے بلاؤں کا بکس کھول دیا تھا۔ اس کی خوبصورت تنہائی مجروح ہو گئی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے ماضی کو دہرانے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہ ماضی بھیانک تھا کہ وہ اپنے تمام مصائب' تمام محرومیوں کو یاد کرے۔ اور اس نے پوری قوت سے مزاحمت کی تھی لیکن اس مزاحمت کے نتیجے میں وہ سکون سے محروم ہو گیا تھا۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام کرنے کی خوشی اس سے چھن گئی تھی۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو سراسر خسارے کا سودا ہے۔

وہ بہت ضدی تھا۔ انور نے جانے سے ایک دن پہلے اسے ضد چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے اس مشورے کو در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ زندگی میں جب بھی اس نے ضد کی تھی' پوری ضرور کی تھی لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ہار ماننا ہو گی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے پُرسکون نیند کا تصور کیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نیند میں کیسی لذت ہوتی ہے اور اب پچھلے دو ماہ سے وہ نہ صرف اس لذت سے محروم تھا بلکہ بے خوابی کی اذیت بھگت رہا تھا۔

بس بہت ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی آمادگی ابھری۔ "میں ہار گیا۔" وہ بڑبڑایا۔ "بس مجھے میری نیند اور میری تنہائی کی حسین محفلیں لوٹا دے اے وقت' مجھے تجھ سے کچھ نہیں چاہئے۔ بس اتنا کر دے۔ اس کے لئے وہ اذیتیں ایک بار اور سہی۔"

اس نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرا تھا پھر اچانک روشنی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے غلم سی چل پڑی۔

اب وہ اپنے آبائی مکان میں تھا!

○☆○

گھر میں بڑی گہما گہمی' بڑی رونق تھی!

اختر بھائی کی شادی ہو رہی تھی۔ ابا جان کی موت کے بعد وہ پہلی خوشی تھی' جو گھر میں آئی تھی ورنہ ہر طرف دکھ ہی دکھ تھا' پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔

آذر اپنے کمرے میں بیٹھا زہرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انگلینڈ سے آنے کے بعد جب اس نے پہلی بار زہرہ کو دیکھا تھا تو درحقیقت دیکھا نہیں تھا۔ اس وقت وہ ابا جان کے صدمے سے دوچار تھا۔ وہ زہرہ کی وجہ سے سنبھل تو گیا تھا لیکن زہرہ پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

اختر بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے زہرہ ایک ہفتہ پہلے آ گئی تھی۔ اس دوران آذر نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ اور اسے شاک لگا تھا۔ زہرہ بہت بدل گئی تھی۔ خوب صورت وہ اب بھی تھی مگر جس نے برسوں پہلے اسے دیکھا ہو' وہ فرق محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اب مرجھائی ہوئی لگتی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر آذر کو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی کسی سے اتنی محبت بھی کرے اور برسوں کے بعد دیکھنے پر اتنی بڑی تبدیلی بھی اسے نظر نہ آئے۔ یہ تو خود غرضی کا ثبوت ہے۔ اپنے دکھ میں گھر کر اس نے زہرہ کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔

شادی کے ہنگاموں میں مصروف زہرہ کو وہ مسلسل دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں شوخی تھی۔ وہ ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی لیکن اس بار آذر دھوکا نہ کھا سکا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ خوشی' خوش مزاجی اور شوخی محض ایک نقاب ہے۔ زہرہ خود کو خوش و خرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کوئی دکھ ہے' جسے وہ چھپا رہی ہے اور وہ جو دکھ بھی ہے' وہی اس کے مرجھانے کا سبب بھی ہے۔

آذر اسے دیکھتا' اس کے بارے میں سوچتا اور الجھتا رہا۔ سوال یہ ہے کہ دکھ ہے تو اسے چھپایا کیوں جا رہا ہے۔ آدمی کسی عام دکھ کا پردہ نہیں رکھتا۔ کوئی بہت ذاتی دکھ ہو سکتا ہے' جسے دو سروں سے چھپایا جائے اور اتنا ذاتی دکھ عام طور پر کسی محرومی کا ہی ہوتا ہے۔

لیکن زہرہ کو ایسا کون سا دکھ ہو سکتا ہے۔ کون سی محرومی ہے' جو اسے ستاتی ہے۔

انسان اپنے معاملے میں بڑا خوش فہم ہوتا ہے۔ بہت محبوب لوگوں کے دکھ میں بھی اپنے لئے آسائش کا پہلو تلاش کرتا ہے۔ آذر نے بھی یہی کیا۔ اس نے سوچا' کہیں زہرہ کے دکھ کا سبب میں تو نہیں۔ کہیں یہ مجھ سے دوری کا۔ مجھ سے محرومی کا تو دکھ نہیں؟

اور جیسے جیسے وہ اس امکان پر سوچتا رہا' اسے یقین ہوتا گیا کہ یہی بات ہے۔ محبت۔ اور سچی محبت خواہ اس کی اساس جسم پر ہو' اتنی بے اثر نہیں ہوتی کہ اس کی آنچ دوسرے فریق تک نہ پہنچے۔

اس پختہ یقین کے ساتھ اس نے فیصلہ کیا کہ اختر بھائی کی برات واپس آنے کے بعد زہرہ سے بات کرے گا۔

وہ اختر بھائی کا شہ بالا بنا لیکن پوری تقریب میں وہ کھویا کھویا سا رہا۔ وہ زہرہ کے منہ سے اپنی محبت کا اعتراف سننے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا اور وہ بے تابی اس نوجوان کی سی تھی' جسے پہلی بار محبت ہوئی ہو۔

نکاح اور رخصتی کی پوری تقریب اس کے لئے خواب کی طرح

تھی۔ وہ تو بس خواب کے بعد آنکھ کھلنے کا منتظر تھا۔

برات واپس آگئی۔ رسموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر دلہا اور دلہن کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رونقیں ختم ہو گئیں۔ ہنگامہ تھم گیا۔ جیسے اچانک رات ہو گئی ہو۔ ہر طرف سکوت چھا گیا اور وہ سکوت بتا رہا تھا کہ اس رات کی صبح بہت دیر سے ہوگی۔

وہ کچھ دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ احتیاطاً سکوت کے اور گہرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دل اس عاشق کے دل کی طرح سینے میں رقص کر رہا تھا' جو پہلی بار اپنے محبوب سے ملاقات کا... وصل کا منتظر ہو۔

اسی کیفیت میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ گھر میں نہ کوئی چاپ تھی نہ سرگوشی۔ لگتا تھا' رات نے بھی سانسیں روک لی ہیں۔ بالآخر وہ اٹھا اور دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ زہرہ کے کمرے کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ فاصلہ دو قدم بھی نہیں تھا لیکن آج پہلی بار اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ زہرہ کے کمرے کے دروازے پر وہ چند لمحے جھجکتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ دستک سے کوئی اور نہ جاگ جائے اور بغیر دستک کے وہ کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

جھجکتے جھجکتے اس نے دروازے پر ناخنوں سے بہت آہستگی سے دستک دی۔ اس دستک کی آواز خود اس نے بھی مشکل سے سنی۔ اس نے سوچا' اس دستک کا تو جواب نہیں مل سکتا۔

یہ سب ایک ثانیے کی بات تھی۔ وہ دوبارہ دستک دینے ہی والا تھا کہ اندر سے زہرہ نے کہا "کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

"زہرہ آپا' یہ میں ہوں آذر۔"

"آذی" لہجے میں حیرانی تھی۔ "آجاؤ ننھے منے۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ زہرہ بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے آثار بھی نہیں تھے اسی لئے اس نے ہلکی سی دستک پر بھی جواب دے دیا تھا۔

آذر کے دل میں خوش فہمی اور زور پکڑ گئی۔ اتنی مصروفیت اور ہنگامے کے بعد وہی جاگ سکتے ہیں' جو فرقت زدہ اور مجبور ہوں۔ اس نے سوچا... اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ بات حقیقت سے کس قدر قریب' لیکن درحقیقت اس کی سوچ سے بہت بڑی ہے۔ وہ ہجر و فراق تو عمر بھر کا تھا' جو زہرہ کو جگا رہا تھا۔

"کیا بات ہے آذی۔ نیند نہیں آرہی ہے؟" زہرہ نے شفقت سے پوچھا۔

"نہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ بھی جاگ رہی ہیں" آذر نے کہا۔

"کیوں' میں نہیں جاگ سکتی" زہرہ نے شوخی سے کہا لیکن اس شوخی کی تہ میں واضح دکھ تھا "تمہاری نیند اڑ سکتی ہے تو میری بھی اڑ سکتی ہے۔"

"میری نیند تو یہاں آنے کے بعد مستقل طور پر اڑ گئی ہے۔ ایک سال ہو گیا۔"

"صرف ایک سال" زہرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا "یہاں تو صدیوں سے نیند اڑی ہوئی ہے۔"

آذر کا دل سینے میں اس زور سے دھڑکا کہ اس کا وجود دل کرہ گیا۔ منہ زور جذبے ایسے امنڈے کہ اسے خود کو روکنا مشکل ہو گیا۔ گھبرا کر اس نے شوخی کا سہارا لیا "کیوں زہرہ... آپا۔ کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی؟"

"محبت اور نفرت' دونوں کی تاثیر ایک سی ہوتی ہے" زہرہ کا لہجہ عجیب سا تھا "فرق صرف اذیت کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ ہوتی ہے' جس میں ہلکی ہلکی تڑپ اور اذیت میں بھی لذت ہوتی ہے۔ دوسری جہنم کی آگ کی طرح جھلساتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے محبت ہی کا انتخاب کیا ہوگا۔"

"انتخاب کا موقع کہاں ملتا ہے۔ یہ تو رزق کی طرح ہے... نصیب اپنا اپنا۔"

آذر کی دھڑکنوں کی لے بدل گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں زہرہ کو NUDE تصویر کا علم تو نہیں۔ اس نے سوچا۔ ورنہ نفرت کا اور کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا "زہرہ... آپا' نفرت تو بہت بری چیز ہے۔ آپ تو کسی سے نفرت نہیں کر سکتیں... کسی سے بھی نہیں۔"

"یہ بے اختیار جذبہ ہے" زہرہ نے سرد آہ بھر کے کہا "ان پر اختیار کہاں ہوتا ہے۔"

اب وہ تجسس آذر کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ تو بس یہ جاننا تھا کہ زہرہ کے پاس جو بھی جذبہ ہے' بس اس کے لئے ہے "آپا... آپ نفرت کرتی ہیں؟"

"ہاں آذی' ننھے منے بچے" زہرہ نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

"آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں؟" آذر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

اس کے لفظوں نے زہرہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا "تم سے... نفرت! یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

دل میں آس کا دیا سا جلنے لگا "میں... میں بہت برا ہوں نا... اس لئے۔"

"ارے نہیں ننھے منے' میں بھلا تم سے نفرت کر سکتی ہوں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" زہرہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

"تو پھر کس سے نفرت ہے آپ کو؟"

زہرہ جیسے اچانک ہوش میں آگئی "یہ میں نے کب کہا" وہ گڑبڑا کر بولی "مجھے کسی سے نفرت نہیں۔"

"تو اتنی دیر سے خواہ مخواہ نفرت کی بات کئے جا رہی ہیں۔ سچ سچ بتائیں' کس سے نفرت ہے آپ کو؟"

"کسی سے بھی نہیں" زہرہ نے کہا پھر بے بسی سے بولی "مجھے

نفرت ہے اپنے نصیب سے" اچانک اس نے بات بدلی "یہ تو بتاؤ' تم اس وقت کیوں آئے ہو؟"

"آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

"اتنی رات کو! جاؤ' صبح پوچھ لینا۔"

"نہیں زہرہ۔ آپا۔ وہ بات اسی وقت کی جاسکتی ہے۔"

"تم سچ مچ پگلے ہو آذی۔ اچھا۔ پوچھو۔"

"زہرہ۔ آپا' آپ خوش نہیں ہیں نا؟"

زہرہ کا چہرہ فق ہوگیا "یہ کس نے کہا تم سے؟"

"آپ کے چہرے نے یہ بات تو آپ کے پورے وجود پر لکھی ہے۔ آپ کا ہر انداز یہ بات کہتا ہے" آذر نے اعتماد سے کہا۔ "چھپانے کی کوشش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ چھپانے میں کامیاب بھی ہوگئیں۔"

"وہم ہے تمہارا۔ کسی اور نے تو کبھی نہیں کہی یہ بات۔"

"مجھ میں اور کسی اور میں بہت فرق ہے۔ میری نگاہ اور طرح کی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میری نظر کی بینائی بھی ڈھونڈ لیتی ہے اور اسے ظاہر میں چھپی اصلیت بھی نظر آجاتی ہے" آذر کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

زہرہ کا چہرہ تمتما اٹھا "فضول باتیں مت کرو" اس نے جھنجلا کر کہا "میں ناخوش نہیں ہوں۔"

"آپ اپنی شادی سے۔ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

اس بار زہرہ کا چہرہ یوں زرد ہوا' جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ "ایسی باتیں مت کرو آذی۔"

اس کے چہرے نے' اس کے کمزور لہجے نے آذر کے دل میں پھر خوش فہمی جگادی۔ زہرہ شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے تو اسی لئے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے "اب میں بچہ نہیں ہوں زہرہ" اس نے پہلی بار حد درجہ اعتماد کا مظاہرہ کیا "میں تمہیں تمہارے شوہر سے رہائی دلواؤں گا۔ اب مجھے تم سے دور کوئی نہیں کرسکتا۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا" زہرہ اچانک بپھر گئی "یہ کیا بکواس کررہے ہو۔ کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔ بہت بڑے ہوگئے ہو۔"

اس کے یوں پھٹ پڑنے سے آذر کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔ "دیکھو زہرہ۔ تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس محبت کو چھپا کر' گھل گھل کر جینے کا کیا فائدہ۔ جب کہ بات کچھ ایسی مشکل بھی نہیں۔"

"تم سچ مچ پاگل ہوگئے ہو" زہرہ نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "ننھے منے بچے' خود کو بڑا سمجھتے سمجھتے کیسی خطرناک غلط فہمیاں پال لی ہیں تم نے۔"

"تم کسے بہلانے کی کوشش کررہی ہو زہرہ؟ مجھے یا خود کو" آذر نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ممکن ہے' میری محبت کو تم خود سے بھی چھپاتی رہی ہو لیکن میں حقیقت سے واقف ہوں۔ اب میں یہ سب کچھ۔۔۔"

"تمہیں کچھ بھی پتا نہیں" زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔۔۔ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ میں کس آگ میں جل رہی ہوں۔"

"میں سب سمجھتا اور جانتا ہوں زہرہ" آذر نے کہا اور زہرہ کا ہاتھ پکڑلیا۔

زہرہ کا ردِعمل بلا دینے والا تھا۔ جیسے ہی آذر نے اس کا ہاتھ تھاما' زہرہ پر جیسے لرزہ چڑھ گیا۔ آذر اپنی بات بھول کر حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ یوں پوری جان سے کانپ رہی تھی' جیسے اپنے بدن پر اس کا اختیار ہی نہ ہو۔ یہ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اسے دھکیلنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا دوسرا آزاد ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر اسے ہٹانا چاہتی تھی لیکن لرزے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور پلکیں جھکنے لگی تھیں۔

"خدا کے لئے آذر۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔"

زہرہ سے کچھ کہا بھی نہیں جارہا تھا۔ وہ بس خدا کے لئے کی گردان کئے جارہی تھی۔ آذر کو اس پر بھی حیرت تھی کہ وہ اسے ننھے منے یا آذی کے بجائے آذر کہہ کر پکار رہی ہے۔

آذر اس کے ردِعمل کے طلسم میں ایسا اسیر ہوا کہ بت بن کر رہ گیا۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے کچھ نہ کیا تو زہرہ کو کچھ ہوجائے گا لیکن الجھن یہ تھی کہ اس طلسم کو توڑنے کے لئے وہ کیا کرسکتا ہے اور یہ ضروری تھا۔

جو کچھ کرنا چاہئے تھا' وہ آذر سے خود بخود سرزد ہوگیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور بے اختیار اس نے زہرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس کی گرفت اتنی سخت نہیں تھی لیکن اس گرفت سے آزاد ہوتے ہی زہرہ بستر پر گری۔ اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا لیکن لرزش کم ہوتی جارہی تھی۔

آذر حیرت سے کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی زہرہ کو لیکن در حیرت ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ اچانک زہرہ بھنچی بھنچی آواز میں بولنے لگی "آذر' خدا کے لئے' مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ مجھے نہ چھونا۔ کیوں میری اذیت بڑھاتے ہو۔ مجھے نہ چھونا آذر۔۔۔"

وہ یہی کچھ دہرائے جارہی تھی۔ اس کا لہجہ التجائیہ تھا لیکن لفظ کچھ اور کہہ رہے تھے اور انداز اور لہجہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ وہ اسے چھونے کو' ہاتھ لگانے کو منع کررہی تھی لیکن آواز اور لہجے میں بھکاریوں کی سی پکار تھی۔۔۔ اپیل تھی کہ وہ اسے چھوئے۔۔۔ ہاتھ لگائے اور اس کا جسم بھی یہی پکار رہا تھا۔ وہ پکار بالکل واضح تھی۔

ابتدائی لمحے میں زہرہ کے ردِعمل کو دیکھ کر آذر کے دل میں جس اندیشے نے سر اٹھایا تھا' وہ اس پکار کے بعد حقیقت میں بدل گیا۔ سب کچھ واضح ہوکر رہ گیا۔ وہ ایک مصور تھا۔ اس کے پاس زرخیز تخیل تھا۔ اور اس طرح کے معاملات کی اسے قدرتی طور پر

سمجھ تھی۔

اس نے لفظوں اور لہجے کے اس نفاق کو محسوس کرنے کے بعد اس زمین کا تصور کیا' جس پر برسوں سے ابر رحمت کی عنایت نہیں ہوئی ہو۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایسی زمین پر پانی کے چند بھولے بھٹکے چھینٹے کیا قیامت جگائیں گے۔ زمین کیسے چٹخے گی۔ گرم ہوا کے بھبکے اٹھیں گے۔ جیسے جہنم دہک اٹھا ہو۔

اس نے زہرہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی وہی لفظ دہرا رہی تھی۔۔۔ آذر مجھے نہ چھونا۔ ہاتھ مت لگانا مجھے۔۔۔۔ لیکن آواز دھیمی ہوتے ہوتے سرگوشی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مگر لہجے میں چھونے کی پکار اب اتنی ہی زیادہ بلند آہنگ ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی ہوش و حواس میں نہیں تھی۔

"میں سمجھ گیا۔ پوری طرح سمجھ گیا" آذر نے خود کلامی کی۔

اور وہ واقعی سمجھ گیا تھا۔ زرخیز زمین نظرانداز کر دی جائے تو اس میں خود رو جھاڑیاں اگنے لگتی ہیں۔ کانٹے نمو پاتے ہیں۔ پھول تو جب کھلیں گے نا جب نگہداشت کرنے والے ہاتھ موجود ہوں۔ پھل تو جب آئیں گے' جب کوئی پھل دار درخت کے بیج ڈالے اور پانی دے۔ فصل کے لئے تو بوائی ضروری ہوتی ہے۔ نگہداشت نہ ملے تو زرخیز زمین بھی پھول کی طرح مرجھا جاتی ہے۔

○☆○

زہرہ کی لرزش اور سرگوشی دونوں معدوم ہو چکی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ آذر" اس نے کہا۔

آذر نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں "زہرہ۔۔۔ میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں" وہ بولا۔

زہرہ گھبرا گئی "کیا سمجھ گئے ہو؟"

"یہی کہ تمہارا شوہر۔۔۔۔"

زہرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سخت لہجے میں بولی۔ "بس اب ایک لفظ نہ کہنا۔"

"مجھے نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی تم سے تصدیق کرانا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔"

زہرہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔

"اب تو مجھے بس علاج کرنا ہے تمہارا اور وہ کچھ مشکل نہیں۔"

"کیا کرو گے تم؟" زہرہ کے لہجے میں بھی خوف تھا۔

"آپریشن" آذر نے کہا "پہلے تمہیں تمہارے شوہر سے رہائی دلاؤں گا پھر تمہارے ہر دکھ اور ہر محرومی کی تلافی کر دوں گا۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے آذر۔"

"مجھے ایسا کرنا ہوگا زہرہ۔ ابا جان زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے" اس کا لہجہ نرم ہو گیا "میں تمہیں بہت خوشیاں دوں گا زہرہ۔"

"تم نادان ہو۔ نہیں سمجھتے کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں۔ نہیں سمجھتے کہ تم میرے لئے ہمیشہ ننھے منے رہو گے۔ میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے۔"

"دیکھوں گا میں" آذر کے لہجے میں چیلنج تھا۔

زہرہ نے اسے نظرانداز کر دیا "اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ تم مداخلت کر کے میری گیارہ برس کی تپسیا غارت کرو گے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"زہرہ' تم سمجھ نہیں رہی ہو مجھے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں' ذمے دار آدمی ہوں۔ اپنے گھر اور گھر کے لوگوں کے مفادات میری ذمے داری ہیں۔" وہ کہتے کہتے رکا "اور تم یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی غرض کے تحت ایسا کروں گا۔ میری قسمت چاہے نہ سنورے۔ میں تمہاری قسمت سنوارنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

زہرہ نے اسے غور سے دیکھا اور سمجھ لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' کر بھی گزرے گا "تم نہیں مانو گے؟"

"یہ ناممکن ہے۔ میں ضمیر پر بوجھ رکھنے کا قائل نہیں۔"

"تو پھر سن لو کہ اس کے نتائج کے ذمے دار بھی تم ہو گے اور نتائج جو ہوں گے' تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"میں اس معاملے میں نتائج کی پروا نہیں کروں گا۔ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں اسے جاری رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا" آذر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "اب تم سکون سے سو جاؤ۔ شب بخیر۔"

وہ کمرے سے نکلا تو صبح ہو چکی تھی۔ آذر کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ قیامت کے دن کی صبح ہے۔ وہ سویا اور دوپہر کو جاگا۔ زہرہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ آذر نے سوچا کہ وہ آج ہی زہرہ کے سلسلے میں اختر بھائی سے بات کرے گا اور پھر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ یہ مسئلہ جتنی جلدی حل ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔

لیکن اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مسئلہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ شام کو زہرہ کی موت کی خبر آگئی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔

○☆○

وہ اپنے اسٹوڈیو میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے' جیسے اندر سینے میں کوئی سیلاب آیا ہوا ہو۔

وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا اسی لئے اس نے اتنی طویل اور اذیت ناک جنگ لڑی تھی۔ زہرہ کی موت ۳۴ سال پہلے جتنا بڑا صدمہ تھی' آج بھی اتنا ہی بڑا صدمہ تھی۔ وہ اس تکلیف دہ حقیقت کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو عمر بھر اس سے نظریں چراتا رہا تھا۔ اس کی زہرہ مری نہیں تھی۔ وہ تو اس کی تنہائی کی محفلوں میں راج نرتکی کے روپ میں آتی تھی۔

لیکن آج ماضی کو دہرانے کے نتیجے میں وہ حقیقت پوری طرح سامنے آگئی تھی' جس سے اس نے عمر بھر نظریں چرائی تھیں۔ وہ

حقیقت یہ تھی کہ وہ زہرہ کا قاتل تھا۔

اس رات اس نے زہرہ سے کہا تھا کہ وہ ضمیر پر بوجھ رکھنے کا قائل نہیں اور اسے نتائج کی بھی پروا نہیں۔۔۔ اس کے بعد وہ یہ سوچنے سے بھی بچتا رہا تھا کہ یہ کہہ کر اس نے زہرہ کے لئے زندگی کے تمام راستے بند کردیے تھے۔ صرف ایک راستہ کھلا چھوڑا تھا۔۔۔ موت کا! اور آج یہ بات اسے شعوری طور پر تسلیم کرنی پڑ گئی تھی۔

آنسو اب بھی بہے جارہے تھے!

زہرہ کی موت کے بعد راز راز ہی رہ گیا تھا۔ صرف وہ تھا جو حقیقت جانتا تھا اور اس کے بعد اس پر بہت کچھ کھلا تھا۔ یہ ثابت ہوگیا تھا کہ زہرہ بے حد عظیم عورت تھی۔ اس کا شوہر اس ڈر سے اسے میکے نہیں جانے دیتا تھا کہ وہ اس کی پول نہ کھول دے۔ لیکن زہرہ نے اس کے راز کو کھلنے کے بعد بھی نہیں کھلنے دیا تھا اور جان سے گزر گئی تھی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیسا بدنصیب انسان ہے کہ جسے اس نے جان سے زیادہ چاہا' اس کی جان لے لی۔

آنسو تھم گئے تھے!

اس نے اٹھ کر اپنے لئے ایک جام بنایا۔ جام سے ایک گھونٹ لے کر وہ بڑبڑایا "اسی وجہ سے تو میں ماضی سے نظریں چرا رہا تھا۔ اب یہ زہر پینے میں اتار لیا تو ماضی سے ڈر کیسا۔ چلو آج یہ قرض بھی اتار دیں۔"

اس بار وہ خود ماضی کی طرف لپکا تھا۔

○☆○

"امی۔۔۔ آذر فنکار ہے' تصویریں بناتا ہے" اختر بھائی امی سے کہہ رہے تھے "اس کی غیر معمولی حسین ہونی چاہئے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں" امی نے جواب دیا۔

امی اور اختر بھائی کی یہ گفتگو آذر کی شادی کے سلسلے میں ہورہی تھی۔

اور جب آذر نے حجلۂ عروسی میں پہلی بار شمر کا گھونگھٹ اٹھایا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ نہیں' وہ تو کسی ماہر سنگ تراش کا شہ پارہ تھی۔۔۔ حسنِ تناسب کا شاہ کار "سبحان اللہ۔ امی نے تو کمال کردیا" اس نے بے ساختہ کہا۔

وہ شمر کے حسن کا ایسا اسیر ہوا کہ اپنے فن کے سوا سب کچھ بھول گیا۔ پانچ سال ایسے گزرے' جیسے کوئی حسین خواب پل بھر میں ختم ہوجاتا ہے۔

عورتیں شادی کے بعد خود سے بے نیاز ہوجاتی ہیں۔ شمر نے اس کی وارفتگی اور اس کا عشق دیکھا لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ اس عشق کی بنیاد ایک فانی اور عارضی چیز پر ہے۔ اگر اس نے سمجھا ہوتا تو اس عارضی چیز کو سنبھال کر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہوتی لیکن وہ تو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھی۔

ایک دن آذر نے اسے ٹوک دیا "اپنا خیال رکھو شمر جان۔ تمہاری کمر پھیل رہی ہے۔"

"ہٹیں۔ کیسی بات کرتے ہیں۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" آذر نے سنجیدگی سے کہا "بھدی ہونا شروع ہوگئیں تو پھر قابو نہیں پاسکو گی۔ مٹاپا بڑی خطرناک چیز ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"احتیاط۔ کھانے پینے میں بھی اور ہر وقت بیٹھی نہ رہا کرو۔"

شمر چڑ گئی "آپ کے خیال میں میں خالی بیٹھی رہتی ہوں۔"

"تمہارے ہی بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

لیکن شمر کی سمجھ میں نہیں آیا اور جب وہ سمجھی تو دیر بہت ہوچکی تھی۔

شمر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ پانچ سال آذر کی زندگی کے سب سے خوب صورت دن تھے۔ اس عرصے میں وہ تین بیٹوں کا باپ بنا۔ اس عرصے میں اس کے لئے آسودگی ہی آسودگی تھی۔ لگتا تھا' ہر محرومی کی تلافی ہوگئی ہے لیکن فن کار کے فن کو جلا محرومیوں ہی سے ملتی ہے۔ اسی لئے قدرت اس کے لئے بطورِ خاص محرومیوں کا اہتمام کرتی ہے۔

مٹاپا وہ چیز ہے' جو ایک بار آجائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ شمر پر آذر کی تنبیہہ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں عورتیں عام طور پر خود سے بے خبر رہتی تھیں۔ شمر کو بھی اپنے مٹاپے کا پتا نہیں چلا۔ شاید پتا چلتا بھی نہیں مگر آذر کی بے التفاتی نے اسے اس کا احساس دلادیا لیکن صرف احساس سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ خود کو بھدے پن سے محفوظ رکھ سکی اور نہ ہی اس کے بعد اسے کبھی آذر کی توجہ ملی۔ اس کی شکایت دل میں لئے وہ دنیا سے رخصت ہوگئی مگر درمیان میں شوہر کی بے التفاتی کے اڑتیس اذیت ناک برس اسے گزارنا پڑے۔

آذر نازک طبع تھا' پیدائشی فنکار تھا۔ بھدا پن اس کی برداشت سے باہر تھا۔ شمر کی خوش بدنی کے پانچ برسوں میں اسے زہرہ کبھی یاد نہیں آئی تھی لیکن جب شمر بھدی ہوگئی تو زخم محرومی پھر سے ہرا ہوگیا۔ وہ پھر سے زہرہ کے لئے تڑپنے لگا۔ طبعاً آوارہ نہیں تھا مگر ایک خوب صورت عورت کے قرب سے محرومی اس کے لئے ایک بڑی محرومی تھی۔ اس محرومی کا ازالہ بھی کرنا تھا۔ یوں اس نے اپنی تنہائی کی محفلیں سجانا شروع کردیں۔

ہر چیز کا کوئی مثبت رخ بھی ہوتا ہے۔ شمر کا بھدا ہوجانا اور اس کی طرف سے آذر کا دل بھر جانا۔۔۔ اس کا فائدہ اس کے فن کو پہنچا۔ اس نے متناسب جسم کی عورتوں کو حالتِ رقص میں پینٹ کرنا شروع کردیا۔ یہ اس کے فن کے بلندی کی طرف سفر کا آغاز تھا۔ یہ

سفر کبھی نہیں رکا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

اسے مستقل مزاجی کہئے' حسن پرستی کہئے یا خواہ احساس کہ شمسہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کبھی شمسہ کے پاس نہیں گیا۔ اس نے شمسہ کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی لیکن ایک بار کے سوا اس نے کبھی شمسہ کو اپنی قربت نہیں دی اور وہ جو قربت کا ایک موقع تھا' اس میں بھی اپنی دانست میں وہ شمسہ کے نہیں' زہرہ کے پاس تھا۔

اس نے آبائی مکان میں بھی اپنے اسٹوڈیو کو گھر سے الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ شمسہ سے دل پھر جانے کے بعد وہ زیادہ وقت اپنے اسٹوڈیو ہی میں گزارتا۔ کبھی کبھی تو وہ کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ دبلی آجانے کے بعد بھی یہی سلسلہ رہا۔ اور یہ بات بھی دبلی ہی کی ہے۔

ایک دن اس کی تنہائی کی محفل سجی ہوئی تھی۔ اس روز اس نے معمول سے زیادہ ہی پی لی تھی اس لئے زیادہ ترنگ میں تھا اور کچھ محرومی کا احساس بھی اس روز زیادہ تھا ورنہ جسمانی تقاضوں سے تو سمجھوتا کرنا اس نے بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔

راج نرتکی کے روپ میں زہرہ اس کے سامنے رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اور وہ خود زیادہ ہی وارفتگی دکھا رہا تھا۔ اچانک زہرہ ناچتے ناچتے اس کے بہت قریب آئی اور اس پر جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولی "آج رات جب سب سو جائیں گے تو میں تمہاری خواب گاہ میں آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔"

آذر کو اب بھی یاد تھا۔ یہ ۷۳ء کی بات ہے۔ وہ جولائی کا مہینہ تھا۔ اپنی وہ سرشاری بھی وہ کبھی نہیں بھول سکا۔ ۵۴ سال کی عمر میں وہ نوجوانوں کی سی بے تابی سے دوچار تھا۔ وہ خواہش سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اپنی اندر سبھا ختم ہو جانے کے بعد عام طور پر وہ کچھ دیر کام کرتا تھا اور پھر سکون سے سو جاتا تھا۔ اس رات ملن کے وعدے نے اسے ایسا بے تاب کیا کہ اس کی محفل معمول سے جلدی ختم ہو گئی پھر وہ کام کرنے بیٹھا تو اس سے کام نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پینے بیٹھ گیا۔ نشہ گہرا ہونے لگا تو وہ اسٹوڈیو میں اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

خواب گاہ میں بھی وہ زہرہ کا انتظار کرتا اور پیتا رہا۔ دیر ہو گئی۔ بہت دیر ہو گئی اور زہرہ وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ مزید تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اس کے نشے میں ڈوبے ہوئے ذہن نے اسے یہ نکتہ سمجھایا کہ زہرہ کا مطلب اسٹوڈیو والی خواب گاہ نہیں بلکہ اس کی اصلی خواب گاہ تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھر کی طرف لپکا۔ اس وقت تک رات بہت ہو چکی تھی۔

گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا خواب گاہ میں گیا۔ وہاں وعدے کے مطابق زہرہ موجود تھی۔ وہ اس کی قربت میں کھو گیا۔

آذر کو اور پھر اس کی وارفتگی کو دیکھ کر شمسہ کو لگا کہ ایک بار پھر اس کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ اس کی تمام دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ اس نے بڑھ چڑھ کر آذر کی پذیرائی کی۔ بیس سال کی خزاں کے بعد اس کے آنگن میں بہار آئی تھی۔ اس پر خود بھی وارفتگی طاری ہو گئی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ آذر اسے زہرہ کے نام سے پکار رہا ہے۔ وہ تو یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ اسے بیس سال بعد کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔ وہ سکون سے بے سدھ ہو کر سو گئی۔

اس رات آذر بھی بڑی طمانیت سے سویا لیکن صبح بیدار ہونے کے بعد اپنے پہلو میں شمسہ کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔ مگر اس کے ذہن نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ رات اس کے پاس زہرہ نہیں شمسہ تھی۔

مئی ۷۴ء کے پہلے ہفتے میں انور کی ولادت ہوئی۔ آذر کو قدرتی طور پر اس سے بڑی محبت تھی۔ اس کے خیال میں وہ اس کے اور زہرہ کے تعلق کی واحد نشانی تھا۔ اس نے اپنا ہر خواب اسے سونپ دیا۔

شمسہ کو بہت دنوں کے بعد یقین آیا کہ خوش قسمتی نے وہ ایک خوب صورت رات اتفاق سے اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اس کے بعد اس طرح کی کوئی خوشی اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ تین جوان بیٹوں کی ایک حادثے میں موت کا صدمہ اس نے اکیلے سہا۔

آذر کو اعتراف تھا کہ قدرت نے اسے بھائی کے روپ میں

بہت بڑی نعمت عطا فرمائی تھی ورنہ خود اسے زندگی کے عملی پہلو اور مالی معاملات کی تمیز تھی ہی نہیں' اختر بھائی شروع ہی سے جائداد کے معاملات سنبھالتے رہے۔ انہوں نے اسے ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا۔ انہوں نے دورِ جدید کے تقاضے جلد ہی سمجھ لئے۔ زراعت کو چھوڑ کر وہ صنعت کے میدان میں اترے۔ اس کے نتیجے میں دولت اور بڑھی۔ یہ سب کچھ وہ بآسانی ہڑپ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس طرح کا انتظام کیا کہ آذر مستقبل کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو گیا۔ اسے دہلی میں بہت اچھا گھر اور اسٹوڈیو بھی مل گیا اور ہر ماہ ایک خطیر رقم کے حصول کی ضمانت بھی۔ آذر کو اپنی تصویروں کی فروخت سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا' وہ اس کے علاوہ تھا۔ بہرحال اگر وہ نہ ہوتا تو بھی اسے کبھی پریشان نہ ہونا پڑتا۔ وہ اس بھائی کو آخری سانس تک دعا ہی دے سکتا تھا' جس نے اپنے فنکار بھائی کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آذر جانتا تھا کہ اس کے فنی قامت کی بلندی میں اختر بھائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

○☆○

آذر نے ایک گہری سانس لی۔ وہ ایسی تھکن محسوس کر رہا تھا' جیسے میلوں پیدل دوڑا ہو لیکن ایک اطمینان بھی تھا۔ وہ اس سخت مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اب شاید باقی عمر... جتنی بھی ہو' سکون سے گزر جائے گی۔

اس نے جام خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ اس نے ملازمہ سلطانہ کو کھانا بیڈ روم میں ہی لانے کی ہدایت کی۔ کھانے کے بعد اس نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کی۔ حالانکہ تھکن کا احساس بہت شدید تھا۔ خواب گاہ میں واپس آ کر وہ بستر پر لیٹا' اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سونے والا ہے۔ چند لمحوں کے اندر وہ سو چکا تھا۔

بہت عرصے کے بعد وہ نیند کی دوا کے بغیر سویا تھا۔

○☆○

فلم نرتکی کی پبلسٹی بہت مختلف اور منفرد انداز میں ہوئی تھی۔ فلم کی ریلیز سے ایک ہفتہ پہلے سے ایڈوانس بکنگ شروع کر دی گئی۔ اس سلسلے میں جو اشتہار اخبارات میں شائع ہوا' اس کے مطابق فلم کی ریلیز سے ایک دن پہلے تک ایڈوانس بکنگ کرانے والوں کو فلم کی ہیروئن نیا کے آٹوگراف کے ساتھ اس کی ایک بڑی کلر تصویر کا تحفہ ملنا تھا۔ یہ آئیڈیا نیا کا ہی تھا۔

آئیڈیا بے حد کامیاب ثابت ہوا لیکن نیا کی مصیبت ہو گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں تصویروں پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ پہلے ہی دن یہ نوبت آ گئی کہ تصویروں کی پشت پر اس کے آٹوگراف پرنٹ کرانے پڑ گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں تصویریں بنوانا ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔

بہرحال فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس کی کامیابی یقینی ہو گئی۔ بمبئی کے مین سینما پر فلم کی ریلیز سے ایک دن پہلے تک آٹھ ہفتے کی بکنگ ہو چکی تھی۔ یہ کسی بھی فلم کی ایڈوانس بکنگ کا ایک نیا ریکارڈ تھا۔ فلم پورے ملک میں بیک وقت ریلیز ہو رہی تھی۔

اس دوران جگدیش والی بلی بھی تھیلے سے باہر آ چکی تھی۔ جگدیش ایک بار اس کے گھر آیا تھا اور اسے شادی کی پیشکش کی تھی۔

"آپ حیران ہوئی ہیں یہ سن کر؟" جگدیش نے اس سے پوچھا تھا۔

"جی نہیں لیکن یہ میرے لئے خلافِ توقع ضرور ہے" نیا نے شائستگی سے جواب دیا پھر پوچھا "آپ برا نہ مانیں تو میں یہ پوچھوں کہ یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"اس کے جواب میں مجھے ایک بہت تلخی پی بات کہنی پڑے گی جو میں کہنا نہیں چاہتا۔"

"آپ اظہارِ محبت کر رہے ہیں مجھ سے؟" نیا نے شوخی سے کہا۔

"جی ہاں اور یہ آپ کے لئے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں بلکہ آپ تو عادی ہوں گی اس کی۔"

"یہ تو ہے لیکن آپ کے معاملے میں مجھے حیرت ضرور ہے۔"

"کیوں؟ میں آپ کو محبت کا اہل نہیں معلوم ہوتا؟"

"یہ بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ چار فلمیں بنا رہے ہیں اور مجھے آپ نے ان میں سے ایک فلم کے لئے بھی سائن نہیں کیا۔"

"میں آپ کو زندگی بھر کے لئے اپنی شریک کی حیثیت سے سائن کرنا چاہتا ہوں اور میں اپنی بیوی کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو سائن نہیں کیا۔ حالانکہ آپ میری کاروباری ضرورت بھی ہیں۔"

نیا مسکرا دی۔ اس کے پہلے تاثر کی تائید ہو رہی تھی۔ جگدیش چالاک آدمی تھا۔ وہ اس کا انٹرویو پڑھ چکا تھا... اور اب اپنی محبت کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ پابندی تو میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔" اس نے کہا۔

ایک لمحے کو جگدیش گڑبڑا گیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی شرط واپس لے لیتا لیکن اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ "دیکھیے' آپ کو فلموں میں کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں آپ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کروں گا۔ میں آپ کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں..."

"میں جانتی ہوں کہ دس بیس کروڑ کی آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں" نیا نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ فلم میں کام کرنا میری ضرورت نہیں' شوق ہے۔ اچھا رول ملے تو میں معاوضے کی بھی پروا نہیں کرتی۔ فلم میں جب تک ایک خاص مقام حاصل نہ کر لوں' میں اداکاری نہیں چھوڑوں گی۔"

"ایک بات صاف گوئی سے بتائیں" جگدیش نے کہا "آپ

مذہب کے فرق کی وجہ سے تو نہیں ہچکچا رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔" نیا مسکرائی۔ "فلم انڈسٹری کا اپنا ایک مذہب ہے۔ نہ یہاں کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔"

"پھر آپ چاہیں تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں جگدیش جی۔"

"پھر میں آپ کا انتظار کروں گا نیا" جگدیش نے اٹھتے ہوئے وقار سے کہا "میری محبت آپ کی منتظر رہے گی۔ کیریئر ختم کرنے کا فیصلہ کرتے وقت مجھے ذہن میں ضرور رکھئے گا۔ اس وقت میری محبت کی سچائی بھی ثابت ہو جائے گی۔"

نیا دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکی "ایک منٹ" وہ بولی۔ "میری ایک اور بات سن لیں۔ میں شادی دولت کی وجہ سے کبھی نہیں کروں گی۔ میں محبت کی شادی کی قائل ہوں۔ صرف آپ کی محبت شادی کے لئے کافی نہیں۔ یہ الگ بات کہ مجھے بھی آپ سے محبت ہو جائے۔ مگر فی الحال ایسا نہیں ہے۔"

جگدیش کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوئی پھر وہ بولا "مجھے آپ کی تو اچھی لگی ہیں کہ سب سے مختلف ہیں۔ آپ کی یہ صاف بات مجھے اچھی لگی ورنہ فلمی اداکاراؤں میں تو یہ خوبی ہوتی ہی نہیں۔ اچھا نیا، اجازت چاہتا ہوں۔"

نیا اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک مسکراتی رہی۔ جگدیش کی ہی اس کی شکست کا سبب بن گئی تھی لیکن اس نے اس کے بعد بھی جس وقار کا مظاہرہ کیا تھا، وہ متاثر کن تھا۔ اور اس نے ایک خطرناک وار بھی کیا تھا۔۔۔ مذہب کے حوالے سے۔ بھارتی فلم انڈسٹری میں مسلمانوں کو ہمیشہ بڑا مقام اور اہمیت حاصل رہی لیکن وہ خواہ اندر سے مذہبی ہی کیوں نہ ہوں، انہیں سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر جینا پڑا۔ نیا کو خوشی تھی کہ اس نے برجستہ درست جواب دیا ورنہ وہ ہندو کے تعصب سے خوب واقف تھی۔ اس وقت کی ایسی ویسی بات منہ سے نکل جاتی تو اسے جگدیش سے شرمندگی پڑتی ورنہ وہ اسے بلیک میل کرتا اور اس کا کیریئر تباہ

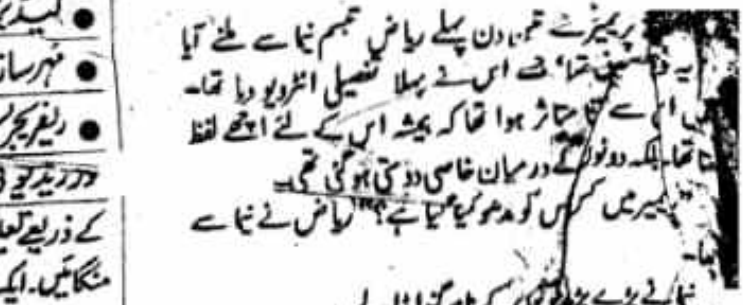

پریمیئر سے تین دن پہلے ریاض تبسم نیا سے ملنے آیا یہ وہ شخص تھا، جسے اس نے پہلا تفصیلی انٹرویو دیا تھا۔ اس سے نیا متاثر ہوا تھا کہ ہمیشہ اس کے لئے اچھے لفظ بولتا تھا۔ بلکہ دونوں کے درمیان خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

"پریمیئر میں کس کو مدعو کیا گیا ہے؟" ریاض نے نیا سے پوچھا۔

نیا نے بڑے بڑے لوگوں کے نام گنوا ڈالے۔

"تمہیں بھی کسی کو مدعو کرنے کا اختیار ہے؟" ریاض نے پوچھا۔ اب ان کے درمیان ایسی ہی بے تکلفی تھی۔

"اختیار تو ہے لیکن میں تمہارا نام مدعوئین کی فہرست میں دیکھ چکی ہوں۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں، جسے تمہاری فلم کے اس پریمیئر کی تقریب کا مہمانِ خصوصی ہونا چاہئے لیکن تم فلم والوں کے ساتھ مسئلہ ہی یہ ہے کہ تم لوگوں کو فلم کے سوا کچھ پتا نہیں ہوتا ورنہ مدعو کرنے والے اسے نہیں بھول سکتے تھے۔"

نیا کو اس شخص کی اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا، جو ریاض تبسم کے خیال میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت کا مستحق تھا "کون ہے وہ شخص؟" اس نے پوچھا۔

"بین الاقوامی شہرت رکھنے والا ایک مصور ہے۔ یہاں کوئی اسے جانتا بھی نہیں لیکن امریکا اور یورپ میں اس کا بڑا مقام ہے۔ وہاں اس کی تصویروں کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ وہاں اس کی تصویریں بہت مہنگے داموں بکتی ہیں۔"

امریکا کے حوالے پر نیا کی آنکھوں میں چمک ابھری پھر اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "ایک مصور اور میری فلم کے پریمیئر کا مہمانِ خصوصی! میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"اس کا مطلب ہے، تم واقعی اس سے ناواقف ہو۔"

"کچھ بتاؤ تو۔"

"وہ مصور رقص کہلاتا ہے۔ وہ رقص کرتی دیوداسیوں کا،

داخلے کے لئے خط لکھیں

خواتین و حضرات! ہم بذریعہ ڈاک

• انگلش لینگویج • پینٹنگ • فلاور میکنگ
• بیوٹیشن • فزیکل بیوٹی • انٹیریئر ڈیکوریشن
• لیڈیز ٹیلرنگ • کوکنگ بیکنگ
• مہر سازی • فوٹوگرافی • کمرشل آرٹ
• ریفریجریشن • میڈیکل ایڈ • اسکول ٹیچنگ

اور ریڈیو ٹی وی پر اردو میں باتصویر لیکچرز و کتب کے ذریعے تعلیم دیتے ہیں۔ داخلے کیلئے تفصیلات جوابی لفافے سے منگائیں۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔

اسلام آباد اکیڈمی

۲۵۱ سیکٹر آئی۔ ٹین۔ ون، اسلام آباد

نرتکیوں کا مصور ہے۔ اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں اس نے برسوں گزارے ہیں۔ صرف رقص کی خاطر ہندو دیو مالا کو وہ گھول کر پی گیا ہے۔ وہ رقص پر اور جسمانی حسنِ تناسب پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔" ریاض کے لہجے میں چیلنج آگیا "اب تم بتاؤ' تمہاری اس فلم کے پریمیر میں مہمانِ خصوصی کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص ہو سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" نیما بولی "پلیز۔ تم انہیں مدعو کرلو۔"

"یہ کام میرے بس کا نہیں" ریاض نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ تم خود دعوت نامہ لے کر جاؤ۔ وہ بہت نخریلے اور نازک طبع ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں جھڑک کر بھگا دیں لیکن میں بتا رہا ہوں' وہ شخص تمہاری اس فلم کو پروموٹ بھی کر سکتا ہے اور سنو۔ میں جانتا ہوں کہ نرتکی تمہاری فلم ہے۔ اس میں صرف اور صرف تمہارا پیسہ لگا ہے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو یہ آخری بات سن کر نیما کو شاک لگا ہوتا لیکن اس وقت وہ اس مصور کے بارے میں سوچ رہی تھی "نام کیا ہے ان کا؟" اس نے پوچھا۔

"آذر جمیل اور وہ دہلی میں رہتے ہیں" ریاض نے کہا اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا "یہ ان کا پتا ہے اور ہاں نیما' دیکھنے میں وہ ۶۰ سے زیادہ کے نہیں لگتے لیکن ان کی عمر ۹۰ کے لگ بھگ ہے۔"

"ٹھیک ہے ریاض' شکریہ۔ میں کوشش کروں گی کہ انہیں رضامند کرلوں۔"

ایک گھنٹے بعد نیما دہلی جانے والی فلائٹ پر تھی۔ رات اس نے ہوٹل میں گزاری۔

اگلے روز پریمیر شو کا دعوت نامہ لے کر وہ آذر کے گھر پہنچ گئی۔ آذر کی ملازمہ سے بات کرکے اسے اندازہ ہو گیا کہ ریاض واقعی آذر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ملازمہ اسے بھی ٹرخانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"دیکھیے بی بی۔ صاحب کسی سے نہیں ملتے۔ خواہ مخواہ مجھے ڈانٹ پڑ جائے گی۔"

"اچھا۔ تم جا کر اپنے صاحب کو بتا تو دو میرے بارے میں۔"

"کیا بتاؤں جی؟"

"کہنا' میں ایک مشہور رقاصہ ہوں اور ان سے ملنے کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔"

ملازمہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ نیما ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتی رہی۔ سادہ سی آرائش تھی اور آؤٹ آف ڈیٹ لگ رہی تھی۔

"بی بی۔ صاحب اس وقت کام میں مصروف ہیں۔ کہہ رہے ہیں پھر کسی وقت آنا" ملازمہ نے واپس آکر بتایا "اس وقت وہ اسٹوڈیو سے نہیں نکلیں گے۔"

"اسٹوڈیو کہاں ہے ان کا؟"

ملازمہ نے اندر کی طرف اشارہ کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسٹوڈیو میں جا کر مل لیتی ہوں" نیما نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صاحب ناراض ہوں گے۔ میری نوکری چلی جائے گی" ملازمہ نے احتجاج کیا۔

"نہیں جائے گی۔ اگر گئی تو میں اس سے زیادہ تنخواہ [illegible] رکھ لوں گی" نیما نے کہا۔

ملازمہ نے ایک نظر سر سے پاؤں تک اسے دیکھا [illegible] ہتھیار ڈال دیے "آخر میں سامنے کی طرف دروازہ ہے۔ دستک دیجئے گا" اس نے رہنمائی کی۔

وہ ایک راہداری تھی' جو ایک چوڑے دروازے پر [illegible] تھی۔ نیما نے اس پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے جھنجلائی [illegible] آواز میں کہا۔ "میں نے منع کیا تھا کہ اب مجھے ڈسٹرب نہ کر [illegible] کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔"

نیما نے ہینڈل گھما کر آہستگی سے دروازہ کھولا "کیا آپ [illegible] بھی ملنا نہیں چاہیں گے؟" اس نے مترنم آواز میں کہا۔

کینوس پر چلتا ہوا برش رکا۔ تصویر بنانے والے نے [illegible] دیکھا۔ اس کے چہرے پر غضب ناکی تھی "یہ کیا بدتمیزی۔" چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا جملہ ٹوٹ گیا۔ چہرے پر غضب [illegible] جگہ حیرت نظر آنے لگی پھر اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

نیما خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس نے دانستہ [illegible] اپنایا تھا' جیسے کوئی رقاصہ رقص کرتے کرتے بہت [illegible] جسمانی نشیب و فراز کو پوری طرح نمایاں کرنے کے [illegible] انداز تھا۔

مصور کے ہونٹ لرزے لیکن کوئی آواز نہ نکلی [illegible] اس نے بڑی مشکل سے کہا "زہرہ! زہرہ۔ تم!" اس کے [illegible] برش چھوٹ گیا۔

وہ لمحہ نیما کے لئے حیرت کا لمحہ تھا۔ وہ ذہن پر زور [illegible] کون ہے یہ شخص اور اسے کیسے جانتا ہے؟ "آپ [illegible] کیسے واقف ہیں؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا "[illegible] معلوم ہوا آپ کو۔"

مصور مسکرایا "اب میرے سوا کون جانے [illegible]

"ایک میں ہی [illegible] جو ۸۰ سال سے تم سے [illegible] میں [illegible]" وہ [illegible] کی طرح [illegible]

نیما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خوف اور [illegible] نے [illegible] جسم کو شل کرکے رکھ دیا۔ اس کے الجھے ہوئے ذہن میں ایک خیال تھا۔ یہ کوئی جادوگر ہے۔ یا پھر دیوانہ ہے۔

اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے [illegible] اس کے بس میں ہوتا تو وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ مگر وہ تو اپنی [illegible] سے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بے بس کھڑی اسے اپنی طرف بڑھتی [illegible] اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی' اب اسے اس میں [illegible] کی جھلک نظر آرہی تھی۔

JA 197

اُن میں خطوط میں وہ واحد خط تھا جو مسز جولیا مارٹن، ایڈیٹر، بچوں کی کتابیں کے نام تھا۔ باقی اُنیس خط ایڈیٹر ڈیسٹر پبلشنگ کمپنی کے نام تھے... اور وہی ایک خط دہشت کا نقطۂ آغاز تھا۔

جولیا کو یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ وہ گمنام رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا کام کچھ ایسا تھا کہ اُسے لوگوں کو فٹی میں جواب دینا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خطوط کو مخلصانہ انداز کرتی تھی اور خط کھولتے ہی خط سے منسلک مسودوں کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ وہ خطوط مبتدیوں کے ہوتے تھے، جو ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے کے خوابوں میں گم رہتے تھے۔

اس خط میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا... اور بس۔ جولیا نے اُسے لفافے سے کھینچ لیا۔ "ڈیئر مس مونٹ..." خط اس انداز میں شروع ہوتا تھا۔ جولیا نے سرد آہ بھری۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی منتقم مزاج مبتدی کا خط ہے۔ مزید لکھا تھا... "دوسرے خط میں تمہارے لیے تحفہ موجود ہے۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اور صرف تمہارے لیے کیا ہے۔ امید ہے یہ کارآمد ثابت ہو گا۔ نہ ہوا تو میری طرف سے مزید خط کی امید رکھنا۔ خلوص کیش ہے آپ کا:"

جولیا نے دوسرے لفافوں پر نظر ڈالی۔ پھر اُسے ایک اور لفافہ نظر آ گیا جس پر اسی تحریر میں پتا درج تھا۔ اس لفافے پر چھ سات جگہ مہر لگی ہوئی تھی: "نازک چیز ہے۔ احتیاط برتیے:"

اسی وقت فرینڈ جولیا کی طرف چلا آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں آرٹ بورڈ تھے۔ اس نے لفافے کو تعجب سے دیکھا اور بولا: "قیمتی لگتا ہے، شاید اس میں سونا ہو گا:"

"تب تو قیمتی نہیں ہو سکتا:" جولیا نے خشک لہجے میں کہا: "اس کا وزن نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے تو خالی معلوم ہوتا ہے:" اس نے لفافہ کھولا... اور حیران رہ گئی۔ لفافے میں سے ایک سیاہ مکڑی برآمد ہوئی تھی۔ پہلے تو وہ مُردہ نظر آئی، لیکن پھر اس کی ٹانگیں متحرک ہو گئیں۔

"اوہ:" جولیا چیخی: "نہیں... نہیں:" پھر وہ کرسی سے اُٹھ گئی۔ کرسی اُلٹ گئی۔ اس کا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔ اُسے ہر رینگنے والی چیز سے خوف آتا تھا۔ فرینڈ نے آرٹ بورڈ کی مدد سے اُسے کچل ڈالا۔

**

وہ روشن روشن ڈرگ اسٹور اس کے گھر کی سڑک کی حیثیت رکھتا

ایک خاتون کا قصہ جو اپنا فرض ذہانت داری سے ادا کر رہی تھی

بعض اوقات بہت معمولی باتیں بڑھ کر وبالِ جان بن جاتی ہیں۔ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا وہ معمولات کے مطابق بندھے ٹکے اصولوں کے تحت کام کرتا رہتا ہے اور پھر ایک دن اچانک اس پر کسی غلطی کا انکشاف ہوتا ہے

علیم الحق حقی

تھا۔ وہ گھر واپس جاتے ہوئے بس سے اترتی... وہاں رکتی اور اخبار، آئس کریم یا آئی واش خریدتی۔ آئی واش اُس کے لیے بے حد ضروری تھا کیونکہ اُسے بہت زیادہ پڑھنا ہوتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ اسٹور اُسے بہت پسند تھا۔ وہ اُسے اس اسٹور کی یاد دلاتا تھا جہاں کالج کے دنوں میں اس نے پہلی ملازمت کی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب وہ مارٹن سے نہیں ملی تھی... جب اس نے مارٹن سے شادی نہیں کی تھی۔ جب مارٹن نے اُسے مسترد نہیں کیا تھا۔

اس نے سفید کوٹ میں ملبوس اسٹور والے کی طرف نسخہ بڑھایا اور اخبار اٹھالیا۔ پھر اس نے پچاس سینٹ کا سکہ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"اور کچھ؟" اسٹور کے مالک نے پوچھا۔

"نہیں۔" جولیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ناخوشگوار دن گزارنے کے بعد وہ اسٹور اُسے خوشگواریت کا احساس دلا رہا تھا۔ ناخوشگواری کا احساس پبلشنگ کمپنی کے اسٹاف نے بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا تھا۔ فریڈ کی آنکھوں سے فکرمندی مترشح تھی، حالانکہ اس کا تبصرہ بے ضرر تھا۔ اس کے خیال میں وہ بے ضرر سا مذاق تھا، لیکن اس کی آنکھوں کا تاثر اس کے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ پھر کاپی ریڈر اور سیکریٹریز... وہ سب مس مونٹ اور اس کی سنکی کے متعلق طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ حد یہ ہوئی کہ مسٹر ولیبسٹر خود اس کے پاس استفسار کرنے چلے آئے، حالانکہ وہ اس طرف بہت کم آتے تھے۔

اُسے دوسروں کی توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں تھا۔ اس نے اپنی ذات کے گرد جو حصار قائم کیا تھا، وہ توجہ اس حصار کو توڑنے لگتی تھی۔ وہ حصار قائم کرنا بہت مشکل تھا اور نفسیات دانوں کی رائے میں غلط بھی تھا۔ لیکن وہ اس کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس نے حماقت کی حد تک پہنچے ہوئے خلوص کے ساتھ اپنی ذات کا تحفہ بیکراں محبت میں پیک کر کے مارٹن کی خدمت میں پیش کیا تھا لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا۔ اس کا تحفہ بغیر شکریے کے اسے واپس کر دیا گیا تھا۔ ایسے میں آدمی خود کو محصور نہ کرے تو کیا کرے۔ اب وہ کسی پر کیسے انحصار کر سکتی تھی۔ مارٹن سے طلاق کے بعد اس نے بڑی مشکل سے خود سے... صرف خود سے دوستی کرنا سیکھا تھا۔

لیکن اس کے انتشار کا سبب صرف اس کے ساتھیوں کی توجہ نہیں تھی۔ اسٹور سے نکل کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا سبب وہ سنکی بھی نہیں تھی، جو کسی نے اُسے بھیجی تھی کیونکہ سنکی سے بے خبر تھی۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ اپنی ذات کو کسی بھی تعلق سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش میں ناکام ہو گئی ہے۔ اس دنیا میں کہیں کوئی جے اسمتھ تھا، جو اس سے پوری شدت سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے خود کو ہر جذبے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک اجنبی شخص کے تند و تیز جذبے میں ملوث ہو گئی تھی۔

اس نے اپنے میل باکس میں سے ڈاک نکالی۔ اس میں کچھ بل تھے۔ دو کتب کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے تھے۔ ایک اس کی خالہ کا خط تھا... اور ایک اور خط تھا، جو مسز جولیا مارٹن کے نام تھا۔ اس نے اس خط کے سوا تمام خطوط اپنے بیگ میں رکھے اور لفٹ میں گھس گئی۔ پھر اس نے وہ خط کھولا۔ اب وہ اس تحریر کو پہچاننے لگی تھی۔ اس بار تخاطب مختلف تھا۔

"ڈیئر مس ہمٹی ڈمٹی... میرا پہلا تحفہ پسند آیا؟ دوسرے تحفے کی توقع بھی رکھو۔"

لفٹ اُوپر کا سفر کر رہی تھی۔ اس نے ایمرجنسی اسٹاپ کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ٹھٹک گئی۔ لفٹ کی رفتار کم ہوئی۔ بالآخر لفٹ ٹھہر گئی۔ دروازے کھلے... اور اب اس کے سامنے جانی پہچانی راہداری تھی۔ وہ باہر نکلی اور کچھ دیر اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا دل گویا حلق میں دھڑک رہا تھا۔

"ہمٹی ڈمٹی بُری طرح گرے؟" اُسے بچوں کی نظم کا وہ مصرعہ یاد آگیا۔ وہ لفٹ میں گر سکتی تھی، نہیں، راہداری میں... لیکن وہاں بہت سے لوگ رہتے تھے۔ کوئی اور بھی تو شکار ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے جال اپارٹمنٹ میں بچھایا گیا ہو۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔ اگر وہ اپنی عام رفتار سے چل رہی ہوتی تو یقیناً بُری طرح گرتی لیکن احتیاط کے خیال اور خوف نے اس کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ جیسے ہی تار اس کے ٹخنے سے مس ہوا وہ ٹھہر گئی۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنے بُری طرح لرز رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ پتلا سُرمئی رنگ کا تار تھا۔ راہداری میں بچھے ہوئے قالین کا ہم رنگ تار۔ وہ دونوں جانب کے دروازوں کی چوکھٹ میں کیلیں گاڑ کر فرش سے تین انچ اوپر تانا گیا تھا۔ اپنے رنگ کی وجہ سے ایک فٹ کے فاصلے سے اُسے دیکھنا ناممکن تھا۔

چند لمحے بعد جولیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کی کیفیت بہتر تھی۔ اس نے پرس سے اپنا سفید رومال نکال کر تار پر ڈال دیا تاکہ کسی اور کے گرنے کا امکان نہ رہے۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک ایک کمرہ چھان مارا لیکن سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ پھر اس نے کمرۂ نشست میں آکر پولیس کو فون کر دیا۔

اگلی صبح اس نے مسترد شدہ مسوّدوں کی فائل سنبھالی اور کانفرنس روم کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ کسی ایسے شوقیہ لکھنے والے کی حرکت ہے، جس کا مسوّدہ مسترد کیا گیا ہوگا۔ اس صورت میں صرف جولیا ہی اُنھیں پہچان سکتی تھی۔

فائل میں جے اسمتھ کا صرف ایک ہی خط موجود تھا۔ اس کے ساتھ بچوں کی حماقتوں پر مشتمل ایک مسوّدہ بھی تھا۔ دستخط جے اسمتھ کے تھے۔

عمر ۸۹ سال۔ وہ خط دو سال پرانا تھا۔ اس کے باوجود جولیا فائل میں الجھی رہی۔ لیفٹیننٹ نے خیال ظاہر کیا تھا کہ نام فرضی ہوگا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ خط لکھنے والے نے اپنی تحریر بگاڑنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں تھی کہ وہ دستخط اپنے اصلی نام کے کرے گا۔ اپنے خلاف ایسی ٹھوس شہادت کون فراہم کر سکتا ہے۔

ابھی وہ اپنے کام میں الجھی ہوئی ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور فریڈ اندر آگیا۔ "کہو... کچھ کامیابی ہوئی؟" اس نے پوچھا۔

جولیا نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں پر پھیلی بے حد کشادہ مسکراہٹ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

"سب جانتے ہیں کہ تم میاں کس کام میں مصروف ہو۔" فریڈ نے کہا۔ "کم از کم چھ افراد نے تمہاری آج کی ڈاک کے سلسلے میں تمہاری سیکرٹری کا ہاتھ بٹایا ہے... لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی؟"

جولیا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ "میں چاہتی ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ سب کچھ بے حد احمقانہ ہے۔ دفتر کے لوگ اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتے؟" اس نے بے حد تند و تلخ لہجے میں کہا۔

"آخر مصیبت کیا ہے؟" فریڈ کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ "تم کیوں نہیں چاہتیں کہ کوئی تمہاری پڑتال کرے... تمہارا خیال رکھے۔ کیا تمہاری لغت میں یہ کوئی جرم ہے؟"

وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ جولیا خاموش رہی۔

"اچھا یہ موضوع ختم۔" بالآخر فریڈ نے خاموشی توڑی۔ "ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ آج رات چارلیز میں ڈنر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جی نہیں، شکریہ۔"

"ہم سیاست پر گفتگو کریں گے؟"

"مزید شکریہ۔"

بعد میں بند دروازے کو دیکھتے ہوئے جولیا کو شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ اگر وہ ہاں کہہ دیتی تو کتنا خوشگوار وقت گزرتا۔ فریڈ بہت اچھا آدمی تھا۔ نرم خو اور مہربان۔ اس کے شوہر سے بالکل مختلف۔ کاش وہ اذیت ناک ماضی کو بھلا کر از سرِ نو زندگی کا آغاز کر سکتی۔ اچانک اسے اپنی ازدواجی زندگی کے وہ آخری چند ماہ یاد آگئے، جب اٹرنی طلاق کی تجویز پیش کر چکا تھا۔ وہ ایام ہی تو حاصلِ محبت تھے۔ وہ راتیں ہی تو کسی کا خیال رکھنے کا صلہ تھیں... وہ پُراذیت روز و شب۔ نہیں... وہ دوسری حماقت کیسے کر سکتی تھی۔

شام تک اس نے تمام فائلیں دیکھ ڈالیں۔ وہ تحریر کہیں نظر نہ آئی جو اس کے نام آنے والے دو خطوں میں تھی۔ گویا ایک دن رائیگاں چلا گیا۔ اتنی دیر میں کتنا کام ہو سکتا تھا۔ پھر اس کی سیکرٹری نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ چھٹی کر رہی ہے۔ جولیا بدستور بیٹھی رہی۔ اس نے وہ تمام خطوط علیحدہ کر لیے تھے جن میں بطخ ماں کا تذکرہ تھا۔ وہ ان خطوط کی دوبارہ پڑتال کرنا چاہتی تھی۔ اسے ملنے والے دو لفافوں خطوط میں نظموں کی اس مشہور کتاب کے حوالے موجود تھے... موفٹ اور ہمٹی ڈمٹی۔

وہ ایک ایک خط کھنگالتی رہی، تفصیل سے پڑھتی رہی۔ تعریفی خطوط بھی تھے، تنقیدی بھی اور سوالیہ بھی۔ پھر اس کی نظر ایک خط پر پڑی۔ جو ریوسینی ٹوریم کے پیڈ پر لکھا گیا تھا۔ اس پر گیارہ فروری کی تاریخ تھی۔ اس خط نے نہ جانے کیوں اس کے دل کو چھو لیا۔

"ڈیئر ایڈیٹر: میں نئے بچوں کے لیے جدید طرز کی بطخ ماں کی نظمیں ارسال کر رہی ہوں۔ اپنی بیماری کے دوران مجھے یہ خیال آیا تھا اور میں نے اس پر خاصا وقت صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ نظمیں آج کے بچوں کے لیے بے حد پُرکشش ہیں۔ مجھے ہر روز صرف آدھے گھنٹے کے لیے بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ تمام نظموں کی نقول میں نے طویل عرصے میں، اسی مہلت کے دوران تیار کی ہیں۔ یہ بات میں ہمدردی سمیٹنے کے لیے نہیں لکھ رہی ہوں بلکہ اپنے بے پایاں خلوص کا اظہار مقصود ہے۔ اگر آپ ان نظموں کو کسی قابل سمجھیں تو میں شکر گزار ہوں گی۔"

خط پر ڈورتھی کیسل کے دستخط تھے۔ نیچے نوٹ لکھا تھا کہ معمول کے مطابق استرداد کا چھپا ہوا خط ۱۲ فروری کو ارسال کر دیا گیا ہے۔ جولیا نے فون اٹھایا اور آپریٹر سے کولوریڈو میں ریوسینی ٹوریم سے رابطے کے لیے کہا۔ "میں سینی ٹوریم کے اس ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتی ہوں جو ڈورتھی کیسل نامی خاتون کا علاج کر رہا ہے۔" اس نے مزید کہا۔

اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران اس نے اس خط کو بار بار پڑھا۔ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف آپریٹر تھی۔ جولیا خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اس نے آپریٹر کا شکریہ ادا کیا اور لیفٹیننٹ شلز سے فون ملانے کی ہدایت کی۔

"میں جولیا مارٹن ہوں۔" اس نے رابطہ ملنے پر لیفٹیننٹ سے کہا۔ "میرا خیال ہے، مجھے سراغ مل گیا ہے۔ تقریباً دو ماہ پہلے ڈورتھی کیسل نامی خاتون نے ہمیں بچوں کی نظمیں بھیجی تھیں۔ ہم نے معمول کے مطابق انہیں مطلع کر دیا تھا کہ نظمیں ناقابلِ اشاعت ہیں۔ ڈورتھی کیسل ٹی بی کی مریضہ تھیں، جس روز ہمارا خط انہیں ملا، اسی روز ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ کولوریڈو کے ایک سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھیں۔ سینی ٹوریم سے پتا چلا ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کے شوہر اڈولف نے اس شہر میں رہائش اختیار کر لی ہے۔"

اس رات جولیا بس سے آئی اور معمول کے مطابق اپنے اپارٹمنٹ

ہاؤس کی طرف چل دی۔ گلیوں میں بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ جولیا دورویہ مکانوں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھتی اور ان کے مکینوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا وہ لوگ خوش ہیں؟ تنہا ہیں؟ وہ اُسے ہر روز یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں؟

ڈرگ اسٹور سے اس نے اخبار اور چند رسالے لیے پھر اُس نے اپنی دوائی، کاؤنٹر پر موجود لڑکی دوا پیک کر رہی تھی۔

"کیا حال ہے؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی حیران رہ گئی۔

"یہ تو موسم بہار ہے نا!" اس نے بچکانہ سے انداز میں مزید کہا۔

باہر نکل کر اُسے احساس ہوا جیسے وہ بیمار ہے... جیسے کاؤنٹر گرل سے وہ رسمی گفت گو بیماری کی پہلی علامت ہے۔ ہوا اُن لوگوں کے دکھوں، مایوسیوں، محرومیوں اور خوشیوں سے بوجھل تھی جو اُسے نفس نفس پی رہے تھے۔ اس نے سر جھٹکا لیکن آگہی کا وہ احساس بدستور موجود رہا۔ ذات کی فصیل چٹخ رہی تھی، اگر اس نے اُسے نہ بچایا تو جلد ہی ساری خلقت اس کے قلعے میں گھس آئے گی۔

اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ وہ بچوں کے قہقہے نہیں سُننا چاہتی تھی۔ وہ خوش و خرم نوجوان جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میل باکس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے میل باکس کو منظر انداز کرنا چاہا لیکن باکس کے رخنے سے جھانکتے ہوئے اس سفید لفافے نے اُسے مجبور کر دیا۔ اس نے بے تابی سے خط کھول کر پڑھا۔

"ڈیئر مس پیپ پیپ! مجھے نہیں معلوم کہ تم پیرانک ہو یا تمھیں کوہ پیمائی سے دلچسپی ہے۔ بہر حال اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ نام تم پر سجتا ہے یا منفرد سجنے لگے گا۔ یہ میرا آخری خط ہے اور تمھاری مہربانی، خدا ترسی اور انسان دوستی کا شاخسانہ ہے۔ خلوص کیش

خیر اندیش"

اس نے خط پڑھا اور کچھ فکر مند نظر آنے لگی۔ پھر وہ لفٹ کی طرف سے ہٹ آئی اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے اپارٹمنٹ والی راہداری میں اس نے پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ وہ کسی بھی اَن دیکھی رکاوٹ کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ اور چند لمحے باہر ہی کھڑی رہی۔ کیا پتا اُس بار کون سی مصیبت اُس کی منتظر ہو۔ اس نے پیپ پیپ کا پہلے کبھی تذکرہ بھی نہیں سُنا تھا اور اس بار اُسے اسی نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

کمرہ ٹھیک ویسا ہی تھا جیسا وہ اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے پورے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے شیلف سے 'ہسٹری آف مدر گوز' نکالی اور اس کا انڈیکس دیکھنے لگی۔ ہاں... اُس میں ایک چھوٹی سی منظوم پہیلی موجود تھی۔

میری ایک چھوٹی بہن ہے، سب اس کو کہتے ہیں پیپ پیپ،
وہ گھسے گھر سے سمندر پار کر لیتی ہے۔
وہ اونچے اونچے پہاڑ عبور کر جاتی ہے۔
لیکن اس بے چاری کی بس ایک ہی آنکھ ہے... کانی ہے وہ۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ جولیا نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے لیفٹیننٹ ٹلز کی آواز سُنائی دی: "مطمئن ہو جاؤ مسز مارٹن! ہم نے اُسے پکڑ لیا ہے۔ وہ موٹر لان مدر گوز والی ڈور تھی کیسل کا شوہر ہے۔ اس نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔ بیوی کی موت نے اُسے زبردست صدمہ پہنچایا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی نے اُن نظموں پر چھ ماہ کام کیا تھا، جو اس نے تمھیں بھیجی تھیں۔ اس کا کہنا ہے کہ تمھیں بذریعہ خط بھی اُس کی حوصلہ افزائی کی توفیق نہیں ہوئی حالانکہ اس سے بہت بڑا فرق پڑ سکتا تھا۔ وہ صرف تمھارے جواب کی آس پر زندہ تھی۔ تمھارا چھپا ہوا جواب ملتے ہی اس کی جینے کی اُمنگ ختم ہو گئی۔ اگر تم اپنی تحریر میں جواب دے دیتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا... یہ... اس کا خیال ہے مسز مارٹن۔"

"میں تمھاری بات سمجھ رہی ہوں لیفٹیننٹ، لیکن سارا الزام مجھ پر رکھ دینا زیادتی ہے۔ سسٹم تو میں نے نہیں..."

"اس نے بتایا ہے کہ اس نے تمھیں تینیسی خط لکھا ہے... وہ تمھیں اشارے دیتا رہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اس بار وہ پکڑا جائے گا لیکن اُسے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے مسز مارٹن... بہر حال اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"کیا میں اُسے جانتی ہوں؟"

"ممکن ہے... دیکھا تو بہر حال ہو گا۔ آپ کے گھر کے قریب والے اسٹور میں دوائیں بناتا ہے۔"

جولیا نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کافی ٹیبل سے آئی واش کی بوتل اٹھائی اور اُس کا ڈھکنا کھول کر تھوڑا سا محلول کپڑے پر گرایا۔ جس جگہ محلول کے قطرے گرے تھے، اس جگہ سے کپڑا پھٹا اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گیا۔ کپڑے کے نیچے کافی ٹیبل کا اُتنا حصہ بھی زرد ہو گیا تھا۔ تب اُسے پہیلی کا وہ حصہ یاد آیا۔ لیکن اس بے چاری کی بس ایک ہی آنکھ ہے... کانی ہے وہ۔

جولیا نے اپنے کمرے کو بہ غور دیکھا۔ وہ بہت عرصے سے اس کا قلعہ رہا تھا۔ محفوظ اور خوش گوار پناہ گاہ۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے نمبر ملایا۔

"ہیلو زیڈ!" اس نے ڈائلنگ ٹون کے بعد کہا۔ "کیا تمھاری ڈاکٹر اب بھی موجود ہے؟ مجھے یقین ہے میں اس وقت بہت لطف اندوز ہوں گی۔"

THE MOTHER GOOSE MADMAN
Betty Ren Wright.

تمید یقین اور ایمان سے جگمگاتی لازوال تحریر

علیم الحق حقی

اُمید کا دیا

بسپنس کے ۱۴ اگست اور ۶ ستمبر کی درمیانی مدت کے شمارے میں اُمید کی روشنی سے معمور یہ کہانی بطورِ خاص شائع کی جارہی ہے۔ پاکستانی عوام ان دنوں جس بحران سے گزر رہے ہیں، وہ ہر روز پچھلے روز سے بڑھ کر مایوس کن ہوتا جارہا ہے۔ یہ کہانی یاد دلاتی ہے کہ مایوسی کفر ہے کیوں کہ یہ فکر اور قوتِ عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اللہ سے تو مایوسی مسلمان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ مایوسی ہوتی ہے تو اپنے اعمال سے۔ اور بندے اعمال کو درست کرنے کی کوشش کے ساتھ اللہ سے ہدایت، توفیق اور سعادت مانگیں تو انقلاب آجاتا ہے۔ ضرورت صرف ترجیحات کو ترتیب دینے کی ہے۔ ہم پہلے مسلم پاکستانی ہیں، اس کے بعد اور کچھ ہو سکتے ہیں اور وہ بھی بس اپنی ذات کے لیے۔ ملک و قوم کو تو بس مسلم پاکستانیوں کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کہانی پڑھ کر آپ کے دل میں یہ جذبہ جاگے تو اس کا اعلان کرتے ہوئے نہ ہچکچائیے انشاء اللہ بے شمار لوگ آپ کے ہم آواز ہوں گے۔ یاد رکھیے ایمان کی آزمائش کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ سچے دل سے مسلم پاکستانی بننا اُن اہلِ ایمان میں شامل ہونے کے لیے آپ کا پہلا قدم ہوگا جنہیں انشاء اللہ مستقبل قریب میں دُنیا پر چھا جانا اور کفر پر غالب آنا ہے، جنہیں اللہ نے جنت کی بشارت دی ہے۔
آپ سے ایک استدعا ہے کہ یہ کہانی آپ کو پسند آئے تو اسے کہانی کی اشرفی کی طرح آگے بڑھا دیجیے، جہاں تک پہنچا سکتے ہیں، پہنچا دیجیے۔ اُن لوگوں تک بھی جو ڈائجسٹ نہیں پڑھتے اور اُن لوگوں تک بھی جو پڑھنا ہی نہیں جانتے۔

مجھے خوب یاد ہے، وہ ۲۶ فروری ۹۶ء کی رات تھی!

میری بیوی ناہید نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی، بھری ہوئی ایش ٹرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولی "کیا بات ہے؟ لکھتے کیوں نہیں؟"

"کیسے لکھوں؟" میں نے بے بسی سے کہا "ایسا پیچ پھنسا ہے کہ نکلتا ہی نہیں۔"

"دن بھر میں تمہیں چائے بنا بنا کر پلاتی رہی۔ تم نے سگریٹ کے ٹوٹوں سے ایش ٹرے بھر دی۔ یہ کیسا پیچ ہے کہ پھر بھی نہیں نکلا" ناہید نے جھنجلا کر کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔"

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی "مجھے بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟"

"ایک پڑھا لکھا شخص ہے جو بینائی سے محروم ہو گیا ہے" میں نے اسے بتایا "چار سال کی ایک بیٹی کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ بہت خوددار ہے، کسی سے مدد مانگنا اسے گوارا نہیں۔ پے در پے محرومیوں اور مصائب نے اسے اتنا تلخ کر دیا ہے کہ اس نے اللہ سے بھی لڑائی کر لی ہے۔"

"توبہ توبہ!" میری بیوی اپنے رخسار پیٹنے لگی "تم تو کفر لکھتے ہو بھئی۔"

"اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ بات ایک پیچ کی ہو رہی ہے" میں نے بے حد عاجزی سے اپیل کی۔

"خیر..... سناؤ" ناہید نے بہت بے زاری سے کہا۔

"اس نے بہ ہزار دقت اپنی آنکھوں کی محرومی سے سمجھوتا کیا۔ اپنی دوسری حسوں کو ڈیولپ کیا۔ یہاں تک کہ اس میں اتنی خود اعتمادی آگئی کہ وہ اس محرومی کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ربڑ کی واٹر بالز بنا کر بیچتا ہے۔ حساب کتاب کا آدمی ہے۔ جو کماتا ہے، اس کے تین حصے کرتا ہے۔ ایک حصہ واٹر بالز خریدنے کے لیے، دوسرا روز مرّہ کی ضروریات کے لیے اور تیسرا پس انداز کرنے کے لیے۔ رمضان کا مہینہ ہے اور اسے اپنی بچی کو عید کے کپڑے دلانے ہیں۔ اسے بہت اچھی عید کرانی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو گیا ہے اور اس کے پاس بچی کی بہت اچھی عید کرانے کے لیے معقول رقم موجود ہے....."

"تو اس میں پیچ کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس کو بھیک مانگنے پر مجبور کرنا ہے؟"

"تو کر دو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے تمہارے لیے" میری بیوی نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"کیسے کر دوں؟" میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا "وہ بہت خود دار آدمی ہے۔ سوچو کہ جو اللہ سے کچھ نہیں مانگتا، وہ اس کے بندوں کے سامنے ہاتھ کیسے پھیلا سکتا ہے۔"

یہ بات میری بیوی کی سمجھ میں آگئی "ہاں، یہ تو ہے۔ تم اس

سے بھیک نہیں منگوا سکتے۔"

"مگر مجھے یہ کرنا ہے۔ اس کے بغیر کہانی منطقی انجام تک کیسے پہنچے گی۔"

"لیکن ٹھیک ٹھاک کمانے والا خوددار آدمی بھیک کبھی نہیں مانگے گا۔"

"مجبور ہو جائے تو مانگے گا۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔"

"عید سے دو تین دن پہلے کوئی اسے لوٹ لے..... پیسے پیسے کو محتاج کردے تو وہ کیا کرے گا؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔ بس تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ اس کے لٹنے کے طریقۂ کار کا ہے۔"

میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں روئے زمین پر سب سے بے وقوف آدمی ہوں "لو..... یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ یہاں لوٹنے والے آنکھوں والوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس بے چارے اندھے کا لٹنا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"بھئی' وہ بہت الرٹ ہے۔ ذہین ہے...."

"سب سے ذہین لوٹنے والے ہوتے ہیں" میری بیوی نے سادگی سے کہا۔

"اس نے اپنی دوسری حسوں سے بصارت کا کام لینا سیکھ لیا ہے۔ وہ کسی کے پاؤں کی چاپ کبھی نہیں بھولتا۔ کوئی بھی ایک بار اس کے قریب سے گزرا ہو تو وہ قدموں کی چاپ سے اسے پہچان لیتا ہے۔ اسے چاپ سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ آنے والا کس ارادے اور نیت سے اس کی طرف آرہا ہے۔ ایسے آدمی کا لٹنا آسان نہیں ہوتا۔"

"کمال کرتے ہو تم۔ کوئی آکر پستول کنپٹی پر رکھ دے تو مسلح آنکھوں والے بھی سب کچھ نکال دیتے ہیں۔ اس اندھے نتھو کی کیا بساط ہے' یہی ہو رہا ہے آج کل۔"

"تم سمجھ نہیں رہی ہو" میں بہت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ "ایسے لٹنے سے وہ خود اعتمادی سے محروم تو نہیں ہوگا۔ بے بسی کا خوف ناک احساس اسے نہیں پچھاڑے گا۔ سچ ہے' پستول کے زور پر تو آنکھوں والے بھی لٹ جاتے ہیں۔ بے چارے اندھے کی کیا بساط ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بے وقوف بنا کر یوں لوٹا جائے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ آنکھوں سے محرومی کے ساتھ اس دنیا میں کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لوٹنے والے اسے لوٹتے رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس واقعے کے نتیجے میں وہ یوں ٹوٹے کہ اس کے پاس بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔"

میری بیوی سوچ میں پڑ گئی "اچھا! تم یہ چاہتے ہو کہ اس لٹنے میں اس کے اندھے ہونے کا دخل ہو اور اس کی یہ خوش فہمی دور ہو جائے کہ آنکھوں کی کمی کا کسی طرح ازالہ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں' یہی بات ہے" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ تو واقعی پیچ ہے" میری بیوی نے تائید میں سر ہلایا "لیکن یہ تو تمہاری کہانی لگتی ہے۔"

"کیسے؟ میں اندھا تو نہیں ہوں" میں نے بھنا کر کہا۔

"عید کے دن تمہارا انجام بھی وہی ہوگا۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنیں گے۔ پتا بھی ہے' تین دن رہ گئے ہیں عید میں۔"

"بچوں کی فکر نہ کرو' وہ میرے بچے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب ہوتا ہے تو انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ کبھی مطالبہ نہیں کرتے۔"

"لیکن میرا دل تو دکھے گا عید کے دن اور پھر راشن بھی ختم ہو رہا ہے۔"

اس پر مجھے تشویش ہوئی "کیا صورتِ حال ہے؟"

"بس کل رات تک کام چل جائے گا۔ پھر آٹا' دال' چاول' گھی' شکر..... سب ختم" میری بیوی نے کہا۔ پھر تیز لہجے میں بولی۔ "یعنی پرسوں تمہیں روزہ رکھنا پڑے گا۔"

میرا تشویش سے برا حال تھا۔ مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ "کہانی پوری ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ' کہانی کتنی باقی ہے؟"

"آخری حصہ ہے۔ دس ایک صفحے اور لکھنے ہیں۔ روانی سے لکھی جائے تو ایک دن کا کام ہے لیکن یہ پیچ.....؟"

میری بیوی نے میری بات کاٹ دی "یہ پیچ تمہارے اندھے ہیرو کی ہی نہیں' ہماری عید بھی خراب کردے گا پھر وہ جھنجلا گئی۔ "چھوڑو یہ ایچ پیچ کے نخرے۔ اسے لٹواؤ جلدی سے اور کہانی پوری کر کے دے آؤ' میں بہت پریشان ہوں۔"

"ارے واہ..... ذرا سی جلد بازی میں کہانی تباہ کردوں۔"

"مجھے کہانی کی نزاکتوں کا نہیں پتا۔ میں بس زندگی کی سختیوں سے واقف ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ یہ آخری بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ وہ تو بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کی قائل تھی۔ میرا دل کٹنے لگا..... اس کے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔ بہت شدت سے احساسِ جرم ہوا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے الزام اِدھر اُدھر کرنے کی کوشش کی "ہر مہینے دس پندرہ ہزار لاتا ہوں۔ پھر بھی سختی میں کمی نہیں ہوتی۔"

کوئی اور بیوی ہوتی تو اس پر بپھر جاتی۔ کہتی' پیسے نہیں لے جاتی ہوں۔ اللے تللے بھی نہیں کرتی لیکن وہ میری بیوی تھی..... ناہید۔ اس نے بے حد ٹھنڈے دھیمے لہجے میں کہا "پتا تو ہے نہیں کہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ جینا مشکل ہو گیا ہے۔ گھر کے اخراجات کا پتا نہیں' بس اپنے کونے میں بیٹھے ایران توران کی لکھتے رہتے ہو" وہ کہتے کہتے رکی پھر بولی "اور یہ بھی ہے کہ گھر میں برکت بھی نہیں ہے۔ کیسے ہو' یہ خیر و برکت کا مہینہ رمضان اللہ کا تحفہ ہے۔ مگر دیکھو' پورا مہینہ گزر گیا۔ تم نے ایک روزہ بھی نہیں

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فواز رزاق
جاسوسی نشست 3331784111 92+

رکھا۔ پتا بھی ہے' آج جمعتہ الوداع تھا۔"

گفتگو اس رخ پر آئے گی' یہ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں گڑبڑا گیا "تم جانتی ہو کہ سگریٹ نہ پیوں تو مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔"

"جانتی ہوں" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"دیکھو' میں اپنے' تمہارے اور بچوں کے لیے رزقِ حلال کمانے کی کوشش کرتا ہوں" میں نے صفائی پیش کی۔

"معلوم ہے مجھے۔ ہمارے حقوق ادا کرنے کے لیے اپنی عاقبت کا خطرہ مول لیتے ہو" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ میرے دل کو ریشم کے نرم و ملائم تار چھو گئے۔ وہ اٹھی' میری کرسی کے پیچھے آئی اور بڑی محبت سے میرے کندھے تھام لیے "مجھے معاف کردینا اس کم ظرفی پر۔ کوئی ایسی پریشانی بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر میں کبھی فاقہ نہیں ہوا... اور نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم پریشان نہ ہو' چائے پی لو' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

وہ چلی گئی مگر میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس روز شاید وہ بہت زیادہ بوجھل تھی ورنہ وہ کبھی اس طرح بات نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت خیال رکھتی تھی کہ میں پریشان ہوں گا تو کام پر برا اثر پڑے گا مگر اس روز مجھے یقین تھا کہ اس کی باتوں کا اچھا نتیجہ نکلے گا اور وہ پیچ دور ہوجائے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلالی۔ میں اس پیچ کو دور کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ صورتِ حال اب حوصلہ افزا بھی تھی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کردینے والی بھی۔ کوئی خیال تھا جو ذہن میں ایک پل کے لیے چمکتا اور فوراً ہی بجھ جاتا تھا۔ مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔

میں اس آنکھ مچولی میں الجھا ہوا تھا کہ ناہید چائے کی پیالی اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی "سنو..... ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟"

"تمہاری بات کا میں برا کب مانتا ہوں۔ کہو۔"

"جمعتہ الوداع تو گزر گیا۔ آج رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔ مسجد چلے جاؤ' عبادت کرلو۔"

"لیکن میں نے روزہ ایک نہیں رکھا....."

"تو شرمندہ بھی تو ہو۔ اللہ سے معافی مانگو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ شرمندگی میں ایسی مبارک رات ضائع کرکے اپنا نقصان کیوں بڑھاتے ہو۔"

کوئی اچھا لمحہ تھا کہ بات میری سمجھ میں آگئی!

○☆○

اگر گھر کی صورتِ حال ابتر نہ ہوتی۔ اگر ناہید نے اس انداز میں بات نہ کی ہوتی اور اگر اس نے مجھے اس مبارک شب سے استفادہ کرنے پر نہ اکسایا ہوتا تو اس رات میں ہرگز گھر سے نہ نکلتا اور گھر سے نہ نکلتا تو میری زندگی یوں نہ بدلتی۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ سب نہ ہوتا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے تھا' جو مسبب الاسباب ہے'

سب رنگ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونے والا سلسلہ

اقابلا

مکمل دو حصوں میں

تاریک براعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور سفلی کے مقابلے برملا ہوتے تھے۔ وحشی قبائل اور اُن کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابلِ یقین سرگزشت —— ان تاریک اور گمنام جزیروں کی کہانی —— جہاں تہذیب کا کوئی دخل نہیں تھا —— شگون کی خاطر معصوم اور شیر خوار بچوں کو نیزوں پر اچھالا جاتا تھا عجیب و اخلاقت اور خوفناک ذبیحاؤں کے مجسموں کو تازہ خون سے غسل دیا جاتا تھا —— نوخیز حسیناؤں کی بھینٹ پیش کیجاتی تھی

اقابلا

وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حسینہ جس کا حسن لازوال تھا جس کے حصول کے لئے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا —— خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اُٹھا کر اقابلا کے دیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا ——

کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہے

قیمت فی حصہ -/۰۰ روپے' علاوہ محصول ڈاک

پتہ ذیل پر رجوع کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ○ کراچی ۱

بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

میں محلے کی مسجد کا چراغاں دیکھتے ہوئے آگے نکل گیا۔ ذہن میں خیالات کی یورش تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف کہانی کا پیچ پھنسا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ فکر تھی کہ گھر کا راشن ختم ہو رہا ہے۔ پرسوں تک پیسے نہیں آئے تو رمضان کے مہینے میں فاقے کی نوبت آجائے گی۔ تیسری طرف عید کا خیال تھا۔ صرف بچوں کے نہیں' اس بار تو ناہید کے کپڑے بھی بننے چاہئیں۔ مگر کہانی تو پوری ہو اور اس کے ساتھ ہی ذہن کی سوئی پھر کہانی کے پیچ پر اٹک جاتی۔

میں محلے کی مسجد کے سامنے سے گزرا تو مجھے یاد تھا کہ میں عبادت کی غرض سے نکلا ہوں لیکن میں اس وقت ذہنی یکسوئی اور ارتکاز سے محروم تھا' پریشان تھا۔ میں نے سوچا' سوچنے سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔ مسجدوں کی تو یہاں کمی نہیں۔ جب جی چاہے گا' کسی مسجد میں چلا جاؤں گا۔ ابھی تو رات پڑی ہے۔

سو میں آگے ہی آگے چلتا رہا۔ سوچوں میں یوں گھرا ہوا تھا کہ وقت اور فاصلے کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر سے چل رہا ہوں اور کتنا چل چکا ہوں۔ انتشار کے عالم میں وہ عجیب ارتکاز تھا۔ مجھے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

پھر ایک کتے کے بھونکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شاید میرے چونکنے کی کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔ کتوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور وہ آواز آئی بھی بہت قریب سے تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر گھوم کر دیکھا مگر کوئی کتا نظر نہیں آیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ اتنے قریب سے آنے والی کتے کی آواز وہم تو نہیں ہو سکتی اور کتا ہے تو نظر تو آئے۔ ورنہ تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہو گی۔ وہ کسی بھی وقت اچانک مجھ پر جھپٹ پڑے گا اور مجھے جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دوبارہ بھونکنے کی آواز سنائی دی..... اور اس بار کتا مجھے نظر آ ہی گیا۔ وہ کافی دور تھا اور مخالف سمت میں دوڑ رہا تھا یعنی مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ مگر وہ سکون دائمی تھا۔ کتے کو دیکھنے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا تھا' اسے دیکھ کر میرے دیوتا کوچ کر گئے۔

یہ انسانی فطرت کا کمال ہے۔ جب وہ پورے ارتکاز کے ساتھ کسی چیز یا شخص کی جستجو میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو اس کے سامنے' گردوپیش میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن وہ اسے نظر نہیں آتا اور جستجو پوری ہو جائے تو گردوپیش کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی ہے۔

مگر میں حیران نہیں' دہشت زدہ ہوا تھا!

میں نے پھر گھوم کر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ جہاں دیکھنے کو گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ہو' وہاں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں ساکت کھڑا ہو گیا اور ایک طرف نظر جما دی۔ نظر اللہ کی دی ہوئی وہ نعمت ہے جو گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی کسی حد تک راہ بنا لیتی ہے۔

میری نظر بھی ذرا دیر میں اس اندھیرے کی عادی ہو گئی مگر اب بھی وہاں دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ آسمان کے پیش منظر میں جا بجا گہرے رنگ کے دھبے نظر آرہے تھے۔ وہ جھاڑیاں بھی ہو سکتی تھیں' میں نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف وہی منظر تھا۔ سر جھکا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میں پتلی سی ایک سڑک پر چل رہا تھا۔

میں چکرا گیا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں' وہاں دور دور تک میں نے کبھی ایسا صحرا اور یہ سڑک نہیں دیکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سر جھکائے چلتا رہا ہوں لیکن اتنا تو نہیں چلا ہوں کہ کسی اجنبی علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹانگیں بھی اس کی تردید کر رہی تھیں کہ میں بہت چلا ہوں۔ میں پوری طرح تازہ دم تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے گھر سے نکلے بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔

بہرکیف یہ طے تھا کہ مجھے اس وحشت ناک ماحول سے بھاگنا ہے..... جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے اور آگے جانا مخدوش تھا۔ گھر کی طرف ہی چلا جائے۔ پلٹ کر ادھر چلوں جہاں سے آرہا ہوں۔ یہ سوچ کر میں پلٹا لیکن اگلے ہی لمحے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پلٹ کر میں نے اسی طرف رخ کیا ہے' جدھر سے آیا ہوں۔

میں نے سمجھ لیا کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں۔ کتے کو دیکھنے کے لئے میں اتنی بار گھوما ہوں کہ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ میں کس طرف سے آرہا ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے کتے کو کہاں دیکھا تھا۔ سمتوں کا تو مجھے احساس ہی نہیں تھا۔

اب ایسے میں آدمی اللہ سے رہنمائی طلب کرنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اللہ سے دعا کی اور جس طرف قدم اٹھے' اس طرف چل پڑا۔ اب میں یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ میں گھر کی سمت قدم اٹھا رہا ہوں۔

آتے ہوئے بے خبری میں جو میں نے سفر کیا تھا' اس کا تو پتا ہی نہیں چلا تھا مگر اب شعور کے ساتھ سفر کرنے میں ایک ایک پل بہت بڑا لگ رہا تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں واپس جا رہا ہوں یا مزید آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میری پہلی طلب تو یہ تھی کہ مجھے کہیں روشنی نظر آجائے۔ میں روشنی کو ترس رہا تھا۔

کچھ آگے بڑھا تو اللہ نے میری سن لی۔ دور جلتی بجھتی ایک روشنی نظر آنے لگی۔ شروع میں تو میں اسے ستارہ سمجھا لیکن آگے بڑھتا گیا تو احساس ہوا کہ وہ ستارہ نہیں ورنہ میرے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ بلندی کی طرف جاتا لگتا اور اس کا وہ جلنا بجھنا فاصلے کی وجہ سے تھا۔ اسے دیکھ کر میری ڈھارس بندھی ورنہ میں بہت پریشان تھا کہ یہ کس لق ودق صحرا میں چل رہا ہوں کہ کہیں زندگی کے آثار نہیں۔ میں تو اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

میں اس روشنی کی طرف بڑھتا رہا۔ شروع میں تو ایسا لگا کہ وہ روشنی بھی میرے ساتھ اس سمت میں سفر کر رہی ہے کیونکہ اس کی طرف بڑھنے کے باوجود فاصلہ کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر اچانک فاصلہ سمٹتا محسوس ہونے لگا..... اور وہ بھی بہت تیزی سے۔

اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میرا تجربہ تھا کہ

نیکی..... کوئی بھی اچھا کام ابتدا میں مشکل لگتا ہے لیکن بعد میں بہت آسان ہوجاتا ہے اور بڑی روانی سے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ درحقیقت مجھے اس کا تجربہ نماز کے دوران میں ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ میں کوئی نمازی ہوں بلکہ سچ یہ ہے کہ میں نماز بے قاعدگی سے بھی نہیں پڑھتا۔ کبھی دل میں اچانک لہر سی اٹھتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھوں۔ جس وقت یہ تحریک پیدا ہوتی ہے تو اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ اپنے زور میں بہا کر لے جاتی ہے۔ پھر میں نماز پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

مجھے وہ پہلا موقع یاد آیا جب مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا۔

اس روز میں بیٹھا ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جانے والا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ کرکٹ پر میری جان جاتی ہے۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ دکھایا جارہا ہو تو میں ہر کام چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے..... زمین جنبد نہ جنبد گل محمد..... کی تصویر بن کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ اس وقت سعید انور بیٹنگ کررہا تھا۔ سعید انور کا میں ایسا فین ہوں کہ اس کی بیٹنگ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ مگر اس وقت میچ دیکھتے دیکھتے اچانک میرے اندر بے چینی کی ایک تیز لہر اٹھی۔ میں نے اسے سمجھنے کے لیے پہلو بدلا۔ اسی لمحے میرے اندر سے کسی نے کہا..... نماز پڑھنی چاہیے۔ میں نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ سعید انور نے ایک چھکا لگایا تھا۔

اس وقت چھوڑو یار، میں بڑبڑایا۔

لیکن بے چینی بڑھتی گئی۔ یہ نماز کا وقت بھی تو نہیں ہے۔ میں نے جان چھڑانی چاہی مگر بے چینی نے مجھے اٹھ کر باہر کا جائزہ لینے پر مجبور کردیا۔ باہر سورج غروب ہونے والا تھا۔ گویا مغرب کا وقت سر پر تھا۔

میں دوبارہ ٹی وی کے سامنے آبیٹھا اور سعید انور کے دو خوب صورت کور ڈرائیوز دیکھے مگر سچ یہ ہے کہ اندر کی بے چینی مجھے انجوائے نہیں کرنے دے رہی تھی۔ اوور ختم ہوا اور ٹی وی پر کمرشلز دکھائے جانے لگے تو اس بے چینی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں نے لپک کر وضو کیا۔ باتھ روم سے نکلا تو اذان کی ابتدا ہورہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے جانماز بچھالی مگر میرا دھیان اب بھی میچ میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچھا خاصا میچ نکل جائے گا اور سعید انور آؤٹ ہوگیا تو یہ میرا ذاتی نقصان ہوگا۔

مغرب کی نماز چھوٹی ہوتی ہے لیکن مجھے عصر کی قضا بھی پڑھنی تھی اس لیے میں اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ مگر مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ میں نے کب عصر کی قضا کی نیت کرلی۔

پہلی دو رکعتیں کتنی طویل، کتنی مشکل تھیں، میں بتا نہیں سکتا۔ لگتا تھا کہ یہ چار رکعتیں پوری ہوتے ہوتے میچ ختم ہوجائے گا۔ ٹی وی کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی مگر نماز میں اتنا ارتکاز ضرور تھا کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ بات اور ڈسٹرب کررہی تھی کیونکہ کمنٹیٹر ہیجانی آواز میں چلا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سعید انور آؤٹ تو نہیں ہوگیا۔

مگر تیسری رکعت میں اچانک سب کچھ بدل گیا۔ سب سے پہلے ٹی وی کی آواز موقوف ہوئی، جیسے کسی نے ٹی وی بند کردیا ہو۔ پھر نماز میں روانی آئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے سلام پھیرا ہے..... اور مغرب کے فرض کی نیت باندھ لی ہے۔ مجھے تو ہوش اس وقت آیا، جب میں نماز مکمل کرکے تسبیح پڑھنے کے بعد دعا کررہا تھا۔

نماز پوری کرکے میں واپس آیا "ٹی وی کیوں بند کردیا تھا؟" میں نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"ٹی وی تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی بند نہیں ہوا بھائی جان!" میرے بھائی نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی..... مگر یہ جان کر میں اور حیران ہوا کہ میں نے صرف دو اوور مس کیے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا کہ آدمی کو نیکی، کوئی اچھا کام شروع میں وقت طلب بھی لگتا ہے اور وقت طلب بھی۔ اس لیے کہ نفس اس پر کڑھتا ہے مگر پھر اللہ اپنی نوازش سے اسے آسان اور تیز رفتار کردیتا ہے۔ نیکی کا نقطۂ آغاز سب سے مشکل ہوتا ہے پھر اللہ ہاتھ تھام لیتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سوچنے کے دوران میں، میں روشنی کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی مقامِ خیر ہے۔ اس لیے تو شروع میں اتنا دشوار اور پہنچ سے دور لگ رہا تھا اور آخر میں، میں اتنی آسانی سے اس تک پہنچ گیا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بڑا سا..... بہت وسیع و عریض کچا مکان تھا جو اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ روشنی بس دروازے بھر تھی۔ وہ لکڑی کا عام سا مگر کافی چوڑا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اس لیے روشنی باہر تک آرہی تھی۔ ورنہ وہاں اندھیرا ہی ہوتا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، پھر سامنے دیکھا۔ کہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ آگے سڑک پر بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گویا امان کی وہی ایک جگہ تھی..... اور گردوپیش کے بارے میں تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور میں کہاں ہوں۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کچے مکان کے کھلے روشن دروازے کی طرف بڑھا۔ سچی بات یہ کہ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کون جانے یہ جس کا مکان ہے وہ کیسا ہو، کون ہو؟ مجھے تھوڑی دیر ٹھہرنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ مکان کے مالک کے بارے میں مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ میں خوف زدہ ہوگیا لیکن جا کہیں نہیں سکتا تھا۔ وہ مکان میری مجبوری تھا۔

میں نے دروازے پر کھڑے ہوکر پکارا "کوئی ہے؟ کوئی ہے تو باہر آئے؟ میں راستہ بھٹک گیا ہوں" میں نے کئی بار پکارا لیکن جواب میں کوئی آہٹ تک نہیں ابھری۔ فضا کا سناٹا بتا تا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً اور کئی بار پکارا۔ اس کے بعد ڈرتے ڈرتے دھڑکتے دل کے ساتھ کھلے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوگیا۔

○☆○

میں کہانی کار ہوں۔ لفظوں سے کھیلتا ہوں۔ اظہار میرا کھیل

ہے لیکن وہاں میں عاجز ہوگیا۔ اندر گھستے ہی جو کچھ میں نے دیکھا' اس طرح کی کوئی اور' عام سی اور دنیاوی صورت حال ہوتی تو میں بلا جھجک کہتا کہ اندر داخل ہوتے ہی جیسے جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا لیکن یہ اظہار' یہ خیال میرے ذہن کو چھو بھی نہیں سکا۔ جادو تو بہت بُری چیز ہوتی ہے۔ جبکہ وہ سب بہت پاکیزہ' بہت اچھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا اور میں ساکت وصامت کھڑا اندر کا منظر دیکھتا رہا۔

وہ بہت بڑی' عظیم الشان اور پُرشکوہ مسجد تھی اور پوری مسجد بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس خوب صورتی کو دیکھ کر میں یوں مبہوت ہوا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ باہر میں نے کچا مکان دیکھا تھا۔ یہ اندر اتنی عظیم الشان مسجد کہاں سے آگئی؟ اور وہ بھی اس سنسان سڑک پر..... اس ویران علاقے میں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کون ہوں اور کس حال میں' کس طرح یہاں پہنچا ہوں؟ میں تو بس اس خوب صورتی کو دیکھے جارہا تھا۔

جہاں میں کھڑا تھا' وہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ بائیں جانب وضوخانہ تھا۔ اس کے پار بہت بڑا دالان تھا۔ دالان کے آگے مسجد کا بے حد وسیع وعریض ہال تھا۔ وضو خانے سے لے کر ہال تک در ودیوار' فرش اور چھت..... سب کچھ سنگِ مرمر کا تھا۔ چھتوں سے بہت خوب صورت فانوس لٹکے ہوئے تھے اور اس مسجد کی فضا کیا بتاؤں..... در ودیوار کیا' وہاں ذرّہ ذرّہ ثنا خوانی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خیال ابھرا کہ مجھے یہاں نماز پڑھنی چاہیے۔ یہاں نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

میں نے چپلیں اتاریں اور وضو کرنے کے لیے جا بیٹھا۔ میں نے ٹونٹی گھمائی اور ہاتھ دھوئے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ میں وضو کرنے کا طریقہ بھول گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ بے بسی کے احساس سے تحت میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی وضو نہیں کیا ہے۔

میں یونہی ٹونٹی کھولے ہاتھوں پر پانی بہاتا رہا۔ آس پاس کوئی ہوتا تو اسے دیکھ کر ہی وضو کرلیتا۔ دل میں یہ خیال آتے ہی میں نے دالان کے اجتماع سے ایک شخص کو وضو خانے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ کھچڑی بال' گھنی داڑھی' تندرست توانا جسم' چہرے کی سرخ وسپید رنگت۔ آنکھوں سے عمر زیادہ لگ رہی تھی مگر اس سے قطع نظر وہ دیکھنے میں چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میری مخالف سمت وضو کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی کہ اب میرا بھی وضو ہو جائے گا۔

وہ شخص اتنی آہستہ وضو کررہا تھا کہ میرا کام اور آسان ہوگیا۔ لگتا تھا' وہ خود وضو نہیں کررہا ہے' مجھے سکھا رہا ہے۔ اس کی رفتار ایسی تھی کہ میرا ہی وضو پہلے مکمل ہوگیا۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔

"سنو..... جاتے ہی سب سے پہلے دو نفل تحیۃ المسجد پڑھنا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے مجھے تحیۃ المسجد کے بارے میں بتایا پھر بولا "جس کے گھر بھی جاتے ہو' پہلے اسے تعظیم دیتے ہو نا اور یہ تو پوری کائنات کے مالک کا گھر ہے۔"

"جی بہت بہتر" میں نے کہا اور چلنے لگا۔

"سنو" اس نے پھر پکارا۔ "کثرت سے شکر کے نفل پڑھنا۔ یہ شکر کی رات ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ تو شبِ قدر ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔ ظاہر ہے' وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہوگا۔

"اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت ضرور کرنا۔ جو شخص سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرتا ہے' وہ گویا اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔"

"جی بہت بہتر۔"

مسجد کے ہال میں جاکر میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ سورۂ رحمٰن کی تلاوت کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک جماعت ہال میں اور ایک جماعت باہر دالان میں ذکر واذکار میں مشغول تھی۔ میں دالان میں آگیا اور اس جماعت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے شامل ہوتے دیکھ کر جماعت کے ایک بزرگ نے بہ آوازِ بلند کئی بار الحمدُللہ کہا۔ یہ گویا اعلان تھا کہ الحمدللہ کا ورد کیا جارہا ہے۔ مجھے یہ بتانا مقصود تھا۔

ورد کے دوران میں جماعت میں شریک لوگوں کو دیکھتا بھی رہا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ ایک سے بڑھ کر ایک نورانی چہرہ تھا کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ انہی میں مجھے وہ چہرہ بھی نظر آیا جسے وضو کرتے دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا۔ وہاں اب وہی ایک مجھے شناسا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے بھی میں مسجد میں داخل ہونے کے بعد ہی ملا تھا۔

ورد کا سلسلہ چلتا رہا اور اپنی کیفیت میں کیا بتاؤں۔ لگتا تھا کہ کسی نے اندر سے اچھی طرح دھو کر مجھے پاک کردیا ہے۔ میں ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ سارے وجود میں کیف وانبساط جیسے موج در موج امنڈ رہا تھا۔ میں عجیب سرخوشی اور سرمستی کے عالم میں تھا۔

اچانک وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے' جنہیں دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا اور اٹھتے اٹھتے انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دروازے سے گزرے اور باہر آگئے۔

"جی فرمایئے؟" باہر آکر میں نے ان سے کہا۔

"کچھ دیر ٹہلیں گے۔ ضروری باتیں کریں گے" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن میں ابھی وہاں رکنا چاہتا تھا" میرے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا "زندگی میں پہلی بار مسجد میں ایسا دل لگا ہے میرا۔ نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔"

"مگر اٹھنے کا حکم ہوگیا تھا برخوردار" انہوں نے مجھے مخاطب کیا جیسے میں ان سے بہت چھوٹا ہوں حالانکہ وہ میرے ہم عمری لگتے تھے۔

"کیسا حکم...؟" میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ حیرت سے میرا برا حال تھا "وہ..... وہ مسجد

کہاں گئی؟"

"مسجد کہیں نہیں گئی۔ ہماری سعادت اتنی ہی تھی اس لیے اب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔"

"لیکن میں..."

"میں نے کہا نا' ہماری سعادت اتنی ہی تھی اور یہ بھی اس کا کرم ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "ہم خوش نصیب ہیں برخوردار۔"

مجھے محسوس ہورہا تھا کہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے حالانکہ درحقیقت میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔

"اور تم ملال کیوں کرتے ہو' تم تو...."

"جی ہاں۔ میں تو اتفاقاً راستہ بھٹک کر یہاں آنکلا تھا" میں نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان کی اس تہدیدی نگاہ کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ صبح کا اجالا رات کی تاریکی کو دھیرے دھیرے نگل رہا ہے "تمہاری بات صریحاً غلط ہے" ان کے لہجے میں بھی سنگینی تھی "تم راستہ بھٹک کر یہاں نہیں آئے۔ تمہاری زندگی گزر گئی راستہ بھٹکتے۔ آج پہلی بار صحیح راستے پر تمہارے قدم پڑے اور یہ اُس کی عنایت ہے" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "اور تم یہاں اتفاقاً بھی نہیں آئے۔ تمہیں بلایا گیا۔ تم پابند کرکے لائے گئے۔ تمہیں یہاں آنا ہی تھا۔"

"میں سمجھا نہیں' کس نے بلایا ہے مجھے؟"

"کون بلا سکتا ہے؟ جس کا گھر ہے' اس نے ہی بلایا تھا۔"

مفہوم سمجھ میں آیا تو مجھ پر لرزہ چڑھ گیا "مجھے! لیکن میں..... میں تو گناہوں کی سیاہ دلدل میں سرتاپا غرق...."

"اپنی باتیں وہ جانے" انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "اس بے نیاز کو برائیوں کے ازدحام میں کسی کی کوئی خوبی پسند آجائے تو وہ اسے دونوں جہان کی ہر نعمت سے نواز دے۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے نا۔"

"مگر مجھ میں تو کوئی خوبی ہی نہیں" میں گڑگڑایا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ میں خوف سے لرز رہا تھا اور شرمندگی سے پانی پانی ہوا جارہا تھا۔

"وہ تمہیں جانتا ہے جبکہ تم خود سے بھی آگاہ نہیں" انہوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا "ایک خوبی تو ہے تم میں۔"

"مجھے بھی بتایئے۔"

"میں کیا بتاؤں' ابھی منہ سے بول پڑے گی خود ہی۔"

"میں تو بہت گناہگار ہوں" مجھ پر رقت طاری ہونے لگی "اب یہی دیکھ لیں کہ یہ برکت کا مہینہ ہے اور میں نے ایک روزہ نہیں رکھا' آج جمعۃ الوداع کا بھی نہیں۔ ایک وقت نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس وقت بھی بلاوا نہ ہوتا تو شاید یہاں بھی نہ آتا میں۔"

انہوں نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں..... روزہ کیوں نہیں رکھتے ہو تم؟ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ پیاس سے گھبراتے ہو۔ ڈرتے بھی نہیں کہ اگر اس نے تم پر بھوک اور پیاس مسلط کردی تو کیا کروگے؟ روزے میں تو صبر دیتا ہے لیکن بھوک کی سزا میں تم پر کیا گزرے گی۔"

میں تھر تھر کانپنے لگا "بددعا نہ دیں مجھے۔ اللہ اپنی خفگی سے امان میں رکھے مجھے۔ بات بھوک پیاس کی نہیں۔"

"تو پھر...؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

میں نے انہیں سگریٹ کی مجبوری کے متعلق بتایا۔

"اکل حلال تو بہت بڑی چیز ہے" انہوں نے سرہلاتے ہوئے کہا "ہاں' روزہ چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ بہت بخشنے والا بھی ہے اور قہار بھی ہے۔ فیصلہ تو وہی کرے گا" اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ "مگر شاید یہ اس ملک کی خرابی ہے کہ یہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس کے باوجود یہاں کے باسی دین سے بے بہرہ ہوگئے۔ یہ ملک ہی خراب ہے۔"

مجھے اس پر شدت کا غصہ آیا کہ اپنی عاجزی..... حتیٰ کہ اپنی گناہ گاری بھی بھول گیا۔ گرم خون جیسے چہرے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ تمتما اٹھا ہوگا۔ "بس اب ایک لفظ بھی نہ کہئے گا۔ میں اس معاملے میں بڑا بدلحاظ ہوں۔ وطن کی برائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی" میں نے بے حد تند لہجے میں کہا۔

وہ میرے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے رہے پھر مسکرادیے "لو' دیکھ لو برخوردار۔ تمہاری ایک خوبی تو منہ سے بول اٹھی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کوئی چھوٹی خوبی نہیں کہ تم وطن سے محبت کرتے ہو۔"

"لیکن آپ تو...."

"تمہیں اکسانے کے لیے..... یہ سب کہلوانے کے لیے کہی تھی وہ بات" انہوں نے بے حد حلیمی سے کہا "ورنہ یہ پاک وطن میرے لیے بھی بہت محترم ہے۔ وطن سے محبت تمہاری بہت بڑی خوبی ہے۔"

میں الجھنے لگا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر رہ گیا "مگر مجھے بلوایا کس لیے گیا تھا؟"

"کوئی کام لینا ہے تم سے۔"

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا "کام! مجھ سے.... اللہ کو لینا ہے؟" میں حواس باختہ ہورہا تھا۔

"اس کی مرضی۔ وہ تو ایسا نوازنے والا ہے کہ توفیق عطا کرتا ہے۔ دل میں خیال ڈالتا ہے۔ قوتِ عمل کو تحرک عطا فرماتا ہے۔ نیکی کے راستے کو آسان کرتا ہے۔ پھر بندہ جب وہ نیکی کرے تو دنیا میں اس کا اجر دیتا ہے..... اور یہی نہیں' آخرت میں اس اجر کو ستر گنا بڑھادیتا ہے۔ ایسا نوازنے والا ہے وہ۔"

"بے شک۔ لیکن میں اس کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگے "تعوذ باللہ..... توبہ توبہ۔ کیا بکتے ہو" انہوں نے برہمی سے کہا "اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے کوئی کیا کرے گا۔ تعوذ باللہ ارے جو کروگے' اپنے ہی لیے کروگے اور لطف یہ کہ اس کی مزدوری بھی ملے گی۔"

مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں بھی دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار

پڑنے لگا تم..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"خیر..... وہ تو دل کا حال بھی جانتا ہے لیکن تم مصنف ہو۔ لفظ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ تمہیں لفظوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کرنی چاہیے" وہ نرم لہجے میں بولے "شاید تم یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پر یہ ذہن میں رکھنا کہ سب کچھ اللہ کی دین ہے' اس کی طرف سے ہے اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں" اتنا کہہ کر انہوں نے گہری سانس لی اور کچھ سوچنے کے بعد بولے "ایک شخص تھا' جو بہت سخی تھا۔ اللہ نے دیا بھی بہت کچھ تھا۔ چنانچہ جسے مصیبت میں دیکھتا' اس کی مدد کرتا۔ ایک بار اُس نے ایک ایسے شخص کو مفلوک الحالی میں دیکھا جسے اللہ نے معاشرے میں بڑی عزت دی تھی اور وہ بہت خوددار بھی تھا۔ سخی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شخص احسان لینے والا نہیں۔ چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اس کے پاس بہت بڑی لیکن بنجر زمین تھی' جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہاں پانی نہیں نکل سکتا۔ سخی اس شخص کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے کنواں کھدوانا چاہتا ہے۔ اسے معقول مزدوری ملے گی۔ وہ شخص راضی ہوگیا۔ کنواں کھدتا رہا اور مفلوک الحال شخص کو مزدوری ملتی رہی۔ کنواں مکمل ہوگیا تو سخی نے کہا..... افسوس' پانی نہیں نکلا۔ خیر' میرا نصیب۔ اس کنوئیں کو بھردو۔ میں تمہیں اس کی مزدوری بھی دوں گا۔ اس سوکھے کنوئیں سے زمین بدنما لگنے لگی ہے۔ کنواں بھر گیا تو اس نے ضرورت مند سے ایک اور جگہ کنواں کھودنے کو کہا۔ مزدوری کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ سخی نے کہا' جب تک پانی نہیں نکلے گا' میں کنواں کھدواتا رہوں گا اور پانی نکل آیا تو تمہیں انعام بھی دوں گا۔ یوں سات کنوئیں کھودے اور بھرے گئے۔ ضرورت مند کا گھر عزت اور آبرو سے چلتا رہا۔ یہاں تک اللہ نے خوش ہو کر پانی کو حکم دیا اور آٹھویں کنوئیں میں پانی نکل آیا۔ سخی نے بڑی عاجزی سے ضرورت مند کو انعام میں اتنا زرِ کثیر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اور اللہ نے سخی کو یہ اجر دیا کہ اس کی بنجر زمین لہلہا اٹھی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے بعد سلسلۂ کلام جوڑا "یہ اللہ کے ایک عام بندے کی سخاوت ہے تو اللہ کی سخاوت اور دین کا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ بندے کی مدد کرنے' اس کے دین اور دنیا کے دلدّر دور کرنے کی خاطر اس کے لیے کام نکالتا ہے۔ اسے کسی سے کوئی ضرورت نہیں' اسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے وہ حکایت اتنے دل نشیں انداز میں سنائی کہ اس کا مفہوم اور ماحصل میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ میرا حوصلہ دوچند ہوگیا کہ میرا رب اپنی کریمی سے میرے دلدّر دور کرنے کا سامان فرمارہا ہے۔ اس سے بڑی بشارت کیا ہوسکتی ہے۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا "بات وہیں رہ گئی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے کرنا کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ بولے "بابا عصری بتائیں گے تمہیں۔"

"بابا عصر! یہ کون ہیں؟"

"بس میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک بے حد برگزیدہ ہستی ہیں۔"

"وہ کب اور کہاں ملیں گے ہم سے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ بس ہمیں چل دینا چاہیے۔ ہمارے چلتے چلتے ہی وہ کہیں آملیں گے ہم سے۔"

میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ کچا مکان تھا جس کے اندر وہ عظیم الشان مسجد تھی مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ان صاحب کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ہم چلتے رہے' اچانک ان صاحب نے کہا "کچھ بات تو کرو کہ سفر کٹے۔"

"مجھے اس مسجد کے بارے میں بتایئے" میں نے کہا۔

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میں یہاں پہلی بار آیا تھا..... میرا مطلب ہے' بلایا گیا تھا۔"

"اور اس مسجد میں موجود لوگ؟"

"یہ عالمِ اسلام کا اجتماع عظیم تھا۔ یہ سب عالمِ اسلام کے چیدہ چیدہ لوگ تھے جو دنیا کے کونے کونے سے یہاں آکر جمع ہوئے تھے" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے یہاں کس کس کو دیکھا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے لیے اس مبارک رات اس اجتماع میں شمولیت ایک بہت بڑی سعادت ہے۔"

"جی بے شک" میں نے اثبات میں سرہلایا "یہ شبِ قدر ہے۔ میں جانتا ہوں مگر آپ نے فرمایا کہ یہ شکر کی رات ہے۔"

"ہاں' یہ شکر کی رات بھی ہے۔ شبِ قدر تو یہ ہے ہی۔ مگر آج خاص طور پر شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔"

"شکر تو ہر حال میں' ہر لمحے واجب ہے" میں نے کہا "مگر آج خاص طور پر کیوں؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے' تم کیسے بے خبر ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"پاکستان سے محبت کرتے ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آج پاکستان بنے پچاس سال ہوگئے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ میں نے تیزی سے تاریخ' ماہ اور سال یاد کرکے ذہن میں دہرائے۔ تقریباً ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔

"کیوں؟ سمجھ میں نہیں آئی میری بات؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے جلدی سے کہا "آپ حساب لگائیں۔ اگر آج پچاسواں یومِ آزادی ہوتا تو ہر طرف جشن کا سماں ہوتا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اس سلسلے میں خصوصی پروگرام چل رہے ہوتے۔ دیکھیں نا' پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بنا تھا..... اور آج ۱۶ فروری ۱۹۹۹ء ہے۔"

"یہی تو المیہ ہے" انہوں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "۱۴

اگست کو تو تم لوگوں نے حرزِ جاں بنالیا..... اور ناقابلِ فراموش ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو بھول گئے۔ اب ذرا خود حساب لگالو۔ پچاس سال ہوئے کہ نہیں؟"

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ..... دراصل یہاں تاریخ پیدائش یاد نہیں رکھی جاتی لیکن جب اسکول میں داخلے کے وقت پوچھی جائے تو سب اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش ۲۳ مارچ' ۱۴ اگست یا ۲۵ دسمبر لکھوادیتے ہیں۔ میں سمجھا شاید یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ مشہور کردیا گیا کہ پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو بنا تھا۔"

"نہیں۔ میں خود اس کا گواہ ہوں۔ رات بارہ بجے ریڈیو پاکستان نے پہلا اناؤنسمنٹ کیا تو وہ رمضان کی ۲۷ ویں شب تھی۔"

میرا وجود خوشی سے بھر گیا۔ پاکستان... میرا محبوب وطن پچاس سال کا ہوگیا۔ شکر میرے دل کی پاکیزہ ترین گہرائی سے ابھر کر لبوں پر آیا اور میرا گمان ہے کہ اللہ کی بارگاہ کی طرف پرواز کرگیا۔ وہ میرے لیے بڑی طمانیت کا لمحہ تھا "تو مسجد میں یہ اجتماع اس سلسلے میں شکر ادا کرنے کے لیے ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پاکستان کے قیام پر تو شکر ادا کیا جاتا رہا ہے۔ یہ قیام پاکستان کے پچاس سال گزرنے پر خصوصی شکر کی رات تھی۔"

"شکر ادا کیا جاتا رہا ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں' دنیا بھر کے مسلمان قیامِ پاکستان پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور استحکامِ پاکستان کے لیے دعائیں کرتے ہیں" انہوں نے کہا۔

"لیکن میں نے تو یہی دیکھا کہ دو ایک اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر تمام اسلامی ممالک کے بھارت سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں" میں نے دل گرفتہ لہجے میں اعتراض کیا "کوئی ملی مسئلہ ہو بین الاقوامی فورم پر یا تجارت' ہمیشہ پاکستان پر بھارت کو ترجیح دی جاتی ہے۔"

"یہ تو حکمرانوں کا رویّہ ہے۔ سچے دردمند مسلمان اور علما و فقہا پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ اب آج ہی دیکھ لو' تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مسجد میں موجود لوگوں میں سے کون کہاں سے کتنی زحمت کرکے آیا ہے اور یہ سب نہ سرکاری طور پر آئے ہیں' نہ یہاں سرکاری مہمان کی حیثیت ہے ان کی۔"

"یہی تو مجھے حیرت ہے۔ پاکستان کو اتنی اہمیت....."

میں اپنی بات پوری نہ کرسکا۔ عقب سے کسی نے بھاری' گونج دار اور بارعب آواز میں میری بات کاٹ دی "یہی تو رونا ہے۔ پاکستان کی اہمیت کوئی پاکستانی نہیں سمجھتا۔ تم جیسے لوگ جو پاکستان سے عشق کرتے ہیں' وہ بھی پاکستان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔"

یہ آواز سنتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز ذرا فاصلے سے آتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس دوران میں مخاطب میرے برابر آچکا تھا۔ میں نے دوبارہ سر گھمایا تو وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھا۔ اس کی رفتار پر مجھے حیرت ہونے لگی۔

میرے ساتھی نے خوش ہوکر چہکتی آواز میں کہا "لو..... بابا عصر آگئے۔"

میں بابا عصر کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا اور اب ان کی پشت میرے سامنے تھی۔ ان کے بڑے بڑے برف جیسے سفید بال کندھوں پر پڑے نظر آرہے تھے۔ اتنے سفید بالوں کے ساتھ میں تو بس جھکی ہوئی کمر کا ہی تصور کرسکتا ہوں لیکن وہ تیر کی طرح سیدھے اور دبلے پتلے تھے۔ ان کی رفتار ان کے پھرتیلے پن کی گواہی دے رہی تھی۔

"ذرا قدم تیز کرو برخوردار آفاق!" میرے رفیق نے مجھ سے کہا "بابا عصر رک کر بات نہیں کرتے۔ سب کچھ چلتے چلتے ہی ہوگا۔"

میں نے قدم تیز کئے اور بابا عصر کو سلام کیا۔ انہوں نے چلتے چلتے ہی مصافحہ کیا۔ میں چلتے چلتے انہیں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو کچھ میں نے دیکھا' وہ بے حد متاثر کن تھا۔ ان کے صرف بال ہی نہیں' بھویں بلکہ پلکیں تک سفید تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عمر کے اعتبار سے وہ ضعیف ہیں لیکن سن کی سفیدی کے سوا باقی ہر چیز اس کی تردید کررہی تھی۔ ان کا چہرہ جھرّیوں سے پاک تھا۔ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ چہرے کی جلد شفاف اور بے داغ تھی۔ ان کی آنکھیں ایسی چمک دار تھیں کہ ان سے زیادہ دیر تک نظر ملانا ناممکن لگتا تھا لیکن میں نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ چند لمحے بعد ان کی آنکھوں سے نرماہٹ جھلکنے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ بالوں کی طرح آنکھیں بھی ان کی طویل العمری کی غمازی کررہی ہیں۔ ان میں مشاہدے اور تجربے کی گہرائی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

وہ مسکرائے "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا آتا ہے تمہیں؟" انہوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

مگر ان کے لفظوں نے مجھے گڑبڑادیا۔ میں ان سے بہت زیادہ مرعوب ہوچکا تھا "میں اس غیر ارادی گستاخی پر معافی چاہتا ہوں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

ان کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی "یہ گستاخی بالارادہ کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

میں ڈرا کہ شاید وہ مجھ پر طنز کررہے ہیں "میں اتنا گستاخ بھی نہیں۔"

"یہ بات نہیں" انہوں نے نرم لہجے میں کہا "مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔ وہ کامیاب رہتے ہیں۔ میں ان کے لیے نرم ہوجاتا ہوں" وہ کہتے کہتے خاموش ہوئے پھر بولے "اور تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ میرا چہرہ یاد رکھ کر تم آئندہ مجھے پہچان نہیں سکوگے۔ بنانے والے نے مجھے ایسے لچک دار خدوخال دیے ہیں کہ ایک معمولی سی جنبش سے میرا چہرہ یکسر تبدیل ہوجاتا ہے۔ لو دیکھو..." انہوں نے بھویں ذرا اوپر اٹھائیں' میں حیران رہ گیا۔ واقعی وہ چہرہ بالکل بدل گیا تھا "میری پہچان اور ہے..... میری چال' میری رفتار۔ چہرے پر نہ جاؤ۔"

میں اور زیادہ مرعوب ہوگیا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ نے ایک بات کہی تھی..."

"سب باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی" بابا عصر نے خشک لہجے میں کہا "پہلے کام کی بات ہوگی۔ تمہارے لیے ایک کام کا حکم آیا ہے اس لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔"

"اور میں اس پر حیران ہوں" میں نے کہا "میں تو کسی کام کا بھی نہیں۔ بے عمل اور نام کا مسلمان ہوں میں۔"

"اوپر والے کا اختیار تو جانتے ہو۔ وہ جب جسے چاہے ہدایت دے اور جب جسے چاہے گمراہ کردے۔"

"مگر میں نکما' ناکارہ انسان۔ مجھ میں تو کوئی خوبی بھی نہیں۔"

"ایک خوبی ہے..... پاکستان سے سچی محبت۔"

"یہی انہوں نے کہا تھا" میں نے اپنے رفیق کی طرف اشارہ کیا "لیکن میں اس کی اہمیت...."

بابا عصر نے میری بات کاٹ دی "یہ سب بعد میں سمجھایا جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ' کوئی ہنر ہے تمہارے پاس۔ اللہ نے کوئی بڑی طاقت دی ہے تمہیں۔"

"میں نے عرض کیا نا' میں بالکل بے کار آدمی ہوں۔"

"بے خبر' ناشکرے" بابا عصر نے گرج کر کہا "اللہ نے قلم نہیں دیا تجھے جو بہت بڑی طاقت ہے۔ اللہ نے لفظ نہیں دیے تجھے' جو بہت بڑی نعمت ہیں اور اس نے لفظوں کو استعمال کرنے اور برتنے کا سلیقہ نہیں دیا تجھے' جو بہت بڑا ہنر ہے۔ تیرے لفظوں کو تاثیر نہیں دی اس نے؟"

مجھ پر کپکپی چڑھ گئی "جی.... مجھے خیال نہیں رہا..."

"خیال اسی لیے نہیں رہا کہ تو نے کبھی ان کی اہمیت اور افادیت نہیں سمجھی" بابا عصر اب بھی غصے میں تھے "قلم کو طاقت' لفظوں کو نعمت اور لکھنے کی صلاحیت کو ہنر نہیں سمجھا اور جب آدمی نعمت کو نعمت نہیں سمجھے گا تو کفرانِ نعمت تو کرے گا ہی' اسی لیے تو سب کچھ رائگاں کرتا رہا۔ یاد رکھ' ناشکرا پن نعمت سے بے خبری کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔"

"بابا' اللہ کا شکر ہے۔ میں نے ناشکرا پن کبھی نہیں کیا۔"

"میری بات غور سے نہیں سنی تو نے۔ جب نعمت ملے' مگر آدمی اس سے بے خبر ہو تو شکر کیسے ادا کرے گا۔ سب سے اچھا شکر تو بہترین استفادہ ہے۔ اللہ نے لفظ دیے' قلم کی طاقت دی' تحریر کا ہنر دیا تو ان سب نعمتوں کو اللہ کے پیغام کی اشاعت کے لیے استعمال کر۔ یہ بہترین استفادہ ہے اور یہی شکرگزاری ہے اور یہ گمان بھی نہ کرنا کہ یہ تو اللہ کے لیے کررہا ہے۔ یہ تو اپنے لیے کررہا ہوگا۔ اللہ جب جسے چاہے' ہدایت دے سکتا ہے۔ تجھے وسیلہ بننے کی سعادت مل رہی ہے تو اس سے استفادہ کر۔"

"میں سمجھ گیا لیکن مجھے لکھنا کیا ہے؟" میں نے بے حد عاجزی سے کہا۔

"جو میں بتاتا رہوں' وہ لکھ۔ میں تجھے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے عروج وزوال کے متعلق بتاؤں گا' مکمل پس منظر فراہم کروں گا۔"

"یعنی مجھے تاریخ لکھنی ہوگی" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں۔ تاریخ تو بادشاہ لکھواتے ہیں اور وہ عموماً جھوٹی ہوتی ہے۔ دباؤ کے تحت لکھی جاتی ہے' اگر بادشاہ زندہ ہو۔ اور وہ مرجائے تو نفرت اور تعصب کے تحت بدلے اتارنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ تجھے تو وہی لکھنا ہے جو تو لکھتا ہے۔ تجھے کہانی لکھنی ہے لیکن اس میں اچھی تلقین اور ترغیب شامل کرنی ہے۔ تجھے اس کہانی میں لوگوں کو آگہی دینی ہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کرنا ہے۔"

"جی.... میں تیار ہوں۔ آپ مجھے پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتایئے۔"

"آج نہیں۔ کل بتاؤں گا" بابا عصر نے کہا۔ "آج کے بعد ہر روز تم رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے نکلو گے۔ میں تم سے ملوں گا اور تمہیں سب کچھ بتاتا' سمجھاتا رہوں گا۔ وہ بے ترتیب ہوگا۔ اسے ترتیب دینا تمہارا کام ہے۔ وہ بیک گراؤنڈ میٹریل ہوگا۔ اسے کہانی میں استعمال کرنا تمہارا کام ہوگا۔"

میں گھبرا گیا "آپ یونہی چلتے پھرتے بتایا کریں گے مجھے؟"

"ہاں' میں رکتا نہیں۔ رک ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر آپ کی کوئی بات مجھے یاد نہیں رہے گی' یہ میری کمزوری ہے۔"

انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھا "میری کہی ہوئی کوئی بات تم انشاء اللہ کبھی نہیں بھولو گے۔ لکھنے بیٹھو گے تو سب یاد آجائے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ نگاہوں کے سامنے نظر ہی آجائے اور ہاں' ذرا تیز چلنے کی عادت ڈالو۔ تمہاری خاطر آہستہ چلنے کی وجہ سے میں تھک گیا ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میرے تو ہانپنے کی نوبت آگئی تھی۔

"ایک کام اور ہے۔ وہ حارث بن عثمان تمہیں بتائیں گے" بابا عصر نے میرے رفیق کی طرف اشارہ کیا "اب میں چلتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی ان کی رفتار تیز ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں نے گہری سانس لے کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "تو آپ حارث بن عثمان ہیں؟"

"ہاں" انہوں نے کہا پھر بولے "چائے کی طلب ہورہی ہے۔ چلو تمہیں چائے پلادوں؟"

"چائے..... یہاں؟" میں نے حیرت سے کہا لیکن سر گھما کر دیکھا تو اور حیران ہوگیا۔ اس وقت میں اپنے علاقے کے بازار والی سڑک پر تھا۔ سامنے وہ ریسٹورنٹ تھا جو رمضان میں افطار سے لے کر ختمِ سحر تک کھلا رہتا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ..." حارث بن عثمان نے میرا ہاتھ تھام کر کہا اور ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

ہم نے چائے کے ساتھ ایک ایک پراٹھا کھایا۔ حارث بن عثمان نے بیرے سے مزید چائے لانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے

بولے "اصل چائے تو اب پئیں گے۔ وہ چائے تو پراٹھا پی گیا۔"

اس اندازِ بیان پر میں بھی مسکرا دیا۔ میں نے ریسٹورنٹ کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجے تھے۔ اس وقت بیرا چائے کی دو پیالیاں رکھ گیا۔ میں نے گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ چھ گھنٹے سے مجھے سگریٹ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے بے تابی سے سگریٹ نکال کر جلائی اور ایک گہرا کش لیا۔ دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ "اب تجسس میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" حارث بن عثمان نے پوچھا۔

"بہت سلسلے ہیں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔ آخر آپ میری اس کہانی کا بے حد اہم کردار ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی بتائیں کہ آج جو میرے ساتھ ہوا' یہ سب کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو مجھے ایک کام بھی سونپنا ہے۔"

"میرا تعارف تو ایسا کوئی خاص نہیں۔ تم جان چکے ہو کہ میرا نام حارث بن عثمان ہے۔ اب یہ بتا دوں کہ میں مہاجر ہوں...."

میں نے گرم جوشی سے ان کا ہاتھ تھام لیا "واہ' بہت خوب۔ میں بھی مہاجر ہوں۔"

انہوں نے سرد مہری سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "تم..... تم مہاجر کیسے ہو سکتے ہو؟" ان کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

"حیرت ہے۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بھئی میرے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔"

"اور تم یہاں پیدا ہوئے؟"

"جی ہاں..... ۱۹۵۶ء میں۔"

"یعنی پاکستان بننے کے نو سال بعد..... پاکستان میں" ان کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"جج..... جی ہاں" نہ جانے کیوں میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

"کوئی..... جہاں' اپنے گھر میں' حالتِ قیام میں پیدا ہوا ہو' وہاں مہاجر کیسے ہو سکتا ہے؟" حارث بن عثمان نے کہا "اور اللہ تعالیٰ نے مہاجر کی تعریف یہ کی ہے..... سو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی' نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں۔ مہاجر ہونا کوئی نسل در نسل منتقل ہونے والی وراثت تو نہیں۔ اس کا انحصار تو پرفارم کرنے پر ہے۔ جس نے ہجرت کی' وہ مہاجر ہے۔ تم ناشکرا پن کیوں کرتے ہو؟"

"جی' ٹھیک ہے۔ آپ نے درست فرمایا۔ میں تو آزاد سرزمین پر پیدا ہوا۔ میں تو پاکستانی ہوں" میں نے سر جھکا کر کہا "آپ اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"میں فلسطینی ہوں" انہوں نے سرد آہ بھر کے کہا "۱۳۶۶ھ کی شب برات کے موقع پر میں وہاں ایسی ہی ایک مسجد میں تھا..... آج کی طرح۔ وہاں بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں۔ پاکستان اس کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد قائم ہوا لیکن یقین کرو' وہاں پاکستان کے قیام کے لیے گڑگڑا کر دعائیں کی جا رہی تھیں۔ اس کے استحکام' اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی جا رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر ایک بزرگ سے استفسار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انشاء اللہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا اسلامی ملک ابھرنے والا ہے۔ یہ بڑا عظیم ملک ہو گا جیسے سرزمینِ عرب اسلام کا روحانی مرکز ہے اور قیامت تک رہے گا' ویسے ہی یہ نیا ملک اسلام کا عسکری مرکز ہو گا۔ یہ اسلام کا قلعہ اور مسلمانوں کی طاقت کا مرکز ہو گا۔ مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہوں' یہ ان کے تحفظ کی علامت ہو گا۔ طاغوتی طاقتیں جب کمزور مسلمانوں کو کچل رہی ہوں گی تو یہ ان کی داد رسی کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو گا۔ جب احیائے اسلام کی تحریک شروع ہو گی' حق و باطل آخری معرکے کے لیے صف آرا ہوں گے تو یہی ملک سب سے آگے ہو گا۔ یہی جذبۂ جہاد میں نئی روح پھونکے گا۔ یہی حق کی فتح میں کلیدی کردار ادا کرے گا" وہ کہتے کہتے رکے اور انہوں نے گہری سانس لی پھر انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا "مجھے اسی لمحے اس اَن دیکھی سرزمین سے عشق ہو گیا جسے اللہ جل شانہٗ نے اتنی سعادتیں بخشنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"پھر آپ یہاں آ گئے؟"

"نہیں۔ ایسے کوئی آ سکتا ہے۔ اشتیاق کتنا ہی ہو پھر یہ ہوا کہ یہودی غاصب آئے اور فلسطین پر چھا گئے۔ ہم سے ہماری زمینیں چھین لی گئیں۔ ہم گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ہم اللہ کی راہ میں ستائے جانے لگے۔ ہمیں کبھی حیلوں بہانوں سے اور کبھی کھلم کھلا نماز سے روکا جانے لگا۔ ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے تاریخ کی روشنی میں سمجھ لیا کہ ہجرت کا وقت آ گیا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ اچانک ایک نام کی پکار میرے اندر ابھری اور میرا پورا وجود جیسے روشن ہو گیا..... پاکستان! پوری دنیا کے مسلمانوں کے تحفظ کی علامت۔ تمام مسلمانوں کی داد رسی کا..... اسلام کی طاقت کا مرکز۔ سو میں جوش و جذبے سے بھرا پاکستان چلا آیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟ اور اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟"

"میں ۱۳۷۱ھ میں یہاں آیا۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگاتا رہا پھر بولا "تو اب آپ کی عمر ۶۵ سے زیادہ ہے۔"

"ہاں۔" حارث بن عثمان مسکرائے "مجھے ۴۵ سال ہو گئے یہاں آئے۔"

"آپ کی اتنی عمر لگتی نہیں۔ پھر آپ واپس نہیں گئے؟"

"نہیں۔ میں یہیں کا ہو گیا۔ پاکستان سے محبت مجھے پہلے ہی سے تھی۔ اب تو میں پاکستانی ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

"آپ کو اپنی زمین' اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

"جس سرزمین پر برائیاں پھیلنے لگیں' ظلم حد سے گزر جائے' اللہ کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہونے لگے اور نیکی کی

گنجائش نہ رہے اور آپ میں اصلاحِ احوال کی طاقت نہ ہو تو ہجرت کرلینی چاہیے اور زمین کی محبت یہ ہے کہ وہاں اس وقت تک واپس نہ جاؤ' جب تک تم میں بدی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی اور ظلم کا سر کچلنے کی طاقت نہ آجائے۔ میں بھی اسی طاقت کا منتظر ہوں۔ انشاءاللہ ایک دن اپنے وطن بھی جاؤں گا۔"

میرا دل خوب صورت مگر اَن جانے جذبوں سے بھر گیا۔ عجیب باتیں کرتے تھے حارث بن عثمان۔ جو کچھ اندر... بہت اندر تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا' وہ بھی سمجھ میں آنے لگتا تھا۔ اللہ کے احکامات کے تحت زندگی گزارنے کے طور طریقے' آداب اور قرینے سمجھ میں آنے لگتے تھے لیکن وہ سب بہت دور کی باتیں لگتی تھیں۔

"اندر اندھیرا بہت گہرا ہو تو ایسا ہی لگتا ہے" حارث بن عثمان نے میری سوچ پڑھ لی۔

"یہاں آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"ایک مسجد میں شب بسری کرتا ہوں۔ وہاں اذان دینا' مسجد کی دُھلائی صفائی میرے ذمے ہے" انہوں نے میری نگاہوں میں کچھ دیکھا تو جلدی سے وضاحت کی "اس کا معقول معاوضہ نہیں لیتا میں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل آتا ہوں۔ مزدوری تلاش کرتا ہوں۔ کچھ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ بوجھ بھی ڈھولیتا ہوں۔ گڑھا بھی کھودلیتا ہوں۔ محنت کا کوئی کام بھی ہو' اجرت پر بھی بحث نہیں کرتا۔ دو وقت پیٹ بھرنے ہی کا تو مسئلہ ہے۔ وہ بھی کیا مسئلہ ہے۔ فاقے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بازار کے سب دکان دار مجھے جانتے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی کام مل ہی جاتا ہے۔ تن ڈھانپنے کے لیے سال میں دو جوڑے بہت ہیں۔ ان کا بھی سامان میرا رزق دینے والا میری محنت کے بہانے کردیتا ہے۔ ایک جوڑا جمعتہ الوداع کے لیے اور دوسرا عید کے لیے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل ایک دم بھر آیا کہ زندگی یہ بھی ہوتی ہے۔

حارث بن عثمان میرے آنسو دیکھ کر بھڑک گئے "تم مجھ پر ترس کھاتے ہو اور مجھے تم پر ترس آتا ہے" انہوں نے برہمی سے کہا "میں کپڑوں کی آرزو نہیں کرتا۔ میرا رب دے دیتا ہے تو میں خوشی اور شکر گزاری سے روتا ہوں۔ تم کپڑوں کی فکر میں ہلکان ہوتے ہو۔ نہ ملیں تو اللہ سے شکوہ کرتے ہو اور دکھ سے روتے ہو۔ زندگی یہی ہے کہ میں سوکھی روٹی مل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے فاقے سے بچالیا۔ زندگی یہ نہیں کہ تم دو دن بگھاری ہوئی دال سے تازہ' نرم روٹی بے دلی سے کھا کر روتے اور شکوہ کرتے ہو کہ اے اللہ' تو نے ہمارے نصیب میں صرف دال ہی لکھ دی ہے' یہ کیا ظلم ہے۔"

کیسی سچی بات تھی۔ مجھ پر اللہ کا ایسا خوف طاری ہوا کہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔ اس لمحے میں اپنی ہر پریشانی بھول گیا تھا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں" میں نے کہا "زندگی وہ نہیں' جو ہم گزار رہے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں حارث بن عثمان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ کے بھائی بہن اور رشتے دار بھی تو ہوں گے۔ کیا وہ فلسطین میں ہی ہیں؟"

"اگر میں جواب اس انداز میں دوں کہ کروڑوں کلمہ گو بھائیوں کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تو یہ بہت بڑی ناشکری ہوگی۔ جہاں تک خونی رشتوں کا تعلق ہے تو...." انہوں نے ایک سرد آہ بھری "... میرے والدین' آٹھ بہن بھائی اور چار چچا' سب یہودیوں کے پھینکے ہوئے ایک بم کی نذر ہوگئے۔ سب شہید ہوگئے۔ ایک میں ہی بدنصیب' خوش نصیب بچا۔ سو میں ہجرت کر آیا۔"

"یہ بدنصیب' خوش نصیب کا کیا مطلب ہوا؟"

"ایسا خوش نصیب جو درحقیقت بدنصیب ہے۔"

"جان بچنا بدنصیبی تو نہیں ہوتی۔ یہ ناشکرا پن نہیں ہے؟"

"جان بچنا خوش نصیبی ہے لیکن موقع ہوتے ہوئے شہادت کا نہ ملنا اس سے بڑی بدنصیبی ہے اسی لیے میں خود کو ایسا خوش نصیب سمجھتا ہوں' جس کی بدنصیبی اس کی خوش نصیبی سے بڑی ہے۔"

"آپ مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کے بیوی بچے..."

"میں نے شادی ہی نہیں کی۔ اس طرزِ زندگی میں شادی نہ کرنا ہی بہتر تھا اور یقین کرو' میں ہمیشہ خوش رہا۔"

اس بار ان کی عید کا تصور کرکے میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ نہ گھر' نہ بیوی بچے' نہ کوئی اپنا۔ اور وطن سے دور! "آپ عید کے دن کیا کرتے ہیں؟"

"اتنے لوگوں سے عید ملتا ہوں کہ کوئی نہیں ملتا ہوگا" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "پہلے اپنی مسجد میں ہر شخص سے عید ملتا ہوں پھر باہر نکل آتا ہوں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہر جاننے والے' ہر اجنبی سے عید ملتا ہوں۔ پھر آگے ہی آگے چلتا جاتا ہوں۔ جو نظر آجائے' اس سے عید ملتا ہوں۔ چلتا چلا جاتا ہوں..... آگے ہی آگے..... لوگوں سے عید ملتا ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کون سی بستی' کون سا علاقہ ہے۔ عصر پڑھ کر واپس چلنا شروع کرتا ہوں اور اگلے دن سے پھر معمول شروع۔"

میرا دل اور بھر آیا "میری ایک بات مانیں گے۔"

"کہو' کوشش کروں گا کہ مان لوں۔"

"آپ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیں۔ میرے ساتھ رہیں۔ میرے بیوی بچے آپ سے بہت خوش ہوں گے۔"

"برخوردار.... تم نے جس خلوص اور محبت سے یہ بات کہی ہے' اسے ٹالنا نہیں چاہیے لیکن خود سوچو' اللہ کے گھر مہمانی کی سعادت سے منہ موڑ کر کیسے آسکتا ہوں۔"

بات ایسی تھی.... اور انہوں نے ایسے لہجے میں کہی تھی کہ میں اصرار نہ کرسکا پھر بھی میں نے کہا "تو ٹھیک ہے۔ آپ عید تک تو میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ٹال کر تمہارے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے کہا پھر گہری سانس لے کر بولے۔

"اپنے بارے میں' میں نے بتادیا۔ اب آگے چلو۔ آج جو کچھ ہوا' تم جان چکے کہ تمہیں کس لیے بلایا گیا تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اب اس مسجد کا سن لو۔ وہاں شکر ادا کرنے والوں میں شہدا بھی تھے اور اللہ کے مقرب صالحین بھی۔ اور وہاں کون کون سی بڑی ہستیاں تھیں' یہ میں بھی نہیں جانتا۔ میں ایک عام انسان ہوں.... اور عام انسانوں سے زیادہ گناہ گار۔ اللہ کا کرم کہ مجھے وہاں حاضری کی سعادت ملی۔ ہاں' میں یہ جانتا ہوں کہ ایسے اجتماع ہوتے رہتے ہیں اور وہی اس ملک میں خیروبرکت کا باعث ہیں۔"

"اور آپ کو مجھے کون سا کام سونپنا ہے؟"

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا پھر انہوں نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔

میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

میں نے اشرفیوں کے متعلق سنا تھا' پڑھا تھا لیکن اشرفیاں دیکھی کبھی نہیں تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ اشرفیاں ہیں۔ میں سحرزدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔ لیکن چند لمحے بعد مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ اشرفیاں نہیں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اشرفیاں سونے کی ہوتی ہیں۔ ابتدا میں وہ مجھے طلائی رنگت کی لگیں مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ ان کی رنگت اس دنیا کی چیز تو نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ رنگت بدل رہی ہوں.... یا ان میں سے مختلف رنگوں کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ ان کا ایک ہی رنگ تھا۔ دنیا میں جو رنگ ہوتے ہیں' ان کے حساب سے وہ سنہرے رنگ سے قریب تر تھا لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ سنہرا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندر جو شیڈ جھلملا رہے تھے' وہ بھی سنہرے رنگ ہی کے تھے۔ بہرحال مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی ارضی شے نہیں' ان کا تعلق سماوات سے ہے۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ وہ شفاف نہیں تھیں لیکن شفاف ہونے کا تاثر دے رہی تھیں۔

میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ان پر ہم رنگ حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو نظر آگیا۔ ان پر اللہ لکھا تھا۔

میری عجیب کیفیت ہوگئی۔ جی چاہا کہ سب کچھ بھول کر سجدوں کے متعلق سوچے بغیر وہیں سجدے میں گر جاؤں۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ باطنی اور روحانی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ میرا دل' میرا دماغ..... بلکہ میرے تمام اعضا حالتِ سجدہ میں ہیں۔ اور ہر بنِ مُو سے سبحان ربی الاعلیٰ کی صدا آرہی ہے۔ اسی کیفیت میں' میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں..... یک لخت میری سوچیں تک ساکت ہوگئیں۔ صرف اس لیے کہ میں انہیں اشرفی کہنا چاہ رہا تھا۔ تو پھر میں انہیں کیا کہوں' میں نے... بے بسی سے سوچا اور ایک دم میرے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ یہ نورانی مہریں ہیں بے وقوف..... مہرِ وحدانیت!

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ حارث بن عثمان کی کھلی ہوئی ہتھیلیوں پر وہ نورانی مہریں رکھی تھیں اور میں انہیں تکے جارہا تھا۔ جانے کتنی دیر از خود رفتگی کی یہ کیفیت رہی۔ پھر میرے دل میں ایک خواہش بڑی شدت سے ابھری۔ اتنی شدت سے کہ میں احتراماً بھی اس سے لڑ نہ سکا۔ میں نے حارث بن عثمان سے بے حد گھگیا کر کہا "یہ مجھے دکھائیں گے۔ میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرائے "کیوں نہیں۔ یہ تو ہیں ہی تمہارے لیے۔ یہی تمہارا دوسرا کام ہے' جو مجھے تم کو سونپنا تھا" یہ کہہ کر انہوں نے وہ نورانی مہریں مجھے دے دیں۔

وہ مہریں میرے ہاتھوں میں آئیں تو جسم میں ایک ادای دوڑنے لگی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے لگا کہ کوئی پانی بہا بہا کر اندر سے مجھے خوب رگڑ رگڑ کر دھو رہا ہے اور میں پاک ہو رہا ہوں۔ آنسو دیر تک بہتے رہے اور بہتے بہتے خود ہی رک بھی گئے۔ اب میں ان کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

مجھے اچنبھا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت ہلکی ہوں گی۔ سونے کا بہت وزن نہیں ہوتا لیکن وہ مہریں میری توقع سے بہت بھاری تھیں۔ مگر میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کے قیمتی ہونے کا خیال نہیں ابھرا۔ ان کے مقدس اور متبرک ہونے کے پہلے تاثر نے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے لفظ اللہ پر انگلی پھیری۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ حروف نہ لکھے ہوئے ہیں اور نہ کندہ ہیں۔ اسم ذات اس مہر کی سطح پر نہیں تھا۔ وہ اس کے اندر گہرائی میں تھا۔ میری انگلیاں اسے چھو نہیں سکتی تھیں۔

پھر میرے اندر ایک اور تجسس ابھرا۔ میں نے تکیہ جیسی' کسی بڑے سکّے جیسی اس مہر کو پلٹ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو میری دھڑکن رک سی گئی۔ دوسری طرف خوشنما نورانی حروف میں کلمۂ طیبہ لکھا تھا۔ میں نے انگلی پھیری۔ وہ بھی سطح پر تحریر نہیں تھا بلکہ اس مہر کے بطن میں تھا۔

میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہوگیا۔ احترام نے میرے وجود کو شل کر دیا تھا!

جانے کتنی دیر بعد یہ کیفیت ختم ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر حارث بن عثمان کو دیکھا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "شاید آپ نے کہا تھا کہ یہ میرے ہی لیے ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہی تمہارا دوسرا کام ہے جو مجھے تم کو سونپنا تھا" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذرا وضاحت کریں۔"

"ان میں سے ایک تمہارے لیے ہے یعنی تم چاہو تو اسے رکھ سکتے ہو۔ دوسری اللہ کی امانت ہے۔ بہت بھاری ذمے داری ہے۔" انہوں نے کہا اور ایک گہری سانس لی پھر وہ دوبارہ گویا ہوئے "جو امانت ہے' وہ تمہیں کسی اور کو دینی ہے..... کسی ایسے شخص کو جو امین اور دیانت دار ہو اور تمہیں اس کو یہی ہدایت دینی ہے جو میں نے تمہیں دی ہے۔ یعنی وہ کسی امین اور دیانت دار آدمی کو یہ مہر

اسی ہدایت کے ساتھ سونپ دے۔"

"یعنی یہ مہر سفر کرتی رہے گی..... ایک ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ...."

"امین اور دیانت دار لوگوں کے درمیان" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن ایسے لوگ ہیں کہاں؟" میں نے گھبرا کر کہا "انہیں دیکھ کر تو کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری نیت تو خراب نہیں ہوئی؟" انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی... نہیں ہوئی..... اور میں خود اس پر حیران ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں امین اور دیانت دار نہیں ہوں" میں نے کہا۔ "میری نیت شاید اس لیے خراب نہیں ہوئی کہ ایک مہر میرے تصرف میں دے دی گئی ہے۔"

"اللہ تمہیں تم سے بہتر جانتا ہے۔"

"لیکن غرض کے سارے ضرورت مندوں کے اس ہجوم میں' میں ایسا آدمی کہاں تلاش کروں گا۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ اس کی حفاظت بہت مشکل کام ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو کوئی کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔" میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

"اس کی حفاظت تمہاری ذمے داری نہیں" حارث بن عثمان نے خشک لہجے میں کہا "کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کرلے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' نہ اس کی بے حرمتی ہو سکتی ہے۔ یاد کرو' انجیل اور تورات بھی اللہ کی کتابیں ہیں لیکن آج کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس تحریف و ترمیم سے پاک ایسی انجیل مقدس یا تورات موجود ہے.... بالکل ویسی ہی' جیسی آسمان سے اتری تھی۔ کوئی دعویٰ کرے تو اس پر یقین کوئی نہیں کرے گا اور اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تو آج اس میں کہیں اعراب کا بھی فرق نہیں ہے۔ تو برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔"

"لیکن میں نے اسے غلط ہاتھوں میں دے دیا تو؟" مجھے ان کے جواب سے ڈھارس تو ہوئی لیکن میں اب بھی گھبرایا ہوا تھا۔

"دیکھو آفاق' اس ملک میں صرف ایک کمی ہے۔ یہاں سیاست داں اور اربابِ اقتدار مصلحت کوش' مفاد پرست اور خودغرض ہیں۔ بڑے بڑے جاگیردار' صنعت کار اور پیسے والے زیادہ تر بے ایمان ہیں لیکن عام' غریب آدمی ایسا نہیں۔ ایک ضرورت مند بھوکے کی بے ایمانی اور ایک صاحب ثروت تونگر کی بے ایمانی میں فرق کرنا سیکھو۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو' اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حرام کو بھی جائز کر دیا ہے۔ جب اس انداز میں سوچنے لگو گے تو اتنے مایوس نہیں رہو گے۔ رونا ان لوگوں کا نہیں جنہیں ضرورت بے ایمان بنا دیتی ہے۔ رونا ان لوگوں کا ہے جن کے پاس سب کچھ ہے۔ مگر وہ عادتاً بے ایمانی کرتے ہیں۔ ہوس کے غلام ہو کر بے ایمانی کرتے ہیں۔"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے۔"

وہ مسکرائے "مگر پھر بھی اسے یاد رکھنا' اسے لکھنا۔ تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ سے بھی غلط ہاتھوں میں جائے گی' وہاں ٹھہرے گی نہیں۔ واپس انہی ہاتھوں میں آجائے گی۔ خواہ وہ ہاتھ تمہارے ہوں یا اگلے مرحلے کے کسی امین کے۔"

میں نے سکون کی سانس لی "لیکن یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟"

"حکم کی تعمیل کے لیے وضاحت ضروری نہیں ہوتی" حارث بن عثمان نے سخت لہجے میں کہا پھر مسکرائے "لیکن اس معاملے میں سب کچھ بتا دیا گیا ہے اور جو کچھ بتایا گیا ہے' ان مہروں کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے بھی آگے بڑھانا ضروری ہے۔ اسے بھی ہدایات کا حصہ سمجھ لو۔ یہ نورانی اشرفیاں یا اللہ کی مہریں پاکستان کی آزادی' خودانحصاری' استحکام اور اسلام کی عظمت اور سربلندی کی علامت اور امین ہیں۔ ان کی منزل پاکستان کا قومی خزانہ ہے۔ انہیں مختلف ہاتھوں سے گزرتے ہوئے پاکستان کے قومی خزانے تک پہنچنا ہے۔ جس دن یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا' اس دن سے پاکستان میں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اس ملک میں خیروبرکت ہوگی۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ عہدِ نو کے تمام بت توڑ دیے جائیں گے۔ اسلام کی چیلنج کرتی ہوئی للکار پوری دنیا میں گونجے گی۔ اس اشرفی کا مجوزہ سفر جتنا طویل ہوگا' اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی' لیکن تکلیف کے بعد ہی راحت ہوتی ہے۔"

"مگر اللہ تو بڑا کارساز ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ پھر اتنے پیچ کی کیا ضرورت ہے" میں نے اعتراض کیا۔

"اللہ کے ہر کام میں بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں۔ یاد کرو' حق و باطل کے آخری معرکے سے پہلے کی صورتِ حال کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔ مسلمان ہر جگہ خوار و زبوں ہوں گے۔ ان کے حوصلے پست ہوں گے۔ وہ تنزلی کی آخری حد پر ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ مٹھی بھر رہ جائیں گے۔ پھر وہ اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور طاغوتی قوتوں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ سنو آفاق' کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی ان مٹھی بھر مسلمانوں میں شامل ہو؟"

"کیوں نہیں" میں نے آزردگی سے کہا "لیکن میرے اعمال ایسے نہیں۔"

"اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اب سنو' یہ نورانی اشرفی اللہ کی ہدایت بھی ہے۔ یہ ان مٹھی بھر سعادت مند اور ہدایت یافتہ خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی دعوت بھی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں بھی یہ پہنچے گی' اسے گویا اللہ کی تائید و ہدایت پہنچے گی۔ خیروبرکت ملے گی اسے۔ وہ خوش نصیب ہوگا اور جو اسے دیانت داری کے ساتھ آگے بڑھا دے گا' اس کی خوش نصیبی پر مہرِ تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ مگر ان خوش نصیبوں میں جس کی نیت میں فتور ہوا' فطرت میں بے ایمانی ہوئی' اس کے پاس سے یہ واپس آجائے گی اور ایسا شخص بدنصیب ہوگا۔ وہ ہر سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے گا۔ یوں ہر مسلمان کو خوش نصیبوں میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ آگے اس کا عمل' اس کا نصیب۔"

"سبحان اللہ..... میں سمجھ گیا۔ یہ تو اللہ کی بڑی رحمت ہے۔"

میں نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"اب دوسرے پہلو سے دیکھو" حارث بن عثمان بولے "یہ معاشرہ اب انحطاط کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ یہاں نیچے سے اوپر تک' عام آدمی کی جیب سے قومی خزانے تک بے برکتی کا دور دورہ ہے۔ اخراجات آمدنی سے زیادہ ہیں۔ قرض سے گزارہ ہوتا ہے اور قرض کا بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ بے سکونی ہے اور مسلسل بے سکونی مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ اور مایوسی وہ چیز ہے کہ بڑھ جائے تو نیکی اور اچھائی کے امکان کو بھی کھا جاتی ہے۔ کسی کو کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اچھا فرد بھی اپنی اچھائی کو بھول کر برائی میں ملوث ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بیشتر لوگوں کو اللہ کا خیال ہی نہیں آتا۔ نہ برائی کرتے ہوئے خوف کے حوالے سے۔ نہ مستقبل کی سوچتے ہوئے دعا کے حوالے سے اور جنہیں اللہ کا خیال ہوتا ہے' وہ سوچتے ہیں کہ اللہ سے کس منہ سے کچھ مانگیں۔ ہمارے اعمال ہی ایسے نہیں۔ دونوں برائیاں ہیں' ایک بہت بڑی اور دوسری چھوٹی۔ بھئی اللہ سے ہدایت تو مانگے بندہ۔ استغفار تو کرلے۔ یہ کیسی نقصان دہ شرمندگی ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی چھوڑ دے۔" انہوں نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ ان کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ "یہ نورانی اشرفی جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا' وہ ایسی خیروبرکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی۔ پھر جب وہ اشرفی اس کے پاس واپس نہیں آئے گی تو اس کا معاشرے کی اچھائی پر اعتماد بحال ہونا شروع ہوگا۔ یہ نیکی کے فروغ کا آغاز ہوگا۔ ایسا شخص سوچے گا کہ ابھی معاشرے میں اچھے لوگ بھی ہیں..... اور بہت اچھے بھی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی..... اپنی اچھائی کا بھی یقین ہوگا اور اس شخص کی اچھائی کا بھی' جسے اس نے یہ امانت سونپی اور وہ اس کے پاس پلٹ کر نہیں آئی۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا" میں نے جوش سے کہا "میں خوش نصیب ہوں اور انشاء اللہ مجھے اللہ کی ہدایت بھی نصیب ہوگی۔"

"انشاء اللہ" حارث بن عثمان نے بے حد خلوص سے کہا۔ "اور میری دعا ہے کہ اشرفی کا یہ سفر تیز رفتاری سے تکمیل کو پہنچے اور مختصر بھی ثابت ہو۔ کیونکہ جن لوگوں تک یہ اشرفی نہیں پہنچے گی' وہ ویسے ہی ہدایت یافتہ ہو جائیں گے..... بغیر کسی آزمائش کے۔ ہاں' یہ بے ایمانوں کو الگ اور نمایاں کردے گی۔"

یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ بس مجھے اس کو لکھنا تھا۔ میرے ذہن میں نئی کہانی کے خدوخال ابھرنے لگے۔

"چلو..... اب چلیں" حارث بن عثمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

○☆○

اس روز سحری مجھے بہت اچھی لگی۔ اس لیے کہ وہ میری پہلی سحری تھی ورنہ میں اس وقت سو رہا ہوتا تھا۔ بچے روز ہی اٹھتے اور سحری کرتے تھے لیکن اس روز حارث بن عثمان کو دیکھ کر وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے حارث کو از خود ماموں بنا لیا تھا "ماموں' اب آپ ہمارے پاس ہی رہیں" میرے بڑے بیٹے نے کہا۔

"عید تک تو تمہارے ساتھ ہیں بیٹے!" حارث بن عثمان نے کہا "لیکن اس کے بعد ہمارے کام شروع ہو جائیں گے۔"

"ماموں' آپ کو کہانیاں آتی ہیں؟" میری چھوٹی بیٹی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا' کہانیاں تو ہمارے پاس بہت ہیں اور ایسی ہیں کہ نہ کوئی سنائے گا' نہ لکھ سکے گا" حارث نے بڑی محبت سے کہا۔

"بس پھر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے" میری بیٹی نے فیصلہ سنا دیا۔

میرا بیٹا کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ "ماموں' ایک ترکیب ہے۔ آپ دن بھر اپنا کام کریں اور رات کو ہمارے پاس آجایا کریں۔ ہم آپ کی کہانی سنتے سنتے آپ کے پاس سو جایا کریں گے' ٹھیک ہے نا؟"

اس کے انداز میں اتنی معصومیت تھی کہ حارث انکار نہ کرسکے۔ تائید میں سر ہلا کر رہ گئے۔

میری بیوی ناہید کا رویہ حارث کے ساتھ بے حد احترام آمیز تھا۔ وہ بار بار ان کی طرف کوئی چیز بڑھاتی "یہ لیجئے نا بھائی جان۔ آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔"

"نہیں بہن' سچ کہہ رہا ہوں۔ سحری میں اتنا زیادہ اور اتنا اچھا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ ڈر رہا ہوں کہ بدہضمی نہ ہو جائے۔"

میرے ذہن میں ان کی سحری کا تصور لہرا گیا۔ وہ سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر کھا رہے تھے۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"کھائیں گے تو بدہضمی ہوگی' لیجئے نا" ناہید نے حارث سے اصرار کیا۔

دو منٹ بعد حارث نے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اذان بھی دینی ہے۔"

"میں بھی چلتا ہوں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ناہید کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ میں فجر پڑھنے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔

ہم گھر سے نکلنے لگے تو ناہید نے حارث سے کہا "بھائی جان' افطار سے پہلے گھر آجایئے گا۔ روزہ یہیں افطار کرنا ہے۔"

"لیکن مسجد..... اذان..." حارث کے لہجے میں الجھن تھی۔

"مسجد میں بتا دیجئے گا۔ اذان کوئی بھی دے دے گا" میں نے کہا کیونکہ میں واقف حال تھا۔

"ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ میں افطار سے پہلے آجاؤں گا۔ اچھا بہن' فی امان اللہ۔"

ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے مسجد پہنچ گئے۔ مجھے پہلی صف میں جگہ مل گئی۔ وقت ہوا تو حارث بن عثمان نے اذان دی۔ ان کی آواز اور لہجے میں شیرینی' نرمی اور سوز کا عجیب امتزاج تھا۔ میں

نے محسوس کیا کہ ان کی پکار اندر اتر کر جگانے اور مسجد کی طرف بلانے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہے۔

نماز کے بعد میں حارث سے ملا۔ انہوں نے کہا "تم جاؤ برخوردار۔ میں تو اب کام کے وقت ہی مسجد سے نکلوں گا۔"

میں انہیں سلام کرکے مسجد سے نکل آیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ کیسی مبارک صبح ہے۔ آج پاکستان پچاس سال کا ہوگیا اور یہ کیسی مبارک صبح ہے کہ مجھ سا بدنصیب دن چڑھے تک سوتے رہنے والا آج جاگا ہوا ہے۔ مجھے سحری اور روزہ نصیب ہوا۔ میں نے فجر پڑھی اور اب پچاس سالہ پاکستان کے نئے سال کی پہلی صبح کا سورج طلوع ہوتے دیکھوں گا۔ اللہ.... میرے رب..... میرے معبود' تیرا کرم ہے۔ تیرا شکر ہے۔

میں گھر پہنچا تو ناہید بچوں کو اسکول کے لیے تیار کررہی تھی۔ میں سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ اس وقت میری کیفیت عجیب تھی۔ میرے وجود میں شکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ آنکھیں رہ رہ کر نم ہوئی جارہی تھیں۔ میں نے پچاس سالہ پاکستان پر تنے ہوئے شفاف نیلے آسمان کو دیکھا۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کی ایک ڈار میرے سر کے عین اوپر سے گزری۔ میرے زینے کی ریلنگ سے چپٹی ہوئی چنبیلی نے خوشبو کی زبان میں اللہ کی حمد وثنا اور اس کا شکر ادا کیا۔ میرے جسم سے صبح کی خنک ہوا کا خوش گوار جھونکا ٹکرایا۔ اسی جھونکے نے گملے میں لگے پودے سے کچھ سرگوشی کی۔ پتے جھومے اور اللہ کی ثنا کا گیت گانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ سامنے والے تمام مکانات' یہاں تک کہ وہ بلڈنگ' جس کے فلیٹ میں' میں رہتا ہوں اور ادھر اُدھر استادہ درخت' سب رب واحد کے حضور سجدہ ریز ہوگئے ہیں۔ حمد وثنا میں مصروف ہیں۔ اس کا شکر ادا کررہے ہیں۔ میں پانی پانی ہوگیا اور وہ سمندر میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ میں بے اختیار سجدے میں گرگیا۔ وہ شکر اور استغفار کا لمحہ تھا۔

بعد میں' میں سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ کی کتنی نعمتیں ہماری نظروں کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر انہیں دیکھنا تو درکنار' ہم بدنصیب انہیں محسوس کیے بغیر ناشکرے پن سے سوچتے ہوئے محرومی' اضطراب اور بے سکونی کے راستے پر چلے جاتے ہیں..... چلتے..... بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کتنی خوشیاں' کتنی سرشاریاں' کتنی طمانیت' کتنی آسودگی' اللہ نے چپے چپے پر ہمارے لیے بکھیری ہوتی ہے لیکن ہم اس سے خود کو محروم کرلیتے ہیں۔

وہ شب انقلاب کے بعد کی پہلی صبح تھی!

○☆○

مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس روز خیروبرکت کا مفہوم مجھ پر کھلے گا!

بچے اسکول چلے گئے تو میں سیڑھیوں سے اٹھا اور فلیٹ کا دروازہ بند کرکے اپنی اسٹڈی میں آبیٹھا۔ میز پر میرے رائٹنگ پیڈ کا کھلا اور نامکمل صفحہ مجھے کہانی کے پیچ کی یاد دلانے کی کوشش کررہا تھا لیکن میری توجہ اس طرف بالکل نہیں تھی۔

ناہید برتن وغیرہ سمیٹنے کے بعد اب انہیں دھونے اور کچن کی صفائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ میں اس وقت ایسا سکون محسوس کررہا تھا..... ایسا بے پایاں سکون جو میرے لیے بالکل نیا تھا۔

میں نے وہ نورانی مہریں یا اشرفیاں جیب سے نکالیں اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر انہیں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ وہ میری ہتھیلی پر ایسی پوزیشن میں رکھی تھیں کہ ایک کا اللہ کے نام والا اور دوسری کا کلمۂ طیبہ والا رخ اوپر تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پھر میری کیفیت عجیب ہوگئی۔ میرا جسم لرزنے لگا لیکن اس کا سبب خوف نہیں' ایک عجیب سا کیف وسرور تھا۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ میرا وہ ہاتھ بے اختیار کپکپایا' جس پر وہ نورانی اشرفیاں رکھی تھیں..... اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ نیچے گرتی نظر آئیں۔ میں انہیں فرش پر گرنے سے بچانے..... انہیں ہوا میں پکڑنے کے لیے جھپٹا..... لیکن ناکام رہا۔ وہ فرش پر گرگئیں۔

اللہ کے نام اور کلمۂ طیبہ کی بے حرمتی اور اپنی کوتاہی کے تصور نے مجھے نیم جاں کردیا۔ میں پوری جان سے کانپ رہا تھا۔ میں نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر انہیں فرش سے اٹھانا چاہا لیکن میرا ہاتھ ان سے کوئی چھ انچ اوپر ہی ساکت ہوگیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھتا رہا۔ میرے کانوں میں حارث بن عثمان کی آواز گونجی..... کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کرے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کی بے حرمتی ہوسکتی ہے..... اور برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔

میں حیرت اور بے یقینی سے تکتا رہا۔ فرش پر گرتے ہی..... بلکہ شاید اس سے پہلے ہی وہ نورانی مہریں ہیئت بدل چکی تھیں۔ ان کی رنگت اب طلائی تھی..... عام سونے جیسی۔ وہ نورانی رنگت جس کی وجہ سے وہ شفاف لگتی تھیں' جس کی وجہ سے ان کے اندر سنہری شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں' وہ غائب ہوچکی تھی۔ اب ان کی وہ سادی رنگت نہیں تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ پرانے زمانے کی اشرفیاں بالکل ایسی ہوتی ہوں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اندر موجود اللہ کا نام اور کلمۂ طیبہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

سب کچھ بدل گیا تھا مگر میں اب بھی ان کی بے حرمتی کے خیال سے لرزاں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان عام اشرفیوں کو چھوا۔ وہ واقعی عام اشرفیوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط بھری نرمی سے انہیں اٹھایا اور پھر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ اگلا لمحہ پھر حیرت کا تھا۔ میری ہتھیلی پر وہی نورانی اشرفیاں رکھی تھیں۔ ایک میں اللہ کے نام اور دوسری میں کلمۂ طیبہ کے نورانی حروف نظر آرہے تھے۔

اسٹڈی کے دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری تو میں نے نورانی اشرفیوں کو جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔ ناہید اندر آئی اور اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے' سوئے نہیں تم؟ تم تو رات کو جاگتے نہیں ہو۔ نیند کے بہت پکے ہو۔"

"ہاں' مجھے بھی حیرت ہے" میں نے کہا "مگر مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"واقعی..... حیرت کی بات ہے" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

مجھے ایک خلش ستارہی تھی "میں حارث بن عثمان کولایا' تمہیں برا تو نہیں لگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"دراصل گھر کی صورتِ حال ایسی ہے کہ ممکن ہے تمہیں وہ بوجھ لگے ہوں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو ان کا آنا اچھا لگا۔ اس لیے تو ان سے انتظار سے پہلے آنے پر اصرار کیا۔ ہاں یہ افسوس ہوا کہ ان کی ٹھیک سے خاطر نہیں کرسکے ہم۔ برا لگنے کا تو سوال ہی نہیں۔ مجھے تو وہ پہلی نظر میں بھا گئے۔ بہت بابرکت انسان ہیں۔"

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"بھئی..... تم نے رات عبادت کی۔ پھر روزہ رکھا۔ فجر پڑھی ماشاءاللہ۔ اور برکت کیا ہوتی ہے؟"

میں کھسیا گیا "اللہ کی دی ہوئی توفیق ہے یہ تو۔"

"اچھے لوگوں کی سنگت بھی فیض پہنچاتی ہے" ناہید نے عالمانہ انداز میں کہا "اچھا' یہ تو بتاؤ' ان سے ملے کیسے؟"

میں ناہید کو اشرفیوں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ بہرکیف اسی لیے اس کو تفصیل بھی نہیں بتا سکتا تھا "مسجد میں ملاقات ہوئی تھی" میں نے مختصراً کہا۔

"ان کے متعلق بھی تو بتاؤ..... گھر..... بیوی..... بچے.....؟"

میں سوچ میں پڑگیا کہ اس سوال کا جواب دینے سے کیسے بچوں۔ اسی لمحے میرے دماغ میں جیسے روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کہانی کی رکاوٹ دور ہوگئی تھی۔ کہانی کے پیچ کا بہترین حل مجھے سوجھ گیا تھا "ناہید..... بس اب تم جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میرے لہجے میں مسرت اور سنسنی تھی۔

"ارے..... یہ تمہیں کیا ہوگیا اچانک؟" ناہید نے حیرت سے پوچھا۔

"کہانی کا پیچ دور ہوگیا۔ مسئلہ حل ہوگیا' اب مجھے لکھنا ہے۔"

ناہید بھی خوش ہوگئی "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کل کہانی دے کر پیسے لے آؤ تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ سنو' آج تک کا گزارہ تو ہوجائے گا نا۔"

"ہاں لیکن کل کی سحری کا نہیں پتا۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب مجھے لکھنے دو' تم جاؤ۔"

ناہید اٹھنے لگی مگر اچانک اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر ابھرا۔

"سنو..... کیا اب تم روزہ توڑ دو گے؟" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا "اللہ نہ کرے' روزہ کیوں توڑوں گا میں؟"

"خود ہی تو کہتے ہو کہ سگریٹ کے بغیر کام نہیں ہوتا ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا اس بات کا" میں نے گہری سانس لے کر کہا "خیر..... کچھ بھی ہو۔ روزہ تو میں توڑنے والا نہیں۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ پیچ دور ہوگیا ہے۔ کم از کم میں اسے تو نوٹ کرہی لوں گا۔"

ناہید کے چہرے پر مایوسی کا سایہ دیکھ کر مجھے رنج ہوا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کہانی مکمل نہیں ہوئی اور میں وہ لے کر نہیں گیا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ کل سے فاقے شروع۔ اور اب تو عید میں بھی زیادہ سے زیادہ تین دن ہیں۔ عید پر کیا ہوگا۔ خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کہانی مکمل ہونے کا امکان سامنے ہوتے ہوئے بھی روزے سے دستبردار ہونے کا خیال میرے ذہن میں بھی نہیں آیا۔ دیکھا جائے گا۔ میرے اندر کسی نے بڑی بے پروائی سے کہا لیکن میں نے ناہید کو حوصلہ دینے کے لیے بے حد امید افزا لہجے میں کہا "اور کیا پتا' کام ہی ہوجائے۔"

لیکن میرا دلاسا بھی اس کی آنکھوں میں امید نہ چمکا سکا۔ بہرحال وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

میں اپنے پیڈ پر جھک گیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ ذہن میں آنے والی ان نئی تفصیلات کو نوٹ کرلوں گا' جنہوں نے کہانی کی رکاوٹ دور کی ہے۔ مگر ہوا یہ کہ میں نے نامکمل کہانی آگے بڑھادی۔ پھر میرا قلم اتنی روانی سے چلا اور کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ صفحے کے صفحے سیاہ ہونے لگے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی اتنی تیز رفتاری سے کام نہیں کیا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس دوران میں مجھے سگریٹ کی طلب بھی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ خیال تک نہیں آیا تھا۔

کلاک نے ایک بجایا تو میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں سات صفحے لکھ چکا ہوں۔ اب میرے اندازے کے مطابق کہانی بمشکل تین ساڑھے تین صفحے کی اور تھی۔ سچی بات یہ کہ کہانی کو اس مقام پر چھوڑ کر اٹھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر باطن کی کسی قوت نے مجھے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں نے جاکر وضو کیا اور گھر میں ہی نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ کہانی میں دھیان ہونے کی وجہ سے میں بس جیسے تیسے نماز پڑھ سکوں گا مگر اس نماز میں مجھے معلوم ہوگیا کہ اللہ کی توفیق و تائید اور اس کی عنایت کیا ہوتی ہے۔ میں نے وہ ایسی نماز پڑھی کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ نماز میں ایسی یکسوئی اور ارتکاز تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

نماز پڑھ کر میں دوبارہ اسٹڈی میں آگیا مگر اس بار مجھ سے لکھا نہیں گیا۔ ایک سطر لکھتے لکھتے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ خاصی دیر کی ناکام کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب سگریٹ کے بغیر

کام نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں مطمئن تھا۔ اب اختتام تک کہانی میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اور زیادہ کام بھی نہیں تھا۔ افطار کے بعد میں اسے بہ آسانی مکمل کر سکتا تھا۔

مجھ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں ہلکا پھلکا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔ نیند آنے لگی۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ فوراً ہی نیند بھی آگئی۔

سو کر اٹھا تو چار بجے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر میں تازہ دم ہوا اور اسٹڈی میں آگیا۔ میں نے لکھنے کی نیم دلانہ کوشش کی لیکن پھر سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ میں نے قلم بند کر کے رکھا اور پاؤں پھیلا کر سکون سے بیٹھ گیا۔

اسی وقت ناہید اسٹڈی میں چلی آئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج افطار کا اہتمام ہونا چاہیے تھا" وہ افسردگی سے بولی۔

"تو پھر؟"

"گھر میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ نہ بیسن' نہ تیل۔ ورنہ پکوڑے تل لیتی۔ دودھ ہوتا تو شربت بن جاتا۔ کل کے بچے ہوئے تھوڑے سے پھل ہیں مگر ان سے بہت تھوڑی چاٹ بنے گی۔ اور تم جانتے ہو کہ بچے ہمارے فروٹ چاٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ تو کسی کو کھانے ہی نہیں دیں گے۔"

"تو کیا ہوا۔ کام چل جائے گا" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم اس طرح پریشان ہو رہی ہو۔"

"خاص بات نہیں' باتیں ہیں آج۔ ۲۷واں روزہ ہے۔ تم نے روزہ رکھا ہے اور حارث بھائی بھی ہمارے ساتھ افطار کریں گے۔"

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کندھے جھٹک دیے "جب کچھ نہیں ہو سکتا تو پریشان ہونے سے فائدہ..."

اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا۔ سامنے والی پرچون کی دکان کے مالک کا لڑکا سعید کھڑا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس بہت سارا سامان رکھا تھا۔ لگتا تھا' گھر کا ماہانہ سودا آگیا ہے "کیا بات ہے سعید؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کا سودا لایا ہوں انکل!"

"لیکن ہم نے تو نہیں منگوایا؟" میں نے کہا۔ اسی لمحے ناہید بھی دروازے پر آگئی۔ سامان دیکھ کر اسے بھی حیرت ہوئی۔

"یہ دیکھیں' پرچہ آپ کا نہیں ہے؟" سعید نے میری طرف لسٹ بڑھائی۔ میں نے دیکھا۔ اوپر فلیٹ نمبر ۵۳ لکھا تھا جو کہ میرے ہی فلیٹ کا تھا۔ مگر وہ تحریر نہ میری تھی' نہ ناہید کی۔ ناہید بھی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"نہیں سعید۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ نمبر تو ہمارے ہی فلیٹ کا ہے لیکن یہ پرچہ ہم نے نہیں بھجوایا۔"

سعید نے سر پکڑ لیا "یہ سامان ۵۳ نمبر کا ہے۔ انہوں نے نمبر الٹ کر لکھ دیا" وہ بڑبڑایا پھر پریشان ہو گیا "اب روزے میں یہ نفٹیگ بھی ہوگی۔"

میں اور ناہید اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ بے چارہ اتنا سامان اٹھا کر تیسری منزل تک آیا تھا اور اب سامان نہ صرف واپس لے جانا تھا بلکہ ۵۳ میں بھی پہنچانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ برابر والے زینے پر چوتھی منزل کا فلیٹ ہے۔

اچانک سعید کی آنکھوں میں چمک سی ابھری "انکل' آپ کا سودا بھی تو ہماری دکان سے آتا ہے۔ آپ کا مہینے کا سودا بھی تو آتا ہے۔"

"آتا تو ہے' ہم کل منگوائیں گے۔"

"اب روزے میں یہ سودا واپس لے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ پلیز..... آپ یہ رکھ لیں نا" سعید کے لہجے میں التجا در آئی۔

"لیکن اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو کیا ہوا۔ کل پرسوں میں دے دیجئے گا' میں ابّی کو بتا دوں گا۔"

"لیکن....." ناہید نے احتجاج کرنا چاہا۔

"میں سمجھ گیا" سعید نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی "یہ تقریباً وہی کچھ ہے جو آپ کے ہاں بھی آتا ہے۔ پھر بھی آپ پرچے سے چیک کر لیں۔ کوئی چیز آپ کے حساب سے کم ہو تو میں لا دوں گا۔ زیادہ ہوئی تو واپس لے جاؤں گا۔"

"اور ۵۳ والوں کو بھی تو ضرورت ہے" ناہید نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ پانچ منٹ میں سودا چیک کر لیں۔ پھر میں یہ پرچہ لے کر جاؤں گا اور ۵۳ والوں کا سودا بھی افطار سے پہلے پہنچا دوں گا۔"

میں اور ناہید مل کر سودا چیک کرنے لگے۔ سعید دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آٹا' چاول' تیل' گھی' دالیں' چائے کی پتی' چینی' سرکہ' صابن' مسالے' بیسن..... "سب چیزیں وہی ہیں جو ہم منگواتے ہیں۔ حتیٰ کہ مقدار بھی وہی ہے ہر چیز کی" ناہید نے کہا۔

"سبحان اللہ" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہمارے ہی گھر کا سودا لگتا ہے" ناہید بولی۔

"الحمدللہ۔ گھر کا ہی نہیں' ہمارے نصیب کا ہے" میں نے کہا۔

"کچھ چیزیں کم ہیں' وہ دوسرے پرچے پر لکھ دیتی ہوں۔"

ناہید نے اضافی پرچہ سعید کو دیتے ہوئے کہا "واپس کچھ نہیں کرنا ہے' بس یہ چیزیں اور لا دو۔"

"آج نہیں آنٹی' کل لا دوں گا۔ آج تو ۵۳ والوں کو بھی سودا پہنچانا ہے ابھی۔ روزے میں میری اتنی ہمت نہیں۔"

"میں وحید کو ساتھ بھیج دیتی ہوں۔ یہ ہلکی چیزیں ہیں۔ وہ لے آئے گا۔ اسے دے دینا" ناہید نے بڑے بیٹے کو پکارا۔

"وحید..... ادھر آؤ..."

"ٹھیک ہے آنٹی۔"

"میں پیسے کل پہنچادوں گا" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوتا رہے گا انکل۔ اس وقت تو آپ نے مجھ پر بہت بڑی مہربانی کی ہے" سعید نے ممنونیت سے کہا پھر وہ وحید کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں سودا کچن میں رکھوانے میں ناہید کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"اسے کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر ملنا" ناہید نے خوشی سے کہا۔

"جی نہیں۔ اسے کہتے ہیں اللہ کی تائید... اللہ کی مدد" میں نے بھیگی آواز میں کہا "ان تمام چیزوں کی طلب تھی ہمیں لیکن مل نہیں سکتی تھیں۔ اب دیکھو کہ یہ بن مانگے ملیں۔ پیسوں کا بھی کوئی مطالبہ نہیں اور الٹا وہ سعید ہمارا احسان مان رہا تھا۔"

"سچ کہتے ہو۔ اب ڈھنگ سے افطار ہو جائے گا۔"

میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ حارث بن عثمان نے کہا تھا.... یہ نورانی اشرفی' جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا' وہ ایسی خیروبرکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی اور ابھی میں نے اشرفی آگے بڑھائی بھی نہیں تھی کہ یہ بات ثابت ہوگئی تھی۔

ناہید افطار کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ میں عصر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا۔

○☆○

میں اور حارث بن عثمان عشا کی نماز پڑھ کر گھر کی طرف واپس آرہے تھے۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ افطار کے بعد میں نے کہانی کا مزید ایک صفحہ لکھا تھا۔ ناہید بھی خوش تھی کہ اس نے افطار کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ حارث بن عثمان افطار سے پانچ منٹ پہلے گھر آگئے تھے لیکن انہوں نے افطار میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ناہید کے اصرار پر انہوں نے کہا "بیٹی' میں تو افطار کے فوراً بعد جو روکھی سوکھی مل جائے' کھالیتا ہوں۔ ان سب کی تو مجھے عادت ہی نہیں۔"

پھر بھی ناہید نے انہیں تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کردیا۔ پھر وہ خود کچن میں روٹی پکانے چلی گئی اور پانچ منٹ بعد اس نے کھانے کا دسترخوان لگادیا۔ میں تو اتنی جلدی کھانا نہیں کھاسکتا تھا۔ البتہ بچے حارث کے ساتھ بیٹھ گئے۔

مسجد سے نکل کر حارث کے ساتھ چلتے ہوئے میں اس دن کی برکتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بڑا بابرکت دن ثابت ہوا تھا۔ مجھے اس دن نے طمانیت اور بے فکری ہی دی تھی۔ گھر میں راشن کا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف رکی ہوئی کہانی تقریباً مکمل ہوچکی تھی جس کے عید سے پہلے مکمل ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے اور اس کا مطلب تھا کہ ہمارے گھر میں بھی انشاءاللہ عید ہوگی۔

میں نے سوچا' گھر جاتے ہی کہانی مکمل کروں گا۔ اسی لمحے عقب سے جانی پہچانی آواز نے کہا "کہانی تو ابھی شروع کرنی ہے برخوردار!" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بابا عصر تھے اور اپنی مخصوص تیز رفتاری کے ساتھ چل رہے تھے۔

میں نے اور حارث بن عثمان نے انہیں سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ ہم اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکے تھے۔

"اپنا کام سمجھ میں آگیا ہے؟" بابا عصر نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں بابا!"

"تو اب ہم بات کرسکتے ہیں" بابا عصر نے گہری سانس لے کر کہا "کل میں نے محسوس کیا کہ پاکستان سے سچی محبت کے باوجود تم پاکستان کی اہمیت سے واقف نہیں ہو۔"

"میں پاکستان کی اہمیت تو سمجھتا ہوں بابا لیکن جیسی غیر معمولی اہمیت کا آپ کی باتوں سے اشارہ ملتا ہے' میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے کہا۔

"پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے" بابا عصر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں آتی' آنی چاہیے" بابا عصر نے جھنجلا کر کہا "اللہ کبھی خود بندوں کے سامنے نہیں آیا' انہیں سمجھانے اور قائل کرنے کے لیے۔ اور اسے قائل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ یہ اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی فکر کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہ بے خبری میں گمراہ ہوں۔ وہ انہیں گمراہی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس لیے انہیں سمجھاتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ وہ انہیں حق کا راستہ دکھاتا ہے اور میں نے کہا ناکہ وہ خود سامنے آکر بندوں کو نہیں سمجھاتا۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ سو وہ ابتدا سے اپنے بندوں کے پاس سفارتیں بھیجتا رہا.... اپنے پیغمبر اور رسول۔ سرکش اور نافرمان بندوں نے' شیطان کے چیلوں نے اس کے سفیروں کا مذاق اڑایا' انہیں جھٹلایا' انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ انہیں قتل بھی کردیا۔ یوں ان پر اللہ کا غضب ہوا لیکن بہرحال اللہ نے حجت تمام کردی۔ اس کا کوئی بندہ بھی گمراہی کے جواز میں اپنی بے خبری کی ڈھال سامنے نہیں لاسکتا۔ حق سے اس کا انکار اس کے منہ پر ماردیا جائے گا۔"

"جی' یہ تو ہے لیکن پاکستان....."

"یہاں تک پہنچنے میں جو صدیاں لگی ہیں' انہیں کیسے چھوڑدوں" بابا عصر نے مجھے ڈانٹ دیا "تم میری بات سنتے رہو۔ یہ سب کچھ تمہیں لکھنا ہے۔ لکھنے بیٹھو گے تو میرا کہا ہوا کوئی ایک لفظ بھی انشاءاللہ نہیں بھولو گے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ہر دور میں سفارتیں بھیجتا رہا۔ خوش نصیب ان سے فیض اٹھاتے رہے لیکن بڑی تعداد میں بدنصیب اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت موسیٰؑ کی امت پر اللہ نے خاص عنایات فرمائیں' انہیں بے حد نوازا' آسمان سے ان کے لیے خصوصی نعمتیں اتاریں مگر پھر اللہ نے انہیں دھتکار دیا۔ کیوں؟ یہ پوری انسانیت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ مسلمانوں کو خاص طور پر۔ تاکہ وہ ان اعمال سے بچے رہیں' جن کی وجہ سے اللہ کی ایک پسندیدہ قوم اس کی

مغضوب ہوئی اسی لیے تو سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ دکھا ہم کو راستہ سیدھا' ان لوگوں کا کہ جن پر تُو نے انعام فرمایا۔ نہ کہ ان بھٹکنے والوں کا' جن پر غضب ہوا تیرا۔

"بہرکیف پھر اللہ نے روئے زمین کے بدترین معاشرے کو اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے نوازا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ جن پر خود اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں جو کائنات کے واحد مثالی انسان ہیں۔ جن کی سیرت اور کردار ایک روشن معجزہ ہے۔ یہ اللہ کی آخری سفارت ہے۔ اللہ نے واضح طور پر بتادیا کہ اس کے بعد کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں آئے گا۔ نبوت کا سلسلہ حضورؐ پر مکمل کرکے ختم کیا جارہا ہے۔ تم دیکھ لو کہ دنیا میں ہمیشہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی کثرت رہی اور لوگوں نے جھوٹی پیغمبری کے دعوے بھی کیے۔ لیکن بدی کی کثرت کے باوجود نہ وہ دعوے کرنے والے پنپے اور نہ ان کے ماننے والے۔

"تو یہ طے ہے کہ اب اللہ کی طرف سے کوئی پیغمبر نہیں آئے گا لیکن اللہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے نعوذ باللہ اپنے بندوں کو چھوڑ کر ان کی ہدایت سے ہاتھ اٹھالیا۔ ایسا نہیں ہے۔ اس نے مکمل ہدایت دے دی۔ دین مکمل کرکے اپنے بندوں کو روشنی کا منبع دکھادیا۔ گویا حجت تمام کردی۔ اب یوم حساب کسی ظالم کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا اپنے ظلم اور گمراہی کا۔ اس لیے کہ اس آخری ہدایت کے بعد بھٹکنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ انسان کو عقل دے کر اس نے پہلے ہی تمام مخلوقات سے افضل بنادیا تھا۔ اب مکمل ہدایت کے ذریعے اسے درست طور پر سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی روشنی بھی دے دی۔ اب اس کے بعد بھی کوئی بھٹکے تو وہ اس کے نفس کی خرابی ہے اور وہ اپنی جان پر ظلم کررہا ہے۔"

"مگر ہم ان لوگوں کے مقابلے میں تو بدنصیب ہیں جنہیں حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور آپؐ کی باتیں سننے کی سعادت حاصل ہوئی" میں نے کہا۔

"درست ہے۔ لیکن اللہ کا کرم دیکھو' اس نے اپنے روشن ہدایت نامے کو تمہارے لیے قیامت تک پوری درستی کے ساتھ محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا اور اللہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ سو وہ روشن ہدایت نامہ تمہارے پاس ہے۔ اسے نہ پڑھو اور سمجھو تو یہ تمہاری بدعملی ہے۔ پھر سیرتِ طیبہ کا کون سا ایسا پہلو ہے' جو انسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ حضورِ پاکؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ریکارڈ پر محفوظ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ گویا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کے احکام پر عمل کیسے کیا جاتا ہے اور رہی محرومی کی بات تو اللہ اس محرومی کا تمہیں صلہ بھی دیتا ہے۔ ہر آگے بڑھتے ہوئے دور میں چھوٹی سی نیکی کا اجر بھی بیش از بیش ہوتا جاتا ہے۔ توفیق بھی بڑھادی گئی ہے۔"

"کچھ بھی ہو' وہ براہِ راست ہدایت کی بات تو نہیں آسکتی۔"

"نہ گمراہی کا جواز نہیں ہے۔ اپنے گناہوں کی اس طرح صفائی پیش نہیں کی جاسکتی۔"

میں کانپ کر رہ گیا "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو بس ایک بات کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں بھی تو کچھ کہہ رہا ہوں" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اللہ نے عقل و دانش والوں کے لیے ہر چیز میں حق کی نشانیاں روزِ ازل سے ہی رکھ دی تھیں۔ جنہیں توفیق عطا ہوئی' انہوں نے تاریک ترین ادوار میں بھی ایک رب کو مانا اور اس کے آگے سر جھکایا۔ مگر اب تو اس نے رسالت اور ہدایت کے ذریعے عقل کو ایسی روشنی عطا کی ہے کہ بھٹکنے کی گنجائش ہی نہیں۔

"اور اللہ نے قرآن پاک میں سب کچھ کھول کھول کر بیان کردیا ہے۔ وہ کون سے جرائم تھے' جن کی پاداش میں اللہ کے پسندیدہ لوگ اس کے عتاب میں آئے اور راندۂ درگاہ ٹھہرے' یہ سب قرآن میں موجود ہے۔ تاکہ رسول کریمؐ کی امت ان اعمال سے بچی رہے اور وہ اعمال کیا تھے؟ بنی اسرائیل میں کچھ بنیادی خرابیاں تھیں' جنہیں وہ دور نہ کرسکے۔ پہلی بات یہ کہ وہ نافرمان تھے۔ وہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اللہ نے جو قانون بنائے' انہوں نے توڑے۔ وہ کم ظرف تھے' اللہ نے ان پر جو انعام و اکرام کیے' انہوں نے انہیں مغرور اور بددماغ کردیا۔ وہ ناشکری کرتے رہے۔ بجائے اس کے کہ شکر ادا کرتے۔ وہ اللہ' اس کے رسولؑ اور اس کی کتاب پر ایمان لائے تو یوں جیسے کہ نعوذ باللہ انہوں نے احسان کیا ہو۔ پھر وہ ست' کاہل اور آرام طلب تھے۔ وہ تو اپنے لیے بھی کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کو وہ سرفروش پسند ہیں' جو اس کی راہ میں دامے' درمے' قولے' سخنے جہاد کریں' جن کے دل میں شوقِ شہادت ہو جبکہ ان سہل پسندوں کو جب بھی اللہ نے جنگ کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اور خدا جاکر لڑو' ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ ہم کیوں لڑیں اور قتل ہوں جبکہ دشمن ہم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب اللہ سب کچھ کرسکتا ہے تو پھر ہمارے دشمنوں کو خود ہی زیر کیوں نہیں کردیتا۔ انہوں نے خدا کے اختیار کو صرف اس لیے مانا کہ اس طرح انہیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے' بیٹھے بیٹھے تحفظ سمیت سب کچھ مل جائے گا۔ چنانچہ جب ان بدبختوں پر اللہ کا غضب ہوا تو وہ معزول کردیے گئے۔ اس کے بعد ان کی ذلت و خواری اور سرگردانی کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ نے دکھادیا کہ یہ ہے سرکشوں اور نافرمانوں کا انجام۔

"تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ نے تمہیں روشن عقل دی۔ ہدایت دی اور اس کی نشانیاں چپے چپے پر بکھری ہوئی ہیں۔ دیکھو' مشاہدہ کرو' سوچو اور انہیں پہچانو۔ ان سے نتائج اخذ کرو۔ کس کی کیا اہمیت ہے' اسے پہچانو.... اور اس اہمیت کے مطابق ہی اس کا خیال رکھو" یہ کہتے کہتے وہ چونکے۔ انہوں نے سر ایک طرف جھکایا' جیسے کوئی دور کی آواز سننے کی کوشش کررہے ہوں "اب میں چلتا ہوں" انہوں نے کہا۔ ان کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

"لیکن ابھی تو میں کچھ سمجھا بھی نہیں ہوں" میں نے احتجاج

کیا۔ مجھے ان سے قدم ملا کر چلنے کے لیے اب تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا۔

"سب سمجھ جاؤ گے۔ میں کل یہیں سے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑوں گا" بابا عصر نے کہا "بس اب جاؤ۔"

"مگر میں یہ سب بھول جاؤں گا" میں نے بلند آواز میں کہا کیونکہ میرے دوڑنے کے باوجود بابا عصر مجھ سے خاصا آگے جا چکے تھے۔

"تم کچھ نہیں بھولو گے" انہوں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

لمحوں میں فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ اب چیخ کر بھی بات ان تک نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ بابا عصر تو ہوا کا جھونکا ہو گئے تھے۔ میں رک گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ہانپ رہا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حارث بن عثمان خاصا پیچھے تھے مگر ہموار قدموں سے اسی طرف آ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد حارث مجھ سے آملے "بابا عصر کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے اور ان کے ساتھ اندھا دھند دوڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ ایسا آدمی راستہ بھٹک بھی سکتا ہے" انہوں نے نرم لہجے میں کہا "آؤ... گھر چلیں۔"

○☆○

میں نے کہانی مکمل کی اور سکون کی سانس لی۔ گھڑی دیکھی' سوا گیارہ بجے تھے۔ میں اس وقت بہت مطمئن تھا۔ سب کام ٹھیک ہو گئے تھے مگر میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں تھا لہٰذا آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟

اچانک مجھے بابا عصر کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ اب تک کی باتوں کو لکھ لوں۔ ابھی یاد تازہ ہے اس کے باوجود یہ کوئی آسان کام نہیں۔ کوئی اتنا سب کچھ کیسے یاد رکھ سکتا ہے اور ایک دن گزر گیا تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔

میں نے پیڈ اپنی طرف کھینچا اور قلم کھولا۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ باتیں اب بھی رہ جائیں گی مگر قلم کھول کر پیڈ کی طرف جھکتے ہوئے جو کچھ ہوا' اس نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ میں کمرے میں بھی بیٹھا تھا..... اور میں ایک سڑک پر بابا عصر کے ساتھ چل بھی رہا تھا۔ حارث بن عثمان بھی میرے ساتھ تھے اور بابا عصر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔"

میرا قلم کاغذ پر چلنے لگا۔ وہ عجیب تجربہ تھا۔ میں بیک وقت دو جگہ تھا۔ حال کے اس لمحے میں بھی..... اور گزرے ہوئے ان لمحوں میں بھی۔ اور وہ تصور نہیں تھا کیونکہ میری ٹانگوں کو چلنے کا احساس بھی ہو رہا تھا اور تیز چلنے کی وجہ سے میری سانسیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور وہ کوئی وڈیو فلم بھی نہیں تھی۔ وہ تو مکمل منظر تھا..... تین جہتوں کے ساتھ۔ بلکہ مجھے چوتھی جہت کی موجودگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

میں لکھتا گیا..... اور لکھنے کے دوران میں مجھے یقین تھا کہ کہیں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

میرا قلم رکا تو میں نے دیکھا کہ تقریباً دو صفحے بھر چکے ہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ یہ سب کچھ میں نے صرف پندرہ منٹ میں لکھا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ٹانگیں یوں دکھ رہی تھیں' جیسے میں میلوں دوڑ لگا کر آیا ہوں۔ پھر جماہی آئی تو اندازہ ہوا کہ مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔ حالانکہ اتنی جلدی میں کبھی سوتا نہیں تھا۔

میں نے قلم بند کر کے رکھا۔ اسی وقت ناہید کمرے میں آگئی۔

"چائے لاؤں' تمہارے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بھئی' مجھے تو نیند آ رہی ہے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "اتنی جلدی تم کب سوتے ہو؟" اس نے کہا پھر خود ہی بولی "اوہ..... کل رات کی نیند بھی تو ہو گی۔"

"ہاں..... یہی بات ہو گی" میں نے کہا پھر پوچھا "حارث بن عثمان کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ تو آتے ہی سو گئے تھے۔ میں نے دوسرے بیڈ روم میں انہیں سلا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں سونے کے لیے لیٹا تو ناہید نے پوچھا "سحری میں تمہیں جگاؤں یا نہیں؟"

"تم جانتی ہو' اب آنکھ کہاں کھلے گی؟"

ناہید نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ جانتی تھی کہ مجھے جگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ سحری میں' میں اس سے بھی پہلے جاگا۔ مجھے یاد ہے' میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا جیسے کسی نے سخت لہجے میں مجھے آواز دی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ناہید اور بچے سو رہے تھے' کمرے میں اندھیرا تھا۔

ایسے کبھی نیند اچٹ جائے تو میں دوبارہ لیٹتا ہوں اور فوراً ہی سو جاتا ہوں۔ اس روز بھی میں نے کوشش کی لیکن آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ تو رمضان کا مہینہ ہے..... اور یہ سحری کا وقت ہو گا۔ میں اٹھا اور بیڈ روم سے نکلا۔ لاؤنج میں روشنی کر کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے پانچ بجے تھے۔ مجھے جھنجلاہٹ بھی ہوئی اور خود پر شرم بھی آئی۔ مجھے نہ انتہائے سحر کا وقت معلوم تھا' نہ افطار کا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سحری تیار کرنے کے لیے ناہید کس وقت اٹھتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ کچن میں رمضان کے ٹائم ٹیبل والا کارڈ لٹکا ہوا ہے۔ میں نے جا کر اسے دیکھا اور پھر ناہید کو جگا دیا۔ اس بے چاری کو دہری حیرت کا سامنا کرنا پڑا "تم..... تم کیسے اٹھ گئے" اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس آنکھ کھل گئی۔ اور پھر سویا ہی نہیں گیا۔"

گھڑی دیکھ کر وہ اور حیران ہوئی "ٹھیک پونے پانچ بجے میں اٹھ

جاتی ہوں۔ آج آنکھ کیوں نہیں کھلی۔"

"میں جو جاگ گیا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے دانت صاف کئے' منہ دھویا اور کچن میں چلی گئی۔ میں نے حارث بن عثمان کو جگانے کی غرض سے بڑی آہستگی سے دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگلیاں تسبیح پر گردش کررہی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا "تم بھی جاگے ہوئے ہو۔"

"جی ہاں' خود بخود آنکھ کھل گئی۔"

"اسی کو خیروبرکت کہتے ہیں برخوردار آفاق۔ یہی اللہ کی تائید ہے" وہ بولے "فجر پڑھنے چلوگے نا؟"

"کیوں نہیں۔ انشاءاللہ ضرور چلوں گا۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

سحری کے بعد ہم گزشتہ روز کی طرح فجر پڑھنے گئے۔ حارث بن عثمان مسجد میں ہی رہ گئے۔ میں گھر آیا اور سوگیا۔

○☆○

اس بار بھی میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ کوئی مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ میری بیوی ناہید تھی "کیا بات ہے؟ کیا دو بج گئے؟" میں نے بدمزگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تو نو بجے ہیں۔"

"تو اتنی جلدی کیوں اٹھایا مجھے۔ دفتر تو میں ظہر کے بعد ہی جاؤں گا۔"

"دفتر کے لیے تھوڑا ہی جگایا ہے۔ ادھر تو دیکھو..... یہ کیا ہے؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ وہ نورانی اشرفیاں تھیں' جو سوتے میں میری جیب سے نکل کر بستر پر گر پڑی تھیں۔ ان پر ناہید کی نظر پڑ گئی تھی اس لیے اس نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے دیکھا' اس وقت وہ عام سی اشرفیاں تھیں۔ ان کے اندر سے حروف غائب ہوگئے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرا بستر نیچے تھا۔

"یہ اشرفیاں ہیں" میں نے سادگی سے کہا لیکن اشرفیوں کو اٹھایا نہیں۔

"بہت قیمتی لگتی ہیں۔ خالص اور بہت اچھی کوالٹی کا سونا ہے۔ تمہیں کہاں سے ملیں؟"

"کسی کی امانت ہیں" میں اسے ان کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا بلکہ دکھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچا تھا' چپکے سے کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا مگر اب وہ انہیں دیکھ چکی تھی پھر بھی میں اسے بہلا سکتا تھا۔ اسی لیے اشرفیاں اس کی موجودگی میں اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ میں آتے ہی حروف ظاہر ہو جائیں گے..... اور پھر اسے سب کچھ بتانا پڑے گا۔

"اتنی قیمتی امانت بھی کوئی رکھوا سکتا ہے" اس نے حیرت سے کہا اور بالکل اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر دونوں اشرفیاں اٹھالیں۔ اتنا اچانک کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا اور اشرفیاں ہاتھ میں آتے ہی جو حروف چمکے تو وہ بوکھلا گئی۔ اشرفیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گریں اور گرنے سے پہلے ہی عام اشرفیاں بن گئیں۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟"

اب اس سے کچھ چھپایا نہیں جاسکتا تھا چنانچہ میں نے اسے پورا ماجرا سنادیا۔ شروع سے آخر تک۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ پھر اس نے اس بار بڑے اعتماد اور احترام کے ساتھ ان اشرفیوں کو اٹھایا اور انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس نے حروف پر انگلی بھی پھیری اور ایک لمحے کو حیران نظر آئی "یہ سونا تو نہیں ہوسکتا" اس نے بے حد یقین سے کہا "سونا شفاف نہیں ہوتا۔ جبکہ حروف صاف نظر آرہے ہیں۔ حالانکہ اشرفی کے اندر ہیں۔"

"بھئی..... میں تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ سونے سے بہت زیادہ قیمتی کوئی دھات ہے۔"

"دھات ہی کیوں؟ ممکن ہے' کوئی اور مادہ ہو۔"

"وزن کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"دھات شفاف کب ہوتی ہے" میں نے اعتراض کیا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی "پارہ بھی تو دھات ہے۔"

"مگر یہ کوئی نایاب قسم کا بلور..... یا اسی طرح کا کوئی پتھر بھی تو ہوسکتا ہے۔"

"جو بھی ہے' یہ میں جانتی ہوں کہ ہے بہت قیمتی۔ اتنا قیمتی کہ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہوگی" اس نے کہا پھر بولی۔ "یہ بتاؤ' اب تم کیا کروگے اس کا؟"

"کرنا کیا ہے۔ کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا" میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"وہ تو امانت سونپو گے نا۔ میں تو اس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں' جو تمہیں دی گئی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی..... یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ ان اشرفیوں کو میرے پاس چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہوگئے تھے۔ لیکن میں نے اس انداز میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔ بلکہ میں نے تو مالیت کے حوالے سے بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ناہید نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہوگی۔ اتنی زیادہ بھی ہوسکتی ہے کہ کہانیوں کی طرح شہر کا سب سے بڑا جوہری بھی عاجزی سے کہے..... بھئی' اس کی قیمت تو میں اپنی دکان' اپنا محل اور تمام اثاثے بیچ کر بھی ادا نہیں کرسکتا۔ مگر یہاں تک سوچ کر ہی مجھے ہنسی آگئی۔ وہ اور زمانے کی بات تھی اور وہ بھی کہانیوں میں۔ جبکہ یہ اور دور تھا۔ آج کا جوہری تو کچھ اور ہی ہوگا۔ کہے گا..... میاں' یہ بس دیکھنے ہی دیکھنے کی ہے۔ ڈیکوریشن پیس سمجھ لو۔ سونا تو اس میں سرے سے نہیں ہے۔ کوئی نگ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی خوب صورت ہے۔ ایک ہزار اس کے دے سکتا ہوں' مگر مجھے معلوم تھا کہ قیمت کیسے

بڑھے گی۔ میں کہوں گا' نہیں بھئی... مجھے یہ بیچنی ہی نہیں ہے۔ اس پر جوہری ہچکچانے کی اداکاری کرتے ہوئے گویا بولی بڑھائے گا۔ میں انکار کرتا رہوں گا.... اور وہ قیمت بڑھاتا رہے گا۔ وہ کہے گا.... بھئی پانچ لاکھ سے اوپر ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔

"نہیں بھئی' مجھے نہیں بیچنی...."

میرے تصور میں موجود جوہری اپنی پیشکش کو کروڑوں تک لے جاتا لیکن میں تصور میں اتنا کھو گیا تھا کہ میں نے یہ آخری مکالمہ بہ آوازِ بلند ادا کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری بیوی گڑبڑا گئی "یہ کیا کہہ رہے ہو' نہیں بیچو گے اسے؟"

میں چونکا۔ میرا تصور ٹوٹ گیا لیکن پھر بھی میں نے اسی رو میں جواب دیا "نہیں بیچوں گا۔"

"لیکن کیوں؟"

اس ایک لمحے میں میرے اندر یہ احساس ابھرا کہ میں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ اشرفی بیچنے کی چیز نہیں اور اس احساس کے سامنے میری کیفیت سپردگی کی تھی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے حتمی طور پر اس بات کا فیصلہ بھی کرلیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ بیوی کو قائل کرنے کے لیے بہت طاقت ور دلائل کی ضرورت ہوگی اور یہ امکان موجود تھا کہ اس کے باوجود وہ قائل نہیں ہوگی۔ تب مجھے اپنی ویٹو پاور استعمال کرنی ہوگی' جو خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے پاس ہی رکھی تھی۔

مگر ایک لمحے میں میرے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ دلائل اتنی تیزی سے ابھرے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ناہید کو دیکھا' جو مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "بات سیدھی سی یہ ہے ناہید بیگم کہ اگر ایک اشرفی مجھے' میرے لیے نہ دی جاتی تو ابتدا ہی میں اس امانت پر میری نیت خراب ہوجاتی۔ میرے اندر کی مٹی میں پاسِ امانت اور دیانت داری کا کلا صرف اس لیے پھوٹا کہ ایک اشرفی کی ملکیت کا احساس میرے ذہن میں تھا۔ یعنی ایک اچھی ترغیب موجود تھی۔"

ناہید بہت غور سے میری بات سن رہی تھی "یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہوتا۔ مگر اب نہیں بیچنے کی کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اب صورتِ حال بدل جو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پاسِ امانت اور دیانت داری کا وہ کلا پودا بن چکا ہے۔ مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ مقامِ شکر ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کفرانِ نعمت کیوں کررہے ہو۔ جب ایک اشرفی تمہارے تصرف' تمہارے اختیار میں دے دی گئی...."

"یہی تو بات ہے۔ اسے میرے تصرف میں' میرے اختیار میں دیا گیا کہ چاہوں تو میں خود رکھ لوں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ یعنی چاہوں تو کسی اور کو دے دوں۔"

"وہ تو ہے لیکن اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سے منہ موڑنا کفرانِ نعمت ہے۔"

"میں کفرانِ نعمت نہیں کررہا ہوں۔ میں اسے ممکنہ طور پر بہترین مصرف میں لارہا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ابھی میں نے کہا اور تم نے بھی تائید کی کہ اگر ایک اشرفی اپنے لیے نہ ملتی تو میں بے ایمان ہوجاتا۔ اب سوچو کہ صرف امانت والی اشرفی میں کسی اور کی طرف بڑھاؤں گا' یہ کہہ کر اسے وہ اشرفی کسی اور کی طرف بڑھانی ہے تو کیا وہ اس مسئلے سے دوچار نہیں ہوگا؟ کیا اس کی نیت خراب نہیں ہوگی؟ اس کا ایمان بہت بڑی اور سنگین آزمائش سے دوچار نہیں ہوگا؟"

"ہوتا رہے۔ یہ تمہارا دردِ سر تو نہیں ہے" ناہید نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

"میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تم میری طرح نہیں سوچ سکتیں۔ یہ آزمائش تم پر نہیں آئی۔ تم خطرۂ ایمان سے دوچار نہیں ہوئیں۔ میں ہوا ہوں۔ مجھے تو اس شخص کی فکر کرنی چاہیے جو میری وجہ سے آزمائش میں پڑے گا۔ دو وجوہ کے تحت میرے لیے یہ کرنا ضروری ہے" میں نے گہری سانس لی "ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں اشرفیاں مجھے اس نظیر کے ساتھ پہنچی ہیں۔ حارث بن عثمان کو جس نے بھی یہ دی ہوں گی' اسی طرح دی ہوں گی مگر انہوں نے اپنے حصے کی اشرفی خود رکھنے کے بجائے میری طرف بڑھادی اور یہ سلسلہ پیچھے سے اسی طرح چل رہا ہوگا تو مجھے بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے۔"

"حارث بن عثمان دنیا دار آدمی نہیں ہیں" ناہید نے اعتراض کیا۔

"دنیا سامنے ہو اور آدمی دنیا دار نہ بنے.... موقع ملنے کے باوجود.... تو یہ تو بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز مجھے بھی مل رہا ہے۔"

"اب دوسری وجہ بھی بتادو" ناہید نے خشک لہجے میں کہا۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کے استحکام اور خیروبرکت کی علامت ہیں۔ یہ اسلام کی سربلندی اور عظمت کی امین ہیں۔ ان کی منزل قومی خزانہ ہے۔ انہیں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

"بھئی' تم نے کسی کو دی اور اس کی نیت خراب ہوئی تو یہ اس کے پاس رکے گی نہیں' واپس آجائے گی۔ اسے تو بہرحال اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔"

"تم ایک بات بھول گئیں" میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "اس کا سفر جتنا مختصر ہو' جتنی جلدی پورا ہو' اتنا ہی اچھا ہے۔ سفر جتنا طویل ہوگا' ملک و قوم کو اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی۔ میں تو چاہوں گا کہ میں جس پہلے آدمی کو یہ دوں' وہی امین ثابت ہو۔ میری تو دعا ہوگی کہ یہ کبھی کسی کے پاس سے واپس نہ آئے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں یہ اشرفی جسے دوں' اسے بے ایمانی کی ترغیب سے بچانے کا سامان بھی کروں۔"

"جسے بے ایمانی کرنی ہوگی' وہ دونوں اشرفیاں ہضم کرنے کی

کوشش کرے گا" ناہید نے منہ بنا کر کہا۔
"بہرحال ہمیں تو اتمام حجت کرنا چاہیے۔"
"تو تم یہ دونوں اشرفیاں آگے بڑھادو گے؟"
"ہاں..... اسی طرح' جیسے یہ میری طرف بڑھائی گئی ہیں" میں نے کہا اور اپنی بیوی کو غور سے دیکھا۔ وہ مایوس لگ رہی تھی۔
"مایوس کیوں ہو؟"
"یہ اشرفی ہمارے سارے دلدّر دور کرسکتی تھی" ناہید نے سوگوار لہجے میں کہا۔
میں مسکرادیا "اس نے تو ہمارے سارے دلدّر دور کردیے" میں نے کہا "تم خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو۔"
"وہ کیسے؟"
"میں اس ڈیڑھ دن میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں بیگم۔ میں نے جان لیا ہے کہ مال و دولت سے دلدّر دور نہیں ہوتے۔ خیروبرکت اور اللہ کی تائید و نصرت سب سے بڑی چیز ہے۔ کل یہ اشرفی مجھے ملی اور جانتی ہو' اس کے بعد کیا کیا ہوا۔ میرا روزہ تھا۔ میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا مگر کل کہانی کا وہ پیچ ہی دور نہیں ہوا' زندگی میں پہلی بار میں نے بغیر سگریٹ پیے کام کیا..... اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے کہانی مکمل کرلی۔ آج انشاء اللہ مجھے پیسے مل جائیں گے اور ہماری عید کا سامان بھی ہوجائے گا۔"
وہ اچھل پڑی "کہانی مکمل کرلی تم نے؟"
"جی ہاں جناب!" میں نے اسے دیکھا۔ مایوسی دور ہوگئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوشی اور امید کے دیے جھلملا رہے تھے۔
"یہ تو ایک پہلو ہے خیروبرکت کا۔ دوسرا تم دیکھ چکی ہو' ہماری ضرورت کی تمام چیزیں کیسے بن مانگے عزت کے ساتھ مل گئیں ہمیں۔"
وہ یک لخت خوش ہوگئی' مسکرانے لگی "ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں سمجھ گئی۔ خیروبرکت کے ایک اور اشارے کا تو تمہیں علم ہی نہیں ہے۔"
میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے؟"
"راشن ختم ہورہا تھا نا۔ میرا اندازہ تھا کہ آج سحری تک بھی شاید نہ چل سکے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ابھی تک نیا سامان کھولنے کی نوبت نہیں آئی ہے اور آج تو آئے گی بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے' کل کی سحری بھی اس سے ہوجائے گی۔ واقعی..... یہ تو حیرت انگیز برکت ہے" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔
میں نے اسے لپٹالیا اور تھپکنے لگا "روتی کیوں ہو پگلی' بیگم!"
"رونے کی بات ہے۔ میں تو خیروبرکت کو تم سے زیادہ سمجھتی تھی مگر مجھے یہ کیا ہوگیا۔ حالات آدمی کو یوں خراب بھی کردیتے ہیں" وہ شرمندگی سے بولی۔
"اللہ عدد نہ کرے تو آزمائش سے کوئی سرخروئی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔"
وہ اٹھ کھڑی ہوئی "تم نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ یہ اشرفی کوئی دنیاوی چیز نہیں۔ یہ تو اللہ کی بارگاہ سے کیش ہونے والا چیک ہے۔ تم انہیں جلد از جلد آگے بڑھادو۔ تم بہت اچھے ہو۔"
"سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہاں سنو....." میں نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "میں ابھی اور کچھ دیر سوؤں گا۔ ظہر کے بعد دفتر جاؤں گا۔ تم کپڑے تیار رکھنا۔"
"بہت بہتر جناب!" وہ مسکرادی۔ شرمندگی کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی وہ مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی۔

○☆○

اس روز دفتر جاتے ہوئے میں ہر شخص کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ورنہ عام طور پر سفر کے دوران میں اپنی سوچوں' اپنے خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔ مگر اس روز مجھے ایک ایسے اہل شخص کی جستجو تھی' جسے میں وہ بے حد اہم امانت سونپ سکوں۔
منی بس میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے گھورتا پاکر کچھ لوگ جواباً مجھے گھورنے لگے۔ مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے نظریں جھکالیں۔
دفتر تک کے پیدل راستے میں بھی میں اپنی جستجو میں لگا رہا مگر کہیں دل نہیں ٹھکا۔ یہاں تک کہ میں دفتر پہنچ گیا۔ کہانی دے کر معاوضہ وصول کرنا ذرا وقت طلب کام تھا۔ میں اس دوران میں حارث بن عثمان کی باتیں یاد کرتا رہا۔ ان کی ایک بات مجھے بہت اہم لگی۔ انہوں نے کہا تھا..... پاکستان کے عام' غریب لوگ بے ایمان نہیں۔ گویا بہتر یہی تھا کہ میں وہ امانت کسی غریب آدمی کے

سپرد کردوں۔

میں دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ میری جیب میں معقول رقم تھی۔ دکان والے کو ادائیگی کرنے کے بعد بھی' ناہید اپنے اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے اور ضروری چیزیں خرید سکتی تھی۔ عیدی وغیرہ بھی نمٹ سکتی تھی۔ سو میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس خوشی میں مجھے اشرفیاں یاد ہی نہیں رہیں۔ اپنی ذمے داری اور جستجو کا بھی مجھے خیال نہیں آیا۔

عصر کی اذان کی آواز سنائی دی تو میرے قدم خود بخود راستے میں نظر آنے والی مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ اس پر مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔ پہلے میں اذان سنتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ نماز کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اذان کی آواز میں سن کر بھی نہیں سنتا تھا۔

عصر پڑھ کر میں مسجد سے نکلا تو اور مطمئن تھا۔ سکون کا سمندر تھا جو میرے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ باطن کی حقیقی طمانیت کیا ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری تھی۔

چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ جیب میں پیسے ہیں تو افطار کے لیے پھل اور بچوں کے لیے کچھ پسندیدہ چیزیں بھی لے لی جائیں۔ مگر میں نے سوچا کہ میرا افطار تک گھر پہنچنا مشکل بھی ہے۔ ایسے میں حارث بن عثمان کا خیال آگیا۔ وہ بھی تو آئیں گے۔ کتنی بری بات ہوگی کہ میں گھر میں موجود نہیں ہوں گا۔ بس اسی لمحے میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں گھر ٹیکسی میں جاؤں گا..... اور انشاء اللہ افطار سے خاصا پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔

میں بازار کی طرف نکل لیا۔ میں نے پھل خریدے۔ پھر بچوں کے لیے نمکین' پیپر اور چند دوسری چیزیں خریدیں۔ یہ سامان اٹھائے میں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ مجھے وہ اندھا فقیر نظر آیا..... اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ اشرفیاں یاد آگئیں۔ میں نے سوچا' اس بھکاری سے زیادہ کوئی کیا غریب ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ امانت اسے سونپ دوں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔

یہ سوچ کر میں اس اندھے بھکاری کی طرف بڑھ گیا...

○☆○

میں گھر پہنچا تو بہت افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ پہلے ہی قدم پر مجھے احساس ہوگیا تھا کہ ذمے داری بہت بڑی ہے۔ پہلا تجربہ ہی بے حد ناخوش گوار تھا۔

لیکن گھر پہنچتے ہی بچوں کی خوشی دیکھ کر سب کوفت دور ہوگئی۔ میں ان کی خوشی میں ایسا خوش ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ پھر جب میں نے ٹھگڑی رقم ناہید کے ہاتھ پر رکھی تو اس کی آنکھوں میں شکر اور خوشی کے آنسو دیکھنا بھی بہت بڑی طمانیت کا سبب تھا۔ "تم انہیں جس طرح چاہو خرچ کرسکتی ہو۔ دکان والے کے پیسے میں دے آیا ہوں" میں نے ناہید سے کہا "اب تو عید ہوجائے گی نا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

اس شام افطار کے وقت ہمارا دسترخوان اللہ کے فضل وکرم سے بے حد کشادہ تھا مگر ہم سب بے چین تھے اور سب کی بے چینی کا سبب ایک ہی تھا۔ حارث بن عثمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ماموں ابھی تک نہیں آئے؟" میرے بڑے بیٹے عبید نے کہا۔

"آجائیں گے بیٹے" ناہید نے اسے تسلی دی۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ انسان کو انسان سے کتنی جلدی انسیت ہوجاتی ہے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت کرتی رہیں۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ حارث نہیں آئیں گے۔ ممکن ہے انہوں نے صرف ایک دن کے لیے ہامی بھری ہو لیکن نہیں' مجھے خوب یاد تھا۔ انہوں نے عید کے دن تک ہمارے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

اب افطار میں صرف ایک منٹ رہ گیا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر حارث بن عثمان ہی تھے۔ انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک تھیلی تھی "معاف کرنا بچو' مجھے دیر ہوگئی لیکن میں تمہارے لیے جلیبیاں لایا ہوں۔ دکان پر رش بہت تھا۔"

"واہ..... ماموں جلیبیاں لائے ہیں" عزیر خوشی سے چلّایا۔

ناہید کچن سے پلیٹ لائی۔ جلیبیاں اس میں رکھ دی گئیں۔ اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوگئی۔ افطار کا وقت ہوگیا تھا۔

○☆○

میں اور حارث عشا اور تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلے۔ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ بابا عصر نے ہمیں آلیا "ہاں برخوردار آفاق..... میں کیا کہہ رہا تھا؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ ابھی ابھی آئے ہیں بابا عصر!" میں نے بوکھلا کر کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے "میں کل کی بات کررہا ہوں۔"

"یہ تو یاد نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے تھے لیکن میں نے وہ سب لکھ لیا ہے۔"

"اسے چھوڑو۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم کو پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتانا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ نے حق کی نشانیاں چپّے چپّے پر بکھیری ہوئی ہیں اور اس نے اپنی ہدایت سے عقل کو روشنی دی ہے۔ سو خوش نصیبوں کو چاہیے کہ گردوپیش کو دیکھتے رہیں' تجسس سے مشاہدہ کرتے رہیں تاکہ نشانیوں کو دیکھیں اور انہیں سمجھیں۔"

"جی ہاں' یہ میں سمجھ گیا۔"

"سمجھ گئے تو اب دیکھو اور بتاؤ' پاکستان کی اہمیت کیا ہے؟"

"پاکستان کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی" میں نے انہی کا کہا ہوا دہرادیا۔

"اور یہ نتیجہ کیسے نکالا ہم نے؟"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ "ہم" کہہ رہے تھے۔

"یہ..... یہ تو آپ ہی بتایئے۔"

"پاکستان کی تخلیق کے لیے اس نے بہت مبارک دن منتخب

کیا۔ ۲۷ رمضان.... شبِ قدر۔ کیا یہ اس کی اہمیت کی دلیل نہیں۔ وہ کوئی اور دن بھی تو ہو سکتا تھا' یہی کیوں؟ وہ رات کہ جس میں قرآن پاک نازل فرمایا گیا۔ اس سے بابرکت کوئی رات ہو سکتی ہے؟"

"جی' بے شک" میں نے پوری سچائی سے کہا۔

"اب اور دلیلیں دو" بابا پھر بولے۔

میں سوچتا رہا۔ ذہن نے اچانک ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"پاکستان کا قائم رہنا' آپ کی اس بات کی دلیل ہے" میں نے کہا۔

"وضاحت کرو۔"

"کیا اپنے کیا پرائے' کیا دوست کیا دشمن' کیا محبت کرنے والے کیا نفرت کرنے والے' سبھی اس کے درپے رہے لیکن یہ خدا کے فضل سے قائم ہے اور انشاءاللہ قائم رہے گا۔"

"اس کی بھی وضاحت کرو۔"

اس وقت بابا عصر مجھے کوئی سخت گیر کلاس ٹیچر لگے لیکن میں بھی اس وقت کلاس کا سب سے ہونہار طالب علم بنا ہوا تھا۔ دماغ جیسے روشن ہو رہا تھا "تقسیم ہند اور تشکیلِ پاکستان کسی فارمولے کے تحت ہونی تھی اور ہوئی" میں نے گہری سانس لے کر کہا "بظاہر فارمولا یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی' وہ پاکستان میں شامل ہوں گے لیکن اصل فارمولا کچھ اور تھا اسی لیے بہت سے مسلمانوں کے اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوئے۔ آزاد ریاستوں میں حیدر آباد دکن کو بھارت نے بزورِ ہڑپ کر لیا اور کشمیر آج تک ایک حل طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ تنازع ہے ہی نہیں۔ ضرورت صرف رائے شماری کی ہے۔"

"تو یہ بھی بتاؤ کہ تقسیم ہند کس بنیاد پر کی گئی اور تشکیلِ پاکستان کس فارمولے کے تحت ہوئی؟"

"تقسیم ہند اس تصور کے تحت کی گئی کہ بالآخر پاکستان کو ختم ہو جانا یعنی خدانخواستہ بھارت میں دوبارہ ضم ہو جانا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کا فارمولا یہ تھا کہ پاکستان کو ان علاقوں سے محروم کر دیا جائے جو وسائل سے مالا مال ہیں' جو اس کی طاقت اور استحکام کا سبب بن سکتے ہیں۔ پاکستان کو وہ علاقے دیے جائیں جہاں مسائل کی بھرمار ہو.... اور جو وسائل سے محروم اور پس ماندہ ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ زمین اور رقبے سے قطع نظر بھارت اور پاکستان کے درمیان جو وسائل کی تقسیم ہوئی' وہ سفاکی کی حد تک غیر منصفانہ تھی۔ پاکستان کو جو فوجی ساز و سامان ملا' اس کے مطابق پاکستانی فوج کو دنیا کی پس ماندہ ترین فوج ہونا تھا۔ پاکستان میں اقتصادی ڈھانچا سرے سے تھا ہی نہیں۔ صنعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ بیشتر بڑے تعلیمی ادارے بھارت میں تھے۔ پھر ستم یہ کہ پاکستان کو جو بہت تھوڑے وسائل ملے' وہ بھی بکھرے ہوئے اور غیر منظم تھے۔ جبکہ بھارت کو جو ملا وہ قائم اور منظم تھا۔ وہاں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر مسلمانوں کی ہجرت نے بوجھ ہلکا کر کے انہیں اور مستحکم کر دیا جبکہ یہاں بکھرے ہوئے تنکے تھے' جنہیں جمع کر کے آشیانہ بنانا تھا۔ بھارت سیٹ تھا اور پاکستان اَپ سیٹ۔ پٹ سن کی پیداوار مشرقی پاکستان میں ہوتی تھی اور اس کی تمام فیکٹریاں مغربی بنگال میں تھیں یعنی پاکستان مجبور تھا کہ اپنی خام پیداوار کوڑیوں کے مول بھارت کو دے جو اس کے ذریعے مصنوعات بنا کر برآمد کر کے بھاری زرِمبادلہ کمائے اور مزید مستحکم ہو۔ مختصر یہ کہ سب کچھ برعکس تھا۔ پاکستان کو ابتری ملی تھی اور بھارت کو استحکام۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نئی نوزائیدہ مملکت کی حیثیت میں ابھرا تھا۔ جبکہ بھارت دنیا کے نقشے پر ہمیشہ سے موجود ایک بڑا ملک تھا جو بس آزاد ہوا تھا' قائم بہت پہلے سے تھا۔"

"بہت خوب!" بابا عصر نے چلتے چلتے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا "سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ تم لوگ سب کچھ سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تمہارے اندر گہرائی میں ہر چیز کی آگہی موجود ہے۔ اچھا' یہ بتاؤ کہ یہ سب کرنے کا مقصد کیا تھا؟"

"اکھنڈ بھارت" میں نے بلا جھجک کہا "ہندو یہ گوارا کر ہی نہیں سکتا تھا کہ بھارت کی سرزمین پر پاکستان بنے۔ اسے تو مسلمانوں سے اپنی ذلت کا حساب لینا تھا۔ باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان اتنے بڑے ملک پر چھا گئے تھے۔ اتنی بھاری اکثریت پر غالب آ گئے تھے۔ انہوں نے صدیوں اس بھاری اکثریت پر حکمرانی کی۔ بھاری اکثریت صدیوں محکوم رہی.... اور وہ

marksman

بھی ہنسی خوشی۔ ہندوؤں کے اکابرین نے سمجھ لیا کہ اگر ہندو مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ ان کے انتقام کے منصوبے کا یہ حصہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو جو پہلے ہندو تھے' ہندو مت کی طرف واپس لانا ہے..... انہیں شدھی کرکے۔ ذلیل کرکے... اور ذلیل کرتے رہنا ہے۔ انہیں صدیوں کی محکومی کا قرض چکانا تھا۔ لیکن کچھ مصلحتوں کی وجہ سے انہیں تقسیم پر آمادہ ہونا پڑا۔ پاکستان کو انہوں نے زہر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارا لیکن انہوں نے انسانی عقل کی حد تک اسے جلد از جلد اگلنے کی ہر ممکن تدبیر بھی کرلی تھی۔ ان کے خیال میں یہ نوزائیدہ ملک فاختہ کی طرح تھا جس کی گھات میں وہ شکرے کی طرح تھے۔ بس وہ یہ بھول گئے کہ وہ شکرا نہیں' گدھ ہیں..... مردار خور گدھ جو زندہ کو شکار کرہی نہیں سکتا۔

"پاکستان کی تشکیل میں ہندوؤں نے اپنی سب عیاریاں آزما ڈالیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ یہ مملکت اپنی بے سروسامانی اور ابتری کے سبب سے بہت تھوڑے عرصے میں خود ان کے قدموں میں آگرے گی لیکن وہ جذبے کی اہمیت اور طاقت سے ناواقف تھے۔ پاکستان میں رہنے والے اتنی تیزی سے پاکستانی قوم بنے اور ان میں اتنی شدت سے جذبۂ تعمیر ابھرا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تنکے ایک خوب صورت اور پُرسکون آشیانے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ہندو قیادت کو اندازہ ہوگیا کہ یہ مملکت خود زیر ہونے والی نہیں۔ بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ ان کے پاس بھاری اور منظم فوجی طاقت تھی۔ انہوں نے سوچا کہ بزور اکھنڈ بھارت بنادیں گے مگر پہلے چیک کرنا ضروری تھا۔ اپنی طاقت اور پاکستان کی کمزوری کی پیمائش کے لیے ان کے پاس آلہ موجود تھا..... کشمیر۔ انہوں نے وہاں جارحیت کی لیکن جو نتیجہ نکلا' اس نے انہیں حیران کردیا۔ ایک مرحلے پر تو ایسی صورتِ حال تھی کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہونے کو تھا چنانچہ بوکھلایا ہوا نہرو بھاگا اور امریکا کی گود میں بیٹھ کر فریاد کرنے لگا۔ امریکا نے اس کے حق میں تصفیہ کرادیا۔ اکھنڈ بھارت کا خواب تو دھرا رہ گیا۔ اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا..."

"بس..... آج کے لیے اتنا کافی ہے" بابا عصر نے کہا "اب مجھے جانا ہے لیکن ایک کام اور ہے۔ اشرفی کے سفر کا ایک مرحلہ میں تمہیں سناؤں گا اور تم اسے لکھو گے۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی "میں تو وہ ویسے بھی لکھ سکتا ہوں' میں اس کا مرکزی کردار ہوں۔"

"لیکن بہت کچھ ایسا ہے جو تمہیں بھی معلوم نہیں۔ ویسے بھی اشرفی کا سفرنامہ آخر تک میں ہی بیان کروں گا۔"

"ٹھیک ہے بابا عصر۔"

اس کے بعد بابا عصر بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی گئیں' آخر میں بابا عصر نے کہا "یاد رکھو' سود کا لین دین یہود کی بیماری ہے۔ جبکہ اللہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ مگر اللہ کے سختی سے حکم دینے کے باوجود یہود نے اسے ترک نہیں کیا۔ یہ ان کی معزولی کے اسباب میں سے ایک ہے۔"

"جی۔ میں سمجھ گیا۔"

"اور مسلمانوں کی وضع قطع' ان کا طرزِ زندگی و بود و باش' ان کا کردار' ان کے اعمال..... سب کچھ مسلمانوں کا سا ہونا چاہیے۔ ویسا جیسا اللہ چاہتا ہے۔ ان کو کسی بھی اعتبار سے کفار سے یا یہود و نصاریٰ سے مشابہ نہیں ہونا چاہیے۔ مشابہت پیدا کی تو نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا۔ اچھا..... اب میں چلتا ہوں۔"

میں بابا عصر کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ آخری بات بہت اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔

○☆○

اس رات میں اشرفی کا سفر لکھنے بیٹھا۔ اس بار بھی وہی ہوا۔ میں اپنی اسٹڈی میں بھی تھا اور اس فٹ پاتھ پر بھی۔ بابا عصر کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی اور ایک اور..... بے حد انوکھا تجربہ بھی ہوا۔ میں جیسے اس اندھے فقیر کو آر پار بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی سوچیں' اس کے خیالات پڑھ سکتا تھا۔

میں نے لکھنا شروع کردیا....

○☆○

وہ بس نام کا فقیر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بھکاری تھا۔ اسے شکایت یہ تھی کہ اس کا نام کوئی ٹھیک سے نہیں لیتا۔ اسے سب فقیرا کہتے تھے حتیٰ کہ گھر میں بیوی بھی اسے او فقیرے کہہ کر بلاتی تھی' فقیرے کو او' پر اور بیوی کے طرزِ تخاطب پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا تو وہ عادی تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگنے والے کو آپ جناب کہہ کر لاکھوں میں کوئی ایک ہی مخاطب کرتا ہے اور وہ بے چارہ اپنی ہی عزت کھو بیٹھتا ہے۔ فقیرے کو بس یہ آرزو تھی کہ کوئی اسے..... سن بھئی فقیر حسین..... کہہ کر پکارے لیکن اس سلسلے میں اس کا زور اپنی بیوی پر بھی نہیں چلتا تھا۔

فقیرا ان دنوں کچھ پریشان تھا۔ رمضان گزرا جارہا تھا۔ آج ۲۸ واں روزہ تھا۔ مگر یہ پورا مہینہ بڑا مندا گیا تھا۔ گزشتہ روز اس نے حساب لگایا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس رمضان میں یومیہ کمائی کا اوسط بمشکل ۴۰۰ روپے بنتا تھا۔ جبکہ عام دنوں میں بھی اس کا دھندا کبھی تین ہزار روپے روز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ پچھلے رمضان میں تو اس نے دو لاکھ سے اوپر پیا تھا۔ مگر اس بار تو حد ہی ہوگئی تھی۔ رمضان کا گراف عام مہینوں سے بھی نیچے آگیا تھا۔ پتا نہیں' کیا ہوتا جارہا ہے اس دور کے مسلمانوں کو۔ فقیرے نے نہایت دکھ سے سوچا۔ اب تو خیرات اور زکوٰۃ سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔

"کیا حال ہے بے فقیرے؟"

کانسٹیبل مولاداد کی آواز نے اسے چونکادیا۔ اس نے سر اٹھا کر ناپسندیدہ نظروں سے مولاداد کو دیکھا "تو عصر مغرب کے درمیان اپنا چہرہ نہ کرایا کر مجھے" اس نے بہت بدمزگی سے کہا "یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تیرے چہرے پر پھٹکار اور نحوست کی حد ہوجاتی ہے۔ ایسے میں تیری صورت دیکھ کر اپنا تو دھندا ہی چوپٹ ہوجاتا ہے۔"

مولا داد نے اس کی بات کا مطلق برا نہیں مانا۔ تھانے میں جانے والے بھتے کے علاوہ بھی وہ اسے روز دس بیس روپے دے دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی حلیمی سے کہا "میں پوچھ رہا ہوں' کیا حال ہے تیرا؟ دھندا کیسا چل رہا ہے فقیرے؟"

"دھندا!" فقیرے نے دل دوز آہ بھر کے کہا "اس بار تو رمضان میں فاقے کر رہا ہوں۔"

مولا داد بدتمیزی سے ہنسنے لگا "واہ... کیا بات کہی ہے فقیرے۔ رمضان میں فاقے۔ کتنا بدنصیب ہے تو۔ ابے روزہ ہی رکھ لیا کر" پھر اس نے فقیرے کے تیور بدلتے دیکھے تو جلدی سے موضوع بدلا۔ "یہ بتا' تجھے اس وقت میرے چہرے پر پھٹکار کیوں نظر آتی ہے؟"

فقیرے نے اس کے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگ کو نفرت سے دیکھا' جس میں سے دنیا بھر کے پھل نکلے پڑ رہے تھے۔ "یہ جو تو بھتے کے علاوہ افطار وصول کرتا ہے' غریب پھل فروشوں سے تو پھٹکار اور نحوست تو برسے گی ہی۔"

"ایس ایچ او کا حکم ہے' یہی کیا کروں۔ اور یہ پھل تو اس سے بھی آگے بڑے بڑے افسروں کو جاتے ہیں" مولا داد نے شرمندگی سے کہا "مجھے تو مشکل سے ایک کھجور اور ایک کیلا ملتا ہے اور کبھی کبھی تو کیلا ملتا ہی نہیں۔"

"اچھا چل' اب آگے بڑھ۔" فقیرے نے اسے ڈپٹا "زیادہ نحوست نہ پھیلا دھندے کے ٹیم۔"

مولا داد ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فقیرا صدا لگانے ہی والا تھا کہ تیرا اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ فقیرے کا بیٹا تھا۔ نام اس کا تنویر تھا لیکن پیار میں اسے تیرا کہا جاتا تھا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے بیٹے!" فقیرے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"دھندا نہیں ہے ابا۔ میں بور ہو کر تمہارے پاس چلا آیا۔ بس میں دھکے کھانا اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ ہی گھر چلوں گا گاڑی میں۔"

فقیرے کا موڈ آف ہو گیا "ابے دھندا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ تجھے پر بیٹھے گا تو مستقبل بنے گا۔ یوں بھاگنے سے تو دھندا اور خراب ہو گا۔"

"میرا دل نہیں لگتا ابا۔ پتا ہے' دن بھر میں چار سو روپے بھی نہیں ملے۔ اس سے زیادہ تو میں تم سے جیب خرچ لے لیتا تھا" تیرے نے شاکی لہجے میں کہا۔

"اب پتا چلا کہ آپ کمائی اور باپ کمائی میں کتنا فرق ہے" فقیرے نے کہا اور تنقیدی نظروں سے بیٹے کو دیکھا "اور یہ تیرے ہاتھ کو کیا ہوا؟"

تیرا بوکھلا کر اپنے ہاتھ ٹٹولنے لگا "کچھ نہیں ابا' ٹھیک تو ہے۔"

"ابے اُلو کے پٹھے! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ٹھیک کیوں ہے۔ اسے موڑ جلدی سے' مٹا بن فاؤنٹ۔"

"ابا' اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" تیرے نے برا مانتے ہوئے کہا "میں آف کر کے آیا ہوں۔"

"دیکھ' ابھی تو اپرنٹس ہے۔ ڈیوٹی پر ہو یا نہ ہو' ڈیوٹی ٹائم تک گیٹ اَپ خراب نہ کیا کر" فقیرے نے سمجھایا "اب تو اسی طرح یہاں بیٹھے گا تو میرا دھندا بھی خراب ہو گا۔"

تیرے نے سعادت مندی سے باپ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہاتھ کو بل دیا اور مٹا بن گیا۔

فقیرے نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ خوش تھا کہ بیٹے سعادت مند ملے ہیں۔ اس کے تین بیٹے تھے' تعلیم مکمل کرانے کے بعد اس نے تینوں کے لیے ٹھیے خرید کر انہیں دھندے پر بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے تھوڑا سا احتجاج کیا تھا کہ اتنی دولت ہوتے ہوئے وہ بھیک کیوں مانگیں۔ اس پر فقیرے نے ڈپٹ کر کہا تھا "یہ دولت بھیک ہی کے دم سے ہے۔"

"مگر اب ہے تو بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟" بڑے بیٹے نے اعتراض کیا۔

"دولت آتی مشکل سے ہے اور جاتی آسانی سے ہے۔ جنہیں کمانا نہیں آتا' وہ تو برسوں کی کمائی ہوئی دولت دنوں میں اڑا دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میری زندگی میں ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔"

"لیکن ابا' ہم پڑھے لکھے ہیں" منجھلا بیٹا بولا۔

"بھیک کے پیسوں سے ہی پڑھے ہو" فقیرے نے تیز لہجے میں کہا "اس سے اچھا دھندا نہیں ملے گا تمہیں۔"

"ہم یہ کام نہیں کر سکتے" تینوں بیٹوں نے بیک آواز کہا۔

"تو نہ کرو۔ کل سے جیب خرچ بھی بند اور گھر میں کھانا بھی نہیں پکے گا۔ بھوکے مرو گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور لڑکوں کا دماغ فوراً ہی ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بڑے بیٹے نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ابا۔ تمہاری زندگی میں نہ سہی' تمہارے مرنے کے بعد سب کچھ ہمارا ہو گا۔ ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں گے۔"

فقیرا اس کی روک تھام پہلے ہی کر چکا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکے اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسا نہیں ہو گا۔ میں وصیت نامہ لکھوا چکا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد بھی یہ سب کچھ تمہارا نہیں ہو گا۔ ہاں' میری موت کے بعد جو دس سال تک ہر روز بلاناغہ دوپہر بارہ بجے سے رات آٹھ بجے تک یہ دھندا کرے گا' وہ میری دولت کا حق دار ہو گا۔ تم تینوں نے یہ شرط پوری کر دی تو میری تمام دولت تینوں میں تقسیم ہو جائے گی ورنہ شہر بھر کے تمام بھکاریوں میں تقسیم ہو جائے گی۔"

لڑکوں کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ تیر کی طرح سیدھے ہو گئے۔ فقیرا جانتا تھا کہ کروڑوں کی دولت چھوڑنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں۔

"ابا... مجھے ایک بائیک ہی دلا دو۔"

تیرے کی فرمائش فقیرے کو حال میں واپس لے آئی۔ اس نے بیٹے کو غور سے دیکھا "تو اپنی کمائی سے ہیلی کاپٹر خرید لے بیٹے' اور اس میں دھندے پر آیا کر اور گھر جایا کر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں

ہو گا" اس نے بے حد شفقت سے کہا "لیکن مجھ سے سائیکل کی امید بھی نہ رکھ۔ اچھا' اب چپ ہو جا' کوئی دیالو آ رہا ہے" اس نے آہٹ کی سمت دیکھا تو اسے وہ شخص آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دو شاپنگ بیگ تھے جن میں پھل اور دوسری چیزیں تھیں۔

فقیرے نے تیزی سے اپنی آنکھوں میں بے نوری کا تاثر ابھارا "اے داتا' اندھے فقیر کو کچھ دے دے۔ دو روز سے بے سحری اور افطار کے ہوں۔"

تیرا دل میں اُش اُش کر اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابا سچا ہے بلکہ یہ انڈر اسٹیٹ مینٹ تھا۔ ابا ۲۸ سحریوں اور ۲۷ افطار سے محروم تھا۔ اس لیے کہ سحری میں وہ اٹھتا نہیں تھا اور افطار کے وقت گھر کے راستے میں ہوتا تھا۔ مگر وہ دعویٰ دو روز کا کر رہا تھا۔ تیرے کا دل بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ جیب میں جو کچھ ہے' ابا کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دے۔

آنے والا رکا اور اس نے فقیرے کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا "لو.... آج اچھی طرح افطار کر لینا۔"

"دس آدمیوں کا کنبہ ہے داتا۔ اس میں کیا اچھی طرح افطار ہو گا" فقیرے نے بے حد عاجزی سے کہا۔

آنے والے نے اس بار سو کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا "بابا.... میں تمہیں کچھ اور بھی دینا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

"میں حاضر ہوں دیالو۔ جو بھی دے دو' کم ہے۔"

"کچھ بتانا سمجھانا بھی ہے۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھ جاؤ داتا۔ اللہ کی زمین ہے' میں کون روکنے والا۔ بس یہاں بیٹھ کر دھندا میرا سگا بیٹا بھی نہیں کر سکتا۔"

آنے والا ایک لمحے کو حیران نظر آیا پھر وہ وہیں اکڑوں بیٹھ گیا۔

"میرا نام آفاق ہے۔ دو دن پہلے اللہ کی بڑی عنایت ہوئی مجھ پر۔ مجھے ایک امانت دی گئی اور حکم ہوا کہ وہ کسی امین اور دیانت دار شخص کو پہنچا دوں' جو اسے آگے بڑھا دے۔"

تیرے کا جی چاہا کہ اس شخص کو خبردار کر دے کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ لیکن عاق ہو جانے کے ڈر سے چپ رہا۔

"ضرور دو داتا۔"

آفاق نے جیب سے دونوں اشرفیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں "ان میں ایک پر تمہارا اختیار ہے' جی چاہے تو رکھ لینا۔"

"دوسری بھی مجھے دے دو نا؟" فقیرے نے گھگیا کر کہا۔

"نہیں۔ وہ اللہ کی امانت ہے اور تمہیں کسی اور امین اور دیانت دار کو سونپنی ہے.... انہی ہدایات کے ساتھ جو میں تمہیں دوں گا...." وہ اسے اشرفیوں کی اہمیت سمجھانے لگا۔

اسی وقت فقیرے کو افضل نظر آ گیا' وہ اسی طرف آ رہا تھا۔

"ایک منٹ بابو' میں ذرا اس سے بات کر لوں۔ پھر تمہاری سنوں گا" اس نے اشرفیاں لبادے کی جیب میں ڈال لیں۔ افضل نے آ کر کچھ نوٹ فقیرے کو دیے۔ فقیرے نے انہیں گنا اور سخت لہجے میں بولا "یہ تو صرف سات سو ہیں۔"

"ہاں بھائی۔ یہ بھی بڑی مشکل سے لایا ہوں۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے اس عید پر" افضل نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگلی عید پر بنا لینا" فقیرے نے بے پروائی سے کہا "مگر مجھے تین سو اور دو۔"

"نہیں ہیں نا استاد۔ ہیں ہی نہیں" افضل گڑگڑانے لگا۔

آفاق حیرت سے کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی فقیرے کو۔

فقیرے نے افضل کا گریبان پکڑ لیا "دیکھ بھئی' ایسے تو میرا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اصل بھلے نہ دے لیکن ہر مہینے سود دینے میں ناغہ نہ کرنا۔ اور تو پہلے ہی مہینے یہ گڑبڑ کر رہا ہے۔ دیکھ تجھ سے تو میں سو پرسیں لے رہا ہوں۔ آج ایک ضرورت مند آیا تھا' پانچ ہزار مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا سو پرسنٹ پچیس لوں گا۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں نے کہا' ضرورت پانچ کی ہے تو سات لینا پڑے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ سات ہزار پر سود ہوا پونے دو ہزار۔ وہ نکال کر بچیں گے سوا پانچ۔ چاہو تو سوا پانچ لے لو ورنہ ۲۵۰ روپے اگلے مہینے کے سود میں کٹوا دو ابھی سے۔ بہت خوش ہو کر گیا بے چارہ۔ دعائیں دے رہا تھا مجھے۔ پر تم لوگ ایسا کرو گے میرے ساتھ تو دوسرے ضرورت مندوں کا نقصان ہو گا۔ میں انہیں کہاں سے دوں گا۔ میں تو غریب بھکاری ہوں۔ میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے" اس کا لہجہ بدل گیا۔

"نکال تین سو روپے اور۔"

"ابھی تو نہیں ہیں فقیرے بھائی۔ کل کہیں سے کروں گا تو لا کر دوں گا۔"

"بس لے آئیو کل۔ ورنہ گھر آ کر بے عزت کروں گا" فقیرے نے گرج کر کہا "بس اب چلا جا۔"

افضل چلا گیا تو فقیرا آفاق کی طرف مڑا' جس کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے قے ہونے والی ہے "ہاں تو بابو' تمہاری بات میں سمجھ گیا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"میرا نہیں' اللہ کا کام" آفاق نے جلدی سے تصحیح کی "مگر تم تو سود کا کاروبار کرتے ہو؟"

"کاروبار کیا' ضرورت مندوں کے کام آتا ہوں" فقیرے نے عاجزی سے کہا۔

"مگر یہ تو سود ہے۔"

"تو یہاں کون ہے جو سود نہیں لیتا دیتا۔ تم بینک میں پیسہ جمع کراتے ہو تو تمہیں سود ملتا ہے۔ بینک سے قرضہ لیتے ہو تو تمہیں سود دینا پڑتا ہے۔ جاؤ پکڑو سب کو۔ مجھ منگتے کو کیوں پکڑتے ہو۔"

"بینک کی باتیں حکومت والے جانیں۔ میں تو خود کو اور تمہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس لیے کہ اللہ کی امانت تمہیں سونپ رہا ہوں۔"

فقیرے کا موڈ خراب ہونے لگا "یہ سب چھوڑو۔ کام کی بات کرو" اس نے بے رخی سے کہا "یہ بتاؤ' اس اشرفی کی قیمت کتنی ہو گی؟"

"مجھے نہیں معلوم" آفاق نے کہا "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی اس کے پانچ سو بھی نہیں دے گا۔ لیکن میں ایک لاکھ بھی دے دوں گا۔ صرف اس لیے کہ نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے مجھے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"دیکھو' ایک تو ویسے ہی میری ہوگئی۔ ہے نا؟ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ دوسری بھی کسی اور ناقدرے کے پاس جائے۔ میں وہ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم امین اور دیانت دار ہو ہی نہیں سکتے۔ سود کا کاروبار بھی کرتے ہو" آفاق نے غصے سے کہا۔

"دیکھو' میرے کاروبار سے تمہارا واسطہ نہیں۔ اور بددیانت اور خائن میں ہوں نہیں۔ ہوتا تو دوسری اشرفی بھی یونہی رکھ لیتا۔ کوئی کیا بگاڑ لیتا میرا لیکن اس میں اللہ کا نام ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ دوسری اشرفی ایک لاکھ میں خریدوں گا اور وہ ایک لاکھ روپے اپنے جیسے کسی امین اور دیانت دار کو تھمادوں گا کہ انہیں آگے بڑھادے۔"

"یہ خیانت نہیں ہے تمہارے خیال میں؟" آفاق غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا "تمہیں وہ اشرفی آگے بڑھانی ہے۔"

"میں اس کی ناقدری نہیں کرنا چاہتا۔ اور دیکھو' پانچ سو کی چیز میں ایک لاکھ میں خرید رہا ہوں' یہ خیانت ہے؟"

"تم امانت کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ کیسے سمجھو گے' سود کھاتے ہو' اندھے نہیں ہو' ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ جھوٹ بے تحاشا بولتے ہو۔ تم تو اس نعمت کے اہل ہی نہیں ہو۔ لاؤ' وہ اشرفیاں مجھے واپس دے دو۔ میں انہیں کسی اچھے دیانت دار شخص کو سونپوں گا۔"

"ارے واہ.... اشرفیاں تو اب تمہیں نہیں مل سکتیں۔"

"میں زبردستی لے لوں گا۔" آفاق نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میں تمہارے ایک ہاتھ جڑدوں تو ابھی تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر یہاں میرا جوان اور مجھ سے زیادہ تگڑا بیٹا بھی بیٹھا ہے لیکن سب سے آسان بات یہ ہے کہ میں شور مچادوں کہ تم اندھے فقیر کو لوٹ رہے ہو۔ میرا بیٹا گواہی دے گا اور لوگ تمہاری چٹنی بنادیں گے۔ پھر پورا تھانہ مجھے جانتا ہے۔ رات بھی حوالات میں گزارنی پڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چل دو یہاں سے۔"

آفاق کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بے بس ہوچکا ہے۔ اس کا دل شرم' رنج اور تاسف سے بھرگیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

"جا بابو' چلا جا یہاں سے" اندھے فقیر نے کڑک کر کہا "یا پھر میں مچاؤں شور۔"

آفاق گھبرا کر وہاں سے ہٹ آیا۔ اسی وقت اسے ایک ٹیکسی گزرتی نظر آئی۔ اس نے اشارہ دے کر ٹیکسی کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ مگر اس کا دل اور روح بوجھل تھے۔ وہ ایک بے حد قیمتی چیز بہت برے آدمی کے پاس چھوڑے جارہا تھا۔

مگر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب اسے یہ خیال آیا کہ اس امانت کی حفاظت اللہ کو کرنی ہے۔ نااہل آدمی کے پاس وہ اشرفیاں رکیں گی نہیں' اس کے پاس واپس آجائیں گی' تو اس کا بوجھ قدرے کم ہوگیا لیکن شرمندگی رہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا.... کوئی مسلمان' کوئی پاکستانی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے بڑی امید کے ساتھ اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اسے مایوسی ہوئی' اشرفیاں ابھی تک اس کی جیب میں واپس نہیں آئی تھیں۔

○☆○

تنویر عرف تیرا دیکھ رہا تھا کہ اشرفیاں ملنے کے بعد ابا کی کیفیت کچھ بدل گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فقیرا بہت بے چین اور مضطرب تھا۔ دھندے میں تو اس لمحے کے بعد اس نے دلچسپی لی ہی نہیں۔ وہ تو بار بار جیب میں ہاتھ ڈال کر ان اشرفیوں کو چھوتا تھا۔ چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ انہیں نکال کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن اشرفیاں اس نے ایک بار بھی جیب سے نہیں نکالیں۔ جیسے وہ ڈرتا ہو کہ کوئی انہیں چھین لے گا۔

دو ایک راہ گیر اس کے سامنے فٹ پاتھ پر سکے گراتے ہوئے گئے لیکن اس نے سکوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ورنہ ہمیشہ وہ ان پر یوں جھپٹتا تھا جیسے ان پر اس کے جینے کا انحصار ہو۔ یہ حرص اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

تیرے نے ابا کو اس حال میں.... دھندے سے بے خبر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موقع مناسب دیکھ کر اس نے اپنا ٹنٹے کا گیٹ اَپ ختم کر دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ایکٹنگ کرنے والے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ گیٹ اَپ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ہاتھ سیدھا کرنے کے بعد بھی پوری طرح سیدھا نہیں ہوتا تھا اور اس میں اینٹھن بھی ہوتی رہتی تھی۔ ڈیوٹی آف کرنے کے بعد سے سونے تک وہ اس ہاتھ کو سہلاتا رہتا تھا۔ کبھی تو اسے ڈر لگنے لگتا تھا کہ اس کا یہ ہاتھ بے کار ہی ہو جائے گا۔

اونچی ایڑیوں کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی تو تیرے نے بے چین ہو کر آہٹ کی سمت دیکھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ لڑکی بے حد حسین تھی اور بے نیازی سے پرس جھلاتی ہوئی اسی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس کی چال میں دل ربائی تھی۔ تیرا بڑی وارفتگی سے اسے تکتا رہا۔ 'جانِ من' نظریں تو اٹھاؤ۔ تمہیں تمہارے بے مثال حسن کی قسم۔' تیرے نے دل میں اسے پکارا۔ لڑکی کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کی پکار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر شاید وہ شدت اثر کر گئی۔ بہت قریب آ کر لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر وہ دیکھنا غضب ہو گیا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی بیمار کتا ہو۔ اس کی نگاہوں میں ترحم ابھرا۔ وہ رکی' اس نے پرس کھول کر اس میں سے روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر چند لمحے وہ باری باری فقیرے اور تیرے کو تکتی رہی' جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ نوٹ کسے دیا جائے۔ تیرے نے جلدی سے ابا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنے آپ میں اور ان اشرفیوں کے سحر میں گم تھا۔ تیرے نے سکون کی سانس لی۔

بالآخر لڑکی نے فیصلہ کر لیا اور روپے کا نوٹ تیرے کی طرف بڑھایا لیکن تیرے نے نوٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا "اس پر اپنے آٹو گراف دے دو مس صاحبہ!" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بلکہ ایڈریس بھی لکھ دو۔"

وہ سرگوشی پورے لفظوں اور مفہوم کے ساتھ لڑکی تک نہیں پہنچ سکی "کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔

تیرے نے کن انکھیوں سے ابا کو دیکھا اور سرگوشی کا والیوم ذرا بڑھا دیا۔ اس کے نتیجے میں اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ اس نے کہا "تم کو جھکنا پڑے گا مس صاحبہ۔ میری آواز اس سے زیادہ نہیں نکل سکتی۔"

لڑکی اس کی طرف جھکی تو تیرے پر قیامت گزر گئی۔ پھر بھی اس نے دل کی بات کہہ ہی دی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے اضافہ کیا "لیکن یہ نوٹ چھوٹا ہے۔ میں جیب سے سو کا نوٹ نکالتا ہوں۔ ایک طرف آٹو گراف اور دوسری طرف ایڈریس دے دو۔"

"آٹو گراف!" لڑکی نے برہمی میں لپٹی ہوئی حیرت سے دہرایا۔ "اے' تم بھک منگے ہو یا لفنگے؟" اس نے بے حد خراب لہجے میں کہا "مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟"

اس دوران میں تیرا جیب سے سو کا نوٹ نکال چکا تھا۔ لڑکی کا ایک کا نوٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن لڑکی کے تیور دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ ابا کے ٹھیے پر گڑبڑ ہو گئی تو ابا عاق ہی کر دے گا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا "آپ.... آپ فلم اسٹار میرا نہیں ہیں؟"

یہ سن کر لڑکی مسکرائی پھر اس کی مسکراہٹ ہوا ہو گئی اور اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "ایسی میری قسمت کہاں؟" اور یہ کہہ کر وہ سست قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

تیرا اس کے جملے پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی میرا ہونا خوش نصیبی کی بات ہے مگر وہ اس بات پر زیادہ دیر غور نہ کر سکا۔ قسمت پر اسے اپنی قسمت کا خیال آ گیا۔ اللہ نے کیسی اچھی شکل و صورت دی تھی اسے۔ کیسا کسرتی جسم تھا اس کا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں اسے پرنس چارمنگ کہتی تھیں۔ دیوانی تھیں اس کی۔ ہائے کیا دن تھے! مگر کیا زندگی ہے کہ وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہو کر ایسی مشقت کر رہا ہے... ذلت اٹھا رہا ہے۔ بارہ بجے سے دس بجے تک ٹنٹے بن کر بھیک مانگو۔ تف ہے اس زندگی پر۔ سیکڑوں لڑکیاں سامنے سے گزر جائیں لیکن نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اسے۔ ہائے..... یہ تو ہنسنے کھیلنے کے دن تھے' فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے کے تو نہیں اور رمضان میں تو ابا نے ڈبل ڈیوٹی کر دی ہے۔ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے ایک اور ٹھیا لگوا دیا ہے۔ رات دس بجے سے صبح چار بجے تک وہاں بھیک مانگو۔ تھک کر چور ہو جاؤ' گھر پہنچ کر بستر پر گر کر بے سدھ ہو جاؤ۔ نیند پوری ہونے سے پہلے اٹھو کہ ڈے شفٹ کا وقت ہو رہا ہے۔ لعنت ہے۔

اچانک تیرے کو اپنے ہاتھوں میں نوٹوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نوٹوں کو دیکھا۔ ایک سو ایک روپے۔ واہ.... کتنا اچھا شگون ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ایک سو ایک روپے تو منہ دکھائی میں ملتے ہیں۔ واہ.... لگتا ہے' قسمت کھلنے والی ہے۔ 'ابے او لنڈھگ' اسی لمحے اس کے اندر سے کسی نے ڈانٹا۔ منہ دکھائی تو لڑکیوں کی ہوتی ہے' لڑکوں کو سلامی ملتی ہے' تو چلو..... سلامی ہی سہی۔ اس نے سوچا۔ بہرحال' شگون اچھا ہے۔ اُلو کا پٹھا ہے تو... اندر کی آواز نے پھر ڈانٹا..... ابے یہ کیسی سلامی ہے کہ سلامی کے ایک سو ایک میں سو تیرے اپنے ہیں اور ایک دوسرے کا' ایسی ہوتی ہے سلامی.....!

اور اسی لمحے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری سلامی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا تو ابا اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا "سالے..... میرے ٹھیے پر تو دھندا نہیں کر سکتا۔" فقیرے نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"ابا.... یہ میرے اپنے ہیں۔ بھیک میں نہیں ملے" تیرے نے احتجاج کیا۔

"جھوٹ مت بول۔ اپنے ٹھیے پر میں بے خبر کبھی نہیں

ہوتا... خاص طور پر دھندے سے۔"

"ابا... ایک کانوٹ لڑکی نے دیا تھا' سو کا میرا اپنا ہے۔"

"یہ جرمانے میں ضبط ہو رہا ہے۔ ٹھیے پر بیٹھ کر یہ سب نہیں کرتے' سمجھا حرام کے تخم۔"

تیرا کہنا چاہتا تھا کہ تخم کا تو نہیں' ہاں پیٹ کا حرامی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ آپ کی کمائی پر پلا بڑھا ہوں لیکن یہ کہنے میں عاق ہونے کا خطرہ تھا' جس سے بچنے کے لیے وہ بھیک تک مانگنے پر تیار ہو گیا تھا "تو پھر کیا کروں ابا۔ رومانس کے لیے ٹائم ہی نہیں بچتا۔"

"رومانس کو چھوڑ۔ کیریر کی فکر کر۔ رومانس کے لیے تو عمر پڑی ہے۔" فقیرے نے سلامی کے ایک سو ایک بغیر سلام کیے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "ارے افطار کا ٹائم ہو رہا ہے۔ چل اب گھر چلیں۔"

تیرا فقیرے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مارکیٹ کے باہر فقیرے کی ٹویوٹا کھڑی تھی۔ وہاں پہنچ کر فقیرے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ افطار کا سائرن بجنے ہی والا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ٹخنوں تک پہنچنے والا لبادہ اتارا۔ اس کے نیچے وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ کوٹ کی جیب سے کنگھا نکال کر اس نے بال سنوارے اور چابی لگا کر کار کا دروازہ کھولا۔ اتنی دیر میں تیرا بھی ٹی شرٹ اور جینز میں برآمد ہو چکا تھا۔

فقیرے نے چند لمحے سوچا' پھر چابی تیرے کی طرف بڑھائی۔

"لے... آج تو ڈرائیو کر۔ کیا یاد کرے گا۔"

تیرے کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے تیزی سے چابی جھپٹ لی۔ ابا کا ڈرائیونگ کا ایسا شوق تھا کہ کسی اور کو ڈرائیو کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ تیرے کو ابا کی عنایت کا سبب معلوم ہو گیا۔ فقیرا اپنی گود میں دونوں اشرفیوں کو رکھے ان سے کھیل رہا تھا۔ تیرے کو پھر وہ خلش ستانے لگی' جسے اس نے فٹ پاتھ پر دبا دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "ابا... ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟"

"خالی ہاتھ بات کہے گا تو ضرور برا مانوں گا۔"

"ابا... تم یہ اشرفیاں رکھنے کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔"

"میں انہیں صرف اس لیے رکھ رہا ہوں کہ یہ نادر و نایاب چیزیں ہیں" فقیرے نے خشک لہجے میں کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ملک و قوم کی امانت ہیں۔ ہماری نسلوں کا ورثہ ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

"نہیں ابا۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک میں خیر و برکت ہو۔ خوش حالی ہو۔ ان اشرفیوں کو تو جلد از جلد قومی خزانے میں پہنچ جانا چاہیے۔ ان کا راستہ کھوٹا مت کرو۔" تیرے کے لہجے میں دردمندی تھی "اس نیک آدمی نے یہی کہا تھا۔"

"وہ نیک کیسے ہو گیا؟" فقیرے نے چونک کر پوچھا۔

"سوچو ابا۔ جس نے اسے وہ اشرفیاں دیں' اس نے اس سے یہی کچھ کہا ہو گا جو اس نے تم سے کہا۔"

"ہاں تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اس نے اپنی اشرفی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ تمہیں دے دی تاکہ تمہارے دل میں بے ایمانی نہیں آئے۔ تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

"وہ نیک نہیں۔ بے وقوف تھا' کنگلا تھا۔ سالے نے ایسی چیز دیکھی ہی نہیں ہو گی کبھی۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ مگر میں نہ بے وقوف ہوں' نہ کنگلا۔"

"تم کچھ بھی کہو ابا۔ وہ سچا پاکستانی اور دیانت دار اور امین مسلمان تھا۔ میں کہتا ہوں' ان پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ کیا اللہ کی امانت میں بھی خیانت کرو گے۔"

"تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی امانت ہیں اور وہ کہانی سچی ہے' جو اس نے سنائی تھی۔"

"انہیں غور سے دیکھو..... دل کی آنکھوں سے دیکھو ابا۔ اللہ کا نام اور کلمہ ان کے اوپر نہیں' اندر لکھا ہے۔"

"اسی لیے تو یہ نادر و نایاب ہیں" فقیرے نے زور دے کر کہا۔ "اور صرف اللہ کا نام ہونے کی وجہ سے میں نے ایک لاکھ روپے قیمت لگا دی۔ سوچ تو بسمی' ہزار نہیں' پانچ ہزار نہیں' دس ہزار نہیں۔ پورے ایک لاکھ۔ ورنہ میں اسے یونہی رکھ لیتا۔ ہے نا دیانت داری۔ ہے نا امانت داری۔"

"نہیں ابا۔ یہ بد نیتی ہے..... خیانت ہے۔ تمہیں اشرفی آگے

جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی دوا

فربینا

فربینا جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے کی یونانی دوا ہے جو قدرتی طور پر ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں بازو' کمر' کولہے' گردن' کندھے اور چہرے کے گالوں پر گوشت میں اضافہ کر کے جسم بھرا بھرا' خوبصورت' موٹا و تندرست بنا دیتی ہے۔

فربینا شروع کرنے سے پہلے اپنا وزن نوٹ کر لیں اور ایک ماہ تک فربینا کی خوراکیں کھاتے رہیں ایک ماہ بعد اپنا وزن دوبارہ چیک کریں تو آپ کو فرق صاف نظر آجائے گا۔ مکمل طور پر قدرتی اجزا سے تیار کردہ قطعی بے ضرر یونانی مرکب قیمت -/۳۵۰ روپے وزن ایک کلو جو ایک ماہ کی مکمل خوراک ہے۔ ایک خط لکھ کر بذریعہ V.P منگوائیں۔

حکیم ارشد لیبارٹریز پوسٹ بکس 2608 اسلام آباد

بڑھانے کو کہا گیا ہے' کوئی رقم نہیں۔"

"بس تو چپ کر جا۔ یہ میرا معاملہ ہے' تیرا نہیں۔ اب بولا تو...."

تیرا جانتا تھا کہ اب ابا عاق کر دینے کی دھمکی دے گا۔ چپ رہنے میں ہی عافیت تھی۔

سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ایک جوان فقیر نے گاڑی روکنے کے لیے ہاتھ دیا۔ تیرے کو دیکھنے میں دیر ہو گئی۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ اس نے جلدی سے بریک لگائے اور گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"ابے یہ کیا کر رہا ہے؟" فقیرا چلایا۔

"ابا.... نظیر بھائی کو لینا ہے۔"

فقیر پچھلا دروازہ کھول کر فقیرے کے برابر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے تیرے سے پوچھا "کہاں ہے جیرا؟"

"میں یہاں ہوں ابا!" برابر بیٹھے ہوئے نظیر نے کہا۔

"کمال ہے۔ میں پہچانا ہی نہیں" فقیرے نے کھسیا کر کہا۔

"ہمیں تو ہمارے ماں باپ بھی نہیں پہچانتے ابا" جیرے نے دردناک لہجے میں کہا "پرسوں اماں میرے کھٹیے کے سامنے سے گزری۔ میں نے سلام کیا تو اجنبیت سے مجھے دیکھا اور میرے سامنے چونی پھینک کر آگے بڑھ گئی۔ پہچانا ہی نہیں مجھے۔"

"پہچان کر ہی چونی دی ہو گی۔ یہ سوچ کر کہ گھر کا مال گھر میں ہی رہے گا" فقیرے نے اسے دلاسا دیا۔ "ورنہ وہ تو اپنا وائرس بھی کسی کو نہیں دیتی۔"

"پہچانا ہوتا تو ہزار نہ دے دیتی مجھے۔ گھر کا مال گھر میں ہی رہنا تھا۔"

"لیکن وہ اپنا مال اپنے کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"یہ کیا ہے ابا؟" جیرے نے فقیرے کی گود میں رکھی اشرفیوں کو دیکھا۔

تیرے نے اسے پوری تفصیل بمع اس معاملے میں اپنی رائے کے سنا ڈالی۔ جیرے کا بھی یہی کہنا تھا کہ ان اشرفیوں کو آگے بڑھانا چاہیے۔ فقیرے نے اسے بھی عاق کرنے کی دھمکی دے کر خاموش کرا دیا۔

کچھ اور آگے جا کر انہوں نے شیدے کو پک کیا۔ وہ فقیرے کے بیٹوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی بیساکھیاں اگلی سیٹ پر رکھیں اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر بغلیں سہلانے لگا "میرا گیٹ اَپ بدلوا ابا۔ بغل میں سوجن بڑھتے بڑھتے گٹھلیاں بن گئی ہیں۔ لعنت ہو ان بیساکھیوں پر" اس نے شکایت کی۔

"تو ایک جگہ بیٹھا رہا کر۔ لنگڑے زیادہ چلا نہیں کرتے" فقیرے نے مشورہ دیا۔

"بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ لگتا ہے' سچ مچ لنگڑا ہو جاؤں گا۔"

"تو کوئی بات نہیں' بیساکھیاں تو موجود ہیں نا۔"

شیدے کو بھی وہ اشرفیاں دیکھ کر تجسس ہوا۔ اسے بھی وہ کہانی سنائی گئی۔ وہ بھی دونوں بھائیوں سے متفق تھا۔ بلکہ اس کے مطالبے میں شدت تھی۔ اسے بھی وہی دھمکی ملی اور وہ بھی چپ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا "آج نائٹ شفٹ گیارہ بجے ہو گی" فقیرے نے اعلان کیا "گیارہ بجے سے پہلے بازار میں گرمی نہیں آتی۔"

اس پر تینوں لڑکوں نے سکون کا سانس لیا۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فقیرا اپنے کمرے میں جا کر اشرفیوں سے کھیلنے لگا۔ ان سے ایک لمحے کے لیے جدا ہونا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

ساڑھے دس بجے اس نے بیٹوں کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔ پونے گیارہ بجے وہ باتھ روم میں گیا۔ باہر آیا تو اشرفیاں غائب تھیں' جنہیں وہ بیڈ پر چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا اور اندر وہ اکیلا ہی تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح اشرفیوں کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ ہوتیں تو ملتیں۔ وہ باہر نکل آیا اور چیخ پکار کرنے لگا۔ لڑکے اس کا خاص ہدف تھے "تم تینوں میری مخالفت کر رہے تھے۔ وہ اشرفیاں تم نے چرائی ہیں" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"لیکن ابا' ہم تو اپنے کمرے سے نکلے ہی نہیں" شیدا بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ پانچ منٹ میں اشرفیاں مجھے دے دو۔ ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

لڑکوں نے معقولیت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بند کمرے میں تو کسی بھی طرح نہیں گھس سکتے تھے لیکن ان اشرفیوں کی گمشدگی نے فقیرے کو پاگل کر دیا تھا اور لڑکے اشرفیاں کسی بھی طرح نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقیرے نے بیوی کے سمجھانے کے باوجود تینوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا "آج کے بعد مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں" اس نے گرج کر کہا پھر اس نے گیٹ بند کر لیا۔ وہ اتنا اپ سیٹ تھا کہ اس روز وہ نائٹ شفٹ پر بھی نہیں گیا۔

باہر تینوں لڑکے ہکا بکا کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے "اب کیا ہو گا بھائی!" تیرے نے فریاد کی۔

اس پر شیدا تن کر کھڑا ہو گیا "اچھا ہی ہو گا انشاء اللہ" اس نے کہا "اچھا ہی ہوا۔ اس ذلت کی زندگی سے نجات مل گئی۔ ہم پڑھے لکھے ہیں' ذہین ہیں۔ عزت کا کام کریں گے۔ عزت سے رہیں گے۔"

"لیکن کہاں رہیں گے؟" جیرے نے سوال اٹھایا۔

شیدے نے چند لمحے سوچا پھر بولا "ابھی تو کسی ہوٹل میں کمرا لیں گے اور کل سے بیک وقت نوکری اور کرائے کے مکان کی تلاش شروع۔"

"لیکن پیسے...."

"بیس بائیس ہزار تو میرے پاس ہیں" شیدے نے کہا۔

"اتنے ہی میرے پاس بھی ہوں گے" جیرا بولا۔

"پندرہ کے قریب میرے پاس ہیں۔"

"بس تو پھر کیا ہے" شیدے نے اعتماد سے کہا "ملکِ خدا تنگ نیست۔ پائے مرالنگ..."

"است بھائی' لنگ است" تیرے نے جلدی سے اس کا جملہ پورا کردیا۔

"نہیں تیرے' پاؤں مرالنگ نیست۔ بیساکھیاں میں اس منحوس بنگلے ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

وہ تینوں ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدم پہلی بار خود اعتمادی سے اٹھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نئی' باعزت زندگی کے خواب تھے۔

○☆○

میں نے قلم بند کرکے رکھا اور جو کچھ لکھا تھا' اسے پڑھا۔ اچانک میری کیفیت بہت عجیب ہوگئی۔ مجھے وہ سب کچھ افسانہ لگنے لگا... حقیقت سے دور۔ وہ مسجد' وہ رات' بابا عصر اور حارث بن عثمان... پتا نہیں وہ خواب تھا یا فینٹاسی۔ لیکن نہیں' خواب تو وہ نہیں ہوسکتا تھا اور فینٹاسی بھی نہیں۔ میرے اندر کسی نے چپکے سے کہا۔ فینٹاسی کسی ایک ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ انفرادی ہوتی ہے' اجتماعی نہیں۔ کوئی اس میں دوسروں کو شریک نہیں کرسکتا کیونکہ اپنے تخیل کے بارے میں دوسروں کو بتایا تو جاسکتا ہے لیکن اپنا تخیل دوسروں کو دکھانا ممکن نہیں۔ جبکہ یہاں دوسرے بھی اس میں شامل ہیں' میرے اپنے بیوی بچے!

اور یہ سچ تھا۔ حارث بن عثمان میرے گھر آئے تھے۔ میرے بیوی بچے ان سے ملے تھے۔ میرے بچوں نے دیکھتے ہی انہیں ماموں کہنا شروع کردیا تھا۔ ناہید انہیں بھائی جان کہنے لگی تھی۔ بلکہ انہوں نے رات ہمارے ہاں گزاری تھی۔ ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر سحری کی تھی... اور پھر افطار بھی۔ وہ میرا تخیل نہیں تھے۔ اگر وہ فینٹاسی تھی تو اجتماعی تھی۔

میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ حارث تو اس وقت بھی میرے گھر میں ہیں۔ وہ دوسرے بیڈ روم میں سو رہے ہوں گے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا گیارہ بجے تھے۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ اتنی دلیلوں کے باوجود مجھے وہ سب کچھ حقیقت نہیں لگ رہا تھا۔ میں اٹھا اور دوسرے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ میں اس وقت یقین اور گمان کے درمیان معلق تھا۔ حارث اس کمرے میں سو رہے ہوں گے... حارث اس کمرے میں نہیں ہوں گے۔ میں ان دو بیانوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا کہ کہیں حارث کی نیند نہ اچٹ جائے۔ اس احتیاط پر مجھے خود ہنسی آگئی۔ گمان نے بڑبڑا کر کہا... بے وقوف' جو شخص موجود نہیں ہے' اس کی نیند کیسے اچٹے گی۔

دروازہ کھلا۔ حارث بن عثمان نہ صرف کمرے میں موجود تھے بلکہ وہ جاگ بھی رہے تھے۔ ان کی انگلیاں ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانوں پر گردش کررہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو وہ جلدی سے بولے "آؤنا آفاق میاں!"

"میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آؤ میاں' کچھ دیر میرے پاس بیٹھو" میں اندر جاکر کرسی پر بیٹھ گیا "سوئے نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں تو بہت دیر سے سوتا ہوں' لکھ رہا تھا کہ آپ کا خیال آگیا۔"

"جو لکھ رہے تھے' اس پر یقین نہیں آرہا ہوگا۔ اس لیے یہاں چلے آئے" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں' یہی بات ہے۔"

"بابا عصر نے جو بتایا تھا' لکھ لیا؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر یقین کچھ دشوار نہیں۔ اپنی جیب دیکھو' اشرفیاں واپس آگئی ہوں گی۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر چھوئے بغیر ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اشرفیاں واپس آچکی تھیں۔ میری جیب بھاری ہورہی تھی۔ میں مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حارث جلدی سے بولے "بیٹھو نا۔"

"پھر آؤں گا۔ آپ کے پاس۔ ابھی تو مجھے کچھ لکھنا ہے۔ ذہن سے نہ نکل جائے۔"

"تب تو ضرور جاؤ۔ لیکن آتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا۔ میں بہت دیر سے سوتا ہوں۔"

میں کمرے سے نکلا اور اسٹڈی میں آگیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر میں سوچتا رہا۔ مجھے لکھنا تھا۔ لکھنا تھا کہ ان اشرفیوں کے آتے ہی میں نے خیروبرکت اور اللہ کی تائید دیکھی اور یہ خیروبرکت اور تائید تو اس بدنصیب فقیرے کو بھی نصیب ہوئی' جس کی نیت خراب تھی' جو امانت دار نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر خیروبرکت کیا ہوگی کہ اس کے تین پڑھے لکھے ہونہار جوان بیٹے جنہیں اس نے دولت کی چکاچوند دکھا کر غلط راستے پر ڈال دیا تھا' اس کے سحر سے آزاد ہوچکے تھے۔ وہ اس کی حرام کی دولت چھوڑ کر خوداختیاری کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اس عزم کے ساتھ کہ اپنی دنیا آپ بنائیں گے۔ یہ جذبۂ تعمیر' یہ خودداری بھی تو خیر ہے۔

مجھے ان تینوں ان دیکھے لڑکوں پر پیار آنے لگا۔ میں نے صرف تیرے کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اشرفیاں میں فقیرے کو دے رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ ننھے بھکاری کے گیٹ اپ میں تھا۔ نہ جانے عام لباس میں وہ کیسا لگ رہا ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے تو انہیں دیکھا تھا۔ اشرفی کا سفرنامہ لکھتے وقت۔ اور وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔

میں نے قلم کھولا اور لکھنا شروع کردیا...

○☆○

اگلی صبح ناشتا کرتے ہی میں گھر سے نکل آیا۔ مجھے محسوس

ہو رہا تھا کہ اشرفیاں کسی امانت دار تک پہنچائے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ سوچ کر بھی مجھ پر ہول چڑھ رہا تھا کہ ایک دن تو ضائع ہو ہی چکا ہے۔ اگر یہ اشرفیاں کئی دنوں میں ایک قدم آگے بڑھیں گی تو یہ سفر تو خدانخواستہ دس سال سے بھی زیادہ جاری رہے گا۔ یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ میرا بس چلتا تو ایک ہی دن میں یہ سفر پورا کر دیتا۔

یہ بات میرے لیے بوجھ بن گئی۔ جس طرح میں اس روز چل رہا تھا' وہ میرا اسٹائل نہیں تھا۔ میرے قدم بہت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا' ہر طرف کان لگائے چل رہا تھا۔ میرے گھورنے کے احساس پر کئی عورتوں نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا۔ لیکن میں اس وقت اپنی ہی دھن میں تھا۔

مجھے بے شمار ایسے افراد ملے جنہیں میں وہ اشرفیاں سونپ سکتا تھا لیکن ذرا سا مشاہدہ کرنے پر مجھے کچھ ایسی باتیں نظر آئیں کہ میری ان پر اعتبار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اشرفی کسی کو بھی تھما سکتا ہوں' وہ غلط ہاتھ ہوئے تو اشرفی واپس آجائے گی لیکن یہی مجھے گوارا نہیں تھا۔ گزشتہ رات اشرفیوں کی واپسی سے مجھے جو اذیت ہوئی تھی وہ میں دوبارہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ مایوسی اور ناامیدی سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میں اس پر یقین رکھنا چاہتا تھا کہ معاشرے میں اہلِ ایمان ابھی موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے ہم اللہ کے غضب سے بچے ہوئے ہیں۔ پھر اشرفیاں واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ جبکہ اس کام کو تیزی کی ضرورت تھی۔

چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ میری ٹانگیں دکھنے لگیں۔ میں بیٹھ کر لکھنے والا آدمی ہوں۔ چلنے کا موقع ہی کم ملتا ہے اس لیے عادت بھی نہیں رہی ہے۔ تھکن کے ساتھ مجھے مایوسی بھی ہونے لگی کہ اتنے انسانوں کی بھیڑ میں میرا کسی پر دل نہیں ٹھکتا۔ مگر میں نے اس مایوسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ میرا عزم تھا اور اللہ سے دعا تھی کہ اشرفیاں اس بار اہل ہاتھوں کو ہی سونپوں گا۔

پھر اچانک میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ مجھے گوہرِ مقصود نظر آگیا۔ سامنے سے پاک وطن کا ایک فوجی مجھے آتا نظر آیا تھا۔

فوجی وردی بچپن ہی سے میری کمزوری ہے۔ جب میں بچہ تھا اور کسی بھی فوجی کو دیکھتا تھا تو میرا ننھا سا دل محبت اور خوشی سے لبالب ہو کر چھلکنے لگتا تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگتی تھیں۔ مجھے عالمِ اسلام کے بڑے بڑے جرنیلوں' مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں کا خیال آجاتا تھا۔ میرے والد میری اس کیفیت کو سمجھتے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے ایسے میں تو کہتے..... اس فوجی جوان کو سلیوٹ کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں شرمیلا بہت تھا۔ مجھے سلیوٹ کرنا آتا تھا لیکن میں کہہ دیتا کہ مجھے آتا ہی نہیں۔ مگر میرے اندر فوجی وردی پہنے ایک چھوٹا سا بچہ کھٹ سے دونوں ایڑیاں ملا کر بہت زبردست سلیوٹ کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ سلیوٹ میرے سوا کبھی کسی کو نظر نہیں آیا۔

اور فوجی وردی میرے لیے بس فوجی وردی ہے۔ مجھے اب بھی رینک کی سمجھ بوجھ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے کبھی رینک کو سمجھنا ہی نہیں چاہا۔ مجھے اس سے غرض نہیں' رینک کوئی بھی ہو' فوج کے ہر جوان سے مجھے عقیدت ہے..... سپاہی سے لے کر جنرل تک سب میرے لیے یکساں طور پر لائقِ احترام اور بے حد محبوب ہیں کیونکہ اپنے اپنے مقام پر' اپنے اپنے انداز میں سب ہمارے وطن کی حفاظت کے لیے سرگرم ہوتے ہیں۔

میں وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ فوجی جوان میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے آہستہ سے کہا "سنئے صاحب' آپ مجھے چند منٹ دے سکتے ہیں؟"

فوجی جوان نے شک و شبے کی نظر سے مجھے دیکھا "کیا بات ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک کام ہے" میں نے کہا پھر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "کام میرا ذاتی نہیں' پاکستان کے لیے اور دینِ اسلام کے لیے ہے۔"

یہ سنتے ہی فوجی جوان کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ سراپا سپردگی بن گیا۔ چہرے پر نرمی بکھر گئی "پاکستان اور اسلام کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے" اس نے والہانہ انداز میں کہا "شہادت میری مطلوبہ منزل ہے" اتنا کہنے کے بعد اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں لہرانے لگیں "لیکن تم ایسے کون ہو کہ مجھ سے اس طرح کا کوئی کام لینا چاہتے ہو؟"

میں نے جلدی سے اشرفیاں نکالیں اور ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ میں اسے سب کچھ بتاتا رہا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اشرفی واپس آنے میں وقت کا زیاں ہے۔ یہ کام جتنی جلدی مکمل ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔

وہ ایک دم تم سے آپ پر آگیا "آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹالوں گا۔ ویسے بھی آج میرا آف ہے۔ میں پورے دن بھی پھر سکتا ہوں۔"

"شکریہ۔"

"شکریہ کیسا۔ یہ تو میرا ذاتی کام ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا' سلام کیا اور اپنے گھر آگیا۔

○☆○

اس شام چاند نظر نہیں آیا۔ روزے داروں کو پورے تیس روزے رکھنے کی سعادت اور خوشی نصیب ہوئی۔

حسبِ معمول عشا کے بعد میں اور حارث بن عثمان چہل قدمی کر رہے تھے کہ بابا عصر ہم سے آملے "ہاں بھئی' تو کیا بات ہو رہی تھی؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یاد تھا' سلسلۂ گفتگو کہاں سے ٹوٹا تھا۔

"ہم ہندوؤں کی پہلی ناکامی کی بات کر رہے تھے" میں نے کہا "ان کا خیال تھا کہ جدوجہد کرتے ہوئے پاکستان کو آسانی سے نگلا جا سکتا ہے لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔"

"بالکل ٹھیک" بابا عصر نے کہا "اصل میں انہیں اس جذبے

کا علم نہیں تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان بے سروسامانوں کو عطا فرمایا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان دنوں دفتروں میں کام ہوتے دیکھا ہے۔ کرسی نہیں ہے تو فرش پر بیٹھ گئے۔ کاغذ اور پنسل تک کی قلت تھی۔ بس ایک جذبۂ تعمیر تھا جو مایوسی سے بچا کر کام کی لگن دیتا تھا۔ ہر جگہ یہی حال تھا اور لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے رہتے تھے" انہوں نے آہ بھری "اب وہ لوگ کہاں' اب وہ جذبہ کہاں؟ خیر..... یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جب چاہے' دے دے۔ تو یوں سمجھ لو کہ ان دنوں پاکستان میں ہر جگہ' چپے چپے پر' گھروں میں' دفتروں میں' فیکٹریوں میں' کھیتوں میں' سڑکوں اور کچے راستوں پر..... غرض ہر جگہ پاکستان کی بقا کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہر شخص مجاہد تھا۔ ہر دل کی ایک ہی آواز تھی..... زندہ تو غازی مرے تو شہید۔ ایسی قوم کو کوئی شکست دے سکتا ہے۔"

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں کوئی برا تھا ہی نہیں؟" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بدی نہ ہو تو نیکی کی پہچان کیسے ہو۔ اس وقت بھی بے ایمان لوگ موجود تھے اور وہ اپنے مفاد کے لیے کام کر رہے تھے۔ انہیں ملک کی بقا کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ہندوستان میں زمینیں' جاگیریں چھوڑ کر آنے والے ملک کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف تھے۔ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا کوئی دعویٰ نہیں تھا جبکہ بے ایمان لوگ جعلی کلیم بھر کر ان مجاہدوں کے حصے کی زمینیں' مکانات' حویلیاں اور جاگیریں حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہی تو ہوا۔" بابا عصر نے پھر آہ بھری "لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پاکستان میں بڑے چھوٹے اور چھوٹے بڑے ہو گئے۔ عظمت حقیر ہو گئی اور پستی بلندی پر چڑھ بیٹھی۔ لیکن یہ سچ نہیں' اس لیے کہ یہ دنیاوی نقطۂ نظر ہے۔ اللہ کی نظر سے دیکھو تو بڑے اور بڑے ہو گئے۔ چھوٹے اور چھوٹے ہو گئے۔ عظمت کو اور عظمتیں ملیں۔ پستی اور پستی میں چلی گئی۔ یہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کا قصور ہے کہ بلندی کو پستی اور پستی کو بلندی سمجھا جانے لگا لیکن اب بھی جو لوگ ایثار و قربانی کا مفہوم اور اس کا اجر سمجھتے ہیں' وہ کبھی محرومی کی شکایت نہیں کرتے کہ آخرت کا اجر سب سے بڑا اجر ہے۔ خیر..... تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"ہندوؤں کا زعم اتنا بڑا تھا کہ اس جھٹکے سے دور نہیں ہو سکا۔ پھر حیدر آباد دکن کو ہڑپ کر لینے کے بعد ان کا اعتماد اور بڑھ گیا۔ اب ان کے عزائم اور بڑے تھے۔ اس کے تحت ۶ ستمبر ۶۵ء کو انہوں نے بغیر اعلان کیے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چند گھنٹے بعد وہ لاہور جیم خانہ میں جشنِ فتح منائیں گے اور جامِ فتح تجویز کریں گے..."

"اللہ نے وعدہ فرمایا کہ جب تک کفر سے لڑو گے تو ہم تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم پر اچانک' خبردار کئے بغیر کفر حملہ کرے گا تو پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کی جائے گی" بابا عصر نے کہا "اور کراچی میں اَن گنت عینی شاہد موجود ہیں جنہوں نے ایک سبز پوش بزرگ کو دیکھا کہ بھارتی طیاروں سے گرائے جانے والے بم اپنے ہاتھوں میں لے کر سمندر میں اچھال دیتے ہیں۔"

"خود بھارتی فوجیوں نے بھی ایسے بے شمار واقعات بیان کئے اور تقریباً ہر محاذ پر یہی کچھ ہوا" میں نے کہا۔

"شہدا کبھی نہیں مرتے۔ وہ زندہ رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی باطنی' نظر نہ آنے والی فوج ہیں۔ بس یہ یاد رکھو کہ وہ ایمان والوں کے حلیف ہیں۔"

"جی ہاں۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ لاہور کی پاک زمین کو تو وہ چھو بھی نہیں سکے۔ الٹا اپنی زمین گنوا بیٹھے۔ چونڈہ کا میدان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔"

"جانتے بھی ہو کیسے؟" بابا عصر نے گرج کر کہا پھر خود ہی بولے۔ "قوم کا ہر فرد جذبۂ جہاد' جذبۂ ایمان سے سرشار تھا۔ ایسی یکجہتی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی' نہتے شہری ڈنڈے لے لے کر سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ ٹینکوں کی یلغار دیکھ کر ان جیالوں نے حساب لگایا کہ ہر فوجی کی زندگی بہت قیمتی ہے..... ایک عام آدمی سے سو گنا' ہزار گنا زیادہ قیمتی۔ کیونکہ وہ دفاعِ پاکستان کی فصیل کی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو' اسے بچایا جائے۔ چنانچہ عام شہری جسم سے بم باندھ کر یلغار کرنے والے ٹینکوں کی پہلی صف میں گھس گئے اور اسے تباہ کر دیا۔ ان ٹینکوں نے پچھلے ٹینکوں کی یلغار روک دی۔ پھر انہیں ناکارہ بنانا مشکل نہیں رہا۔"

"جی ہاں۔ یہ بات میں نے بھی سنی ہے" میں نے کہا۔ مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے پوچھا "ایک بات تو بتائیں' عربوں نے بھی دو جنگیں لڑیں اور وہ تعداد میں یہودیوں سے زیادہ تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔ وہ بیت المقدس بھی کھو بیٹھے..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی تائید انہیں حاصل نہیں تھی' کیوں؟"

"اللہ کی باتیں اللہ جانے۔ لیکن اس کے بندے اس کے احکام کی روشنی میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں" بابا عصر نے کہا "میرا خیال ہے کہ عربوں نے کوئی جنگ اللہ کے لیے نہیں لڑی۔ اسلام کے لیے نہیں لڑی۔ لڑتے وقت صرف اللہ پر تکیہ نہیں کیا۔ دوسری طرف اس سے پاکستان کی اہمیت بھی ثابت ہو جاتی ہے' جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"لیکن ۷۱ء کی جنگ میں کیا ہوا؟"

"وہی عربوں والا حشر" بابا عصر کے لہجے میں تلخی آ گئی "۶۵ء میں بھارت نے سمجھ لیا کہ میدانِ جنگ میں پاکستان کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے حکمتِ عملی تبدیل کر لی۔ انہوں نے سازشیں کیں۔ پاکستانیوں کے اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کے سلسلے میں کام کیا۔ زہریلا پروپیگنڈا کیا۔ نفرت اور تعصب کو ابھارا' جو پہلے ہی موجود تھا۔ غلطیاں تمہاری بھی تھیں۔ بھائیوں کو بھائیوں سے محرومیوں کا گلہ تھا لیکن بااختیار بھائیوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ نہیں سمجھا کہ محرومیوں کا ازالہ نہیں کرو گے تو دشمن انہیں ایکسپلائٹ کر کے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرے گا۔ پھر اس

وقت قیادت بھی بدکاروں اور بے راہ روؤں کے ہاتھوں میں تھی اور اللہ پر تکیہ کرنا تو کجا' اللہ سے مدد بھی نہیں مانگی گئی۔ تم تو امریکا اور چین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ساتویں بحری بیڑے سے آس لگائے بیٹھے تھے۔"

میں نے شرمندگی سے سر جھکالیا "جی..... یہ سچ ہے۔"

"پھر بھی پاکستان پر ہمیشہ اللہ کا ہاتھ رہا" بابا عصر بولے "ایک کمیونسٹ نے پاکستان میں ایک ہفتہ گزارا تو اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ملک کا ہر ہر فرد' وہ صاحبِ اختیار و اقتدار ہو یا عام آدمی ہو' اپنے اپنے طور پر ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے پھر بھی یہ ملک قائم و دائم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی سپریم طاقت موجود ہے' جو اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ جسے اس کا ختم ہونا منظور نہیں۔ تو یہ طے ہے کہ پاکستان پر اللہ کی نظرِ کرم ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی مرضی۔ اس کے ہر کام میں سو حکمتیں ہوتی ہیں۔ وہ بندے کی عقل کو روشنی عطا کرے تو بندہ سمجھ لیتا ہے۔"

"دیکھیں بابا' مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنے کے بعد سات سو سال وہاں حکومت کی۔ مگر اب وہاں ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ یادگاریں بھی مٹ گئی ہیں اور مٹتی جارہی ہیں۔"

"لیکن اس سرزمین..... یعنی برصغیر میں انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اسلام کی آخری فتح میں یہ خطہ انشاء اللہ بہت اہم رول ادا کرے گا۔"

"کیوں؟"

"اسپین کو فتح کرکے اسلامی سلطنت میں توسیع کی گئی لیکن تبلیغ نہیں ہوئی۔ وقت گزرا تو مسلمان لہو و لعب میں پڑ گئے۔ نصرانیوں کے شوق اور مشغلے اپنا لیے گئے۔ پھر سازشیں ہوئیں' مسلمانوں نے غداریاں کیں' اس کا نتیجہ تو یہی نکلنا تھا۔"

"لیکن ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہوا" میں نے اعتراض کیا۔

"ایک فرق تھا۔ یہاں تبلیغ ہوئی۔ اسلام ہمیشہ اخلاق سے پھیلا ہے۔ تلوار سے نہیں۔ محمد بن قاسم کو یہاں بہت تھوڑی مہلت ملی لیکن اتنے کم وقت میں بھی اس نے اپنے حسنِ سلوک سے دل جیت لیے۔ اسلامی اخوت نے ہندوستان کے مظلوم معاشرے کی مظلوم اکثریت کو پہلی بار احساسِ تحفظ دیا۔ وہ جو کچھ نہیں تھے' انہیں احساس دلایا کہ وہ بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ تیزی سے مسلمان ہونے لگے اور وہ خوف سے نہیں' محبت سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان پر اپنی تاریکی بھی کھل گئی تھی اور اسلام کی روشنی بھی۔ پھر وہ اندھیرے میں کیسے رہتے۔

"اب ایک اور اہم بات سنو۔ شاید تم نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا" بابا عصر نے کہا "ہر عہد میں اللہ کی طرف سے انسانوں کے لیے ہدایت آتی رہی۔ اللہ پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ یہاں تک حضورؐ کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ مکمل ہوگیا' دین مکمل ہوگیا۔ شریعت مکمل ہوگئی۔ غور کرو تو بیشتر انبیائے کرامؑ ایک خاص خطے میں اتارے گئے۔ حضورؐ عرب میں تشریف لائے۔ آپؐ رحمۃ اللعالمین تھے۔ چنانچہ اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اب اس خطے برصغیر کے بارے میں سوچو۔ محمد بن قاسم کے ساتھ یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے بہت سے مسلمان یہیں رہ گئے۔ ان کے کردار اور اخلاق سے متاثر ہو کر ہندو مسلمان ہوتے رہے۔ مگر اللہ نے اس خطے کو اور طرح سے نوازا۔ ختمِ نبوت کے بعد ولایت کا سلسلہ شروع ہوا اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' تمام ولی کامل یہیں گزرے۔ وہ اس خطے میں دور دراز کا سفر کرکے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے محبت اور سلوک سے دل جیتے اور اسلام کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ سب آئے نہیں' بھیجے گئے تھے اور اسی لیے بھیجے گئے تھے۔ اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے آئے تھے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مرتبہ اور مقام تھا۔ اپنے اپنے علاقے تھے۔ وہ اس برصغیر کی باطنی حکومت تھی۔ جیسے بادشاہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں میں گورنر مقرر کرتے ہیں' ویسے ہی یہ اپنے اپنے علاقے میں مقتدرِ اعلیٰ کے گورنر تھے۔ وہ بغیر فوج کی طاقت کے حکومت کرتے تھے..... دلوں پر۔ وہ لوگوں کو جینا سکھاتے تھے۔ ان کے مزاروں سے آج بھی لاکھوں کروڑوں کو فیض ملتا ہے۔ ہندوستان سے لے کر کشمیر کے دور دراز کے گاؤں دیہاتوں تک یہ روحانی مملکت قائم تھی..... اور آج بھی قائم ہے۔

"اب تم اسپین اور ہندوستان کا فرق سمجھو گے۔ یہاں بھی بادشاہوں نے حکومت کی لیکن یہاں اللہ اور رسولؐ کے عاشق ولیوں نے اسلام کو عام آدمی تک پہنچادیا۔ اس کی وجہ سے یہاں اسلام درباروں اور اقتدار کے ایوانوں تک محدود نہیں رہا۔ یہاں نسلوں کی تقدیر بدل گئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرب کے بعد اسلام سے سب سے زیادہ فائدہ اس خطے کو پہنچا اس لیے کہ یہاں اسلام کو قائم رہنا تھا۔ اس لیے کہ اس خطے کے مسلمانوں کو اسلام کی سربلندی میں فعال کردار ادا کرنا تھا۔ حق و باطل کے معرکے میں انہیں اسلام کا ہراول دستہ ہونا تھا۔ اسی لیے یہاں مسلمانوں کو کبھی ہندوؤں کا زیرِ دست نہیں ہونے دیا گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر کبھی حکومت نہیں کی اور جب وہ وقت آیا کہ ہندو صدیوں کی غلامی کا حساب لینے کو تیار ہوئے تو پاکستان بن گیا۔ سرزمینِ ہنود پر ایک اسلامی مملکت..... اللہ کی قائم کی ہوئی ایسی مملکت کہ جسے اپنے برائے سر توڑ کوشش کے باوجود ختم نہیں کرسکے اور کبھی ختم نہیں کرسکیں گے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت' سمجھ میں آتی ہے؟"

میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔ واقعی یہ تو ہے۔ اللہ نے دین کی تبلیغ کا کام اس خطے میں اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں سے لیا۔ انہیں کہاں کہاں سے بھیجا۔ بات تو بالکل واضح تھی "جی..... میں سمجھ گیا لیکن یہ عنایت اسپین پر کیوں نہیں ہوئی؟"

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن بندہ اس کا ہو اور کوشش کرے تو سمجھ سکتا ہے۔ اللہ کو وہ لوگ بہت ناپسند ہیں جن تک

ہدایت پہنچی' جن پر اس نے عنایات کیں' جنہیں روشن نشانیاں دکھادی گئیں' جن کے لیے معجزے بھی رونما ہوئے۔ مگر وہ ہدایت پانے کے بعد گمراہی میں پڑ گئے۔ جنہیں کتاب دی گئی مگر وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور ان کا مذاق اڑانے لگے۔ انہیں کتاب میں نشانیاں بتادی گئیں لیکن جب حضورؐ تشریف لائے تو انہوں نے اپنی گواہی دینے کی ذمے داری سے ہی منہ نہیں موڑا' اللہ کی آیات کو بھی جھٹلانے لگے۔ ان کے لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ گمراہ ہیں جن کے لیے آسمان سے فرشتے بھی بھیج دیے جائیں تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حضورؐ کو بطورِ خاص کوئی معجزہ نہیں عطا ہوا کیونکہ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ اس کے باوجود ایمان لے آئے اور یہ ہدایت یافتہ گمراہ' معجزوں کی بھی توجیہہ کرنے لگیں گے۔ اللہ نے فرمادیا کہ ان کا غم نہ کرو۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جسے ہم نے گمراہ کردیا' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ یہ غفلت میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ مقررہ دن آجائے گا' پھر یہ ایمان لائیں گے مگر اس وقت انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔

"اب اس روشنی میں دیکھو' اسپین میں اہلِ کتاب تھے۔ وہ بدنصیب اہلِ کتاب جنہیں ہدایت سے محروم کردیا گیا۔ جن لوگوں کو اللہ نے گمراہ کرکے ان کے حال پر انہیں چھوڑ دیا' وہ کیسے ہدایت پاسکتے ہیں۔ مگر وہ اہلِ کتاب بھی ہیں' جنہوں نے ہدایت سے منہ نہیں موڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو تقویٰ کرتے ہیں۔ جس سے منع کیا گیا' اس سے بچتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے۔"

"مگر اس خطے..... یعنی برصغیر پر اس عنایت کی وجہ؟"

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے' ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ حضورؐ کو عرب میں کیوں مبعوث فرمایا گیا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ بے حد رحیم و کریم ہے۔ جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو' وہاں وہ روشنی ضرور بھیجتا ہے۔ جہاں روشنی بھیجی گئی اور لوگوں نے اسے اندھیروں میں چھپادیا' وہاں سے وہ منہ پھیرلیتا ہے۔ بعثت سے پہلے کا عرب معاشرہ اس عہد کا سب سے بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ بت پرستی وہاں ہوتی تھی۔ شراب' جوا' جھوٹ' زنا..... کون سا گناہ تھا جو وہاں عام نہیں تھا۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ جہالت کی ایسی تاریکی تھی کہ عقل ان تاریک دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی تھی اور راستہ نہیں ملتا تھا۔ رسالت مآبؐ نے اللہ کی رحمت اور ہدایت سے اور اپنی سیرتِ طیبہ سے بے حد قلیل وقت میں اسے دنیا کا سب سے مہذب اور متمدن معاشرہ بنادیا۔ اسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہدایت یافتہ گمراہوں کے لیے ایک مثال بھی تھی اور تنبیہہ بھی کہ دیکھو' ہم ایسے کایا پلٹ بھی کرسکتے ہیں لیکن تم نہیں بدلوگے۔ کیونکہ تم نے جانتے بوجھتے انکار کیا۔ سو تم دھتکار دیے گئے۔

"اب ذرا محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے کے ہندوستانی معاشرے کا تصور کرو۔ وہاں بھی بت پرستی ہوتی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں دیوی دیوتاؤں کو کہیں نہیں پوجا گیا۔ یہاں تو زندہ انسانوں کو ان دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھادیا جاتا تھا۔ عورت کا کوئی احترام نہیں تھا۔ وہ صرف استعمال کی چیز تھی' ملکیت تھی' جسے جوئے میں ہارا جاسکتا تھا۔ وہ خوب صورت تھی تو دیوداسی تھی' جسے دیوی دیوتاؤں کے نام پر مذہبی رہنما اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر پامال کرتے رہتے تھے۔ یہاں انسانوں میں تفریق تھی۔ بہت بڑی اکثریت ایسی تھی جسے نفرت اور حقارت سے شودر کہا جاتا تھا' جس کے مقابلے میں غلاظت میں لتھڑا ہوا جوتا بھی اہمیت رکھتا تھا۔ یعنی انسان کی بے حرمتی اور اس کی عزتِ نفس کی پامالی ہوتی تھی جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ان تک ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی تھی۔ سو اللہ نے رحمت فرمائی اور اپنے نیک بندوں کے ذریعے وہ روشنی بھیج دی۔

"تو سمجھ رہے ہو نا کہ یہ بدترین کفر کی سرزمین تھی۔ یہاں چپے چپے پر کفر ہوتا تھا۔ یہاں گائے اپنے پیشاب اور گوبر سمیت متبرک اور مقدس تھی۔ گندگی اور ناپاکی کو پاکیزگی کا درجہ دیا جاتا تھا اور انسان کو شودر بنا کر ناپاک تصور کرلیا گیا تھا۔ ایسا کفر تو کہیں نہیں ہوا۔ یہاں اللہ کی رحمت تو ہونی ہی تھی اور جس دن یہاں اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا' اسی دن پاکستان کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ پاکستان صدیوں بعد ظہور میں آیا۔

"اور اب دیکھو' دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے۔ مگر آج بھی بھارت کی تاریکی کا وہی حال ہے۔ اس خطے کے سوا دنیا میں بت پرستی کہیں نہیں ہوتی۔ سب کچھ بتوں سے مانگا جاتا ہے۔ صدیوں پہلے محمود غزنوی نے سومنات کا بت توڑ کر انہیں لمحۂ فکریہ دیا تھا۔ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ جو دیوتا اپنا دفاع بھی نہ کرسکے' وہ انہیں کیا دے گا۔ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ سمجھ گئے اور ایمان لے آئے' باقی گمراہ رہ گئے۔

"لیکن اب صورتِ حال مختلف ہے۔ کفرستان کے سینے پر اب ایک پاکستان بھی موجود ہے۔ سو یقین کرلو کہ حق و باطل کا آخری معرکہ اسی میدان میں ہوگا۔ باطل کی گردن کو پاکستان کی تلوار ہی کاٹے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بداعمالیوں کے باوجود اللہ نے پاکستان پر ہمیشہ عنایت فرمائی' اسے قائم رکھا اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رکھے گا۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اسے اللہ کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ اس کی ظاہری فوج ہی نہیں' باطنی فوج بھی بہت طاقت ور ہے۔ تم تصور نہیں کرسکتے کہ کیسی کیسی عظیم المرتبت ہستیاں اس کی سربلندی کے لیے دعا کرتی ہیں اور جہاد میں شامل ہوتی ہیں۔"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک طرف ایسی قدر اور اہمیت..... اور دوسری طرف اس کے اپنوں کی ایسی ناقدری' ایسی بے مہری۔ اس کے اپنوں میں ایسے لوگ بھی ہیں' کہ کچھ اپنے مفاد کے لیے اور کچھ دشمنوں کی خوشنودی کے لیے اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ میرا دل پھٹنے لگا۔

"کاٹنے دو۔ وہ انشاء اللہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے" بابا

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فواز رزاق
جاسوسی نشست +92 3331784111

عصر نے کہا "ملول اور مایوس نہ ہو۔ حوصلہ رکھو۔ اس سے محبت کرو اور اس کی عظمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔ بے عمل ناکارہ۔۔۔"

"اس کا ایک عام مزدور بھی بے حد اہم ہے' اگر اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے جان دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔ خود کو حقیر نہ سمجھو۔ ہاں اپنی اصلاح کرتے رہو۔ صرف اللہ کا خوف دل میں بٹھالو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ پاکستان سے محبت کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ اس سے محبت کرنے والوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔"

"اس پر بعد میں بات کریں گے" بابا عصر نے کہا "فی الحال تمہارے لیے اچھی خبر ہے.... بڑی خوش خبری۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہو گیا "عطا کیجئے۔"

"اشرفی کا سفر شروع ہو گیا ہے" بابا عصر نے بتایا۔

میری آنکھوں میں اس فوجی کی صورت پھر گئی جسے میں نے وہ امانت سونپی تھی۔ میرا یقین سچا نکلا۔ میرا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔ دھڑکنیں اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔

"یہی نہیں۔ صرف آدھا دن ہوا ہے اور وہ اشرفیاں اس وقت دس امانت داروں کے ہاتھوں سے گزر چکی ہیں۔" بابا نے مزید کہا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "اتنی جلدی....؟"

"ہاں۔ تم نے امانت بہت بابرکت مسلمان کے سپرد کی تھی۔ اب تفصیل سن لو" بابا عصر مجھے امانت کے آگے بڑھنے کا حال لمحہ بہ لمحہ سناتے رہے۔ میری آنکھیں بار بار بھیگتی رہیں۔ دل میں امید کی کرنیں پھوٹتی رہیں۔ مایوسی دھلنے لگی۔

بابا عصر کے خاموش ہونے پر میں نے کہا "لیکن میں یہ سب کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔"

"یہ تو ممکن بھی نہیں ہے" بابا عصر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا "دیکھو.... یہ تمہاری اشرفیاں تو ہزاروں ہاتھوں سے گزریں گی انشاء اللہ۔ اتنے واقعات تو تم نہیں لکھ سکتے۔ ہاں ان میں چیدہ چیدہ اثر انگیز واقعات ضرور لکھ دینا۔ ایمان داری کے بھی۔ تاکہ لوگوں کو حوصلہ ہو اور بے ایمانی کے بھی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور پتا چلے کہ بدنصیبی کیا ہوتی ہے۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے بابا" میں نے عاجزی سے کہا "کہانی بہت طویل ہو جائے گی۔ ان واقعات کے بغیر بھی اسے خاصا طویل ہونا ہے۔ کچھ پڑھنے والوں کو تو بہت بوریت ہو گی۔"

"ہونے دو۔ تمہیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ تم اس کی پروا نہ کرو اور دیکھ لینا' انشاء اللہ یہ سب کو پسند آئے گی۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھیں گے جنہیں کہانیوں سے دلچسپی نہیں اور یہ انشاء اللہ ان لوگوں تک بھی پہنچے گی جو پڑھنا نہیں جانتے' تم بس اپنا کام کرو۔"

"وہ تو میں کروں گا لیکن واقعات میں زیادہ سے زیادہ دو تین شامل کر سکوں گا۔"

بابا عصر سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔

"یہ ممکن نہیں کہ اس کہانی کی اشاعت کے بعد تم یہ واقعات ایک ایک کر کے لکھتے رہو اور لوگوں تک پہنچاتے رہو۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"خیر' دیکھا جائے گا' ہو سکتا ہے کہ قارئین ہی فرمائش کر کے تمہیں اس پر مجبور کر دیں' چھوڑو اس بات کو" بابا نے کہا "یہ بتاؤ کہ ایک اشرفی تو تمہارے اختیار میں دی گئی تھی' تم سے یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ تم وہ بھی دے دو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

میں سہم گیا۔ ان کا انداز اور لہجہ باز پرس کرنے والوں کا سا تھا۔ "پہلے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ اگر وہ اشرفی مجھے نہ دی جاتی تو شاید ابتدا میں ہی میری نیت خراب ہو جاتی۔ مگر اس اشرفی نے مجھے سہارا دیا۔ یہاں تک کہ میں پختہ ہو گیا۔ پھر میں نے سوچا' دوسروں کا بھی یہی حال ہو گا۔ چنانچہ میں نے وہ بھی آگے بڑھا دی۔"

"لیکن تم نے جسے دی' اسے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"بتا دیتا تو اس کا اختیار ختم ہو جاتا۔ وہ بھی آزمائش میں پڑ سکتا تھا۔"

بابا پھر مسکرائے "بالکل ٹھیک۔ یہ طے ہے کہ ہر امانت دار یہی سوچے گا اور یہی کرے گا۔ اور یہ بتا دوں کہ جو اپنا حصہ رکھنا چاہے گا' وہ دوسری اشرفی کو آگے بھی نہیں بڑھا سکے گا۔ اس کی نیت خراب ہو جائے گی اور وہ سعادت سے محروم ہو جائے گا۔ یہ یونہی ہونا ہے۔ اچھا.... اب میں چلتا ہوں۔"

بابا اوجھل ہو گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ ٹانگیں دکھ رہی ہیں۔ شاید اس رات ہم بہت زیادہ چلے تھے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ بابا نے نہ جانے مجھے کتنی دور چھوڑا ہو گا۔ یعنی ابھی مجھے مزید چلنا ہے لیکن میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا۔ میں اپنی بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا۔

"آیئے!" میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ ہم دونوں گھر کی طرف چل دیے۔

○☆○

اس پہلی رات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ حارث بن عثمان نے عید کا دن ہمارے ساتھ گزارا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ بچوں کے اصرار پر بھی نہیں رکے تھے "تم خود سوچو" انہوں نے بے حد لجاجت سے ہمیں سمجھایا تھا "اللہ کی مہمانی کا اعزاز کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔"

اس کے بعد کہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں خود بھی بچوں کو سمجھانے لگا۔

"لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں جب موقع ملے گا' تم سے ملنے آؤں گا۔"

بچے آبدیدہ تھے لیکن انہوں نے صبر کر لیا۔

میں البتہ حارث بن عثمان سے دن میں پانچ بار ملتا تھا اس لیے کہ اللہ کے فضل و کرم سے پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا اور اسی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ عشا کے بعد ہم چہل قدمی کرتے اور اس دوران میں بابا عصر سے ملاقات ہوتی تھی۔

اللہ کی بڑی عنایت تھی کہ اشرفی کا سفر جاری تھا بلکہ سست بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اشرفیاں اوسطاً ہر روز دس بارہ امانت داروں تک پہنچ رہی تھیں۔

اس عرصے نے مجھے ایسی طمانیت سے نوازا تھا جو میرے لیے بالکل نئی تھی۔ مگر اس روز ۲۰ مارچ ۹۶ء کو میں اچانک فکرمند ہوگیا۔ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میرے کام کرنے کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی۔ اس وقت سے اب تک میں ایک کہانی بھی نہیں لکھ سکا تھا۔

اس روز ناہید میری اسٹڈی میں آئی تو میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ میں نظریں چرانے لگا۔ "کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... نہیں" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ ہاں' اور نہیں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں تمہاری پوچھ گچھ سے ڈر رہا ہوں۔"

"کیسی پوچھ گچھ؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہی کہ کہانی کب پوری ہوگی؟"

اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا "میں کبھی بلاوجہ پریشان کرتی ہوں تمہیں؟" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔

"اسی لیے تو پریشان ہوں میں" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "تم بلاوجہ پریشان کیا کرتیں تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہی نہیں۔ مگر اب تو وجہ ہوگی نا۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی... راشن کا مسئلہ ضرور کھڑا ہوگا۔ ایک مہینے سے اوپر ہوچکا سودا آئے ہوئے" میں نے کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ "اس دوسرے کام کی وجہ سے بھی فرق پڑا ہے۔"

"دوسرے کام کو کچھ نہ کہیں" اس نے بے حد غصے سے کہا۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا "کیسا خیروبرکت والا کام ہے۔ یہ تو ساری عمر کرتے رہیں' عافیت میں رہیں گے ہم سب۔"

میں گھبرایا کہ وہ طنز کر رہی ہے "طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں عورت ہوں۔ یہ بات تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ ایسی برکت دیکھنا تو کجا' میں نے سنی بھی نہیں۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اسی دوسرے کام کو عمر بھر کرتے رہو' کبھی ترک نہ کرو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کچن میں چل کر دیکھو تو سمجھ میں آجائے گا۔ آٹے دال' چاول گھی اور سب چیزوں کو دیکھو تو لگے گا کہ سودا آئے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ کوئی چیز چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے کچن میں جا کر دیکھا' وہ ٹھیک کہہ رہی تھی "حیرت ہے" حالانکہ اس مہینے مہمانوں کا بھی تانتا بندھا رہا ہے" میں حیرت سے بڑبڑایا۔

"اسی کو خیروبرکت کہتے ہیں۔"

اب میری طمانیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں اسٹڈی میں آیا اور بیٹھ کر سکون سے لکھنے لگا۔

○☆○

۹۶ء رخصت ہوتے ہوتے پرانی حکومت کو بھی رخصت کرا گیا۔ اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ بابا عصر نے اسمبلی ٹوٹنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "یہ بھی خیروبرکت اور اللہ کی تائید کا ثبوت ہے۔ اشرفیوں کا سفر جو جاری ہے" پھر وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد اچانک انہوں نے کہا "ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی بھی اس ملک کو طویل عرصے تک نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"لیکن یہاں امریکا کی تائید کے بغیر کوئی حکومت نہیں کر سکتا" میں بولا۔

"کفر مت بکو" بابا نے مجھے بری طرح ڈانٹا "برا اور ظالم حکمراں' رعایا کے برے اعمال کی وجہ سے ان پر مسلط کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قہر ہے۔ اب یہ اسی مسبب الاسباب کی مرضی کہ سبب امریکا کو بنا دے یا کسی اور کو۔"

۹۷ء آیا اور اپنے ساتھ نئی حکومت لایا۔ لیکن نئے حکمراں نیم دلی سے کام کر رہے تھے اور اس طرح مختلف سمتوں میں دوڑ رہے تھے' جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو اور انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو۔

اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

پھر ایک رات بابا عصر سے پاکستان کی محبت پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کتنی تیزی سے پھیلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے' آدھی دنیا پر چھا گیا۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا "وہ بھی معجزہ لگتا ہے لیکن اس کا پاکستان کی محبت سے کیا تعلق ہے؟"

"تم سنا اور سمجھا کرو۔ بعض باتوں کا تعلق بہت..... بہت پیچھے سے ہوتا ہے۔ انہیں سمجھے بغیر سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی" انہوں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔"

"اللہ نے دکھا دیا کہ اس کی مرضی ہو تو پوری دنیا پر اسلام کو غلبہ پانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔ مگر اس کی مصلحت' اس کی حکمتیں اور اس کی مرضی کچھ اور ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ چاہتا تو سب ایک امت کے ہو جاتے لیکن وہ لوگ بھی تھے' جنہیں ان کے اعمال کے سبب اس نے گمراہ کر دیا۔ جن کے دلوں میں بیماری ڈال دی گئی' جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ جو جاننے کے باوجود حق کا انکار کرتے رہے' وہ ایمان والوں کے لیے شیطان بن گئے۔

انہیں بہکانے کی کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے ترغیب اور لالچ کے ذریعے' طاقت کے ذریعے ایمان والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں' انہیں بہکایا۔ وہ مومنوں کی آزمائش تھے اور ہیں۔ اس آزمائش سے ایمان کے ساتھ گزرنے کا صلہ جنت ہے۔ بہک جانے والوں کے لیے گمراہی ہے اور دوزخ کا عذاب۔ یہ کفر و ایمان کی جنگ ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

"سو کافر تو اپنی جگہ تھے ہی' اس جنگ کے نتیجے میں مشرک اور منافق بھی پیدا ہوئے۔ طرح طرح کے فتنوں نے جنم لیا۔ بے ایمانوں نے ایمان بیچے اور غداریاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کے ہر موڑ پر زوال اور شکست کے پیچھے کسی غدار کا چہرہ نظر آتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ منافق مسلمانوں کے سوا کسی امت میں نہیں ہوئے۔ ہر امت میں انکار کرنے والے بھی گزرے اور شرک کرنے والے بھی لیکن منافق نہیں۔ منافق جو بزدل ہوتے ہیں۔ اوپر سے ایمان والے بنتے ہیں اور اندر انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ چپکے چپکے سازشیں کرتے اور شورشیں برپا کرتے ہیں۔ لیکن سوچو تو' منافقوں اور غداروں کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام دینِ برحق ہے۔ کیونکہ حق اٹل ہوتا ہے۔ اس کو کھلم کھلا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ یہ بے بسی باطل کو سازشیں کرنے' نقب لگانے اور چھپ کر وار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور حق کبھی باطل کے ساتھ ایسا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ طاقت ور ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ باطل کمزور ہے۔ وہ ہمیشہ للکارتا ہے کہ حق پر آجاؤ ورنہ تمہیں طاقت سے زیر کیا جائے گا۔"

بابا عصر کی یہ دلیل میرے دل میں اتر گئی۔ مجھے افسوس ہوا' خود پر شرم آئی کہ ایسی روشن دلیل بھی ہمیں نظر نہیں آتی۔

"منافق سب سے خطرناک ہے اس لیے کہ اسلام سلامتی کا دین ہے" بابا عصر کہہ رہے تھے "اسلام کسی کلمہ پڑھنے والے کو رد نہیں کرتا۔ خواہ اس کا عمل اسے منافق ثابت کر رہا ہو۔ چنانچہ اپنے خیال کے مطابق منافق کو بڑی سہولت حاصل ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اسے یہ سہولت دے کر اتمامِ حجت کر دیا۔ اس سے بڑی کوئی قوت کفر کو نہیں مل سکتی کہ ایک منافق مومنوں کی صف میں گھسا' ان کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جاننے کے باوجود اس سے صرف محتاط رہا جاتا ہے۔ اسے رد نہیں کیا جاتا۔ اسے ختم نہیں کیا جاتا۔ صرف اس لیے کہ بظاہر وہ کلمہ گو ہے۔ یہ ہے اسلام کی شان اور طاقت اور اس کے باوجود وہ ایمان والوں کو گمراہ نہیں کر پاتا تو یہ دلیل ہے اسلام کے دینِ برحق ہونے کی۔ اور یہی اللہ کو منظور تھا۔"

"سبحان اللہ!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"سو منافقوں نے کفار اور مشرکوں کے ساتھ مل کر ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچایا۔ کمزور ایمان والوں کو گمراہ کیا۔ عصبیتوں کو فروغ دیا۔ عرب اور عجم کے درمیان نفاق ڈالا۔ اخوت کے تصور کو مجروح کیا۔ ہوسِ اقتدار ابھاری۔ غدار تلاش کئے اور انہیں سازشوں پر اکسایا۔ ظاہری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو اسلام قیامت تک دنیا پر چھایا رہتا۔ مگر قرآن کو سمجھ کر سوچو تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب اللہ کی تدبیر کا حصہ ہے۔ ایمان کی آزمائش تو سخت ہوتی ہی ہے کہ اس کا اجر اجرِ عظیم ہے۔ اسے تو باطل کے تمام حربوں کا مقابلہ کر کے استقامت پر رہنا ہے۔ حق کو تعداد' اسلحے اور طاقت میں کم ہونا ہے اور باطل کو زیادہ۔ اس کے بعد وہ باطل پر غالب آئے گا' تبھی تو حق ہوگا۔ لہٰذا اللہ نے باطل کو ہر ممکن طاقت دی' رعایت بھی دی (حالانکہ وہ اس کے لیے سزا ہے... گمراہی میں حد سے گزر جانا) تاکہ اس کے باوجود وہ شکست کا مزہ چکھے اور بدترین بے بسی میں مبتلا ہو۔

"ایک اور زاویے سے دیکھو۔ اگر اسلام پوری دنیا پر چھا جاتا تو لطف کیا رہتا۔ لطف اور سنسنی تو خیر اور شر کی اس جنگ سے ہے۔ جنت اور جہنم کی اہمیت بھی اسی سے ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے شیطان کو ڈھیل دی۔ یوم حساب تک کی مہلت بخشی جبکہ شیطان کا کہنا تھا کہ جتنے بھی بندے تیرے راستے پر ہوں گے' میں انہیں بہکاؤں گا اور دیکھ لینا کہ ان میں سے بیشتر گمراہ ہو جائیں گے۔ اللہ نے مہلت دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان بہک جانے' گمراہ ہو جانے والوں سے دوزخ کو بھر دے گا اور ثابت قدم رہنے والوں کے لیے جنت ہوگی۔ یعنی فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا کہ نیکی' راستی اللہ کی طرف سے آسان اور شیطان کی وجہ سے بہت دشوار ہوگی۔ جبکہ بدی تو ہے ہی آسان۔ کیونکہ نفس تو ہر بشر کے ساتھ ہے۔ بدی سے روکنے والی طاقت صرف ایمان اور تقویٰ میں ہے۔

"خیر.... نتیجہ دیکھو۔ عصبیتیں پھیلیں۔ اسلامی بھائی چارے کے اصول سے انحراف ہوا۔ انتشار پیدا ہوا۔ اتحاد پارہ پارہ ہوا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا' وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور تم دیکھ بھی رہے ہو۔ مسلمان دھتکاری ہوئی بے گھر اور آوارہ گرد قوم کے ہاتھوں زیر ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں جو استہزا کی حد کو پہنچی ہوئی سرکشی اور اللہ کی نافرمانیوں اور اپنی بے عملی' بزدلی اور میدانِ جنگ سے منہ موڑنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیے گئے تھے۔ کیسی توہین' کیسی ذلت ہے یہ۔ لیکن ذلت پانے والوں کو شاید اس کا احساس بھی نہیں۔ عرب اور عجم کی باہمی آویزشوں اور نفرتوں نے انہیں نااہل بنا دیا۔ اب عالمِ اسلام کی سرداری کے لیے کون بچا۔ پاکستان' جو بہت پہلے منتخب کر لیا گیا تھا۔

"یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اس سرزمین کو اللہ نے خاص اسلام کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ وہ واحد ملک ہے جو دین کے نام پر' دین کی خاطر وجود میں آیا۔ یہ نام بے شک کسی نے سوچا' مگر میں کہتا ہوں کہ یہ آسمانوں پر طے ہوا اور اس کے بعد اسے تجویز کرنے والے پر القا کیا گیا۔ یہ ایک مبارک شب کی مبارک ساعتوں میں وجود میں آیا۔ یہ امر آپ اللہ کی تائید اور اس کے مبارک ہونے کا ثبوت ہے۔

"اب کوئی اس ملک سے محبت کرتا ہے' اسے اپنی جان سے بھی زیادہ اہم سمجھتا ہے تو درحقیقت وہ دین سے ہی محبت کر رہا ہے

نا۔ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے نا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی محبت بہت بڑا وصف شمار ہوتا ہے اور پاکستان کی ابتدائی نسل کو پاکستان سے عشق تھا اس لیے کہ انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا۔ قربانیاں جو دی گئیں' ان کے سامنے تھیں۔ وہ پاکستان کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے۔ بعد میں آنے والی نسلوں کو وہ محبت گھٹی میں پلائی جانی چاہیے تھی۔ جو کچھ ابتدا میں دیا جائے' وہ دریا ہوتا ہے۔ شخصیت بننے کے بعد وہ تاثیر نہیں رہتی۔ خرابی یہ ہوئی کہ سیاست نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ اقتدار والے صرف اپنے اقتدار کی فکر میں رہے۔ نسلوں کی تعمیر کی فکر کسی نے نہیں کی۔ یہ ایک نظریاتی ملک تھا۔ یہاں نظام تعلیم کو خاص طور پر اس نظریے کے تحت استوار کرنا چاہیے تھا۔ یہاں ایک لازمی مضمون ہونا تھا.... پاکستان... ابتدا سے آخر تک۔ مگر یہاں مذہبی جماعتیں اپنے عقیدے کی بنیاد پر الیکشن لڑتی رہیں اور دوسرے سیاست داں امپورٹیڈ نظریات کو استعمال کرتے رہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کسی نے نہیں کیا۔ کہیں ووٹ لینے کے لیے اسلام کا نام استعمال ہوا تو کہیں ترقی پسندی کا' سوشلزم کا۔ اور اسے بھی اپنے قول و فعل میں تضاد کے ذریعے بدنام اور ناکام کر دیا گیا۔ یہ دہرا نقصان ہوا' لوگ ہر چیز سے بیزار ہو گئے۔

"مذہبی جماعتیں کہتی ہیں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا۔ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں' اس کام کے لیے تمہاری بھی ضرورت نہیں.... کم از کم سیاسی انداز میں۔ ارے یہ تو ہونا ہے۔ اس ملک میں اسلام کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے' جو ٹل نہیں سکتی۔ پاکستان کو غیر اہم کیوں کہتے ہو۔ جبکہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔ پاکستان سے محبت کرو تو دین سے محبت کرو گے۔ پاکستان ہے تو اس خطے میں دین ہے' ورنہ یہ کفرستان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد مسلمان ہیں ورنہ خدانخواستہ ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ پاکستان سے محبت کرو گے تو یہ اسلام سے محبت بھی ہو گی اور اسلام کی خدمت بھی۔ مگر ان میں بیشتر تو وہ ہیں' جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی...."

"اس لیے کہ قائداعظم کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔ اور ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا جا رہا تھا" میں نے کہا۔

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے سعادت عطا کر دے" بابا عصر بولے "دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ انگریز بھی مسلمانوں سے ڈرتا تھا۔ انہیں آزاد رہ کر پنپنے اور طاقت پکڑنے کا موقع کیسے دیتا۔ اس کے نزدیک ہندو ناقابل اعتبار تھے لیکن مسلمان بہت خطرناک۔ محمد علی جناح ہی ایک ایسے شخص تھے جو ظاہر میں اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ انگریز کو قدرے بے ضرر لگتے تھے۔ بھئی اللہ جس سے جو کام لینا چاہے' لے لیتا ہے۔

"بنیادی چیز پاکستان سے محبت ہے۔ اس سے محبت کرو۔ اس کے لیے اپنے مفاد ترک کر کے محنت کرو۔ اسے ناقابل تسخیر بناؤ۔ یہ دین کا قلعہ ہے۔ یہاں کبھی کوئی اور نظام نہیں آ سکتا۔ اب عمل کے لحاظ سے ہی دیکھ لو۔ اسلام کا نام لینے والے اس کے نام پر کلمہ گو بھائیوں کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ مغربی نظام کے حامی سیاست داں' خودغرض' مفاد پرست اور لٹیرے ہیں۔ پاکستان سے محبت کرنے والا نسبتاً بہتر ہے۔ اس میں تعصب ضرور ہے مگر وہ بھی سیاست دانوں کے ایکسپلائٹیشن کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک وجہ پاکستان سے محبت کا نامکمل ہونا ہے۔ پاکستان کو اللہ کی طرف سے نعمت سمجھو' اس کی اہمیت سمجھو۔ ہندوؤں کی غلامی کا تصور کرو تو ہر پاکستانی ہر پاکستانی سے محبت کرے گا۔ یکجہتی کی فضا پیدا ہو گی۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اسلام متحد کرتا ہے' منتشر نہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اتحاد ہے۔ سب سے اہم پاکستان ہے۔ اس کی حفاظت خود اللہ فرما رہا ہے۔ اس کا قیام بھی معجزہ اور اس کا قائم رہنا بھی معجزہ۔"

میں دم بخود تھا۔ حارث بن عثمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تم لوگوں کو تو دنیا کے تمام مظلوم مسلمانوں کے آنسو پونچھنے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے سے محبت تو کر لو۔ ایک دوسرے کے لیے آنسوؤں کا سامان کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے آنسو پونچھنا تو سیکھ لو۔"

"اب شاید تمہاری سمجھ میں پاکستان سے محبت کی اہمیت آ گئی ہو گی" بابا عصر نے کہا "اب آج کے اشرفیوں کے سفر کی روداد سنو..."

○☆○

اس رات بابا عصر نے جو واقعات سنائے' ان میں سے ایک کے بارے میں' میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ضرور لکھوں گا۔

گھر پہنچ کر میں نے قلم کھولا اور پیڈ اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اسی لمحے بابا عصر کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور اس کے ساتھ ہی منظر تبدیل ہو گیا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ میرا قلم پیڈ پر رواں تھا۔

○☆○

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ دور دور تک سب کچھ بہت روشن تو نہیں' البتہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھ پاتے۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ کو الجھن ہو رہی تھی۔ اس رات برکت بہت الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ زرینہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ برکت کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات رہ رہ کر بدل رہے تھے۔ ابھی وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہوتا۔ ایک پل میں اس کی آنکھوں میں محبت کی جگہ ایک عجیب سی حسرت لے لیتی۔ اور اگلے ہی لمحے ان میں نفرت دہکنے لگتی۔ وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا۔ اور اس کے بعد پھر اچانک وہی محبت کا لمحہ آ جاتا۔

"برکت' تم مجھے پاپا سے مانگ کر تو دیکھو" بالآخر زرینہ نے چپ توڑی۔

"تم اس کا انجام جانتی تو ہو جیناں" برکت نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"ہاں' جانتی ہوں" زرینہ نے آہ بھر کے کہا "اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کہیں بھاگ چلیں۔ خدا کی قسم' میں تمہارے ساتھ جھونپڑی میں بھی خوش رہوں گی' پر تم مانتے نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ چوہدری جی کی زمین بہت بڑی ہے اور ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ ان کی زمینوں سے باہر بھی بہت دور تک جاتے ہیں۔ ان کے کتوں کے دانت اور پنجے بہت تیز ہیں اور انسان کا گوشت انہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" زرینہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"مسئلہ یہی ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتیں" برکت نے ذرا چڑ کر کہا "ہم ابھی پوری جان سے بھاگنا شروع کردیں' سورج نکلنے تک بھاگتے رہیں۔ پھر دن بھر بھی بھاگتے رہیں تو سورج تمہارے پاپا چوہدری صاحب کی زمینوں میں ہی غروب ہوگا۔ پھر قرض کرلو' ہم ان کی زمینوں سے دور نکل جائیں' کہیں کوئی جھونپڑی بنا کر رہنا شروع کردیں تو بھی کسی دن چوہدری جی کا ان دیکھا ہاتھ ہمیں دبوچ لے گا۔ تم حویلی میں بند کردی جاؤ گی اور مجھے زندہ چوہدری صاحب کے خونخوار کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔" برکت نے گہری سانس لی اور قدرے بلند آواز میں بولا "خدا کی قسم' میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر کتوں کی غذا بننے میں بے عزتی کا احساس ہوتا ہے۔ موت ملے تو شہادت کی ملے۔"

"تو کیا سچ مچ پاپا کے پاس ایسے کتے ہیں؟" زرینہ نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں' وہ بھٹے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔"

زرینہ کانپنے لگی "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تمہیں تو بہت کچھ معلوم نہیں ہے" برکت نے کہا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

زرینہ کو اس کی نگاہوں سے خوف آنے لگا۔ وہ نگاہیں اس کے لیے نئی تھیں۔ وہ جیسے اسے بے لباس کیے دے رہی تھیں اور اس کے ادھ کھلے ہونٹوں سے اس کے چمکدار دانت جھانک رہے تھے۔ وہ بہت سفاک لگ رہا تھا' جیسے وہ کوئی بھیڑیا ہو "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟" زرینہ نے گھبرا کر کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے تم سے۔"

ایک دم ان نگاہوں کا تاثر بدل گیا "میں کیسا ہی لگوں۔ تم مت ڈرا کرو مجھ سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"مگر ایسے کیوں دیکھتے ہو؟"

"انسان ہوں نا۔"

"میری سمجھ میں آج تمہاری باتیں نہیں آرہی ہیں" زرینہ منمنائی۔ اسے برکت سے چھپ چھپ کر ملتے ہوئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ برکت نے کبھی اسے ایسے ویسے چھوا تک نہیں تھا۔ مگر آج کسی کسی لمحے اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اسے بھنبھوڑ ڈالے گا۔ یوں تو وہ خود چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں ایسے بھینچے کہ اس کی سانسیں رک جائیں لیکن محبت سے..... ان خطرناک نسبت کے ساتھ نہیں' یہ تو کوئی اور چیز ہے "تمہیں ہوا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جیناں' آج ہم آخری بار مل رہے ہیں" برکت نے دھماکا کیا۔

"اس کے بعد کبھی نہیں ملیں گے۔"

زرینہ بھونچکی ہوگئی "کیوں بھئی؟"

"اس لیے کہ میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

"کیوں؟ کہاں جاؤ گے؟"

"شاید مرجاؤں۔ یا پھر فوج میں بھرتی ہوجاؤں۔"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" زرینہ پریشان ہوگئی۔

"چوہدری جی نے ناجو کو حویلی میں طلب کیا ہے" برکت پھٹ پڑا۔

"تمہاری بہن کو؟" اس کی آنکھوں میں اثبات دیکھ کر زرینہ بولی "کیوں؟ حویلی میں کام کرنے کے لیے؟"

برکت نے اس زور سے ہونٹ دانتوں سے دبائے کہ خون نکل آیا "نہیں..... اپنے نفس کے کتے کے آگے ڈالنے کے لیے۔"

زرینہ کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ سمجھ میں آیا تو اسے یقین نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ناجو کوئی پہلی لڑکی نہیں ہے اس جاگیر کی' نہ آخری ہے جسے یہ حکم ملا ہو۔ ایسی جیسی سیکڑوں جاچکی ہیں تمہاری حویلی میں۔ تم نے اپنی پوری حویلی دیکھی ہی کب ہے" برکت نے تلخ لہجے میں کہا۔

زرینہ پانی پانی ہوگئی۔

"چوہدری کا حکم ہے کہ ناجو سورج نکلنے سے پہلے خود حویلی پہنچ جائے۔ ورنہ اس کے بندے اسے اٹھالے جائیں گے زبردستی۔"

اس بار زرینہ کی سمجھ میں بہت کچھ آگیا۔ وہ برکت کی نظروں کا مفہوم بھی سمجھ گئی اور جو اس نے پوچھا تھا کہ مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہو اور اس نے جواب میں کہا تھا' انسان ہوں نا..... تو اس کا مطلب بھی وہ سمجھ گئی۔ اس نے جان لیا کہ اس وقت برکت کے اندر کیسا طوفان اٹھ رہا ہے۔ برکت کو خیال آیا ہوگا کہ اس رات کی تنہائی میں وہ اپنی بہن کے لٹنے سے پہلے اسے لوٹ سکتا ہے۔ پیشگی بدلہ لے سکتا ہے اور یہ عین انصاف ہوگا۔ یہ سب سوچ کر ایک لمحے کے لیے اس کا بدن کانپا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پُرسکون ہوگئی "میں حاضر ہوں برکت۔ اگر مجھ سے تمہیں کچھ سکون مل سکتا ہے تو ضرور حاصل کرلو۔" وہ بولی۔

برکت شرمندہ نظر آنے لگا "یہ خیال آیا تھا مجھے..... پر میں ایسے کر تو نہیں سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں جیناں۔"

زرینہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں محبت ہی محبت تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "اب تم کیا کرو گے؟"

"یہ پوچھو کہ میں کیا کرنا چاہتا تھا" برکت نے کہا پھر خود ہی جواب دیا "میں نے سوچا تھا کہ ناجو کو حویلی جانے سے تو میں نہیں روک سکوں گا۔ چوہدری سے کبھی کوئی اپنی بہن یا بیٹی بلکہ بیوی کو بھی نہیں بچا سکا۔ پر میں مزاحمت کروں گا' جان دے دوں گا' بے غیرتی قبول نہیں کروں گا۔ پر رب کو یہ منظور نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"میں نے سوچا' تم سے آخری بار مل لوں۔ یہاں آرہا تھا کہ راستے میں ایک مسافر مل گیا۔ اس نے مجھے ایسی امانت دے دی جسے پہنچائے بغیر میں مرنا بھی نہیں چاہتا اور اسے امانت دار تک پہنچانے میں نہ جانے کتنا وقت لگے اور اس کے بعد میں مزاحمت کی موت تو نہیں' ہاں حرام موت مر سکتا ہوں۔ راستے میں' میں نے سوچا اس سے اچھا ہے کہ شہادت کی آرزو کروں۔ فوج میں بھرتی ہو جاؤں اور کبھی گاؤں واپس نہ آؤں۔ بتاؤ' میں کیا کروں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زرینہ نے اس کے آنسو اپنی انگلی سے پونچھے اور پھر اپنی انگلیوں کو چوم لیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگالیا "میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتی برکت۔ اتنی محبت کرتی ہوں تم سے۔ پر بہتر یہی ہے کہ تم ناجو کو بچاتے ہوئے مر جاؤ۔ تمہارے بعد میں بھی جان دے دوں گی' یہی پاپا کی سزا ہوگی۔"

"پر اب میں ایسا نہیں کر سکتا..... اس امانت کی وجہ سے۔ یہ تو وطن کی امانت ہے نا۔ اس سے میں کیسے منہ موڑوں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے اپنے وطن سے اتنا پیار ہے۔ یہ مٹی مجھے اپنی عزت آبرو اور جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ اس کے لیے میں ذلت اٹھا کر بھی جی سکتا ہوں۔"

زرینہ کو تجسس ہوا "دکھاؤ تو کیا ہے؟" اس نے کہا۔

برکت نے اشرفیاں نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ چوہدری کے آدمی اس پر قیامت کی طرح ٹوٹ پڑے۔

○☆○

چوہدری مہدین کے وہ چاروں آدمی اصل میں برکت کے گھر کے پہرے پر تھے۔ یہ چوہدری کا اصول تھا کہ جس گھر میں بلاوا بھجوا دیتا' مقررہ وقت تک اس گھر پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ محض احتیاط تھی کیونکہ بھاگنے کی ہمت تو کسی کو نہیں ہوتی تھی مگر چوہدری اپنے شکار کو کھونے کا قائل نہیں تھا۔ وہ یہ خطرہ مول لیتا ہی نہیں تھا کہ اس کی مطلوبہ لڑکی کو نکالنے کا کوئی موقع متاثرہ خاندان کو ملے۔ ایک بار بھی ایسا ہوتا تو اس کی ناک ہمیشہ کے لیے نیچی ہو جاتی اور چوہدری مہدین کو اپنی ناک بہت عزیز تھی۔

رات کے پہرے پر اصغر' نادر' آکا اور عاقل تھے۔ ولایت کا گھر الگ تھلگ تھا۔ ادھر ادھر بس کھیت ہی کھیت تھے۔ چوہدری کا حکم پہنچنے کے ساتھ ہی پہرا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ چاروں بے فکر تھے۔ مگر آدھی رات کے بعد برکت کے گھر سے انہوں نے کسی کو نکلتے دیکھا۔ چاندنی کی وجہ سے انہیں پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی' وہ ولایت کا بیٹا برکت تھا۔

اصغر سب سے سینئر ہونے کے ناتے انچارج تھا۔ آکا نے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا برکت کو روکا جائے۔ اصغر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاوجہ ہنگامہ کرنے سے فائدہ۔ لیکن خود اصغر کو بھی تجسس تھا کہ اس وقت برکت کہاں جا رہا ہے۔ پھر اس نے سوچا' ممکن ہے' رفع حاجت کے لیے جا رہا ہو۔ اصغر آکا کو پسند نہیں کرتا تھا۔ آکا میں وحشت بہت تھی۔ مار پیٹ اس کا شوق تھا۔ چوہدری کا آدمی تھا اس لیے اس کا شوق پورا ہوتا رہتا تھا۔ خون بہانے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔

ایک بجے پہرا دینے کے لیے دوسری ٹولی آگئی۔ اصغر نے چلتے چلتے آنے والوں کو ہدایات دیں "پانچ بجے تک ناجو باہر آجائے تو خاموشی سے اس پر نظر رکھنا۔ اسے حویلی کے سوا کہیں نہیں جانا ہے۔ ادھر اُدھر جاتی نظر آئے تو اٹھا لینا اور حویلی لے آنا۔"

"اور وہ باہر نہیں آئے تو؟"

اصغر نے سوال کرنے والے کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔ "اوئے تم کب سے ہو چوہدری جی کے پاس۔ اتنا بھی نہیں معلوم" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔ "اوئے پانچ بجے تک لڑکی باہر نہ آئے تو گھر میں گھس کر اٹھا لینا اسے۔ آئی تمہیں سمجھ کہ نہیں؟"

اس کے بعد وہ چاروں حویلی کی طرف چل دیے۔ حویلی سے کچھ دور کھیت کے باہر سے گزرتے ہوئے انہیں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ بولنے والا سرگوشی میں بول رہا تھا لیکن اتنے گہرے سناٹے میں تو آدمی سوچے بھی تو وہ سنائی دینے لگتا ہے۔ پھر نسوانی آواز بھی سنائی دی تو وہ رک گئے اور چوکنے پن سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس کے بعد وہ آوازوں کی سمت چلنے لگے۔ اچانک ٹالی کے درخت کے نیچے انہیں وہ دونوں بیٹھے نظر آگئے۔

برکت پر ٹوٹ پڑنے والوں میں آکا سب سے آگے تھا۔ زرینہ برکت کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اصغر نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ زرینہ پر کب سے اس کی نظر تھی لیکن چوہدری صاحب کی دھی کو وہ کن انکھیوں سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہاتھ جکڑنے کے بعد اس نے زرینہ کو بے بس کرنے کے بہانے لپٹا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے نصیب کو کوس رہا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ زرینہ سے اپنی خاموشی کی قیمت وصول کر سکتا تھا اور سلسلہ چل نکلے تو پھر وہ کب رکتا ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہاں تو تین مسٹنڈے اور تھے۔ اس جھنجلاہٹ نے اس کی گرفت سخت کر دی۔

"تمہاری یہ جرأت کہ مجھ کو ہاتھ لگاؤ" زرینہ نے نفرت سے کہا۔ وہ چوہدری کی بیٹی تھی اور اسے جکڑنے والا چوہدری کا غلام۔

"آپ کا فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے۔ آپ بس گھر چلو" اصغر نے بوجھل آواز میں کہا۔

زرینہ نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس بہانے اصغر کو کچھ اور قربت کا موقع مل گیا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا "نہ بی بی' ایسے نہیں کرتے" اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن..... لیکن یہ اسے مار ڈالیں گے..... برکت کو....." زرینہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس پر اصغر کو کچھ ہوش آیا۔ واقعی..... وہ برکت کو بری طرح مار رہے تھے اور ان میں آکا بھی تھا جو شوقیہ بندے کو مار بھی سکتا

تھا۔ اس نے انہیں ڈانٹا "اوئے.... مارنا نہیں ہے۔ بس پکڑ کر حویلی لے چلنا ہے۔ روکو ہاتھ۔"

حسبِ توقع احتجاج بھی آکے نے ہی کیا "لیکن بھا' اس نے چوہدری جی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے" اس نے لذت لیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ چوہدری جی کا مجرم ہے" اصغر بولا "اور ان کے مجرم ان تک پہنچنے سے پہلے مرجائیں تو اسے لانے والے بھی زندہ نہیں بچتے۔"

عاقل اور نادر کے ہاتھ فوراً رک گئے لیکن آکا نے چھوڑتے چھوڑتے بھی اپنی کچھ تسلی کرلی۔ اس وقت تک برکت نڈھال ہوچکا تھا۔

برکت کی جان چھوٹی تو زرینہ کو اپنا ہوش آیا۔ اصغر نے اسے عجیب انداز میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ شرم سے نڈھال ہوگئی۔ اسے غصہ بھی شدید آیا "چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگانا" اس نے اصغر کو ڈانٹا۔ اصغر نے بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑ دیا۔

وہ سب حویلی کی طرف چل دیے۔ حویلی کے قریب پہنچ کر اصغر رک گیا۔ اس نے عاقل سے کہا "بی بی کا وہاں اس طرح جانا چوہدری جی کو پسند نہیں ہوگا۔ تم جاکر انہیں بتاؤ۔"

وہ تینوں برکت کو لے کر چلے گئے۔ اصغر زرینہ کو لے کر وہیں رک گیا۔

○☆○

چوہدری کو جگانا کارے دارد تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اٹھایا گیا لیکن اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ بہرحال وہ اس بڑے ہال نما بیٹھک کی طرف چل دیا جسے وہ دربار کہتا تھا۔ وہاں اسے اپنے تین خاص بندے نظر آئے لیکن برکت کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا "اس نے مزاحمت کی تو مجھے جگانا کیوں ضروری تھا؟" وہ عاقل پر برس پڑا۔

"یہ بات نہیں ہے چوہدری جی!" عاقل نے اسے کان میں اصل صورتِ حال بتائی۔ چوہدری کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے حویلی کے پہرے دار کو اِدھر اُدھر کیا تاکہ زرینہ کو رازداری کے ساتھ گھر میں لایا جاسکے۔ اس کے بعد وہ دربار میں آیا۔ اس بار اصغر بھی اس کے ساتھ تھا۔

چوہدری اپنی چوکی پر بیٹھ گیا "اب بتاؤ' کیا بات ہے؟" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔

"سرکار' میں تو اسے جان سے مار دیتا پر آپ کے لیے چھوڑ دیا" آکا بولا "یہ سرکار وہاں بی بی کے ساتھ...."

"بس...." چوہدری ہاتھ اٹھا کر دہاڑا "میں سمجھ گیا۔ میرے بھوکے کتے بدنصیب ہیں کہ انہیں صرف چار زبانیں ملیں گی۔"

یہ سن کر وہ چاروں کانپنے لگے "چوہدری جی! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کے بندے ہیں" اصغر گڑگڑایا۔

"اسی لیے تو زندہ چھوڑ رہا ہوں" چوہدری نے سفاکی سے کہا۔ "شکر کرو کہ جاہل ہو ورنہ ہاتھ بھی کٹوانے پڑتے۔"

"پر چوہدری صاحب' بات پھیلنے کے ڈر سے ہی تو میں پیچھے رک گیا تھا" اصغر نے صفائی پیش کی۔

چوہدری کے چہرے پر نرمی نظر آئی "وہ تو ٹھیک ہے پر زبان کبھی پھسل بھی جاتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا سرکار۔ ہم آپ کے وفادار ہیں۔"

چوہدری چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے۔ پر یاد رکھنا' زبان کھولنے والے کی نسل ہی ختم کردوں گا میں۔"

"آپ بے فکر رہیں چوہدری جی!" وہ چاروں بیک آواز بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم تینوں جاؤ' بس اصغر یہاں رکے گا۔"

ان تینوں کے جانے کے بعد چوہدری نے اصغر سے کہا "اب ذرا اسے میرے قریب تو لا۔"

اصغر برکت کو دھکیلتا ہوا چوہدری کے نزدیک لے گیا۔ چوہدری نے برکت کو نفرت سے گھورا "اتنی بڑی جرأت!"

صدیوں کا محکوم لرز اٹھا "چوہدری جی' خدا کی قسم میں نے کبھی جیناں کو چھوا بھی نہیں' ہم بس ملتے رہے ہیں۔"

چوہدری آپے سے باہر ہوگیا۔ غلام آقا زادی کا نام اتنی بے تکلفی سے لے رہا تھا "تجھے نہیں معلوم۔ تیرا اسے اتفاقاً دیکھ لینا بھی بہت بڑا جرم ہوتا۔"

"اور آپ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو حویلی بلوا سکتے ہو؟" محکوم تڑپ کر بولا۔

"ہماری بات اور ہے...."

"تم خدا تو نہیں ہو چوہدری" اس بار برکت نے بڑی نفرت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ چوہدری کچھ کہتا' وفادار اصغر نے برکت کے پوری قوت سے لات رسید کی "اوئے.... زبان لڑاتے ہو چوہدری جی سے۔"

برکت چوہدری کے قدموں میں پہلو کے بل گرا لیکن چوہدری کی نظریں اس کے وجود پر نہیں' قالین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور حرص و طمع گلے مل رہی تھیں۔

قالین پر دو بہت چمک دار اشرفیاں پڑی تھیں۔ وہ برکت کی جیب سے گری تھیں۔ چوہدری نے جھک کر انہیں اٹھالیا۔ ہاتھ میں اشرفیاں لیتے ہی وہ حیران ہوا۔ اشرفیاں اس کے اندازے سے بہت زیادہ بھاری تھیں۔ پھر اسے اور حیرت ہوئی۔ وہ قالین پر پڑی تھیں اور اس نے انہیں بالکل صاف دیکھا تھا۔ ان پر کچھ لکھا نہیں تھا مگر اب ان پر اللہ لکھا نظر آرہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دوسری طرف کلمہ لکھا تھا۔

چوہدری کچھ خوف زدہ ہوگیا لیکن پھر تجسس خوف پر حاوی آگیا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے مجھے نظر کا دھوکا ہوا ہو۔ سوتے سے اٹھا ہوں نا' اب وہ لالچ کے تحت ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ سونے کی ہیں۔ پر سونا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ

جانتا تھا کہ وہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ حروف اوپر لکھے ہوئے نہیں تھے' وہ اشرفیوں کے اندر کئی رنگوں سے ابھرے ہوئے تھے اور ان سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اشرفیوں کا وزن بھی گواہی دیتا تھا کہ اندر یقیناً قیمتی جواہرات کی تحریر ہے اور شعاعوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہیرے' زمرد' نیلم اور یاقوت بہت نایاب قسم کے ہیں۔ یہ کروڑوں کا..... بلکہ شاید اربوں کا مال ہو۔

چوہدری اپنی عزت' جیناں کو بھی بھول گیا۔ ان اشرفیوں کے سوا اسے کسی بات کا خیال نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کنگلے برکت کو یہ کہاں سے مل گئیں۔ اس نے برکت کو کڑی نظروں سے دیکھا "تو تو چور بھی ہے" وہ بولا "یہ کہاں سے چرا کر لایا ہے؟"

"میں چور نہیں ہوں چوہدری' یہ مجھے کسی نے امانت دی ہے۔"

"کیسی امانت؟"

برکت اسے تفصیل بتانے لگا۔ چوہدری غور سے سنتا رہا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ برکت سچ بول رہا ہے پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ فرش پر پڑی تھیں تو وہ عام سی اشرفیاں تھیں' جن کے اندر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ برکت سب کچھ بتا چکا تو وہ بولا "تو یہ ایک اشرفی تیری ہے اور دوسری تو کسی امانت دار کو دے گا؟"

"جی نہیں۔ میں دونوں آگے بڑھادوں گا" برکت نے کہا اور پھر اس کی وجہ بتائی۔

"یہ اور بھی اچھا ہے" چوہدری نے خوش ہو کر کہا "تو یہ اشرفیاں مجھے دے دے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میں تمہیں نہیں دوں گا چوہدری!"

چوہدری کی نرمی اور اس کا تحمل حیرت انگیز تھا "اوجھلے' میں بے ایمان نہیں ہوں۔ ایک رکھوں گا' دوسری آگے بڑھادوں گا۔"

"نہیں چوہدری۔ یہ پاکستان کی ہیں' پاکستان کے لیے اہم ہیں۔ یہ میں تمہیں کیوں دوں؟"

"اوئے پاکستان ہمارا ہے۔ ہم پاکستان کے ہیں" چوہدری نے سینہ تان کر کہا۔

"اسی کا تو افسوس ہے" برکت نے نفرت سے کہا "یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔"

"دیکھ' یہ تو ہیں ہی میرے قبضے میں۔ میں زبردستی بھی لے سکتا ہوں۔ بس ان کا ہی احترام کر رہا ہوں۔ ان میں اللہ کا نام اور کلمہ لکھا ہوا ہے نا' اس لیے۔ تو یہ مجھے ہنسی خوشی دے دے۔"

بات معقول تھی' برکت نے سوچا..... چوہدری بھی خوفِ خدا والا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کسی نے اسے سمجھایا کہ یہ خوفِ خدا نہیں' سزا کا خوف ہے۔ چوہدری ڈرتا ہے کہ اللہ ناراض ہوا تو سب کچھ چھین لے گا اور پھر وہ ایک اشرفی رکھے گا تو دوسری کا لالچ بھی کرے گا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے بھی نہیں دوں گا۔"

"دیکھ برکتے' اس کے بدلے میں تجھے زندگی بخش دوں گا۔ بس تو یہاں سے چلے جانا اور کبھی واپس نہ آنا۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے چوہدری!"

چوہدری سوچتا رہا۔ وہ اشرفیاں کرامت والی چیز بھی تھیں اور بہت قیمتی بھی تھیں۔ ڈرنے کی بات یہ تھی کہ ان میں اللہ اور کلمہ لکھا ہوا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا' اس معاملے میں زبردستی اچھی نہیں۔ کوئی بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بالآخر اس نے نرم لہجے میں کہا "تا جو تیری بہن ہے نا؟"

برکت کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے بھی چھوڑ دوں گا۔ کبھی اس کے متعلق سوچوں گا بھی نہیں۔ تو یہ اشرفیاں مجھے سونپ دے۔ مجھے امانت دار بنادے ان کا۔"

برکت کے لیے وہ بہت بڑی ترغیب تھی۔ ایک لمحے کو..... صرف ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ تو وطن سے غداری ہو گی۔ لیکن نہیں' اس نے سوچا۔ ایک سہولت تو ہے۔ چوہدری بے ایمان ہوا تو اشرفیاں میرے پاس واپس آجائیں گی۔ اس میں نقصان کا تو کوئی پہلو ہے بھی نہیں۔ بہن کی عزت بھی بچ جائے گی۔ وہ ہاں کہنے ہی والا تھا کہ اس کے اندر ایک آواز ابھری' "مگر یہ سوچ کہ اس سے پہلے تو ہی بے ایمان ثابت ہو جائے گا۔ تو ان اشرفیوں کی قیمت جو وصول کر رہا ہے۔ تو پاکستان کی عزت' خود انحصاری اور استحکام اور دین کی سربلندی کی علامت اشرفیوں کو چوہدری جیسے بدکار' بے ایمان اور خائن آدمی کو سونپ کر ان کی بے حرمتی کرنا چاہتا ہے..... اور وہ بھی اپنی غرض کے لیے۔ نہیں برکت' بہن کی عزت ملک کی عزت سے بڑی نہیں۔"

"میں یہ تمہیں دے ہی نہیں سکتا چوہدری!" برکت نے سر اٹھا کر' چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

مگر چوہدری ڈر اور خوف کے باوجود ان اشرفیوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور وہ زبردستی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا "سن..... جو زمینیں تیرے زیرِ کاشت ہیں' وہ میں تیرے نام کر دوں گا' بس تو راضی ہو جا۔"

"چوہدری..... میں رشوت لینے والا نہیں ہوں۔"

چوہدری پھر سوچنے لگا۔ اس کے شاطر سیاسی ذہن نے اسے سمجھایا کہ اس کے پاس ترپ کا اِکا ہے..... آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک سیاسی نظیر بھی قائم ہو جائے گی۔ الیکشن جیتنا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر یہ پتا کھیلنے میں اس کی انا برکت کے پیروں تلے کچل جاتی۔ پھر بھی غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فائدہ توہین کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ سیاسی فائدے کے علاوہ کروڑوں اربوں کی وہ اشرفیاں بھی اسے مل رہی ہیں۔ اس نے کہا "برکتے' میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک اشرفی صحیح امانت دار کو پہنچاؤں گا۔ دیکھ' میں ملک و قوم کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں۔ اور سن' میں تجھے اپنا داماد بنانے کو بھی تیار ہوں۔ میں جیناں کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

یہ سن کر اصغر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سوچا' چوہدری کی پاگل ہوگئے ہیں۔ جو چیز اختیار میں ہے' اسے مانگ رہے ہیں۔ اس کی بڑھ چڑھ کر قیمت لگا رہے ہیں۔

ادھر برکت بھی بھونچکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری اس حد تک بڑھ جائے گا۔ ایک لمحے کو اس کا دل یوں دھڑکا جیسے ناچ اٹھا ہو۔ اسے جیناں سے بہت محبت تھی اور وہ اسے ناقابل حصول سمجھتا تھا اور اب وہ اسے مل رہی تھی۔ زمین آسمان مل رہے تھے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ جیناں کا حصول بہن کی عزت سے بڑھ کر تو نہیں ہے اور جس بات کے لیے وہ لڑ رہا ہے' وہ بہن کی عزت سے بھی بڑی ہے۔ وطن کے استحکام اور دین کی سربلندی کے معاملے میں وہ ایمان دار ہو کر بھی بے ایمان بن جائے' یہ تو خسارے کا سودا ہے۔ اس نے مستحکم لہجے میں کہا "نہیں چوہدری' یہ اشرفیاں میں کسی قیمت پر تمہیں نہیں سونپوں گا۔"

چوہدری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ترپ کا اکا بھی رائگاں ہوگیا تھا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے اشرفیوں پر نظر ڈالی اور فیصلہ ہوگیا۔ اشرفیوں کا لالچ ڈر اور خوف پر حاوی ہوگیا۔ اس نے بے حد نفرت سے برکت کو دیکھا۔ "میں تو تجھے آزما رہا تھا۔ اشرفیاں تو میرے پاس ہی ہیں' مجھے تیری اجازت کی ضرورت نہیں" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "اور تو نے ثابت کر دیا کہ تو بہت ڈھیٹ اور اڑیل ہے۔ اب میں تجھے ایسی موت دوں گا جس کا تو نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا" پھر وہ اصغر کی طرف مڑا "اصغر' اسے لے جا کر بند کر دے اور ہاں' ناجو آجائے تو اسے بنا سنوار کر میرے کمرے میں لے آنا.... اور اسے بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر لے آنا۔ اسے میں ایک بہت خوب صورت تماشا دکھاؤں گا.... مفت.... بغیر ٹکٹ کے" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

بستر پر لیٹ کر چوہدری اشرفیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نیند آگئی۔

○☆○

صبح اصغر نے برکت کو بندی خانے سے نکالا تو دھوپ نکل چکی تھی۔ اصغر نے اس کے پاؤں کھولے اور بولا "چل اوئے' اب وقت میں زندہ ناچ گانے والی انگلش فلم دیکھنے کے لیے تیار ہو جا" برکت کے تیور بدلتے دیکھ کر اس نے ریوالور لہرایا "کوئی گڑبڑ مت کرنا۔ مجھے تجھ سے کوئی محبت نہیں ہے اور ٹانگوں پر گولی چلانے سے چوہدری صاحب کبھی نہیں روکتے۔"

برکت کا خون کھول رہا تھا۔ وہ یقیناً بھڑ جاتا لیکن اسے اپنے دونوں فیصلے یاد تھے۔ سب سے پہلے تو اسے اشرفیوں کی فکر کرنی تھی کیونکہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اشرفیاں اس کے پاس واپس آچکی ہیں۔ گویا اشرفیاں سونپنے والے نے جو کچھ کہا تھا' درست تھا اور اسے جلد از جلد انہیں آگے پہنچانا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے حرام موت سے بچنا تھا اور شہادت کی آرزو میں جینا تھا۔

"چل آگے بڑھ" اصغر نے اسے دھکا دیا۔

اچانک برکت خوف زدہ ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا دکھانے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اس کی روح تک کانپ گئی۔ "اے اللہ' میری مدد فرما" اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی لیکن اب ایک قدم اٹھانا بھی اسے دوبھر لگ رہا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پھانسی کے مجرم پھانسی کے کھاٹ تک کیسے جاتے ہوں گے۔

اصغر کا رخ حویلی کے اس حصے کی طرف تھا جو اصل حویلی سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہاں مہمان خانہ تھا۔ اس طرف جانے کی اجازت صرف چوہدری کے خاص ملازموں کو تھی یا پھر اسے جسے چوہدری صاحب بلائیں۔ وہ چوہدری کا عشرت کدہ تھا۔

چوہدری برکت کا فیصلہ کرنے کے بعد حویلی کے زنان خانے میں جانے کے بجائے اپنی مہمان خانے والی خواب گاہ میں چلا آیا تھا۔ اس وقت وہ جاگ چکا تھا لیکن متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ مسہری پر نیم دراز تھا۔ سہمی ہوئی ناجو بھی مسہری پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ چوہدری اسے بھوکی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسی لمحے اصغر برکت کو لے کر خواب گاہ میں داخل ہوا "لے آیا چوہدری جی!" اس نے اعلان کیا۔

"کرسی پر بٹھا کر اس کے پاؤں بھی باندھ دے" چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر برکت کے پاؤں باندھ چکا تو چوہدری نے کہا "اب باہر بیٹھ جا۔ جب تک میں نہ بلاؤں' کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

اصغر باہر چلا گیا۔ ناجو نے بھائی کو سامنے پا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔ برکت نے بڑی عاجزی سے کہا "چوہدری' خدا کا خوف کر۔"

چوہدری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "ایسا پھل دار تو میں نے کوئی درخت بھی نہیں دیکھا برکتے!" وہ بولا۔ پھر ناجو کی طرف مڑا "ان کپڑوں میں تو بہت اچھی لگتی ہے۔ پر میں جانتا ہوں' ان کے بغیر تو تجھ پر نگاہ بھی نہیں ٹھہرے گی۔"

ناجو یوں تھرتھرائی جیسے اس کی روح جسم سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔

"دیکھا برکتے' اشرفیاں بھی میری' تیری بہن بھی میری۔ اور تجھے کیا ملا؟ یہ ہے ضد کا انجام" چوہدری نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے سو کر اٹھنے کے بعد اشرفیوں کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس نے اشرفیاں نکالنے کے لیے بغیر دیکھے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا تکیے کے نیچے والا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مسلسل چیخے جا رہا تھا۔

چوہدری نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچا تھا تو تکیہ الٹ گیا تھا۔ برکت نے حیرت سے دیکھا۔ تکیے کے نیچے دو سیاہ بچھو موجود تھے۔ یہ منظر ناجو نے دیکھا جو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ ان بچھوؤں کو دیکھ کر تو وہ بے ہوش ہی ہوگئی۔ برکت نے بے تابی سے زور لگایا لیکن رسی کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ

بچھو کہیں ناجو کو ڈنک نہ ماردیں۔ ایسے سیاہ اور بڑے بچھو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت زہریلے لگ رہے تھے۔

چیختے ہوئے چوہدری نے بھی حیرت سے ان بچھوؤں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اشرفیاں کہاں گئیں..... اور یہ بچھو کہاں سے آگئے۔ پھر اذیت نے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچھو اس کے جسم پر چڑھ گئے اور بار بار اس کے جسم کے مختلف حصوں پر ڈنک مارتے رہے۔ ہر بار چوہدری کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلتی۔ زہر ایسا تھا کہ اس کا چہرہ تک سیاہی مائل نیلا ہوگیا تھا۔

گھبرایا ہوا اصغر کمرے میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر گھبرایا۔

"ارے..... ڈاکٹر کو لا..... جلدی سے....." اذیت سے چیختے ہوئے چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر الٹے پاؤں کمرے سے نکلا۔ "یہ..... ان بچھوؤں کو..... تو مار دے" چوہدری نے پھر پکارا لیکن یا تو اصغر نے سنا نہیں یا وہ بچھوا اسے بہت خوفناک لگے۔ وہ کمرے سے نکلا چلا گیا۔

بچھو ڈنک مارتے رہے۔ پھر بے ہوش ناجو کے پاس سے گزر کر نیچے چلے گئے۔ برکت حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور چوہدری اب یوں چلا رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جہنم کی آگ دہک رہی ہو۔

"ارے..... میں مرا..... ہائے ربا..... ربا..... مجھے بچالے....."

اچانک چوہدری خاموش ہوگیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پائنتی کی سمت دیکھنے لگا۔ وہاں اسے ایک نورانی چہرے والی ہستی نظر آرہی تھی "آپ..... آپ میری مدد کریں نا....." وہ گڑگڑایا۔

"آیا تو میں تمہاری مدد کرنے ہی تھا لیکن تم نے تو کچھ بچایا ہی نہیں۔"

"کچھ کریں....." چوہدری اور گڑگڑایا۔

"کوئی حصہ تم نے ایسا پاک چھوڑا ہی نہیں کہ تمہاری جان نکال سکوں اے ناپاک آدمی۔"

"تت..... تو..... تو..... آ..... آپ....."

"ہاں۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔"

"مم..... مجھے..... آپ..... کی..... ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر..... مجھے..... بچالے..... گا۔"

"تمہارا وقت پورا ہوچکا ہے" موت کے فرشتے نے کہا "اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ ڈاکٹری دوا تمہاری اذیت اور بڑھادے گی۔ تم خود موت مانگنے لگو گے۔"

برکت حیران تھا کہ چوہدری کس سے باتیں کررہا ہے۔ اسے کمرے میں اور کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ چوہدری اب یوں لرز رہا تھا، جیسے جسم اس کے قابو میں نہ ہو۔ اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں لیکن اب اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس سے چیخا بھی نہیں جارہا تھا۔ شاید اس لیے اس کی تشنج کی کیفیت اور شدید ہوگئی تھی۔

اصغر ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے چوہدری کو ایک نظر دیکھتے ہی مایوسی سے سر ہلایا "زہر پوری طرح اثر کرچکا ہے۔ بہت مشکل ہے" اس نے کہا "میں انجکشن لگا رہا ہوں مگر بہتر یہی ہے کہ اسپتال لے جاؤ۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ بچیں گے پھر بھی نہیں۔"

ڈاکٹر انجکشن لگا کر چلا گیا مگر چوہدری کی اذیت اور بڑھ گئی۔ اس نے موت کے فرشتے سے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم میری جان نکال لو نا" وہ گڑگڑانے لگا۔

اس بار اصغر کو یقین ہوگیا کہ چوہدری پاگل ہوگیا ہے۔ وہ ہوا سے باتیں کررہا تھا۔

فرشتے نے کہا "کیسے نکالوں، کوئی راستہ بناؤ۔ ایسے تو میں تمہیں نجات نہیں دے سکتا۔"

"کک..... کیسے..... ب..... بناؤں..... راستہ؟"

"یہ نزع کا وقت ہے۔ توبہ اب قبول نہیں ہوسکتی۔ نیکی تم کر نہیں سکتے کہ توفیق کا دروازہ بھی بند ہوگیا ہے" فرشتے نے کہا۔ "اب زبان سے کچھ کرو، جو کرنا چاہئے۔ تب راستہ بنے گا۔ کچھ ہاتھوں کو بھی کام میں لاؤ۔"

"کیا..... کک..... کروں؟"

"یہ تو تمہیں ہی سوچنا ہے" فرشتے نے بے رخی سے کہا۔

چوہدری سوچتا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کی نظر برکت پر..... اور پھر ناجو پر پڑی۔ اس نے اصغر کو حکم دیا کہ برکت کو کھول دے "اور میری اس..... بیٹی کو ہوش میں لا" یہ کہتے ہوئے اسے یہ خوش آئند احساس ہوا کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کی اذیت یک لخت موقوف ہوگئی تھی لیکن خاموش ہوتے ہی اذیت پھر لوٹ آئی، وہ چیخنے لگا۔

اصغر ہچکچایا کہ پاگل چوہدری کی بات مانے یا نہ مانے۔ کیا پتا، ہوش میں آنے کے بعد وہ اسی بات پر اس کی کھال میں بھس بھروادے "اص..... غر..... سنتا نہیں ہے" چوہدری نے گرجنے کی کوشش کی۔

اصغر کو تعمیل کرنا ہی پڑی۔ برکت کے ہاتھ پاؤں کھول کر وہ ناجو کی طرف بڑھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

چوہدری نے برکت سے کہا "برکتے..... میں ہل بھی نہیں سکتا۔ تو یہ سمجھ لے کہ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردے۔"

برکت کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ بولا "چوہدری، اللہ تجھے معاف کرے، میں نے تجھے معاف کیا۔"

چوہدری نے مظلومیت سے فرشتے کی طرف دیکھا "اب میری مشکل آسان کردو۔"

"ابھی بات بنی نہیں" فرشتے نے کہا "کچھ اور کوشش کرو۔"

چوہدری سوچتا رہا۔ ناجو ہوش میں آگئی تھی۔ چوہدری نے اصغر سے کہا کہ وہ زنان خانے سے گھر کے تمام افراد کو بلا لائے۔ پھر وہ ناجو سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ "میری بیٹی، مجھے معاف کردے۔"

فرشتے نے کہا "کیا بس یہی دو ہیں جن پر تو نے ظلم کیا ہے؟"

چوہدری پوری جان سے کانپ گیا۔ ظلم کی کہانی تو بہت بڑی تھی۔ گھر گھر پھیلی ہوئی تھی "مم..... میں..... کس..... سب سے..... معافی مانگ لوں گا۔"

اتنے میں گھر کے لوگ آگئے۔ اس کی بیوی، بیٹی زرینہ اور

اکلوتا بیٹا منصور۔ اور رشتے دار بھی۔ وہ ان سب سے معافی مانگنے لگا پھر اس نے اصغر سے کہا "سب آدمیوں کو ایک کام پر لگادو۔ میری جاگیر میں جتنے گھر ہیں' تمہیں ہر جگہ جاکر معافی مانگنی ہے۔ کہنا' میں اس قابل ہوتا تو خود آتا۔ خدا کے نام پر' مجھے معاف کردیں۔"

اس کے گھر والے اور رشتے دار رو رہے تھے۔ چوہدری کا چہرہ اور پورا جسم سیاہ ہوچکا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اب چوہدری بچے گا نہیں۔

"اب تو میری مشکل آسان کردو" چوہدری نے فرشتے سے التجا کی۔

"ابھی بات نہیں بنی۔ تم نے برکت سے کچھ وعدہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں پورا کردوں گا۔ بات پکی کردوں گا۔ تم اب مجھے موت دے دو۔"

"ایسے نہیں۔ اپنے معاملات خود نمٹا کر جاسکتے ہو تم' ایسے نہیں۔"

چوہدری نے اپنی بیوی سے کہا "میں جیناں کی شادی برکت سے کررہا ہوں" وہ بیٹے کی طرف مڑا "منصور' جلدی سے قاضی کو بلا۔ جلدی کر۔ فوراً نکاح پڑھوادے میرے بیٹے!" وہ فرشتے کی طرف مڑا "اب تو ٹھیک ہے؟"

"اور وصیت..."

"وہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"

"وارث کسے بنایا ہے؟"

"اپنے بیٹے منصور کو۔ سب جائداد زمین اسی کے نام کردی ہے۔"

"کیوں؟ زمین کس کی ہے؟" فرشتے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میری ہے۔"

"کیسے؟"

"میرے پرکھوں سے چلی آرہی ہے' باپ سے مجھے ملی۔"

"غلط ہے۔ سب غلط" فرشتے نے تیکھے لہجے میں کہا "تمہارے پرکھوں کو انگریزوں نے دی تھی نا۔ جانتے ہو کیوں' غداری اور غلامی کے صلے میں۔ اور کیا تم نہیں جانتے کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے' وارث بنادے اور وارث سرکش اور نافرمان ہو تو اللہ زمین اس سے چھین کر کسی اور کو وارث بنادیتا ہے۔"

"تو میری زمین...."

"یہ نہ کہو۔ کہو اللہ کی زمین۔ یہ اسی کی ہونی چاہیے جو اس پر محنت کرے۔"

"ٹھیک ہے' جو جس زمین پر فصل اگا رہا ہے' اب وہی اس کا مالک ہوگا۔"

"وصیت نامہ لکھواؤ اور اس پر دستخط کرو' یوں ہاتھوں سے راستہ بنے گا۔"

چوہدری نے اپنے وکیل کو اور اپنے تمام مزارعوں کو طلب کرلیا۔ اسی دوران میں قاضی صاحب آچکے تھے۔ انہوں نے برکت اور زرینہ کا نکاح پڑھادیا۔

دوپہر تک تمام کام مکمل ہوگئے۔ وصیت نامے پر دستخط ہوگئے۔ اس کے بعد ہی چوہدری کی جان نکلی۔

چوہدری کی تدفین کے بعد برکت نے دوسرے مزارعوں کو جو اب زمین دار بن چکے تھے' وہ اشرفیاں دکھائیں اور ان کے بارے میں بتایا اور کہا "اب تم سب پر اللہ کی رحمت ہوچکی ہے۔ ان اشرفیوں کی خیروبرکت کا یہ ثبوت ہے کہ ظلم مٹ گیا اور ہم سب کو وہ کچھ مل گیا جس کا ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب سوچو کہ ان اشرفیوں کے قومی خزانے میں پہنچنے کے بعد انشاء اللہ ملک میں کیا کچھ ہوگا۔ میرا بس چلے تو انہیں آج ہی ان کی آخری منزل پر پہنچادوں۔ مگر ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ کل کے مزارع اور آج کے ہم زمین دار ان اشرفیوں کو جلد از جلد یہ جاگیر پار کرا کے آگے بڑھادیں۔ پہلے مرحلے میں میں یہ اشرفیاں چاچا کریم کو سونپتا ہوں۔"

چاچا کریم نے اشرفیوں کو چوما' آنکھوں سے لگایا اور اپنے پڑوسی عطا محمد کی طرف بڑھادیں۔

کیسی ناقابلِ یقین بات ہے کہ رات ہونے تک اشرفیوں کی امانت ایک ہزار سے زائد ہاتھوں سے گزر چکی تھی۔

○☆○

میں نے قلم بند کرکے رکھا اور اپنے لکھے ہوئے کو پڑھنے لگا۔ اسے پڑھ کر میرا وجود عجیب طمانیت اور خوشی سے بھر گیا۔ میں ان اشرفیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

اشرفیوں کے اس سفر کو شروع ہوئے ڈیڑھ سال سے اوپر ہوچکا تھا۔ اس سفر کی ہر کہانی بابا عصر نے مجھے سنائی تھی۔ میں ہزاروں کہانیاں سن چکا تھا مگر انہیں لکھ نہیں سکتا تھا۔ لکھتا تو لاکھوں صفحے ہوجاتے۔ کچھ باتیں ہر کہانی میں مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ کسی امانت دار نے اپنے حصے کی اشرفی نہیں رکھی تھی۔ دوسری یہ کہ ہر امانت دار ضرورت مند تھا۔ ہر ایک کی ضرورت بڑی تھی۔ مگر ملک وقوم کی محبت میں اور اس کے مفاد میں ان میں سے ہر ایک نے اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال دیا۔ پھر بے ایمان بھی تھے..... اور وہ سب ایک جیسے تھے۔ ان کے دل میں کسی ضرورت کی وجہ سے بے ایمانی نہیں آتی تھی' ہوس انہیں مجبور کردیتی تھی اور ایک مشترکہ بات یہ تھی کہ اشرفی جہاں بھی گئی تھی' وہاں خیروبرکت چھوڑ آئی تھی۔

ایک اور بات سامنے آئی تھی۔ بے ایمانوں کو وہ اشرفیاں اپنی خواہش' اپنی ہوس کے مطابق نظر آتی تھیں۔ ان میں بعض تو ایسے بدنصیب تھے کہ انہیں ان میں نہ اللہ کا نام لکھا نظر آیا' نہ کلمہ طیبہ۔ کسی کو وہ بہت قیمتی دھات کی ڈلیاں لگیں۔ کسی کو ان میں ہیرے جواہرات نظر آئے۔ اور سب کے ہوس ناک ردِعمل بھی مختلف اور عجیب تھے۔ کسی نے انہیں سینت کر رکھنا چاہا' کسی نے ہیرے جواہرات نکالنے کے لیے انہیں توڑنے کی کوشش کرڈالی۔

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فوزیہ رزاق +92 3331784111 جاسوسی ڈائجسٹ

کوئی انہیں فروخت کرنے کے لیے جوہری کے پاس پہنچ گیا اور کوئی کسی ملک کے سفارت خانے۔ قصہ مختصر یہ کہ عجیب عجیب کہانیاں' عجیب عجیب پہلو سامنے آتے تھے۔

آج کے واقعے نے مجھے جس وجہ سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وہ بے حد پہلو دار تھا۔ اس بار اشرفیوں کی خیر و برکت نے بہت بڑھ کر اجتماعی رخ اختیار کیا تھا۔ اس بار بدترین ظلم اپنے انجام کو پہنچا تھا اور بے شمار لوگوں کو ظلم سے نجات ملی تھی۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ اللہ کی پکڑ کے سامنے طاقت ور سے طاقت ور انسان کتنا بے بس اور حقیر ہوتا ہے۔ اس بدنصیبی کا بھی پتا چلا تھا کہ توبہ اور توفیق کے دروازے بند ہونے سے پہلے انسان اللہ سے رجوع نہ کرے تو ایسی عظیم رحمت اور کرم سے بھی محروم رہ جاتا ہے جو برسہا برس کے گناہ گار کو توبہ کے ایک سچے لمحے میں بخش دیتی ہے' دھو کر پاک کر دیتی ہے۔ اور یہ عبرت ناک بات بھی سامنے آئی تھی کہ گناہ گار کی موت کتنی دشوار اور اذیت ناک ہوتی ہے۔

بہرکیف اس سفرنامے نے مجھے بہت پُرامید کر دیا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ بے برکتی اور بدحالی کی طویل رات ختم ہونے کو ہے اور میرے وطن کے افق پر خیر و برکت' استحکام' خود انحصاری اور اللہ کی تائید کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

بس مجھے اس صبح کا انتظار تھا..... اور پوری قوم کو اس کے لیے اللہ سے دعا کرنی تھی۔

○☆○

۲۷ رمضان ۱۴۱۸ھ کو اشرفیوں کے سفر کو دو سال ہو چکے تھے۔ اب ہمارے معمول میں فرق پڑ گیا تھا۔ بابا عصر سے اب ملاقات ہر روز نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اب اس میں باقاعدگی بھی نہیں رہی تھی۔ کبھی وہ تین چار دن بعد مل جاتے اور کبھی دو ہفتے ہو جاتے اور ملاقات نہ ہوتی۔ بہرحال جب بھی وہ ملتے' اتنے دنوں کے اشرفیوں کے سفر کی تمام روداد وہ مجھ تک پہنچا دیتے۔ البتہ میرا معمول اب بھی وہی تھا۔ عشا کے بعد چہل قدمی کی عادت ہو گئی تھی۔

.... مئی ۹۸ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکا کر دیا۔ اس کے اگلے روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس روز میں جس سے بھی ملا تھا' اس سے یہی گفتگو ہوئی تھی۔ پاکستان کو دھماکا کرنا چاہیے یا نہیں۔ تقریباً پوری قوم اس پر متفق تھی کہ پاکستان کو دھماکا کرنا چاہیے۔ معمولی سی اقلیت اس سے اختلاف بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پاکستان کی معیشت بہت ابتر حال میں ہے۔ اسے بہتر بنانا چاہیے۔ ملک اور قوم کی خوش حالی کی فکر کرنی چاہیے۔ یہاں لوگوں کو یہ میسر نہیں اور وہ میسر نہیں۔ پینے کا صاف پانی تک تو ہے نہیں۔ علاج معالجے کی سہولت سے لوگ محروم ہیں۔ تعلیم تک دشوار ہے لوگوں کے لیے۔ ایسے میں ایٹمی دھماکا کرنا۔ اس کے بعد امداد بند اور ملک اقتصادی طور پر پوری طرح تباہ....

"یہ سب کچھ تو حکومتوں نے کرنا ہی نہیں چاہا" میں نے ایک دوست کی یہ دلیل سن کر تبصرہ کیا تھا "ورنہ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔"

"اور تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایٹمی دھماکا نہ کرنا کوئی جادوئی چراغ ہے کہ جس کے زور پر یہ سب کچھ ہو جائے گا" میرے ایک اور جذباتی دوست نے دھماکے کے خلاف دلیل دینے والے دوست کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔

اور ایک ٹھنڈے دماغ والے دوست نے کہا "میاں..... ملک پہلی چیز ہے۔ خدانخواستہ وہی نہیں رہا تو کیا خوش حالی اور کیا بدحالی۔ اور کیسی محرومی اور پس ماندگی۔"

میں نے یہ سب کچھ بابا عصر کو سنایا' وہ سر ہلا کر بولے "اس وقت بھارت میں حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' وہ بہت کٹر اور متعصب ہیں۔ یاد رکھو' ایسے لوگ بزدل بھی ہوتے ہیں۔ وہ بم گرانے میں ایک لمحے کو بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ پاکستان کے لیے دھماکا ناگزیر ہے..... اور ہو کر رہے گا۔"

"لیکن بابا' ہمارے یہاں تو احکامات باہر سے آتے ہیں..... وہاں سے جہاں ہمیں دبا کر رکھنے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں' ہماری بہتری نہیں" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اللہ سب سے بڑا تدبیر کرنے والا ہے۔ وہ جس سے جو چاہتا ہے' کرا لیتا ہے" بابا عصر نے نہایت اطمینان سے کہا "وہ دشمنانِ اسلام کے دل میں مسلمانوں کی دہشت بھی بٹھا سکتا ہے۔ وہ انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے پروائی میں مبتلا کر کے غفلت میں بھی ڈال سکتا ہے۔ وہ ان کے دل میں یہ خیال بھی ڈال سکتا ہے کہ پاکستان کو ایٹمی دھماکے کے بعد اقتصادی پابندیوں اور قرضوں کی ادائیگی کی بلیک میلنگ کے ذریعے زیادہ آسانی سے زیر بھی کیا جا سکتا ہے" انہوں نے گہری سانس لی اور چند لمحے کے توقف کے بعد بولے "اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ پاکستان میں کوئی مردِ مومن' کوئی مردِ آہن ہی موجود ہو جو ملک و قوم کی ضرورت کے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ تم فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

بھارتی دھماکے کے بعد کے وہ دن عجیب تھے۔ ہر شخص مضطرب تھا۔ لیکن ایٹم بم کا خوف کسی کو بھی نہیں تھا۔ البتہ پاکستان کے دھماکے کی آرزو سبھی کو تھی۔ ایک عام آدمی بھی یہ بات سمجھ رہا تھا کہ بھارت کو پاکستان پر بم گرانے سے صرف ایک بات روک سکتی ہے..... پاکستان کی طرف سے جوابی ایٹم بم کا خطرہ۔ ادھر غیر ملکی ذرائع ابلاغ مسلسل خبریں دے رہے تھے کہ پاکستان پوری طرح تیار ہے اور کسی بھی وقت ایٹمی دھماکا کر سکتا ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایٹمی دھماکا کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

پھر ۲۸ مئی کو پوری قوم نے سکون کا سانس لیا۔ پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر دیے تھے۔ ملک بھر میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ شکر کے نوافل ادا کیے گئے۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کا وہ مظاہرہ دیکھنے

میں آیا تو صرف ۶۵ء کی جنگ کے دوران میں دیکھا گیا تھا۔

اس روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے چلتے چلتے چہک کر کہا "دیکھی پاکستان کی اہمیت۔ اب تو سمجھ میں آگیا۔"

میں نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"اب بتاؤ' عالم اسلام کے تحفظ اور اس کی قیادت کا منصب کسے ملا؟ پاکستان کو.... اب مظلوم مسلمانوں کی دادرسی پاکستان کے سوا کون کر سکتا ہے۔ کوئی کسی اسلامی ملک کو ایٹم بم کی دھمکی دے کر بلیک میل کر سکتا ہے' انشاء اللہ کبھی نہیں.... ہرگز نہیں۔"

"جی ہاں... یہ تو ہے۔"

"اور اس بم کو کیا نام دیا جا رہا ہے' جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔ اسلامی بم۔"

"ہاں۔ یہ بھی اسلامی بم ہے۔ کیونکہ یہ ٹیکنالوجی مسلمانوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ پاکستان ایک جست لگا کر دنیا کی ممتاز اقوام کی صف میں جا کھڑا ہوا ہے۔"

"لیکن بہرحال ہم پس ماندہ اور ترقی پذیر..."

"پس ماندگی کو چھوڑو۔ بقا پہلی چیز ہے۔ جو یہ راگ گا رہے ہیں' انہیں گانے دو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ہیں تو سب کچھ ہے۔ خدانخواستہ ہم غلام ہو گئے تو خوش حالی کس کام کی۔ پاکستان نظریاتی ملک ہے۔ اس کا دفاع سب سے اہم ہے۔"

"لیکن بابا.... ایٹم بم بہرحال اچھی چیز نہیں۔"

"اسے کوئی اچھا نہیں کہتا لیکن جن کے پاس یہ ہے' وہ اسے ضائع کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ کیسی برائی ہے' جسے سب برا بھی کہتے ہیں اور سینے سے لگا کر بھی رکھتے ہیں" بابا عصر نے جوش سے کہا "لیکن میں اسے اچھا نہیں کہتا۔ یہ انسانیت کا قاتل بم ہے۔ اللہ نے کہا کہ بلاجواز' بغیر کسی قصور کے اگر ایک انسان بھی قتل کر دیا جائے تو یہ قتل انسانیت ہے۔ یہ بم تو جہاں بھی گرایا جائے گا' وہاں لاکھوں کروڑوں بے قصور انسان ختم ہو جائیں گے۔ خواہ بم کوئی بھی گرائے' کہیں بھی گرائے۔ خواہ پاکستان بھارت کے کسی شہر پر بم گرائے' وہ بھی لاکھوں کروڑوں بار پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔"

"لیکن بابا گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے۔"

"مگر یہ تو گھن کے ساتھ گیہوں پسنے والی بات ہے" بابا عصر نے تیز لہجے میں کہا "اسلام نے ہمیشہ نہتے شہریوں کو تحفظ دیا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔ بلکہ لڑنے والے بھی ہتھیار ڈال دیں تو ان کا قتل بھی جائز نہیں۔ اور سنو' یہ جو بلا تفریق ختم کر دینے کی بات ہے تو یہ صرف اللہ کے قہر کو زیبا ہے۔ کسی انسان' کسی قوم کے لیے یہ جائز نہیں۔"

"تب تو یہ غلط ہے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بم پاکستان کی ضرورت تھی۔ اس کے ذریعے پاکستان نے بھارت کو خبردار کر دیا کہ وہ جارحیت سے باز رہے۔ ورنہ ایک ایٹم بم کا جواب دو سے دیا جائے گا اور یہ پیغام بھارت تک پہنچ گیا۔ اب بھارت انشاء اللہ یہ غلطی نہیں کرے گا اور انشاء اللہ پاکستان کو یہ بم استعمال کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔"

"اس کا مطلب ہے' امن قائم ہو جائے گا" میں نے کہا۔

"بات یہ نہیں۔ دراصل میں بہت تیز چل رہا ہوں" بابا عصر نے کہا۔ مجھے ان کی یہ بات بے ربط لگی۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا "ٹیکنالوجی بہت آگے چلی گئی ہے" انہوں نے مزید کہا "لہٰذا جنگ کے فارمولے بھی بدل گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہترین دفاع حملہ کرنے میں ہے اور یہ ایٹم بم یا ایسے ہی دوسرے بم ہلاکت خیز ہیں۔ یہ دفاع نہیں کر سکتے۔ حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ایٹم بم ہمارا دفاع کرے گا۔ سوچو تو کسی نے تمہارے شہر پر ایٹم بم گرا دیا اور تم نے ان کے دو شہروں پر ایٹمی حملہ کر دیا۔ یہ دفاع تو نہیں ہوا۔ تم اپنے شہریوں کا دفاع تو نہیں کر سکے۔

"تو اب نیا فارمولا بنے گا۔ کہا جائے گا کہ بہترین حملہ اپنا دفاع کرنے میں ہے۔ اور دفاع یہ ہے کہ جو تمہاری طرف ہلاکت بھیجے' تم وہ ہلاکت اسی کو لوٹا دو۔ اسی کی طرف بھیج دو تاکہ وہ خود اپنی بنائی ہوئی موت کا مزہ چکھے۔ دفاع یہ ہے کہ اپنی سرحدوں' زمینی' بحری اور فضائی سرحدوں کو ناقابل تسخیر بنا لو۔ کوئی ہلاکت بردار چیز اس سرحد کو پار نہ کر سکے۔ اس سے ٹکرا کر اپنے ہی خالق کی طرف لوٹ جائے۔ یوں تمہارے شہری بھی محفوظ۔ اور دشمن کا بھی اپنی تباہی کے سلسلے میں تم پر کوئی دعویٰ نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنا ہی کیا دھرا بھگتا ہوگا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ اب نئی ٹیکنالوجی کے تحت اپنا دفاعی نظام مرتب اور منظم کرنے کا وقت ہے اور انشاء اللہ یہ کام سب سے پہلے پاکستان کرے گا کیونکہ اسلام بے قصور لوگوں کو مٹانے سے روکتا ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جو اب ہو رہا ہے' پہلے اسے بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا" بابا عصر نے کہا "بات اتنی سی ہے کہ کسی نے ایٹمی اسلحہ اٹھائے ہوئے ایک میزائل کو تمہاری طرف روانہ کیا۔ آنے والے وقت میں انشاء اللہ یہ بڑی بات نہیں ہوگی کہ اسے بھیجنے والے کی حد میں ہی فنا کر دیا جائے۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہوگا کہ وہ آپ کی سرحد پار نہ کر سکے۔ بس سائنس دانوں کو اپنی سوچ کا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد محنت اور لگن سے کام.... اور اللہ کی تائید سب ٹھیک کر دے گی۔ دیکھ لینا' انشاء اللہ سب سے پہلے یہ نظام پاکستان بنائے گا۔ اب سوچو تو' اس کے بعد کیا ہوگا۔ حملہ کرنے والا اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہو کر منہ کی کھائے گا اور جنگ ہار جائے گا اور دفاع کرنے والا بغیر ہتھیار اٹھائے' بغیر لڑے جنگ جیت جائے گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا.... اور پاکستان میں ہوگا" بابا عصر نے نہایت اعتماد سے کہا "اور اب میں کہتا ہوں کہ اللہ نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنایا ہے تو تم اسے محاورے کے طور پر لیتے ہو مگر اس

وقت یہ لفظی ولغوی معنوں میں اسلام کا قلعہ ہوگا.... مسلمانوں کے مکمل تحفظ کی علامت۔"

میرا دل امید اور جوش سے بھر گیا "تو اب سب ٹھیک ہے..."

"نہیں۔ اندر مجھے سازشی لوگ بیٹھے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر جڑیں کاٹتے' سازشیں کرتے نظر آرہے ہیں۔ وہ ملک کو قرضے کی عدم ادائیگی اور مزید قرضوں اور امداد کے عوض بیچ دینا چاہتے ہیں۔ وہ وزیراعظم سے جڑے بیٹھے ہیں۔ وہ ناکام ہوں گے انشاء اللہ۔ لیکن قوم کے مصائب ضرور بڑھادیں گے۔ اب ہر دن ایمان کی آزمائش کا ہوگا۔ کم زور ایمان والوں کو ۹۹ء تک کا عرصہ بہت سخت لگے گا۔ کہیں کہیں ایمان بیچنے کی نوبت بھی آجائے گی۔ ہاں' ایمان والے اس سے آسانی سے گزر جائیں گے اور انشاء اللہ ۲۰۰۰ء سے سب ٹھیک ہونے لگے گا۔ اس وقت قوم کو چاہیے کہ دعا اور عمل دونوں میں کمی نہیں چھوڑے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ ملک انشاء اللہ سلامت رہے گا لیکن افراد کے لیے خطرۂ ایمان سخت ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ سعادت والے وقت میں مٹھی بھر اہلِ ایمان میں شامل ہونے کے لیے اچھے عمل کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے۔"

مجھے جھرجھری آگئی "اے اللہ.... تو مجھ کمزور کی مدد فرما کہ میں ایمان میں کمزور ہوں" میں نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

"میرا اس ملک کی عورتوں کے لیے ایک پیغام ہے" بابا عصر نے کہا "وہ بھول گئی ہیں کہ اللہ نے..... اسلام نے انہیں بڑا مقام دیا ہے' بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کے ذمے ایک بہت بڑا کام ہے۔ انہیں بیٹوں کو دودھ سے' ممتا بھری آغوش سے' اپنی محبت سے اللہ کا خوف' جذبۂ جہاد' سیرتِ رسول کریمؐ کے اتباع کا شوق اور دین کی محبت کی نہایت طاقتور تلقین سونپنی ہے۔ انہیں بیٹیوں کو نسلوں کی تربیت کرنے کی تربیت دینی ہے۔ مغرب کی تقلید میں وہ اپنے مقام اور اپنی اہمیت کو بھول بیٹھی ہیں۔ انہیں یاد نہیں رہا کہ وہ قوم کی اصل معمار ہیں۔ مومن اور مجاہد ماں کی گود میں بنتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی قوم کا حال سمجھنے کے لیے اس کے درمیان وقت گزارنے اور مشاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قوم کی ماؤں کو دیکھ لو۔ ان سے تمہیں قوم کا حال معلوم ہوجائے گا۔

"اور میں قوم کے جوانوں سے کہتا ہوں کہ مایوسی ذہنوں سے جھٹک دو۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے پاس بہت بڑی سعادت کے ایک عہد میں داخل ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔ سب کچھ بھول کر خود کو اس کے لیے تیار کرو۔ اپنے اندر جذبۂ جہاد ابھارو۔ جہاد بہت آسان ہے۔ چاہو تو اپنے ہر کام کو جہاد بنالو۔ گفتگو بھی جہاد ہوسکتی ہے' تمہارا ہر قدم جہاد ہوسکتا ہے۔ جسم کی ہر حرکت جہاد ہوسکتی ہے۔ اگر وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔ تم قلم سے جہاد کرو' سرنج سے جہاد کرو' ترازو سے جہاد کرو' کدال پھاوڑے سے جہاد کرو۔ جہاد کے لیے اسلحہ ضروری نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ رہتے ہوئے جہاد کرسکتا ہے۔ تمہارا قول وفعل' تمہارا ہر عمل اگر نفرت' تعصب' جہالت' غرض ہر برائی کے خاتمے کی نیت لیے ہوئے ہو تو نتائج سے قطع نظر تمہاری پوری زندگی کو انشاء اللہ مکمل جہاد کا درجہ حاصل ہوگا اور موت شہادت ہوگی۔ یاد رکھو' یہ دنیا اور اس کی تمام آسائشیں اور نعمتیں محض آزمائش کے لیے ہیں۔ یہاں سے تم صرف اپنے اعمال لے کر جاؤ گے' جن پر ابدی زندگی کا فیصلہ ہوگا۔ سو ابدی زندگی کی نعمتوں پر نظر رکھو اور اس کے عذاب سے... جہنم سے ڈرتے رہو۔ تم یہاں بھی سرخرو ہوگے اور آخرت میں بھی۔"

میں بابا عصر کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ گیا تھا۔

"آپ اتنا تیز کیوں چلتے ہیں؟" میں نے شکایتاً کہا۔

"ابھی تو مجھے اور تیز چلنا ہے۔ میرے ساتھ چلنا سیکھو" بابا عصر نے بے پروائی سے کہا "اب اشرفیوں کے سفر کا احوال سنو...."

○☆○

اس روز بابا عصر نے جو مجھے سفرنامے سنائے تھے' ان میں ایک مجھے بہت اچھا لگا۔ میرا جی چاہا کہ اسے لکھوں۔ میں اسے لکھنے کے لیے بیٹھا تو ہمیشہ کی طرح کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ میں ایک منظر میں تھا اور وہ منظر تحرک سے بھرپور تھا۔

میں لکھنے لگا....

○☆○

کبریٰ نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ لیکن دیکھنے میں وہ اس سے زیادہ کا لگتا تھا اور وہ اسے بمشکل واجبی شکل وصورت کا لگتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ گفتگو بھی وہ سڑک چھاپ کرتا تھا۔ رہنے کو اس کے پاس بھی ایک کچا مکان تھا۔ ہاں اس کے مکان سے بہتر تھا اور اس میں سامانِ ضرورت بھی اس کے اپنے گھر سے زیادہ تھا۔ بس ایک اچھی بات تھی.... وہ یہ کہ وہ برسرِروزگار تھا۔ ایک ٹیکسٹائل مل میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک لگی بندھی تنخواہ ہر مہینے گھر لاتا تھا۔

کبریٰ کی نگاہوں میں اپنی بیٹی صغریٰ کی صورت پھر گئی۔ صغریٰ کو اللہ نے ایسا حسن وجمال عطا کیا تھا کہ پیوند لگے معمولی کپڑوں میں بھی وہ بدلی سے جھانکتے چاند سے زیادہ حسین لگتی تھی مگر اس کا حسن کبریٰ کے لیے اور مصیبت بن گیا تھا۔ وہ تنہا عورت کیسے اس کی حفاظت کرسکتی تھی۔ لڑکی یتیم ہو' بے سہارا ہو اور پھر چندے آفتاب چندے ماہتاب بھی ہو تو اس سے شادی کون کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حق میں سب بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ بس موقع ملے اور چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ محض اسی وجہ سے کبریٰ نے امجد کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ورنہ وہ کسی طرح صغریٰ کے جوڑ کا نہیں تھا۔ مگر وہ صغریٰ سے شادی کرکے اسے عزت سے رکھ تو سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ پھر بھی کبریٰ تصور میں ان دونوں کو ساتھ دیکھتی تو اس کے دل پر گھونسا سا لگتا لیکن وہ یہ سوچ کر صبر کرلیتی کہ نصیب لکھنے والا جانے۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے چاچی؟"

کبریٰ کو امجد کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے پہلو بدلا پھر وہی سوال' سانپ کی طرح پھن کاڑھے آکھڑا ہوا تھا "کیا سوچوں؟ جو بس میں نہیں' اس کے لیے کیسے ہاں کردوں؟"

"سوچ لو چاچی!" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی "دیکھو نا' میں کہتا ہوں تم مجھے کچھ نہ دو' کچھ بھی نہیں۔ پر موٹر سائیکل میری ضرورت ہے اور میں نئی بھی نہیں مانگتا' پرانی ہی لادو۔"

"میرے بس میں ہوتا تو نئی دلا دیتی لیکن تو کہتا ہے کہ پرانی بھی تیس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔"

"ہاں چاچی۔ یوں تو دس میں بھی مل جائے پر میں دیکھنے کے لیے نہیں' آنے جانے کے لیے موٹر سائیکل چاہتا ہوں۔ اس پر آؤں جاؤں گا تو پیسے بچیں گے۔ گھر میں ہی کام آئیں گے۔"

"لیکن میں تیس ہزار کہاں سے لاؤں؟"

"تو بیٹی کی شادی ایسے ہی کردو گی؟" امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شادی میں روکڑا تو چاہیے ہوتا ہے چاچی۔ جس کے پاس نہیں ہوتا وہ بھی قرض ادھار کرلیتا ہے۔"

"مجھے کون قرض دے گا بیٹے!" کبریٰ نے لجاجت سے کہا۔

"دینے کے لیے تو سیکڑوں تیار ہوں گے' تم لینے والی تو بنو" امجد نے بے ہودگی سے کہا۔

کبریٰ کے دل پر چوٹ لگی۔ یہ بات امجد کئی بار کہہ چکا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس وقت اسے یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ صغریٰ چائے لے کر آگئی۔ کبریٰ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بات ٹل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات آگے بڑھی تو یہ رشتہ ہی ختم ہوجائے گا اور یہ وہ چاہتی نہیں تھی۔

صغریٰ نے چائے کی پیالی امجد کو دی جو اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھے جارہا تھا۔ صغریٰ نے ماں کو چائے کی پیالی تھمائی اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

امجد نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا "واہ بڑی گرم ہے.... بم ہے چاچی بم!"

کبریٰ جانتی تھی کہ امجد چائے پر تبصرہ نہیں کررہا ہے۔ وہ اس کی نظریں پہچانتی بھی تھی اور اسے بری بھی لگتی تھیں مگر مجبوری تھی۔ وہ اس کی آخری امید بھی تو تھا۔

"یہ صغریٰ جلدی بھاگ جاتی ہے چاچی۔ اسے کہو' کبھی بیٹھا کرے میرے پاس۔ باتیں کیا کرے اور تم بھی کبھی ادھر اُدھر ٹہل جایا کرو" امجد نے بدتمیزی سے کہا۔

"صبر کرلے بیٹا۔ بس پندرہ دن کی تو بات ہے۔ پھر وہ تیری ہی ہوجائے گی" یہ کہتے کہتے کبریٰ اداس ہوگئی۔

امجد پھر اسی ٹریک پر چلا گیا "دیکھو چاچی' میں کھلی بات کرتا ہوں۔ موٹر سائیکل کے بغیر میں شادی کرنے والا نہیں۔ تم کچھ بھی کرو' مجھے تیس ہزار کرکے دو۔"

کبریٰ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

امجد پیالی خالی کرکے اٹھ کھڑا ہوا "تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے چاچی!" اس نے کہا "سوچو اور فیصلہ کرو۔ میرے پاس ایک اچھا رشتہ ہے۔ وہ نئی موٹر سائیکل بھی دیں گے اور ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر بھی۔ لڑکی صغریٰ جیسی تو نہیں پر مجھے خوب صورتی کو چاٹنا ہے کیا" یہ کہہ کر وہ سلام کیے بغیر چلا گیا۔

کبریٰ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ اس نے اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ وہ تو بس یہ سوچے جارہی تھی کہ اس کے پاس پیٹ کاٹ کر بچائے ہوئے صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس نے سوچا تھا' اس میں سے کچھ برات کے کھانے میں خرچ کرے گی اور کچھ چیزیں لے آئے گی جہیز کے لیے۔ مگر یہ موٹر سائیکل!

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ صغریٰ اس کے پاس آکھڑی ہوئی ہے۔

"چائے ٹھنڈی ہوگئی اماں۔ لاؤ' گرم کرلاؤں۔"

کبریٰ نے چونک کر اسے دیکھا "رہنے دے۔ میں تو پیتی ہی ٹھنڈی کرکے ہوں۔"

صغریٰ وہیں بیٹھ گئی "اماں.... یہ امجد بھائی مجھے اچھے نہیں لگتے" وہ آہستہ سے بولی۔

"کوئی بات نہیں' شادی ہوگی تو اچھا لگنے لگے گا۔" کبریٰ نے کہا "اور دیکھ' شکل صورت اللہ بناتا ہے' اسے نہ برا کہتے ہیں' نہ سمجھتے ہیں۔"

"میں شکل صورت کو نہیں کہتی اماں۔ وہ مجھے بہت خراب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور اماں' میں بتادوں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

کبریٰ نے اسے بہت غور سے دیکھا "وہ جیسا بھی ہے' ہماری آخری امید ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اماں' تم مجھے بوجھ سمجھ کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو" صغریٰ نے شکایتاً کہا "اب میں میٹرک کرچکی ہوں۔ بوجھ نہیں ہوں' نوکری کرسکتی ہوں۔"

"میں تجھے کبھی نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ تجھے نہیں پتا' یہ دنیا بہت بری ہے..... خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کے لیے۔ اور یہ بھی نہیں کہ تو میرے لیے بوجھ ہے۔ بس شادی ضروری ہے۔ کسی کا نام جڑ جائے تو مضبوطی آجاتی ہے۔ ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اس کے بغیر لڑکی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے' جسے لوٹنے کے لیے سب دوڑ پڑتے ہیں۔"

"لیکن اماں' تم نے بھی تو بے سہارے زندگی گزار دی۔ خود کو بھی سنبھال کر رکھا اور مجھے بھی۔"

"اللہ کا آسرا تھا بیٹی۔ ورنہ جیسے گزری ہے' میرا دل ہی جانتا ہے" کبریٰ نے آہ بھر کے کہا "یہ دنیا بھوکے بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے اور ایسے بھی ہیں جو روپ بدل کر آتے ہیں۔ میں تو پل صراط سے گزری ہوں بیٹی۔ تجھے اس سے نہیں گزارنا چاہتی" پھر کبریٰ نے بیٹی کو اپنے چند ایسے واقعات سنائے' جو اس نے کسی کو نہیں سنائے تھے اور وہ صغریٰ کو تو مر کر بھی نہ سناتی مگر وہ اسے احساس

دلانا چاہتی تھی کہ امجد جیسا بھی ہے' اس کے لیے سائبان ہوگا۔ اس نے امجد کے لیے صغریٰ کی ناپسندیدگی بھانپ لی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی ازدواجی زندگی کا آغاز اس ناپسندیدگی کو ساتھ لے کر کرے۔ ایسے میں ساری زندگی روتے روتے ناخوش ہی گزر جاتی ہے۔ وہ بیٹی کو سمجھوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ زندگی میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور وہ ہنسی خوشی کرلیے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اس کا نتیجہ مثبت نکلا۔ صغریٰ سمجھ گئی کہ دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کبریٰ نے سکون کی سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی بیٹی امجد کو اپنا پسندیدہ مرد مان لے گی۔ اس کے سپنے دیکھنے لگے گی۔ اس کی آنکھوں میں تو ابھی سے سپنوں کے رنگ نظر آنے لگے تھے۔

مگر خود کبریٰ کے تصور میں موٹر سائیکل در آئی جو وہ امجد کو لے کر نہیں دے سکتی تھی۔ مگر امجد نے اس کی شرط لگادی تھی۔

صغریٰ نے جو ماں کا رنگ بدلتے دیکھا تو پریشان ہوگئی "کیا ہوگیا اماں؟"

کبریٰ نے اسے سب کچھ بتادیا۔ وہ سن کر صغریٰ پریشان ہوئی۔ کبریٰ نے سمجھ لیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ بیٹی نے اپنی سوچ بدل لی ہے اور ذہنی طور پر امجد کو قبول کرلیا ہے۔ اسے افسوس ہوا کہ تبدیلی کے ساتھ ہی اسے عدم تحفظ کا احساس بھی ملا۔

"تو اب کیا ہوگا اماں؟" صغریٰ کے لہجے میں خوف تھا۔ ماں کے سنائے ہوئے واقعات نے اسے ڈرادیا تھا۔ اب وہ بے سہارا نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"اللہ سب سے اعلیٰ سبب ہے۔ کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔" کبریٰ نے اسے دلاسا دیا۔

"اور جو نہ ہوا تو؟"

"ایک بات کہوں۔" کبریٰ نے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تو اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ امجد کے سامنے بھی کم ہی آتی ہے۔ ذرا خود کو بدل کے تو دیکھ۔ اس کے پاس بیٹھ۔ محبت سے بات کر۔ پیار سے سمجھا تو وہ مان بھی جائے گا۔ تیری بات تو کوئی مرد ٹال ہی نہیں سکتا۔ اتنی پیاری ہے تو" یہ کہتے کہتے کبریٰ کو بے غیرتی کا احساس ستانے لگا۔ امجد کی نظربازی سے وہ بے خبر تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے اس احساس کو دبالیا۔ اس پر ضرورت اور مصلحت کا پردہ ڈال دیا۔

"اچھا اماں' کوشش کروں گی" صغریٰ نے آہستہ سے کہا۔ اب وہ اس بات کی اہمیت کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب امجد کو نظرانداز نہیں کرے گی۔

"شاباش بیٹی!" کبریٰ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد صغریٰ نے کہا "اماں..... کاکا کے ہاں سے مونگ کی دال لے آؤ۔ چینی بھی ختم ہونے والی ہے۔"

"اچھا بیٹی!"

○☆○

وہ محلے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ کاکا زبان کا میٹھا اور دل کا اس سے بھی اچھا تھا۔ تمام وقت دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی کوشش میں گھلتا رہتا تھا۔ اور دکھ درد بہت تھے۔ اس لیے کہ اس کی دکان اس محلے کا..... اس کے اپنے گھر کا ایک حصہ تھی۔ سو محلے کے دکھ درد سے کون بے خبر رہ سکتا ہے۔

دکان کافی چلتی تھی۔ اللہ کی رحمت تھی اس پر۔ دوسرے محلوں کے لوگ بھی اس کے پاس سودا لینے آتے تھے۔ کچھ اس میں اس کی نیکی اور ایمان داری کا بھی دخل تھا۔ وہ تول کا سچا تھا۔ کبھی ڈنڈی نہیں مارتا تھا۔ پھر اس دور میں بھی وہ سچ مچ آٹے میں نمک کے برابر منافع لیتا تھا اور نمک وہ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے بہت کم کھاتا تھا۔ اس لیے اس کا منافع اور کم ہوجاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ آدمی کے اپنے دکھ درد کم نہیں ہوتے۔ ایسے میں وہ دوسروں کے دکھ اور تکلیفیں بھی محسوس کرنے لگے تو بلڈ پریشر تو ہائی ہوتا ہی ہے۔ مختصر یہ کہ علاقے میں وہ ایسی دکان تھی' جہاں ہر چیز دوسری دکانوں سے سستی ملتی تھی' ایسے میں دکان داری تو بڑھتی ہی ہے۔

لیکن اتنی دکان داری کے باوجود کاکا کا ہاتھ تنگ ہی رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہر ایک کو ادھار نہیں دیتا تھا مگر جن کے حالات سے وہ واقف تھا' ان سے تو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اور آڑا وقت تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی وہ منع نہیں کرسکتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اسے قرض وصول کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے تو یاددہانی بھی آسان نہیں تھی' اصرار تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بے مروتی اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔

کاکا خوش قسمت بھی تھا۔ اللہ نے اسے تین سعادت مند بیٹے دیے تھے اور وہ تینوں برسرروزگار تھے۔ پھر کاکا طبعاً درویش تھا۔ اس کا اپنا کوئی خرچ تھا ہی نہیں۔ چائے' پان سگریٹ سے وہ بے نیاز تھا۔ تین وقت کی روٹی گھر سے مل جاتی تھی۔ کپڑوں سے اسے غرض نہیں تھی۔ عید بقرعید پر بیٹے زبردستی کپڑے بنادیتے تھے۔ ورنہ اسے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس کے باوجود اکثر مہینے میں ایک دوبار اسے بیٹوں سے مدد لینی پڑجاتی تھی۔ وجہ سادہ سی تھی۔ آٹے میں ہائی بلڈ پریشر کے مریض کی ضرورت جتنے نمک کا منافع تو ادھار کھانے والوں کی نذر ہوجاتا تھا۔ اس کے علاوہ اصل رقم کا کچھ حصہ بھی ہر ماہ پھنس جاتا تھا اور جن سے وہ ہول سیل پر مال لیتا تھا' وہ ایک خاص مدت بعد تقاضا کرنے لگتے تھے۔ ان کا حساب صاف نہ کرتا تو مال ملنا بند ہوجاتا۔ ایسے میں بیٹے ہی اس کی مدد کرتے۔ وہ نہ ہوتے تو دکان بہت پہلے بند ہوچکی ہوتی۔

کاکا ایک ایسا خوش نصیب انسان تھا' جس کی اپنی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ مگر وہ دوسروں سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ وہ دوسروں کی پریشانیوں کا خیال کرکے بھی پریشان ہوتا اور پھر انہیں ادھار دے کر خود بھی پریشان ہوجاتا۔

اس وقت بھی کاکا پریشان تھا۔ صابن کی گاڑی والا کہہ کر گیا تھا کہ کل اسے ہر حال میں پیسے چاہئیں۔ گویا اب پھر کسی بیٹے سے مدد مانگنی تھی۔

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فواز رزاق
جاسوسی نشست +92 3331784111

اچانک اسے کبریٰ دکان کی طرف آتی دکھائی دی۔ کبریٰ پر اسے بڑا پیار آتا تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بیوہ بھی ہوئی اور بیٹی کی ماں بھی بنی۔ اور اب اس کی بیٹی بھی بیس سال کی ہوگئی تھی۔ کاکا نے کبریٰ کا حسن و جمال بھی دیکھا تھا۔ وہ لاکھوں میں نہیں' کروڑوں میں ایک تھی۔ اس حسن پر مستزاد بھری جوانی۔ ایسے میں بیوگی کے بیس بے داغ سال گزارنا بہت بڑا جہاد تھا جو کبریٰ نے کیا تھا۔ کیسی کیسی آزمائشوں سے گزری تھی وہ۔ کیسی کیسی ترغیب سے بچی تھی' کاکا خود اس کا گواہ تھا۔ وہ تو اب بھی ایسی تھی کہ مرد اسے دیکھ کر آہیں بھرنے لگیں۔ مگر اس نے خود کو پتھر کرلیا تھا۔ اسی لیے کاکا پیار سے زیادہ اس کا احترام کرتا تھا۔

کبریٰ نے آکر اسے سلام کیا اور بولی "کاکا... آدھا کلو مونگ کی دال دے دو۔"

کاکا دال تولنے لگا "بیٹی... صابن بھی لے جا پھر پتا نہیں' دکان پر رہے نہ رہے" وہ بولا۔ اسے پریشانی تھی کہ وہ کل صابن والے کو پیسے نہیں دے سکے گا۔

کبریٰ بھی ناتجربہ کار نہیں تھی۔ اس بات کا مطلب سمجھتی تھی۔

"کاکا... میرا حساب تو کافی لمبا ہوگیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں" کاکا نے جلدی سے کہا۔

"پھر بھی بتا تو دو۔"

"سات سو سے کم ہی ہے" کاکا نے کہا پھر پوچھا "صغریٰ کی شادی کب کر رہی ہے تو؟"

"عید کے دوسرے دن کا ارادہ ہے۔ دعا کرو کاکا' اللہ نصیب اچھے کرے میری بچی کے۔"

"دعا تو کر ہی رہا ہوں' فکر بھی کرتا ہوں بیٹی۔ دیکھ کوئی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا' سب سے پہلے مجھے بتانا۔"

کبریٰ شرمندہ ہوئی... اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تم اتنے اچھے ہو کاکا۔ اور میں اتنی بری ہوں کہ پیسے ہوتے ہوئے بھی تمہارا حساب صاف نہیں کر رہی ہوں۔"

"تو میں نے تجھ سے تقاضا تو نہیں کیا" کاکا بولا "کیا میں سمجھتا نہیں ہوں' شادی کے گھر میں تو لاکھ بھی ہو تو کم ہے۔ لے یہ صابن بھی لے جا۔"

کبریٰ کاکا کی دکان سے اپنے گھر تک روتی ہوئی آئی...

○☆○

انتظار کا وقت قریب تھا۔ صغریٰ پریشان تھی کہ اماں ابھی تک پھل لے کر نہیں آئی۔ پھر اسے امجد کا خیال آیا اور اس کا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ واجبی سے بھی کم شکل صورت کا امجد اس کے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کرگیا تھا۔ اور یہ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں کہ آج وہ اس کے قریب بیٹھے گی۔

دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اماں کے چہرے پر ایسی خوشی اور آنکھوں میں ایسی چمک اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے غور سے اماں کے ہاتھوں کو دیکھا اور مایوس ہوگئی۔ اماں پھل نہیں لائی تھی۔ مگر اس کی مٹھی بند تھی "اماں... پھل نہیں لائیں؟"

"لوٹ پڑی ہوئی ہے بیٹی۔ پھل بہت مہنگا ہے۔ چھوڑ... ہم پکوڑوں سے افطار کرلیں گے۔"

صغریٰ نے مزید شکوہ نہیں کیا۔ اس سب کی وہ بچپن سے عادی تھی۔ پتا نہیں کیوں' جو چیز بھی اچھی لگے' وہ مہنگی ہی ہوتی ہے۔ اس نے سوچا' مگر فوراً ہی اس سوچ کو جھٹک دیا "پر اماں' پھل مہنگے ہونے پر تم اتنی خوش کیوں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں پگلی!" کبریٰ نے کہا اور بند مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

صغریٰ سانس لینا بھی بھول گئی۔ وہ مبہوت ہو کر ان اشرفیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جھپٹ کر ماں کی ہتھیلی پر سے انہیں اٹھایا اور بولی "اللہ... کتنی حسین ہیں یہ۔ یہ کیا چیز ہے اماں؟"

"ظاہر میں تو اشرفیاں ہیں لیکن اصل میں اللہ کی رحمت اور خیر و برکت ہیں۔ ہم بے حیثیت لوگوں کو عزت اور اعتبار ملتا ہے ان سے۔"

صغریٰ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اشرفیوں پر ایک طرف اللہ اور دوسری طرف کلمہ لکھا تھا "یہ تو بہت... بہت زیادہ قیمتی ہیں اماں!" وہ بولی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "اماں... ان کے بندے بن جائیں تو مجھ پر کیسے لگیں گے؟"

"نہیں بیٹی۔ ایسا سوچنا بھی نہیں" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "یہ تو امانت ہیں۔"

"تمہیں ملیں کہاں سے؟"

"میں بازار سے آرہی تھی کہ ایک شخص نے مجھے روک کر یہ تھمائیں اور بولا..." کبریٰ اس شخص کی باتیں من و عن دہراتی رہی۔ صغریٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات" کبریٰ کے خاموش ہونے پر صغریٰ نے کہا "پاکستان کی خوش حالی اور استحکام سے ان کا کیا واسطہ...؟"

"اللہ کی باتیں ایسی آسانی سے کب سمجھ میں آتی ہیں۔ اپنے بھید وہی جانے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ قرآن پاک ہدایت نامہ ہے۔ کروڑوں انسان اسے پڑھتے ہیں لیکن سمجھ میں کتنوں کی آتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی نہیں' بس ماننے اور عمل کرنے کی ہے۔"

"لیکن اماں' یہ بہت قیمتی ہیں۔ موٹر سائیکل کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ بہت سارے پیسے مل سکتے ہیں ہمیں۔"

"جہنم میں گئی موٹر سائیکل" کبریٰ کو طرارہ آگیا "ان کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

صغریٰ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ اس نے کبھی اس سے اتنی سختی سے بات نہیں کی تھی "اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہو اماں۔ میں دونوں کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں مگر دینے والے نے کہا تھا کہ تم

چاہو تو ان میں سے ایک رکھ سکتی ہو اور اس ایک سے ہمارے سب دلدر دور ہو سکتے ہیں۔"

"مگر میں یہ بھی نہیں رکھوں گی۔ جسے دوں گی' دونوں ہی دوں گی۔ اس کا ایمان کیوں خطرے میں ڈالوں۔"

"یہ تو زبردستی کی بات ہے اماں!" صغریٰ نے منہ پھلا کر کہا۔

"دیکھ بیٹی۔ دینے والے نے مجھ سے کہا' چاہو تو ایک تم رکھ لینا۔ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ ایک تمہاری ہے۔ مگر اس نے نہیں کہا۔ کہتا تو میں رکھ لیتی۔ لیکن اس نے مجھے بس اختیار دیا.... چاہو تو...."

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"دیکھ۔ اسے بھی کسی نے یہی کہہ کر دونوں اشرفیاں دی ہوں گی۔ اس بھلے آدمی نے بھی ایک اپنے لیے نہیں رکھی۔ دونوں میری طرف بڑھادیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کہاں سے یونہی چلا آرہا ہوگا۔ میں کیوں اس کے خلاف کروں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ ہم اتنے غریب ہیں...."

"لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عزت سے جی رہے ہیں۔ کبھی ایک وقت کا فاقہ بھی نہیں ہوا" کبریٰ نے تیز لہجے میں کہا پھر نرمی سے بیٹی کو سمجھایا "بیٹی پاکستان ہے تو سب کچھ ہے۔ پاکستان کا فائدہ ہم سب کا فائدہ۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی۔ اس کی برکت ہماری برکت۔ ہم لالچ میں پڑ کر اپنے چھوٹے سے فائدے کے لیے پاکستان کا بڑا نقصان کیوں کریں جو کروڑوں پاکستانیوں کا نقصان ہوگا۔ پھر دینے والے نے کہا کہ یہ اپنی منزل پر پہنچ کر دین اسلام کی سربلندی لائیں گی۔ تو میں دین کا کام بھی خراب کروں۔ تو غور سے اللہ کا نام اور یہ کلمہ دیکھ۔ یہ حرف تجھے کچھ کہتے محسوس نہیں ہوتے۔ مجھ سے تو یہ صاف کہہ رہے تھے.... تم کمزور نہ پڑنا کبریٰ.... ورنہ بہت نقصان ہوگا۔"

صغریٰ کچھ کچھ قائل ہوگئی تھی۔ اس نے اللہ کے نام اور کلمے کو غور سے دیکھا۔ انہوں نے اس سے کچھ کہا تو نہیں لیکن انہیں نظریں جما کر دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ پوری طرح قائل نہ ہونے کے باوجود اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو اماں!" یہ کہہ کر اس نے اشرفیاں ماں کو دے دیں۔

اسی لمحے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ افطار کا وقت ہوگیا تھا۔

○☆○

دونوں ماں بیٹی کمرے میں تھیں۔ کبریٰ نے کہا "بیٹی' امجد آئے تو اس کے پاس بیٹھ کر طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ تو ہی اسے سمجھا سکتی ہے۔ میرا پوچھے تو کہہ دینا نماز پڑھ رہی ہیں۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ لپک کر گئی۔ کبریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سانسیں بھی دعا بن گئیں۔

صغریٰ نے امجد کو صحن میں چارپائی پر بٹھایا اور خود ذرا فاصلے سے بیٹھ گئی "اماں تو نماز پڑھ رہی ہیں" وہ بولی۔

امجد بڑی خباثت سے مسکرایا "آج پہلی بار میں صحیح وقت پر آیا ہوں" پھر اس نے بہت غور سے صغریٰ کو دیکھا اور شک آمیز لہجے میں بولا "پہلے تو' تو جھلکی بھی نہیں مارتی تھی۔ آج بڑی مہربان ہو رہی ہے' خیر تو ہے؟"

"اماں ہوتی تھیں نا اور مجھے شرم بھی آتی ہے۔"

امجد اسے غور سے دیکھتا رہا "ویسے تو ہے بڑی بم چیز۔ میں کیا ہوں' تجھے دیکھ کر تو فرشتوں کے دل بے ایمان ہو جائیں۔"

صغریٰ کو وہ تعریف بہت بری لگی مگر اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھوتا کرنا سیکھ رہی تھی۔

"ذرا قریب تو آ۔ اتنی دور کیوں بیٹھی ہے؟" امجد نے فرمائش کی۔

صغریٰ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے قریب ہوگئی۔

امجد نے صغریٰ کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگا۔ صغریٰ کو وہ لمس بہت برا لگا لیکن اسے ڈر تھا کہ وہ کچھ کہے گی تو امجد ناراض ہو جائے گا اور اماں کا کہنا تھا کہ وہ ان کی آخری امید ہے۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے تو اس کو موٹر سائیکل سے دستبردار ہونے پر رضامند کرنا تھا۔

ادھر کمرے میں کبریٰ ان کی آوازوں پر کان لگائے تھی۔ اس کی دروازے پر آکر انہیں دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

صغریٰ اپنے خیالوں سے چونکی۔ امجد کا ہاتھ حرکت کرتے کرتے اس کے ہاتھ سے گزر کر بازو تک پہنچ چکا تھا اور اب کندھے پر پہنچنے والا تھا۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ "یہ.... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

اتنی دیر میں امجد اس کے کندھے پکڑ چکا تھا۔ اس نے کھینچ کر صغریٰ کو سینے سے لگانے کی کوشش کی "کیوں.... تم پر میرا اتنا حق بھی نہیں" اس نے بدمعاشی سے کہا۔

"شادی سے پہلے تو یہ حق نہیں ہوتا" صغریٰ نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی "بے صبرے نہ بنو۔"

"میں اس لیے بے صبرا بن رہا ہوں کہ شادی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں' سب سمجھتا ہوں۔ چاچی نے تجھے اس لیے میرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو مجھے لبھا کر موٹر سائیکل کا خیال دل سے نکالنے پر راضی کرے۔ پر ایسا ہوگا نہیں۔ میں موٹر سائیکل کے بغیر نہیں مانوں گا" اور امجد کے جبر میں اور شدت آگئی۔

کبریٰ نے دروازے سے یہ سب دیکھا اور تڑپ کر باہر نکل آئی "بیٹی.... تو جا کر چائے بنا" اس نے نرم لہجے میں صغریٰ سے کہا۔ صغریٰ کے جانے کے بعد وہ امجد کے سامنے بیٹھ گئی "تو

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فواز رزاق
جاسوسی ڈائجسٹ 111 3331784111 92+

ضد چھوڑ دے امجد۔ دیکھ' وہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تیری ضد کیسے پوری کروں؟"

"یہ ضد میں نہیں چھوڑوں گا کیونکہ تم پوری کر سکتی ہو۔"

"کیسے؟ میں سچ کہہ رہی ہوں...."

"وہ رمضان تم پر مرتا ہے۔ تمہاری ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ تم اس سے شادی کرلو۔ صغریٰ کے جانے کے بعد اکیلی بھی نہیں رہو گی اور مجھے بھی موٹر سائیکل مل جائے گی۔"

"وہ اڈا چلانے والا رمضان...؟" کبریٰ نے حقارت سے کہا۔

"وہ اس کا کاروبار ہے اور شادی کوئی بری بات نہیں۔"

"لعنت ہو ایسے کاروبار پر..... اور ایسی شادی پر۔ پہلے جو تین کی تھیں اس نے' ان کا کیا ہوا۔ انہیں بھی کاروبار میں جھونک دیا بدبخت نے۔ میں اس سے شادی کرلوں۔"

"نہ کرو۔ تمہاری مرضی' کرلو تو دھن میں کھیلو گی۔ نہیں کرو گی تو بیٹی کا بوجھ بھی لیے بیٹھی رہو گی۔"

"مجھے شادی کرنی ہوتی تو پہلے ہی کرلیتی جب جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی" کبریٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جوان تم اب بھی ہو..... اور خوب صورتی میں تو صغریٰ سے بھی آگے ہو چاچی" امجد نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے ایسے بات مت کر۔ دیکھ مان جا' میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" کبریٰ کو خیال ہی نہیں رہا کہ اشرفیاں اس کی مٹھی میں دبی ہیں۔ اشرفیاں نیچے گریں۔ اس نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا لیکن امجد انہیں دیکھ چکا تھا۔ "یہ..... یہ کیا ہیں؟"

کبریٰ کو کہانی پھر دہرانی پڑی "یہ تو بیڑا پار کر سکتی ہیں اپنا" امجد نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ امانت ہیں' میری نہیں" کبریٰ نے اسے سمجھایا لیکن اسے سمجھانا صغریٰ کے مقابلے میں بہت بڑا کام تھا اور ناممکن بھی.... وہ بھی دلیل دے رہا تھا کہ ایک تو اس کی اپنی ہے اور وہ اسے قائل بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"اس کے زور پر تو تم مجھے کار بھی دلا سکتی ہو چاچی!"

"میں نے کہا نا' یہ میری نہیں۔"

امجد نے مسئلے کا آسان حل ڈھونڈ نکالا "چلو.... ایسا کرو چاچی۔ یہ مجھے دے دو۔ پھر میں کچھ بھی نہیں مانگوں گا اور صغریٰ سے شادی بھی کرلوں گا۔"

"یہ میں تمہیں نہیں دے سکتی۔"

"کیوں نہیں دے سکتیں" امجد نے حیرت سے کہا "تمہیں آگے تو بڑھانی ہی ہیں۔ مجھے دے دو۔ تمہیں موٹر سائیکل کی فکر سے نجات بھی مل جائے گی اور بیٹی کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

"یہ کسی نیک اور ایمان دار آدمی کو دینی ہیں۔"

"تمہارے داماد سے بڑھ کر نیک اور ایمان دار کون ہو گا" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"نہیں۔ یہ میں تجھے نہیں دے سکتی..... نہ ہی دوں گی" کبریٰ کے لہجے میں جانے کیسے قطعیت آگئی۔

امجد اٹھ کھڑا ہوا "بس تو شادی کی بات ختم سمجھو۔"

"ٹھیک ہے' اللہ کی مرضی!" کبریٰ نے آہ بھر کر کہا اور آسمان کو تکنے لگی۔

جاتا ہوا امجد دروازے پر رکا "تم مجھے موٹر سائیکل دے سکتی تھیں۔ ایک اور بھی صورت تھی تمہاری شادی کے سوا" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "صغریٰ کو تو صرف ایک رات میں نئی موٹر سائیکل بھی مل سکتی تھی اور میں اسے پھر بھی قبول کرلیتا۔ ایک رات سے فرق کیا پڑتا ہے۔"

کبریٰ کا ضبط جواب دے گیا "چلا جا بے غیرت!" وہ چلائی۔

"جا رہا ہوں مگر حسین بیٹی وبال بنے گی' عزت لٹے گی تو میں تمہیں یاد آؤں گا" یہ کہہ کر امجد چلا گیا۔

کچن کے دروازے پر کھڑی صغریٰ کے دل میں اس کی آخری بات کھب گئی۔ وہ وبال بنے گی..... اس کی عزت لٹے گی! یہ اماں نے کیا کیا؟

○☆○

وہ بڑی سوگوار رات تھی!

دونوں ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکیں۔ اپنے اپنے پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ مگر انہوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ بیٹی کو حجاب روکتا تھا اور ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

لیکن سحری کے بعد صغریٰ سے نہ رہا گیا "اماں' تم نے برا کیا" اس نے آہستہ سے کہا "اشرفیاں انہیں دے دیتیں۔"

"ایسے ذلیل' نیچ بدکار کے ہاتھ میں وہ پاک امانت دے دیتی" کبریٰ بھڑک گئی۔

"وہ بے ایمان ہوتے تو اشرفیاں تمہارے پاس واپس آجاتیں' نقصان کیا تھا اس میں۔"

"جانتے بوجھتے غلط آدمی کو امانت سونپنے کی گناہ گار بن جاتی۔ اپنی غرض کے لیے وہ ایک بے ایمان آدمی کو دے دیتی... یہ سوچ کر انہیں واپس تو آنا ہی ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہوتی۔ میں خود بھی بے ایمان ہو جاتی۔ سعادت سے محروم ہو جاتی۔ پھر تو وہ اشرفیاں میرے پاس بھی نہیں ٹھہرتیں۔"

"لیکن اماں' اب کیا ہو گا؟"

"تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا ٹھیک ہو جائے گا اماں۔ تمہی تو کہتی تھیں کہ وہ ہماری آخری امید ہے۔"

"غلط کہتی تھی میں۔ امید تو بس اللہ سے رکھنی چاہیے۔ اسی کے سہارے تو بیوگی کے بیس سال گزارے ہیں میں نے۔"

"مگر اماں' میرا کیا ہو گا۔ تم نے تو ڈرا دیا ہے مجھے۔"

"سب بھول جا۔ آدمی آدمی سے لو لگائے گا تو ڈرے گا ہی۔ اللہ سے لو لگالے تو کوئی ڈر نہیں رہتا۔ میں تو نڈر ہو گئی' تو بھی ہو جا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"لیکن اماں' امجد بھائی مجھے تحفظ دے سکتے تھے۔"

"وہ صرف رب دے سکتا ہے اور اس لنگڑے کو بھائی نہ کہنا کبھی۔ یاد نہیں' اس بے غیرت نے کیا کہا تھا۔"

صغریٰ کو یاد آیا تو اس کا دل برا ہوگیا۔ امجد واقعی بے غیرت تھا۔ وہ تو بعد میں بھی اسے بچاتا رہتا۔ اچھا تو وہ صغریٰ کو لگتا ہی نہیں تھا۔ مگر اب تو اس سے نفرت محسوس ہونے لگی "ٹھیک ہے اماں' وہ واقعی برا تھا..... لیکن..."

"سن..... جو ہونا ہے' ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ تو بھی میری طرح کی زندگی گزارے گی۔ پر زندگی تو گزر ہی جاتی ہے بیٹی۔ نہ گھبرا۔ آخرت میں بڑا اجر ملے گا انشاء اللہ۔"

اور نہ جانے کیسے صغریٰ کو قرار آگیا۔ چند لمحے بعد اس نے پوچھا "اور اشرفیوں کا کیا کروگی اماں؟"

"ان کا بھی سوچ لیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

○☆○

کاکا نے اشرفیوں کو عقیدت سے دیکھا' چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ کبریٰ کی پوری بات سننے کے بعد کہا "تجھے اللہ نے بڑائی دی ہے بیٹی۔ تو فکر نہ کر۔ میں انہیں ایک ایسے شخص کو سونپوں گا کہ ان کے تو انشاء اللہ پر لگ جائیں گے۔ بہت تیز سفر کریں گی یہ۔"

"شکریہ کاکا۔ تم نے میرا بوجھ ہلکا کردیا۔"

"شکریہ کیسا بیٹی۔ تو نے اپنا فرض پورا کیا۔ میں اپنا کروں گا" کاکا کہتے کہتے رکا اور پھر جھجک جھجک کر بولا "ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانے گی؟ تو میرے ادھار کو اب بھول ہی جا۔"

"نہیں کاکا۔ تم مجھے اس کا صلہ دے رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں۔ تو نے مجھے سعادت دلوا کر احسان کیا ہے۔"

"کیسا احسان کاکا!" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگایا "یہ تو اللہ کی دین ہے..... میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی" پھر اس نے پلو سے کھول کر ہزار کا نوٹ کاکا کی طرف بڑھایا "پچھلے حساب صاف کرکے باقی پیشگی رکھ لو" کاکا کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اس نے وضاحت کی "کہا تھا نا کہ پیسے ہوتے ہوئے نہیں دے رہی ہوں۔ دس ہزار روپے صغریٰ کی شادی کے لیے رکھے تھے۔"

"تو...؟"

"اللہ کا حکم نہیں ہے تو پھر قرض کیوں نہ اتار دوں۔ جب وہ چاہے گا' بہتری کردے گا" یہ کہہ کر کبریٰ تیزی سے چل دی۔ ورنہ مزید وضاحت کرنی پڑتی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ ایک عجیب سی بے فکری اس پر طاری ہوگئی تھی اور اپنا آپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چلتے چلتے اس کے ذہن میں عجیب سوچ ابھری اور اس نے فیصلہ بھی کرلیا۔ آج وہ مرغی پکوائے گی۔ پھل خریدے گی' چاہے کتنے ہی مہنگے ہوں۔ صغریٰ خوش ہوگی اور یہی نہیں' وہ عید کی خریداری بھی ڈھنگ سے کرے گی۔ عید کے دن بھی اچھا کھانا پکے گا اس کے گھر میں...

○☆○

عید کے روز پڑوسن رشیدہ ملنے آئی۔ وہ رشتے کراتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے کبریٰ سے پوچھا "صغریٰ کو کب نمٹا رہی ہو' عید کے دسویں دن نا..؟"

"نہیں۔ وہ بات ہی ختم ہوگئی" کبریٰ نے کہا لیکن رشیدہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ مچلتی دیکھ کر اسے غصہ آگیا "میری بیٹی کا رشتہ ٹوٹنے پر تمہیں خوشی ہورہی ہے؟"

"بات ہی خوشی کی ہے" رشیدہ نے ڈھٹائی سے کہا پھر کبریٰ کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "اب تمہاری بیٹی کا ایسا رشتہ کراؤں گی کہ تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔"

"سچ؟" کبریٰ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سامنے والی پکی بستی میں شیخ صاحب رہتے ہیں۔ بہت بڑا بنگلا ہے ان کا۔ کئی تو کارخانے ہیں۔ انہوں نے تمہاری صغریٰ کو دیکھا اور اس پر ریجھ گئے۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔ خوب صورت' پڑھا لکھا' کوئی کمی نہیں۔ مجھ سے بات کی' میرے منہ سے نکل گیا کہ اس کی تو بات پکی ہوچکی ہے۔ اب شادی ہونے والی ہے۔ سچی بات ہے بہن' میں کہہ کر پچھتائی۔ وہ ایک دم بجھ گئے۔ میں نے کہا بھی کہ پھر بھی کوشش کرتی ہوں۔ بولے نہیں' میں پیسے کے زور پر کسی کی خوشی خراب نہیں کرسکتا۔ رہنے دو' ہمارے نصیب میں نہیں۔ پر بچی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔"

"بہت ہی نیک آدمی ہوں گے" کبریٰ نے کہا۔

"پنج وقتہ نمازی ہیں۔ پانچ سال پہلے بیوی فوت ہوگئی تھی پھر شادی نہیں کی۔"

"تو اب...؟"

"آج ہی جاکر انہیں بتاؤں گی' کل انہیں لے آؤں گی۔ مگر مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آج ہی دوڑے آئیں گے" رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رکو تو سہی۔ منہ تو میٹھا کرلو۔ کل رات مٹھائی لائی تھی میں۔"

"منہ تو ضرور میٹھا کروں گی مگر رکوں گی نہیں۔ میں تو ابھی جاؤں گی شیخ صاحب کے پاس۔"

○☆○

وہ عید کا دن سب سے بڑی خوشی کا دن بن گیا!

لیکن کبریٰ مخمصے میں تھی۔ اتنے بڑے لوگ! اسے رہ رہ کر فکر ستاتی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔ لڑکے میں کوئی نقص نہ ہو۔ پیسے والے ہیں تو میری بچی کو حقیر نہ سمجھیں ساری زندگی۔ آخر انہیں ہم غریب کیسے بھاگئے۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

مگر پھر اس کے اندر ایک آواز ابھری' اللہ کی عنایت صاف شفاف اور بے داغ ہوتی ہے' اور اس کے دل کو قرار آگیا۔

شیخ صاحب شام کو ہی آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی کبریٰ کے سب واہمے دور ہوگئے۔ شیخ صاحب کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ خوبرو'

خوش گفتار' ایسے داماد کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے دل سے صدائے شکر بلند ہوئی۔

"میں ذیشان کو بھی ساتھ لے آیا تاکہ تم بھی اسے دیکھ لو۔ ممکن ہے' تمہیں بعد میں پسند نہ آئے" شیخ صاحب نے کہا۔

"یہ تو لاکھوں میں ایک ہیں جناب!" کبریٰ نے عاجزی سے کہا۔

"برا نہ مانو تو بیٹی صغریٰ کو بھی بلا لو بہن۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ زندگی تو انہیں گزارنی ہے۔"

وہ دونوں ساتھ کھڑے ہوئے تو چاند سورج کی جوڑی بن گئی۔

"دیکھو بہن' تمہاری بیٹی اتنی انمول ہے اور میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے اس بیٹی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ میں عید کے دسویں دن مختصر سی برات لاؤں گا۔ منظور ہے؟"

"جی شیخ....."

"بھائی صاحب کہو نا' میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔"

"جی بھائی صاحب' مجھے منظور ہے" کبریٰ نے دل میں کہا.... دل و جان سے۔

"بس تو بات پکی ہو گئی۔ ذیشان' لو بیٹے... صغریٰ بیٹی کو یہ انگوٹھی پہنا دو" شیخ صاحب نے بیٹے کی طرف مخملی کیس بڑھایا۔

اور وہ انگوٹھی ایسی حسین تھی کہ اسے دیکھ کر کبریٰ کو متبرک اشرفیاں یاد آ گئیں۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

جاتے جاتے شیخ صاحب نے بے حد عاجزی سے کہا "میں تم سے کچھ اور بھی مانگنا چاہتا ہوں بہن!"

کبریٰ نے حیرت سے انہیں دیکھا "جی.... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"جو دے سکتی ہو' وہ مانگوں گا۔ بس مایوس نہ کرنا۔ دیکھو میں نے تمہیں بہن کہا اور خود کو تمہارا بھائی سمجھ لیا۔ صغریٰ کی رخصتی کے بعد تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور پھر ذیشان کی ماں کے بعد میرا گھر بھی سونا اور بد نظمی کا شکار ہے۔ کوئی خیال رکھنے والا.... انتظام کرنے والا نہیں۔ میری بہن' تم اسے سنبھال سکتی ہو۔ صغریٰ تو بہت چھوٹی ہے۔"

"لیکن بھائی صاحب...."

"بھائی صاحب کہتی ہو تو بات بھی مانو گی' ٹھیک ہے نا۔"

کبریٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ آپ جب مجھے لینے آئیں گے' میں آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔"

"جیتی رہو بہن!" شیخ صاحب نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ کبریٰ ہی نہیں' صغریٰ بھی حیران تھی۔ چند گھنٹوں میں ایسی کایا پلٹ بھی ہو سکتی ہے؟ نئی' خوب صورت' بابرکت اور خوش حال زندگی ان کے لیے اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔

○☆○

میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد دیر تک ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اللہ کی رحمت' تائید اور خیر و برکت کیسی ہوتی ہے' یہ میں دیکھ چکا تھا لیکن اس واقعے نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ کوئی ایسے مہربان' رحم والے اور کریم رب کا شکر ادا کر سکتا ہے؟

پھر میرے ذہن میں اس سوال کا جواب ابھرا "کیوں نہیں' کر سکتا ہے لیکن شکر کا حق کوئی ادا نہیں کر سکتا۔"

○☆○

وہ ۳۰ جون ۹۸ء کی رات تھی۔ مجھے بابا عمر سے ملتے ہوئے تقریباً ڈھائی سال ہو چکے تھے۔ اس رات میں نے بابا عمر کے چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جو میرے لیے بالکل نئی چیز تھی "آج آپ بہت خوش ہیں بابا!" میں نے ان سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج کام کا..... کہانی کا ایک مرحلہ مکمل ہو رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ایک مرحلے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"آگے کیا ہو گا' یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ کون سعادت پائے گا اور کس کو ذلت اور رسوائی ملے گی' یہ اسے ہی خبر ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو وہ بولے "اس سے زیادہ میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس جو بھی ہے' سب کے سامنے آ جائے گا۔ تم بھی دیکھ لو گے۔ ہمیں تو بس اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہم نے اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے اور اس پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔"

"جی.... بے شک" میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ لیکن یاد رکھو' صبح چار بجے اپنے گھر سے نکل آنا۔ میں تمہیں ساتھ لے لوں گا' کہیں چلنا ہے۔"

"صبح چار بجے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی تمہارے کام کی تکمیل ہو گی۔ بس اب جاؤ۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹتا' ہمیشہ کی طرح وہ خود ہی تیزی سے چلتے لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں گھر پہنچا تو گیارہ بجے تھے۔ میں نے گھڑی میں ساڑھے تین بجے کا الارم لگایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یہ تصور بہت خوش آئند تھا کہ ڈھائی سال پہلے شروع ہونے والا اہم ترین کام مکمل ہونے والا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم تھا اور اللہ کے فضل و کرم کے سبب سے تھا۔ میرا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے یہ سعادت عطا فرمائی اور اسے میرے لیے آسان بھی کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس دوران میں میری زندگی بدل گئی۔

مجھے تجسس بھی تھا کہ اس کہانی کا اختتام کیا ہوتا ہے۔ میں

○☆○

کہانی لکھنے والا پروفیشنل ہوں۔ مگر اس کہانی کا انجام' اس کا وائنڈ اپ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسی عجیب حقیقت تو میں نے کہانی میں بھی کبھی نہیں لکھی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ اس رات نیند میری آنکھوں کے قریب بھی نہیں پھٹکی اور کمال یہ ہوا کہ اس بیداری نے مجھے مضمحل بھی نہیں کیا۔ میں تازہ دم تھا۔

سوا تین بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے گھڑی کا الارم بند کردیا۔ باتھ روم سے غسل کرکے میں باہر آیا اور میں نے شکر کے نوافل ادا کیے۔ اب ہر لمحہ میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ جسم میں دوڑنے والی سنسنی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ میں بے چین اور مضطرب تھا لیکن اس بے چینی اور اضطراب میں بے سکونی نہیں تھی' طمانیت اور سکون تھا۔

پونے چار بجے میں گھر سے نکل آیا۔ بلڈنگ کے چوکی دار نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ لیکن کچھ کہے سنے بغیر میرے لیے گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکل آیا۔ صبح کی خوش گوار ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی لیکن بری نہیں لگ رہی تھی۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔

اچانک جیسے کسی ہوا کے لطیف جھونکے نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مجھے برابر سے بابا عصر گزرتے نظر آئے اور اگلے ہی ثانیے وہ مجھ سے آگے نکل گئے "چلو..... قدم بڑھاؤ نا۔ کھڑے کیوں ہو؟" انہوں نے کہا۔

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ میں چل رہا ہوتا تھا مگر انہیں ٹھہرا ہوا لگتا تھا..... شاید اپنی تیز رفتار کی وجہ سے۔ بہرحال میں تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل دیا۔ میرا تجسس سے برا حال تھا۔ اچانک میری نظر بابا عصر کے ہاتھ پر پڑی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بے حد خوب صورت اور کافی بڑا رومال تھا۔ اس میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی' جس کی وجہ سے وہ پوٹلی جیسا لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے تجسس کو استفسار کا راستہ مل گیا "بابا..... یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے چلتے چلتے سر گھما کر مجھے دیکھا "اس میں وہ نورانی اشرفیاں ہیں جن کے سفر میں تم شریک رہے ہو۔ جن کا سفرنامہ تم لکھتے رہے ہو۔"

میں نے بے یقینی سے اس رومال کو دیکھا "دو اشرفیاں تو نہیں لگتیں یہ" میں نے کہا "یہ پوٹلی اتنی بڑی کیوں لگ رہی ہے؟"

"میں نے کب کہا کہ یہ دو اشرفیاں ہیں" بابا عصر تیکھے لہجے میں بولے "یہ بہت ساری اشرفیاں ہیں" انہوں نے کہا اور چلتے چلتے ہی رومال کھول کر مجھے دکھایا۔

میں نے دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ واقعی بہت ساری اشرفیاں تھیں۔ میں انہیں گن بھی نہیں سکتا تھا..... اور سب ایک جیسی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ رات یاد آگئی جب میری کایا پلٹ ہوئی تھی۔ "یہ اتنی بہت سی کیسے ہوگئیں؟"

بابا عصر نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کوئی نادان بچہ ہوں۔ "کراچی پاکستان نہیں۔ نہ ہی یہ پاکستان کا واحد شہر ہے۔ خیر و برکت کا یہ سفر ہر بڑے چھوٹے شہر میں شروع ہوا تھا اور یہ پاکستان کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں تک پہنچی ہیں۔ اللہ خود کسی کو خیر سے محروم نہیں کرتا' وہ بڑا کریم ہے۔"

"اوہ' تو یہ بات ہے" بات کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے سوچا' یہ بات تو مجھے خود ہی سمجھ لینی چاہیے تھی "مگر یہ سب آپ کے پاس...؟"

وہ پھر مسکرائے "آخری مرحلے کی تکمیل سے پہلے انہیں میرے پاس اکٹھا ہونا تھا۔"

"تو اب کیا ہوگا؟"

"خود ہی دیکھ لینا۔ اب انہیں آخری ہاتھوں میں جانا ہے..... آخری آدمی کے پاس۔ دعا کرو کہ وہ آخری آدمی ہی ثابت ہو" آخری بات کہتے کہتے ان کے لہجے میں تشویش در آئی "اگر وہ اہل' امین اور دیانت دار ثابت ہوا تو یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچ جائیں گی۔ پھر یہاں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ پاکستان کے استحکام اور اسلام کی سربلندی کا دور۔ کفر و باطل کی ہزیمت کا دور۔ جہاد فی سبیل اللہ کا دور۔ شہادت کے اعزاز تقسیم ہوں گے" ان کا لہجہ خواب ناک ہوگیا۔

"اور اگر خدانخواستہ وہ آخری آدمی اہل' امین اور دیانت دار ثابت نہ ہوا تو...؟"

"پھر وہ بدنصیب ثابت ہوگا۔ اپنی دنیا اور آخرت ایک ساتھ گنوادے گا" بابا عصر نے افسردگی سے کہا۔

تجسس مجھے بے صبرا بنائے دے رہا تھا۔ مجھے آخری آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت مجھے یہ تجسس بھی نہیں تھا کہ یہ آخری آدمی کون ہے۔ میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے..... یہ بتائیں کہ پھر ہوگا کیا؟"

"اشرفیاں واپس میرے پاس آجائیں گی" بابا عصر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "پھر اس کے متبادل کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر تو اشرفیاں قومی خزانے میں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"اور اگر خدانخواستہ وہ متبادل بھی اہل' امین اور دیانت دار نہ ہوا تو؟"

"اللہ نہ کرے۔ لیکن ایسا ہوا تو انتظار اور طویل ہوجائے گا" بابا کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "لیکن مجھے امید ہے..... اور اللہ سے میری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ اس موجودہ آخری آدمی نے یہ اعزاز گنوادیا تو اس کی جگہ لینے والا انشاء اللہ تمام اہلیتوں اور سعادتوں سے مالا مال ہوگا۔ کیونکہ معرکے کا وقت بہت قریب ہے۔ آگے اللہ کی مرضی' وہی جانے۔"

نہ جانے کیوں میں بھی اداس ہوگیا۔ ڈھائی سال میں تو یہ مرحلہ طے ہوا تھا اور اس دوران میں قومی معیشت تباہی کے دہانے تک پہنچ گئی تھی۔ ملک دوالیا ہونے کے قریب تھا۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ خدانخواستہ ابھی اور دیر لگ سکتی ہے۔

"دل چھوٹا نہ کرو" بابا عصر نے مجھے دلاسا دیا "حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں' مایوسی کفر ہے۔ اللہ مسبب الاسباب بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔"

اب مجھے اس پر حیرت نہیں ہوتی تھی کہ بابا عصر میری سوچیں پڑھ لیتے ہیں۔ میں چلتا رہا۔ اچانک میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں ان متبرک اشرفیوں کو اٹھا کر چلوں۔ میں نے یہ بات بابا عصر سے کی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے پھر بولے "یہ بہت زیادہ ہیں' تم اٹھا نہیں سکو گے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اتنا سا تو رومال تھا۔ اشرفیاں یقیناً بہت زیادہ تھیں۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں اٹھا نہ سکوں "میں اٹھالوں گا" میں نے کہا۔

انہوں نے بڑی احتیاط سے وہ پوٹلی مجھے دی مگر اسے تھامتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جتنی بڑی نظر آرہی ہے' درحقیقت اس سے بہت بڑی ہے اور ان اشرفیوں کا بوجھ! اسے لے کر ایک قدم چلنا تو درکنار' میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور پوٹلی ہاتھ سے چھوٹنے لگی۔

بابا عصر نے بڑی پھرتی سے اسے تھام لیا "یہ بڑی بھاری امانت ہے" انہوں نے وضاحت کی "ہزاروں مل کر اٹھائیں تو بھی یہ آسان بوجھ نہیں۔"

میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ اتنا بوجھ لے کر بھی اتنے تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ جبکہ میں نے اس پوٹلی کو پوری طرح تھاما بھی نہیں تھا تو مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے میں بھاری سامان سے لدے ہوئے کسی ٹرک کو ہلانے کی ناکام کوشش کررہا ہوں۔

ہم چلتے رہے۔ اچانک میرے تجسس نے رخ بدلا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھ لیا "یہ آخری آدمی کون ہے؟"

"خود دیکھ لینا' اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم اس وقت ایک پختہ سڑک پر چل رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ گردوپیش مجھے بے حد اجنبی سا لگ رہا تھا اور پھر صبح کی اس ہلکی روشنی میں' میں نے جو کچھ دیکھا' اس نے مجھے حیران کردیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

یادگارِ پاکستان کے مینار نے میرے ہوش اڑادیے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا مگر وہ خواب یا میرا تصور ہرگز نہیں تھا۔

"بابا..... یہ....."

"ہاں۔ ہم لاہور میں ہیں۔"

"لیکن یہ کیسے..... ہم تو کراچی میں تھے؟"

"اللہ کے بھید وہی جانے۔ اس میں تجسس نہ کرو۔ جیسے آئے ہو' ویسے ہی واپس بھی پہنچ جاؤ گے۔"

اب ہم شاید کسی بہت بڑے باغ میں تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے سبزہ تھا۔ اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو دور مجھے ایک بڑا آہنی گیٹ نظر آیا۔ وہاں دس بارہ مسلح پہرے دار بھی تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کسی بڑے اور اہم عہدے دار کی رہائش گاہ ہے۔ شکر ہے کہ ہم اس کے باہر اور اس سے خاصا دور تھے۔ ورنہ پہرے داروں کے سامنے جواب دہی مشکل ہوجاتی۔ مگر اسی لمحے بابا عصر کے قدم گیٹ کی سمت اٹھنے لگے "اس طرف کیوں جارہے ہیں؟" میں نے فریاد کی "دیکھتے نہیں' وہ کسی بڑے آدمی کی رہائش گاہ ہے۔"

"وہ کیوں کہہ رہے ہو؟" بابا عصر نے مجھے ڈانٹا "رہائش گاہ میں تو ہم موجود ہیں۔ یہ جہاں ہم چل رہے ہیں' یہ اس گیٹ کے اندر کا حصہ ہے' باہر کا نہیں۔"

میں نے سر گھما کر دیکھا تو اقامتی عمارت نظر آئی۔ میری تو گھگی بندھ گئی "مروادیا آپ نے۔ گارڈ تو دیکھتے ہی گولی ماردیں گے ہمیں" میں نے بلبلا کر کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم آخری آدمی سے ملنے آئے ہیں" بابا عصر کا لہجہ پُرسکون تھا۔

مگر میں بری طرح دہل گیا تھا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور ایک کار اندر آتی دکھائی دی۔ گیٹ پھر بند کردیا گیا۔

کار جس وقت جہاں رکی' اسی وقت ہم بھی وہاں پہنچے تھے۔ کار کا دروازہ کھول کر جو شخص باہر آیا' اسے دیکھ کر میں تو سناٹے میں آگیا لیکن بابا عصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کار سے اترنے والا شخص اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وزیراعظم تھا!

○☆○

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا!

وزیراعظم کے لیے بھی وہ شاک تھا۔ دو مداخلت کار سخت سیکیورٹی کے باوجود ان کے گھر میں موجود تھے۔ وہ حیرت اور تشویش سے ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ ہمیں نہیں مجھے کہیے۔ سفید سن بابا عصر انہیں خطرناک نہیں لگ رہے تھے البتہ مجھے دیکھ کر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرے عزائم خطرناک تو نہیں۔

لیکن مجھے ان پر فخر محسوس ہوا۔ اس صورتِ حال نے انہیں PANIC میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ وہ تشویش زدہ ضرور تھے لیکن پریشان نظر نہیں آرہے تھے۔ کار میں وہ اکیلے تھے۔ خود ہی ڈرائیو کرکے لائے تھے۔

پھر خاموشی ہماری طرف سے ہی ٹوٹی۔ میں نے اور بابا عصر نے انہیں بیک وقت سلام کیا۔ ان کے چہرے سے پریشانی کا سایہ ہٹ گیا۔ اب وہ شرمندہ نظر آرہے تھے۔ شاید اس بات پر کہ انہوں نے سلام کرنے میں پہل کیوں نہیں کی۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر بولے "آپ لوگ کون ہیں؟ اور یہاں کیسے گھس آئے ہیں؟"

"اللہ کی مرضی پر چلنے والے تو کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں" بابا عصر نے کہا "کون روک سکتا ہے انہیں۔"

وزیراعظم نے گیٹ کی طرف سر گھمایا۔ شاید وہ سیکیورٹی والوں کو آواز دینا چاہتے تھے مگر بابا نے انہیں روک دیا "اس وقت وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ نہ ہماری باتیں سن سکتے ہیں' نہ ہمیں دیکھ

سکتے ہیں۔ اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے سیکیورٹی زون میں ہو۔"

وزیراعظم حیران نظر آئے "لیکن کیوں؟"

"میں اللہ کی ایک امانت لایا ہوں تمہارے لیے لیکن مجھے کچھ ہدایات بھی دی ہیں اور تم سے باز پرس کرکے تمہیں تنبیہہ بھی کرنی ہے۔"

اب میں بھی حیران تھا کہ کہانی یہاں کہاں پہنچ گئی۔ ادھر وزیراعظم کے چہرے پر تردد کا سایہ ابھرا۔

"باز پرس سے ڈرتے ہو..... یا ہتک کا احساس ہو رہا ہے" بابا عصر نے تیز لہجے میں پوچھا۔ وزیراعظم نے کوئی جواب نہیں دیا "کیا تم نہیں جانتے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ سے تو ایک عام شہری بھی جواب طلب کرسکتا ہے..... اور وہ جواب دے کر اسے مطمئن بھی کرتا ہے۔ کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ یہ اقتدار تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے اور اس کی جواب دہی اتنی سخت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی ہستی کو خوف کے مارے نیند نہیں آتی تھی۔"

وزیراعظم کے چہرے پر نرمی اور آنکھوں میں روشنی بکھر گئی۔ "جی..... میں جانتا ہوں۔ مجھے احساس ہے" انہوں نے آہستہ سے کہا "آپ باز پرس ضرور کریں مجھ سے۔"

"مطمئن تو تم ایسے ہو کہ کوئی متقی بھی نہیں ہوتا" بابا عصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وزیراعظم کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔ بابا عصر چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتے رہے، پھر بولے۔ "کشکول تم نے توڑ دیا، بہت اچھا کیا۔ مگر یہ کیا کہ اپنے دامن کو ہی بھکاری کی جھولی بنا کر بیٹھ گئے۔"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتمایا "میرے محترم بزرگ، آپ کو اندر کا حال نہیں معلوم۔"

"بے شک، مجھے نہیں معلوم لیکن اللہ اقتدار کے ایوانوں کے اندر کا حال بھی جانتا ہے اور اسے تمہارے اور تمہارے رفقا کے اندر کا بھی سب معلوم ہے۔"

وزیراعظم کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ لرزش واضح طور پر نظر آئی تھی "جی بے شک۔ یہ تو ہمارا ایمان ہے۔"

"لیکن اسے بھول کر بے ایمان ہو جاتے ہو۔ ورنہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے خوف سے مر جاؤ۔ پتا ہے، جس اقتدار کی آرزو میں تم سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہو، تقویٰ کرنے والے اس کے ملنے کے امکان سے بھی تھر تھر کانپتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں میرے بزرگ۔ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں۔"

"یہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا" بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا کہ گنہگاری کا اعلان کرتے رہو اور اسی دوران میں ڈھٹائی سے گناہ بھی کیے جاؤ" اچانک ان کا لہجہ نرم ہو گیا "اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ اس کی عنایت ہے کہ یہاں دنیا میں اس کے حکم سے میں کھڑا تم سے جواب طلب کر رہا ہوں۔ ذرا سوچو، سوا نیزے کی بلندی پر تپتے سورج کے نیچے حشر کی دھوپ میں اعمال نامہ ہاتھ میں لیے جواب دہی کے مرحلے سے گزرو گے تو کیا حال ہوگا تمہارا۔ وہاں نہ توبہ کا موقع ہوگا، نہ ہی مال و دولت دے کر جان چھڑا سکو گے۔"

وزیراعظم تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کے کپکپاتے ہونٹوں پر شاید استغفار تھا "خزانہ خالی ہے۔ اور ایٹمی دھماکا ناگزیر تھا..." انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ اسی لیے جزا و سزا کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ دھماکا کیسے ہوا، کس نے کرایا، وہ سب جانتا ہے" بابا عصر نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "وہ جس نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ہاتھوں لاڈ پیار سے کرائی، وہ دھماکا دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں بھی کرا سکتا ہے۔ رہی تمہاری خزانے والی بات تو خزانہ تو برسوں سے خالی چل رہا ہے لیکن مقتدرین کے صرفِ تعیشات میں تو کمی نہیں ہوئی بلکہ زیادتی ہی ہوئی۔ بڑی بڑی کاریں، ذاتی استعمال کے لیے ہوائی جہاز، محلوں کی آرائش، پُرتکلف ضیافتیں۔ یہ سب دیکھ کر کوئی مان سکتا ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ اور اب ایٹمی دھماکے کی بات کرو۔ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا یا حکومت کی؟"

"سب جانتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا۔" وزیراعظم نے دبے لفظوں میں کہا۔

"لیکن تمہارے نزدیک وہ حکومت کی ضرورت تھا، یہ تو کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ تباہ معیشت، خالی خزانے اور اپنی اور اپنے پچھلوں کی بداعمالیوں اور بے ایمانیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بھی تو تمہیں اس دھماکے کی ضرورت تھی۔ ملک اور قوم کو تو بونس میں فائدہ ہوا اس لیے ہوا کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ حکومت کو یہ فائدہ ہوا کہ پہلے وہ اقتصادی دوالیے پن کا اعلان نہیں کر سکتی تھی، اب کر رہی ہے۔ اب تم تمام بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں..... اپنی بھی اور اپنے سے پہلوں کی بھی..... بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔"

وزیراعظم کی پیشانی پر شکنیں ابھریں لیکن ان کا تحمل قابلِ رشک تھا۔

"یہ بتاؤ کہ دھماکے کے اعلان کے وقت تو تم بہت پُرامید تھے۔ تمہیں اقتصادی پابندیوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ تم کہہ رہے تھے کہ ہنگامی منصوبہ تیار ہے۔ انقلابی تبدیلیاں آئیں گی اور ہم انشاء اللہ پہلے سے زیادہ خوش حال اور طاقت ور بن کر ابھریں گے۔ تو اتنے سے دنوں میں اب کیا ہو گیا؟"

"دیکھیں، ہم نے خود انحصاری کی اسکیم شروع کی..."

"اور وہ بہت کامیاب ہوئی" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "ملک و قوم سے محبت کرنے والوں نے فاقہ کرکے بھی اس میں کم از کم سو روپے دیے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا" بابا کہتے کہتے رکے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری "تم نے اس اسکیم میں خود کیا دیا؟"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتما اٹھا "اس کی تشہیر کرنے کی کم ظرفی میں نہیں کر سکتا" انہوں نے قدرے بدمزگی سے کہا۔

"حالانکہ اس کی تشہیر ضروری ہے۔ تمہاری قربانی' تمہاری شمولیت لوگوں کے جذبوں کو مہمیز کرے گی اور تمہاری کابینہ میں بھی تو بڑے صاحب ثروت لوگ موجود ہیں۔ کچھ پچھلے چند برسوں میں صاحب ثروت بن گئے ہیں' انہوں نے اس اسکیم میں کچھ دیا؟"

"دیا ہوگا لیکن میں ان کا ذمے دار نہیں۔"

"کیا بکتے ہو؟" بابا عصر کو جلال آگیا "میں اللہ کے آئین کو درمیان میں نہیں لاتا۔ لیکن جس آئین کے تحت تم وزیراعظم بنے ہو' اسی کے تحت وزیراعظم اپنی کابینہ کے ہر فعل کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔ ان کے تو کرپشن کے جواب دہ بھی تم ہو' یہاں بھی اور حشر کے روز بھی۔"

وزیراعظم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"اب میں تمہیں اسکیم میں صاحب اقتدار لوگوں کے عطیات کی تشہیر کی افادیت بتاؤں" بابا عصر کا لہجہ نرم ہوگیا "اللہ نے فرمایا کہ عمل کے اجر کا انحصار نیت پر ہے۔ اب سوچو کہ ایک طالب علم ہے' جس نے اپنا دل مار کر' اپنی خواہشوں سے محرومی کے بدلے کچھ رقم جمع کی۔ فرض کرلو... ڈیڑھ سو روپے اور اس میں سے سو روپے اس نے تمہارے خود انحصاری فنڈ میں دے دیے۔ یہ ہوا کل رقم کا تقریباً ۶۷ فیصد۔ اور کسی کے پاس دس کروڑ روپے ہیں اور اس نے فنڈ میں دس لاکھ روپے دیے۔ یہ کل رقم کا صرف ایک فیصد ہے۔ یعنی دنیاوی اعتبار سے وہ طالب علم اس کروڑ پتی کے مقابلے میں ۶۷ گنا عظیم ہے۔ اب اللہ کے حساب سے سوچو' جو سب کچھ جانتا ہے۔ نیت بھی اور اندر کی بات بھی۔ آخرت میں اس طالب علم کی ان ضرورتوں کا حساب ہوگا' جو سو روپے کے اس عطیے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکیں۔ محرومی دے گئیں اسے۔ اور وہاں اس کروڑ پتی کا بھی حساب ہوگا جس کی کوئی خواہش تشنۂ تکمیل نہیں۔ کوئی ضرورت پوری ہونے سے نہیں رہتی۔ اور اس کے پاس دس کروڑ روپے بے مصرف پڑے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ماہانہ آمدنی کے وسائل بھی ہیں۔ ایسے میں اس کے دس لاکھ کی وقعت صفر سے نیچے تو ہوسکتی ہے' اوپر نہیں ہوسکتی۔ یعنی ہم حساب نہیں لگاسکتے کہ آخرت میں اس طالب علم اور اس کروڑ پتی کے عطیوں کے درمیان کتنے ہزار یا کتنے لاکھ گنے کا فرق ہوگا۔"

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے کبھی اس زاویے سے سوچا ہی نہیں تھا۔

"میرے بزرگ' گستاخی معاف" وزیراعظم چند لمحے سوچنے کے بعد بولے "ہمیں تو پیسے کی ضرورت ہے.... زیادہ سے زیادہ۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان سو روپوں کے مقابلے میں وہ دس لاکھ ہماری زیادہ مدد کریں گے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" بابا عصر مسکرائے "شیطان کی دی ہوئی افراط اللہ کی عطا کردہ برکت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کبھی تعداد یعنی افراط پر زور نہیں دیا۔ نیکی ہمیشہ گنتی میں کم اور وزن اور تاثیر میں بیش ہوتی ہے۔ کافروں نے اپنی کثیر تعداد کے باوجود گنتی کے مومنوں سے ہمیشہ شکست کھائی۔ ہاں' افراط اللہ کی دی ہوئی ہو تو آزمائش ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں خست اور تنگی کرے تو اس کے مال میں بے برکتی بھی آتی ہے اور وہ اس کے لیے وبال بھی بن جاتا ہے۔ حق حلال کے سو روپے کو حقیر سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔"

وزیراعظم کے چہرے پر شرمندگی تحریر تھی "آپ درست فرماتے ہیں" انہوں نے بے حد احترام سے کہا۔

"اب یہ بتاؤ کہ جب تم نے دھماکے سے پہلے تمام نتائج پر غور کرکے مکمل منصوبہ بندی کرلی تھی تو اب یہ بار بار کی تبدیلیاں کیسی' جو قوم کو بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کررہی ہیں۔"

وزیراعظم چند لمحے سوچتے رہے' پھر بولے "میرے مشیروں اور منصوبہ سازوں سے کہیں چوک ہوگئی۔ مگر انشاء اللہ ہم قابو پالیں گے۔"

"چوک ہوگئی" بابا عصر نے حقارت سے کہا "انہوں نے تو حکومت کا اعتبار ہی ختم کردیا۔ حکومت کو خیانت کار اور احسان فراموش بنادیا۔ پاکستانیوں میں کتنی ہی خرابیاں سہی' پاکستان کی ضرورت کا سن کر سب لبیک کہتے ہیں۔ وہ جو ملک سے باہر پردیس میں بیٹھے ہیں' انہیں پاکستان سے دوسروں سے زیادہ محبت ہے۔ تم نے جب انہیں مدد کے لیے پکارا' انہوں نے دل کھول کر مدد کی۔ تم نے دولت ملک میں واپس لانے کی اپیل کی' وہ لے آئے۔ اور اب حکومت ان کی تمام جمع پونجی کھاگئی۔ ان کے پاس ڈالر کے بجائے یہ نڈھال اور تھکا ماندہ روپیہ ہے' جس کا حکومت کے قول کی طرح اب کوئی اعتبار نہیں۔ یہ سب کچھ پہلے کبھی کسی حکومت نے نہیں کیا۔ اپنی ضامن کی حیثیت ہی کھودی۔"

"پہلے کسی حکومت پر یہ وقت بھی نہیں آیا میرے محترم بزرگ!" وزیراعظم نے آہستہ سے کہا "اور لوگوں کی امانت والا زرمبادلہ ہم سے پہلے والے استعمال کرتے رہے ہیں۔"

"یہ کوئی جواز نہیں برائی کا۔ اور تم کو تو یہ جواب دہی بھی کرنی ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا' وہ قومی مجرم ہیں۔ انہیں کیا سزا دی تم نے۔ جو قومی دولت لوٹ کر باہر لے جاتے اور معیشت کو کھوکھلا کرتے رہے' ان کے خلاف کیا کارروائی ہورہی ہے؟"

"ان کے خلاف شواہد اکٹھے کیے جارہے ہیں' مقدمے قائم ہورہے ہیں۔"

"اور جنہیں باہر کی عدالتیں مجرم قرار دے رہی ہیں؟"

"وہ عدالتی عمل سے گزر رہے ہیں۔"

"اس سے ملک و قوم کو کیا فائدہ ہوگا؟" بابا عصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وزیراعظم نے انہیں غور سے دیکھا "آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟"

"انصاف ہونا چاہیے اور انصاف صرف سزا دینا نہیں۔ جو لوٹا گیا ہو' اسے اس کا مال بھی واپس ملنا چاہیے" بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا "اور یہاں ملک و قوم کی دولت لوٹی گئی ہے۔ اسے بدنامی دی گئی ہے۔ اسے تنگ دستی اور محرومیاں دی گئی ہیں۔ لہٰذا

ڈائجسٹ ملکیت: شیخ فواز رزاق
جاسوسی نشست +92 3331784121

جو دولت لوٹ کر باہر لے جائی گئی ہے' وہ واپس لاؤ۔ مجرموں کی سزا قید یا موت نہیں' زندگی ہے۔ ان کے پاس یہاں بھی بہت دولت ہے۔ اسے ضبط کرکے قومی خزانے میں لے جاؤ۔ ان سے ان کی زمینیں' جاگیریں اور محل چھین لو۔ انہیں سخت نگرانی میں رکھو اور ملک سے باہر نہ جانے دو۔ ان سے کہو کہ یہاں عام لوگوں کی طرح نوکری کریں' کہیں چار ہزار روپے ماہانہ پر کلرکی کریں۔ کرائے کے مکان میں رہیں اور ذرا عام آدمی کی طرح زندگی گزاریں۔ ایک دو دن نہیں' مہینے نہیں' پوری زندگی۔ پھر انہیں معلوم ہو کہ پائی بھی کتنی بڑی نعمت ہے اور بھوک غریبوں کے معدے میں کس طرح ڈنک مارتی ہے اور دس روپے کی کسی چیز کی فرمائش رد ہونے پر بچوں کی آنکھوں میں آنے والے آنسو ماں باپ کی آنکھوں کی بینائی کیسے چاٹتے ہیں۔ تمہاری سزائے قید تو غریبوں کی زندگی کے مقابلے میں اتنی پُرتعیش ہے کہ اگر تم عوام سے اس کا وعدہ کرو تو وہ سب کے سب مجرم بن کر تمہاری جیلوں میں پہنچ جائیں۔ آرام دہ بستر' ٹی وی' مفت کا بہترین کھانا' اخبار اور مانگنے پر ائرکنڈیشنر..... ہونہہ اسے تم سزا کہتے ہو۔ انہیں سزا نہیں' غریبوں کی زندگی دو۔ یہی انصاف ہے۔ اور سنو' یہ سزا بلا تفریق ہر لٹیرے کو دو..... اس کو بھی جو سب کچھ ہوتے ہوئے واپس نہ کرنے کے ارادے سے بینکوں سے قرضے لے کر ملک کو لوٹتا رہا ہے۔ خواہ وہ تمہاری طرف کا ہو' خواہ ان کی طرف کا۔ ان سب کو یکساں طور پر مثال عبرت بنادو۔"

بابا عصر کے لہجے کا جوش ہر لفظ کے ساتھ بڑھتا گیا تھا اور وزیراعظم کے چہرے کا رنگ اڑتا جارہا تھا "یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں نہیں کرسکتے۔ اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہے۔ اقتدار کی امانت تمہارے پاس ہے۔ طاقت اور اختیار ہے تمہارے پاس۔ بس ایک کمی ہے' وہ پوری کردو۔ اپنا سب کچھ قوم کو دے دو۔ کسی چھوٹے سے عام مکان میں رہو۔ جس رقم میں ایک عام آدمی زندگی گزارتا ہے' اسی میں تم بھی گزارہ کرو۔ یوں تمہیں زندگی سے اور اس سے متعلق ان بہت سی چیزوں سے آگہی ہوگی جنہیں تم صرف لفظوں کی شکل میں سمجھتے ہو' عملاً جانتے نہیں۔ پھر تم لوگوں سے پاکستان کے لیے ایثار اور قربانی کا مطالبہ کروگے تو اس قربانی اور ایثار کی قیمت بھی سمجھوگے۔ اسلام میں حکمرانی کا اصول ہے کہ لوگوں سے جو کچھ کروانا ہے' خود کرکے دکھاؤ۔ پھر دیکھو' کیا ہوتا ہے۔ سالوں میں نہیں' مہینوں میں ملک و قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ اسلام کے ظہور کے موقع پر اصول کے تحت کام کیا گیا تھا۔ تو انسانی تاریخ کا بدترین معاشرہ صرف چند برسوں میں مہذب ترین ہوگیا تھا۔ یہی نہیں' اس کی روشنی مزید چند برسوں میں آدھی دنیا تک پہنچ گئی تھی۔ مثالیں تو تمہارے سامنے ہر طرح کی موجود ہیں۔ چاہو تو اچھی مثالیں منتخب کرلو اور چاہو تو بری' پہلے قربانی تو دو۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں" وزیراعظم نے بڑے اعتماد سے کہا "میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔"

"وہ کسی کی لکھی ہوئی تقریر تھی جو کوئی بھی کرسکتا ہے" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "جب تم عام بستیوں میں عام لوگوں کے درمیان انہی کی طرح زندگی گزارو گے تو کسی تقریر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سب کو خود بخود صرف معلوم نہیں ہوگا' یقین بھی ہوجائے گا۔"

"آپ نے میری بات نہیں سنی" وزیراعظم نے شکایتی لہجے میں کہا "میں یہ عرض کررہا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے' وہ بہت سے لوگوں کا ملا جلا ہے۔ اس پر مکمل اختیار ایک سربراہ کا ہے۔"

"آدمی کے پاس ارادہ اور عزم ہو' نیت درست ہو تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں' جس کا حل نہ ہو" بابا عصر نے بے حد اطمینان سے کہا "پہلے مرحلے میں تم اپنے حصے سے دستبرداری کا اعلان کردو۔ پھر وزیراعظم کی حیثیت سے ہدایت کردو کہ قرضوں کی وصولی کے سلسلے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے' پھر تم عام لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ۔ وہ تنخواہ لو' جو اس ملک میں عام ہے۔"

"لیکن میرے بیوی بچے جس طرز زندگی کے عادی..."

بابا عصر نے پھر ان کی بات کاٹ دی "اگر کوئی اور آکر تم سے یہ سب چھین لے تو تم اور تمہارے بیوی بچے کیا کریں گے۔ مریں گے تو نہیں نا۔ ویسے ہی جئیں گے جیسے میں تمہیں رضاکارانہ طور پر جینے کو کہہ رہا ہوں اور تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ اللہ کی راہ ہے۔ بڑی سعادت ہے۔ اس راہ میں بیوی بچے رکاوٹ بنیں تو انہیں چھوڑ دو۔ تم اکیلے محلوں سے اتر کر جھونپڑی میں آجاؤ۔ مثالوں سے آنکھیں چرانے کے بجائے مثالیں قائم کرنا سیکھو۔ تمہارے لوگ تم سے عشق کرنے لگیں گے۔ تمہیں وہ طاقت حاصل ہوگی' جو آئینی ترمیمات اور من پسند آرڈی نینس بھی تمہیں نہیں دے سکتے۔"

"جی..... یہ میں کرسکتا ہوں" وزیراعظم نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"پھر تم قومی مجرموں کو میری مجوزہ سزا دو....."

"یہ تو نہیں ہوسکتا محترم بزرگ۔ ملکی قانون اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"اپنی مثال قائم کرنے کے بعد تم یہ سب کچھ کرسکتے ہو۔ عوامی طاقت تمہارے ساتھ ہوگی اور قانون کیا ہے..... وہ بھی آدمی کا بنایا ہوا ہے۔ اپنی غرض کے لیے تم آرڈی نینس جاری کردیتے ہو۔ آئین میں ترمیم کرا کے قانون منسوخ کردیتے ہو۔ نئے قانون بھی بنالیتے ہو' ایک اچھے کام کے لیے ایسا نہیں کرسکتے؟"

مگر اب وزیراعظم بے حد پُراعتماد نظر آرہے تھے "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں میرے محترم بزرگ۔ اس کے لیے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہے..."

"تو کیا ہوا' وہ تمہارے پاس موجود ہے۔"

"لیکن اس طرح کے کسی قانون کے لیے وہ میرا ساتھ نہیں دیں گے' وہ مجھے ہی فارغ کردیں گے۔"

"اسی لیے نا کہ وہ سب بھی ایسے ہی ہیں اور وہ سب تمہارے منتخب کردہ ہیں اور تمہاری کابینہ اس کریم کی بھی کریم ہے۔ ہے نا۔

تو تم نے انہیں ٹکٹ کیوں دیے۔ وزارتیں کیوں دیں؟ کیا تمہارے خیال میں خدانخواستہ اس ملک میں اہلِ ایمان کا کال پڑ گیا ہے؟"

"یہ سیاسی مجبوریاں ہیں میرے بزرگ!"

"مغربی سیاست کی ہوں گی۔ اسلامی سیاست کچھ اور چیز ہے۔ خیر تم یہ رکاوٹ بھی دور کر سکتے ہو۔ ان سب سے پیچھا چھڑا لو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے جناب۔ البتہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا لیں گے۔"

"مشورہ میں دیتا ہوں' عمل کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ تم اپنا محل چھوڑ کر غریبوں کے درمیان پہنچ جاؤ..."

"میرا ارادہ یہی تھا محترم۔ لیکن سیکیورٹی کے ایسے مسائل سامنے آئے..."

"کیا کفر بکتے ہو" بابا عمر نے دہاڑ کر کہا۔ ان کا چہرہ تمتما اٹھا تھا "تمہیں یاد نہیں کہ اسلامی تاریخ کے چار بہترین اور مثالی خلفا میں سے تین نے شہادت پائی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ مسجد میں شہید کیے گئے۔ ان سے زیادہ اہم کون ہو سکتا ہے اور موت تو وہ حقیقت ہے کہ صرف اللہ کے حکم سے آتی ہے اور جب وقت ہو تو سات آہنی پردوں میں چھپا ہوا آدمی بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اب یہاں کتنی سیکیورٹی ہے تمہاری۔ لیکن ہم یہاں تمہارے روبرو کھڑے ہیں اور تمہاری حفاظت کرنے والوں کو پتا بھی نہیں۔ ہم تو ہدایت لے کر آئے ہیں' موت لے کر آئے ہوتے تو تم اس وقت کہاں ہوتے۔ بتاؤ' اور بات آگے بڑھنے سے پہلے سن لو کہ روشن مثالیں یاد رکھو۔ تم مجرموں کو سزا دینے سے گھبراتے ہو کہ اس پر سیاسی انتقام کا الزام لگے گا۔ تمہیں نہیں ڈرنا چاہیے اس سیاسی بلیک میلنگ سے۔ کیونکہ مجرم قومی مجرم بھی ہیں اور اللہ کے مجرم بھی۔ یاد رکھو' ایک خلیفۂ وقت نے اپنے بیٹے کو کس شان سے سزائے موت دی تھی۔ ڈر تھا کہ جلاد کوڑے مارنے میں رعایت سے کام لے گا تو آپ نے خود کوڑے مارے۔ انصاف کے ایک سے زیادہ معیار کبھی نہیں ہوتے۔ یاد رکھو کہ ایک بے حد وسیع و عریض سلطنت کا خلیفہ اپنے گھر میں روشنی کے لیے خزانے سے تیل بھی نہیں لیتا تھا۔ وہ بادشاہ تو اس ہندوستان میں بھی ایسے گزرے ہیں جو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے اپنے ہاتھ سے قرآن پاک لکھنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اور تم لوگ ہو کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خزانے پر بوجھ بنتے ہو۔ کہتے ہو' پاکستان مقروض ہے۔ یہ تو بتاؤ' جو قرضہ آتا رہا' وہ گیا کہاں؟ عوام کو کچھ ملا؟ کوئی فائدہ پہنچا؟ سب اقتدار و اختیار والوں نے مل بانٹ کر کھا لیا۔ عوام کو دیا کچھ نہیں۔ ہمیشہ ان سے مانگتے رہو۔ ڈرو اس وقت سے' جب اللہ تم لوگوں سے حساب لے گا اور تمہارے پاس ادائیگی کے لیے اعمال کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ بہتر ہے' یہیں اپنا اپنا حساب کرو۔ پھر تلافی کرو اور توبہ کرو۔ اقتدار کا شوق بہت آسان ہے۔ اقتدار کے بوجھ کا تمہیں اندازہ نہیں۔ انصاف کو کھیل نہ بناؤ۔ چور تمہاری پارٹی کا ہو یا مخالف پارٹی کا' وہ اوّل و آخر چور ہے۔ اسے سزا دو' انصاف کرو۔ ورنہ اللہ کے انصاف کے منتظر رہو۔ مگر تم نہیں جانتے کہ..

فیروپائرین (رجسٹرڈ)
قائم شدہ
1976

★ فیروپائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کر دیتی ہے
★ فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کر دیتی ہے
★ فیروپائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے
★ فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کر کے ورم اور سوزش اتارتا ہے
★ فیروپائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کر کے مسوڑوں کو مظبوط اور سخت بناتی ہے
★ فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا بنانے کا سبب بنتے ہیں
★ فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے
★ فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔

تیار کردہ:- فیر لیبارٹریز O/1084 غازی روڈ راولپنڈی۔ (051-72471)

[illegible] صاف ہوگا۔ جانتے ہوتے تو تم اس سے ڈرتے۔ دیانت دار [illegible] کو پچھلے دس سال کے حسابات کی جانچ پڑتال پر پورے اختیار کے ساتھ مامور کرو اور صاف شفاف گوشوارے قوم کے سامنے رکھ دو۔ اپنا بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردو۔ تم کہتے ہو' تم اپنی کابینہ کے اراکین کے ذمے دار نہیں اور حضرت عمرؓ کو نیند نہیں آتی تھی..... اس خوف سے کہ اس وسیع و عریض سلطنت میں کوئی کتا بھی بھوکا سو گیا تو اللہ آپ سے جواب طلبی کرے گا۔ یاد رکھو تم سربراہ ہو۔ کسی کے جرم سے چشم پوشی کروگے تو وہ جرم [illegible] ہو جائے گا" بابا عصر کہتے کہتے رکے اور ایک گہری سانس لے کر پھر گویا ہوئے "ہاں' میں کہہ رہا تھا کہ اپنا سب کچھ قوم کے لیے [illegible] کردو۔ یہ پوری قوم تمہاری جان نثار بن جائے گی۔ پھر تم یہ کرسٹ اسمبلی توڑ دو۔ دوبارہ عوام کے پاس جاؤ۔ اہل' امین' دیانت دار اور سچے افراد کو ٹکٹ دو۔ پاکستان سے محبت کرنے والے عام لوگوں کو آگے لاؤ اور ذمے داریاں سونپو۔ اعتبار کماؤ گے تو لوگ نام نہیں دیکھیں گے۔ تمہارے نشان کو ووٹ دیں گے۔ پھر تم نیک نیتی سے اقدامات کرو۔ انصاف کرو۔ پرانی غلطیاں مت [illegible] اب تاریخ کے صفحات میں تمہارا نام رقم ہو کر رہے گا۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کون سا رنگ دیتے ہو۔"

وزیراعظم کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا "میں اقتدار ہی نہ چھوڑ دوں؟" انہوں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اب یہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ یاد نہیں' ابھی کچھ ہی عرصے پہلے تم بزرگوں کے' اللہ کے محبوب بندوں کے پاؤں پکڑ کر' پیروں میں گر کر گریہ وزاری کر رہے تھے..... گڑگڑا رہے تھے کہ تمہیں ایک موقع اور چاہیے۔ تم نے کیا' کیا کہا تھا' بھول گئے؟ کیا وعدے کیے تھے اللہ سے..... اللہ کو گواہ بنا کر' یاد نہیں۔ اور تمہیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ موقع ملے گا اور وہ آخری ہوگا۔ اگر تم سچے ہوئے تو اس عہد کے رہنماؤں میں تمہیں وہ مقام ملے گا جو شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ اور اگر تم جھوٹے ہوئے تو بڑی ذلت اور رسوائی سے جاؤ گے۔ اب تم خود سے نہیں جا سکتے۔"

"جی ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔"

"تمہاری خوبیاں اور خامیاں اللہ جانتا ہے مگر تمہاری ایک بہت بڑی خوبی مجھے بھی نظر آتی ہے" بابا عصر کے لہجے میں اس بار شفقت تھی "اور وہ یہ ہے کہ تم پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہو۔ اب معلوم نہیں کہ مجھے محبت کرتے ہو کہنا چاہیے یا محبت کرتے تھے کہنا چاہیے۔"

وزیراعظم کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میرے محترم بزرگ' میری لغزشیں' میرے گناہ اپنی جگہ۔ اللہ گواہ ہے کہ پاکستان سے مجھے عشق ہے۔"

"عمل سے ثابت کرو نا۔"

"ہمہ وقت یہی کوشش کرتا ہوں مگر رفقا کے غلط مشوروں سے مار کھا جاتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اچھی صحبت میں اٹھو بیٹھو" بابا عصر نے محبت بھرے لہجے میں کہا "بہرحال تم نہیں جانتے کہ تمہیں کتنی بڑی سعادت مل رہی ہے۔ اسے نہ گنواؤ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور متقی ہیں..... یعنی اس سے ڈرتے ہیں۔ اور تنبیہہ ہے ان لوگوں کے لیے جو غلط راستے پر ہیں اور دل سے ایمان نہیں لائے۔ تمہارے پاس جو ہدایت آئی ہے اگر تم اچھے ہو تو وہ تمہارے لیے بشارت ہے اور تم برے ہو تو تمہارے لیے تنبیہہ ہے۔ دونوں مبارک ہیں۔ تنبیہہ بھی مبارک ہے کہ تمہیں ایک اور موقع مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور بشارت پانے والے خوش نصیبوں میں شامل ہو جاؤ۔"

وزیراعظم نے آسمان کی طرف سر اٹھایا' جیسے اللہ سے دعا کر رہے ہوں یا رہنمائی اور استقامت طلب کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دھیرے سے بولے "اللہ کا شکر ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ پر عنایت فرمائی۔ انشاء اللہ اس بار میں سعادت سے محروم نہیں ہوں گا۔ بے شک عزت اور ذلت اسی کے اختیار میں ہے" پھر انہوں نے نظریں اٹھائیں "آپ نے ابتدا میں فرمایا تھا کہ آپ اللہ کی ایک امانت لائے ہیں میرے لیے۔"

بابا عصر نے رومال کی پوٹلی ان کے سامنے کھول دی "یہ تمہیں قومی خزانے میں پہنچانی ہیں۔"

"اتنا سا کام؟"

"یہ بہت بڑا کام ہے۔ اگر تم متقی' امین' سچے اور دیانت دار ہوئے تو یہ کام کر سکو گے ورنہ نہیں" بابا عصر نے کہا۔ پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ وہ اشرفیاں کتنے مرحلوں سے گزر کر آئی ہیں۔ "اس سے اندازہ کرو کہ یہاں کیسے ایمان دار' متقی اور اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والے موجود ہیں" بابا نے کہا "یہ حقیقت تمہیں خود اعتمادی دے گی' قوم پر اعتماد بھی دے گی اور تم آئندہ صالح رفقا کا انتخاب بھی کر سکو گے۔"

وزیراعظم یہ سب کچھ حیرت سے سن رہے تھے' ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

"یاد رکھنا' یہ اشرفیاں لاکھوں ہاتھوں سے گزریں لیکن کسی ایک امین نے بھی اپنے حصے کی اشرفی خود نہیں رکھی۔ وہ بھی آگے بڑھا دی۔"

"مجھے فخر ہے اپنی قوم پر۔"

"کوشش کرو کہ تمہاری قوم بھی تم پر فخر کرے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا" وزیراعظم نے کہا پھر بولے "میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں' تم ان کے امین ہو۔ تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔"

وزیراعظم نے ایک اشرفی اٹھالی۔ انہوں نے حروف پر انگلی پھیری پھر اشرفی کو پلٹ کر دیکھا۔ کلمہ طیبہ کے حروف کو بھی عقیدت سے چھوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے

لگے۔ وہ اتنا روئے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر انہوں نے اس اشرفی کو چوما اور آنکھوں سے لگالیا۔

"یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچادو۔ لوٹی ہوئی دولت واپس لو۔ لوگوں کا اعتماد اور اعتبار اپنے اوپر بحال کرو۔ خود کو امین' سچا اور دیانت دار ثابت کرو۔ پھر خیروبرکت دیکھو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ انشاء اللہ کیسے اچھے دور کا آغاز ہوگا۔ تم کفر کے خلاف جہاد کروگے۔ غازی یا شہید بنوگے۔ فتح یاب ہوگے اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگا۔ آخرت میں سرخروئی ملے گی۔"

"انشاء اللہ" وزیراعظم نے بے حد خلوص سے کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرایا "لیکن حضرت' یہاں بہت برا حال ہے۔ خزانہ خالی ہے' امداد بند ہوچکی ہے...."

"اسے امداد نہ سمجھو۔ دشمنوں کی امداد بھی ضرر رساں ہوتی ہے۔"

"اور حضرت' قومی معیشت قرض کے بوجھ تلے دبی سسک رہی ہے.... دم توڑ رہی ہے۔"

"غم نہ کرو۔ تم نے افراط دیکھی ہے' خیروبرکت نہیں۔ اللہ کی تائید سے واقف نہیں ہو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ جو کچھ زمینوں میں ہے اور آسمانوں میں ہے' صرف وہی جانتا ہے۔ اس کی عنایت ہوگی تو انشاء اللہ جو زمینیں فصلیں نہیں اگلتیں' وہ سونا اور قیمتی دھاتیں' ہیرے اور جواہرات' تیل اور گیس اگلنے لگیں گی۔ تم اللہ پر ایمان رکھ کر جستجو تو کرو۔ لو اب اپنی امانت سنبھالو۔"

مجھے اپنا تجربہ یاد آیا۔ میں نے کہنا چاہا کہ وزیراعظم یہ بھاری بوجھ نہیں اٹھاسکیں گے لیکن جیسے کسی نے میرے ہونٹ سی دیے۔ اور اگلے ہی لمحے یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وزیراعظم نے اس پوٹلی کو بہت آسانی سے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا" بابا عصر نے وزیراعظم سے کہا "اگر خدانخواستہ تم اہل ثابت نہیں ہوئے تو اس قوم کا عرصہ ابتلا اور طویل ہوجائے گا۔ پھر یہ کام تمہارے پیش رو کو کرنا ہوگا۔ لیکن تم ذاتی طور پر زیادہ بڑے نقصان میں رہوگے۔ تم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی محروم رہ جاؤ گے اللہ کے انعام سے۔ جو ہونا ہے' وہ تو ہوکر رہے گا اور اللہ کی مرضی نہیں ٹلتی۔ وہ جس سے جو کام چاہے' لے سکتا ہے۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں یہ سعادت مل رہی ہے۔"

"میں یاد رکھوں گا میرے محترم بزرگ!" وزیراعظم نے بے حد احترام سے کہا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ اللہ تمہیں ہمت' استقامت اور سرخروئی عطا فرمائے۔ فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔"

میں بابا عصر کے ساتھ گیٹ کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اچانک عقب سے ہمیں وزیراعظم نے پکارا۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا محترم بزرگ!" وزیراعظم نے ہماری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ آفاق ہے.... کہانیاں لکھتا ہے" بابا عصر نے کہا "اور میں وہ ہوں' جس کی قسم کھا کر اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے.... اور جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

میں حیران رہ گیا مگر مجھ سے زیادہ حیران وزیراعظم تھے۔ بلکہ وہ تو ہل کر رہ گئے تھے۔ ہم پلٹے اور چل دیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وزیراعظم اسی جگہ کھڑے تھے۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ میں موجود رومال کو دیکھتے تھے اور کبھی بابا عصر کو۔ اس دوران میں کئی بار انہوں نے سر جھٹکا۔

میں نے بابا عصر سے کہا "تو آپ...."

"ہاں۔ کم از کم تمہیں تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا" وہ بولے۔ "کتنے اشارے تھے تمہارے سامنے۔ میں کبھی رکتا نہیں' ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ میری اپنی رفتار ہے۔ میرے ساتھ چلنے والے وہ لوگ فائدے میں رہتے ہیں' جنہیں ان کے اوصاف کی وجہ سے اللہ نے خسارے والوں سے مستثنیٰ کیا ہے۔"

"لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آپ رکے ہوئے تھے؟" میں نے اعتراض کیا۔

"تو ابھی کچھ رک گیا تھا نا۔ اس وقت کوئی ہمارے درمیان مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔"

یہ بات درست تھی۔ مجھے اس کا احساس ہوا تھا۔

"میں اپنے بارے میں کہہ رہا تھا" بابا عصر پھر گویا ہوئے "جو مجھ سے نظریں چرائیں' میری شکایت کرتے رہیں' رونا روتے رہیں'

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹس فلائیٹ اسٹیوارڈ		بیوٹی پارلر کورس
اردو مڈل کورس (تعلیم بالغاں)	ڈرافٹسمین	ایئر ٹکٹنگ	ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
ریڈیو ٹی وی وی سی آر ٹیکنیشن	الیکٹریشن	کمپیوٹر	اسکول ٹیچنگ میتھڈ
انٹیریئر ڈیکوریشن	فوٹوگرافی	صحافت	امپورٹ ایکسپورٹ
فزیکل بیوٹی اینڈ سلمنگ	شمسی توانائی	کوکنگ بیکنگ	فلاور میکنگ
آئل پینٹنگ	میڈیکل ایڈ	ڈینٹل ٹیکنیشن	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (پوربلر زراعت)	پبلک ریلیشن آفیسر	نیوز رپورٹر	مہر سازی

یہ تمام کورسز اردو میں سینکڑوں تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹیڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک لڑکے لڑکیوں کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس 1237
جی پی او اسلام آباد

میں ان لوگوں کے لیے سخت ہوں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی تمہیں بتایا تھا کہ جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں' میں ان کے لیے نرم ہو جاتا ہوں۔"

"جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ واقعی مجھے آپ کو اسی وقت پہچان لینا چاہیے تھا" میں نے شرمندگی سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا "مجھے ایک اور بات پر حیرت ہے۔ وہ پوٹلی تو بہت بھاری تھی۔ میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا' وزیراعظم نے وہ کیسے اٹھالی؟"

بابا عصر مسکرائے "اللہ جب کسی کو کوئی بوجھ دیتا ہے تو اس کے لیے طاقت اور ظرف بھی عطا فرماتا ہے۔ وہ بوجھ تمہارے وزیراعظم کا تھا سو انہوں نے اٹھالیا۔ تمہارا نہیں تھا' تم سے اٹھایا نہیں گیا۔"

چند لمحے بعد میں نے پوچھا "بابا.... ہم کراچی کب پہنچیں گے؟"

"کراچی؟ تو اس وقت ہم کہاں ہیں؟" بابا نے حیرت سے کہا۔

"جی....!" میں نے سر گھما کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میں کراچی میں ہی نہیں' اپنے گھر کے بہت نزدیک تھا۔ سامنے وہ بلڈنگ نظر آرہی تھی جس میں میرا فلیٹ تھا۔

"اب میں چلتا ہوں" بابا عصر نے کہا۔

"رات کو ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اب شاید ہم کبھی نہ ملیں" انہوں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ بہت دور جا چکے تھے۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں گھر جانے کے بجائے مسجد کی طرف چل دیا۔ فجر پڑھنے کے بعد میں گھر آیا۔ نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ میں لکھنے بیٹھ گیا۔ شاید نیند اس لیے رکی ہوئی تھی کہ میں وہ سب کچھ لکھ لوں' جو اب خود بھی' مجھے خواب سا لگتا ہے۔ وہ سب لکھنے کے بعد مجھے نیند آگئی' میں سو گیا۔

○☆○

ایک مہینہ گزر گیا۔ یہ اگست کا مہینہ ہے۔ میں متجسس بھی ہوں اور بے چین بھی۔ میں روز اسلام اور پاکستان کی عظمت اور سربلندی کے خواب دیکھتا ہوں لیکن جاگنے کے بعد مجھے زوال اور ابتری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خوف' بے یقینی اور انتشار ہے۔ میں مایوس ہونے لگتا ہوں۔ ایسے میں میرے اندر ایک پُراعتماد آواز ابھرتی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے' ہو کر رہے گا۔ ٹل نہیں سکتا۔ کب ہوگا' یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بس تم دعا کرتے رہو۔ ہر گزرتے دن کی امید آنے والے دن کو سونپتے رہو۔ سو میں یہی کرتا ہوں۔

مجھے تجسس ہے۔ نہ جانے وہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچیں یا نہیں۔ بابا عصر نے کہا تھا کہ اگر آخری آدمی نااہل ثابت ہوا تو اشرفیاں ان کے پاس واپس آجائیں گی۔ پھر وہ انہیں اگلے آخری آدمی کے سپرد کردیں گے' عرصۂ ابتلا ذرا طویل ہو جائے گا۔

میں عشا کے بعد ہر روز اس امید پر ٹہلتا ہوں کہ شاید بابا عصر سے ملاقات ہو جائے۔ ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اشرفیاں ان کے پاس پہنچی ہیں یا نہیں۔ لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ کل میں حارث بن عثمان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی بابا عصر کو کہیں نہیں دیکھا "تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے اپنی پریشانی بتادی۔

وہ مسکرائے "اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم نے اپنا کام کردیا۔ اللہ مسبب الاسباب ہے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن کب؟"

"جب اس کی مرضی ہوگی" حارث نے دو ٹوک جواب دیا۔ ان کی انگلی آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

"میں کیا کروں؟ بے حد مضطرب ہوں۔"

"اپنا کام کرتے رہو۔" حارث بن عثمان نے کہا "ہر پاکستانی کو پیغام پہنچادو کہ سب کچھ بھول کر اللہ کی رسی تھام لے۔ محنت اور دیانت کو اپنائے۔ اللہ کے خوف کو دل میں بسائے۔ اللہ پر توکل کرے۔ اس سے خیروبرکت مانگے.... اپنے لیے بھی اور اس محبوب وطن پاکستان کے لیے بھی۔ اپنے عمل اور کردار سے خود کو تیار کرتا رہے تاکہ وقت آئے تو وہ سعادت مندوں میں سے ہو نہ کہ سرکشوں اور نافرمانوں میں سے۔ کہہ دو کہ اللہ کے عطا کردہ اس پاک وطن کے مفاد کو جان سے عزیز جانو۔ پریشانیوں سے نہ گھبراؤ۔ تمہیں غلام بنانے کا خواب دیکھنے والے کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ یہ رات سدا رہنے والی نہیں۔ اس سے گھبرا کر ان تیرہ بختوں میں شامل نہ ہو جانا' جو اس رات کا حصہ بننے والے ہیں۔ جنہیں ظلمتوں میں کھو جانا ہے۔ اللہ کی عبودیت' رسول کریمؐ کی سیرت پاک کی پیروی' دین کی پاس داری' استغفار کی تسبیح اور قوم اور وطن کی سچی محبت کا زادِ راہ لے کر اس روشن صبح کا صبر کے ساتھ انتظار کرو' جو اللہ کے حکم سے بالآخر آنی ہے۔ تب تمہارے لیے اجر ہی اجر ہوگا۔ اللہ کا انعام ہوگا۔"

میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ سے تائید طلب کرتا ہوں۔ اللہ آپ سب پاکستانیوں کو.... اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو سلامتی اور خیروبرکت سے نوازے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اللہ ہم سب کو سیدھا راستہ دکھائے اور گمراہی سے نکالے۔ اللہ ہمیں جذبۂ جہاد سے نوازے۔ اللہ اسی لمحے سے ہماری زندگی میں وہ انقلاب لائے' جو ہدایت آفریں ہو۔ جو ہمیں صرف اس کا مطیع و فرماں بردار بنادے' آمین۔

مگر میں اب بھی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر خدانخواستہ وہ اشرفیاں ابھی تک قومی خزانے میں نہیں پہنچی ہیں تو کب پہنچیں گی.... اور یہ سعادت کسے ملے گی؟

ملک میں در آنے والے ایک موذی مرض ایڈز کا حوال جس کی تباہ کاریاں ایٹمی جنگ سے زیادہ ہیں!

ایک گمبھیر مسئلہ جس سے صحیح طور پر نمٹنے میں ہی ہماری آیندہ نسلوں کی بقا مضمر ہے

اچھوت

علیم الحق حقی

فطرت کے وضع کردہ اصولوں کی خلاف ورزی تباہی کا سبب ہے۔ ان اصولوں کے تحت زندگی گزارنے میں ہی آدمی کی بھلائی ہے۔ فطرت سے اختلاف کرنے والے... اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے آخرکار قدرت کی سخت گرفت میں آجاتے ہیں۔ ایسے میں اپنے اعمال کی پاداش کو قدرت کی بے رحمی اور ظلم کا نام دینے والے یہ نظرانداز کر دیتے ہیں کہ قدرت انسانیت کی فلاح چاہتی ہے نہ کہ تباہی!

اس داستان کا مرکزی کردار ان قوانین سے آگاہ بھی تھا اور ان پر عمل پیرا بھی لیکن ایک روز اُسے ان گناہوں کا سزاوار ٹھہرا دیا گیا جو اُس کے خیال میں اُس نے نہیں کیے تھے۔ اس موذی مرض کے شکنجے میں تھا جس کا دوسرا نام ایڈز یا موت ہے۔ ایک الزام، ایک گالی کی صورت یہ مرض اُس کے احساسِ بے گناہی کو لاحق تھا... لیکن اُسے بے عزتی کی موت قبول تھی نہ اچھوت بن کر زندہ رہنا۔ اُس کے پاس مہلتِ حیات کم تھی اور فرصتِ غم بالکل نہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا نے اُسے دنیا سے انتقام لینے کی راہ پر ڈال دیا۔ مگر فطرت نے اپنے اسیروں کو کب گمراہ اور بے آسرا چھوڑا ہے۔ وہ اُس وقت بھی اُن کی رہنمائی کرتی ہے جب وہ مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیروں میں گھر کر اپنی راہ سے ہٹ رہے ہوتے ہیں اور اس میں بھلا کیا شک ہے کہ پارسائی کے صلے میں بدکاری کی سزا جھیلنے والے بھی اگر لغزشوں سے بچتے رہیں تو آزمائش سے سرخرو گزر سکتے ہیں۔

بشیر کو وہ گاہک اچھا نہیں لگا تھا!

وہ طارق روڈ کی ایک اعلیٰ درجے کی ہیئر شاپ تھی.... ائرکنڈیشنڈ۔ وہاں صرف متمول لوگ ہی آتے تھے۔ کیونکہ وہاں خدمات کی اجرت بہت زیادہ وصول کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود گاہک کاریگر کو بھاری ٹپ بھی دیتے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی کنگلا وہاں گھس آئے اور بال بنوانے یا شیو کرانے کے بعد اُجرت پر ناک بھوں چڑھائے اور ٹپ دیئے بغیر چلتا بنے۔ زیادہ تر تو لگے بندھے گاہک ہی ہوتے تھے۔ مگر بشیر جانتا تھا کہ ہر آنے والے کو معزز سمجھنا اور اسے سر کہہ کر بات کرنا ضروری ہے۔ وہ بہت اچھا کاریگر تھا۔ اسی لیے وہاں کام کر رہا تھا۔ ٹپ بہت اچھی ملتی تھی۔ آمدنی کافی تھی لیکن کسی گاہک کی شکایت پر اچھے سے اچھے کاریگر کو نکالا جاسکتا تھا۔ اچھے کاریگروں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اچھے گاہک بہت اہم تھے۔

یہ گاہک عام سی شلوار قمیص پہنے تھا۔ اُس کی گھنی داڑھی بہت بے ترتیب تھی' دکان میں داخل ہوتے وقت وہ نروس تھا۔ لگتا تھا خود اعتمادی اسے چھو کر نہیں گزری ہے۔ وہ آکر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ بدقسمتی سے اِس وقت صرف بشیر ہی فارغ تھا۔ چنانچہ اسے مودبانہ انداز میں کہنا پڑا "اس کرسی پر تشریف لے آئیں سر۔"

گاہک اُس کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے بال چھوٹے کرانے ہیں۔ بہت چھوٹے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"بہت بہتر سر۔"

بشیر نے صاف ستھری چادر لپیٹی اور اس کے بال تراشنے میں مصروف ہوگیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ائرکنڈیشنڈ ماحول میں بھی اس شخص کو پسینہ کیوں آرہا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت نروس تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلی بار ایسی کسی دکان میں بال ترشوا رہا تھا۔

بشیر اپنا کام کرتا رہا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ بے دھیانی میں بھی کبھی اُس کا ہاتھ نہیں بہکتا تھا۔ مگر جو کچھ ہوا' وہ جانتا تھا کہ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قینچی سے کانوں کے اوپر کے بال ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کام میں قینچی کی نوکیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اچانک گاہک نے یوں سر جھٹکا' جیسے جسم کے کسی حساس حصے پر مکھی بیٹھ گئی ہو۔ حالانکہ دکان میں مکھی کا کوئی کام نہیں تھا۔ قینچی اس وقت گدی کی طرف نیچے کا سفر کر رہی تھی۔ اس کی نوکیں نرم گوشت میں دھنس گئیں۔ سرخ خون کی ایک چھوٹی سی بوند ابھر آئی اور بتدریج بڑی ہونے لگی۔ بشیر کا چہرہ فق ہوگیا۔ اسے ڈر تھا کہ گاہک اس پر برسے گا۔ پھر دکان کا مالک آئے گا اور.....

وہ سحر زدہ سا خون کی اس بڑی ہوتی بوند کو دیکھتا رہا۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ اُس کے ہاتھوں....

"کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی تھی۔"

بشیر نے چونک کر گاہک کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ بے حد سرد لگ رہی تھیں

"سوری سر" بشیر نے کہا۔

"میں نے کہا نا' غلطی میری تھی۔ کبھی کبھی میں اپنی جھرجھری پر قابو نہیں رکھ پاتا ہوں۔ تم ایسا کرو' یہاں آفٹر شیو لوشن لگادو۔"

"ضرور سر" یہ کہہ کر بشیر نے آفٹر شیو لوشن کی شیشی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ہاتھوں کے لمس سے حتی الامکان بچتا ہوں۔" گاہک نے اسے پھر چونکا دیا "لوشن ہاتھ سے نہیں لگانا۔ کوئی اسپرے لوشن نہیں ہے تمہارے پاس؟"

اُس لمحے بشیر اس گاہک کے بارے میں رائے بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ اب گاہک کے لہجے میں خود اعتمادی بلکہ سختی تھی اور لگتا تھا کہ وہ ایسی ہی دکانوں میں بال ترشواتا رہا ہے۔

"کیوں نہیں سر ابھی لیجئے۔" بشیر نے کہا۔ اب اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا اور وہ نروس ہوگیا تھا۔

اُس نے دوسری شیشی اٹھا کر اس کے زخم پر لوشن لگایا اور دوبارہ سوری کہا۔ گاہک اس بار خاموش رہا۔ بشیر اب جلد از جلد اسے نمٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ انداز میں عجلت لائے بغیر ہاتھ چلاتا رہا۔ مگر آخری مرحلے میں پھر گڑبڑ ہوگئی۔ اس بار وہ گدی کے نیچے کے بال استرے سے صاف کر رہا تھا کہ گاہک کا جھرجھری کا مرض پھر عود کر آیا۔ اس بار بھی کٹ خاصا گہرا تھا۔ لیکن گاہک کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا ہے۔ بشیر نے پف کی مدد سے پاؤڈر لگایا اور برش سے پاؤڈر اور بال جھاڑ دیئے۔ پف پر خون کا داغ لگ گیا تھا۔

"خط بنوائیں گے سر؟" بشیر نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن داڑھی چھوٹی نہ کرنا۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"اور ہاں' یہ نصف بلیڈ والا استرا استعمال نہ کرنا۔" گاہک نے کہا "مجھے وہی پرانا پھل والا استرا پسند ہے۔"

بشیر کو حیرت نہیں ہوئی۔ اکثر ایسے گاہک آتے تھے' جو پھل والے استرے سے شیو کراتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نیا استرا جس میں ہر بار نیا نصف بلیڈ لگا دیا جاتا تھا' اسے بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اسے بہت ہلکا لگتا تھا۔

"جی بہتر سر۔"

"اور اس بار میرے گلے پر مشق ستم نہ کر بیٹھنا۔" گاہک نے شگفتگی سے کہا لیکن اس کے لہجے میں سنگینی تھی۔

اس بار بشیر سچ مچ نروس ہوگیا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کام کے دوران کبھی اُس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہوئی ہو' مگر اس وقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بار گھاؤ اس کی ہی غلطی سے لگا۔ اس کا ہی ہاتھ بہکا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی۔ نروس کیوں ہو؟" گاہک نے سخت لہجے میں کہا۔

"سوری سر۔ یقین کریں' پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔" بشیر ہچکچانے لگا۔

"چلو خیر۔۔۔ لیکن اس بار وہ لوشن نہ لگانا۔ اس کی خوشبو مجھے اچھی نہیں لگی ہے۔ اور ہاں۔۔۔ لوشن ہاتھ سے نہ لگانا۔"

بشیر اسے ہر قیمت پر خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ الماری میں سے ایک اور لوشن نکال لایا۔

کام مکمل ہوا تو گاہک نے کہا "اب تم میرے بال دھو ڈالو اور پھر کلر لگا دینا۔۔۔ لائٹ براؤن۔"

بشیر کٹنگ کے دوران دیکھ چکا تھا کہ گاہک کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں لیکن اسے رنگ کے انتخاب پر حیرت ہوئی کیونکہ اس کے بالوں کی قدرتی رنگت سیاہ تھی۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

بشیر کو ٹپ کی مطلق امید نہ تھی۔ اُس نے شیمپو سے بال دھوئے۔ پھر کلر کیا۔ اس کے بعد گاہک کو ایک میگزین تھما کر بال خشک ہونے کے وقفے میں اس نے ایک اور گاہک کو نمٹایا۔ پھر آخری بار بال دھوئے۔

اس گاہک پر اس نے ڈیڑھ گھنٹا صرف کیا تھا اور بے سود۔ گاہک کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے اُس کی طرف آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ گاہک نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کے چند نوٹ تھمائے تو وہ حیران رہ گیا۔

"میں اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرتا ہوں۔" گاہک نے مسکراتے ہوئے کہا "اور تم اچھے کاریگر ہو۔"

بشیر نے اُس کے باہر نکلتے ہی اطمینان کی سانس لی اور نوٹوں کو دیکھا۔ وہ چالیس روپے تھے۔۔۔ یعنی پچیس فیصد ٹپ!

○☆○

باربر شاپ سے نکلنے کے بعد اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں رہی تھی!

اسے اپنا نام' اپنی شخصیت بدلنے میں ڈیڑھ ماہ لگا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے تک وہ کروڑ پتی صنعت کار عاصم قریشی تھا۔ مگر اب وہ مرشد حسین تھا' جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا چہرہ اب کلین شیو نہیں تھا بلکہ مونچھوں اور گھنی داڑھی کے حصار میں آگیا تھا۔ پیچھے جانے والے بالوں میں اب مانگ نکلی ہوئی تھی اور وہ انہیں دونوں جانب کنگھا کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیشانی پہلے جیسی کشادہ نہیں لگتی تھی۔ بالوں کی رنگت بھی اس نے تبدیل کرلی تھی۔ بال وہ پہلے بھی رنگواتا تھا اس لیے کہ صرف بیس سال کی عمر میں اس کا آدھا سر سفید ہوچکا تھا۔ مگر پہلے وہ اُن پر سیاہ رنگ کراتا تھا جو اس کے بالوں کا قدرتی رنگ تھا۔ اب اس نے بالوں کو لائٹ براؤن رنگت دے دی تھی۔ اس کی وجاہت اور خوب روئی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید وہ پہلے سے زیادہ وجیہہ اور خوب رو لگ رہا تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ دیکھنے میں وہ تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مگر پچھلے دو ماہ میں اس کے چہرے پر لکیروں نے جالے بُن دیئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس پر گزری ہی کچھ ایسی تھی۔

اسے گھر سے نکلے دو ماہ ہو چکے تھے۔ فوزیہ اور بالخصوص بچے اسے رہ رہ کر یاد آتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اُن کے لیے مر چکا ہے۔ ان بدنصیبوں کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ باپ کے زندہ ہوتے یتیم ہو جائیں۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی معاشرے کی نظروں میں مجرم تھا۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے انگشت نمائی کا باعث بنے۔ اس لیے وہ چپکے سے ان کی دنیا سے نکل آیا تھا۔

اور اب اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کا وجود انتقام کی آگ میں پھنک رہا تھا۔

○☆○

روزنامہ سویرا کا رپورٹر وحید نجمی پاک لیب میں ڈاکٹر نجیب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ نجیب اور وہ پرانے دوست تھے۔ انٹر تک دونوں ساتھ ہی پڑھے تھے۔ پھر ان کی راہیں جدا ہوگئی تھیں لیکن اُن کا ایک دوسرے سے رابطہ نہیں ٹوٹا تھا۔ ان میں سب سے بڑی قدر مشترک دردمندی اور انسان دوستی تھی۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس سلسلے میں کام کرتے تھے۔ دونوں کی اپنے اپنے میدان میں ایک ساکھ تھی۔

"کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟" نجمی نے نجیب سے پوچھا۔

"ہاں پریشان تو ہوں۔"

نجمی نے محسوس کیا کہ نجیب کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا "اور سناؤ میرے مشورے پر عمل درآمد کے بعد سے اب تک کوئی پروگریس بھی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"اسی سلسلے میں تو پریشان ہوں۔" نجیب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایک کیس سامنے آیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو مستقل ہماری خدمات حاصل کرتا ہے۔" نجیب نے کہا "وہ باقاعدگی سے کولسٹرول اور شوگر چیک کراتا ہے۔"

نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا "تو پھر؟"

"وہ رپورٹ لینے آیا تو میں نے اسے بلوالیا۔ میں نے بڑی نرمی اور ہمدردی سے اسے سمجھایا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون رہا۔ بس اس نے ایک بار اتنا کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر۔ میں نے اسے ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

"دو ماہ سے زیادہ ہوگئے۔"

"اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا۔"

"تم بھول رہے ہو بھائی کہ تم ایک مصروف صحافی ہو۔" نجیب

نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "اس عرصے میں تم وزیراعظم کے ساتھ بیرون ملک سفر کرتے رہے ہو۔"

"اوہ سوری' مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ خیر' پھر کیا ہوا؟"

"وہ ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔ اُس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ اُس نے جاتے وقت کہا تھا..... مجھے یقین ہے ڈاکٹر کہ ایسی کوئی بات میرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے کسی سے۔ ایک ہفتے بعد وہ نہیں آیا تو میں نے اس کے گھر فون کیا۔ اس کی بیوی سے پتا چلا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں امریکا گیا ہے۔ ایک ماہ بعد واپس آئے گا۔ میں اُس کیس کو پہلے ہی محکمہ صحت کے حوالے کرچکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُسے ان کے پاس بھیج دوں۔"

"تو پھر؟"

"اب اُس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے۔ میں نے ایک ماہ انتظار کیا۔ پھر دوبارہ فون کیا اُس کے گھر۔ اس بار اُس کی بیوی پریشان تھی۔ وہ شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکی تھی۔ اس بات کو تقریباً ایک ماہ ہوچکا ہے۔ پولیس بھی اُس کی تلاش میں ناکام رہی ہے۔"

"پولیس مجرموں کو تلاش نہیں کرپاتی' جن کی تعداد بہرحال شرفا کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کو کیا تلاش کرے گی۔" نجمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بہرحال محکمہ صحت والوں کا نزلہ مجھ پر گر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کو خود ہینڈل کرنے کی بجائے صرف انہیں مطلع کردینا چاہیے تھا۔ وہ خود دیکھ لیتے' اس معاملے کو۔"

"کیا دیکھ لیتے' ہوتا پھر بھی یہی۔"

"اس ملک میں تو پتلی گردن ہی ڈھونڈی جاتی ہے نا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ اس معاملے میں' میں صرف مخبر کا رول ادا کروں۔"

"تو یہ ہے تمہاری پریشانی کا سبب۔" نجمی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ ایسا ہے جیسے کوئی پاگل کتا بھرے شہر میں آزاد پھر رہا ہو۔ اب وہ جسے بھی کاٹے گا اُس کی موت اور اس کے گھرانے کی تباہی کا ذمے دار میں ہوں گا۔"

"بھائی وہ کتا نہیں' انسان ہے۔" نجمی نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" نجیب نے شرمندگی سے کہا "یہ میں نے محکمہ صحت والوں کے الفاظ دہرائے تھے۔"

"ویسے تمہارا اندازہ کیا ہے۔ تمہارا مریض کیا سوچ کر بھاگا ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" نجیب نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت اُس نے کہا کہ یہ ناممکن ہے' اس کے لہجے میں وہ اعتماد تھا' جو ایک صاف ستھری زندگی گزارنے والے ہی کا ہو سکتا ہے۔ اُس کے لہجے میں اعتماد ہی نہیں چیلنج بھی تھا۔ بعد میں اس نے میری بات پر غور کیا ہوگا تو اس پر نجانے کیا گزری ہوگی۔ وہ بہرحال بہت بڑا دھماکا تھا اُس کے لیے۔ لیکن ہم کسی کے ردعمل کا درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بہرکیف مجھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ غائب ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس کا نام پتا بتاؤ۔" نجمی نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ کچھ پیشہ ورانہ اخلاقی ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ میں کسی مریض کو ایکسپوز نہیں کرسکتا۔ اس کی بیماری کا راز....."

"قومی ذمے داری ہر اخلاقی ضابطے سے بڑی ہوتی ہے۔ کیا تمہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں؟"

"اندازہ تو ہے لیکن....."

"تمہیں اندازہ نہیں ہے۔" نجمی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "تصور تو کرو کہ اس کے نتائج کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ڈاکٹر نجیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں نہیں چاہتا کہ اُس کا نام اچھالا جائے۔"

"میں صرف اسے تلاش کروں گا۔ یہ میرے لیے محض اسٹوری نہیں ہے۔"

○☆○

نجمی کاظم قریشی اور حال کا مرشد حسین بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک وہ ایک بار بھی بھرپور نیند نہیں لے سکا تھا۔ زہریلی سوچوں نے اس کے پورے وجود کو تلخ کرکے رکھ دیا تھا۔

اُس دن' اُس وقت اور اُس بھیانک لمحے کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا جس نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اب اس بات کو دو ماہ سے اوپر ہوچکے تھے۔ وہ اُس روز اپنے خون کے ٹیسٹ کی رپورٹ لینے پاک لیب گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر رسید دی تو کلرک نے کہا "سر' آپ کی رپورٹ ڈاکٹر نجیب کے پاس ہے۔ آپ ان سے مل لیں۔"

اُس کا دل دھڑک اٹھا "خیریت تو ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے سر۔ وہ آپ کو کوئی مشورہ دینا چاہتے ہیں۔" کلرک نے بے حد خلوص سے کہا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ برسوں سے باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کرا رہا تھا۔ محض احتیاطاً تاکہ شوگر اور کولسٹرول نہ بڑھنے پائے۔ وہ جانتا تھا کہ صحت کی بہت اہمیت ہے۔ صحت نہ ہو تو دولت بھی بے کار ہے۔ مگر اب اُس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی..... شوگر یا کولسٹرول۔ اور اس میں اضافہ اتنا ہوگا کہ ڈاکٹر نجیب نے اسے مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

اُس نے دھڑکتے دل سے ڈاکٹر نجیب کے دفتر کے دروازے پر دستک دی "پلیز کم ان" اندر سے ڈاکٹر کی آواز آئی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھیے قریشی صاحب۔"

وہ بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ ان چند لمحوں کی خاموشی بہت سنگین تھی۔ ڈاکٹر کے انداز میں بھی ہچکچاہٹ تھی اور عاصم... وہ اُس سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ نجانے کیا سامنے آئے۔

آخر کار ڈاکٹر کی خاموشی ٹوٹی "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی لیکن یہ ضروری تھا۔"

عاصم خاموش رہا۔ وہ خود کو بُری خبر کے لیے تیار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بُری خبر کیسے سنائے۔ شاید اسی لیے اس نے بلا تمہید دھماکا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں سختی اور لہجے میں درشتی تھی "قریشی صاحب' آئی ایم سوری لیکن آپ کے خون میں ایچ آئی وی پازیٹو ملا ہے۔"

چند لمحے تو عاصم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بلکہ اس نے سکون کی سانس بھی لی۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ یہ شوگر کا یا دل کا کوئی سنگین معاملہ ہوگا لیکن پرسکون ہوتے ہی بات اُس کی سمجھ میں آگئی اور اسے زبردست شاک لگا۔ چند لمحے تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "آپ کا مطلب ہے ایڈز....؟"

ڈاکٹر نجیب نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی "آئی ایم رئیلی سوری قریشی صاحب' لیکن یہ حقیقت ہے۔"

عاصم کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن کسی نامعلوم حس نے اسے بتادیا تھا کہ اسے شدید ردعمل ظاہر کرنے سے بچنا ہوگا اور وہ حس بے حد قوی تھی۔ ذہن میں طوفان برپا ہونے کے باوجود وہ سوچ سکتا تھا کہ اسے تنہائی میں سکون سے اس پر غور کرنا... سوچنا ہوگا۔ قبل از وقت ردعمل تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ چہرے کو بے تاثر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا۔

اُس نے عجیب سی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر نظریں جھکائے بیٹھا تھا جیسے خود کو چور محسوس کر رہا ہو۔ اس حقیقت نے عاصم کو اور پُراعتماد بنادیا۔ اسے یہاں محض چند منٹ ایک رول پلے کرنا تھا اور وہ بھی نظریں جھکائے ہوئے مدافعت پر مائل ڈاکٹر کے سامنے۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔

"ڈاکٹر صاحب" اس نے پکارا۔

ڈاکٹر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر....." پھر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے اوور ری ایکٹ بھی نہیں کرنا ہے اور اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر کیا' دنیا کا کوئی شخص بھی اُس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ بے سود ہے۔ یہ دکھ وہ صلیب ہے جو اسے تنہا اپنے کندھوں پر اٹھانی ہے۔ اس نے بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں پُریقین لہجے میں دہرایا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ہمدردی اور تفہیم کی چمک ابھری جیسے وہ اس پانچ لفظی بلیغ جملے کے تمام معانی اور مفاہیم کو سمجھ چکا ہو "یہ ہر اعتبار سے ممکن ہے قریشی صاحب۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا "اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس میں آدمی کا قصور ہو۔"

عاصم بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر درست کہہ رہا ہے "تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اگلے ہفتے میرے پاس آئیں۔ اس دوران میں اور اچھی طرح چیک کرلوں گا۔" ڈاکٹر جانتا تھا کہ یہ دوبارہ چیک کرنا محض طفل تسلی ہے۔

"میں ضرور آؤں گا ڈاکٹر صاحب۔" عاصم نے اٹھتے ہوئے کہا "اس یقین کے ساتھ کہ آپ مجھے خوش خبری سنائیں گے کہ یہ محض ایک تکنیکی غلطی کا نتیجہ تھا۔"

ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ باہر آکر اسے احساس ہوا کہ اس نے خون کی رپورٹ تو لی ہی نہیں۔ پھر اس نے کندھے جھٹک دیے۔ اب کولسٹرول اور شوگر کی کیا اہمیت رہ گئی تھی!

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بجنے والے تھے۔ آفس جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے موبائل فون پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ کیا "رعنا... میں آج دفتر نہیں آسکوں گا۔ کوئی ضروری ملاقات یا مصروفیت تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔ رعنا نے نفی میں جواب دیا تو اس نے رابطہ منقطع کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی' جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر سوچ سکے۔ آخر کار اس نے گاڑی کا رخ کلفٹن کی طرف موڑ دیا۔ اولڈ کلفٹن تو عام حالات میں بھی سنسان رہتا تھا اور اس وقت تو شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی پارک کرکے وہ ساحل کی طرف چل دیا۔ دھوپ بہت ناگوار تھی لیکن اس وقت وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔

وہ ساحل کی نرم ریت پر ٹہلتا رہا۔ اپنی سوچوں اور اپنے ذہن کو مرتکز کرنا کارے دارد تھا۔ خیالات مختلف جہتوں میں دوڑ رہے تھے لیکن اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ اُس کے لیے ذہن کو یکسو کرنا ضروری تھا۔

فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اپنے جیتے جی اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنا کوئی مذاق نہیں تھا لیکن اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جس گناہ گار معاشرے میں جی رہا تھا اس

سے خوب واقف تھا۔ یہاں برسوں سے یہ رسم چلی تھی کہ اپنا قد بڑھانے کی زحمت کوئی نہیں کرتا تھا۔ گرنے والوں کو لاشوں کی طرح ایک دوسرے پر رکھ کر اُن پر چڑھ کر خود کو اونچا کیا جاتا۔ کوئی خود نہ گرتا تو لوگ تاک میں لگے رہتے کہ اڑنگا لگا دیں یا دھکا دے دیں۔ کسی کا گناہ سامنے آجاتا تو گناہ گاروں کی جیسے عید ہو جاتی۔ سب اپنے اپنے تمام گناہوں کی سزا بھی اسے دینے کی کوشش کرتے۔

اور اب اس دور میں خدا کے قہر کی وجہ سے گناہ گاروں کی نقاب کشائی عام ہو گئی تھی۔ گناہ گاروں کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے۔ عام قسم کے گناہ گار حد درجہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ صاحب اقتدار ہوتے ہیں کچھ اس لیے کہ ان کے پاس دولت کی طاقت ہوتی ہے اور کچھ اس لیے کہ انہیں ابھی بہت عرصے زندہ رہنے کا یقین ہوتا ہے۔ وہ چڑھتے سورج جیسے گناہ کی بھی تردید کرتے ہیں۔ بلکہ الزام لگانے والوں پر بھی جوابی حملے شروع کر دیتے ہیں۔ جرم کی صحت قبول کرنا تو دور کی بات ہے' وہ اپنے خداداد اقتدار اور اختیار سے دست بردار ہونا بھی قبول نہیں کرتے' جو اُن پر اخلاقاً واجب ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ یہ معاشرہ اخلاقی انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہے۔

مگر وہ گناہ گار جسے یہ علم ہو جائے کہ موت اس پر حملہ آور ہو چکی ہے اور اب وہ دنوں' ہفتوں' مہینوں یا چند برسوں کا مہمان ہے' وہ تو جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری ڈھٹائی' تمام تاویلیں اور جوابی الزامات دوسروں کی عیوب کشائی' سب کچھ زندگی کے یقین سے وابستہ ہوتا ہے۔ حالانکہ زندگی کا یقین تو صحت مند آدمی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ مگر یہاں بات شاید موت کے یقین کی ہے۔ یقینی موت سامنے ہو تو ہر چیز اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ آدمی جان لیتا ہے کہ عمر بھر جس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا رہا' جس سے نظریں چراتا رہا' اب اسے بہرحال اس کا سامنا کرنا ہے۔ تب اس کے پاس صرف پشیمانی اور خوف رہ جاتا ہے۔ اپنے خالق' اپنے رب کا سامنا کرنے کے تصور سے اس پر لرزہ طاری رہتا ہے۔

اب یہاں معاشرے کے مزاج کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اکڑ کر' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تردید جرم پیش کرنا' تاویلات گھڑنا اور جوابی حملے کرتا ہوا طاقت ور گناہ گار محترم ہی رہتا ہے اور وہ جو گناہ کی پاداش میں جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن گیا ہو' اسے پورا معاشرہ ملامت اور طعنوں کی پھونکوں سے بکھیر دینے پر تل جاتا ہے۔ اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے جیسے وہ قبل از مسیح کا کوڑھی ہو۔

اور پھر کوئی ایسا شخص جو بے گناہ ہو لیکن سزا اسے گناہ گاروں کی مل رہی ہو۔ ایسے شخص کا کیا حشر ہوگا۔ وہ تو دہرے کرب میں زندگی گزارے گا۔ ایک تو ناکردہ گناہ کی سزا کا کرب اور دوسرے یہ کرب کہ کوئی اُس کی بے گناہی تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ اچھوت بن کر رہے گا' زمانہ قبل از مسیح کے کوڑھی کی طرح۔ اور یہاں تو اس کے ساتھ اس کی بے گناہ بیوی اور معصوم بچے بھی اچھوت بن کر رہ جائیں گے...

عاصم نے جھرجھری لی اور اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ اس وقت اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ موجوں کا شور سن کر اُس نے چونک کر دیکھا تب اسے یاد آیا کہ وہ ساحل کی ریت پر چلتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ یہ آخری خیال بے حد روح فرسا تھا۔ فوزیہ' پانچ سالہ سلیم اور تین سالہ ملیحہ... ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن بے قصور تو وہ خود بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ اُس کے اور اُس کے خدا کے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا۔ اس بار خدا کا خیال آتے ہی اس کا وجود غصے سے کانپنے لگا "کیوں دی ہے تو نے مجھے یہ سزا؟" وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چلایا "جبکہ میں اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟"

مگر اوپر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ بلکتا جھنکارتا رہا۔ آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا... نڈھال!

بھڑاس کسی حد تک نکل چکی تھی۔ اب وہ نسبتاً پرسکون انداز میں سوچ رہا تھا۔ بیوی بچوں کی خاطر اسے جیتے جی مرجانا تھا۔ اس میں ان کی بھی بہتری تھی اور خود اس کی بھی۔ وہ عزت سے مرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ حق خدا نے اُس سے چھین لیا تھا۔ پھر بھی اسے کوشش کرنا تھی۔ اور کوشش میں کامیابی کا امکان بھی تھا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ بچوں کے مستقبل کو وہ بہ آسانی محفوظ کر سکتا تھا۔ اس طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے مشن کی طرف توجہ دینا تھی۔ اب جتنی بھی زندگی رہ گئی تھی اس میں اسے یہی ایک کام کرنا تھا جس کا مقصد تھا انتقام۔

"دنیا نے جس بھی شکل میں اور جس بھی روپ میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں" وہ ساحر کے شعر کو تصرف کے ساتھ گنگناتا رہا۔ وہ ساحل پر ٹہلتے ہوئے اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ شام ہوئی تو وہ گھر میں آخری رات گزارنے کے لیے چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے فوزیہ کو بتایا کہ وہ بزنس کے سلسلے میں اگلے روز امریکا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فوزیہ جانتی تھی کہ جب سے اس کے سر میں امریکا میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا سودا سمایا ہے' وہ اچانک ہی امریکا کا رخ کرتا ہے۔

اُس رات وہ ایک پل بھی نہیں سویا۔ سلیم اور ملیحہ کو خود سے لپٹائے ہوئے وہ رات بھر جاگتا رہا۔ وہ اپنے جگر گوشوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا تھا۔ لیکن وہ شدید خواہش کے باوجود انہیں پیار کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ اپنے بچوں کے معاملے میں آدمی کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔

وہ عاصم قریشی کی آخری رات تھی۔

اور اب اسے اپنے مشن کا آغاز کیے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی اب تک کی کارگزاری کے بارے میں سوچا اور اس کے نتائج کا تصور کیا۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ایک لمحے کو مچلی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا کر رہا ہوں میں۔ یہ تو ٹھیک نہیں" وہ لرزیدہ آواز میں بڑبڑایا۔

اور جیسے جیسے وہ سوچتا گیا یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ واقعی' اس نے اس انداز میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچتا بھی کیسے۔ اس کا ذہن' اس کی سوچیں.... سب کچھ تو مسخ ہو چکا تھا۔ جس شخص پر اتنی بڑی قیامت گزری ہو وہ بھلا سوچنے کے قابل رہ سکتا ہے۔ اس نے تو خدا سے بھی بغاوت کر دی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یہ رہنمائی خدا نے ہی کی تھی۔

اب وہ سوچنا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ایسے نہیں' سکون سے۔ اس نے خود کو تلقین کی۔ یہ نیند سے محروم دماغ ٹھیک طرح سے نہیں سوچ سکتا۔ تمہیں ایک اچھی نیند لے کر خود کو تازہ دم کرنا ہوگا ورنہ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ بے بسی سے مرنے کے سوا۔

اس نے دراز کھول کر وہ لیم کی پانچ ملی گرام کی دو ٹکیاں نکالیں' اٹھ کر کولر سے پانی لیا اور دونوں ٹکیاں حلق سے اتار لیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک نیند کی دوا اس کے لیے بے اثر ثابت ہوئی تھی لیکن اس وقت نیند کی ضرورت کا جواز بہت مضبوط تھا۔ وہ خود سے اپیلیں کرتا رہا۔ آخر کار اسے نیند آگئی۔

○☆○

وحید نجمی سب سے پہلے کلفٹن تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر شہاب سے ملا۔ وہاں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ سنسنی خیز تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ عاصم قریشی سرے سے امریکا نہیں گیا تھا۔

"ہمارے ہاں رپورٹ ایک ماہ بعد درج کرائی گئی تھی۔" انسپکٹر شہاب نے بتایا "اس کی بیوی مطمئن تھی کہ وہ امریکا گیا ہوا ہے۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ تب وہ ہمارے پاس آئی۔ ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کا ریکارڈ چیک کیا۔ لیکن پاکستان سے باہر جانے والوں میں اُس کا نام نہیں تھا۔"

"پھر؟" نجمی نے پوچھا۔

"ہم نے معمول کے مطابق کارروائی شروع کی۔ اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ پھر اس کی سیکریٹری سے۔ سیکریٹری نے بتایا کہ عاصم قریشی نے سختی سے اسے ہدایت کی تھی کہ اُس کے بارے میں کوئی بھی پوچھے تو یہی بتایا جائے کہ وہ امریکا گیا ہوا ہے۔"

"کوئی وجہ نہیں بتائی تھی اُس نے؟"

"سیکریٹری صرف احکامات کی تعمیل کرتی ہے' وجہ نہیں پوچھتی" انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا "اور اس ہدایت سے اس کی بیوی بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔"

"سوال یہ ہے کہ سیکریٹری کو اس راز میں شریک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت تھی" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اسے اپنی ملیں فروخت کرنا تھیں۔ سودا مکمل ہو گیا تو اس نے سیکریٹری کو بتایا کہ اب وہ امریکا جا رہا ہے۔"

"لیکن امریکا وہ پھر بھی نہیں گیا؟" نجمی نے کہا۔ ملوں کی فروخت کے تذکرے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا "ایک بات بتاؤ' کیا اس نے اپنی تمام ملیں فروخت کر دیں؟"

"ملیں ہی نہیں' اپنے رہائشی بنگلے کو چھوڑ کر تمام اثاثے۔ ان میں زرعی زمین بھی تھی جہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔"

"تو یہ تو لمبا سودا ہوا۔"

"ہاں میری اطلاع کے مطابق ۴۰ کروڑ کی ڈیل تھی۔"

"۴۰ کروڑ" نجمی نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے "اتنی جلدی اتنی مگرمچھ پارٹی مل جانا حیرت انگیز بات ہے۔"

"یہ پورا معاملہ ایک ہفتے میں نمٹ گیا تھا۔" انسپکٹر نے کہا "وجہ یہ ہے کہ پارٹی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ غیر ملکی پارٹی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کا گروپ ہے۔"

"اور یہ سودا....."

"ہر اعتبار سے قانونی ہے۔ اب قریشی انڈسٹریز کے منتظم اعلیٰ مسٹر ڈیوڈ میکلم ہیں۔ حکومت بھی ان سے ہر ممکن تعاون کر رہی ہے۔ ڈیڈ کی تصدیق حکومت پاکستان نے کی ہے۔ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ حکومت غیر ملکی سرمایہ کاروں کی کس طرح حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔"

نجمی نے سر کو تصیبی جنبش دی "لیکن انسپکٹر' ۴۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا "تم نے یہ معلوم کیا کہ ادائیگی کس طرح سے ہوئی۔"

"کوشش کی تھی میں نے۔ لیکن مسٹر ڈیوڈ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں اور میں ان پر زور نہیں ڈال سکتا تھا۔"

نجمی اس کی پوزیشن سمجھتا تھا۔ یہ معاملہ انسپکٹر کے بس کا نہیں تھا "تم نے یہ معلوم کیا کہ سودا مکمل ہونے تک عاصم قریشی کہاں مقیم رہا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ایک ہفتے انٹرکان میں رہا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

انسپکٹر نے کندھے جھٹک دیئے "اس کے بعد شاید وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔"

"اب یہ بتاؤ کہ اس کیس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

انسپکٹر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "میرا خیال ہے' وہ کسی

منصوبے کے تحت غائب ہوا ہے لیکن یہ ناممکن نہیں کہ وہ خطرات میں گھر گیا ہو۔ وہ بہت دولت مند آدمی ہے اور تم جانتے ہو کہ آج کل شہر کا ماحول کیسا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرسکے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس وقت وہ زندہ ہو۔"

مجی نے دل میں کہا۔۔۔ ہاں' اس کی زندگی کی تو کوئی ضمانت نہیں "تمہارے خیال میں وہ غائب کیوں ہوا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ امریکا سیٹل ہونے کے چکر میں تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے بیوی اور بچوں کے دم چھلوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ ڈراما کیا ہو۔ وہ جوان آدمی ہے۔ دولت کی بھی کمی نہیں۔ امریکا میں کھل کھیلنا چاہتا ہوگا۔"

"ممکن ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں انسپکٹر۔" مجی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے سوال تم نے پوچھے۔ اب ایک سوال میں بھی پوچھوں تم سے۔"

مجی جاتے جاتے پلٹا "ضرور پوچھو۔"

"تم اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"سوئی آسامی بڑی خبر ہوتی ہے۔" مجی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا "ویسے بھی اس کی گمشدگی کا معما بڑی سنسنی خیز کہانی ہے۔ اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔"

○☆○

وہ بارہ گھنٹے سویا تھا!

دو مہینے سے نیند کو ترسا ہوا انسان نیند آجائے تو ایسے ہی سوتا ہے۔ اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ بھوک کا بھی احساس نہیں تھا۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو پانی تیار تھا۔ اُس نے چائے بنائی۔ ایک پیالی لے کر اس نے باقی چائے تھرموس میں بھری اور تھرموس اور پیالی لے کر بیڈ روم میں چلا آیا۔ چائے کی ایک پیالی سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے تھرموس سے دوسری پیالی بھری۔ دوسری پیالی پینے کے بعد وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ سکون سے سوچ سکتا تھا۔ حقائق اس کے سامنے تھے۔ اسے اُن کا تجزیہ کرکے ان سے نتائج اخذ کرنا تھے اور پھر اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

پہلی اور سنگین ترین حقیقت یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔

اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنا ذہن منتشر ہوتا محسوس ہوا مگر اس بار اُس نے جلد ہی اس انتشار پر قابو پالیا۔ پریشان ہونے سے یہ حقیقت بدل تو نہیں سکتی تھی۔ اس حقیقت کو پوری طرح قبول کرلینے ہی میں عافیت تھی۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ عیاشی اور جنسی بے راہ روی سے اس کا کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنی غلط سوچ کا احساس ہوا۔ وہ ایڈز کے مریضوں کو قابل نفرت سمجھتا تھا۔ اُس کا طرز عمل جیسی کرنی ویسی بھرنی والا ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ بدترین گناہ گار تھے جو کسی ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ان میں سے کوئی بے گناہ بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ گناہ گار بھی اس سلوک کے مستحق نہیں ہوتے۔ آخرت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن جنہیں دنیا میں بھی اللہ کی طرف سے سزا مل گئی ہو' انسانوں کو ان کے ساتھ بدسلوکی کا کوئی حق نہیں۔ وہ جن کے مقدر میں اذیت بھری موت لکھ دی گئی' ان کی دل جوئی کرنی چاہیے' کم از کم انہیں اچھوت بنا کر تو نہیں رکھنا چاہیے۔ لواحقین کو۔۔۔ بلکہ معاشرے کو ان کی موت آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حال میں تو انسان اتنا نازک ہوجاتا ہوگا کہ ملامت کی ایک نگاہ سے اس کا دل چھلنی ہوجائے۔ اسے ایک واقعہ یاد آیا جو ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے علم میں ایڈز کا ایک کیس آیا تھا۔ مریض غریب آدمی تھا۔ خون بیچنا اس کا پیشہ تھا۔ جب اسے علم ہوا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہے تو ڈاکٹر کی تسلی اور دل جوئی بھی اسے سہارا نہ دے سکی۔ وہ انتقام کی باتیں کرنے لگا پھر ایک دن وہ غائب ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اسے خطرناک قرار دیا۔ کیونکہ اب اس شخص کا ایک ہی مقصد ہوسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کرکے معاشرے سے انتقام لینا۔ لاقانونیت کے پروردہ اس معاشرے میں یہ کام بہت ہی آسان تھا۔ خون خریدنے والے اب بھی ایک سرنج پچاسوں افراد پر استعمال کرنے سے تائب نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس شخص کے لیے ایڈز کیریئر کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن عاصم کو خبر پڑھنے کے بعد کی اپنی سوچ یاد تھی اس کے خیال میں وہ انسان نہیں' پاگل کتا تھا' جو بے سوچے سمجھے دوسروں کو کاٹ کر موت سونپنے کے لیے نکلا تھا۔

اب وہ اس شخص کو سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اس جیسا ہوگیا تھا۔ اسے بھی کسی پاگل کتے نے کاٹ کر موت کے جراثیم سونپ دیئے تھے۔ اُس وقت اس نے نہیں سوچا تھا مگر اب وہ سوچ سکتا تھا کہ شاید وہ شخص بے قصور ہوگا۔ بغیر کوئی گناہ یا آوارگی کیے وہ اس مرض میں مبتلا ہوا ہوگا۔ ایسے کسی شخص کا ردعمل اتنا تند و شدید ہوسکتا ہے' جسے احساس ہو کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ وہی انتقام لینے کی سوچ سکتا ہے۔ خود اس نے بھی تو یہی سوچا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کردیا تھا۔ گناہ گار آدمی تو یہ معلوم ہونے پر گناہ کے بے کراں بوجھ تلے دب کر رہ جائے گا۔ وہ تو سہم جائے گا۔

اب اسے اپنا ردعمل اور خدا سے اپنی خفگی یاد آئی۔ اسے غلطی کا۔۔۔ توبہ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ بنیادی طور پر اس کے سوچنے کا انداز ہی غلط تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے

اب درست کرلیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایڈز خدا کا قہر ہے۔ اس اعتبار سے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا شکار ہو سکتا ہے اُس کا ردعمل اسی لیے اتنا شدید تھا۔ اسے زعم پارسائی جو تھا۔ مواقع حاصل ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں کبھی نہیں بہکا تھا۔ لہٰذا وہ اس سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس ایک گناہ سے محفوظ سہی لیکن ہر گناہ سے محفوظ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ پیغمبروں اور ولیوں کو چھوڑ کر کوئی نیک سے نیک عام انسان صرف اپنے اعمال کے بل پر بخشش نہیں پا سکتا۔ صرف اللہ کی رحمت کے زور پر ہی آخرت سنورتی ہے۔ وہ خدا کے متعلق بے انصافی کا خیال دل میں لایا۔ حالانکہ وہ کبھی بے انصافی نہیں کرتا۔ بلکہ اُس سے تو انصاف نہیں' رحم طلب کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جاننے والا' آدمی کے پل پل سے واقف اگر انصاف کرے گا تو دنیا میں کون ایسا ہوگا' جو مجرم ثابت ہونے سے بچ جائے گا۔

پھر ایک اور زاویہ بھی تھا۔ معاشرے کی خرابی سے فرد بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی معاشرہ اللہ تعالیٰ کے قہر کی زد میں آتا ہے تو اس میں بچتا تو کوئی بھی نہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اسے یاد آیا اس نے کسی کتاب میں یا اخبار کے کالم میں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی معاشرے کو تباہ کرنے کا حکم دیا۔ جبریل امینؑ اس کام کے لیے گئے لیکن لوٹ آئے۔ عرض کیا کہ خداوند کریم' وہاں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو عابد و زاہد ہے' نیک ہے۔ اس میں تو وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میرے حکم پر عمل کرو۔ وہ عبادت گزار بھی گناہ گار ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے میرے احکامات کی کھلی خلاف ورزی ہوتی رہی اور اس نے آواز تک نہ اٹھائی۔ چنانچہ وہ بستی تباہ کر دی گئی۔ تو یہ ایک حوالہ یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ معاشرے کی ذمے داری فرد پر بھی عائد ہوتی ہے۔ معاشرے میں کوئی برائی فروغ پانے لگے تو اس کے ہر فرد پر اس برائی کے خلاف حسبِ حیثیت جہاد فرض ہوتا ہے۔ طاقت ور ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس برائی کو بہ جبر روکے' سختی سے ٹوکے۔ کمزور ہو تو اس کے خلاف زبان سے جہاد کرے۔ بہت زیادہ کمزور ہو اور کسی طرح کے احتجاج کے قابل نہ ہو تو اپنے عمل سے اس کی مذمت کرے اور اس برائی میں ملوث لوگوں سے نفرت کرے' ان کا بائیکاٹ کرے' ان سے قطع تعلق کر لے۔ اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ برائی کا آغاز ہمیشہ چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے اور اکثریت جو کہ بڑی طاقت ہوتی ہے' ابتدا ہی میں اس کا خاتمہ کر دینے کی قدرت رکھتی ہے۔ ہر جرم پہلے ڈھکے چھپے ہوتا ہے لیکن جب اکثریت اس پر احتجاج نہیں کرتی تو یہ اس کی توثیق کے مترادف ہوتا ہے۔ پھر مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ وہی سب کچھ کھلے بندوں ہونے لگتا ہے یوں اکثریت اس میں ملوث ہو جاتی ہے پھر جرم' جرم اور گناہ' گناہ نہیں رہتا۔ تو اس کی بڑی ذمے دار تو اکثریت ہی ہوئی نا۔ اسی لیے قہر سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔

اب جو اُس نے سوچا تو خود کو کم گناہ گار نہیں پایا۔ ماڈیت کے اس دور میں رشوت لینے والے کی عزت کی جاتی ہے کہ وہ دولت مند ہوتا ہے اور رزقِ حلال کمانے والا غریب بے عزت ہوتا ہے تو یہ تو برائی کی عزت ہوئی نا۔ اور یہ سب کچھ وہ خود بھی کرتا رہا تھا۔ وہ دولت کے اعتبار سے بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ کیوں بُروں کی عزت کرتا اور اچھوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ اس نے برائیوں میں ملوث لوگوں سے نفرت نہیں کی۔ ان کا بائیکاٹ نہیں کیا۔ یقیناً وہ بھی مجرم ہے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اُس پر لرزہ چڑھ گیا۔ اس وقت اس کے جسم کا رواں رواں توبہ کر رہا تھا۔

اور جو رویہ اس کا تھا وہی پورے معاشرے کا تھا۔ دنیاوی قانون کے معاملے میں بھی لوگ مجرم سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ ہاں... سزا ہونے کے بعد..... سزا کاٹنے کے بعد وہ ان کے لیے قابلِ نفرت ٹھہرتا تھا۔ اور اب سماوی قانون کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ نفرت گناہ گار سے نہیں' سزا یافتہ سے کی جاتی تھی۔ شاید جرم بے وقوفی کی پاداش میں۔ کہ اس نے خود پر جرم ثابت کیوں ہونے دیا۔ استغفراللہ!

تیسری حقیقت یہ تھی کہ نااہل' خود غرض اور بددیانت حکمراں سب سے بڑے مجرم تھے!

حکمرانوں کی باقی کمزوریاں ایک طرف' ایڈز کے معاملے میں ان کی مجرمانہ غفلت ناقابلِ معافی تھی۔ ایڈز کے متعلق لوگوں کو کچھ بتایا ہی نہیں گیا' عملی اقدامات تو دور کی بات تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی کہ ہر شخص کا خون لے کر تجزیہ کرایا جائے یوں ایڈز کے مریضوں کی درست اور حتمی تعداد سامنے آجاتی۔ پھر انہیں اسپتالوں میں داخل کر دیا جاتا تاکہ وہ نہ اچھوت بنیں اور نہ اس کو پھیلانے کا سبب بنیں۔ یہ قانون بنایا جا سکتا تھا کہ اگر کوئی ایک سرنج ایک سے زیادہ افراد پر استعمال کرنے کا مجرم پایا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ تمام پرائیویٹ بلڈ بینکوں کو غیر قانونی قرار دے کر بند کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو یہ آگہی دینے کی کوشش کی جاتی کہ دینِ فطرت اسلام نے فطری تقاضوں کو اخلاقی ضابطوں کا پابند کیا ہے اور اتنی سختی سے کہ ان کی خلاف ورزی پر سخت ترین سزا رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں انسانوں کی بہتری ہے۔ ہونا تو یہ کچھ چاہیے تھا لیکن ہو کچھ اور رہا تھا۔ ایڈز کے مریضوں کی تعداد چھپائی جا رہی تھی۔ یہ افواہ عام تھی کہ ایڈز کے مریضوں کو علاج کے نام پر ختم کر دیا جاتا ہے..... قانونی قتل! سب سے بڑی بات یہ کہ "احتیاط ہی آپ کا واحد بچاؤ ہے ایڈز کے خلاف" کی تشہیر ترغیبی انداز میں کی جا رہی تھی۔ بدکاری ترک کرنے کی تنبیہہ کی بجائے لوگوں کو اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔

مختصر یہ کہ مراعات یافتہ طبقے کے لوگ بدترین مجرم تھے۔ وہ بدترین سزاؤں کے مستحق تھے!

اور وہ انتقام لینے نکلا تھا تو کن لوگوں سے۔ اپنے جیسے لوگوں سے' نائی کے استرے' قینچی' آفٹر شیو لوشن اور پاؤڈر puff کی زد میں کون آتا؟ اسی جیسا کوئی انسان' جو انکشاف ہونے پر ڈاکٹر سے کہتا یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟ میں نے تو بے حد صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ احتیاطی تدابیر کے سائے میں بدکاری کرنے والا کوئی شخص اس کے انتقام کی لپیٹ میں نہیں آسکتا تھا۔

تو گویا اُس کی اپروچ ہی غلط تھی!

اور اب اسے تجزیہ کرنا اور اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

اس نے سوچا ممکن ہے خدا اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہو۔ ورنہ وہ جس کیفیت میں تھا اس سے نکلنا ناممکن ہی تھا۔ مگر اسے ہوش آگیا تھا اور وہ ہوش مندوں کی طرح سوچنے کے قابل ہوگیا تھا۔ اب اسے کوئی ڈر' کوئی خوف نہیں تھا۔ موت ایک ناگزیر حقیقت تھی۔ اب جتنی مہلت خدا اسے عنایت فرمائے۔

بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے دو مختلف سمتوں میں کام کرنا ہوگا۔ ایک عام اور کمزور لوگوں کی ناکردہ گناہوں کے عذاب سے بچنے میں مدد اور دوسرے بدکار لوگوں کو جلد از جلد ان کے انجام تک پہنچانے میں تعاون۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دونوں خاکوں میں جزئیات کا رنگ بھرنے میں مصروف ہوگیا۔

وسائل یعنی دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی مگر اسے دونوں کاموں کے لیے دو قابل اعتماد ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ ایک فیلڈ کے لیے تو اس کے پاس آدمی موجود تھا۔ بابر امریکا میں تعلیم مکمل کرچکا تھا۔ فون پر اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تقسیم اسناد کی تقریب کے فوراً بعد وہ وطن واپس آئے گا۔ عاصم نے اسے بتادیا تھا کہ اسے کہاں پہنچنا اور کس نام کے آدمی سے ملاقات کرنی ہوگی۔ بابر پر وہ مکمل اعتماد کرسکتا تھا۔ اپنے مطلب کے دوسرے آدمی کی تلاش کچھ مشکل نہیں تھی۔

اب بس اسے پُرسکون رہ کر بابر کا انتظار کرنا تھا۔

○☆○

وحید نجمی کو فوزیہ قریشی سے وقت لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاید اپنے شوہر کی گمشدگی کے معاملے میں میڈیا کے موثر ہونے پر یقین رکھتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اخبارات اس سلسلے میں بے حد معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

نجمی کی منزل کلفٹن کے علاقے میں چھ کروں کا ایک لگژری فلیٹ تھا۔ گیٹ پر اسے روکا گیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے اس کے اخبار کا شناختی کارڈ دیکھا پھر انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا "مسز قریشی' نجمی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔" چند لمحے وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا "جی بہتر" وہ نجمی کی طرف مڑا "آپ چھوٹے گیٹ پر آئیں۔ میں اسے کھول رہا ہوں۔"

نجمی چھوٹے گیٹ کی طرف گیا جو اسی لمحے کھول دیا گیا "آٹھویں منزل' فلیٹ نمبر سی ۸۴" گارڈ نے کہا۔ "لفٹ موجود ہے۔"

دسیع و عریض لابی میں لفٹ موجود تھی۔ آٹھویں منزل پر اتر کر اس نے فلیٹ سی ۸۴ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ نجمی کو اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آواز سن کر اس نے اندازہ قائم کیا تھا کہ فوزیہ قریشی کوئی تھکی ہوئی' معمول سی' ادھیڑ عمری کی حدوں کو چھوتی ہوئی عورت ہوگی۔ لیکن وہ اس کے اندازے سے کہیں کم عمر تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ کی پریشانی اس پر اثرانداز ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ خوب صورت اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ عمر اس کی تیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن چہرے پر آنکھوں کے نیچے کچھ تازہ لکیریں نظر آرہی تھیں۔

"آیئے نجمی صاحب' اندر آجایئے۔" اُس کی آواز بھی بے حد مترنم تھی۔

نجمی اندر چلا گیا۔ وہ ایک بہت کشادہ ڈرائنگ روم تھا جس کا فرنیچر اور آرائش دیدنی تھی۔ امارت سے زیادہ وہ سلیقے اور خوش ذوقی کی مظہر تھی۔ فوزیہ کے اشارے پر وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فوزیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی "کیا پئیں گے آپ؟ دیکھیے تکلف نہ کیجیے گا۔"

"کافی پلوادیں۔"

"ثمینہ....." فوزیہ نے اندر کسی کو آواز دی "کافی لے آؤ" پھر وہ نجمی کی طرف متوجہ ہوئی "میں آپ کی آمد پر شکرگزار ہوں آپ کی۔"

نجمی کو حیرت ہوئی "شکرگزار تو مجھے ہونا چاہیے۔"

"چلیں' یہ شکرگزاری دو طرفہ سہی۔ حرج کیا ہے اس میں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ بہرحال آپ کے خلوص کا شکریہ۔"

"خلوص" وہ تلخی سے ہنسی "آج کل جس کیفیت سے میں گزر رہی ہوں' اس میں اپنے اور اپنے بچوں کے سوا کسی سے خلوص نہیں برت سکتی میں۔ آپ اس صاف گوئی پر برا نہ مانیے گا۔ میں عام طور پر جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے صحافی ہیں۔ انوسٹی گیشن آپ کی فیلڈ ہے۔ بااثر حلقوں تک آپ کی رسائی ہے۔ آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔"

نجمی کو وہ عورت بے حد مختلف' بے حد بھلی لگی۔ وہ عام دولت مندوں کی طرح بے نیازی ظاہر کرکے کام نکلوانے کی قائل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر اسے اُس پر ترس آنے لگا۔ بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر کس طوفان میں گھرا ہوا ہے اور کس انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کی صاف گوئی مجھے بہت اچھی لگی بیگم قریشی۔ میں ہر خدمت کے لیے

حاضر ہوں۔ لیکن فی الحال تو مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

فوزیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک خوب صورت لڑکی کافی کی ٹرے لے آئی۔ اس کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی حسین تھی بلکہ اس کے انداز میں بے حد وقار بھی تھا۔ اس نے کافی کی پیالی پہلے نجمی اور پھر فوزیہ کے سامنے رکھی اور بغیر ایک لفظ کے اندر چلی گئی۔

کافی کا گھونٹ لینے کے بعد نجمی نے مستفسرانہ نظروں سے فوزیہ کو دیکھا۔

"یہ ثمینہ ہے۔ ہمارے بچوں کی گورنس۔" فوزیہ نے بتایا "بہت پیاری لڑکی ہے چار سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ اب تو مجھے سہیلی سی' بہن سی لگتی ہے۔ بچے بہت مانوس ہیں اس سے۔ اس وقت یہ نہ ہوتی تو....." فوزیہ نے بات نامکمل چھوڑ دی اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

وحید نجمی یونہی ایک کامیاب تفتیشی رپورٹر نہیں بن گیا تھا۔ اُس نے کم عمری میں ہی سیکھ لیا تھا کہ انسان کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ' ہر لفظ اُس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ پھر اس نے غور سے سننے اور نہایت تیزی سے نتائج اخذ کرنے کی مشق بھی کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ فوزیہ اپنے گمشدہ شوہر سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے بچوں کا تذکرہ "ہمارے بچے" کہہ کر کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ خواہ اس کا شوہر اس کا اہل نہ ہو لیکن یہ طے تھا کہ اسے اپنے شوہر پر اندھا اعتماد ہے ورنہ وہ اتنی خوب صورت اور اپنے سے کم عمر لڑکی کو گھر میں نہ رکھتی۔ ایک تفتیشی رپورٹر ہونے کی حیثیت سے یہ بھی نجمی کا مزاج تھا کہ وہ ہر چیز' ہر بات اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تا آنکہ وہ پوری طرح درست ثابت نہ ہو جائے۔

فوزیہ نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "تو آپ عاصم کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں آپ سے بہت کچھ پوچھوں گا۔ بشرطیکہ آپ بُرا نہ مانیں۔"

"جو جی چاہے پوچھیں۔ میں بُرا نہیں مانوں گی۔ کسی سے مدد یونہی تو نہیں مل سکتی۔ اور میں تو غرض مند ہوں۔"

نجمی نے چونک کر اسے دیکھا لیکن نہ اس کے لہجے میں کوئی کاٹ تھی' نہ چہرے پر بدمزگی کا سایہ۔ وہ بس حقیقت پسند ثابت ہو رہی تھی "شکریہ بیگم قریشی" اس نے گہری سانس لے کر کہا "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ ثمینہ آپ کا انتخاب ہے یا قریشی صاحب کا؟"

ایک لمحے کو فوزیہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ نجمی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن فوزیہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "آپ یقیناً بہت اچھے انوسٹی گیٹر اور صحافی ہیں۔" آخرکار وہ بولی "یہ سوال نجی ہے۔ ایک گمشدہ شخص کی بیوی سے کیا جانے والا پہلا سوال۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اور عاصم فیصلے مل کر کرتے تھے۔ ثمینہ میرا انتخاب تھی لیکن عاصم نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ ہم دونوں اس بات کے قائل تھے کہ بچوں کی گورنس میں خوش اطواری' خوش گفتاری اور خوب صورتی۔ سبھی کچھ ہونا چاہیے۔"

"ثمینہ یہیں رہتی ہے؟"

"ہاں۔ اس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ خالہ نے پالا پوسا۔ اسے ہمارے ہاں آئے پانچ چھ مہینے ہوئے تھے کہ اس کی خالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب یہی اس کا گھر ہے۔"

"آپ کے خیال میں عاصم اس اعتماد کے اہل ہیں؟ میرا مطلب سمجھ رہی ہے نا آپ؟"

فوزیہ کی آنکھوں میں برہمی چمکی "خوب سمجھ رہی ہوں۔ آپ اہلیت کا پوچھتے ہیں۔ عاصم پر اعتماد کے سوا کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

"اچھا..... اب شروع سے بتائیں۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر نکلے کہ امریکا جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں اور انہوں نے کہا تھا کہ واپسی میں ایک ماہ لگ جائے گا۔ ایک ماہ گزر چکا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں نے سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ عاصم کو ویزا جاری ہی نہیں کیا گیا۔ امریکا میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کیا گیا۔ وہاں سے بھی نفی میں جواب ملا۔ پھر میں نے گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ مگر اب تک....."

نجمی نے اس کی بات کاٹ دی "آپ کے خیال میں یہ کس نوعیت کا کیس ہے؟"

"میں..... میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔" فوزیہ بے بسی سے بولی "عاصم امریکا نہیں گئے۔ کم از کم اصلی نام سے تو نہیں گئے۔ انہوں نے اپنے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔ ۹۰ کروڑ کی غیر معمولی رقم ہے ان کے پاس۔ میں بس یہ دعا ہی کرتی رہتی ہوں کہ اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔"

"آپ سے کوئی ان بن تو نہیں.....؟"

"نہیں۔"

"آثار بتاتے ہیں کہ وہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت آپ کو اور بچوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ کیوں؟"

"مجھے تو اس پر یقین نہیں آتا۔ اس کا کوئی جواز ہی موجود نہیں۔"

"کوئی عورت؟"

"آپ انہیں بالکل نہیں جانتے نجمی صاحب۔" فوزیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ اور میں شرع کے مطابق ان کے حق میں کبھی مداخلت نہ کرتی۔ بلکہ میں ان کے ساتھ پورا تعاون کرتی۔"

"روانگی سے پہلے آپ نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی ان میں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ لگتا تھا تصور میں جب کچھ دہرا کر دیکھ رہی ہے "وہ کچھ چپ چپ تھے اس رات" آخر کار اس نے کہا "اور سوتے وقت دونوں بچوں کو لپٹائے رہے تھے۔ صبح انہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ رات سو نہیں سکے ہیں۔ اب یہی یاد مجھے لرزا دیتی ہے۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ وہ بچوں سے جدا ہو رہے ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"یوں غائب ہونے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں۔" نجمی نے کہا "پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔"

"سوچتی ہوں تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔" فوزیہ بولی "لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ آتا ہے کہ ممکن ہے ان پر کسی گروہ کا دباؤ ہو۔ دولت ہتھیانے کے لئے... اور خدانخواستہ..." وہ کہتے کہتے رک گئی "دیکھیں نا... آج کل تو اس طرح کی کارروائیاں عام ہو گئی ہیں۔" اب اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"اور یہ امکان بھی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے' آزادانہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے گئے ہوں۔" نجمی نے خیال آرائی کی۔

فوزیہ کی بھویں تن گئیں "آپ جلدی میں تو نہیں ہیں نجمی صاحب؟"

"جی نہیں۔"

"تو آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اسے ڈرائنگ روم کے اندر والے دروازے سے گزار کر ایک راہ داری میں لے گئی۔ اس بار وہ جس کمرے میں داخل ہوئے' اس نے نجمی کو حیران کر دیا۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل ایک وڈیو روم تھا۔ کونے میں ٹرالی پر ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا۔ شوکیس میں ایک وڈیو کیمرا رکھا تھا۔ دیواروں پر شیلف تھے جن میں وڈیو کیسٹ سلیقے سے رکھے تھے۔ وہ پوری وڈیو لائبریری تھی۔ وہاں چار شیلف تھے تین بڑے اور ایک چھوٹا۔ دو میں اردو فلمیں تھیں ایک میں انگریزی... اور چھوٹے شیلف میں چٹ لگی تھی... پرسنل۔

"عاصم کو وڈیو کا خبط ہے۔" فوزیہ نے بتایا "وہ خود بھی شوٹ کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کا ہر یادگار لمحہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔" وہ پرسنل کیسٹ والے شیلف کی طرف بڑھ گئی۔ شیلف سے ایک کیسٹ نکال کر وہ ٹرالی کی طرف بڑھی۔ اس نے کئی سوئچ دبائے کمرا روشن ہو گیا۔

"ارے' آپ کھڑے کیوں ہیں۔" اس نے نجمی کو کھڑے دیکھ کر کہا "بیٹھئے نا" نجمی بیٹھ گیا۔

کیسٹ وی سی آر میں لگا کر وہ خود بھی ایک آرام کرسی میں آبیٹھی۔ ٹی وی آن تھا۔ اسکرین پر لکیریں سی اڑتی نظر آ رہی تھیں۔ کیسٹ ری وائنڈ ہو رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وی سی آر پر پلے روشن ہوا اور اگلے ہی لمحے ٹی وی اسکرین پر دو خوب صورت اور من موہنے بچے نظر آئے۔

نجمی محو ہو کر دیکھتا رہا۔

انسانی نفسیات کو سمجھنا وحید نجمی کے لئے فطرت ثانیہ کی حیثیت رکھتا تھا اور جو کچھ اسکرین پر اسے نظر آ رہا تھا وہ براہ راست دل کو چھو رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے خوش حال گھرانے کی ننھی منی معصوم سی خوشیاں تھیں۔ معصوم اور بے ساختہ خوشیاں۔ یہ بات واضح تھی کہ عاصم اپنی بیوی اور بچوں کو والہانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں چھلک رہی ہوتی تھیں۔

وہ کوشش کے باوجود اس محبت کو جھوٹ اور کھوٹ قرار نہ دے سکا۔ وہ ایک کروڑ پتی کی چھوٹی سی زمینی جنت تھی جس کا منظر منہ سے بول رہا تھا کہ اس جنت کو دولت کا کوئی چشمہ زندگی نہیں دے رہا ہے۔ وہ ایک مکمل جنت تھی۔ اور بچوں پر جان چھڑکنے والا اور بیوی سے والہانہ محبت کرنے والا وہ شخص ایڈز کا مریض تھا... ایڈز کا! یہ کیسی انہونی ہے۔

"یہ ہے آپ کے سوال کا جواب۔" فوزیہ نے اسے چونکا دیا "یہ ہے میرے شوہر کا طرز زندگی۔ اور میں پوری دیانت داری سے محسوس کرتی ہوں کہ وہ اس سے مطمئن تھے۔ اب یہ آپ سوچیں کہ ممکن ہے وہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔"

نجمی اسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کے لہجے میں اب بھی طنز نہیں تھا "اس کیسٹ نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اب اسے آف کر دوں؟"

"جی شکریہ۔"

وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے "اور کافی پئیں گے؟" فوزیہ نے اس سے پوچھا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کافی کی۔"

فوزیہ اندر چلی گئی۔ نجمی بیٹھا سوچتا رہا۔ ایڈز کا مریض اور اس طرح کا بیک گراؤنڈ۔ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر نجیب کی بات بھی یاد تھی۔ عاصم قریشی نے اس سے بے حد یقین سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا اور بیک گراؤنڈ تائید کر رہا تھا کہ عاصم اپنے یقین میں سچا ہی ہوگا۔

فوزیہ پھر واپس آ گئی تھی "کافی ابھی آ رہی ہے۔" اس نے کہا "اور بھی کچھ پوچھنا ہے تو بے تکلفی سے پوچھیں۔"

"بس ایک اہم بات اور۔ مجھے اپنے شوہر کے کردار کے بارے میں بتایئے۔"

فوزیہ' ثمینہ کے ٹرے رکھ کر جانے تک خاموش رہی۔ پھر اس نے کافی کی پیالی نجمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "وہ بہت اچھے شوہر' بہت اچھے باپ اور بہت اچھے انسان ہیں۔ خامیوں سے پاک

برائی نہیں ہوتی۔ لیکن عاصم میں خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔" نجمی نے دھیرے سے کہا "وہ کروڑ پتی ہیں۔ دولت مندوں کے کچھ شوق بھی ہوتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ میرا مطلب ہے عورتیں وغیرہ۔"

فوزیہ کا چہرہ تمتما اٹھا تھا تاہم اس نے حیرت انگیز طور پر خود پر قابو رکھا "مجھے عاصم پر فخر ہے۔" اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "وہ لفظ عصمت اور اس کی پاکیزگی کو عورتوں تک محدود نہیں رکھتے۔ کوئی کسی کے لیے ایسی قسم نہیں کھا سکتا۔ لیکن میں عاصم کے کردار کی قسم کھا سکتی ہوں۔"

نجمی پھر حیران رہ گیا۔ یہ کس قسم کا شخص تھا۔ اس دنیا کا آدمی تو نہیں لگتا تھا "اچھا' آپ مجھے ان کے کسی قریبی دوست کا نام بتائیں۔" اس نے کہا "کوئی ایسا شخص جس سے وہ بہت قریب ہوں۔"

"ان کے ایک ایسے دوست سے تو آپ اس وقت ہم کلام ہیں۔" فوزیہ نے بڑے اعتماد سے کہا "دوسرے دوست کا نام خاور ندیم ہے۔ تنظیم انڈسٹریز والے۔"

"بہت بہت شکریہ بیگم قریشی۔ آپ نے مجھ سے مثالی تعاون کیا ہے۔" نجمی نے بے حد خلوص سے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم ہوگا تو میں پہلے آپ سے رابطہ کروں گا۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ نے میری مدد کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب ایک بات میں بھی کہوں۔ برا نہ منایئے گا اور اسے گھٹیا پن نہ سمجھئے گا۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں آپ کو جتنی بھی ضرورت پڑے' آپ مجھ سے طلب کرلیں۔"

"میں یہ کام بلا معاوضہ کررہا ہوں۔" نجمی نے خشک لہجے میں کہا۔

فوزیہ نے ایک گہری سانس لی "حیرت ہے۔ آپ صحافی ہوکر انسانوں کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ میں نے معاوضے کی بات نہیں کی تھی۔ بہرحال اسے ذہن میں رکھیے گا۔"

"شکریہ' ہاں ایک بات اور۔ آپ کا کوئی ذاتی اکاؤنٹ ہے؟"

فوزیہ نے حیرت سے اسے دیکھا "جی ہاں۔"

"تو ذرا اسے چیک کیجئے گا۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ یہ رہا میرا کارڈ۔"

○☆○

خاور ندیم سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ امریکا گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی دو ہفتے بعد متوقع تھی۔ نجمی نے اس دوران اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات جمع کرلیں۔ اس کے علاوہ اس نے عاصم کی سیکریٹری رعنا سے بھی ملاقات کی تھی لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ عاصم صرف ایک بار اپنے دفتر آیا تھا۔ اس روز' جس روز بظاہر وہ امریکا روانہ ہوچکا تھا۔ رعنا کی ملازمت برقرار تھی۔ عاصم نے نئی انتظامیہ سے سفارش کی تھی کہ وہ کام کی کارکن ہے اور دفتری معاملات کو خوب سمجھتی ہے۔

نجمی نے انٹرکان کو بھی چیک کیا تھا۔ ہوٹل سے معلوم ہوا کہ قیام کے دوران عاصم اپنے کمرے تک ہی محدود رہا تھا۔ کھانا اور ناشتا وہ روم سروس کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ صرف دو بار کہیں باہر گیا تھا۔ دوسری بار چیک آؤٹ ہونے سے صرف ایک دن پہلے۔ اور اس موقعے پر وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو بھاری سوٹ کیس بھی تھے۔ اگلے روز وہ رخصت ہوگیا تھا۔ وہ پبلی ٹیکسی میں گیا تھا۔ نجمی نے ہوٹل کے باہر رکیو کر کھڑی ہونے والی پبلی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کی لیکن بات بنی نہیں۔ تاہم اس نے چند ڈرائیوروں سے استدعا کی کہ وہ اس سلسلے میں دوسرے ڈرائیوروں کو ٹٹولتے رہیں۔ کام کی معلومات حاصل ہونے پر انہیں معقول انعام ملے گا۔

یہ وہ مقام تھا' جہاں سے عاصم قریشی کے نقوش پا ہوا میں تحلیل ہوگئے تھے۔

اب نجمی نے اُس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ صنعتی اور تجارتی حلقوں کے لوگوں سے ملا۔ اس کلب کے ممبروں سے بات چیت کی' جس کا عاصم قریشی ممبر تھا۔ وہاں سے فوزیہ کی باتوں کی تصدیق و تائید کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ تمام جاننے والوں کے نزدیک عاصم قریشی ایک فرشتہ تھا۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسی دولت کا کیا فائدہ جس سے آدمی لطف اٹھانے کی کوشش بھی نہ کرے۔ عاصم اپنی سوسائٹی کی نچلی قسم کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا بلکہ اب تو لوگوں نے اسے مدعو کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے پینے پلانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ اپنے طبقے کے لوگوں میں وہ نرا بور مشہور تھا۔ عورتیں اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھیں۔ ظاہر ہے وہ ان کی توقعات پر پورا جو نہیں اترتا تھا۔

کلب کے ممبروں کے کہنے کے مطابق ٹینس وہ صرف ایکسرسائز اور فٹنس کی نیت سے کھیلتا تھا۔ اُس کا گیم واجبی سا تھا۔ شطرنج کا البتہ وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کسی زمانے میں وہ ہر سال کلب کا چیس ٹورنامنٹ جیتتا تھا۔ شادی کے بعد اس کا کلب آنا اور شطرنج میں دلچسپی کم ہوگئی تھی۔ البتہ جمعرات کے دن وہ اب بھی کلب ضرور آتا تھا۔

اور اب نجمی ان معلومات کو مربوط کرکے ایک خاکہ بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ عاصم قریشی کی شخصیت ہر قدم پر اسے حیران کررہی تھی۔ وہ بے داغ کردار کا مالک ثابت ہورہا تھا۔ اس کے مخالفین بھی اسے زاہد خشک اور پارسا کے مترادفات استعمال کرکے گالی دیتے تھے۔ وہ ریزرو رہنے والا آدمی تھا۔ اُس کا خاص دوست صرف ایک ہی تھا... نہیں' ایک نہیں دو تھے۔ ایک فوزیہ

ں اور دوسرا خاور ندیم۔ وہ زیادہ دوست بنانے کا قائل نہیں
اُس کی طبیعت میں دردمندی تھی۔ غریبوں اور ضرورت
ں کی مدد وہ فرض سمجھتا تھا۔ اُس کے در سے کوئی سوالی خالی
نہیں جاتا تھا۔ اس شہر میں جہاں کسی کا عیب چھپائے نہیں
اُس کی عیاشی اور آوارگی کی ایک افواہ بھی نہیں ملی تھی۔
کے ایک مریض کے لیے یہ ایک بہت پھیکا' بے رنگ اور
ں کن پس منظر تھا۔
اچانک نجمی کے ذہن میں ایک لفظ گونجا' سیکریٹری! یہ ایک
امر تھا کہ کسی شخص کے بارے میں اس کی سیکریٹری سب سے
معلومات فراہم کرسکتی ہے۔ وہ رعنا سے ملا ضرور تھا مگر اس
عاصم کی ذات کے بارے میں نہیں' صرف اس کی گمشدگی کے
ے میں بات کی تھی۔
نجمی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ اس
رعنا کے دفتر فون ملایا "اتحاد انڈسٹریز" دوسری طرف سے آواز
ی۔
"آپ رعنا ہی بول رہی ہیں نا؟"
"جی ہاں اور آپ شاید وحید نجمی ہیں' روزنامہ سویرا کے
ٹر۔"
نجمی کو حیرت ہوئی۔ صرف ایک ملاقات کے بعد اس طرح
ز پہچان لینا! "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کس حیثیت سے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
نجمی کو شاک لگا۔ وہ گڑبڑا گیا "میں آپ کا مطلب نہیں
ا۔"
"اتحاد انڈسٹریز کی ملازم تو اب میں رہی نہیں۔ میں نے
مت چھوڑ دی ہے۔ اب گھر جانے کے لیے اٹھنے ہی والی
۔"
یہ اطلاع بھی شاک تھی۔ تاہم نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے
"میں جس حیثیت کی وجہ سے آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں' وہ بھی
نہیں ہوگی۔ وہ حیثیت یہ ہے کہ آپ بھی عاصم قریشی صاحب
سیکریٹری رہی ہیں۔"
دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر رعنا کی آواز ابھری
یک کہتے ہیں آپ۔ اس حیثیت کو میں کبھی بھولوں گی بھی نہیں۔
ں نے مجھے اعتماد دیا' سربلندی سے جینا سکھایا۔ نہ میں اپنی اس
یت کو بھولوں گی نہ عاصم صاحب کو۔"
لڑکی جذباتی ہو رہی تھی "تو پھر میں آپ کے دفتر آجاؤں؟"
"نہیں' یہاں تو میں ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتی۔"
"تو پھر اپنا پتا بتادیجیے میں آپ کے گھر آجاتا ہوں۔"
"یہ بھی مناسب نہیں۔" وہ ہچکچائی۔
"بس پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کو دفتر سے لے لیتا ہوں۔
کہیں چل کر چائے پئیں گے اور آن اے کپ آف ٹی....."

وہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ تاہم چند لمحے کے بعد اس نے کہا
"ٹھیک ہے لیکن آپ کو پہنچنے میں دیر لگے گی اور میں یہاں رکنا
نہیں چاہتی۔"
"میں صرف پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے' میں باہر ملوں گی آپ کو۔" رابطہ منقطع ہوگیا۔
ریسیور رکھ کر نجمی جھپٹ کر اٹھا۔ ایسی ہنگامی صورت میں گھر
سے نکلنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

○☆○

ریسٹورنٹ تقریباً خالی تھا۔ نجمی نے کونے کی ایک میز منتخب کی
تھی۔ رعنا چائے بنا رہی تھی اور نجمی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دل
ہی دل میں وہ خود کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ بڑے صحافی بنے پھرتے ہو۔
ایک ایسی سیکریٹری کو نظرانداز کیسے کردیا تم نے؟ رعنا صرف
خوب صورت اور شاداب لڑکی نہیں تھی۔ اس میں ایک طرح کی
اپیل بھی بے پناہ تھی۔ وہی سب سے موثر اور فیصلہ کن شہادت
دے سکتی تھی۔ اس کا حسن بلاشبہ زہد شکن تھا۔ نجمی کو حیرت تھی
کہ اُس نے پچھلی بار ہی یہ پوچھ گچھ کیوں نہیں کی۔
رعنا نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی "اب پوچھیں' کیا
پوچھنا ہے آپ کو۔" وہ بولی۔
"وہ تو میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے یہ بتایئے کہ ملازمت کیوں
چھوڑ دی آپ نے؟"
رعنا نظریں چرانے لگی۔ پھر اس نے چائے کی پیالی پر جھکتے
ہوئے کہا "اس لیے کہ اب وہاں عزت سے کام کرنا ممکن نہیں
رہا۔"
"کیا مطلب؟"
"اس سے زیادہ وضاحت میں نہیں کرسکتی۔"
نجمی نے پھر دل میں خود کو کوسا۔ واقعی وہ ڈفر ثابت ہو رہا تھا۔
اس بیان میں وضاحت کی ضرورت ہی کہاں تھی "مگر آپ تو....."
اس نے کہا اور کہتے کہتے رک گیا "کتنے عرصے سے یہ جاب کر رہی
تھیں آپ؟"
"تقریباً آٹھ سال ہوگئے۔"
"اور عاصم صاحب....."
"اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ عاصم صاحب بہت عظیم
انسان ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ جب میں پہلی بار جاب کے لیے
گھر سے نکلی تو کتنی مجبور تھی۔ ایک حادثے میں میرے والد کی
دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔
میرے چھ چھوٹے بہن بھائی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں
بی اے کی طالبہ تھی۔ تلاش رزق میں گھر سے نکلی تو مجبوری نے
میرے ذہن کو شل کردیا تھا۔ اس وقت میں آج کی طرح سر اٹھا کر
اپنی عزت نفس کے لیے لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ بھائی بہنوں اور
ماں باپ کی بھوک نے مجھے کمزور کردیا تھا اور میرے ساتھ احساس

کتنی بھی تھا۔ میں صرف اتنا جانتی تھی۔ مجھے ٹائپنگ تک نہیں آتی تھی۔ عملی زندگی کیسی ہوتی ہے' اس کا تصور تک نہیں تھا میرے پاس۔ اللہ نے کرم کیا کہ مجھے عاصم صاحب تک پہنچادیا۔ انہوں نے میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے اہلیت نہ ہونے کے باوجود مجھے ملازمت دی۔ مجھے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لیے سہولت اور حوصلہ دیا۔ پرائیویٹ تعلیم کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ دفتری امور سکھائے۔ باہر کی دنیا سے مجھے متعارف کرایا۔ مجھے عزت دی اور عزت سے جینا سکھایا۔ انہوں نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ اہل اور تجربہ کار امیدواروں کو نظرانداز کرکے وہ ایک کم عمر' خوب صورت لیکن ملازمت کے لیے نااہل لڑکی کو جاب دے رہے ہیں تو اُن کا اسٹاف ان کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کرے گا۔" وہ کہتے کہتے رُکی اور اس نے سر اٹھا کر محجوب نظروں سے نجمی کو دیکھا "آپ کو عجیب لگے گا نجمی صاحب لیکن میں جانتی ہوں کہ میں غیر معمولی طور پر حسین ہوں۔ جس وقت عاصم صاحب نے مجھے ملازمت دی تو میں نے ایک فطری بدگمانی کی۔ میں نے سوچا' یہ باس سسٹم کی عنایت ہے۔ عنایت کے بدلے عنایت۔ اور میں ضرورت مند تھی اور اس کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی۔ لیکن عاصم صاحب نے مجھ پر جو احسان کیا' وہ جاریہ احسان ہے۔ وہ اب بھی جاری ہے۔ میں ڈرتی رہی کہ کسی بھی وقت مجھ سے عنایت کے صلے کا تقاضا کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ایک سپردگی بھی طاری رہی تھی مجھ پر۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور ایک سال ہوگیا تو میرا ڈر آہستہ آہستہ نکلنے لگا۔ صرف سپردگی رہ گئی اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "اب تک جو کچھ میں نے کہا' آپ چاہیں تو اسے شائع کرسکتے ہیں۔ مگر اب جو کچھ میں کہوں گی' وہ آف دی ریکارڈ ہے۔ بولیں کیا کہتے ہیں آپ؟"

سحرزدہ نجمی نے بے جان سے انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دی "آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

رعنا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی "لفظ تو دور کی بات ہے' عاصم صاحب کی آنکھ کے ایک اشارے پر میں اپنا وجود ان پر قربان کرسکتی تھی اور قربان کرسکتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون سا جذبہ ہے یا کسی جذبے کا کون سا درجہ ہے مگر یہ ہے بڑا سچا جذبہ۔"

بیرا بل لے آیا تھا۔ نجمی نے پلیٹ میں دو نوٹ رکھ دیئے "باقی تم رکھ لینا۔" اس نے بیرے سے کہا۔ بیرا چلا گیا تو وہ رعنا کی طرف متوجہ ہوا "اور اب یہ اچھی بھلی ملازمت آپ نے چھوڑ دی ہے۔ کیوں؟"

"میرے نئے باس کا خیال ہے کہ سیکریٹری کی حیثیت سے جو فرائض میں ادا کررہی ہوں' اس کے علاوہ بھی میرے کچھ فرائض ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوری کے حوالے میں' میں یہ بات تسلیم کرسکتی تھی مگر اب جبکہ میرے پاس ہر طرح کی اہلیت ہے' خود اعتمادی ہے اور میں سر اٹھا کر جینا سیکھ چکی ہوں تو یہ کیسے تسلیم کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" نجمی کے لہجے میں احترام تھا۔

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔"

نجمی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا اُس سے زیادہ سمجھ چکا ہوں۔"

رعنا نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی "تو پھر چلیں؟"

"آیئے۔"

دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے "چلئے میں آپ کو رکشا میں بٹھادوں۔" نجمی نے کہا۔

"نہیں آپ اطمینان سے چلے جائیں۔ میں بس سے جاؤں گی۔"

نجمی چند لمحے ہچکچاتا رہا پھر اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر رعنا کی طرف بڑھایا "یہ کارڈ رکھ لیجئے۔ دو تین دن میں مجھے فون کرلیجئے گا۔ ممکن ہے اس وقت تک میں آپ کے لیے کسی جاب کا بندوبست کرچکا ہوں۔"

رعنا نے ممنونیت سے اسے دیکھا "شکریہ نجمی صاحب۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

○☆○

وحید نجمی کی نفسیات دانی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

رعنا سے دوسری ملاقات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ عاصم قریشی اس دنیا کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ تاہم دنیا ابھی اچھے انسانوں سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے عاصم قریشی کا وجود کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ ایڈز میں مبتلا کیسے ہوا؟

ایڈز کے بارے میں اول تو بات کی ہی نہیں جاتی تھی مگر کچھ عرصے سے 'نیشنل ایڈز پروگرام' اچانک ہی فعال ہوگیا تھا۔ اب ٹی وی پر کمرشل بھی آرہے تھے اور اخبار میں اشتہارات بھی۔ لوگوں کو بتایا جارہا تھا کہ ایڈز کیسے پھیلتا ہے۔ احتیاطی تدابیر پر زور دیا جارہا تھا۔ یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ بلاواسطہ اور بالواسطہ ایڈز میں مبتلا ہونے کے امکانات برابر ہی ہیں۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ایڈز کے شکار سے نفرت نہ کریں۔ اسے اچھوت نہ بنالیں۔ اور شاید اس لیے بھی کہ مریض بھی اس خود فریبی میں مبتلا رہے کہ اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے گناہوں کا شاخسانہ نہیں بلکہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ نجمی کے خیال میں جنسی بے راہ روی کا شکار لوگوں اور سرنج کے ذریعے منشیات استعمال کرنے والوں کے علاوہ کسی کے لیے ایڈز کا شکار ہونے کا

ان ہزار میں ایک تھا۔ لیکن لوگ جنہیں ایڈز کے بارے میں
ومات حاصل نہیں تھیں' وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔
ویسے احتیاط بہت ضروری تھی۔ ایڈز کے حوالے سے ہی
ں' عام انسانی صحت کے لیے بھی۔ حجاموں کی دکانوں پر ایک
زے کا استعمال ویسے بھی اچھا نہیں تھا۔ لوگوں کو ایک دوسرے
، جلدی بیماریاں لگ سکتی تھیں اور کئی مریضوں پر ایک ہی سرنج
استعمال تو بے حد مذموم تھا۔
نجی کے خیال میں نیشنل ایڈز پروگرام کے اشتہاروں میں دیا
نے والا تاثر ہر زاویے سے منفی پہلو رکھتا تھا۔ ایک طرف تو یہ
ز ایڈز کے مریض کو خود ترسی میں مبتلا کرتا تھا۔ اسے احساس
تا تھا کہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یوں اس کے اندر انتقام
جذبہ دیوانگی کی حد تک ابھر سکتا تھا۔ اور وہ بے حد خطرناک
ت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس انداز کی مسلسل پبلسٹی نے
ل زندگی گزارنے والے عام لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کردیا
۔ سیدھے راستے پر چلنے والے لوگ ایڈز کے اندیشے کے بوجھ
لے دبتے جارہے تھے۔ یہ زیادتی تھی۔ نارمل لوگوں کو ابنارملٹی کی
رف دھکیلا جارہا تھا۔ نجی کتنے ہی ایسے لوگوں سے واقف تھا جو
م کے پاس جانے سے گھبرانے لگے تھے۔ شیو تو خیر گھر پر کیا جاسکتا
ے لیکن بال ترشوانے کی تو مجبوری ہے۔ دوسری طرف ایسے
ریض بھی تھے جنہیں ڈاکٹر خون ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیتا تو یا وہ
اف انکار کردیتے یا پرچا لے کر کسی لیبارٹری کا رخ کرنے کی
ائے گھر آتے اور دوبارہ اس ڈاکٹر کے پاس نہ جاتے۔ جن
ریضوں کو خون کی ضرورت ہوتی وہ خود بھی اور اُن کے لواحقین
ی خون لینے سے ڈرتے۔ یعنی ایڈز کے خوف کے مارے دوسرے
ریقوں سے اپنی صحت کو اتنا ہی نقصان پہنچا رہے تھے۔ تیسری
رف وہ لوگ جنہیں صحیح معنوں میں ایڈز کا خطرہ لاحق تھا' احتیاطی
ابیر پر عمل کرکے مطمئن تھے۔ انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی
ی۔
یعنی محدود اور نامکمل آگہی سب کے لیے مہلک ثابت ہورہی
ی۔ سبھی کے لیے عذاب بن گئی تھی!
نجی کا خیال تھا کہ ایڈز کے ہزار مریضوں میں صرف ایک ایسا
و سکتا ہے' جو بے قصور ایڈز کا شکار ہوا ہو اور لگتا تھا کہ اسے
اصم قریشی کو ہزار میں سے ایک تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ ایک
یر معمولی بات تھی۔ مگر اب بھی وہ اس سوچ سے دست بردار
ہونے کو تیار نہیں تھا کہ عاصم کو بھی یہ مرض کسی سے لگا ہوگا۔ وجہ
یہ تھی کہ جتنے مضبوط اس بات کے شواہد تھے کہ عاصم کردار کے
اعتبار سے ایک بڑا آدمی ہے' اتنی ہی جان دار اس بات کی دلیلیں
تھیں کہ وہ بالواسطہ ایڈز کا کیس ہے۔
عاصم قریشی کروڑ پتی آدمی تھا۔ ایسا شخص جسے معاشرے میں
ی آئی پی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کراتا تھا
لیکن پاک لیب میں جو ملک بھر میں مانی ہوئی اور قابل اعتبار لیب
تھی۔ وہاں ہر شخص کے لیے پیکنگ کھول کر نئی سرنج استعمال کی
جاتی تھی اور استعمال کے بعد ضائع کردی جاتی تھی۔ اس میں شک و
شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یقیناً کسی بہت اچھی باربر شاپ میں
جاتا ہوگا۔ وہاں پرانے زمانے والے استرے کے استعمال کا کوئی
سوال نہیں تھا۔ اب تو عام نائی بھی وہ استرے استعمال کرتے تھے
جن میں بھل نہیں ہوتا بلکہ سیفٹی بلیڈ کو نصف کرکے استعمال کیا
جاتا ہے۔
تو پھر عاصم قریشی ایڈز کا شکار کیسے ہوا؟ اگر وہ اتنا ہی صاحب
کردار اور پارسا ہے جتنا کہ ہر شخص کہتا ہے تو ایک ہی صورت رہ
جاتی ہے۔ اس کی بیوی فوزیہ! یہ خیال آتے ہی نجی چونک کر اٹھ
بیٹھا۔ اس کے تصور میں بارِ وقار فوزیہ کا سراپا لہرایا۔ کیا یہ ممکن ہے؟
اس نے خود سے سوال کیا۔ دل نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن صحافی کے
تربیت یافتہ دماغ نے دل کو ڈپٹ دیا۔ "تم چپ رہو جذباتیت کے
مارے۔ خوا مخواہ ٹانگ نہ اڑایا کرو ہر معاملے میں۔ بس خون پمپ
کرتے رہو" وہ دل جسے کبھی لفٹ نہیں ملی تھی' گھبرا کر جلدی جلدی
خون پمپ کرنے لگا اور دماغ نے نجی کے کان میں سرگوشی کی۔
کیوں نہیں۔ انسان سے کسی بھی خطا کی امید رکھی جاسکتی ہے۔
شیطان نے سب سے پہلے کسے بہکایا تھا اماں حوا کو!
دل نہیں مانتا تھا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے لیکن نجی صحافی تھا۔
بہت اچھا تفتیشی صحافی۔ وہ ہر شخص پر اس وقت تک شک کرنے کا
قائل تھا جب تک اس کی برأت ثابت نہ ہو جائے۔
تو اب اسے فوزیہ کو ٹٹولنا تھا مگر کیسے؟ وہ اس بارے میں غور کر
ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "نجی
اسپیکنگ۔"
دوسری طرف خاموشی رہی۔
"ہیلو' کون ہے بھئی؟" اس بار اس کی آواز نسبتاً بلند تھی۔
پھر بھی چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک نسوانی آواز ابھری
"نجی صاحب' میں فوزیہ بول رہی ہوں۔ فوزیہ قریشی۔"
نجی کو شاک لگا۔ کچھ یوں کہ اس وقت وہ اسی کے بارے میں
سوچ رہا تھا اور کچھ اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خاصے
توقف کے بعد اُس سے مخاطب ہوئی تھی اور اُس کی آواز بھی بھرائی
ہوئی تھی جیسے دیر تک روتی رہی ہو۔
"ہیلو' یہ وحید نجی صاحب کا ہی نمبر ہے نا؟" اس بار فوزیہ کا
لہجہ ہذیانی تھا۔
"جی ہاں مسز قریشی' میں نجی بول رہا ہوں۔ فرمایئے۔"
"آپ مصروف تو نہیں ہیں؟"
"جی نہیں۔ آپ کام بتایئے۔"
"میرے گھر آسکتے ہیں؟"
"کیوں نہیں" نجی نے گھڑی میں وقت دیکھا "میں دس منٹ

میں پہنچ جاؤں گا۔"

"شکریہ' خدا حافظ۔" ریسیور رکھ دیا گیا۔

مجی کے بدن میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ ضرور کوئی اہم بات ہے۔ فوزیہ قریشی بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کہیں.... کہیں.....

○☆○

یہ اُس کی سالگرہ کا دن تھا۔ یہ دن اس کی زندگی کا خاص دن تھا جب تک امّی زندہ تھیں' اس روز خاص اہتمام کرتی تھیں۔ اس کی پسند کے کھانے پکواتیں۔ اسے تحفے ملتے۔ پھر امّی کے بعد ابّو نے بھی اس دن کا ہمیشہ خاص خیال رکھا۔ اس روز صبح سویرے ناشتے کی میز پر وہ اسے دیسی برتھ ڈے کہتے اور ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے۔ وہ بے تابی سے پیکٹ کھولتا۔ پیکٹ میں سے ہمیشہ کوئی ایسی چیز ملتی' جس کی اس نے کبھی خواہش کی ہوتی۔ پھر ابو کہتے۔ شام کو بازار چلیں گے۔ وہاں سے تم اپنی پسند کی کوئی چیز لے سکو گے۔ یہ ایک ریت بن گئی تھی۔ شام کو وہ ابو کے ساتھ بازار جاتا۔ رات کو گھر میں محدود سی پارٹی ہوتی جس میں ابو کے چند دوست اپنی فیملی کے ساتھ شریک ہوتے۔ شادی کے بعد فوزیہ نے بھی ہمیشہ اُس دن کا خاص خیال رکھا۔ تب مہمان زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ صرف خاور اپنی بیوی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اور اب پچھلے دو سال سے تو بچے بھی اسے تحفے دے رہے تھے۔

یہ اس کی پہلی سالگرہ تھی کہ وہ سو کر اٹھا تو کسی نے اسے وش نہیں کیا۔ پچھلی سالگرہ کا دن اسے خوب یاد تھا۔ چومے جانے کے احساس سے اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ فوزیہ کے ہونٹ اس کی پیشانی پر تھے۔ ایک رخسار پر سلیم کے اور دوسرے رخسار پر ملیحہ کے ہونٹ ثبت تھے اور جیسے ہی اُس کی آنکھیں کھلیں' کورس شروع ہوگیا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیڈی اور فوزیہ کی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو عاصم بالکل الگ تھی۔

وہ چونکا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے مسل ڈالیں۔ "میرے خدا میری ہر خطا معاف کردے۔ میرے آقا مجھے بخش دے۔ آج کے دن کی تنہائی تو میرے لیے بہت بڑی سزا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

اسے بابر کا خیال آیا۔ یہ بھی ضروری تھا۔ بابر اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ لیکن سالگرہ کے دن وہ اسے خاص طور پر یاد آتا تھا۔ اس سے رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اُس کی ۱۸ویں سالگرہ کا تحفہ تھا۔

اسے بچپن سے ہی بھائی کی بڑی آرزو تھی۔ کہیں دو بھائیوں کو لڑتے کھیلتے دیکھتا تو اداس ہو کر گھر آتا اور امی کی گود میں سر رکھ کر کہتا "امی.... میرا کوئی بھائی کیوں نہیں ہے؟"

امی سرد آہ بھر کر کہتیں "خدا کی مرضی میں کس کا دخل ہے بیٹے۔"

"تو اللہ میاں کیا مجھے ایک بھائی نہیں دے سکتے؟" معصومیت سے کہتا۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹے۔ اللہ میاں سب کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ کیا کرو۔"

وہ بڑا ہوتا گیا۔ بھائی سے محروم ہی رہا لیکن اس نے کبھی اس محرومی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ اُس کی آرزو بھی اُس کی عمر کے ساتھ بڑھتی رہی۔ البتہ اس نے اب امی یا کسی اور کے سامنے اس خواہش کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ امی اور ابو یہی سمجھے کہ اُس نے اس محرومی کو قبول کرلیا ہے۔

اسے امّی کی موت خوب یاد تھی۔ وہ اس وقت بارہ سال کا تھا۔ وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔ نا سمجھی اور سمجھ داری کے درمیان معلق لڑکا اتنا جانتا تھا کہ اس کی دعا قبول ہونے والی ہے۔ اس کے گھر ایک چھوٹا بھائی آنے والا ہے۔ وہ ہر روز آنے والے اس بھائی کے لیے نت نئے منصوبے بناتا۔ اسے امی سے شرم آنے لگی تھی لیکن وہ امی سے بہت خوش بھی تھا۔

لیکن پھر اس کی خوشیاں چھن گئیں۔ سب خواب بکھر گئے۔ امی اس کے لیے بھائی کو جنم دینے کے دوران ہی اللہ میاں کے پاس چلی گئیں اور پھر ننھا بھائی بھی چند گھنٹے بعد امی کے پاس چلا گیا۔

وہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو قبول کرلیا۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھدار تھا۔ اور اس سانحے نے اسے اور سمجھدار بنا دیا تھا۔ اس نے غم بہت کیا لیکن ظاہر بہت کم کیا۔ البتہ ماں اور اس بھائی کی موت جس کے لیے اس نے پل پل دعائیں کی تھیں' کی حقیقت کو قبول کرنے والے بارہ سالہ لڑکے نے بھائی کی آرزو سے دست بردار ہونا قبول نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی انسان کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ موت پر صرف اللہ کا اختیار ہے۔ اس میں شکایت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اتنی کم عمری میں بھی اُس کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ دعائیں ضرور قبول فرماتے ہیں۔ اس کی طبیعت میں شکر اتنا تھا کہ وہ سوچتا... اللہ نے میری بھائی والی دعا بھی قبول فرمائی۔ مجھے بھائی دیا۔ چند گھنٹے کے لیے سہی مگر میری دعا بھی تو نامکمل تھی۔ میں نے بھائی تو مانگا تھا' اس کے لیے بڑی عمر تو نہیں مانگی تھی۔ سو وہ بھائی کی آرزو دل میں لیے لڑکپن سے گزر کر جوانی کی سرحد میں داخل ہوگیا۔

وہ اس کی ۱۸ویں سالگرہ تھی۔ صبح ابو نے معمول کے مطابق اسے وش کیا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا "یہ تمہارا تحفہ ہے بیٹے اور ہاں... آج شیڈول کچھ مختلف ہوگا۔ شام پانچ بجے دارالاطفال میں ایک تقریب ہے۔ مجھے اس میں شرکت کرنی ہے اس کے بعد بازار چلیں گے۔ پارٹی نو بجے ہوگی۔"

عاصم جانتا تھا کہ ابو ایسے کئی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ کتنے ہی یتیم لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے اخراجات بھی انہوں نے

ہ وتے لے رکھے تھے "ابو' میں بھی تقریب میں چلوں گا آپ
ساتھ۔" اس نے بے دھیانی سے کہا۔ اس کی انگلیاں پیکٹ
کاغذ سے الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے اوپر کا کاغذ کھولا اندر
ن پیپر تھا۔ اس نے بے تابی سے براؤن پیپر کو پھاڑ ڈالا۔ وہ
ن رہ گیا' چھوٹا سا بے حد خوب صورت ایک مخملیں جیول باکس
کے ہاتھ میں تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ انگوٹھی' کف لنکس' ٹائی
کیا ہو سکتا ہے۔
ابو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرائے "کھول کر دیکھو

اس نے دھڑکتے دل سے باکس کھولا۔ ایک لمحے کو اس کا دل
دھڑکنا بھول گیا۔ خوب صورت مخملیں بیج پر ایک چابی رکھی
۔ چابی کے سرے پر حروف چمک رہے تھے۔ TOYOTA
"باہر کھڑی ہے' چل کر دیکھ لو۔" ابو نے کہا۔
اُس نے سر اٹھا کر ابو کو دیکھا لیکن ان کی محبت سے چھلکتی
وں میں دیکھا نہیں گیا۔ اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ
کہا "لیکن ابو میں اس کا اہل بھی۔۔۔"
"تم آج ۱۸ سال کے ہو گئے ہو عاصم۔ اب تم بالغ ہو' اب میں
سے امید کرتا ہوں کہ تم بڑے فیصلے بھی پورے اعتماد سے کرو
۔"
"شکریہ ابو۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور میں ہمیشہ آپ کے اعتماد
را اترنے کی کوشش کروں گا۔"
"ہاں' تم کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ تقریب میں شرکت کرو
؟"
"جی ابو۔"
"تو چار بجے دفتر پہنچ جانا تیار ہو کر۔ وہیں سے چلے چلیں گے۔
ب کے بعد بازار چلیں گے۔ جہاں سے تم اپنی مرضی کی کوئی بھی
خرید سکو گے۔"
"ابو' کار کے بعد کم از کم آج مجھے کسی چیز کی ضرورت
۔"
"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ موقع ملے تو اس سے ضرور
ہ اٹھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرنا کبھی نہ بھولو۔ اوکے؟"
"اوکے ابو۔"
"ہاں' دفتر اپنی کار میں آنا۔ اچھا چلو کار تو دیکھ لو اپنی۔"
دونوں باہر آئے جہاں نئی چم چماتی سلور گرے ٹویوٹا کرولا
ڑی تھی۔
ابو دفتر چلے گئے۔ وہ ناشتا کر کے اپنی گاڑی میں نکل کھڑا ہوا۔
اتنا خوش تھا کہ اسے کھانے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ بھوک ہی
ں لگی۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں کہاں گاڑی دوڑاتا
رہا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ سوا چار بجے ابو کے پاس پہنچ گیا۔
دارالاطفال کی تقریب بے حد سادہ تھی۔ بچوں کو صاف
ستھرے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ تقریب کچھ بچوں کے ختم قرآن
مجید کی اور کچھ بچوں کی بسم اللہ کی تھی۔ وسیم قریشی صاحب مہمان
خصوصی تھے۔ تقریب کے بعد وہ فرداً فرداً بچوں سے ہاتھ ملا رہے
تھے۔ عاصم ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بچوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔
اچانک ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی نظر اس بچے سے ملی۔ وہ بڑی
معصومیت سے سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں میں نجانے
کیا تھا کہ عاصم بُت بن کر رہ گیا۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔
ابو آگے نکل گئے۔
اُس بچے میں نہ جانے کیسی کشش تھی۔ وہ بے حد جانا پہچانا'
بے حد اپنا اپنا محسوس ہو رہا تھا "تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟" اس نے
پوچھا۔
"میرا نام بابر ہے انکل۔"
"انکل نہیں' مجھے بھائی جان کہو۔"
"ٹھیک ہے بھائی جان۔"
اسی لمحے ابو نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ تمام بچوں سے ہاتھ ملا
چکے تھے "کیا بات ہے عاصم؟" انہوں نے اسے پکارا۔
"آیا ابو" عاصم نے کہا پھر وہ بچے کی طرف مڑا "تم یہیں
کھڑے رہنا بیٹے۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ابو کی طرف چلا
گیا۔ ابو یتیم خانے کے منتظم سے بات کر رہے تھے۔
"ابو۔۔۔ ایکسکیوزمی۔" اس نے کہا۔
"جی بیٹا؟" ابو اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"آپ کو مجھے ایک من پسند تحفہ دینا ہے نا آج؟"
"جی بیٹے' یہ تو طے شدہ بات ہے۔"
"تو میں وہ بچہ لینا چاہتا ہوں۔" عاصم نے بچے کی طرف اشارہ
کیا "بابر ہے اس کا نام۔"
حیرت سے ابو کا منہ کھل گیا "بچہ؟ بابر؟"
"جی ہاں ابو' میرے لیے چھوٹا بھائی۔"
ابو کی آنکھوں میں پل بھر کو نمی سی چمکی لیکن پھر انہوں نے خود
پر قابو پا لیا "رضوان صاحب' کیا یہ ممکن ہے؟" انہوں نے منتظم
سے پوچھا۔
"کیوں نہیں جناب۔ یہ تو خوشی کی بات ہو گی ہمارے لیے اور
بچے کی تو قسمت سنور جائے گی۔ کل آپ وکیل کو لے آیئے گا'
قانونی کارروائی مکمل ہو جائے تو اسے لے جایئے گا۔"
"ٹھیک ہے رضوان صاحب۔"
"ابو۔۔۔" عاصم نے اچانک مداخلت کی "۳۰ دسمبر تو آج ہے
نا' کل تو ۳۱ ہو جائے گی۔"
ابو اُس کی بات سمجھ گئے "رضوان صاحب' ہم اس بچے کو
ابھی نہیں لے جا سکتے؟" انہوں نے پوچھا۔
رضوان صاحب مسکرائے "کوئی بات نہیں سر۔ قانونی
کارروائی کل ہو جائے گی۔ آپ بچے کو آج لے جائیں۔ ویسے

عاصم میاں نے بہت پیارے بچے کا انتخاب کیا ہے۔ بہت نیک طینت اور محبت والا بچہ ہے یہ بابر۔ نہایت سلیم الطبع۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ابو رضوان صاحب کے ساتھ بابر کی طرف بڑھ گئے۔ عاصم چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ پھر وہ بھی بابر کی طرف چل دیا۔ وہاں ابو رضوان صاحب سے کہہ رہے تھے "بچے سے تو پوچھ لیں رضوان صاحب۔"

"اس کی تو یہ خوش قسمتی....."

"پھر بھی" ابو کے لہجے میں تیزی تھی۔

"بابر... قریشی صاحب تمہیں اپنا بیٹا بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ جاؤ گے بیٹے؟" رضوان صاحب نے بابر سے پوچھا۔

بابر نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں" اس کے لہجے میں عجیب سی معذرت تھی۔

قریب پہنچتے ہوئے عاصم نے دیکھا کہ ابو کا چہرہ ست گیا ہے "کیوں بیٹے؟" انہوں نے بے حد شفقت سے پوچھا "ہم تمہیں اچھے نہیں لگے؟"

"آپ بہت اچھے ہیں" بابر نے کہا پھر اُس نے سر گھما کر اپنی طرف آتے ہوئے عاصم کو دیکھا اور بولا "میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ بھائی جان کے ساتھ۔"

ابو کے چہرے سے کشیدگی ڈھل گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے "ٹھیک ہے بابر تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

رضوان صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ابو سے کہا "آپ میرے ساتھ دفتر میں تشریف لے چلیں۔ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ لے لیجئے گا۔ میں اس کے بارے میں بتا بھی دوں گا آپ کو۔" ابو رضوان صاحب کے ساتھ آفس کی طرف چل دیئے۔

"بابر... تم اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔" عاصم نے بابر سے کہا اور خود بھی آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں رضوان صاحب ایک فائل کھولے بیٹھے تھے "یہ بچہ چھ سال کا ہونے والا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے کہ عاصم بھی وہاں پہنچ گیا "اس کی ماں اس کی ولادت سے چھ ماہ پہلے بیوہ ہوئی تھی۔ یہ جناح اسپتال میں پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے دوران مر گئی۔ یہ یہاں ایک دن کا آیا تھا۔ یہ ہے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ۔" انہوں نے سرٹیفکیٹ عاصم کی طرف بڑھایا۔ عاصم نے سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ پھر اس نے سرٹیفکیٹ ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ابو... اللہ میاں نے سچ مچ مجھے میرا بھائی دے دیا ہے۔"

ابو نے حیرت سے اسے دیکھا پھر سرٹیفکیٹ کو پڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "۲۴ اپریل ۶۷ء"

انہوں نے دھیمی آواز میں کہا "بے شک بیٹے' یہ اللہ کی طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

وہ تاریخ عاصم کیسے بھول سکتا تھا۔ اس دن اللہ نے امی کے ساتھ اس کے نومولود بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔

دفتر کے باہر ننھا بابر اس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپنگ بیگ تھا۔ عاصم کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے بابر؟" عاصم نے پوچھا۔

"میرے کپڑے اور کتابیں ہیں بھائی جان۔"

"یہاں کی سب چیزیں اور تمام یادیں یہیں چھوڑ دو بابر۔ ابھی ہم تمہارے لیے نئے کپڑے اور کتابیں لیتے ہوئے گھر چلیں گے۔" عاصم نے کہا۔

یادیں وہیں چھوڑنا تو بابر کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا تاہم شاپنگ بیگ اس نے وہیں زمین پر رکھ دیا اور اس کی انگلی تھام کر بولا "چلیں بھائی جان۔"

انگلی پر ننھے منے ہاتھوں کی وہ گرفت ایک ایسی محبت کا احساس دلا رہی تھی جو عاصم کے لیے بالکل نئی تھی' جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ وہ بابر کو اپنی نئی گاڑی کی طرف لے گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر بابر سے کہا "بیٹھو بابر' یہ تمہاری اور میری کار ہے۔"

گلی میں کوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ انجن نے بیک فائر کیا تو عاصم بری طرح چونکا۔ پھر نگاہوں کی دھندلاہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس بار اُس نے دریا پر بند نہیں باندھا "میرے معبود' تو نے مجھ پر ہمیشہ کرم فرمایا۔ مجھے خوشیاں عطا فرمائیں۔ آج میں اکیلا ہوں۔ بچوں سے' بیوی سے دور تو ضرور مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا ہوئی ہوگی۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "عاصم قریشی اسپیکنگ" اس نے بے ساختہ کہا۔ اس وقت اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اب وہ مرشد حسین ہے۔

"ہیلو بھائی جان" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "میں آگیا ہوں بھائی جان۔"

عاصم گنگ ہو کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے وہ بولا "بابر... بابر!" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"ائرپورٹ سے لیکن زیادہ باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ مجھے یہ بتائیں' میں کہاں پہنچوں؟"

"ٹیکسی کرو اور کینے لبرٹی طارق روڈ پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں منتظر ملوں گا۔"

"او کے بھائی جان۔ باقی باتیں ملاقات پر۔" رابطہ منقطع ہو گیا۔

رکے ہوئے آنسو پھر بہنے لگے۔ اس بار وہ شکر کے آنسو تھے۔

معبود نے پھر اس پر کرم فرمایا تھا۔ جنم دن پر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کی سالگرہ کا تحفہ امریکا سے آیا تھا۔

○☆○

اس بار فوزیہ ایک ٹوٹی پھوٹی ہستی لگ رہی تھی۔ متورم آنکھوں نے نجمی کے اندازے کی تصدیق کردی۔ وہ یقیناً روتی رہی تھی۔ نجمی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے پھیکی پھیکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری "آیئے نجمی صاحب" فوزیہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا "میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں فرصت سے بیٹھا تھا۔" نجمی نے کہا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ثمینہ کافی کی ٹرے رکھنے کے بعد واپس جارہی تھی۔ شاید فوزیہ نے ریسیور رکھتے ہی اسے کافی کے لیے کہہ دیا تھا۔ فوزیہ نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکادی "آج میں بینک گئی تھی۔" اس نے کہا۔

"اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے؟" نجمی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

فوزیہ نے سر کو تھپکی جنبش دی اور کافی کی پیالی پر جھک گئی۔

"کوئی خاص بات؟"

فوزیہ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نجمی حیران رہ گیا۔ پچھلی ملاقات میں وہ بہت مضبوط اعصاب کی ثابت ہوئی تھی۔ یقیناً کوئی بڑی بات ہوگی جس نے اسے اس طرح توڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ لیکن کیا بات ہوسکتی ہے وہ فوزیہ کو بغور دیکھتا رہا جو پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ "کچھ بتایئے تو۔" نجمی نے کہا۔

"انہوں نے میرے اکاؤنٹ میں دس کروڑ روپے جمع کرائے ہیں۔"

نجمی کو جھٹکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا "کب کی بات ہے؟"

"گھر سے جانے کے ٹھیک آٹھویں دن۔"

"نقد یا چیک کے ذریعے؟"

"میکرانویسٹرز انکارپوریٹڈ کا چیک تھا۔"

"تو آپ اتنی دل گرفتہ کیوں ہیں۔ یہ تو ایک مثبت علامت ہے یعنی وہ زندہ ہیں۔"

فوزیہ نے سر اٹھا کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میرے نزدیک یہ سراسر منفی علامت ہے۔ اتنی بڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا مطلب ہے کہ خدانخواستہ....." وہ کہتے کہتے رک گئی "کاش ایسا نہ ہو لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طور پر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے اور بچوں کو اتنی دولت کا کیا کرنا۔ اس سے زیادہ تو ہمیں اُن کی ضرورت ہے اور رہے گی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

نجمی کو پشیمانی ہونے لگی۔ پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت وہ اس عورت پر شک کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا میں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی جنہیں اُن کا شوہر دس کروڑ روپے دے کر غائب ہوجائے اور وہ خوش ہونے کی بجائے شوہر کا غم کریں۔ یقیناً ایسی عورتیں کم ہی ہوں گی۔ اور جو ہوں گی وہ شوہر پرست ہوں گی۔ ان پر اس طرح کا شک کرنا بھی بدترین گناہ ہوگا۔

"اب یہ تو طے ہے بیگم قریشی کہ آپ کے شوہر اپنی مرضی سے، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت روپوش ہوئے ہیں۔" اس نے کہا "آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔"

"میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے لیکن مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" فوزیہ کے لہجے میں بے بسی تھی "سچ کہہ رہی ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

نجمی نے سوچا، ظاہر ہے یہ کیسے سمجھ سکتی ہے۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی ختم کرکے رکھ دی "ایک بات بتائیں۔" اُس نے کہا "آپ صرف اس بات پر تو اپ سیٹ نہیں ہیں۔ کوئی اور بات بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟"

فوزیہ اُس سے نظریں چرانے لگی "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پلیز مجھ سے نہ چھپایئے، میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

فوزیہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ آخرکار اس نے بتایا "دراصل آج عاصم کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے یہ سوچنا بہت عجیب لگ رہا ہے کہ آج وہ اکیلے ہوں گے۔ کاش ایسا نہ ہو۔"

نجمی سمجھ گیا، اسے فوزیہ کو اداسی کے خول سے نکالنا تھا۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ایسی کیفیت میں اشتعال بے حد موثر ثابت ہوتا ہے "تو آپ یہ کیوں سمجھ رہی ہیں کہ وہ اکیلے رہنے کے لیے آپ کو اور بچوں کو چھوڑ کر روپوش ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں مسز قریشی۔ اگر کوئی شخص اپنے تمام اثاثے ۹۰ کروڑ میں فروخت کرکے ۱۰ کروڑ بیوی کو نکادے تو یہ کوئی احسان تو نہیں۔ اور ۸۰ کروڑ روپے لے کر روپوش ہونے والا کسی کٹیا میں بیٹھ کر خود کو عبادت و ریاضت میں مصروف کرنے کے لیے تو روپوش نہیں ہوا ہوگا۔"

خلاف توقع فوزیہ مسکرادی "آپ عاصم کو نہیں جانتے اس لیے ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ ورنہ میں عاصم کے متعلق اس قسم کی گفتگو برداشت نہیں کرتی۔"

"تو آپ کے خیال میں اُس پورے قصے کی بنیاد میں کوئی عورت نہیں ہوگی؟"

"اگر مجھے اس مفروضے پر یقین آسکتا ہوتا تو میں اس وقت پریشان نہ ہوتی نجمی صاحب۔ پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی بہت ہی خطرناک بات ہوگی کہ وہ اس طرح چلے گئے اور میں اس کے بارے میں کوئی اندازہ تک نہیں قائم کرسکتی۔

کی وجہ ہے میری پریشانی کی۔"

اب نجمی خود کو اُس کی جگہ رکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کتنی پریشان ہوگی۔ اُس کے جی میں آئی کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا کر کم از کم امریکنوں کی قید سے تو آزادی دلادے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ اس کے لیے کوئی مناسب موقع نہیں۔ یہ اس کے شوہر کا جنم دن ہے۔ "ایک ذاتی سوال پوچھوں آپ سے؟"

"ضرور پوچھیں۔ آخر میں ایک بے حد ذاتی معاملے میں آپ سے مدد لے رہی ہوں۔"

"بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"

فوزیہ نے ایک سرد آہ بھری اور جیسے کچھ دیر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ پھر بولی "میں انہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کے پاپا انہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اتنے چھوٹے معصوم بچے۔ کیا گزرے گی ان پر۔ انہیں یہی معلوم ہے کہ عاصم امریکا گئے ہوئے ہیں۔"

"لیکن یہ اس مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔"

"جانتی ہوں۔ کل میں انہیں لے کر مری جارہی ہوں۔ وہاں اسکول میں داخل کرادوں گی۔ ثمینہ وہیں مری میں رہے گی۔ وہاں ہمارا ایک کاٹیج ہے۔"

"آپ کی واپسی کب ہوگی؟"

"جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گی۔ پھر بھی ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔" فوزیہ نے جواب دیا "آپ عاصم کو تلاش کررہے ہیں نا۔ کرتے رہیں گے نا؟"

نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا "میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ انکاؤنٹر سے چیک آؤٹ کے بعد انہوں نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنا جس نے خود کو چھپانے کے لیے اپنی ہر شناخت مٹادی ہو، تقریباً ناممکن کام ہے۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا رہوں گا لیکن میں زیادہ پرامید نہیں ہوں۔"

فوزیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا "میں سمجھتی ہوں اور آپ کی شکرگزار بھی ہوں۔ مجھ سے آپ کسی بھی قسم کی مدد طلب کرسکتے ہیں۔ مری میں آپ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کرسکتے ہیں۔" اس نے کاغذ پر ایک نمبر لکھ کر نجمی کی طرف بڑھادیا۔

اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے نجمی سوچ رہا تھا کہ اب چند روز کی فرصت ہے۔ خاور ندیم ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ فوزیہ مری جارہی تھی اور عاصم کا کوئی سراغ فی الحال سامنے نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس عرصے میں ایڈز پر دو تین آرٹیکل ضرور لکھے گا۔ وقت آگیا تھا کہ لوگوں کو ایڈز کے بارے میں بتایا جائے۔ حکومت کو اور محکمہ صحت کو احساس دلایا جائے کہ وہ اس معاملے میں صحیح خطوط پر کام نہیں کررہے ہیں اور درست سمت میں بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ عام لوگوں کو یہ بھی بتانا تھا کہ انہیں ایڈز کے مریضوں سے نفرت کا کوئی حق نہیں۔ جو کیس عدالت میں ہوتا ہے اس پر اخبارات میں بھی رائے زنی نہیں کی جاتی کہ یہ توہین عدالت ہے تو پھر انسانوں کو کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں زیر سماعت کسی کیس پر فیصلہ صادر کرنے کا کیا حق ہے!

○☆○

ٹیکسی کیفے لبرٹی کے سامنے رکی۔ بابر نے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈرائیور نے ڈکی کھول دی تھی۔ اس نے دو سوٹ کیس نکال کر رکھ دیئے "یہ لیجئے سر آپ کا سامان۔" بابر نے پرس کھول کر اسے دو سو روپے دیئے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص اس کی طرف بڑھا "واپسی مبارک ہو بابر۔"

بابر نے اسے صورت سے نہیں آواز سے پہچانا۔ اس شخص کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی، بال بھورے تھے۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اسے اس میں بھائی جان کی شباہت نظر آنے لگی "السلام علیکم۔ ارے بھائی جان، یہ کیا حلیہ بنالیا ہے آپ نے۔"

عاصم نے سلام کا جواب دے کر اسے گرم جوشی سے لپٹالیا۔ بابر بے تابانہ بھائی جان، بھائی جان کہتے ہوئے اس کے رخساروں اور گردن کو چومے جارہا تھا۔ دونوں کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک مصروف فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔

پھر پہلے عاصم کو ہی ہوش آیا "چلو، اب گھر چلیں۔"

بابر کی مزاحمت کے باوجود ایک سوٹ کیس عاصم نے اٹھالیا اس کی پناہ گاہ ویسے بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ تین منٹ بعد وہ فلیٹ میں تھے۔

"اب تم نہا دھو کر کپڑے بدل لو پہلے۔" عاصم نے کہا "اپنے سوٹ کیس سے تولیہ بھی نکال لینا۔"

"تولیہ تو یہ کرسی پر بھی پڑا ہے۔" بابر نے اشارہ کیا۔

"یار بہت میلا اور بدبودار ہورہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔" بابر نے کہا اور اپنے سوٹ کیس پر جھک گیا۔ کپڑے اور تولیہ لینے کے بعد وہ باتھ روم میں جا گھسا۔ نہا دھو کر نکلا تو وہ فریش ہوچکا تھا "بھائی جان، میں شیو بنوا کر ابھی آیا۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"شیو؟ یہ کیا حماقت ہے۔ شیو ہمیشہ گھر میں بنایا کرو، سمجھے؟" عاصم نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ آئندہ ایسا ہی ہوگا لیکن آج معاف کردیں۔ میرے پاس شیونگ کٹ نہیں ہے۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں تم شیو باہر نہیں بنواؤ گے۔"

"تو پھر؟ آپ تو شیو سے بے نیاز ہوچکے ہیں۔" بابر کے لہجے میں شگفتگی تھی "اب کیا کروں؟"

"شیو بنوانے جارہے تھے، اب شیو کرنے کا سامان لے آؤ۔" عاصم نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر اس نے جیب سے ہزار کے چند نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے "دو ایک شلوار سوٹ بھی خرید

لینا اپنے لیے۔"

"رقم تو میرے پاس بھی ہے بھائی جان۔ لیکن آپ کے ہاتھ سے پیسے لیے اتنے دن ہو گئے ہیں اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

بابر کے جانے کے بعد عاصم بیڈ پر دراز ہو گیا۔ بابر کے آنے سے وہ بڑی تقویت محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلا نہیں تھا۔

بابر کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا تو لدا پھندا تھا۔ اس نے شاپنگ بیگ بیڈ پر ڈھیر کر دیے اور دو شاپنگ بیگ لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک کیک، چھری اور ایک لفافہ ٹرے پر رکھ کر لایا اور ٹرے چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی۔

عاصم چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا؟"

"بنے مت۔ آج آپ کی سالگرہ ہے۔"

عاصم اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے روکنے کے لیے پلکیں جھپکانے لگا "تمہیں یاد تھی؟"

"کب یاد نہیں ہوتی یہ تاریخ۔ بھائی جان، یہ آپ ہی کا نہیں میرا بھی تو جنم دن ہے۔" بابر نے کہا "آج یہاں پہنچنے کی خاطر تو میں نے وہ پہاڑ جیسے دن امریکا میں گزارے ہیں۔"

عاصم اس جملے کی معنویت کو سمجھ گیا لیکن خاموش رہا۔ بابر نے لفافے سے دو عدد کی موم بتیاں نکال کر کیک پر لگائیں پھر وہ اس سوٹ کیس کی طرف بڑھا جو اس نے ابھی کھولا بھی نہیں تھا۔ وہ سوٹ کیس کھول کر بابر نے چھوٹا سا ایک پیکٹ نکالا۔ پیکٹ بہت خوب صورت کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مبارکبادی کارڈ بھی منسلک تھا۔ بابر نے پیکٹ لے جا کر میز پر رکھ دیا "اب اٹھ بھی جائیے قبلہ۔"

عاصم اٹھا اور میز کی طرف چلا آیا۔ بابر نے موم بتیاں روشن کیں اور چھری عاصم کی طرف بڑھائی "بسم اللہ کیجیے بھائی جان۔"

عاصم کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ بابر کی محبت کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جھک کر پھونک ماری اور موم بتیاں بجھا دیں۔ اس نے کیک کاٹا۔ بابر کی تنہا آواز اسے وش کر رہی تھی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو بھائی جان۔ پھر اس نے عاصم سے چھری لے کر کیک کا ایک پیس کاٹا اور اسے انگلیوں میں تھام کر عاصم کی طرف بڑھا "منہ کھولیے بھائی جان۔"

"ایسے نہیں چھری مجھے دو۔"

عاصم نے بابر سے چھری لے کر ایک اور پیس کاٹا "اب تم بھی منہ کھولو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے منہ میں کیک کا ٹکڑا ٹھونس دیا اور دونوں ہی ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر بابر دوبارہ کچن کی طرف چلا گیا۔ اس بار وہ پلیٹیں لے کر آیا تھا "اب کیا ارادہ ہے بھائی؟" عاصم نے پوچھا۔

"ہمت بھوک لگ رہی ہے بھائی جان۔ اب کھانا کھائیں گے۔" بابر نے کہا۔ پھر اس کی نظر تحفے کے پیکٹ پر پڑی "میں بھی بہت بدتمیز آدمی ہوں۔ بھوک لگے تو جانور بن جاتا ہوں۔ تحفہ دینا بھول ہی گیا آپ کو۔" اس نے پیکٹ اٹھا کر عاصم کی طرف بڑھایا "سالگرہ مبارک بھائی جان۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے اور طویل عمر۔"

عاصم کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری "شکریہ بھائی" اس نے کہا اور بے تابی سے کاغذ کو ہٹانے لگا۔ بابر پھر کچن میں چلا گیا تھا۔

کاغذ ہٹا تو گتے کا ایک پیکٹ نکلا۔ اس پیکٹ کو کھولا تو ایک چھوٹا سا جیول باکس نکلا۔ مخملیں جیول باکس۔ عاصم کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی اٹھارویں سالگرہ یاد آ گئی۔ وہی سالگرہ جس پر اللہ نے اسے بابر کا تحفہ دیا تھا۔ اس سالگرہ پر ابو نے اسے ایسا ہی ایک جیول باکس دیا تھا جس میں اس کی زندگی کی پہلی کار کی چابی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ دن ہی یادوں اور آنسوؤں کا ہوتا ہے شاید۔

اس نے بچوں کے سے دھڑکتے دل کے ساتھ باکس کھولا۔ اندر ایک بے حد خوب صورت سنہری رسٹ واچ تھی۔

"کیسی لگی بھائی جان؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ بابر کھانا لگا چکا تھا۔ بروسٹ چکن، رائتہ، سلاد اور کلیجے.... اور اب وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عاصم گھڑی کو ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا "بہت خوب صورت ہے۔" اس نے کہا۔

"خوب صورت تو ہے لیکن اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک چابی میرے دل کی بھی ہے۔ جب بھی کبھی بے یقینی میں گرفتار ہوں اس چابی کو کھینچیں اور میرے دل کی آواز سن لیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

بابر نے قریب آ کر گھڑی کی سائیڈ میں لگی ایک چابی کی طرف اشارہ کیا "ذرا اسے باہر کی طرف کھینچیں۔"

عاصم نے چابی باہر کھینچی تو بابر کی آواز ابھری "آئی لو یو بھائی جان، آئی ٹیل آ لیز لو یو۔ آئی لو...." عاصم نے چابی دبا دی اور عجیب سی نظروں سے بابر کو دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال تھا۔ کیا یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی مجھ سے محبت کرتا رہے گا؟

"آیئے اب کھانا کھالیں۔"

کھانے کے بعد عاصم نے چائے بنائی۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر وہ دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے "اب سناؤ تعلیم مکمل ہو گئی؟" عاصم نے پوچھا۔

"جی ہاں" بابر نے چائے کا ایک گھونٹ لیا "فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوں۔ بہت سخت آٹھ سال گزارے ہیں آپ کے بغیر۔"

"کوئی محبت دحبت بھی کی کسی سے؟"

"اکیس سال پہلے کسی سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ تب سے اب تک کسی اور محبت کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

عاصم نے غور سے اسے دیکھا۔ نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی نہ آنکھوں میں۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"اب آپ سنائیں" بابر نے گہری سانس لے کر کہا اور چائے کی پیالی خالی کردی۔

"سگریٹ" عاصم نے سگریٹ کا پیکٹ اُس کی طرف بڑھایا۔

بابر ہچکچایا "یہ گستاخی تو نہیں ہوگی بھائی جان۔"

"پاگل۔ میں نے ہمیشہ تم سے یہی کہا تھا نا کہ ہم بھائی سے زیادہ اچھے دوست ہیں۔"

"یاد ہے بھائی جان۔" بابر نے سگریٹ لے لی۔ عاصم نے دیا سلائی جلا کر بڑھائی پھر اپنی سگریٹ بھی سلگالی۔

"ہاں بھائی جان' آپ کے فون نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری ضرورت ہے۔ پھر آپ نے یہ فون نمبر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گھر کا فون نمبر نہیں ہے اور اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ آپ کسی بہت بڑی پریشانی میں گرفتار ہیں۔ آپ بھابی اور بچوں سے دور اس فلیٹ میں رہ رہے ہیں کیوں؟ اور آپ کی صحت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"ہاں' میں اتنی بڑی مصیبت میں ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔" عاصم نے آہستہ سے کہا "تمہیں مدد کے لیے بلایا مگر اب سوچتا ہوں کہ اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں کیوں پھنساؤں۔"

"کیا بات کررہے ہیں بھائی جان۔ میں تو بس آپ ہی کا دوسرا روپ ہوں' آپ کا سایہ۔"

"مگر اب میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ ایک ایسا شخص جس سے کوئی بھی تعلق رکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

"میں تو جو کچھ ہوں اور رہوں گا' میرا حوالہ آپ ہی ہوں گے اور میں اس پر فخر کروں گا ہمیشہ۔" بابر نے کہا۔

"مجھے تم سے جو مدد درکار ہے وہ مجرمانہ بھی ہوسکتی ہے۔"

"میں آپ کے ایک اشارے پر جہنم بھی جاسکتا ہوں۔"

"صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اِس سے لگالو کہ اب میں عاصم قریشی نہیں ہوں۔ میرا نام' میری شخصیت بدل چکی ہے۔ سوائے تمہارے کسی کو نہیں معلوم کہ میں یہاں ہوں۔"

بابر مسکرایا "یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔ آپ دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد مجھ پر کرتے ہیں۔"

"ہاں بھائی' یہ تو ہے۔" عاصم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بس پھر سب کچھ بتادیجیے مجھے۔"

"اِس وقت نہیں' فی الوقت تو سکون سے سوجاؤ۔ تازہ دم ہوکر اٹھو گے تو بات کریں گے۔ اس وقت تو مجھے بھی نیند کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔"

بابر نے بحث نہیں کی۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے بھائی جان۔ یہ مناسب ہے۔ جلدی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔"

اُس رات عاصم کو نیند کے لیے دوا لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

○☆○

نجمی کو خاور ندیم سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ پہنچا۔ اس نے اُس کی سیکریٹری کو اپنا نام بتایا۔ سیکریٹری نے انٹرکام پر خاور سے بات کی اور پھر بولی "آپ تشریف لے جایئے جناب۔ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔"

اس ملاقات کا بندوبست فوزیہ نے کیا تھا۔ اس نے نجمی کو یقین دلایا تھا کہ خاور اس کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔

خاور نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "تشریف رکھیے مسٹر نجمی۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نجمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ خاور اٹھا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر آبیٹھا "آپ مصروف تو نہیں ہیں۔" نجمی نے اُس سے پوچھا "میری گفتگو طویل بھی ہوسکتی ہے۔"

خاور ندیم مسکرایا "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اسی لیے آپ کو چھٹی کے بعد کا وقت دیا ہے۔"

"شکریہ" نجمی بھی مسکرایا۔ خاور خوش اخلاق آدمی معلوم ہورہا تھا۔ ابھی وہ گفتگو شروع نہیں کرپائے تھے کہ سیکریٹری چائے لے آئی۔ چائے بنا کر اس نے پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھیں اور واپس جانے لگی۔ خاور نے اسے پکارا "مس ناہید' آپ اب چھٹی کرسکتی ہیں۔ بنارس موجود رہے گا۔"

"بہتر سر۔"

اس کے جانے کے بعد خاور نجمی کی طرف متوجہ ہوا "اب فرمایئے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں قریشی صاحب کی گمشدگی کے کیس پر کام کررہا ہوں؟"

خاور نے سر کو تصدیقی جنبش دی "فوزیہ نے مجھے بتادیا تھا۔"

"میں قریشی صاحب کی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ آپ اُن کے سب سے اچھے دوست ہیں؟"

"واحد دوست کہیے۔ میرے دوست بے شمار ہیں لیکن میں عاصم کا واحد دوست ہوں۔"

"آپ انہیں کب سے جانتے ہیں؟"

"ہمارا ساتھ تو بچپن سے ہے۔ ہم قریب رہے' ساتھ پڑھے اور پھر ایک ہی فیلڈ میں گئے... یعنی آبائی بزنس۔" خاور نے جواب دیا۔

"آپ قریشی صاحب کے واحد دوست ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آدم بیزار..."

"نہیں" خاور نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "عاصم کے بھی ملنے والے بہت ہیں لیکن وہ خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ طبع بھی ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ دوست ہوتا نہیں ہر ایک

ملانے والا۔ بس' کئی اعتبار سے وہ مختلف آدمی ہے۔"

"اُن کی گمشدگی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ پولیس بھی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے۔"

"لیکن پولیس قریشی صاحب کے متعلق اتنا نہیں جانتی' جتنا آپ جانتے ہیں۔" نجمی نے کہا "میں اس سلسلے میں آپ کا نظریہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"سچ پوچھیں تو میں اس سلسلے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکا ہوں۔ اس کی وجہ وہ ہے' جسے آپ پولیس پر میری فوقیت قرار دے رہے ہیں۔ یہ کہ میں عاصم کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اسے۔ وہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اب تک اُس کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے پاس کئی نظریے ہوتے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ وضاحت کریں گے آپ؟"

"عام آدمی کے بارے میں ہم کہہ سکتے تھے کہ کوئی لڑکی کا..... عشق کا چکر ہو گا یا یہ کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی کوئی بات عاصم کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور یہ خیال آتے ہی میں خود کو اندھیرے میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے سجھائی نہیں دیتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔"

"میں نے ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں' جو پارسا مشہور تھے' عورتوں کی قربت سے گھبراتے تھے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ ایسے ہی لوگ عورتوں کے معاملے میں کچھ بھی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ جنونی بھی ہوتے ہیں۔ ان سے کسی بھی اقدام کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ چھپے رستم کہا جاتا ہے ایسے لوگوں کو۔"

"عاصم ایسا نہیں ہے۔ میں اسے واقعی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو اپنے گردوپیش کو بھی درست دیکھنا چاہتا ہے۔ میری محفلوں میں شرکت تو دور کی بات ہے' وہ تو جب بھی ملتا ہے مجھے لیکچر پلاتا رہتا ہے۔ اُس کے اختیار میں ہو تو وہ پورے معاشرے کو سدھار کر رکھ دے۔"

"گہرے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔" نجمی نے رائے زنی کی۔

خاور مسکرایا "تم یقیناً اچھے صحافی ہو۔ مجھے اکسا رہے ہو؟ لیکن میں تمہیں وہی کچھ بتاؤں گا' جو میں جانتا ہوں' جس پر یقین ہے مجھے۔ اور یقین کرو میں خود آسانی سے کسی کی اچھائی پر یقین لانے والا آدمی نہیں۔ میں تو بہت عیب جو ہوں۔ انسانوں میں صرف خامیاں ہی تلاش کرتا ہوں۔"

نجمی بھی مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ خاور ایسا ہی ہے "پھر بھی خاور صاحب' میں عاصم صاحب کی تلاش میں نکلا ہوں اور سب سے مضبوط امکان یہی ہے۔"

خاور نے ایک سرد آہ بھر کے پوچھا "تم اس کے گھر گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"ثمینہ کو دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے۔"

"تب بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر میری چار بیویاں ہوتیں اور مجھے ثمینہ جیسی کوئی لڑکی نظر آجاتی تو میں اس سے ہر قیمت پر شادی کرتا اور اگر میں فوزیہ کی جگہ ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کو گورنس رکھنا تو کجا گھر سے ایک میل تک پھٹکنے نہ دیتا۔"

نجمی کو ہنسی آگئی "میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے میں اُن کی سیکریٹری رعنا سے بھی مل چکا ہوں۔"

"پھر بھی اپنے نظریے پر ڈٹے ہوئے ہو۔"

"میرے پاس فی الحال کوئی نظریہ نہیں۔ میں تو کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بہرحال' یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں گیا ہو۔"

"انہوں نے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔"

"یہ ارادہ تو اُس کا تقریباً ایک سال سے تھا۔ یہ تو جو کچھ بھی ہوا ہے اچانک ہی ہوا ہے کیونکہ وہ تو اپنے پروگرام پر عمل بھی نہیں کر سکا۔"

"کیسا پروگرام؟"

"فوزیہ نے نہیں بتایا تمہیں؟" خاور نے حیرت سے اسے دیکھا "وہ بیوی بچوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہونا چاہتا تھا۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے' وہ پاکستان سے عشق کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔" نجمی نے اعتراض اٹھایا۔

"عاصم آئیڈیلسٹ آدمی ہے۔ یہاں کے حالات نے اسے مایوس کر دیا ہے۔ اس کی اپنی منطق ہے کہ پاکستان میں اب سب کچھ امریکا کے حکم سے ہوتا ہے تو وہ وہاں کیوں نہ جا رہے' جہاں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آزادی تو اب وہاں ہے۔ یہاں تو آزادی کے نام پر بدترین غلامی ہے۔"

"تب تو انہیں فائٹ کرنی چاہیے۔ آزادی کے لیے' جمہوریت کے لیے۔"

خاور سنبھل کر بیٹھ گیا "آپ مان لیں کہ جمہوریت کا الاپ بھی امریکا ہی کا ہے۔ اب جو کچھ میں کہوں گا' وہ عاصم کے نظریات ہیں۔ میں ان میں سے بیشتر سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو پتا چلے گا کہ بھاری اکثریت اُن سے متفق ہو گی۔ دیکھیں' اسلامی جمہوریت کی مثالیں کم سہی لیکن ایسی ہیں کہ قیامت تک روشن رہیں گی۔ وہاں خلیفۂ وقت سے کوئی عام آدمی بھی جواب طلب کر سکتا تھا کہ اس کے پاس یہ چادر کہاں سے آئی جو وہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اور خلیفۂ وقت عاجزی سے سب لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا تھا۔ اور یہ جو مغربی جمہوریت ہے' اس میں تو ہر انسان کی رائے برابر ہے۔ حالانکہ عقل و فہم اور شعور میں کوئی دو انسان برابر نہیں ہوتے۔"

"اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔" نجمی بولا "لیکن اب تو مغربی جمہوریت ہی چلے گی۔ بہرحال جمہوریت آمریت سے تو بہتر

ہے۔"

"یہ تو ایک فیشن والا نعرہ ہے۔ ذرا حقیقت پسند بن کر تو سوچیں کہ کس دور نے کیا دیا۔ ایوب خان کے دس برسوں نے پاکستان کو معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس عرصے میں ملک کو پہلی بار زراعت کے مرکز سے ہٹا کر صنعت کے راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلایا گیا۔ ملکی معیشت کو ایسی مضبوط بنیاد فراہم کی گئی جس کی وجہ سے ہم آج اس سے برے حال میں نہیں۔ پھر منتخب جمہوری حکومتیں آئیں۔ ذرا حساب تو لگائیں کہ انہوں نے ملک و قوم کو کیا دیا۔ انہوں نے تو مضبوط صنعتی بنیاد میں اپنے مفادات کی خاطر نقب لگائی۔ اور سیاسی کلچر جو بنا وہ بھی سامنے ہے۔ اور اب ۸۸ء سے اب تک کی جمہوریت کا حساب بھی لگالو۔ کرپشن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اقتدار سے محبت بھی کس حد تک کی جاسکتی ہے اس کے حصول کے لیے اگر کوئی تمام جمہوری اصولوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دے تو کیا اسے کوئی سیاسی پارٹی چلانے کا حق ملنا چاہیے۔"

"بات یہ ہے کہ فوجی آمریت کی وجہ سے جمہوریت کی نشوونما ہمارے ہاں تعطل کا شکار ہوتی رہی۔ سیاستدانوں کی تربیت نہ ہو سکی۔"

"یہ بات سن سن کر بھی کان پک گئے ہیں اب تو۔ مجھے یہ بتائیں کہ کیا سیاست کوئی ٹیکنیکل شعبہ ہے۔ ارے ایک سیاست داں کے لیے صرف ایک اچھا مسلمان اور ملک و قوم سے محبت کرنے والا ہونا ہی کافی ہے اور اس کے لیے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہیں غلیظ گالیاں دینا شروع کردوں تو تم کیا کہو گے۔ یہ کہ میری تربیت جمہوری ماحول میں نہیں ہوئی۔ یہ کوئی عذر ہے۔ سیاسی تربیت نہیں ہوئی تو کیا اچھا مسلمان بننے کی تربیت بھی نہیں ملی انہیں؟ اور اگر نہیں ملی تو قصور کس کا ہے؟ کسے کرنی چاہیے تھی یہ تربیت؟ میرے خیال میں تو آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے آداب جمہوریت زیادہ بہتر طور پر سیکھے جاسکتے ہیں۔ ہمارے سیاست داں اسمبلی میں گالم گلوچ کرتے ہیں۔ بگڑے ہوئے بچوں کا سا بدتمیزی والا رویہ رکھتے ہیں۔ اس پر تم کچھ لکھ دو تو بچے صحافی میدان میں اتر آئیں گے۔ جیسے بدتمیز بچوں کے والدین ان کی صفائی پیش کرنے کھڑے ہوتے ہیں کہ فلاں کا بچہ تو ان سے زیادہ بدتمیز ہے۔ لکھیں گے کہ یورپ اور امریکا کے جمہوری ممالک میں اسمبلیوں میں اس سے زیادہ بدتمیزی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی گالیاں دی جاتی ہیں کہ حد اور بس۔ اب ان سے پوچھا جائے کہ ان میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ ہم مسلمان ہیں جنہیں خوش خلقی کی تاکید کی گئی ہے۔ ہم مغرب کی تقلید کیوں کریں اگر کرتے ہی ہو تو جمہوری رویوں کے معاملے میں بھی تو ایسا ہی کرو۔ وہاں ریل کا کوئی حادثہ ہو تو متعلقہ وزیر فوراً استعفیٰ دے دیتا ہے۔ ذرا سے اسکینڈل پر پورا کیریئر ختم ہوجاتا ہے۔ یہاں کرپشن ثابت کیے جاؤ تو بھی لوگ اپنے عہدوں سے چپکے رہتے ہیں۔ اسمبلی میں 'نی دی پر' اخبار نویسوں کے سامنے قسمیں کھا کر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بات ثابت ہوگئی تو استعفیٰ دے دیں گے۔ بات ثابت ہوجائے تو کہا جاتا ہے کہ ہم تو مذاق کررہے تھے۔ ایک وزیر اپنا عہد پورا کرنے سے بچنے کے لیے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اقتدار میں ہونے کے باوجود الیکشن میں دھاندلی ہوئی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس صورت میں ان کی نااہلی ثابت ہوگئی اور استعفیٰ لازم ٹھہرا۔ یہ سب کیا ہے کم سن نوجوانوں کا رویہ بھی اس سے زیادہ ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ تو پھر کیا ایسا ہے کہ ہم نے چھ سال کی عمر تک کے بچوں کو اپنا رہنما بنالیا ہے۔ ملک کی باگ ڈور سونپ دی ہے۔ سات سال میں نے اس لیے نہیں کہا کہ سات سال کے بچے کو تو نماز پڑھوانا فرض ہوجاتا ہے۔"

نجمی اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے صحافی ہو کر بھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا "تو یہ عاصم قریشی کے خیالات ہیں؟"

"ہاں" خاور نے گہری سانس لے کر کہا "اور غلط نہیں ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ یہاں اقتدار کا مثلث بن گیا ہے۔ سب سے کمزور طاقت وہ ہے جسکے پیچھے عوامی قوت ہے' جسے سب سے زیادہ طاقت ور ہونا چاہیے۔ یہ جمہوریت ہے؟ ہاں' یہ وہ جمہوریت ہے جو امریکا کو ہمارے لیے پسند ہے۔ ہماری پچھلی حکومت دو تہائی اکثریت کے باوجود ختم ہوگئی۔ دنیائے جمہوریت سے کوئی ایک ایسی مثال لادو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی لانگ مارچ کا نتیجہ نہیں تھا۔ احکامات اوپر سے آئے تھے۔ اب جو یہ حکومت مانگے کی سادہ اکثریت کے زور پر چل رہی ہے تو کیسے چل رہی ہے؟ میں بھی جانتا ہوں' تم بھی جانتے ہو اور پوری قوم جانتی ہے۔ ایسے میں آدمی بے بسی نہیں محسوس کرے گا' مایوس نہیں ہوگا کہ جمہوریت میں بھی اس کی مرضی نہیں چل رہی ہے۔ رائے اس کی لی جاتی ہے اور اس کے فیصلے کو توڑ مروڑ کر اس کے ہی خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دیکھی طاقتیں کیا کیا کچھ کردیتی ہیں اور ووٹ دینے والوں کو مطلع بھی نہیں کرتیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ سچ پوچھو تو اس نام نہاد جمہوریت سے تو آمریت ہی بہتر تھی۔ اس میں انسانوں کو استعمال کی چیزوں کی طرح برتا جاتا ہے۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ جب حکم ہوا' ووٹ ڈال آئے۔"

نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا "بات تو سچ ہے۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ممکن ہے قریشی صاحب امریکا چلے گئے ہوں۔"

"بیوی بچوں کو چھوڑ کر؟ ناممکن۔ تم نہیں جانتے وہ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"میرے ذہن میں ہمیشہ اس سلسلے میں ایک ہی خیال آتا ہے۔ مگر کیونکہ عاصم مجھے بہت عزیز ہے اس لیے میں اسے رد کردیتا ہوں۔" خاور نے کہا اور کچھ دیر سوچتا رہا "یہی ایک امکان رہ جاتا ہے کہ کسی گروہ کو بھنک مل گئی ہو کہ وہ اپنے تمام اثاثے فروخت

کررہا ہے اور انہوں نے اسے یرغمال بنالیا ہو اور ممکن ہے۔ خدانخواستہ اب وہ اس دنیا میں نہ ہو۔"

"اس کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی؟"

"میں نے کہا نا کہ میں عاصم کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن مجھے اب تک جتنی معلومات ملی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوئے ہیں۔"

"تو پھر اُس کا دماغ چل گیا ہوگا۔ ورنہ روپوش ہونے کا کیا سوال ہے۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں۔"

"اور اُن کے پاس ۸۰ کروڑ روپے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" خاور سوچ میں پڑگیا "۸۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کرے۔ ۸۰ کروڑ کے ۸۰ ارب بنانے کے ارادے سے روپوش ہوگیا ہو اس لیے کہ دولت کی اسے کبھی کمی نہیں رہی لیکن اس نے دولت کو کبھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اگر اسے یرغمال نہیں بنایا گیا اور وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوا ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کسی خاص مقصد کے لیے ایسا کیا ہوگا۔"

"کیسا مقصد؟" نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اس کے اپنے خیال میں وہ ملک و قوم کی خدمت ہوگی۔ خواہ میری تمہاری اور دوسروں کی نظر میں وہ جرم ہو۔ ممکن ہے وہ قوم کو متبادل قیادت فراہم کرنے کے چکر میں ہو اور اس سلسلے میں کسی احمقانہ اسکیم پر وقت اور پیسہ برباد کررہا ہو کیونکہ یہاں کچھ بدل نہیں سکتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ملک کے تمام لیڈروں اور سیاست دانوں سے متنفر ہوچکا ہے۔ اگر وہ متشددانہ ذہنیت کا مالک ہوتا تو شاید ان لوگوں کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا اور ان پر عمل کرتا۔"

نجمی اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ خاور صاحب' میں چلتا ہوں' ضرورت پڑی تو آپ کو پھر زحمت دوں گا۔"

"جب بھی ضرورت محسوس کرو مجھے فون کرلینا۔"

نجمی باہر نکل آیا۔ خاور ندیم کا آخری جملہ اس کے ذہن پر نقش ہوگیا تھا۔

○☆○

"میں بس اتنا بتادینا کافی سمجھتا ہوں کہ جرم مجھ پر ثابت ہوچکا ہے۔" عاصم بابر سے کہہ رہا تھا "لیکن میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ لہٰذا میرے پاس روپوشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"لیکن جرم کی نوعیت کے بارے میں تو بتایئے۔" بابر نے کہا۔

"سوری بھائی' اگر میں مجرم ہوں ہی نہیں تو پھر نوعیت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس لیے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

بابر نے کندھے جھٹک دیئے "ٹھیک ہے بھائی جان۔ میرے لیے تو صرف آپ کی بات' آپ کا حکم کافی ہے۔ میرے لیے کچھ بھی جاننا ضروری نہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کاروبار اور خدمت خلق۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں اپنا کاروبار فروخت کرچکا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے' اس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔ لہٰذا میں تمہاری شراکت میں ایک خاص کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں جدید طرز کی ایک لیب قائم کرنا چاہتا ہوں اور ممکن ہو تو ایک بلڈ بینک بھی۔ یہ تمہاری فیلڈ ہے۔ سرمایہ تم جتنا کہو گے مل جائے گا۔"

بابر چند لمحے سوچتا رہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس لیب میں ایچ آئی وی اسکریننگ کا بندوبست بھی ہو اور ایڈز کے مریضوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جائے۔"

"یہ تو ضروری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ایڈز سے نمٹنے اور اُس کی روک تھام کے لیے اب تک سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔"

"اسی پر کیا منحصر ہے۔ ہمارے ہاں پیسہ کمانے کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے۔" عاصم نے سادگی سے کہا۔

"تو بھائی جان' یہ کام تو ہوجائے گا۔" بابر نے کہا۔ وہ ہچکچا رہا تھا "لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہاں تم دنیا میں واحد آدمی ہوگے جس سے میرا رابطہ ہوگا۔ یہ میری مدد ہی تو ہے۔ ورنہ تو میرا دنیا سے' ہر اپنے سے اور اپنے ماضی سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ تنہائی کیسی تنہائی ہے اس کا اندازہ تم کرسکتے ہو۔ پردیس میں آٹھ سال رہے ہو۔"

"یہ تو کوئی مدد نہ ہوئی۔" بابر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تو کیا تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہیں کسی غیر قانونی کام میں ملوث کروں گا۔"

"خیر' آپ کی مرضی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ایک اشارے پر سب کچھ کرسکتا ہوں۔" بابر نے کہا "اب پروگرام بتایئے۔"

پروگرام کا خاکہ عاصم پہلے ہی مکمل کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے "جب بھی تم تیار ہو تو بتادینا۔ میں اس کام کا آغاز لاہور سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہم لاہور چل کر جگہ منتخب کریں گے پھر تمہیں آلات اور دیگر ساز و سامان کی خریداری کے لیے بیرون ملک جانا ہوگا۔ وہاں سے آگے کا سب کام تمہارا۔"

"میں تو اس وقت بھی تیار ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل ہم لاہور چل رہے ہیں۔"

○☆○

وحید نجمی بے حد پریشان تھا۔ خاور ندیم سے انٹرویو کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ عاصم قریشی کی روپوشی ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اب اسے عاصم قریشی کی شخصیت کے

بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ اُس نے عاصم کو خود پر طاری کرکے خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچنے کی کوشش کی تھی۔ ایک 'حب وطن' آئیڈیلسٹ شخص جس نے صاف ستھری زندگی گزاری ہو' جو اپنے وطن کے بددیانت' بدکردار اور غیر ملکی اشاروں پر ناچنے والے کٹھ پتلی لیڈروں سے متنفر ہو۔ جسے خدشہ ہو کہ اُس کا ملک خدانخواستہ کسی بدیسی طاقت کا غلام بننے والا ہے' جس کے لیے آزاد سرزمین پر زندہ رہنا اتنا اہم ہو کہ وہ اس کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کے لیے تیار ہو۔ جو کروڑ پتی بھی ہو اور ایسے شخص کو اچانک یہ پتا چلے کہ وہ ایڈز کا شکار ہوگیا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ یہ طے ہے کہ وہ خود کو مظلوم سمجھے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ معاشرے نے اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایسے شخص کے ذہن کے مسخ ہوجانے کا امکان بے حد قوی تھا اور مسخ ذہن کے لیے سب سے زیادہ اہم کون سا جذبہ ہوگا؟ یقینی طور پر نفرت۔ اور نفرت تو بے حد تند شکل میں اس ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔ اب اس کا کیا حال ہوگا۔

اور ایڈز یقینی موت ہے۔ یقینی موت سے دوچار کوئی شخص اگر کوئی مقصد' کوئی نصب العین بھی رکھتا ہو تو وہ حد درجہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی ایک جاپانی شہری نے جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے مایہ ناز بحری جہاز کو تباہ کیا تھا۔ وہ اپنے طیارے کو لے کر جہاز کی چمنی میں کود گیا تھا۔

یعنی اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ عاصم قریشی ملک و قوم کو اپنی دانست میں سیاست دانوں کے ناسوروں سے نجات دلانے کی کوشش کرسکتا ہے مگر کیسے؟ اُس کے پاس دولت ہے۔ وہ اجرتی قاتلوں کو استعمال کرسکتا ہے۔ کوئی بڑی تخریب کاری کرا سکتا ہے۔ کوئی نئی سیاسی جماعت بنا سکتا ہے جس کے ذریعے متوسط طبقے سے قیادت ابھر کر آسکے۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔ اچانک نجمی کو خیال آیا کہ عاصم کے پاس ایک طاقت اور بھی ہے۔ ایچ آئی وی' چلتی پھرتی موت۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ سوال یہ تھا کہ عاصم اسے مخصوص لوگوں کے خلاف کیسے استعمال کرسکتا ہے۔ ایسی کون سی صورت ہوسکتی ہے۔

وہ اس پر غور کرتے کرتے تھک گیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اُس نے تھک کر فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں غور کرتا رہے گا لیکن اس سے زیادہ اہم مسئلہ عاصم کو تلاش کرنے کا ہے۔ اور یہ اب بہت ضروری ہوگیا تھا۔ عاصم کی روپوشی کسی وقت بھی دھماکا خیز ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اسے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ بے خبر فوزیہ قریشی کو حقیقت بتادے۔ وہی اپنے شوہر کو اس کی کمیں گاہ سے باہر لاسکتی ہے۔

○☆○

فوزیہ نے اب خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن اُس کے سامنے ایک اِس سے بڑی پریشانی بھی تھی۔ دونوں بچے۔ ابھی اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن بچوں کے لیے باپ کی محبت بہت بڑی تھی۔ عاصم نے انہیں وقت بھی بہت دیا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں عاصم سے بہت زیادہ قریب تھے۔ فوزیہ نے اِس کا عارضی حل تو بہت اچھا تلاش کرلیا تھا۔ وہ انہیں مری کے کانونٹ اسکول میں داخل کرا آئی تھی۔ یوں اسے ایک سال کے لگ بھگ مہلت مل گئی تھی۔ اب وہ پُرامید تھی کہ اس عرصے میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ ایک دبی دبی آس بھی تھی کہ شاید اِس دوران عاصم واپس ہی آجائے۔

اب وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر صرف عاصم کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ عاصم زندہ اور بخیریت ہے۔ پولیس نے گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے کے بعد معمول کے مطابق ہر طرح کی کارروائی کی تھی۔ انہوں نے اسپتال چیک کیے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عاصم کا اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا اِس بات کی دلیل تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ یہ بات جہاں طمانیت بخش تھی وہیں قلبی اذیت کا باعث بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عاصم اسے اور بچوں کو چھوڑ گیا ہے۔ ایسے کہ اُسے اعتماد میں لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسے کچھ بتایا تک نہیں کیوں؟ بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کے درمیان تو کبھی سخت کلامی تک نہیں ہوئی تھی۔ ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے پُرسکون اور خوش گوار تھی۔ پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

اور وجہ کے بارے میں سوچتے سوچتے فوزیہ آخرکار عورت بن گئی اور عورت بننا اور زیادہ اذیت ناک تھا۔ جہاں مرد کے یوں چھوڑ جانے کی کوئی ظاہری وجہ نہ ہو' وہاں پھر ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے۔ دوسری عورت! عاصم ایسا نہیں تھا' کبھی نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی مرد تو مرد ہی رہتا ہے نا۔ اس خیال نے اس کا سکون تباہ کردیا۔ نیند اڑ گئی۔ وہ بے حد معقولیت کے ساتھ اس خیال کو رد کرتی' اسے ذہن سے جھٹکتی۔ لیکن پھر کسی وقت اچانک وہ پھانس کی طرح ذہن میں چبھنے' کھٹکنے لگتا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس نے اپنے لیے ایک جہنم دہکا لیا ہے لیکن اِس میں قصور عاصم کا بھی تھا۔ آخر ایسی کون سی بات ہوگئی تھی کہ وہ بغیر کچھ بتائے' بغیر کچھ کہے یوں چپکے سے اس کی زندگی سے نکل گیا۔ مگر اس کیفیت میں بھی اس نے ایک بڑا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے لیے اسے مدد اور رہنمائی کی ضرورت تھی جو اسے وحید نجمی سے مل سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نجمی کا نمبر ڈائل کیا دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ اس نے چند منٹ کے وقفے سے دوبارہ رنگ کیا مگر بے سود... وہ گھر میں ہی نہیں تھا۔

وہ تیسری بار کوشش کررہی تھی کہ انٹرکام کا بزر چیخا۔ اُس نے فون رکھ کر انٹرکام اٹینڈ کیا "وحید نجمی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" سیکیورٹی گیٹ سے بتایا گیا۔

"انہیں اوپر بھیج دو۔"

نجمی اوپر پہنچا تو وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی "میں خاصی دیر سے آپ کا نمبر ملا رہی تھی۔" اس نے کہا۔

"میں گھر سے یہاں کے لیے نکل چکا ہوں گا۔" نجمی بولا۔
دونوں ڈرائنگ روم میں آبیٹھے "خاور بھائی سے مل لئے آپ؟" فوزیہ نے پوچھا۔
"جی ہاں اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اندھیرے میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔"
فوزیہ سنبھل کر بیٹھ گئی "کیا آپ مجھ سے کچھ چھپاتے رہے ہیں؟"
"میں آپ کو اذیت نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"
فوزیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا "کچھ بھی معلوم نہ ہونے کی اذیت زیادہ بڑی ہوتی ہے۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس کا فیصلہ تو اب آپ ہی کریں گے۔ میں اس وقت یہاں اس لیے آیا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے' آپ کو بتا دوں۔"
فوزیہ اسے متوقع نظروں سے دیکھتی رہی۔ ذرا سے توقف کے بعد نجمی نے جو کچھ کہا' وہ اس حقیقت کے باوجود کہ فوزیہ نے خود کو بدترین خبر کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا' فوزیہ کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا تھا "قریشی صاحب اس لیے روپوش ہوئے ہیں کہ ان کا ایچ آئی وی پازیٹو تھا۔ وہ ایڈز کے مریض ہیں۔"
فوزیہ تھوڑی دیر یوں بیٹھی رہی جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا "یہ ناممکن ہے۔"
"انہوں نے بھی معلوم ہونے پر یہی کہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی یہ ناممکن لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔"
فوزیہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ جیسے سل گئے تھے۔
"مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو ان بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے جنہوں نے آپ کو اب تک پریشان کر رکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو یہ سچ بتا کر اچھا کیا ہے یا برا۔ مگر اب اس سے فرق بھی کوئی نہیں پڑتا۔ بہرحال اب آپ کے سامنے ایک یقینی صورت حال ہے' کتنی ہی خوف ناک سہی۔"
فوزیہ بدستور خاموش تھی۔
نجمی اٹھ کھڑا ہوا "میں سمجھتا ہوں' آپ کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تنہائی کی ہے۔ آپ مجھے فون کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنا تھی لیکن وہ بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ ضرورت کے ہر لمحے میں مجھے یاد رکھیے گا' خدا حافظ۔"
فوزیہ کے ہونٹ ہلے۔ شاید وہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی لیکن آواز نجمی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

○☆○

وہ کسی گہرے کنویں میں قید تھی' جہاں وقت کا کوئی گزر نہیں تھا۔ سوچوں کے بھنور بنتے بگڑتے اور وہ ان میں ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ ابتدا میں تو غیر جذباتی انداز میں سوچنا ہی ناممکن تھا۔ بس ایک ہی خیال تھا اس کے ذہن میں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس خیال میں بھی اس کے لیے ایک تسلی..... ایک طمانیت تھی۔ وہ شک کے جہنم سے بری ہو گئی تھی اور نجمی کی بات کو غلط قرار دینا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ سچ تھا کہ اس سچ نے اس کے سب سے مشکل سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اب وہ جان گئی تھی کہ عاصم اتنی خاموشی سے اس کی اور بچوں کی زندگی سے کیوں نکل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے اور بچوں کو شرمسار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ انہیں تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں گناہ گار پر اتنے پتھر نہیں برسائے جاتے جتنے اس بے گناہ پر برسائے جاتے ہیں جو دھوکے میں گناہ گار کی حیثیت سے پکڑا گیا ہو۔ ان جملوں کا تو مزہ ہی اور ہے..... 'دیکھا سالے کو بڑا پارسا بنا پھرتا تھا۔ میاں ایسے لوگ زیادہ خراب ہوتے ہیں۔' عاصم خود کو بھی ان تیروں سے چھلنی نہیں کرانا چاہتا تھا اور اسے اور بچوں کو بھی ان سے بچانا چاہتا تھا۔ ایسے میں وہ اور کیا کرتا۔
وہ ہر بار یہاں تک سوچتی اور پھر اس کا ذہن..... لیکن یہ ناممکن ہے کی تکرار کرنے لگتا۔ پھر نجانے کب ایسے ہی ایک موقعے پر وہ ایک ہی جست میں اس کنویں سے باہر آ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا "ناممکن کیسے ہے؟" اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی تھی اور اس کنویں سے نکلتے ہی اس کے اندر ایک ملامت ابھری۔ کیا اس امر کو ناممکن کہتے ہوئے اس نے اس امر کے ممکن ہونے کو عاصم کی بے وفائی سے مشروط کر دیا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ بات کیا تھی لیکن اب بہرحال وہ ہوش مندی اور حقیقت پسندی سے سوچ سکتی تھی۔ عاصم بہت اچھا شوہر' بہت اچھا باپ تھا اس کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش.....
اچانک وہ بری طرح چونکی۔ ارے' یہ کیا..... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیوں؟ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ رات ہو چکی ہے اور فلیٹ میں اندھیرا ہے۔ وہ اٹھی اور ٹٹول ٹٹول کر سوئچ بورڈ کی طرف گئی۔ روشنی ہوئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔
وہ پھر صوفے پر آبیٹھی۔ یہ حقیقت تھی کہ عاصم کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ خود بھی یہ حماقت کر بیٹھی تھی تو پھر دوسرے کیا کریں گے۔ سچ ہے کہ انہیں موقع مل جائے تو وہ تو اسے چھلنی کر دیں۔ اس لحاظ سے عاصم نے درست فیصلہ کیا لیکن اس سے ایک غلطی ہو گئی۔ اسے اس کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ یہاں پھر دل میں ٹیس اٹھی۔ اسے شاید مجھ پر اعتماد نہیں۔ پھر وہ پشیمان ہو گئی۔ اس کا پہلا ردعمل عاصم کے فیصلے کو درست ہی ثابت کر رہا تھا۔
اب اسے پہلی بار موقع ملا کہ وہ عاصم کے کرب کو محسوس کر سکے اور وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ بے چارہ تو اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے پھر رہا تھا۔ کس قدر اکیلا ہو گا وہ؟ کہاں ہو گا۔ اور کیا کر رہا ہو گا؟ دیر تک وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔ یہ جذباتی ریلا گزرا تو اسے اپنا فیصلہ یاد آیا۔ اسے یاد آیا کہ اس سلسلے میں اسے نجمی سے مدد لینا تھی۔ اب وہ فیصلہ اور زیادہ اہم

ہو گیا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طور عاصم تک اپنی بات پہنچانا تھی اور اس کی سب سے اچھی اور یقینی صورت یہی تھی۔
اُس نے سوچا نجمی سے اگلے روز بات کرے گی۔

○☆○

لیب کا مسئلہ توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ زمین خرید کر خود تعمیر کرائے گا۔ لیکن بابر کو اپنے مطلب کی ایک عمارت نظر آگئی۔ عاصم کو بھی وہ پسند آگئی۔ چنانچہ اسے خرید لیا گیا۔ اتنا کیش عاصم کے پاس موجود تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے مرشد حسین کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ اب اسے باقی رقم سوئزرلینڈ سے منتقل کرانا تھی۔ اکاؤنٹ بابر کا بھی کھل گیا تھا۔
لیب کے لیے مشینری کی درآمد کے سلسلے میں ڈیوٹی سے استثنا لینا تھا۔ بابر کو دو ہفتے اسلام آباد میں دھکے کھانا پڑے۔ اس دوران عاصم نے اپنے لیے لاہور میں مکان کا بندوبست کرلیا۔ وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں چھوٹا سا تین کمروں کا مکان تھا جو اس کے لیے بہت کافی تھا۔ مشینری کی درآمد کی اجازت ملتے ہی بابر نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اسے سوئزرلینڈ اور پھر جرمنی جانا تھا۔ اندازاً ایک ہفتہ اس میں بھی لگ جاتا۔ بابر نے اس پر بہت شور مچایا کہ عاصم نے اپنی رہائش کا بندوبست الگ کرلیا ہے۔
"یہی بہتر ہے۔" عاصم نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہیں اپنے معاملات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی لیب کی بلڈنگ میں تمہاری رہائش مجھے پسند نہیں آئی۔ اب تو تمہیں گھر بسانے کا سوچنا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد اپنے لیے کوئی اچھا سا بنگلا ڈھونڈو۔"
"جب میرا گھر بسایئے گا تو خود ہی ڈھونڈ لیجئے گا۔" بابر نے کہا "ویسے آپ میرے ساتھ زیادتی کررہے ہیں۔ میں بھابی اور بچوں سے ملنے کو تڑپ رہا ہوں۔"
"مل لینا' پہلے کام مکمل کرلو۔"
تین دن بعد بابر یورپ روانہ ہوگیا۔
اب عاصم کو اپنے اصل منصوبے پر کام کرنا تھا۔ پیسے کی تو ہر جگہ اہمیت ہے لیکن فلمی دنیا میں تو اس کی حیثیت ایک دیوتا کی سی ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اسے ملک اسٹوڈیوز میں دفتر مل گیا۔ پہلے ہی دن سے امداد پروڈکشنز کے دفتر میں بھیڑ لگ گئی۔ مزید ایک ہفتے میں پورے اسٹوڈیو کو معلوم ہوگیا کہ مرشد حسین بہت مگڑی اسامی ہے۔ دفتر میں ان ہدایت کاروں کی قطار لگ گئی جن کا کام یہی تھا کہ مگڑی پارٹی پھانسیں اور فلم بنانے کے نام پر سال دو سال کا خرچا نکال لیں۔ ان کے کریڈٹ پر آج تک کوئی فلم نہیں تھی۔
عاصم اس دنیا کو اسٹڈی کررہا تھا۔ اسے کسی مناسب آدمی کی تلاش تھی۔ اس دوران وہ اس ماحول کو بھی سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ وہ زندگی سے قریب ہوگیا تھا۔ فلم میکنگ اس کا پرانا شوق تھا۔ اب قدرت نے اسے اس شوق کی تکمیل کا موقع دے دیا تھا۔

○☆○

نجمی کو یقین تھا کہ فوزیہ کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ شاک بہت بڑا تھا۔ لیکن کوئی شاک بھی آدمی سے بڑا نہیں ہوتا۔ آخرکار آدمی سنبھل جاتا ہے۔ فوزیہ بھی سنبھل جائے گی۔ البتہ یہ ضروری نہیں تھا کہ اب وہ اس سے رابطہ کرے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب کبھی اس کا سامنا ہی نہ کرے۔
فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "وحید نجمی اسپیکنگ۔"
"میں فوزیہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز آئی اور نجمی سناٹے میں رہ گیا "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے نجمی صاحب۔"
"جی' میں حاضر ہوں۔ فرمایئے" نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"آپ میرے فلیٹ پر آسکتے ہیں؟"
"جی' حاضر ہوجاؤں گا۔"
"تو پھر آجایئے۔ بات تفصیل طلب ہے۔"
"میں آرہا ہوں۔"
اس بار گیٹ پر موجود گارڈ نے نہ اس کا شناختی کارڈ چیک کیا' نہ ہی انٹرکام پر فوزیہ سے رابطہ کیا "ہیلو مسٹر نجمی فرام ڈیلی سویرا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ نجمی کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ گارڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ اپنی موٹر سائیکل اندر لے گیا۔
اوپر فوزیہ نے دروازہ کھولا اور بولی "آیئے' آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔ بنا چکی ہوں۔"
"تو ثمینہ.....؟"
"وہ اب مری میں ہے۔"
فوزیہ اندر چلی گئی اور ذرا دیر بعد چائے کی ٹرے لے آئی۔ چائے کی ایک پیالی اس نے نجمی کی طرف بڑھائی۔ دوسری پیالی اپنے سامنے رکھ لی۔
"بیگم صاحبہ' آپ آہنی اعصاب کی مالک ہیں۔" نجمی نے ستائشی لہجے میں کہا۔
"اعصاب کسی کے آہنی نہیں ہوتے۔" فوزیہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کچی مٹی کے جسم پر بھی اسٹیل کی پتری چڑھ جاتی ہے۔ اندر کی مٹی تو چٹخی بھی ہے اور جھڑتی بھی ہے۔ لیکن نظر کسی کو کچھ نہیں آتا۔"
"پھر بھی آپ بہت مضبوط ثابت ہوئی ہیں۔"
"پہلے مضبوطی بچوں کی وجہ سے تھی۔ اب اس دکھ کی وجہ سے ہے کہ اس وقت انہیں میری شدید ضرورت ہے۔ کیا گزر رہی ہوگی اُن پر۔ ان کے دکھ کے سامنے میرے دکھ کی کیا حیثیت ہے۔ اور اب تو میرے پاس اس یقین کی مضبوطی بھی ہے کہ وہ جہاں بھی

ہیں خیریت سے ہیں۔ اور میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی ہے۔"

"قریشی صاحب بہت خوش نصیب ہیں۔"

فوزیہ نے تیزی سے بات کا رخ بدلا "نجمی صاحب' میں اپنے شوہر تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ یا تو گھر آجائیں یا مجھے اپنے پاس بلالیں۔ کیونکہ اس وقت صرف میں ہی ان کے کام آسکتی ہوں۔ مجھے اُن سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

نجمی ہکا بکا رہ گیا "بیگم صاحبہ' اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہیں تو میں یہ بات سب سے پہلے آپ کو بتاتا۔ آپ غلط سمجھ....."

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن میرا ان سے رابطہ ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ہمیں جب علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں تو....."

"میری سمجھ میں ایک طریقہ آگیا ہے۔ اس سے یہ کام یقینی طور پر ہوسکتا ہے۔"

ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود نجمی کی سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ نہ آسکا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا "معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ' میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے آپ کا ٹیکنیکل تعاون درکار ہوگا۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ لیکن پہلے مجھے سمجھائیں تو۔"

"اس مقصد کے لیے مجھے ایک اخبار کی اشاعت کا اہتمام کرنا ہوگا۔"

"اخبار؟" نجمی حیران رہ گیا "اس سے آپ کا مقصد کیسے حاصل ہوگا؟"

"ہم اخبار کی پبلسٹی کرتے ہوئے فوزیہ قریشی کی زیر ادارت پر خاص طور پر زور دیں گے۔ یوں عاصم ہمارا اخبار لینے پر مجبور ہوجائیں گے اور اخبار میں میرا کوئی مضمون ہوگا تو وہ اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور اس مضمون کے ذریعے میں اُن سے ہر بات کرسکتی ہوں۔ ایسے کہ اس کے اصل مفہوم کو ان کے سوا کوئی سمجھ بھی نہیں سکے گا۔"

نجمی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اس عورت نے ہر قدم پر اسے حیران کیا تھا۔ اس میں ضبط اور حوصلہ بھی تھا' ذہانت بھی تھی اور قوت عمل بھی "آپ کا آئیڈیا بہت شاندار ہے لیکن اخبار نکالنا بے حد اعصاب شکن کام ہے۔"

"اعصاب شکن مراحل سے میں گزر چکی ہوں۔ بلکہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اعصاب شکن کام میرے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹنے میں مدد دے گا۔" فوزیہ نے کہا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اس فیلڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کے لیے مجھے آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"نوعیت کی وضاحت بھی کردیجئے۔" نجمی بولا "ویسے میں آپ سے وعدہ کرچکا ہوں کہ آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔"

"آپ مجھے اخبار کے لیے اہل اور محنتی کارکن فراہم کرسکتے ہیں۔ اشاعت کے مراحل سے مجھے روشناس کراسکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو میرے اخبار کی ادارت کرنا ہوگی۔"

"اور میں آپ کو مشورے بھی دے سکتا ہوں؟"

"ظاہر ہے مجھے سب سے زیادہ ضرورت انہی کی ہوگی۔"

"تو میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ مجھے ایڈیٹر نہ بنائیں۔ میں اس کا اہل نہیں۔ ایڈیٹر جم کر بیٹھنے والا آدمی ہوتا ہے۔ جبکہ میں وہ لڑکا ہوں جو شہر بھر کے کوڑا گھروں کو چھانتا پھرتا ہے' ان چیزوں کی تلاش میں جو کارآمد ہوتی ہیں لیکن لوگ انہیں بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ایسے تمام لڑکوں کی چن کر لائی ہوئی چیزوں کا معائنہ کرکے ان کی وقعت کا تعین کرتا ہے۔ فیصلہ کرتا ہے کہ کس چیز کو کب' کہاں' کیسے اور کس مقام پر استعمال کرنا ہے۔"

فوزیہ مایوس نظر آنے لگی "تو پھر؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے لیے اسٹاف کا بندوبست میں کردوں گا۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ آپ کا پہلا مسئلہ تو ڈکلیریشن کا حصول ہے۔"

"نام تجویز ہوجائے تو میں کل ہی درخواست دے دوں۔"

"بیگم صاحبہ' ڈکلیریشن آسانی سے نہیں ملے گا۔" نجمی نے کہا۔

"اس جمہوری دور میں بھی!"

"جی ہاں۔ جمہوری حکومت عوامی مینڈیٹ سے قائم ہوتی ہے لہٰذا عوام کی طرف سے بے پروا ہوتی ہے۔ کیونکہ عوام تو احساس جرم کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اف بھی نہیں کرسکتے۔ حکومت کو خطرہ بس عدلیہ اور صحافت سے ہوتا ہے۔ عدلیہ کو تو کسی طرح قابو کرلیا جاتا ہے کیونکہ تقرریوں کا اختیار حکومت کو ہوتا ہے۔ لیکن صحافت میں تمام لوگوں کو نہیں باندھ کر رکھا جاسکتا۔ صحافی دردِ سر بنے رہتے ہیں۔ اس لیے حکومت نئے آنے والوں کو بڑی سختی سے چیک کرتی ہے۔ بلکہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ مزید لوگ آئیں اور اس کے دردِ سر میں اضافہ کا سبب بنیں۔"

"بہرکیف میرا خیال ہے کہ یہ کام ہوجائے گا۔ کچھ ایسے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں جو یہ کام کرا سکتے ہیں۔"

"بس تو بسم اللہ کیجئے۔ لیکن ایک مشورہ اور بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ روزنامے کی بجائے ہفت روزے کا ارادہ کیجئے۔ اس میں دردِ سر اور پھیلاؤ کم ہوگا۔ ڈکلیریشن بھی نسبتاً آسانی سے مل جائے گا۔"

فوزیہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ لگتا تھا فیصلہ نہیں کرپا رہی ہے۔

"دیکھیں نا آپ کا مقصد ہفت روزے سے بھی پورا ہوسکتا

ہے۔" مجی نے کہا "بلکہ میرے خیال میں آپ کے مقصد کے حصول کے لیے ہفت روزہ زیادہ موثر رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہر اعتبار سے۔ کالم آپ کے لیے زیادہ موثر پیرایہ اظہار نہیں۔ افسانہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اب آپ ہر روز ایک نئے انداز میں اپنے پیغام پر مبنی کالم تو لکھنے سے رہیں پھر عام قارئین بھی اس کالم میں اور طرح کی دلچسپی لیں گے۔ وہ انہیں مضحکہ خیز اور پھر معنویت سے پُر لگے گا۔ افسانے میں یہ قباحت نہیں ہوتی۔ دوسرے اخبار کی زندگی بمشکل ایک دن ہوتی ہے' دوسرے دن وہ باسی ہو جاتا ہے۔ اسٹال پر اس کی گنجائش نہیں رہتی۔ جبکہ ہفت روزہ ہفتوں اسٹال پر موجود رہتا ہے۔"

فوزیہ سر کو تشفی جنبش دیتی رہی تھی "میں آپ کی بات سمجھ گئی۔" اس نے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس کا تجربہ ہو جانے کے بعد آپ چاہیں تو روزنامے کا اجرا بھی کر سکتی ہیں۔"

"بس تو یہ طے ہو گیا' ڈکلیریشن کی درخواست میں دے رہی ہوں۔ باقی سب کچھ آپ کو کرنا ہے۔ آپ سویرا سے استعفیٰ دے دیں۔"

"بہت بہتر۔"

○☆○

عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ صوبائی وزیر صحت تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ عاصم نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔ وہ خود کو نمایاں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس کی تجویز پر لیبارٹری کی پبلسٹی کے دوران یہ اعلان کیا گیا تھا کہ افتتاح کے روز کوئی بھی شخص مفت خون ٹیسٹ کرا سکتا ہے چنانچہ خون ٹیسٹ کرانے والوں کا ہجوم تھا۔ افتتاح کے بعد بابر نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس کا بلڈ بینک خون بطور عطیہ یا قیمتاً اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک خون دینے والے کے خون کی مکمل اسکریننگ نہ ہو جائے۔ اس نے اپنی تقریر میں اس بات کی اہمیت کو بھی واضح کیا تھا اور لوگوں کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔

اُس رات بابر عاصم سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ عاصم نے اس سے تقریب کا احوال سنا اور خوش ہوا "اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے لیکن تمہیں یہیں نہیں ٹھہرنا ہے۔" وہ بولا "میری خواہش ہے کہ ملک کے کم از کم ہر بڑے شہر میں لیبارٹری قائم کی جائے اور اسے اسی انداز میں چلایا جائے۔ یہ میری خواہش ہے۔"

"انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہو کر رہے گی۔" بابر نے بے حد خلوص سے کہا "لیکن یہ آپ نے فلم کا کیا چکر چلایا ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ یہ شوق مجھے لڑکپن سے تھا۔ مجھے خبط تھا کہ خوب صورت فلمیں بناؤں۔ اب فرصت ملی ہے تو سوچا کہ یہ شوق بھی پورا کر لیا جائے۔"

بابر اس بات سے واقف تھا۔ لیکن اس نے وطن واپس آ کر عاصم کو غیر معمولی صورت حال میں پایا تھا۔ پھر بے حد اہم آٹھ برسوں کے دوران وہ عاصم سے دور رہا تھا۔ اسے عاصم کی فلم میکنگ سے دلچسپی یاد تھی۔ مگر یوں فلمی دنیا میں داخل ہونا' نہ جانے کیوں اسے یہ سب بے حد غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ عاصم کا اسے فون کرنا... واپسی پر اپنے گھر کی بجائے طارق روڈ کے ایک فلیٹ میں تنہا زندگی گزارتے ملنا۔ بیوی بچوں سے دوری' اور یہ کہانی کہ وہ مجرم نہیں ہوتے ہوئے بھی مجرم ثابت ہو چکا ہے' یہ سب اسے افسانہ سا لگ رہا تھا۔ بابر بھی بچہ نہیں تھا۔ اس نے زندگی کا ایک حصہ پردیس میں اور تنہا گزارا تھا۔ اس میں سوجھ بوجھ بھی تھی اور ذہانت بھی۔ اس نے اب تک جو مشاہدہ کیا تھا وہ عاصم کی باتوں کی نفی کرتا تھا۔ پولیس سے چھپنے والے مجرم تو راہ میں کسی پولیس والے کو دیکھ لیں تو ان کا چہرہ فق پڑ جاتا ہے۔ عاصم کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا شخص ہرگز نہیں لگتا تھا جس پر کوئی جرم' خواہ غلط ہی سہی' ثابت ہو گیا ہو اور وہ قانون سے چھپتا پھر رہا ہو۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس صورت میں اسے ملک سے نکلنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ یہ آسانی کہیں بھی جا سکتا تھا۔ دولت اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔

تو پھر؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عاصم سے کوئی اخلاقی جرم سرزد ہوا ہے۔ ایسا شخص بھی مجرم تو ہوتا ہی ہے۔ بابر کو اس خیال میں وزن محسوس ہوا۔ لگتا یہی تھا کہ عاصم خود اپنے آپ سے' اپنی بیوی اور بچوں سے بھاگ رہا ہے اور پھر فلمی دنیا میں جانا۔ بابر جانتا تھا کہ مصنوعی روشنیوں کی اس دنیا میں کون سے سکے چلتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اگر عاصم کی بیان کی ہوئی نامکمل کہانی درست تھی تو بھی عاصم کا بیوی کو کچھ نہ بتانا غیر فطری تھا۔ بابر' فوزیہ سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن فون پر اس سے بات ہوتی رہی تھی۔ فوزیہ اور بچوں کی تصویریں اسے باقاعدگی سے بھیجی جاتی رہی تھیں۔ فوزیہ اسے بہت اچھی لگی تھی اور عاصم تو تھا ہی بہت اچھا۔ اس گھرانے میں محبت ہی محبت' ہم آہنگی ہی ہم آہنگی تھی۔ ہاں یہ ایک جواز بنتا ہے کہ عاصم نے فوزیہ کو اس لیے اپنے متعلق بے خبر رکھا کہ پولیس اس کے ذریعے اس کے متعلق معلوم نہ کر لے۔ ایسا ہوتا تو ہے لیکن بے حد ہائی کیسز میں۔ یہاں یہ بات بھی نہیں تھی۔ بابر کو وطن واپس آئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مگر عاصم قریشی کے کسی کیس کی خبر کہیں نہیں چھپی تھی۔ نہ ہی یہ خبر چھپی تھی کہ پولیس فوزیہ قریشی سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

مگر بابر یہ سب کچھ عاصم سے نہیں کہہ سکتا تھا نہ کچھ پوچھ سکتا تھا اور نہ ہی اُس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کا بندہ بے دام تھا۔ اس لیے کہ اسے سب کچھ یاد تھا۔ اُس پل سے آج تک کا ہر لمحہ اسے یاد تھا۔ جب اس نے عاصم کو اور عاصم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اُس پہلی شام اسے گھر لے

جاتے ہوئے بڑے ابا اور بھائی جان پہلے بازار گئے تھے۔ اس کے لیے کپڑے خریدے گئے تھے اور کتابیں بھی۔ بھائی جان نے اصرار کرکے ادائیگی اپنی جیب سے کی تھی۔ اور اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو بابر کو آج بھی یاد تھی۔

بھائی جان نے بڑے ابا سے کہا تھا "ابو' میں بابر کو اپنی ذمے داری کے طور پر قبول کرچکا ہوں۔ اس کے تمام اخراجات میں پورے کروں گا۔"

"لیکن بیٹے' ابو تو اس کا میں ہی ہوں۔" بڑے ابا نے کہا تھا۔

"ابو' یقین کریں وہ چھوٹا بھائی جی گیا ہوتا تب بھی میں یہی کرتا۔"

"مگر عاصم' میرے پاس جو کچھ بھی ہے تمہارا ہی تو ہے۔"

"نہیں ابو' جب میں تعلیم مکمل کرکے کاروبار سنبھالوں گا' تب یہ سب کچھ میرا ہوگا۔ ابھی نہیں ہے۔ ہاں ابھی میں آپ کی ذمے داری ہوں۔ بابر میری ذمے داری ہے۔"

"تو تعلیم کے دوران تم یہ ذمے داری کیسے اٹھاؤ گے؟" بڑے ابا ایک لخت سنجیدہ ہوگئے تھے۔

"پارٹ ٹائم جاب کروں گا اس کے لیے۔ آپ مجھے کام دیں گے نا؟"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ لیکن...."

"بس ابو' یہ طے ہوگیا۔ اس میں کئی فائدے ہیں میرے۔ میں ذمے دار بھی ہوجاؤں گا اور دو سال بعد مجھے ایم بی اے کرنا ہے۔ اس کے لیے تربیت بھی ہوجائے گی۔ کاروبار کے رموز بھی سمجھ لوں گا میں۔"

بابر کو یاد تھا.... خوب یاد تھا۔ اس کے اخراجات بھائی جان نے ہمیشہ اپنی تنخواہ سے پورے کیے تھے۔ بڑے ابا صرف اسے تحفے دے سکتے تھے۔ کائنات پر وہ بڑے ابا کا بیٹا تھا لیکن اس کے اصل سرپرست بھائی جان تھے۔ ایسی محبت اور اس بچے کے لیے' جس نے آنکھیں کھول کر ماں باپ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ جس نے زندگی کے چھ سال یتیم خانے میں گزارے تھے۔ جس کا روئے زمین پر کوئی اپنا نہیں تھا۔ بھائی جان نے تو اسے ہمیشہ کے لیے خرید لیا تھا۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا' اللہ کے بعد بھائی جان کی بدولت تھا۔ وہ اگر بدترین مجرم بھی تھے' تب بھی اُس کے لیے صرف بھائی جان تھے۔

"کہاں کھو گئے بھائی۔" عاصم نے اسے چونکا دیا۔

"کہیں نہیں بھائی جان۔ کبھی کبھی پرانی حسین یادیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔"

"اب تم عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہو بھائی۔ یادوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔"

"کچھ یادیں تو سرمایہ حیات ہوتی ہیں بھائی جان۔" بابر نے گہری سانس لے کر کہا "خیر چھوڑیں" اچانک اس کے لہجے میں التجا در آئی "بھائی جان.... بھابی اور بچوں سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

"فی الحال یہ مناسب نہیں ہے بابر۔"

"بھائی جان' بھابی کتنی تنہا اور پریشان ہوں گی۔ بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' اس کا احساس تمہیں مجھ سے زیادہ ہوسکتا ہے۔" عاصم نے چڑچڑے پن سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنے لہجے کی درشتی کا احساس ہوگیا "معاف کرنا بابر' میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی جان۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو بھائی۔ تم میرا سراغ بن سکتے ہو۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔"

"تمہیں پتا ہے کہ میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کرچکے ہیں۔" عاصم کا لہجہ خوش گوار ہوگیا "یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کرچکے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بھائی جان۔ آپ کے انتخاب سے اچھا کوئی ہوسکتا ہے بھلا۔"

"کاش! میں تمہاری شادی میں شریک ہوسکوں۔" عاصم کے لہجے میں حسرت تھی۔

○☆○

امداد پروڈکشنز کے آفس میں اب گدھوں کی بھیڑ نہیں رہتی تھی۔ فنانس کی تلاش میں آنے والے تمام گدھ اڑ چکے تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مرشد حسین نہ تو بے وقوف ہے اور نہ ہی عیاشی کے ارادے سے اس میدان میں اترا ہے۔ اس کے کچھ سنجیدہ قسم کے عزائم تھے جنہیں وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی تھا کہ مرشد حسین کی نظریں انہیں آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور فلمی گدھ یہ بات کبھی پسند نہیں کرتے۔ مرشد حسین شاہ خرچ آدمی ضرور تھا مگر سمجھ دار اور منہ پھٹ بھی تھا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اس کی رائے میں وہ لوگ فلم میکنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے کسی کام کے نہیں۔

یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ مرشد حسین ملک کے ایک نامور ادیب سے ایک فلم کا اسکرپٹ لکھوا رہا ہے۔

اس دوران اسٹوڈیو کے مالک سعید ملک سے مرشد حسین کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ وہ زیادہ وقت ملک صاحب کے عالی شان دفتر میں گزارتا' جہاں تاش کی محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی وہ نہ جاتا تو ملک صاحب خود اس کے دفتر میں چلے آتے۔ حالانکہ وہ کبھی کسی پروڈیوسر کے آفس میں جانے کے روادار نہیں تھے۔ مرشد حسین کی وضع داری' انکسار اور خود اعتمادی نے ان کا دل جیت لیا تھا۔ ملک صاحب فلمی دنیا کی روایت کے مطابق نہایت شوقین

مزاج آدمی تھے۔ فلم بنانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹوڈیو سے جو کچھ کماتا ہوں' فلم میں کیوں گنواؤں۔ لیکن ہر اونٹ ایک دن پہاڑ کے نیچے ضرور آتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ ایک حسین لڑکی کے چکر میں ایسے آئے کہ فلم بنانے پر آمادہ ہوگئے۔ لڑکی کو مرشد حسین نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین اور طرح دار لڑکی تھی لیکن مرشد حسین کا خیال تھا کہ اداکاری اس کے بس کی بات نہیں۔ ادھر لڑکی نے ملک صاحب کو ایسا شیشے میں اتارا تھا کہ وہ ایک معروف فلمی رائٹر سے خاص طور پر اس کے لیے فلم لکھوا رہے تھے۔

وہ لڑکی ہی مرشد حسین کے عظمت مرزا سے تعارف کا سبب بنی! اس روز وہ ملک صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص آندھی طوفان کی طرح دفتر میں آیا "ملک صاحب' آپ اس نیلوفر کے بارے میں سنجیدہ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ملک صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں "میں نے کبھی آپ سے مذاق نہیں کیا۔ پھر آپ کو یہ سوال کرنے کا حق کیسے مل گیا۔"

"ملک صاحب' اس لڑکی کو اسکرین ٹیسٹ کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ ویسے بہت خوب صورت ہے لیکن فلم کے لیے نہیں۔ اداکاری تو خیر اسے آتی ہی نہیں۔ اسکرین پر اس کا حسن بھی جاتا رہے گا۔ وہ بس ایسے ہی ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ شخص ایک آنکھ بند کرکے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

مرشد نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا "میں نے آپ سے تبصرہ کرنے کو کب کہا مرزا صاحب۔"

"تبصرہ تو میں نے اب تک کیا ہی نہیں ہے ملک صاحب۔ وہ اب سن لیں۔ اس کا کوئی ٹیسٹ کرانا ہی ہے تو پورا ٹیسٹ کرالیں اور اسکرین ٹیسٹ کی کمی بیشی کے سلسلے میں مشورہ بھی سن لیں۔ وہ پلاسٹک سرجری کا کیس ہے سرجی۔ سرجری کے بعد اے ون ہوجائے گی۔ آج تک کی تمام اداکاراؤں کو مات دے دے گی۔"

مرشد کے کان مرزا کی آواز پر لگے تھے اور نظریں ملک صاحب کے چہرے پر جمی تھیں۔ اب ملک صاحب بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ لیکن مرزا کے اگلے جملے پر ان کا چہرہ پھر تپ اٹھا۔

"اداکاری آپ اسے پھر بھی نہیں سکھا سکیں گے۔ خیر جی' اب آپ مشورہ بھی سن لیں۔ نتھنوں کو پانچ ملی میٹر اوپر لے جاتے ہوئے مرکزی ناک کی تین ملی میٹر کی چھلائی کردیں۔ بالائی ہونٹ کو گم دیتے ہوئے دو ملی میٹر چھیل دیں۔"

"بس مرزا صاحب" ملک صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "آپ اب ایک لمحہ بھی نہ رکیے۔ فوراً تشریف لے جائیے یہاں سے۔ اور ہاں... ریاض کو بھیج دیجیے۔"

"بہتر ملک صاحب۔" وہ چلا گیا۔

مرشد حیران تھا۔ اس نے کبھی کسی کو ملک صاحب سے اس طرح بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹر ان کے سامنے گھگیاتے تھے۔ جبکہ یہ مرزا تو کوئی ایسی اچھی حیثیت والا بھی نہیں تھا۔ بلکہ یقینی طور پر وہ کوئی فوٹو گرافر تھا۔ لیکن ملک صاحب اس سے آپ جناب کرکے بات کررہے تھے۔

"یہ کون ذات شریف تھے؟" اُس نے ملک صاحب سے پوچھا تھا۔

"ارے عظمت مرزا کو نہیں جانتے؟" ملک صاحب نے حیرت سے کہا۔

مرشد کو شاک لگا۔ یہ.... عظمت مرزا؟ اسے یاد تھا کہ عظمت مرزا بہت وجیہہ اور خوش پوش آدمی تھا۔ وہ ایک بے مثال کیمرا مین تھا۔ فری لانسر تھا۔ ہر اچھی فلم کے لیے اسے سائن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پھر وہ امریکا گیا اور وہاں ہدایت کاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی' ڈپلوما لیا۔ وطن واپس آکر اس نے ذاتی فلم پروڈیوس اور ڈائریکٹ کی اور اپنا سب کچھ اس میں جھونک دیا۔ وہ بہت خوب صورت فلم تھی۔ ناقدین نے اسے بے حد سراہا۔ اسے بے شمار ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ ملے۔ لیکن اس فلم نے عظمت مرزا کا ہٹہ بٹھادیا۔ انتقام کیے یا سنبھلنے کی کوشش' طوفان کے بعد مرزا نے تین چار پنجابی فلمیں ڈائریکٹ کیں' دوسروں کے لیے۔ لیکن وہاں بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر اس کا نام بھی سننے میں نہ آیا۔

"یہ... یہ عظمت مرزا؟" مرشد نے کہا "کیمرا مین ڈائریکٹر عظمت مرزا؟"

"ہاں۔ یہ وہی ہے۔ فلم لائن میں آدمی ایسے ہی تباہ ہوتا ہے۔ آخری فلم کی ناکامی کے بعد ہدایت کار کی حیثیت سے تو اس کا کیریئر ختم ہوگیا تھا۔ ہے یہ بہت باصلاحیت اور یہ بات جانتا بھی ہے۔ اُس وقت بھی کیمرا مین کی حیثیت سے یہ ٹاپ پر تھا۔ لیکن اس نے ہر پیشکش ٹھکرادی۔ کہنے لگا' اب مجھ سے روی فلمیں نہیں ہوں گی۔ فلمیں ڈائریکٹ کرنے کے دوران اس نے ہر طرح کی لت بھی لگالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحت بھی تباہ ہوگئی۔ کام بھی نہیں تھا اور اسٹوڈیو کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے چیف کیمرا مین کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش کی۔ اور جانتے ہو اس نے کس شرط پر قبول کی۔ یہ صرف میری فلم کے لیے عملی کام کرے گا۔ اور اب میرے ساتھ اس کا رویہ دیکھ لو۔"

اتنے میں کیمرا مین ریاض دفتر میں آگیا "آپ نے مجھے بلوایا صاحب جی۔"

"نیلوفر کہاں ہے؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"وہ جی کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ مرزا صاحب سے باتیں کررہی ہے۔"

ملک صاحب پریشان نظر آنے لگے "نیلوفر کا موڈ کیسا ہے؟ باتیں کیا ہورہی ہیں؟"

"نیلو جی کا موڈ بہت اچھا ہے صاحب جی۔ مرزا صاحب انہیں بتارہے ہیں کہ ان کے اسکرین ٹیسٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کی نظروں سے اچھا ٹیسٹ کیمرا نہیں کرسکتا۔ صاحب جی' میں کیا

بتاؤں۔ انہوں نے نیلوفر کے حسن کی ایسی ایسی تعریف کی کہ میں نے کبھی نہیں سنی۔ نیلوجی نے بھی نہیں سنی ہوگی۔ اور اب وہ انہیں بتا رہے تھے کہ بلی میٹر اور انچ کا کیا تعلق ہے۔"

ملک صاحب مسکرائے "بس تم دوڑ جاؤ' اب وہ کسی بھی لمحے استراہن جائے گا۔ تم نیلوفر کا اسکرین ٹیسٹ کرو گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔"

"ملک صاحب' ایک بات کہوں۔" ریاض کے جانے کے بعد مرشد نے کہا۔

"وس کہو۔"

"عظمت مرزا کو آپ مجھے دے دیں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دیکھ رہے ہو' میں تو اب اس سے تنگ آگیا ہوں۔"

"وہ میرے پاس آنا قبول کرلے گا؟"

"کیسے نہیں کرے گا۔ میری ملازمت میں ہے وہ۔" ملک صاحب نے اکڑ کر کہا "مگر شرط کے مطابق وہ میرے علاوہ کسی اور کی فلم شوٹ نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے' بس آپ اسے کہہ دیں کہ وہ میرے دفتر میں بیٹھا کرے۔"

اُن کے درمیان پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دو گھنٹے بعد ریاض نیلوفر کے اسکرین ٹیسٹ کے تازہ پرنٹس لے آیا۔ ملک صاحب نے تصویروں پر ایک نظر ڈالی اور ان کا منہ اتر گیا۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد انہوں نے مرشد کی طرف بڑھادیں "دیکھو انہیں اور اس کی نظر کے قائل ہو جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

وہ نیلوفر کے ہر زاویے سے لی گئی تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر پر نظر ڈالتے ہی مرشد حیران رہ گیا۔ پھر ہر تصویر کے ساتھ اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ بات ہی حیرت کی تھی۔ نیلوفر ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے کہیں عدم تناسب کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر کیمرے کی آنکھ نے اس کے چہرے میں عدم تناسب ڈھونڈ لیا تھا۔

مرشد کو مرزا کی کہی ہوئی ہر بات یاد تھی۔ اس نے تصویر میں اس کی تجویز کردہ ترامیم پر عمل کرکے دیکھا اور اُس کی نظر کا قائل ہوگیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ مرزا کی تجویز کردہ پیمائشیں تک درست ہوں گی۔

"ہیرا آدمی ہے آپ کے پاس۔" وہ تصویریں ملک صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"لیکن چاٹنے کے لیے۔" ملک صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا "اور اب تمہارے پاس پہنچنے والا ہے۔"

○☆○

فوزیہ پہلے ہی مرحلے میں نجمی کی قائل ہوگئی۔ اُس کی کہی ہوئی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھی۔ اُس کے پاس اثر و رسوخ بھی تھا اور پیسہ بھی۔ پھر بھی ڈکلیریشن کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ فوزیہ کو یہ احساس بھی ہوگیا کہ اگر اس نے روزنامے کے لیے درخواست دی ہوتی تو نجانے کیا ہوتا۔ اسے تو ہفت روزے کے حصول میں پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ جسے سرکاری زبان میں یتیم بے ضرر سمجھا جاتا ہے۔

ڈکلیریشن کے علاوہ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ دفتر کا بندوبست کیا جاچکا تھا۔ اسٹاف رکھا جاچکا تھا۔ تین شماروں کا عام میٹر مکمل تھا۔ فوزیہ نے نجمی کی مدد سے وہ افسانہ مکمل کرلیا تھا جو درحقیقت عاصم کے نام کھلا خط تھا۔ وہ اُس سے مطمئن بھی تھی۔ اُس نے دل کی ہر بات اُس میں کہہ دی تھی۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ ابھی سے پبلسٹی شروع کردی جائے لیکن نجمی نے اس موقع پر بھی اس سے اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ضروری نہیں کہ اسی نام سے ڈکلیریشن ملے' جو ہم چاہتے ہیں۔ فارم میں متبادل نام اسی لیے طلب کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا پبلسٹی سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ڈکلیریشن کس نام کا ملا ہے۔

اس عرصے میں یہ ضروری تھا کہ کام جاری رکھا جائے۔ فوزیہ کو یہ کام بہت اچھا لگا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسائل سے اس کا ذہن بڑی حد تک ہٹ گیا تھا۔ اگر ان مسائل میں وہ نہ گھری ہوتی تو یقیناً اس وقت کو بہت زیادہ انجوائے کرتی۔ اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ آسائش کے دنوں میں کچھ کرنے کا خیال لوگوں کو کم ہی سوجھتا ہے۔ کیونکہ مصروفیت کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی۔ خدا کا دیا سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔

نجمی فوزیہ کی ذہانت کا پہلے ہی قائل ہوگیا تھا۔ اب اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فوزیہ معاملات کو کتنی تیزی سے سمجھتی ہے۔ اتنے سے عرصے میں پرچے کے بیشتر معاملات اور مراحل وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اسے لوگوں کو ہینڈل کرنا' ان سے کام لینا بھی آتا تھا۔ اب صرف اشاعتی مراحل اس کی دسترس سے دور رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ابھی پرچا اشاعت کے مراحل سے نہیں گزرا تھا۔

ڈکلیریشن کے حصول کے سلسلے میں خاور کے ایک دوست صنعت کار فوزیہ کی مدد کر رہے تھے۔ ان کے حکومتی حلقوں میں اچھے تعلقات تھے۔ مگر اب تک ان کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ نئی حکومت نے اپنے پہلے سال میں ابھی تک کسی روزنامے یا ہفت روزے کے لیے ڈکلیریشن نہیں دیا تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ ڈکلیریشن کے لیے درخواستیں بھی نہیں دی گئی تھیں۔ جس ترقی پذیر ملک میں کاغذ کی قیمت ہر سال چڑھتی ہو وہاں لفظوں کو فروغ کب ہوتا ہے۔ وہاں کتاب' اخبار یا رسالہ چھاپنے کی حماقت کون کرے اور کب تک کرے۔ یہاں تو اب کاغذ کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے چلتے ہوئے اخبار اور رسائل بند ہونے کے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی لیے تو ہر حکومت آئے اور کاغذ کی قیمت میں خوف ناک اضافہ

کرتی ہے۔ آٹے کی قیمت میں اس لیے کہ غریب آدمی آٹے کی فکر میں لگ جائے اور کوئی اور فکر نہ کرے۔ کاغذ کی قیمت میں اس لیے کہ کتاب کی اشاعت مشکل ہو جائے اور تعلیم اور اس کے نتیجے میں شعور عام نہ ہو جائے۔ اخبار اور رسائل کی قیمت اتنی بڑھ جائے کہ لوگوں کی قوت خرید سے باہر ہو جائے۔ اس کے بعد لکھنے والے حق لکھتے رہیں' بے شک حقِ قلم ادا کرتے رہیں۔ قصیدہ خوانوں کے آنسو تو اشتہارات کا ریٹ بڑھا کر بھی پونچھے جا سکتے ہیں۔

فون کی گھنٹی بجی۔ فوزیہ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف طاہر بیگ تھے۔ خاور ندیم کے صنعت کار دوست "سیکریٹری اطلاعات سے آپ کے لیے وقت لے لیا گیا ہے۔" انہوں نے فوزیہ کو خوش خبری سنائی "پرسوں سہ پہر تین بجے آپ اسلام آباد روانگی کا بندوبست کرلیں۔ پلیز' انہیں اپنے سیاسی خیالات کے بارے میں اچھی طرح مطمئن کر دیجیے گا۔ انشاءاللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"میں شکر گزار ہوں آپ کی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔"

ریسیور رکھ کر فوزیہ مجمی کی طرف مڑی "مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ سیکریٹری اطلاعات سے وقت لے لیا گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیسٹ آف لک" مجمی نے دفتر میں بیٹھے لوگوں کی طرف ہاتھ گھما کر اشارہ کیا "فور آل آف اُس۔"

○☆○

ساڑھے گیارہ بجے عظمت مرزا امداد پروڈکشنز کے دفتر میں داخل ہوا اور بے تکلفی سے مرشد حسین کے سامنے بیٹھ گیا "آپ شاید مرشد حسین ہیں؟"

"جی ہاں" مرشد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"حکم ہوا ہے کہ اب میں آپ کے دفتر میں حاضری لگایا کروں۔"

"فرمائش میری ہی تھی۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں اس عنایت کی۔" عظمت مرزا کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"بس آپ مجھے اچھے لگے تھے۔ جی چاہا کہ آپ کے ساتھ وقت گزارا جائے۔" مرشد نے کہا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں۔ لوگ مجھے محض مجبوراً برداشت کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بڑی ناقدری کا زمانہ ہے۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"وہی جو کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں کرتے تھے۔"

"وہاں تو میں لوگوں کا جینا عذاب کرتا تھا۔" مرزا نے سادگی سے کہا۔

"یہاں میں حاضر ہوں۔ ناکافی لگوں تو بتا دیجیے گا' کچھ اور لوگوں کو ملازم بھی رکھ لوں گا۔"

عظمت مرزا کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ورنہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہیں آئی ہوگی۔ اس لمحے وہ بہت پیارا لگا "آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ مگر فوراً ہی کھسیا بھی گیا "حالانکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر میں نے یہ بات کبھی ملک صاحب سے ان کی ملازمت کے دوران بھی نہیں کہی۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم کھرے آدمی ہو بہرحال پسندیدگی کا شکریہ۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"کیا پی سکتا ہوں۔" مرزا نے بے بسی سے کہا "سنا ہے کہ آپ بدذوق آدمی ہیں۔"

مرشد کو ہنسی آگئی "بدذوق تو ہوں لیکن متواضع بھی ہوں۔" اس نے شگفتگی سے کہا "ویسے آپ کی خوش ذوقی کی حد کہاں تک ہے؟"

"اب تو کوئی حد نہیں۔" مرزا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک زمانے میں ایک ہی شوق تھا۔ خوب صورت فلم بنانے کا' جسے فن پارہ قرار دیا جائے۔ خبط تھا اچھے سے اچھا شاٹ ٹیک کرنے کا۔ خود کو خوش ذوق سمجھتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے ثابت کیا کہ میں جسے فن پارہ سمجھ رہا تھا' وہ ڈبہ فلم تھی تو میں نے لوگوں کے معیار کے مطابق خوش ذوق بننے کا فیصلہ کیا۔ کمزور آدمی تھا نا۔ ایک ہی بار میں قلاش ہو گیا تھا۔ بس اس دن سے ہر طرح کی خوش ذوقی میں مبتلا ہوں۔ جسم' بوتل' سگریٹ' سرنج' سب سے گزر چکا ہوں۔ اب بوٹی سے کام چلا رہا ہوں۔ سستی ہے نا۔" اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

"میں تو آپ کی پرانی خوش ذوقی کا قائل ہوں۔ مرزا صاحب۔ طوفان کے حوالے سے آپ کافین ہوں میں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اُس سے بہتر اور مکمل کوئی پاکستانی فلم آج تک نہیں دیکھی۔"

"طوفان کا خالق تو بہت پہلے مر گیا تھا مرشد صاحب۔ یہ۔۔۔" مرزا نے اپنے جسم کی طرف اشارہ کیا "یہ تو ملبہ ہے اس کا۔"

"خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آیئے اندر والے کمرے میں چلیں۔" مرشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عظمت مرزا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرونی کمرا بے حد آرام دہ اور آراستہ تھا "یہاں آرام سے بیٹھیں۔" مرشد نے کہا اور دیواری کیبنٹ کھول کر ایک بوتل نکال لی۔

○☆○

سیکریٹری اطلاعات سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے ایک دن پہلے ہی سرکاری اعلان جاری کر دیا گیا' جس کے تحت چھ ماہ تک کسی بھی قسم کے ڈکلیریشن پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ سیکریٹری صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ پابندی اٹھتے ہی ہفت روزہ 'گلدان' کے لیے سرکاری اجازت نامہ

جاری کردیا جائے گا۔ یہ صورت حال بے حد مایوس کن تھی۔ لیکن کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ فوزیہ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اسٹاف کو خوا مخواہ تنخواہ دینا پڑے گی۔ افسوس یہ تھا کہ اس کے سامنے موجود واحد دریا امکان بھی وقتی طور پر ہی سہی' بند ہوگیا تھا۔ اسے مزید چھ ماہ تک انتظار کرنا تھا۔

یہ خبر ملتے ہی اس نے اپنے فلیٹ کا رخ کیا اور بند ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈپریشن کا یہ دورہ بہت شدید تھا جو تین دن تک جاری رہا۔

○☆○

دس بارہ دن میں مرشد نے دیکھ لیا کہ عظمت مرزا کتنا خوددار آدمی ہے۔ اس کے لہجے میں کبھی عاجزی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ نشے کے عادی لوگ نشے کے حصول کے لیے کسی کے بھی سامنے زمین پر ناک بھی گھسنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مے نوشی کے معاملے میں بھی وہ اعتدال کا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی خود شراب کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اس روز عظمت مرزا دفتر آیا تو مرشد بیٹھا ایک اسکرپٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ اسکرپٹ گزشتہ روز ہی مکمل ہوا تھا اور مرشد نے اس کی کئی کاپیاں بنوالی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے مرشد صاحب؟" مرزا نے پوچھا۔

"بہت دن عیش کرلیے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا "اب کام کے دن شروع ہوگئے ہیں۔ ایک کام کریں گے میرا؟"

"جی فرمایئے۔"

مرشد نے دراز کھول کر اسکرپٹ کی ایک اور کاپی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی "ایک نظر اس پر ڈال لیجئے۔ میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔"

عظمت مرزا نے ہچکچاتے ہوئے اسکرپٹ لے لیا۔ مرشد سر جھکا کر دوبارہ اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن وقفے وقفے سے سر اٹھا کر وہ عظمت مرزا کے چہرے پر نظر ضرور ڈال لیتا تھا اور وہاں ہر بار اسے حوصلہ افزا تاثر نظر آتا۔ مرزا کا انہماک دیدنی تھا۔ کبھی اس کا چہرہ تمتمانے لگتا اور کبھی اس پر دبا دبا جوش نظر آتا۔ لیکن یہ طے تھا کہ اسے اس وقت یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ دیکھے جانے کا احساس تو دور کی بات تھی۔

ڈیڑھ بجے مرشد نے اسے پکارا "اب اسے چھوڑ دیں مرزا صاحب۔ پہلے کھانا کھالیں۔ پھر پڑھ لیجئے گا۔"

عظمت مرزا نے چونک کر دیکھا "مجھے تو خواہش نہیں ہے۔ آپ کھالیجئے۔"

"یہ نہیں چلے گی مرزا صاحب۔ اسکرپٹ کوئی بھاگا تو نہیں جارہا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" مرزا نے کھسیا کر کہا "مجھے واقعی بھوک نہیں ہے۔"

"پھر بھی دو چار لقمے تو لے لیں۔ چلئے۔"

مرشد کے اصرار نے مرزا کو مجبور کردیا۔ دونوں اٹھ کر اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ چپراسی کھانا لگا چکا تھا۔ خلاف توقع مرزا نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مرزا نے کہا "مرشد صاحب' آج آپ نے چائے بھی نہیں پلوائی۔"

"چائے آپ پیتے ہی کب ہیں۔"

مرزا کھسیا گیا "کام کے دوران تو یہ ہوتا ہے کہ چائے پینے کے پانچ منٹ بعد یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ چائے پی تھی یا نہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ اب آپ کی پیالی خالی نہیں رہنے دیں گے۔" مرشد نے کہا۔ پھر اس نے چپراسی کو آواز دی "نذیر' ادھر آؤ۔ بھئی چائے کا بندوبست کرو فرسٹ کلاس۔"

مرزا نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر نذیر کی طرف بڑھایا "میرے لیے سگریٹ بھی لے آنا... دو پیکٹ۔"

"آجائے گی سگریٹ بھی۔ نذیر کے پاس پیسے ہیں۔" مرشد نے کہا۔

"نہیں میاں صاحب۔ سگریٹ کے معاملے میں یہ نہ کریں۔ میں ویسے ہی کم زیربار نہیں ہوں آپ کا۔"

مرشد نے بحث نہیں کی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ پھر اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ شام سات بجے مرشد نے اسکرپٹ بند کرکے ایک طرف رکھا "مرزا صاحب' پڑھ لیا آپ نے؟"

مرزا نے چونک کر دیکھا "جی نہیں' ابھی تو آدھے کے قریب باقی ہے۔"

تب مرشد نے دیکھا کہ مرزا کے کانوں کے اوپر پنسل رکھی ہے۔ وہ دیر تک اسے پڑھتے دیکھتا رہا۔ مرزا پھر منہمک ہوگیا تھا۔ کبھی وہ پڑھتے پڑھتے کئی ورق الٹ کر پیچھے دیکھتا۔ کبھی حاشیے میں پنسل سے کچھ لکھتا۔ آٹھ بجے مرشد نے کہا "مرزا صاحب' میں تو اب گھر جارہا ہوں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

مرزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "میاں صاحب' میں رات دفتر میں گزار سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔"

"دراصل میں اسکرپٹ پوری طرح پڑھے بغیر نہیں اٹھنا چاہتا۔" مرزا کے لہجے میں شرمندگی تھی "گھر جانے میں تو خاصا وقت لگے گا۔"

"میں نذیر سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ کا خیال رکھے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا۔"

"شکریہ میاں صاحب۔"

"ہاں' اسکرپٹ آپ کو کیسا لگا؟"

"پورا اسکرپٹ پڑھے بغیر میں تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"چلئے یہی سہی۔ میں اب چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔" مرشد نے کہا اور باہر نکل آیا۔ وہ جمعرات کی رات تھی اور جمعرات کو بابر ان کے پاس آتا تھا۔ دونوں جمعرات کی رات اور جمعے کا دن

ساتھ گزارتے۔ ہفتے کو باہر پھر لب چلا جاتا۔

○☆○

"بہت جان دار' مربوط اور مکمل اسکرپٹ ہے۔" عظمت مرزا نے گہری سانس لے کر کہا "اس اسکرپٹ کو کوئی ہدایت کار محض فلما بھی لے تو بڑا ہدایت کار کہلائے گا۔ کون یہ بات سمجھے گا کہ یہ صرف اسکرپٹ کا کمال ہے۔"

"اور اگر یہ اسکرپٹ کسی باکمال ہدایت کار کو مل جائے تو؟" مرشد نے پوچھا۔

"تو بلاشبہ یہ ایک عظیم فلم ہوگی۔ یہ خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن' ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائی ہیں۔"

"کاش! طوفان کا اسکرپٹ ایسا ہی ہوتا۔ یہ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ طوفان کا اسکرپٹ کمزور تھا۔"

"آپ نے فلم کے ہیرو اور ہیروئن کو کتنا معاوضہ دیا تھا؟" مرشد نے پوچھا۔

"ساڑھے تین لاکھ روپے۔"

"اور رائٹر کو کیا دیا تھا؟"

"سات ہزار۔"

"میں نے یہ اسکرپٹ ڈیڑھ ماہ میں مکمل کرایا ہے اور معاوضہ ایک لاکھ دیا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کو شاید میں دس ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

مرزا نے اسے حیرت سے دیکھا "ایک لاکھ؟"

"جی ہاں میں زیادہ اہم چیزوں پر زیادہ پیسہ خرچ کرنے کا قائل ہوں۔ اسکرپٹ فلم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ ہیرو ہیروئن تو میں کسی کو بھی بنا دوں۔"

عظمت مرزا اب اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا "آپ بہت ذہین پروڈیوسر لگتے ہیں۔ حالانکہ فلم کا تجربہ نہیں ہے آپ کو۔"

"میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ فلم کے آرٹ کو بھی سمجھتا ہوں لیکن آرٹ فلم اور کمرشل فلم کی اصطلاحات میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ فلم میرے نزدیک کمرشل آرٹ ہے۔"

"لیکن اچھی سے اچھی فلم تجارتی اعتبار سے بُری طرح ناکام ہو سکتی ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ سو میں ایک اچھے بزنس مین کی طرح خسارے کے اس امکان کو اور طرح سے کور کروں گا۔"

"کیسے؟" مرزا کے لہجے میں تجسس تھا۔

"یہ بزنس سیکرٹ ہے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ عظمت مرزا بھی اسکرپٹ کو اٹھاتا' چند ورق الٹتا' نظر ڈالتا اور پھر رکھ دیتا۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" مرشد نے اس سے پوچھا۔

"میں... میں... کچھ نہیں" مرزا کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اب بھی گومگو کے عالم میں تھا "میری ایک التجا ہے آپ سے۔"

"جی فرمایئے۔"

مرزا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کا حال اس بچے کا سا تھا جس کا چاند کھلونا نیچے اتر آیا ہو۔ مگر پھر بھی اس کی پہنچ سے دور ہو اور وہ کسی بڑے سے امید کر رہا ہو کہ وہ چاند کو پکڑ کر اسے دے دے گا۔ آخر کار وہ یوں پھٹ پڑا' جیسے یقین ہو کہ عام انداز میں اپنا مدعا کبھی بیان نہ کر سکے گا "میں اپنی اہلیت تو ثابت نہیں کر سکتا مرشد صاحب لیکن میری آرزو ہے کہ آپ یہ فلم بنانے کا موقع مجھے دیں۔"

"آپ کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے تو طوفان ہی کافی ہے۔" مرشد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں کبھی کوئی بڑا فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔"

"پلیز مرشد صاحب۔" عظمت مرزا اب گھگیا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا' جس نے مفلسی میں بھی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ رویہ ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک سچا فنکار ہے اور اب وہ ایک اچھا اسکرپٹ دیکھ کر بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ خوشامدیں کر رہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا تھا' کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مرشد نے سوچا' ابھی لوہے کو اور گرم کرنا ہوگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں مرزا صاحب کہ آپ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا۔" مرشد نے کہا "آپ فنکار تو ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بزنس مین بھی بن جائیں۔ بزنس کے اسرار و رموز مجھ سے سیکھ لیں۔"

"آپ جیسا کہیں گے' میں ویسا ہی کروں گا۔"

"میرا کہنا یہ ہے کہ فلم بناتے ہوئے باکس آفس کو اپنی کمزوری کبھی نہ بنائیں۔ فن کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہ کریں۔ ہاں' اس میں ہونے والے ممکنہ نقصان کو کہیں اور سے پورا کرنے کی سبیل ضرور کریں۔" مرشد نے کچھ توقف کیا "میں دیکھوں گا کہ میرا طریق کار آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔"

"جیسی فلم آپ بنا رہے ہیں۔" مرزا نے میز پر رکھے اسکرپٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی فلمیں بنانے کے مواقع حاصل کرنے کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں "نئے چہروں کی ضرورت ہے" کا یہ اشتہار ملک کے تمام بڑے اخباروں میں دے رہا ہوں۔ اس کا رسپانس زبردست آئے گا۔ ہم انٹرویو کریں گے' آپ میرے ساتھ موجود ہوں گے۔ اس موقع کے لیے میں آپ کو پہلا کاروباری گر بتا رہا ہوں۔ یہ ہر موقع پر کام آئے گا۔"

عظمت مرزا ہمہ تن سماعت تھا۔

"اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔ سامنے والے پر اپنی دلچسپی کبھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ اسکرپٹ کے معاملے میں بھی آپ سے

غلطی ہوئی تھی۔ اور....."
عظمت مرزا سر کو تھپکی جنبش دیتا رہا۔

○☆○

صوفیہ نے چوکیدار کو امداد پروڈکشنز کا انٹرویو لیٹر دکھایا۔ چوکیدار نے بغلی دروازہ کھول کر اسے اشارے سے بتایا "اس طرف سے....."

"شکریہ۔ دفتر ڈھونڈنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔" صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی اور اسٹوڈیو میں داخل ہوگئی۔

دفتر ڈھونڈنے میں اسے واقعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بیرونی کمرے میں دروازے پر رکھے اسٹول پر چپراسی بیٹھا تھا۔ ایک میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ صوفیہ نے انٹرویو لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ایک نظر لیٹر پر ڈالی اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تشریف رکھیے' آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔"

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ ایک باغی لڑکی تھی۔ لیکن اب سے دو سال پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے مزاج میں بغاوت ہے۔ تب وہ سیکنڈ ایئر کی معصوم سی طالبہ تھی جس نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی تھی۔ ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہوچکا تھا۔ لیکن بڑے بھائی نے سوتیلا ہونے کے باوجود بڑی محبت سے اسے پالا تھا۔ وہ محبت اس کا سرمایہ حیات تھی۔ لیکن ایک روز وہ بھی دامن رہ گئی۔

ان کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ زمینیں تھیں' بہت بڑی جاگیر تھی۔ بہت احترام کیا جاتا تھا بھائی جان کا۔ ان کے گھر بڑی بڑی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سیاستدان آتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی باتیں ہوتی تھیں۔ بھائی جان پیسہ پانی کی طرح بہانے کے قائل تھے۔ اکثر بھابی سے کہتے' ہمارے مطلب کی حکومت آجائے تو وارے نیارے ہوسکتے ہیں۔"

"کیوں' آپ کو کیا مل جائے گا؟" بھابی پوچھتیں۔

"تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو۔ شوگر ملز کے لیے قرضہ مل جائے گا۔"

"تو قرضہ ادا بھی تو کرنا ہوگا' سود سمیت۔"

بھائی جان ہنسنے لگتے "قرضہ چھوٹا سونا ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ کا یا عام کسانوں کو ملنے والا قرضہ۔ بڑا قرضہ کون ادا کرتا ہے۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔"

"تمہارے سمجھنے کی ہیں بھی نہیں۔"

صوفیہ کو ان باتوں سے ویسے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آبائی زمین بکتے بکتے سمٹتی جارہی ہے اور جو رہ گئی ہے وہ قابل کاشت کم ہی ہے۔ اسے تو اپنے حصے سے بھی غرض نہیں تھی۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ بھائی جان اب اس قرضے ہی پر انحصار کررہے تھے۔

اُس روز گھر میں دعوت تھی۔ دعوت میں ایک وزیر صاحب بھی شریک تھے۔ محدود سی پارٹی تھی لیکن اہتمام بہت زیادہ کیا گیا تھا۔ صوفیہ معمول کے مطابق کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے صبح انگریزی کے ٹیسٹ کے لیے تیاری کرنا تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ سوگئی۔ اس کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اسے یاد تھا کہ اس نے سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ لاک کیا تھا اور نائٹ بلب بھی آن کیا تھا مگر اب کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی "کون ہے؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ڈرو نہیں بے بی۔" ایک اجنبی آواز ابھری۔

اس نے ٹٹول کر بیڈ سائیڈ لیمپ روشن کردیا۔ یہ دیکھ کر اسے دھچکا لگا کہ وزیر صاحب اس کے کمرے میں موجود ہیں.....

وزیر صاحب کے جانے کے بعد اس نے خود کو سمیٹا۔ وہ اٹھ رہی تھی کہ اسے قالین پر پڑی چابی نظر آئی۔ وہ یقیناً اس کے کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ وزیر صاحب بھائی جان کو وہی فائل دے رہے تھے جو انہوں نے کمرے میں اسے دکھائی تھی۔ پھر اس نے واضح طور پر وزیر صاحب کو کہتے سنا۔ آواز بلند نہیں تھی مگر رات کے سکوت میں تو سرگوشی بھی بلند آہنگ ہوجاتی ہے "آپ بے فکر ہوجائیں افضل صاحب' سمجھ لیں کہ آپ کا کام ہوگیا۔ آپ یہ فائل کل منیجر کے پاس لے جایئے گا' میں گیارہ بجے فون کردوں گا منیجر کو۔"

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اسے یاد آیا کہ منسٹر صاحب نے وہ فائل اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا "بے بی' یہ تمہارے بھائی جان کے شوگر ملز کے قرضے کی فائل ہے۔ مجھے اس پر دستخط کرنے ہیں۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن یہاں آنا کیوں ضروری تھا؟"

"ایسے کام سکون سے کہیں بیٹھ کر ہی کیے جاتے ہیں۔ ویسے تمہارے بھائی جان نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کوئی مجھے ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت صوفیہ کو یقین نہیں آیا تھا۔ مگر اب اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے لٹ گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت یا شور مچانا بے سود ثابت ہوگا۔ لیکن اس لمحے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے اندر ایک بہت باغی روح موجود ہے۔ اور اب وہ باغی روح مرتے دم تک چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس نے اپنی مرضی سے خود کو سیکڑوں بار استعمال کرکے دیکھ لیا۔ مگر وہ ایک بار مرضی کے خلاف استعمال ہونے کا داغ نہ دھل سکا۔ اس نے گھر کے نوکروں تک کو نہیں بخشا۔ بھائی جان کو ذلیل کیا' جنہوں نے اس پر آنکھیں نکالنے کی حماقت کی تھی۔ پھر وہ ماڈلنگ کی طرف چلی گئی۔

اب ماڈلنگ میں مسابقت بہت زیادہ تھی۔ جہاں ایک ماڈل کی ضرورت ہوتی وہاں بلا مبالغہ پچاس ماڈل موجود ہوتیں اس لیے کہ اچھے گھروں کی لڑکیاں اب بلا جھجک اس میدان میں اتر رہی تھی طلب کم تھی اور رسد زیادہ۔ لہٰذا وقعت کم ہوگئی تھی مگر صوفیہ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو گھر سے بے وقعت ہو کر نکلی تھی۔

پھر اس نے گھر ہی چھوڑ دیا اور پوری طرح آزاد ہوگئی اور اب وہ فلمی دنیا میں اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

چپراسی کی آواز نے اسے چونکا دیا "مس صاب... صاب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔"

○☆○

عظمت مرزا بے حد مایوس نظر آرہا تھا۔ مرشد حسین نے ایک ہزار سے زائد درخواستوں میں سے اس کی مدد سے صرف سات لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا اب تک وہ چھ لڑکیوں کا انٹرویو کر چکے تھے۔ دو خود ہی دست بردار ہوگئی تھیں اور چار کو مرشد نے مسترد کر دیا تھا۔ وہ سوال ہی اس نوعیت کے کر رہا تھا کہ کسی لڑکی کا منتخب ہونا ناممکن لگتا تھا۔

مرشد نے مرزا کی مایوسی بھانپ لی "فکر نہ کرو مرزا صاحب" اس نے اسے دلاسا دیا "یہ نہ بھولیں کہ ہمارے پاس ابھی ایک ہزار سے زائد امیدوار موجود ہیں۔"

"لیکن ان میں دو بہت اہل لڑکیاں نکل گئیں۔"

"آپ کے ذہن میں اہلیت کا مکمل تصور نہیں ہے۔ وہ پوری طرح اہل نہیں تھیں اور میں بعد میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا چاہتا۔"

"کیسی پریشانی؟"

"آپ ابھی نہیں سمجھ سکتے مرزا صاحب۔ آپ کو یاد ہے میں نے اصل فلم پر لگنے والے سرمائے کے رسک کو کور کرنے کی بات کی تھی۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

"جی بہت بہتر۔"

اسی لمحے صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرشد اگلے ہی لمحے مرزا کو دیکھنے لگا۔ مرزا کی آنکھوں کی چمک نے اس کے اندازے کی تصدیق کردی۔ لڑکی نے اپنی جو تصویر بھیجی تھی' وہ اس کے حسن کا احاطہ نہیں کر سکی تھی۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی طور پر حسین لڑکی تھی۔ تصویر کے لحاظ سے ترجیحی فہرست میں اسے ساتواں نمبر ملا تھا لیکن درحقیقت وہ ایک نمبر تھی۔ اس کا چہرہ بھی ایسا تھا کہ لگتا تھا' تاثرات اس پر سے پھسلتے ہوں گے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ وہ بہت بڑی اداکارہ بن سکتی ہے۔

"تشریف رکھیے۔" مرشد نے لڑکی سے کہا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا کو پہلا کاروباری درس یاد دلایا۔ مرزا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"شکریہ" لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بے حد مترنم اور لہجہ بہت شیریں تھا۔ یعنی وہ سرتاپا موزوں تھی۔ اب صرف اس کا ذہن چیک کرنا تھا۔

مرشد کو احساس ہوا کہ لڑکی بھی اسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نام' پتا پوچھنے اور چند رسمی سوالات کرنے کے بعد مرشد نے اچانک پوچھا "آپ فلم میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟"

"اس کے گلیمر کی وجہ سے۔" لڑکی نے بے جھجک کہا۔

"آپ کو معلوم ہے' اس گلیمر کی کیا قیمت ادا کرنا ہوتی ہے؟"

"جی ہاں' جانتی ہوں۔" لڑکی نے بے ساختہ کہا "وہ قیمت میں پہلے ہی کہیں اور ادا کر چکی ہوں۔"

اس جواب سے مرشد بھی سناٹے میں آگیا۔ پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا "آپ کو معلوم ہے' یہاں آنے کے لیے ضروری ہے کہ عزت کا تصور گھر میں چھوڑ کر نکلا جائے۔"

"عزت کا تصور تو گھر کی چار دیواری میں ہی چکنا چور ہوا تھا۔" صوفیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو میں بس مردوں کے دلوں کو تاراج کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ اسٹار بن گئیں' جس کا خاصا قوی امکان ہے تو آپ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن جائیں گی۔ لوگ آپ کے ایک اشارے پر آپ کے قدموں میں بیٹھ جائیں گے۔ لیکن خود آپ ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی ہوں گی۔ عزتِ نفس تک قربان کرنا پڑے گی آپ کو۔"

"چٹخے ہوئے شیشے میں عزت نفس کہاں ہوتی ہے۔"

"عزت نفس کبھی ختم نہیں ہوتی۔" مرشد نے مربیانہ لہجے میں کہا "تم ایک حقیقت پسند لڑکی ہونے کے باوجود یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ بہرحال تم حیرت انگیز لڑکی ثابت ہوئی ہو۔ لگتا ہے گھر سے تیار ہو کر نکلی ہو۔"

"مجھے آپ حیرت انگیز آدمی لگے ہیں۔" صوفیہ نے ترکی بہ ترکی کہا "آپ تو مجھے بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس دنیا کے متعلق سنا ہے کہ یہاں ابتدا میں اچھی اچھی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ جو آپ ابتدا میں زبانی سنا رہے ہیں' یہ تو بعد کا مرحلہ ہوتا ہے۔"

"ہاں میں بھی تمہاری طرح حیرت انگیز ہی ہوں۔"

"مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔"

"اچھا صوفیہ' نام کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"جو جی چاہے نام دے دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اعتراض کرنے کے حق سے میں پہلے ہی دست بردار ہو چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے صوفیہ۔ آپ کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں دو تین دن میں آپ سے رابطہ کروں گا۔" مرشد نے اسکرپٹ کی ایک کاپی اس کی طرف بڑھائی "اس دوران آپ اسکرپٹ کا مطالعہ کرلیں۔ ابھی کچھ حتمی نہیں ہے۔ اگلی ملاقات میں ممکن ہے' معاہدے پر دستخط ہو جائیں۔"

ایک لمحے کو صوفیہ مایوس نظر آئی مگر پھر وہ مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھی "بہت بہتر، میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔"

اُس کے جانے کے بعد مرشد نے سوالیہ نظروں سے عظمت مرزا کو دیکھا "کیا خیال ہے مرزا صاحب؟"

"میرے خیال میں تو ہیرا مل گیا ہے ہمیں۔"

"میرے ذہن میں ایسی ہی لڑکی کا خیال تھا۔" مرشد نے کہا "اب آپ اپنی بات کریں۔ آپ اس فلم کو ڈائریکٹ کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں اور آپ کی ہر شرط مجھے منظور ہوگی۔ بس مجھے آزادانہ کام کرنے دیجئے گا۔"

"اور معاوضہ؟"

"معاوضہ آپ نہ بھی دیں تو مجھے منظور ہے۔"

"میرے ذہن میں آپ کے لیے معاوضہ کا تصور ہے بھی نہیں۔ بہرحال یہ کل آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ فی الوقت مجھے آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بات کرنی ہے۔ یہ سرمائے کے رسک کو کور کرنے کا معاملہ ہے۔"

"مجھے اس سلسلے میں بڑا تجسس ہے میاں صاحب۔"

"ارے عام سی بات ہے، ہم اپنی اچھی فلم کو پورنو سے کور کر سکتے ہیں۔"

عظمت مرزا کا منہ بن گیا۔ اندر کا فنکار اپنی خودداری سمیت پھر جاگ گیا "آپ مجھ سے اس گھٹیا پن کی امید رکھتے ہیں۔"

"دیکھیے مرزا صاحب، آپ نے طوفان بنائی۔ وہ نہایت اعلیٰ فلم تھی مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ کیا اس کے بعد کی پنجابی فلمیں گھٹیا نہیں تھیں۔ اور اس کے بعد کیا ہوا۔ آپ عضو معطل بن کر رہ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایک شاہکار فلم بنائیں اور پھر اس حال کو پہنچ جائیں۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ جیسا نہ سہی، بہرحال کوئی اچھا ڈائریکٹر مل ہی جائے گا مجھے۔"

مرزا یوں سمٹا جیسے اس کے جسم پر کوئی نادیدہ کوڑا پڑا ہو۔

"ویسے جو آپ سمجھ رہے ہیں، میرا خیال اس سے مختلف ہے۔" مرشد نے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی "میں سولو پورنو بنانا چاہتا ہوں۔ گھٹیا قسم کی فحاشی نہیں۔ آپ جیسا ہدایت کار اسے آرٹ فلم کے درجے پر پہنچا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں اس کے منظر نامے کا ہلکا سا خاکہ بھی ہے۔"

"لیکن میاں صاحب، مخرب اخلاق تو وہ پھر بھی رہے گی۔ ہم چند ہزار کے لیے قوم کو اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ پن کی طرف کیوں دھکیلیں۔"

"آپ کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہیں مرزا صاحب۔" مرشد نے سرد لہجے میں کہا "میری نظر میں ایسے لوگ ہیں جنہیں ان فلموں میں دلچسپی ہے، جنہیں میں قوم میں شامل بھی نہیں سمجھتا۔ شوقین مزاج جاگیردار ہیں کچھ، جن کی اوپر، بہت اوپر تک رسائی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب یہاں اسٹوڈیو بھی آتے رہتے ہیں۔ ملک صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی میری۔ ان سے میں کس طرح ڈیل کروں گا یہ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔"

"لیکن انہیں اس کیسٹ کو تجارتی پیمانے پر ریلیز کرنے سے کون روکے گا۔"

"میں روکوں گا۔ اول تو وہ اس طرح کے آدمی نہیں ہیں اور پھر میں ان سے یہ شرط منواؤں گا۔"

"اور بعد میں وہ مکر گئے تو؟"

"تو وہ بہت پچھتائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ بولیے کیا کہتے ہیں آپ؟"

مرزا سوچ میں پڑ گیا۔ 'ٹوٹے ستارے' کا اسکرپٹ اسے اتنا بھا گیا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مرشد حسین کی بات کسی حد تک اس کے دل کو لگتی تھی۔ ایسی فلم عیاش طبع بڑے لوگوں تک محدود رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بس معاشرے کی عام اور معصوم اکثریت کو اس سے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، آپ مجھے خاکہ سنائیے۔"

"اس فلم کا نام ہے 'صبح بخیر، شب بخیر'۔ اس میں صرف ایک کردار ہے ایک لڑکی، جو گھر میں اکیلی ہے۔ پہلے شاٹ میں ہم صبح سات بجے اسے نیند میں کسمساتا دکھائیں گے۔ پھر وہ اٹھتی ہے...."

مرشد کہتا گیا اور عظمت مرزا سراپا تا گیا۔ اس کی نگاہوں میں مرشد کے لیے ستائش تھی۔ مرشد کے خاموش ہونے کے بعد وہ بولا "آپ کا کہنا درست ہے میاں صاحب۔ یہ تو اچھی خاصی فلم بن جائے گی۔ میاں صاحب، آپ کا ذہن، آپ کی نظر تو ڈائریکٹر والی ہے۔ کمال کر دیا آپ نے۔"

"اس کا اسکرپٹ لکھ کر مجھے دے دیں۔" مرشد نے اپنی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنا وقت لگ جائے گا اس میں۔"

"یوں تو چند گھنٹے کا کام ہے لیکن میں اس پر خاص توجہ دوں گا۔ دو دن تو ضرور دے دیجئے مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کام شروع کر دیں۔" مرشد نے جیب سے ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر مرزا کی طرف بڑھائے "یہ وقتی ضروریات کے لیے ہیں۔ کل انشاء اللہ پکا بندوبست کر دوں گا میں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نذیر سے منگوا لیجئے گا۔"

○☆○

عوامی لیب نے بہت کم عرصے میں بہت اچھی ساکھ بنا لی تھی۔ اسپتالوں کے ڈاکٹر خون تجویز کرتے ہوئے سفارش کرتے تھے کہ مطلوبہ خون عوامی لیب سے لینے کی کوشش کی جائے۔ لیب کا بزنس بھی بہت اچھا جا رہا تھا۔ بابر اب کراچی میں لیب قائم کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اُس رات اس نے عاصم سے اس سلسلے میں بات کی۔

"پہلے یہاں کا کام پوری طرح جم جائے پھر آگے کی سوچنا۔"

عاصم نے مشورہ دیا۔

"یہاں مجھے نہایت قابل اعتماد اسٹاف مل گیا ہے۔ کام بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ اب میں اپنا دھیان دوسری طرف دے سکتا ہوں۔" بابر نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ پہلے راولپنڈی اور پشاور کی طرف توجہ کی جائے۔ کراچی میں بعض بہت اچھی لیبارٹریز موجود ہیں۔"

بابر اس گریز کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ عاصم نہیں چاہتا تھا کہ وہ کراچی جائے۔ کراچی جائے گا تو بھابی اور بچوں سے بھی ملے گا۔ اس میں یہ خطرہ بہرحال تھا کہ وہ بھابی کا برا حال دیکھے تو اپنا عہد بھول جائے اور اسے عاصم کے بارے میں بتا بیٹھے۔ بابر کی سمجھ میں یہ معما اب بھی نہیں آیا تھا۔ عاصم کا رویہ اسے غیر فطری لگتا تھا

"آپ کی فلم کی کیا پروگریس ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کاغذی تیاریاں مکمل ہیں۔ کاسٹ فائنل ہو جائے تو شروع کردیں گے۔ میں اسکرپٹ سے بہت مطمئن ہوں۔" عاصم نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "میں فلم سے متعلق لوگوں کو میڈیکل چیک اپ کے لیے بھجواؤں گا۔ بل امداد پروڈکشنز سے چارج کرنا اور رپورٹ براہ راست مجھے بھجوانا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ ویسے یہ آپ نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔"

عاصم نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "بابر، مجھے ایڈز کے بارے میں بتاؤ۔"

"مجھے حیرت ہے کہ یہاں لوگ ایڈز کے بارے میں نہیں جانتے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایڈز کا وائرس انسان کے جسم کے مدافعتی نظام کو تباہ کردیتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ معمولی سی کوئی بیماری حملہ آور ہو جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی.... مثلاً نزلہ زکام۔ مریض کو مستقل بخار رہتا ہے۔ دستوں کا سلسلہ نہیں رکتا۔ بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ وزن بہت تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ اسی کیفیت میں مریض موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔"

"اور اس کے اسباب؟"

"اسباب کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہاں یہ طے ہے کہ اس کا وائرس خون کے ذریعے خون میں شامل ہوتا ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ اب تک جو سب سے بڑا سبب سامنے آیا ہے وہ جنسی تعلق ہے۔ لیکن اور اسباب بھی یقیناً ہوں گے۔ اس پر کام کیا جارہا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ وائرس خون میں شامل ہونے کے بعد بیماری کا حملہ کتنے عرصے کے بعد ہوتا ہے؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جوانوں میں وائرس زیادہ عرصے بعد فعال ہوتا ہے جبکہ بوڑھوں پر اس کا حملہ جلدی اور بعض اوقات بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کو یوں بیان کروں گا کہ اس کا تعلق اس

بات سے ہے کہ مریض کے جسم کا مدافعتی نظام کتنا طاقت ور ہے۔ اس کی عمومی صحت کیسی ہے۔ جو بچے پیدائشی ایڈز کے مریض ہوں وہ بہت زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ کسی شخص کے خون میں اگر بیس سال کی عمر میں ایڈز کا وائرس شامل ہو جائے اور اس شخص کی صحت بہت اچھی ہو اور وہ اپنا خیال رکھنے والا بھی ہو تو امکان ہے کہ بیماری کا حملہ اس پر بیس یا پچیس سال سے پہلے نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بہرحال کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ ایڈز کسی بھی وقت کسی بھی تجربے' کسی بھی کلیے کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔"

"مرض کا حملہ ہونے سے پہلے بھی مریض وائرس کسی دوسرے شخص کو منتقل کر سکتا ہے؟"

"جی ہاں' یہ خطرہ تو ایچ آئی وی کے ہر پازیٹو کیس میں موجود ہوتا ہے۔"

"اس کے سلسلے میں احتیاطی تدابیر..."

"دیکھیے' یہ فرد سے زیادہ اسٹیٹ کا کام ہے۔ فرد کے لیے تو صرف ایک احتیاطی تدبیر کافی ہے کہ وہ زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارے۔ اس کے علاوہ کوئی احتیاط بچاؤ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ فیملی پلاننگ کے نام پر جو گناہ کے لیے آسانی پیدا کر دی گئی ہے' وہ بہت بھیانک ہے۔ مغرب میں تو یہ تحقیق بھی کی جا رہی ہے کہ مانع حمل ادویات بھی کہیں ایڈز کا سبب تو نہیں بنتیں۔ یہاں میں حیران ہوں کہ کچھ بھی نہیں کیا گیا بلکہ شاید ابتدا میں تو ایڈز کا ذکر بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ حیرت ہے کہ ٹی وی جیسے میڈیا پر فیملی پلاننگ کی تشہیر کرتے وقت یہ نہیں سوچا گیا کہ نابالغ لوگوں کو قبل از وقت آگہی دی جا رہی ہے اور لازمی طور پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن ایڈز جیسے مہلک مرض کا نام لینا بھی فحاشی کے زمرے میں آگیا۔ یہ تو شتر مرغ والا رویہ ہے۔ پھر یہاں ائرپورٹس پر باہر سے آنے والوں کے خون کی اسکریننگ کا ابھی تک بندوبست نہیں کیا گیا حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ یہ کام تو ایڈز کی دریافت کے ساتھ ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ دوسرے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر سختی کرنی چاہیے تھی۔ سرنج کے معاملے میں غیر ذمے داری اور خون کی اندھا دھند خرید و فروخت کو بڑا جرم قرار دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو مجرمانہ غفلت اور بے پروائی ہے۔ یہاں تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ایڈز کے لیے ہم نے اپنی تمام سرحدیں' تمام دروازے کھول دیے ہیں اور لوگوں کو بتایا ہی نہیں گیا کہ ایڈز کیا ہے۔ باہر تو یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ اسلام واقعی انسان کی فلاح کے لیے آیا ہے۔ اسلام نے ہر اس کام سے انسان کو روکا ہے بلکہ سختی سے روکا ہے' جو انسان کے لیے پرکشش ہونے کے باوجود ضرر رساں ہے۔ باہر تو اب اسلام کے حرام اور حلال کے تصور پر غور کیا جا رہا ہے۔ اسلام کی حرام قرار دی ہوئی چیزوں پر اس یقین کے ساتھ ریسرچ کی جا رہی ہے کہ وہ بے حد ضرر رساں ہوں گی۔ اور ہم مسلمان ہیں کہ حرام خوری میں لگے ہیں۔ حکمراں کسی بھی معاملے میں اپنی ذمے داری نہیں نبھاتے۔"

"خوف خدا سے محروم ہیں۔" عاصم نے کہا "دو ایک کو ایڈز لاحق ہو جائے تو سب سدھر جائیں گے۔"

اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ بابر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"بابر سنو' اب تک تمہاری لیب میں کتنے ایچ آئی وی کیس آئے ہیں؟" عاصم نے اچانک پوچھا۔

"گیارہ۔"

"تم نے ان کے سلسلے میں کیا کیا؟"

"نیشنل ایڈز پروگرام کو مطلع کر دیا۔"

"دیکھو... میری فلم کمپنی سے متعلق لوگوں میں اگر کوئی ایچ آئی وی کیس ہو تو اسے آگے نہ بڑھانا۔ بلکہ اپنے ریکارڈ میں بھی نہ رکھنا اور رپورٹ صرف مجھے بھیجنا۔"

"لیکن بھائی جان...."

"یہ میرا حکم ہے بابر۔ انہیں میں خود ڈیل کروں گا۔" عاصم کے لہجے میں قطعیت تھی۔ بابر سر ہلا کر رہ گیا۔

○☆○

عظمت مرزا حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرشد حسین کس قسم کا آدمی ہے۔ اسے کیا سمجھا جائے۔ لڑکیوں سے انٹرویو کے اگلے روز اس نے بینک کے کچھ فارموں پر اس سے دستخط کرائے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ قانونی دستاویزات بھی تھیں جن پر مرزا نے دستخط کیے۔ وہ دستاویزات پڑھنا چاہ رہا تھا مگر مرشد نے ہنستے ہوئے کہا تھا "میں آپ کو بتا دیتا ہوں مرزا صاحب۔ آپ کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب یہ ایک ادارہ ہے... امداد فلمز لمیٹڈ' جس کے آپ سینئر پارٹنر ہیں۔ میں جونیئر پارٹنر ہوں۔ آپ ہی اس کے کرتا دھرتا ہوں گے۔ میں تو سیلانی آدمی ہوں۔ کبھی اچانک مہینوں کے لیے غائب ہو جاتا ہوں۔ بینک اکاؤنٹ اس طرح کا ہے کہ رقم نکلوانے کے لیے بیک وقت ہم دونوں کے دستخط ضروری نہیں' ہم میں سے کوئی ایک بھی رقم نکلوا سکتا ہے۔"

"لیکن میاں صاحب...."

"آپ معاوضے کے متعلق کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تو مجھے ٹھیک طرح سے جانتے بھی نہیں۔ پھر مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری کیوں ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے بڑا مان ہے کہ میں آدمی کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ مخلص اور سچے فن کار ہیں۔ ایسا شخص جھوٹا' بے ایمان اور دھوکے باز نہیں ہوتا۔"

اُس وقت تو مرزا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس پر کتنی بھاری ذمے داری عائد کی گئی ہے۔ کتنا اعتبار کیا گیا ہے۔ مرشد حسین نے بینک کی پاس بکس اور چیک بکس اسے لا کر دیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ امداد فلمز لمیٹڈ کا اکاؤنٹ ۶۵ لاکھ روپے سے کھولا گیا تھا۔ ۶۵ لاکھ... اور وہ جب چاہے' جتنی بھی رقم نکلوا سکتا

تھا۔

"نہیں میاں صاحب' میں خود کو اتنی بڑی ذمے داری کا اہل نہیں سمجھتا۔" عظمت مرزا تقریباً رو دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں تو سمجھتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر کہہ رہا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کبھی بھی مجھے جواب دہ نہیں ہوں گے۔"

اس بار مرزا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مرشد اسے تھپکتا رہا۔

اگلے روز مرزا نے "صبح بخیر شب بخیر" کا مظر نامہ مرشد کے سامنے رکھ دیا۔ مرشد نے اسے پڑھا اور چند ترامیم تجویز کیں۔ مرزا نے بخوشی انہیں قبول کرلیا۔ وہ مرشد حسین پر واقعی حیران تھا۔ اس کی فلمی سوجھ بوجھ حیران کن تھی۔

"بس آپ پہلے یہ فلم تیار کرلیں۔ اس کے بعد 'ٹوٹے ستارے' پر دھیان دیجئے گا۔" مرشد نے کہا۔

"جی بہتر۔ آپ صوفیہ کو فائنل کردیں۔ ہاں' شوٹ کہاں کریں گے؟"

"ایک بنگلا ہے میری تحویل میں۔ بہت خوب صورت اور مناسب ہے۔"

"اور اس فلم کے لیے اسٹاف؟"

"اسٹاف کی ضرورت نہیں۔ سب کام آپ کو ہی کرنے ہیں پروسیسنگ کے سوا۔ فوٹوگرافی اور ایڈیٹنگ آپ کرسکتے ہیں نا؟"

"جی ہاں' کیمرا تو میری پہلی محبت ہے اور ایڈیٹنگ کے بغیر کوئی ڈائریکٹر نہیں بن سکتا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ ہر اعتبار سے یہ سولو جاب ہے۔ اب میں صوفیہ کو بلا رہا ہوں۔"

○☆○

صوفیہ نے اسکرپٹ کی چند سطریں پڑھیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا "یہ.... یہ تو میرے اندازے سے مشکل ہے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔" صوفیہ نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

"اور میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب کچھ سوچ لیں۔ خیر اب بھی کیا بگڑا ہے' واپسی کا راستہ تو کھلا ہے۔"

صوفیہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مرشد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی "آپ مجھے کیا آفر کررہے ہیں۔"

"ٹوٹے ستارے میں ہیروئن کا رول۔"

"بس؟"

"اور کیا چاہتی ہیں آپ۔ ٹوٹے ستارے ایسی فلم ہے جو آپ کو ایک ہی جست میں شہرت کی بلندیوں پر لے جاسکتی ہے۔"

"لیکن اتنے لوگوں کے سامنے...."

"وہاں مرزا صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔" مرشد نے یقین دہانی کرائی "اور یہ فلم عام ریلیز کے لیے بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

مرشد نے وضاحت کی۔ صوفیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "مجھے منظور ہے۔"

مرشد نے معاہدے کے کاغذات اس کی طرف بڑھادیے "تو پھر اس پر دستخط کردیجئے۔ میں منہ میٹھا کراتا ہوں۔" پھر اس نے نذیر کو آواز دی "مٹھائی لاؤ نذیر۔"

صوفیہ معاہدے کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اس کے مطابق تو آپ مجھے پچاس ہزار روپے معاوضہ دے رہے ہیں۔"

"جی ہاں' دس ہزار ایڈوانس۔ بیس ہزار فلم آدھی مکمل ہونے کے بعد اور بیس ہزار فلم کی ریلیز سے پہلے۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے....."

"وہ صبح بخیر شب بخیر کی بات تھی۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہوگا۔ اس کا معاوضہ لے کر آپ حقیر ہوجائیں گی اور معاوضہ دے کر میں حقیر ہوجاؤں گا۔"

صوفیہ نے اسے شکر گزاری سے دیکھا اور کانٹریکٹ پر دستخط کردیئے۔ میڈیکل چیک اپ کی شق پڑھ کر اسے حیرت ضرور ہوئی تھی۔

○☆○

"چوہدری صاحب' آپ کو فلم کیسی لگی؟" مرشد نے چوہدری جمیل سے پوچھا۔ اس نے فلم کا چھوٹا سا ٹریلر بنوا کر چوہدری کو دے دیا تھا۔

"ایسی حسین فلم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" چوہدری نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"فلم تو ابھی آپ نے دیکھی ہی نہیں ہے۔ یہ تو بس جھلکیاں ہیں۔ ایک گھنٹے کی فلم ہے۔"

"تو مجھے دے دیں نا مرشد صاحب' نذرانہ منہ مانگا دوں گا۔" چوہدری نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"نذرانہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صرف پانچ ہزار روپے۔"

چوہدری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسری طرف عظمت مرزا بھی حیران رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ لاکھوں کی بات ہوگی۔ پھر چوہدری نے خود کو سنبھالا اور شک آمیز لہجے میں کہا "تو کیا اسے باقاعدہ ریلیز کریں گے آپ؟ یہ تو زیادتی ہوگی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔ خاص چیز تو خاص لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔" مرشد نے وضاحت کی "میں نے صرف پچاس پرنٹ بنوائے ہیں۔ صرف خاص خاص لوگوں کو دوں گا اور وہ بھی اس شرط پر کہ کیسٹ عام نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی کمرشل کام نہیں ہے۔ صرف تعلقات کی وجہ سے میں نے یہ فلم بنائی ہے۔"

"تو کسی اور کو دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جو موجود

ہوں۔" چوہدری نے جلدی سے کہا۔

"لیکن چوہدری صاحب آپ پچاس پرنٹ لے کر کیا کریں گے؟ میں نے عرض کیا نا' یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

"ہو' تو کیا میں یہ فلم چلواؤں گا۔ ویڈیو شاپس کو دوں گا۔" چوہدری نے ہرا مانتے ہوئے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا چوہدری صاحب۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ پچاس پرنٹ....."

"جی' اپنے یاروں میں شوقین لوگ کوئی کم ہیں۔" چوہدری نے فخریہ لہجے میں کہا "پھر لوگوں سے کام بھی پڑتا رہتا ہے۔"

"لیکن آپ کسی کو دیں اور وہ اس کی کاپیاں بنا کر تجارت شروع کردے۔"

"اس طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں مرشد صاحب' ہم لالچی لوگ نہیں۔ نہ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ایسا دھندا کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔"

"دیکھ لیں چوہدری صاحب' آپ بڑی گارنٹی دے رہے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں نا۔ بس آپ پرنٹ میری گاڑی میں رکھوا دیں۔" چوہدری نے جیب سے چیک بک نکالی اور ڈھائی لاکھ روپے کا چیک مرشد کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ مرزا صاحب کو دیں۔" مرشد نے مرزا کی طرف اشارہ کیا پھر مرزا سے بولا "مرزا صاحب' یہ چوہدری صاحب اپنے خاص آدمی ہے۔ معاملات کے کھرے ہیں۔ جو کہہ دیں اسے پتھر پر لکیر سمجھئے۔ ان کا ہمیشہ خاص خیال رکھئے گا۔"

مرزا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چیک لیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ چوہدری نے جاتے جاتے کہا "میاں صاحب' ایک بات بتا دوں آپ کو۔ یہ آپ کی ہیروئن بڑے لوگوں میں سپرہٹ ہو کر رہے گی۔"

چوہدری کے جانے کے بعد مرشد نے مرزا سے کہا "یہ ہے آپ کے ٹوٹے ستارے پر لگنے والے سرمائے کا کور۔ اب آپ ناکامی سے بے نیاز ہو کر فلم بنائیں۔"

"میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن کچھ باتیں اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"وہ آپ مجھ سے پوچھ لیں۔"

"ایک تو یہ کہ چوہدری صاحب نے پورے ۵۰ کیسٹ کیوں خرید لئے جبکہ کام ایک سے بھی چل سکتا تھا۔ ڈھائی لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔"

"جواب یہ ہے کہ چوہدری صاحب مجبور تھے۔ اگر ہم ۱۰۰ کیسٹ کہتے تو وہ ۱۰۰ کیسٹ خریدتے۔ چوہدری صاحب کے حلقہ احباب میں بڑے اور صاحب اختیار بیوروکریٹس ہیں' بیکار ہیں اور وزرا ہیں۔ یہ تعلق غرض کا ہے جس کے لیے دوستوں کو خوش کرنا ضروری ہے۔ اب یہی کیسٹ اگر کسی وی آئی پی کو چوہدری صاحب کے علاوہ کوئی ایکس وائی زیڈ بھی پیش کردے تو اس کی کیا وقعت رہے گی۔ اس لیے تمام کیسٹ خریدنا چوہدری صاحب کے لیے ضروری تھا۔ اب یہ ایک قیمتی تحفہ ہے دوستوں کو خوش کرنے کے لیے۔ دوسری بات یہ کہ چوہدری صاحب کے لیے یہ ڈھائی لاکھ کوئی بڑی چیز نہیں۔ ایک طرح کی سرمایہ کاری ہے' جس سے وہ کروڑوں کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری صاحب یہ فلم غیر ملکی شائقین کو فروخت کردیں۔"

عظمت مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چوہدری صاحب اس فلم کی تجارت نہیں کریں گے؟"

"اس کی ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتا دی۔ چوہدری صاحب کے لیے یہ فلم ایک نایاب تحفہ ہے' جسے صرف وہ کسی کو پیش کرسکتے ہیں۔ وہ فلم کا اچھوتا پن مجروح نہیں کرسکتے۔ اس کے باوجود بھی میں نے احتیاطی تدبیر کی ہے۔" مرشد نے دراز کھول کر چھوٹا ٹیپ ریکارڈر مرزا کو دکھایا "ان کی گفتگو میں نے ٹیپ کرلی ہے۔"

عظمت مرزا بے ساختہ مسکرا دیا۔

○☆○

فلم ٹوٹے ستارے کا مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ فلم کی کاسٹ میں زیادہ تر نئے لوگ تھے۔ فلم کی شوٹنگ جس رفتار سے ہو رہی تھی اس سے لگتا تھا کہ تین چار مہینے میں فلم ایڈیٹنگ ٹیبل پر ہوگی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اداکاروں کی ڈیٹس کا وہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

شام شوٹنگ جلدی پیک اپ کردی گئی۔ عظمت مرزا کو اپنی فیملی کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ مرشد نے اس سے وعدہ لے لیا کہ تقریب سے نمٹنے کے بعد وہ اس کے گھر آجائے گا "مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

دفتر میں مرشد نے صوفیہ سے' جس کا فلمی نام الماس رکھا گیا تھا' پوچھا "بے بی آج کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے تمہیں؟"

صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا "جی نہیں' کوئی کام ہے تو بتائیں۔"

"آج میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

صوفیہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ مرشد اکیلا ہی رہتا ہے "نہ مجھے کوئی مصروفیت ہے اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔"

مرشد کو اس کی نظریں اچھی نہیں لگیں۔ تاہم اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تو پھر چلو میرے ساتھ۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔"

صوفیہ کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اس اہم بات سے بخوبی واقف ہے "چلئے....." اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ باہر نکلے۔ صوفیہ مرشد کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹوڈیو

سے نکل آئی۔ راستے میں مرشد نے صوفیہ سے پوچھا "کھانا پکانا آتا ہے تمہیں؟"

صوفیہ پھر حیران ہوئی "جی ہاں لیکن اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ میرا پکایا ہوا کھانا آپ کو پسند بھی آئے گا۔"

"تو پھر یہ زحمت کر سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔"

"ویسے میں کھانے کے معاملے میں نخرے باز ہوں بھی نہیں۔"

راستے میں انہوں نے رک کر گوشت اور کچھ دوسری چیزیں لے لیں۔ صوفیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

مرشد کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر صوفیہ کو بہت اچھا لگا۔ مرشد نے بتایا کہ ایک ملازمہ روز صبح آتی ہے اور صفائی کر جاتی ہے۔ صوفیہ نے جا کر کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں مسالے اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی "آپ خود بھی پکاتے رہتے ہیں کیا؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"کبھی کبھی موڈ بن جائے تو پکا لیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹائیں گے؟"

"ضرور۔"

"اچھا یہ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی پکا لو۔"

"بھوک جلدی لگنے کا امکان تو نہیں؟"

مرشد نے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے "دو گھنٹے کی مہلت ہے تمہارے پاس۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ بریانی اور کباب بناؤں گی میں۔"

مرشد نے بڑی حد تک صوفیہ کا ہاتھ بٹایا۔ یوں کام جلدی نمٹ گیا۔ نو بجے وہ کھانے سے نمٹ چکے تھے۔ صوفیہ چائے بنا کر لے آئی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے "میں منتظر ہوں مرشد صاحب۔" اچانک صوفیہ نے کہا۔

"کس کی؟"

"اُس خاص بات کی جو آپ کو مجھ سے کرنی ہے۔"

"اس کے لیے تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔"

صوفیہ نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کر صوفے پر مرشد کے برابر آ بیٹھی "جھجکنے کی ضرورت نہیں مرشد صاحب۔" اُس نے لرزیدہ آواز میں کہا "میں ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی ہوں۔ ویسے بھی آپ کو میں نے ناپسند کبھی نہیں کیا۔"

مرشد نے سر گھما کر ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا "تم غلط سمجھ رہی ہو بے بی۔ میں ہرگز نہیں جھجک رہا ہوں۔ جھجکتا تو آدمی وہاں ہے جہاں کوئی خوف یا خدشہ ہو۔ لیکن تم میرے لیے بہت محترم ہو۔"

"حیرت ہے۔ میری وہ فلم دیکھنے کے باوجود۔"

"تم یقین نہیں کرو گی لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے وہ فلم نہیں دیکھی۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ تم سے ایک عجیب طرح کا دلی ناتا جڑ گیا ہے۔" مرشد نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے بھی ان چیزوں میں میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اُس سے لپٹ گئی "مجھے معاف کر دیجیے اس بدگمانی پر۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "آپ مجھے ایسے ماحول میں ملے تھے پھر جس طرح آپ نے میرا انٹرویو لیا' مجھے وہ دوسرا اسکرپٹ دیا' میرا تاثر آپ کے بارے میں کچھ اور ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ میں خود حیران ہوئی تھی کہ آپ کا امیج اچھا ہی کیوں بنتا ہے۔ آج جب آپ نے گھر چلنے کو کہا تو ایک شیشہ سا چٹخا۔ لیکن یقین کریں مجھے خوشی ہوئی۔ اب میں آپ سے وہ بات کہوں گی جو مجھے کہنے کا حق نہیں۔ اس لیے کہ میں اس قابل ہی نہیں رہی۔ مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

مرشد کے لیے وہ بے حد کمزور اور آزمائشی لمحے تھے۔ وہ بے حد حسین تھی' بے حد قریب تھی' اس سے اظہار محبت بھی کر رہی تھی اور وہ خود انسان تھا۔ خطا کا پتلا پھر وہ ایسا انسان تھا جو اپنی دانست میں ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ بہت قریب تھا کہ وہ بہک جاتا لیکن اس خیال نے کہ آخری لمحوں میں کیوں اپنا دامن آلودہ کرے' عین وقت پر اسے بچا لیا۔

اُس نے بے حد نرمی سے صوفیہ کو ہٹایا "تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔"

صوفیہ بے حد شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا اب ان کے درمیان گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا ہے۔ مرشد نے اس کی کھسیاہٹ محسوس کر کے اس سے چائے کی فرمائش کر دی تاکہ شرمندگی اور تعطل کی فضا ختم ہو جائے "چائے زیادہ بنا لینا' تمہارس میں بھر لینا۔ تھوڑی دیر میں مرزا صاحب بھی آنے والے ہیں۔"

"مرزا صاحب؟"

"ہاں' میں نے انہیں بھی بلایا ہے۔"

صوفیہ کچن میں چلی گئی اور مرشد اُن رپورٹس کا جائزہ لینے لگا جو گزشتہ شب بابر نے اسے دی تھیں۔ اُن رپورٹس کو دیکھتے ہوئے اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ اداسی کی دھند نے آہستہ آہستہ اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

صوفیہ چائے بنا لائی تھی۔ دونوں چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ صوفیہ کے انداز میں بے فکری تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مرشد بار بار اسے عجیب سی اداس سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ساڑھے دس بجے عظمت مرزا بھی آ گیا۔ صوفیہ کو موجود پا کر وہ حیران ہوا۔ صوفیہ کے پوچھنے پر اُس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ کھانا وہ تقریب سے کھا کر چلا تھا۔

"چائے پئیں گے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"یا آپ کے ذوق کے مطابق کچھ پیش کروں۔" مرشد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"شرمندہ نہ کریں میاں صاحب۔ جب سے مجھے میرا ماحول ملا ہے' میں نے آوارگی ترک کردی ہے۔ میں اپنے موجودہ مقام پر بہت مطمئن اور خوش ہوں۔" مرزا نے جواب دیا۔ پھر وہ صوفیہ کی طرف مڑا "چائے پلاؤ بے بی۔"

"نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ ایسے ہی ہیں۔" مرشد بولا۔

صوفیہ نے تھرموس سے چائے انڈیل کر مرزا کے سامنے رکھ دی۔ مرشد نے سگریٹ سلگائی اور ان دونوں کو غور سے دیکھا "اب میں آپ دونوں کی توجہ کا خواستگار ہوں۔" اس نے کہا "میں نے کہا تھا کہ مجھے بہت اہم بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن بولے کچھ نہیں۔

"سب سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں ایک کروڑ پتی صنعت کار ہوں۔ نہیں.... تھا کہئے۔ میری بیوی ہے' دو بچے ہیں۔ میں ان کو بہت چاہتا ہوں.... بہت زیادہ لیکن میں خود سے بھاگ رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں ایڈز کا مریض ہوں۔"

وہ بہت بڑا دھماکا تھا۔ صوفیہ اور مرزا کے چہروں پر زلزلے کا سا تاثر تھا۔ مرزا تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی منٹ سناٹا سا طاری رہا۔ پھر صوفیہ نے کوشش کرکے خود کو سناٹے کے اس طلسم سے نکالا "میں.... میں یقین نہیں کرسکتی۔"

"میں بھی نہیں کرسکا تھا۔ لیکن میری خون کی رپورٹ بتاتی ہے کہ میرا ایچ آئی وی ٹیسٹ پازیٹو ہے۔"

"میں اب بھی یقین نہیں کرسکتی۔" صوفیہ تنویم زدگی کی سی کیفیت میں بڑبڑائی۔

"میرے بھائی کو چھوڑ کر صرف آپ دونوں دنیا میں ایسے ہیں جنہیں میں نے اس راز میں شریک کیا ہے۔ اس لیے کہ اب آپ ہی وہ لوگ ہیں جنہیں میں اپنی فیملی سمجھتا ہوں۔"

"آپ کی بیوی کو بھی نہیں معلوم؟" صوفیہ نے پوچھا۔ مرزا اب تک یوں بیٹھا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

مرشد یا عاصم نے انہیں اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں بڑی محویت سے سن رہے تھے "میں اپنے بچوں کو عمر بھر کی بدنامی کا داغ نہیں دینا چاہتا تھا۔" مرشد کہہ رہا تھا "سو میں اُن کی زندگی سے نکل آیا۔ پہلے میں منفی انداز میں سوچتا رہا۔ میں قصوروار نہیں تھا۔ مجھے یہ مرض لگا تو یہ پورے معاشرے کا قصور تھا۔ پھر میں نے سوچا' ممکن ہے مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہو جو خداوند کریم کو بہت ناپسند ہوئی ہو۔ اس کی مجھے یہ سزا ملی ہو۔ پھر میں نے اس حقیقت کو قبول کرلیا۔ مگر ایک بات میں نے پھر بھی سوچی۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے' جنہیں فرصت و سلست گناہ نہیں۔ جن کی محدود وقت کی روٹی کی فکر میں تمام ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ ایڈز سے محفوظ نہیں۔ انہیں احتیاط کی تلقین کی جاتی ہے اس لیے کہ معاشرے کی گمراہ اور دولت مند اقلیت صرف احتیاط پر انحصار کرتی ہے' جو کہ ناکافی ہے۔ وہ اقلیت معاشرے کی معصوم اقلیت کے لیے ایک مہلک خطرہ ہے۔ یہ وہ اقلیت ہے جس کی سوچ گناہ سے شروع ہو کر گناہ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان گناہ گاروں کی فنا کے قدرتی عمل کو تیز کردوں تاکہ معصوم اکثریت کا تحفظ یقینی ہو جائے۔ قلم سے میری دلچسپی کافی پرانی ہے مگر میں یہ مشن لے کر اس طرف آیا۔ میں نے خود کو آلہ قہر سمجھ لیا۔ لیکن میں خود کو اس حیثیت میں استعمال نہیں کرسکا اور تن بہ تقدیر ہو گیا۔"

"مجھے بہت افسوس ہے مرشد صاحب۔" صوفیہ نے کہا "مگر اب میری الجھن دور ہو گئی ہے۔ آپ مجھے اس ماحول کے آدمی نہیں لگے تھے۔"

"میں بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہوں۔" عظمت مرزا نے پہلی بار لب کشائی کی "میں بھی الجھ رہا تھا۔ آپ مجھے پیسے سے بے نیاز آدمی معلوم ہوتے تھے مگر آپ اچھی فلم پر لگنے والے سرمائے کے کوہ کی بات کرتے تھے۔ یہ بات آپ کے منہ سے غیر فطری لگتی تھی۔ پھر آپ نے یہ پورنو فلم بنوائی تو اس دوران بھی آپ کا رویہ عیاش رئیسوں کا سا نہیں تھا۔ پھر اس بات پر زور کہ یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ حالانکہ آپ اُس سے خود لاکھوں کما سکتے تھے۔ آپ اسے بیرون ملک کے شوقین لوگوں کو منہ مانگے داموں بھی فروخت کرسکتے تھے لیکن اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ آپ ایک مشن کے تحت کام کررہے تھے۔"

"کررہا تھا نہیں کررہا ہوں۔" مرشد نے کہا "میں یقین رکھتا ہوں کہ رزق حرام کا ایک لقمہ بھی خون میں شامل ہو جائے تو اس کے اثرات بے حد خوف ناک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی گناہ کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ایسے لوگ' ایسے سیاست داں' ایسے حکمراں ہیں جنہوں نے کرپشن کی انتہا کردی ہے۔ جن کی رگوں میں خون نہیں' صرف رزق حرام دوڑ رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی گناہ سے بھی بچ سکتے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے۔ میں انہیں ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میری سوچ یہ ہے اگر غلط ہو تو اللہ معاف کرے کہ اُن لوگوں کو گناہ کے ذریعے خدا کے قہر کی طرف لے جانا گناہ نہیں ایک قومی خدمت ہے۔ یہ لوگ بے حس ہو چکے ہیں۔ انہیں عوام کی کوئی پروا نہیں۔ یہ اُس وقت سے بھی نہیں ڈرتے جب ملک کے عوام یہ دعا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اے اللہ' ان لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کردے۔"

عظمت مرزا جھرجھری لے کر رہ گیا۔ صوفیہ نے کہا "مجھے لگتا ہے' ابھی آپ نے ہمیں اہم بات نہیں بتائی ہے۔"

مرشد نے گہری سانس لی "ہاں۔ بات یہ ہے کہ آپ دونوں کے لیے ایک بُری خبر ہے۔ آپ کی بلڈ رپورٹ بھی ایچ آئی وی پازیٹو ظاہر کررہی ہے اور میری ہدایت پر اسے ٹرپل چیک کیا گیا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہے۔"

"لیکن مجھے نہ دکھ ہے نہ حیرت۔" صوفیہ بولی "یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں تھی ہی اس قابل۔"

"میں نہیں مانتا۔ تمہیں کسی نے اس طرف دھکیلا ہوگا۔ تم ایسی نہیں ہو۔ بہرحال میں ڈاکٹر سے بات کرچکا ہوں۔ جوان لوگوں پر بیماری کا حملہ عام طور پر بیس پچیس سال بعد ہوتا ہے۔ یہ مہلت کافی ہے۔ اس دوران ہوسکتا ہے علاج بھی دریافت ہوجائے اس کا....."

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ جتنی مہلت مل جائے بڑی نعمت ہے۔ میں بھی آپ کی طرح ایک مشن لے کر نکلی تھی۔ اس مشن کو آپ نے وسعت دے دی ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں' مجھے نہ کوئی دکھ ہے نہ ملال۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" عظمت مرزا نے کہا "مسئلہ میرا بھی آپ والا ہے۔ بیوی بچے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "میں ان سے بھاگ بھی نہیں سکتا۔ میرا تو سب کچھ یہ کیریر ہے اور اب تو یہ اور اہم ہوگیا ہے۔ زندگی نے مجھے جتنی بھی مہلت دی' میں اسے آپ کے مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک اس کی آنکھوں میں امید چمکی "میاں صاحب' کیا یہ ممکن ہے کہ میرا راز راز ہی رہے؟"

"اس طرف سے آپ بے فکر ہوجائیں مرزا صاحب۔ یہ بات کبھی کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔"

"بس تو پھر میں خوش ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کی سزا دنیا میں بھی مل رہی ہے۔"

وہ تینوں دیر تک بیٹھے مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔ اب وہ ایک فیملی تھی۔

اچانک مرشد نے صوفیہ سے کہا "میری ایک بات یاد رکھنا بی بی۔ خود کو سہل الحصول نہ بنانا۔ یوں تمہاری کشش بھی بڑھے گی اور تم زیادہ موثر بھی ثابت ہوگی۔"

صوفیہ نے بے وصیانی سے اثبات میں سرہلایا۔ اس کے تصور میں اس وزیر کی صورت تھی جو اس کے بھائی کے ساتھ مل کر اس کی تباہی کا سبب بنا تھا۔

مرزا بدیائی انداز میں ہنسنے لگا "تو یہ ہے آپ کی امداد فلمز لمیٹڈ امداد عام لوگوں کے لیے اور ایڈز فلموں کے ذریعے گناہ گاروں تک محدود....."

○☆○

ڈکلیریشن کے اجرا پر سے سرکاری پابندی اٹھنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ وحید نجمی کے لیے یہ عرصہ اکتا دینے والا تھا۔ اس نے اس عرصے میں ایڈز کے حوالے سے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر کافی گراؤنڈ ورک مکمل کرلیا تھا۔ کراچی کی حد تک وہ کام مکمل کرچکا تھا۔ اب اس کا ارادہ لاہور اور پھر راولپنڈی کی لیبارٹریز پر کام کرنے کا تھا۔

لاہور میں عوامی لیب کا بہت چرچا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس لیب نے بڑی اچھی ساکھ بنالی تھی۔ نجمی نے اس کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر بابر نسیم سے ملاقات کا وقت لیا۔ ڈاکٹر کی شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آیا تھا۔ خون کے امراض کا وہ اسپیشلسٹ تھا۔

"آپ کی لیب کو قائم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" نجمی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سات ماہ ہونے والے ہیں۔"

"آپ کو لیب قائم کرنے کا خیال کیوں آیا؟"

"دیکھیں' پہلی بات تو یہ کہ یہ میری فیلڈ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایڈز پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہوچکا ہے۔ اب بلڈ بینکوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کو مطلوبہ خون دینے بلکہ لینے سے پہلے خون کی مکمل اسکریننگ کریں۔ ہر لیبارٹری میں ایڈز کے وائرس کی چیکنگ کا بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ بڑا ذمے داری کا کام ہے۔ یہ صحت عامہ کا مسئلہ ہے۔ جو شخص بھی یہ کام کرے گا وہ درحقیقت ایک اہم قومی خدمت انجام دے گا۔"

"تو آپ کی لیبارٹری میں یہ کام ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا "میں اس کا جواب دوں گا۔ لیکن یہ آف دی ریکارڈ ہوگا۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا "آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایڈز کے بارے میں یہاں لوگوں کا رویہ کیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" نجمی نے سرہلاتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا کہا ہوا ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوگا۔"

"شکریہ" ڈاکٹر بابر مسکرایا "ہم نہ صرف اپنے معزز کرم فرماؤں کے خون کی ایچ آئی وی اسکریننگ کررہے ہیں بلکہ مکمل ریکارڈ بھی رکھ رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس بات کا اعلان بھی کردیں تو لوگ ہمارے پاس آنا چھوڑ دیں گے۔ یہاں تو ایڈز مرض کی بجائے ایک گالی کی صورت اختیار کرگیا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔ اور اس میں لوگوں کے رویے کا بڑا دخل ہے۔"

"لوگوں کو صحیح طرح سے بتایا بھی تو نہیں گیا ہے ایڈز کے بارے میں..... اور اچھوت بننے سے تو ہر شخص ڈرتا ہے۔"

"جی ہاں یہی بات ہے۔ کئی ایسے افراد ہیں جنہیں اپنے ایڈز میں مبتلا ہونے کا علم ہوا تو وہ روپوش ہوگئے۔" نجمی نے کہا "ایک شخص تو ایسا تھا کہ جو ڈاکٹر سے یہ کہتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لہٰذا اب وہ اس مرض کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرے گا۔"

"کمال ہے۔ اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی؟ یہ تو بے حد خطرناک بات ہے۔"

"اخبار میں خبر چھپی لیکن اس شخص کو بہرحال سنجیدگی سے تلاش نہیں کیا گیا۔ ایڈز کی بدنامی کا یہ حال ہے کہ دولت مند لوگ جو ہمارے معاشرے میں بے حد طاقت ور ہوتے ہیں' وہ بھی خود کو معاشرے میں ایڈز کے مریض کی حیثیت سے نہیں پیش کرپاتے۔ وہ روپوش ہونے والا شخص تو بہت غریب آدمی تھا۔ خون بھی بیچتا تھا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے۔ کوئی دس ماہ پہلے ملک کے ایک معروف کروڑپتی صنعت کار نے بھی روپوشی اختیار کرلی۔ اُس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔"

ڈاکٹر بابر کچھ چونکا "کروڑپتی صنعت کار؟ کیا نام تھا اُس کا؟"

"یہ بات پلیز اپنی ہی حد تک رکھیے گا۔" نجمی نے کہا "اس صنعت کار کا نام عاصم قریشی تھا۔" ڈاکٹر بابر کی آنکھوں میں اسے حیرت نظر آئی "آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"نہیں' میں نے بتایا نا کہ میں آٹھ سال امریکا میں رہ کر واپس آیا ہوں۔" ڈاکٹر بابر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ اپنے پورے وجود کو لرزتا محسوس کررہا تھا "البتہ نام مجھے سنا ہوا لگا ہے۔"

"میں نے قریشی صاحب کے بارے میں بہت چھان بین کی۔ لیکن وہ ہر اعتبار سے بہت صاف ستھرے آدمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے خود بھی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں ایڈز کیسے لگا ہوگا۔"

"دیکھیں' اِن ڈائریکٹ طریقے بھی تو ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایڈز کا ہر مریض گناہ گار ہو۔"

"آپ کے خیال میں ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت نے موثر اقدامات کیے ہیں؟"

"موثر اقدامات؟" ڈاکٹر تلخی سے ہنسا "مجھے تو ابھی تک اقدامات بھی نظر نہیں آئے ہیں۔ حکومت تو بس ایک ادارہ قائم کرکے مطمئن ہوگئی ہے۔ انداز شتر مرغ والا ہے جو ریت میں منہ چھپا کر مطمئن ہوجاتا ہے کہ اُس کا پہاڑ جیسا وجود بھی چھپ گیا ہے۔ اب اس ادارے کے نام کو ہی لیجیے۔ نیشنل ایڈز پروگرام۔ پہلی بار میں نے یہ نام سنا تو سمجھا کہ یہ غریبوں کی مدد کرنے والا کوئی فلاحی ادارہ ہے۔ پھر پتا یا گیا کہ یہ ایڈز کا چکر ہے۔ اب بھی نام سے مجھے یہ ادارہ ایڈز کی روک تھام والا نہیں بلکہ فروغ والا لگتا ہے۔ نیشنل ایڈز پروگرام۔" اُس نے تمسخر سے دہرایا "یہ ہے ہمارا حال۔ نیشنل ایڈز کنٹرول ہی رکھ دیتے نام۔ اور اس ادارے کی ناقص کارکردگی کی گواہی ٹی وی اور اخبارات دیتے ہیں۔"

"اچھا.... آپ کا بلڈ بینک؟"

"مجھے فخر ہے کہ ہم یہ بڑا کام کررہے ہیں۔ ہم دعوے سے صاف ستھرا خون فراہم کرتے ہیں ضرورت مندوں کو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات ہم ضرورت پوری نہیں کرپاتے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ کوئی خون فروخت کرنے آئے تو ہم پوری طرح ٹیسٹ کیے بغیر خون قبول نہیں۔ لہٰذا ہمارے وسائل کم ہیں۔ عطیہ دینے والے کم ہی آتے ہیں۔ بہرکیف ہم کسی کو ضرررساں خون نہیں دیتے۔"

"اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔" نجمی نے کہا "ایڈز کے سلسلے میں عام لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے آپ کا؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے سوچتا رہا "جی ہاں' میں اُن سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایڈز کے کسی بھی مریض کو بدکار اور گناہ گار نہ سمجھیں۔ اسے ملامت' نفرت اور گریز کی نہیں' ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اُس کا نظروں کے سامنے رہنا اچھا ہے۔ دوسری صورت میں وہ انسانی بم بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ محض شک کی بنا پر کسی کو مجرم قرار دے دیں۔ حقیقت صرف خدا کو معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں تو پیار سے بس ہمدردی کرنی چاہیے۔"

"ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت کو کوئی مشورہ دیں گے آپ؟"

"ائرپورٹس پر خون ٹیسٹ کرنے کا انتظام ضروری ہے۔ غیرملکیوں کو بغیر چیکنگ کے ملک میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری بات' باہر سے آنے والے پاکستانیوں کو بھی ائرپورٹ پر ہی چیک کیا جائے خواہ ان میں دو چار ہفتوں کے کاروباری' تفریحی دوروں پر جانے والے ہوں خصوصاً جو عام طور پر مشرق بعید کے ممالک یا ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ بھارت اور مشرق بعید کے ممالک میں ایڈز کے مریض کتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ پاکستان میں یہ مرض باہر سے ہی آیا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی "یہ کام ابتدا میں ہی ہوجانا چاہیے تھا۔ اب تک تو صورت حال نجانے کتنی خراب ہوچکی ہوگی۔ پھر بھی کم از کم اب تو یہ کام کرلیا جائے۔ دوسرے ایڈز کے مریضوں پر نظر رکھی جائے۔"

"شکریہ ڈاکٹر" نجمی اٹھ کھڑا ہوا۔

○☆○

بابر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

گمشدہ کڑی مل گئی تھی۔ زنجیر مکمل ہوگئی تھی۔ بات پوری طرح اُس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ عاصم کا رویہ جو ناقابل فہم لگتا تھا' اب ناقابل فہم نہیں رہا تھا۔ معما حل ہوگیا تھا لیکن کیا ایسا تھا؟ اس معمے کا تو کوئی حل نہیں تھا۔ ایڈز موت تھی.... یقینی موت!

بابر یہ سوچ کر کانپ اٹھتا تھا کہ عاصم اتنے عرصے سے اکیلا اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھائے پھر رہا ہے۔ ایک معزز' قابل فخر شخص اپنی شناخت سے' اپنی محبوب بیوی سے' اپنے چہیتے بچوں سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوگیا تھا اور وہ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کرب کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

بابر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت جاکر بھائی جان سے لپٹ جائے۔ روئے اور انہیں بھی رلائے کہ اب تک نہ جانے کتنے آنسو وہ پی چکے ہوں گے۔ انہیں دلاسا دے۔ انہیں بتائے کہ اُن سے محبت کرنے والا کوئی بھی شخص اُن

کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ وہ اب بھی سب کو محبوب ہیں۔ اور آخری لمحے تک وہ انشاء اللہ اکیلے نہیں ہوں گے۔

آخری لمحے کا خیال آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دیر تک روتا رہا۔ پھر اچانک اس کا دل جیسے جگمگا اٹھا۔ گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن بھی بہت ہوتی ہے۔ اس نے اس کرن کو جیسے دل کی مٹھی میں بند کر لیا۔

یہ خیال اسے بعد میں آیا کہ یہ فیصلہ کچھ دشوار تو نہیں ہے بلکہ ہونا ہی یہ چاہیے تھا۔

○☆○

صوفیہ دل ہی دل میں خوش تھی لیکن بظاہر پریشان اور برہم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی "میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔" اس نے چوہدری جمیل سے کہا۔ چوہدری جو نک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں امداد فلم لمیٹڈ کے دفتر کے اندرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔

"کیوں ناممکن ہے؟" چوہدری نے کہا۔

"اس لیے ناممکن ہے کہ نہ مجھے رقص آتا ہے نہ ہی میں گانے والی ہوں۔"

"تو تم ایک معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہو سکتی ہو؟"

"دیکھیں چوہدری صاحب' میں نادان بچی نہیں' سب سمجھتی ہوں۔ میں اس طرح کی نجی محفلوں میں شریک نہیں ہو سکتی۔" صوفیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں آخر؟ یہ تو تمہاری عزت افزائی ہے۔ اس محفل میں تین منسٹر شریک ہوں گے۔"

"یہ منسٹر آخر مجھ پر ہی کیوں مہربان ہو رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

چوہدری مکاری سے ہنسنے لگا "تبھی فلم نگری میں چلی آئی ہو۔"

"فلم نگری میں ابھی تک قدم بھی نہیں رکھا میں نے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے مرشد صاحب اور مرزا صاحب جیسے لوگ ملے۔ میں ایک عزت دار لڑکی ہوں۔ اسی لیے میں نے کسی اور ادارے کی کوئی فلم قبول نہیں کی۔ اب تک کسی نے یہاں میلی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا مجھے۔"

"تم بھول رہی ہو۔ ادارہ تمہاری ایک دھانسو فلم خاص لوگوں میں ریلیز کر چکا ہے۔" چوہدری نے زہریلے لہجے میں کہا "اس فلم سے تم عزت دار لڑکی تو ثابت نہیں ہوتیں۔ اُس فلم نے بڑے لوگوں کو دیوانہ بنا دیا ہے تو اس میں کس کا قصور ہے؟ تمہارا ہے عزت دار لڑکی۔"

صوفیہ نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "وہ فلم بھی مجھے عزت دار ہی ثابت کرتی ہے۔ ورنہ میں اکیلی نہ ہوتی اس فلم میں۔"

"اسی بات نے تو ویلیو بڑھا دی ہے تمہاری۔" چوہدری نے

میت میں پڑوسی عورتیں تعزیت کر رہی تھیں۔ ایک بولی "اپنی کا ہوگا۔"

دوسری بولی "نہیں ستر سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

میت کے قریب بیٹھے ہوئے چھ سالہ پوتے نے کہا۔ "چلو ستر ہی دے دو اور لے جاؤ۔"

ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دیکھو بے بی الماس' بے کار ضد نہ کرو۔ تم خوش قسمت ہو کہ ابتدا میں ہی اتنا اونچا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ میں تمہیں جن لوگوں سے متعارف کرا رہا ہوں' وہ بڑے اختیار والے لوگ ہیں۔ اُن سے کیا کچھ نہیں مل سکتا تمہیں۔ ضد کرو گی تو نقصان میں رہو گی۔ جو لوگ تمہیں عزت سے بلوا رہے ہیں وہ تمہیں اٹھوا بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں... ملک میں اب اتنی لاقانونیت بھی نہیں۔" صوفیہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں لاقانونیت کی نہیں' قانون کی بات کر رہا ہوں۔ وہ فلم جو تمہیں اتنا اوپر لے جا رہی ہے' تمہیں تباہ بھی کر سکتی ہے۔ تمہارے خلاف ناقابل تردید ثبوت بھی بن سکتی ہے۔"

صوفیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "اچھا میں سوچوں گی چوہدری صاحب۔"

"سوچنا کیا ہے۔ پروگرام مری میں ہوگا۔ تمہیں مسلسل شوٹنگ نے تھکا دیا ہے۔ میں میاں صاحب سے بات کر لوں گا۔ تمہیں پندرہ دن کی چھٹی مل جائے گی۔"

"پندرہ دن...؟"

"میرا وہاں شاندار بنگلا ہے۔ وہیں قیام کرنا۔ میں تو دو دن سے زیادہ نہیں رک سکوں گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ میاں صاحب سے بات کر لیں۔" صوفیہ نے مُردہ لہجے میں کہا۔ دل ہی دل میں وہ ہنس رہی تھی کہ موذی اپنی موت کو خود آواز دے رہے ہیں۔

○☆○

فلم آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی تھی۔ الماس اگرچہ موجود نہیں تھی مگر دوسرے اداکاروں کی شوٹنگ جاری تھی۔ مرشد جمعرات کی رات معمول کے مطابق اسٹوڈیو سے جلدی نکل آیا۔ وہ گھر پہنچا تو بابر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

بابر اپنے ساتھ کھانا لے کر آیا تھا۔ دونوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا پھر بابر نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے بعد عاصم کو جمائیاں آنے لگیں۔

"لگتا ہے آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔" بابر نے کہا۔

"تھکن تو نہیں ہے لیکن نیند بہت آ رہی ہے۔"

"تو سو جائیں۔"

"نہیں' اب ایسا بھی نہیں۔ ٹی وی پر آج بہت اچھی فلم آرہی ہے۔"

لیکن عاصم فلم نہ دیکھ سکا۔ نیند پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ بستر پر جاتے اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ بابر نے ایک گھنٹے انتظار کیا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے سرنج نکالی اور بڑی مہارت سے عاصم کی کلائی سے خون لیا۔ عاصم کسمسایا بھی نہیں۔ بابر اُس وقت بے حد ایکسائیٹڈ تھا۔ اپنے لیب اسسٹنٹ کو وہ پہلے ہی رکنے کی ہدایت کر آیا تھا۔

اس نے عاصم کو کمبل اُڑھایا اور دروازہ لاک کرکے باہر نکل آیا۔ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اِس وقت اُس کا رواں رواں دعا کررہا تھا۔

○☆○

عاصم کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی دھوپ اتر چکی تھی۔ اُس کی نظر سرہانے کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے بابر پر پڑی تو اسے حیرت ہوئی۔ بابر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے جاگتے دیکھا تو مسکرایا۔

"کیا بات ہے' تم سوئے نہیں؟" عاصم نے پوچھا۔

"نہیں بھائی جان۔ کل جاگنے کی رات تھی۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اب بھی نہیں سوؤں گا۔ یہ جشن منانے کا دن ہے۔"

عاصم اٹھ بیٹھا "کیا بات ہے۔ معموں میں بات کررہے ہو۔ رات تو ایسی کوئی بات نہیں کی تم نے۔"

"خوش خبری آپ کے سونے کے بعد ملی تھی۔"

اچانک عاصم کو گمنی سے نیچے اس جگہ تکلیف کا احساس ہوا' جہاں سے بابر نے خون لیا تھا "ارے یہ کیا' رات کسی کیڑے نے کاٹ لیا شاید۔" وہ بڑبڑایا۔

"اس کیڑے کا نام بابر نسیم ہے بھائی جان۔"

"کیا... کیا مطلب؟"

"رات میرا جی چاہا کہ آپ کا خون چکھ کر دیکھوں۔" بابر نے کہا۔ عاصم کا چہرہ فق ہوگیا "ڈریے نہیں' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"یہ صبح صبح کیا بکواس..."

"بھائی جان' جس نے آپ کا خون چیک کرکے ایچ آئی وی پازیٹیو ڈکلیر کیا تھا' وہ غلطی پر تھا۔"

عاصم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اس کا بھی زیادہ قصور نہیں۔ میں نے اس وائرس کو اسٹڈی نہ کیا ہوتا امریکا میں تو میں بھی دھوکا کھا جاتا۔" بابر نے اپنی بات جاری رکھی "رات میں نے ٹیسٹ کرنے کے لیے آپ کا خون لیا تھا۔ جاکر اسکریننگ کرائی اپنے سامنے۔ پونے چھ بجے خوش خبری لے کر واپس آیا اور آپ کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔"

"میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آرہی ہے۔"

"آپ باتھ روم ہو آئیں۔ میں اتنے میں ناشتے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بیٹھ کر سکون سے بات کریں گے۔"

عاصم باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں اسے غور کرنے کا موقع مل گیا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ اس کے بعد تو اس کے لیے سکون سے نہانا بھی ممکن نہیں رہا۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آیا۔ بابر ناشتا لے آیا تھا۔ لیکن عاصم نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

"تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کررہے ہو کہ مجھے ایڈز کا کوئی خطرہ لاحق نہیں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

"سمجھا نہیں رہا ہوں' حتمی طور پر بتا رہا ہوں۔" بابر نے کہا "پوری طرح چھان بین کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

عاصم کچھ سوچنے لگا پھر بولا "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟"

بابر نے اسے لبجی کے متعلق تفصیل سے بتادیا۔

"اور تم نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تاکہ میں گھر جاؤں اور بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارمل زندگی گزارنے لگوں اور آخر کار ایڈز سے مرجاؤں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ اسی انداز میں سوچیں گے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "حالانکہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اتنا بڑا جھوٹ بولنے کا... دھوکا دینے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں بھائی جان۔ بہرحال آپ کی اِس بے یقینی کا بھی حل ہے میرے پاس۔ میں آپ کو امریکا لے کر چلوں گا۔ وہاں سے آپ مطمئن ہوکر وطن واپس آئیں گے۔ پھر ہم کہیں اور نہیں جائیں گے۔ بس گھر چلیں گے۔ ٹھیک ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے بابر۔" عاصم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"بھائی جان' آپ جانتے ہیں کہ آپ مجھے کتنے عزیز ہیں۔" بابر نے جذباتی لہجے میں کہا "میں آپ کی قسم کھاکر کہہ رہا ہوں کہ میری بات سچ ہے۔"

عاصم نے بابر کو لپٹالیا "مجھے یقین آگیا میرے بھائی لیکن امریکا ہم پھر بھی چلیں گے۔"

"بالکل چلیں گے لیکن اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے جائیں گے۔ اپنا پاسپورٹ دے دیں مجھے۔"

عاصم کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر فوزیہ اور بچوں کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن احتیاط کے نام پر چند دن اور سہی۔ کاش... کاش وہ فوزیہ کو فون ہی کرسکتا۔

○☆○

وہ اُن لوگوں کی الوداعی ملاقات تھی۔ عاصم اگلے روز بابر کے ساتھ امریکا جارہا تھا۔ صوفیہ اور عظمت مرزا کی حالت عجیب تھی۔ وہ سانس روکے بیٹھے عاصم سے تفصیل سن رہے تھے۔ کبھی ان میں سے کسی کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا "اللہ کا شکر ہے۔"

"مجھے دلی خوشی ہوئی ہے میاں صاحب۔" عظمت مرزا نے کہا "اگرچہ دکھ بھی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو جائیں گے لیکن آپ ہماری دنیا کے آدمی ہی نہیں تھے۔" مرزا کے لہجے میں اداسی اتر آئی "آپ کو تو اللہ نے ہم لوگوں کو نئی زندگی دینے کے لیے بھیجا تھا' گمنامی میں مرجانا جن کا مقدر تھا۔"

صوفیہ بیک وقت اپنے آنسوؤں کو پینے اور چھپانے کی کوشش کررہی تھی "مبارک ہو مرشد صاحب' مجھے یقین تھا کہ آپ کے معاملے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔"

عاصم اُس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آگئی' جب وہ صوفیہ کو اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ جب اُس نے اپنا راز ان پر منکشف کیا تھا۔ وہ وقت شاید اُس کی آخری آزمائش کا تھا۔ تنہائی' صوفیہ کا حسن اور اس کی سپردگی۔ اور پھر یہ ترغیب کہ پارسائی کے صلے میں بدکاری کی سزا تو مل ہی چکی ہے۔ عاصم کو یاد تھا کہ شیطان نے اُن لمحوں میں اس کے کانوں میں فسوں پھونکا تھا۔ لیکن اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ اس آزمائش سے سرخرو نکلا تھا۔ اگر اُس رات اس سے لغزش ہوگئی ہوتی تو اب وہ یقینی طور پر ایچ آئی وی پازیٹیو کیس ہوتا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا "صوفیہ بے بی اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو مجھے معاف کردینا۔"

صوفیہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے "ایسی باتیں نہ کریں پلیز۔ آپ نے تو ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں تو میرے پاس آپ کی صرف اچھی یادیں ہیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے اصل زندگی گزاریں گے۔" مرزا نے کہا "یہ خوشی کی بات ہے۔ ہمیں بھی کبھی کبھی یاد کرتے رہیے گا کوئی خبر پڑھ لیں تو دعائے مغفرت کردیجیے گا۔" اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میں نے اپنے بدترین دنوں میں تنہائی کے باوجود بھی کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اب میں بھری دنیا میں' اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں رابطہ رکھوں گا آپ سے۔"

"میرا مشورہ مانیں تو ایسا نہ کیجیے گا۔" مرزا نے کہا "مرشد صاحب کو یہیں چھوڑ جائیں آپ۔ اور عاصم قریشی کا ہم سے کوئی تعلق رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔"

عاصم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر عاصم نے کہا "میں آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا کہ کتنا شکر گزار ہوں آپ کا۔ جب میں دنیا میں اکیلا تھا' اپنی شناخت تک سے محروم تو آپ میری فیملی بنے۔"

ماحول بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ صوفیہ نے گفتگو کا رخ بدلا "امریکا سے واپس پر کیا کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے کوئی کاروبار۔"

"کاروبار میں تو عمر گزر گئی۔" عاصم نے اداسی سے کہا "اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اخبار نکالوں گا' کاروبار کے لیے نہیں' صحافت کی آبرو کے لیے' سچ لکھنے کے لیے عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے۔"

"ہم آپ کی کامیابی کے لیے دعا کرتے رہیں گے۔"

"آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔" عظمت مرزا نے کہا "مشن جاری رہے گا۔ نتائج خدا کے اختیار میں ہیں۔"

معیاری نفسیاتی و علمی کتابیں

ان کتابوں کا مطالعہ آپ کی شخصیت کے نکھار نے' آپ کو صحت مند رکھنے اور کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی	۲۰/-	دست شناسی کے نئے رُخ	۲۰/-
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات	۲۰/-	تحریر اور شخصیت	۱۵/-
ہپناٹزم	۱۵/-	مسائل اور حل	۲۰/-
ہپناٹزم کے عملی طریقے	۲۰/-	باغبیری	۱۰/-
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات	۲۰/-	چھ حیرت انگیز علوم	۱۵/-
ذاتی ہپناٹزم	۱۵/-	احساس کمتری	۱۵/-
خوابوں کے اسرار	۱۵/-	سگریٹ نوشی چھوڑیے	۱۵/-
عورتوں کی نفسیات	۳۰/-	کامیابی	۱۵/-
مقناطیسیت	۲۰/-	کرائے	۳۰/-
ازدواجی نفسیات	۳۰/-	مٹاپا اور اس کا سدباب	۲۰/-
خوف و شرم اور اس کا سدباب	۲۰/-	امتحان میں کامیابی	۱۵/-
فکر کی کمزوری اور اس کا سدباب	۱۵/-		

اندرونِ ملک ڈاک خرچ ایک یا دو کتابوں کا ۱۰/- روپے۔
۳ یا ۴ کتابوں کا ۱۲ روپے ہوگا۔ رقم صرف منی آرڈر کے ذریعے بھیجیں

بیرونِ ملک اخراجات

بیرونِ ملک ڈاک خرچ مشرقِ وسطیٰ ۲۵ روپے فی کتاب یورپ و مشرقِ بعید ۳۰ روپے فی کتاب آسٹریلیا و امریکا ۴۰/- روپے فی کتاب

رقم پیشگی بذریعہ ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ کسی قسم کی نقد رقم لفافے میں نہ رکھیں۔ ڈرافٹ اس نام پر بنوائیں۔

MAKTABA NAFSIAT A/C 688 H. B. L.
MANSFIELD STR. BR. KARACHI

کتب نفسیات پوسٹ بکس ۹۴۴ کراچی ۱

صوفیہ تائید میں سر ہلا رہی تھی۔
"امداد فلر مینٹ کو یا آپ لوگوں کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو عاصم قریشی کو فون کر دیجئے گا۔"

○☆○

فوزیہ اب قدرے پرسکون تھی۔ ڈکلیریشن مل گیا تھا۔ ہفت روزہ آنگن کی اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ پہلے شمارے کی سیل اگرچہ کم تھی لیکن اب پرچہ بتدریج جگہ بنا رہا تھا۔ پہلا شمارہ کسی بھی اسٹال سے بکنے نہیں دیا گیا تھا اور اب فوزیہ متوقع نتائج کی بے صبری سے منتظر تھی۔ گھر میں جب بھی فون کی گھنٹی بجتی' وہ اس توقع پر ریسیور اٹھاتی کہ عاصم کی آواز سنائی دے گی لیکن ابھی تک مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ بس اب انتظار کی وہ کیفیت تھی اور وہ۔ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ پرچے کی مصروفیات نہ ہوتیں تو شاید یہ انتظار اسے پاگل ہی کر دیتا۔

اُس شام وہ تھکی ہاری گھر پہنچی۔ بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا "ہیلو؟"

"بھابی السلام علیکم" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے بابر" وہ خوش ہو گئی "بے مروت لڑکے' کتنے عرصے بعد فون کیا ہے تم نے۔" ساتھ ہی اس کا دل دھڑکا کہ اب وہ بھائی جان کو پوچھے گا۔

"بھابی' آپ کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔"

"واپس آرہے ہو نا؟"

"جی ہاں لیکن خوش خبری اور ہے۔ اپنے ساتھ آپ کے لیے ایسا تحفہ لا رہا ہوں کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔"

"بتاؤ نا۔"

"آپ کی ہی ایک گمشدہ چیز ہے۔"

فوزیہ کا دل بے طرح دھڑکا۔ اس کی تو ایک ہی چیز گم ہوئی تھی۔ عزیز ترین ہستی.... اس کا شوہر۔ "پہیلیاں نہ بجھواؤ بابر۔"

بابر کا لہجہ ہیجانی ہو گیا "آپ بھائی جان کی یادگار سالگرہ کی تیاری مکمل کر لیں۔ میرے ساتھ بھائی جان بھی ہوں گے۔ اب آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہم لوگ انشاء اللہ سالگرہ والے دن پہنچیں گے۔"

فوزیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل تھا کہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔ بابر بھابی' بھابی پکار رہا تھا لیکن بولنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا "بابر... بابر کیا یہ سچ ہے؟" اُس نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

"بھابی اتنے بڑے معاملے میں' میں مذاق کروں گا کیا۔ پلیز بھابی آپ رو نہیں۔"

"میں کتنی خوش ہوں' بتا نہیں سکتی۔ اِس سے بڑی خوش خبری کوئی مجھے سنا نہیں سکتا۔"

"بس تو منہ مانگا انعام پکا۔"

"بالکل پکا۔"

"تو انعام میں وہیں آکر لوں گا۔ اچھا بھابی خدا حافظ۔"

فوزیہ ریسیور رکھ کر سناٹے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ بابر نے کہا تھا بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ جس حال میں بھی ہوں میرے لیے تو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں لیکن ابھی اُس کے آنے میں آٹھ دن ہیں۔ کیسے کٹیں گے یہ دن۔ وہ روتے روتے ہنس دی۔ ایک سال سے زیادہ کی جدائی سہنے والی اب صرف ایک ہفتے کی جدائی سے گھبرا رہی تھی۔

اچانک اسے بچوں کا خیال آیا۔ بچوں کو بھی بلوا لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اُس نے ریسیور اٹھایا۔

"باجی' میں ثمینہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ ثمینہ۔"

"باجی کل اسکول کا آخری دن ہے پھر چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ انہیں لے آؤں یا..."

"ارے پگلی' ابھی میں اسی لیے تمہیں فون کرنے والی تھی کہ تمہارا فون آگیا۔ بچوں کو لے آؤ۔"

"کیا بات ہے باجی' بہت خوش لگ رہی ہیں؟"

"خوش خبری تم بھی سنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ ۳۰ دسمبر کو تمہارے بھائی جان گھر آرہے ہیں۔"

"مبارک ہو باجی۔" ثمینہ کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"بس تم کل کی فلائٹ سے آجاؤ بچوں کو لے کر۔ بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے باجی۔"

○☆○

عاصم کی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ عالم خواب میں ہو۔ ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ بابر کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایڈز کا مریض نہیں تھا۔ امریکی ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں تجویز کر دی تھیں۔ دس دن وہ اسپتال میں داخل رہا تھا اور اب وہ وطن واپس جا رہا تھا۔

سفر کے دوران وہ صرف یہ سوچتا رہا کہ فوزیہ کا سامنا کیسے کرے گا۔ اِس ذہنی کیفیت میں یہ فیصلہ کرنا اُس کے لیے دشوار تھا کہ اس نے گھر چھوڑ کر غلطی کی تھی یا نہیں۔ صوفیہ کو اعتماد میں نہ لینا زیادتی تھی یا نہیں۔ اب اُس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے اور فوزیہ کا رویہ کیسا ہوگا۔ ان سوچوں نے اسے اور الجھا دیا۔

اسے علم نہیں تھا کہ بابر گھر فون کر کے آمد کی اطلاع دے چکا ہے۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ ائرپورٹ سے ہی منہ چھپا کر کہیں نکل لے گا۔ لیکن ائرپورٹ پر فوزیہ اور بچے اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے جبکہ بچوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

پھر بھرے ہوئے دریا نے بند کو توڑ دیا۔ عاصم کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کب وہ گاڑی میں بیٹھے اور کب گھر پہنچے۔ گھر جسے وہ بھول چکا تھا' جس سے وہ دست بردار ہو چکا تھا' جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہاں اب وہ قدم بھی نہیں رکھ سکے گا۔ وہ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ بھی اُس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ بچے البتہ حیران تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ وہ ان کے ہاسٹل میں قیام کے دوران گھر میں نہیں تھا۔

عاصم اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ فوزیہ اور بچے اس کے ساتھ تھے۔ ثمینہ بابر کو اس کا کمرا دکھانے لے گئی جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔

"فوزیہ' میں....."

فوزیہ نے اُس کی بات کاٹ دی "کیا پھر بھاگ جانے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"نہیں تو' کیا مطلب؟" وہ گڑبڑا گیا۔

"مطلب یہ کہ باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی آپ باتھ روم جائیں' نہا دھو کر تازہ دم ہوں اور فوراً سو جائیں۔ دو گھنٹے بعد آپ کو جگا دیا جائے گا۔"

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا' صبح کے نو بجے تھے "لیکن میں....."

فوزیہ نے پھر اُس کی بات کاٹ دی "بس آپ کو اس ہدایت پر عمل کرنا ہے۔ آپ باتھ روم میں جائیں۔ میں بچوں کو لے کر جا رہی ہوں۔ آپ کے کپڑے نکال جاؤں گی۔"

"مگر کپڑے تو میرے سوٹ کیس میں ہیں۔"

فوزیہ نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا "آپ کو یاد نہیں کہ آپ اس وقت اپنے گھر میں ہیں اور گھر میں آپ کا وارڈ روب موجود ہے۔"

عاصم کھسیا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو کپڑے بیڈ پر پھیلے نظر آئے۔ اس نے کپڑے بدلے تو عجیب طمانیت کا احساس ہوا۔ پہلی بار اسے یقین آیا کہ وہ گھر واپس آ گیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ اس کا وجود شکر گزاری کے احساس سے چھلکنے لگا۔ رب کریم نے اس کا سب کچھ اسے لوٹا دیا تھا۔ وہ شکر کے دو نفل پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

وہ دو رکعتیں بہت طویل تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ یونہی نماز پڑھتا رہے۔ آنکھوں سے شکر کے آنسو بہتے رہیں اور سجدے کی لذت... سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اُس وقت وہ فوزیہ سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے نیند نہیں آ رہی ہے اور نیند اسے اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ بس وہ فوزیہ کی بات رکھنے کے لیے بستر پر جا لیٹا۔ بستر جیسے جانی پہچانی کسی آغوش کی طرح اس کے لیے وا ہو گیا۔ اسے بے خبر سونے میں چند لمحے بھی نہیں لگے اور وہ ایسی نیند تھی جو گھر سے باہر اسے ایک بار بھی میسر نہیں آئی تھی۔ آٹھ گھنٹے سو کر بھی نہیں۔ پھر وہ خواب دیکھ رہا تھا وجود میں طمانیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کے دونوں رخساروں پر چپکے ہوئے ہونٹ محبت کا امرت اس کی روح میں اتار رہے تھے۔ پھر کورس میں آواز ابھری "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ... اس مقام سے آوازیں جدا ہو گئیں۔ بچے ڈیڈی کہہ رہے تھے' فوزیہ عاصم کہہ رہی تھی اور ایک بھائی جان کا ڈوٹ بھی تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب نہیں تھا۔ وہ سب اس کے کمرے میں موجود تھے۔ سلیم اور ملیحہ اس کے رخسار چوم رہے تھے۔ فوزیہ سرہانے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ثمینہ کھڑی تالیاں بجا رہی تھی اور سامنے بابر کیمرا لیے یہ سب کچھ ریکارڈ کر رہا تھا۔

عاصم بوکھلا گیا "یہ.... یہ کیا؟"

"ڈیڈی' آپ کو یاد نہیں' آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔" ملیحہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

"کیا واقعی؟" اس نے تائید کے لیے پہلے فوزیہ اور پھر بابر کو دیکھا۔

"بیٹے' تمہارے ڈیڈی بھلکڑ پروفیسر ہو گئے ہیں۔" فوزیہ نے ملیحہ سے کہا "اچھا اب اٹھ جائیے' کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا' بارہ بج چکے تھے۔ وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ دھو کر کمرے سے نکلا تو سب ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ وہاں ایک اجنبی چہرہ بھی تھا "بھائی جان' آپ کو ایک اہم شخص سے ملواؤں۔" بابر نے کہا "آپ آج کے دن کے ہیرو ہیں تو یہ اس کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر اور مصنف ہیں۔"

"پھر تو یہ وی آئی پی ہوئے۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن میں سمجھا نہیں۔"

"یہ وہ پریس رپورٹر ہیں وحید نجمی' جنہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ نہ بتاتے تو شاید ہم یہاں اکٹھے نہ ہوتے۔"

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں ڈاکٹر۔" نجمی کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"نہیں نجمی صاحب' بابر نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں بلکہ ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔" اس نے گرم جوشی سے نجمی سے ہاتھ ملایا "کس اخبار کے لیے لکھتے ہیں آپ؟"

نجمی مسکرانے لگا "آج کل تو بیگم صاحبہ کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

عاصم کو حیرت ہوئی لیکن اس دوران ثمینہ اس کی طرف آنگن کی پہلی کاپی بڑھا چکی تھی۔ "چھوڑو جی' جس کے لیے ہم نے یہ سب کیا اسے تو پتا بھی نہیں۔" فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا اب کھانے کو انتظار نہ کرائیں آپ لوگ۔" ثمینہ نے احتجاج کیا۔

کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عاصم نے فوزیہ سے کہا "تم خوامخواہ آگے نکل گئیں۔ جانتی ہو' میں یہ ارادہ کر کے آیا ہوں کہ اب اخبار نکالوں گا۔"

"تو اب آپ کے لیے ایک سیٹ اپ پہلے سے موجود ہے۔"

مجی نے کہا "ویسے آپ جیسے آدمی کو اس فیلڈ میں ضرور آنا چاہیے۔"

"آپ مجھے جانتے بھی نہیں پھر ایسی بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"آپ کے قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دنیا میں سب سے زیادہ آپ کو میں جانتا ہوں۔"

"یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔" فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا "تحقیق ان کا خاص میدان ہے۔"

"تب تو یہ ہماری ٹیم میں شامل ہوں گے انشاء اللہ۔" عاصم نے کہا "ارے فوزیہ اپنے اسٹاف سے تو ملواؤ نا۔"

"شام کو مل لیجئے گا۔ میں نے آپ کی برتھ ڈے پر سب کو مدعو کیا ہے۔"

○☆○

اس بات کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ پاکستان میں اس عرصے میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ وفاقی کابینہ سے کچھ وزیر رخصت ہو گئے تھے اور کچھ نئے لوگ کابینہ میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اس سے قطع نظر وہی فضا تھی' وہی کرتوڑ مہنگائی تھی اور وہی وعظ کہ عوام دو تین سال اسی طرح قربانی دیتے رہے تو پاکستان کو دائمی خوش حالی نصیب ہو جائے گی۔ لیکن ارباب اقتدار کے اعلیٰ طبقے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی ان کے طور طریقے اور انداز دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ ملک میں جمہوریت نہیں ملوکیت قائم ہے۔

عاصم قریشی کو روزنامہ "صبح بخیر" کا ڈکلیریشن مل چکا تھا۔ اخبار کے اجرا کے لیے تین ماہ کی مہلت دی گئی تھی مگر عاصم کو امید تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر ہی اخبار کو اسٹال پر لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل تھے۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ جس دن کوئی دھماکا خیز خبر آگئی اسی دن سے اخبار کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔

فوزیہ کا ہفت روزہ آنگن خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ اُس کی اشاعت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ادارے کے لوگ روزنامے کی اضافی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے کیونکہ ان کے پبلشرز دیانت دار بھی تھے اور حوصلہ مند بھی۔

ہاں' ملک میں ایک اور مثبت کام بھی ہوا تھا۔ عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک نے کراچی میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ بابر کا خیال تھا کہ آئندہ سال پشاور یا راولپنڈی میں بھی لیب کی شاخ قائم ہو جائے گی۔

اُس صبح عاصم تازہ اخبار کا فلمی صفحہ پڑھ رہا تھا۔ فلمی صفحہ وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس روز عظمت مرزا کی فلم ٹوٹے ستارے کے متعلق خبر چھپی تھی کہ فلم آئندہ جمعے سے عام نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ خبر دینے والے نے لکھا تھا فلم کی اسٹوڈیو رپورٹ اور سنسر رپورٹ بے حد شان دار ہے۔ پریمیر شو دیکھنے والے ناقدین کا کہنا ہے کہ ٹوٹے ستارے فلم انڈسٹری کے مُردہ تن میں نئی روح پھونک دے گی۔ ممکن ہے یہ ایسی آرٹ فلم ثابت ہو جو باکس آفس پر کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کرے۔ فلمی نجومیوں نے اس فلم کی زبردست کامیابی کی پیش گوئی کی ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ فلم کی ہیروئن الماس اپنی معصومیت' حسن اور اعلیٰ کردار نگاری کے زور پر اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی سپر اسٹار بن جائے گی۔ واضح رہے کہ الماس فلم کی ریلیز سے پہلے ہی خواص میں سپر اسٹار کا مرتبہ پا چکی ہے۔ غیر فلمی سرگرمیوں کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت اونچا اڑ رہی ہے بلکہ اوپر ہی اوپر جا رہی ہے۔

عاصم نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھا اور بابر کی طرف متوجہ ہوا جو فوزیہ سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا "کیا سازش ہو رہی ہے؟"

"آپ بھی سُن لیں" بابر نے کہا "بھابی نے مجھ سے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا' اب مکر رہی ہیں۔"

"دیکھو نا' تم نے مانگا بھی کیا ہے۔" فوزیہ بولی۔

"کیا مانگ لیا بھئی؟" عاصم نے متجسس لہجے میں بابر سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں ثمینہ سے میری شادی کرا دیجئے۔"

فوزیہ مسکرا رہی تھی۔ عاصم نے پوچھا "پھر تمہاری بھابی کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں' وہ تو بہت پہلے سے بک ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہیں۔" عاصم نے کہا۔ پھر وہ فوزیہ کی طرف مڑا "ثمینہ سے بکنگ کنفرم بھی کرا لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بس تو پھر بتا دیں۔"

بابر کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بابر' منہ مانگا انعام تمہارا ہوا۔" فوزیہ نے کہا۔

بابر کا منہ پہلے حیرت سے کھلا پھر وہ اچانک ہنسنے لگا "میں سمجھ گیا۔ میں نے منہ مانگے انعام کا موقع گنوا دیا۔ یہ تو آپ لوگ پہلے سے طے کیے بیٹھے تھے۔ اب مجھے یاد آیا' لاہور میں ایک دن بھائی جان نے مجھ سے کہا تھا "میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کر چکے ہو۔" بابر نے عاصم کی سی آواز بنا کر دہرایا "پھر بڑی سوگواری سے یہ بھی فرمایا تھا' کاش..... میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں۔"

عاصم جھینپ گیا۔ فوزیہ قہقہے لگانے لگی۔ اسی وقت ثمینہ کافی لے آئی "کس بات پر ہنس رہی ہیں؟" اس نے فوزیہ سے پوچھا۔

"مت پوچھو۔ اِدھر بھائی جان کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ بات تمہیں بتا دی تو تمہارا حشر ان سے بھی بُرا ہو گا۔ دیکھ رہی ہو ان کا جھینپنا۔" بابر نے کہا۔

ثمینہ بغیر بات سنے اور سمجھے ہی جھینپ گئی۔ اس بار عاصم بھی قہقہوں میں شامل ہو گیا۔

☆☆

ڈائمنڈ اردو بکس

تمام کتب فی سبیل اللہ

ایڈمن ٹیم:

شاہ زر خان + کول فائر

جہاں ملیں آپ کو نایاب کتب نایاب ویب سائٹس سے

Rekhta	ناول + کہانیاں
Scribd	ماہانہ ڈائجسٹ
Slide Share	عمران سیریز
Kitab Ghar	بچوں کی کہانیاں
English Book,s	سکول و کالج بکس
English Novel,s	نوٹس + مواد

اس گروپ میں ایڈمنز 24/7 دستیاب ہوتے ہیں

اور آپ کی ڈیمانڈ پر بروقت کام کیا جاتا ہے

03176699066
SHAHZAR KHAN
TEAM DIAMOND URDU BOOKS

COOL FIRE/WAQAS AHMED
RANA M.AZEEM RIZVI
FAISAL MIRZA

تمام کتب انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے مہیا کی جاتی ہیں جو کتاب پیڈ ہو یا پی ڈی ایف میسر نہ ہو وہ شیئر نہیں کی جاتی

ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس گروپس لنکس

گروپ میں ایڈ ہونے کے لیئے گروپ کے نام یا تصویر پہ کلک کریں

ڈائمنڈ اردوبکس	ڈائمنڈ اردوبکس
ڈی یوبی میڈیا	کاروانِ شعروادب
اردوتحاریر کاگلدستہ	ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
کتابوں پر تبصرے	حمدونعت آفیشل
ڈی یوبی ٹیلی گرام 300,000+ books	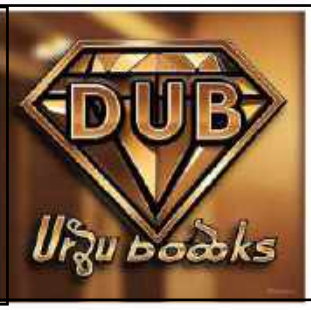 فیس بک گروپ ڈائمنڈ اردوبکس

لنک ری سیٹ ہونے یا کام نہ کرنے کی صورت میں اس نمبر پر رابطہ کریں

شاہ زر خان: 03176699066

DUB

یا اللہ عزوجل　　بسم اللہ الرحمن الرحیم　　یا رسول اللہ ﷺ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معزز اراکینِ ڈائمنڈ اردو بکس !

آپ سب کو ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس کے گروپس میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

گروپس کے قواعد و ضوابط :

گروپس میں کسی بھی قسم کی تصاویر ، ویڈیوز ، آڈیوز ، فیس بک/واٹس ایپ لنکس ، یا وائس میسجز شیئر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

کوئی بھی ممبر کسی دوسرے ممبر سے ذاتی رابطہ (بغیر اجازت) نہ کرے۔ شکایت کی صورت میں متعلقہ ممبر کو تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

تمام ممبران اور ایڈمنز کے ساتھ خوش اخلاقی، عزت و وقار اور بہترین تربیت کا مظاہرہ کریں۔

گروپس میں سیاسی ، مذہبی یا کوئی بھی ایسی بحث جس سے انتشار پیدا ہو یا جھگڑے کا خدشہ ہو ، سختی سے منع ہے۔

یہ قواعد سخت ضرور ہیں، لیکن ان کا مقصد گروپ کے نظم و ضبط اور ممبران کی سہولت کو یقینی بنانا ہے۔

انتہائی اہم اعلامیہ

گروپ میں قادیانی، مرزائی، احمدی، مرتد، گستاخِ رسول، گستاخِ صحابہ و اہلِ بیت، گستاخِ اولیاء، دہشت گرد تنظیموں، پاکستان و اسلام مخالف افراد، فوج یا سرکاری اداروں کے خلاف بولنے والوں کا داخلہ سختی سے ممنوع ہے۔ ایسے افراد کی شناخت کی صورت میں انہیں فوری طور پر تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

ہم صرف معیاری کتب فراہم کرتے ہیں، تاہم درج ذیل کتب ہماری پالیسی کا حصہ نہیں ہیں:

شیعہ مکتبہ فکر کی کتب , انتشار پھیلانے والی تحریریں , اداروں اور ریاست پاکستان کے خلاف مواد , لادین، ملحد یا فتنہ پرور مصنفین کی کتب

نوٹ :

تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش کر کے فی سبیل اللّٰہ اور بغیر کسی معاوضے کے فراہم کی جاتی ہیں (خود سکین نہیں کرتے)۔ اگر کسی کتاب سے متعلق کاپی رائٹ مسئلہ ہو تو براہِ کرم ایڈمنز سے رابطہ کریں، متعلقہ کتاب گروپ سے حذف کر دی جائے گی۔

رابطہ برائے شمولیت یا گروپ لنک ری سیٹ

سپر ایڈمن شاہ زر خان

+92 317 6699066

ایڈمن وقاص احمد/کول فائر

+44 7716 717193

+994 40 729 52 41